ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

Please examine the book before taking it out. You will be responsible for damages to the book discovered while returning it

DUE DATE

Cl No. _ *Acc No* ____

Late Fine Ordinary books **25 Paise** per day Text Book **Re 1/-** per day Over Night book **Re. 1/-** per day

33(1)

اردو کی منتخب کتابیں

سیاسی کتابیں

(۱) غبار خاطر۔ از ابوالکلام آزاد (آرڈر بک کیجئے)
(۲) مضامین ابوالکلام آزاد اوّل قیمت للعہ
(۳) " " دوم " للعہ
(۴) مضامین البلاغ " سے
(۵) اٹھارہ مہینے ہندوستان میں جواہر لال " [illegible]
(۶) تاریخ آزاد ہند فوج۔ امداد صابری " سے
(۷) سرخ چین کا رہنما۔ اسرار احمد " سے
(۸) ستالن۔ از آصف علی بیرسٹر للعہ
(۹) جواہر لال کی کہانی " [illegible]
(۱۰) ہمارے ہندوستانی مسلمان " [illegible]

ادبی کتابیں

(۱) شبلی کا [illegible] اردو ادب میں قیمت سے
(۲) مقالات [illegible] " [illegible]
(۳) جاپانی شاعری " [illegible]
(۴) [illegible]ستان " [illegible]

ناول وافسانے

(۱) شمع۔ اے آر خاتون۔ قیمت [illegible]
(۲) شمیم۔ فیاض علی۔ [illegible]
(۳) [illegible] مسز احمد علی [illegible]

(۴) واردات پریم چند۔ قیمت [illegible]
(۵) بیوہ " [illegible]
(۶) آخری تحفہ " [illegible]
(۷) موج نیل۔ زین العابدین " [illegible]
(۸) چوراہا۔ قیسی رامپوری " [illegible]
(۹) ہما خانم۔ سجاد حیدر " [illegible]
(۱۰) نئے محل۔ ظفر قریشی " [illegible]

نظم

(۱) مسدس حالی صدی اڈیشن قیمت [illegible]
(۲) اردو شاعروں کا البم " سے
(۳) جاپانی شاعری " [illegible]
(۴) آبگینے " [illegible]

مذہبی کتابیں

(۱) اسلام کیسے شروع ہوا۔ قیمت [illegible]
(۲) اسلام کیسے پھیلا اوّل " [illegible]
(۳) " " " دوم " [illegible]
(۴) دربار رسولؐ کے فیصلے " للعہ
(۵) نظریہ توحید۔
(۶) شاہ ولی اللہ کا فلسفہ " [illegible]
(۷) افادات شاہ ولی اللہ " [illegible]
(۸) کتب سماوی پر ایک نظر " [illegible]

(۹) لغات القرآن اوّل۔ قیمت [illegible]
(۱۰) " " دوم " [illegible]

مختلف کتابیں

(۱) [illegible] لندن سے آداب عرض قیمت [illegible]
(۲) [illegible]
(۳) آبحیات کے چشمے " [illegible]
(۴) ہوائی حملے " ۱۲

بچوں کی کتابیں

نظم

(۱) اسلامی نظمیں شفیع الدین نیر۔ قیمت [illegible]
(۲) وطنی نظمیں " [illegible]
(۳) بچوں کا تحفہ اوّل " [illegible]
(۴) " " دوم " [illegible]

کہانیاں

(۱) چمن شن۔ شفیع الدین نیر قیمت [illegible]
(۲) میاں مٹھو " [illegible]
(۳) جادو کی کتاب " [illegible]
(۴) ننھے جج کو [illegible]

سادہ لوح شوہر کے [illegible] سے گھر کے پڑھنے کے لائق

ملنے کا پتہ

اپنے شہر کے کتب فروشوں [illegible] سے خریدیئے

حالی پبلشنگ ہاؤس (دہلی)

اردو کتابوں کا سب سے بڑا مرکز

ادارہ
شاہد احمد دہلوی
محمد حسن عسکری

جرعات

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ نہیں لیا جاتا
سالنامہ تین روپیہ

124633
1.8.95

جلد ۳۳ | ساقی سالنامہ دہلی، بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۶ء | نمبر ۱

معذرت

افسوس ہے کہ سالنامہ کے لئے جتنے مضمون منتخب کئے گئے تھے اُن میں سے چند شریک نہیں ہوسکے۔ ساقی نادم اور اپنی تنگ دامانی کا شاکی ہے ؎

دامانِ نگہ تنگ وگلِ حُسنِ تو بسیار
گلچینِ تو از تنگیٔ دامانِ گلہ دارد

باقی ماندہ مضامین ساقی کی آئندہ اشاعتوں میں پیش کئے جائیں گے۔ گو ادائے سپاس کا یہ ایک موزوں پیرایہ نہ ہوگا۔ تاہم اُمید ہے کہ محترم خواتین وحضرات شاکی ہوکر ساقی کو مزید شرمندہ نہ فرمائیں گے۔

(ادارۂ ساقی)

خانم

مرزا عظیم بیگ چغتائی کی وہ ہنسانے والی کتاب، جس میں دیورانی جٹھانی کی خندہ خیز نوک جھونک اور خانم اور خانم کے سادہ لوح شوہر کے پُرلطف قصے درج ہیں۔ سارے گھر کے پڑھنے کے لائق کتاب۔ قیمت چار روپیہ! اپنے شہر کے کتب فروشوں یا ساقی بکڈپو دہلی سے خریدیئے!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شاہد احمد دہلوی

نگاہِ اوّلیں

الحمدللہ۔ ساقی نے اپنی زندگی کے سولہ سال پورے کئے اور اب سترھویں میں قدم رکھ رہا ہے۔ ۴۵ء میں رسائل نے فراغت کا سانس لیا۔ حکومت نے اخباری کاغذ کی ماہوار مقدار میں اضافہ کر دیا اور ساقی اس لائق ہوا کہ "ظرافت و طنز نمبر" اور "افسانہ نمبر" پیش کر سکے۔ اب نئے سال کا تحفہ سالنامہ کی صورت میں پیش کر رہا ہے۔ سالنامہ کا کام اکتوبر سے شروع کر دیا گیا تھا۔ کاغذ کی فراوانی اور چھاپہ خانوں کی کمی نے پبلشرز کے لئے ایک ایسا پیچیدہ سوال پیدا کر دیا ہے جس کا کوئی حل نہیں ہے۔ پرانی مشینیں کام کی زیادتی کی وجہ سے ٹوٹنے لگیں۔ نئی مشینیں آتے آتے آئیں گی ابھی تو مشین بنانے والے کارخانے بھی نہیں بنے۔ مسابقت نے چھاپہ خانوں میں اندھیر نگری کو جنم دیا۔ چنانچہ چارگنی اُجرت پر بھی کام نہیں ہو سکتا کیونکہ چھ گنی اُجرت کا کام ہو رہا ہے۔ ہم نے اسی اندیشے کی وجہ سے سالنامہ کا کام تین مہینے پہلے شروع کیا تھا مگر وسط دسمبر میں معلوم ہوا کہ پریس نے ایک کاپی بھی نہیں چھاپی۔ وجہ یہ بیان کی گئی کہ مشین ٹوٹی پڑی ہے اور بہتر ہوگا کہ ساقی کسی اور پریس میں چھپوا لیا جائے۔ اِس چھاپہ خانے میں ساقی گذشتہ دس سال سے چھپ رہا ہے۔ اب پہلی بار معلوم ہوا کہ ساقی اس مخصوص ٹوٹی ہوئی مشین پر چھپتا تھا اور باقی مشینیں ساقی کے لئے ممنوع ہیں۔ ناچار ایک اور چھاپہ خانے میں پرچہ بھیجا گیا۔ وہاں بجلی گھر کمپنی والوں نے کسی وجہ سے پریس کی بجلی کاٹ دی۔ مگر پریس والوں نے ہمت نہ ہاری اور بڑی کوشش اور تن دہی سے سالنامہ چھاپا۔ ہفتہ عشرہ کی تاخیر سے سالنامہ آپکو انہی مشکلات کی وجہ سے ملا ہے۔

سالنامہ کے مضامین کے متعلق بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے لیکن ساقی کے خوش ذوق ناظرین پر انکا فیصلہ چھوڑا جاتا ہے کیونکہ اصل پسند اور ناپسند انہی کی ہے۔ اور یہی ساقی کا معیار ہے۔

سالنامہ کے لئے جو مضامین جمع کئے گئے تھے اُن میں سے بعض مذکورۂ صدر مجبوریوں کی وجہ سے روکنے پڑے ورنہ سالنامہ بجائے جنوری کے فروری میں شائع ہوتا۔ اِس کا ہمیں بہت افسوس ہے اور اس کی معذرت کہیں اور بھی ہم کر چکے ہیں۔ اسے ساقی کی تنگ دلی پر نہیں تنگ دامانی پر محمول کیجئے۔ یہ مضامین فروری کے ساقی میں شائع ہوں گے۔

"ظرافت و طنز نمبر" حسب معمول یکم اپریل کو شائع ہوگا۔ اِس کے لئے چند مضامین انتخاب کئے جا چکے ہیں۔ لکھنے والوں کے نام ہیں:۔ مرزا فرحت اللہ بیگ۔ غلام یزدانی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، چیتن آنند، ہرندرناتھ چٹوپادھیا۔ سعادت حسن منٹو۔ اور کرشن چندر۔ "ظرافت و طنز نمبر" کے مضامین ۱۵ر فروری تک مکمل کر لئے جائیں گے۔ مارچ کے ساقی میں ان کی فہرست پیش کی جائے گی۔

حضرت خواجہ حسن نظامی دلّی کی اُن مخصوص ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمر (اپنی بے شمار مصروفیات کے باوجود) اُردو ادب کی خدمت میں صرف کی ہے۔ خواجہ صاحب نے ایک نہایت دلکش طرزِ تحریر وضع کیا جس کے لوچ اور لچک نے ثابت کر دیا کہ اُردو میں ہر قسم کے خیالات کے اظہار کی کتنی بڑی صلاحیت ہے۔ خواجہ صاحب کے اسلوبِ بیان نے اُردو کو وہ ہردلعزیزی بخشی جو ابوالکلامی اندازِ تحریر نے اس سے چھین لی تھی۔ خواجہ صاحب نے بولنے اور لکھنے کی زبان کے فرق کو مٹا کر اُردو کی ایسی خدمت کی ہے کہ ان کا نام ہمیشہ مفتخر رہے گا۔ ہمارے علماء نے اُردو کو اتنا مغلق بنا دیا تھا کہ یہ ہمارے دیس کی زبان ہی نہیں معلوم ہوتی تھی خواجہ صاحب نے اُردو کو عربی اور فارسی کی تاخت سے بچایا اور وہ نحیف آواز جو آج سے چالیس سال پہلے ایک شخص نے اُٹھائی تھی آج ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گونج رہی ہے۔ آسان اُردو یعنی دیس کی عام زبان خواجہ صاحب کی ایک ہی خدمت ایسی ہے کہ انہیں عظمت کا مستحق بناتی ہے۔ حکومت نے انہیں "شمس العلماء" کا خطاب دے کر ان کی صحیح قدردانی کی ہے حق بہ حقدار رسید۔ خدا کرے کہ اِن کا سایہ اُردو کے سر پر تا دیر قائم رہے۔

محمد حسن عسکری

جھلکیاں

جیمز جوئس!

آج میں نے عجب مسخرگی اختیار کی ہے۔ ایک مستقل عنوان قائم کر کے مضمون لکھ رہا ہوں، اور وہ بھی جوئس پر۔ یہ ٹھیک ہے کہ جہاں تک جوئس کا تعلق ہے۔ میں بہت سے لوگوں پر کم سے کم ایک بات میں فوقیت رکھتا ہوں ۔ میں نے جوئس کی کتابیں پڑھی ہیں۔ اس لئے ممکن تھا کہ میں جوئس پر دس بیس صفحے معقولیت کے ساتھ لکھ سکوں۔ لیکن اس کو کیا کروں کہ نئے ادب کی تحریک میں میں بھی شامل رہا ہوں۔ اور اب اس تحریک میں چند سالس اور باقی رہ گئے ہیں ۔ وہ بھی اکھڑے اکھڑے۔ یہ سارا ہنگامہ محض بلوغت کا اُبال تھا اور ریاستہ بلوغت لازوال نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ پچھلے دس سال میں اس تحریک نے جو ادب پیدا کیا ہے وہ صرف انڈرگریجویٹ ادب ہے۔ عصمت چغتائی کے مضمون "دوزخی" کو چھوڑ کر (ایسی ایک آدھ چیز کوئی اور ہو تو اس وقت یاد نہیں آرہی) اس ادب میں کوئی چیز ایسی ہے ہی نہیں جو سنجیدہ ذوق رکھنے والے دماغ کو زیادہ دیر تک مصروف رکھ سکے۔ میٹھا برس لگتا ہے تو اسکول کی لونڈیاں تک ایسا ادب پیدا کر لیتی ہیں ادب میں نئے ادیبوں کا بس وہی درجہ ہے جو عاشقی میں انشا کے اس عاشق کا:

کود اترے گھر میں کوئی یوں دھم سے نہ ہوگا جو کام ہوا ہم سے وہ رستم سے نہ ہوگا

انشا نے لطیفے کے طور پر نقل نہیں کیا، بلکہ حقیقت ہے ۔ ادیبوں اور شاعروں کو واقعی اس دھم سے کودنے ہی پر فخر ہے، اور ان کے نزدیک یہی ادب ہے۔ لیکن دھما چوکڑی کا نتیجہ صرف ایک ہی ہوتا ہے ۔ آدمی تھک کے گر پڑتا ہے۔ چنانچہ نئے ادیبوں کو آج یہی صورت حال در پیش ہے۔ اب تو بس گھنی ہی گھنی باقی رہ گئی ہے: البتہ ندا ہوں نے ضرور انھیں بالنس پر چڑھا رکھا ہے۔ جن میں تو ادیب ودیب کس بات کا ہوں، نہ خاں میں نہ خان کے اونٹوں میں، لیکن چونکہ اس ٹھٹھے کے ساتھ مضمون لکھنے بیٹھا ہوں، اس لئے ایمانداری کا تقاضا تو یہی ہے کہ میں اعتراف کر ہی لوں حالانکہ یہ وہی بات ہوگی کہ تم کون، میں خواہ مخواہ اپنا حال تو یہ ہے کہ اب میری کھوپڑی میں ایک خیال تک باقی نہیں ہے اب تو میں اس لائق رہ گیا ہوں کہ الہ آباد کے علاوہ کسی اور ہندستانی یونیورسٹی میں مجھے شعبۂ انگریزی کا صدر بنا دیا جائے۔ لیکن چونکہ ابھی میں اپنے آپ سے بالکل مایوس نہیں ہوا اس لئے یہ منصب قبول نہیں کروں گا۔ اگر سوال محض جوئس کے طالب علموں کو آسانیاں پہنچانے کا ہوتا تو بغیر خیالات کے بھی کام چل سکتا تھا۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ میرے لئے جوئس ایک عجوبہ نہیں ہے۔ بلکہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا ادیب ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ جوئس کے اسلوب کو اور ٹیکنیک کو سمجھے اور اسے ذہن میں رکھے بغیر اس کی کتابوں سے لطف نہیں اٹھایا جا سکتا۔ لیکن "یولی سیز" کو شائع ہوئے اب پچیس برس کے قریب ہوتے ہیں، اب ٹیکنیک کی تشریحیں لکھنے، اور اسلوب بیان کی گتھیاں سلجھاتے رہنے کا تو زمانہ رہا نہیں جو لوگ کل تک جوئس کے مخالف تھے وہ بھی یہ بات تسلیم کرتے جا رہے ہیں کہ اس کا شمار یورپ کی تہذیب کے پیدا کئے ہوئے بڑے سے بڑے آدمیوں میں ہے۔ چنانچہ اب وقت آگیا ہے کہ جوئس کے کارنامہ کو مجموعی حیثیت سے جانچا جائے۔ یہاں آکر بہت سے سوال اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ نہ صرف آرٹ کے بارے میں، بلکہ یورپ کی تہذیب اور ادب کے بارے میں بھی ہم ایسی باتیں ہیں جن کے ... کی صلاحیت آج میرے اندر باقی نہیں ہے۔ ایک سال، پہلے بہت کچھ کہہ سکتا تھا، دو سال پہلے اس سے بھی زیادہ گناہ خواہ کسی کا ہو مگر نتیجہ بھگتنے والوں میں اوروں کے ساتھ میں بھی شامل ہوں۔

پھر اس وقت اردو ادب کا ماحول بھی اس قسم کا نہیں جہاں کسی مصنف کا ذکر کیا جا سکے۔ ...... Writings ... نے لوگوں کا مذاق اس قدر خراب کر دیا ہے ۔ اور کچھ ترقی پسند ... نے ۔ کہ اب تو "عظیم" کا لفظ ہمہ شما ہر ایک کے لئے استعمال کیا جانے لگا ہے۔

تعریف کے جملے لفظ بکے وہ لوگ دوسروں سے ورثے میں اُڑ دیئے۔ اب شاہانہ محل کے اندر رہنے والوں کا ذکر میں کن لفظوں میں کروں۔ اب اس کے بعد جوائس کو بڑا "کہنا درحقیقت اس کی توہین کرنا ہے۔ ایک اور لفظ ہے جس کی بُری طرح مٹی پلید ہو رہی ہے — آرٹ اور آرٹسٹ۔ بعض شاعروں اور نظروں تک میں اپنے آپ کو آرٹسٹ کے نام سے یاد فرمانے لگے ہیں۔ یہ لفظ اتنا مجبور ہو گیا ہے کہ ہمیں اسے استعمال کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ آرٹ کو تو ان حضرات نے بالکل دال روٹی بنا ڈالا ہے، حالانکہ آرٹ کی تخلیق وہ ہیبت ناک ذمہ داری ہے جس سے بچنے کیلئے لوگ، بقول مارسل پروست قومی لڑائیوں میں شامل ہو کر جان دے دیتے ہیں، اور شاید اسی کے لئے فراقؔ نے کہا ہے:

حیات تو اسی جو پاتے ہیں لوگ اے ساقی یہ کون درد اٹھاتے ہیں لوگ اے ساقی

کم سے کم میں ایسے ماحول کو اپنے لئے خوشگوار نہیں پاتا۔ جہاں لوگ یہ جاننے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ کس چیز کی عزت کی جائے اور کس چیز کی نہ کی جائے، جہاں کوئی چیز پاکیزہ اور مقدس نہ رہی ہو بلکہ ابتذال میں تبدیل ہو گئی ہو۔ میں اب بھی آرٹ برائے آرٹ کا قائل ہوں۔ لیکن اس بوالہوسی کے زمانہ میں تو میں چیسٹرٹن کا نعرہ اختیار کرنا چاہتا ہوں: "No art, for God's Sake."

بہرحال میں نے مارسیٹ کے اپنے آپ کو جوائس پر کچھ لکھنے کیلئے تیار کیا ہے۔ جو کچھ میں لکھوں گا وہ بالکل ذاتی اور شخصی تعبیر ہوگی۔ یہ میری رائیں نہیں ہونگی بلکہ محض تاثرات۔ نہ میرا کوئی نقطۂ نظر ہے۔ اگر میرا کوئی "نقطۂ نظر" قائم ہو گیا تو میں اُسے اپنی سب سے بڑی ناکامیابی سمجھوں گا۔ اگر میرا کوئی "نقطۂ نظر" ہوتا بھی تو مجھے اُسے "عام" کرنے کی کوئی فکر نہ ہوتی۔ میں کسی مسئلے میں بھی کسی کو قائل کرنا نہیں چاہتا — اسی لئے میں غیر منطقی باتیں کرنے سے نہیں ڈرتا۔ بعض وقت تو بحث کرنے اور دوسروں کو قائل کرنے سے زیادہ مبتذل بات مجھے اور کوئی نظر نہیں آتی۔ جوائس نے ایک جملہ میں میرے لئے زندگی کا لائحہ عمل مقرر کر دیا ہے:

"He could not strive against another. He knew his part."

آدمی کو صرف ان چیزوں کے متعلق بحث کرنی چاہیئے جن سے قلبی تعلق یونہی ہلکا سا ہو۔ "یولی سیز" میں ایک مقام بہت بلند آتا ہے یہاں پہنچ کر مجھے کچھ وجد سا آنے لگتا ہے — حالانکہ اس کے متعلق جوائس کے نقادوں نے کچھ نہیں لکھا۔ اسٹیون شیکسپیئر کے متعلق عجیب و غریب نظریئے پیش کر رہا ہے۔ اور اس نے سب بحث کرنے والوں کو زچ کر رکھا ہے۔ آخر ایک آدمی پوچھتا ہے: "کیا واقعی تمہارا ان سب باتوں پر پورا یقین ہے؟" اسٹیون جواب دیتا ہے۔ "نہیں، در ابھی نہیں"۔ اس جملہ میں فن کار کی حیثیت خالق کے اپنی پوری قدرت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس جملہ پر تو ایک مضمون لکھا جائے۔ تو یہ ہے ایک مثالی نمونہ غیر اہم چیزوں کے بارے میں فن کار کے طرز عمل کا۔ لیکن جو چیزیں واقعی فن کار کی زندگی کے لئے زبردست اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے بارے میں دوسروں سے بحث کرنا کیا معنی، اپنے آپ کو قائل کرنا بھی صداقت سے غداری کے مترادف ہے۔ "Portrait of the Artist" میں اسٹیون ایک دوست سے کہتا ہے کہ میں مذہبی رسوم پر اعتقاد نہیں رکھتا، اور یہ بات بھی نہیں کہ اعتقاد نہ رکھتا ہوں۔ دوست تجویز کرتا ہے کہ اس قسم کے شکوک پر غلبہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسٹیون کا جواب ہے "میں ان پر غلبہ حاصل کرنا نہیں چاہتا۔" تو مطلب یہ کہ میں فن کار نہ سہی۔ لیکن مجھے لوگوں کو قائل کرنے کا بالکل شوق نہیں۔ اگر میں کبھی بحث کرتا ہوں تو صرف اس وجہ سے کہ مجھے پتنگ اڑانا نہیں آتا۔ چنانچہ میں اس مضمون میں کوئی ایسی بات نہیں لکھوں گا جس سے متعلق مجھے یہ اصرار ہو کہ اگر آپ نے اسے نہ مانا تو نئی دُنیا پیدا نہیں ہوگی۔ زیادہ خطرناک چیز یہ ہے کہ جہاں تک جوائس کا تعلق ہے اپنے دو ایک استادوں کو چھوڑ کر میں ہندوستان کے کسی آدمی کی بات سُننے کو تیار نہیں ہوں۔ یہ اپنی علمیت کا غرور نہیں ہے عالم بننے کی مجھ میں اتنی ہی صلاحیت ہے، جتنی ترقی پسندوں میں آرٹ کی اہمیت سمجھنے کی، اور عالم کہلانے کا اتنا ہی اشتیاق ہے جتنا سر پہ دو من بوجھ لاد کے پانچ میل چلنے کی داد پانے کا۔ اگر مجھے غرور ہے تو اپنے تاثرات کا، جو میرے ہیں خواہ تعداد میں چار ہی کیوں نہ ہوں ———— اور میں کسی کی علمیت یا منطق کے رُعب میں آکر انھیں بدلنے پر تیار نہیں ہوں۔

اگر میں جوائس پر ایسا لوٹ کے عاشق ہوا ہوں تو اس کی وجہ بھی تاثراتی ہے۔ جس وقت تک میں صرف منطق سے کام لے رہا تھا میں جوائس کے خلاف تھا۔ بلکہ "یولی سیز" کو بے معنی ثابت کرنے کے لئے میں نے ایک بڑی عمدہ دلیل بھی ڈھونڈی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ گورکی

ے بھی جوائس پر یہی الزام لگایا تھا۔ میں یہ ثابت نہیں کر رہا ہوں کہ میرا دماغ بھی بڑے آدمیوں کے دماغ کی طرح کام کرتا ہے۔ (اوّل تو مجھے گورکی کے بڑے ہونے ہی میں شک ہے)۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ جب بڑے آدمی اپنی عقل اور منطق کے قائل ہو جاتے ہیں تو وہ بھی اسکول کے لڑکوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ جوائس کی تعریفیں پڑھ کر بھی میں بد گمان ہی رہا۔ حالانکہ ہربرٹ ریڈ نے جوائس کا مماثلت کسپیئر سے کیا تھا۔ لیکن ہربرٹ ریڈ صاحب کو کسی کی تعریف کرتے کرتے جوش آ جاتا ہے تو پھر وہ ... ادھر نہیں رُکتے۔ بہر حال جب میں نے ... "یولی سیز" پڑھنے کیلئے اٹھائی تو معلوم ہوا کہ آج تک میں نے کوئی ناول اتنی دلچسپی سے پڑھا ہی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ جن حصوں کو جوائس کے مداحوں نے بھی خشک سمجھا ہے ان میں سے بھی مجھے اتنا ہی لطف آیا۔ اس کے بعد مجھے جوائس کی تخلیقی صلاحیت اور اس کی اصلیت میں شک شبہ کی گنجائش رہی نہیں۔ لیکن اب مجھے وہ رائیں یاد آتیں۔ A. E. نے کہا ہے کہ "میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ جوائس حد سچا ہے یا چینٹہ"۔ مڈلٹن مری نے لارنس اور جوائس کا موازنہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ لارنس کو پڑھنے سے نئی زندگی ملتی ہے۔ لارنس زندگی کا سرچشمہ ہے جوائس بنجر میدان ہے۔ ہاں، تیسری رائے فورسٹر کی تھی۔ وہ یہ کہ جوائس نے کائنات کو گندگی سے ڈھک دیا ہے۔ میرا ذاتی تجربہ یہ تھا کہ کائنات کی تعریف جس طرح جوائس نے کی ہے بیسویں صدی میں کسی نے بھی نہیں کی، زندگی کا جو احساس اور جو تر و تازگی کم سے کم مجھے جوائس کے یہاں ملی ویسی لارنس کے یہاں بالکل نہیں۔ اب سوال یہ تھا کہ اپنے تاثرات کو جھٹلاؤں یا ان متصوفین کی رائے کا احترام کروں۔ میرے لئے اپنا ذاتی تاثر A. E. کی روحانیت سے زیادہ حقیقی بھی تھا۔ اور عزیز بھی۔ اس لئے کان دبا کے اور لوگوں کی رائے مان لینے کی بجائے میں نے اپنے تاثر کو عقلی رنگ دینے کی زیادہ کوشش کی۔

جوائس کے یہاں زندگی کا احساس لارنس سے زیادہ گہرا اور حقیقی ہے۔ کیونکہ جوائس کی تمام تصانیف پر ایک بوجھل افسردگی چھائی ہوئی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں المناک آدمی کو عظیم انسان آدمی سمجھتا ہوں۔ جوائس کی افسردگی رومانی افسردگی سے بالکل مختلف چیز ہے۔ کیونکہ یہ افسردگی اخلاقیاتی ہے۔ مجبوری دینیات کی اصطلاح استعمال کرنے کا شوق ہو تو کہہ سکتے ہیں کہ جوائس کو ابتدائی گناہ پر یقین ہے۔ دوسرے لفظوں میں، جوائس اس وجہ سے افسردہ نہیں کہ وہ "ناممکن شناسائی پیکر" اس کے ہاتھ نہیں آتا، یا مستقل دور سے اس کا مذاق اُڑاتا رہتا، وہ افسردہ ہے، کیونکہ اسے انسان کے نامکمل ہونے کا بڑا المناک احساس ہے۔ جب جوائس اس نامکمل انسان کو قبول کر کے ... کے حُسن کی تعریف کرتا ہے تو یقیناً اس کی تعریف لارنس کے نغمے سے زیادہ بامعنی اور اہم ہوتی ہے، اور عظیم تر بھی۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے کسی رومن کیتھولک مصنف کی کتاب نکلی ہے جس نے یورپ کے ادیبوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے —— پہلے حصہ میں تو ویلز اور برنرڈ شا جیسے لوگ ہیں جو آزادی پسند انسان کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ دوسرے طبقے میں روسو اور لارنس قسم کے لوگ ہیں جو فطری انسان کے قائل ہیں تیسرے طبقے والے مثلاً ایلیٹ اور جوائس، انسان کو نامکمل ... ہیں ... کیتھولک مذہب کے نقطۂ نظر سے تو یہ آخری نقطۂ نظر سب سے زیادہ صحیح ہو گا ہی، لیکن مجھ جیسے کمزور انسان کو بھی لارنس کی ڈینگیں کچھ زیادہ ... نہیں آتیں۔ ویسے بھی اپنے ذاتی تجربات کے پیشِ نظر چیسٹرٹن کی طرح میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انسان کی فطرت کے متعلق اگر کوئی ... افزا اور بہت افزوں ہے تو یہی ابتدائی گناہ والا اور پھر دیکھئے تو لارنس نے انسانی زندگی کی تعریف کی ہی کب ہے — ... اس لفظ کو سمجھتے ہیں لارنس "کاربن ڈائی آکسائڈ" کا ایسا گرویدہ تھا کہ اسے تو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ "ہیرے" اور "کوئلے" ... کیا فرق ہوتا ... "زندگی کے شعلے" کی حمد و ثنا اور تقدیس تو تھوڑی بہت ہر ایک کر سکتا ہے، گو مُوت میں پیدا ہونے والے انسان کی تعریف میں دو جملے ... کوشش کرتے تو پتہ چلتا کہ کتنے پانی میں ہیں۔

لیکن جوائس نے زندگی کو سب سے کم عزیز آور شکل میں قبول کیا ہے —— یعنی مریم بلوم کی شکل میں یہاں ایک ... قابل لحاظ ہے۔ جوائس "یولی سیز" کے آخری چالیس صفحوں میں Pagan بن گیا ہے۔ اور اخلاقیات سے منحرف ہو گیا ہے، لیکن ... ایک ایسی شخصیت کے سلسلہ میں جو زندگی کو بے چون و چرا کلیتاً قبول کر لیتی ہے، جو سراپا اثبات ہے، جو بالکل اسی طرح ... کی جو کر دیتا ہے جیسے جبرالٹر کے پھول۔ لیکن شاید جوائس کو Pagan بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ عیسائیت کچھ اس طرح اتنی تنگ نظر نہیں ہو سکتی کہ مولی بلوم کو رد کر دے۔ آخر حضرت مسیح نے بھی تو اس کی بڑی بہن بابل کی خاتون کو قبول کر لیا تھا۔ جوائس کے اندر یہ اخلاقی جدو جہد (باقی)

شروع ہوتی ہے جب کوئی اپنے آپ کو زندگی کے سپرد کر دینے کے بجائے دماغ سے زندگی کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ذہنی مدافعت جتنی زیادہ شدید ہوگی جولین کے اندر اخلاقی کش مکش بھی اتنی ہی زیادہ شدید اور المناک ہوگی۔ اس کش مکش کا مظہر جولین کی کتابوں میں فنکا[ر] کی شخصیت ہے۔ اسی شخصیت کے سلسلہ میں جولین یہ سوال پوچھتا ہے کہ کائنات اور زندگی کے متعلق انسان کا رویہ کیا ہونا چاہئے، کیونکہ فن کار بڑی حد تک اپنے آپ کو زندگی کے سپرد کر دیتا ہے مگر اس کا کام محض مفعولیت نہیں، فن کار خالق بھی ہے۔ اور اُسے عموماً اپنی قدرتوں کا احساس اور ان پر فخر بھی ہوتا ہے۔ لیکن اپنی تمام صلاحیتوں کے باوجود فن کار بھی آخر انسان ہوتا ہے اور انسانی زندگی کی پابندیوں میں گرفتار۔ فن انسان کی قوت اور انسان کی کمزوری دونوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ انسان کی ان دونوں حیثیتوں کی کش مکش جیسی شدید اور المناک کیفیت فن کار کے اندر اختیار کر سکتی ہے وہ اوروں کے اندر ممکن نہیں ہے۔ غالباً فاتحوں اور قوم کے معماروں کے اندر بھی نہیں۔ اسی طرح کائنات میں انسان کی حیثیت کا سوال اوروں کیلئے ایسی ہولناک حیثیت نہیں رکھتا جیسی فن کار کے لئے۔ جولین نے فن کار کی شخصیت کے جمال او[ر] ہولناکی دونوں کا اظہار جیسی خوبصورتی اور درد کے ساتھ کیا ہے ویسا مشکل ہی سے کہیں اور ملے گا۔ ایک طرف تو فن کار کی ہولناکی دیکھئے، و[ہ] زیادہ سے زیادہ زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین ہے مگر زندگی اس سے دامن چھڑاتی ہے۔ "Portrait" میں اسٹیون کو حیرت اور افسوس ہے کہ اسے کسی عورت کی آنکھوں نے دعوت نہیں دی۔ مگر یہاں ذرا سے انتباہ کی ضرورت ہے۔ اسٹیون کی اس حسرت کو اُر[دو] کے اکثر افسانہ نگاروں کے آدرشوں سے گڈمڈ نہیں کرنا چاہئے۔ اُردو کے بہت سے افسانوں کی تہ میں یہ جھلکتا ہے کہ افسانہ نگار کسی ایک خاص عورت یا پچاس عورتوں کے ساتھ نہیں سو سکا۔ لیکن اگر ہم کسی ادیب کا احترام کرتے ہیں تو عورتوں کے ساتھ سونے کی خواہش کرنے یا نہ کرنے کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے دوسرے پہلوؤں کی وجہ سے۔ کم سے کم مجھے کسی کی خواہشوں پر ناک بھوں چڑھانے کا حق نہیں پہنچتا۔ میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کوئی آدمی اپنی خواہشوں کو، وہ بُری ہوں یا بھلی اس سے مجھے مطلب نہیں، کیا بناتا ہے۔ اگر بڑے فن کار کے اندر ایسی خواہشیں اور حسرتیں پیدا ہوتی بھی ہیں تو وہ ان کا اظہار ایسے اُن گھڑ طریقے سے نہیں کرتا۔ وہ ایلیٹ کی طرح کہتا ہے:

The smell of hyacinths across the garden
Recalling things that other people have desired.

جہاں تک جولین کا تعلق ہے اس نے اپنی اور ہر بڑے فن کار کی ترجمانی خود کر دی ہے۔ اسٹیون کا دوست پوچھتا ہے: "کیا تم کنوا[رپنے] کی عصمت لے سکتے ہو؟" اسٹیون بڑی ملامت سے جواب دیتا ہے: "معاف کرنا کیا یہ اکثر نوجوانوں کی خواہش نہیں ہوتی؟" اگر فن کار آنکھوں کی دعوت کی تمنا کرتا ہے تو اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اُسے اوروں سے زیادہ زندگی چاہئے۔ ایک اور بڑے فن کار نے اس مسئلہ کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:

نہ قربت میں مطلب، غرض نہ دوری سے
نہ جانے کیوں ہمہ تن انتظار ہیں ہم لوگ

یہ تو تھا فن کار کی زندگی کا ایک ناکام لمحہ — جسے اپنی تخلیقات میں اسے کارآمد بنانا ہے۔ اب فن کار کی فتح بھی دیکھئے۔ اُس شیکسپیر والی بحث میں اسٹیون نے سب کا قافیہ تنگ کر دیا ہے، اور کسی کو کوئی بات نہیں سوجھ رہی۔ اس موقع پر اسٹیون اپنے آپ سے کہتا ہے:

Why am I Condemned to do all this?

اس ایک جملہ میں جو درد اور کرب بھرا ہوا ہے وہ ترقی پسندوں یا سیاست میں غرق رہنے والوں کی سمجھ میں آنے والی بات نہیں اب فن کار کی مضبوطی، قوت اور خود اعتمادی بھی دیکھئے۔ ملک ہو، یا قومیت، یا مذہب، اسٹیون کسی کی بھی خدمت کے لئے تیار نہیں سوائے اس خواب کے جسے وہ وجود میں لانا چاہتا ہے۔ وہ اکیلا رہنے سے نہیں ڈرتا، نہ غلطی کرنے سے، چاہے غلطی ابد تک ہی برقرار کیوں نہ ہو۔ اُسے جلاوطنی منظور ہے، خاموشی منظور ہے، مگر کسی قسم کا سمجھوتہ منظور نہیں۔ یہ طرزِ عمل فن کار کے لئے ضروری ہے اور اس کے بغیر اس زمانہ میں کوئی حقیقی تخلیقی کام ممکن بھی نہیں۔ خود جولین کو بڑے سے بڑے آدمیوں کی توہین کرنے میں مزا آتا تھا، حالانکہ سینہ میں حسد آ

میں اس سے زیادہ منکسر المزاج مصنف بہت ہی کم ہوں گے۔ جوئس نے بیسویں صدی کے فن کار کے لئے عرد۔ کو لازمی تو مانا ہے لیکن اسکی عظمت اس بات میں ہے کہ وہ صرف اپنے ماحول میں گھٹ کر نہیں رہ گیا۔ اس نے فن کار کو وسیع تر انسانی زندگی اور کائنات کے مقابل رکھ کر بھی دیکھا ہے۔ اور اعتراف کرلیا ہے کہ اپنے دماغ پر غرور بھی گناہِ کبیرہ ہے۔ اس لے "یولی سیز" کے متعلق خود اپنے ایک دوست سے کہا تھا کہ جیسے جیسے کتاب آگے بڑھے گی بلوم اور کرداروں پر غالب آتا چلا جائیگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ غیر فن کار یا عام آدمی اخلاقی اور روحانی اعتبار سے فن کار پر فتح پائیگا۔ بورژوا ماحول میں تجربۂ تخلیق کی لازمی شرط سہی لیکن اس گناہ کا مرتکب ہونے کے بعد فن کار بھی اس کے نتائج سے نہیں بچ سکتا۔ اُسے قابیل کی طرح یکہ و تنہا رہنا پڑے گا۔ اپنی خودی کو زندگی سے زیادہ مقدس سمجھنے والوں کے لئے دروازے نہیں کھلیں گے، انھیں باہر ہی کھڑا رہنا پڑے گا۔ جوئس نے فن کار کی شخصیت کی یہ کش مکش صرف ایک جملہ میں بڑی خوبصورتی سے بیان کی ہے۔ اس کی عظمت بھی اور اس کی کمزوریاں بھی، یہ دونوں چیزیں ایک فقرے میں آگئی ہیں:

Do you hold yourself then for some god in the manger that you will neither serve nor let serve, pray nor let pray.

یہاں ذرا سی وضاحت کی ضرورت ہے۔ انگریزی کا محاورہ ہے: "*Dog in the manger*" جسے جوئس نے تبدیل کیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ حضرت عیسیٰ آخور میں پیدا ہوئے تھے . . فن کار کی شخصیت نے زندگی کے مقابلہ میں اپنی شکست کا مکمل اقرار جوئس کی آخری کتاب کے آخری صفحہ پر کرلیا ہے۔ اس عبارت کا دردستان کی رومن کیتھولک دعاؤں کے مفاد کا ہے۔ دو چار جملے دیکھئے:

How small it's all! . I thought you were all glittering with the noblest of carriage. You are only a bumpkin. I thought you the great in all things, in guilt and in glory. You are but a puny . I am passing out.... They will never see. Nor know Nor miss me. And it's old and old it's sad and old.

فن کار کی شخصیت کی ناکامی دکھانے کے باوجود جوئس کی کتابوں کا آخری تاثر یاس انگیز نہیں ہوتا۔ بلکہ صحیح معنوں میں *Katharsis* کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ قرار پیدا کرنے کے لئے یوں تو جوئس کا آرٹ ہی کافی ہوتا، لیکن جوئس کی کتابوں کے آخر میں ایک اخلاقی معنویت بھی ہوتی ہے۔ اکثر جوئس کے خاتمہ میں فطرت کا ذکر ہوتا ہے۔ شروع شروع میں تو فطرت ایک ہیبت ناک تصور کے طور پر سامنے آتی ہے جس کے مقابل انسان ایک ناچیز ذرّہ بن جاتا ہے۔

جوئس کی سب سے بڑی کہانی "*The Dead*" کے آخر میں فطرت کو اسی طرح پیش کیا گیا ہے۔ یہاں نہ صرف رفتہ رفتہ نے انسانی زندگی کو چھپا لیا ہے، بلکہ لفظوں کی موسیقی تک انسان کی ہیچ مقداری کا ماتم کر رہی ہے۔ "یولی سیز" میں فطرت انسانی زندگی کی پیچیدگیوں کا حل بن کر آتی ہے۔ اس کتاب میں اصلی مسئلہ یہ ہے کہ ہر آدمی بالکل اکیلا ہے۔ لوگ آپس میں باتیں بھی کرتے ہیں، ہنستے بھی ہیں، مگر یہ سارا ربط و ضبط سماجی اور سطحی ہے، ورنہ درحقیقت ہر آدمی دوسروں سے بالکل الگ تھلگ اور اپنی گہرائیوں میں بند رہتا ہے۔ حالانکہ اسٹیون کو ایک روحانی باپ کی تلاش ہے، اور بلوم کو بیٹے کی، مگر ان دونوں میں روحانی تعلق قائم ہوتا ہے تو محض ایک مختصر سے لمحے کے لئے۔ میں ایڈمنڈ ولسن کی رائے سے پوری طرح متفق ہوں کہ اس لمحے کا اثر کتاب کے تینوں بڑے کرداروں پر بہت گہرا پڑتا ہے مگر بہرحال یہ دونوں بہت جلد جُدا ہو جاتے ہیں، بلکہ اور کئی آدمیوں اور چیزوں میں اصلی رابطہ قائم ہوتا ہے تو میرین کی خود کلامی میں، اور آخر یہ سب لوگ گھل مل کر فطرت میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ جو ربط و ضبط، سماجی تعلقات اور میل جول کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکا تھا وہ فطرت کے تصور سے حاصل ہو جاتا ہے۔ یا فطرت اور انسان کی ہم آہنگی کے تصور سے۔ جس قسم کی سپردگی میرین کو پاکیزہ اور معصوم بنا سکتی ہے اس سے بلوم اور اسٹیون کی روح کے زخم بھی بھر سکتے ہیں۔

فلپ ہنڈرسن جوئس کے اس خاتمہ سے بہت ناراض ہیں۔ ان کے خیال میں جوئس نے اپنے کرداروں کے روحانی مسئلے کی پیچیدگیوں سے بھاگ کر فطرت کے تصور میں پناہ لی ہے۔ غالباً ان کے خیال میں اصلی حل یہ ہوتا کہ اسٹیون، بلوم اور میرین تینوں لال جھنڈا لیکر قلیوں کی ہڑتال کرانے

روا رہ جاتے۔ لیکن اگر اس حل میں کوئی صداقت ہے تو وہ سیاسی آدمی کی صداقت ہے نہ کہ فن کار کی۔ آندرے مالرو نے باوجود ترقی پسند ہونے کے
اپنے ایک ناول میں سچ بولا ہے۔ ہیرو چین کی خانہ جنگی میں جمہوریت پسندوں کے ساتھ لڑ رہا ہے۔ لیکن وہ صرف اس وجہ سے شامل ہوا ہے کہ اسے
زندگی میں کوئی مقصد ہی نظر نہیں آتا۔ جو مارکسی مصنف ہیں ہیں بھی وہی اگر سچ بول سکتے ہیں جنہوں نے اخلاقیات کے متعلق فرد کے نقطۂ نظر سے غور
کیا ہے۔ انقلاب میں حصہ لینا اجتماعی مسئلوں کا حل ہے، فرد کی روحانی کشمکش ایسے بہلاووں سے ختم نہیں ہوا کرتی۔ فرد کو اپنے مسئلوں کا
انفرادی حل ڈھونڈھنا پڑتا ہے۔ اس لئے اخلاقیات پر فرد کی حیثیت سے غور کرنے والے زیادہ بنیادی معنویت کے حامل ہیں۔

"یولی سیز" کے آخر میں تو فطرت کا تصور صرف بہجت انگیز ہے۔ لیکن "Finnegans Wake" کے آخر میں سمندر جس میں
دریا نے لفی گرنے والا ہے موت کی علامت بھی بن جاتا ہے۔ خواب دیکھنے والے کے لئے موت لازمی ہے اور دریا کے لئے اپنی ہستی سمندر میں
کھو دینا ضروری ہے، اور ان چیزوں سے مفر ممکن نہیں، بلکہ شاید دونوں کو اپنی زندگی کے دکھوں کا مداوا اسی بات میں ملے گا کہ اپنی ہستی
کو کسی عظیم تر ہستی میں مدغم کر دیں — دریا اپنے آپ کو سمندر میں، انسان اپنے آپ کو موت میں جو بیک وقت حیات بھی ہے۔ جیسا لفظ
Wake کے مختلف معانی سے ظاہر ہے۔ چنانچہ یہاں سمندر کے تصور میں امید بھی شامل ہے اور ہیبت بھی، اضطراب بھی اور سکون بھی۔ اگر
یولی سیز" کے خاتمہ میں Pagan روح پائی جاتی ہے تو اس کتاب کا خاتمہ خالصۃً عیسوی ہے۔ ایک لحاظ سے جوئس کی ساری کتابوں کو
ایک سلسلہ وار کتاب سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کے شروع میں فن کار ایک باغی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس کا تکبر اسے کسی چیز سے سمجھوتہ کرنے کی
اجازت نہیں دیتا۔ ایک زمانہ تک وہ تنہائی اور جلاوطنی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن آخر سے پتہ چلتا ہے کہ غرور روح القدس کے خلاف ایک
عظیم گناہ ہے۔ چنانچہ Finnegans Wake پر کسی مبہم گناہ کا احساس چھایا ہوا ہے۔ اس کتاب کے آخر میں وہ اعتراف کر لیتا ہے کہ کائنات
میں اس کی حیثیت ذرّہ سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ اور اس کا سارا غرور بے بنیاد تھا۔ اعتراف کے بعد اب اُسے صرف موت کا انتظار ہے۔ اس انتظار
میں ڈر تو شامل ہے ہی لیکن ساتھ ہی رحم کی امید بھی ہے، بلکہ شاید یقین ہے کہ خدا اس سے محبت کرنے والے باپ کا سا سلوک کرے گا۔
یہ خاتمہ سراسر عیسائیت کی روح میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور اسی وجہ سے مجھے "یولی سیز" کے خاتمہ سے زیادہ پسند ہے۔

جوئس کے یہاں ایک اور اخلاقیاتی معنویت بھی ہے جو مارسل پروست کے یہاں بھی ملتی ہے۔ ابتدائی اور بنیادی انسانی تعلقات کی
سچائی اور اہمیت کا احساس اور ان کی طرف دوبارہ واپس ہونا۔ پروست اور جوئس دونوں کے ہیرو اپنے آدرش کی تلاش میں گھر سے باہر
جاتے ہیں لیکن دونوں کو آخر وہیں لوٹنا پڑتا ہے۔ پروست کے ہیرو کو اعلیٰ سوسائٹی میں شامل ہونے کا شوق ہے، لیکن اپنی خواہش میں کامیاب
ہونے کے بعد اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خلوص اور محبت کا وجود کہیں تھا تو ان لوگوں میں نہیں جن کی خاطر اس نے اپنے محبت کرنے والوں کو چھوڑا
بلکہ خود اس کی دادی اور ماں میں، جن کی طرف سے وہ اب تک بے اعتنائی برتتا رہا تھا۔ جوئس بھی اپنے آرٹ کی خاطر ماں باپ سے بغاوت کر کے
بھاگتا ہے۔ لیکن اُسے بھی آخر میں پتہ چلتا ہے کہ پوری زندگی کے مقابلہ میں فن کار کی شخصیت اور فن کی تخلیق کی کیا حیثیت ہے۔ اب اُسے احساس
ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں کوئی چیز اگر معنویت پیدا کرتی ہے، اور اگر کسی چیز میں روحانی سکون مل سکتا ہے تو وہ یہی روزمرّہ کے انسانی تعلقات
اور چھوٹی چھوٹی محبتیں ہیں۔ جوئس نے یہ ساری باتیں Finnegans Wake کے آخری صفحے پر صرف ایک جملے میں کہہ دی ہیں۔ اس جملے کی پوری
معنویت تو اپنی جگہ پر ہی ظاہر ہوتی ہے، بہرحال وہ جملہ یہ ہے:

"Carry me along, taddy, like you done through the toy fair."

یہاں پھر اس بات پر غور کیجئے کہ جوئس جب کبھی کسی کی تعریف کرنا چاہتا ہے تو اس پر روغن نہیں کرتا بلکہ اس کے کھردرے پن کو نمایاں کرتے
ہوئے تعریف کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں اس ایک لفظ taddy میں جوئس نے متضاد جذبوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اور ایسے موقع پر ایسے
لفظ کا استعمال صرف ایک بہت ہی بڑے فن کار کے بس کی بات تھی۔ یہاں تو یہ جملہ Earwicker کے بچے نے کہا ہے۔ اُسے شاید زکام ہے
جس کی وجہ سے daddy بگڑ کر taddy بن گیا ہے۔ اسی کے قریب قریب دوسرا لفظ teddy ہے جس کے معنی ریچھ کے ہیں۔ چنانچہ اس
لفظ taddy میں دو مفہوم شامل ہو گئے، ایک تو باپ کا دوسرے ریچھ کا۔ اچھا، غالباً Dubliners کی کسی کہانی میں یہ ذکر ہے کہ
اسٹیون کو بچپن میں اس کے باپ نے کندھے پر بٹھا کر میلے کی سیر کرائی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے "یولی سیز" میں بھی اسٹیون نے اس واقعہ کو یاد
کیا ہے۔

کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسٹیون کے باپ کی مضحکہ خیز شخصیت بھی ذہن میں رکھئے، جس کیلئے ریچھ کی پھبتی کچھ بہت زیادہ ناموزوں نہ ہوگی۔ اب آخری کتاب میں اسٹیون کا خالق پھر اس باپ کو یاد کر رہا ہے جس کی عادتیں ریچھ کی سی سہی مگر جو پھر بھی اسٹیون کا باپ ہے، اور پُرخلوص محبت کرسکتا ہے۔ اب فن کار تخیل میں باپ کی طرف مڑتا ہے، طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ نہیں بلکہ اپنی روحانی مشکل میں امداد مانگنے کے لئے۔ اور یہ امداد یقینی ہے۔ اگر موت میں بھی اسے سکون کا ایک پہلو دکھائی دیتا ہے تو صرف اس خیال سے کہ شاید خدا بھی باپ کی طرح محبت کرنے والا ہوگا۔ مارسل پروست کی طرح جوئس بھی یہی گواہی دے رہا ہے کہ اگر زندگی میں حسن، صداقت اور نیکی مل سکتی ہے تو ابتدائی انسانی تعلقات میں۔

تحلیل نفسی کرنے والوں کو اس خاتمہ میں رحم مادر میں واپس جانے کی خواہش اپنی تمام علامتوں کے ساتھ نظر آئیگی، خاص طور پر سمندر اور اس میں دریا کا گرنا۔ لیکن ادب اور تنقید میں اس قسم کے تجزیے فروعی دلچسپی رکھتے ہیں۔ دراصل مارسل پروست اور جوئس کی کتابیں ہمارے زمانہ کی روحانی تاریخیں ہیں، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر نئی زندگی کا سرچشمہ بھی ہیں۔ جب زندگی کی تمام اقدار باطل ہوگئی ہوں اور کسی چیز میں بھی سچائی نظر نہ آتی ہو تو زندگی کو از سر نو تازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بالکل ابتدائی چیزوں سے تعمیر شروع کی جائے۔ سیاست دانوں اور ادب کو سیاست بنا دینے والوں سے تو خیر ہمیں مطلب ہی کیا ہے۔ لیکن جہاں تک فن کاروں کا تعلق ہے صرف جوئس اور مارسل پروست ہی کو نہیں بیسویں صدی کے ہر سچے فن کار کو انھیں ابتدائی تعلقات کی طرف جانا پڑے گا۔ اور ان کی اہمیت کا اعتراف کرنا پڑیگا۔

اب پھر جوئس کی اخلاقیات کے بنیادی تصور کی طرف واپس آئیے، یعنی انسان کے نامکمل ہونے کا احساس۔ یہ بات نہیں کہ جوئس اپنے آپ سے بالکل بیزار تھا۔ اس کے برخلاف جوئس اپنی عظمت کا جتنا قائل تھا اتنا اس کے مداح بھی نہ ہوں گے۔ چنانچہ اپنی آخری کتاب میں اس نے جگہ جگہ اپنی تعریف کی ہے۔ بعض نقاد جوئس کو تشائم پرست سمجھتے ہیں۔ لیکن اس نے اپنی اور فن کار کی نمائندگی کے لئے Grace-hoper (Grasshopper) کو چنا ہے اور ٹڈے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

hoppy on akkant of his joyicity.

ایک جگہ تو اس نے اپنے آپ کو صاف طور پر شیکسپیئر کا مقابل اور نئی دنیاؤں کا خالق کہا ہے۔ اس فقرے میں شیکسپیئر کے نام کو استعمال کیا گیا ہے:

As the great Shapesphere puns it.

لیکن اپنی عظمت کے اس احساس کے باوجود جوئس انتہائی منکسر المزاج انسان تھا۔ حقیقی انکسار کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی اپنے آپکو ہر ایک سے کمتر سمجھے یہاں تک کہ ترقی پسندوں سے بھی۔ اصلی انکسار کا مطلب ہے کائنات اور زندگی میں اپنی جگہ پہچاننا۔ یہ انکسار جوئس میں بھی موجود ہے اور شیکسپیئر میں بھی۔ شیکسپیئر کو بھی اپنی فن کارانہ قدرت کا پورا علم تھا اور پروسپیرو کی زبان سے اپنی طاقتوں کا اعلان اس نے خود کیا ہے۔ اس نے دوپہر کے سورج کو دھندلا دیا ہے، ہوائیں اور بجلیاں اس کے قبضہ میں ہیں، اس کے حکم سے مُردے جاگ اٹھتے ہیں۔ لیکن شیکسپیئر ہرگز اتنا بڑا فن کار نہ ہوتا اگر اپنی عظمت کے یقین کے ساتھ ساتھ اُسے یہ احساس نہ ہوتا کہ فن کار بڑی قدرتوں والا ہی، لیکن زندگی کے مقابلہ میں فن کی تخلیق بھلا کیا حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ساری ہوائی باتیں ہیں، فن کی اچھائی اور بُرائی سب محض خیال پر منحصر ہے۔ جس آدمی نے اتنی ڈینگیں ماری ہیں اس نے یہ بھی تو کہا ہے:

The best in this kind are but shadows.

اسی طرح جوئس نے آخری کتاب میں اپنا اور اپنی کتاب کا مذاق اڑایا ہے۔ کبھی تو اُسے اپنی یہ ساری کوششیں مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں کبھی اُسے یہ خیال ستاتا ہے کہ شاید وہ جعل ساز اور دھوکے باز ہے۔ ایک دفعہ میں نے کہیں لکھا تھا کہ بودلیر کا یہ جملہ عظیم الشان اخلاقی انقلاب کا حامل ہے: "میرے ریاکار پڑھنے والے، میرے ہمشکل، میرے بھائی۔" ممکن ہے کہ میرے دماغ پر عیسوی تصورات ضرورت سے زیادہ حاوی ہوں، بہرحال مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ سچی اخلاقیات کی بنیاد مارکسیوں کے بڑبولے پن پر قائم نہیں ہوسکتی، بلکہ اس اعتراف پر کہ ہر آدمی کے اندر ریاکار اور بے خلوص ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ (بقیہ بر صفحہ ۳۰۵)

اثیر

انسان

(ایک دو نظمہ)

۱- دوراہہ* : ۲- اجنبی :

۱) دوراہہ :-

ریل گاڑی پہ یہ گھمسان — الٰہی توبہ!
نہ مروّت نہ تکلف نہ تبسم نہ ادا
یونہی اک غیر شعوری سی خشونت کا خروش! —
بے ارادہ ہے تو کیا غیر شعوری ہے تو کیا
یہ نئے دَور کے احساسِ غلامی کا ظہور
انتقامانہ تحکّم کی نمود! —
خانہ جنگی ہی سہی
اس میں اک اظہارِ بغاوت بھی تو ہے
یونہی، یونہی سہی
اک شائبۂ دادِ شجاعت بھی تو ہے
— (چاک تو کرتا ہوں میں، اپنا گریباں ہی سہی) —

x x x

کلبلاتی ہوئی مخلوق کی اس دلدل میں
سینہ تانے ہوئے کچھ لوگ بڑھے جاتے ہیں
خوب پھنکارتے، پھن پھیلائے
لوگ؟ وہ لوگ "کالانعام" نہیں
جن کو ٹھکراتے ہوئے جاتے ہیں
یہ لوگ! — بڑے صاحب لوگ
یہ جو حکام ہمارے ہیں یہ حکام نہیں
جو ہمیں سے ہیں مگر ہم میں نہیں
یہ جو بندوں کے ہیں آقا مگر آقا کے غلام
باوفا ہوں تو ہوں بے دام نہیں
"(تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا!)"

x x x

ان پہ دُنیا کی ہر اک راہ کشادہ ہے مگر
آج اک سنگِ گراں حائل ہے
کہ اٹھائے نہ اٹھے اور ہلائے نہ ہلے! —
دوسرے درجے کے دروازے میں
ان کے آقاؤں کا اک فرد — فرنگی گورا
باہیں پھیلائے ہوئے راستہ روکے ہے کھڑا
"(کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق؟)"

x x

سیٹیاں بجنے لگیں! — خدمتِ سرکار بجا لانا ہے
اور سرکار ہی خود سنگِ رہِ منزل ہے —
زندگی آ گئی دوراہے پر! —

x

دیر کیوں کرتے ہو — بھاگو بھاگو
دوڑ کر تھرڈ کے ڈبے میں گھسو
اپنے ہم جنس غلاموں میں ملو
زندگی آ گئی دوراہے پر!

۲- اجنبی

اجنبیت کا کچھ احساس تھا اور
ریل گاڑی کا سفر! ہچکولے! —
شور! — ایسا کہ خزاں میں جیسے
کسی ویرانے سے ... کوئی
شاعرانہ سی مثال آپ تصور کر لیں! —
[شور کا زور تو خود
شور کے لفظ سے ہی ظاہر ہے
آبشاروں کی طرح، تند شراروں کی طرح] —
جب یہ حالت ہو تو پھر
بات کرنے کو کوئی اپنی زباں کیا کھولے! —
اور اگر ایسی ہی مجبوری ہو
تو فرنگی سے؟ سفر میں؟ ہاں نہیں؟

---

* [illegible]

یہ تو مر جائے تو پھر بھی نہ کسی سے بولے!

x x x

جی میں آتا ہے کہ کچھ کھائیے اور سو رہیئے
نیند کیا آئیگی
یونہی میں نے
اپنی آنکھوں کو ذرا بند کیا لیٹ گیا
اور پھر اٹھ کے کھڑا ہو گیا پھر بیٹھ گیا! —
ریل کا شور! — کھچا کھچ - کچھ کچھ
اور گاڑی میں خموشی جیسے
بس ہی میں ہوں، نہ خدا ہے نہ رسول! —
یہ فرنگی بھی تو انسان ہے؟ مجھ جیسا ہے؟
مگر ان کے ہیں نرالے ہی اصول
یہ مشینوں کی فضاؤں میں پلا پوسا ہے
مگر — انسان ہے! — مجھ جیسا ہے؟ —
ریل کے شور سے یہ بھی تو پریشاں ہوگا
مگر اس کے ہیں نرالے ہی اصول
یہ مشینوں کا پلا پوسا ہے
مگر — انسان ہے! — مجھ جیسا ہے؟ —

x x x

اس نے بھی — میری طرح
اپنی آنکھوں کو ذرا بند کیا لیٹ گیا
اور پھر اٹھ کے کھڑا ہو گیا پھر بیٹھ گیا
ریل کا شور — کھچا کھچ - کچھ کچھ
اور گاڑی میں خموشی! — جیسے . . .

x x

تجربہ ہی سہی - دیکھوں تو سہی
یہ بھی انسان ہے؟ مجھ جیسا ہے؟
میں نے پوچھا کدھر جاؤ گے
اس نے پوچھا کدھر جاؤ گے
اس نے کچھ مجھ سے کہا، میں نے کہا، اس نے کہا! —
یونہی بے سود ہوائی باتیں
یونہی ہر روز کی، یونہی، باتیں
جیسے گاڑی کا سفر! — ہچکولے!
کبھی دائیں، کبھی بائیں
کبھی آگے، کبھی پیچھے! —

x x

یہ فرنگی سہی، انسان ہے! — مجھ جیسا ہے! —
وہی سگرٹ، وہی سوڈا، وہی وہسکی، وہی پیاس
وہی خوشیاں، وہی غصّے، وہی حسرت، وہی یاس
وہی گاڑی، وہی گاڑی کا سفر! — ہچکولے! —
ایک جھٹکا جو لگا، دھم سے گری ہیٹ، لبالب ساغر
ایسا چھلکا کہ شرابور ہوئے سب کپڑے
سر بہ پا — جیسے کہ مچھلی نے لگا کر ڈبکی
جھیل کی سطح سے سر اپنا نکالا ہو ابھی! —
سر کے بالوں کو وہ ہاتھوں سے جھٹک کر اٹھا
مسکراتا ہوا، کھسیاتا سا! —
میں نے بے ساختہ اک قہقہہ یوں برسایا
جیسے گھنگھور گھٹاؤں میں کڑکتی ہوئی رعد! —
اور اس قہقہے کی گونج میں سب ختم ہوئے
ریل گاڑی کا سفر
ہچکولے
ریل کا شور کھچا کھچ - کچھ کچھ! —
دونوں انسانوں کے ان قہقہوں نے ختم کئے
اجنبیت کے سب احساس
مذاہب کا نفور
رنگ اور نسل کے عصبیت
حکومت کا شعور
اور ان سب سے زیادہ مسموم
وہ غلامانہ خودی، خودداری
وطنیت کا غرور! —
نہ میں ہندی، وہ فرنگی، نہ وہ آقا میں غلام
دونوں انسان ہیں
انسان ہیں
انسان ہیں ہم! —

امین حزیں سیالکوٹی

ساقی

تری اک نظر نے ساقی مری چوکڑی بھلادی — وہ جو خود پرستیاں تھیں انھیں بیخودی پلادی
مرے سازِ زندگی کو جو ذرا سا تو نے چھیڑا — رگِ جانِ بے نوا نے تری لَے سے لَے ملادی

(۲)

مری روح رقص میں ہے لبِ جاں پہ ہیں ترانے — نہیں اب نظر میں جچتے یہ چمن یہ آشیانے
"گلِ گلستاں بکف" پہ رہیں جمی ہوئی نگاہیں — تری مسکراہٹوں نے کیا سحر کوئی جانے!

(۳)

وہی رَو جو جم رہی تھی سوئے یم رواں دواں ہے — کوئی اس کو روک دیکھے۔ یہ خضرؑ کا رواں ہے
وہی دشت کا بگولا جو غبار اُڑا رہا تھا — مری کشتِ تشنہ لب پہ بخدا گہر فشاں ہے

(۴)

مرے آشیاں کے تنکے، مری شاخِ آشیانہ — جو بھلا چکے تھے کب کے وہ بہار کا زمانہ
انھیں پھر سے کر دیا ہے تر و تازہ تو نے ساقی! — مئے ناب جام میں تھی کہ "بہار جاودانہ"!

غلام یزدانی

پچاس برس پہلے کی دلّی

وقت گزرتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ میں ۱۸۹۵ء میں کشمیری دروازے کے مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ اس وقت یہ میونسپلٹی کی مدد سے چلتا تھا۔ اور میونسپل بورڈ ہائی اسکول کہلاتا تھا۔ میں آٹھویں جماعت میں تھا اور مڈل کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ جو جنوری ۱۸۹۶ء میں پاس کیا۔ مدرسہ کے استاد تنخواہ زیادہ نہیں پاتے تھے لیکن علم وفضل کے لحاظ سے باکمال تھے۔ تاہم منشی بھیروں پرساد کو جو ہمارے ہیڈ ماسٹر تھے ساڑھے تین سو روپئے تنخواہ ملتی تھی۔ یہ بی۔ اے پاس تھے۔ لیکن انگریزی ایسی لکھتے تھے کہ آجکل کے بی۔ اے (آکسن) لکھ سکیں تو لکھ سکیں۔ ہندستان کی موجودہ یونیورسٹیوں کے گریجویٹ تو نہیں لکھ سکتے۔ تعجب ہے کہ اتنی کمیشنیں مقرر ہوتی ہیں۔ ولایت سے بھی بڑے بڑے ماہر آتے ہیں۔ لیکن ہندستان کی یونیورسٹیوں کے گریجویٹوں کا معیار عام طور سے گرتا ہی جاتا ہے۔ وجہ شاید یہ ہے کہ پہلی مشرقی درس گاہوں کے اساتذہ کا معیار قابلیت بہت اعلیٰ تھا۔ ہر استاد[1] اپنے علم کا ماہر ہوتا تھا۔ طالب علم بھی خاص طبقے کے لوگ ہوتے تھے۔ پیشہ وروں اور عام درجے کے بچے اپنے آبائی کاموں میں شروع ہی سے لگ جاتے تھے۔ اس لئے طلبہ کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ اور ان کی ذہنیت بھی صدیوں کی دماغی تربیت کی وجہ سے ایک بلند مرتبہ پر پہنچ گئی تھی۔

ہاں میں منشی بھیروں پرشاد کا ذکر کر رہا تھا۔ ان کی لیاقت اور شرافت کا کیا کہنا۔ دلّی کے رہنے والے تھے۔ چیلپوری میں مکان تھا۔ جس کا عالی شان دروازہ مجھے اب تک یاد ہے۔ منشی بھیروں پرشاد ذات کے کالیستھ تھے۔ رنگ گہرا سانولا۔ عینک ہر وقت لگی رہتی تھی۔ جاڑے میں سیاہ مخمل کی اچکن پہنتے تھے۔ اور گرمی میں ململ کی ساٹر اچوڑی دار پیجامہ۔ سیاہ وارنش کا چمکتا ہوا انگریزی جوتہ۔ سر پر پٹیالہ کی وضع کا عمامہ۔ ریشمی ازاربند اکثر لٹکتا رہتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ منشی بھیروں پرشاد صاحب کو موسیقی کا بہت شوق تھا۔ اور ہر وقت اک گونہ بے خودی کے عالم میں رہتے تھے۔ علم و فضل اور شرافت کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ تمام استاد ان کا احترام کرتے تھے۔ اور لڑکے تو ان کو پوجتے تھے۔ مسلمان اساتذہ بھی قابل تھے۔ ان میں مولوی عمو جان جو فارسی پڑھاتے خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ صہبائی کے شاگرد تھے۔ یہی ان کی لیاقت کے لئے کہہ دینا کافی ہے۔ طبیعت موزوں پائی تھی۔ شعر فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ دہلی کے ڈپٹی کمشنر ڈیوس صاحب کی شان میں ایک قطعہ لکھا تھا جس کے دو شعر مجھے یاد رہ گئے ہیں۔

گورنر کے بیٹے ہیں ڈپٹی کمشنر بس اب فخر لندن ہے دہلی کی قسمت
ولی قیصری زمزمہ کا مترجم ثنا سے دعا پر لگاتا ہے ہمت

میں نے زمزمہ قیصری نہیں پڑھا۔ اس لئے منشی عمو جان صاحب کی قابلیت پر کچھ نہیں لکھ سکتا۔ مولوی صاحب سے میں نے گلستاں بوستاں اور سکندر نامہ پڑھا۔ اس زمانہ کے استادوں کو درسی کتابیں حفظ ہوتی تھیں۔ اور آجکل کے استادوں کی طرح لغت اور حوالے کی کتابوں کے ٹٹولنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ علم و سینہ باید نہ کہ در سفینہ کے مصداق تھے۔ پڑھنے کے علاوہ طالب علموں کے خصائل پر بھی نظر رکھتے تھے۔ مولوی عمو جان صاحب کا لباس، ان کا طرز گفتگو اور تادیب کا طریقہ لڑکوں کو بے اختیار ہنسا دیتے تھے۔[2]

مولوی صاحب صوفی منش بھی تھے۔ بوعلی شاہ قلندر پانی پتی کے سلسلے سے تعلق تھا۔ گیارھویں شریف کی نیاز کیلئے مٹھائی ہمارے ہاں سے بھی مولوی صاحب کے پاس جاتی تھی۔ کچھ حکمت میں بھی

---

[1] ماسٹر بھیروں پرشاد کی طرح سنسکرت اسکول کے ہیڈ ماسٹر کھولا ناتھ صاحب عربک اسکول کے ہیڈ ماسٹر خواجہ شہاب الدین صاحب اور مشن اسکول کے ہیڈ ماسٹر پنڈت جانکی ناتھ بھی اپنی قابلیت اور کردار کے لحاظ سے قابل ستائش تھے۔

[2] مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے اپنے مدرسہ کے حالات میں مولوی عمو جان صاحب کے طرز گفتگو اور لڑکوں کو سزا دینے کی بہت پر لطف تصویر کھینچی ہے۔

داخل تھا۔ میری والدہ صاحبہ کو جاڑوں میں زلہ کی بہت شکایت رہتی تھی۔ اور وہ حبِ جدوار استعمال کرتی تھیں۔ ان کا نسخہ مولوی عمو جان صاحب کی بیاض سے نقل کیا گیا تھا۔ مولوی صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ اسکول ماسٹری کا مدرس اس زمانہ میں اپنی علمی حیثیت کے علاوہ شہری اجتماعی زندگی میں بھی خاصا اثر رکھتا تھا۔

میں نے دلی کے پچاس برس پہلے کے حالات لکھنے میں مدرسہ کے استادوں سے مضمون کو اس وجہ سے شروع کیا ہے کہ ان کی قابلیت اور مسائل کے نقوش میرے حافظہ کی لوح پر خوب روشن اور واضح ہیں۔ دلی مشن کالج قائم ہو چکا تھا۔ اوّل پادری آلنٹ پرنسپل رہے۔ اور بعد میں رائٹ صاحب۔ آلنٹ فاضل شخص تھے لیکن بعد میں چند استاد ایسے آئے جو ان سے کہیں زیادہ چمکے۔ مثلاً لیفرائی جو آخر میں ہندوستان کے لارڈ بشپ (Metropolitan) ہو گئے۔ میں جب کالج میں پہنچا اس وقت سی۔ ایف۔ اینڈریوز اور جے۔ جی۔ ایف۔ ڈے انگریزی کے استاد تھے۔ اینڈریوز نے ہندوستان کی سماجی، اخلاقی اور سیاسی ترقی کیلئے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہندوستان کے تمدن اور تہذیب کی تاریخ میں ہمیشہ نمایاں رہیں گی۔ ڈے صاحب بڑے باپ کے بیٹے تھے۔ ان کے والد آئرلینڈ میں بشپ تھے۔ اور جب یہ خود بھی صحت کی خرابی کی وجہ سے وطن واپس گئے تو جلد وہاں بشپ اور پھر ممبر ہو گئے اور پھر کل آئرستان کے اسقف اعظم (Primate) بن گئے۔

ڈے اور اینڈریوز طالب علموں کے ساتھ بے حد ہمدردی کرتے تھے اور میل جول کا طریقہ ایسا تھا کہ کسی قسم کی دوست کا اظہار نہ ہونے دیتے تھے۔ اسی وجہ سے جماعت کے کمرے سے زیادہ کھیل کے میدان میں لڑکوں میں کھلے ملے نظر آتے تھے۔ تاکہ ان کے ذہن سے محکومی کی پستی دور کر دیں۔ اور لونڈری کی اسکول کے ساتھ جرأت اور اولوالعزمی پیدا ہو۔ ہندوستان کے ان ہاتھوں کے ابتدائی زمانہ کے استاد عام طور سے بہت قابل رہے ہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی کے لورڈ لے بھی جو دلی کے مشن کالج کے لئے استاد منتخب کر کے بھیجتا تھا علمی معیار اور کردار کی برتری کا خاص خیال رکھتا۔ اسی وجہ سے طلب علم توطالب علم شہر دلی کے عام رئیس پر ایسا اثر ہوا۔ دوسرے معترفین اور مصروفین دلی کے اچھے علما سے جو غدر سے پہلے کی تہذیب اور فضل و کمال کے نمونہ تھے اچھے دوست پیدا ہو گئے۔

ان مشنری استادوں کی سادہ زندگی اور علمی تبحر اس انگریزی مقولے *Plain living high thinking.* کا حقیقی مصداق تھا۔

مولانا نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ، ماسٹر پیارے لال، ماسٹر ساگر چند سب مل کر دلی میں جمع ہوئے، اور دہلی لٹریری سوسائٹی کی بنیاد ڈالی مشن کالج کے پادری استاد ان کے گہرے دوست ہو گئے۔ اینڈریوز نے مولانا نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ سے اپنی ارادت کا اظہار روزمرہ کے میل جول کے علاوہ اپنی کتاب *Renaissance in India* میں تفصیل سے کیا ہے۔

ماسٹر پیارے لال کے خاندان کا سلسلہ اکبری نورتن راجہ ٹوڈرمل تک پہنچتا ہے۔ خوش شکل، خوش لباس، خوش خو۔ میں نے ان کو ان کی ضعیفی کے زمانہ میں دیکھا۔ جب ان کے پوتے ہرچند کی وجہ سے جو کالج میں میرے ہم جماعت تھے میرا ان کے مکان پر آنا جانا زیادہ ہوا۔ کوچہ کلاں میں اپنے خاندانی مکان میں رہتے تھے۔ قد درازی مائل تھا لیکن چہرہ بہت بارعب۔ آنکھیں بڑی بڑی اور محبت سے بھری ہوئی۔ انگرکھا اور اس پر چغہ، چوڑی دار پاجامہ۔ اور دستار کا کر گابی یا سنڈا جوتا پہنتے تھے۔ انگریزی خوب لکھتے تھے۔ چنانچہ وائسرائے یا گورنر جب دلی آتے تھے تو میونسپلٹی کا انگریزی ایڈریس ماسٹر پیارے لال ہی مرتب کرتے تھے۔ میں نے ہندو کالج کے قیام کے موقع پر ایک دفعہ ان کو تقریر کرتے بھی سنا تھا اور انگرکھا، دستار چغہ پہننے والے کو ایسی عمدہ انگریزی بولتے ہوئے سننا میرے لئے ضرور باعث تعجب ہوا تھا۔ ماسٹر پیارے لال پنجاب کے محکمہ تعلیمات کے مختلف جلیل القدر عہدوں پر فائز رہے۔ اور آخر خدمت پر انسپکٹر مدارس تھے۔ اور رائے بہادری کا خطاب بھی پایا۔ جس کی اس زمانہ میں اتنی ہی قدر و منزلت تھی جتنی آجکل نائٹ (*Knight*) کے اعزاز کی۔ لیکن دلی والے رائے بہادر صاحب کو ان کی مشرقی علوم کی اعلیٰ مہارت کی وجہ سے ماسٹر ہی کہتے رہے اور یہ لقب شاید اس وقت تک اتنی ہی اہمیت رکھتا تھا جیسا کہ آکسفورڈ کے بعض کالجوں کے پرنسپلوں کو ماسٹر کہنا۔

ماسٹر پیارے لال کا اردو زبان پر بھی بڑا احسان ہے۔ ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے ان کا اصلاح اور مشورہ اور عالمانہ تنقید زبان میں سلاست اور روانی پیدا کرنے میں بہت مفید ثابت ہوئی۔ خود بھی کتابیں لکھیں۔ کہتے ہیں کہ

رسوم ہند میں ہندوؤں کے رسم ورواج کا حال منشی سکھ اور خوشحال چند کے دلچسپ قصوں کی شکل میں ماسٹر صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے۔ قصص ہند کا پہلا حصہ بھی شاید انھوں نے ہی تالیف کیا تھا۔ ان کتابوں کی عبارت کی روانی اور مضامین کی دلکشی بچوں کے ذہن پر خاص اثر ڈالتی تھی۔ چنانچہ مجھے خود بچپن میں ان کتابوں کے صفحے کے صفحے حفظ تھے۔ اور میری طرح اور بیسیوں بچوں کو بھی حفظ ہونگے۔ طریقہ تعلیم اب ایک علم بن گیا ہے۔ اور بچوں کی نفسیات اور ذہنی ترقی کے مدنظر نصاب کی کتابیں جدید اصولوں پر مرتب ہوئی ہیں۔ لیکن زبان کی شستگی اور طرز بیان کے لحاظ سے ان کا مقابلہ جب ماسٹر پیارے لال، محمد حسین آزاد اور ان کے لائق رفقا کی مرتبہ درسی کتابوں سے کیا جاتا ہے۔ تو آجکل کی کتابیں نہایت پھیکی اور گھٹیا نظر آتی ہیں۔ محکمہ تعلیمات کو بچوں میں ادبی ذوق پیدا کرنے کے لئے درسی کتابوں کی تالیف میں زبان کی سادگی اور لطافت کا بھی ضرور خیال رکھنا چاہئے۔ ماسٹر پیارے لال کی تحریر کو دیکھنا ہو تو اس ترجمے کو ملاحظہ فرمائیے جو انھوں نے دربار قیصری ۱۸۷۷ء کی انگریزی تاریخ کا کیا تھا۔ اصل انگریزی کتاب کی عبارت میں بھی یہ روانی اور سلاست نہیں جو اس ترجمہ میں موجود ہے۔ اور پھر طرز تحریر اتنا دلکش کہ ادب لطیف کی طرح صفحے کے صفحے پڑھ جائیے۔ اور طبیعت سیر نہیں ہوتی۔

ماسٹر ساگر چند انگریزی کے ایم۔ اے تھے اور وہ بھی انسپکٹری مدارس کے عہدے سے پنشن لے کر علیحدہ ہوئے۔ ان کے علم وفضل کی بڑی دھاک تھی۔ لیکن یہ نہایت خاموش اور سنجیدہ بزرگ تھے۔ جو صفات ان کے لائق بیٹے بابو موتی ساگر مرحوم میں بھی آئیں۔ ماسٹر ساگر چند جینی تھے۔ لیکن اس زمانہ کے دلی کے لوگوں میں کوئی مذہبی تعصب یا تنگ نظری نہ تھی۔ ماسٹر پیارے لال اور ماسٹر ساگر چند دونوں کی میرے والد بزرگوار منشی غلام جیلانی اور پھوپھا ڈپٹی امیر علی سے اچھی رسم وراہ تھی۔ اور بابو موتی ساگر آنجہانی کا تو یہ حال تھا کہ جب حضرت شاہ عبدالسلام رحمۃ اللہ علیہ کا عرس بالسن کولی[1] میں ہوتا تھا۔ تو یہ قوالی کی محفل میں بالالتزام شریک ہوتے تھے۔ اور میرے خالو صاحب مرحوم حضرت شاہ عبدالصمد صاحب رح کو بطور عقیدت نذر پیش کرتے تھے۔

دلی کے پایہ تخت ہونیکی وجہ سے یہاں عربی علوم کے متعدد مدرسے تھے جن میں سے تین اب تک باقی ہیں۔ سنہری مسجد کا مدرسہ، مسجد فتحپوری کا مدرسہ، اور حسین بخش کا مدرسہ۔ ان مدرسوں کے استاد اپنے خاص علم کے ماہر ہوتے تھے۔ لیکن دلی میں پچاس برس پہلے بعض اور یگانہ دہر استاد بھی تھے جن سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے لئے افغانستان، ترکستان، ایران، عراق اور عرب کے علماء دلی آتے تھے۔ اور حلقہ درس میں شریک ہوتے تھے۔ میرے بچپن کے زمانہ میں مولوی نذیر حسین صاحب کی ذات بابرکت ایسے علماء کی آخری نشانی تھی۔ یہ حدیث میں یکتا سمجھے جاتے تھے۔ دلی کے ایک اور بڑے عالم مولوی محمد اسحٰق مرحوم جو اپنے علم وفضل کے مقابل میں کسی کو نہیں گردانتے تھے خود فرمایا کرتے تھے کہ میں مولوی نذیر حسین صاحب کے درس میں باقاعدہ طور سے شریک رہا ہوں۔ اور یہ شرکت میرے لئے باعث فخر ہے۔ مولوی محمد اسحٰق صاحب ریاضی اور منطق میں یکتا ہونے کے علاوہ علوم تفسیر اور معنی وبیان کے بھی بڑے ماہر تھے۔ میں نے عربی کے ایم۔ اے کے امتحان کیلئے مختصر المعانی اور مطول انہی سے پڑھی تھی۔ ان کو یہ سب کتابیں ازبر یاد تھیں۔ اور مطالب کو سمجھانے کیلئے کبھی متن کو دیکھنے کی حاجت نہ ہوتی تھی۔

مولوی محمد اسحٰق صاحب کا اتقا اور پابندی وضع بھی عجیب شان رکھتی تھی۔ ان کے حلقہ درس میں بھی ہندو مسلمان سب شریک ہوتے تھے۔ ساری عمر نواب مشرف الدین خان مرحوم کے ہاں گزار دی۔ جب نواب صاحب کا انتقال ہوگیا تو ان کے بیٹے نواب مصلح الدین مرحوم اور پوتے سعید الدین صاحب کے پاس رہے۔ سعید الدین صاحب اب صوبجات متحدہ میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ مولوی صاحب کی تجہیز وتکفین سعید الدین صاحب نے ایسی محبت اور احترام سے کی جیسا کہ اپنے خاندان کے بزرگ یا پیر ومرشد کی کرتا ہے۔

مولوی نذیر حسین صاحب کے زمانہ حیات ہی میں یا انکی وفات کے تھوڑے ہی عرصہ بعد تفسیر کا درس مولوی عبد الحق صاحب نے محلہ ملیماران میں جاری کر دیا تھا۔ اور مولانا نذیر احمد صاحب نے عربی ادب کی تعلیم کا سلسلہ گلی بتاشان میں۔ لیکن ان علماء کے درس کی شہرت زیادہ تر بیسویں صدی میں ہوئی۔ دہلی کے پچاس برس پہلے کے علماء میں مولوی ضیاء الدین صاحب کا نام

[1] یہ گاؤں اب نئی دہلی کی آبادی میں شامل ہوگیا ہے۔ حضرت شاہ عبدالسلام کی درگاہ کناٹ پلیس کے عقبی جانب واقع ہے۔ اور اب بھی مرجع خلائق ہے۔

لیا مشہور ہی ہے یہ مولوی مملوک علی کے شاگرد تھے۔ اور دہلی کالج کے ٹوٹنے سے پہلے شاید وہاں ملازم بھی ہو گئے تھے۔ کالج کے ٹوٹنے کے بعد گورنمنٹ نے ان کو ڈپٹی بنا دیا۔ مولوی صاحب کی علمی قابلیت کی شہرت تو بہت تھی۔ چنانچہ ایڈنبرا یونیورسٹی نے مولانا نذیر احمد صاحب سے بہت پہلے مولوی ضیاء الدین صاحب کو ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ لیکن مولوی صاحب نے کوئی حلقہ درس قائم نہیں کیا۔ نہ کوئی قابل ذکر کتاب تصنیف کی۔ البتہ اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے شہر میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ مکان رہٹ کے کوئیں کی گلی میں تھا پانچوں وقت کی نماز پابندی سے جامع مسجد میں ادا کرتے تھے۔ اور رمضان شریف میں اکثر اعتکاف بھی اس حجرے میں کیا کرتے تھے۔ جو پایہ والوں کی جانب مسجد کے شمال مغربی گوشے میں واقع ہے۔

اس زمانہ کی دلی میں فقر و درویشی کا بھی چرچا تھا۔ ظاہری علم کے علاوہ باطنی تعلیم کو بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ شاہ عبدالسلام صاحب نے جن کی درگاہ واقع بالسکول کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں اپنے لڑکے کو جو اس زمانہ میں میاں عبدالصمد صاحب کہلاتے تھے باطنی تعلیم کیلئے حضرت شاہ اللہ بخش صاحب کے پاس تونسہ جو اٹک کے اس پار واقع ہے بھیج دیا تھا۔ حضرت شاہ اللہ بخش کے والد حضرت شاہ سلیمان مولانا فخر کے خلیفہ حضرت نور محمد کے مرید تھے۔ اور اس وجہ سے ان دو خاندانوں میں بیعت کا سلسلہ قائم تھا۔ صوفی منش بزرگوں کا آجکل کی مادی خیالات کی دنیا قدر کرے نہ کرے لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کہ ان درویشوں نے ہندوستان کے مختلف مذاہب کی آبادی میں اسلام اور خصوصاً توحید کی نہایت خوش اسلوبی سے تلقین کی۔ اور انہی کے اعلیٰ مشرب کا فیضان تھا جو قدیم زمانہ میں گرونانک اور کبیر جیسے موحد پیدا ہو گئے۔

پچاس برس پہلے کی دلی کے ولی صفت بزرگوں میں حضرت مسیح الدین رحمۃ اللہ علیہ کا نام لینا ضروری ہے۔ یہ بغداد سے تشریف لائے تھے۔ اور قادری سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیا کی بستی کی ایک مسجد میں آکر مقیم ہو گئے اور پچیس تیس سال عبادت اور ریاضت میں وہیں گذار دیئے۔ بہت نورانی شکل تھی۔ رنگ سپید اور شہاب۔ سپید ڈاڑھی۔ سپید پیرہن اور سپید براق تہبند۔ عرب بزرگانِ دین کی طرح سر پر اوڑھنی ڈالے رہتے تھے۔ مسجد کا دروازہ نماز کے وقت کھلتا تھا اور پھر بند ہو جاتا تھا عام خلائق سے ملنے کیلئے دس اور بارہ بجے کے درمیان کا وقت مقرر تھا۔ مسجد سے باہر صرف صبح کے وقت حضرت سلطان الاولیا کے مزار پر حاضر ہونے کے لئے جاتے تھے۔ جہاں قرآن مجید تلاوت فرماتے تھے۔ اور پھر واپس آجاتے تھے۔ دلی کے امیر و غریب ہندو مسلمان سب ان سے فیض حاصل کرنے کیلئے آتے تھے۔ یہ سب سے ایسی محبت سے ملتے تھے کہ ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ بغدادی صاحب کو مجھ سے سب سے زیادہ محبت ہے۔

اس زمانہ کی ایک اور مقدس ہستی حضرت شاہ محمد عمر صاحب تھے۔ یہ آخوند جی کے نام سے مشہور تھے۔ دلی میں ان کا خاندان قدیم زمانے سے زہد و ورع میں مشہور رہا تھا۔ چنانچہ ان کے نانا بھی جو بڑے اخوند صاحب کہلاتے تھے اپنے زمانہ میں دلی کی ایک برگزیدہ ہستی تھے۔ فراش خانہ میں آخوند جی کی گلی ان ہی کے نام سے آجتک منسوب ہے۔ شاہ محمد عمر صاحب کا قد چھوٹا تھا اور جسم بھاری ہونے کی وجہ سے اعصاب میں فرق آگیا تھا۔ پھر بھی چہرہ بڑا نورانی تھا۔ اور بات چیت نہایت محبت سے کرتے تھے۔ شہر کے ہندو مسلمان ان کے اخلاق اور روحانیت کے گرویدہ تھے۔ شاہ محمد عمر صاحب قادری سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ تاہم ان کا مشرب نہایت وسیع تھا۔ میں نے باوجود نشست و برخاست میں سخت تکلیف ہونے کے ان کو اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کے عرس میں شریک ہوتے دیکھا ہے۔ قادری اور چشتی عقائد کے اختلافات کا ان میں شائبہ بھی نہیں تھا۔ شاہ محمد عمر صاحب حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے مزار پر ہر جمعرات کو بالالتزام حاضر ہوتے تھے۔ ربیع الاول کے مہینہ میں بارھویں تاریخ کو ختم شریف میں ان کی ذات بابرکت کی وجہ سے لوگوں کے اژدہام نے ایک میلے کی صورت پیدا کر دی تھی۔ اور ختم قرآن شریف اور فاتحہ کا انتظام نہایت وسیع اور پاکیزہ طور سے عمل میں آتا تھا۔ دلی کے بہترین نعت خواں اور حافظ اپنی مناجات خوانی اور قرأت کا کمال دکھلاتے تھے۔

علماء کے بعد شاعروں کا اگر ذکر کیا جائے تو دلی اس زمانہ میں اوّل درجہ کے باکمالوں سے دراصل خالی نظر آتی ہے۔ نواب مرزا خاں داغ حیدر آباد چلے گئے۔ حالی نے سرسید نے دلی چھڑا دی۔ اور وہ زیادہ تر علی گڑھ یا پانی پت رہنے لگے۔ اور عربک اسکول دہلی کی فارسی مدرسی کو ایسے عالم اور یگانہ روزگار استاد کا فخر حاصل نہ رہا۔ محمد حسین آزاد کو محکمہ تعلیمات پنجاب اور اہل لاہور کی قدردانی نے وہیں کا کر لیا۔ انور مرحوم نے کچھ دن اپنی طباعی سے مشاعروں میں جان

رکھی۔ پھر وہ بھی باہر چلے گئے۔ اپنے بچپن کے زمانہ میں جن شعراء کا میں نے نام سنا ہے ان میں میر مہدی مجروحؔ اور منشی ہری لال مشتاقؔ پرانے لوگوں میں اور عبدالرحمٰن راسخؔ، آغا شاعر قزلباش، وحید الدین بیخودؔ اور نواب سراج الدین خان سائلؔ[1] متوسط عمر طبقے میں نمایاں تھے۔ مشاعرے البتہ متعدد جگہ ہوتے تھے۔ مثلاً کرم اللہ خاں صاحب عرف سیفے خاں صاحب شیداؔ، بدلت امرناتھ صاحب ساحرؔ اور بدری کرشن صاحب کے مکانات پر جو شہر کے مختلف محلوں میں واقع تھے۔ کنور بدری کرشن صاحب وکالت کرتے تھے لیکن ان کا خاندان ہرگوپال تفتہؔ سے تعلق رکھتا تھا اس لئے مشاعرے کی محفلوں کا انتظام ان کے لئے ایک قدیم خاندانی روایت تھی۔ جو وہ بزرگ نہایت آن بان سے نبھا گئے۔

نثر نویسوں میں سرسیّد کا نام سب میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن انھوں نے دہلی چھوڑ کو ل (علی گڑھ) کو بسا لیا۔ اس لئے میں پچاس برس پہلے کی دلّی میں ان کا نام شامل نہیں کرتا۔ البتہ دو آدمیوں کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔ اول مولوی سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ اور دوسرے میر ناصر علی۔ مولوی سید احمد صاحب کا کارنامہ ڈاکٹر فیلن کے مددگار کی حیثیت سے بھی قابل قدر ہے لیکن اُردو زبان کی تاریخ میں ان کا نام ان کی اُردو لغت کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ مولوی صاحب کا حلیہ اور عادات ڈاکٹر جانسن کی شکل و صورت اور خصائل سے ملتے جلتے تھے۔ دونو کی بصارت کم، دونوں کا مٹاپے کی وجہ سے بے ہنگم جسم، مولوی سید احمد صاحب کی پلکیں بالکل جھڑ گئی تھیں اور بر نیوں کی وجہ سے پپوٹوں کے کنارے بالکل سرخ رہتے تھے۔ پھر بھی مطالعہ اور تصنیف کے کام میں مشغول رہتے تھے۔ ایک دفعہ میں کسی لفظ کے معنی کی تلاش میں ان کے گھر پہنچا۔ یہ اس زمانہ میں ایک تنگ سی گلی میں رہتے تھے۔ جو شاہ گنج اور گلی شاہ تارا کے درمیان واقع ہے۔ گرمی کا موسم تھا۔ میں نے مکان پر جا کر کنڈی کھٹکھٹائی۔ مولوی صاحب باہر نکل آئے۔ ننگ دھڑنگ صرف ایک میلا جانگیہ زیب تن تھا۔ میں نے اپنا مطلب عرض کیا۔ فرمایا ذرا ٹھہریئے۔ پھر گھر میں اندر گئے۔ اور کرتا پاجامہ پہن کر اور ایک کنجیوں کا گچھا لیکر باہر آ گئے۔ اور مجھے ساتھ لیکر گلی شاہ تارا کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں ایک لیتھو پریس تھا۔ اور مسودات بھی وہیں رہتے تھے۔ مولوی صاحب ایک ڈیسک نما میز پر بیٹھ گئے۔ بستہ میں سے مسودہ نکالا۔ کچھ ورق گردانی پھر کلاں نما آئینہ اور اپنی عینک دونوں کی مدد سے میری پیش کردہ لفظ کے مختلف معنی اور محل استعمال بیان کرنے شروع کر دیئے۔ میں کھڑا سنتا رہا۔ اور یہ جب تک میری تسلی نہ ہو گئی سمجھاتے رہے کچھ لوگ راہگیر بھی جمع ہو گئے۔ کیونکہ مطبع لب سڑک واقع تھا۔ اور اس کا نقشہ اصطبل کا سا تھا۔ مولوی صاحب ایک کاٹ کی کرسی پر بے تکلف بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اطمینان اور فراغت کا یہ حال تھا کہ شاید آکسفورڈ اور کیمبرج کے پروفیسروں کو اپنے مطالعہ کے کمروں میں بھی اتنا ہی سکون حاصل ہوتا ہو۔

مولوی سید احمد صاحب اردو نہایت سہل اور پاکیزہ لکھتے تھے۔ عورتوں کی زبان میں لڑکیوں کیلئے جو اشعار انھوں نے تالیف فرمائی ہے۔ اس کی زبان بھی نہایت شستہ اور صاف ہے ان کے بہت سے مضامین صوبہ پنجاب کی پچھلی صدی کی ابتدائی درسی کتابوں میں شامل تھے۔ سرکار انگریزی نے ان کو خانصاحب کا خطاب عطا فرمایا۔ لیکن فرہنگ آصفیہ کی تالیف سے جو عزت اور شہرت حاصل ہوئی وہ کسی نائٹ کم مدبر کو بھی حاصل نہ ہو گی۔ مولوی سیّد احمد صاحب شاعر بھی تھے۔ شملہ پر ان کی نظم اُردو کورس میں شامل تھی۔ اس کا ٹیپ کا مصرع یہ تھا ع

لیتو ہیں سا تے ہیں صاحب پہاڑ پر

اس زمانہ کے دوسرے ادیب میر ناصر علی تھے۔ ان کا خاندان علم و فضل کی وجہ سے ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ چنانچہ خود ان کے والد مولوی ناصر الدین ابو منصور پایہ کے عالم تھے۔ اور پادریوں کے ساتھ مناظرہ میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ میر ناصر علی نے ابتدائی ملازمت سررشتہ تعلیمات کی ادنیٰ درجے کی مدرسی سے کی۔ اور بتدریج محکمہ نمک کی سپرنٹنڈنٹی تک پہونچے۔ خانبہادری کا خطاب حاصل کیا۔ اور آخری عمر نہایت عزت اور وقار سے بسر کی۔ میر صاحب کی وضع قطع اور لباس قدیم علماء کا سا تھا۔ ڈاڑھی لمبی خشخاشی رکھتے تھے۔ چہرے اور آنکھوں پر تبسم کی چمک رہتی تھی۔

---

[1] یہ مضمون لکھا جا چکا تھا کہ نواب سراج الدین خاں سائلؔ کے انتقال کی خبر دہلی سے آئی۔ اس زمانہ میں ان کا دم بہت غنیمت تھا۔ پُرانی طرز کی شاعری میں استاد کا درجہ رکھتے تھے۔ ترنم کے ساتھ پڑھنے کا ڈھنگ بھی خاص تھا۔ اللہ تعالیٰ اغریق رحمت فرمائے۔

انگریزی افسروں اور اہل علم سے بہایت تپاک سے ملتے تھے۔ لیکن ہم عصر مولویوں کی کٹ حجتی سے بیزار تھے۔ کتب بینی کا بے حد شوق تھا۔ قلمی کتابوں کی تلاش میں بہ گدری (گدڑی) پر روز نظر آتے تھے۔ فارسی اور اردو کے باکمال شاعروں کے ہزاروں شعر حفظ تھے۔ اور انھیں ایسا برمحل پڑھتے تھے کہ دل پھڑک جاتا تھا طبیعت میں بے حد سادگی تھی۔ اور اسراف سے بے حد محتاط تھے پھر بھی علم کی خدمت اور اہل ذوق کی خاطر مدارات میں دل کھول کر روپیہ صرف کرتے تھے۔

میر ناصر علی کا طرز تحریر ان کے ہم عصر ادیبوں، سرسید، حالی، نذیر احمد، اور آزاد سے بالکل جُدا گانہ ہے۔ شاعرانہ لطیف ترکیبوں اور دلآویز استعاروں نے ان کی طبیعت پر ایسا اثر کیا تھا کہ ان کی تحریر میں شعر کی سی شان پیدا ہو گئی تھی۔ اور جیسا کہ غزل کے ایک شعر کا مضمون دوسرے سے جُدا ہوتا ہے، ایسے ہی ان کی تحریر میں بھی تسلسل باقی نہیں رہتا تھا۔ میر صاحب جو شعر کسی خیال کی تصریح میں نقل فرماتے تھے اس کے ذہنی معنی اور محاسن کے بیان کرنے میں مضمون کے اصل موضوع کو چھوڑ دیتے تھے۔ بھی اس جرأت کو خوب سمجھتے تھے۔ اور "صلائے عام" میں مضمون پریشاں کے عنوان سے عرصہ تک رشحہ افشانی فرماتے رہے "تیرھویں صدی" اور "صلائے عام" کے مضامین میر ناصر علی کی قدر اور طرز تحریر کی ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ میر صاحب نے ... یہ لکھنؤ کی فضا سے حاصل کیا۔ کیونکہ دلّی میں تو غالب ہی نے نثر کو حقیقیہ تکلف سے پاک کر دیا تھا۔ میر صاحب کی تحریر میں جو خصوصیت ہے اس کو "کلاسیکل" (Classical) یعنی قدیم استادانہ کہنا بیجا نہ ہوگا۔ مطالب کے عدم تسلسل کے لحاظ سے آجکل کی رومانی نثر کا بھی اسے پیش خیمہ تصور کیا جا سکتا ہے۔

شاعروں اور ادیبوں کے بعد اس زمانہ کے حکیموں کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان سب میں ممتاز حکیم محمود خاں تھے۔ جن کا مرثیہ حالی نے بڑے درد سے لکھا ہے۔ حکیم محمود خاں کو علم و فضل کے علاوہ حذاقت فن کی بھی خدائے تعالیٰ نے بدرجہ اتم عطا فرمائی تھی۔ ان کے علاج کو عوام معجزہ سا سمجھنے لگے تھے۔ یہ فقط ان کی تشخیص اور نباضی کا کمال تھا۔ امیر، غریب، تہیدست، بدیسی سب کیلئے ان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نہ کوئی نذر، نہ کوئی فیس۔ نسخہ ایسا کہ دو تین پیسے میں کام چل جاتا تھا۔ اور غریبوں کو کبھی کچھ مارنہ پڑتا تھا۔ حکیم صاحب کے دو بیٹوں محمد خاں اور واصل خاں نے بھی مطب شروع کر دیا تھا۔ ان میں باپ جیسا علم و فضل تو نہ تھا لیکن خاندانی روایات اور تعلیم نے تشخیص اور نباضی کا ملکہ پیدا کر دیا تھا۔ حکیم محمود خاں میں کسی قسم کا طمطراق نہ تھا۔ لیکن حکیم محمد خاں کی سواری کی ونگٹ اور گھوڑوں کی جوڑی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ خود جوڑی کو ہنکاتے تھے۔ یہ اکثر رجواڑوں سے بغیر کسی طلب کے آتی تھی۔

حکیم محمد خاں ... ستوں میں بھی علاج کے واسطے دلّی سے ... گئے تھے۔ ... یہ ... روزانہ سفر خرچ کے اور ریل کا فرسٹ ... کلاس ... مقرر تھا۔ ... بڑی عزت کا بڑا احساس تھا۔ ایک ... کسی جگہ گئے اور وہاں ... استقبال کیلئے کوئی وقت پر نہ پہنچا۔ یہ ... بگڑ گئے۔ اور پھر جب لوگ ان کے اتروانے کو آئے یہ نہ اترے اور دوسری ٹرین سے واپس دلّی آ گئے۔ حکیم محمد خاں اور حکیم واصل خاں دونوں کے ہاتھ میں خدا نے بڑی شفا دی تھی۔ اور ان کے علاج سے خاندان کا نام اور چمکا۔ دلّی میں اس خاندان کی وجاہت کا بڑا اثر تھا۔ ہر طبقے اور ملت کے لوگ ان کی خوشنودی اور ان سے راہ و رسم رکھنے کو باعث فخر سمجھتے تھے۔ دلّی کے مسلمان اور ہندو باشندوں کی یگانگت اور دوستی کا ایک بڑا سبب اس خاندان کا کمالِ فن اور اعلیٰ اخلاق بھی تھے۔

حکیم محمد خاں اور حکیم واصل خاں کو جسمانی ورزش کا بھی بڑا شوق تھا۔ گھر میں اکھاڑا تھا۔ صبح ہی لڑنت ہوتی تھی۔ استاد اپنے نوکر تھے۔ وہ زور کراتے تھے۔ دنگلوں میں بھی شریک ہوتے تھے اور میلوں ٹھیلوں سے بھی اس دلچسپی تھی۔ دلّی میں جو دو نو عیدوں کے بعد ٹر کا میلہ ہوتا تھا اس کی رونق بھی ان کے دم سے تھی۔ مطب میں مریضوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ایک جانب ایسے شاگردوں کی جماعت بیٹھی رہتی تھی جو فارغ التحصیل ہونے والے ہیں۔ حکیم صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا اور ہونٹوں کی جنبش سے طالب علموں کو کچھ ایسا فرمایا۔ ابھی مریض حال ہی بیان کر رہا ہے کہ نسخہ تیار ہو کر حکیم صاحب

۱؎ جامع مسجد کے نیچے کے میدان میں پہلے جو بڑا انجیر دن کی قسم وقت کا بازار صبح میں لگتا تھا اس کو پہلے گذری اور بعد میں گدڑی کہنے لگے تھے۔

(بیرونی)

کے ملاحظہ کیلئے پیش ہوگیا۔ اور انھوں نے اس پر ایک نظر ڈال کر مریض کے حوالے کر دیا۔ تو نسخہ لکھنے کیلئے ادویات طبی حاضر رہتی تھیں۔ مریضوں سے بھی مذاق ہوتا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ مجھے حرارت ہوگئی۔ دس بارہ برس کی عمر ہوگی۔ حکیم صاحب نے فرمایا۔ میاں صاحبزادے مجھے بعض دکھا نے آئے ہو۔ گھر میں حلال خوری موجود تھی اس سے گلے لگ لئے ہوتے۔ حاضرین نے قہقہہ لگایا۔ حکیم صاحب بھی مسکرائے۔ میں شرمندہ سا ہوگیا۔

حکیم مجید خاں کا بڑا کارنامہ مدرسہ طبیہ کا قیام ہے۔ یونانی طب کی حالت زبوں ہوتی جا رہی تھی۔ اور مدرسے کے قیام کی ایک مرکزی مقام پر سخت ضرورت تھی۔ بعد میں ان کے لائق چھوٹے بھائی حکیم اجمل خاں صاحب نے اس مدرسہ کو اور ترقی دی۔ اور کالج کے درجے تک پہنچا دیا۔ ابتدا میں مدرسہ کے سالانہ جلسے جو تقسیم اسناد کی غرض سے منعقد ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک دو میں میں بھی شریک ہوا ہوں۔ ایک جلسہ میں سرسید بھی شریک تھے مسٹر آرکلارک کمشنر دہلی نے انعامات تقسیم فرمائے۔ مولانا نذیر احمد صاحب کی تقریر سب سے آخر میں رکھی گئی تھی کیونکہ ان کی تقریر کے بعد کسی اور مقرر کا رنگ نہیں جمتا تھا۔ مولانا نے جو شعر ابتدا میں پڑھا وہ مجھے اب تک یاد ہے ؎

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے بھینس کے انڈے سے نکال

مولانا کے مزاحیہ شعر سے سارا جلسہ پھڑک گیا۔ لیکن بعد میں جو تقریر حکیموں اور دوا فروشوں کی حالت پر کی اس سے سب حد درجہ متاثر ہوئے۔

دلّی میں اس زمانہ میں حکیم محمود خاں کے خاندان کے علاوہ اور حاذق طبیب بھی تھے۔ مثلاً حکیم محمد حسین اور حکیم بدرالدین خاں فراش خانہ میں، حکیم غلام نجف خاں کٹڑہ دینا بیگ خاں میں اور حکیم لطیف حسین اور حکیم قیام الدین قاضی کے حوض پر گلی حکیم بقا میں۔ حکیم بدرالدین خاں صاحب کے خاندان میں اب تک مطب کا سلسلہ جاری ہے۔ اور ان کے چھوٹے صاحبزادے حکیم سراج الدین جن کو سرکار انگریزی سے خانصاحب کا خطاب بھی عطا فرمایا ہے خدمت خلق فرما رہے ہیں۔ حکیم غلام نجف خانصاحب کے خاندان میں حکیم رضی الدین صاحب کو اس صدی کے شروع میں خاصا عروج ہوا اور اب ان کے صاحبزادے حکیم ناصر الدین خانصاحب مطب کو چلا رہے ہیں۔ حکیم بقا کا خاندان امراض چشم کیلئے خاص طور سے مشہور رہا ہے۔ اس خاندان کے ایک لائق فرد یعنی حکیم مصالح الدین صاحب حیدرآباد سے تشریف لے آتے تھے۔ اور یہاں خلق اللہ کو ان کے علاج سے بہت فائدہ ہوا۔

ڈاکٹری علاج کا بھی اس زمانہ میں دلّی میں خاصا چرچا ہوگیا تھا۔ اور دو بنگالی ڈاکٹروں کو بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ ایک ڈاکٹر ہیم چندر سین اور دوسرے ڈاکٹر سانیال۔ ڈاکٹر سین کا مطب بہت چلتا تھا۔ اپنے فن کے ماہر تھے اور ساتھ ہی اخلاق بھی پسندیدہ اور شکل بھی اچھی۔ بڑی بڑی آنکھیں، کھلا ہوا رنگ۔ لمبی ڈاڑھی۔ کوٹ پتلون پہنتے تھے۔ لیکن اردو بے تکلف بولتے تھے۔ دو روپے فیس مقرر تھی۔ آٹھ آنے یا کی گاڑی کا کرایہ، گھر پر بلانے کی صورت میں ادا کرنا ہوتا تھا۔ اللہ نے عجب شفا ان کے ہاتھ میں دی تھی۔ مریضوں کا اژدہام رہتا تھا۔ تو اسے پر مطب تھا۔ خدا نے ان کی نیک نیتی اور خدمت خلق کا یہ پھل دیا ہے کہ آج اس مقام پر ان کی اولاد کی ایک عظیم الشان دوا فروشی کی دکان قائم ہے اور خاندان کے بعض افراد مطب بھی کرتے ہیں۔

جراحی عمل کیلئے دلّی والے سول سرجن یا ہندوستانی ڈاکٹروں کی طرف رجوع ہونے لگے تھے۔ پھر بھی پھنسی پھوڑوں کا علاج عام طور پر محلہ کے حجام کرتے تھے۔ خود ہمارے خاندان کا حجام جس کا نام عبدالرزاق تھا جراحی عمل میں بڑا مشتاق تھا۔ سیتارام کے بازار میں اس کی دکان تھی۔ مختلف قسم کے مرہم تیار رہتے تھے۔ اور پھپاروں اور لیپوں کے نسخے یاد تھے۔ عام طور سے اس کے علاج سے اللہ ہمیشہ شفا دیتا تھا اور اگر زخموں کی حالت زیادہ خراب نظر آتی تھی تو عبدالرحمٰن جراح کو بلا لیا جاتا تھا۔ ان کی نشست چاوڑی بازار میں ایک بالاخانہ پر طوائفوں کے کوٹھوں کے برابر تھی۔ بالاخانہ کا اور صحیح محل وقوع معلوم کرنا ہو تو یہ سمجھئے کہ نئی سڑک سے جب چاوڑی بازار میں داخل ہوتے ہیں اور حوض قاضی کی طرف مڑتے ہیں تو شروع ہی میں بازار کی دائیں جانب کسیروں کی دکان کے اوپر یہ بالاخانہ واقع تھا۔ عبدالرحمٰن جراح کا حلیہ تو عجیب و ترتیب تھا۔ سیاہ فام رنگت اور اس پر کالی خضاب شدہ لمبی ڈاڑھی سوکھا سہما جسم۔ لیکن لباس بہت صاف اُجلا پہنتے تھے۔ مرہم کی ڈبیہ چاندی کی تھی۔ اور آلات جراحی بھی چمکتے ہوئے رکھتے تھے مریضوں سے خواہ کوٹھے پہ آئیں خواہ گھر پر بلائیں معقول معاوضہ لیتے تھے۔

جو اس وقت گراں سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج کل کے سرجنوں کی فیس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ یعنی جب گھر پر ان کو بلایا جاتا تھا تو علاوہ دوا کی قیمت کے دو روپیے خاصدان میں رکھ کر پان اور الائچی کے ساتھ بطور نذر دیئے ہوتے تھے۔ ان لوگوں کو آج کل اتائی کہا جائیگا۔ لیکن جلد کے امراض میں یہ صدیوں کے خاندانی تجربے کی وجہ سے ایسے ماہر ہو گئے تھے کہ ان کا علاج اور جراحی عمل ہمیشہ کامیاب ہوتا تھا۔ عبدالرحمٰن جراح کے بعد کچھ روز ان کے بیٹے نے کام چلایا لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے سلسلہ بند ہو گیا۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

آنکھوں کے علاج کے بارے میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ حکیم بقا کا خاندان بہت مشہور تھا۔ لیکن پہاڑ گنج میں محمد شفیع سرمہ والوں کا ایک اور خاندان تھا۔ جو امراض چشم میں ماہر سمجھا جاتا تھا۔ میری نانی کی آنکھ میں گندہ پانی (Glaucoma) اتر آیا تھا۔ اور سخت تکلیف تھی۔ محمد شفیع صاحب نے کوئی جراحی عمل تو نہیں کیا لیکن اپنے مختلف سرموں سے درد اور تکلیف کو ہمیشہ کیلئے کھو دیا۔ اس خاندان کے ماہر بھی معقول معاوضہ لیتے تھے۔ اب خبر نہیں کوئی فرد اس خاندان کا باقی ہے یا نہیں۔

باکمالوں اور ماہرین میں قانون دانوں کا ذکر کرنا بھی لازمی ہے۔ پچاس برس پہلے کی دلّی نے دو شخص پیدا کئے۔ ایک آنریبل مسٹر مدن گوپال اور دوسرے رائے حکم چند۔ لیکن یہ دونوں دلّی سے باہر چلے گئے۔ مدن گوپال آنجہانی ماسٹر پیارے لال کے بھائی تھے۔ لیکن یہ لاہور میں رہ پڑے اور وہاں چیف کورٹ کے جج ہو گئے۔ مدن گوپال کے صاحبزادے لالہ سری رام پھر دلّی آ گئے۔ اور ان کا نام "خمخانۂ جاوید" کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ لیکن لالہ سری رام کا کام بیسویں صدی سے متعلق ہے۔ رائے حکم چند حیدرآباد چلے گئے۔ جہاں ان کی قانون دانی کی شہرت اب تک باقی ہے۔ رائے حکم چند کے پوتے مسٹر کشن چند اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی میں ریاضی کے استاد ہیں۔ کیمبرج کے رنگلر (Wrangler) ہیں۔ اور دلّی والوں کے خاص اخلاق و عادات سے بھی متصف ہیں۔ ان دو بڑی ہستیوں کے علاوہ دلّی کے اس زمانہ کے ممتاز وکیلوں میں دو لالہ گردھاری لال اور حافظ عزیزالدین صاحب تھے۔ بڑے گردھاری لال ذات کے بنئے تھے۔ رنگ سانولا، قد میانہ، بدن بھاری اور توند نکلی ہوئی۔ انگرکھا اور چغہ پہنتے تھے۔ اور سر پر دوپٹہ باندھتے تھے۔ ہم تو ان کے قانونی نکات کو سننے کہاں جاتا۔ لیکن والد مرحوم اور اپنے ماما حافظ عزیزالدین صاحب سے اکثر سنتا تھا کہ بڑے گردھاری لال کو خدا نے عجیب دماغ دیا ہے۔ ایسی قانونی بحث پیش کرتا ہے کہ انگریز بیرسٹروں کے مقابلہ میں دانت کھٹے ہو جاتے ہیں۔ ان کا عالی شان کئی منزل کا مکان اس محلہ میں جو چھیپی واڑہ اور کناری بازار کے درمیان واقع ہے۔ میرے بچپن میں (۱۹۰۳ء یا ۱۹۰۴ء میں) تعمیر ہوا۔ مجھے اس سے دلچسپی یوں تھی کہ اس کے ابھارے اور بازو کی دیواروں پر فرشتوں، سازندوں، صحرائی جانوروں اور طرح طرح کی جانی تصویریں بنائی گئی تھیں۔ جن کو میں اور میرے ہم جماعت مدرسہ سے واپسی کے وقت بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ بڑے گردھاری لال کے صاحبزادے چندو لال بی۔ اے میں میرے ہم جماعت بھی رہے ہیں۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد یہ آکسفورڈ چلے گئے اور بیلیول کالج (Balliol College) میں تعلیم پائی۔ خبر نہیں انکی بیرسٹری کیسی چلی۔ شاید سرگباشی ہو گئے ہیں۔ اور ان کے خاندان میں اب کوئی آبائی پیشے کو سنبھال رہا ہے یا نہیں۔

چھوٹے گردھاری لال صاحب ذات کے کھتری تھے گورے اور خوبصورت۔ بات چیت میں متین اور سنجیدہ۔ ان کے خاندان میں لالہ سردارام نے قانونی پیشے کو جاری رکھا۔ لیکن بیسویں صدی کے اوائل کے سب میں بہترین قانون داں بابو موتی ساگر تھے۔ جن کا ذکر میں ان کے والد رائے بہادر لالہ ساگر چند کے حال میں ضمناً کر چکا ہوں[1]۔

---

[1] مجھے اس زمانہ میں خبر نہیں تھی کہ میرے ایک ہم جماعت اور ایک ہم مدرسہ بھی آئندہ اپنی قانونی قابلیت سے دلّی میں نام پیدا کرینگے۔ ان میں سے پہلے لالہ رام کشور ہیں جو پہلی جماعت سے لیکر کالج تک میرے ساتھ رہے اور جن کو ان کی اعلیٰ قانون دانی اور وجاہت کے لحاظ سے آج بجائے رائے بہادر لالہ رام کشور کے سر رام کشور ہونا چاہیئے تھا۔ دوسرے سر عبدالرحمٰن ہیں جو مدرسہ اور کالج دونوں میں میرے زمانہ میں موجود تھے لیکن دو جماعتیں پیچھے۔ بہ حیثیت وکیل دلّی میں اور بحیثیت ہائیکورٹ جج صوبہ مدراس میں اپنی قانون دانی کا سکہ بٹھا چکے ہیں اور فی الحال لاہور میں پنجاب ہائیکورٹ کی ججی پر فائز ہیں۔ لالہ رام کشور اور سر عبدالرحمٰن دونوں بیسویں صدی کی ممتاز ہستیاں ہیں۔

حافظ عزیز الدین صاحب شاہ عبدالحق محدث کی اولاد میں تھے۔ اور رشتہ میں میرے نانا۔ میرے حقیقی نانا کپتان حسین علی اور حافظ عزیز الدین صاحب سگے چچا زاد بھائی تھے۔ حافظ صاحب نہایت وجیہ، لسان اور صاحب علم وفضل تھے۔ انگریزی نہیں جانتے تھے پھر بھی ان کی وکالت بہت چلتی تھی اور حکام پر بڑا اثر تھا۔ آواز میں خاص گرج تھی جس سے ہر شخص پر رعب پڑتا تھا۔ لباس سادہ اور علماء کی شان کا پہنتے تھے۔ پابندی شرع کا بڑا خیال تھا۔ پیجامہ ہمیشہ شرعی وضع کا ہوتا تھا۔ اور عمامہ بھی چھوٹا جس کی لمبائی مشکل سے تین گز ہوتی ہوگی۔ زرد بانات کی جوتی جو خاص طور سے اجمیری دروازہ کا ایک مسلمان موچی ان کے لئے تیار کرتا تھا۔ مذہبی رجحانات کی وجہ سے آخر میں وکالت ترک کردی۔ شہر میں ان کی بڑی عزت تھی۔ گلی حافظ عزیز الدین اب تک بنڈت کے کوچہ میں ان کے نام سے منسوب ہے حافظ صاحب کی آل میں مشتاق احمد زاہدی ہیں۔ یہ پہلے بہاولپور کالج میں پرنسپل رہے اور جب سے پنشن ہوئی ہے قرولباغ میں رہتے ہیں۔ ادبی ذوق نہایت اچھا ہے اور تحریر بھی پاکیزہ۔ انہی سے اب حافظ عزیز الدین صاحب کے خاندان کا نام باقی ہے۔

علم وفضل کے تذکرے کو ختم کرنے سے پہلے میں دلی کے اخباروں اور مطبعوں کا بھی کچھ حال لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اردو اخباروں کا معیار غدر کے بعد مختلف وجوہ سے گر گیا تھا۔ دو اخبار نکلتے تھے۔ اکمل الاخبار محلہ بلی ماران سے اور افضل الاخبار حویلی اعظم خاں سے۔ دونوں گھٹیا۔ خبریں بھی غیر مکمل اور ادارتی تحریریں بھی تیسرے کیا چوتھے درجہ کی۔ حالانکہ علی گڑھ سے اس زمانے میں "تہذیب الاخلاق" ایک اعلیٰ معیار پر شائع ہورہا تھا۔ مزاحیہ رنگ میں "اودھ پنچ" کی نقل میں "دلی پنچ" جاری ہوا۔ جو کچھ دن چلا لیکن مزاح کو پاکیزہ اور برجستہ رکھنے کے لئے بڑی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ بازاری فقرہ بازی اور ہجو اس شدومد سے ہوجاتی ہے۔ اور صحیح ذوق بیہودہ اور لایعنی لفاظی سے ہمیشہ نفرت کرتا ہے۔ ایسے ہی اسباب کی بنا پر دلی پنچ

دلی کے چھاپہ خانوں میں مطبع مصطفائی اور مطبع مجتبائی کو خاص شہرت حاصل تھی۔ زیادہ تر قرآن شریف اور مذہبی علوم کی کتابیں شائع کرتے تھے۔ دونوں مطبعوں کی قدر ومنزلت ان کی اعلیٰ خطاطی کی وجہ سے تھی۔ مطبع مصطفائی میرے بچپن ہی میں بند ہوگیا۔ لیکن اس مطبع کی چھپی ہوئی کتابوں کی بڑی مانگ رہی۔ اس زمانہ میں جید عالموں کو تصحیح کیلئے رکھا جاتا تھا۔ اور باکمال خوشنویس کتابت کا کام کرتے تھے۔ مولوی ممتاز علی صاحب مرحوم کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن شریف کو جو مطبع مجتبائی سے شائع ہوا تھا۔ آجکل بھی قدر دان اسی ذوق وشوق سے خریدتے ہیں۔ جیسا کہ انگلستان اور فرانس میں مشہور مصنفین کی پہلی مرتبہ چھپی ہوئی کتابوں کو بڑی بڑی قیمتوں پر مول لیا جاتا ہے۔ مطبع مجتبائی کو اب سے پچاس برس قبل مولوی عبد الاحد صاحب نے جو تھانہ بھون کے رہنے والے تھے خرید لیا تھا۔ اور چونکہ وہ نہایت منتظم شخص تھے اور تجارتی کاروبار کا بڑا تجربہ رکھتے تھے اس لئے مطبع کو بڑی ترقی ہوئی اور اس کی مطبوعہ کتابیں تمام ایشیائی اسلامی ممالک اور افریقہ میں بھی پہنچنے لگیں۔ لیکن کتابت کی صحت اور خطاطی کی دیدہ زیبی مصارف کی کمی اور نفع کی فراوانی کی تدابیر کے نذر ہوگئیں۔ دریبہ کلاں میں منشی بلاقی داس کا بھی ایک بہت بڑا مطبع تھا۔ قدیم علوم وفنون کی کتابوں کی اشاعت میں بھی منشی صاحب نے بھی مشرقی ادب کی کم وبیش ویسی ہی خدمت کی جیسا کہ منشی نول کشور کے مطبع نے لکھنؤ میں ادا کی منشی صاحب کے مطبع میں قرآن شریف کی طباعت اور کتابت کا علیحدہ انتظام تھا۔ اور جس جگہ کام ہوتا تھا صرف باوضو شخص داخل ہوسکتا تھا۔ آجکل کے مذہبی جھگڑوں اور دل آزاری کی باتوں پر جب خیال کیا جاتا ہے تو ایک ہندو مذہب والے کی عقیدت اور احترام پر حیرت ہوتی ہے۔ منشی بلاقی داس کا مطبع تجارتی مدوجزر کی نذر ہوگیا۔ لیکن دریبہ میں اب تک ایک محلہ ان کے نام سے آباد ہے۔ اور خدا کرے کہ ان کی نیک نیتی اور پاک طینتی کی وجہ سے ہمیشہ آباد رہے۔ کوچہ بلاقی داس کے سامنے ہی منشی درگا پرشاد صاحب کتب فروش کی دکان تھی۔ یہ خود فارسی کے عالم تھے۔ اور خریداروں کو اچھی اور صحیح چھپی ہوئی کتابوں کے خرید میں مشورہ دیتے تھے۔ ایک ٹانگ میں لنگ تھی۔ پھر بھی کتابوں کے نکالنے میں تکلف نہ کرتے تھے۔ اور بڑے شوق سے قدیم نسخے دکھاتے تھے۔ خود بھی سارے دن عینک لگائے مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ اور کتب فروشی کا پیشہ صرف نفع

کمانے کیلئے اختیار نہیں کیا تھا بلکہ اہل علم کی خدمت بھی مدنظر تھی۔ اور اپنے ذہن کو بھی راحت و سرور پہنچانا مقصود تھا۔

غدر نے دلی اور دلی والوں پر سخت مصیبت ڈھائی۔ یوریوں نے جو انگریز معصوم بچوں اور بیکس عورتوں پر ظلم توڑے تھے ان کا خمیازہ دلی والوں کو اٹھانا پڑا۔ قلعہ کی نواح میں ستم ڈھانے والے کوتیں کے پاس املی کے درختوں کے نیچے پھانسی گڑا گئی تھی۔ اور وہیں فوجی عہدہ داروں نے ایک عدالت بھی قائم کرلی تھی۔ محبوب علی خواجہ سرا جیسے چند مخبروں نے مجرمین کی فہرست مرتب کرائی تھی شریف خاندان کے خوالوں کو بغاوت کے الزام میں بڑے تشدد کے ساتھ پکڑ کر لایا جاتا تھا۔ اور سرسری پوچھ گچھ کے بعد پھانسی پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ قلعہ کی بہت سی شاہی عمارات مسمار کردی گئیں۔ اور انکی جگہ نے ہم فوجی بارکیں بن گئیں۔ پریڈ کے میدان اور اس سے ملحقہ آراضی پر دو بڑے بازار تھے۔ ایک اردو بازار کہلاتا تھا اور دوسرے کا نام خانم کا بازار تھا۔ ان کے تمام مکانات اور دکانوں کو ڈھاکر زمین کو قلعہ کی حفاظت کے مدنظر صاف کردیا۔

بادشاہی خاندان کے اخلاق غدر سے پہلے ہی بہت گر گئے تھے۔ صحیح النسبی عنقا ہوگئی تھی۔ مختلف بیماریوں کا ستون تھا۔ غدر کے بعد ان کی حالت اور زبوں ہوگئی۔ سرکار انگریزی نے ان کے گزارے کیلئے پنشنیں مقرر کیں۔ لیکن ان کے چٹورپن اور بد افعالیوں نے سب کو سنگ لگا دیا۔

پچاس برس پہلے کی دلی میں کوئی ڈور سوسا تھا۔ کوئی ٹٹی کا کام کرتا تھا۔ کوئی دہی بڑے بیچتا تھا۔ ان کو دیکھکر عبرت ضرور ہوتی تھی۔ لیکن مشہر خانہ عادات کا کیا علاج کیا جائے۔ حضرت شاہ نصیر الدین صاحب عرف میاں کالے صاحب کی صاحبزادی فیروز بانو صاحبہ کے پاس دو شہزادیاں رہتی تھیں۔ ایک کا نام اشرف زمانی تھا اور دوسری کا عباسی بیگم۔ عباسی بیگم میں حسن بھی ضرور تھا۔ جو قلعہ کی صحبت کا نتیجہ تھا۔ رنگ سیاہ فام اور بال گھنگھر والے۔ افیم کا شوق تھا۔ سرکار انگریزی سے دونوں کو تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن وہ افیم پر خرچ ہوجاتی تھی۔ یا بالائی اور لیپے لوازمات پر۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کو صاحبزادی صاحبہ کی وجہ سے کھانے پینے اور کپڑے لتے کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ جب تک زندہ رہیں چین سے رہیں۔ لیکن جن کو ایسے توسل حاصل نہ تھے ان کو بھیک مانگنے کی نوبت پہونچی۔ رات کے گیارہ بجے ہمارے محلہ میں ایک شہزادی گداگری کیلئے نکلتی تھیں۔ افلاس نے نابینا کردیا تھا۔ ... کی د... سے بال بھی کتروا دیئے تھے لیکن آواز خدا نے ایسی دی تھی کہ ہر ایک کے دل پر اثر ہوتا تھا۔ ظفر کی یہ غزل بڑے درد سے پڑھتی تھیں۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے

میری نانی صاحبہ مرحومہ اکثر ان شہزادی کو گلی میں سے اندر گھر میں بلالیتی تھیں اور غزل کو سن کر روتی رہتی تھیں۔ اور اکثر کپڑے اور نقد ان کو دیتی تھیں۔ میرے والد چونکہ اس زمانے میں ڈپٹی کمشنر صاحب کی پیشی میں سررشتہ دار تھے اور شہزادوں کی تنخواہوں کی کارروائیاں اکثر رہتی تھیں۔ اس لئے شہزادے اور شہزادیوں کا ہمارے گھر میں بہت آنا جانا تھا۔ یہ سب مرزا ثریا جاہ مرحوم کے جو صدر خاندان تھے بہت شاکی تھے۔ پچاس برس پہلے کی دلی میں جو نام نہاد شہزادے خاص دلی میں رہ گئے تھے ان میں مرزا فرخندہ جمال اور مرزا الٰہی کی ذاتی حیثیت قائم تھی۔ مرزا ابالی صوفی منش تھے۔ سماع میں جب کیفیت ہوتی تھی تو ان کا رقص اور حرکات دیکھنے کے قابل ہوتی تھیں۔ اکثر ایک چھوٹے قد کی گھوڑی پر جس کو وہ خود ٹانگن کہا کرتے تھے نکلتے تھے۔ ڈاڑھی اور نقشہ بہادر شاہ بادشاہ آخری تاجدار مغلیہ سے ملتا تھا۔ شہزادیوں میں معظمی بیگم صاحبہ اور ان کی پوتی رفیع الزمانی کا خاص وقت کمسن تھیں میری والدہ صاحبہ سے میل جول تھا۔ معظمی بیگم صاحبہ نے مرزا ولایت شاہ سے دوسری شادی کرلی تھی۔ میرزا صاحب اچھی صفات کے شہزادے تھے اور آن بان سے رہتے تھے۔ سواری کیلئے شاندار جوڑی تھی۔ سترھویں کے موقع پر اپنی باغیچی میں جو حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ سے تھوڑے فاصلہ پر صفدر جنگ کی سڑک کے شمالی جانب واقع تھی۔ شہر کے مسلمان رئیسوں کی بڑی پرتکلف دعوت کیا کرتے تھے۔ رفیع الزمانی صاحبہ آجکل حیدرآباد میں ہیں اور اکثر ہمارے ہاں تشریف لاتی ہیں۔

شہزادوں کے طبقے کے علاوہ دلی کے باشندوں کی معاشرت اور عام معیار زندگی کچھ پست نہیں ہوئے تھے۔ سرکاری ملازم، تجارت پیشہ لوگ، اور کاریگر سب مرفہ الحال نظر آتے تھے ہمارے ہی محلہ چوڑی والان میں اس زمانہ میں سات ڈپٹی رہتے تھے۔ جن میں سے چار کے نام مجھے اب تک یاد ہیں۔ ڈپٹی امیر علی،

ڈپٹی سلطان خاں، ڈپٹی جانکی ناتھ اور ڈپٹی فخرالدین۔ بیل والی گلی اور سیتارام کے بازار کے اس حصے میں جو بیل والی گلی سے ملحق ہے دو تین معزز کشمیری پنڈتوں کے مکان تھے جو ڈپٹی یا اسکے مماثل عہدوں پر فائز تھے۔ قاضی کے حوض کے قریب ایک گلی میں پنڈت شومبدت صاحب کا مکان تھا جو جج تھے۔ سرکی والان میں ڈپٹی الٰہی بخش صاحب نے جو نہر کے محکمہ کے ڈپٹی تھے اپنی کوٹھی بنائی تھی۔ یہ خاص دلی کے باشندے نہ تھے مگر پنشن لینے کے بعد دلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ سرکار نے ان کو آنریری مجسٹریٹ مقرر کر دیا تھا۔ ان کے بیٹوں نے بڑی عزت حاصل کی۔ چنانچہ محمد رفیق سر محمد رفیق ہوئے۔ اور آخر میں وزیر ہند کی کونسل کے رکن مقرر ہوئے۔ یہ بیسویں صدی کے پہلے ربع کی بات ہے۔ سرکی والوں ہی میں ڈپٹی اکرام اللہ خاں رہتے تھے۔ ان کے والد انعام اللہ خاں (لقب اتو خان) سمیع اللہ خاں صاحب سی۔ ایم۔ جی کے چچا تھے۔ جس زمانہ کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت اکرام اللہ خاں دلی میں رجسٹرار تھے۔ یہ اپنے والد کی شاندار حویلی میں مقیم تھے۔ اس حویلی کے کئی حصے تھے۔ دلی کی قدیم حویلیوں کا عام نقشہ یہ ہوتا تھا۔ دالان در دالان، پیچھے شہ نشین جس کی کرسی بلند ہوتی تھی۔ دالانوں کے بازوؤں میں چھوٹے دالان جن کے بھی دو درجے ہوتے تھے۔ اور اندر کے درجے سے شاہ نشین میں جانیکا راستہ ہوتا تھا۔ چھوٹے دالانوں میں سامان رکھنے کیلئے حجرے ہوتے تھے۔ بڑے دالانوں کے سامنے چبوترہ جس کے دائیں بائیں سہ دری صحنچیاں ہوتی تھیں۔ چبوترے کے سامنے کے حصہ پر مہتابی۔ چبوترے کے نیچے چمن اور روشیں اور وسط میں نہر جس میں فوارے نصب ہوتے تھے۔ چمن کے اختتام پر ایک اور صحن ہوتا تھا۔ جو ڈیوڑھی تک پہونچتا تھا۔ اور اسی حصہ میں باورچی خانہ، ماماؤں کے حجرے اور سامان کی کوٹھڑیاں ہوتی تھیں۔ یہ نقشہ میں ڈپٹی امیر علی صاحب کے مکان کے زنانہ حصہ کا دیکھ کر لکھ رہا ہوں جہاں میں نے اپنا بچپن گذارا۔ اور شعور کی عمر کو بھی وہیں پہنچا۔ لیکن شہر میں متعدد حویلیاں اسی شان کی تھیں۔ جن کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مثلاً مفتی صدر الدین کی حویلی جو ہمارے مکان سے قریب تھی۔ منشی اتو خان کی حویلی جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ زینت محل کی حویلی جو اب پٹیالہ ہاؤس کے نام سے موسوم ہے۔ کیا اچھا ہو کہ دلی کا محکمہ آثار قدیمہ ان قدیم حویلیوں میں سے کسی کو درست کر کے اس زمانہ کے سازوسامان سے سجائے۔ تاکہ غدر سے پہلے اور بعد کے طرز زندگی اور رہنے سہنے کے لوازمات کا صحیح حال معلوم ہو سکے۔ یورپ میں اہل ذوق اور بلدیہ جماعتوں نے مختلف زمانوں کی تمدنی حالت کو دکھانے کے لئے ایسے مکانات کو محفوظ کر دیا ہے۔

ہاں سرکی والوں میں ڈپٹی اکرام اللہ خاں کا میں ذکر کر رہا تھا۔ ان کے مکان کے سامنے ہی نواب محمد حسن خاں صاحب رہتے تھے جو شہر کے شرفاء میں سے تھے۔ لیکن کبوتر بازی اور قمار بازی دو علتوں میں ان کی خاندانی دولت بہت برباد ہوئی۔ پروفیسر آغا حیدر حسن جو اُردو کے اچھے ادیب ہیں اور عورتوں کی زبان لکھنے میں بے مثل ہیں نواب محمد حسن خاں کے قریبی رشتہ دار ہیں۔

پنڈت کے کوچہ کے اندر ڈپٹی نظام الدین خاں کے علاوہ دو تین اور خوشحال خاندان آباد تھے۔ جن میں سے مولوی نصیرالدین خوجم صاحب اور میر عبداللہ کی اولاد کا اب تک دلی کے شرفا میں شمار ہوتا ہے۔ خوجم صاحب کے پڑپوتے خواجہ مسعود آجکل علیگڑھ میں انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری انگریزی ادب میں اعزازات کے ساتھ حاصل کی ہے۔ اور ذہین ہونے کے علاوہ ذوق بھی نفیس رکھتے ہیں۔

فراش خانہ میں بہت سے شریف خاندان تھے۔ جن میں سے بعض کے لائق افراد کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اور اب اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ البتہ نواب اکبر علی خاں اور ان کے بھائی نواب محمد علی خاں اور حکیم حسن رضا خاں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ نواب اکبر علی خاں بہت لسّان تھے۔ اور آداب مجلس سے خوب واقف تھے۔ اسی وجہ سے یہ اکثر ریاستوں میں ندماء کی جماعت میں شریک رہے۔ نواب حامد علی خاں والئی رامپور سے ان کی گہری راہ و رسم تھی۔ اور نواب صاحب مرحوم جب دلی تشریف لاتے تھے تو اکبر علی خاں صاحب کے مکان پر ضرور آتے تھے۔ نواب اکبر علی خاں صاحب کو نادر اشیا کی تجارت کا بھی شوق ہو گیا تھا اور وہ اکثر ریاستوں میں عجائبات فروخت کرنے کی غرض سے جاتے تھے۔ حکیم حسن رضا خاں صاحب کا میرے والد مرحوم سے دوستانہ تھا۔ اور چونکہ وہ اکثر ہمارے مکان پر تشریف لاتے تھے اس لئے مجھے انھیں دیکھنے کا خوب موقع ملا ہے۔ مطبن،

سنجیدہ، بات نہایت آہستگی سے کرتے تھے۔ شکل و صورت معقول اور لباس بھی نفیس پہنتے تھے۔ ان کے بیٹے علی رضا صاحب اپنے آبائی مکان میں رہتے ہیں۔ بہت با وضع اور خوش خو ہیں۔ لیکن ان کی گفتگو میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک میں انتہا درجہ کی نرمی اور وقار اور ایک میں انتہا درجے کی شوخی اور بیباکی۔

گلی قاسم جان میں لوہارو والوں کے خاندان کے علاوہ ڈپٹی ہادی حسین خاں کی بھی خاص شخصیت تھی۔ سرکار انگریزی نے ان کو آنریری مجسٹریٹ مقرر کر دیا تھا۔ فوجداری مقدموں کے تصفیہ میں ذرا سخت سزائیں دیتے تھے۔ اور جب مجرم حسرت اور یاس سے ان کی طرف دیکھتا تھا۔ تو فرماتے تھے "میں کیا کروں میری لال کتاب میں یہی لکھا ہے"۔ قد چھوٹا تھا اور بدن مسخی۔ رنگ البتہ بہت گورا تھا۔ لیکن بڑھاپے نے چہرے پر جھریاں ڈال دیں۔ ڈاڑھی صاف۔ البتہ قلمیں اس زمانے کے وضعدار لوگوں کی طرح لمبی رکھتے تھے۔ محرم میں ان کے ہاں بڑے زور کی مجلس ہوتی تھی۔

لوہارو والوں کے خاندان میں دو معزز ہستیاں تھیں۔ نواب سر امیر الدین خاں جو اس وقت نواب لوہارو تھے۔ لیکن اپنے اعلیٰ تدبر اور سیاست دانی کی وجہ سے۔ اور ریاستوں میں بحیثیت مشیر کام کرتے تھے۔ اور اکثر دلی سے باہر رہتے تھے۔ دوسری ہستی نواب احمد سعید خاں کی تھی جو نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر کے صاحبزادے تھے۔ اور خصائل اور عادات کے لحاظ سے دلی کے نوابوں کا بہترین نمونہ تھے۔ سرکار انگریزی نے ان کو خاندانی وجاہت کے لحاظ سے صوبہ پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر کر دیا تھا۔ لیکن جس زمانہ کا میں حال لکھ رہا ہوں یہ دلی واپس آ گئے تھے رنگ گورا، جسم کسرتی، خد و خال متناسب، ڈاڑھی البتہ صرف ٹھوڑی پر تھی۔ لیکن اس کو بڑھا کر اس طرح لپیٹتے تھے کہ ان کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھی۔ طبیعت موزوں تھی۔ طالب تخلص تھا۔ عشقیہ رنگ میں اچھا کہتے تھے۔ مزاج میں رنگینی اور ساتھ ہی بانکپن بھی تھا۔ گھوڑے کی سواری کا شوق تھا۔ کاٹھیاواڑ اور بالوترے کی نسل کے گھوڑے اپنی سواری میں رکھتے تھے ذرا سی ایڑ کے اشارے سے گھوڑے کو الف کرنا۔ اور پچھلی دونوں ٹانگوں پر چلانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ یہ مظاہرے اکثر چاوڑی بازار میں ہوتے تھے۔ طوائفیں بالاخانوں سے نواب صاحب کی شہسواری کی داد میں سلام کرتی تھیں۔ یہ شان سے سلام لیتے ہوئے گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھا لے جاتے تھے۔ آداب مجلس اور خاندانی وقار کا یوں بڑا خیال تھا۔ بات چیت میں نہایت مہذب اور متین تھے۔ تاہم گفتگو میں ایک خاص شگفتگی تھی۔

کشمیری دروازے کے قریب نواب سلطان مرزا صاحب دلی کے ایک اور خاندانی امیر رہتے تھے۔ ان کو بھی گورنمنٹ نے آنریری مجسٹریٹ مقرر کر دیا تھا۔ وسط شہر میں منشی جیون لال کا قدیم مکان تھا۔ ان کا خاندان ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ راج نرائن صاحب نے بیرسٹری شروع کر دی تھی۔ لیکن ان کو بہ حیثیت وکیل زیادہ شہرت بیسویں صدی میں حاصل ہوئی۔

زیر جامع مسجد بڑے امام صاحب کی ذات بابرکت سے رونق تھی۔ ان کے مورثِ اعلیٰ شاہجہاں کے زمانے میں دلی آئے تھے۔ امام صاحب کی قرأت اور روانی مشہور تھی۔ رمضان شریف میں تراویح کی نماز میں ان کی قرآن خوانی کو سننے کیلئے لوگ بڑی کثرت سے جمع ہوتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا موجزن ہے۔ پھر ہر لفظ کے حروف کو صحیح مخرج سے ادا کرتے تھے۔ اور وقفوں کا بھی بدرجہ اتم خیال تھا ان کے صاحبزادے سید احمد صاحب بھی جوان ہو گئے تھے۔ یہ اب شمس العلماء کے خطاب سے ممتاز ہیں اور اپنا تمام وقت خدمتِ خلق میں گذارتے ہیں۔

مٹیا محل پر مفتی صدر الدین خانصاحب کے پوتے نواب عنایت الرحمٰن خانصاحب ملازمت کے سلسلہ میں حیدرآباد چلے گئے تھے۔ لیکن ان کے دو نو صاحبزادے محمد حسن خاں اور ابو الحسن خاں وہیں مقیم تھے۔ محمد حسن خاں صاحب نے سینٹ اسٹیفنز کالج سے بی۔ اے پاس کیا۔ ان کا شمار درحقیقت بیسویں صدی کی ابتدا کی ممتاز ہستیوں میں ہونا چاہیئے۔ محمد حسن خانصاحب کے دوستوں میں حکیم اجمل خاں صاحب، نواب فیض احمد خانصاحب مولوی عنایت اللہ صاحب اور زین العابدین خانصاحب تھے۔ زین العابدین خاں صاحب ڈپٹی سلطان خانصاحب کے نواسے تھے۔ یہ سب بیسویں صدی میں چمکے۔

ترا ہا بیرم خاں میں مولوی الوار الحق صاحب کی ذات علم و فضل کے لحاظ سے خاص امتیاز رکھتی تھی۔ لیکن وہ ایجنٹ گورنر جنرل کے ممبر منتی کے عہدے پر فائز ہو کر آبو چلے گئے تھے۔ بیسویں صدی میں اس خاندان کے بعض اراکین نے اچھی شہرت حاصل کی۔ مثلاً انعام الحق صاحب جو گورنمنٹ آف انڈیا محکمہ خارجہ کے اسسٹنٹ سکریٹری تھے۔ ڈاکٹر مشرف الحق صاحب مرحوم جو ڈھاکہ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے۔ سلام الحق صاحب اور صبیح الدین صاحب جو پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدوں تک پہنچے۔ اور احتشام الدین صاحب جن کا انتقال ابھی حال میں ہوا ہے اور جو اُردو لغت کی تدوین میں ایک بڑا کارنامہ چھوڑ گئے ہیں۔

ترا ہہ بیرام خاں سے قریب سرسید کا مکان تھا جو اب بھی موجود ہے۔ لیکن ان کا خاندان دلّی چھوڑ چکا تھا۔ میر برعلی صاحب کے صاحبزادے بھی دلّی سے باہر چلے گئے تھے۔ اور میتن لیکر بھی دلّی سے باہر رہے۔ لیکن میر صاحب کے نواسے میرزا محمد سعید صاحب محکمہ تعلیمات کے مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر اب دلّی آ گئے ہیں۔ اور اپنے خاندانی مکان میں مقیم ہیں۔ یہ اُردو کے مایہ ناز ادیب ہیں۔

چیلوں کے کوچہ میں نواب شرف الدین صاحب دلّی کے ممتاز شرفا میں سے تھے۔ سرسید نے اپنے لڑکے جسٹس محمود کی شادی انہی کی صاحبزادی سے کی تھی۔

تموّل اور ظاہری ثروت کے لحاظ سے چھنا مل والوں کا خاندان شہر میں سب پر فوقیت رکھتا تھا۔ میرے بچپن میں رائےبہادر لالہ رام کشن داس اس خاندان کے صدر تھے۔ انھوں نے اپنی جائداد کا نہایت عمدہ انتظام کیا۔ اور آمدنی کو بہت بڑھایا۔ روز صبح کو گھوڑے پر سوار ہو کر دیکھ بھال اور ہدایات دینے کے لئے نکلتے تھے۔ اہل خاندان کی عزّت کا بڑا خیال تھا۔ رہنے سہنے اور سواری کا انتظام صدر خاندان کے ذمّے تھا۔ جیب خرچ کے لئے ہر فرد کے واسطے معقول رقم ماہانہ مقرر تھی۔ شام کے وقت چاندنی چوک میں ان کے کوٹھے کے نیچے شاندار گاڑیوں کی ایک لمبی قطار لگی رہتی تھی۔ بہترین نسل کے گھوڑے جتے ہوتے تھے۔ ساز و سامان بھی چمکدار اور سائیسوں اور کوچوانوں کی وردیاں بھی بھڑک دار۔ تہواروں کے موقع پر مکان کو خوب سجایا جاتا تھا۔ دلّی میں اس وقت بجلی کی روشنی نہیں ہوئی تھی۔ لالہ رام کشن داس نے اپنے مکان کیلئے علیحدہ انجن سے روشنی کا انتظام کر رکھا تھا۔ دیوالی پر کوٹھے کے نیچے زیبائش اور روشنی کو دیکھنے کیلئے تماشائیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ میلوں کے موقع پر اس خاندان کے افراد بہت داد و دہش کرتے تھے۔ چنانچہ پھول والوں کی سیر میں ان کے کوٹھوں پر سے پھول والوں کو اور نفیری والوں کو جو پنکھے کے ہمراہ ہوتے تھے بھاری دوپٹے اور نقد رقوم انعام میں دی جاتی تھیں۔ پچھلے پچاس برس میں اس خاندان میں بہت سی قبل از وقت موتیں ہوئیں۔ جن میں لالہ رادھے موہن کی وفات قابلِ افسوس ہے۔ ان کا نام آئندہ دہلی یونیورسٹی گورنمنٹ شیلڈ سے باقی رہے گا۔ جو انہی کا عطیہ ہے۔ آج کل لالہ لاڈلی پرشاد صاحب صدر خاندان ہیں جو میرے قدیم عنایت فرما ہیں۔

لالہ رام کشن داس صاحب کے مکان کے قریب ہی چاندنی چوک میں رائےبہادر لالہ ہردھیان سنگھ کا مکان تھا۔ یہ اتنے دولت مند تو نہیں تھے۔ پھر بھی سرکار میں ان کا اچھا خاصہ رسوخ تھا۔ اور میونسپلٹی کے وائس پریسیڈنٹ بھی تھے۔ شکل و صورت اچھی تھی۔ مونچھیں سفید ہو گئی تھیں لیکن خاصی گھن دار تھیں اور ان کو خوب تاؤ دیا جاتا تھا۔ طبیعت شوقین تھی۔ میلوں ٹھیلوں میں گھوڑے پر نکلتے تھے۔ ململ کنارے کی چھوٹی پگڑی۔ تن زیب کا چُست انگرکھا جس میں سے کسرتی ڈنٹر اور بازو نمایاں رہتے تھے۔ اور آڑا تنگ چوڑی دار پاجامہ، گلے میں آڑا دوپٹہ بڑے بانکپن سے پڑا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر چاوڑی بازار میں بھی آتے تھے۔ چاوڑی بازار کو اس زمانہ کی لندن کی پکاڈلی (Piccadilly) سمجھنا چاہیئے۔

روپیہ کے لین دین اور ہنڈی پرچے کے کام میں گوڑ والوں کا خاندان دلّی میں سب میں قدیم تھا۔ میرے بچپن میں لالہ سری کشن داس اس خاندان کے صدر تھے۔ بیسویں صدی کے شروع میں ان پر بہت مصیبتیں آئیں۔ اور ان کی کوٹھی کا دیوالہ نکل گیا۔ اپنی ذات سے بہت نیک اور اولوالعزم شخص تھے۔ دلّی میں ہندو کالج کی بنیاد انھوں نے ہی ڈالی تھی۔ جینی خاندانوں میں اس زمانہ میں لالہ ایشری پرشاد اور لالہ سلطان سنگھ بہت ممتاز تھے۔ لالہ سلطان سنگھ کو تو بیسویں صدی کے دلّی والوں میں شمار کرنا چاہیئے۔ ان دونوں نیک نفس ہستیوں کی خصائل کا اثر بعد میں ان کی اولاد میں بھی رہا۔ چنانچہ لالہ ایشری پرشاد

کے صاحبزادے لالہ پارس ناتھ مرحوم بھی ایسی نیک صفات اور وسیع مشربی کی وجہ سے شہر میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ اور لالہ سلطان سنگھ کی مہمان نوازی، علم دوستی اور خدمت خلق کا جذبہ ان کے بیٹے اور پوتے میں اب تک موجود ہے۔ سی۔ الیف۔ اینڈ روز کو لالہ سلطان سنگھ کے خاندان سے بڑی محبت تھی۔ اور یہ محبت ان کے جیتے جی باقی رہی۔ میں سی۔ الیف اینڈ روز سے آخری مرتبہ ۱۹۳۹ء میں انہی کے مکان واقع کشمیری دروازہ میں ملا تھا۔

دادوستد کے کاروبار میں دلّی میں اور بہت سی کوٹھیاں بھی تھیں۔ مثلاً دھولیا والوں کی جو ستیارام کے بازار میں رہتے تھے۔ لیکن ان کا لین دین اور ہنڈی پرچے گوڑ والوں کی طرح سارے ہندستان پر حاوی نہ تھے۔ دلّی کی مرفہ الحالی جو غدر کے بعد تھوڑی بہت رہ گئی تھی۔ اس کا دارومدار صنعت وحرفت اور باکمال مزدوروں پر تھا۔ دلّی کے ہنرمند، نگینہ تراشنے والوں (حکاکوں) اور خوش ذوق سادہ کاروں اور جڑیوں نے شہر کے جوہریوں کو دولت مند بنا دیا۔ پہلے بھی دلّی کے جوہری امیر تھے لیکن میرے بچپن میں دیکھتے ہی دیکھتے یہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ بعض کی تو دریبہ کلاں میں چاندی کے سامان کی معمولی دکانیں تھیں۔ اور اب مسوری، آگرہ، دلّی میں ان کی بڑی بڑی شاپیں (Shops) ہیں۔ جوہری بازار میں پہلے کوٹھے پر ایک حکاک کی دکان تھی۔ یہ استاد پہاڑ گنج میں رہتے تھے۔ لیکن ہیرے کو ایسا تراشتے تھے۔ اور اس پر ایسی جلا دیتے تھے کہ بلجیم اور ہالینڈ کی تراش کا شبہ ہوتا تھا۔ نمونہ ان کو دیدیجئے اور پھر ان کے کمال کو دیکھئے۔ آپ کو یورپ کے تراشیدہ نگینے اور ان کے تراشیدہ جواہر کی آب وتاب میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ دلّی کے جڑیوں اور سادہ کاروں کو بعض انگریز جوہریوں نے بھی نوکر رکھ لیا تھا۔ مثلاً ہملٹن اینڈ کمپنی میں بھی دلّی کے صناع ملازم تھے۔ لیکن وقت کی پابندی اُن کی سرشت میں نہ تھی۔ اس لئے بیش قرار تنخواہوں کی ملازمت کو چھوڑ کر بھاگ آئے۔ یہ طبقہ خوش صورت، خوش پوشاک اور خوش خوراک ہے لیکن کام میں بے حد دیر لگانے والے اور گاہک کی اغراض سے سخت لاپروا۔ ان سے کام لینا دلّی کے جوہریوں ہی کا حق تھا۔ سادہ کار زیادہ تر جامع مسجد، کوچہ استاد حامد، چاہ رہٹ اور کوچہ رحمان میں رہتے تھے۔ آج کل بھی دلّی کے سادہ کاروں کا کام نفاست اور صنّاعی کے لحاظ سے ہندوستان میں سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ ان کے بنے ہوئے زیور کو وہی فوقیت حاصل ہے جو یورپ میں پیرس کے زیور کو۔

حکاکی کی صنعت کی ضمن میں مہرکنی کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میرے بچپن میں چند اہل کمال رہ گئے تھے۔ لیکن مغلیہ بادشاہت کے بعد اس ہنر میں کوئی بدرالدین جیسا مہر کن پیدا نہ ہوا۔ جو غدر کے بعد اس صنعت کے آخری استاد تھے

مصوری بھی روبہ انحطاط تھی۔ صرف استاد فضل کا خاندان رہ گیا تھا۔ یہ عجائب فروشوں کی فرمائش پر قدیم تصویروں کی نقل کرتے تھے۔ جو برسات میں دریوں کے نیچے رکھ دی جاتی تھیں۔ اور جب رنگ ملگجے ہو کر ان کا جوبن چلا جاتا تھا۔ اور بعض کو گھن بھی چاٹ جاتے تھے تو پھر یہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد کی بیان ہو کر یوروپین اور امریکن سیاحوں کے ہاتھ منہ مانگی قیمتوں پر بکتی تھیں۔ اس قسم کی جعل سازی دلّی لاہور، بنارس، آگرہ اور جے پور میں اب بھی کھلم کھلا ہو رہی ہے نتیجہ یہ ہے کہ تخلیقی قوت کو کھو کر صرف نقال بن گئے ہیں۔ اب ان سے کوئی تصویر کھنچوائیے تو وہ کسی کی نقل کرتے ہیں۔ صاحب شبیہ کے خدوخال اور ہیئت کو اپنے تصور سے نمایاں کرنے کے فن کو بھول گئے ہیں۔ رنگ بھی اب ٹیوبوں کے استعمال کرتے ہیں۔ جن میں کچھ عرصے کے بعد وہ خوشنمائی اور تازگی نہیں رہتی جو قدیم رنگوں میں صدیاں گزرنے کے بعد بھی موجود ہے۔ ہندستان کے قدیم استادوں نے لاجورد، شنگرف اور سونے کو حل کر کے تو بہت پائدار اور نفیس رنگ تیار کئے۔ لیکن ان کا زنگاری رنگ جو شاید طوطیا (Copper Sulphate) سے تیار ہوا تھا وہ شاید کامیاب نہیں ہوا۔ کیونکہ پرانی کتابوں کی اکثر جدولیں اس رنگ کی وجہ سے ضائع ہو گئی ہیں۔ حالانکہ انہی کتابوں کا لاجوردی اور طلائی کام صدیوں بعد بھی بالکل نیا معلوم ہوتا ہے۔

ایک اور بہت بڑی صنعت جس سے غریبوں کے پیٹ بھی پلتے تھے اور دلّی کے تجارت پیشہ طبقہ کو اس سے نفع بھی معقول ہوتا تھا۔ گوٹہ کناری اور زریں مسالہ کی تیاری اور کارچوبی سامان کی تھی جو ساور کے طور پر ہندستان کے بڑے بڑے شہروں میں اور صنعت کے نمونوں کی صورت میں باہر بھی جاتا تھا۔ مسلمان محلوں میں بیسیوں کارخانے دبکی، تارکشی اور بٹی کے تھے۔ عورتیں گھروں میں ٹھپہ

دھنک اور مختلف قسم کی بیلیں علیحدہ بنتی تھیں۔ گوکھرو، مقیش اور گوٹے پٹھے کا کام زیادہ تر کناری بازار میں ہوتا تھا۔ جہاں کئی سو دکانیں تھیں۔ زردوزی کا کام کارچوب پر بھی ہوتا تھا۔ اور علیحدہ ہاتھوں پر بھی۔ اس کام میں دلی کا نفیس ذوق مشہور تھا۔ اور اچھے زردوز اس زمانہ میں ڈیڑھ روپیہ سے ڈھائی روپے تک روزانہ اجرت لیتے تھے۔ بعض بڑے کارخانوں میں ماہانہ معاوضہ پر بھی کام کرتے تھے۔ کارخانہ دار کی اس زمانہ کے معیار زندگی کے لحاظ سے آسودہ حالت تھی۔ ان کو عام پیشہ ور روزمرہ کی گفتگو میں کرخندار کہا کرتے تھے۔ اور ان کی زبان اور محاوروں کو باہر والے کو سمجھنا اتنا ہی دشوار ہے جیسا کہ معمولی انگریزی جاننے والوں کو شہر لندن کے خاص رہنے والوں (Cockneyese) کی گفتگو اور لب ولہجہ کو سمجھنا۔ کارخانہ دار اور کاریگر چونکہ مزدوریاں معقول پاتے تھے اور دن بھر خوب محنت کرتے تھے اس لئے تفریح کیلئے مشاغل بھی پیدا کر لئے تھے۔ خالی وقت میں کبوتر بازی یا پتنگ بازی ہوتی تھی۔ بعض نے گانے والے پرند مثل اگن، چنڈول، شام دیڑہ پال لئے تھے۔ جن کی وہ خوب خدمت کرتے تھے۔ اور بولنا سکھاتے تھے۔ گرمی کے موسم میں یہ اپنے پرندوں کو صبح و شام تازی ہوا کھلانے ٹھنڈی سڑک اور پریڈ کے میدان میں لے جاتے تھے۔ اس سے ان کی خود کی صحت بھی اچھی رہتی تھی۔ اور پرندوں کی بھی۔ اور آپس میں فقرے بازی اور ٹھٹول ہو کر تفریح بھی ہو جاتی تھی۔ چاوڑی بازار کے طوائف کے کوٹھوں کی رونق بھی انہی سے تھی۔ شام کو کاریگر نہا دھو، بن ٹھن، سفید لباس پہن اس بازار میں چکر لگانے نکل جاتے تھے۔ سستا سماں تھا۔ اگر کاریگر مسلمان ہے تو اچکن یا ململ کے کرتے پر گورنمنٹ کی صدری ضرور ہوتی تھی۔ جس کے حاشیہ پر زردوزی کا کام ہوتا تھا۔ جوتی بھی شام کو ہمیشہ اچھی پہنتے تھے جو اکثر ٹاٹ بافی کے کام کی ہوتی تھی۔

اس زمانہ میں گوٹہ کناری اور کارچوبی سامان کے تاجر ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ مسلمانوں میں حاجی علی جان والوں کا کارخانہ اور کوٹھی بہت مشہور تھے۔ یہ زیادہ سامان دیسی ریاستوں میں بھیجتے تھے۔ اب بھی کوٹھی باقی ہے لیکن ذوق بدل جانے سے کاروبار کا وہ زور نہ رہا۔ اس خاندان کے لوگ پابندیٔ شرع میں بھی مشہور رہے ہیں۔ لیکن پتنگ بازی کا شغل اس وقت شاید معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ حاجی علی جان کے خاندان کے بعض افراد خوب پیچ لڑاتے تھے۔ میرے بچپن میں اس فن کے استاد رنگی مل تھے۔ جن کی جامع مسجد کے نیچے پانوں کی دکان تھی۔

کارچوبی اور کلابتونی کام کے ساتھ ساتھ ٹوپیوں اور جوتیوں کی تجارت کو بھی بڑا فروغ تھا۔ اور کثرت سے مال باہر جاتا تھا۔ دلی کے پیشہ ور اور تاجر جو یہ بیوپار کرتے تھے خوب دولتمند تھے۔ ہمارے محلّہ (چوڑی والان) میں جوتوں کی تجارت کرنے والے سوداگروں کے بہت سے گھر تھے۔ یہ سب خوش حال تھے۔ اور دور دور ان کی دکانیں تھیں۔ جن میں بنارس، کلکتہ اور حیدرآباد ان کی تجارت کے بڑے مرکز تھے۔ اس ولایتی سامان کے شوق اور رواج نے ان کے کاروبار پر پانی پھیر دیا۔

ولایتی سامان کی تجارت میں دلی کی آبادی کا ایک طبقہ البتہ امیر کبیر ہو گیا تھا۔ یہ کسی زمانہ میں پنجاب سے آئے تھے اور اس نسبت سے پنجابی کہلاتے تھے۔ لیکن ان کو دلی میں بسے ہوئے ڈیڑھ سو برس کے قریب ہو گئے تھے۔ اور لباس، طرز گفتگو اور عام معاشرت میں دلی والوں میں اور ان میں کوئی فرق نہ تھا۔ یہ زیادہ تر لاہور اور ملتان سے آئے تھے۔ چونکہ انھوں نے شادیاں اپنی ہی برادری میں کیں اور مخلوط النسل نہیں بنے اس لئے دلی کے پنجابیوں کے خدوخال پنجاب کے کھتریوں سے ملتے جلتے ہیں۔ دلی کے جوتے والے بھی غالباً پنجاب سے آئے تھے۔ اور ان کے گورے رنگ اور پاکیزہ نقشے آریائی خدوخال سے مشابہت رکھتے ہیں۔ دلی کے پنجابی تجارت کی جانب فطرۃً مائل ہیں۔ اور جو خصائل اور ذہانت تجارت پیشہ لوگوں میں ہونی چاہئیں وہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دی ہیں۔ دلی کے بہت سے پنجابی کاروبار کی خاطر کلکتہ چلے گئے ہیں۔ اور وہاں ان کا لاکھوں کا بیوپار ہے۔ اور بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ خاص دلی میں صدر کی رونق انہی سے ہے۔ چاندنی چوک میں بھی ان کی بہت سی دکانیں ہیں۔

دلی کی دستی صنعتوں میں پچاس برس پہلے تانبے کے برتنوں کی صنعت بھی خاصی اہمیت رکھتی تھی۔ چاوڑی بازار کے شمالی جانب جامع مسجد سے لیکر قاضی کے حوض تک کسیروں کی دکانیں تھیں جہاں تانبے کے برتن بکتے تھے۔ اس کے علاوہ ملحقہ گلیوں میں ٹھٹھیرے، ڈھلیئے اور چھیتے کام کرتے تھے۔ ٹھٹھیرے تانبے کو پیٹ کر برتنوں کی شکل درست کرتے تھے۔ ڈھلیئے

برتنوں کو ڈھالتے تھے اور جیسے نقش و نگار کا کام کرتے تھے۔ جہاں یہ کاریگر کام کرتے تھے وہاں اتنا غل و شور ہوتا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ تانبے کا سامان دلی کے نواح کے دیہات میں بھی جاتا تھا۔ اور دساور کے طور پر دوسرے شہروں میں بھی۔ چینی اور کانچ کے برتنوں کے استعمال نے اس دستی صنعت کو خاصا نقصان پہونچایا ہے۔ کلوں اور بڑی صنعتوں کا رواج میرے بچپن میں عام نہیں ہوا تھا۔ گو ہماری گلی میں لالہ بھاما مل نے اور اجمیری دروازہ کے قریب لالہ سیتے مل جانکی داس نے لوہے کے سامان کو ڈھالنے کے کارخانے جو انجن سے چلتے تھے نئے نئے قائم کئے تھے۔ دہلی کلاتھ مل، گنیش فلور مل اور دہلی بسکٹ فیکٹری بھی بن گئی تھیں یا بننے والی تھیں۔ ان بڑے بڑے کارخانوں کے قیام، اور ولایت کی بڑھتی ہوئی تجارت نے دلی کے مالدار لوگوں کو خوب فائدہ پہنچایا۔ اور وہ لکھ پتی اور کروڑپتی ہو گئے۔ لیکن دستی صنعت والے طبقے رفتہ رفتہ تباہ ہو گئے۔

پچاس برس پہلے دلی والوں کی عام صحت اب سے کہیں بہتر تھی۔ ہر محلہ اور گلی میں اکھاڑا تھا۔ ڈنٹ ہوتی تھی۔ ورزش جسمانی کا شوق تھا۔ گھروں میں مگدروں کی جوڑیاں اور مل ڈ بڑ عام طور سے نظر آتے تھے۔ کھانے پینے کی چیزوں کی فراوانی تھی۔ اور ہر چیز عمدہ اور تازہ ملتی تھی۔ گھی جو عنقا ہو گیا ہے دلی کے دیہات سے ایسا دانہ دار اور خالص آتا تھا کہ جاڑے کے موسم میں روکھا کھانے کو جی چاہتا تھا۔ روپیہ کا ڈیڑھ سیر ملتا تھا۔ دودھ ڈیڑھ آنہ فی سیر۔ سبز ترکاریاں بھی نہایت ارزاں تھیں اور میوہ بھی جن کے مہیا کرنے کے لئے دلی کی نواح کے باغ موجود تھے۔ آبادی اتنی گنجان نہیں تھی۔ میرے بچپن میں دلی شہر کی مردم شماری ایک لاکھ بارہ ہزار تھی۔ اور صدر، کشن گنج، سبزی منڈی۔ اور پہاڑ گنج کو ملا کر کل ڈیڑھ لاکھ۔ اتنے نفوس کی آبادی کے لحاظ سے صفائی کا انتظام برا نہیں تھا۔ اور تانگہ والوں کے گھوڑوں کی لید اور فضلے اور کوڑے کرکٹ کے انبار جو اب گلی کوچوں میں نظر آتے ہیں۔ اس وقت دیکھنے میں نہیں آتے تھے۔ نہ سہ منزلہ چو منزلہ عمارتوں نے مکانوں کو کبوتروں کی قلقل بنا دیا تھا۔ اور نہ ٹریموے سے دلی کے بازاروں کی وسعت سکڑی تھی۔ ذوق لطیف والے کے لئے چاندنی چوک کے قدیم بازار میں خاص دلکشی تھی۔ جس کے بیچ میں مسقف نہر تھی۔ اور دورویہ سایہ دار درخت تھے۔ ہندوستان میں یہ بازار اپنی وضع کا ایک ہی تھا۔ اور شاید دمشق اور حلب کے اسلامی ماثلہ کے قدیم بازاروں کے طرز پر بنایا گیا تھا۔ یورپ والوں نے اسلامی ممالک سے بازاروں کی اس وضع کو اپنے بڑے بڑے شہروں میں نقل کیا۔ اور فی زمانہ پیرس کے بولوا ہر (Boulevard) اس طرز کے بازار دنیا میں سب میں زیادہ خوبصورت ہیں۔ نئی دلی کے کنگز وے (Kingsway) کو بھی پیرس اور برسلیز کے بولواسروں کے طرز پر ترتیب دیا گیا ہے۔ مگر اس کو بدمذاقی کہئے یا ستم ظریفی کہ جو قدیم بازار دلی میں اس وضع کا موجود تھا اس کے سایہ دار درختوں اور نہر کو برباد کر کے ٹریموے کی لائنوں کیلئے گنجائش پیدا کی گئی۔

کسی شہر کی معاشی حالت دکھانے کیلئے میلوں اور تہواروں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جب لوگ مرفہ الحال ہوتے ہیں۔ اور کاروبار کا زور ہوتا ہے تو تفریح کی بھی سوجھتی ہے۔ دلی کے لوگ ہمیشہ سے سیلانی جیوڑے مشہور ہیں۔ اور یہاں کے متعلق یہ فقرہ بھی تقریباً ضرب المثل بن گیا ہے کہ دلی میں بارہ مہینے بارہ میلے۔ یعنی سارا سال تہواروں میں ہی گزرتا ہے۔ جو بڑی حد تک ٹھیک ہے۔ ابھی بہار کا موسم پورے طور پر شروع بھی نہیں ہوتا کہ بسنتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بسنت یوں ہندوؤں کا تہوار ہے لیکن مسلمان درویشوں اور شاعروں کی وسیع مشربی نے ان میلوں کو مزارات سے نسبت دیکر آپس کے میل جول اور دوستی اور یگانگت کا اچھا ذریعہ بنا دیا تھا۔ پہلی بسنت پہاڑوں پر اللہ میاں کے نام کی ہوتی تھی۔ اور پھر دلی کی مختلف درگاہوں پر۔ قطب صاحب سے لیکر سوئی والوں اور بھولو شاہ کے مزار تک جو کابلی دروازہ کے قریب واقع ہے۔ یہ میلہ زیادہ تر طوائفوں اور شوقین مزاجوں کا ہوتا تھا۔ اور بچے بھی کھلونوں، جھولوں اور مٹھائی کی خاطر پہنچ جاتے تھے۔ جس زمانہ کا میں حال لکھ رہا ہوں اس میں موٹروں، تانگوں اور گھوڑا گاڑیوں کا زیادہ رواج نہ تھا۔ طوائف بیل کے تانگوں میں بیٹھ کر

لہ ـ ان بزرگ کا صحیح نام شاید بوعلی شاہ ہو۔ لیکن فقراء بعض اوقات ایسے نام بھی رکھ لیتے ہیں۔

نکلی تھیں۔ ان تانگوں کی ساخت بے چھتری کے یکّے کی سی ہوتی تھی۔ لیکن ان میں خوبصورت بیلوں کی جوڑیاں جتی ہوتی تھیں۔ اور طوائف ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر ایک دلربایانہ انداز سے ان میں بیٹھتی تھیں۔ اور ہچکولوں کا مطلق خیال نہیں کرتی تھیں۔ میں نے چوٹی اور دوتی دونوں بہنوں کو جو ڈیرے دار طوائف تھیں اور اپنے زمانہ میں نہایت خوبصورت مشہور تھیں۔ چاوڑی بازار میں شام کے وقت ایسے تانگے میں نکلتا دیکھا ہے۔ تانگے کے ناگوری بیل جن کے سینگوں پر سنگوٹیاں اور گلے میں گھنٹیاں اور ہیکلیں پڑی ہوتی تھیں تانگہ کو لیکر بازار میں بڑے زور سے دوڑتے تھے۔ اور یہ دونوں بہنیں تانگہ میں شان سے بھی بیٹھی رہتی تھیں۔ جیسے کوئی شہسوار کسی تیز رو گھوڑے پر مطلق نہیں ہلتا۔ کچھ زمانے کے بعد میں نے نورجہاں کو ولایتی لینڈو میں جس میں آسٹریلین گھوڑوں کی جوڑی جتی ہوتی تھی چاوڑی بازار میں سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر کوئی دس برس بعد اسی بازار میں جمیا کو نفیس موٹر میں بیٹھے دیکھا۔ بعض لقہ پڑھنے والے شاید مجھ پر چیں بہ جبیں ہوں اور کہیں کہ میں طوائف کا کیا قصہ لیکر بیٹھ گیا لیکن جس زمانہ کا میں حال لکھ رہا ہوں اس وقت شرفا کا طوائف کے کوٹھوں پر اگر نشاط اور سرور کی خاطر نہیں تو کم از کم آداب مجلس اور لب ولہجہ درست کرنے کے لئے جانا روا سمجھا جاتا تھا۔

میں بسنتوں کا ذکر کر رہا تھا۔ ابھی ان کا سلسلہ ختم ہونے نہیں پاتا تھا کہ پھاگن کا مہینہ لگتے ہی جوان لڑکیاں ہولی کے گیت گانے شروع کر دیتی تھیں۔ اور ڈھولک کی آواز بڑی رات گئے تک سنائی دیتی تھی۔ آخری تین دن تو بے حد زور رہتا تھا۔ اور گلی کوچوں میں سے رنگ کی پچکاریوں سے بچ کر نکلنا محال ہوتا تھا۔ آجکل جو جھگڑے مذہبی تنگ نظری کی وجہ سے ہوجاتے ہیں وہ کبھی نہ ہوتے تھے۔ میں نے خود چھپی واڑے اور تیلی واڑے کے کٹڑے میں اپنے مدرسہ کے لڑکوں کے ساتھ رنگ کھیلا ہے۔ دولہنڈی کی شام کو کمپنی باغ میں بڑے زور کا میلا ہوتا تھا جس میں ہندو مسلمان یکساں شریک ہوتے تھے۔ اور آپس میں خلوص و محبت سے گلے ملتے تھے۔

گرمی کے موسم میں سوائے مسلمان تہواروں کے جو غیر معین وقت پر آتے ہیں اور جن کا میں بعد میں ذکر کروں گا۔ کوئی مشہور میلہ یا تہوار دلی میں نہیں ہوتا تھا۔ البتہ امیر لوگ اپنے ذاتی باغوں میں تفریح کیلئے چلے جاتے تھے۔ اور متوسط طبقہ اور پیشہ ور لوگ قطب صاحب، جوگ مایا، اوکھلے اور دلی کی مشہور تاریخی عمارتوں اور باغات میں سیر کیلئے جاتے تھے۔ ان کی ٹولیاں کی ٹولیاں ہمایوں کے مقبرے، صفدر جنگ اور شمسی تالاب پر نظر آتی تھیں۔ گرمی کے موسم میں فالیزوں پر بھی دعوتیں اور نارنج رنگ کے جلسے ہوجاتے تھے۔ جن میں زیادہ تر دلی کے صناع اور پیشہ ور لطف اٹھاتے تھے۔ برسات میں البتہ میلوں اور تہواروں دونوں کا زور ہوجاتا تھا۔ اوّل تو ساون آتے ہی گھر گھر جھولے پڑجاتے تھے اور ہنڈول اور ملہار گائے جانے لگتے تھے۔ سلونوں کا میلہ شاہدرہ کے شاہی باغ میں بڑے زور سے ہوتا تھا۔ ایک دفعہ میں بھی گیا تھا۔ اور مسیتی جان کا گانا یاد ہے۔ یہ دلی کی مشہور طوائف میں سے تھی شکل تو اچھی نہ تھی۔ لیکن گلا خدا نے عجیب دیا تھا۔ اسی وجہ سے ان کو حکیم واصل خاں کی مجلس میں خاص قرب حاصل ہوگیا تھا۔ سلونو بڑا پُر اثر تہوار ہے۔ بہن بھائیوں کے ہاتھ میں چمکتے ہوئے دست بند باندھتی ہے۔ جن کو راکھی کہتے ہیں۔ اور اس بندش سے اپنے رشتۂ الفت کو مضبوط کر کے انھیں اسیر بنا دیتی ہے بھائی جوش محبت سے بہنوں کو تحفے اور نقد رقم بطور ریگ دیتے ہیں۔

برسات میں جب جمنا خوب چڑھتی تھی تو تیراکی کا میلہ ہوتا تھا جوان تیراک دم اور تیزی میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کی خاطر مجنوں کے ٹیلے یا لوٹے ٹکنویں سے چلتے تھے اور فیروز شاہ کے کوٹلہ کے پاس آکر نکلتے تھے جہاں مسابقت کا فیصلہ کرنے والے ماہرین جمع رہتے تھے۔ پیراکی کے استاد کوٹلے پر اپنے فن کا کمال بھی دکھلاتے تھے۔ کوئی کھڑی لگاتا تھا، کوئی آلتی پالتی مارے صرف انگوٹھے کے ذریعے سے پانی کو چیرتا چلا جاتا تھا۔ شاید یہ میلے اب بھی ہوتے ہیں۔

برسات کا سب میں بڑا میلہ قطب میں ہوتا تھا۔ جس کو پھول والوں کی سیر کہتے تھے۔ یہ بھادوں کے آخر میں ہوتا تھا۔ اور اس میلہ میں دلی کی آبادی کا بڑا حصہ دو تین روز کیلئے شہر چھوڑ کر قطب چلا جاتا تھا۔ اور غریب امیر یکساں رنگ رلیاں مناتے تھے۔ میرے لائق دوست مرزا فرحت اللہ بیگ نے ایک مستقل مضمون اس میلہ کے متعلق لکھا ہے جو علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع ہوگیا ہے۔ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ بھادوں کے آخر میں بڑے بڑے مندروں میں سانجھیاں نکلتی تھیں۔ اور ساتھ ہی گانے اور ناچ کا انتظام ہوتا تھا۔ سانجھیوں کا مقصد تو مقدس تصویریں بنانا تھا لیکن اب

نقاشی کا فن بھی تازہ جان ہوجاتا تھا۔ اور صاحب کمال کو داد بھی مل جاتی تھی۔ لوگ جوق جوق ان سانجھیوں کو دیکھنے کیلئے نکلتے تھے اور گانے کی محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ آسوین کے مہینے میں جس کو دلی والے عام طور سے کوار کہتے ہیں دو بڑے ہندو تہوار آتے ہیں۔ ایک دسہرہ اور دوسرا دیوالی۔ یہ سارے ہندستان میں منائے جاتے ہیں۔ اور بمبئی کی دیوالی کی روشنی اور ریاست میسور کا دسہرے کا جلوس تزک و احتشام اور شان و شوکت میں سارے ملک میں مشہور ہیں۔ لیکن یہ دونوں تہوار دلی میں پچاس برس پہلے جس طرح منائے جاتے تھے اس کی نمایاں خصوصیت شہر کے باشندوں کی بے لوث مذہبی امنگ اور پُرخلوص عقیدت کا جوش تھا۔ جلوس اور مظاہرے جو رام لیلا کے نام سے موسوم ہیں اور جن کو کھلی فضا کا ناٹک سمجھنا چاہیے گیارہ دن تک جاری رہتے تھے اور دلی والے اور دلی کے مضافات کے باشندے بڑی کثرت سے تماشہ دیکھنے کیلئے جمع ہونے تھے۔ دسہرہ کے تین روز پہلے خلقت کا اژدحام بڑھ جاتا تھا۔ اور دسہرے کے روز تو کسن گنج میں اور تماشائیوں کے ریلوں اور دھکا پیل کا ٹھکانا نہیں رہتا تھا۔ لیلا کی واپسی شام کے وقت چاوڑی بازار میں ہوتی تھی۔ جہاں گھنٹوں پہلے سے گھاسن کے آنے کا انتظار رہتا تھا۔ اور لو تمر اور جوانوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ کر راستہ تقریباً بند ہوجاتا تھا۔ تماشائیوں میں ہندو مسلمان یکساں شریک ہوتے تھے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ رام لیلا کے اژدحام اور میلے کی عام رونق کی کیفیت کچھ ایسی محبوب تھی کہ مہینوں پہلے سے اس میلے اور تہوار کا مجھ کو اور میرے ہم عمر دوستوں کو انتظار رہتا تھا۔

دیوالی کے تہوار کی بھی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ اور ہمارے گھر میں تو ہندو دوستوں کے پاس سے مٹھائی کے اتنے تھال آتے تھے کہ دیگیں بھر جاتی تھیں۔ دیوالی کی روشنی کا مرکز دریبہ کا محلہ تھا جہاں گلاب گندی کی دکان شاندار جھاڑوں اور رنگ برنگ کی ہانڈیوں سے سجائی جاتی تھی۔ پوجا کے لئے کھلونے بھی بکتے تھے جن میں کرشن جی اور گوالنوں کی مورتیوں کی خوب بکری ہوتی تھی۔ لیکن غازی کمہار کی دوکان پر ہر سال شہر کے کسی عہدہ دار کی شبیہ بھی بنائی جاتی تھی۔ مجھے سینڈھے خاں کوتوال اور نجم الدین تحصیلدار کی مورتیں خوب یاد ہیں۔ جن کی بہت تعریف ہوئی تھی۔ اور کثرت سے فروخت ہوئیں۔ غازی کمہار کا خاندان کھلونے بنانے میں مشہور تھا۔ اور اس کے کھلونے یورپ کی نمائشوں میں بھی جاتے تھے۔

مسلمان تہواروں میں محرم کی مجلسیں نہایت احترام اور مذہبی جوش سے منعقد ہوتی تھیں۔ اور مہندی کے جلوس بھی بڑے کرّ و فر سے نکلتے تھے سبیلوں کا سلسلہ محلّہ در محلّہ ہوتا تھا۔ اور بڑے بازاروں میں تو ان کی آرائش دیکھنے کے قابل ہوتی تھی اعظم خاں کی حویلی میں عبدالرحمٰن رنگساز براق کی تصویر بناتا تھا۔ اور تمام شہر کے معزز لوگوں کو گھر پر جاکر دعوت دیتا تھا۔ کہ وہ آکر

---

1. رام لیلا کے ہی موقع پر ٹیسو اور جھانجھیاں نکلتی تھیں۔ ٹیسو ایسے حلال خور جن کو پہلوانی کا شوق ہوتا تھا اور کسی مشہور اکھاڑے سے بھی تعلق رکھتے تھے نکالتے تھے۔ اور جھانجھیاں ان کی بیویاں۔ خود ٹیسو تو ایک سپاہی کی مورت ہوتی تھی۔ مونچھیں چڑھی ہوئی۔ ٹھڑکی دار پگڑی سر پر۔ مورت کا صرف اوپر کا آدھا دھڑ ہوتا تھا جس کو تین بانسوں کی ایک ٹکٹی پر جما دیتے تھے۔ ٹیسو کے جلوس والے ماہیاں بناتے تھے۔ یا لی شہر کے کسی تازہ واقعہ کا منظوم قصہ ہوتا تھا۔ جس کو یہ لوگ ایسے جذبات کے لحاظ سے تیار کرتے تھے۔ میرے بچپن میں نذیر جان طوائف کا قتل ہوگیا تھا۔ ٹیسو والوں نے اس کی ما

ہیا بنائی تھی۔ جس میں عشقیہ اور رزمیہ دونوں رنگ موجود تھے۔ اگر ایک اکھاڑے کے ٹیسو والوں کی دوسرے اکھاڑے کے ٹیسو والوں سے راستے میں مڈبھیڑ ہوجاتی تھی تو اکثر لاٹھی چل جاتی تھی۔ ایسے جملے ان کے ورد زبان تھے "ٹیسو ہے تیلیو والوں کا۔ جبڑا توڑے گودی شاہ والوں کا" جھانجھی مٹی کی ایک ہانڈی ہوتی تھی۔ جس کے اندر نوک دار آلوں سے چھید کردیئے جاتے تھے۔ اور بعض اوقات پھول بھی بنائے جاتے تھے۔ حلال خوریاں ان ہانڈیوں میں مٹی کے چراغ روشن کرکے گھر گھر انعام مانگتی پھرتی تھیں۔ جھانجھیوں کے گیت بندھے ہوئے تھے۔ جن میں گھر کی بہو بیٹیوں کا نام داخل کرکے "اونچی اڑیوں" کا ذکر ہوتا تھا۔ اور آخر میں "اسیس" مانگی جاتی تھی۔ ٹیسو والے جھانجھی کے دشمن ہوتے تھے۔ اور اگر راستے میں دیکھ لیتے تھے تو پتھر مار کر جھانجھی کو پھوڑ دیتے تھے۔

اس کے کمال کو دیکھیں۔ دلی کے زنگسازوں میں شاید اس فن کا وہ آخری استاد تھا۔ اور جب غدر کے بعد دیوان خاص کی چھت کے سنہری کام کی درستی ہوئی تھی تو وہ کام عبدالرحمٰن نے ہی کیا تھا۔ عام طور سے وہ استاد عبّو کے نام سے مشہور تھا۔ ساتویں کو مہندی کا جلوس چتلے دروازے سے لمبے وزیر کے ہاں سے نکلتا تھا۔ اور نویں کو تعزیئے گشت لگاتے تھے۔ خالسا ماں کا تعزیہ موری دروازے سے اور فوج والوں کا دریا گنج سے آتا تھا۔ اور قاضی کے حوض پر دونوں کا ملاپ ہوتا تھا۔ خالسا ماں کے تعزیے کو اس کی بلندی کے لحاظ سے دلی والے نو گزا کہا کرتے تھے۔ تعزیوں کے بنانے میں بھی صنعت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ اور شہزادوں کے تعزیے کی نفیس گلی زرانی بہت خراج تحسین حاصل کرتی تھی۔ قاضی کے حوض پر سب چھوٹے بڑے تعزیئے رات کے ساڑھے گیارہ بارہ بجے تک جمع ہو جاتے تھے۔ اور پھر جامع مسجد کی طرف جاتے تھے۔ جہاں لالہ بھڑبوبجے کی دکان کے سامنے بجرا چھٹتا تھا۔ یہ لال کاغذ سے منڈھا ہوتا تھا۔ اور اور کھمبیوں اور بانسوں کے ڈھانچ میں گولے اور پٹاخے لگتے جاتے تھے۔ جن کی آواز اور گرج فضا میں دیر تک رہتی تھی۔ بڑے تعزیوں کے آگے پٹہ بازوں لیزم برداروں اور بنیٹی پھرانے والوں کی جماعتیں بھی ہوتی تھیں۔ جو مہینوں پہلے سے اپنے اپنے فن کی مشق کرتی تھیں۔ اور تاک میں رہتی تھیں کہ کس طرح دوسری ٹکڑی کے حریف کو نیچا دکھائیں تعزیوں کے ساتھ پیشہ ور مرثیہ خوانوں اور سوز خوانوں کے علاوہ بعض خوش گلو محض عقیدت سے بھی پڑھتے تھے۔ اور جس زمانہ کا میں حال لکھ رہا ہوں اس وقت صاحب عالم مرزا محمد شجاع کی مرثیہ خوانی بہت مشہور تھی۔ یہ شہزادوں کے تعزیے کے ساتھ برہنہ سر، برہنہ پا، سینہ چاک رہتے تھے۔ اور اس درد سے پڑھتے تھے کہ سننے والوں کے دل شق ہوتے تھے۔ بڑا تو صاحب عالم کی خوش گلوئی کا اثر تھا۔ اور پھر مذہبی جوش اور عقیدت کا۔ جب یہ چاوڑی بازار میں پہنچتا تھا طوائف کوٹھوں پر سے اتر کر ساتھ ہو جاتی تھیں۔ اب بھی دلی میں محرم اسی خلوص اور مذہبی عقیدت سے ہوتا ہوگا لیکن لمبے وزیر، خالسا ماں اور صاحب مرزا محمد شجاع کہاں*۔

دونوں عیدیں بڑے زور سے منائی جاتی تھیں۔ اور ان کے بعد جوڑ کے میلے محلہ ارخاں اور حکیم عبدالمجید خاں کے باغ میں ہوتے تھے ان میں صناع اور کاریگر لوگوں کی خوشی اور انبساط کی کوئی حد نہیں رہتی تھی۔ ان موقعوں پر شہر کے ہندو مسلمان آپس میں بغل گیر ہوتے تھے۔ اور ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے تھے۔ اگر کسی فریق میں جھگڑا بھی ہو جاتا تھا تو ایسے تہواروں پر پان اور الائچی کی تواضع اور پھولوں کے ہاروں کی مدارات سے رفع ہو جاتا تھا۔ نزاعوں کے طے کرنے میں حکیم محمد خاں اور چھنامل والوں کا خاندان ہمیشہ نمایاں خدمات انجام دیتا تھا۔

شب رات کا تہوار بچوں کیلئے بیشک خطرناک تھا۔ اور ہر سال ایک دو بچے آتشبازی کی نذر ہو جاتے تھے۔ کیونکہ پوٹاس کے گولے ہر محلہ میں بچے بناتے تھے۔ اور وہ خطرے کو بالکل نہ سمجھتے تھے۔ نالس بھی بعض اوقات عمدہ لوہے کی نہیں ہوتی تھیں۔ اور بارود زیادہ بھرنے سے پھٹ جاتی تھیں۔ آتشبازی کی صنعت دلی میں اب باقی نہیں رہی ہے۔ ورنہ براتوں میں انار اور مہتابیوں کا ایسا زور ہوتا تھا کہ فضا روشنی اور رنگ برنگ کے پھولوں سے جگمگا جاتی تھی۔ میرے ہمیشہ کے رفیق اور گھر کے دوست مرزا فرحت اللہ بیگ بھی اپنی نانی کے ہاں سے جو فراش خانہ میں رہتی تھیں اُڑن انار بنانے کی ترکیب سیکھ آئے تھے۔ اور شب برات کے دنوں میں سامان جیبوں میں بھرا رہتا تھا۔ اور دوستوں کو خوش کرنے یا ان پر رعب جمانے کیلئے شام کو تو کیا دن کو بھی انار اُڑائے جاتے تھے۔ یہ حضرت سگریٹ کے ٹین میں چھید کر کے اور اس میں بارود بھر کر اس کو بھی اُڑاتے تھے۔ آواز نال سے تو کم لیکن پوٹاس کے گولوں کے برابر ہوتی تھی۔

---

* دلی کی مشہور گانے والی کالی جان نے آخر میں توبہ کر کے صاحب عالم سے شادی کر لی تھی۔ کالی جان کے ریکارڈ ایک زمانہ میں بہت مقبول تھے۔ یہ ڈیرہ دار طوائف میں سے تھیں اور امیر جان پانی پت والوں سے قریبی خاندانی تعلق تھا۔ پچاس برس پہلے کی دلی میں امیر جان کے گانے کی بھی بڑی دھوم تھی۔ آواز نہایت رسیلی اور پاٹ دار تھی۔ اور محفل پر چھا جاتی تھیں۔ اب سنتے ہیں بی مجیدن جو اسی خاندان سے ہیں اپنی نانی پرنانی کی روایات کو نبھا رہی ہیں۔

مسلمانوں کے مذہبی میلوں میں دونوں سترھویاں اور قدم شریف کا ربیع الاول کے مہینے کا ختم بھی خلقت کے اجتماع کے لحاظ سے حالے پُر رونق ہوتے تھے لیکن سترھویں کا لطف سُنا ہے سیر تماشے کے لحاظ سے اب کم ہوگیا ہے۔ فسق اور فجور بری چیز ہے۔ اور اس کا ضرور انسداد ہونا چاہیے لیکن مذہبی فروعی باتوں کیلئے پابندیاں قائم کرنے میں ایسی وسیع مشربی برتنی چاہیے جس سے امنگ مردہ نہ ہو۔ کیونکہ جب کسی قوم کی امنگ تباہ ہو جاتی ہے تو وہ قوم بھی تباہ ہو جاتی ہے۔ قدم شریف کے ختم کا ذکر میں شاہ محمد عمر صاحب کے حالات میں ضمناً کر چکا ہوں۔ اس لئے میں دوہرانا مناسب نہیں سمجھتا۔ البتہ ختم کے زمانے میں ربیع الاول کی شروع تاریخوں سے قلندر دلی کے دیہات اور باہر شہروں سے آنے لگتے تھے۔ ان کے سر پر کلاہ اور بدن پر لمبا جبہ ہوتا تھا۔ دلی والے ان کو ملنگ کہتے تھے۔ یہ گھر گھر دھم قلندر، دودھ ملیدا، اللہی دیگا۔ کی صدائیں لگاتے ہوئے پہنچتے تھے۔ اور بڑے تحکم سے چاندی کا چراغا مانگتے تھے۔ اور کوئی پس و پیش کرتا تھا تو یہ قلندر دار کو دیتے رہتے تھے۔ اور صدا کے ساتھ یہ جملہ چاندی کا چراغا اللہی دگیا دہراتے رہتے تھے۔

اس زمانہ کی بڑی بوڑھیوں کا یہ خیال تھا کہ دلی بائیس خواجہ کی چوکھٹ ہے۔ اور ربیع الاول کے مہینے میں بہت سے بزرگ اس بھیس میں دلی آتے ہیں۔ اور یہیں سے قطب، ابدال بنتے ہیں۔ اس لئے ان قلندروں کے سوال کو ہرگز نہ ٹالنا چاہیے۔ جو مانگیں وہ دینا چاہیئے۔ بڑی بوڑھیوں کا یہ خیال بالکل ٹھیک ہوگا۔ لیکن ہم ظاہر بینوں نے تو ان حضرات کو سارے دن کی کمائی کے بعد قدم شریف کے تکیوں میں جہاں یہ آکر اُترا کرتے تھے۔ شام کے وقت بھنگ کے پیالے پیا

---

۱ دلی کے تحکم سے مانگنے والے فقیروں میں جٹادار ہندو سادھو اور مسلمان عقیدے کے مچھڑے بھی میرے بچپن میں کثرت سے نظر آتے تھے۔ سادھو تک دھڑنگ فقط عرق لگائے سارے بدن پر بھبوت ملے ہاتھ میں لوہے کا بڑا چمٹا لئے آن دھمکتے تھے اور گانجے کے نشے سے بار اکھروغیرہ ملنے سے ان کی آنکھیں دہکتے ہوئے انگارے کی طرح چمکتی تھیں۔ عورتیں اور بچے ان سے ڈر جاتے تھے۔ اور جو سادھو جی مانگتے تھے وہ پیش کیا جاتا تھا۔ مچھڑوں کی صدائیں اور افعال زیادہ دلچسپ تھے۔ ان کے بال لمبے لمبے، ایک ہاتھ میں لوہے کی چوڑیاں اور چھوٹا سا لکڑی کا ڈنڈا۔ گلے میں جھولی جس میں لوہے کے سوئے، چھریاں اور اسی قسم کی جارحانہ چیزیں ہوتی تھیں۔ اکثر ٹولیوں میں نکلتے تھے۔ نظیر کا کلام لوہے کی چوڑیوں کی جھنکار کے ساتھ پڑھتے تھے۔ زیادہ تر یہ نظم دنیا کی بے ثباتی پر بہت پڑھی جاتی تھی۔

"آیا تھا ٹھی ددر سے اک ہنس بیچارا"

یہ مصرعہ سنانے کے بعد اگر دکاندار بخیل ہوا اور ان کو خاطر خواہ

۴ نذرانہ نہیں دیا تو یہ حضرت بے تکلف سُوا اپنے حلقوم کے پاس کے گوشت میں ٹھونک کر آر پار کر لیتے تھے یا ہتھیلی کے دونوں طرف نکال دیتے تھے۔ اور جب تک دکاندار خطادار کی طرح ان کو خوش نہ کر دیتا تھا یہ وہاں سے نہ ٹلتے تھے۔

قدیم دلی کے فقیروں میں حمروں کی جماعت بھی قابل ذکر ہے۔ یہ غالباً تکیوں کے فقیروں کی بیبیاں ہوتی تھیں۔ کیونکہ یہ اکثر قدم شریف کے راستے پر یا حضرت نظام الدینؒ کی سڑک پر یا قطب صاحب کے راستے میں پہاڑ گنج کے قریب ملتی تھیں۔ اور ان سب مقامات پر تکیوں کی کثرت تھی۔ یہ بھی بہت لیچڑ ہوتی تھیں اور بغیر پیسہ لئے پیچھا نہ چھوڑتی تھیں۔ سوال کا طریقہ ایک قسم کی ریں ریں ہوتا تھا جس کا نہ کوئی تال نہ سُر۔ اور اس میں ایسے فقرے "تیرے بٹوے میں پیسہ دھرا ہے دھرا ہے" سننے والے کو ہنسا دیتے تھے۔ حمرے کا لفظ خمر بمعنی نشہ سے غالباً مشتق ہے خمرے اردو زبان میں اوباشوں کو کہا جاتا تھا۔ اب بھی مسلمان شادیوں میں شہدے اور خمرے شاید آتے ہیں۔ نکاح کے ختم کے بعد بھی انکی دعا کا یہ جملہ "الہیٰ دولھا ست پوتا ہو" میرے کانوں میں بسا ہوا ہے۔

ان کا کام انعام مانگنے کے علاوہ جہیز کے سامان کا دلہن والوں کے گھر سے دولھا والوں کے مکان تک پہنچانا بھی تھا۔ عام ان کا شہدا یا خمرا ہو لیکن یہ ایسے امین تھے کہ سامان سپرد ہونے کے بعد ایک چیز ادھر سے ادھر نہ ہوتی تھی۔ ورنہ شادیوں کی ہڑبونگ اور بے ہنگامی سب کو معلوم ہے۔

وہ منی، چڑھاتے ہوئے یا گا بجے اور چرس کے دم لگاتے دیکھا ہے۔

پچاس برس پہلے کی دلی کی جو تصویر میں نے آپکے سامنے پیش کی ہے ممکن ہے اس میں بعض ضروری خدوخال چھوٹ گئے ہوں۔ اور وہ کمی کوئی صاحب ذوق مشن ادیب پوری کر دے۔ دلی صدیوں سے آباد ہے۔ اور کئی چولے بدل چکی ہے لیکن ہر چولے میں ذہانت، اولوالعزمی اور نیک نفسی اس کا شعار رہے ہیں۔ اس کی طینت میں جذب کرنیکی خاص صلاحیت ہے۔ باہر سے علما اور اہل کمال آئے۔ اور اس نے ان کو اپنا لیا۔ اس صدی میں بھی ڈاکٹر انصاری اور محمد علی آئے اور لیڈر بن گئے۔ وقت کے چکر سے بعض ٹیڑھے خاں بھی برسر اقتدار ہو جاتے ہیں۔ لیکن دلی تھوڑے عرصہ میں ان کو جنتری کے تار کی طرح سیدھا کر دیتی ہے۔ اس شہر کا شعور زمانہ کے رنگ کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ جب سیاسی فضا ہوئی تو ہر دیال کو پیدا کر دیا۔ لیکن اس سپوت کو ساری عمر جلاوطنی میں یورپ میں گزارنی پڑی۔ اور زیادہ کڑی آزمائش کی ضرورت ہوئی تو امیر چند اور اودبہاری ہنستے ہوئے پھانسی پر چڑھ گئے۔ آجکل اقتصادی ترقی اور سائنس کی رہنمائی کی ضرورت ہے سر سری رام اور سر شانتی بھٹناگر پیدا ہو گئے ہیں۔ اور ویسے ہی باکمال پیدا ہو جائیں گے۔

کروٹیں بدلا کریگا یونہی دورِ آسماں
رات دن بنتے بگڑتے ہی رہینگے یہ نشاں

ہمسر کعبہ تجھے سمجھیں اسی قابل ہے تو
نام ہے دلی ترا ہندوستاں کا دل ہے تو

گھونگھٹ میں گوری جلے

کرشن چندر کے چودہ طنزیہ مضامین، افسانوں اور ڈراموں کا تازہ مجموعہ۔ مجلد معہ دلکش سرورق قیمت ایکروپیہ بارہ آنہ

ساقی بکڈپو دہلی سے طلب فرمائیے

دعوتِ سجدہ

رقص میں ماہ و آفتاب
گرم نشاط آسماں
وجد میں شامِ پُرسکوں
صبح بہار گل فشاں
فرش سے لیکے عرش تک
جھوم رہی ہیں مستیاں
کس کے حضور میں اخترؔ زمزمہ خواں ہے کائنات

(۲)

شوق سے گردنِ فلک
سجدہ میں ہے جھکی ہوئی
جوشِ نیاز سے زمیں
قدموں میں ہے بچھی ہوئی
اے دلِ بیخبر اب تجھے
کچھ بھی نہ آگہی ہوئی
سر بسجود تو بھی ہو سجدہ کناں ہے کائنات"

—— اختر صہبائی

ہر فرعونے را موسیٰ

(۱)

نغمۂ روحِ مطمئن بن گیا نالۂ جرس

زندہ دلانِ حق طلب گرمِ سفر ہیں پیش و پس   قصرِ "خدائے مصر" میں آئے کلیمِ خوش نفس

سب جسے معجزہ کہیں ان کی زباں میں ہے وہ جس   آنکھ میں اک نیا اثر بات میں ایک عجیب رس

جاہ کی بھی نہیں طمع، مال کی بھی نہیں ہوس

(۲)

عزمِ کلیم سے جلا یادِ کلیم پا گئی

راہِ نجات خود بخود سامنے سب کے آ گئی   چشمِ کلیمِ حق نگر خاص سبق پڑھا گئی

"غاصبِ حق" کے قصر کو سیل کی طرح ڈھا گئی   ہاں یہ نگاہِ نکتہ رس کون و مکاں پہ چھا گئی

کیسے کوئی سمیٹ لے ذوقِ نگاہِ نکتہ رس

(۳)

مالکِ تاج و تخت ہے صورتِ سرو پا بہ گل

مثلِ کلیم خاک ہو اس کا مزاج معتدل   اور بھی اس کو کر دیا تنگ دلی نے منفعل

روح خجل، زباں خجل، قلب خجل، نظر خجل   جلوۂ نگہِ کلیم سے آنکھ ملائے کور دل!

حسرتِ دیدۂ کم نظر، گوہرِ اشک و بوالہوس!!

(۴)

قدر کرے کلیم کی سرکشِ یکہ تاز کیا

قلبِ "سیہ دروں" میں ہو عظمتِ پاکباز کیا   داد حقیقتوں کی دے معتقدِ مجاز کیا

جاہلِ تنگدل کرے سیرِ جہانِ راز کیا   مردِ خدا کا ساتھ دے فردِ زمانہ ساز کیا

خوش ہمہ داں سے کیوں رہے ہیچمدان و ہیچ کس

(۵)

اب تو "خدائے مصر" کی موت کا راز سمجھئے

سیلِ فنا کی رَو میں کیا "غاصبِ فتنہ گر" سبھی   منعمِ زر پرست نے پیش جو ضابطے کئے

ان کو جلا کے آپ نے باغ کئی لگا دیئے   خاص فضا نہ ہو اگر خاص نگاہ کیلئے

ہے یہ متاعِ گلکدہ عام روش میں خار و خس

سیّد علی منظور

مرزا فرحت اللہ بیگ

لاحول ولا

نام تو ان کا نبی اللہ خاں تھا مگر اپنے تخلص کی وجہ سے یہ مولانا وحشی کہلانے لگے۔ اور اس تخلص نے وہ رور پکڑا کہ لوگ ان کے اصلی نام کو بھول گئے۔ ہر مشاعرے میں پہنچتے اور دو غزلہ سہ غزلہ پڑھتے اور بڑے زوروں سے پڑھتے۔ شاگرد بھی بہت سے ہوگئے تھے۔ اس لئے دنیا کا کچھ کام کرنے کو وقت بہت کم ملتا تھا۔ اور جو کچھ وقت ملتا تھا وہ یہ ریاضت اور عبادت میں صرف کر ڈالتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص میں یہ دو صفتیں جمع ہو جائیں وہ بھلا دنیا کے کس کام کا رہتا ہے۔ اور دنیا کا کام نہ کرے تو گذارہ کیسے ہو۔ شاگردوں سے تو کچھ ملنے کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ ہاں پیری مریدی میں بہت کچھ مل سکتا ہے بشرطیکہ روپیہ گھسیٹنے کی صلاحیت ہو۔ انھوں نے کوشش بھی کی کہ کچھ روپے پیسے والوں کو مرید کریں مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اور کامیابی بھی کیسے ہوتی جب مرشد کیلئے کسی قدر پولیٹیکل ہونا بھی ایک لازمی چیز ہے۔ اور یہ ٹھیرے محض ایک کٹ حجت شاعر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کھانے پینے کا خرچ نکلنا مشکل ہوگیا۔ خیر یوں بھی کسی نہ کسی طرح گھسٹ ہی جاتی۔ مگر ریاضت کی گرمی نے شادی پر مجبور کیا اور ان کے گلے میں "سنت پیمبر" پڑگئی۔

یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ ایک اور ایک دو ہوتے ہیں۔ میاں اور بیوی مل کر دو آدمیوں کے برابر ہونے چاہئیں۔ یہاں بھی یہی صورت پیش آئی۔ یہ تو تھے سوکھے سہمے آدمی۔ اور بیوی ملیں "ڈبل روٹی" اور اس طرح ان دونوں کی جسامت نے مل کر اصول بالا کی تکمیل کر دی۔ خدا معلوم یہ کیا بات ہے کہ ہمیشہ مفلسی میں آٹا گیلا ہوتا ہے۔ بھلا مولانا وحشی اس کلیہ سے کیسے بچتے۔ ایک سے دو ہوئے، پھر دو سے تین۔ اور بڑھتے بڑھتے ایک سے چھ ہوگئے۔ موٹی بیوی کی آواز ہمیشہ کرخت اونچی ہوتی ہے۔ اور ہونی بھی چاہیئے۔ کیونکہ پیٹ کا ہیر پھیر گنبد کی گونج کا کام دیتا ہے۔ اس لئے تھوڑے ہی دنوں میں محلہ والوں پر ان کے گھر کا رنگ کھل گیا۔ اور کھانا پینا تو رہا ایک طرف خود ان کی شاعری اور ریاضت پر اثر پڑنے لگا۔ آخر تنگ آکر انھوں نے اللہ میاں کو "الٹی میٹم" دینے کی ٹھان لی۔ پہلے تو انھوں نے سوچا کہ اللہ میاں سے لڑائی مول لینی ٹھیک نہیں ہے لیکن جب گھروالی کی زیادتیوں نے ان کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیئے تو انھوں نے بھی پکا ارادہ کر لیا کہ اب جو ہو سو ہو اللہ میاں کو ایک آخری موقع دیکر ان سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ چنانچہ ایک دن تہجد کی نماز پڑھنے کے بعد انھوں نے دعا کو دونوں ہاتھ اٹھائے اور کہا کہ "دیکھئے اللہ میاں ہماری اور آپکی اس طرح نبھنی مشکل ہے۔ اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو ہمارے رزق کا دروازہ کھولئے یا ان بیوی بچوں سے ہم کو نجات دلوائیے۔ ورنہ سمجھ لیجئے کہ کل رات کے بارہ بجے سے ہماری اور آپ کی القطع ہے۔"

اللہ میاں کے کارخانوں کو سمجھنا ذرا مشکل کام ہے۔ جب جی چاہتا ہے وہ لعیر مانگے گھر بھر دیتے ہیں۔ اور جی نہیں چاہتا تو کتنی ہی ناک رگڑو۔ ایک پیسہ نہیں دیتے۔ اب رہا بیوی بچوں کو ٹھکانے لگانا تو اللہ میاں سے یہ کیا امید ہو سکتی ہے کہ وہ محض ایک آدمی کے کہنے سے پوری پانچ جانوں کا خاتمہ بالخیر کر دینگے۔ اس لئے مولانا وحشی کی اس ناواجبی دعا کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اور دوسرے دن ٹن ٹن کرکے رات کے بارہ بج گئے۔ یہ بھی دھن کے پکے تھے۔ مصلیٰ اٹھا کر ایک طرف پھینکا۔ اور ایک ایسی ہستی کی طرف رجوع ہوئے جو اپنے آپ کو اللہ میاں کا مدمقابل سمجھتی ہے۔ اور نہایت خشوع و خضوع سے کہا کہ "اے معلم الملکوت اب تیرے سوا میرا کوئی آسرا نہیں ہے۔ جس در سے بہت کچھ امید ہے اس نے اپنے در سے خالی ہاتھ واپس کیا۔ تو میری مدد فرما اور میری باقی عمر آرام سے گذار دے میں اپنی یہ ناچیز ہستی اب تیرے سپرد کرتا ہوں۔ اگر تو نے بھی مدد نہیں کی تو میں سمجھوں گا کہ دنیا میں غریبوں کا کوئی نہیں ہے"

ان کا یہ کہنا تھا کہ گھر میں گندھک کا سا دھواں بھر گیا۔ اب یہ کیا دیکھتے ہیں کہ جو ہاتھ انھوں نے دعا کیلئے اٹھائے تھے ان کی بائیں ہتھیلی پر کوئی دو تین انچ اونچا ایک آدمی کھڑا ہے۔ لمبا

چہرہ ہے۔ بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ فرنچ فیشن ڈاڑھی ہے سر پر دو سینگ ہیں۔ پاؤں کے بجائے کھُر ہیں۔ پیچھے ایک لمبی سی دُم ہے۔ گہرا سُرخ رنگ ہے اور سیاہ لباس پہنے انھوں نے گھبرا کر ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ مگر وہ شخص جس طرح انکی ہتیلی پر جما ہوا تھا اسی طرح چپکا رہا۔ اور کہنے لگا "مولانا! یا تو مجھے اس جوش سے بلایا تھا یا اب اس طرح مجھے دُور کرنیکی فکر کر رہے ہو" انھوں نے کہا کہ "آپ ہیں کون؟" اس نے کہا کہ "میں وہی ہوں جس کو آپ یاد کر رہے تھے۔ اور جس کی مدد کے آپ طالب تھے" انھوں نے کہا "تو آپ شیطان ہیں" اس نے کہا کہ "جی ہاں۔ پہلے میں معلم الملکوت تھا اور اب معلم الانسان ہوں۔ لیکن دنیا والے میرے تخلص کے لحاظ سے مجھے شیطان کہنے لگے ہیں۔ فرمائیے کہ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں" شیطان یہیں تک کہنے پایا تھا کہ مولانا وحشی کی زوجہ محترمہ نے کوٹھی میں سے آواز دی کہ "یہ کس سے باتیں ہو رہی ہیں" انھوں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اب کیا تھا ان کی بیگم صاحبہ آپے سے باہر ہو گئیں۔ اور ایسے شائستہ الفاظ میں گفتگو کی کہ مولانا تو رہے ایک طرف خود شیطان نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اتنے میں ایک چھوٹا بچہ اٹھ کر رونے لگا۔ بیگم صاحبہ نے اس کی "دھم کٹی" شروع کی۔ اس گڑبڑ سے دوسرے بچوں کی آنکھ بھی کھل گئی۔ اور اب شور قیامت بپا ہو گیا۔ یہ دیکھکر شیطان نے کہا "مولانا۔ جب آپ کے گھر میں آپ کی بیوی جیسی ہستی موجود ہے تو مجھ کو یاد کرنے کی کیا ضرورت تھی" اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ "لوہا لوہے سے کٹتا ہے" یہ جواب ایسا معقول تھا کہ شیطان کو بھی قائل ہونا پڑا۔ اور اس نے کہا تو "ہاں فرمائیے کہ آپکی کیا خواہش ہے۔ اس وقت میں آپ کی صرف ایک خواہش پوری کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد کل اسی وقت حاضر ہوں گا۔ اور آپس کے طرزِ عمل سے متعلق آپ سے باقاعدہ معاہدہ ہو جائیگا" چونکہ بیوی کی "صورِ اسرافیلی" آواز سے یہ بہت پریشان تھے۔ اس لئے انھوں نے کہا کہ "میری پہلی خواہش تو یہ ہے کہ آئندہ اس عورت کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچے" شیطان نے کہا "منظور" اور یہ کہکر ہتیلی پر سے غائب ہو گیا۔

اب صبح کی سنئے۔ کوئی دس بجے جو مولانا کی بیگم صاحبہ اٹھیں تو حسب عادت ان کو آواز دی۔ یہ آواز گو بہت اونچی تھی لیکن مولانا وحشی تک نہیں گئی۔ بلکہ ہونٹوں ہی میں چکر کھا کر رہ گئی۔ بیوی نے دوسری آواز دی اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ یہ دیکھ کر وہ عورت تو آگ بگولا ہو گئی۔ ہزاروں صلواتیں سنائیں۔ مگر وہ بھی مولانا تک نہ پہنچیں۔ اگر پہنچتیں تو ضرور کچھ نہ کچھ جواب دیتے۔ اب کیا تھا بیگم صاحبہ اٹھیں اور سیدھی ان کے پاس پہنچیں۔ وہاں پہنچ کر بہت اونچی آوازیں ان سے بہت کچھ کہا۔ مگر ظاہر ہے کہ جو بات سُنی نہ جائے اس کا جواب کیا دیا جائے۔ انھوں نے کہا بھی تو یہی کہا کہ "تم کچھ بولتی تو ہو نہیں اور یونہی منہ چلائے چلی جا رہی ہو" بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ بیگم صاحبہ کے متعلق "منہ چلانے" کا رکیک محاورہ استعمال کیا جاتا اور وہ خاموش رہتیں۔ اس لئے انھوں نے باورچی خانہ کا رُخ کیا۔ اور وہاں سے وہ سلاحِ مہلک لیکر آئیں۔ جو دراصل تو بانس کی پوری ہے مگر اصطلاحِ عام میں اس کو پھکنی کہا جاتا ہے۔ اور جو عموماً آگ جلانے اور بعض دفعہ ضربِ شدید پہنچانے کے کام آتی ہے۔ ایک دو ہی ہاتھ پڑے تھے کہ بیوی کی آواز ان کی حد تک تو بیٹھی تھی مگر خود ان کی آواز پوری طرح کھل گئی۔ بیوی کی گل فشانی، میاں کی "دہائی۔ تہائی" اور بچوں کے رونے دھونے نے گھر میں ایک میلہ کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ جب یہ اودھم حد سے زیادہ بڑھ گیا تو پڑوسی ہمسائی نے اپنی ماما کو حالات معلوم کرنے کیلئے بھیجا۔ اس نے آکر بیوی کا ہاتھ پکڑا اور وجہ پوچھی۔ انھوں نے کہا "یہ مردوا کل سے میری بات کا جواب نہیں دیتا" ماما نے کہا "میاں آخر یہ تو بتائیے کہ آپ ان کی بات کا جواب کیوں نہیں دیتے" مولانا وحشی نے کہا "بوا۔ جواب کیا دوں۔ یہ کچھ بولتی ہوں تو جواب دوں" یہ سن کر بیوی تو آگ بگولا ہو گئیں۔ اور کہنے لگیں "دیکھا بوا۔ دیکھا تم نے۔ موا کہتا ہے کہ یہ کچھ بولیں تو جواب دوں۔ اب تم ہی دیکھو۔ میں بول رہی ہوں یا نہیں" ماما نے کہا۔ "میاں یہ سچ تو کہتی ہیں" میاں نے کہا "تم تو خاصی طرح بول رہی ہو مگر ان کے صرف ہونٹ ہلتے ہیں۔ آواز تو خاک

دوسرے دن وقت مقررہ پر مسٹر شیطان نازل ہوئے مولانا اس وقت تک جاگ رہے تھے اور طرح طرح کے منصوبے دل میں گانٹھ رہے تھے "آداب عرض" ہے کی آواز پر اٹھ بیٹھے اور کہا۔

یہ: میں نے آج ایک ایسی ترکیب نکالی ہے کہ جس سے بھی اس روز روز کے مانگنے کی مصیبت سے بچ جاؤں گا اور تمہاری بھی کچھ مدد کرسکوں گا۔

شیطان: مولانا آخر ہم بھی تو سُنیں کہ وہ کیسی ترکیب ہے۔

یہ: ترکیب یہ ہے کہ اخبار نکالا جائے اور اپنا پروپیگنڈا کیا جائے کیونکہ آجکل پروپیگنڈا کرنے سے آدمی ایک مفلس لکھ پتی بن سکتا ہے۔ مگر اخبار نکالنے کیلئے پیسے کی ضرورت ہے۔

شیطان: ترکیب تو اچھی ہے اب رہا روپیہ پیسہ۔ تو اس سے آپ بےفکر رہیے ذرا یہ کہ مطبع کھولنے میں کیا خرچ ہوگا؟

یہ: میرے خیال میں اگر ایک لاکھ روپیہ مل جائے تو یہ کام قابلِ اطمینان طریقے پر چل سکتا ہے۔ اب رہی رقم کی ادائی تو کام چل نکلنے پر معہ سود آپ کو ادا کر دی جائیگی۔

شیطان: ادائی کی آپ فکر نہ کیجئے۔ یہ لیجئے ایک لاکھ روپے کا چک۔ اب اس کے بعد میری خواہش بھی سن لیجئے۔ وہ یہ ہے کہ آپ اخبار نکالئے۔ مگر اس میں مضمون ایسے لکھا کیجئے کہ ان کو پڑھ کر دُنیا کے جتنے مذہب ہیں ان کے پیرو گُتھم گُتھا ہو کر آپس میں لٹھ چلے اور اس طرح آپ کا نام دُنیا بھر میں مشہور ہو۔ کل جو میری کرسی پر بیٹھ کر آپ نے فیصلے کئے ہیں اس کے لحاظ سے مجھے یقین ہے کہ آپ کا اخبار چلے گا اور خوب چلے گا۔

یہ: مگر مسٹر آجکل قانون کا بڑا زور ہے لڑائی تو ہو گی بعد میں شروع ہی میں مجھے یہ لوگ عدالت میں دھر گھسیٹیں گے۔

شیطان: تعجب ہے کہ آپ اتنے ہوشیار ہونے کے بعد بھی قانون سے ڈرتے ہیں۔ قانون ہے ہی کیا۔ صرف لفظوں کا گورکھ دھندا ہے۔ جب آپ نے اپنی لفاظی سے مولوی نعمت اللہ جیسے قابل شخص کو دبا لیا تو عدالت کے ایک معمولی جج کو دبا لینا آپ کے نزدیک کونسی بڑی بات ہے۔ اور جب میں آپ کی مدد کو ہر وقت تیار ہوں اور روپیہ پیسہ پانی کی طرح بہانے پر آمادہ ہوں تو کیا یہ تو خیال میں بھی نہیں آ سکتا کہ کوئی فیصلہ آپ کے خلاف ہوگا یا ہو سکے گا۔

یہ: میں تو یہ چاہتا تھا کہ اخبار میں پولیٹکل مضمون دیا کروں۔ اور اس طرح تھوڑے دنوں میں کسی پارٹی کا لیڈر ہو جاؤں۔ اور آپ اس کے بجائے مجھ سے مذہبی امور پر لکھنے کی خواہش کرتے ہیں۔ ذرا یہ تو غور کیجئے کہ فی زمانہ مذہبی امور سے کون بھلا مانس دلچسپی لیتا ہے۔

شیطان: میرا منشاء یہی نہیں ہے کہ آپ خالص مذہبی امور لکھیں۔ میرا تو یہ مقصد ہے کہ آپ ہر مذہب کے اصولوں پر حملہ کریں۔ ہر مقتدر مذہب کا خاکہ اُڑائیں۔ اور اس طرح ان حامیانِ مذہب کا کچا چٹھا کھول کر دُنیا کے سامنے رکھ دیں۔

یہ: مگر اس سے مجھے کیا فائدہ پہنچے گا یا پہنچ سکتا ہے۔

شیطان: مجھے ان باتوں کا بہت تجربہ ہے ابھی کچھ عرصہ ہوا کہ اسی ملک کے ایک حصہ میں ایک صاحب پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں ہر مذہب پر ایسے ایسے الٹے سیدھے اعتراض کرنے شروع کئے کہ سارے ملک میں ایک آگ سی لگ گئی۔ پہلے تو آپس میں تو تکار ہوئی۔ اس کے بعد لپا ڈگی ہوئی پھر سر پھٹول ہوئی۔ آخر نتیجہ یہ نکلا کہ وہ صاحب پورے ایک فرقہ کے بانی ہو گئے اور اب اُن کے لاکھوں پیرو ہیں تو مولانا میرا یہ کہنا ہے کہ آپ کے اس عجیب و غریب ملک میں انسان مار پیٹ اور جیل جانے کے بعد ہی لیڈر بنتا ہے۔ خواہ اس میں لیڈر بننے کی صلاحیت ہو یا نہ ہو۔ فرمائیے کہ اس کے بعد آپ کی کیا رائے قرار پائی ہے۔

یہ: میں نے اس مسئلہ پر اس پہلو سے غور نہیں کیا تھا۔ اب آپکی حجت سُننے کے بعد میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ اخبار کا لہجہ ذرا سخت اور اعتراضات کا پہلو لئے ہوئے ہونا چاہیئے۔ اب رہا اس کا پولیٹکل پہلو تو مذہبی

مباحث کی موجودگی میں خود پولیٹکل پہلو نکل آتا ہے۔ کیونکہ ایسے کم ہمارے ملک میں تو ہر اخبار اور ہر تحریر کا پولیٹکل پہلو در اصل مذہبی پہلو ہے۔

شیطان:۔ تو پھر کل ہی اخبار جاری کرنے کی اجازت لے لیجئے۔ مجھے اب ہر روز حاضر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب یاد کیجئے گا حاضر ہو جاؤں گا۔ اور ہاں آپ نے اپنے اخبار کا نام کیا تجویز کیا ہے۔

میں:۔ میں اس کا نام لاحول ولاقوۃ الا باللہ رکھنا چاہتا ہوں۔

شیطان:۔ دیکھئے اس نام سے نہ صرف میری توہین بلکہ اس معاہدہ کی اس شرط کی بھی خلاف ورزی ہوتی ہے جو ہمارے اور آپکے درمیان ہوا تھا۔

میں:۔ تو پھر میں اس فقرے کو ذرا مختصر کر دیتا ہوں اور اخبار کا نام صرف لاحول ولا رکھتا ہوں۔ کہیئے منظور ہے؟

مسٹر شیطان نے کچھ تھوڑی دیر غور کر کے کہا کہ "مجھے منظور ہے۔ اچھا اب اجازت چاہتا ہوں۔ آداب عرض ہے۔"

الغرض دوسرے ہی دن اخبار کی اجرائی کی درخواست دی گئی۔ اور اسی روز مناسب پیروی کے بعد منظور ہو گئی۔ پہلا پرچہ نکلا۔ اور سارے شہر میں ایک اودھم مچ گیا۔ اخباروں نے اس نئے پرچے کے لہجہ پر اعتراض کئے۔ اور اس طرح اس کی اشاعت تھوڑے ہی دنوں میں ہزاروں تک پہونچ گئی۔ اور ساتھ ہی ساتھ مولانا وحشی کے معتقدین کی تعداد بھی بڑھنے لگی۔ دوسرا حملہ اس پر ایک مذہبی پیشوا نے کیا۔ اور مولانا وحشی کو عدالت میں کھینچ بلایا۔ یہاں کچھ تو مولانا کی تقریر سے، کچھ روپے کے زور سے اور کچھ ان وسوسوں کی وجہ سے جو مسٹر شیطان نے مجسٹریٹ کے دل میں پیدا کر دیئے تھے مقدمہ اخبار کے موافق طے پایا۔ اور اس کے ساتھ ہی مولانا وحشی کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ اور ان کی ایک خاصی اچھی پارٹی قائم ہو گئی۔ اس کے بعد ان کی پارٹی ایک اور پارٹی میں جس کے خلاف اخبار لاحول ولا میں زہر اگلا گیا تھا کچھ مار پیٹ ہوئی۔ چونکہ ان کی پارٹی والوں کی تعداد کم تھی اس لئے "ٹھکائی" ان ہی کی ہوئی۔ مقدمہ بازی ہوا اور ان کی مخالف پارٹی والے سزایاب ہوئے۔ اب کیا تھا سارے ملک میں مولانا وحشی اور ان کے اخبار کی دھوم مچ گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں چھپتا اور گھنٹے دو گھنٹے ہی میں سارے پرچے نکل جاتے۔

اس اخبار میں کیا کیا چھپا۔ کس کس مذہب پر حملے کئے گئے۔ کن کن لوگوں کو برا بھلا کہا گیا۔ اور کس کس رنگ میں مولانا نے اپنے نام اور کام کو اجاگر کیا۔ اس کا اظہار میں غیر ضروری سمجھتا ہوں اور اس لئے غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ اس اخبار کے پرچے ہر جگہ ملتے ہیں۔ آپ خود خرید کر یا مانگ کر یا چرا کر دیکھ لیجئے۔ اگر میں نے کہیں اپنے اس مضمون میں اس کا کچھ حصہ نقل کر دیا۔ تو معلوم نہیں کہ مجھ پر کیا مصیبت نازل ہو۔ اور کس کس عدالت میں گھسٹنا پڑے۔

بہر حال تھوڑے ہی دنوں میں مولانا وحشی نے ایک بہت بڑا باغ خریدا۔ اس میں ایک عالی شان مکان تعمیر کرایا۔ بہت سی آراضی نیلام میں لی۔ کئی مکان گروی لئے اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ کچھ سے کچھ ہو گئے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ بڑے آدمیوں کے بڑے ہی خیالات ہوتے ہیں۔ اب ان کو خیال آیا کہ اگر اپنی پارٹی میں پیری مریدی کا رنگ ڈالا جائے تو اس سے بہت کچھ "دست غیب" کا کام لیا جا سکتا ہے۔ خیال آنا تھا کہ اس کو عملی جامہ پہنا دیا گیا۔ اور مولانا وحشی کی جگہ یہ اب "پیر و مرشد" کہلانے لگے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے اخبار کے ذریعے سے اپنے سلسلہ کے ایسے عجیب و غریب پہلو ظاہر کئے کہ ہر شخص کل جدید لذیذ کا خیال کر کے ان کے سلسلہ میں داخل اور مولانا کے کمال کا دم بھرنے اور ان کا کلمہ پڑھنے لگا۔ اب رہا آمدنی کا سوال تو جہاں مرید اپنے مرشد کے ایسے گرویدہ ہوں وہاں آمدنی کا روز بروز بڑھنا ایک لازمی امر ہے۔ چونکہ انھوں نے اپنے مریدوں کو نئی نئی قسم کے اعمال کی تلقین کی تھی۔ اس لئے مذہبی مقتداؤں نے ان کے کافر ہونے کا فتویٰ دیدیا۔ اور آپ جانتے ہی ہیں کہ کافر بننے یا بنائے جانے کے بعد انسان کی شہرت کو پر لگ جاتے ہیں۔ جب اس کشاکش نے ذرا سخت صورت اختیار کی تو انھوں نے ایک نئے فرقے کی بنیاد ڈالی۔ اور "پیر و مرشد" سے بڑھ کر ایک قسم "نبی" ہو گئے۔ ان کے نبی ہونے کا اعلان ہونا تھا کہ سارے ملک میں ایک آگ سی لگ گئی۔ مگر آجکل دنیا میں نبی اسی تیزی

آرہے ہیں کہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ آگ بھی ٹھنڈی پڑ کر رہ گئی۔

اب کیا ہے۔ یہ ہمیشہ دورے پر نکلتے ہیں۔ جابجا دعوتیں کھاتے ہیں۔ روپے اکٹھے کرتے ہیں۔ الٹا سیدھا وعظ کہتے ہیں۔ دوسرے مذہب والوں کو صلواتیں سناتے ہیں۔ اور گھر پر آکر مزے اڑاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ جہاں یہ جاتے ہیں وہاں لڑائی ضرور چل جاتی ہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا ہے کہ اگر ان کی پارٹی والوں میں سے دس پانچ کو سزا ہو جاتی ہے تو دوسرے فریق کے بیس پچیس آدمی جیل جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ جھاڑو کی تیلیوں کی طرح ملے ہوئے اور دوسرے بکھرے ہوئے ہیں۔ اس کے پاس روپیہ ہے اور دوسرے قلاش۔ غرض بڑے مزے میں گذر رہی ہے۔

ایک روز رات کے بارہ بجے جناب "بنی حدید" اکیلے بیٹھے آمد و خرچ کا حساب کر رہے تھے کہ آواز آئی "آداب عرض کرتا ہوں"۔ انھوں نے کہا "اوہو آپ ہیں۔ بہت دنوں میں تشریف آوری ہوئی"۔ ان کے دوست مسٹر شیطان نے کہا۔ "جناب والا جس ڈھنگ سے جس طرح آپ اس مذہبی کارروائی کو چلا رہے ہیں وہ ایسی مکمل ہے کہ مجھے آنے یا مشورہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اب تو آپ نبی ہو کر مجھ سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ میں شیطان ہوں مگر میں نے کبھی نبوت کا دعوے نہیں کیا۔ اور کیسے کر سکتا تھا۔ جب میں جانتا تھا کہ اس رتبے پر پہنچنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ بہرحال میں مبارکباد دینے حاضر ہوا ہوں۔ اب آپ کو میری ضرورت نہیں رہی ہے اس لئے شاید اب حاضر بھی نہ ہوں۔ البتہ اس کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کے طریقہ عمل سے میری کارگذاری کو بہت تقویت پہونچ رہی ہے۔ اور میں آپ کا بیحد مشکور ہوں۔ اچھا۔ اجازت ہے۔

نبی: مسٹر ذرا ٹھیرو۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر تم میری امت میں داخل ہو جاؤ تو کیسا ہو؟

شیطان: جناب والا۔ مجھے شاگرد ہونے میں تو کوئی تامل نہیں ہے مگر میرے شاگرد ہونے سے جناب والا کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ مجھ سے کہیں زیادہ تیز اور کارگذار لوگ آپکی امت میں موجود ہیں۔ اچھا آداب عرض ہے۔

یہ کہتے ہی رہے کہ "ذرا ٹھیرو تو ٹھیرو تو" مگر شیطان یہ کہتا ہوا بھاگ گیا کہ "جناب معاف فرمایئے۔ مجھے ڈر ہے میں اگر تھوڑی دیر اور آپ کے پاس ٹھیر گیا تو کہیں میرا ایمان نہ بگڑ جائے۔"

ساقی بکڈپو دہلی کی مطبوعات

حضرت بہزاد لکھنوی کے مجموعے

نغمۂ نور ۔ کیف و سرور
موج طہور ۔ چراغ طور

ہر مجموعہ میں حمد، نعت، غزلیں، گیت، نظمیں اور کچھ بن شا ہیں۔ ہر کتاب مجلد اور دلکش سرورق سے آراستہ ہے۔ مجموعہ کی قیمت ایک روپیہ۔

موج نور
بہزاد لکھنوی کے سو گیتوں کا مجموعہ۔ قیمت ۱۲

بیان حضور
حضور سرور کائنات صلعم سے بہزاد لکھنوی کے والہانہ عشق کا حاصل "بیان حضور" کی صورت میں ظاہر ہوا۔ قیمت عہ

آئینۂ حیرت
سید رفیق حسین مرحوم نے وحشی اور گھریلو جانوروں کے خصائل کو افسانہ کے پیرایہ میں پیش کر کے ایک انوکھی طرز کی کہانیاں لکھی ہیں۔ یہ مجموعہ ایسی ہی آٹھ دلکش کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ قیمت دو روپے۔

منیجر ساقی بک ڈپو دہلی سے طلب فرمایئے

میرا دل پسند صفحہ

سراج حسین نقوی

اخبار اور رسائل کے ازدواجی مسئلوں سے تعلق رکھنے والے کالم یا صفحہ کو میری اولین توجہ کا شرف حاصل ہے اس لئے نہیں کہ میں خدانخواستہ کنوارا ہوں ۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے تعددِ ازدواج کا بھی قائل نہیں ہوں ۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر ڈنکے کی چوٹ پر کیا "ساقی" کے صفحات میں بھی یہ اعلان کر سکتا ہوں کہ میری ازدواجی زندگی نہایت پُرامن اور مسرت آمیز ہے ۔ نکاح پڑھانے کی بھی ٹوہ میں نہیں رہتا ۔ گو اس پیشے میں کشش بہت ہے لیکن باپ کی نصیحت اور دادا کی وصیت ہے کہ بے گناہوں کے خون سے نامہ اعمال سیاہ نہ کرنا ۔ پیشہ کا معلم ہوں ۔ اور خاندان میں کوئی وکیل ہے نہ مجسٹریٹ جن کی آمدنی کیلئے ازدواجی جھگڑوں اور طلاق کی خبروں کا متلاشی رہوں ۔ لیکن پڑھتا ہوں یہی صفحہ سب سے پہلے ۔ اس لئے کہ تاریخ عالم کا دارومدار اسی پر ہے ۔ تہذیب کی ترقی کے راز اسی میں مضمر ہیں ۔ جیل خانے، ہسپتال، فنونِ لطیفہ، ادب جدید وصیت نامے اور پاگل خانے قسم کی تمام چیزیں الفت جنسی ہی کی مرہونِ منت ہیں ۔ دنیا کے ہست و بود میں ہر طرف اسی کی کارفرمائی ہے ۔ یہ ایک بے پناہ جذبہ ہے اور تعلقاتِ انسانی میں اس سے زیادہ طاقتور رشتہ دوسرا نہیں ۔ دنیا کی نیکیوں اور بدیوں کا تجزیہ کیجئے سب میں یہی جذبہ عیاں یا نہاں طور پر نظر آئیگا ۔ نیمہ یہ دیکھ کر اچنبھا ہوتا ہے کہ شہروں کو دریا کے سیلاب سے بچانے اور گھروں کو آگ سے محفوظ رکھنے کی تدبیریں تو انسان نے کیں ۔ لیکن جنسی جذبات کا دھارا بے روک [illegible] بہہ رہا ہے ۔ آتشِ نفسانی گھروں کو خاک سیاہ کئے ڈالتی ہے ۔ اور کوئی پابندیاں اس پر عائد نہیں کی جاتیں

اخباروں میں "ضرورت رشتہ" چھاپ دیجئے اور بیسیوں درخواستیں لے لیجئے ۔ ایک دلچسپ اشتہار ملاحظہ فرمائیے اعلان ہوتا ہے کہ "ایک خوش نظم، ہردلعزیز معزز رئیس کو جن کی سالانہ آمدنی تقریباً چوبیس ہزار روپیہ ہے اپنے اکلوتے صاحبزادے (بنیرۂ خان بہادر) کیلئے رفیقۂ زندگی کی تلاش ہے ۔ موصوف کا پارۂ جگر بعمر ۱۸ سال حسین، ذہین، تندرست، تمام صوری و معنوی سعادت مندانہ خصوصیات سے ممتاز اور ایف ۔ اے کی تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہے ۔ کثیر اندوختہ رقم کے علاوہ سالانہ بارہ ہزار آمدنی کا بلا شرکت غیرے مالک ہے ۔ اس نوزدیدہ کے عروسانہ رشتے کیلئے ذی عزت خاندان کی دوشیزہ لڑکی پسند کی جائے گی ۔ جو اپنے [illegible] ، ذاتی وجاہت، شخصی جاہ و حشمت، جسمانی حدوخال کی اعتباری موروثیت، نسوانی دلکشی، شریفانہ معاشرت ظاہری باطنی زیورات کا مجمعِ امتیاز رکھنے کی وجہ سے اس رینِ فات کی صحیح حقدار ہو سکے ۔ اگر باسانی ممکن ہو تو تصویر بھی پردۂ احتیاط میں دیکھی جا سکتی ہے ۔ محرکین رشتہ پتہ ذیل پر مراسلت شروع کریں ۔"

اس کو پڑھ کر میرے ذہن نے حالات کا نقشہ یوں کھینچا ۔ بہتیرے والدین کے منہ میں پانی بھر آیا ۔ تحریکیں شروع ہوئیں، کاغذی گھوڑے دوڑے، درمیانی لوگوں کی لے مانگے مراد آئی، جاسوس چھوڑے گئے ۔ کٹنیاں دوڑائی گئیں "پردہ احتیاط" میں تصویروں کا تبادلہ ہوا ۔ شرطیں طے ہوئیں ۔ مہر کا تصفیہ ہوا ۔ جہیز کی فہرست مرتب ہوئی ۔ دھوم دھام سے برات آئی ۔ لوگوں نے مرغن اڑائے ۔ نکاح ہوا ۔ کہرام برپا ہوا ۔ اور گھر سے جنازہ نکل گیا ۔

اشتہار سے لیکر نکاح کے وقت تک آپ کہیں بھی اس کا ذکر دیکھیں گے نہ سنیں گے کہ لڑکے کے ذہنی رجحانات کیا ہیں ۔ تندرستی میں اس کی کوئی فتور تو نہیں ۔ خاندان میں کسی قسم کی متعدی یا اچھا کر بیماری تو نہیں ہے ۔ اور نہ لڑکے والے ہونے والی رفیقۂ حیات کے متعلق اس قسم کی چھان بین کی زحمت گوارا کرتے ہیں ۔ بعد میں جب اصلیتیں بے نقاب ہوتی ہیں تو

قسمت کو مورد الزام ٹھیرا کر سب کے سب بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ ہندستان کے شرفا ابھی تک طلاق کو مذموم سمجھتے ہیں۔ لہٰذا میاں بیوی کی زندگی جیسی گزرتی ہے وہ تو انہی دونوں کا دل جانتا ہوگا۔ لیکن یہ خالے اللہ میاں کی اس میں کیا مصلحت ہے کہ روگی انسانوں کو چھپڑ پھاڑ کر اولاد کی نعمت سے مالا مال کر دیا کرتی پھرتے ہیں۔ یہ ہے وہ ذہنیت جس کا ماتم میرا دل کیا کرتا ہے اور سماج اور حکومت کی لے پروائیوں سے انتقام لینے کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ نسل انسانی میں جسمانی کمزوریوں اور دماغی خرابیوں کی روز افزوں زیادتی اسی ذہنیت کی آئینہ دار ہے۔ ایک دائم المریض یا پیدائشی مجرم کو پوری آزادی حاصل ہے کہ جس عورت کے ساتھ چاہے شادی کر کے درجنوں اولادیں پیدا کر دے۔ سماج اور حکومت اپنا فرض صرف یہ سمجھتے ہیں کہ والدین کے ارتکاب جرم کی سزا میں اولادوں کے واسطے پاگل خانے، جیل خانے اور شفاخانے قائم کر دیں یا پھر اس کے "انسداد" کیلئے "ادب جدید" کی داغ بیل ڈال دیں۔ حفظ ما تقدم کا زریں اصول تو اس کا متقاضی ہے کہ ایسے روگی افراد قوم کی تولیدی صلاحیتیں طبی ذرائع سے مفقود کر دی جائے تاکہ امراض جسمانی و دماغی انہیں کے ہمراہ دفن ہو جائیں۔ آئندہ نسل کو اس کا خمیازہ نہ بھگتنا پڑے اور قوم کی گاڑھی کمائی زیادہ مفید کاموں میں صرف کی جا سکے۔

زمانہ قدیم میں مشرقی رواج کی شادیاں بہت کامیاب ثابت ہوئیں۔ تاریخ اس کی شاہد ہے اور سبب بھی آسانی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اس وقت مقصد حیات اور زندگی کی دلچسپیاں محدود تھیں۔ مرد کو ایسی بیوی درکار تھی جو وفادار، باعصمت اور امور خانہ داری میں ماہر ہو۔ عورت اور مرد اپنی عادتوں میں ردّ و بدل کر کے ایک دوسرے کے مذاق کے مطابق اپنے آپ کو بنا لیتے تھے۔ لیکن مغربی تمدّن کے اثرات سے اب ہماری ذہنیت میں انقلاب ہو رہا ہے۔ چنانچہ شادی کے طریقوں میں بھی اسی قسم کا رجحان پایا جاتا ہے۔ البتہ ابھی آدھا تیتر آدھا بٹیر والی نوعیت ہے۔ معاشرتی انقلاب کی جھلکیاں اس میں ضرور نظر آ رہی ہیں۔ تعلیم یافتہ والدین نے اپنی اولادوں کو کافی آزادی دینی شروع کر دی ہے۔ لڑکیوں کو بھی اعلیٰ تعلیم دلائی جانے لگی ہے۔ انھیں اعلیٰ سوسائٹی میں شرکت کی سہولتیں مل رہی ہیں۔ عشق و الفت کی داستانوں اور رومانی ناولوں سے ان کی الماریاں بھری رہتی ہیں۔ اور اپنی دلپسند ہیروئن کے نقش قدم پر چلنے کی آرزو ان کے دلوں میں غیر ارادی طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ اس تخیل پر فلموں کی مزید جلا کاری سونے پر سہاگہ کا کام کر رہی ہے۔ اس تمام ماحول کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اپنے ہونے والے شوہر کے متعلق وہ میٹھے میٹھے سپنے دیکھنا شروع کر دیتی ہیں۔ لیکن والدین کو یہ گوارا نہیں کہ ان کی رائے کے خلاف لڑکیاں شادی کریں۔ نتیجہ اس کا گھریلو کشمکش اور بے چینی ہے۔ جس کا ردّ عمل یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات لڑکی اپنے منتخب کئے ہوئے مرد کے ساتھ خفیہ طور پر مفرور ہو جاتی ہے۔ اور ایسے افعال کی ذمہ دار مغربی تعلیم قرار دی جاتی ہے۔ لڑکوں کی حالت یہ ہے کہ شباب کے نشہ سے ان کی آنکھیں زندگی کو اصلی رنگ میں دیکھنے سے قاصر ہوتی ہیں۔ لہٰذا وہ ظاہری حسن اور نمائشی دلفریبیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن شادی کے بعد جب اصل عورت سے سابقہ پڑتا ہے تو سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ اور دونوں یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ شادی سے پہلے ان کی زندگی زیادہ خوشگوار تھی۔ اس بے لطفی اور ناگوار تعلقات کا کیا سبب ہے؟ قدامت پسندی اور اولاد کی شادی کے تمام اختیارات کی چودھریت کے سبب ہم والدین کو ملزم نہیں ٹھیرا سکتے۔ کیونکہ انھیں اس نظام میں کوئی خامی نظر آ ہی نہیں سکتی۔ جس سے ان کی اور ان کے بزرگوں کی ازدواجی زندگی پُر سکون اور اطمینان بخش رہی۔

اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جدید طریقہ میں کشش، عارضی مسرت، ہنگامے اور رومان ضرور ہیں۔ لیکن ایسی شادی لازمی ہوا کرتی ہے جس میں محرومیاں زیادہ اور کامیابیاں بہت کم ہوا کرتی ہیں۔ ہندستان میں ان دونوں نظام میں ابھی کشمکش ہو رہی ہے۔ اس انقلابی دَور میں کبھی ایک کی جیت ہوتی ہے تو کبھی دوسرے کی۔ لیکن تاریخ زیادہ صورتوں میں ناگوار ہی ہوتے ہیں۔ نئے رواج کے مطابق منگنی یا سگائی کے اعلان کا مطالعہ میرے ذہن میں دو طرح کی تصویریں بناتا اور بگاڑتا رہتا ہے۔ ایک تو سادہ لوح حماقت کے پُتلے مرد کی اور دوسری بے دردا اور خود فریب عورت کی۔ اس دلچسپ ڈرامے کی ابتدا عموماً پھولوں اور سالگرہ کے تحفوں سے ہوتی ہے کبھی تو میں کسی مارغ کے

ایک خاموش گوشہ میں ہوتا ہوں۔ اور کبھی کسی مکان کے برامدہ میں جہاں دھیمی دھیمی روشنی میں دو اداکار اپنے بہترین شاہکار پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہیروئن میں خوبصورتی سے زیادہ عیاری اور محبت سے زیادہ نمائش ہے۔ وہ ایک تجربہ کار ناخدا کی طرح اپنے مستقبل کی کشتی پہلے سے سوچے ہوئے محفوظ راستے پر کھیتی ہوئی اپنے محبوب بندرگاہ کی طرف لئے جا رہی ہے۔ دوسری طرف ہیرو اپنے اور اک سے زیادہ احمق، ضرورت سے زیادہ مدہوش تمام احتیاطیں اور عاقبت اندیشیاں نذر باد و باراں کئے ہوئے بڑی سے بڑی قربانی کیلئے تیار۔ ہر لفظ پر سمعاً و طاعتاً کہتا چلا جاتا ہے۔ خدا خدا کر کے ناخدا نے لنگر ڈالا۔ کشتی محبت ساحل پر رکی مہینوں آئینے کے سامنے کھڑے ہو ہو کر جس تقریر کو حضرت حماقت مآب نے حفظ کیا تھا آخر بھیگی بلی بن کر لڑکھڑاتی زبان پر اسے جاری کر ہی دیا۔ تقریر کیا ہوتی ہے چند حماقت بھرے معصوم بھینپے ہوئے الفاظ کمزوری کے لمحات میں ایک بدقسمت انسان کے منہ سے نکلتے ہیں۔ جیسے ان کا خمیازہ ساری عمر بھگتنا ہے۔ بولتا تو مرد ہے لیکن سنتی عورت دیتی ہے۔ اور جب مرد اپنی ملکہ تقدیر کے حسب منشا سب کچھ کہہ چکتا ہے اس وقت کی دلربا اداکاریاں ایسی ہوتی ہیں کہ ہالی ووڈ کی حسینائیں بھی ان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنے پر مجبور ہوں۔ اب وہ وقت آتا ہے کہ ہیرو کی جیب سے ایک انگشتری نکلتی ہے۔ اور ہیروئن کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنائی جاتی ہے۔ اس وقت یہ بُتِ طناز بہ ہزار دلربائی اطمینان کا سانس لیتی ہے۔ اور نگاہیں فاتحانہ انداز سے دنیا والوں کو یہ مژدہ سناتی ہیں کہ لو آج ایک اور مرد معقول سے دنیا خالی ہو گئی۔ اخباروں میں اس خبر جانکاہ کو پڑھ کر ہم جیسے "حسرت یاس مسافر بیکس کی رو دیئے" کی زندہ تصویر بن جاتے ہیں۔

دستور متروک ہوتے گئے۔ اور ان کی جگہ مکاری نے لے لی۔ شادی کی خواہش ظاہر کرنے میں فریب سے کام لیا جانے لگا۔ اے ملکہ تصور تیری آنکھیں رشک غزالاں، تیرا چہرہ غیرتِ حور۔ تیری پلکیں نوک پیکاں، تیری نگاہیں ہوشربا، تو شمع میں پروانہ . . . وغیرہ۔ لیکن عورت ان بے پناہ تعریفوں کو کافی نہیں سمجھتی۔ ان سے اس کا مقصد حل نہیں ہوتا۔ وہ تو یہ سننا چاہتی ہے کہ میرے پاس ایک عالی شان مکان ہے۔ اس سے ملحق ایک باغیں باغ ہے۔ بنک میں کافی سرمایہ ہے جس سے تمام تفریح کے سامان مہیا ہو سکتے ہیں۔ لیکن شادی کی درخواست میں چونکہ ان سب کا ذکر معیوب خیال کیا جاتا ہے اس لئے فکر یہ کی جاتی ہے کہ تجویز پیش کرنے سے قبل عورت کو رفتہ رفتہ مکان جائداد، آمدنی، بنک کی پونجی وغیرہ سے آگاہی ہو جائے لیکن کچھ عرصے سے زمانہ نے پھر پلٹا کھایا ہے۔ مرد بھی حقیقت شناس اور اصلیت پسند ہو چلا ہے بلکہ دن کو دن اور رات کو رات کہنے کی خطرناک عادت اس میں آ رہی ہے جس کے ثبوت میں ہمارا اپنا ادب ملاحظہ ہو۔ کیا عجب جو کچھ عرصے بعد شگفتہ مزاج بیسویں صدی کے قیس اپنی لیلیٰ کو یوں مخاطب کرنے لگیں "تم مصائب کی پوٹلی ہو۔ اور میں نے تم سے محبت کرنے کی حماقت کی ہے۔ بہرحال میں زندگی کے چند لمحات کیلئے یہ دردِ سری مول لینا چاہتا ہوں" مجھے یقین تو نہیں کہ اس طرز کی تجویزیں کامیاب ہو سکیں گی۔ لیکن "امیدوار" قسم کے ناظرین چاہیں تو آزما دیکھیں۔ البتہ اگر آزمائش میں دوسرا ہاتھ آ جائے تو خاکسار ذمہ دار نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ زمانہ قدیم میں جو المزد سپاہی کسی حسین دوشیزہ سے شادی کی تجویز کرتے وقت کہا کرتا تھا کہ "اے بنتِ حوّا تو جتنی خوبصورت اور دلکش ہے میں اتنا ہی تندرست اور بہادر ہوں۔ کیا تو میرے بچوں کی ماں بننا پسند کریگی؟" اس وقت تہذیب نے اتنی ترقی نہ کی تھی کہ عورت جواب میں یہ کہتی کہ اگر بچوں کو باپ کا حسن اور ماں کی بہادری ورثہ میں ملی تو نسل کا کیا حال ہوگا۔ رفتہ رفتہ انسان میں زیادہ سمجھ آ گئی۔ زمانہ قدیم کے بھونڈے

حسب عادت ایک دن میں سگائی کے اعلانات پڑھ رہا تھا۔ اور کچھ اصولی بحث ہو رہی تھی کہ ایک مرد بزرگ پوچھ بیٹھے۔ جناب اگر ہمارا پرانا دستور برا اور مغربی نظام مذموم ہے تو پھر آپ ہی فرمائیے کہ ازدواجی رشتے کس طرح قائم کئے جائیں۔ میں نے کہا سنئے "یہ تخیل نہایت مہمل ہے کہ بغیر پہلے سے محبت کئے ازدواجی زندگی کامیاب نہیں بن سکتی۔ کہنے لگے۔ ہمارا بھی یہی خیال ہے۔ اگر صورت شکل،

مناسب انتخاب اور سماجی وقار کا لحاظ رکھتے ہوئے رشتہ قائم کیا جائے تو طرفین میں محبت کا پیدا ہو جانا لازمی ہے جیسے ہم مذاق لوگوں میں ایک جگہ رہنے سہنے سے دوستی اور دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ دائمی محبت قائم ہو جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا، بجا ارشاد ہوا۔ شادی تو مقصد حیات ہے۔ اور محبت مادی مسرت کا نام ہے۔ یہ عفت اور نفرت جیسا ایک جذبہ ہے جو ہر طرح کی قید و بند سے آزاد ہے۔ مادی تفریحیں ختم ہو جانے پر بھی ازدواجی زندگی پُر کیف رہ سکتی ہے۔ اور جذبات جنسی سے کہیں زیادہ اہم اغراض زندگی کو پورا کرتی ہے۔ لہٰذا اگر دولہا دولہن یہ عہد کرلیں کہ وہ تاحیات ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں گے اور بجائے ایسے رفیق کی تلاش جو انھیں خوش کر سکے اپنے انتخاب کردہ رفیق کو خوش کرنے میں منہمک رہیں تو یہ گتھی بڑی حد تک سلجھ سکتی ہے۔

شادی کو رومان سے کوئی واسطہ نہیں یہ تو ایک اصول زندگی ہے جس کا دارومدار طبعی میلان پر ہے۔ اس کی کامیابی کیلئے محض مادی کشش نہیں بلکہ ارادے کی استواری قناعت اور ایک دوسرے کا ہم خیال بننا بھی نہایت ضروری ہیں۔ اگر اس مطمع نظر کا پرچار عام ہو جائے اور لوگوں کی ذہنیت اسے قبول کرلے تو دائمی محبت کی راہ میں بچھے ہوئے تمام کانٹے دور ہو جائیں۔ اور یگانگت، جنسی مسرت، ایک دوسرے کی توقیر، یکجا ہو کر صحیح معنوں میں میاں بیوی کو ایک جان دو قالب بنا دیں۔ پیر فرتوت نے بتایا کہ میاں یہ تو تم لوگوں کا شیوہ ہے کہ خوبصورت اور سامعہ نواز الفاظ سے زندگی کے اصول بیان کر دیا کرتے ہو۔ لیکن آخر ان زریں مقاصد کے حصول کیلئے لائحہ عمل کیا تجویز کرتے ہو۔ میں نے کہا بہت آسان ہے۔ جب لڑکی سن شعور کو پہنچ جائے تو اس کے حلقۂ انتخاب میں ایسے نوجوان لڑکوں کو شامل کیا جائے جنھیں والدین اس کے شوہر ہونے کا اہل سمجھتے ہوں۔ کہنے لگے۔ پھر وہی مغربیت نے زور پکڑا۔ سنئے تو مغرب میں لڑکی خود لڑکوں سے محبت کرتی ہے اور والدین مزاحم نہیں ہوتے۔ مگر میری تجویز کے مطابق پہلا انتخاب والدین کا اور پھر لڑکی کی پسند۔

کہنے لگے اگر لونڈیا کسی کے ساتھ بھاگ گئی تو خاندان کی ناک نہ کٹ جائے گی۔ میں نے کہا "قبلہ! وہ ضرورت رشتہ والا اشتہار آپ نے شاید نہیں دیکھا جس میں تصویر بپردہ احتیاط، ہمیں دکھائی جا سکتی ہے" کہنے لگے کیا مطلب؟ میں نے کہا مطلب یہ کہ والدین کو لڑکی کے منتخب کردہ لڑکوں سے ملاقات کا موقع بپردہ اختلاط میں نہیں بپردہ احتیاط میں دیئے جائیں تاکہ آپ کا اندیشہ بھی دور ہو جائے اور طرفین کو آزادی سے تبادلہ خیالات کا موقع بھی مل جائیں۔ باپ بھائی، ماں، بہنوں کی موجودگی میں لڑکی کو زیادہ سہولتیں مہیا ہو سکتی ہیں۔ اور وہ ان کی مدد سے امیدوار کے نظریہ حیات کا صحیح مطالعہ کر سکتی ہے۔ گھاگھ صاحب بولے یہ سب لغویت ہے۔ کم کوئی ترقی پسند ادیب معلوم ہوتے ہو۔ میں نے کہا قبلہ، آپ حضرات کا یہ تشدد ہی نئی پود کو بغاوت پر ابھار رہا ہے۔ اگر آپ لوگ اب بھی نہ سنبھلے تو مغرب کی لعنت اپنی تمام برائیوں اور رسوائیوں کے ساتھ یہاں بھی تسلط کرے گی۔ آپ لوگوں کو چاہیئے کہ میری طرح اخباروں اور رسالوں میں ازدواجی مسئلوں والا صفحہ بغور پڑھا کیجئے اور نفسیات انسانی اور موجودہ رجحانات سے کما حقہٗ آگاہی حاصل کر کے ہوش کے ناخن لیجئے۔ ورنہ سر پر ہاتھ دھرے روتے ہی رہئے گا۔

نور مشرق

ضیا فتح آبادی ایم اے پنجاب کے ان چند مقتدر شعراء میں سے ہیں جنھوں نے جدید اردو شاعری کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں اہم حصہ لیا۔ نور مشرق کا مطالعہ جدید شاعری کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے۔ اس میں شاعر کی نظمیں بھی ہیں، سانیٹ بھی، اور گیت بھی۔ اس کا تعارف جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے۔ قیمت ایک روپیہ

طلوع — ضیا کے قطعات کا مجموعہ — قیمت ۱ر

ضیا کے سو شعر قیمت ۴ر

ملنے کا پتہ گجندلال سونی نمبر ۳ دریا گنج دہلی

ماہتابِ فسردہ

شامِ افسردہ و پژمردہ سہی
میں تو محرابِ افق دیکھ رہا ہوں ہمدم
ایک دُھندلی سی تجلّی کا وہ موہوم سا خم
بیکراں چرخ ہیں آزردہ سہی
اک دمکتی ہوئی انگڑائی کی تمہید تو ہے
عزمِ تجدید تو ہے
عزم یہ تیرے لئے مُژدہ سہی

آگیا وہ مرا معبودِ کہن
سُرمئی جھیل پہ تاروں کے سفینے کھیتا
شام کے عارضِ شب رنگ کے بوسے لیتا
ڈالتا چہرۂ ظلمت پہ شکن
میں اسے گردشِ ایام کا گرداب کہوں
یا وہ مہتاب کہوں
میرے فردا پہ جو ہے عکس فگن

اب تو ہر شے ہے مرا افگندہ نقاب
یہ کسی شوخ کے گلنار لبوں کی محراب
یہ تبسم کی چکاچوند، یہ گالوں کے گلاب
نیم وا آنکھوں میں نظروں کی شراب
یہ سمٹتی ہوئی باہوں میں لپٹنے کی اُمنگ
آتے جاتے ہوئے رنگ
یہ تقاضوں کا حیاؤں سے خطاب

مہِ تاباں مرے فانوسِ خیال
اپنی کرنوں کو ذرا اور بکھر جانے دے
تیرہ و تار گپھاؤں میں اتر جانے دے
تیرا پرتو ہو اگر شاملِ حال
اپنا جینا کسی جبّار کا مرہون نہ ہو
زیست کا حزن نہ ہو
اے مری مشعلِ مریخ جلال

(اے۔ آئی۔ آر۔ لاہور)
احمد ندیم قاسمی

مشتاق احمد زاہدی

اورنگ زیب عالمگیر اور تعصب

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے متعلق بعض مؤرخوں کی مہربانی سے یہ غلط فہمی عام ہوگئی ہے کہ اورنگ زیب متعصب تھا۔ ہندو کش تھا، ظالم تھا۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ اورنگزیب نے ۱۔ جزیہ لگایا۔ ۲۔ ہندوؤں کی جگہ مسلمانوں کو نوکریاں دینے کا حکم صادر کیا۔ ۳۔ مندر گروائے۔ ۴۔ ہندو سرداروں اور راجاؤں کو ذلیل و خوار کیا۔ اور یہ سب کچھ تعصب مذہبی کی بنا پر کیا۔

واقعات کو غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب الزامات بالکل غلط ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اورنگزیب عالمگیر نے جزیہ بھی دوبارہ جاری کیا۔ ایک حکم ایسا بھی صادر کیا کہ جن عہدوں پر صرف ہندو ہی تھے ان پر مسلمانوں کو مقرر کیا جائے مندر بھی گروائے۔ ہندو سرداروں اور راجاؤں سے جھگڑے بھی ہوئے، مگر یہ سب کچھ کن حالات میں ہوا۔ آیا سیاسی ضروریات کے ماتحت یا محض مذہبی تعصب کی بنا پر۔ اسی سوال کے جواب پر اورنگ زیب عالمگیر کی صفائی کا دارو مدار ہے۔

اوّل جزیہ کو لیجئے۔ پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلامی حکومت خدائی راج ہے۔ یعنی اسلامی قانون جس کو شریعت کہتے ہیں خدا کا بنایا ہوا ہے۔ بادشاہ یا قانونی مجالس کا بنایا ہوا نہیں۔ اور اس کی پابندی کرانا ہر مسلمان بادشاہ کا فرض اوّلین ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر اس فرض کو بوجہ احسن پورا کرنے میں ہندوستان کے سب مسلمان بادشاہوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس نے اپنی حکومت کے دوران میں اوّل سے آخر تک شرع محمدی پر عمل کیا۔ جزیئے کے متعلق اسلامی قانون کا حکم ہے کہ اگر غیر مسلم مطیع الاسلام ہوں تو جزیہ لگانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر وہ اسلامی حکومت کے خلاف سازشیں کریں اور اسلام کی تحقیر کریں اور ملک میں اس وجہ سے بد امنی کا اندیشہ ہو تو وہ ملک دار الحرب کہلائیگا۔ اور اس میں غیر مسلم پر جزیہ اس طرح لگایا جائیگا کہ جس سے غیر مسلموں پر ظاہر ہو جاوے کہ مسلمان ان پر غالب ہیں۔ اور ان کیلئے بہتر یہی ہے کہ وہ اُن کے مطیع ہو جاویں اور بد امنی پیدا نہ کریں۔ جزیئے کی رقم اس قدر قلیل تھی کہ کسی پر اس کا بوجھ نہیں معلوم ہو سکتا تھا یعنی فی کس تین روپئے سے چھ روپئے سالانہ تک یا یوں کہو کہ ۴ سے ۸ روپیہ ماہوار تک۔ اس کے بدلے میں فوجی ملازمت سے نجات مل جاتی تھی۔ بتوں کو پوجنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ اور ہر طرح کی مذہبی آزادی میسّر ہو جاتی تھی۔ ایک رُخ اس کا یہ بھی ہے کہ اسلام نے شرک یعنی بُت پرستی کی سخت ممانعت کی ہے لیکن جزیہ دینے کی صورت میں یہ ممانعت منسوخ ہو جاتی ہے۔ اگر ۴ روپیہ ماہوار یعنی دیکر بُت پرست اپنے بتوں کی پوجا اپنے عقیدے کے مطابق بلا مزاحمت کر سکتا ہو تو اس سے سستا اور کیا سودا ہو سکتا ہے۔ برخلاف اس کے عیسوی مذہب میں کوئی اس قسم کی رعایت نہیں ہے۔ پروٹسٹنٹ عیسائیوں نے ہزاروں منکروں کو زندہ جلا دیا۔ اور رومن کیتھولک عیسائی صدیوں تک منکروں کو سخت سے سخت اذیت دیکر جان سے مارتے رہے۔ فرانس میں رومن کیتھولک حکومت نے ایک معینہ وقت میں ایک رات تمام مملکت میں سینٹ بورتھولمیو کے عرس کے موقع پر کئی لاکھ منکروں کو دھوکے سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ باینہمہ یورپین عیسائی مؤرخ مسلمان بادشاہوں کو متعصب اور ظالم بتلاتے ہیں۔ بہرحال اچھّا ہو یا بُرا ہو جزیہ شریعت کا حکم ہے اور جس طرح اور بادشاہوں نے اس کو ہندوستان میں جاری کیا اورنگ زیب نے بھی کیا۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ اجرا کی ضرورت تھی یا نہیں۔

عالمگیر جن حالات میں تخت نشین ہوا وہ مخفی نہیں ہیں۔ ایک طرف شاہجہاں شہنشاہ ہند اور دارا شکوہ۔ اور دوسری طرف شاہجہاں کی باقی ماندہ اولاد۔ اس کے بعد فتحمند بیٹوں میں آپس میں جنگ شروع ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرکزی حکومت غائب ہوگئی۔ اس سے بہتر موقع ان غیر مسلم

راجاؤں کیلئے اور کب مل سکتا تھا۔ جو مغلوں کی حکومت کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب اورنگ زیب اپنے حریفوں کو شکست دیکر بادشاہ ہوا تو کئی سال تک برابر ان ہندو راجاؤں کو مغلوب کرتا رہا۔ جو مختار ہو گئے تھے۔ لیکن یہ سب سیاسی جنگیں تھیں ان کی بنا کسی مذہبی تعصب پر نہ تھی۔ ان میں سے کسی نے اسلام کے خلاف جہاد نہیں کیا تھا۔ اور جب تک ایسا نہیں ہوا عالمگیر نے جزیہ جاری نہیں کیا۔ عالمگیر کے سن جلوس اکیس کے آغاز میں نارنول میں ایک مذہبی فرقہ ستنامی کے نام سے جاری ہوا۔ اور کسی جھگڑے کی بنا پر اس فرقہ نے مسلمانوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ اور ان کو اس قدر کامیابی ہوئی کہ اسلام اور اسلامی حکومت ہند کی سخت تحقیر اور توہین کی نوبت آ گئی۔ عالمگیر نے مقابلہ کو جو فوج بھیجی ان کے جھنڈوں پر کلمہ طیبہ لکھ کر مسلمانوں کا خوف رفع کیا۔ بہرحال بغاوت رفع ہو گئی۔ اسی طرح متھرا میں ایک مذہبی رنگ کی بغاوت ہوئی۔ اور بہت سے راجہ ایک مندر میں سازش کرنے کیلئے جمع ہوئے۔ اس بغاوت کو بھی رفع کیا۔ مگر عالمگیر پر یہ ثابت ہو گیا کہ اب تک سیاسی مخالفت ہوتی تھی۔ اب مذہبی سازشیں ہونے لگی ہے۔ اس لئے دار الحرب کے قاعدے سے جو علاقہ مطیع الاسلام نہ ہو اس پر جزیہ لگا دیا جاوے۔ چنانچہ ان حالات میں جزیہ لازم ہونے کی وجہ سے اس عالمگیر نے اس اسلامی قانون کا اجرا کر دیا۔ اگر عالمگیر ذاتی طور پر متعصب تھا تو جس دن تخت پر بیٹھا تھا۔ اسی دن سے جزیہ لگوا دیتا۔ مگر یہ بات نہ تھی۔ اس نے بائیس برس تک صبر سے کام لیا۔ Constitutional (پابند قانون) بادشاہ تھا۔ ہر معاملہ میں اس نے قانون کی مدد حاصل کی ہے۔

اس موقع پر یہ بیان کرنا بھی خالی از دلچسپی ہوگا کہ یہ الزام کہ فقط ہندوؤں پر ہی ٹیکس لگایا گیا تھا غلط ہے۔ جہاں جزیہ ہندوؤں پر لگایا گیا وہاں مسلمانوں پر زکوٰۃ کا ٹیکس جو شرعاً لازمی ہے سرکاری طور پر وصول کرنے کا حکم صادر کر دیا گیا۔ اور یہ ٹیکس چونکہ آمدنی اور ملکیت پر ہوتا تھا اس لئے جزیہ سے زیادہ رقم میں دینا ہوتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اسلامی احکام کی پابندی کے احکام جاری کئے گئے۔ مثلاً ہندوستان میں آداب اور کورنش وتسلیمات کا دستور ہو گیا تھا۔ عالمگیر نے حکم جاری کیا کہ یہ خلاف شرع ہے۔ ہر شخص ایک دوسرے کو سلام علیک کہے حتیٰ کہ عدالت میں محکوم حاکم کو اور حاکم محکوم کو بھی اسلامی سلام کرے۔ شرع میں صرف زمین کا لگان جائز ہے۔ اس بنا پر عالمگیر نے حکم جاری کیا کہ تمام مزاروں، عرسوں اور جاترا کے موقع پر جو ٹیکس لئے جاتے تھے ان کو معاف کیا جاتا ہے۔ اسی طرح راہداری کا ٹیکس یعنی روڈ ٹیکس معاف کر دیا جس سے مسلمان ہندو سب کو برابر فائدہ پہنچا۔ ان ٹیکسوں کے بند کرنے سے سالانہ بجٹ میں پانچ کروڑ روپیہ کا خسارہ ہوا۔ مگر عالمگیر شرع کی پابندی کا قائل تھا۔ وہ ذاتی فائدے کو پیش نظر نہ رکھتا تھا۔

دوسرا الزام یہ ہے کہ عالمگیر نے ایک حکم جاری کیا کہ ہندو ملازمین کی جگہ مسلمانوں کو دی جائے۔ اس کی اصلیت صرف یہ ہے کہ محکمہ حساب میں خاص طور پر افسر و ماتحت ہندو تھے اور بادشاہ کے پاس بہت شکایتیں پہنچی تھیں کہ وہ مسلمانوں کو بہت تنگ کرتے ہیں۔ مثلاً عالمگیر کے زمانہ میں اتی رائے برہمن صدر دفتر کے صیغۂ حساب وتنخواہ کا دیوان اعلیٰ یعنی اکونٹنٹ جنرل تھا۔ مسلمان اس سے اتنے نالاں تھے کہ جب وہ مرا تو خود عالمگیر کے معتمد امیر نعمت خان عالی نے جو اسکی ہجو لکھی اس کے تین شعر ملاحظہ ہوں :-

آں صورت دہاوت فیلاں ہتیا بول
مارا چہ فیل بند حساب وکتاب کرد
یارب نصیب ہیچ مسلمان دگر مباد
ظلمیکہ آں برہمن خانہ خراب کرد
تحقیق داں کہ آں خر عیسیٰ مردہ است
درسایہ رسید وعلف خور خواب کرد

یہ ضرور نہیں کہ سب شکایتیں لفظ بلفظ صحیح ہوں مگر عالمگیر نے یہ مناسب سمجھا کہ محکمہ حساب میں مسلمانوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ اور اس نے حکم دیا کہ جو جگہ خالی ہو مسلمانوں کو دی جائے مگر فوراً ہی دوسرا حکم صادر کیا کہ حساب کے عہدوں پر دو افسر رکھے جائیں ایک ہندو اور ایک مسلمان۔ اس زمانہ میں اقلیت کے حقوق کا عمل نہیں مچا تھا۔ بادشاہ خود رعایا کا نگران ومحافظ تھا۔ باینہمہ فارسی مؤرخوں کا بیان ہے کہ عالمگیر کے اس حکم پر

کہ مسلمان مقرر کئے جاویں عملدر آمد بہت کم ہوا۔ جو دیکھنے کی بات ہے وہ عالمگیر کی نیت ہے کہ سرکاری ملازمت میں وہ غیر مسلموں کے ساتھ کیا سلوک کرتا تھا۔ اس کے متعلق روایت ہے کہ ایک مسلمان نے اورنگ زیب کو عرضی دی کہ دو پارسی ملازم جو تنخواہ تقسیم کرنے پر مقرر تھے اس علت میں برخاست کر دیئے جائیں کہ وہ آتش پرست ہیں۔ اور ان کی جگہ عرضی دینے والے کو مقرر کیا جاوے کیونکہ وہ مسلمان ہے۔ کیونکہ قرآن شریف میں آیا ہے کہ میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔ عالمگیر نے اپنے ہاتھ سے اس عرضی پر جواب لکھا کہ مذہب کو دنیا کے کاروبار میں دخل نہیں ہے۔ اور نہ ان معاملات میں تعصب کو دخل مل سکتا ہے۔ اور لکم دینکم ولی دین یعنی تم کو تمہارا دین اور ہم کو ہمارا دین کی آیت قرآن شریف سے نقل کر دی اور لکھا کہ اگر سلطنت کا یہ دستور العمل ہوتا تو پہلے ہندو راجاؤں اور ہندو رعایا کا خاتمہ ہو جانا چاہئے تھا۔ بادشاہی نوکریاں لیاقت کے موافق ملیں گی (دعوت اسلام مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ صفحہ ۲۷۸) عالمگیر کے اس جواب سے اس کی پالیسی غیر مسلم کی ملازمت کے متعلق صاف ظاہر ہو جاتی ہے اور تعصب کا الزام غلط ثابت ہوتا ہے۔

ایک الزام عالمگیر پر یہ ہے کہ اس نے مندر منہدم کرائے۔ اس میں اصلیت صرف اتنی ہے کہ ایک وہ مندر گروایا جس میں سلطنت کے خلاف سازش کرنے کیلئے ہندو راجہ جمع ہونے تھے اور دوسرے وہ مندر گروائے گئے جو بلا منظوری بنائے گئے تھے۔ اس کے علاوہ بلا وجہ محض تعصب مذہبی کی بنا پر کوئی مندر مسمار نہیں کیا گیا۔

ایک اور الزام یہ ہے کہ تعصب کی بنا پر عالمگیر نے سیوا جی کو دربار میں بلاکر ذلیل کیا اور پھر نظربند کر دیا۔ اور جسونت سنگھ راٹھور کے بیٹے اجیت سنگھ کو باپ کا جانشین نہ مانا سیوا جی کے حالات عام طور سے مشہور ہیں۔ مرہٹے سیوا جی کو بہت بڑھاتے ہیں۔ اب جس کا جس کو جو جی چاہے بنا دے۔ مگر عالمگیر ساری عمر دکن میں رہا تھا۔ پہلے بہ حیثیت صوبہ دار اور بعد میں بہ حیثیت بادشاہ کے۔ دوسری دفعہ ۲۷ سال تک برابر مرہٹوں کے استیصال میں لگا رہا۔ اور اس سارے عرصہ میں قطعاً دار الخلافہ واپس نہ گیا۔ تاہم شمالی ہند میں کسی کی مجال نہ تھی کہ بادشاہ کی اس غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر بغاوت کر دے۔ عالمگیر دکن اور دکن والوں کے سب حال جانتا تھا۔ اُسے سیوا جی کے خاندانی حالات اور اس کی سیاسی حیثیت اچھی طرح معلوم تھی۔ سنہ جلوس میں اورنگ زیب نے راجہ جے سنگھ کو سیوا جی کی تادیب کیلئے مقرر کیا۔ راجہ کی فوج نے قلعہ پورندھر کو گھیر لیا سیوا جی نے عجز و نیاز کا اظہار کیا۔ راجہ کو اس کا اختیار نہ تھا۔ کہلا بھیجا کہ مجرموں کی طرح ہتیار کھول کر حاضر ہو گے تو اطاعت قبول کی جاوے گی۔ سیوا جی نے آخر یہ شرط قبول کی اور حاضر ہوا۔ چنانچہ راجہ جے سنگھ نے ذیل کی شرائط پر صلح کر لی۔ یہ شرائط اس لئے قابل غور ہیں کہ ان سے سیوا جی کی سیاسی حیثیت کا پتہ چلتا ہے۔ ۳۵ قلعوں میں سے جو اس وقت سیوا جی کے قبضے میں تھے ۲۳ قلعے سلطنت عالمگیری میں شامل کر لئے گئے۔ باقی ماندہ ۱۲ قلعے سیوا جی کے پاس رہے۔ سیوا جی نے یہ شرط بھی قبول کر لی کہ دکن کی مہمات میں بادشاہی فوج میں شامل ہو کر بادشاہ کی خدمت کروں گا۔ بعد میں سیوا جی نے راجہ جے سنگھ سے بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کی درخواست کی۔ راجہ کی سفارش سے سیوا جی کو اجازت ملی۔ مگر سنبھا جی یعنی سیوا جی کے بیٹے کو مدعو نہیں کیا گیا تھا مگر سیوا جی مع بیٹے کے دلی آیا۔ سیوا جی کی شکایت یہ تھی کہ مجھے پنجہزاری کے درجے میں جگہ دیکر عالمگیر نے میری ہتک کی۔ چنانچہ بعد میں جو کچھ سیوا جی نے کیا وہ سب کو معلوم ہے۔ اس وقت سوال صرف یہ ہے کہ سیوا جی صرف ۱۲ پہاڑی قلعوں کا ایک سردار تھا۔ اس کی حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے پنجہزاری کا خطاب کسی طرح کم نہ تھا۔ سلطنت مغلیہ بڑی وسیع تھی۔ اور بڑے بڑے خاندانی راجہ پنجہزاری تھے۔ کل سلطنت میں عالمگیر کے عہد میں تین ہفت ہزاری اور دو شش ہزاری تھے۔ سیوا جی کو دیگر امرا کی قدامت اور خدمات کا خیال کرتے ہوئے کس طرح ایک دم سے شش یا ہفت ہزاری بنا دیا جاتا۔ بعد میں ممکن ہے کہ وہ اونچے درجے پر پہونچ جاتا۔ مگر بایں ہمہ پنجہزاری منصب کسی طرح سیوا جی کیلئے ہتک کا رتبہ نہ تھا۔ وہ خدا جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتا تھا مگر بادشاہ کو تو ساری مملکت کے امرا کا خیال رکھنا تھا۔

اب رہا جسونت سنگھ راٹھور کے بیٹے اجیت سنگھ کا حال۔ جسونت سنگھ کے دادا کی سگی بہن جودہ بائی جہانگیر کی بیوی اور شاہجہاں کی ماں تھی۔ اس طرح اجیت سنگھ کا شاہجہاں سے

عہد میں بڑا اقتدار تھا۔ شاہجہاں کی ماں عالمگیر کی بھی دادی تھی لہذا جسونت سنگھ رشتے میں اورنگ زیب کا بھائی تھا۔ شجاع پر جب عالمگیر نے حملہ کیا تو جسونت سنگھ اورنگ زیب کے ساتھ تھا۔ مگر اندرونی طور پر شجاع سے ملا ہوا تھا۔ اور آپس میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ موقع پاکر جسونت سنگھ اورنگ زیب کے خیموں کو شبخون مار کر لوٹ لے۔ اور اس گڑبڑ میں شجاع اس پر حملہ کردے۔ چنانچہ جسونت سنگھ نے یہی کیا۔ اور لوٹ لاٹ کر اپنے وطن بھاگ گیا۔ شجاع سے فارغ ہوکر اورنگ زیب نے جودھپور کا رُخ کیا۔ مگر جسونت سنگھ کے بھائی نے تقصیر کے عفو کی درخواست کی اور اورنگ زیب نے معاف کردیا اور کابل کا صوبہ دار بنا کر بھیجدیا۔ کیا موجودہ سیاسیات میں ایسی رواداری کی مثال مل سکتی ہے۔ مگر تذکرہ اجیت سنگھ پسر جسونت سنگھ کا تھا۔ اس کی اصلیت یہ ہے کہ جسونت سنگھ کا بیٹا کنور پرتھی سنگھ جسونت سنگھ کی زندگی میں مرچکا تھا۔ کابل میں وفات کے وقت جسونت سنگھ کی دو رانیاں حاملہ بیان کی گئیں۔ ان رانیوں کو بادشاہ کی اجازت بغیر راجپوت کابل سے لانے لگے۔ اٹک دریا کے گھاٹ پر پروانہ راہداری مانگا گیا۔ تو راجپوتوں نے تلواریں نکال لیں۔ کشت و خون ہوا۔ آخر سب کو گرفتار کرکے لاہور لایا گیا۔ یہاں پہونچکر دونوں رانیوں کے ہاں بیٹے پیدا ہوئے ایک کا نام دل تھمن اور دوسرے کا اجیت سنگھ رکھا گیا۔ لاہور سے یہ لوگ حراست میں دلی لائے گئے۔ اور عالمگیر نے ان رانیوں کو اس تحقیقات کیلئے کہ یہ بچے اصلی ہیں یا فرضی دلی میں نظربند رکھا۔ سوال جودھپور کی گدی کا تھا کہ جسونت سنگھ کے بعد کس کو ملے۔ حقیقت میں جسونت سنگھ بھی حقدار نہ تھا۔ اس کے باپ راجہ گج سنگھ راٹھور تھے۔ ان کی بڑی بیوی سے راؤ امر سنگھ راٹھور پیدا ہوا۔ اس کے بہت دن بعد چھوٹی بیوی سے جو بہت چہیتی تھی جسونت سنگھ ہوا۔ راجہ گج سنگھ نے بیوی کے کہنے میں آکر بڑے بیٹے کا حق مارا۔ اور جسونت سنگھ کو اپنا ولیعہد مقرر کردیا اور چونکہ شاہجہاں کو راجہ کی خوشی منظور تھی بادشاہ نے بھی اس فیصلے کو مان لیا۔ چنانچہ باپ کے مرنے کے بعد جسونت سنگھ گدی پر بیٹھا۔ اب جبکہ جسونت سنگھ مرگیا تو امر سنگھ کے پوتے اندر سنگھ نے عالمگیر کو اپنے حق کے متعلق درخواست دی اور جودھپور کی گدی کا دعوی کیا۔ اور دل تھمن اور اجیت سنگھ کو مشتبہ بتایا۔ ان کے باپ کے عقب کا حوالہ دیا۔ عالمگیر کیلئے ضروری ہوا کہ اس معاملہ کی تحقیقات کرے۔ اسی لئے ان بچوں اور رانیوں کو دلی میں مقدمہ فیصل ہونے تک رکھنا چاہا۔ جس طرح چال کرکے سیواجی بھاگ گیا تھا اسی طرح راجپوت جسونت سنگھ کی رانیوں اور اجیت سنگھ کو بھگا کر جودھپور لے گئے۔ اور وہاں پہنچکر بغاوت شروع کردی۔ طاہر خاں فوجدار جودھپور اور اندر سنگھ حاکم جودھپور بغاوت کو فرو نہ کرسکے۔ طاہر خاں کو اس جرم میں موقوف کردیا گیا۔ اور اندر سنگھ نے دلی آکر پناہ لی۔ عالمگیر نے فوج بھیجی۔ اس موقع پر راجپوتوں نے شہزادہ اکبر کو اپنی طرف کرلیا تھا۔ قصہ مختصر ایک طویل جنگ کے بعد راجپوتوں کا زور توڑ دیا گیا۔ اجیت سنگھ اور اس کے رفقا پہاڑوں میں جا چھپے۔ جودھپور کا انتظام مناسب کیا گیا۔ اندر سنگھ کو جس کا حق ثابت ہوگیا تھا قوم راٹھور اور حکومت جودھپور پر سرفراز کیا گیا۔ اس طویل واقعہ کو اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ اجیت سنگھ کے معاملہ میں جو سلوک عالمگیر نے کیا وہ محض سیاسی تھا۔ مذہبی تعصب سے اُسے کچھ تعلق نہ تھا۔ اگر مذہبی تعصب ہوتا تو جودھپور کی گدی پر اندر سنگھ کو کیوں بٹھایا جاتا کسی مسلمان کو بٹھا دیا جاتا۔

عالمگیر کا سلوک ہندو امراء کے ساتھ باوجود انکی سازشوں اور بغاوتوں کے کیا تھا اس سلسلہ میں راجہ جسونت سنگھ کا ذکر ہوچکا ہے۔ اب درگاداس کا ذکر سنئے:۔

یہ شخص جسونت سنگھ کا رشتہ دار تھا۔ اس نے راٹھوروں کی بغاوت جودھپور کے موقع پر شہزادہ محمد اکبر کو عالمگیر کے خلاف کیا تھا۔ اور محمد اکبر کے بیٹے بلند اختر کو غائب کردیا تھا۔ جب جودھپور کا فتنہ رفع ہوگیا تو درگاداس شجاعت خاں صوبیدار دکن کے توسل سے معافی کیلئے ہاتھ باندھے ہوئے دربار میں حاضر ہوا۔ عالمگیر نے معافی دی اور سہ ہزاری اور دو ہزار سوار کے منصب پر سرفراز ہوا۔ سھاگو بنجارہ دکن کی مہم میں عالمگیر کا ساتھ چھوڑ مرہٹوں سے جا ملا تھا اسے بھی معافی دی گئی اور چار ہزار سوار کے منصب سرفراز کیا۔ ان ہندو امرا کے علاوہ جو عالمگیر سے قبل صاحب منصب تھے خود اورنگ زیب نے بہت ہندو کو امرا کے زمرہ میں شامل کیا۔ برسوجی اور مالوجی دو مرہٹہ سردار جنہوں نے جنگ برادران میں عالمگیر کیخلاف دارا شکوہ کیساتھ داد شجاعت دی تھی جنگ کے خاتمہ پر ان کو ملازمت سے برخاست کردیا مگر برسوجی کو جو چھوٹا بھائی تھا بیس ہزار اور مالوجی کو تیس ہزار روپیہ سالانہ کی پنشن مقرر کردی۔

مندرجہ بالا واقعات کی باوجود اگر یہ کہا جائے کہ اورنگزیب متعصب تھا تو اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ ہٹ دھرمی کا کوئی علاج نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ عالمگیر ایک کارکن منتظم بادشاہ ہونے کی وجہ سے ملک کے امن اور قانون کی پابندی کا قائل ضرور تھا۔ اور

ایم اسلم

کہاروں سے کہو آہستہ چلیں

بچپن کی محبت عمر کے ساتھ ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ اور شعور کے ساتھ جذبات بھی نشوونما پاتے رہتے ہیں۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب شباب کی آندھی چڑھتی ہے، جوانی کا دریا موجیں مارنے لگتا ہے۔ ہوش اور خرد ضمیر سے سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ لیکن سماج کا تازیانہ اتنا زبردست ہوتا ہے کہ ارمان، جذبات، آرزوئیں سب ناکامیوں اور نامرادیوں کی آغوش میں جا سوتے ہیں گو بعض طبائع ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی سرکشی جنون بن جاتی ہے۔ اور جوش جنون میں وہ جو کچھ بھی کر گذریں کم ہے۔ جنون کی باتوں کی سند نہیں۔ اور علاقہ بار کی اس رومان کا ایسے دیوانوں یا سرکشوں سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ داستان ایک ایسے بدقسمت نوجوان کی ہے جس پر کسی شاعر کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ ؎

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

راوی[1] کے کنارے "جھوک[2] پیر[3] اندی" جانگلیوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ میلوں تک چراگاہیں اور کھلے میدان تھے۔ اور راوی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ گاؤں کی جوان لڑکیاں اور لڑکے مال مویشی لیکر چراگاہوں کی طرف نکل جاتے۔ جب دھوپ کی وجہ سے گرمی زیادہ ہوتی تو بھینسیں چراگاہوں سے نکل کر دریا میں جا بیٹھتیں۔ اور لڑکے اور لڑکیاں مل کر تیرتے یا ریت پر مختلف قسم کے کھیل کھیلتے۔ کبڈی[4]۔ سونچی[5]۔ کوٹلہ چھپاکی[6]۔ کھدو کھنڈی[7]۔ چھلانگ۔ آنکھ مچولی وغیرہ وغیرہ کھیلوں میں دن بسر ہو جاتا۔ اور کبھی کبھی ڈھولوں کا مقابلہ بھی ہو جاتا۔ ادھر سورج مغرب کے میدانوں میں روپوش ہوتا۔ ادھر یہ فکروں کے قافلے گاؤں کی راہ لیتے۔ آزاد ہوائیں۔ آزاد فضائیں۔ آزاد ماحول اور زندگی کے تفکرات سے آزاد لیکن رسم و رواج کا تازیانہ زبردست کے ٹھینگے کی طرح ہر وقت سر پر سوار۔ اور تدبیر تقدیر کی دست نگر۔ اور تقدیر کا مالک خالق تقدیر۔ اسباب و علل کی دنیا واقعات کے جنگل میں گرفتار۔ رہا انسان تو اس کی بیکسی اور بیچارگی اہل بصیرت کے لئے درس عبرت۔ لیکن اس پر بھی اس کے عزم، اس کے ارادے اس کے حوصلے اور طبیعت کی جولانیاں انسان تو کیا اگر آسمانوں کی مخلوق بھی دیکھ دیکھ کر حیران ہو تو کچھ تعجب کی بات نہیں اور غالباً اس کی یہی ایک ادا کردگار عالم کو کچھ ایسی محبوب ہے کہ اس کی رحمت کا دریا جوش میں آجاتا ہے۔

اور انسان اپنی بساط سے زیادہ قدم اٹھانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور ان چیزوں کی تمنا کرتا ہے جن سے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے گریز کرنا چاہیئے۔ لیکن جب جوانی کا بھوت سر پر سوار ہو تو عقل اور دور اندیشی بھی خواب کی آغوش میں جا سوتی ہے۔

اس جھوک پیر اندی میں چوہدری نبی بخش جو عوام میں چوہدری نبو کہلاتا رہتا تھا۔ چوہدری نبو معمر آدمی تھا اور اکا دکا بھینسوں کا مالک تھا۔ اور بستی میں سب سے معزز آدمی متصور ہوتا تھا۔ چوہدری نبو کی ایک بیٹی تھی جس کا نام مہراں تھا۔ مہراں کی عمر اٹھارہ انیس کے لگ بھگ تھی۔ اور گاؤں والیوں میں سب سے زیادہ حسین متصور ہوتی تھی۔ چوہدری نبو کے گوالے کا بیٹا جس کا نام تو لال دین تھا لیکن گاؤں میں لالو کہلاتا تھا۔ چوہدری کے گھر میں ہی پل کر جوان ہوا تھا۔ قدرت نے اسے رنگیلی طبیعت اور شاعرانہ مذاق عطا کیا تھا۔ اور آس پاس کی بستیوں میں

---

[1] دریائے راوی [2] جھوک۔ گاؤں۔ پیروں کا گاؤں [3] پنجاب کا عام کھیل جس میں دو پارٹیاں ہوتی ہیں۔ [4]۔ یہ بھی کبڈی سے ملتا جلتا ایک کھیل ہے اس میں چیدہ چیدہ جوان شامل ہوتے ہیں [5]۔ چند لڑکے ایک دائرے میں بیٹھ جاتے ہیں اور کسی کپڑے کا ایک کوڑا بنا لیا جاتا، ایک لڑکا یہ کوڑا لیکر دائرے کے گرد چکر لگایا جاتا ہے اور چپکے سے کسی کے پیچھے کوڑا رکھ کر اپنی جگہ جا بیٹھتا ہے۔ [6]۔ چھپاتی ہاکی۔ [7]۔ جانگلیوں کے گیت۔

اسکے ڈھولے یعنی دیہاتی گیت بہت مشہور رکھتے۔ عیدین اور بیساکھی کے موقع پر جب بستی میں میلہ لگتا تو ادھر ادھر کے لوگ لالو کے ڈھولے سننے کیلئے وہاں آجاتے تھے۔ لالو کی آواز میں لوچ بھی تھا اور سوز بھی۔ اور قدرت نے اُسے مردانہ حسن بھی بہت فراخدلی سے عطا کیا تھا۔ مہراں اور لالو بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ جیسے جیسے عمر اپنی منزلیں طے کر رہی تھی اسی طرح قدرت جذبات میں بھی رنگ بھر رہی تھی۔

مہراں نے تو شاید کبھی اظہار محبت کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ لیکن لالو جن نظروں سے دیکھتا وہ پوری طرح محبت کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ اور دیکھنے والے بھی اس کی ان نگاہوں کو خوب سمجھتے تھے۔ مردوں کی نسبت عورتوں کو ان باتوں کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ چنانچہ عورتوں میں اسی قسم کی سرگوشیاں اکثر ہوا کرتی تھیں۔ جب چوہدرانی کے کانوں تک یہ باتیں پہونچیں تو اس کے کان کھڑے ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عورتوں کا لالو کے پاس آنا جانا کم ہو گیا۔ پردہ تو ان لوگوں میں ہوتا نہیں۔ مرد اپنے ہوں یا بیگانے کھلے بندوں مستورات کے پاس آتے جاتے ہیں۔ اور گھر کے ملازم دونوں وقت روٹی بھی اپنی مالکن کے پاس ہی بیٹھکر کھاتے ہیں۔

کچھ روز اس طرح بھی گذرے۔ لیکن مہراں اور لالو کو ایک دوسرے سے بات چیت کرنے کا موقع مل ہی جاتا۔ کبھی گھر میں کبھی کنوئیں پر، کبھی دریا پر۔ اور باتیں کرنے والیاں بات کا بتنگڑ بنا کر چوہدرانی کو سنائیں۔ چوہدرانی بیٹی سے تو کچھ نہ کہتی لیکن لالو پر آئے دن لتاڑ ہوتی رہتی۔ اور ان ملاقاتوں کی روک تھام کیلئے گھر میں کام کرنے والی ایک عورت کو تاکید کر دی کہ مہراں جب کہیں جائے وہ بھی اس کے ساتھ جایا کرے۔ اسی اثنا میں مہراں کی ایک گاؤں میں جو دریا کے پار کہیں دور فاصلہ پر تھا سگائی ہو گئی۔ لالو کے دل پر سخت چرکا لگا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اب اسے مہراں کو کچھ کہنے سننے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ اور جو ملتا بھی تو بس بمشکل ایک دو بات کرنے کا وقت۔ لالو جب بھینسیں لیکر جنگل میں جاتا تو فراق کے گیت (ڈھولے) گاتا۔ لیکن ایسی آواز سے جو دُور تک نہ پہنچ سکے یعنی ع

دل ہی دل میں ہم انھیں یاد کیا کرتے ہیں

ایک روز مہراں سہیلیوں کے ساتھ دریا پر نہانے جو گئی تو لالو بھی اس کے باپ کی بھینسیں لیکر دریا پر گیا ہوا تھا۔ بھینسیں دریا میں کنارے کے پاس پانی میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ سر پانی سے باہر تھے اور کبھی کالی کالی پیٹھیں بھی نظر آنے لگتیں۔ لالو کنارے پر بیٹھا ریت پر ہاتھ سے مختلف شکلیں بناتا اور مٹا دیتا۔ دریا کے کنارے ایک جگہ سرکنڈے اُگے ہوئے تھے۔ سب سہیلیاں سرکنڈوں کی اوٹ میں ہو کر دریا میں تیرنے لگیں۔ مہراں چپکے سے لالو کے پاس آگئی۔ اور آتے ہی ذرا غصہ سے بولی:

"لالو! تم مجھے جینے بھی دو گے یا نہیں۔ کیا بکھیڑا پھیلا رکھا ہے تم نے؟"

"کیسا بکھیڑا؟" لالو نے سر اٹھائے بغیر پوچھا۔

"بکھیڑا نہیں تو اور کیا؟" مہراں نے جواب دیا۔ "جدھر جاتی ہوں یہی طعنے ملتے ہیں۔"

"کیسے طعنے؟" لالو نے پوچھا۔ "کون دیتا ہے طعنے؟"

"تمھیں معلوم نہیں؟" مہراں نے پوچھا۔ "کوئی مُنہ پر تو نہیں کہتا لیکن زبان بھی تو کسی کی بند نہیں کی جاسکتی۔"

"سب قصور میرا ہی ہے۔" لالو نے کہا۔

"تمھارا نہیں تو اور کس کا!" مہراں نے کہا۔ "تم عقل والے ہوتے تو یہ پابندیاں کیوں ہوتیں!"

"جب دل قابو میں نہ ہو تو عقل کی آواز کانوں تک نہیں پہونچتی۔" لالو نے جواب دیا۔

"دل کب تک قابو میں نہ رہے گا؟" مہراں نے پوچھا۔ "پرائی چیز پر کافر کی نظر ہوتی ہے۔"

"پرائی چیز!" لالو نے ذرا مسکرا کر کہا۔

"پرائی نہیں تو اور کیا؟" مہراں نے جواب دیا۔ "مسافر آج بھی گیا اور کل بھی۔"

"تم خوش تو ہوگی؟" لالو نے پوچھا۔

"خوش تو تم بھی رہ سکتے تھے۔" مہراں نے کہا۔

"میں تو اب بھی خوش ہوں۔" لالو نے کہا۔

"مجھے بدنام کر کے؟" مہراں نے پوچھا۔ "آفرین ہے تم پر۔"

"میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔" لالو نے جواب دیا کہ "جو قصور ہے میرا ہی ہے۔"

"میرا بھی تو نہیں۔" مہراں نے کہا۔ "سانڈنی کی مہار سلیا

کے ہاتھ ہوتی ہے۔ جدھر لے جائے جانا ہی پڑتا ہے۔ ماں باپ کی مرضی کے آگے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔"

"مہراں!" لالو نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "تم جو کچھ کہہ رہی ہو ٹھیک ہے لیکن محبت کی راہ اور ہوتی ہے۔"

"وہ کونسی راہ ہے؟" مہراں نے پوچھا۔

"جو عشق کے محرم ہوتے ہیں وہ طعنوں اور جگ ہنسائی کی پرواہ نہیں کرتے۔" لالو نے جواب دیا۔ "جو عشق کی راہ میں مرتا ہے زندگی اسی کو ملتی ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟" مہراں بولی۔ "کچھ مجھے بھی بتاؤ۔"

"تم کو جو کچھ کرنا تھا وہ تو تم کر چکیں۔" لالو نے جواب دیا۔

"لالو!" مہراں نے جواب دیا۔ "تم مرد ہو میں عورت ہوں۔ تم اس مہرے[1] کی طرح ہو جس کی ناک میں نکیل ابھی نہیں پڑی۔ میں اس ڈاچی کی طرح ہوں جس کے ماتھے پر قدرت نے روز پیدائش سے ہی عیز کی سندس کی مُہر لگا دی ہے۔ میں خوش تب تھی جب میرے بس میں کچھ ہوتا۔ جب تک مجھ پر قید نہ تھی میں ہر روز تم سے ملتی تھی۔ صرف دن ہی کو نہیں بلکہ راتوں کو بھی۔ لیکن آج جو کچھ ہو رہا ہے آخر ایک روز ہونا ہی تھا۔"

"قسمت کی بات ہے مہراں۔" لالو نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "میرے پاس بھی دس بیس بھینسیں ہوتیں۔ ڈوم[2] کو میرے کسے کا شجرہ بھی یاد ہوتا۔ میں بھی لوگوں کے ساتھ ایک چارپائی پر بیٹھ سکتا۔ تو شاید آج جب تم مجھے کہیں ملتیں تو کسی ساتھ والی کی اوٹ میں ہو کر چلتیں۔ میں غریب تو ہوں اور تمہارے باپ کا نوکر بھی۔ لیکن نہ میرا دل غریب ہے اور نہ کسی کا نوکر ہے۔ لیکن دل پر میرا اختیار نہیں۔"

اور مہراں نے طنزاً کہا۔ "جس مرد کو دل پر قابو نہ ہو وہ مرد بھی نہیں۔ جس مرد کو کسی عورت سے محبت ہو وہ اس کی عزت اور آبرو کیلئے شوق سے سر کٹوا تا ہے۔"

"اور عورت!" لالو نے پوچھا۔ "عورت ہمیشہ مرد سے بے وفائی ہی کیا کرتی ہے کیا؟"

مہراں نے جواب دیا۔ "عورت بے وفا ہوتی ہے جو اپنے شوہر کی عزت کا خیال نہ رکھے۔"

"سچ ہے مہراں۔" لالو نے ایک آہ بھر کر کہا۔

مہراں نے کہا۔ "مجھ پر جب تک سدھ نہ تھی کیا میں تم سے ہر روز نہیں ملتی تھی۔ کیا میں تمہیں اپنے ہاتھ سے روٹی پکا کر نہیں کھلاتی تھی کیا میں تمہیں کٹورے میں لسی ڈال کر تمہیں نہیں پلاتی تھی۔ کیا میں نے ماں سے چھپا چھپا کر تار[3] مکھن نہیں کھلایا۔ کیا میں تمہارے ساتھ پیلو کھانے نہیں جایا کرتی تھی۔ افسوس! تم نے یہ سب باتیں بھلا دیں۔"

"نہیں مہراں۔" لالو نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "میں یہ باتیں نہیں بھولا۔ بلکہ ان باتوں نے مجھے دھوکا دیا۔ میں نے سمجھا کچھ اور تھا اور ہوا کچھ اور۔"

"لالو!" مہراں بولی۔ "میں تمہاری دشمن نہیں۔ میری بات سنو۔ یہ باتیں اب بھول جاؤ۔ وہ کون لڑکی ہے جسے ایک نہ ایک دن دوسرے گھر نہیں جانا۔ پرائی چیز کی دلوانے آس لگاتے ہیں۔"

دونوں میں یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ مہراں کی سہیلیاں اسے آوازیں دینے لگیں۔ مہراں بولی۔ "لالو۔ لو اب تو میں جاتی ہوں۔ میں کسی روز ماں سے کہوں گی وہ تمہاری شادی کا کہیں انتظام کر دیگی۔"

لالو صرف مسکرا دیا۔ آوازیں اب لحظہ بہ لحظہ نزدیک سے آ رہی تھیں۔ مہراں لمبے لمبے ڈگ بھرتی سرکنڈوں کی طرف چلی گئی۔

آخر ایک روز مہراں کی برات آئی۔ چوہدری تمو نے دس تولے سونا، پچاس تولے چاندی، پانچ بھینسیں اور تین اونٹ بیٹی کو جہیز میں دیئے۔ برات کی خدمت کرنیوالوں میں لالو بھی تھا۔ جس وقت کہاروں نے ڈولی اٹھائی وہ صحن میں ایک طرف دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ دولہا والوں نے جب دولھن کی ڈولی پر سے پیسے نچھاور کئے تو بھک منگے اور گاؤں کے لڑکے لوٹنے کیلئے ٹوٹ پڑے لیکن لالو جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہا۔ جب ڈولی چلی تو وہ بھی پیچھے ہو لیا۔ آٹھ کہار اٹھانے والے تھے۔ براتی گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار تھے۔ لالو کیسے ساتھ دے سکتا تھا۔ وہ ڈولی کو ایسی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا تھا جیسے زخمی کونج ڈار کو اڑتے ہوئے۔ آخر وہ

۱۔ مہرا۔ اونٹ۔ ۲۔ گاؤں میں شادی بیاہ کے موقع پر اچھے گھرانوں کا مراثی حسب و نسب بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں۔ ۳۔ یعنی ممکن تھا کہ تم سے میری منگنی ہو جاتی۔

ایک ہاتھ کانوں پر رکھ کر اور دوسرا ڈولی کی طرف اٹھا کر
بڑی درد بھری آواز سے بولا :-

(۱)

کہاروں سے کہو آہستہ چلیں
پیروں کی گرد سے بُندوں کی چمک ماند پڑ جاتی ہے ۔
کنواریوں[1] کے بندوں کی چمک
جو کانوں میں اس طرح لٹکتے ہیں
جیسے ڈالوں میں پیلو
یا بیریوں میں بیر ۔
گول گول بُندے !
محبوب کے سیاہ بالوں میں ایسے چمکتے ہیں
جیسے کالی کالی بدلیوں کے گھونگھٹ میں تارے ۔
بندوں والیاں جب تتلیوں کی طرح
ایک دوسری کا پیچھا کرتی ہیں
پاؤں کی گرد مرگ کی آنکھ کا سرمہ بن جاتی ہے
مرگ نے میرے محبوب کی آنکھ سے مستی چرائی
چکور نے چال
مجنوں کی آہوں سے لیلائے شب بیقرار ہو گئی
پھول پر بہار آئی ۔
کلی پھوٹی تو گلچیں بھی آ گیا ۔
محبت کی سیج[2] خار بن گئی
اور نیند گردِ رم آہو !
شکاری کا نشانہ خطا جاتا ہے جب قسمت جاگتی ہو ۔
جب قسمت سو گئی تو شکایت کیسی ۔
کہاروں سے کہو آہستہ چلیں

(۲)

کہاروں سے کہو آہستہ چلیں
زندگی زمانہ کے دوش پر سوار ہے
موت کا راہزن
کینچلی والے مٹیلے سانپ کی طرح
راہ میں گھات لگائے بیٹھا ہے ۔

افسوس !
اس راہی کی قسمت پر جس کا ساتھی
اسے چھوڑ کر دوسرے سے جا ملے
ظالم ہوا نے یار کے ناقہ کا نقش مٹا دیا ۔
جس طرح موت زندگی کا نقش مٹا دیتی ہے ۔
ایک یاد ہے ۔ تلخ یا خوشگوار
جو نفس[1] کے ساتھ زندہ ہے ۔
زندگی نفس سے اور نفس زندگی سے ۔
آس زندگی کا سہارا ہے ۔
صبر ہر حالت میں آتا ہے ۔
پھول مرجھا گئے ۔ باغ اجڑ گیا ۔
مالی اُداس نہ ہو ۔
بہار تو پھر ایک بار آئیگی
اگر اُجڑا رہے گا تو عاشق دل
دل کی بستی اجڑ کر نہیں بستی
فریاد وہ ہے جو دل سے نکلے زبان پر نہ آئے ۔
کہاروں سے کہو آہستہ چلیں ۔

(۳)

کہاروں سے کہو آہستہ چلیں
نامراد کی آہوں سے ہوا گرم ہو گئی ۔
زمین جہنم کا توا بن گئی ۔
ہونٹ اس طرح سوکھ گئے
جیسے چراگاہوں میں گھاس ۔
فریاد دل سے نکلی لب پر رک گئی
محبوب کا ظلم کس طرح آشکارا ہو ۔
ڈولی والی کو سہاگ کی رات مبارک ۔
سہاگ کے جوڑے کے لئے
عاشق کے دل کا خون رنگ بنا
محبوب کا دل بدلا
زمانہ بدل گیا
بیریوں کی ہری ہری ٹہنیوں پر ہرے ہرے طوطے

۱۔ کنواریاں ۲۔ بستر ۔

۱۔ سانس ، زندگی ۔

بچے بیر نوچ نوچ کر پھینک رہے ہیں۔
جیسے قسمت نے ارمان
ایک ایک کرکے تباہ کر ڈالے۔
عاشق کی فریاد دل سے نکلی زبان پر رُکی۔
زخم کے منہ سے خون رِستا رہے تو درد کی لذت ہے۔
زخم خشک ہوا تو لذت بھی گئی۔
محبت جونک ہے عاشق کے دل کا خون پیتی ہے۔
رقیب کے گھر میں گھی کے چراغ جلے
بدنصیب کے دل کی نگری سُونی ہوگئی۔
جیسے اندھیرے میں قبرستان!
جہاں پکے ہوئے پیلوؤں والے ون[1] کا سایہ ہو۔
ارنڈ کو کون پوچھتا ہے۔
کہاروں سے کہو آہستہ چلیں۔

(۴)

کہاروں سے کہو آہستہ چلیں۔
ٹالیوں[2] کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
ونوں کا سُست سایہ۔
لال لال میٹھے میٹھے پیلو۔
جیسے ناری کے کانوں میں بندے
اجل کا فرشتہ بھی دیکھ لے تو سُستانے کو رُک جائے۔
لیکن موت نہ بلائے آتی ہے نہ ٹالے ٹلتی ہے۔
ٹالیوں کی چھاؤں میں
تاروں کے چرخے کی گھوں گھوں
راہٹ کی چوں چوں
نصیب والے ہی دیکھتے ہیں
جہاں دیا جلتا ہے
جلنے والے خود ہی جلنے کو آموجود ہوتے ہیں۔
پروانہ کو اس سے کیا
دیا مندر میں جلتا ہے یا مسجد میں۔
ڈولی سایہ میں رکھ دو۔

۱۔ علاقہ بار کا ایک درخت جس میں پیلو لگتے ہیں۔
۲۔ شیشم کا درخت۔

سرد آہوں سے دل کی آگ نہیں بجھ سکتی۔
محبت کی آگ فراق کی آہوں سے بھڑکتی ہے۔
کہاروں سے کہو آہستہ چلیں۔

(۵)

کہاروں سے کہو آہستہ چلیں
عاشق کی آہوں سے زمین اور آسمان تپ گئے۔
خوبصورت پٹے جن میں ماں تیل جھلتی[1] تھی۔
مٹی سے اس طرح اٹ گئے
جیسے کربلا کے شہیدوں کے خیمے
چمکتا ہوا چہرہ ٹھنڈا تانبہ بن گیا۔
سوار کا ساتھ پیدل کب تک دے گا۔
جب ڈاچی نے قدم اٹھایا
بگولوں نے مسافر کو آغوش میں چھپا لیا۔
جس طرح چاند ہالے میں
یا سورج کا چہرہ کالی بدلیوں میں
یا قسمت نامرادیوں کے بادل میں
ڈولی والی سُہاگن سے کہو۔
زمانہ کی طرح آنکھیں مت پھیر
زمانہ کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔
پیلو ہرے تھے۔
بندوں والی کے سُرخ رخسار دیکھ کر سرخ ہوگئے۔
تھل[2] سسی[3] کیلئے گلزار بن گئے۔
جیسے نمرود مردود کی آگ
ابراہیم کیلئے۔
جس نے عشق کی تلوار کے نیچے گردن رکھی۔
فرشتوں نے اسے سلام بھیجا
فرہاد کا تیشہ دنیا میں یادگار رہا
جس طرح کاوے[4] کی مشک۔

۱۔ ملتی، لگاتی۔ ۲۔ ریت کے میدان۔ ۳۔ سسی، پنوں کی محبوبہ جو پنوں کی تلاش میں تھلوں میں مر گئی۔
۴۔ کاوا۔ ایران کا ایک لوہار جس نے فریدوں شاہ ایران کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔

محبت کا پودا عاشق کے خون سے پنپتا ہے۔
محبت کا مکان دل ہے
دل کی آنکھیں کھلی ہوں۔
تو فراق کیسا اور ہجر کا گلہ کیوں۔
محبوب کے قافلے کی گرد
عاشق کے دل کا آئینہ ہے
جس میں یار کی تصویر نظر آتی ہے
محبوب دور نہیں
کہاروں سے کہو آہستہ چلیں۔

(۶)

کہاروں سے کہو آہستہ چلیں
ڈولی والی سے ایک بات کہنی ہے
سہاگ کی مہندی سے ہاتھ شہاب بن گئے۔
سرخ سرخ چوڑیاں
گوری گوری کلائیوں میں چھنک رہی ہیں۔
مانگ میں سہاگ کا سیندور
میرے سینے کے زخم کی طرح چمک رہا ہے۔
چاندی کی ہیکل سینے کے اٹھتے ابھار کو چوم رہی ہے۔
جیسے حاجی حجر اسود کو
ناک میں سونے کی نتھ[1] ہے جیسے پانی میں کنول۔
ماتھے پر جھومر جیسے عرش کی چوکھٹ پر چاند
کانوں میں گول گول بالیاں۔
راوی کے ننھے ننھے گرداب
بدن پر سہاگ کا جوڑا
بیر بہوٹی[2] کی چادر کی طرح سرخ۔
بندے جو دوشیزگی کے ساتھی تھے
سہیلیوں نے ہنسی ہنسی کر اتار ڈالے۔
سرخ چیرے[3] والا ڈولی کے ساتھ ساتھ
جیسے اندر کے اکھاڑے کا چوبدار

۱۔ ناک کا ایک زیور۔ ۲۔ بیر بہوٹی۔ سرخ رنگ کا ایک کیڑا۔
۳۔ چیرا۔ پگڑی۔ سرخ چیرے والا۔
دولہا۔

۱۔ لتو اریاں ۲۔ بستر

قسمت کا ستارہ اس طرح چمک رہا ہے
جیسے نامراد کے دل کے داغ
ڈولی والی سے ایک بات کہنی ہے۔
بھولے وعدے کون یاد رکھتا ہے
فقیر کی آواز کسی نے سنی کسی نے نہ سنی۔
کہاروں سے کہو آہستہ چلیں

(۷)

کہاروں سے کہو آہستہ چلیں
پیلو سوکھ گئے
مٹیاریں[1] گھر میں بیٹھ رہیں
جیسے ڈاچیاں چر چگ کر۔
کیکروں کے ہرے ہرے پتے
بکریوں نے کھا لیے۔
گڈریے کے الغوزوں[2] کی آواز سے
تنوں میں جوانی جاگ اٹھی
گڈریے سے کہو
اب الغوزوں پر بارہ ماہ[3] نہ گائے
بالوں میں تیل آنکھوں میں سرمہ لگانے کی رت گئی۔
آنکھیں مٹکا مٹکا کر بکنے والی نے وطن چھوڑ دیا۔
گول گول بندوں والیاں
جب آلوہ[4] پر آ کر بیٹھیں
آلوہ کو چار چاند لگ گئے
کپڑوں کے داغ تو دھو لئے
دل کے داغ نہ دھو سکیں
آنکھیں وہیں بچھی[5] ہیں
جہاں بندوں والی کا سایہ ہو۔

۱۔ جوان لڑکیاں۔ ۲۔ الغوزے۔ ایک قسم کا ساز جو پنجاب کے دیہات میں عام طور پر بجایا جاتا ہے، دو بنسریاں جن کو ہونٹوں میں دبا کر بجاتے ہیں۔ ۳۔ بارہ ماہ۔ بارہ مہینے۔ ایک گیت جس میں سال بھر کے مہینوں کے خواص کا ذکر ہوتا ہے۔ ۴۔ آلوہ۔ حوض جس میں کنوئیں کا پانی جمع ہوتا ہے۔ ۵۔ بچھی ہیں۔ فرش راہ ہونا۔

پتّے ہلیں تو ہوا چلتی ہے۔
آنکھوں کے چشمے اُبلیں
دل ہلکا ہوتا ہے
عاشق کی آہیں
کہاروں کی گردیں بھٹک گئیں
کہاروں سے کہو آہستہ چلیں

(۸)

کہاروں سے کہو آہستہ چلیں
راوی عاشق کے آنسوؤں کی طرح بہہ رہی ہے۔
ہواؤں میں سسکیاں بھر رہی ہے۔
سورج سے آگ برس رہی ہے۔
آج عاشق کیلئے حشر کا دن ہے
مسافر ٹالیوں کے سایہ میں لیٹ گئے
کنڈلدار سینگوں والی کالی بھوری بھینسیں
ساون کے بادلوں سے بے آس ہو کر
کیچڑ میں چھپ بیٹھیں
گوالے کی بنسری نے گوپیوں کو بیقرار کر دیا۔
عاشق کی فریاد ۔ کونج کی پکار
ویرانہ میں کھو گئی۔
کونج نے وطن کی راہ لی
نہ ڈولی والی نے ڈولی کا پردہ اٹھایا
نہ عاشق کی فریاد نے اثر کیا۔
لالو کی آواز سے جنگل آباد ہونگے
لالو کی آہیں راگنیاں بن کر
بنوں میں جادو جگائیں گی۔
عاشقوں کی روح
سدرہ کی ڈالیوں میں بیٹھ کر
لالو کی فریاد سن کر بیقرار ہونگے
جب پیر دستگیر کی سواری گذریگی
لالو دل نذر کریگا جسمیں محبوب کی محبت چھلک رہی ہے۔
جب قسمت سو گئی تو شکوہ کیسا
کہار جلدی چلیں یا آہستہ
لالو نے محبت کی بازی ہاری ہار نہیں مانی!

چیلنج

سلام مچھلی شہری

شہزادیٔ بہار کی نازک سہیلیو!
تم بھی ری نگاہ کی چھاؤں میں ناچ لو
اے دامنِ گلاب کی رنگین تیتلیو!
تم بھی حسین فضاؤں میں ناچ لو

میں دیکھ چکا ہوں وسعتِ داماں تنگ لو
تم بھی نشاطِ حسن کی محفل سنوار لو
کافی ہیں میرے بربط و مینا و جام و مئے
اب تم بھی جیتِ ناز ہو اس کو پکار لو

یا آج ٹوٹ جائینگے یہ ساغر و رباب
یا زہرۂ بہار کو رقصاں کرو نگا میں
یا آج چھا ہی جائیگی تاریکیٔ حیات
یا بزمِ زندگی میں چراغاں کرو نگا میں ـــ!!!

رشید احمد صدیقی

خبطی

شیخ سعدی فرماتے ہیں ایک سال دمشق میں ایسا قحط پڑا کہ یاروں نے عشق فراموش کر دیا۔ قحط پڑتا رہتا ہے اور عشق بھی فراموش کیا جا سکتا ہے لیکن شیخ سعدی کا یہ شعر کبھی فراموش نہ ہوگا۔ البتہ یہ بات عجیب ہے کہ ہمارے ہاں حال ہی میں ایک بڑا اچھا قحط پڑا تھا لیکن ہم نے عشق بالکل ترک نہ کیا یہی نہیں بلکہ اس زمانہ میں ہم نے ہر کام چھوڑ کر عشق کا کاروبار شروع کر دیا۔ ممکن ہے یہ بات بھی اپنی جگہ پر وزن رکھتی ہو۔ کہ ہم نے پہلے ہی سے عشق کا کاروبار اتنے بڑے پیمانہ پر شروع کر رکھا تھا کہ لوگ بھوک کے مرنے لگے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ عشق سے قحط اور قحط سے عشق پیدا ہوتا ہے۔
اور قحط و عشق کا حاصل ضرب خبطی!

یہاں تک گفتگو کرنے کے بعد مجھے یک بیک یاد آیا کہ عشق اور قحط کے زد سے بچ کر بھی خبط کے موضوع پر سوچا جا سکتا ہے۔ لیکن ابھی میں سوچنے کا تہیہ کر ہی رہا تھا کہ بہت دنوں کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ہماری بستی میں ایک بزرگ کو اچانک یہ یقین آ گیا تھا کہ بستی کے اصلی مالک وہ خود تھے اور دشمنوں نے اپنی ریشہ دوانی سے ان کو بے دخل کر دیا تھا۔ اس کے بعد ان کا یہ شغلہ رہ گیا تھا کہ وہ ہر عدالت میں خواہ وہ کسی کی ہو ملکیت کی بازیافت کا دعویٰ دائر کر دیا کرتے تھے۔ اور طرح طرح کے کاغذات کا پلندہ چیلے سے بستے میں باندھے بغل میں دبائے گھوما کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھے معائنہ مسل کی دعوت دی۔ ان کی ایک عرضی پر عدالت نے فیصلہ لکھا تھا: "سائل کو خبط ہے۔"

اس فیصلہ کو پڑھ کر میں اپنی ہنسی روکنا چاہتا تھا۔ لیکن دوست نے یہ سمجھا کہ میں نے رونا شروع کر دیا ہے۔ انھوں نے فوراً تسلی کے کچھ کلمات کہے اور فرمایا "دیکھیے آپ نے اتنے ہی پر صبر کا دامن چھوڑ دیا۔ مجھے دیکھیے جب سے یہ فیصلہ صادر ہوا ہے عجیب چکر میں مبتلا ہوں۔ عدالت نے جو فیصلہ صادر کیا ہے وہ سر آنکھوں پر لیکن آخر کوئی انتہا بھی ہوتی ہے"

میں نے پوچھا "کاہے کی انتہا؟" بولے "ضبط کی"۔ میں نے بے ساختہ پوچھا "آخر ضبط کا کیا سوال ہے؟" بولے "تو پھر آپ نے پڑھا کیا؟ دیکھیے یہ کیا لکھا ہوا ہے "سائل کو ضبط ہے""۔ میں نے فوراً اپنے کان پکڑے اور اپنے دوست سے بغلگیر ہو کر رخصت ہو گیا مجھے کچھ وہم سا ہوا نہ معلوم فریقین میں سے کون اپنا ضبط کھو بیٹھے۔

میرا کاروبار طالب علموں سے رہتا ہے جو ہر دیکھ بھال کے باوجود ایسی کتابیں پڑھ لیتے ہیں جن کو اکثر اس لئے قابل ضبطی سمجھتے تھے کہ ان کو پڑھ کر بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ایسی کتابیں نہ بھی پڑھتے تب بھی اپنے باپ کو خبطی ہی سمجھتے۔ اس لئے کہ باپ اپنے لڑکے کے بارے میں اکثر غلط رائے قائم کرتا ہے۔ اور غلط کو خبط کا ہم قافیہ قرار دیدیں جیسا کہ اکثر سننے میں آتا ہے تو غلط اور خبط ہم قافیہ اور ہم معنی دونوں ہو جاتے ہیں۔

بیشتر والدین اس خبط میں مبتلا ہوتے ہیں کہ فلاں شخص کا لڑکا اگر کسی کی جیب بڑی صفائی سے کتر لیتا ہے تو میرا لڑکا اس کے کان اتنے ہی صفائی سے کیوں نہ کتر لے گا۔ اس کا سے مراد وہ بدنصیب ہے جس کی جیب کتری گئی ہو نہ وہ جس نے جیب کتری ہو۔ میں نے بہت کم ایسے باپ دیکھے ہیں جو اپنی اولاد کی طرف سے کسی خبط میں نہ مبتلا ہوں۔ ان کے خبط کی منطق یہ ہوتی ہے کہ اولاد ہونے کے اعتبار سے ہر اولاد برابر۔ اس لئے قابلیت میں بھی برابر اور خوش نصیبی میں بھی برابر۔ اور چونکہ میرے بیٹے میں یہ مزید وصف ہے کہ وہ میرا بیٹا ہے اس لئے ہر بیٹے سے افضل ہے۔ اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ باپ بیٹے دونوں اس خبط میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ خود نہیں بلکہ دوسرا خبطی ہے۔ ان کو باتیں کرتے سنئے تو آپ کو محسوس ہونے لگے گا کہ آپ بھی عنقریب خبطی ہو جانے والے ہیں۔

طالب علم بالعموم دو طرح کے ہوتے ہیں کچھ خبطی بقیہ غبی۔ غبی وہ جن کے پاس گرہ کی کچھ نہیں ہوتی۔ کورس کی ساری

کتابیں ہوتی ہیں۔ دماغ اکثر غیر حاضر رہتا ہے۔ خود ہمیشہ کلاس میں رہتے ہیں۔ فیصلہ کی قوت سے زیادہ ہاضمہ کی قوت ہوتی ہے۔ پڑھنے لکھنے میں شوق کو نہیں خود آزاری کو دخل دیتے ہیں۔ وہ صرف اتنا ہی سیکھنا پڑھنا چاہتے ہیں جتنا روزی کمانے کے کام میں آئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کبھی بھی کسی خبط میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔ ان کی ساری امیدیں دُنیا سے وابستہ ہوتی ہیں دُنیا کی کوئی امید ان سے وابستہ نہیں ہوتی۔

طالب علموں کا خبط کئی طرح کا ہوتا ہے۔ ان میں بیشتر کتابی خبطی ہوتے ہیں۔ جن کی طرف اس سے پہلے میں اشارہ کر چکا ہوں۔ بعض آرٹ۔ ادب و انقلاب کا خبط رکھتے ہیں۔ کچھ قوم کا خبط رکھتے ہیں۔ قوم کا بھلا دیکھ سکتے ہیں نہ بُرا۔ بقیہ خبطی بصیغۂ متفرقات ہوتے ہیں۔ اب میں جستہ جستہ ان خبطیوں کے اخلاق و اطوار پر خیال دوں گا۔ میری مراد خبطی پر خطبہ ہے۔

کتابی خبطی سے میری مراد ان سے ہے جو کتاب پڑھ کر خبطی ہو جاتے ہیں۔ یہ سمجھتا ہوں کہ جس طرح بعض طبائع کے لئے یا بعض امراض میں بہتر سے بہتر مقامات مضر صحت ہوتے ہیں بعض بہترین کتابیں بعض طالب علموں کیلئے نقصان دہ ہوتی ہیں۔ ہمارے بعض طلبا محض اس بنا پر تباہ ہو جاتے ہیں کہ وہ انسانوں سے زیادہ کتابوں پر بھروسہ کرتے ہیں ہر کتاب ہر طالب علم کیلئے مفید نہیں ہوتی۔ کتابی خبطی قابل رحم خبطی ہوتا ہے۔ مجھے ہر خبطی سے محبت ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے نمائشی یا مصنوعی خبطی سے اتنی ہی نفرت بھی ہے۔

دُنیا کا دستور یہ ہے کہ سچے خبطی کو ہر طرح ستاتی ہے اور جھوٹے خبطی کی پرورش کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر بڑے شاعر، آرٹسٹ اور مصلح کے گرد بے شمار مصنوعی خبطی جمع ہو جاتے ہیں۔ در اصل یہ خبطی نہیں چیلے ہوتے ہیں۔ یہ خبطی اس لئے بنتے ہیں کہ ان کی بیہودگی یا نکمے پن کا محاسبہ نہ کیا جائے۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنی اس حرکت سے یہ دوسرے کی نظر میں اصطلاحاً محترم بنے رہتے ہیں۔ اس سے خوب نفع کماتے ہیں اور شریفوں کی آبروریزی کرتے ہیں۔ ہم اپنی زندگی کے ہر شعبے میں ایسے چیلے پاتے ہیں۔ اور ان سے ایک اعلیٰ مقصد، ایک اعلیٰ شخصیت اور ایک اعلیٰ قدر کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے ممکن ہے کہ اس کا سبب یہ ہو کہ ہم خود بھی خبطیوں کے زمرے میں آتے ہیں۔

آرٹ کا خبط در اصل آرٹ کا خبط نہیں ہوتا بلکہ اپنے آرٹ کا پروپیگنڈا ہوتا ہے۔ اور "اپنا آرٹ" جن لوگوں کا جیسا کچھ ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ میں ایسے آرٹ کے سامنے سر خم کرنے کو تیار ہوں جس سے انسان کی عظمت و منزلت متعین ہوتی ہو۔ اور ایسے آرٹ کا بالکل قائل نہیں ہوں جس کی خصوصیت صرف اتنی ہو کہ میں یا آپ اس کے واضع ہوں۔ اور جس کی ہر کمزوری پر صرف اس لئے فخر کیا جائے یا اس کو نظر انداز کیا جائے کہ وہ میری یا آپ کی انفرادی کمزوری ہے۔ آرٹ میں انفرادیت یا جمہوریت کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر سفلہ یا ناکارہ آرٹ کو ہاتھ لگائے اور یہ دعویٰ کرے کہ ہمارا بھی آرٹ ہے، آرٹ خدائے فن ڈھونڈھتا ہے ٹکڑگدوں سے اس کا کوئی علاقہ نہیں۔ اور خدائے فن محض ایک ووٹ سے خدائے فن کبھی قرار نہیں پاتا۔

میری قطعی رائے ہے کہ آرٹ میں انفرادیت اور جمہوریت کے خبط کی روک تھام ہونی چاہیئے۔ اور وہ صرف اس طور پر ممکن ہے کہ جس طرح بڑی بڑی مجلسوں اور نمائشوں میں اس سال کے شاہکار یا فن کار متعین کئے جاتے ہیں ان کو شہرت دی جاتی ہے اور ان کو نوازا جاتا ہے۔ اسی طرح اس سال کے نالائقوں اور ان کے مزخرافات کی بھی نمائش کی جائے۔ اور عین انصاف ہے۔ اگر ہر کس و ناکس کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ عظیم المرتبت شخصیتوں کو بے نور یا اپنی شخصیت کو اجاگر کرے تو اس کو اس بات پر بھی تیار رہنا چاہیئے کہ نالائق ثابت ہو جانے پر مردود قرار دیا جائے۔ اور عبرت کیلئے وہ یا اس کا شاہکار خود وضاحتی طریقے پر کہیں لٹکا ہوا نظر آئے۔

ہندوستان میں قومی خبطیوں کی کمی نہیں۔ قومی خبطی سے مراد وہ لوگ ہیں جو قوم کو نہ اچھی حالت میں دیکھ سکتے ہیں اور نہ بُری حالت میں۔ قوم کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی قوم کی خدمت کرنے کا خبط ہے۔ لیکن میں نے خدمت قوم کا خبط کسی ملازمت دلانے والی ایجنسی یا فوٹو کے تبادلے سے نہیں حاصل کیا ہے میں نے اس کیلئے تھوڑا بہت لہو پانی کیا ہے لیکن اس کا لحاظ رکھا ہے کہ تھوڑا کیا ہو۔ اور بہت

کیا ہو لہو کس کا ہو۔ پانی کس کا۔ کس وقت لہو کو گاڑھا رکھا جائے اور کس وقت پانی کو۔ جب تک لہو اور پانی کے ان تمام رشتوں کو پورے طور سے ذہن نشین نہ کر لیا جائے قوم کی کما حقہٗ خدمت نہیں کی جا سکتی۔ میں جھوٹ نہ بولوں گا۔ اس لئے کہ یہاں اور اس وقت سچ سچ بولنے میں کوئی مضائقہ نہیں دیکھتا۔ میں قوم کیلئے سر کی بازی تو نہیں لگا سکتا لیکن پگڑی کی بازی لگانے کیلئے آمادہ ہوں۔ باوجود اس کے کہ میں نے سر پر پگڑی استعمال نہیں کی ہے۔ میں اپنے ملک کی بڑی عزت کرتا ہوں اس لئے کہ دنیا میں میرا ہی یہ ایک ملک ہے جو اپنے خدمت گذاروں کو کبھی آزمائش میں نہیں ڈالتا اور خود ہمیشہ ہمیش سے آزمائش اٹھاتا چلا آرہا ہے۔ مجھ میں کوئی اور عیب نہیں سوائے ان عیبوں کے جو ہم قومی کارکنوں کے محاسن قرار دیئے گئے ہیں۔ اگر قوم کا راس المال بننے کی مجھ میں اہلیت نہیں ہے تو بیت المال بننے میں کیا قباحت لاحق آتی ہے۔

بات کچھ یوں ہے کہ زندگی کے اصول دو طرح بنتے ہیں، انجام پر نظر رکھ کر اور انجام سے بے نیاز ہو کر۔ ایک کو تجربہ کہتے ہیں دوسرے کو خبط۔ اگر یہ دونوں اس طرح ملے جلے رہتے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوتا ہے کہ کون کہاں ہے۔ شاید اسی لئے یہ بھی مانتے ہیں کہ سب کچھ کھو ڈالنے کے عمل کو خبط کہتے ہیں اور سب کچھ کھو چکنے کے بعد جو باقی بچے اس کو تجربہ، اصولاً تو یہ ٹھیک ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اصولاً جو بات ٹھیک ہوتی ہے اس کے برتنے میں بڑی بے اصولیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ پھر خبط کے معاملہ میں تو یوں بھی جو اصول کا قائل ہوا لوگوں کو اس کے بارے میں بڑے شبہات ہونے لگتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ خبط کب خبط کو چھوڑ کر تجربہ کے حدود میں داخل ہو جائیگا۔ یا کب تجربہ خبط کیلئے درس عبرت بن جائیگا۔ خاص طور سے ہمارے ہندستان ایسے ملک میں جہاں جسم کم اور روحیں زیادہ نظر آتی ہیں۔

میری سمجھ میں کچھ ایسا آتا ہے کہ ہندستان کی برِّ عظمیت کی طرح اس کی روحانیت بھی جو برِّ اعظم ہی کے پیمانے پر اس میں ملتی ہے اس کیلئے بیک وقت مفید بھی ہے اور مضر بھی۔ خیال اور عمل کے درمیان جتنی گہری خلیج یہاں ہے وہ کہیں اور ملنی مشکل ہے۔

یہاں اصولوں کے قطب مینار بھی ملیں گے۔ تخیل کے تاج محل بھی۔ فن کے اجنٹا بھی اور فطرت کے ہمالیہ بھی۔ لیکن ہے کچھ یہی کہ زندگی کی تدھم خزینہ لئے ان سب سے بے نیاز اور سب سے الگ تھلگ افلاس، بے عملی اور ناکامی کے شکستہ آرزو تاروں میں کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔ یہاں سورج بہت چمکتا ہے لیکن پانی بھی بہت برستا ہے اس لئے پیٹ میں آگ لگی ہونے کے باوجود آنکھوں میں ہریالی چھائی رہتی ہے۔ یہاں ہر دن ایک ہی طرح سے شروع ہوتا ہے اور ایک ہی ڈھنگ سے ختم ہوتا ہے۔ زمانہ بدلنے میں صدیاں لگتی ہیں۔ ماضی کی پناہ ڈھونڈھتے ہیں مستقبل پر عمل کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس طور پر ماضی تو درکنار مستقبل بھی ان کے ہاں ماضی ہی بن کر آتا ہے۔ اس سے اس میں کاہلی، قناعت، بیکسی اور مایوسی آگئی ہے۔ اور ان سب نے گڈمڈ ہو کر ان کو دو چیزوں کا بڑا معتقد بنا دیا ہے ایک خبط دوسرا مذہب!

آپ کے کہنے سے یہ مان لوں گا کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں لیکن اگر خواص کے بہکانے سے عوام نے یا عوام سے ووٹ حاصل کرنے کیلئے خواص نے آپ کی جان و آبرو کی دھمکی دی تو پھر ان دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھوں گا۔ لیکن اتنا تو ماننا پڑے گا کہ ہمارے ہاں ہر خبط کی اس طرح پرستش ہوتی ہے جس طرح فرانس میں عورتوں کی، امریکہ میں دولت، روس میں انقلاب، انگلستان میں گنجے سروں، جاپان میں شہنشاہ اور جمہوریت میں خروں کی!

خبط دراصل حوصلے کی اڑان اور عمل کی اس تازہ کاری کا نام ہے جس سے انسانی کارناموں کی طویل داستان میں ربط اور تسلسل پیدا ہوتا ہے اور اس میں جان پڑتی ہے۔ یہ زندگی کا طوقِ گلو افتادہ نہیں، زندگی کی بازی ہے جس کو ہار جیت سے سروکار نہیں۔ یہ مردانِ کار کے کندھوں کو کچھ نہ کچھ کر گذرنے اور کرتے رہنے کے بوجھ سے گرانبار رکھتا ہے۔ اس کی جبین بڑی سرکش و بے باک، اس کا تصور بڑا توانا اور چالاک، اس کے اعصاب بڑے مطمئن اور لاپروا ہوتے ہیں۔ اس کا سرمایہ مستقبل کے وہ خواب ہوتے ہیں جو گھوڑ دوڑ کے کھلے میدانوں، تجارت کی بھری منڈیوں، نہنگ وحدت کے اتھاہ سمندروں، عشق کے حسین خارزاروں، سیاست کی دلدلوں اور شعر و ادب

کی سکون بخش وادیوں میں کشاں کشاں لیجاتے ہیں اور زندگی یا اس کے انجام پر غور کرنیکی مہلت دیئے بغیر چپکے چپکے یقین دلاتے ہیں کہ یہی زندگی ہے جو اپنی ابتدا اور انجام بتائے بغیر خود اپنا انعام ہے۔

شاید اسی لئے انسانی تاریخ نے اپنا فرض خیال کیا ہے کہ وہ اپنے تمام خبطیوں کی یاد ہم راہیوں کو دلاتی رہے۔ اُن خبطیوں کی یاد جو نپولین وچنگیز کی طرح خوب خوب کھیلے اور خوب خوب ہارے۔ یا نیٹشے اور اقبال کی طرح ایک لامحدود اور مضطرب روح کی بازی لگا کر زندگی اور زمانہ کیلئے ایسی آیات و ہدایات چھوڑ گئے جن کو بار بار نئے نئے رُوپ میں نت نئے رنگ وآہنگ کے ساتھ دوہرائیگی مگر کہیگی ان کو خبطی ہی!

خواب اور خواب دیکھنے والوں سے انتقام لینے کا دنیا کو عجیب خبط ہے۔ اسی کو انسان اور زندگی کی جنگ کہتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس سے ڈرجاتے ہیں اور زندگی سے مصالحت کر لیتے ہیں لیکن تاریخ وتجربہ شاہد ہیں کہ زندگی سے مصالحت کرنے والوں کو سب سے پہلے چھوڑ دینے والی اور پھر کبھی نہ ان کو منہ لگانے والی خود زندگی ہی ہوتی ہے لیکن بعض سر پھرے ایسے ہوتے ہیں جو زندگی سے دبتے نہیں۔ جو نہ زمین کی سختی سے مرعوب ہوتے ہیں اور نہ آسمان کی دوری سے۔ زندگی کو ان سے اور ان کو زندگی سے بڑی لاگ ہوتی ہے۔ زندگی کی ساری پیش بندیاں۔ دُنیا کے اہم ترین تقاضے اور وقت کے گوناگوں مطالبات ان کے خبط پر قبضہ نہیں پاسکتے۔ ان کو ناکام بتایا گیا ہے اور خبطی بھی!

خبطی کو منزل کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ سفر کے مناظر ہی میں سے اپنے لئے رنگ برنگے خواب تراشتا جاتا ہے۔ اچھے سنگ تراش کی طرح جو ہر پتھر میں اپنی تخلیق کا عکس اور اس کے تمام نقوش نمایاں طور پر دیکھ لیتا ہے۔ اسے کسی چیز کا یقین نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے جنوں کی سزاوار تقریباً ہر چیز ہوتی ہے۔ وہ اپنے تخیل سے محبت کرتا ہے کیونکہ اس تصور کے شیش محل ہی میں زندگی کرمک شب تاب بن کر نئے نئے پہلوؤں سے طرح طرح کی رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس کیلئے دُنیا بہ تو فیق کی جنت ہو یا نہ ہو، دیوانہ کا خواب ضرور ہے!

(باجازت آل انڈیا ریڈیو)

منیر کمال

آمد!

وہ جو آئیں میرے دیار میں میں نصیب اپنے سنوار لوں
یہ ستارے دیدۂ چرخ کے میں انھیں کی صدقے اتار لوں
وہ جو مان جائیں تو گل بنا کے ہر اک نظر کو بکھیر دوں
رہِ کہکشاں کی طرح سے میں دلِ پُر شرر کو بکھیر دوں
میں خوشی کے گیت نکال لوں کسی خوشنوا کی ستار سے
کوئی دُکھ بھری سی کہانیاں کسی دل جلے کی پکار سے
میں غرورِ جلوۂ یاسمن کو اُڑا کے لاؤں بہشت سے
کسی اُپسرا کا کھلا کھلا سا شباب شہرِ کنشت سے
گھڑی بھر کو مانگ لوں خنکیاں میں فروغ موجِ نسیم سے
تری راہ تکتی رہے سدا یہ کہونگی جا کے شمیم سے
میں گھٹا سے کھینچ لوں شوخیاں مرے بال آکے سنوار دیں
میں صبا کے ناز اُتار لوں مری خلوتوں کو نکھار دیں
کسی حُور سے ہی طلب کرونگی میں دھڑکنوں کی گرانیاں
یہ سحاب کی سی روانیاں، یہ گلاب کی سی جوانیاں
میں سجا کے خلوتِ شرمگیں کو جمالِ جلوۂ طور سے
تجھے دیکھتی رہوں قُرب سے تجھے دیکھتی رہوں دُور سے
مری آرزوؤں میں نور ہو مرے گیسوؤں میں سہاگ ہو
مرے لب پہ تیرا ہی نام ہو مرے دل میں تیری ہی آگ ہو

جاں نثار اختر

تجاہل

کیا ہوا تو نے جو پیمانِ وفا توڑ دیا ——

میں نے خود بھی تو کسی پھول سے نازک دل کو
وقت کی ریت پہ تپتا ہوا چھوڑا تھا کبھی
اپنا پیمانِ وفا جان کے توڑا تھا کبھی
کیا ہوا تو نے جو پیمانِ وفا توڑ دیا

کیا ہوا تجھ کو اگر مجھ سے محبت نہ رہی ——

زندگی آبِ تغیّر کا فقط نہ حباب ہو
دل کے جذبات بھی ہر آن بدل سکتے ہیں
اشک خود برف کے سانچے میں بھی ڈھل سکتے ہیں
کیا ہوا تجھ کو اگر مجھ سے محبت نہ رہی

کیا ہوا پھیر لیں تو نے جو نگاہیں مجھ سے ——

آبگینوں کے حسیں قلب سے کتنی کرنیں
بے کسی عکس کے خاموش گذر جاتی ہیں
کتنی موجیں ہیں جو ساحل پہ بکھر جاتی ہیں
کیا ہوا پھیر لیں تو نے جو نگاہیں مجھ سے

کیا ہوا آج اگر تیرا شبستاں نہ رہا ——

میرے سینے میں جوانی کی تڑپتی ہوئی لَو
ہر جگہ ایک نئی شمع جلا سکتی ہے
خلوتیں اور بھی صد رنگ سجا سکتی ہے
کیا ہوا آج اگر تیرا شبستاں نہ رہا

کیا ہوا توڑ دیا تو نے اگر ساز مرا ——

چھین سکتا نہیں مجھ سے مرے نغمے کوئی
ساز کا کیا ہے کہ یہ ساز بھی گا سکتا ہوں
آج بھی ایک حسیں آگ لگا سکتا ہوں
کیا ہوا توڑ دیا تو نے اگر ساز مرا

قرۃ العین حیدر

رقصِ شرر

پارٹنر کشتی پر!

جیسوماریہ!

ہُم۔ جیسوماریہ!! (بالکل ولایتی ہو)

اوہ۔ ادھر دیکھو۔ چھتر منزل کے پیچھے پیچھے درختوں کے سائے میں گومتی کا رنگ کتنا گہرا سبز نظر آرہا ہے۔

تمہاری آنکھوں کا رنگ بھی تو ایسا ہی ہے۔ دھندلا سا سبز اور چھلکتا ہوا جیسا۔

ہوں۔

کیسی۔ میرا مطلب ہے کہ۔ نفیس بات ہے (دراصل مجھے اس سے بہتر اُردو بولنی نہیں آتی)

بہت نفیس۔ (افسوس کہ مجھے بھی نہیں آتی)

کیونکہ ہم دونوں ہندستان کے ہو کر بھی ہندستان کے نہیں ہیں۔

ہیں ہیں۔

کس قدر بری بات ہے یہ۔

بے انتہا۔

غروبِ آفتاب کی خاموش قرمزی موسیقی کے ساتھ ساتھ کشتی کھینا تمہیں پسند آرہا ہے۔

خاصا۔ (اے میرے گیتوں کے ملاح)

اجازت دو کہ عرض کروں کہ کاش شفق کی سُرخی پانیوں پر پھیلتی رہے۔ شام کی دبیز ہوائیں تمہارے خوبصورت بال اسی طرح پریشان کرتی رہیں۔ اور یہ کشتی ان نامعلوم آبی راستوں پر یوں ہی رواں رہے۔ (ٹیگور کی نظموں پر میں ایسی الفاظ کا بہترین انگریزی ترجمہ کر دیا کرتا تھا)

میرا خیال نہیں۔

اور جب میں نے تمہیں پہلی مرتبہ ۱۹۴۴ء کے جاڑوں میں مے فیئر بال روم کی اسٹیج پر سفید پھولوں کا تاج پہنے جنوبی اطالیہ کے ساحلوں کا رقص کرتے دیکھا تھا۔ (جہاں تمہارے کالج کا ڈرامہ "ماہی گیر کی لڑکی پرل" کھیلا جا رہا تھا) اور ہنستے ہنستے جب تم پھولوں کے ڈالے سنبھالے کیبنٹس سے نکل کر اپنی کار کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

بیحد طویل عبارتیں زبانی کہہ ڈالتے ہو۔ ذرا مختصر الفاظ میں اپنا مطلب بیان کرو۔

ار۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ چھتر منزل کے سائے دریا پر پھیلتے جا رہے ہیں۔ اور میں بے انتہا خوش قسمت ہوں۔

ظاہر ہے۔

شپ۔ شپ۔ شپ۔ شپ۔

تمہیں میرا اسٹروک کیسا لگا؟

اچھا ہے۔ خصوصاً نیو انڈیا کی بالکونی اور امپیڈر۔ یہ پُرسکون ندی۔ اور وہ دوسرے کنارے پر سیدھی ہوئی لمبی تاڑ کا سلہٹ اور اس کے سائے میں چھپا ہوا کیوپس کا گھر۔

جناب وہ ہمارے ہاں کا لوٹ کلب ہے۔

تمہارے ہاں کا؟

جی یونیورسٹی کا ہماری۔

اور وہ بیحد شاندار سائپل۔

موتی محل برج۔

اسی پر سے رومان خوابوں کے گیت گاتا ہوا گذرتا ہے۔!

معلوم نہیں۔

شپ۔ شپ۔ شپ۔ چاروں طرف یہ سائے طویل ہوتے جا رہے ہیں۔ فطرت کے یہ مبہم بے معنی اشارے۔ ایک نظم سنو گی۔ ہم تین دوست ہیں۔ میں اور میرا سایہ اور زرد چاند۔ شنتوفو کی رات میں جب ستاروں کے دیوتا فیوجی کو کا مقدس بربط بجاتے ہیں تو میں چیری کے درخت کے نیچے بیٹھ کر یاماسیتا کے چاولوں کی سرخ شراب پیتا ہوں۔ لیکن چاند اور میرا سایہ شراب نہیں پی سکتے۔ پھر

میں شاکو مارا کے مندر میں واپس چلا آتا ہوں ۔ ہم تین دوست ہیں ۔ یہ جاپانی نظم تھی ۔ چینی نظم سناؤں ۔ یا روسی!

اُف ۔ خدا کیلئے چپ رہو ۔

شٹ ۔ چپ ۔ شٹ ۔

کیا سوچ رہی ہو ؟

کچھ نہیں ۔ ارے یہ کون ؟

کہاں ؟ آنکھوں کے پپوٹے بھاری ۔ ہونٹوں پہ لپٹے لی دھاری ۔ یہ کون آیا ۔ کون آیا ؟

بیحد لغو ہو ۔

لیکن اس طرف اتنی دلچسپی سے کیا دیکھ رہی ہو ۔ اس بیولش کے گھر کے پیچھے سے کوئی رومال ہلا رہا ہے ۔ ہوگا کوئی ۔ وہ ہے یا تو یہ نغمہ سو جو سترھویں صدی کی ـــ

ارے وکٹر ۔ قطعی وکٹر ہے ۔ وِیو آؤٹ کر رہا ہے بیچارہ اتنی دیر سے ـــ

کون ہیں یہ بزرگ ؟

وکی ۔ وک ۔ ٹر ۔ ہیلو ۔ سی ۔ سی ۔ شوہ ۔

(ارے اس نے تمہاری آواز نہیں سنی ۔ بہرہ ہے ۔

وکی آئی سے ۔ ستو ستو ستو وہ بھی سیٹی بجا رہا ہے ۔ بہترین سیٹی بجاتا ہے)

آخر یہ کون صاحب ہیں جن سے آپ اسی بے تکلف ہیں ـــ

وکٹر رونلڈ احسن کمار سنگھ ـــ لا مارٹینیر میں میرے ساتھ پڑھتا تھا ۔

بہرحال ، ایک تھرڈ کلاس اینگلو انڈین لڑکے کا تمہیں اس طرح رومال ہلانا میری نظروں میں سخت نامناسب اور معیوب بات ہے ۔

کیا فرمایا آپ نے ۔ تھرڈ کلاس ۔ جناب والا وہ سر مہاراج سنگھ کا بھانجا لگتا ہے ۔

وہ ۔ ـــ

شٹ ۔ شٹ ۔ چپ ۔ شٹ ۔

وہ ۔ شوہ ـــ

لالہ!

فرمائیے!

میں تم سے صمیم قلب سے معافی چاہتا ہوں ۔

اور میں آپ کو اسی صمیم قلب سے معاف کرتی ہوں ۔

اچھا تو باتیں کرو ۔

گومتی کے پانیوں پر اڑنے والے نیلے پرندے دیکھے ہیں تم نے ۔ (جنرل قسم کے Topics پر گفتگو کی جائے گی ۔)

تم ۔ روکی جھیل میں دیکھے تھے ۔ اور سارس ۔ اس کے علاوہ شطرنج بھی نہایت عمدہ اور مفید پرندہ ہوتا ہے ۔

کس قدر بد دست ہو رہی ہیں آپ ۔

لالہ ۔

ارشاد ۔

کبھی تم نے یہ بھی غور کیا (قطع نظر اور تمام باتوں کے) کہ محبت کتنا اسٹیریل ، خوبصورت ، پیارا خیال ہے ۔

رلش ۔ (لفظوں سے محبت پر آپ خوب پہنچ گئے)

لالہ ۔ ایسے خوبصورت وقت میں (جبکہ آئینہ آب پر موجۂ ساداب پر ، سایہ مہتاب پر ، منظر شب تاب پر ـــ بہے مری کشتی رواں اور میں ہوں نغمہ بار) اگر تم نے اپنی فلسفیانہ سنجیدگی چھوڑ کر تھوڑی دیر رومان کی باتیں نہ کیں تو یقین جانو ان تمام چیزوں کے ساتھ (جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے) سخت زیادتی ہوگی ۔ (لہٰذا محبت کے متعلق اپنی رائے مفصل بیان کرو)

روٹ ۔

ایں!

ہوہ!

(جاپانی زبان میں بولتی ہو ۔) تو یہ افواہ درست تھی کہ آپ انتہا سے زیادہ میٹر آف فیکٹ ہیں ۔

قطعی درست ۔ تم سے کس نے کہا تھا ۔

عارف کہہ رہا تھا بیچارہ ۔ حالانکہ اس کا خیال تھا کہ یہ اس کی پسند کی منگنی ہے ۔

پسند کی منگنی ۔ اس سے زیادہ تو کاروباری چیز اور کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی ۔ جیسے دنیا کی اور بہت سی باتیں ایک خالص پروگرام کے ماتحت چل رہی ہیں ۔ رات کو سویا صبح کی جائے ۔ دوپہر کو یونیورسٹی کے لکچر ، شام کو کافی ہاؤس ـــ

اور اس وقت تمہارے ساتھ یہ کشتی رانی !

ایں ؟ لیکن اس رومان آفریں ——

اس سے آگے پہنچکر سارا رومان کوچ کر جائیگا۔

پر اگر تم میرا یقین کرو ——

تم جیسے گدھوں پر یقین کرنا کس —— گدھے نے بتایا ہے

میرا خیال ہے تمہیں اپنی زبان کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔

بہر کیف۔ آپ اطمینان رکھئے۔ میں دہلی کلاتھ ملز کے کپڑے کے کوپنوں اور پولسن مکھن کے ڈبوں کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچ سکی۔ لیکن آپ اور عارف اور آپ کے سارے فتیلے والے گلنار شفق کی سرخی اور تبسم کے گیت پر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔

اور اگر اس وقت تمہیں بتاؤں کہ میں تم پر بالکل —— مرتا ہوں تو تم کیا کروگی ؟

بس فوراً یہ کشتی اُلٹ دونگی تاکہ ڈوب کر تم زیادہ آسانی سے مر سکو۔

کشتی اُلٹ دوگی ؟ خدا کی قسم —— اُفوہ ! غالب نے یا شاید ذوق نے خوب کہا تھا ؎

احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

اس کے علاوہ جذبی کہتا ہے۔ جب کشتی ثابت و سالم تھی ——

ہائے اللہ۔ کس قدر برجستہ اور باموقع شعر پڑھتے ہو واقعی۔

تسلیمات۔ تسلیمات۔ عرض کیا ہے کہ —— گیتوں کا طوفان اٹھا ہے اپنی بینا تیز کرو —— یعنی غور کرو کہ ان الفاظ میں طوفان۔ ریڈیو آرکسٹرا اور شاعر کے جذبات کی باہم چپقلش کو کس خوبی سے پیش کیا گیا ہے —— محبت کے فلسفے پر نوٹ لکھتے ہوئے اس دوسرے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ ——

خدا کیلئے تم چُپ بھی ہوگے یا نہیں۔ محبت۔ محبت۔

واللہ۔ خوب۔ محبت کا افسانہ اور ان لبوں سے ——

خوشا آں زبانے نہے آں بیانے۔

خوشا آں —— رازؔ بھی بڑے پایہ کا شاعر ہوگا ایک دن۔ علی گڈھ میں میرا کلاس فیلو تھا۔ اور سنو —— کہتا ہے کہ۔

ارے تم تو واقعی اس قدر گلنار ہو رہی ہو جلیبے ——

اتنے بکواسی ہیں آپ خدا کی قسم —— اب میں سچ مچ میں رونا شروع کر دوں گی۔

اچھا تو آؤ پھر تمہارے مطلب کی کاروباری باتیں کریں۔ بمبئی مارکیٹ میں پچھلے تین گھنٹے میں دکھی کپاس اور خاندیش کی موم کیلی ساڑھے بینتالیس فیصدی کے بھاؤ سے گر گئی ——

اور گینیش فلور ملز کے پریفیرنس شیرز ——

شپ۔ شپ۔ چپ۔ شپ۔

ہائے اللہ اگر میں تمہیں قتل کر سکتی —— تم اسے بُرے کیوں ہو ؟

اور تم اتنی پیاری سی گڑیا کیوں ہو۔

کاش تم میں عقل کرتی ہو۔

کاش تم اتنی فاضل نہ ہوتیں۔ (ورنہ میں تم سے شادی کرلیتا)

پارٹ ٹو —— کینٹین میں

جیسو ماریہ !

ہا —— جیسو ماریہ !!

سیلما —— چاندنی رات کا گیت، موسم گل کے نغمہ، ناروں کی شراب ——

اندر آجاؤ —— میری نیلی آنکھوں والی سینورینا ——

اور آج کی رات کو محض آج کی رات سمجھو۔

سیلما۔ تمہیں کونسی شراب پسند ہے۔ اسکوچ —— شیری —— ورموتھ —— کوک ٹیل بناؤں ؟

دونٹ مائنڈ اے لٹل شیری ——

اور آپ —— مس —— ار —— مس ——

—— لالہ رُخ ——

مس لالہ رُخ۔ وونٹ یو لائک ٹو ——

نو۔ تھینکس، کرنل —— آئی ڈونٹ ڈرنک ——

اوہ ——

—— فرالین سیلما ماریا فرنزبرگ۔

مس ۔۔ ں — !

۔۔ ۔۔ ۔ لو —

مس سالو ہم دونیں دوست تاب ہوں گے ۔

سیلما ما یا ۔ لیبا وماتیک اور حسینوں جیسا نام ہے (میری بتائی ٹوٹی پھوٹی فرنچ کا سارا ار در لگادیے پر بھی تم خوش ہو رہی ہو ۔ یہ بات ٹھیک نہیں)

ہمارے اوٹیکس کا ستبڈ بےحد پیارا ہے ۔

بات کے تہوار کے بعد بھی ہم ملا کریں گے نا ۔ تم لکھنؤ ہی میں رہتی ہو ۔ لایلا میں مجھے تم بہت اچھی لڑکی معلوم ہو رہی ہو ۔ حالانکہ عموماً غیر ملکی مجھے ذرا بھی نہیں بھاتے ۔ کیونکہ ہم لوگ بہت سخت قوم پرست ہیں ۔ میرا بھائی بھی تمہیں بہت پسند کرتا ہے ۔

تمہارا بھائی ؟

ہاں ۔ بہترین لسٹری کلر ہے ۔ اس کینٹین کا ٹھیکہ اسی کے پاس ہے ۔

میں اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی ۔

۔۔ سیلما ۔ آج کی رات ۔ آج کی رات ۔ کتنی بیوقوفی کی باتیں ۔۔ رسا ۔۔ کی ساری ۔ حنکہ ۔ حنکہ خاموش ہوا یام کے پتوں کو آہستہ آہستہ ملا رہی ہے ۔ اور باہر سر آسمان پر رو پہلے ستارے جھلملا رہے ہیں ۔ اور کل جب میں یہاں سے سیکڑوں میل دور جا چکا ہوں گا ۔ یہ پتے اور یہ ہوا تمہیں یونہی کہانی رہیں گی ۔

سیلما ۔

ہاں ۔

۔ سامنے ۔۔ رتی ہو ؟

وہ کون ہے ؟

میرا منگیتر ۔ آئیتل فیالنے —

آئیتل فیالسے ۔

یَپ ۔

اور وہ — دوسرا ۔

وہ کمال ہے —۔ انتہائی مانوس آدمی ۔ اور یہ میں ہوں ۔ لالہ رخ (سہ اصل یہ نام نہیں ہے ۔ لیکن چونکہ اس نام میں رومان زیادہ نظر آتا ہے اس لئے میں اسے آپ کو یہی کہلوانا زیادہ پسند کرتی ہوں) ۔ اور تم — محض ایک ہنگرین سی سال روم ڈانسر — اور یہ اپریل کی رات ہے — اور ہم کینٹین کے باہر پائن کے سائے میں سبز بید کی کرسیوں پر بیٹھے انتہائی بے معنی باتیں کر کر کے بےحد خوش ہو رہے ہیں ۔ اور پہلی مئی کے جشنِ بہاراں کی شام کو تم پہلے ڈیبوپ کے سبزہ زاروں کا ناچ دکھلاؤ گی جس کیلئے تم کو ساڑھے تین سو روپے جنگی فنڈ میں سے دیئے جائیں گے — سیلما ۔

ہاں ۔

کیا خیال ہے تمہارا ؟

سب خوب ۔

نہیں میرا منگیتر پسند آیا ؟

نہیں ۔

اور کمال ؟

نہیں ۔

میرا بھائی ؟

وہ بھی نہیں ۔

وہ ۔ خیر تمہارے لئے کیا کیا جائے ؟

کچھ نہیں ۔ شکریہ ۔

تمھیں ہندوستان کے لڑکے اچھے نہیں لگتے ۔

بہت اچھے لگتے ہیں ۔

کیونکہ بہت ویل ٹریسڈ ہوتے ہیں ۔ بڑی عمدہ انگریزی بولتے ہیں ۔ بےحد اسٹائیل سے پیار کرتے ہیں ۔ انتہائی احمق ہوتے ہیں ۔ لیکن انتہائی عقل مند نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ تمہارے ملک کے لڑکے ایسے نہیں ہوتے ۔

نہیں ۔

— فرالین سیلما ۔

ہاں ۔

تمہاری ماں کون تھی ؟

اس کنٹریکٹ میں میری ماں کا ذکر بھی ضروری ہے ۔ ؟

نہیں یونہی پوچھ رہی ہوں ۔ ازراہ ہمدردی ۔

اچھا، شکریہ ، بوڈاپسٹ میں ڈوبیاں بھیجی تھی —
مرگئی —
اوہ چچ چچ چچ — اور باپ ؟
اس سے بھی بیحد ہمدردی ہے ۔ وہ برلن کے ایک
لوہے کے کارخانہ میں فورمین تھا ۔
نازیوں نے مار ڈالا ؟
نہیں ، خود ہی مر گیا ۔ خودکشی کر کے ۔
اوہ ۔ ہاؤ ریئلی سیڈ —— برلن واپس جانا
چاہتی ہو ؟
نہیں ۔
کیوں ؟
وہاں کے نائٹ کلب اجڑ چکے ہیں ۔ اور یہاں روز
ایک نیا نائٹ کلب قائم ہو رہا ہے ۔
تو تمھیں ہمارا ملک پسند ہے گویا ۔
بہت ۔
سیلما ۔
تم نے پولٹ گوڈرڈ اور اَین ستیرنڈس کو دیکھا ہے ؟
نہیں — تم نے دیکھا ہے ؟
ہاں ۔ دہلی کے روشن آرا کلب میں ۔ دونوں ہالی ووڈ
سے ہندستان اتحادی فوجوں کو محظوظ کرنے کیلیے آئی تھیں ۔
(جی چاہتا ہے بیورلی نکولس کو پکڑ کر کھا جاؤں ۔)
بیورلی نکولس کون ؟
ارے تم بیورلی نکولس کو نہیں جانتیں — اس نے
ہمارے متعلق ایک سخت بیہودہ کتاب لکھی ہے ۔
اچھا ۔ میں کتابیں نہیں پڑھا کرتی ۔
ارے ۔ پھر کیا کرتی ہو ؟
کچھ نہیں ۔
اوہ —
— ہلو چکّو ۔ چچ چچ چچ ۔
سیلما یہ کس کا اتنا سوئٹ سا بچہ ہے ۔
میرا ۔
تم — ہا — را — ؟
ہاں ۔ کوئی اعتراض نہیں ؟

یقیناً نہیں ۔
(تم ایک زبردست سماجی انقلاب کی قائل ہو)

. . . .

— کبھی اللہ — واقعی — اُفوہ —
کیا ہو رہا ہے ۔
فلسفہ حیات کی تفسیر ۔
اہم — کب سے ؟
— میں ایک جدید ترطرز کی نظم لکھ رہی ہوں — (ایک
سفید فام بال روم ڈانسر سے متاثر ہو کے)
فرمائیے ۔
یہ — آ سیلما ماریتا — آج کی رات (جسے محض آج
کی رات سمجھ)
اے اجنبی عورت —
ٹھیرو ۔ اس رفتار سے بہت دیر لگے گی ۔ لکھو ۔
یہ ڈنیا ایک کینٹین ہے ۔
یا میونسپلٹی کا دفتر —
ایک آرمی سٹریکر کے بھاری ٹرک کا گھومتا ہوا پہیہ ۔
تو لیا ۔ یوتری کا
خوبصورت تشکردان حسن کا
چینی کا روغن بہت جلد اتر
جاتا ہے
چنانچہ میں چپ کھڑا ہوں زندگی کے موڑ پر
اور آمری جان میرے پاس دریچے کے قریب
یہ ڈرائنگ روم ہے
اور یہ پائپ ہے میرا
اے اجنبی عورت
— ٹھیرو ۔ یہ تو تم چُرا رہے ہو صفا
چپ چاپ سنتی رہو ۔ آگے لکھو ۔ —
ساقی کی اک نگاہ پہ لہرا کے پی گیا ۔ رحمت کو باتوں
باتوں میں بہلا کے پی گیا ۔ ارے میاں گھبرا کے پی گیا — اجی
ٹھکرا کے —
یہ ۔ اشد کی مشہور غزل ہے ۔
اچھا آپ میری جان پر کرم کیجئے ۔

لیکن مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔

ارشاد۔

کیا آپ وہی عارف ہے، اس نامعقول سے جس کے آگے سارے کالج ہاؤس ڈیبیڈی پانی بھرتے ہیں (اور جو بے انتہا اسٹائل سے ہلا کر پائپ پیتے ہوئے خالص ولایتی انگریزی بولتا ہے) شادی کر رہی ہیں۔

جی۔ (اور کمال تھا۔ آپ اس کی ترجمانی اور نمائندگی فرما رہے تھے)

لیکن۔

اچھا۔ کمال صاحب ایک کام کیجئے۔ یہاں سے تشریف لے جائیے فی الحال۔

— اوہ لالا۔ کتنے خوش رنگ پیارے سے پھول ہیں۔ کہاں سے خریدے؟

شکریہ۔ ہمارے ہاں پھول خریدے نہیں جاتے ہیں میرے منگیتر نے اسے باغ سے صبح بھیجے تھے (ہماری دکانوں میں صرف مصنوعی پھول بکتے ہیں)

اوہ۔ تمہارا منگیتر۔ آئیڈیل ڈیا لنے آئی ہیں۔

ہاں اس سے ملو۔ دفتر سے آکر صوفے پر یہی اکتایا ہوا سا بیٹھا ہے۔ جوائنٹ مجسٹریٹ ہے یا اسی قسم کا کوئی بڑا سا کام کرتا ہے۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ پر ایسا رعب ڈالنا چاہتا ہے جیسے مجھ سے شادی کر کے مجھ پر بڑا عظیم الشان احسان کئے دے رہا ہے۔ سلی گوس۔

ہماری منگنی کی اطلاع گزشتہ مہینے آئیڈیل طور پر اخباروں میں چھپ چکی ہے لیکن ہم نے اب تک بہت کم باتیں کی ہیں۔ (موسم اور سینما کے متعلق) ہم دونوں ایسی ایسی جگہ پر بہترین قسم کے منگیتر ثابت ہوئے ہیں۔ کرکٹ اور متانی۔ وہ ستر میل کی رفتار سے کبھی ڈرائیو نہیں کرتا۔ بس آپ گرلز کی تصویروں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ بیچارہ کو موویر یا فلیکس کہتے اسے نہیں شرما گیا۔ چار آنہ پوائنٹ سے کبھی برج نہیں کھیلتا۔ صبح بہت جلد اٹھ جاتا ہے سگریٹ کے دھوئیں کے حلقے ہرگز نہیں بناتا۔ (اور کمال صاحب جو کچھ اس کے متعلق بیان کرتے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔) لیس اور لوکو سب

اور لوپ نہیں کہا۔ ہم دونوں کا جب کسی دوسری جگہ پر ملنا ہو جاتا ہے تو دونوں فوراً از راہ اخلاق تھوڑا سا شرما کر دوسروں سے مختلف سنجیدہ موضوعات میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ (اسی لئے میں تم سے یہ باتیں کر رہی ہوں۔)

مجھے انتہائی مسرت ہوئی تمہارے منگیتر سے مل کر۔

اور یہ کمال صاحب ہیں۔ آپ چار پانچ لڑکیوں سے بیک وقت عشق فرماتے ہیں۔ اور ہر تیسرے منٹ پر شعر پڑھتے ہیں۔

شعر!

ہاں۔ ہمارے ہاں کے ڈان جان شاعروں اور کتابوں کے حوالے پہلے دیتے ہیں اور اپنا مطلب بعد میں بیان کرتے ہیں۔

اس کم عمری میں خاصا وسیع تجربہ رکھتی ہو۔ یہ بھی تمہارے ملک کی خاصیت ہے۔

در اصل ہمارے خطۂ زمین کی گرم ٹروپیکل آب و ہوا کی وجہ سے —

قطعی۔

تم لپ اسٹک کیوں استعمال کرتی ہو۔

تم بھی تو —

لیکن میں محض ایک بال روم ڈانسر ہوں۔ ہمارے ہاں کوئی اعلیٰ خاندان لڑکی میک اپ کا استعمال نہیں کر سکتی۔

تم نے زندگی کو جمالیاتی احساسات سے علیحدہ کر دیا ہے۔ اور ہم جذبات و احساسات پر مرتے ہیں۔ آرٹ اور خوبصورتی کے پرستار ہیں (تم نے لکھنؤ آرٹ اسکول کی نمائش دیکھی ہوگی)

یقیناً۔ یہی وجہ ہے غالباً کہ تمہارے کافی ہاؤس آرٹ اور خوبصورتی کے پرستاروں سے پُر ہوتے ہیں۔

اوہ سلما۔ نہ جانے تمہارے کیسے خیالات ہیں۔ تمہارے علاوہ کوئی اور غیر ملکی خصوصاً امریکن جب ہم سے ملتے ہیں ہماری ایک ایک چیز کی تعریف کرتے ہیں۔ ہماری رنگ برنگی ساریاں، ہمارے سیاہ لمبے لمبے بالوں میں سجے ہوئے کنول اور یاسمن کے پھول، ہمارے مانی پوری رقص — وہ کہتے

ہیں کہ چغتائی کے نقوش اور اجنتا کے ابھاروں میں جان پڑ گئی ہے۔ (اس اتوار کو ایسٹ اینڈ ویسٹ فریٹرنٹی کی میٹنگ میں چلنا۔ تمہارے خیالات ٹھیک ہو جائیں گے)

اور یہ میرا بھائی ہے۔ فوج میں تھا لیکن جب ہمارے یہاں ٹھیکوں کا کام حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ تو وہ کسی ترکیب سے ملازمت چھوڑ کر گھر آ گیا۔ بڑی بڑی تجارتی اور قومی فائدہ کی اسکیمیں ہیں نہ۔ اس کے دماغ میں۔ علی گڑھ میں میڈیکل کالج قائم ہو جانے پر وہاں ایک کافی ہاؤس کھولے گا۔ (تاکہ ملت کے فرزندوں کو اسٹیشن جانے سے نجات ملے۔) اور پھر اعلیٰ کاروباری تجربہ حاصل کرنے امریکہ جائیگا۔

پارٹ تھری ـــــ فائنل

ـــ اپنے نیلے پردوں والے دریچے میں سے صرف ایک بار اور جھانک لو۔ آخری بار ـــ پھر جب تمہیں نیند آ جائیگی اس وقت ساحل بہت پیچھے رہ چکا ہوگا۔ اس گیت کی لہریں تمہیں فراموش کر دینگی جن کے سہارے سہارے بہار کا چاند آسمان کا چکر لگاتا ہے۔ آہستہ آہستہ قدم رکھو سمندر کی سبز موجیں ریت پر اپنے نشان چھوڑتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ بہت دور تمہاری خوابوں کی کشتی سمندر کی ایک اجنبی کرخت چٹان سے ٹکرا کر ڈوب چکی ہے۔ اس کے ٹوٹنے کی آواز، لہروں کا غمگین نغمہ اب بھی تمہیں سنائی دے رہا ہے دھوئیں کے ان نیلے بادلوں کے پرے سے کوئی تمہیں پکار رہا ہے۔ آخری بار انھیں جواب دیدو۔ پھر وہ آوازیں واپس چلی جائیں گی۔ اپنا دریچہ بند کرنے سے پہلے، سوچو۔ وہ تحو وہ گیت، جو تم انھیں نہ دے سکیں ـــ وہ بہت آگے نکل چکے ہیں۔ ان کا پیچھا کرنے کی تم میں ہمت نہیں۔ اس شکست کا خیال کرو جو ایک شاہین کو ایک اونچی چٹان پر سے گرتے ہوئے محسوس ہو سکتی ہے۔ وہ راہیں کہاں کھو گئیں جن کے سبز کناروں پر مسرتوں کے جوان اور خوبصورت چرواہے اپنی رنگین بانسریاں بجایا کرتے تھے۔ اور جہاں پہاڑیوں کے پرے سے روپہلی تلواروں کی جھنکاریں سنائی دیتی تھیں ـــ اپنی آنکھیں، اپنے لب بند کر لو۔ اپنی پگڈنڈیوں پر سے گذرتے ہوئے ہم نے خیالوں کے اونچے ایوان سجائے تھے۔ ہم ان چٹانوں پر کھڑے تھے۔ لیکن ہمارے پرچم مخالف طوفانی ہواؤں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اور آج جبکہ تم زرد بالوں اور نیلی آنکھوں والے بیگ گراؤنڈ سے بہت دور ہو جو تمہارے دریچے کے پیچھے آتا ہے وہ بیک گراؤنڈ ہوتا ہے سیلما سیلما ـــ

ـــ ہوتے ـــ ہل ـــ وہ سستی سی دو علی چھوکری جو ہماری کینٹین کے ہندستانی کنٹریکٹر کورینس کے اسٹال پر چوکو بار زبیچتی ہوئی مل گئی تھی۔

ہنری! مجھے پچاس روپئے چاہئیں۔

اہم۔ نہیں دے سکتا۔

ایک ہفتے سے مانگ رہی ہوں۔

میرے پاس نہیں ہیں۔ اپنے کالے ہندستانی دوستوں سے لو۔

تم ـــ بیحد سور ہو۔

اور تم شیطان کی اپنی بیٹی۔ فائی فائی ـــ فو ـــ

(جنگ ختم ہوگئی۔ ہم فاتح ہیں)

ـــ فائی فو ـــ جنگ ختم ہوگئی ـــ خدایا تیرا شکر۔

آج شام کو ہم چراغاں دیکھنے گنج حضرت گنج چلیں گے اور پھر امبیسڈر (کیونکہ دونوں کافی ہاؤسوں میں ساری یونیورسٹی اس قدر بھری ہوتی ہے کہ بڑا اوز اعجیب سا لگتا ہے وہاں جانا) اوہ۔ کیسے خوش ہیں ہم آج ـــ اور سیلما تم چرچ کیلئے اتنک تیار نہیں ہوتیں۔ چھاؤنی کی طویل اور چمکیلی سڑکوں پر پولیس کی گارد خاموشی سے ٹہل رہی ہے کیونکہ گورنمنٹ ہاؤس کی سروس کیلئے سینٹ پال جانے والا ہے۔ اور مہاراجہ جہانگیر آباد کی لمبی سیاہ کار کسی انتظام کے سلسلہ میں ان سڑکوں پر سے بار بار تیزی سے گزر رہی ہے۔ اور ان کی کوٹھی کے پھاٹک میں سے نکل کر کلکتہ لامارٹینز کے سیاہ پوش لڑکے قطار در قطار سیٹیاں بجاتے چرچ جا رہے ہیں۔ لفٹ ـــ رائٹ۔ لفٹ ـــ رائٹ۔

اوہ خدا۔ ہماری آزمائش کا صبر آزما زمانہ نفرت کے ترانے گاتا ہوا آج آخر ختم ہو گیا۔ ظلم اور تشدد کی اندھیری طاقتوں کے طوفان کے مقابلہ میں ہم اور ہمارے ساتھیوں نے کتنی عظیم الشان قربانیاں پیش کیں۔ مصائب کا کیسی بہادری اور مسکراہٹ کے ساتھ سامنا کیا۔ اور کیا مضائقہ تھا جو ہندستان کے ایک پست سے خطہ کے چند لاکھ نفوس (جو صدیوں سے

[illegible] جنھوں نے [illegible] کے عیر ملکیوں کو کتا میں [illegible] میں اضافہ [illegible] طرف [illegible] اور جمہوریت کی [illegible] پیشکش تھی۔ [illegible] ملکوں سے [illegible] کو ساتھی [illegible] کوشش [illegible] تبلیغ کی اور [illegible] قوموں کے [illegible] اپنی کار [illegible] ساڑھے چار [illegible] اور روس کی عورتوں نے کارنامے [illegible] اور روس۔ [illegible] اور روس۔ کیا مہیں نہیں معلوم [illegible] دن رات اور رات [illegible] پھلوں اور [illegible] کریگی [illegible] کیلئے اونی چیزیں، مٹھائیاں، [illegible] تیار کیں [illegible] آرمی کی، [illegible] کے بعد [illegible] کیا۔ ہفتہ میں صرف ایک بار [illegible] رسالے اور کتابیں [illegible] ہسپتالوں میں بھیجیں۔ [illegible] کے علاوہ بنگال ریلیف کیلئے [illegible] ہوسٹل میں شاندار [illegible] منعقد کر دیئے۔ تم نے دنیا کو جمہوریت کیلئے محفوظ بنایا ہے۔ ہم [illegible] کے مشکور ہیں۔ [illegible] امن اور صلح کی خوشگوار [illegible] ہے۔ [illegible] پاکستان کے خواب دیکھنا انتہائی حماقت ہے) [illegible] انسانی۔ پائندہ باد عالمگیر جمہوریت۔

جانی تو۔ جنگ ختم ہوگئی۔ اُف کمال۔ مجھے سنبھالو۔ میں بیہوش ہوئی جا رہی ہوں ——— *Horro - Horror*

جنگ ختم ہوگئی۔ اس نے کہا۔ اور تم فاتح ہو۔ یہ تمہارے جشن فتح کی رات ہے۔ اور تم انگریز ہو اور میں جرمن۔ تم میرے پاس رقص کیلئے آؤ گے۔ میں تمہیں پیار کرونگی۔ تم مجھے چومنے لگ [illegible] گے اور [illegible]۔ جانتے ہو۔ میں تمھیں شوٹ

[illegible] ریوالور کے [illegible] سے سگریٹ [illegible] حسب ہو [illegible] شراب خانہ [illegible] شوٹ کر دونگی پھر تم مر جاؤ گے۔ ایک کے بعد [illegible] کی بوتلیں لنڈھاتے ہوئے [illegible] کمشنر میں [illegible] ملٹری پولیس [illegible] اور ایمبولینس کار [illegible] آفیسر کمانڈنگ اس [illegible] آئی سی ایس کو جو اس [illegible] کا انچارج ہے۔ اور وہ [illegible] آئی سی ایس [illegible] اس ہندوستانی کنٹریکٹر کی بہن کو [illegible] دہشت ناک خبر سے بیہوش ہو کر [illegible] سب بیہوش ہو جائیں گے۔ اوہ [illegible] کس قدر لذیذ، مسرت بخش خیال ہے۔ پھر اس نے سچ مچ [illegible] ریوالور کا نشانہ بنا دیا۔ اُف کمال۔ کمال۔

اس۔ جان سے مار ڈالا۔ اور تم واقعی بیہوش ہوئی جا رہی ہو۔ کسقدر دلکش انداز ہے۔ کاش میں شاعر ہوتا۔ علاوہ ازیں تم اس وقت قطعی ان بے انتہا ترقی پسند خاتون افسانہ نگار کی طرح [illegible] جو حسب پچھلے دنوں ریڈیو اسٹیشن پر سیاہ رومانٹک قصے میں ملفوف، ایک ڈرامہ میں حصہ لیتے ہوئے مائیکروفون پر براڈکاسٹ کے دوران میں ایک مرد آرٹسٹ کی زبانی خود کو لفظ "پیاری" سے مخاطب [illegible] (یقین کرو تمہارے دوست کی اس سنی [illegible] سے میرے قلب کو انتہائی صدمہ پہنچا (لیکن منیت ایزدی یہی تھا) [illegible] حملہ تھا۔ اسکے ختم ہونے کا انتظار کرتی رہی ورنہ اب تک اطمینان سے بیہوش ہو چکی ہوتی) *Shocking* ——— اور پھر جب عارف معائنہ کیلئے موقعہ واردات پہنچا تو شیطان کا چھوٹا بھائی وہ کمبخت بچہ اسے دیکھتے [illegible] چلا چلا کر دیر تک روتا رہا۔ اف۔ (فانی فو)۔

[illegible] (فانی تو) لالہ۔ تمہاری دھندلی سی سبز۔ چمکتی ہوئی آنکھیں [illegible] پر آمادہ نظر آتی ہیں۔

وہ۔ بچہ۔ اور۔ عارف۔

یہی زندگی کے کاروبار کی ایک شاخ تھی (یعنی برانچ آفس) رومان اور سچائی۔ اور۔ اور یہ تمام خرافات، زندگی کے خالص تجارتی پروگرام میں قطعی نہیں سما سکتیں (بہذا اللہ رحم پیاری) اس *Shocking* واقعہ کو بھول کر گرمی کے ٹریکون پانیوں پر چلو جہاں میں تمہیں وہ جاپانی نظم سناؤنگا جو شنگھائی کی رات میں یا ماتسیٹا کے سایہ تلے فوجی کو مار ڈالنے کا ساز بجاتی ہے۔

کسوٹی

ڈاکٹر عندلیب شادانی

عربوں نے جس وقت ایران کو فتح کیا تو اُن کا مذہب، اُنکی زبان، اُن کی تہذیب، اُن کا تمدّن، اُن کے عقاید و خیالات حتٰی کہ اُن کے توہمات سارے ایران پر چھا گئے۔ اور اس طرح چھا گئے کہ ایرانی زندگی کے ہر شعبے میں عربیت جھلکنے لگی۔ تقریبًا ڈھائی سو سال تک ایرانی اپنی زبان اور اپنی ادبیات کی طرف مطلق توجہ نہ کرسکے۔ لیکن رفتہ رفتہ انہیں اپنی اس کمی کا احساس ہوا۔ اس ڈھائی سو سال میں عربی اور قدیم ایرانی زبانوں کی آمیزش سے ایران میں ایک نئی زبان تیار ہوچکی تھی جسے آج ہم فارسی کہتے ہیں۔ تیسری صدی ہجری میں ایرانیوں نے جب فارسی میں باقاعدہ شاعری شروع کی تو اُن کے سامنے عربی شاعری کے نمونے موجود تھے۔ قدرتی طور پر یہی نمونے اُن کی شاعری کا سنگِ بنیاد قرار پاتے۔

عربی شاعری صرف قصیدے تک محدود تھی اور مدح، ہجو، مرثیہ، غزل، دانش و حکمت کی باتیں، مناظرِ قدرت کا بیان، سب کچھ قصیدے ہی میں ہوتا تھا۔ عرب کی سادہ زندگی اور اس کی محدود ضرورتیں اپنے اظہار کے لئے قصیدے سے زیادہ وسیع میدان کی محتاج بھی نہ تھیں۔ اس کے علاوہ عربی میں ہم قافیہ الفاظ کی اتنی بہتات ہے کہ ایک طویل قصیدے کے لئے حسبِ ضرورت قوافی بہ آسانی مل سکتے ہیں۔ فارسی میں یہ سہولت نہ تھی۔ اس کے علاوہ ایران ایک قدیم تہذیب و تمدّن کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ ایرانیوں کی زندگی کے تکلّفات، ان کی گوناگوں ضرورتوں کا پھیلاؤ۔ اُن کے خیالات کی نزاکتیں صرف قصیدے کے محدود پیمانے میں نہیں سما سکتی تھیں خصوصًا رزم و بزم کی طویل داستانوں کے لئے قصیدے میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس لئے مثنوی وجود میں آئی۔

جسے ہم رباعی کہتے ہیں اس کا ایرانی نام دوبیتی اور ترانہ ہے۔ ترانے کا وزن خصوصیت کے ساتھ اہلِ ایران کی طبائع اور ایرانی موسیقی سے بہت زیادہ مناسبت رکھتا ہے اس لئے رباعی ایجاد ہوئی۔ قصیدے کی تشبیب کو قصیدے سے الگ کرلیا تو غزل بن گئی۔ قصیدہ بجائے خود باقی رہا۔ اس طرح فارسی نظم کی چار اہم صنفیں ہوگئیں۔ قصیدہ، رباعی، مثنوی اور غزل۔ انہیں بنیادوں پر اردو شاعری کا محل چُنا گیا۔

رُباعی کا وزن ہماری طبائع سے مناسبت نہیں رکھتا اس لئے وہ رفتہ رفتہ تقریبًا متروک ہوگئی۔ قصیدوں کے لئے ممدوحوں کی ضرورت تھی۔ ممدوح نہ رہے تو قصیدے کس کے لئے کہے جاتے لہٰذا وہ بھی ختم ہوئے۔ مثنویاں بیشک لکھی گئیں اور بہ خاصی تعداد میں لکھی گئیں لیکن ان میں سے دوچار ہی کو قبولِ عام نصیب ہوا۔ باقی گمنامی کے پردوں میں جا چھپیں۔ غزل نے البتّہ ہر صنفِ نظم سے زیادہ فروغ پایا اور امیر و داغ کے زمانے تک ہماری شاعری کا بیشتر حصّہ غزلوں ہی پر مشتمل ہے۔ لہٰذا خصوصیت کے ساتھ غزل اور بہ عام طور پر دوسرے اصنافِ سخن کو پرکھنے کے لئے ہم ایک کسوٹی پیش کرنا چاہتے ہیں جس کی مدد سے کسی شعر کے حُسن و قبح کے متعلق ایک بڑی حد تک قطعی اور یقینی رائے دی جاسکے۔

"مطلق حسن و قبح اور خوبی و زشتی کو پرکھنے کے لئے کوئی حقیقی معیار نہ کبھی معین ہوا اور نہ ہوسکتا ہے۔ تعریفات عمومًا یکساں طور پر مغالطہ انگیز اور غیر تسلی بخش ہوتی ہیں۔ خصوصًا شعر کی جتنی تعریفیں آج تک کی گئی ہیں وہ اسی نوعیت کی ہیں۔ کیا ایک نقاد کے لئے کسی کلامِ موزوں کے متعلق قطعی طور پر یہ کہنا ممکن ہے کہ "یہ شعر ہے" اور "یہ شعر نہیں ہے"۔ یا جس طرح ایک سائنس داں مادّی اشیاء کی نسبت ایک قطعی حکم لگا سکتا ہے کیا اُسی طرح ایک نقاد بھی شعر کے محاسن کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ صادر کرسکتا ہے؟ لارڈ بائرن کے بقول: "نقدِ شعر کے اصول یکسانی سے اس قدر بعید ہیں کہ نہ کبھی اُن کی تعیین ہوسکی

اظہار کیا ہے جس سے قدرتی طور پر شعر کی تاثیر میں اضافہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ خطاب چونکہ محبوب سے ہے لہذا ضمناً یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ کوئی جانے یا نہ جانے مگر تم جانتے ہو کہ یہ رونے والا کون ہے اور اس کے گریہ پیہم کا سبب کیا ہے یعنی تم سے محبت اور اس محبت کی ناکامی۔ اسی کا نام ہے جسے "ابلغ من التصریح" کہا گیا ہے۔ اگر یہی بات اس طرح کہہ دیا جاتا کہ ہم رات کو اٹھ اٹھ کر رونے میں شب بسر کیا کرتے ہیں تو بعض سننے والے اور خصوصاً محبوب پر اس کا اتنا اثر نہ ہوتا جتنا اس طرح پردے پردے میں کہنے کا ہوا ہو گا۔ اور ہونا چاہیئے۔

(۲) میں کہوں تو شاید ہی تم کو اعتبار آئے
سب کا ماجرا پوچھو آستیں دامن سے (ابرم بخاری)

ہجور کی ساری رات رونے روتے کٹ گئی۔ آنسوؤں سے آستیں بھیگ گئی۔ تکیہ تر ہو گیا گو شعر میں لانے کا لفظ تک نہیں آیا لیکن اس کی ساری روداد اور قطعی ثبوت موجود ہے۔

تخیل کی بے راہ روی:

اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے قابل ہے کہ جہاں تخیل شعر کی روح رواں ہے وہاں اس کی بے راہ روی اور بے اعتدالی شعر کی موت بھی ہے۔ مثلاً انشاء اللہ خاں انشا فرماتے ہیں

گل برگ سمجھ کے لگا میٹھی ایک چونچ
بلبل ہمارے زخم جگر کے کھرنڈ پر

اول تو جگر کا زخم، پھر اس کا کھرنڈ اور کھرنڈ بھی ایسا شاداب و گلگوں کہ پھول کی پتی کا اس پر دھوکا ہو، اور دھوکا بھی کیسا کچھ کہ بلبل نے اُسے سچ مچ پھول کی ایک تازہ پنکھڑی سمجھ کر اور شاعر کے سینے کے اندر پہنچ کر پیار سے اس میں چونچ ماردی۔ شعر میں تخیل موجود ہے مگر گمراہ، لہذا پوری روداد بے بنیاد، صداقت سے خالی اور اثر سے محروم۔ شعر نہیں، ذہنی جمناسٹک ہے اس سے بھی زیادہ تعریف مقصود ہو تو سرکس کا کرتب کہہ لیجئے جسے دیکھ کر تھوڑی سی تفریح تو ضرور ہوتی ہے اور ہم کرتب دکھانے والے کی تعریف بھی کرتے ہیں لیکن ہمارے جذبات بیدار نہیں ہوتے۔

حکیم مومن خاں مومن کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہوں گے

شاعر کو اپنی سوختہ سامانی کی شدت کا اظہار مقصود ہے۔ مشہور ہے کہ زمین گائے کے سینگ پر قائم ہے اور خود گائے ایک مچھلی پر کھڑی ہے جس وقت عاشق صاحب کو دفن کیا جائے گا تو اُن کی سوختہ سامانی کے اثر سے مچھلی کے سفنے جل اُٹھیں گے اور اُن کی اندھیری قبر کے اندر وہ سفنے گویا چراغ کا گل بن جائیں گے۔

تخیل اس شعر میں بھی موجود ہے مگر بیمار۔ بلند پروازی کی انتہا نہیں مگر گمراہی نے منزل مقصود سے بھٹکا دیا۔ شعر خوشنما لفظوں کا ایک گورکھ دھندا بن کر رہ گیا اور بس۔ سوختہ سامانی کی انتہا ہے مگر سننے والا اس کی حرارت کو ذرا بھی محسوس نہیں کرتا۔

نعشق لکھنوی کا ایک شعر ہے:

لکھا تھا خط میں انہیں حال آہِ سوزاں کا
سنا ہے راہ میں بجلی گری کبوتر پر

اللہ اللہ! آہِ سوزاں کی معنوی تاثیر تو دیکھئے کہ بیچارا کبوتر جو خط لے کر جا رہا تھا، راستے ہی میں اُس پر بجلی گر پڑی اور وہ جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ بڑی خیر ہوئی کہ وہ خط محبوب تک نہ پہنچا ورنہ شاید اس پر بھی بجلی گرتی۔ سچ کہیئے اس شعر کو سن کر آپ نے آہِ سوزاں کی آنچ کچھ محسوس کی!

تخیل کی بے راہ روی کے سلسلے میں مبالغے کے متعلق بھی چند ضروری باتیں سن لیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ مبالغے سے کلام میں زور پیدا ہو جاتا ہے جو تاثیر بیان میں مدد دیتا ہے اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ "احسن الشعر اکذبہ" بہترین شعر وہ ہے جس میں حد سے زیادہ جھوٹ بولا گیا ہو یعنی مبالغہ انتہا کو پہنچا دیا گیا ہو۔ لیکن جس طرح تخیل کی بے راہ روی شعر کو غارت کر دیتی ہے اُسی طرح مبالغے کی بے اعتدالی بھی اُس کے حسن کو خاک میں ملا دیتی ہے نہ صرف اس قدر بلکہ بعض اوقات کثرتِ مبالغہ کی بنا پر

نجم دو گئے اور کھو میں محفل ۔ جانتے ہو ۔ میں ...

اصل مقصود ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اور تاثیر تو کجا، شعر ایک ضحوکہ پن جاتا ہے۔ مثلاً شاعر کو اپنی کثرتِ گریہ کا اظہار مقصود ہے۔ وہ کہتا ہے:

یاد آجاتے ہے احباب کو طوفانِ نوح
دیکھتے ہیں جو ترے ہجر میں گریاں مجھکو

طوفانِ نوح نے تو کشتی نوح کے سوا ساری دُنیا کو غرق کر دیا تھا۔ معلوم نہیں شاعر صاحب کے طوفانِ گریہ کی بدولت دُنیا کا کیا حشر ہوا۔ بہر حال یہاں تک بھی خیریت تھی، "قضیۂ زمیں برسرِ زمیں" سے بات آگے نہ بڑھی لیکن ایک اور بزرگ زمیں سے جو اُڑے تو آسمان کی خبر لائے۔ فرماتے ہیں:

ایک دن فراقِ یار میں رویا میں اس قدر
چوتھے فلک پہ پہنچا تھا پانی کمر کمر

سُنا ہے حضرت عیسیٰ بھی چوتھے آسمان پر رہتے ہیں۔ اُن بیچاروں کو بھی کچھ دیر کے لئے کمر کمر پانی میں کھڑا رہنا پڑا ہوگا۔

یہ ایک بہت بڑا مبالغہ ہے لیکن ابھی تو کئی اور آسمان باقی ہیں۔ سیلِ سرشک اگر آخری آسمان تک نہ پہنچا تو بات ہی کیا ہوئی۔ غالباً اسی خیال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جرأت نے کہا ہے:-

طوفانِ گریہ کیا کہیں، کس وقت ہمنشیں
موجِ سرشک تا فلکِ ہشتمیں نہیں

لیجئے آنسوؤں کا سمندر آٹھویں آسمان کو چھو آیا، اور مبالغے میں اب بظاہر کسی اضافہ کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن گمراہ تخیل کی پرواز کا تعین بہت دشوار ہے۔ ایک صاحب جرأت کی قائم کی ہوئی آخری حدود کو بھی پھاند گئے۔ ارشاد ہوتا ہے:

ہجر کی شب جب اُمنڈ آتا ہے دریائے سرشک
تیر کے پھرتے ہیں آٹھوں آسماں مثلِ حباب

کیا اِن اشعار کو پڑھ کر کسی دردمندِ محبت کی اشکباری کے تصور سے آپ کے دل میں چوٹ لگتی ہے؟ کیا اُس کے لئے آپ اپنے قلب میں کسی قسم کی ہمدردی کا احساس موجود پاتے ہیں؟

بلند تخیل کے ساتھ ساتھ صداقت و خلوصِ جذبات اور شدتِ احساس ایک اچھے اور پُر تاثیر شعر کے لئے ازبس ضروری ہے۔ خلوصِ جذبات کے سلسلے میں دو باتیں خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہیں ایک تو یہ کہ آپ بیتی میں جو مزہ ہے وہ جگ بیتی میں نہیں۔ مولانا حالی نے سچ کہا ہے کہ

آپ بیتی جو نہ ہو، ہے وہ کہانی بے لطف
گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ بیتی کے سوا انسان اور کچھ لکھے ہی نہیں۔ لکھے اور ضرور لکھے لیکن وہی چیزیں زیادہ مقبول ہوں گی جن میں ہمہ گیری و آفاقیت اور بنیادی صداقت پائی جائے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر شاعر کو اپنے فطری میلانِ طبع کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ورنہ صداقت و خلوص کی راہ سے بھٹک جائے گا۔ جب کسی نے اپنے فطری میلان کو چھوڑ کر رسم و رواج کی بنا پر یا کسی ضرورت کے تقاضے سے یا کسی غرض کو پورا کرنے کے لئے دوسروں کی روش اختیار کی، ہمیشہ ٹھوکر کھائی اور مُنہ کے بل گرا۔

میر صاحب کی شاعرانہ عظمت و بزرگی سے کسی کو انکار نہیں۔ اُن کی زندگی اور اُن کے ماحول سے بھی دُنیا واقف ہے۔ اُن کی طبیعت کا خاص انداز بھی سب کو معلوم ہے۔ محبت کا سوز و گداز، دل کا درد اور روح کی تڑپ اُنکا سرمایۂ حیات، اور اشک و آہ اُن کی شاعری کا خلاصہ ہے۔ اس رنگ میں وہ جو کچھ کہتے ہیں، لاجواب کہتے ہیں۔ لیکن جب وہ اس میدان کو چھوڑ کر اپنے فطری میلان کے خلاف، غالباً رسم و رواج کی بنا پر یا کسی دوسرے اسباب سے، دوسروں کی نقالی کرتے ہیں تو اُن کی ناکامیابی پر خود اُن کے مداحوں کو ندامت ہونے لگتی ہے۔ میر صاحب کی اُفتادِ طبیعت اور اُن کی زندگی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار پڑھئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ اِن آئینوں میں میر صاحب کی شکل کیسی نظر آتی ہے:-

ہے تیرہ رطنز اپنا لونڈوں کی دوستی سے

اِس دن ہی کو کہے تھا اکثر پدر ہمارا

تاثیر سے مالا مال ہیں یہی حال فارسی کے بعض قصائد کا ہے۔ حسان العجم خاقانی کا نام کون نہیں جانتا۔ سلجوقی دور کے بہترین قصیدہ گویوں میں اس کا شمار ہے لیکن عام طور پر اُس کے قصیدے تاثیر سے محروم ہیں۔ اور کیونکر محروم نہ ہوں جب ان کا یہ انداز ہو:

دلِ من پیر تعلیم است و من طفل زباں دانش
دمِ تسلیم سرِ عُشر و سرِ زانو دبستانش

ترجمہ اس کا یہ ہوا کہ میرا دل میرا معلّم ہے اور میں اس کا طفلِ زباں داں ہوں۔ اور خاموشی یا فرماں برداری سرِ عُشر ہے (سرِ عُشر وہ پہلی دس آیتیں جو قرآن مجید شروع کرانے سے پہلے بچے کو یاد کراتے ہیں) جو شروع تعلیم سے پہلے مجھے سکھایا گیا ہے۔ اور یہ سب تعلیم میں دبستانِ زانو یعنی مدرسۂ مراقبہ میں حاصل کرتا ہوں

انصاف سے کہیے کہ اس شعر کے پڑھنے کے بعد آپ کے جذبات کس حد تک متاثر ہوئے؟ بہت ممکن ہو آپ یہ سوچنے لگے ہوں کہ آیا اس کلام پر صحیح معنی میں شعر کا اطلاق ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔ لیکن یہی خاقانی جب مدائن میں قصرِ نوشیرواں کے کھنڈر دیکھتا ہے اور اس ویران مسکن کی عظمتِ رفتہ کو یاد کرتا ہے تو اس کا دل بھر آتا ہے۔ سینے میں جذبات کا ایک طوفان اُمنڈنے لگتا ہے۔ وہ دل کے سوز اور روح کی تڑپ کے ساتھ "ایوانِ مدائن" کے متعلق ایک قصیدہ لکھتا ہے جس کا ایک ایک لفظ تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے اور اس کا سبب وہی خلوصِ جذبات اور شدتِ احساس ہے۔ اس قصیدے کے دو شعر سُنیے: ایوانِ مدائن زبانِ حال سے کہتا ہے:

از نوحۂ جغد الحق مائیم بہ دردِ سر
از دیدہ گلابے کُن، دردِ سرِ ما بنشاں

اُلّوؤں کے شور سے بخدا سر میں درد ہو گیا ہے اے مخاطب تو اپنی آنکھوں سے تھوڑا سا گلاب بنا کر یعنی دو آنسو بہا کر ہمارے دردِ سر کو دُور کر دے۔

ما بارگہِ دادیم، ایں رفت ستم بر ما
بر قصرِ ستمگاراں، تا خود چہ رسد خذلاں

یہ نوشیروانِ عادل کی بارگاہ ہے۔ اس میں انصاف

ہوتا تھا۔ اس پر یہ تباہی آئی۔ خدا جانے ظالموں کے محلوں کا کیا حشر ہوگا؟

جیسا کہ ہم بیشتر بیان کر چکے ہیں، شعر کا ایک نہایت اہم عنصر تخیل ہے۔ اور اس کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ ادنیٰ۔ متوسط۔ اعلیٰ۔ تخیل شعر میں تشبیہ و استعارہ اور تلمیح و کنایہ کی صورت اختیار کرتا ہے۔ یہ مسئلہ چند مثالوں سے اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔

تشبیہ ۔ (۱) سب جانتے ہیں کہ نیا چاند اور پُورا چاند سمندر کے سینے میں ایک تلاطم برپا کر دیتا ہے۔ اور چاند کی کشش سے پانی اپنی سطح سے بلند ہو ہو کر بڑھتا ہے اسی کو ہم مَدّ (وجزر) یا جوار (بھاٹا) کہتے ہیں۔ یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ محبوب کے چہرے کو ماہِ کامل سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اور یہ تشبیہ بہت پامال و فرسودہ ہے، لیکن تخیل نے انہیں مقدمات کو ایک خاص انداز سے ترتیب دے کر ایک نیا نتیجہ نکالا ؎

کششِ بدر سے چڑھتا ہوا دریا دیکھا
اللہ اللہ، وہ عالم تری انگڑائی کا (پریم پجاری)

(۲) ایک ایسا آشیانہ جسے طائر نے چھوڑ دیا ہو اور اُڑ کر کہیں اور چلا گیا ہو ظاہر ہے کہ کس قدر سنسان اور ویران ہوگا۔ محبوب سے جدائی کے بعد چاہنے والے کی مہجور آنکھیں، جنہیں اشکباری کے سوا اور کچھ بھی اختیار باقی نہ ہو، جس درجہ سوگوار ہوں گی وہ بھی کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ لیکن تشبیہ کے علاقے سے شاعر نے ان دونوں حالتوں کو باہم مربوط کر کے ویرانی کا جو دل دوز منظر پیش کیا ہے وہ قیامت ہے: ؎

روتا مجھے چھوڑ جانے والے ، کیا تجھ سے کہوں کہ حال کیا ہے
آنکھیں ہیں کہ آشیانِ ویراں ، طائر جس میں سے اُڑ گیا ہے
(پریم پجاری)

(۳) بیس برس گذرے میں اس وقت ایم۔ اے کا طالب علم تھا۔ لاہور میں پڑھتا تھا۔ ایک دوست کے یہاں کسی تقریب سے "ایٹ ہوم" میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ ایک باغ میں نشستوں کا انتظام تھا۔ سبزہ و گل کا ہجوم، گلاب کے تختے پھولوں سے لدے ہوئے خواتین کی رنگا رنگ،

تم .. گے اور کہ میں لمس — جانتے ہو — میں ہیں ...

زرق برق پوشاکیں، شفق اور دھنک کو شرمانے والی۔ عجب رُوح پرور منظر تھا۔ ایک خوب رُوشوخ لڑکی نے میزبان سے کہا: "کیا یہاں بھی آپ نے میونسپلٹی کا قانون جاری کر رکھا ہے؟" میرے دوست نے جو اتفاق سے میونسپل کمشنر بھی تھے، تعجب سے پوچھا: "کون سا قانون؟" کہا: "یہی کہ پھول توڑنے والے گرفتار کئے جائیں گے"۔ اِس پر سب ہنس پڑے اور میرے دوست نے تمام خواتین سے باصرار تمام گل چینی کی درخواست کی۔ اکثر جوان لڑکیاں اور خواتین گلاب کے تختوں میں گھس گئیں۔ جی بھر کے پھول توڑے اور توڑ کر کسی نے اپنے جوڑے میں لگائے۔ کسی نے ساڑی کی پن میں اٹکائے۔ کسی نے گریبان کی زینت بنائے۔ اتفاق سے اُسی وقت ایک شعر موزوں ہوگیا۔ اور جب میں نے اُسے پڑھ کر سُنایا تو سارا مجمع جھوم گیا: ؎

گریباں میں ہیں اور کچھ پھول، بالوں میں سجائے ہیں
چمن کو لُوٹنے والے گلستاں بن کے آئے ہیں

استعارہ:

تم دُور تھے نظر سے، اور چاندنی کھلی تھی
آنکھوں سے رات پیہم ٹوٹا کئے ستارے (پریم پجاری)

چاندنی یوں ہی کیا کم قیامت ہوتی ہے۔ لیکن اگر اسکے ساتھ ماضی کی حسین یادیں بھی وابستہ ہوں تو اس منظر سے ایک حساس دل میں اور بھی نشتر ٹوٹنے لگتے ہیں۔ جی اُمنڈتا ہے۔ آنکھیں برستی ہیں۔ آنسوؤں کی تاروں سے تشبیہ اگر پامال نہیں تو بالکل تازہ بھی نہیں لیکن اشکباری کا ستاروں کے ٹوٹنے سے استعارہ البتہ اپنے اندر ایک نُدرت رکھتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی جس ماحول میں اس استعارے سے کام لیا گیا [illegible] نے شعر کی تاثیر میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔

تلمیح:

مانعِ جلوہ گری، خوف ہے رُسوائی کا
بس اسی پر تمہیں دعویٰ ہے زلیخائی کا (پریم پجاری)

زلیخا کو یوسف سے جو والہانہ محبت تھی دُنیا کو معلوم ہے۔ اِس محبت نے زلیخا کو رسوائے عالم کیا۔ لوگ اُسے طعنے دیتے تھے۔ شرمندہ کرتے تھے۔ لیکن زلیخا نے رسوائی کے ڈر سے کبھی اپنی طوفانی محبت کو چھُپانے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ایک قدم پیچھے ہٹایا۔ شاعر کی محبوبہ کو بھی شاعر سے ایسی ہی محبت ہے جیسی زلیخا کو یوسف سے تھی۔ مگر رسوائی کے خوف سے وہ اُسکے سامنے آنے کی جرأت نہیں کرتی۔ شاعر اُسے طعنہ دیتا ہے کہ "تم تو کہتی ہو "میں تمہیں اُسی طرح چاہتی ہوں جس طرح زلیخا یوسف کو چاہتی تھی"! مگر اس کے باوجود تم نے میری آرزو مند آنکھوں کو اپنے دیدار سے محروم رکھا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ تمہیں رسوائی کا ڈر ہے۔ لیکن زلیخا نے تو امور محبت میں کبھی رسوائی کی پروا نہیں کی۔ معلوم ہوا تمہارا دعویٰ محبت فقط دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ حقیقت نہیں۔ ایک لفظ "زلیخا" نے یوسف زلیخا کی پوری داستان دُہرا دی۔

کنایہ:

(۱) سُنا ہو تم نے شاید، میرے ہمسایوں میں چرچا ہے
کہ اکثر رات کو رونے کی اک آواز آتی ہے

(پریم پجاری)

کہنا یہ مقصود ہے کہ "ہم رات کو اُٹھ اُٹھ روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے"! لیکن اسی طرح کہہ دیا تو بات ہی کیا ہوئی۔ شاعر نے اس کے بجائے "گفتہ آید در حدیثِ دیگراں" کا پیرایہ اختیار کیا۔ یہ نہیں کہا کہ میں روتا ہوں۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ کون روتا ہے۔ خود ہمسایوں کو بھی معلوم نہیں کہ رونے والا کون ہے۔ رات کے وقت سونے سے کسی کی آنکھ کھل جاتی ہے تو اُس کے کان میں کسی کے رونے کی آواز آتی ہے۔ خدا جانے وہ کون ہے اور کیوں روتا ہے۔ اسی کا لوگوں میں چرچا ہے۔ رونے کی آواز ہر رات کو نہیں آتی۔ کبھی کبھی آتی ہے۔ اس توضیح نے واقعے کو اور بھی زیادہ نیچرل بنا دیا۔ پھر "سنا ہو تم نے شاید" کہہ کر اس بات کا اظہار بھی کر دیا کہ یہ کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں کہ ہر جگہ اس کی شہرت ہو اور لازمی طور پر تم نے سُنا ہی ہو۔ ممکن ہے سُنا ہو۔ یہاں واقعہ کی اہمیت کو گھٹا کر رونے والے کی کس مپرسی کا

اور نہ ہو سکے گی۔ ان اصولوں سے مراد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ ایک خاص عہد کے میلانات ہیں اور یہ میلانات ہر دور میں مخصوص اور عہد گذشتہ سے مختلف ہوتے ہیں۔ ایک وقت ہومر اور ورجل کا دور دورہ تھا دوسرے وقت ڈرائیڈن کا، اس کے بعد سر والٹر اسکاٹ کا وغیرہ وغیرہ۔"

خود میرے ایک زمانہ شناس دوست کا قول ہے کہ "حسن نام ہے پسند کا"۔ با ایں ہمہ جس طرح کائنات کی دیگر اشیاء کی ایک اضافی اور اعتباری حیثیت قائم کی جاتی ہے اسی طرح شعر کے حدود بھی معین کئے جا سکتے ہیں اور کئے گئے ہیں[1]۔

جیسا کہ ہم ابتدا میں بیان کر چکے ہیں اُردو شعر کا ماخذ فارسی اور فارسی کا سرچشمہ عربی ہے اس لئے ہمیں سب سے پہلے اساتذۂ عرب و عجم کے خیالات پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ عربی زبان میں سب سے پہلی کتاب جو انتقادِ شعری سے بحث کرتی ہے وہ غالبًا ابوالفرج قدامہ بن جعفر کی شہرۂ آفاق تصنیف "نقد الشعر" ہے۔ قدامہ کے نزدیک "شعر ایک قولِ موزوں و مقفیٰ ہے جو کسی معنی پر دلالت کرتا ہو۔ اور جہاں تک معانی کا تعلق ہے ان کے کل معانی (یعنی مضامین شعری) شاعر کے لئے نہایت آزادی کے ساتھ جائز ہیں۔ شاعر کا فریضہ فقط اتنا ہے کہ وہ جس مضمون کو بھی ہاتھ لگائے، خواہ وہ مضمون پست ہو یا بلند، حسنِ ادا میں اُس کو حدِ اعلیٰ تک پہنچا دے۔ مضمون و تخیل کا بجائے خود اچھا ہونا شعر کی خوبی کو زائل کرنے والی چیز نہیں"۔

اپنے اس بیان کی وضاحت میں قدامہ مثال پیش کرتا ہے کہ جس طرح ایک نجار کے لئے صنعت کی لکڑی ہے (خواہ وہ آم کی ہو یا ساگون کی) بہترین فرنیچر تیار کر سکتا ہے اور جیسے ایک سنار ہر دھات سے (چاہے وہ خالص سونا ہو یا کھوٹی چاندی) بہت خوبصورت زیور بنا سکتا ہے اسی طرح ایک صناع شاعر ہر قسم کے پست و بلند مضامین سے اعلیٰ درجے کے اشعار تیار کر سکتا ہے۔ گویا قدامہ کے نزدیک مضامین و معانی کی چنداں اہمیت نہیں بلکہ حسنِ ادا معتبر ہے۔

حسنِ ادا کی اہمیت سے نہ تو انکار ممکن ہے اور نہ اُسے نظرانداز ہی کیا جا سکتا ہے لیکن معنی سے قطع نظر کر کے محض حسنِ ادا ہی کو سب کچھ سمجھ لینا ایک ایسی بات ہے جسے بیسویں صدی کا ذوقِ شعری کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ سُنار لاکھ ہنرمند ہو لیکن اُس کی صنعت کے بہترین نمونے جو کھوٹی چاندی سے تیار کئے گئے ہوں، خود اُسی کے بنائے ہوئے بہترین طلائی زیوروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ایک ماہر صناع ادنیٰ درجے کے مواد پر انتہائی کوشش کے باوجود اپنے کمال کا اظہار بدرجۂ اتم کر ہی نہیں سکتا کیونکہ اس مادّہ میں اتنی قابلیت ہی نہیں ہوتی کہ کمالِ صنعت کو قبول کر سکے۔ کیا ایک ماہر سنگ تراش اینٹوں میں بھی ویسی ہی نازک، شستہ اور حسین جالیاں تراش سکتا ہے جیسی ایک سنگِ مرمر کی تختی میں تراشی جا سکتی ہیں؟ یہی بات شاعر پر صادق آتی ہے کہ وہ ایک باکمال آرٹسٹ ہوتے ہوئے بھی ادنیٰ اور پست مضامین سے بلند پایہ قابلِ قدر اشعار تیار نہیں کر سکتا۔

آج یہ مسئلہ بالکل طے ہو چکا ہے کہ اعلیٰ شاعری صرف وزن و قافیہ کا نام نہیں بلکہ اُس کی رُوحِ رواں تخیل ہے۔ اساتذۂ فارس نے بھی تخیل ہی کو شاعری کی جان مانا ہے۔ نظامی عروضی سمرقندی جو چھٹی صدی ہجری کا ایک ممتاز شاعر اور جید فاضل ہے۔ اپنی گراں مایہ تصنیف "چہار مقالہ" میں فنِ شعر کے متعلق لکھتا ہے کہ:

"شاعری وہ فن ہے جس کے ذریعے سے شاعر مقدماتِ موہومہ کو اس طرح مرتب کرتا ہے کہ چھوٹی بات کو بڑی اور بڑی بات کو چھوٹی، خوبی کو زشتی اور زشتی کو خوبی کر دکھاتا ہے اور ایہام کی مدد سے قوتِ غضبی و شہوانی کو مشتعل کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس ایہام سے دلوں میں شگفتگی اور گرفتگی پیدا ہو جاتی ہے"۔

یورپ کے نکتہ سنجوں نے اس مسئلہ پر نہایت نازک اور لطیف بحثیں کی ہیں۔ اُن سب کا خلاصہ شعر کی وہ حسبِ ذیل تعریف ہے جو "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا" میں بیان کی گئی ہے:

"شعر مطلق وہ جذبات انگیز اور موزوں کلام ہے"

---

[1] مقدمہ مشمولہ "درد" (مجموعۂ کلام ثاقب کانپوری) از حضرت عبدالباری آسی۔

[illegible] گئے اور کھو بیٹھے جاتے ہوئے بھی ہیں حرف

انسان کے قلبی کیفیات کو اس خوبصورتی سے بیان کرے کہ وہ مجسم ہوکر سامنے آجائیں۔"

متاخرین میں صاحبِ "آتش کدہ" مرزا لطف علی بیگ آذر، جو اپنے زمانے کا ایک خوش گو شاعر ہونے کے علاوہ نقدِ شعر کا بھی اچھا ذوق اور سلیقہ رکھتا ہے، اہلی شیرازی کے ذکر میں لکھتا ہے کہ:

"اہلی نے صنعت ذوبحرین وذوقافیتین میں ایک مثنوی بھی لکھی ہے اور اس میں بڑی جگر کاوی کی ہے لیکن فقیر کے نزدیک یہ صنائع محاسنِ شعری سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ محاسنِ شعری مستمع کے لئے "تغیرِ حال" کا باعث ہوتے ہیں۔ اور شعر کی غرضِ کلی یہی ہے (کہ سننے والا اس سے متاثر ہو)"

آذر کی اس رائے سے اختلاف کرنا غالباً ممکن نہیں کہ شعر کی اصلی غرض وغایت سننے والے کو متاثر کرنا ہے۔ اب جو شعر جتنا زیادہ پُرتاثیر ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ کامیاب سمجھا جائے گا۔ بعض لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ "ہم کسی دوسرے کے لئے شعر نہیں کہتے بلکہ صرف اپنے لئے کہتے ہیں۔" چنانچہ اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے بھی اسی خیال کو نظم کیا ہے:

سہ ان کے لئے ہیں نہ اُن کے لئے
کہ میں شعر کہتا ہوں اپنے لئے

مگر آج تک غالباً ایسا کبھی نہیں ہوا کہ شاعر نے بالقصد اپنے کلام کو دوسروں سے چھپا چھپا کر صرف اپنی ذات تک محدود رکھا ہو۔ نہ کبھی کسی کو دکھایا ہو نہ سُنایا ہو۔ نہ کسی دوسرے ذریعے سے اس کی اشاعت کی ہو۔ بلکہ اس کے برعکس عام طور پر تو یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ شاعر جب تک اپنا کلام دوسروں کو سُنا نہ لے اُسے چین نہیں آتا کیونکہ وہ اپنی کیفیتِ تاثر میں دوسروں کو بھی شریک کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ ایک بالکل فطری جذبہ ہے۔ اب اگر کوئی شعر دوسروں کو بالکل بھی متاثر نہ کر سکے تو شاعر کا مقصد تقریباً فوت ہو گیا۔ مگر یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک اچھا شعر سُن کر سُننے والا متاثر نہ ہو۔ اور اس قضیہ کا عکس بھی صحیح ہے۔ یعنی جس شعر کو سُن کر سامع پر وجد کی کیفیت طاری ہو جائے یقیناً وہ ایک بلند پایہ شعر ہوگا۔

اِس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر اچھا شعر، ہر محل پر، ہر سُننے والے کو پسند آنا چاہیئے۔ نہیں۔ مقتضائے حال کی مطابقت اور مخالفت سے شعر کی تاثیر میں کمی بیشی کا پیدا ہوجانا لازمی ہے۔ شادی کے موقع پر اگر ایک نغمۂ مسرت کے بجائے بہترین مرثیہ پڑھا جائے تب بھی وہ ناکامیاب رہے گا۔ اسی طرح اگر غمی کے موقع پر کوئی ایسے اشعار پڑھے جن میں جشن ونشاط کا ذکر ہو تو یقیناً وہ اپنی تمام خوبیوں کے باوجود سُننے والوں کو محظوظ نہ کر سکیں گے۔ بایں ہمہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ ایک اچھا شعر، عام حالات میں سُننے والے کو ضرور متاثر کرتا ہے اور اسی تاثیر کی نسبت سے ہم شعر کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کمالِ شعر تاثیر پر منحصر ہے تو آخر شعر میں تاثیر پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں؟

اِس میں شک نہیں کہ شعر کا ایک نہایت اہم عنصر تخیل ہے۔ تخیل کے بغیر بیکر شعر میں جان نہیں پڑتی۔ مگر اس کا مطلب نہیں کہ تمام محاسنِ شعری کا انحصار اور تاثیر کا دار و مدار فقط تخیل پر ہے۔ نہیں۔ بلکہ تخیل کے علاوہ اور بھی کئی عناصر ہیں جنہیں شعر کی تاثیر میں بڑا دخل ہے۔

ایرانی کہتا ہے "آنچہ از دل خیزد، بر دل ریزد" علامہ اقبال مرحوم نے اُردو میں اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔ ع

دل سے جو بات نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے۔ فطرتِ انسانی کے رمز شناسوں نے اس نکتہ کو دریافت کیا اور دُنیا کو بتایا کہ صداقت وخلوصِ جذبات کے بغیر کلام میں تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور خلوص جذبات کے ساتھ ساتھ شدتِ احساس کا ہونا بھی ضروری ہے۔ کہنے والا جو کچھ کہے پہلے خود اُسے محسوس کرے اور شدت کے ساتھ محسوس کرے، اس کے بعد کہے تو ممکن نہیں کہ اس کا کلام تاثیر سے خالی ہو۔

قصیدے کو عموماً مصنوعی شاعری سمجھا جاتا ہے اور یہ خیال ایک بڑی حد تک درست بھی ہے لیکن شعرائے عرب کے وہ قصائد جو خلوص جذبات اور شدتِ احساس کا نتیجہ ہیں۔

فردوس ہولصب مدر آدمی تھا خوب
دل کو دبا کے اُس نے کسی جوش پسر گئے تھیں

جب نہ تب ملتا ہے بازاروں میں میر
ایک ظالم ہے وہ لوطی مسر فردس

ترش رُو بہت ہے وہ زرگر پسر
پڑے ہیں کھٹائی میں مدّت سے ہم

کیا اُس آتش بازکے لونڈے کا اتنا شوق میر
بہ چلی ہے دیکھکر اُسکو تمہاری لال کچھ

دل لے کے لونڈے دلّی کے کب کا بجا گئے
اب اُن سے کھائی پی ہوئی شے کیا وصول ہو

مُشتے نمونہ از خروارے کے طور پر ہم نے صرف چند ہی شعر نقل کئے ورنہ اس قسم کے لغو اشعار میر صاحب کے یہاں بکثرت موجود ہیں۔ میر صاحب کے ان اشعار کو اُس وقت کی سوسائٹی پر طنز و تعریض سمجھنا اپنی خوش اعتقادی کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ درحقیقت یہ روش اُس وقت مقبول تھی۔ میر صاحب بھی اس رَو میں بہ گئے ورنہ اُن کا یہ اصلی رنگ نہیں۔

ہمارے اساتذہ میں سے خواہ کسی کا کلام اُٹھا کر دیکھ لیجئے، یہ بات آپ کو ہر جگہ نظر آئے گی کہ لکھنے والا اُسی رنگ میں زیادہ کامیاب ہے جو اُس کے طبعی میلان سے مطابقت رکھتا ہے چنانچہ میر کے یہاں سوز و گداز، درد کے یہاں تصوف، غالب کے یہاں مضمون آفرینی، آتش کے یہاں خودداری اور بےفکر مستی، جرأت کے یہاں معاملہ بندی، انشا کے یہاں ٹھٹول بازی، نظیر اکبر آبادی کے یہاں عوام الناس کے مشغلِ زندگی، حالی کے یہاں احساسِ دردِ قومی، اور اکبر کے یہاں مغربی تہذیب پر ظریفانہ پیرائے میں طنز و نکتہ چینی کے متعلق جتنے کامیاب اشعار ملیں گے اتنے کسی دوسرے موضوع پر ہرگز نہ ملیں گے۔ وہی صداقت و خلوصِ جذبات کا اصول یہاں کارفرما ہے۔

اس بحث میں حالی اور اکبر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ دونوں نے پُرانی وضع کی غزل کے ضخیم دیوان چھوڑے ہیں۔ لیکن ان دونوں بزرگوں کا کمالِ شاعری آپ کو ان دیوانوں میں نہ ملے گا۔ حالی کو دیکھنا ہو تو اُنکی وہ نظمیں پڑھیئے جو اُنھوں نے دردِ قومی کے احساس سے بیتاب ہوکر اور قلم کو اپنے دل کے خون میں ڈبو ڈبو کر لکھیں۔

مُسدّسِ مدوجزرِ اسلام جو عام طور پر مسدسِ حالی کے نام سے مشہور ہے اُن کی ایک نہ مٹنے والی یادگار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مُسدّس بعض مقامات پر بہت پھیکی اور بے رنگ ہو گئی ہے۔ تخیّل کی رعنائیاں وہاں آپ کو زیادہ نہ ملیں گی۔ لیکن چونکہ اس نظم کے ایک ایک لفظ میں شاعر کے دل کی دھڑکنیں شامل ہیں اور اس کی روح کی تڑپ پوری نظم میں جاری و ساری ہے اس لئے اس کا مجموعی اثر اتنا شدید ہوتا ہے کہ سُننے والا تڑپ اُٹھتا ہے۔ اسی طرح حقیقی اکبر وہ نہیں ہیں جو عاشقانہ غزلوں کے دیوان میں نظر آتے ہیں بلکہ اُن کی اصلی صورت فکاہیہ اشعار کے آئینوں میں دکھائی دیتی ہے۔ اکبر کے نشتر اُن کے ظریفانہ کلام میں آپکو ملیں گے۔

شاعری کے مختلف ادوار میں زمانے کے ساتھ ساتھ ذوقِ شعری ہمیشہ بدلتا رہا، لیکن اس کے باوجود ہر عہد کے بلند پایہ اشعار میں خلوصِ جذبات کا عنصر ہمیشہ مشترک رہا اور کیونکر نہ رہتا جب کہ شعر کی کامیابی کا دار و مدار اس کی تاثیر پر ہے اور تاثیر اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک صداقت و خلوصِ جذبات سے کام نہ لیا جائے۔

اب تک ہم نے شعر کی معنوی حیثیت سے بحث کی۔ اس کے بعد ہیئتِ ظاہری کا درجہ ہے جس کا تعلق شعر کے الفاظ، فقروں اور جملوں کی ترکیب و ترتیب اور بندشوں کی ساخت سے ہے۔ شعر کا وزن، قافیہ، بحر اور زمین بھی اسی کے تحت میں آتے ہیں۔

تخیّل، صداقت و خلوصِ جذبات اور شدّتِ احساس کے ساتھ شاعر کا قادر الکلام ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر اُسے بیان پر کامل قدرت حاصل نہیں، اور اس کا طریقِ اظہار ناقص ہے تو معنوی عناصر خواہ کتنے ہی گراں مایہ کیوں نہ ہوں، وہ ایک اعلیٰ درجے کا شعر نہیں کہہ سکتا۔ اسلوبِ بیان کی ندرت اور پیرایۂ ادا کا حُسن شعر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ

لفظی صنعت گری کو حقیقی شاعری سمجھ لیا جانے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں عموماً ایسے شعر کو اچھا شعر کہا جاتا ہے جو خوبصورت لفظوں، حسین ترکیبوں، لفظی رعایتوں اور دوسری صنعتوں کا مجموعہ ہو حُسنِ معنی سے چنداں سروکار نہیں ہوتا۔

مشینی اشعار:- ہمارے اساتذہ کی کوششوں سے ہماری زبان میں ہر قسم کے شاعرانہ مضامین اور انہیں ادا کرنے کے لئے ہر قسم کے خوب صورت لفظوں اور ترکیبوں، نیز گوناگوں اسالیب کا اتنا وافر ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے کہ اب ایک رسمی مگر بظاہر لطیف و جمیل شعر کہنے کے لئے تھوڑی سی موزونیٔ طبع اور قدرتِ بیان کے سوا اور کسی سامان کی ضرورت نہیں۔ مضامین و خیالات کی تلاش تو بالکل غیر ضروری ہے کیونکہ کسی ایک ہی خیال کو تھوڑے سے تغیّر کے ساتھ ہر بحر اور ہر زمین میں بہ آسانی ادا کیا جا سکتا ہے۔

شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے احباب کی ایک صحبت میں ایک بار میں نے یہی دعویٰ پیش کیا تو لوگوں نے اسے مبالغہ سمجھا۔ میں نے کہا امتحان شرط ہے۔ ابھی فیصلہ ہو سکتا ہے۔ کوئی صاحب کسی کا شعر پڑھیں۔ میں اسی مضمون کو تھوڑے سے تغیّر کے ساتھ جس بحر اور جس زمین میں ارشاد ہو نظم کر دوں گا۔ میرے ایک دوست جمیل صاحب نے کسی کا یہ شعر پڑھا:-

اللہ اللہ پرتوِ خورشید کی جادوگری
خاک کا ایک ایک ذرّہ نجم و اختر بن گیا

میں نے کہا "اب اسی مضمون سے تھوڑی سی کمی بیشی کے ساتھ جتنے اشعار جی چاہے نظم کر لیجئے"۔ ایک اور صاحب بولے۔ "اچھا تو اس مضمون کو میر صاحب کے اس سانچے میں ڈھالئے:

صبح گذری شام ہونے آئی میر ⁂ تو نہ چیتا اور بہت دن کم رہا

دو تین منٹ غور کرنے کے بعد میں نے یہ شعر عرض کیا:

ذرّے بن جائیں گے انجم کا جواب ⁂ مہر کا پرتو اگر پیہم رہا

جمیل صاحب نے کہا، اختر صاحب آپ نے بھی کیا سہل زمین انتخاب کی۔ اچھا عندلیب صاحب میں سودا کا ایک شعر پڑھتا ہوں اس پر طبع آزمائی کیجئے:-

کمبخت جیتم اُس کی مجھے یاد رہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لیتا کہ چلا میں

میں نے فی البدیہہ کہا:-

ہر ذرّے میں ہے مہر جہانتاب کا پرتو
کیوں کر کہوں اللہ سے بندے کو جدا میں

جمیل صاحب حیرت سے میرا منہ تکنے لگے۔ ایک اور صاحب رفیق نامی بولے۔ عندلیب صاحب اجازت ہو تو میں بھی ایک شعر پڑھوں۔ میں نے کہا بسم اللہ، ارشاد فرمایئے۔ انہوں نے غالب کا یہ شعر پڑھا:-

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

تھوڑے سے تفکر کے بعد ایک شعر ذہن میں آیا۔ میں نے کہا رفیق صاحب اگر آپ فرمائیں تو قافیہ بھی یہی رہے انہوں نے کہا سبحان اللہ۔ اس سے بہتر اور کیا۔ میں نے یہ دو مصرعے پیش کئے:-

پرتوِ مہر سے ذرّے میں چمک آتی ہے
سامنے تم ہو تو پیارے مرا حال اچھا ہے

سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ عندلیب صاحب خوب کہا۔ کیا کہنا سبحان اللہ۔ میں نے کہا صاحب اس قسم کے اشعار میں خوب اور ناخوب کا سوال ہی نہیں خام مواد تو پہلے سے موجود ہے۔ موزونیٔ طبع کی مشین میں رکھا اور شعر ڈھال دیا۔ رونا تو اسی کا ہے کہ آپ اس قسم کے مشینی اشعار کو فنکاری سمجھتے ہیں۔ ایک صاحب جو اب تک خاموش بیٹھے تھے فرمانے لگے۔ حکیم مومن خاں کا ایک شعر یاد آگیا۔ ذرا اس کو بھی دیکھئے۔

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

اس مرتبہ مجھے کئی منٹ لگ گئے۔ انہوں نے سمجھا کہ اس زمین میں شعر نہ نکل سکے گا۔ فرمانے لگے، حضرت یہ مومن خاں ہیں، کوئی اور نہیں۔ میں نے کہا، تو سنئے:-

دل کے ہر ذرّے میں آسودہ ہے اک مہرِ جمال
مشتری ہم نہ ترے اے مہِ کنعان ہونگے

شعر سن کر وہ صاحب کچھ کھسیانے سے ہو گئے۔ بولے یہ مومن خاں کا رنگ نہیں۔ میں نے کہا اس سے مجھے کیا۔ نہ یہ میرا

دعویٰ ہے جمیل صاحب نے کہا، عندلیب صاحب آزمائش تو کافی سے زیادہ ہو چکی لیکن اگر آپ کی طبیعت حاضر ہو تو ایک تجربہ اور سہی۔ میں نے کہا برادر! اس قسم کے اشعار کے لئے طبیعت کے حاضر ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ آپ فرمائیں۔ انہوں نے ناسخ کا یہ مشہور مطلع پڑھا:۔

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

حسنِ اتفاق سے اس مرتبہ دو منٹ بھی نہ لگے اور شعر موزوں ہو گیا:۔

بہ کیس خورشید کے پرتو سے ہر ذرہ چمک اٹھا
کہ میرے غم کدے میں آج عالم ہے چراغاں کا

سامعین نے بہت پسند کیا۔ اختر صاحب نے کہا، عندلیب صاحب آج تو واقعتاً آپ نے کمال کر دیا۔ میں نے کہا ہائے قسمت! اسے آپ کمال کہتے ہیں اور کمال کہہ کر میرے دعوے کو باطل کر دینا چاہتے ہیں۔ بندہ نواز اس میں کمال کو ذرہ برابر دخل نہیں۔ اس قسم کے اشعار تو اوسطاً میں منٹ فی شعر کے حساب سے ہر وہ شخص کہہ سکتا ہے جسے نظم پر قدرت ہو۔

میں اس قسم کے اشعار یا غزل کو سائیکل سے تشبیہ دیتا ہوں جس کے تمام کل پرزے یعنی فریم، ہینڈل، پہیے، پیڈل، ٹیوب، ٹائر، گھنٹی، اسٹینڈ، مڈگارڈ وغیرہ ہر چیز پہلے سے ایک مستری کے پاس موجود ہے۔ وہ ان سب کل پرزوں کو جوڑ کر سائیکل آپ کے سامنے کھڑی کر دیتا ہے۔ تو کیا آپ واقعی اس مستری کو سائیکل کا موجد یا صانع کہیں گے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ یہی حال ہمارے اُن شعرا کا ہے جو صرف موزونیٔ طبع کے سہارے، کسی ذہنی کاوش کے بغیر دوسروں کے مضامین و الفاظ کو ایک خاص وضع سے مُرتّب کر کے ایک نئے شعر کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور آپ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کوئی بڑا کمال کیا۔ مگر میرے نزدیک ان کی حیثیت سائیکل کے مستری سے زیادہ نہیں اور انہیں ایک آرٹسٹ یا فن کار کا درجہ دینا صریح ظلم ہے۔

اسلوبِ بیان کے سلسلے میں طرزِ ادا کی ندرت کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی باتوں کا لحاظ ضروری ہے مثلاً یہ کہ اگر غزل کا شعر ہے تو اس کی زبان بھی غزل کی ہو۔ آمد ہو آورد نہ ہو۔ قافیہ کی مجبوری سے مضمون دب نہ گیا ہو۔ مثلاً ایک مرتبہ مشاعرے کے لئے یہ مصرعہ طرح تجویز ہوا۔ ع:

اب درد بھی نہیں ہے جو درماں نہیں رہا

میں نے بھی چند شعر کہے۔ اُن میں سے ایک یہ تھا:۔

آخر اس التفات سے دیکھا ہی تم نے کیوں
کس کا تصورِ شوق جو پنہاں نہیں رہا

مشاعرے میں اس شعر پر بہت داد ملی لیکن قافیہ کی مجبوری سے اس میں جو کمی رہ گئی تھی اُس کا مجھے اچھی طرح احساس تھا۔ چند روز کے بعد آخر میں نے اس شعر کو غزل میں سے کاٹ دیا۔ اور علیحدہ اس طرح لکھا:۔

آخر اس التفات سے دیکھا ہی تم نے کیوں
کس کا تصورِ شوق جو بیباک ہو گیا

قارئین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس تھوڑے سے تغیر سے شعر کتنا بہتر ہو گیا۔ درحقیقت شعر کہتے وقت بھی یہی مضمون میرے دماغ میں آیا تھا مگر قافیہ نے مجبور کر کے دوسری طرح کہلوا لیا۔

شعر میں حسن پیدا کرنے کے لئے زمین اور بحر کی شگفتگی بھی نہایت ضروری ہے، بعض بحریں مترنم اور خوش آہنگ ہیں۔ بعض ایسی ہیں کہ ہماری طبائع اُن سے بہت کم مناسبت رکھتی ہیں مثلاً۔

تو نے قسم مےکشی کی کھائی ہے غالب
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

یا

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بحر تو شگفتہ ہے لیکن زمین اچھی نہیں مثلاً ایک اُستاد کا مطلع ہے:

مری فطرت میں ہے داخل ہوسِ جامِ شراب
ساقیا مجھ کو بنا دے مگسِ جامِ شراب

اس قسم کی زمینوں میں غزل لکھنا، غزل کی جانِ نازنین پر انتہائی ظلم کرنا اور اپنی بدذوقی کا ثبوت دینا ہے۔

تحلیلِ شعر

سطورِ بالا میں نقدِ شعر کے جو اصول بیان کئے گئے اُن کی مدد سے ہر شعر کی تحلیل کر کے ہم اس کے حسن و قبح کا ایک بڑی حد تک صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جب ہم کوئی شعر پڑھیں یا سُنیں تو اُس کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب ہونے کے بجائے سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ

(۱) نفسِ خیال کیا ہے اور کیسا ہے۔ (۲) اور وہ طبع زاد ہے یا سرقہ۔ (۳) اُس میں کوئی تازگی ہے یا عامۃ الورود ہے اس کے بعد یہ دیکھنا چاہیئے کہ (۴) اس میں تخیل کا عنصر کتنا ہے اور کیسا ہے۔ (۵) جذبے میں صداقت اور خلوص ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کس حد تک ہے۔ (۶) اور کہنے والے نے کتنی شدت کے ساتھ اُسے محسوس کیا ہے۔

اِس کے بعد اسلوبِ بیان کا جائزہ لینا چاہیئے کہ (۷) آیا طرزِ ادا میں کوئی نُدرت ہے یا نہیں (۸) اور زبان کیسی ہے (۹) آمد ہے یا آورد (۱۰) قافیہ کی مجبوری سے مضمون میں کتر بیونت تو نہیں کی گئی (۱۱) بحر و زمین شگفتہ و خوش آہنگ ہیں یا نہیں (۱۲) اور بحیثیتِ مجموعی شعر میں تاثیر کتنی ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے اگر اپنے یا دوسروں کے اشعار کو اس کسوٹی پر کَس کر دیکھیں گے تو انہیں کھوٹا کھرا بہت آسانی سے معلوم ہو جائے گا اور وہ مشاہیر و اساتذہ کے ناموں سے مرعوب ہونے کے بجائے شعر کے حقیقی حُسن کی بنا پر اُسے اچھا یا بُرا قرار دے سکیں گے۔

مولوی عنایت اللہ دہلوی کے تراجم

سلامبو:۔ قرطاجنۃ قدیم کا رومان مشہورِ عالم تصنیف۔ قیمت للعہ

نجم السحر:۔ پانچ ہزار سال پہلے کے مصر کا رومان۔ ،، ۳؍

تائیس:۔ اناطول فرانس کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ۔ ،، ۸؍

ہردو یاس:۔ سالوی کے خون آشام حُسن کا قصہ۔ ،، ۱۰؍

اِنطونی کلا بطرہ:۔ شیکسپیئر کے مشہور ڈرامہ کا ترجمہ۔ ،، ۱۲؍

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بک ڈپو! دہلی!

فرار

میں نے سوچا ہے کہ اِک جنبشِ مژگاں کے طفیل
تلخیٔ زیست کے پرچم کو نگوں سر کردوں
لے کے دامن میں فقط ایک دہکتا آنسو
آج تاریک خلاؤں میں ستارے بھردوں
خامشی جھوم اٹھے گھوم اٹھیں سارے نجوم
کہکشاں بڑھ کے بچھا ڈالے ستاروں کی بساط
جس پہ میں بڑھتی چلی جاؤں بصد ناز و ادا
اپنے قدموں سے جگاتی ہوئی خوابیدہ نجوم
اپنی ٹھوکر سے جلاتی ہوئی تاروں کے چراغ
یوں ہی اِک برق کی مانند چمکتی، مڑتی
تیرہ و تار ستاروں کو منور کرتی۔
کسی تاریک سی دنیا میں فنا ہو جاؤں

کاش یہ خواب حقیقت میں بدل سکتا کبھی!
کاش یہ سوچ مری بن کے عمل کا پیغام
مجھے اِس قلزمِ ہستی سے دلا سکتی نجات
جس کی ہر موج میں مستور ہے فرسودہ نظام
جس کے بے پایاں سلاسل سے نہیں کوئی بری
جس کی آواز، سسکتی ہوئی روحوں کا جمود
جس کا قانون، امارت کے حلاؤں کا غلام
جس کی تعمیر میں خوں گشتہ تمناؤں کا جوش
جس کی تخریب میں مصروف ہر اک پیر و جواں
میں نے سوچا ہے کہ اس قلزمِ بے پایاں سے
کاش میں برق کی مانند چمکتی، مڑتی
تیرہ و تار ستاروں کو منور کرتی۔
کسی تاریک سی دنیا میں فنا ہو جاؤں

نصرت آرا نصرت

نہال سیوہاروی

دوسری جنگِ عظیم کا آخری منظر

گونجتے ہیں پے بہ پے غمناک انسانوں کے بین
مشرق و مغرب سے آتی ہے صدائے شور و شین
خانہ ویرانی پہ اپنی گرمِ ماتم ہے حیات
اک فغانِ بیکسی، اک نالۂ غم ہے حیات
الاماں یہ شکل، یہ حالِ زبوں تہذیب کا
فتنۂ تخریب پر ہے سرنگوں تہذیب کا
امن کے دیدے کو پر ہے غبارِ انتشار
ہے قبائے نظمِ عالم جا بجا سے تار تار
پھونکدے جو خرمنِ راحت وہ ساماں ہیں ہنوز
دھیمی دھیمی جنگ کی آتش فروزاں ہے ہنوز
مل چکا ہے خاک میں جنکی بلندی کا غرور
دُور تک ایسے نظر آتے ہیں ایوان و قصور
بزمِ عالم دُور تک جز عالمِ ویراں نہیں
دُور تک خاموشیاں ہیں دُور تک انساں نہیں
کس قدر سفاکیت کا ہے نمونہ شانِ دہر
خونِ آدم سے ہے رنگیں بسترِ دامانِ دہر
دُور تک سایہ فگن تاریکیٔ آلام ہے
دُور تک صبحِ درخشاں پر یقینِ شام ہے

انتہائے رنج سے کب تک پکاریں کیا ہوئیں
جن سے یہ دُنیا تھی جنّت وہ بہاریں کیا ہوئیں

وہ فراعینِ جہاں تھا جنکو طاقت پر غرور
کاسہ ہائے سر نظر آتے ہیں اُن کے چُور چُور
ہیبت نرم جہاں تھی جنکے ماتھے کی شکن
وقت لے آیا ہے انکو جانبِ دار و رسن
خندہ زن تھی جنکی نخوت رفعتِ افلاک پر
انکا زعمِ نادری دم توڑتا ہے خاک پر
وہ جہانبانی، جہانگیری کا سارا طمطراق
فطرتِ گردونِ گرداں کا تھا اک وقتی مذاق

دیدۂ بینا مآلِ گردشِ ایام دیکھ
خسروانہ قہقہوں کا ہولناک انجام دیکھ

زندگی سے تنگ فاقوں کے ستم سے نیم جاں
رہگزاروں میں رواں ہیں مجمع پیر و جواں
زرد چہرے، جسم فرطِ لاغری سے مثلِ دوک
بھوک کے مارے ہوئے چلّا رہے ہیں بھوک بھوک
شدّتِ ناطاقتی پیہم گراتی ہے انہیں
موت اپنی سمت رہ رہ کر بلاتی ہے انہیں
آدمی کہتے ہیں جس کو افتخارِ کائنات
ننگِ بازارِ جہاں ہے آج عارِ کائنات

الحذر از سختیٔ جورِ زمانہ الحذر … آدمی ہے چند ٹکڑوں کے لئے دریوزہ گر
زیرِ گردوں بھوک کی فریاد ہے گونجی ہوئی … داستانِ خاطرِ ناشاد ہے گونجی ہوئی

اس طرح اہلِ دُوَل ہیں مطمئن بیٹھے ہوئے
سرکشی جیسے ہوں مغرورِ جن بیٹھے ہوئے

میرے دل کے پار ہی احساسِ غربت کی انی … دیکھتا ہوں ایک ایسا منظرِ عریاں تنی
اُف یہ دردانگیز نظارہ تہِ چرخِ کہن … فکر میں تن ڈھانپنے کی ہیں پریشاں مرد و زن
پاسِ عزت کیا کرے پاسِ شرافت کیا کرے … ہو میسر ہی نہ جب پوشاک عورت کیا کرے
ستر پوشی کیلئے نایاب اک چادر ہے آج … شمع پر ایسی بنی فانوس سے باہر ہے آج
صنفِ نازک اپنے آپ کو چھپا سکتی نہیں … کیا قیامت وقت سے کچھ قبل آ سکتی نہیں
دُور اس منظر سے ہیں کچھ لوگ بارنج و محن … اپنے کاندھوں پر اٹھائے ایک نعشِ بے کفن
جینے والوں پہ جہاں آسائشِ تن ہو حرام … مرنے والوں کا ہو اس دُنیا میں کیونکر احترام

عہدِ نو آتا ہے کچھ دن اے غریبی صبر کر
صبر کر کچھ دن یونہی اے بدنصیبی صبر کر

انتہائے غیظ میں وہ دیکھنا اک اژدحام … اپنی محکومی سے سرگرمِ بغاوت ہیں غلام
کیوں چمن پہ غلبۂ صیّاد ہونا چاہیئے … گلستاں میں شور ہے آزاد ہونا چاہیئے
نعرہ زن ہے بندگی یہ تلخ کامی تابکجا … قسمتِ محکوم میں زہرِ غلامی تابکجا
سوچکے اربابِ غفلت دورِ ہشیاری کا ہے … عالمِ مجبور کو ارمان مختاری کا ہے

پھر رہا ہے دیوِ استبداد گھبرایا ہوا
صید کے نالوں سے ہے صیّاد گھبرایا ہوا

یہ تری دنیائے پُرغم اے الٰہ العالمیں … ہے یہ دُنیا یا جہنم اے الٰہ العالمیں
یہ بلکتی زندگانی کے نظارے الاماں … یہ دُھواں آہوں کا، نالوں کے شرارے الاماں

دید کی لاؤں کہاں تک تاب چکراتا ہے سر
ایک ہلکا سا الٰہی خواب چکراتا ہے سر

حجاب امتیاز علی

"وہ طریقہ تو بتادو تمہیں چاہیں کیونکر؟"

بہار کی ایک سنہری صبح میں صوفی اطہر ر سے منتھی نفسیاتی ماحصہ کی ایک کتاب کے دلائل کو کوئے گھونٹوں کی امداد سے دماغ میں اتارنے کی کوشش کر رہی تھی

اچانک ریحانی اپنے کالج کا ملبیر پہنے ہانپتے ہوئے دریچے میں سے اندر کمرے میں کود پڑا

"تم!"

"میں!"

صوفی:- "چوروں کی سی شکل سے ادھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہو؟"

ریحانی:- "ش ش ش ش! ــــ دادا ابا کا ڈر ہے موجود تو نہیں گھر میں؟"

صوفی:- (حقارت سے) "دادا ابا کا ڈر۔ کس قدر دقیانوسی بات ہے۔ مزید براں مجھے بزدلی اور بزدلوں سے اتنی نفرت ہے کہ کسی اور چیز سے نہیں"

ریحانی:- "میری جگہ کوئی شیر دل بھی ہوتا تو ایسے موقع پر دادا ابا سے ڈرے بغیر نہ رہ سکتا۔ جانتی بھی ہو ان دنوں سالانہ امتحان ہو رہے ہیں۔ اور میں ایسے موقع پر کالج سے بھاگ کر یہاں آ پہنچا ہوں!"

صوفی:- (بے پروائی سے) "کوئی کتاب لینے آئے ہو؟"

ریحانی:- "اب جان بوجھ کر انجان نہ بنو میری جان!"

صوفی:- "یہ طرزِ خطاب دقیانوسی ہونے کے علاوہ بہت ارزاں بھی ہے ریحانی۔ خیر جس غرض سے بھی آئے ہو میری بلا سے۔ میرے مطالعہ میں خلل اندازی نہ کرو"

یہ کہہ کر وہ کتاب میں غرق ہو گئی۔

ریحانی:- "اتنا ظلم؟ آہ۔ کس قدر حسین معلوم ہو رہی ہو کتاب پر جھکے ہوئے! جیسے یونانیوں کی علم کی دیوی! میں کالج سے صرف اس لئے آیا ہوں تاکہ تم پر ثابت کر دوں کہ مجھے تم سے کس قدر محبت ہے"

یہ کہہ کر ریحانی ایک ڈسپی پر بیٹھ کر صوفی کے چہرے کو تکنے لگا۔ مگر صوفی کتاب میں غرق تھی۔ اُسنے سُنا ہی نہیں۔

ریحانی (دوبارہ) "تاکہ تم پر ثابت کر دوں کہ مجھے تم سے کس قدر محبت ہے!"

صوفی:- (کتاب سے نظر اُٹھائے بغیر) "کچھ کہا تم نے؟"

ریحانی:- "میں نے کہا مجھے تم سے محبت ہے"

صوفی:- "پھر ــــ؟ جملہ ختم بھی تو کرو"

ریحانی:- "اس سے زیادہ مکمل جملہ اور کیا ہوگا بھلا؟ مجھے تم سے محبت ہے"

صوفی:- "کتنی دقیانوسی باتیں کرتے ہو۔ پچھلی صدی کی مظلوم عورتیں شاید اس قسم کی باتوں سے خوش ہو جاتی ہوں۔ اب ایسی باتوں کا زمانہ لد چکا۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ پچھلی صدی کی سی باتیں نہ کیا کرو"

ریحانی:- "پچھلی صدی کی سی؟ ــــ آخر محبت جیسی پچھلی صدی میں ہوتی ہو گی ویسی ہی اب ہوتی ہے۔ اسے کیا بھونڈی لگ سکتی ہے اور اس میں کیا فرق پڑ سکتا ہے؟ مجھے تم سے محبت ہے صوفی"

صوفی:- (حقارت سے) "کند ذہن! محبت عملی ہونی چاہیئے۔ نہ کہ لفظی!"

ریحانی:- (بے تابانہ بڑھ کر) "یعنی! یعنی! تمہیں اپنے بازوؤں میں؟ ــــ"

صوفی:- (ناک پر رومال رکھ کر) "بات مناسب فاصلہ پر رہ کر کرنی چاہیئے۔ قریب ہی آکر کچھ کہنا ہو تو بات کرتے وقت منہ دوسری طرف پھیر لینا چاہیئے۔ خصوصیت سے ایسی صورت میں جب گذشتہ مہینے انفلوئنزہ ہو چکا ہو۔ تم نے پڑھا ہوگا جراثیم نو فٹ تک اثر کر سکتے ہیں۔ اور انفلوئنزا کے جراثیم عشق کے جراثیم کو مار ڈالتے ہیں۔ تو کیا کہہ رہے تھے تم؟"

ریحانی:- (منہ دوسری طرف پھیر کر) "یہی کہ مجھے تم سے عشق ہے"

صوفی:- یہ اور بھی دقیانوسی بات ہے۔ محبت کہنا بہت کافی

تھا عشق سے خواہ مخواہ دماغی امراض کا خیال آجاتا ہے۔"
ریحانی:۔ "تو یونہی سہی۔ مجھے تم سے محبت ہے۔"
صوفی:۔ "یہ میں چار سال سے سُنتی آرہی ہوں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اظہارِ محبت سے پہلے اپنے اوپر ایک نگاہِ تنقید ڈالنا بے حد فائدہ مند ہوتا ہے۔"
ریحانی:۔ (نکٹائی کی گرہ درُست کرتے ہوئے) "میں نے کل ہی شام سینما جانے سے پہلے ڈالی تھی۔"
صوفی:۔ "میرا مطلب تمہیں تمہاری عنابی نکٹائی کی یاد دلانا نہ تھا۔ اس رنگ کی ٹائی تو ہرا ایرا غیرا لگا سکتا ہے۔ تم نے ہی کونسا تیر مار لیا؟ میرا مطلب تھا عاشق بننے سے پہلے تمہیں وہ باتیں اپنے میں پیدا کرلے کی کوشش کرنی چاہیئں جن پر عورتیں فدا ہوں۔"
ریحانی:۔ "اس سے زیادہ تم مجھ سے اور کیا چاہتی ہو صوفی! میں تمہارا زرخرید غلام بن چکا ہوں۔"
صوفی:۔ زرخرید سے محبت کرنا احساس کمتری کی دلیل ہے! جو پچھلی صدی کی عورتوں میں تھی۔ شکر ہے یہ مرض مجھ میں نہیں ہے۔"
ریحانی:۔ "ٹھیک کہتی ہو۔ گذشتہ ہفتے ڈاکٹر نجم کی محکومی اور فرماں برداری ہی کے باعث ڈاکٹر اور بیگم نجم میں قانونی جدائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔"
صوفی:۔ "یہ ہوتے ہوتے رہ جانا اور بھی دقیانوسی بات ہے۔ ہو جانا زیادہ عملی پہلو لئے ہوئے ہے۔ اور زندگی عمل کا نام ہے۔"
ریحانی:۔ "تو میں کہہ رہا تھا کہ تم جو حکم بھی دوگی میں اسی کے مطابق بن جاؤں گا۔ اور وہی حرکتیں کرونگا، جن کی تم اجازت دوگی۔ تم بتاؤ مجھے کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہیئے؟"
صوفی:۔ "تمہاری یہی باتیں مجھے زہر لگتی ہیں۔ آدمی میں ——— میرا مطلب ہے عاشق میں طبع زاد باتیں ہونی چاہئیں نہ کہ مانگے تانگے کی ؎

شعور سیکھ مجھے امتیازِ عشق کہاں
کہاں تو لذتِ سوز و گدازِ عشق کہاں

ریحانی:۔ "طبع زاد باتیں؟ تو میرے خیال میں مجھے سب سے پہلے تمہیں اس بات کا یقین دلانا چاہیئے کہ میں نے آج تک کبھی کسی دوسری لڑکی سے محبت نہیں کی۔"
صوفی:۔ "خطرناک طور پر دقیانوسی بات ہے! مزید براں میں نے یہ کب کہا تھا کہ تم بے تعلق باتیں شروع کردو؟"
ریحانی:۔ "یہ بے تعلق بات تھی؟ تو پھر میں کیا کہکر تمہیں اپنی پہلی گہری اور اٹل محبت کا یقین دلاؤں؟ اچھا یاد آیا ——— یوں فرض کرو کہ حسین مئی کی ایک دلربا چمکیلی صبح تم محو گلگشت ہو۔ اور زرد لیموں کی خمیدہ ٹہنی پر سے ایک بُلبُل ناشاد اچانک تم پر حملہ آور ہو جائے اور تمہاری ایک سرگیں نرگسی آنکھ اس ظالم بُلبُل کی چونچ کی مدر ہو جائے تو کیا تم سمجھتی ہو کہ میری محبت میں کسی قسم کا فرق پڑ جائے گا؟"
صوفی:۔ "اصولاً پڑ جانا چاہیئے۔"
ریحانی:۔ (فخریہ) "غلط! میری جان! ایک تو کیا تمہاری دونوں آنکھیں پٹ ہو جائیں اور تمہاری ستون جیسی ناک کی نوک پر کسی تیز چاقو کا بدنما داغ بھی پڑ جائے تب بھی میری محبت میں سرِ مو فرق نہیں پڑے گا۔"
صوفی:۔ (حیران ہوکر) "عجب ہے! کیا سچ کہتے ہو؟"
ریحانی:۔ "بالکل سچ۔"
صوفی:۔ "ہوگا۔ لیکن اگر اس پر یقین کر بھی لیا جائے تو اس سے صرف تمہاری بدمذاقی پر روشنی پڑتی ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ مذاقِ حسُن تم کو چھو کر بھی نہیں گیا۔"
ریحانی:۔ "تو آخر میں کیا کہوں؟ کیا کہکر تمہیں اپنی محبت کا قائل کروں؟ یہ کہکر کہ اگر تم زہر کا پیالہ بھی مجھے دو تو میں اُسے امرت سمجھکر پی جاؤں گا؟"
صوفی:۔ "پی جاؤ گے؟"
ریحانی:۔ "یقیناً۔ (ہنستے ہوئے)"
صوفی:۔ "کس قدر بے وقوف ہو! جی چاہتا ہے کہ تمہیں واقعی ایک ہاتھ سے زہر کا پیالہ دوں اور دوسرے سے ایک تھپیڑ رسید ———"
خشم زدن میں ریحانی کا چہرہ چقندر کی طرح سُرخ ہوگیا۔
ریحانی:۔ (چلاّ کر) "کیا کہا تھپیڑ؟ اِدھر تو آجو اُٹھا کر

دریچی سے باہر سمندر میں نہ پھینک دیا ہو اور اگر لہروں میں سے ابھر آئے تو کیواڑ توڑ کر ابھری ہوئی پر دھڑے سے نہ دے مارا ہو! ایک گھنٹے سے بک رہا ہوں کہ مجھے محبت ہے۔ محبت ہے۔ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی! خیر کہیں کی! خیر تو ہی تو!"

صوفی۔ (مسرت اور خوف کی تیز چیخ کے ساتھ) "میری جان ریحانی! تم میں محبت کے جلنے کی صلاحیت ہے! تم قابلِ پرستش ہو! تم میں جدت ہے! تم ماڈرن ہو!"

خانم

(دوسرا ایڈیشن)

عظیم بیگ چغتائی مرحوم کی بہترین تصنیف ہے۔ اس دلچسپ اور دلکش کتاب کا ہر ایک باب ایک چمکتا ہوا مزاحیہ افسانہ ہے ہر افسانہ ایک علیحدہ کہانی ہے مگر سب کہانیوں کا ہیرو اور کردار ایک ہے ایک سے ایک مزیدار اور ہنستی ہوئی کہانی اس قدر پُر لطف، اس قدر پُر مذاق اس قدر عجیب اور اس قدر مضحکہ خیز اس قدر ظرافت اور لطافت آمیز اور مزیدار پلاٹ کہ جو پڑھے ہنسے۔ اس کے افسانے برسوں اخباروں اور رسالوں میں نقل ہوتے رہے، رسالوں میں چھپے، بنگلہ زبان میں اور گجراتی میں بھی چھپ گئے۔

یہ چغتائی صاحب کی بہترین کتاب ہے۔ بہترین لکھائی چھپائی۔ مجلد، گردپوش سے آراستہ قیمت چار روپے (للعہ) علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ:۔

ساقی بکڈپو، دہلی۔



عورتوں کی

خوب صورتی

اور جوانی گلاب کے اس نازک پھول کے مانند ہے جو ذراسی بے احتیاطی سے کملا جاتا ہے چنانچہ سو میں سے ننانوے عورتیں وقت سے پہلے بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ لیکن ہمدرد کے ماءاللحم نے لاتعداد عورتوں کو تندرست اور خوب صورت بنا دیا ہے۔

ماءاللحم

غذا نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں تازہ خون جو حلق سے اترتے ہی رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔ ہمدرد کا ماءاللحم عورتوں کا رنگ نکھارتا ہے۔ چہرہ گلاب کی طرح دمکنے لگتا ہے۔ نسوانی بیماریاں خود بخود جاتی رہتی ہیں۔ زچگی کی کمزوری کو فوراً دور کرتا ہے۔

ہمدرد کا ماءاللحم

تازہ پھلوں، مقوی میووں، صحت بخش غذاؤں اور قیمتی دواؤں کے جوہروں سے صحت سازی کی جدید مشینوں میں خالص سائنٹفک اصول پر تیار کیا جاتا ہے۔ یہ دل، دماغ اور اعضاء رئیسہ میں نئی زندگی پیدا کر کے عورتوں کو نئے سرے سے جوان اور خوب صورت بنا دیتا ہے۔ معالج پورے اطمینان کے ساتھ استعمال کراتے ہیں۔

قیمت فی بوتل پانچ روپے نمونہ کی شیشی ایک روپیہ چار آنے۔

Hamdard ہمدرد دواخانہ دہلی

علامہ مضحک

توبڑے پہلوان

کسی نے سچ کہا ہے کہ حاکم کی اگاڑی اور گھوڑے کی پچھاڑی سے بچتے رہنا چاہیئے۔ حاکم کی اگاڑی سے تو انسان خوشامد کرے۔ اطاعت اور فرمانبرداری سے بچ بھی جائے مگر گھوڑے کی دولتی سے خدا بچائے۔ اس سے بھی کہیں زیادہ ایک مہلک دولتی ابلق لیل و نہار اور گردش ایام کی ہے کہ جس نے دلی بالکل اینڈ کر دیا۔ دلی غریب بھی جس تاریخ سے جنم لیا ایسی ہی دولتیاں کھاتی رہی۔ اینڈ ہوتی رہی اور بسنورتی رہی۔ ایک جگہ سے اجڑی دوسری جگہ بسی۔ دلی جن دل والوں کے دم سے آباد تھی ان کے جو دولتیاں لگیں تو ایک ایک کرکے غائب ہو گئے۔ اور ہو رہے ہیں بقول مرزا غالب ع خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں۔ ہمارے ہوش ہی کی بات ہے کہ اسی دلی میں ہر ایک فن کا صاحب کمال موجود تھا۔ اگر ان با کمال لوگوں کے تذکرے لکھے جائیں تو آثار صنادید کی سیکڑوں جلدیں تیار ہو جائیں۔ اس وقت تو تیس پینتیس برس پہلے کی دلی کے ایک زبردست کشتی گیر کے کردار کے دو تین دَور جو لطف اور سبق آموزی سے پُر ہیں پیش کرنے ہیں۔ ان کا پورا نام آغا جان عرف توبڑے پہلوان تھا۔ یہ چار بھائی تھے۔ ہاتھ پاؤں ہلانے اور کسرت کا شوق سب کو تھا۔ اور چاروں کسیرو والے اکھاڑے کے شاگرد تھے۔ توبڑے پہلوان بڑے سے چھوٹے یعنی سنجھلے تھے۔ ان کی کشتی اور پہلوانی کا حال پڑھنے اور سننے سے قبل ان کے ڈیل ڈول کا تذکرہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ پانچ فٹ کا قد اس پر ۴۰ انچ کا سینہ۔ اور تقریباً ۴۲ انچ کی کمر اور اسی نسبت سے وہ بنے بنائے آدمی نہیں بلکہ آدمی کی پیمائش کا مُربع تھے۔ چار ساڑھے چار من کا وزن۔ فربہی اور تیاری کی وجہ سے دونوں بغلوں میں اتنا گوشت تھا کہ بغل بند نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر جسم کے تمام عضلات اور مچھلیاں خوب نمایاں ابھری ہوئی سڈول اور سخت۔ توند بہت بڑی مگر تھل تھل نہیں بلکہ بہت ٹھوس قسم کی جس پر ایک آدھ مکے کا اثر آسانی سے نہ ہو۔ رانوں کی تیاری کا قیاس اس سے کر لیجئے کہ ان کی جانگیہ میں سے آٹھ دس برس کے بچے کا سارا جسم آسانی سے نکل سکتا تھا۔ اور یہ جانگیہ ران پر اتنی چسُت آتی تھی کہ لڑنت کے وقت اس میں ہاتھ پڑنے کی گنجائش مشکل سے ملتی تھی۔ سر منڈا ہوا، چہرہ گول اور خوب بھرا ہوا۔ گردن نہایت مضبوط اور تیار۔ پشت کی طرف سے دیکھئے تو یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ گردن کہاں سے شروع ہوئی ہے بلکہ سر سے کندھوں تک گردن کی بجائے ایک چوڑی سل سی معلوم ہوتی تھی۔ چہرے پر نہایت گہرے گہرے چیچک کے داغ، گلے چونکہ خوب ابھرے ہوئے تھے اسی وجہ سے "توبڑے" کی پھبتی چسپاں کی گئی تھی۔ آنکھیں بہت بڑی بڑی اور کشادہ، رنگ گندمی، چال ڈھال نہایت مستانہ، مگر اس فربہی اور تن و توش پر دوڑ بلا کی تیز اور کشتی میں پھرتی اور چستی "برق مثال"۔ یہ اور ان کا سب سے چھوٹا بھائی بُم بُم دہلی شہر میں بلا کے کشتی گیر گذرے ہیں۔

آغا نے اپنی تمام کمائی اور زندگی کا زیادہ حصہ بُم بُم کو بنانے میں خرچ کیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اس کی عمر وفا کرتی تو سنیچو والے اکھاڑے میں تو کیا شہر کے کسی اکھاڑے میں اسکی جوڑ مشکل سے نکلتی۔ اس جوانا مرگ کی موت کا حال اپنے پرائے جس کسی نے سُنا آنسو نکل پڑے۔ شہر میں تہلکہ مچ گیا تھا۔

بُم بُم کے مرنے کے بعد کئی روز تک اکھاڑہ بند رہا پٹھوں نے ادھر اُدھر کونے کھُدرے میں ہاتھ پاؤں ہلالئے۔ اور اکھاڑہ کھلنے کے بعد کئی مہینے تک آغا نے ادھر کا رخ نہ کیا۔ آخر تابکے۔ وہی مقولہ کی کہاوت کہ میاں مرنے کے ساتھ کسو کو مرتے نہیں دیکھا — جو مصیبت کہ پہاڑ ڈھاتا ہے وہی زخمی دلوں کیلئے مرہم کا کام بھی دیتا ہے۔ آخر استاد کے زور دینے سے آغا نے بھی ظہر و عصر درویش برہان درویش اکھاڑے میں رفتہ رفتہ جانا شروع کر دیا۔ دو چار پٹھوں کو چھانٹ چھانٹ کر زور کیلئے مقرر کیا۔ مگر خود ابھی تک لنگر جانگیا کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔

ایک روز کا واقعہ عجیب ہوا۔ آغا اکھاڑے کی سیڑھی پر بیٹھے زور کی سیر دیکھ رہے تھے۔ وقتاً فوقتاً بتاتے جاتے تھے "یہاں سے گردن کا ہاتھ ڈال" "فلانے کا بیٹا پکڑ لے" "یہاں سے سکھی لگا"۔ دو چار بڑے پٹھوں میں اشارے سمجھ۔

ایک دم سے پیچھے سے آکر آغا کو مقام الٹا گئے میں پیل دیا۔ ایک بے سواری گا نتھی، کرسی سے "ہفتہ" جنت حلسے، غرض چیونٹیوں کی طرح چمٹ گئے۔ آغا ان کو دھکا لے نہ ہی رہے۔ سب نے مل کر ایسا زور دیا کہ میاں آغا کا ناک ٹھوک جاری ہو گیا۔ اس سے پہلے ایسا ہوتا تھا کہ دس بیس تگڑے بیٹھے تو بڑے پہلوان پر بوجھا دستی اور مشکل سے ان کا دم گھٹاتے یا اب دو ہی تین منٹ میں آغا کو خود "مشق اللہ" مانگنی پڑی۔ اس وقت کے بعد سے آغا کی پہلوانی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اور اس دور میں آغا نے دلی میں دو ایک بڑی کشتیاں لڑیں۔ اور وہ اچھو پہلوان سے ہوئی۔ کشتی کا نام "...۔" تھی۔ "یہ فیصلہ ہونا تھا کہ دلی میں اس وقت کون پہلوان سر ... تھا۔ یہ طرہ حاصل کرنے کیلئے طرفین کی جانب سے پوری پوری کوشش ہوئی اور "پورا" تین دن مسلسل کشتی جاری رہی۔ اور سرود دنگل گنڈے کی طرح بھر مارا رہا۔ دور دور سے لوگ اور شوقین آتے رہے۔ مثلاً حد اکی سنا کہ دو نو پہلوانوں کے ایسے "کس" ملے کہ باوجود انتہائی سرگرمی کے "قسم بیٹھ" تک نہ ہو سکی۔ دونوں نے داؤں گھات میں کسر نہ اٹھا رکھی۔ لاکھ "پینترے" بدلے۔ جھکیاں دیں مگر ایک دوسرے کو پکڑا نہ لا سکا۔ بڑے بڑے ماہرین فن اور معزز لوگ منصف تھے۔ آخر میں یہی فیصلہ ہوا کہ "برابر کی جوڑ" تسلیم کر لئے گئے۔ آغا میں باوجود اس جسم اور ڈیل ڈول کے پھرتی غضب کی تھی۔ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ یہ چار ساڑھے چار من کا جسم لنگ جانگیہ باندھتے ہی برق مجسم بن جاتا ہے۔ وہ "ترا پ" اور "پیچ" کہ معاذ اللہ۔ آغا یوں تو پہلوان ہی تھے۔ مگر یہ بات مشہور تھی۔ بلکہ مسلم حقیقت تھی کہ پانچ داؤں تو مسلسل ایسے رواں تھے کہ فریق مخالف کو ان داؤں سے بچنا اور "روک تھام" مشکل ہو جاتی تھی۔ داؤں ایسے بھرپور ہوتے تھے کہ جن کا "توڑ" اکثر کا موقع ہی مشکل سے ملتا تھا۔ "پکڑ" تے ہی سب سے پہلے "کسوٹا" ہوتا تھا۔ اس سے بچا تو "لوکان" کا داؤں ڈال دیا۔ پہلوانوں کی اصطلاح میں یہ داؤں "ساجھی" کہلاتا ہے۔ اور جس پہلوان کو سوجھ بوجھ اور سرعت زیادہ ہو اس کو فائدہ پہنچا دیتا ہے۔ آغا اس داؤں میں نوے فیصدی سے زیادہ کامیاب ہوتے تھے۔ اور فریق مخالف کو آغا فانا میں آگے رکھ لیتے تھے۔ پہلوان کو آگے لاتے ہی "کھڑا اکھیڑ" یہ اس سے بچ نکلا تو فوراً "قلاجنگ" اس سے بچ نکلا تو "گدھا لاٹ" ان پانچوں داؤں کا سلسلہ اس قدر پھرتی کے ساتھ جاری رہتا تھا۔ اور پانچوں داؤں ایسے تابڑ توڑ کئے جاتے تھے کہ پوری کشتی میں تین منٹ سے زیادہ نہیں لگتے تھے۔ آغا کے کردار میں ایک زبردست اور عدیم المثال طریقہ "تادیب نفسی" کا تھا۔ جب زندگی میں ان سے کوئی غلطی کوئی خطا یا لغزش سرزد ہوئی تو فوراً اس نے ایک چھری لیکر اپنے جسم کی کہیں نہ کہیں سے ایک بوٹی کاٹ ڈالتے تھے۔ اور اس تادیب نفسی میں اس درجہ سختی برتی جاتی تھی کہ زخم کی مرہم پٹی تو درکنار کبھی پٹی کپڑا بھی نہ باندھا گیا۔ ایسے نفس کو سزا دینے کا یہ ہولناک اور وحشیانہ طریقہ سہی مگر آغا کو اس پر پورا اعتماد تھا۔ اور یہ ایسا موثر اور کارگر عمل ہوتا تھا کہ اس کے بعد اس غلطی اور جرم کی تلافی فوراً ہوتی تھی اور نتیجہ اس کا یقیناً اصلاح ہی اصلاح تھا۔ اور لطیف بات اس میں یہ تھی کہ آغا پہلوان کا جسم خود ان کی بد اعمالیوں جزا اور سزا کا ایک جیتا جاگتا مرقع تھا اور مکمل فہرست۔ ان کے قصور اور خطا کا حال ان سے نہ پوچھئے ان کے جسم کے داغ گن لیجئے۔ صورت سبب حالت میں بس۔

اس کشتی کے بعد آغا پہلوان نے کچھ عرصہ تک کوئی کشتی نہیں لڑی۔ اور لڑتے کیا فی الاصل ان کو کوئی جوڑی نہ ملی۔ البتہ پردیس میں لاتعداد کشتیاں لڑیں۔ اور دھوم دھام سے جیتے۔ دلی والوں کو ان کشتیوں کا حال یوں ہی معلوم ہوتا تھا کہ بسا اوقات ان کے دروازے کے آگے مساکین اور محتاجوں کو کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ میلاد کی مٹھائیاں بٹتی تھیں۔ کبھی کپڑا تقسیم ہوتا تھا۔ غرض اس قسم کی داد و دہش عام تھی۔

آغا پہلوان کے تیسرے دور زندگی میں کرداری حیثیت سے ایک اور واقعہ اہم ہے۔ جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس دور میں ایک وقت ایسا آیا کہ کچھ تو لوگوں کے بہکانے سکھانے سے کچھ اپنی طبیعت کی بغاوت سے آغا پہلوان نے اپنے استاد سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ "میاں تم استاد بنے پھرتے ہو تم نے مجھے سکھایا ہی کیا۔ بڑے استاد ہو تو مجھے اب چت کر کے جب جانوں۔ ورنہ میں تمہیں چت کرتا ہوں۔"

جن لوگوں نے آغا کی اس بدکلامی کو سنا وہ انگشت بدنداں ہوئے اور بہتوں نے یہ خیال کیا کہ استاد آخر استاد ہیں۔ یہ آغا کی بدنصیبی ہے کہ اپنے شفیق استاد کا مقابلہ کیا۔ یہ مار کھائے گا۔

ادھر استاد کی شرافت اور سنجابت دیکھئے کہ شاگرد کی اس حرکت کو ایک دفعہ بہ لطائف الحیل ٹالا۔ مگر آغا نے یہ روز کا مشغلہ سمجھ لیا کہ دم بدم استاد کو لوکنا شروع کیا۔ آخر تابکے استاد ماہر رخ کی بھی رگ حمیت پھڑکی۔ اور ایک دن انھوں نے بھی کہہ دیا کہ "اچھا بیٹا! اگر تیرے دل میں خیال ہے کہ میں نے تجھے کچھ نہیں سکھایا تو اکھاڑا موجود ہے جس دن تیرا جی چاہے ایک پکڑ دیکھ لے۔ مگر ایک شرط ہے۔ تو جوان میں بڈھا۔ تو چار من کا میری پاؤ بھر ہڈیاں۔ تو زور اور بل سے نہیں ہنر اور داؤں سے مجھے چت کر لے تو میں تیرا شاگرد ہو جاؤں گا۔ اور جو میں نے تجھے مار لیا تو چلو بھر پانی میں ناک ڈبو لیجیو" لیجئے جو لوگ استاد شاگرد کی تو تو میں میں دلچسپی لیتے تھے ان کی بن آئی۔ شاگرد نے استاد پر خم مارا۔ اور دونوں کے ہاتھ مل گئے اور کشتی ٹھیر گئی۔

اب اس کشتی کا مزہ اور لطف ان آنکھوں سے پوچھئے جنھوں نے پورا تماشہ دیکھا۔ بڑی خیریت اس کشتی میں یہ ہوئی کہ اور اکھاڑے والوں کو معلوم نہ ہو سکا اور معاملہ خفیہ ہی رہا۔ صرف وہ لوگ اس میں شریک تھے جن کا تعلق بیجو والوں کے اکھاڑے سے تھا۔ کشتی ظاہری صورت سے تو کسی طرح کشتی کہلانے کی مستحق ہی نہ تھی۔ پدی اور شتر مرغ کا مقابلہ تھا۔ مگر جن حضرات کو کشتی کے فن سے لگاؤ تھا انھوں نے استاد ماہر رخ بیگ کے تیور دیکھے۔ اور معلوم کیا کہ اس وقت استادی اور بزرگی کا پورا پورا اجلال، ان کی شکل و صورت، پیچ در پیچ، پیترا اور ٹھاٹھ پر حاوی تھا۔

جس وقت کا یہ تذکرہ ہے اس وقت ہماری دلی میں سو سے زائد مستند اکھاڑے تھے۔ اور ایک سے ایک جنید استاد فن موجود تھا۔ مگر استاد ماہر رخ بیگ میں اور دیگر اساتذہ میں اتنا ہی فرق تھا جتنا — فرق ہی شے دگر است و آماس شئے دیگر۔ استاد نے لنگ باندھتے ہی "یا علی" کا ایک نعرہ لگایا۔ اور اکھاڑے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پانچ سات ڈھیکیاں لگائیں۔ ان ڈھیکیوں میں کیا اڑان اور چستی تھی کہ سبحان اللہ۔ بیچ اکھاڑے میں قائم ہو کر پہلے اپنے خم پر مٹی ملی اور پھر قاعدے کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے حاضرین کو سلام کر کے پیترا قائم کیا۔ اتنا تو سب نے دیکھا۔ اس کے بعد خدا دے اور بندہ لے۔ وہ پھرت پھرت تھی کہ نگاہ قائم نہیں ہو سکتی تھی۔ جتنے اکھاڑے میں بیٹھے ہوئے تھے سب کے دل میں پکھے لگے ہوئے تھے۔ ایک ہی منٹ ہوا ہوگا، آغا ایک طرف ناک سنکنے کو جھکا ہی تھا کہ استاد نے جھپکی دی اور جھٹ سے بغلی ڈوب کر آغا کو آگے رکھ لیا۔ فوراً ایک چپڑاس ماری، آغا کے دونوں گھٹنے ٹک گئے۔ ہاتھ ٹیک کر اٹھنا چاہا۔ استاد اتنا کہاں موقع دینے والے تھے فوراً اپنی سیدھی ٹانگ آغا کی الٹی ٹانگ میں پھنسا کر ایک ہاتھ سے جانگئے کو تھاما اور الٹی ٹانگ سے گھسا کیا۔ آغا گیند کی طرح لڑھک گئے کشتی ہو گئی۔ آغا نے وہیں چت پڑے پڑے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا۔ اور چیخیں مار مار کر رونا شروع کیا۔ ادھر استاد اکھاڑے سے نکل اپنے کپڑے سنبھال چلنے لگے۔ سب سے پہلے ان کے بڑے بیٹے لونے نے دوڑ کر کولی بھر لی اور استاد کو اٹھا کر کندھے پر دھر لیا۔ دوسری طرف آغا اکھاڑے سے لپک کر اپنے کپڑوں کی طرف آئے اور استرا نکال ران میں سے ایک بوٹی کاٹ لی۔ اور پھر فوراً دوڑ کر استاد کے پاؤں سے لپٹ گئے۔ اپنا منہ اور آنکھیں ان کے پاؤں سے ملیں۔ پھر لو رہلوان کے کندھے سے اتار گڑیا کی طرح استاد کو اپنے کندھے پر رکھا اور اجمیری دروازہ کی طرف بھاگے۔ ران میں جو زخم تھا اس سے خون جاری۔ لنگر جانگیہ بندھی ہوئی۔ کمر میں اکھاڑے کی مٹی لگی ہوئی۔ دونوں ہاتھوں سے استاد کی ٹانگیں پکڑے شاہ گنج پہنچے۔ وہاں بیجو والوں کا ڈھولیا رہتا تھا۔ آواز دیکر بلا لیا۔ آگے آگے ڈھول بج رہا ہے۔ پیچھے آغا استاد کو سوار کئے چلے اور خود نعرہ لگاتے جاتے ہیں۔ آغا کے استاد نے آغا کو . . . . وہ مارا۔ پیچھے سارا ہجوم وہ مارا کا نعرہ لگاتا ہے۔ جس طرح اپنے زعم ناقص میں پھول کر استاد کا مقابلہ کیا تھا آج اپنی شکست کا اعتراف بھی اس سے زیادہ شان سے ہو رہا ہے۔ قدم قدم پر آغا ہی کے منہ سے یہ صدا آرہی تھی۔ آغا کے استاد نے آغا حرامی کو وہ مارا۔

دوسرے دن دوسرا سین یہ دیکھا کہ بیجو والے اکھاڑے میں صبح ہی دیگیں کھڑک رہی ہیں۔ بریانی دم ہو رہی ہے لولے لنگڑے محتاج فقرا اور مساکین کو کھانا لقمہ [illegible] ہے استاد ماہر رخ بیگ صاحب تک سے سک نیا جوڑا زیب تن کئے

کرسی پر بیٹھے ہیں۔ آغا نیچے بیٹھے ہیں۔ استاد کے پاؤں دبا رہے ہیں۔ لنگوٹ جانگیہ استاد کے قدموں میں رکھا ہے۔ اصرار ہو رہا ہے کہ یہ لنگوٹ جانگیہ آپ ہی نے بندھوایا تھا اور اب آپ ہی بندھوائیے تو بندھے گا نہیں تو پھونک دوں گا۔ استاد ایک تو استاد اور پھر شریف النسل، نیک دل، کرسی پر سے اٹھ کر آغا کو گلے سے لگا لیا۔ لنگوٹ جانگیہ لوبان کی دھونی دیکر اپنے ہاتھ سے بندھوایا۔

آغا نے استاد کو سلام کیا ہاتھ کو بوسہ دیا۔ پانچ ڈنڈ اور پانچ بیٹھک عتیق اللہ کی لگائیں۔ اتنے میں شیرینی آئی۔ فاتحہ ہوئی۔ لیجئے آغا پہلوان . . . کی پہلوانی کا تیسرا دور شروع ہوا۔ یہ دور تقریباً ڈیڑھ دو سال کا تھا۔ آغا پہلوان اگرچہ پچاس کے لپیٹے میں آ گئے تھے۔ مگر ہاتھ پاؤں برابر ہلاتے تھے ریاض خوب چڑھا ہوا تھا۔ اگرچہ توند زیادہ نکل آئی تھی۔ مگر بدن کندن کی طرح چمکتا تھا۔ اور بقول شخصے کہ مکھی پھسلتی تھی۔
کسرت کا طریقہ بھی نرالا تھا۔ توند کی وجہ سے نہ تو مل ڈنڈ پر اور نہ نالی پر ڈنڈ پیل سکتے تھے بلکہ اینٹوں کے چار ریختہ پائے ہموار رکھے تھے۔ بس پر دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں رکھ کر زمین سے معلق اور اُدھر ہو کر ڈنڈ پیلتے تھے۔ جو حضرات اس فن سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ طریقہ ڈنڈ پیلنے کا کس قدر دقیق اور مشکل ہے اور ڈنڈ پیلنے والے پر کتنا کسالا پڑتا ہے۔ آغا اس طریقے پر ایسے ڈنڈ پچاس کا بھر کھینچتے تھے یعنی پچاس سے شروع کر کے ایک ایک ہر دفعہ کم کرتے یہاں تک کہ ایک پر پہنچ گئے۔ اس طرح پر کل ۱۲۷۵ ڈنڈ ہوئے اور اسی طرح سو کا بھر بیٹھکیاں جو اس سے دگنی ہوتیں۔ اس کے علاوہ صبح شام کی میل سوا میل کی دوڑ۔ یہ اس دور کی معمولی کسرت تھی۔ اسی دور میں آغا نے آخری کشتی لڑی۔ اور جیت لی۔ یہ کشتی بھی تاریخی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت رکھتی
کچھ عرصہ سے دلی میں رحیم خورجہ والا آ کر دلی میں کئی کشتیاں نکال چکا تھا۔ دو دنگل سے اس کو جوڑ نہیں ملتی تھی آخر ایک دنگل میں اس نے زعم میں آ کر آوازہ کسا اور کہا "دلی والے بہت پہلوانی کا زور باندھتے تھے اب دلی میں میری جوڑ نہیں ملتی۔ آج بھرے دنگل میں کشتی مانگتا ہوں۔ ہے کوئی ماں کا لال جو مجھ سے ہاتھ ملائے" روئے سخن اس وقت دنگل کے بانی پیر جی مظفر علی صاحب مرحوم کی طرف تھا۔ آغا ان کے پاس بیٹھے دنگل دیکھ رہے تھے۔ دلی کا نام سن کر نہ رہا گیا۔ فوراً کھڑے ہو کر جواب دیا "آؤ پہلوان دل چھوٹا نہ کرو ابھی آغا مرا نہیں ہے۔ دلی میں ابھی بہت دم خم ہے۔ میں تم سے لڑوں گا" رحیم بولا "جاؤ پہلوان اپنا کام کرو۔ اب تم میں کیا رکھا ہے خالی گوشت ہی گوشت ہے۔ کیوں اپنے ہاتھ پاؤں انڈکرانے کی فکر میں ہو" اتنا سن کر آغا کو تاب نہ رہی۔ بولے "صاحبزادے کیوں گھمنڈ کرتے ہو۔ ہم نے خدا کے فضل سے کشتی نہیں کھائی پھر بھی غرور نہیں کیا۔ تم کو کاغذ کی طرح چیر ڈالوں گا۔ اور پانچ منٹ میں تین دفعہ چت کروں گا۔ آؤ ہاتھ ملاؤ"

کشتی کا اعلان ہو گیا۔ آئندہ آنے والے جمعہ کو دنگل بندھا۔ آغا کی کشتی کی دھوم سن کر خلقت کا وہ اژدہام تھا کہ خدا کی پناہ۔ شروع شروع آٹھ دس چھوٹی جوڑیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد نقیب نے ایک دم سے آواز لگائی "آغا پہلوان شیخو والے اور رحیم پہلوان خورجہ والے لنگر باندھیں" آواز کا سننا تھا کہ پہلے تو بڑی ہلچل مچی۔ اس کے بعد جب دونوں پہلوان آمنے سامنے آ گئے تو ایک سناٹا چھا گیا۔ دونوں میں انیس بیس ہی کا فرق ہوگا۔ البتہ بلحاظ عمر ایک عروج پر تھا دوسرا مائل بہ انحطاط۔ اس روز پون گھنٹہ تک "تیغ بیل" ہی ہوتا رہا کبھی آغا پہلوان ریل کر رحیم کو دور تک لیجاتے۔ کبھی رحیم آغا کو۔ پینترے ہوتے رہے مگر بدن سے بدن نہ ملا۔ واللہ اعلم بالصواب کیا بھید تھا۔ مبصرین نے رائے دی کہ کشتی تورا ہو رہی ہے۔ لوگوں نے تھوڑی دیر تو صبر کیا۔ اس کے بعد "کشتی تورا ہے" کے آوازے پڑنے لگے۔ کسی نے کہا "دونوں کھلیتوں کو علیحدہ کرو۔ اور چھوٹنے کی حکم بس جوڑ دو" کوئی کہتا "ان کی اللہ کے نام قربانی کر دو" کوئی کہتا "دام واپس پھیر دو۔" مگر جو لوگ آغا کی ذہنیت سے واقف تھے وہ "تورا" کشتی کے خلاف تھے۔ قصہ مختصر اس دن کشتی برابر رہی۔ اگلے جمعہ پر جا پڑی۔ آغا کے دوست احباب نے اس واردات کے متعلق لاکھ پوچھا۔ مگر آغا نے نہ بتانا تھا نہ بتایا۔ اگلے جمعہ کا آنا تھا کہ پھر خلقت کی وہی ریل پیل۔ جوڑ ٹھیک وقت پر چھوٹی۔ آج آغا کے تیور ہی کچھ اور تھے آنکھیں غلافی نکلی ہوئیں۔ ناک کے نتھنے پھولے ہوئے۔ ہاتھ ملانے

کی دیر تھی کہ آغا نے "کھسوطا" کیا۔ اور آن کی آن میں رحیم کو آگے رکھ قلاجنگ پر مار لیا۔ کشتی دنگلی ہوئی۔ ساری خلقت چیخ اٹھی کہ یہ "صحیح" نہیں ہے کشتی آر پار ہوگی۔ دوسری دفعہ پھر دنگلی داؤں پر جیت کیا پھر بھی لوگوں کی اطمینان نہوا۔ رحیم کا یہ حال کہ موم کی گڑیا بن گئے۔ تیسری دفعہ کی کشتی میں سنبھل کر لڑے اور گھستا کر کے چھاتی پر سوار ہو گئے۔ وہ مارا وہ مارا کا غل مچ گیا۔ پھول کے کنٹھوں کا ڈھیر ہوگیا۔ دوشالہ اوڑھ اکھاڑے سے باہر آئے۔ لوگوں نے نذریں دینی شروع کیں تو دوشالہ کی جھولی بھر گئی۔ جھڑا چاندی ہی چاندی ہوگئی۔ کچھ عرصے کے بعد پہلے دن کی کشتی کا حال بھی کھل گیا۔ دنگل کے بانی نے دکانداری کی۔ اگلے جمعہ کے دنگل میں کمائی کی خاطر آغا سے درخواست کی کہ پہلے دن بیچ کر لیں۔ دوسرے جمعہ کو وار پار۔ اس صلہ میں آغا کو دو سو روپے دنگل کے بانی کی طرف سے عطیہ ملا کشتی کا انعام، نذریں اور عطیہ سب ملا کر کئی ہزار کی رقم پلے پڑ گئی۔ اس کشتی کے بعد ایک تو بھائی کا صدمہ دوسرے استاد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آغا نے لنگر کھول دیا۔ اور اپنا کا مداتی کا کارخانہ لیکر بیٹھ گئے۔

(اے۔ آئی۔ آر۔ دلی)

شکست

گذشتہ دس سال کا بہترین ناول

دورِ حاضر کا مشہور صاحبِ طرز انشا پرداز

کرشن چندر

کا لکھا ہوا معرکۃ الآرا ناول شکست اردو افسانوی ادب کا شاہکار ہے ایک مشہور نقاد کہتا ہے "شکست" کرشن چندر کی سب سے بڑی فتح ہے۔ ایک اور صاحبِ ذوق کی رائے ہے کہ "اردو ناول کے باب میں پریم چند کی انتہا کرشن چندر کا آغاز ہے"

ضخامت ۴۰۰ صفحے قیمت تین روپے۔ اپنے شہر کے کتب فروشوں یا

ساقی بک ڈپو دہلی سے طلب کیجئے

فکر تونسوی

قصۂ ہجر و فراق بہ طرزِ نو میگویم

اے مستِ رنگ و نگار و صورت! اگر تجھے اعتبار آئے
مری نظر ہی نے تیرے سترنگ گیسوؤں میں دیئے جلائے
کبھی ترے شور ہیکراں سے ابھار ڈھاتی خموشیوں کو
کبھی تری بے افق خموشی سے بند نغموں میں سُر ملائے
کبھی نہ سوچا بہ جان کر بھی ۔ کہ میرا دل بھی ہے شعلہ شعلہ
کبھی تری جلتی جلتی راتوں میں ساز شبنم پہ گیت گائے
تو چاند تاروں سے پوچھ میرے الم کی رنگت غموں کے نقشے
کہ میرے منہ زور آنسوؤں پر جو اس کٹے دل نے ظلم ڈھائے
کبھی نہ سوچا مری بہاروں میں زہر سا کیوں گھلا ہوا ہے
کہ تیرے لب سے بندھے ہوئے عہد شکوؤں پر نہ حرف آئے
سلگتی جلتی یہ خوشبوئیں گرد و پیش میرے کہاں سے آئیں
یہ کون مجھ کو پکارتا ہے یہ کس نے خوشبو کے پر جلائے
ترے جہاں میں تبسم پے بہ پے سے انکار تو نہیں ہے
مگر وہی ایک مسکراہٹ جو کھو چکے ہیں۔ کبھی نہ پائے
میں دور ہوں تو بھی دور ہے ایک راستہ پر رواں ہیں دونوں
جدائی کا تو اسے گلہ ہو۔ جو اپنی رفتار بھول جائے

جب آنکھ کھلی تو

کھیل

جب آنکھ کھلی تو موسمِ گُل
پھولوں کی زبانیں ایک کہانی
ہر برگ و شجر سے کہہ رہا تھا
مقصود تھی دل کی ترجمانی
چہروں سے سرک رہے تھے آنچل
مصروف تھی کھیل میں جوانی
ہر عضو سے پھوٹتے تھے نغمے
آنکھوں سے شراب ڈھل رہی تھی
جسموں سے ابھر رہی تھیں تانیں
ہر پہلو میں آگ جل رہی تھی

جب آنکھ کھلی تو موسمِ گُل
رنگوں کی گھلاوٹوں میں گم تھا

زخم

چھاگل سے اٹھی جو تان غم کی
آنکھوں سے لہو کی دھار پھوٹی
سینے میں دھواں سا پیچ کھا کر
اس طرح اٹھا کہ آس ٹوٹی
سر جھک گیا داغ مسکرائے
تاریکی میں پھلجھڑی سی چھوٹی
وہ قوس قزح وہ دست رنگیں
کیا جانے سمٹ کے رہ گئے کیوں
اک سیمگوں رات میں نہ جانے
آنسو آنکھوں سے بہہ گئے کیوں

میں تھا کہ بھٹک رہا تھا ہر سُو
ہر خواب سُلگ رہا تھا دل میں

وسوسہ

اک وہم سے نہ بیش تھا کچھ بھی
ساحل تھا نگاہ میں نہ طوفاں
ہر چیز تھی رنگ و بُو سے خالی
صحرا، کہسار اور گلستاں
میں خود ہی تھا رنج و غم کا خالق
میں خود ہی بنا تھا درد ساماں
ہر چیز میں رنگ بھر رہا تھا
میں خود کو فریب دے رہا تھا
میں خود سے الجھ رہا تھا اب تک
خشکی ہی میں ناؤ کھے رہا تھا

پھر خواب سے چونک اٹھا سنبھل کر
ہر شے تھی حقیقتِ مجسّم!

رہگزار

مغموم تھا وقت، راہ مسدود
تھے چھائے ہوئے سیاہ بادل
ہر نغمہ خموش ہو چکا تھا
پاؤں سے الجھ چکی تھی چھاگل
کملائے ہوئے تھے دستِ رنگیں
چہروں سے سرک چکے تھے آنچل
اک اور ہی سمت تھیں نگاہیں
ہر اشک مچل کے بہہ گیا تھا
تاباں تھی اُفق پہ خون کی لَو
ہر خواب سُلگ کے رہ گیا تھا

تاروں کے سہارے چل رہے تھے
سُورج کی تلاش میں تھے راہی!

اختر الایمان

فسردہ لمحے شگفتہ لمحوں کو چھو رہے ہیں

پھسلتے ملبوس لغزشِ بے صدا ہیں، میں نے
سُنے ہیں ایسے ہزاروں نغمے۔
ہزاروں نغمے سُنے ہیں میں نے۔
پھسلتے ملبوس، کھلتی کلیاں، اُمنڈتی خوشبو!
ڈھلکتی پلکیں، بکھرتے گیسو . .

سیاہ گیسو . .
دبیز بادل۔
دبیز بادل مری نگاہوں پہ چھا رہے ہیں۔
دبیز بادل یہ کیسے مبہم نقوش اپنی گُھلاوٹوں میں دکھا رہے ہیں؟
کبھی کسی ڈبڈباتی کشتی کا رقص دیکھا ہو میں نے جیسے۔
ابھی ابھی ایک داستاں تھی مرے خیالوں کی سلوٹوں میں . .

سنو! یہ مسلی ہوئی جبیں کچھ بتا رہی ہے۔
وہ دیکھو بادل نئے نقوش اب گُھلاوٹوں میں دکھا رہا ہے۔
کچھ ایسے، جیسے . . کچھ ایسے، جیسے . . . .
ابھی ابھی ایک داستاں تھی مرے خیالوں کی سلوٹوں میں۔

کبھی کسی عزمِ طرزن کو دیکھا ہے، کیسے نظروں سے کھیلتا ہے!
کبھی عیاں ہے، کبھی نہاں ہے!
ابھی یہاں تھا اور اب کہاں ہے؟
وہ دیکھو پھر اس نے سر نکالا
وہاں جہاں تیرتا ہے لہروں پہ سبز جالا
وہ اب کچھ ایسے دکھائی دیتا ہے جیسے اک جل پری نے پہنی ہوئی ہو الماس رنگ مالا۔

وہ دیکھو! جیسے ہوا اُجالا
مرے خیالوں کی تیرہ و تار سلوٹوں میں۔
وہ دیکھو آثار زندگی ہیں گزشتہ لمحوں کی کروٹوں میں۔
گزشتہ نغمے۔ شگفتہ لمحوں کی یادگاریں۔
شگفتہ لمحے چٹکتی کلیوں کے رازداں تھے۔

چٹکتی کلیوں کی بات کیا تھی۔
میں سوچتا ہوں چٹکتی کلیوں کی بات کیا تھی۔
چٹکتی کلیوں کی بات اک واہمہ ہے شاید۔
چٹکتی کلیوں کی آرزو میں ہزاروں جل پریاں مبتلا تھیں۔
چٹکتی کلیوں کی آرزو میں ہزاروں جل پریاں مبتلا ہیں۔
ہر ایک یہ چاہتی ہے مہ لشین ان کے تتیب میں ہو۔
مگر ہر اک جل پری الجھتی ہے، لڑکھڑاتی ہے، پھیل جاتی ہے سطحِ دریا کی وسعتوں
چٹکتی کلیاں۔ بکھرتی پریاں۔
کہیں کسی ڈبڈباتی کشتی کا رقص دیکھا ہو میں نے جیسے۔
ابھی ابھی کوئی دھندلی خوشبو چٹکتی کلیوں سے آ رہی تھی۔

سنو! یہ جھٹکے ہوئے پریشاں سے بال کچھ کہنا چاہتے ہیں،
بکھرتے گیسو، ڈھلکتی پلکیں، پھسلتے ملبوس واہمہ ہیں!
ادھورے نغمے سُنے ہیں تم نے!!

تمام نغمے، ادھورے نغمے ہیں، میرے کانوں کی چلمنوں میں
ہزاروں نغمے جھلک رہے ہیں۔
میں سوچتا ہوں کسی نے اب تک سُنا بھی ہے کوئی پورا نغمہ؟ . .

انجم رومانی

ابن سعید

مریا!

جب وہ سائیکل رکشے کو بلا چکی تو ہانپتی کانپتی پھر کوسٹے پر واپس آئی۔ جوکس کا مکان تیسری منزل پر تھا اور ساتھ ہی اس کو اس قدر جلدی تھی، وہ جلد سے جلد اس جگہ سے چلی جانا چاہتی تھی۔ لیکن پتلے زینے کی اونچی اونچی سیڑھیاں تو ہر بار معلوم ہوتا تھا اس کے پیروں میں اٹک جانا چاہتی تھیں اور اس کا سانس بھی تو دوسرے چکر میں اس قدر پھول گیا تھا۔ اپنے سینے اور پیٹ کو پھولتے ہوئے وہ اپنی کسی ہوئی گلابی ساڑھی میں دیکھ سکتی تھی! ــ پھر جب وہ پورا زینہ طے کر کے اوپر پہونچی تو اس نے دیکھا کہ جوکس اس کے سامان کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اس کی گود میں اس کا گورے رنگ کا بچہ بھی تھا جو حسب معمول اس کے بلاؤز کے بٹنوں سے جھگڑ رہا تھا۔ مریا نے بغیر جوکس کی طرف دیکھے اپنے سامان کا ایک بار پھر جائزہ لیا۔ اور اس کو اپنے بستر بند کے تسموں میں وہ کڑھا ہوا سرخ رنگ کا کرتہ نظر آیا۔ جو اس نے جوکس کے بچے کیلئے بازار میں ایک پھیری والے سے خریدا تھا۔ سرخ کرتہ کے سنہری کڑھے ہوئے پھول اس کو دیکھ دیکھ کر طنزیہ طور پر مسکرا رہے تھے۔ اور مریا نے غیر ارادی طور پر جوکس کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرنا چاہا لیکن جوکس کی آنکھیں تو ویسے ہی بے تعلق اور خفا سی تھیں۔ بیشک اس کے بچے نے بٹن کھولنے کی کوشش اب تھوڑی دیر کیلئے چھوڑ دی تھی اور سنہری پھول والے سرخ کرتہ پر بہک رہا تھا۔

مریا نے اپنی ساڑھی کے آنچل کو اپنے پیٹ پر پیٹی کی طرح کس کے باندھ لیا۔ لیکن پھر بھی سامان اس کو دیا۔ وہ بوجھل ہی معلوم ہو رہا تھا۔ اس کو غصہ تو اپنے پر اس قدر آ رہا تھا کہ اس کا جی چاہا کہ وہ سارا سامان اس سہ منزل فلیٹ سے خود ہی اتار کر لے جائے۔ لیکن پھر بھی کسی اور خیال نے اس کو روک دیا۔

"بڑی بی!" اس نے آواز دی۔

"بڑی بی، ممو تیرے لئے کیا لینے گئی ہیں؟" جوکس اپنے بچے کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے جیسے اس سے باتیں کرنے لگی۔ مریا کو محسوس ہوا کہ جوکس کی آواز کس قدر اجنبی سی ہو گئی تھی۔ جیسے وہ واقعی اپنے بچے سے ہی کہہ رہی تھی۔ اور جیسے! ــ اور مریا کا غصہ اور بھی بڑھ گیا۔ اس کے چہرے کی زرد جلد پر سرخی سی دوڑ گئی۔ اور اس کے بال جن میں وہ بیچ کی مانگ نکالا کرتی تھی تن سے گئے۔ اور ہانپتے ہوئے اس نے بستر بند ایک ہاتھ میں اٹھا لیا اور زینے کی طرف بڑھی۔ لیکن اسی وقت اس کی کلائی کانپنے لگی۔ اور بستر بند کا تسمہ اس کی ہتھیلی میں چبھنے لگا۔ اور ساتھ ہی ساڑھی میں جکڑا ہوا اس کا جسم جیسے پھر سے سانس کی وجہ سے بڑی طرح پھولنے سا لگا۔ اور اس نے سوچا کہ وہ سامان رکشا والے سے ہی اتار نے کو کہہ دیگی۔ اور گو کہ اس طرح پر اس کو رکشا والے کو چھ پیسے یا دو آنے زیادہ دینے پڑیں گے۔ لیکن پھر بھی شاید اس کو اتنا تھک جانے کے بعد اتنا ڈھیر سارا سامان خود ہی نہ اٹھانا چاہئے۔ جوکس سے خفا ہو جانے پر وہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو اس قدر پریشان کیوں کرے! ــ

ــ اور ایک بار وہ پھر اپنے خیالات میں کھو گئی۔

وہ جوکس کے ہاں کوئی دو مہینے سے اس کی مہمان رہ رہی تھی۔ دراصل جب جوکس کے ہاں بچہ ہونے والا تھا جوکس نے مریا کو اس کے مشن اسکول سے بلوا لیا تھا۔ اور مریا مزے میں پورے دو مہینے تک جوکس کے ہاں پڑی رہی تھی مشن اسکول میں تو اس کو دن بھر کے 'جی' میں پڑھنے والے بچوں کو الٹی سیدھی مشقیں کرانی پڑتی تھیں۔ ایسی مشقیں جن کی ضرورت یا مطلب وہ خود بھی آج تک پوری طرح نہ سمجھ سکی تھی۔ اس کو مادام منٹیسوری کے تمام سبق بھی ازبر یاد کرنے پڑے تھے۔ اور ساتھ ہی مشن اسکول سے دسویں کا امتحان پاس کرنا پڑا تھا جب کہیں جا کے اس کو پچہتر روپے کی نوکری ملی تھی۔ لیکن اس

نوکری کے مل جانے پر بھی وہ پہلے کی طرح پریشان ہی رہا کرتی تھی۔ اس کے جسم کا ایک ایک جوڑ درد کرتا رہتا۔ اس کو ایسے محسوس ہوتا کہ جیسے منوں مٹی اور چونے کے ڈھیر میں اس کو گاڑ دیا گیا تھا۔ اور اس ڈھیر میں دبے دبے اس کی ہڈی پسلی ایک ہوگئی تھی ــــ اس کا ذہن ہر وقت تھکا سا رہتا ــــ اور پھر کے۔جی میں پڑھنے والے بچوں کی بہتی ہوئی ناکیں اور زرد گال اور چپڑے ہوئے پیچھے کو مڑے ہوئے بال، ان سب سے تو اس کو کتنی قے آتی تھی۔ یہ بچے ہر وقت اس کو گھیرے رہتے تھے ــــ

"مس صاب جی، اب کونسا سبق ہے؟" کوئی بچہ اپنے گول گول ہونٹوں سے ناک سڑکتے ہوئے کہتا۔ اور سواہ مخواہ مریا مس صاحب کو ابکائی آجاتی اور وہ سوچنے لگتی کہ نہ معلوم کوئی ترکیب ہے بھی کہ نہیں جس سے کہ وہ کے۔جی اور مادام منطیسوری کے سبقوں اور مشقتوں سے باہر نکل سکے ــــ اور پھر ایکا ایکی اس کو جوئس کا وہ خط مل گیا تھا۔

جوئس کے ہاں بچہ ہونے والا تھا ــــ اور مریا نے اپنی نوکری سے استعفےٰ دیدیا، اور یوں وہ پورے دو مہینے جوئس کے ہاں گذار سکی تھی۔ ان دو مہینوں میں اس کو کس قدر آرام مل گیا تھا اس پر وہ خود بھی حیران تھی۔ اور پھر جوئس کا بچہ ان بچوں سے کس قدر مختلف تھا جن کے درمیان وہ اب تک کڑھ رہی تھی۔ حالانکہ جوئس کا خود اپنا رنگ بہت پکا کالا تھا لیکن پھر بھی اس کا بچہ کافی گورا تھا۔ اس کے بال بیشک جوئس کے بالوں کی طرح گہرے کالے تھے لیکن اس کے گورے رنگ کے ساتھ تو یہ بال اور بھی خوبصورت معلوم ہوتے تھے اور اس کی آنکھوں کا رنگ ہلکا سا نیلا گدلا معلوم ہونے لگتا تھا، اور وہ جوئس کی قسمت پر رشک کرنے لگتی تھی۔ اور جوئس کے مسلمان میاں داؤد سے کہتی تھی ــــ

"دیکھا جی، آپ نے ــــ ہماری سہیلی نے کیسا خوبصورت بچہ دیا ہے" وہ یہ الفاظ ایسے کہتی کہ جیسے داؤد کے لئے ایسا بچہ کوئی بہت ہی بڑی نعمت ہے۔ دراصل مریا کو خود ہی جوئس کا بچہ بہت ہی بڑی نعمت معلوم ہوتا تھا، اور اسی لئے وہ داؤد سے یہ کہہ دیتی تھی۔ حالانکہ داؤد نے کئی بار اس کو اپنے بچپن کی تصویریں دکھائی تھیں۔ اور کئی بار یہ اشارہ بھی کیا تھا کہ اس کے بچے کی شکل ویسی ہے جیسی کہ اس کی اپنے بچپن میں تھی۔ لیکن پھر بھی مریا اس بچے کو جوئس کا ہی کوئی کارنامہ سمجھتی اور ایسے کہتی کہ جیسے داؤد کا اس کارنامے میں کوئی حصہ بھی نہیں ہے ــــ!

اور پورے دو مہینے تک جو تبدیلیاں جوئس میں پیدا ہوتی رہی تھیں ان میں بھی تو اس کو کتنی دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔ پہلے پہل تو جب وہ مشن اسکول کی نوکری چھوڑ کے لکھنؤ آئی اور جوئس کو اس نے اسٹیشن پر دیکھا تو جوئس اس کو اچھی خاصی بھلی چنگی نظر آئی جس سے اس کو ذرا حیرت بھی ہوئی، سوائے اس کے کہ جوئس کا جسم ساڑھی میں ضرورت سے زیادہ پھولا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اور کوئی تبدیلی اس کو نظر نہ آتی تھی اور مریا سمجھی تھی کہ جوئس نے محض اس کو بلانے کیلئے یہ مذاق کیا تھا۔ پر وہ کے۔جی میں پڑھنے والے بچوں سے اس قدر اکتا چکی تھی کہ وہ جوئس کے اس مذاق پر ذرا بھی نہ بگڑی ــــ بلکہ خود بھی وہ جوئس کی وقت بے وقت کی ہنسی میں زور شور سے شرکت کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن پھر ایک شام کھانے کے بعد جبکہ جوئس کا میاں داؤد کلب گیا ہوا تھا جوئس نے آہستہ سے مریا سے کہا:ــ

"مریا اب دکھ ہو رہا ہے" ــــ جوئس شکل سے کتنی تھکی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اور مریا پریشان ہوگئی تھی۔ وہ خود تو جوئس سے بھی زیادہ ناتجربہ کار تھی۔ اور اس کو خود بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ اور اس نے گھبرا کے جوئس کو سب سے آرام دہ پلنگ پر لٹا دیا تھا۔

"کہاں ہو رہا ہے دکھ ــــ" اس نے سوچا تھا کہ شاید اس کے سینکنے یا دبانے سے جوئس کی تکلیف کم ہو جائیگی لیکن جوئس کی تکلیف تو برابر بڑھتی ہی چلی گئی تھی حتیٰ کہ جب داؤد کلب سے واپس آیا اور لیڈی ڈاکٹر کو بلا کے لایا تو جوئس پڑی اپنے پلنگ پر تڑپ رہی تھی۔ اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ اور لمبے ہاتھوں کو پلنگ کی نواڑ میں گھسا دیا تھا۔ اور پھر بیچ رات میں یہ ننھا منا سرخ سے چہرے اور بالوں والا بچہ پیدا ہوا تھا۔ اور مریا کو یقین آیا تھا کہ جوئس نے محض مذاق نہ کیا تھا۔

بچے کے پیدا ہونے کے بعد سے مریا جوئس کے ہاں

اور بھی مزے سے رہنے لگی۔ وہ دونوں کی دونوں دن بھر بچے کے کاموں میں مصروف رہتیں۔ اور جولئس کا میاں داؤد مزے سے کلب اور دفتر میں لگا رہتا ــــ وہ دونوں گھر پر حکومت کرتی رہتیں۔

اور جب جولئس اور بچے کے ساتھ مریا اکیلی رہ جاتی تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ اس کے جسم کے اندر جیسے آہستہ آہستہ کوئی پرندہ پھڑپھڑانے لگتا۔ اور اس کا سانس آہستہ آہستہ پھولنا شروع ہو جاتا۔ اس کو محسوس ہوتا کہ جیسے وہ جولئس کو اپنے اندر چھپی ہوئی بات بتا دے گی۔ لیکن پھر جلدی ہی کوئی نامعلوم خیال اس کو روک دیتا۔ اور وہ بات پلٹنے کیلئے کوئی اور ادھر ادھر کی بات شروع کر دیتی۔

"اب اس کو ہضم کیسا ہو رہا ہے؟ گرائپ واٹر دیا تھا کل رات؟"

"دودھ پلانے میں وقت تو نہیں ہوتی کوئی ـــ؟"

اور اس کے جسم کے اندر جو پھڑپھڑاہٹ ہو رہی تھی وہ آہستہ ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی۔ اور وہ سوچتی کہ وہ کبھی کسی دن بتا دے گی ابھی جلدی کیا ہے؟"

لیکن یونہی تو پورے دو مہینے گذر گئے تھے۔ جولئس کا بچہ ایک تیزی کے ساتھ بڑھتا چلا گیا تھا۔ تھوڑے دن بعد ہی وہ کافی ہشیار ہو گیا تھا۔ اور اپنی اونچے اونچے کٹہرے والی مسہری میں پڑے پڑے روشنی کو تکا کرتا تھا۔ اور پھر روشنی کو دیکھ کے ہی ہمکنا شروع کر دیتا تھا۔ یا پھر ٹیاؤں ٹیاؤں کرنے لگتا۔ اور ابھی سے وہ کتنی بھاری آواز میں روتا تھا جیسے کوئی خاصا بڑا بچہ ہو۔ لیکن مریا پھر بھی اپنی تمام باتیں جولئس کو نہ بتا پائی تھی۔

حالانکہ اس نے جولئس کو بہت سی ایسی باتیں بتا دی تھیں جن پر بعد میں اکیلے میں سوچنے سے اس کو خود بھی کچھ شرم سی آنے لگتی تھی۔ مثلاً اس نے وہ ڈیوڈ والا قصہ پورا کا پورا جولئس کو سنا دیا تھا اور اس پر مریا اور جولئس نے مل کر ڈیوڈ کو گالیاں اور کوسنے بھی دیئے تھے۔ اور پھر وہ دونوں کسی نامعلوم خیال پر ایک ساتھ مل کر ہنسنے بھی لگی تھیں۔

اور جولئس کو اس نے مشن اسکول کی تقریباً تمام باتیں جو ذرا دلچسپ تھیں بتا دی تھیں، ہیڈ مسٹریس والا قصہ؟ ـــ ہیڈ مسٹریس صاحب اس عمر میں بھی ایسی حرکتیں کرتی تھیں۔ پھر مشن اسکول میں اردو پڑھانے والے منشی جو سارے اسکول بھر میں ایک اکیلے مرد تھے! غرضیکہ مریا نے جولئس کو ہزاروں ہی الٹی سیدھی باتیں بتا دی تھیں۔ لیکن پھر جیسے ہی وہ اپنی بات بتانے کی کوشش کرنے لگتی ویسے ہی اس کے سینے میں، پیٹ میں اور دماغ میں کوئی چیز زور زور سے پھڑپھڑانے لگتی۔ جیسے یہ پھڑپھڑاہٹ اس بات کو اس کے دماغ سے باہر نکال ہی پھینکے گی۔ اور مریا فیصلہ بھی نہ کر پاتی کہ وہ وہ بات جولئس کو بتائے یا نہ بتائے۔

اور پھر جولئس سے اس کی کئی مرتبہ لڑائی بھی تو ہوئی تھی۔ جتنی دفعہ اس کی لڑائی ہوئی۔ وہ سوچتی کہ اچھا ہوا کہ اس نے جولئس کو اپنی باتیں تمام کی تمام نہ بتائی تھیں۔ ورنہ جولئس تو بہت اوچھی ہے۔ نہ معلوم اس وقت وہ اس بات کو کس طرح پر اور لوگوں کے سامنے بیان کرنا شروع کر دیتی۔

ـــ اور وقت گذرتا چلا گیا۔ اور جولئس کے ہاں اس کو پورے دو مہینے ہو گئے۔

حالانکہ جولئس سے اس کی دوستی اتنی پرانی تھی۔ اور اس کو اسکول کی تھکا دینے والی نوکری کے بعد جولئس کے ہاں رہنا بھی بہت اچھا لگتا تھا، لیکن پھر بھی وہ ایک بار جولئس سے بری طرح لڑ پڑی۔ جولئس سے لڑائی ہو جانے کے بعد اس نے دو دن تک اس سے بات بھی نہ کی، اور الگ پڑی رہی۔ اور جولئس کے میاں داؤد کی بھی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ آن کر مریا کو منا سکے، حالانکہ شاید کئی بار اس نے کوشش بھی کی تھی۔ اور مریا نے سوچا کہ اب اس کو جولئس کے ہاں اور زیادہ نہ رہنا چاہیے۔ اور اس نے سوچا کہ جب تک اس کو کسی اور اسکول میں نوکری ملے گی۔ وہ اپنے بھائی کے ہاں رہ لے گی ـــ اور اس کا غصہ اتنا تھا کہ وہ تھرڈ کلاس کا سفر اور راستے بھر کی کوفت اور پھر اپنی بھابی کے گنوارانہ طور طریقے بھی برداشت کرنے کیلئے تیار تھی۔ اور خاموشی سے وہ اپنا سامان باندھنے لگی تھی۔

شروع میں تو جولئس نے اس کے سامان باندھنے پر غور ہی نہ کیا۔ جیسے اس کو اس سے کوئی مطلب ہی نہ تھا لیکن پھر تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے بچے سے مریا کے سامان باندھنے کے متعلق الٹی سیدھی باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ مریا بخوبی جانتی تھی کہ جولئس کا بچہ اس کی باتوں کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ

سکتا تھا۔ اور جولیس وہ تمام باتیں محض اس کو ہی سُنانے کے لئے کہہ رہی تھی۔ لیکن وہ بھی خاموشی سے اپنا سامان باندھنے میں لگی رہی تھی۔ اور جولیس بھی اس کے قریب ہی منڈلا رہی تھی — اور سائیکل رکشے کی کھڑکھڑاہٹ جو ایکا ایکی بہت بڑھ گئی تھی۔ مریا کے خیالات میں ایک دم سے آن کے حائل ہوگئی! — سائیکل رکشا ایک سائیکل سے ٹکرا گئی تھی — اور بچانے کی کوشش کرتے ہوئے رکشا والا سائیکل رکشے کو پیدل چلنے کی پٹڑی پر چڑھا لے گیا تھا۔ سڑک پر کھیلنے والے دو چار شریر بچے سائیکل رکشے کے گرد جمع ہو گئے تھے اور زور زور سے ہنس رہے تھے۔ اور مریا فوراً ہی سمجھ گئی کہ یہ بچے رکشا یا رکشا والے پر نہیں بلکہ خود اسی پر ہنس رہے ہیں "مس صاحب کی رکشہ لڑ گئی"۔ یہ بچے دل ہی دل میں سوچ رہے ہوں گے۔ مریا نے سوچا۔ اور اس کو یوں بالکل اکیلے چلے آنے پر تھوڑا سا افسوس ہوا۔ لیکن پھر بھی وہ پوری اطمینان سے سائیکل رکشہ کی سیٹ پر بیٹھی رہی۔ اور سائیکل رکشہ والا ایک گما اینٹ سے سائیکل کی زنجیر کو سیدھا کرنے لگا۔ اور وہ سائیکل والا جس سے رکشہ سائیکل ٹکرائی تھی دبے دبے لہجہ میں انگریزی میں گالیاں دے رہا تھا۔ اور تھوڑی دور پیدل چلنے کے بعد اپنی سائیکل پر بیٹھ گیا — اور مریا پھر بھی خاموش جمی بیٹھی رہی۔

در اصل شاید وہ خود اس وقت اس سائیکل رکشہ سے بہت دور تھی۔ لڑکوں کے اس طرح پر چاروں طرف جمع ہو جانے کی وجہ سے اور یوں بازار میں گھر جانے پر اس کو اپنے بالکل تنہا ہونے کا خیال ایکا ایکی آ گیا تھا۔ اور یہ خیال ہی اس کو اپنی رکشہ سے بہت دور لے گیا تھا۔ اگر اس کی جولیس سے اس وقت لڑائی نہ ہوئی ہوتی تو وہ یوں اس وقت اکیلی ہوتی بلکہ اگر وہ وہاں سے کہیں جانا بھی چاہتی تو جولیس کا میاں داؤد خوشی خوشی اس کو اپنی چھوٹی سی نیلی موٹر میں اسٹیشن سے چھوڑ کے آتا، جولیس کا میاں داؤد موٹر خوب تیز چلاتا تھا اتنی کہ مریا کو اپنے جسم کے اندر خواہ مخواہ ہی بے چین سی پھڑپھڑاہٹ محسوس ہونے لگتی تھی — کاش وہ اس وقت چھوٹی سی نیلی موٹر کی گدّوں والی سیٹ پر جمی ہوتی۔ اور کاش اس کے جسم میں پھر وہی پھڑپھڑاہٹ شروع ہو جاتی۔ یوں وہ شاید چپکے سے جولیس کے کان میں وہ بات کہہ دیتی جو اس نے جولیس کو دو مہینے کے لمبے عرصے میں بھی نہ بتائی تھی — اور یوں شاید جولیس اس کو تھوڑے سے عرصے کیلئے اور لکھنؤ میں روک لیتی۔ لیکن کھٹ، کھٹ، کھٹ، کھٹ — اور رکشہ والا سائیکل کی زنجیر کا بیٹہ ٹھیک کر کے پھر چلنے لگا۔ اور مریا پھر خاموشی سے سوچنے لگی کہ آخر جب جولیس سے اس کی اتنی پرانی دوستی تھی تو پھر ان دونوں کی اس قدر سخت لڑائی کیسے ہو گئی۔ کہ وہ پورے دو دن تک اس سے بولی بھی نہیں اور پھر اکیلی چلے جانے کو تیار بھی ہو گئی — اور پھر مریا کو اپنے ساتھ ہمدردی سی محسوس ہونے لگی۔

اس کو محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں کے آگے نمی سی چھا گئی ہے۔ اور کوئی اس کے سارے جسم کو آہستہ آہستہ دبا رہا ہے۔ اور جیسے یوں دبانے سے یہ نمی اسکی آنکھوں سے بہہ نکلے گی — مریا کو اپنے پر افسوس اور بھی زیادہ ہونے لگا —!

جولیس دراصل اس کی بہت پرانی سہیلی تھی اتنی کہ کوئی اور سہیلی اس کی اتنی پرانی نہ تھی۔ جولیس کو تو وہ جب سے جانتی تھی جب سے کہ اس نے شعوری طور پر اپنی زندگی شروع کی تھی۔ مریا کو وہ شام اچھی طرح یاد تھی —!

اس شام سے پہلے کی کوئی بات بھی اس کو اچھی طرح یاد نہ تھی۔ دراصل وہ اس زمانہ میں تھی ہی اتنی چھوٹی کہ کوئی بات یاد رہنی ذرا مشکل ہی تھی — لیکن پھر بھی وہ شام اسکے ذہن میں خاصی صاف طور پر جمی ہوئی تھی۔ گویا اس شام کو اس کی زندگی شروع ہوئی تھی۔ اور اس شام نے ہی اس کو اس راستے پر ڈال دیا تھا جس پر وہ آج تک چلتی رہی تھی۔ اگر اس شام کو کچھ اور ہو جاتا تو —؟ — جاڑوں کی اس شام کو باوجود اتنی سردی کے مریا کو گرمی سی لگ رہی تھی۔ اس کے ماتھے اور بغلوں میں پسینہ آ رہا تھا۔ گو ساتھ ہی ساتھ اس کا سارا جسم بھی کانپ رہا تھا۔ نئی نئی شکلوں اور اجنبی آوازوں کا ایک عجیب و غریب الجھاؤ سا تھا۔ جس میں وہ نہ جانے کیونکر پھنس گئی تھی۔ ہر آدمی اس کو بالکل نیا اور اجنبی معلوم ہوتا تھا۔ اور ان سب کی آوازوں سے تو اسکی روح تک کانپ اٹھی تھی۔

جب وہ اس عمارت میں داخل ہوئی تھی جو بعد میں

اس کو معلوم ہوا تھا کہ مشن کا یتیم خانہ ہے تو اس کے پاؤں کانپنے لگے تھے۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے تھے اور اس کا جسم کانپنے لگا تھا لیکن وہ پھر بھی ایک طرح کے بچوں کے سے شوق کے ساتھ ہر چیز کو دیکھنا چاہتی تھی۔ کہ یکایک اس بڑی عمارت کے پچھلے حصے میں ہزاروں بڑھیوں، عورتوں اور بچیوں کی میٹھی میٹھی آوازوں نے گانا شروع کر دیا تھا۔ وہ سب عورتیں مل کر اس وقت کیا گا رہی تھیں یہ تو مریا کو آج تک بھی پتہ نہ چلا تھا۔ لیکن پھر بھی جیسے وہ مختلف آوازیں اس کے ذہن میں گھسی جا رہی تھیں۔ ایک دو، تین، چار، پانچ، گنتے گنتے بھی وہ ساری آوازیں نہ گن پائی۔ لیکن کیسی آسانی سے وہ سب آوازیں ایک دوسرے کے ساتھ مل گئی تھیں۔ صرف اس لئے کہ مریا کے دماغ میں اتری چلی جائیں۔ اور اس عمارت میں آجانے کے بعد جو احساس اس کو شوق اور نئے پن کا ہوا تھا وہ فوراً غائب ہو گیا تھا۔ اور اس کے جسم کے اندر بھی تمام چیزیں کپکپانے لگی تھیں۔ اور وہ چلا چلا کے رونے لگی تھی۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی مٹھیوں سے اپنی دونوں آنکھیں بھینچ کر کے بھینچ لی تھیں۔ اور پھر جب اس نے اپنی مٹھیاں اپنی آنکھوں پر سے ہٹائی تھیں تو اس کو اپنے قریب ہی کسی کے سسکیاں لے لیکر رونے کی آواز آ رہی تھی۔ ان سسکیوں سے پہلے تو وہ ڈر گئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جب رات کے اندھیرے سے اس کی آنکھیں مانوس ہو گئی تھیں تو اس نے دیکھا تھا کہ اس کی پلنگڑی کے برابر کی پلنگڑی پر کوئی اور بچی اس کی ہم عمر پڑی تھی۔ سسکیوں اور ہچکیوں کے ساتھ ساتھ اس بچی کا سارا جسم بھی لرز سا جاتا تھا۔ اور بالکل غیر ارادی طور پر مریا اس لڑکی کی پلنگڑی پر چلی گئی تھی۔ اور اس کے گلے میں باہیں ڈال کے خود بھی آہستہ آہستہ رونے لگی تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے ایک ایک ہچکیاں روکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"جولس"۔ اور اسی رات مریا کی جولس سے دوستی ہو گئی تھی۔ اور اس رات کے بعد سے ان دونوں کی دوستی برابر بڑھتی ہی چلی گئی تھی۔

ساتھ ہی دونوں پڑھتی تھیں۔ اور پھر ایک دوسرے کے ساتھ کھیلوں میں بھی رہتیں۔ مشن کے یتیم خانے میں ان سب کو کپڑے بھی ایک سے ہی ملتے۔ اونچی اونچی سادی فراکیں اور کسے ہوئے سفید جانگیے۔ دونوں اپنے اس لباس میں ساتھ ہی ساتھ کھیلتی پھرتی تھیں۔ جولس کی کالی کالی کھردری ٹانگیں ہر وقت تھرکتی رہتی تھیں۔ اور ہر وقت اس کے دماغ میں کوئی نیا کھیل گھسا آتا تھا۔ اور کود کے مریا بھی اس کے ساتھ شریک ہو جاتی تھی۔

جب اپنی ساری جماعت کے ساتھ وہ دونوں ایسٹر یا کرسمس پر کوئی مذہبی سی فلم دیکھنے جاتیں تو بھی ساتھ ساتھ ہی چلتیں۔ اور قریب قریب بیٹھتی تھیں۔ اور پھر دونوں تیزی کے ساتھ بڑھتی بھی تو چلی گئی تھیں۔ حتیٰ کہ جولس اسکول چھوڑ کے غائب ہو گئی تھی۔

اور کافی عرصے تک مریا کو جولس کا کوئی پتہ نہ رہا تھا۔ لیکن پھر ایک دن اس کو جولس کا ایک خط ملا تھا کہ اس نے ایک مسلمان سے شادی کر لی۔ اور مریا کا جی چاہا تھا کہ اس وقت وہ جولس کے ساتھ جا ملتی۔ اور یوں وہ اس کی شادی کے تمام ہنگاموں میں پوری طرح دلچسپی لے سکتی۔ لیکن اس کے بجائے اس کو تو سارے وقت مشن اسکول کے کے، جی کے بچوں کو الٹے سیدھے کھیل کھلانے پڑتے۔ ان کے ساتھ ساتھ ہزار بار سبق دوہرانے پڑتے۔ بہت سے سبق تو اس کو زبانی یاد ہو گئے تھے۔ لیکن ان گندے گندے چہروں والے بچوں کو تو کوئی سبق ہی نہ یاد رہتا تھا۔ اور وہ تو ہمیشہ ویسے ہی ناک سڑکتے ہوئے پوچھا کرتے تھے۔

"اب کیا آتا ہے مس صاحب، جی! اس سے آگے؟" مریا کے تو آگ ہی لگ جاتی تھی۔ کے، جی میں بھنکتی ہوئی صورتوں اور رونی شکلوں والے بچوں کی تو معلوم ہوتا تھا بھرمار تھی۔ مکھیوں کی طرح وہ ہر وقت بھنبھناتے رہتے تھے۔ گیت یاد کرتے تھے سبق دہراتے رہتے تھے۔ اور پھر ان کا سبق دوہرانا یا گیت یاد کرنا۔ یا لڑنا وہ بھی تو سب مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے کم نہ ہوتا۔ اور مریا کا دماغ تو بالکل پک سا گیا تھا۔ پہلے پہل تو اسے اپنے دماغ میں اس کو بھنبھناہٹ کی وجہ سے کچھ تکلیف محسوس ہوتی تھی، جیسے زہریلی زہریلی مکھیاں کسی کھلے ہوئے زخم کا منہ چاٹ رہی ہوں۔ لیکن پھر جلد ہی وہ ان مکھیوں کو اڑانے کی تکلیف بھی نہ اٹھاتی تھی۔ اور پھر اڑانے سے فائدہ؟ — مکھیاں تو ویسے ہی پھر بھنبھناتی ہوتی جوں کی توں آموجود ہوتی تھیں، اور —

مس صاحب جی یہ . . !"

"مس صاحب جی" کا افسانہ جو اس کے نام کے ساتھ چپکا ہوا تھا، کاش کوئی اُسے ہٹا سکتا۔ اور اس کو اس جھنجھناہٹ سے دور ہٹا لے جاتا ___ اور واقعی جولس کے اس خط نے جس نے اُسے بتایا تھا کہ اس کی سہیلی کے یہاں بچہ ہونے والا ہے، اس جھنجھناہٹ کو کچھ کم کر دیا تھا، بھٹکتی ہوئی صورتیں تھوڑی دیر کے لئے ایک دُھند کے پیچھے چلی گئی تھیں۔ اور اس دُھند سے ہی فائدہ اٹھا کے اُس نے اپنی نوکری چھوڑ دی تھی۔ جولس کے ہاں بچہ ہونے کے خیال سے ہی اس کو اپنے سارے جسم میں ایک عجیب سی بے چینی کا احساس ہونے لگا تھا۔ جیسے جولس کے ہاں بچہ ہونے سے اس کو ذاتی طور پر خود کچھ حاصل ہو جائیگا جیسے وہ اپنے لئے کسی چیز کی منتظر تھی۔

لیکن اب تو وہ جولس کے ہاں ۲ مہینے گذار چکی تھی۔ جولس کے بچے کو بھی جی بھر کے دیکھ چکی تھی۔ اور اُن تبدیلیوں کو بھی خوب اچھی طرح دیکھ چکی تھی۔ جو ان دو مہینوں میں مختلف طریقوں پر جولس میں پیدا ہو گئی تھیں ___ شاید ان تبدیلیوں کا ہی نتیجہ تھا کہ جولس اس سے اس قدر سختی کے ساتھ لڑ پڑی تھی۔ یا شاید اس لڑائی کی وجہ یہ ہی ہو کہ وہ جولس کے بچے میں ایک خود غرضانہ دلچسپی لیتی تھی، اور جولس نے اس کی اس کمزوری سے خوب فائدہ اٹھایا تھا ___!

شاید اسے ___ پر وہ تو کوئی معقول وجہ تلاش نہ کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کو جولس سے پوری طرح خفا رہنے کا بالکل حق حاصل رہے ___ تو جولس نے چلتے وقت وہ سُرخ رنگ کا کریپ بھی واپس کر دیا تھا جو اس نے دو روپے صرف کر کے امین آباد میں جولس کے بچے کیلئے خریدا تھا۔ اس کرتہ کے سُنہری پھول کیسے بستر بند کے تسموں میں اُلجھے ہوئے کے باوجود بھی اس کو منہ چڑا رہے تھے ___ !! اور جولس نے اپنی نوکرانی کو بھی اس کا سامان اتارنے نہ دیا تھا۔ اور جو وہ اس وقت غصہ میں اپنا سارا سامان خود ہی اس سہ منزلہ فلیٹ سے نیچے سائیکل رکشہ تک لے آئی!

___ اور ثریا کا جی چاہا کہ اس کی سائیکل رکشہ بہت تیز چلنے لگے، خوب تیز چلنے لگے ___ اڑنے لگے ___ اور تیزی میں پیدل چلنے کی بڑائی سے کچکپائی ہوئی آگے بڑھ جائے۔ آگے بڑھتی جائے، آگے بڑھتی جائے ___ اور پہیوں میں سے نکلتی ہوئی سرسراہٹ بھی تیز ہوتی چلی جائے، خوب تیز ہوتی چلی جائے ___! لیکن وہ سرسراہٹ تو ہزاروں مکھیوں کے بھنکنے کی آواز سے جا ملی تھی ___ اور اسٹیشن آ گیا تھا ___!!

اسٹیشن پر شور، ہجوم اور غل کے طوفان میں ثریا کا اپنا ذہنی ہیجان جیسے ڈوبتا چلا گیا، حتیٰ کہ اس نے محسوس کیا کہ جلد ہی وہ ہیجان بالکل ہی خاموش ہو گیا تھا۔ اور وہ لوگوں کی بھیڑ بھاڑ میں اطمینان سے کھو کے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خریدنے کی کوشش کرنے لگی ___ لیکن آہستہ آہستہ خواہ مخواہ اس کے جسم میں ایک پھڑپھڑاہٹ ہونی شروع ہو گئی۔ اس کے کان بھی تو سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔

"___ کوئی اس پیتل کے لوٹے کے بدلے ہی بھگوان کے لئے مجھ کو دو روپے دیدے ___! کوئی بھگوان کیلئے ___! کوئی کھدا کے واسطے تو ذرا مجھ پر کرپا کر دے ___ کوئی . . . ! میری عورت کے درد شروع ہو گیا ہے۔ کوئی آبرو عزت والا میری عورت کی بھی آبرو بچائے ___ میرے پاس ___!"

ایک ادھیڑ عمر کا پوربیہ ایک ہجوم کے درمیان گھرا گڑگڑا گڑگڑا کر زور زور سے چلا رہا تھا۔ ثریا ہجوم میں صرف اسکی آواز سن سکی ___ اور اس کی باتوں کا کوئی مطلب نہ نکال سکی۔ لیکن جب اس نے ایک پیتل کے لوٹے اور ایک پرانی دری کے بستر کے قریب ایک عورت کو بیٹھے دیکھا تو اس کی سمجھ میں اس پوربی کی باتیں تھوڑی بہت آنے لگیں۔

___ وہ عورت سفید ساڑھی کا لمبا سا گھونگھٹ کاڑھے خاموش بیٹھی تھی، اور کانپ رہی تھی۔ جیسے اپنے جسم کے اندر ہی اندر کسی تکلیف کو چھپائے رکھنا چاہتی ہو۔

"___ کوئی آبرو والا میری بھی آبرو بچائے ___ کوئی اس لوٹے کے بدلے مجھ کو دو روپے دیدے ___ میں تانگہ میں ہسپتال لے جاؤں ___ کوئی ___!" اور ثریا کو محسوس ہوا کہ اس کے جسم میں تو پرندوں جیسی پھڑپھڑاہٹ ہو رہی تھی۔ وہ ایک دم سے بہت بڑھ گئی۔ یہ پھڑپھڑاہٹ بالکل ویسی ہو گئی تھی جیسی کہ اس کو جولس کے بچے کی گدلی گدلی نیلاہٹ کو گھورنے پر محسوس ہونے لگتی تھی۔ اور وہ کوشش کر کے اس پھڑپھڑاہٹ کو دور کر دیا کرتی تھی۔ لیکن اس وقت تو وہ پھڑپھڑاہٹ بہت ہی زیادہ ہو گئی تھی۔ اتنی زیادہ کہ ___ ؟ ___

ـــ اور اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا تو اس کو گھبراہٹ سی ہونے لگی ـ اس کا ایک ہاتھ جو ایک پیتل کے لوٹے کو تھامے ہوئے تھا ـ کپکپانے سا لگا، اور وہ پھڑپھڑاہٹ ـ! جیسے وہ جولس کو انسانوں کے اس ہجوم میں تلاش کر رہی تھی اور جیسے جولس کو وہاں نہ پا کر اس کا دل بیٹھا سا جا رہا تھا ـ اگر جولس اس وقت وہاں ہوتی تو وہ ضرور اس کو وہ بات بتا دیتی جس کو وہ آج تک اس قدر چھپاتی رہی تھی ـ! وہ جولس کی لڑائی کو بھی بالکل ہی بھول جانے پر تیار ہو گئی تھی! ـــ اور ـــ اور وہ ادھیڑ عمر کا یوریشین گڑگڑائے جا رہا تھا ـــــ روئے جا رہا تھا ـــ!

ـــ "دیکھو، قلی ـــ کوئی سائیکل رکشہ ہے قریب! دیکھو یہ میرا سارا سامان واپس کسی سائیکل رکشہ میں رکھ دو"

ـــ اور جب مریا کا تمام سامان قلی نے احتیاط سے سائیکل رکشہ پر رکھ دیا تو اس نے ایک مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ کو اپنے پاس سے ہٹاتے ہوئے سوچا کہ وہ جولس کو بتا دے گی کہ اس کے ہاں بھی بچہ ہونے والا ہے!!!

ساقی بک ڈپو کی مطبوعات

کہکشاں رفیعی اجمیری کے ۲۴ افسانوں کا مجموعہ ـ رفیعی اجمیری کی تحریر کا البیلا پن کسی اور ادیب کی تحریر میں آپ کو نہیں مل سکتا ـ قیمت تین روپے ـ

دھنک صادق الخیری ایم ـ اے کے سات رومانوں کا مجموعہ ـ آخری افسانہ "نشیمن" اردو ادب میں ایک بالکل نئی چیز ہے ـ صادق الخیری کی زبان و بیان کی خوبیاں محتاجِ تشریح نہیں ـ قیمت دو روپے ـ

ید قدرت علامہ مضحک دہلوی کا لکھا ہوا ایک طویل سائنٹیفک افسانہ، سائنس کی حیرت انگیز کرشمہ سازیاں اور محیر العقول نیرنگیاں افسانہ کے پیرایہ میں بیان کی گئی ہیں ـ قیمت صرف ۴/ ـ

ملنے کا پتہ ساقی بک ڈپو ـ کھاری باولی دہلی

غزل

طفیل ہوشیارپوری

فرطِ الم سے قلب و جگر خوں فشاں رہے
آنکھوں سے آنسوؤں کے سفینے رواں رہے

مژگاں کو پھر ہوس ہے گلِ لالہ فام کی
کانٹوں کی زد پہ پھر دلِ حسرت نشاں رہے

اس دل کے اضطراب کا عالم نہ پوچھئے
جو دل اسیرِ کشمکشِ امتحاں رہے

آئینۂ نگاہ سے تو چھپ کہاں سکا
تو چھپ کہاں سکا ترے جلوے کہاں رہے

تیری نگاہ میں نہ رہا میں نہ میرا دل
میری نگاہ میں ترے دونوں جہاں رہے

تو سامنے نہیں ہے تو کیا بندگی کا لطف
میری جبینِ شوق پہ سجدے گراں رہے

آتی رہی بہار خزاں کے لباس میں
اہلِ چمن طفیل چمن میں کہاں رہے

عبادت بریلوی

ادب کا افادی پہلو

جس روز سے ادب کا سوتا پھوٹا اسی روز سے ان مباحث نے بھی جڑ پکڑ لی کہ ادب کیا ہے؟ وہ کیوں پیدا کیا جاتا ہے؟ کن حالات میں ان کی تخلیق ہوتی ہے؟ کون لوگ ہیں جو اس کی تخلیق کرتے ہیں؟ اس کا انسانی زندگی سے کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ اس کے عناصر کیا ہیں؟ زندگی میں اس کی کیا اہمیت ہے؟ اور آیا اس کا کوئی مقصد بھی ہے یا نہیں؟۔ چنانچہ ادبی تاریخ کے ہر دور کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے مباحث کم و بیش ہر دور میں جاری رہے ہیں۔ آج بھی جاری ہیں اور رہتی دُنیا تک جاری رہیں گے اس لئے ان کی اہمیت سے تو کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پس جب وہ اہمیت کو مالک ہیں تو پھر ان پر غور و خوض کرنے میں جذبات کی جگہ عقل سے اور دل کی جگہ دماغ سے کام لینا ضروری ہے، ورنہ ان کا حل کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ ادب کے متعلق ان خیالات کا مدوجزر ہمیں اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ جتنے دور بھی آئے ان میں اگرچہ ان باتوں پر دل کھول کر بحث کی گئی، لیکن کہیں جذبات سے کام لیا گیا اور کہیں عقل سے! کہیں دل سے نکلی ہوئی بات کہی گئی، کہیں دماغ کی بھٹی میں پکا ہوا کوئی خیال پیش کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اختلافات رہے۔ ہیں — اور آئندہ بھی رہیں گے۔ البتہ ایک بات پر کم و بیش ادب کے متعلق ہر غور کرنے والا متفق معلوم ہوتا ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ انسانوں سے دلچسپی لینے ہی کے نتیجے ہی میں ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ چاہے نظریاتی طور پر کوئی کتنا ہی ادب کو زندگی سے دور کر دینے پر ایمان رکھتا ہو۔ چاہے کسی کے نزدیک ادب کتنی ہی بے مقصد لایعنی اور بے نتیجہ چیز ہو۔ چاہے وہ ادب کی ہستی کو کتنی ہی سختی کے ساتھ صرف ادب ہی کی حیثیت سے دیکھنے کا قائل ہو لیکن وہ اس حقیقت سے چشم پوشی یا انکار کی جرأت نہیں کر سکتا کہ ادب کے اندر جب تک ملے انسانی عنصر کا وجود نہ پایا جائیگا اس وقت تک کسی انسان کا اس سے دلچسپی لینا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن اور محال ہے۔

ادب بہرحال انسانوں کے درمیان رہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس لئے ادیب کا انسانوں سے دلچسپی لینا ناگزیر ہے جب وہ خود بھی ایک انسان ہے۔ اور اس کی زندگی بھی انسانوں کے درمیان بسر ہو رہی ہے۔ تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنے اور ان کے جذبات و احساسات کے مدوجزر، حالات و واقعات کے تلاطم اور زندگی کی مختلف کروٹوں کو اپنی تخلیقات میں سمونے سے باز رہے۔ بعضوں نے تو ادب کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ ادب ایسی تخلیقاتِ نظم و نثر کے مجموعہ کا نام ہے جس میں عام انسانوں کی دلچسپی کی باتوں کو موضوع بنا کر پیش کیا گیا ہو۔ یہ تو گویا ادب کی پہلی اور اوّلین خصوصیت ہوئی۔ اس کے علاوہ اس میں فنی اور جمالیاتی خوبیاں بھی ہونی ضروری ہیں کیونکہ بغیر ان خصوصیات کے ان میں زیادہ کشش باقی نہیں رہے گی۔ اور ادب کی حیثیت سے وہ بلند مرتبہ نہیں کہلایا جا سکے گا۔ بات یہ ہے کہ ادب کا ایک بڑا مقصد عوام کے احساس جمال کی تسکین کا باعث بننا بھی ہے۔ لیکن بہرحال پہلی خصوصیت اس کیلئے بڑی ضروری اور اہم ہے۔ کیونکہ انسانوں کو بہرحال اپنی جنس یعنی انسانوں ہی سے زیادہ دلچسپی ہو سکتی ہے۔ وہ مافوق الفطرت یا مابعد الطبیعاتی چیزوں میں اتنی دلچسپی نہیں لے سکتا جتنی کہ خود اپنے آپ میں! چنانچہ اس وجہ سے اس ادب کو اچھا ادب — نہیں نہیں — بلکہ ادب ہی نہیں کہا جا سکتا جس میں انسانوں کی دیکھی بھالی، تجربہ کی ہوئی اور سوچ سمجھ کی ہوئی باتوں کا ذکر نہ ہو۔ یہ خیال حقیقت بن جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانہ کے ادبیات میں یہ ایک خصوصیت عام طور پر مشترک پائی جاتی ہے کسی ملک اور کسی قوم کے کسی زمانے اور کسی دور کے ادب کو لے لیجیے۔ اس میں آپ کو اس قوم اور ملک کی اس وقت کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تصویریں بے نقاب نظر آئیں گی۔

اگر یہ ادب میں زندگی کی ترجمانی نہیں ہے۔ اگر یہ ادب کی ہم آہنگی نہیں ہے۔ اگر یہ زندگی کی عکاسی نہیں ہے تو خدارا بتائیے کہ کیا ہے؟ اگر ادب کو ان معاشی معاشرتی حالات سے علیحدہ کر کے دیکھا جائیگا تو کیا وہ ادب کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتار دینے کے مصداق نہیں ہوگا۔ کیا اس میں زندگی سے دور ہونے کے باعث غیر فطری ہونے کی خرابی پیدا نہیں ہو جائیگی۔ کیا اس میں بے روح ہو جانے کے باعث اثر انگیزی کے عناصر ڈھونڈنے سے بھی مل سکیں گے۔ کیا وہ کسی دوسری دُنیا کی چیز نہیں معلوم ہوگا؟

جواب ان عام سوالات کا صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر یہ صورت پیدا ہو تو پھر وہ ادب باقی ہی نہیں رہ سکتا۔ وہ مر جائیگا۔ اور جب وہ ادب باقی ہی نہیں رہتا تو پھر اس کے اہم اور غیر اہم ہونے کی ضرورت باقی ہی نہیں رہ جاتی۔ ادب کی تخلیق تو اس ایک بات کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتی ہے کہ وہ ادیب کچھ کہنا چاہتا ہے خود اپنے متعلق اور اپنے جذبات واحساسات کو بیان کرے اور ان کو دوسروں تک پہنچانے کی خواہش اس کو رہتی ہے۔ وہ دوسروں کو بھی ان کیفیات سے واقف کرانا چاہتا ہے۔ جو اس کے دل پر خارجی حالات سے ردّ عمل کے طور پر پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اپنے آس پاس اور گردوپیش کے لوگوں سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ ان کی حرکات وسکنات، حالات وواقعات اور جذبات و کیفیات کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنا کر دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ جس سے ایک طرف تو خود اس کو تسکین ہوتی ہے۔ اور دوسری طرف پڑھنے والوں کیلئے بھی یہ بات اچھی خاصی دلچسپی کا باعث بنتی ہے کیونکہ اپنے ہی جیسے انسانوں کے حالات کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنی ہر انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ یہی تمام باتیں ہیں جو ادب کو زندگی سے متعلق کرتی ہیں۔ اس لئے یہ ناممکن سا ہے ہوا کہ فن کار یا ادیب خواہ وہ کسی نظریئے کا قائل ہو، اپنی تخلیقات میں انسانی زندگی کے مختلف اور متنوع مسائل کو جگہ دینے سے باز نہیں رہ سکتا۔ یہی نہیں بلکہ اس کا آرٹ عبارت ہی ہوگا زندگی کے مختلف مسائل سے۔

زندگی کی دو حیثیتیں ہیں، ایک انفرادی، دوسری اجتماعی۔ اول الذکر میں وہ تمام باتیں آجاتی ہیں جن سے کہ خاص انسان بعض خاص حالات میں بعض خاص ماحول سے دوچار ہوتا ہے اور وہ صرف اسی سے متعلق ہوتی ہیں۔ اور موخر الذکر کا تعلق ان باتوں سے ہے جو نوعی، سماجی اور مجلسی زندگی سے متعلق ہوتی ہیں۔ یعنی ایک ایسا ماحول، ایک ایسی فضا جس میں پہنچ کر انسان اپنی انفرادیت کو اس اجتماعیت میں مدغم کر دینے کیلئے مجبور ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانوں کے بعض مسائل انفرادی ہیں بعض اجتماعی جہاں تک اپنی ذات کا تعلق ہے وہ صرف ایک فرد ہے اور اس کے اپنے چند مسائل ہیں۔ اس کی اپنی چند الجھنیں ہیں۔ اس کی اپنی چند پریشانیاں ہیں۔ وہ ان سب سے متاثر ہوتا ہے۔ ان سب کا تجربہ کرتا ہے۔ ان سے بچنے، ان پر غالب آنے، ان کا کوئی مخصوص حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کے علاوہ اس کی زندگی اجتماعی زندگی بھی ہے۔ جس میں وہ ایک بڑے حلقے اور ایک بڑے گروپ سے متعلق ہو جاتا ہے جس میں اس کو اپنی ذاتی ضروریات، الجھنوں اور پریشانیوں کے دائرے سے نکل کر ذرا بڑے پیمانے پر سوچنا پڑتا ہے۔ بڑے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے انفرادی مسائل بھی اس اجتماعی ناہمواری کے باعث پیدا شدہ مختلف الجھنوں اور پریشانیوں سے تشکیل پاتے ہیں کیونکہ بہرحال وہ اپنے سماج کا ایک فرد ہے۔ اور اس پر اس کے اثرات پڑنے ضروری اور لازمی ہیں۔ اب اگر وہ ان سماجی حالات سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھنا چاہے تو ناممکن اور محال ہے۔ کیونکہ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے اس سماج کو بنایا ہے۔ وہ بذاتِ خود فطرۃً ایک سماجی مخلوق ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ چند افراد کی دست درازیوں کے باعث انھیں کے ہاتھوں تشکیل کردہ سماج کے حالات میں ناہمواری پیدا ہو جائے۔ اگر یہ ناہمواری سماجی زندگی میں پیدا ہوتی ہے تو اس کو ختم کرنے کیلئے اس کو نارمل حالت پر لانے کے لئے ایک اہم فرض کی ذمہ داری اس سماج کے ہر فرد پر عائد ہوتی ہے کیونکہ اس میں خود اپنے نقصان اور فائدہ کا سوال ہے، خود اپنی تکلیف اور راحت کا سوال ہے۔ خود اپنی موت اور زیست کا سوال ہے۔

جب یہ صورت حال نہ ہو تو کیا سماج کے ہر معقول اور اچھے

دہ کیلئے یہ ضروری نہیں ہو جاتا کہ وہ اپنی انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی کے اثرات سے تشکیل پانے والی انفرادی زندگی اور ان کے مسائل پر گہری نظر رکھے۔ ان کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہو۔ ان کی بیماریوں کا اس کو پورا پورا علم ہو۔ وہ ان تمام باتوں کا علم رکھنے کے بعد اس کے ہاتھوں ان تمام موضوعات کا علاج نکالنے کی ایک شعوری کوشش بھی جاری رہے۔ یہ سب ضروری ہے اور ایسی سرسری!

ادیب بھی اسی سماج کا ایک معقول فرد ہوتا ہے جس کی نظریں دوسرے افراد سے کہیں زیادہ وسعت تخیل میں کہیں زیادہ گہرائی ... کہیں زیادہ بیداری اور احساس میں کہیں زیادہ شدت پائی جاتی ہے۔ اگر وہ کسی بڑے انسان کی طرح نہیں سوچ سکتا تو سماج کے ایک عام اور معمولی فرد کی طرح تو ضرور سوچتا ہوگا اور جیسے ایک عام اور معمولی فرد اپنے انفرادی اور اجتماعی مسائل کو حل کرنے کی فکر میں رہتا ہے اسی طرح کیا ممکن نہیں کہ ادیب یا فن کار کو ان باتوں کا خیال نہ رہتے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ ادیب تو درکنار سماج کا ایک اچھا فرد بھی نہیں بن سکتا۔ اور جب وہ سماج کا اچھا فرد ہی نہیں بن سکتا ... اس کی کوئی اہمیت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے ادیب کیلئے ضروری ہے کہ وہ کم از کم سماج کے ایک عام فرد کی طرح اپنے گرد و پیش اور اپنے اجتماعی اور انفرادی مسائل پر غائر نظر رکھتا ہو۔ بہرحال وہ سماج سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ وہ ان تمام حالات سے اثر قبول کرتا ہے جو سماجی زندگی میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ وہ حالات خود اس کے پیدا کئے ہوتے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ وہ ان سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ وہ اپنے گرد و پیش اور اپنے ماحول ہی سے اپنے موضوعات لیتا ہے۔ اس لئے ان تمام باتوں کو موضوع بنانا اس کیلئے ناگزیر ہے۔

خیر تو یہ بات طے ہو گئی کہ ادیب کی اپنے سماجی ماحول سے چشم پوشی ناممکن ہے۔ وہ اس ماحول اور اس کے مختلف حالات کو مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے۔ وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا کہ چونکہ اُسے اپنے ساتھ رہنے والوں سے ہمدردی ہے اس لئے صرف ان کے مختلف جذبات و احساسات کی ترجمانی کر دے۔ یا جس حالت میں وہ ہیں اس کا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے کھینچ دے۔ بلکہ اس کی کوشش یہ رہتی ہے کہ ان حالات کو سامنے رکھ کر وہ جدا جدا طبقے کے سماج کے افراد کو سمجھائے جس سے خود ان کے اندر زندگی کے متعلق ایک شعور پیدا ہو۔ وہ خود اس کے تمام اسرار و رموز اور اس کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہوں۔ اور اگر ان کے حالات ٹھیک نہیں ہیں، اگر ان میں ناہمواری ہے، اگر ان میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں تو ان کو بدلنے کی کوشش کریں۔ اسی پیمانے سے ادیب کی عظمت کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ اگر وہ کسی بڑی شخصیت کا مالک ہے۔ اگر زندگی کا شعور اس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اگر اس نے دنیا کے معاملات پر گہری نظر ڈالی ہے، اگر وہ چیزوں کے متعلق صحیح غور و فکر کر سکتا ہے تو پھر اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ کوئی ایسی بات کہے، کوئی ایسا پیغام دے، کسی ایسے خیال کا اظہار کرے جو خود اس کی ذات اور اس کی سماجی زندگی کیلئے مفید ثابت ہو۔ ورنہ اگر وہ معمولی قسم کا ادیب ہے، اگر اس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کم ہیں اگر وہ زندگی اور اس کے مسائل کے متعلق کوئی شعور نہیں رکھتا تو پھر اس کو معمولی شخصیت کا ادیب سمجھا جائیگا۔ وہ کوئی پیغام نہیں دے سکے گا۔ اور اس لئے اس کی حیثیت کسی سماجی اہمیت کی مالک بھی نہیں ہو سکے گی۔ لیکن ادیب اور فن کار کو اس پیغام میں اس بات کی بھی تلاش کرنے کی ضرورت ہے کہ کس حد تک اس نے اپنے سماجی ماحول سے صحت مند اثر قبول کیا ہے۔ اس کا تاثر غلط تو نہیں؟ اس کی سوچ اور تفکر نے جو راستہ بنایا ہے وہ صحیح ہے یا غلط؟ اگر حالات کے تجزیہ اور شعور کی بیداری اس بات کو صحیح ثابت کر دے کہ جو کچھ ادیب کہتا ہے، جو چیز بھی اس نے پیش کی ہے وہ غیر مناسب اور غیر صحت مند نہیں ہے۔ بلکہ سماجی زندگی کیلئے مفید اور صحت بخش ہے۔ تب اس نے اپنے کام کو پوری طرح انجام دیا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا ورنہ نہیں۔

یہی ادب کا افادی پہلو ہے۔ اسی کو "مقصدیت" کہتے ہیں۔ اور ادب میں زندگی کی صحیح ترجمانی بھی یہی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ حالات و واقعات کے تقاضوں سے مختلف ممالک اور مختلف اوقات میں افادیت کے تصورات بدلتے رہتے ہیں۔ اور یہ پوری طرح سماجی زندگی کی مختلف کروٹوں میں منحصر ہے۔

جب سماجی زندگی میں تغیرات ہوں گے عوام کا رجحان جس طرف بھی ہوگا۔ اسی طرف ادب کو بھی اپنی باگ موڑنی پڑے گی۔ کیونکہ وہ اسی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اور اگر نہ چلے تو اس کو زندگی کا صحیح ترجمان نہیں کہا جاسکتا۔ یہ بات ناممکن ہے کہ اگر کسی قوم یا ملک پر کوئی بپتا پڑے کوئی مصیبت آئے تو وہاں کے ادیب رنگینیوں اور رعنائیوں کے سرور میں کھوئے ہوئے ہوں۔ ان کو اس بپتا، اس پریشانی اور اس مصیبت کو محسوس کرنا ہوگا۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے اور صرف خیالی دنیا میں ہوائی باتوں کے تذکرے ہی کو اپنا مشغلہ بنالیں گے تو ظاہر ہے کہ وہ کسی اہمیت کے مالک نہیں کہے جاسکتے۔ زمانہ ان کو بہت جلد بھلا دے گا۔ زندگی کا قانون ان کو موت کے گھاٹ اتار کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ابدی نیند سلا دیگا۔

آج حالات کے پیش نظر افادیت کا تصور کچھ اور ہے، کل کچھ اور تھا، اور آئندہ کون جانے کہ کیا ہوگا۔ لیکن بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حالات و واقعات کے تقاضوں اور سماجی زندگی کی ضروریات کے پیش نظر ہی اس کی تشکیل ہوگی۔ آج انسان ہر چیز کو عقل کی روشنی میں دیکھنے اور اس کی تہ تک پہونچنے کا عادی ہوگیا ہے۔ کیونکہ زندگی نے اس کے ذہن و دماغ کو ایک خاص سانچے میں ڈھال کر زیادہ دوررس و دوربیں بنا دیا ہے۔ وہ اب سطحی باتوں پر نظر نہیں ڈالتا۔ کل اس کی یہ حالت نہ تھی۔ آج سے صدیوں پہلے اگر ہم اس زمانہ پر نظر ڈالیں جب انسان اس دنیا میں بالکل نووارد تھا اور اس کی زندگی اپنے بچپن کی ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھی، اس وقت اس کے شعور میں بیداری اور عقل میں روشنی کی فراوانی نہیں تھی۔ ہیئت اجتماعی، نظام تمدنی اور سماجی زندگی کا کوئی تصور اس کے سامنے نہیں تھا۔ وہ جذبات کا پتلا تھا۔ اس لئے کائنات کی ہر چیز تک اس کی پہونچ جذبات ہی کے سہارے ہوتی تھی۔ وہ ہر چیز کے متعلق ایک خاص خیال قائم کرلیا کرتا تھا۔ جس کو عقل و شعور سے کوئی واسطہ نہیں۔ چنانچہ اس وقت کی ادبی تخلیقات میں بھی اس کی طبیعت کا یہی رجحان پوری طرح نمایاں نظر آتا ہے۔ اس میں افادیت کا تصور ظاہر ہے کہ وہ نہیں ہوسکتا تھا جو آج واقعات و حالات کی مختلف کروٹوں نے پیدا کردیا ہے۔ اس زمانہ میں انسان کے شعور میں بیداری نہیں تھی، عقل میں زیادتی نہیں تھی۔ تخیل میں بلند پروازی نہیں تھی۔ نظر میں وسعت اور گہرائی نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر چیز تک جذبات کے سہارے پہنچتا تھا۔ وہ جو کچھ محسوس کرتا تھا خارجی حالات اس کے دل پر جیسا بھی اثر ڈالتے تھے وہ ان پر بغیر کسی غور و فکر کے کسی خیال کا اظہار کردیا کرتا تھا۔ پھر ان خیالات کے اظہار، ان جذبات و احساسات کے بیانات میں سطحیت ہوتی ضروری تھی۔ کیونکہ اس کا ذہن و دماغ اس میں سوچ اور تفکر کے عنصر کو پیدا کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بات یہ تھی کہ اس وقت حالات ہی کچھ ایسے تھے۔ انسان نے دنیا کی تمام باتوں کے متعلق اور کائنات کی تمام چیزوں کے متعلق کچھ بھی غور نہیں کیا تھا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ صرف جذباتیت ہی پنپ سکتی اور پروان چڑھ سکتی تھی۔ چنانچہ انسانیت کی اس وقت کی حالت جب وہ کلچر اور تہذیب سے روشناس نہیں ہوئی تھی ہمیں بتاتی ہے کہ اس وقت خیالات میں سطحیت اور سوچ میں جذبات کو زیادہ دخل تھا۔ پھر اس وقت کے مسائل بھی کچھ ایسے زیادہ پیچیدہ نہیں تھے۔ کیونکہ سماجی زندگی اس وقت تک شروع ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت کا ادب جو آج مختلف گیتوں وغیرہ کے روپ میں ہمارے سامنے ہے اس کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے زمانے کا پوری طرح ترجمان ہے۔ اس میں چند سطحی باتوں کا بیان ہے۔ چند جذباتی باتوں کا تذکرہ ہے۔ اس میں کسی افادی پہلو کا پتہ نہیں۔ کیونکہ اس وقت جو زندگی میں افادیت کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور جب زندگی میں افادیت کے تصور کا پتہ نہیں تھا تو پھر بھلا ادب میں اس کے اثرات کیسے آسکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یا تو جنسی جذبات کی مختلف کیفیات کے سطحی بیان پر مشتمل ہیں یا پھر حسن فطرت کی تصویر کشی تک محدود ہیں۔ جنھوں نے اپنے عجیب ہونے کی وجہ سے اس کو حیران کر دیا تھا۔ لیکن انسانی زندگی جامد اور غیر متحرک نہیں تھی۔ اس لئے وہ شروع دن ہی سے ارتقا کے راستے پر برابر آگے بڑھتی رہی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ انسان کی سوچ اور تفکر بھی اپنے پاؤں پھیلانے لگا۔ حسن فطرت کے متعلق اس نے یہ سوچا کہ یہ آخر ہے کیا۔ یہ کیسا کارخانہ ہے۔ ان سب کے وجود میں آنے کا کیا مقصد ہے۔ زندگی میں وہ کس اہمیت کے مالک ہیں۔ یہ اور اسی طرح کے سوالات کی لہریں اس کے ذہن اور دماغ میں اٹھنے لگیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کے دھیان میں ان باتوں کا شعور پیدا ہوتا گیا۔ اس نے سوچا کہ یہ سب چیزیں بہت عجیب ہیں۔ اس لئے ہونہ ہو ان کی حیثیت ماورائی ہے۔

مابعد الطبیعاتی ہے۔ چنانچہ اس نے ان سب کو مختلف دیوتا بنا دیا۔ اور وہ ان کے گُن گانے لگا۔ جس میں ان کی اہمیت کو عوام کے ذہن نشین کرنے، اس کو صحیح ثابت کرنے اور یقین دلانے کا ایک شعوری احساس کارفرما تھا۔ اس طرح اس ادب کی پیدائش ظہور میں آئی۔ جس میں حمد اور جمالیاتی حس کے ساتھ ساتھ عوام کو اس طرف راغب کرنے کی افادیت بھی تھوڑی بہت موجود تھی۔ ویدوں کے اشلوک، ژند و اوستا اور اسی طرح کی دوسری مذہبی کتابوں میں سموئے خیالات اسی طرح کے ادب میں شامل ہوتے ہیں۔ ان سب میں افادیت کا پہلو موجود ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ بلا کے خوبصورت بھی ہیں۔

اس کے بعد دنیا اور آگے بڑھی۔ مذہب کا چراغ روشن ہوا ہر شخص اسی کے رنگ میں رنگ گیا۔ پروہتوں اور پجاریوں کی بن آئی۔ فاقہ کش سادھو، خدا رسیدہ اور پہنچے ہوئے لوگ پیدا ہونے لگے۔ اس حساب اور احتساب کا ظہور ہوتا رہا۔ جو ایک زمانے تک عوام کے اذہان پر حکمرانی کرتے رہے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں انھوں نے ان کو دھوکہ میں ڈال کر اپنا الو خوب سیدھا کیا۔ اس کے اثرات ادب میں بھی دیکھئے۔ برابر ملتے ہیں۔ ایک زمانہ تک انھیں مذہبی خیالات اور نظریات کا پرچار ہوتا رہا۔ جس میں اگر ہم اپنے نقطۂ نظر سے افادیت نہ بھی پائیں لیکن اس بات کا ایک شعوری احساس ضرور ملے گا کہ ادب کے ذریعے سے ان کو پھیلانے کی ایک کوشش کی جا رہی تھی۔ پروہتوں، پجاریوں اور مذہبی لوگوں کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس وقت بھی ادب نے اپنے دامن میں افادیت کو جگہ دی۔ انھوں نے بہت کچھ اس سے کام بھی لیا۔ اور ان کو اپنے مقصد میں کامیابی بھی حاصل ہوئی لوگوں کے دلوں میں مذہب نے گھر کر لیا۔ ہر شخص خدا پرستی کے نشے سے سرشار نظر آنے لگا۔ وہ ماورائی اور مابعد الطبیعاتی باتوں کو صحیح سمجھے۔ اور ان پر یقین رکھنا ان کا ایمان بن گیا۔ اس کام میں ادب کا اچھا خاصہ حصہ ہے۔ اور اس قسم کے ادب کی مثالیں دنیا کے مختلف ممالک کے ادبیات کے ابتدائی ادوار میں بہت کافی ملتی ہیں۔ جن کا سلسلہ آگے چل کر جاگیردارانہ اور سامنتی دور سے مل جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان لوگوں نے ادب کو کسی اچھے کام کیلئے استعمال نہیں کیا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب میں وہ خیالات سموئے گئے اور عوام پر اثر انداز ہوئے۔

جاگیردارانہ اور سامنتی دور بھی اسی کے ساتھ ساتھ چلا۔ جب انسان کے دل میں ایک دوسرے پر قابض ہونے، حکومت کرنے اور لوٹ مار مچانے کا خیال پیدا ہوا تو ہوس ملک گیری بڑھی۔ انسان ہنگامے برپا کرنے لگے۔ جس کے نتیجے میں بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں۔ چند مٹھی بھر انسانوں نے اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر ہر زمانہ میں ان گنت انسانوں کا خون بہایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ حاکم ہو گئے کچھ محکوم۔ اور جب محکوم نے حاکم بننے کی کوشش کی، یا کسی ایک حاکم نے دوسرے کو محکوم بنانے کا ارادہ کیا تو جدال و پیکار کا بازار گرم ہوا۔ ہنگامے ہوئے مصیبتیں آئیں۔ خونریزیاں ہوئیں اور ساری دنیا ایک آماجگاہ شر و فساد بن گئی۔ ان حالات کے اثرات بھی ادبیات پر پڑے۔ جو ہنگامہ اور شر و فساد برپا کرنے والوں نے اس کو اپنایا۔ اور اس سے کام لینے کی کوشش کی۔ ماحول انھوں نے پیدا کر ہی دیا تھا۔ چنانچہ ادیبوں کے لئے ان میں سے کسی ایک کا ساتھ دینا ناگزیر تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی تخلیقات کو ان ہنگاموں اور شر و فساد کی داستانوں کیلئے استعمال کرنے لگے۔ شاعری میں بڑی بڑی لڑائیوں کا ذکر کیا گیا۔ جس میں کسی نہ کسی کے ساتھ دینے پر آمادہ کرنے کی ایک شعوری کوشش موجود تھی۔ اور ان کے خیال میں اپنے نظریات فکر کے مطابق یہی سب سے بڑی افادیت تھی۔ کیونکہ اسی طرح سوچتے تھے۔ انھوں نے اچھائی برائی کے تصورات کو انھیں لڑائیوں اور ہنگاموں کی شرکت اور علیحدگی تک محدود کر لیا تھا۔ ممکن ہے کہ بعضوں کے نقطۂ نظر سے اس دور کے ادیبوں کی حرکات لائق تحسین نہ ہوں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت بھی ادب میں اس وقت کے اپنے انداز فکر کے اعتبار سے ادیبوں نے ایک افادی پہلو کو پیدا کرنے کی کوشش کی۔

دوسری طرف اسی سامنتی اور جاگیردارانہ نظام نے ایک ایسے ادب کی تخلیق کیلئے بھی زمین تیار کی جس میں ذہنی عیاشی کو زیادہ دخل تھا یعنی ادب کو ان کی تفریح طبع اور لطف اندوزی کا ذریعہ بھی بنایا گیا۔ بات یہ تھی کہ یہ جاگیردار وقت کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے حالات و واقعات کے تقاضوں سے زیادہ عیش پسند ہوتے جا رہے تھے۔ اور ہر چیز میں وہ اپنی ذہنی عیاشی کا سامان پیدا کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جہاں انھوں نے اور چیزوں کو عیاشی کیلئے استعمال کیا وہاں ادب کو بھی اس کا آلۂ کار بنایا۔ ادبی تخلیقات تفریح طبع کی چیز سمجھی جانے لگیں۔ لیکن اس ادب کا بھی مقصد تھا۔ اس کو بھی صرف برائے ادب نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ تفریح حاصل کرنا لطف اندوزی اور تعیش پرستی بذات خود مقصد ہے۔ ہر چند وہ ہماری نظروں میں پسندیدہ نہیں، بہرحال اس زمانہ میں ادب کے یہ دو پہلو نمایاں

رہے۔ اور دونوں کو دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس کے تخلیق کرنے والوں نے اپنے خیالات و نظریات کے پیش نظر اس میں افادیت کا رنگ دینے اور مقصدیت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔

یہ زمانہ بھی ہمیشہ باقی رہنے والا نہ تھا۔ حالات برابر بدل رہے تھے۔ جس کے نتیجے میں جاگیردارانہ دور ایک سرمایہ دارانہ نظام میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ صنعتی انقلاب نے ساری دُنیا کی صورت بدل دی تھی۔ انسانوں کے مسائل اب پھیل اور بڑھ رہے تھے جس کی وجہ سے انھوں نے بالکل ایک نیا روپ دھار لیا تھا۔ عوام اب سوچنے سمجھنے لگے۔ جاگیردارانہ اور سامنتی دور نے جس پستی میں ان کو ڈال رکھا تھا اسی پستی سے وہ اب اٹھنا چاہتے تھے۔ انھیں اب اپنے مسائل کو سمجھنے کی تمنا تھی۔ اور ان کو یہ احساس بھی ہو چلا تھا کہ انسان کو انسان کا محکوم اور دست نگر نہیں رہنا چاہیے۔ جب دلوں کے اندر یہ بات بیٹھ گئی تو اس نے اس پامالی، بے حسی اور افتادگی کو متزلزل کر دیا۔ جو جاگیردارانہ اور سامنتی دور میں ساری دُنیا کے انسانوں پر مسلط تھی چنانچہ سماج کے افراد کے اندر اب ایک جارحانہ انداز پیدا ہوا۔ ایک بپھری ہوئی کیفیت نظر آئی جس کے نتیجہ میں جاگیرداری اور سامنت کال کی عمارت ہلنے لگی۔ اس کے اثرات ادب پر بھی پڑے۔ چنانچہ ادب میں بھی یہی ایک جارحانہ انداز، یہی ایک محدود دائرے سے نکل کر اس کو ختم کر دینے کی خواہش نظر آئی۔ سوچ اور تفکر کا عنصر اس میں گھر کرنے لگا۔ ادبی تخلیقات میں انسانوں کی زبوں حالی، کس مپرسی اور بے بسی کی تصویریں بنائی جانے لگیں۔ مختلف ممالک کی سیاسی تنگی میں انقلاب کے نعرے بلند ہونے لگے۔ مروّجہ سماجی، اقتصادی اور معاشی نظاموں کو درہم برہم کر دینے کا خیال پیدا ہوا۔ ادب بھی ان سے اپنا دامن نہ بچا سکا۔ بلکہ ان حالات کو پیدا کرنے میں تو ادب نے بڑا کام کیا۔ مختلف ممالک کے مختلف ادیبوں نے نہ صرف ان خیالات کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی بلکہ ان کے ذریعے ان خیالات کا پرچار کرنے کی کوشش کی۔ اور ادبی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے عوام کے اندر اس شعور کی بیداری میں بڑا حصہ لیا۔ جس کی وجہ سے عوام کے قدم ترقی کے راستے پر زیادہ تیزی سے آگے کی طرف بڑھنے لگے۔ انقلاب فرانس کے زمانہ کا ادب اور اسی طرح دوسرے ممالک کے اس قسم کے ادبیات کو دیکھ کر کون ہوگا جو یہ ماننے کیلئے تیار نہ ہو کہ انھوں نے سماج کے افراد کی بیداری میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔ بہرحال اس زمانہ میں بھی ادیبوں نے کچھ کہنے کی کوشش نہ کی ہو۔ کوئی پیغام دینے کا احساس پیدا کیا گیا یہ ادب میں افادیت کی جھلکیاں نہیں تھیں۔ ان تمام باتوں کو مقصدیت سے کوئی تعلق نہیں تھا؟

انسانیت کے اس تاریخی ارتقا پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کم و بیش ہر دور میں افادیت اپنے اپنے وقت، ماحول، نظریات اور انداز تفکر کے اعتبار سے ادبیات سے ہم آہنگ رہی۔ البتہ افادیت کے تصورات بدلتے رہے۔ ایک زمانہ میں ماورائی اور مابعد الطبیعاتی چیزوں میں یقین رکھنے اور ان پر ایمان لانے کا پرچار کیا گیا۔ دوسرے زمانہ میں جاگیرداروں اور سامنتیوں کے گُن گائے گئے۔ اور گُن گا کر عوام کو ان کا غلام بنانے کی کوشش کی گئی۔ اور ہوس ملک گیری کی خاطر لڑائیاں ہوئیں۔ جن کے بیانات ادبیات میں کئے گئے۔ پھر ایک زمانہ اور آیا جب اس نظام کو انسانیت کیلئے لعنت سمجھا گیا۔ عوام میں ایک سیاسی، معاشی اور اقتصادی شعور پیدا ہوا۔ جس کے نتیجے میں اس دور کا ادب بھی ایک انقلابی رنگ میں رنگ گیا۔

آج زمانہ اس سے بھی دو چار قدم آگے بڑھ چکا ہے۔ چنانچہ آج افادیت کے تقاضے بھی کچھ اور ہیں۔ صنعتی انقلاب نے سرمایہ و محنت کی کش مکش کو ساری دُنیا کیلئے ایک بہت بڑا مسئلہ بنا دیا ہے۔ مزدور پامال ہے۔ سرمایہ دار اس کا خون چوسنے میں مشغول ہے۔ آج غلط تقسیم کے باعث نوع انسانی کیلئے مصیبت کا باعث بن رہی ہے۔ اس سے عوام کو آرام ملنے کے بجائے نقصان پہونچ رہا ہے۔ یہ کتنا بڑا تضاد ہے۔ ظاہر ہے کہ زندگی کی اس تضادی کیفیت میں ترقی کرنی مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ ہمارے مروجہ نظام کا یہ تضاد تو خود کسی تیسرے نظام کو جنم دینے کی گواہی دے رہا ہے۔ کیونکہ زندگی اس عالم میں ہمیشہ رہ نہیں سکتی۔ ان متضاد عناصر کا وجود بجائے خود اندر ہی اندر برسرپیکار رہنا لازمی ہے جس کے نتیجے میں ایک نئی زندگی، ایک نیا نظام، ایک نئے عالم کا پیدا ہونا بھی ناگزیر ہے یہی زندگی کی جدلیاتی کیفیت ہے۔ یہی جدلیات کا فلسفہ ہے جو انقلاب کو لاتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں انسانوں کی شعوری کوششیں بھی شامل ہوں۔ اور یہ ماحول اور سرمایہ و محنت کی کش مکش، یہ ہنگامہ، یہ پریشانی، یہ انتشار، یہ کس مپرسی، یہ زبوں حالی کسی اصلاح اور ریفارم سے ختم نہیں ہو سکتے۔ ان کے درختوں کو تو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنے کی ضرورت ہے۔ جو بغیر ایک انقلاب کے سیلاب کے ناممکن ہے۔ اس لئے دُنیا میں سماجی اقدار کی ناہموار کیفیت کو درست

کرنے کیلئے ایک انقلابی رجحان پیدا کرنا از بس ضروری ہے۔

اس انقلابی رجحان کے پیدا کرنے کیلئے ظاہر ہے کہ ہر کوشش کو انفرادی بنانے کے بجائے اجتماعی بنانا پڑے گا۔ کسانوں، مزدوروں، محنت کشوں اور دوسرے پامال طبقوں کو اپنے ساتھ لیکر چلنا ہوگا۔ ورنہ تہذیب و تمدن، ہیئت اجتماعی، سماجی زندگی اور کلچر کی ترقی کیلئے نظام اقدار میں ایک انقلاب کے بعد ہمواری پیدا کرنا مشکل ہے۔ چنانچہ آج کا سب سے بڑا ضروری اور اہم کام یہ ہے کہ ان ٹکڑی ٹکڑی اور انفرادی قوتوں کو ایک اجتماعیت کی لڑی میں پرو دیا جائے۔ تاکہ وہ اس انتشاری اور ہنگامی دور کو ختم کرنے کے لئے زندگی کی جدلیاتی رفتار سے ہم آہنگ ہوں۔ اور ان کی کوششوں سے ایک نئے نظام اور ایک نئی زندگی کا آفتاب طلوع ہو سکے۔ انھیں حالات نے بہت سے ایسے نظریات فکر کو جنم دیا ہے۔ جن میں سے بعض دنیا کی بہتری کیلئے ہیں بعض تباہی و بربادی کیلئے۔ بعض اچھائی کے لئے ہیں اور بعض برائی کیلئے۔ اور وہ سب کے سب ایک دوسرے سے برسر پیکار ہیں۔ کیونکہ خود زندگی میں سکون نہیں۔ اور خود زندگی کے مسائل ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔

ادب بھی بہرحال اپنے وقت کی سماجی زندگی کی پیداوار ہوا کرتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ ان موجودہ حالات اور موجودہ سماجی ماحول کے پیچیدہ اہم اور ضروری مسائل سے اپنا دامن نہیں بچا سکتا۔ اس کیلئے موجودہ حالات میں ناگزیر ہے کہ سرمایہ و محنت کی کشمکش سے چشم پوشی اختیار کرے۔ اس کیلئے ناگزیر ہے کہ وہ غریبوں، مزدوروں، کسانوں، اور محنت کشوں کو جبر و استبداد کے پیروں تلے تڑپتا اور تلملاتا ہوا دیکھے اور خاموش رہے۔ اور خاموش ہی نہ رہے بلکہ سرور و سرخوشی، عیش و عشرت اور راحت و آرام کے گیت گائے۔ آج حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ادیب ان تمام حالات کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنائے۔ اس کو احساس ہو کہ زندگی ایک جدلیاتی حقیقت ہے اور اس میں تضاد کی کیفیت ایک نئے نظام، ایک نئی دنیا اور ایک نئے ماحول کو جنم دیتی ہے۔ تغیر اور انقلاب کے جراثیم خود اس کے وجود میں موجود ہیں۔ اور پھر زندگی کی تضادی کیفیت اس وقت انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ جو اس بات کی متقاضی ہے کہ کوئی زبردست سماجی انقلاب ظہور میں آئے۔ اس انقلاب کی رفتار سماج کے افراد کی شعوری کوششوں سے زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ اس لئے آج کے ادیب کا فرض ہے کہ وہ ان حقیقتوں کے پیش نظر شعوری طور پر اس انقلاب کو لانے میں اپنی تخلیقی کوششوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔

ادب کو انفرادیت کے محدود دائرے سے نکل کر اجتماعیت کی کھلی ہوئی فضا میں آنا پڑے گا۔ داخلیت کی جگہ خارجیت کو دینی ہوگی عوام کو اپنے ساتھ لیکر چلنا ہوگا۔ غرض یہ کہ اگر وہ اپنی تخلیقات میں ایک اجتماعی شعور کو پیدا نہیں کرے گا اس وقت تک یہ تمام معاملات کسی صورت سے بھی بدل نہیں ہو سکتے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کو ایک فردی اور پرولتاری ادب پیدا کرنا ہوگا جس میں آج کی زندگی کے بنیادی مسائل سموئے ہوئے ہوں۔ اور ساتھ ہی ساتھ جس میں ان مسائل کی گتھیوں کو سلجھانے کا ایک شعوری احساس بھی کارفرما ہو۔

یہ مسائل ظاہر ہے کہ اقتصادی ہیں اس لئے ادبیات میں معاشیات و اقتصادیات کی موشگافیوں کو جگہ دینی پڑے گی معاشیات اور اقتصادیات میں آج ساری انسانی زندگی الجھی ہوئی ہے۔ حالات بے انتہا پیچیدہ ہو چکے ہیں۔ کوئی فرد بھی ان سے الگ رہکر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ورنہ اس کی اجتماعی زندگی اور ساتھ ہی ساتھ انفرادی زندگی بہت سی الجھنوں کا شکار ہو جائے گی۔ اور وہ سماج کے درمیان کسی اہمیت کا مالک نہیں سمجھا جائیگا۔ یہ معاشی اور اقتصادی مسائل یوں تو ہر زمانے اور ہر دور میں زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کی اہمیت کو سمجھا گیا ہے۔ لیکن آج سوچ اور تفکر کی نئی راہوں نے چونکہ ان کو ایک انقلابی رنگ دیدیا ہے۔ اس لئے ان کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس لئے آج زندگی میں ان کی اہمیت اور ضرورت کو محسوس کیا جا رہا ہے۔ ادبیات میں اسی وجہ سے ان کی ایک خاص جگہ ہے۔ ادیب اس وجہ سے ان کو اپنی تخلیقات میں سمو رہے ہیں تاکہ وہ وقت کی ضرورت کو پورا کر سکیں۔ اور زندگی کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویریں ان کے ہاتھوں پیش ہوں۔ انسانوں کے دوسرے جذبات و احساسات اور زندگی کے دوسرے موضوعات ان مسائل کے سامنے اس وقت زیادہ اہمیت نہیں رکھتے چنانچہ وہ پس منظر میں جا پڑے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تذکرہ ادب میں بھی کم کیا جا رہا ہے۔ اور کم کرنا چاہیئے۔ کیونکہ آج ادیبوں کے پیش نظر زیادہ اہم اور زیادہ ضروری یہ اقتصادی اور معاشی مسائل ہیں انسان کے دوسرے جذبات و احساسات بھی انھیں معاشی اور اقتصادی مسائل کے زیر اثر ہی تشکیل پاتے ہیں۔ اس لئے

آج کا احساس ادیب ان کی ناہموار کیفیت کو اس وجہ سے بھی درست کرلے اور درست کرنے کا پیغام دینے کو اپنا ضروری فرض سمجھتا کہ کیونکہ اس ماحول میں جو وہ پیدا کرنا چاہتا ہے یہ جذبات و احساسات بھی زیادہ صحت مند اور صحت بخش صورت اختیار کرلیں گے۔ اور اس وقت گویا ان کو مثالیت سے ہمکنار ہونے کا شرف حاصل ہوسکے گا۔ بہرحال آج ان اقتصادی اور معاشی مسائل کی اہمیت ہماری سماجی زندگی میں وہی ہے جو کسی زمانہ میں مذہبیات و اخلاقیات کی مختلف اقدار کو حاصل تھی۔ اور جس کا پرچار ادیب کیا کرتے تھے۔ اُس وقت ادب کا افادی پہلو وہ تھا آج یہ ہے اور کل جب حالات سُدھر جائیں گے تو ادب کا افادی پہلو کوئی اور روپ اختیار کرلے گا۔ البتہ بعض لوگوں کو ادب کے اس افادی رجحان سے ممکن ہے کہ دلچسپی نہ ہو اور وہ اس کو غیر ضروری خیال کرتے ہوں لیکن یہ وہی لوگ ہوسکتے ہیں جن کو حالات و واقعات کی کروٹوں سے آگاہی نہیں۔

عوام کو اقتصادی اور معاشی اعتبار سے بلند کردینے کے خیال ہی نے ادب کے اندر سیاسیات کے افادی رجحان کو پیدا کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ کسی بھی اقتصادی اور معاشی نظام کا چراغ اس وقت تک روشن نہیں کیا جاسکتا جب تک سیاسیات کے راستے سے نہ گزرا جائے۔ چنانچہ آج ساری انسانی زندگی معاشیات اور اقتصادیات کے ساتھ ساتھ سیاسیات میں بھی اُلجھی ہوئی ہے انسان صبح و شام سیاسی ہنگامے دیکھ رہا ہے۔ اس کے آس پاس سیاسی انقلابات ہو رہے ہیں۔ خود اس کے مزاج میں انقلاب ہے۔ ذہنی کیفیات میں انقلاب ہے۔ افتاد طبع میں انقلاب ہے۔ غرض یہ کہ سیاسی اعتبار سے وہ ایک بدلتی ہوئی دُنیا اور انقلابات سے ایک ہم آغوش و ہمکنار فضا میں سانس لے رہا ہے۔ چنانچہ اس انقلاب میں شریک ہونے کے خیال اور اپنے نظریات فکر کو عام کرنے کی جستجو نے اس کو سیاست میں قدم رکھنے کیلئے مجبور کردیا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی تخلیقات میں سیاسی رنگ ہونا چاہیئے۔ آج سے قبل بھی سیاسی رُجحان کا پتہ ادبیات میں چلتا ہے۔ لیکن یہ کیفیت اس کے اندر موجود نہیں تھی۔ آج کا سا انہماک، آج کا سا جوش، آج کی سی تندی اور تیزی کا اس زمانہ میں پتہ نہیں چلتا۔ پچھلی جنگ عظیم سے قبل کے ادیب اور ساغر سیاست سے زیادہ فلسفہ اور مابعد الطبیعیات پر غور کرنا بہتر خیال کرتے تھے۔ غرض یہ ہے کہ وہ سیاسیات کو زندگی میں کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے تھے۔ ان کے نزدیک سیاست ایک خاص طبقے کی جیسے تھی جس کو عوام سے کوئی سروکار نہیں تھا لیکن آج سیاست میں حصہ لے کر طاقت کو حاصل کرنا بہت ہی ضروری ہوجانا چاہیئے۔ آج سیاست ایک خاص طبقے کی چیز نہیں رہ گئی ہے۔ آج سیاست عوام کی سیاست ہے۔ اور سیاسی طاقت کا عوام کیلئے حاصل کرنا آج وقت کا سب سے بڑا ضروری اور اہم مسئلہ ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے انسانیت امن و سکون اور سرور و مسرت سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔ اس لئے آج کا ادیب سیاست میں حصہ لینے کیلئے مجبور ہو جاتا ہے۔ لوئی میکینس نے لکھا ہے کہ آجکل کی دُنیا میں جو لوگ سیاسیات سے نفرت کرنے کے عادی ہوچکے ہیں ان کے ذاتی مفاد بھی اس وقت تک محفوظ نہیں جب تک وہ ایک معقول صحت مند اور صحت بخش سیاسی نظام کو رواج دینے میں انفرادی اور اجتماعی کوششوں سے کام نہ لیں۔

آج کئی نظریات فکر کی آویزش پوری شدت کے ساتھ جاری ہے۔ اس لئے جب تک ان سب کے نشیب و فراز پر گہری نظر نہ ڈال لی جائے اس وقت تک گوہر مقصود ہاتھ نہیں لگ سکتا۔ یعنی کسی سائنٹیفک اور صحیح نظام سیاسی کو اپنانے کے لئے موجودہ نظریات فکر کے جنگل میں کافی کاوش اور تلاش کی ضرورت ہے۔ آج جمہوریت، فاشیت اور اشتراکیت و اشتمالیت ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ فاشیت جس نے پچھلی جنگ عظیم کے بعد سرمایہ دارانہ آمریت کی بدترین شکل اختیار کرلی تھی آج قریب قریب موت کی نیند سوچکی ہے اور جمہوریت جو دیواستبداد کے علاوہ کوئی اور دوسری چیز نہیں دُنیا پر حکمراں ہوچکی ہے۔ لیکن کیا اس میں جمہوریت کی کہیں شکل بھی دکھائی دیتی ہے۔ کیا ان اصولوں میں دور تک بھی کہیں جمہوری اصولوں کا پتہ چلتا ہے۔ جمہوریت آج سرمایہ دارانہ آمریت کا روپ دھار کر اپنے آپ کو فاشیت کی بدترین صورت میں پیش کررہی ہے۔

ایسی صورت میں موجودہ نظریات افکار میں سے ظاہر ہے کہ ایک ایسے ہی نظریئے کو اپنایا جاسکتا ہے جو ان تمام ہنگاموں کو ختم کرنے کیلئے تیار ہو۔ جو اپنے افعال و اقوال سے اس بات کو ثابت کرچکا ہو کہ وہ دُنیا میں انسانیت کی پریشانیوں اور زبوں حالیوں کا مداوا چاہتا ہے۔ جس نے اپنی تعمیری کوششوں سے

دُنیا کے ایک حصے کو فردوس ارضی کا نمونہ بنا دیا ہو۔ جس نے انسانوں کے اندر ارتقا کے راستے پر گامزن ہونے کیلئے ایک نیا ولولہ، ایک نئی امنگ اور ایک نیا جوش پیدا کر دیا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ نظام صرف اشتراکی اور اشتمالی نظام ہے۔

ادیب بھی اس حقیقت سے واقف ہے، اور چونکہ آج دُنیا کا سب سے بڑا مسئلہ انسانیت کیلئے یہی ہے کہ موجودہ نظریات فکر کی آویزش، ہنگاموں، ریشہ دوانیوں اور انتشار کو ختم کرنے کیلئے کسی ایک معقول اور سائنٹیفک نظام کو اپنایا جائے۔ اس لئے ادیب بھی ان مسائل کی اہمیت کو محسوس کر رہے ہیں۔ اور ان کو کرنا چاہئے کیونکہ آج زندگی کے سب سے زیادہ ضروری، اہم اور بنیادی مسائل یہی ہیں۔ چنانچہ ان کی تخلیقات میں موجودہ نظریاتِ فکر کی آویزش انسانیت کی زبوں حالی اور اشتراکیت و اشتمالیت کے نظریۂ فکر کے اثرات ملتے ہیں۔

ادیب سکون کا متلاشی ہوتا ہے۔ اور جب اس کے سکون میسر آنے کی راہ میں کوئی چیز حائل ہو تو وہ اس کو موت کے گھاٹ اتارنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ چاہے اپنی اس کوشش میں اُسے اپنے فن کو پیچھے ہی کیوں نہ لانا پڑے۔ آج بھی یہی حال ہے باشعور اور سمجھدار ادیب اشتراکیت کے پرچار میں مشغول ہیں کیونکہ یہ وقت کا تقاضہ ہے۔ ماحول کی پکار ہے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ اشتراکیت کے زیر اثر اب تک ادبی تخلیقات کم ہی پیش کی جا سکی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی زیادہ تر توجہ اپنے مقصد کی طرف ہوتی ہے۔ فنی اور جمالیاتی خوبیوں کو پیدا کرنے کا احساس اس کے نیچے دب جاتا ہے۔ سیاسی اور معاشی اقتدار کے حاصل کرنے کا خیال ان کی نظروں سے کسی حال میں بھی اوجھل نہیں ہوتا۔ پھر چونکہ ان کی نظروں میں دُنیا کی کوئی غیر متلاطم، غیر سکون یافتہ اور غیر انقلابی شکل نہیں ہوتی۔ اور چونکہ ان کے ذہن میں زندگی ہر آن اور ہر لمحہ رنگ بدلتی رہتی ہے اس لئے ان کو کوئی ایسا ماحول نصیب نہیں ہوتا جو کسی بڑے ادبی تخلیقی کارنامہ کو پیدا کرنے کیلئے زمین تیار کر سکے۔ ان کے خیال میں تخلیق کیلئے سماجی نظام میں سکون اور خوشحالی کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے اکثر بعض اوقات ادب کو چھوڑ کر عملی سیاست میں حصہ لینے لگتے ہیں۔ کوئی کسی جنگ میں مارا جاتا ہے۔ کسی کی شمع حیات عوام کے حقوق کی حفاظت کیلئے لڑتے ہوئے گل ہو جاتی ہے۔ بہرحال یہ ایک آدرش ہے اور بہت بلند آدرش! کیونکہ اس سے آئندہ بڑے تخلیقی کارناموں کیلئے ایک مناسب فضا اور ایک مناسب ماحول پیدا ہو جانے کے امکانات ہیں۔

ایک سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج سے قبل ادب میں افادیت کے یہ رجحانات کیوں پیدا نہیں ہوئے۔ آج سے قبل ادب نے اشتراکیت اور اس کے اصولوں کو اپنے دامن میں جگہ کیوں نہیں دی۔ بات یہ ہے کہ آج سے قبل ادیبوں کے شعور میں وہ بیداری نہیں پیدا ہوئی تھی جس کی آج فراوانی ہے۔ آج سے قبل حالات نے وہ پیچیدہ صورت اختیار نہیں کی تھی جو آج موجود ہے۔ آج سے قبل ادیب اپنے ماحول سے اتنا زیادہ غیر مطمئن نہ تھا جتنا کہ آج ہے۔ حالات نے اس کیلئے بہت بڑی حد تک اطمینان کا سامان بہم پہنچا دیا تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اس کو بدلنے کا خواب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ گھمسان کی لڑائیاں ہوتی تھیں ہنگاموں کا دور دورہ ہوتا تھا۔ لیکن ادیب چونکہ براہ راست ان لڑائیوں سے دوچار نہیں ہوتے تھے اس لئے ان پر ان حالات کا اثر پڑنا مشکل تھا۔ وہ خود اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو دُنیا پر حکومت کر رہا تھا جس نے اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر عوام کی بہتری کو پوری طرح نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ زندگی کو ایک خاص زاویہ نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا میدان محدود تھا۔ وہ ایک خاص طبقے کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے تھے۔ سیاسی، معاشی اور اقتصادی کشمکش کو انھوں نے گہری نظر سے دیکھا نہیں تھا۔ وہ اس فضا اور اس ماحول سے دور رہتے تھے۔ ادبی تخلیق اُن کے نزدیک الہام کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لئے وہ علم و عمل دونوں سے بے نیاز تھا۔ لیکن حالات بدلے، دُنیا نے ایک نئی کروٹ لی۔ زمانہ نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ انسانی سوچ اور تفکر نے ترقی کے نئے راستے دکھلائے۔ زندگی کے مسائل پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے گئے۔ کیونکہ فطری اصولوں پر کوئی نظام بنایا نہیں گیا تھا۔ ادیب نے سب سے پہلے یہ خیال کیا کہ ادبی تخلیق الہام نہیں بلکہ اس کی شعوری کوششوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ علم نے اس کی نظر میں وسعت، تخیل میں بلند پروازی اور سوچ میں گہرائی پیدا کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اپنے ماحول کا جائزہ گہری نظر سے لیا۔ اور اس کو وہ سراسر غلط، بے بنیاد اور انسانیت کیلئے تباہ کن نظر آیا۔ چنانچہ اس نے اپنی تخلیقات کے ذریعے ان حالات کو بدلنے کی کوشش کی۔ جاگیردارانہ

اب چونکہ خود ختم ہو گیا تھا اس لئے اس کو کہیں جائے پناہ ملنی مشکل تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے ماحول سے غیر مطمئن ہوا۔ اور اسی عدم اطمینانی نے اس کے اندر طبقاتی کشمکش کا بیج بو دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ نہ صرف عوام اپنے ماحول کا شکار ہونے کی وجہ سے زبوں حال ہیں بلکہ وہ خود بھی انہی میں کا ایک فرد ہے۔ اور اس وجہ سے سماجی انتشار اور پریشانی سے کسی حال میں بھی بچ نہیں سکتا۔ چنانچہ پریشانیاں اس پر پڑیں مصیبتیں اس نے اٹھائیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے ساری انسانیت کو مستقل اور مسلسل پامالی کا شکار ہوتے دیکھا۔ انھیں چیزوں کے احساس نے اور شعوری بیداری نے اس کو بالکل ایک نئی مخلوق بنا دیا۔ اس میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اس کو خود اپنی ذات کا احساس پیدا ہوا۔ ادب کی اہمیت کو اس نے جانا۔ زندگی کو اس نے پہچانا۔ بدلتی ہوئی دُنیا کا سارا نقشہ اسکی آنکھوں کے سامنے آیا۔ اس نے طبقاتی کشمکش کے روپ میں حیات و موت کی آویزش پائی۔ ہنگامے اپنی آنکھوں سے نہ صرف دیکھے بلکہ خود ان میں شریک ہوا۔ گھمسان کی لڑائیوں کا نہ صرف نظارہ کیا بلکہ خود سپاہی کی حیثیت سے میدان جنگ میں شرکت کی بموں کا شور، توپوں کی سنسناہٹ اور تلواروں کی چمک کے درمیان اس کی زندگی کے دن گذرنے لگے۔ اجتماعی شعور، جماعتی احساس اور ایک نئے نظام اقدار کی ترویج کے خیال نے اس کو ان تمام باتوں سے دلچسپی لینے کیلئے مجبور کیا۔ اس نے ان حالات سے چشم پوشی نہیں کی بلکہ وہ مردانہ وار آگے بڑھا۔ تاکہ یہ ہنگامے اسکی شعوری کوششوں سے جلد از جلد ختم ہو کر ایک نئی دنیا کو جگہ دیں۔ لینن نے کہا کہ ہم خاموشی کے ساتھ ان ہنگاموں کو پھیلتے اور بڑھتے ہوئے دیکھکر خاموشی اختیار نہیں کر سکتے۔ ہم ان تمام حالات میں ایک نظم و ضبط پیدا کریں تاکہ انسانیت کو فائدہ ہو۔ اور چونکہ انسانیت کے فائدہ کیلئے وہ صرف اشتراکی اصولوں ہی کو ضروری سمجھتا ہے۔ اس لئے اس نے صاف صاف کہا ہے کہ چاہے دوسرے کسی طرح کا بھی ادب پیش کریں لیکن جو انسانیت کا بہی خواہ ہے، جو عوام کے مفاد کا خیال رکھنا چاہتا ہے، جس کو یہ تمنا ہے کہ کسانوں اور مزدوروں کی حالت بہتر ہو کیونکہ انہی کے سہارے تہذیب زندہ رہتی ہے۔ تمدن میں چار چاند لگتے ہیں تو اس کے لئے ناگزیر ہے کہ اس انتشاری دور میں اپنی تخلیقات کو پوری طرح عوام کا ترجمان اور ان کے مسائل کا پرچارک بنائے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ خیال ادب کو پروپیگنڈے کا روپ دیدیتا ہے۔ لیکن اس کی نوعیت اس بھونڈے، غلط اور چھچھورے قسم کے پروپیگنڈے سے مختلف ہے جو ذاتی اور شخصی اغراض کے ماتحت کیا جاتا ہے۔ پروپیگنڈا کوئی ایسی چیز نہیں جس سے خواہ مخواہ بیر باندھ لیا جائے۔ پروپیگنڈا اچھا بھی ہو سکتا ہے۔ بُرا بھی! مفید بھی ہو سکتا ہے مضر بھی! صحتمند بھی ہو سکتا ہے غیر صحت مند بھی! اس لئے اگر اچھا، مفید اور صحت مند قسم کا پروپیگنڈا کیا جائے تو کوئی ایسی بُری بات نہیں اور پھر پروپیگنڈا تو انسان کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات میں ہوتا ہے۔ ذہن و دماغ سے نکلے ہوئے ہر خیال میں ہوتا ہے۔ جب بھی انسان کو کچھ کہنے کی تمنا ہوتی ہے۔ جب بھی وہ اپنا مقصد و مطلوب دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے اس وقت اسکی بات ایک پروپیگنڈا بن جاتی ہے۔ ادب میں بھی بہر حال کچھ کہا جاتا ہے۔ کوئی خیال اور کوئی نظریہ پیش کرنیکی کوشش کی جاتی ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ہر قسم کا ادب جس میں کوئی نہ کوئی بات کہی جائے۔ کوئی نہ کوئی نظریہ یا خیال پیش کیا جائے وہ پروپیگنڈا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ ہر دور اور ہر زمانے کا ادب اپنے اپنے وقت اور ماحول کی خصوصیات اور انداز تفکر کا ترجمان ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اپنے زمانے اور وقت کے خیالات و نظریات کا پروپیگنڈا ہوا۔ ایک زمانہ تک وہ ایک بورژوا تہذیب، ایک بورژوا نظام اور اس کے زیر اثر تشکیل پائے ہوئے مختلف حالات و واقعات کا پروپیگنڈا کرتا رہا۔ آج زمانہ نے ایک نئی کروٹ لی ہے۔ وقت کی ضروریات کچھ اور ہیں۔ خیالات و نظریات میں ایک انقلاب پیدا ہو چکا ہے۔ بورژوا نظام اور اس کی آغوش میں پرورش پائی ہوئی خصوصیات سے سماج کے افراد نفرت کرنے لگے ہیں۔ عوام کے مفاد کے خیال کا ہر طرف شہرہ ہے۔ زندگی ایک نئے راستہ پر گامزن ہے۔ اس لئے آج ادب میں پروپیگنڈے کی نوعیت بدل چکی ہے۔ افادیت کا تصور ایک نیا روپ اختیار کر چکا ہے۔ اور افادیت جس جگہ اور جہاں کہیں بھی ہوگی پروپیگنڈے کی صورت اختیار کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

البتہ ادب میں اس افادی پہلو کے ساتھ ساتھ

فن اور جمالیاتی نوموں سے چشم پوشی ناممکن ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ادب کو ادب ہی نہیں کہا جا سکتا۔ اور اس میں تاثر کی وہ کیفیت بھی پیدا نہیں ہو سکتی جس کو پیدا کرنے کیلئے ادب اپنی تخلیقات میں افادی پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ افادیت کے تاثر کو زیادہ گہرا اور زیادہ دیرپا بنانے کے لئے ادیب اپنے فن میں جمالیاتی پہلو کو لانے کے لئے مجبور ہے۔ کیونکہ وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ انسان کے اندر حُسن کا احساس بھی بالکل فطری ہے۔ روزمرہ کی استعمال کی چیزوں میں بھی جو صرف مادی اور جسمانی اعتبار سے اس کی راحت و آرام کا باعث بنتی ہیں۔ جب وہ حسن پیدا کرتا ہے تو پھر ادب میں جمالیاتی پہلو کے لانے سے کس طرح باز رہ سکتا ہے لیکن ادب کو صرف جمالیات تک محدود کر دینا نقش پرستی اور لایعنی سی بات ہے۔ جو سماجی زندگی کیلئے کسی طرح بھی مفید نہیں۔ کیونکہ بغیر کسی مقصد کے حُسن کاری سماجی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس کو بہرحال زندگی کے مختلف مسائل کو اپنے دامن میں سمونا چاہیئے۔ بے شک ہے کہ حُسن کی تخلیق بذات خود ایک اچھا فعل ہے۔ کیونکہ وہ بہرحال انسانوں کی دلچسپی اور ایک ذہنی سکون کا باعث بنتی ہے۔ لیکن ایسے حُسن کی تخلیق کو کوئی لیکر کیا کرے گا جس میں زندگی سے فرار ہو بنیادی مسائل سے چشم پوشی اور اہم باتوں سے شعوری طور پر بے نیازی برتی جائے۔ ایسی تخلیقات سماجی زندگی کے لئے مضر اور نقصان رساں ثابت ہوں گی۔ کیونکہ افراد کے ذہن تعیش کی فضا سے ہمکنار ہونے کے باعث مفلوج ہو جائیں گے۔

مضراب

زندگی ایک تلخ حقیقت ہے اور کبھی کبھی ایک خوابناک رومان۔

مضراب راجہ مہدی علی خاں کی ساٹھ طنزیہ اور رومانی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس طرز کی نظمیں آج تک اردو ادب میں نہیں لکھی گئیں اُردو شاعری میں ان نظموں سے جدید اضافہ ہوا ہے۔ دیباچہ میراجی نے لکھا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

مینیجر ساقی بک ڈپو۔ دہلی سے طلب فرمائیے

آغا شورش کاشمیری

رقیب سے!

مرے رقیب نہ کر مجھ سے نفرت پیہم
کہ تیرے قدموں پہ میں نے لٹا دیا عالم
جوانی اپنی کچل دی وفا کے ہاتھوں سے
رگِ حیات میں خود رکھ لیا ہے نشترِ غم
بس اک تسلسلِ محرومیِ دوام ہو کہیں
میں بے نیازِ کرم ہو کہیں بے نیازِ ستم!
ترے نصیب کو انعام دینے آیا ہوں
یہ ایک تحفۂ بے نام دینے آیا ہوں
مرے رقیب نہ کر مجھ سے نفرت پیہم
کہ تیرے قدموں پہ میں نے لٹا دیا عالم

مرے رقیب مبارک ہو تربتِ محبوب
کہ میں نے اسکو بہارِ چمن بنایا تھا
اسے زمانہ کی نیرنگیاں نہیں معلوم
کہ میں نے ایک ہی نغمہ اسے سنایا تھا
عدولِ حکمی گوارا نہ ہو سکے اس کو
کہ میں نے حکم پہ پہلے ہی سر جھکایا تھا
یہ آنسوؤں کے بھی معنی سے نابلد ہے ابھی
کہ میں نے صرف تبسم اسے سکھایا تھا
مرا یہ جرم نہ بخشا گیا کسی عنوان
کہ میں نے اسکی محبت کو آزمایا تھا

مرے رقیب مبارک ہو تربتِ محبوب
کہ میں نے اسکو بہارِ چمن بنایا تھا

قدرت اللہ شہاب

جلترنگ!

صبح سے اس کو دو بار نکسیر پھوٹ چکی تھی۔ حالانکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے نتھنوں میں گرم گرم ریت ڈال کر اندر سے جھلس دیا گیا ہو۔ سانس کی ہوا بھڑکتی ہوئی لالٹین کے دھوئیں کی طرح کثیف اور گھٹی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تنگ آ کر ناک کو رومال سے بند کر لیتا تھا۔ اور منہ کھول کر سانس لینے لگتا تھا۔ لیکن چند ہی لمحوں میں اس کا گلا خشک ہو کر سوکھے ہوئے پتے کی طرح چرچرانے لگتا تھا۔ وہ زور زور سے رو دینا چاہتا تھا لیکن رو نہ سکتا تھا۔ اب وہ سیانا ہو گیا تھا۔ اگلے سال میٹریکولیشن کے امتحان میں بیٹھنے والا تھا۔ محلّہ کی لڑکیاں جن کے ساتھ وہ مٹی کے گھروندے بنا کر کھیلا کرتا تھا اب اس کے سامنے جسم چُرا کر سمٹ جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ اب جمو پہلوان بھی اس کو اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھا کر روزنامہ "انقلاب" زور زور سے پڑھ کر سنانے کو کہا کرتا تھا۔

جمو پہلوان کے ساتھ چارپائی پر بیٹھنے کا اعزاز محلّہ میں بہت کم لوگوں کے حصّے میں آتا تھا۔ گلی کے نکّڑ پر اس کا تنور تھا جس کے ماتھے پر "خوش لذیذ ہوٹل از طرف جمال دین پہلوان خادمِ قوم" کا سائن بورڈ لٹکا رہتا تھا۔ ہوٹل میں ایک باورچی تھا اس کا نام تاج دین تھا۔ لیکن موقع و محل کے لحاظ سے جمو پہلوان اسے خانساماں، بٹلر، لونڈے، تاجو اور اُلّو کی دُم فاختہ کے مناسب القاب سے بُلایا کرتا تھا۔ خوش لذیذ ہوٹل کے عقب میں ایک بوسیدہ چھپّر تھا۔ جس کے نیچے بہت سی ٹیڑھی ترچھی چارپائیاں بچھی رہتی تھیں۔ شہر میں آئے ہوئے مقدمہ باز دیہاتیوں میں یہ جگہ بہت ہردلعزیز تھی۔ کیونکہ جمو پہلوان صرف بارہ آنے نقد کے عوض آٹھ پہر کھانے کیلئے گوشت اور چپاتی، سونے کیلئے ایک چارپائی بچھی چارپائی اور مقدمہ لڑنے کے لئے مشورہ مفت دیا کرتا تھا۔ ہاری ہوئی اپیلوں کیلئے وہ بڑی چابک دستی سے اپیل دائر کرنے کے ٹوٹکے، گرمیوں میں دہی کی لسّی، اور سردیوں میں چائے کے ساتھ تازہ پراٹھے تیار رکھتا تھا۔ جیتنے والوں کیلئے تاج دین مُرغ ذبح کر لیتا تھا۔

یا پلاؤ اور قورمے کے ساتھ شامی کباب بنا لیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ایسے موقعوں پر "خوش لذیذ ہوٹل" کے نرخ درجہ لذّت حد تک اونچے چڑھ جاتے تھے۔ لیکن اگر ڈوبتی ہوئی امیدوں کو تنکے کا سہارا ملے اور بلّیوں اچھلتے ہوئے دل کے سامنے عین موقع پر بُھنا ہوا مُرغ اور کرارے کرارے شامی کباب رکھ دیئے جائیں تو وکیلوں، مختاروں، اہلکاروں اور کلرکوں کی زد سے بچے ہوئے چند حقیر ٹکے یاروں کے یار جمو پہلوان کے ہوٹل میں خرچ کرنے میں بھلا کس کو اعتراض ہو سکتا تھا۔

ہوٹل کے سامنے سڑک پر ایک مضبوط چارپائی پڑی رہتی تھی۔ اس پر جمو پہلوان تکیہ لگا کر میر مجلس کی حیثیت سے بیٹھتا تھا۔ گاہکوں، ملاقاتیوں اور مسافروں کیلئے آس پاس لکڑی کے بنچ اور لوہے کی کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔ بیٹھے بٹھائے کئی بار پہلوان کو شک ہوتا تھا کہ شاید گوشت ٹھیک طرح بھونا نہیں گیا۔ شاید کبابوں میں مرچ زیادہ ہو۔ شاید قیمہ میں نمک کم ہو۔ اس لئے وہ گھڑی دو گھڑی کے بعد اپنے خانساماں، بٹلر یا لونڈے کو آواز دیکر گوشت کا بھرا ہوا پیالہ یا کبابوں کی پلیٹ منگوا کر چکھ لیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تاج دین صدائے احتجاج بلند کرتا تھا کہ "پہلوان ایک ہی دفعہ اطمینان سے کیوں نہیں کھا لیتے؟ اب ہوٹل کی بکری کیلئے خاک چیز بچے گی؟"

"ابے چل کہیں کا۔ اُلّو کی دُم فاختہ نہ ہو" پہلوان اپنے چوڑے چکلے سینے پر ہاتھ مارتا تھا "جان ہے تو جہان ہے۔ پیارے! تیرے باپ کی کمائی کھاتا ہوں سالے۔ آیا بڑا ہوٹل کا مالک . . . !"

مالک تو جو ہو سو ہو لیکن "خوش لذیذ ہوٹل" کو لذیذ رکھنا تاج دین کا فرض تھا۔ چنانچہ اس فرض کی انجام دہی کیلئے وہ بھی عموماً [illegible] میں بیٹھ کر سالن اور کبابوں کا کنکشن چکھ لیا کرتا تھا [illegible] ہوٹل کی باہمی فرض شناسی کا بار الٹا بیچارے مسافروں پر گرتا تھا۔ لیکن جمو پہلوان کا مرتبہ

بتاؤ اور حکیمانہ چٹخارے مانی کبھی کسی کو بزنس کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی کہ سالن میں بوٹیوں کی جگہ بڑے بڑے پیاز تیر رہے ہیں یا اور کباب ان میں قیمہ سے زیادہ بیسن کی ملاوٹ ہے۔

شام کے وقت خالد جب سکول کے کھیلوں سے لوٹتا تو جمو پہلوان اُسے آواز دیکر اپنی چارپائی پر بٹھا لیتا تھا "آؤ بابا خالد بابو۔۔۔ ارے او تاج دین ایک پلیٹ میں کٹی ہوئی مصالحہ دار بوٹیاں تو لا ذرا۔ دیکھتے نہیں بیٹا خالد تھکا ہوا آیا ہوا ہے" جب پہلوان اور خالد دونوں مل کر بوٹیوں کا خیارہ ختم کر لیتے تو "روزنامہ انقلاب" کا دور شروع ہوتا تھا۔ خالد فر فر اخبار سُناتا اور جمو پہلوان لیٹے ہی لیٹے خبروں پر تبصرہ جاری رکھتا۔ وہ تمہیداً ہر ایک سے نام پر چندہ اکٹھا کرنے کیلئے رضا کاروں کی ایک ٹولی کے ساتھ بمبئی، کلکتہ اور حیدرآباد کی طرف گھوما ہوا تھا۔ اس لئے وہ بین الاقوامی معاملات پر رائے زنی کرنا اپنا علمی حق سمجھتا تھا۔ جمو پہلوان کے ریویو میں دو چار چیزیں خاص طور پر نمایاں ہوتی تھیں۔ آگرہ کے مجمع میں چین کا بادشاہ۔ بمبئی کے پاس ہانگ کانگ کا ملک۔ انگریزی ولایت کے عقب میں طرابلس کا میدانِ جنگ۔ توپوں کے دہانوں کو ہاتھوں سے پھیر دینے والے جوان ترک۔ کلکتہ کے ہوٹلوں میں ننگی ناچنے والی میمیں۔۔۔

خالد کو عموماً اس بے تکی لاف زنی پر ہنسی آتی تھی لیکن وہ پہلوان کو ٹوکنا خلافِ مصلحت سمجھتا تھا۔ ایسا کرنے سے نہ صرف جمو پہلوان کی چارپائی پر بیٹھ کر مصالحہ دار بوٹیاں اُڑانے کا مزا کرکرا ہو جانے کا ڈر تھا بلکہ پہلوان کی نظر میں خالد کا علمی درجہ گر جانے کا بھی اندیشہ تھا۔ چنانچہ پہلوان کو ٹوکنے کی بجائے خالد اس کی بات کو کہیں مناسب طور پر لقمہ ہی دیا کرتا تھا۔ پہلوان خوش ہو کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا ۔۔۔ "شاباش بیٹا خالد بابو! خوب علم کما رہے ہو یار۔ جلدی جلدی کالج کر لو بیٹا۔ ڈپٹی کمشنر بن کے رہو گے۔۔۔ جی ہاں، جہاں دین خادمِ قوم کی بات پتھر پر لکیر ہوا ہاں"

ڈپٹی کمشنر کا نام سن کر مقدمہ باز مسافروں کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ دم بھر کے لئے حقہ پینا چھوڑ کر خالد کو ایک عجیب سی عقیدت مندی کے ساتھ دیکھنے لگتے تھے۔ اس وقت اُن کے دل میں سینے سے ارمان اٹھتے تھے۔ کہ کسی روز وہ اپنے بیٹوں کو شہر لا کر خالد سے ملا دیں۔ قسمت تو سب کی اپنے اپنے

بیٹوں یا پوتوں کی مقدمہ بازی میں کام آ جائے۔" بیٹا پوت، گھوڑے پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا" جمو پہلوان کہا کرتا تھا "کیوں نہ ہو اپنے باپ کا بیٹا ہے۔ شاباش میرے شیر جلدی جلدی کالج کر لو۔۔۔"

جمو پہلوان کے منہ سے اپنے باپ کا ذکر سن کے خالد کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بھی آگرے کے مجمع میں چین کے بادشاہ کی طرح کوئی فرضی ہستی ہے۔ اس نے اپنے ماں باپ کو دیکھا تک نہ تھا۔ وہ ابھی ڈیڑھ برس کا تھا۔ جب اس کے والدین ریل کے حادثہ میں کٹ کر مر گئے تھے۔ خالد کو اس کے ماموں نے اپنے زیر سایہ لے لیا تھا۔ ماموں تو تجارت کے لئے زیادہ عرصے باہر رہتے تھے۔ لیکن ممانی نے خاصی توجہ سے اس کو پالا تھا۔ وہ کسی حد تک اس کے ساتھ شفقت کا برتاؤ بھی کرتی تھی۔ البتہ جہاں معاملہ خالد اور عزیزہ کے درمیان ہو وہاں ممانی کا انصاف کھلم کھلا عزیزہ کا ساتھ دیتا تھا۔ عزیزہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ عمر میں خالد سے تین برس بڑی تھی۔ لیکن خالد مجبوراً اسے کندھے پر بٹھا کر بازار لے جایا کرتا تھا۔ عزیزہ غصے میں آکر اس کا منہ نوچ لیتی تھی، قلم توڑ دیتی تھی، کتاب پھاڑ دیتی تھی۔ اور اگر ممانی سے پٹتا تو غریب خالد۔ ایک روز وہ دونوں رضائی میں لیٹے ہوئے سبق یاد کر رہے تھے۔ کسی بات پر اُلجھ گئے۔ عزیزہ نے کھٹ سے اس کی گردن میں کاٹ کھایا۔ خالد کی قمیص خون سے لت پت ہو گئی۔ اور وہ شاید پہلا موقع تھا جب ممانی نے خالد کی وجہ سے عزیزہ کے منہ پر ایک زور کا تھپڑ مارا۔ خالد کی گردن پر بائیں طرف دانتوں کا ایک گہرا نشان اب تک نئے چاند کی طرح نمایاں تھا۔

شاید یہ بچپن کے دبے ہوئے نقوش تھے جن کی وجہ سے خالد کے دل میں اب تک عزیزہ کیلئے ایک نامعلوم سی بے اعتنائی شاید ڈر، شاید نفرت، شاید تینوں کا ملا جلا جذبہ باقی تھا۔ وہ عزیزہ کے ساتھ نہایت سرد مہری کا برتاؤ کرتا تھا۔ عزیزہ اس کے ساتھ ہنستی تھی، وہ کتاب کھول لیتا۔ عزیزہ اس سے پڑھنے آتی تھی۔ وہ سو جاتا تھا۔ عزیزہ اس کے ساتھ خوبصورت باتیں کرنے کی کوشش کرتی تھی، وہ رکھائی سے ٹال دیتا تھا۔ لیکن عزیزہ تیوری پر بل نہ لاتی تھی۔ وہ اس کے آرام کی چھوٹی چھوٹی باتوں

کے موٹے موٹے ٹکڑے ڈال دیتی تھی۔ اس کے کپڑوں پر استری کر دیتی تھی۔ کمرے کی چیزیں قرینے سے سجا رکھتی تھی۔ اگر خالد کے سر میں درد ہوتا تھا تو سر دبا دیتی تھی۔ اگر فٹ بال کھیلتے ہوئے اس کے پاؤں میں موچ آجاتی تھی تو اس کی رضائی میں بیٹھ کر گھنٹوں پاؤں دباتی رہتی تھی — ایک روز ممانی پڑوس کی شادی میں گئی ہوئی تھیں۔ خالد انفلوئنزا کے شدید بخار میں مبتلا پڑا تھا۔ اس کے انگ انگ میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ عزیزہ نے اس کا سر دبایا، بازو دبائے، کمر دبائی، گھٹنے دبائے، لیکن خالد کراہتا رہا۔ عزیزہ نے کہا "میں ایک ترکیب بتاؤں خالد۔ تم سیدھے لیٹ جاؤ میں تمہارے جسم پر ایک ساتھ دباؤ ڈالتی ہوں"۔ عزیزہ نے کمبل میں کھسک کر اپنے بھرپور جسم کا سارا گداز خالد پر ڈھیر کر دیا۔ خالد ریشم کے تانے بانے میں الجھ گیا۔ جال کی لڑیاں اس کے بدن میں پیوست ہوتی گئیں۔ عزیزہ نے لاکھ کہا کہ "میرے خالد ذرا ٹھہر جاؤ، تم ابھی ٹھیک ہو جاؤ گے"۔ لیکن وہ جھنجھلا کر اٹھا اور کمبل اوڑھ کر دوسرے پلنگ پر جا لیٹا۔

اگلے سال وہ میٹرک کا امتحان دینے والا تھا۔ اسکول میں گرمی کی چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ وہ صبح سویرے کتابیں لے کر کمپنی باغ چلا جاتا تھا، اور دوپہر تک آموں کی چھاؤں میں لیٹ کر پڑھتا رہتا تھا۔ اب وہ کئی روز سے کمپنی باغ نہ جا سکا تھا۔ کیونکہ دوپہر کے وقت اسے نکسیر آجاتی تھی۔ ممانی کا خیال تھا کہ گرمی کا غبار ہے، تھوڑا بہت نکل جائے تو اچھا ہے۔ تاہم احتیاط کے طور پر اس نے خالد کو گاجروں کی کلونجی بنا دی تھی۔ اور صبح و شام تازہ مکھن میں کالی مرچ اور کدو کے مغز ملا کر اُسے چٹا دیتی تھی۔ لیکن آج صبح سے اس کو دو بار نکسیر پھوٹ چکی تھی۔ خالد کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے نتھنوں میں گرم گرم ریت ڈال کر اندر سے جھُلس دیا ہو۔

اس نے بیزار ہو کر تولیہ کندھے پر ڈالا، اور غسل خانہ کی طرف چل دیا۔ شاید ٹھنڈے پانی کی بالٹی میں سر ڈبو کر اسے تسکین حاصل ہو۔ لیکن غسل خانہ کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اسے غصہ آیا۔ یہ کڑی دوپہر میں بھی کوئی نہانے کا وقت ہے بھلا! وہ غصہ سے بڑبڑاتا ہوا گھوما۔ اور گھومتے ہی یونہی نادانستہ طور پر اس نے کھڑکی کی ایک درز سے اندر کی طرف جھانکا۔ جھانکتے ہی اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ اور بجلی کی طرح تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر وہ ٹھہر ٹھہر کر رکا۔ ٹھٹکا، جھجکا اور چوروں کی طرح ادھر اُدھر ایک بار پھر جھانکا۔ گھوما۔ پھر اسے ہچکچایا۔ لیکن پھر جھانکا۔ اس بار اس کی آنکھیں درز کے ساتھ جم کے لگ گئیں۔ جیسے مقناطیس کے ساتھ لوہے کا ٹکڑا چمٹ جائے!

یہ عزیزہ تھی — وہ جگمگاتے ہوئے موتی کی طرح صدف سے باہر کھڑی تھی۔ یا شاید وہ بجلی کی ایک آوارہ لڑی تھی جو کالی گھٹاؤں کے دبیز پردوں سے باہر نکل آئی ہو۔ اس نے اپنے گھنے بالوں کی لٹوں کو کھولا۔ اور ہاتھی دانت کی چھوٹی سی کنگھی کو ان کے پیچ و خم میں الجھا کر دیر تک آنکھ مچولی کھیلتی رہی۔ پھر اس نے زلفوں کے ابر چھوڑ دئیے۔ بازو اٹھا کر دونوں ہاتھ جوڑے اور کمان کی طرح تن کر انگڑائی لی۔ خالد ڈرا کہ شاید زلزلہ آجائیگا۔ اور سنگ مرمر کے دو تاج محل گر کر چُور چُور ہو جائیں گے۔ آگرہ میں محبت کا ایک مرمریں خواب سویا ہوا ہے۔ آگرہ کے پچھم میں چین کا بادشاہ حکومت کرتا ہے۔ لیکن آگرہ کے اس طرف بھی تاج محل ہیں۔ برفیلی چوٹیوں کی طرح دمکتے ہوئے کوہستان۔ ہمالیہ کی چھاتی پر بنائے ہوئے بلوری مینار۔ عزیزہ نے دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹ کر بالٹی میں ڈال دئیے۔ پھر اس نے سر اٹھا کر گردن کو ذرا زور سے جھٹکا دیا۔ برسات کی کالی گھٹائیں بکھر کر چھا گئیں۔ بارش کی پھوار فضا میں جھلملانے لگی۔ ایک گستاخ قطرہ صبح کے ستارے کی طرح تاج محل کے کلس سے لٹک گیا۔ عزیزہ شرارت سے اس پر پھونکیں مارنے لگی۔ وہ جھولتا رہا۔ جیسے سفید گلاب پر چڑھے ہوئے شبنم کے موتی کو نسیم سحر جھولا جھُلا رہی ہو — اور جب وہ مجبور ہو کر ایک مچلتے ہوئے آنسو کی طرح گرنے لگا تو عزیزہ نے جھک کر اسے اپنے ہونٹوں کی گود میں دبوچ لیا — وہ نہا رہی تھی پانی کی لہریں پہاڑی چشموں کی طرح اپنا جلترنگ بجانے لگیں۔ تاج محل کے دامن میں جمنا کے سیمابی دھارے بہنے لگے۔ کوہساروں پر کہکشاں کا غبار سا چھا گیا۔ کائنات کی رگ رگ سے قوس قزح کے فوارے چھوٹنے لگے — یہ مچلتا ہوا سیلاب کہاں جا رہا ہے؟ اس طوفان کی شورش کو کس سمندر کی گود سنبھالے گی۔ خالد کی باہیں سانپ کی طرح بل کھا کر کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ لپٹ گئیں۔ پتھر کی دیوار میں ریشم ایسا لوچ آگیا وہ دمبدم دیوار کے سینے میں سمایا جا رہا تھا۔ شاید اگلے لمحہ وہ چھپاک سے اندر جا گریگا۔ گرتے گرتے اسکو ایک جھٹکا سا لگا۔ اسکی آنکھیں دم بھر کے لئے بند ہو گئیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ برفانی چوٹیوں کے ساتھ لپٹا ہوا لٹو کی طرح گھوم رہا ہے۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے سر کو جھٹکا دیکر آنکھیں کھولیں اور جلدی کر اپنی خشک ناک پر ٹٹولنے لگا۔ اسے شک ہوا کہ شاید نکسیر پھر بہنے لگی!

کرشن چندر

تاریخ ہند

(داخلی نقطۂ نگاہ سے)

ہندستان کی تاریخ بہت ہی پرانی ہے۔ اتنی پرانی ہے کہ جس دنوں مغربی اقوام جنگل سے لکڑیاں کاٹتی تھیں اور کنوؤں سے پانی بھرتی تھیں۔ ہم لکڑی کے بجائے اُپلے جلاتے تھے۔ اور صندل کا شربت پیتے تھے۔ چنانچہ یہ امر ہمارے لئے باعث فخر ہے کہ ہندستان کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اتنی پرانی کہ اس کے اکثر مقامات تو مرورِ زمانہ سے معدوم ہو چکے ہیں۔ اور جو باقی رہ گئے ہیں وہ اس قدر بوسیدہ، غلیظ اور گندے سڑے نظر آتے ہیں کہ ان کا مطالعہ کرنے کیلئے ہر طالب علم کو فنائل کی ایک بوتل اپنے ساتھ رکھنا پڑتی ہے۔ فنائل کے لئے ہندستان کی تاریخ کا مطالعہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ہندستان کی تاریخ بہت پرانی ہے۔

ہندستان کی تاریخ کے دو حصّے ہیں:۔

حصّہ اوّل:۔ دیمک چاٹ چکی ہے۔

حصّہ دوم:۔ جسے ابھی چاٹ رہی ہیں۔

حصّہ اول اور حصّہ دوم کے علاوہ ایک حصّہ سوم بھی ہے جسے پتھر اور دھات کا زمانہ کہتے ہیں۔ چونکہ یہ ہندستان کا سنہری زمانہ ہے اس لئے اسے شہد لگا کر چاٹا جاتا ہے۔

آج کا سبق اسی زمانہ سے شروع ہوتا ہے اس لئے سب طالب علم اپنی اپنی شہد کی بوتل کھول کر ڈیسک پر رکھ لیں۔

پتھر کا زمانہ

پتھر کے زمانہ میں دراوڑ لوگ ہندوستان میں رہتے تھے۔ یہ لوگ بڑے وحشی اور جاہل تھے اور ان کا رنگ کالا ہوتا تھا (آجکل سب ہندستانی پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور ان کا رنگ گورا ہوتا ہے) یہ لوگ پتھر کا استعمال بہت زیادہ کرتے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ پتھر کے مکانوں میں رہتے تھے۔ یا پتھر کے غاروں میں سوتے تھے کہ جس طرح آجکل انگلستان کے لوگ بمباری سے بچنے کیلئے چاک پہاڑیوں کی غاروں میں سوتے ہیں۔ پتھر کے ہتیار استعمال کرتے تھے۔ پتھر کی چھال اوڑھتے تھے۔ میرا مطلب ہے درخت کی چھال اوڑھتے تھے۔ اور پتھر کے زیور از قسم ہیرا، مرجان، لال، زمرد، نیلم وغیرہ پہنتے تھے۔ الغرض یہ لوگ بڑے وحشی تھے۔ حد تو یہ ہے کہ آگ بھی پتھر کے دو ٹکڑوں کو رگڑ کر پیدا کرتے تھے۔ دیاسلائی اور مسالے کی رگڑ سے آگ نہیں پیدا کر سکتے تھے۔ غیر مہذب تھے نا آخر!

دراوڑ لوگ پوجا بھی پتھروں کی کرتے تھے۔ اس لئے آریاؤں نے ہندستان پر حملہ کرنا مناسب سمجھا۔ تاکہ وہ دراوڑوں کو قدرت کی پوجا کرنا سکھائیں۔

آریاؤں کا زمانہ

ہدایت:۔ شہد کی بوتلیں بند کر لو۔ سنہری زمانہ ختم ہوا۔

آریہ لوگ صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے اور درۂ خیبر کی راہ سے ہندستان میں داخل ہوئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آریہ شمالی یا جنوبی ترکستان سے آئے۔ بعض ان کا ماخذ مشرقی یا مغربی ترکستان بتاتے ہیں۔ پروفیسر مسٹر براؤن کی تحقیق ہے کہ آریہ لوگ دراصل یورپی تھے۔ جو یورال کی پہاڑیوں کو طے کر کے سمرقند بخارا کے راستے ہندستان پہنچے۔ برخلاف اس کے الوالفتنہ لکھتا ہے کہ آریہ سامی النسل تھے اور غالباً عربوں کی اس شاخ سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے ماورائے فلسطین مار نطینی تہذیب کی بنیاد مستحکم کی۔ شری پنڈت راگھوچاریہ براہمنم کا خیال ہے کہ آریہ لوگ دیوتا تھے اور آکاش سے اترے تھے۔ بہرحال یہ آریہ لوگ آسمان سے پاریں سے کہیں سے بھی اترے ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ صرف درۂ خیبر کی راہ سے ہندستان میں داخل ہوئے۔

آریہ لوگ بڑے تہذیب یافتہ تھے اس لئے انھوں نے دراوڑوں کو بہت جلد شکست فاش دیدی۔ اور سارے ملک پر قابض ہو گئے۔ آریوں کی فتح کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:۔

ا۔ آریہ لوگ گورے رنگ کی نسل سے تعلق رکھتے تھے،

دراوڑ لوگ کالے تھے۔

۲۔ آریہ لوگوں کو ہندستان سے بڑی محبت تھی۔

۳۔ آریہ پتھروں کی پوجا کے بجائے قدرت کے مظاہر از قسم سورج، آگ، پانی، ہوا، گائے، بیل کی پوجا کرتے تھے۔ وہ پتھروں کو قدرت کے مظاہر میں شمار نہ کرتے تھے۔ اور خدا کی وحدت میں یقین رکھتے تھے۔

۴۔ انھوں نے اپنی عورتوں کو مردوں کے مساوی درجہ دے رکھا تھا۔ چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے ہندستان میں ستی کی رسم قائم کی۔ جو مرد اور عورت کی مکمل مساوات کی معراج ہے ستی کا مطلب یہ ہے کہ جب مرد مر جائے تو اسی وقت عورت کی موت بھی ہو جائے۔ مرد کی موت = عورت کی موت = مکمل مساوات۔ اسی لئے مؤرخ آریوں کے زمانہ کو ستی کا زمانہ بھی کہتے ہیں۔

۵۔ آریہ لوگ ایک بہتر نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ دراوڑ نیٹو تھے۔ یعنی ہندستان کے اصلی باشندے یعنی راکشش۔

۶۔ آریہ لوگوں کے راجہ اور سردار ہوتے تھے جو سبھاؤں کی مدد سے راج کرتے تھے۔ اگر راج سبھا کسی بات پر راجہ کے خلاف ہو جاتی تو راجہ اس وقت بے چون وچرا سبھا کے سامنے اپنا سر جھکا لیتا۔ اور بعد میں سبھا کو معطل کر کے یا اس کے اراکین کو قتل کر کے من مانی کارروائی کرتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آریہ لوگ بڑے جمہوریت پسند تھے۔ اور دراوڑوں کی طرح بیوقوف نہ تھے جو ہمیشہ اپنے سردار کا کہا مانتے تھے۔

آریوں نے ہندستان پر آٹھ ہزار سال تک راج کیا پھر ہندوؤں نے انھیں شکستِ فاش دیدی۔

ہندوؤں کا زمانہ

ہندو لوگ دریائے گنگا اور برہمپتر کے منبع پر رہتے تھے۔ اور جھیل مانسرودر میں تیرتے تھے۔ یہ لوگ ذات کے برہمن تھے ماتھے پر تلک لگاتے تھے۔ دھوتی پہنتے تھے۔ گیان دھیان کی باتیں کرتے تھے۔ اور ماش کی دال کھاتے تھے۔ یہ لوگ آریاؤں کی طرح جنگ جو نہ تھے بلکہ ہمیشہ فلسفہ بگھارا کرتے تھے۔ اور ہاتھوں کے بجائے دماغ سے کام لیتے تھے۔

جب برہمنوں نے ہندستان پر حملہ کیا تو انھوں نے صوبہ سرحد کے قریب بیٹھ کر ہون کیا۔ اور مقدس اگنی سے چار جنگجو پیدا کئے اور انھیں راجپوت کا خطاب دیا۔ پھر یہ لوگ اپنے بہادروں کو لیکر ہندستان میں داخل ہوئے۔ (درۂ خیبر کی راہ سے) اور دیکھتے دیکھتے سارے ملک میں چھا گئے۔ ہندوؤں کے زمانہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانہ میں راجپوت تخت پر بیٹھتے تھے اور برہمن راج کرتے تھے۔ ان برہمنوں میں منو، چانکیہ اور شنکر اچاریہ بہت مشہور ہیں۔

بکرماجیت

ہندوؤں کا سب سے پہلا راجہ بکرماجیت تھا۔ اس نے ہندوؤں کا سمت ایجاد کیا اور بمبئی میں بکرماجیت کمیٹی بنائی جو آج تک وہاں کام کر رہی ہے۔

بکرماجیت بڑا انصاف پسند بادشاہ تھا۔ کہتے ہیں، اگر ایک بیوقوف گڈریا بھی اس کے تخت پر بیٹھ جاتا تو بکرماجیت کی طرح انصاف کرنے لگتا۔ اس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ انصاف بکرماجیت کے دماغ میں نہیں اس کے تخت میں تھا۔ یہ تخت آجکل انگریزوں کے قبضے میں ہے اور لندن کے عجائب گھر میں بند ہے۔

بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ بکرماجیت اس کا اصل نام نہ تھا۔ بکرماجیت دراصل راجہ ہرش تھا یا راجہ بھوج جس کا نام اکثر گنگو تیلی کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ کچھ بھی ہو۔ بکرماجیت کے ماخذ کا آج تک پتہ نہیں چلا۔ ماسوا اس کے کہ وہ ہندوؤں کا پہلا راجہ ہے۔

بکرماجیت نے ہندستان میں اپنے عدل و انصاف کا وہ ڈنکا بجایا کہ اس کے تین سو سال بعد تک ہندستان کی تاریخ کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

اشوک اعظم

اب راجہ اشوک کا زمانہ آتا ہے۔ اسے اشوک اعظم بھی کہتے ہیں۔ اشوک بڑا امن پسند بادشاہ تھا۔ اس نے اپنی عمر میں صرف ایک لڑائی لڑی۔ کالنگا کی لڑائی۔ اس لڑائی میں تین لاکھ آدمی جان سے مارے گئے۔ اور پندرہ لاکھ زخمی ہوئے۔ اشوک کو انسانوں سے بڑی محبت تھی۔ اس کے علاوہ اشوک کسی ذی حس کو دکھ دینا پسند نہ کرتا تھا۔ کہتے ہیں اس نے اپنی عمر کے آخری حصے میں اپنے بیٹے کنال کی آنکھیں نکلوا ڈالی تھیں۔ اشوک بدھ مت کا پیرو تھا اس نے ہندستان میں مختلف جگہوں پر بدھ مت کے اقوال کندہ کرائے۔

نئی دلّی میں اس نے ایک سڑک اشوکا روڈ تعمیر کرائی۔ اس کے علاوہ اشوک کی لاٹھ بھی۔ اس لاٹھ پر لکھا ہے "جب تک یہ لاٹھ موجود ہے اشوک کی حکومت ہندستان میں رہے گی"۔ بس اس اعتبار سے ہندستان میں آج بھی اشوک کی حکومت ہے۔

لیکن اشوک کی زندگی کا خوب ترین مشغلہ کتبے تیار کرنا تھا۔ وہ آئے دن پتھروں پر خوبصورت کتبے تحریر کرتا رہتا تھا۔ اس سے مؤرخین نے اندازہ لگایا ہے کہ اشوک اعظم تخت پر بیٹھنے سے پہلے کسی اردو پریس میں سنگسار تھا۔ واللہ اعلم!

اشوک کے بعد اس کا بیٹا مندھوسار تخت پر بیٹھا۔ اور ایسا بیٹھا کہ اس کے دو سو سال بعد تک ہندی تاریخ کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ فائل چیر کنے سے بھی کوئی واقعہ نہیں ہوتا۔ اس کے بعد چندرگپت موریا کا راج آتا ہے۔

چندرگپت موریا

چندرگپت موریا بڑا ظالم بادشاہ تھا۔ اس نے مگدھ کے نندا خاندان کو شکست (فاش) دیکر تخت حاصل کیا۔

اس نے یونانیوں کو بھی شکست فاش دی (جو درۂ خیبر کی راہ سے ہندستان آئے تھے)

اس نے سکندر اعظم کے جرنل سلوکس کی ملیچھ لڑکی سے بیاہ کیا یہ بیاہ ہندوؤں کے رسم ورواج کے خلاف تھا۔ چنانچہ اس پر چندرگپت موریا کو ذات برادری سے خارج کر دیا گیا۔

چندرگپت کا باپ کون تھا؟ اس کے ماخذ کا کچھ پتہ نہیں چلتا البتہ اس کی ماں کا نام موریا تھا۔ اور یہی اس خاندان کی وجہ تسمیہ ہے چندرگپت کا گرو چانکیہ تھا جس نے پہلی بار دنیا کو بتایا کہ سیاست یعنی راج نیتی دھوکہ کا دوسرا نام ہے۔ چانکیہ ذات کا برہمن تھا اور اس کی راج نیتی دنیا کی عظیم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

چندرگپت موریا کے بعد ہندستان میں کوئی عظیم ہندو بادشاہ نہیں ہوا۔ چھوٹے چھوٹے بادشاہ البتہ بہتیرے ہیں۔ مثال کے طور پر راجہ ہرش، بھوج، شالباہن، کنشک، یہ سب معمولی بادشاہ تھے۔ اور ان میں مذہبی رواداری بہت تھی۔ جس کی وجہ سے ہندوؤں کا شیرازۂ حکومت بہت جلد بکھر گیا۔ مختصر طور پر بیان کرتا ہوں۔

۱۔ راجہ ہرش علم دوست راجہ تھا۔ اس کے دربار میں دربار اکبری کی طرح نورتن تھے۔ راجہ ہرش نے "شکنتلا" ناٹک لکھا جسے آجکل [illegible]

کالی داس سے منسوب کیا جاتا ہے۔ دراصل کالی داس راجہ ہرش کا ہی ادبی نام ہے۔ جس طرح مرزا اسداللہ کا ادبی نام "میرزا نجی" ہے۔

۲۔ راجہ بھوج نے بھوج پتروں پر سیکڑوں کتابیں لکھیں۔ لیکن اس کی شہرت اس کی کتابوں کی وجہ سے نہیں اس کے دوست گنگو تیلی کی وجہ سے ہے جس طرح ہمایوں کی شہرت سقّہ بادشاہ اور امان اللہ کی شہرت بچہ سقہ پر مبنی ہے۔

۳۔ شالباہن سیالکوٹ میں راج کرتا تھا اور پورن بھگت کا باپ تھا جو بعد میں یوکلپٹس میں ملازم ہوا۔

۴۔ کنشک۔ بدھ مت کا حامی تھا اور پشاور میں رہتا تھا۔ اس لئے اس کی حکومت کا بہت جلد خاتمہ ہو گیا۔

ہندوؤں کے زمانہ میں سکندر کا حملہ ہوا۔ جو ایک مشہور و معروف تاریخی واقعہ ہے۔ اس لئے اس کے ماخذ، وجہ تسمیہ اور اسباب بھی بیان کرنا ضروری ہیں:۔

سکندر کا حملہ

ہندستان پر سکندر کے حملے کے بہت سے اسباب تھے۔

۱۔ وہ سکندر اعظم تھا۔

۲۔ وہ اپنے باپ سے لڑ کر گھر سے نکلا تھا۔

۳۔ وہ پورس والئی سندھ کو اپنا دست بنانا چاہتا تھا۔

۴۔ اسے ایک دفعہ دیوجانس کلبی نے جھڑک دیا تھا۔

۵۔ اُسے ہندستان سے محبت تھی۔

چنانچہ جب سکندر جسے سکندر اعظم بھی کہتے ہیں ہندستان میں داخل ہوا (درّہ خیبر کے راستے) تو ہر جگہ اس کا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ پورس نے اس کا شاہانہ استقبال کیا، پھر ملتان میں اس کا شاہانہ استقبال ہوا۔ پھر ستلج پر اس کا وہ شاہانہ استقبال ہوا کہ اس کی فوج آدھی سے کم ہو گئی۔ جب وہ دریائے بیاس کے کنارے پہنچا تو اس کے سپاہی اس شاہانہ استقبال سے اس قدر پریشان ہو گئے کہ انھوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ سکندر اعظم بصد انداز تغزّ ہندستان سے واپس چلا گیا۔ اس لئے اسے "فاتح ہندستان" کہتے ہیں۔ سکندر جب ہندستان سے لوٹا تو اس کے کئی جہاز بیش قیمت کپڑوں اور زر وجواہر سے بھرے ہوئے تھے۔ لیکن جب وہ لوٹتے ہوئے فارس میں مر گیا تو اس کے دونوں ہاتھ خالی کفن سے نکلے۔

سکندر کے حملہ کے بعد ہندستان کی حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور اس کی مذہبی رواداری بڑھتی گئی۔ آخر میں ہر ہندوستانی گاؤں میں ایک ایک حکومت قائم ہوئی۔ ہر گھر میں تین چولھے بنائے گئے۔ اچھوتوں کو سڑکوں پر چلنے اور مغرور برہمنوں پر اپنی پرچھائیں ڈالنے سے بھی منع کر دیا گیا۔ اور برہمن لوگوں کے علاوہ باقی تمام رعایا کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا گیا۔ تاکہ وہ وید منتر نہ سن سکیں۔

اس صورت حال کا خاتمہ کرنے کیلئے، اور ہندوستان میں اخوت و مساوات پھیلانے کیلئے مسلمانوں نے ہندستان پر حملہ کیا اور ہندوؤں کو شکست فاش دی۔

مسلمانوں کا زمانہ

مسلمانوں کا زمانہ سبکتگین کے خواب سے شروع ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ایک دفعہ سبکتگین نے شکار کھیلتے کھیلتے ایک حاملہ ہرنی کی جان بچائی تھی۔ اسی رات کو وہ ہرنی سبکتگین کو خواب میں نظر آئی اور اس سے کہا کہ تو بادشاہ ہوگا۔ اور اگر تو ہندستان پر حملہ کریگا تو فتح یاب ہوگا اور ہندستان پر حکومت کرے گا۔ اس خواب کے بعد سبکتگین نے ہندستان پر حملہ کر دیا۔

پہلے پہل ہندوؤں نے جی توڑ کر ملیچھوں کا مقابلہ کیا۔ راجہ جے پال جو پنجابی تھا اور اس لئے بڑا بہادر تھا کئی بار سبکتگین کے خلاف لڑا۔ لیکن چونکہ سبکتگین کو ایک ہرنی کی مدد حاصل تھی، اس لئے اس نے راجہ جے پال کو شکست فاش دی۔ حتیٰ کہ راجہ جے پال خودکشی کر کے مر گیا۔

لیکن اس پر بھی ہندوؤں نے آس نہیں چھوڑی۔ چنانچہ سومنات مندر نے محمود غزنوی پر سولہ بار چڑھائی کر کے اس کے ایسے دانت کھٹے کئے کہ محمود غزنوی کو پھر کبھی ہندستان کا رخ کرنے کا حوصلہ نہ پڑا۔ اور وہیں غزنی میں ایاز کی محبت میں گھل گھل کر مر گیا۔ اس پر بھی ایاز تخت پر نہ بیٹھا۔ بلکہ غلام کا غلام ہی رہا۔ ایاز کے اس شاندار ایثار کو دیکھتے ہوئے ہندستانیوں نے خاندان غلامان قائم کیا کیونکہ ہندستان کو شروع ہی سے غلامی سے محبت رہی ہے۔

ہندوؤں کا آخری راجہ پرتھوی راج چوہان تھا اور پہلا غدار جے چند والی قنوج۔ موخرالذکر ہندستان میں غداروں کے اس عظیم الشان غیر مختتم سلسلے کا بانی ہے جو ابھی تک پروان چڑھ رہا ہے۔

مسلمانوں نے فتح پا کر ہندوؤں کے راج کی جگہ اپنی حکومت قائم کی اور اخوت و مساوات کا وہ درس دیا کہ ان کے عہد حکومت میں شاہ و گدا اور امیر و غریب کا فرق بالکل مٹ گیا۔ اور محمود آباد (راجہ آف) اور ایاز (خاکسار بستی ضلع لکھنؤ) ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک مساوات کا ڈنکا بجایا۔ ان کی فتح کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ مسلمان درہ خیبر کی راہ سے آئے تھے۔

۲۔ وہ ہندستان کے نیٹیو نہ تھے۔ بلکہ ایک بہتر نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

۳۔ وہ ہندوؤں کی طرح صرف سبزی پر قناعت نہ کرتے تھے بلکہ گوشت بھی کھاتے تھے اور گائے کا گوشت بھی۔

۴۔ وہ بڑے تہذیب یافتہ لوگ تھے۔ جس طرح دراوڑوں سے آریہ، اور آریاؤں سے ہندو زیادہ تہذیب یافتہ قوم تھے۔

۵۔ انھیں ایک ہرنی کی حمایت حاصل تھی (بحوالہ سبکتگین کا خواب) بخلاف اس کے ہندوؤں کو ایک ہرنی کی حمایت تو کجا ایک چڑیا کا سہارا بھی نہ تھا۔

مسلمانوں کے زمانہ میں بھی دو حصے کئے جا سکتے ہیں حصہ اول یعنی خاندانوں کا زمانہ اور حصہ دوم یعنی مغلوں کا زمانہ۔

مسلمانوں کے حصہ اول یعنی خاندانوں کے زمانہ میں یہ خاندان بہت مشہور رہیں۔ خاندان غلامان کہ اب تک چلا آتا ہے۔ خلجی خاندان تغلق خاندان، لودھی خاندان، خاندان سادات۔ اور شیر شاہ سوری کو نسلم ہے اس لئے بجائے خود ایک خاندان ہے۔ ان خاندانوں میں ہمیشہ لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اور کبھی ایک خاندان اور کبھی دوسرا خاندان برسر اقتدار آجاتا تھا۔ اس زمانہ میں رعایا کا کیا حال تھا۔ لگان، کاشتکاری، صنعت و حرفت کے کیا مسائل تھے۔ مجوزہ تاریخ ہند اس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ قائل چھڑکنے سے بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ان خاندانوں کے مشہور بادشاہ یہ ہیں:۔

۱۔ قطب الدین ایبک۔ ایک گمنام غلام تھا جسے قطب مینار نے مشہور کیا۔ ورنہ اس بادشاہ میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ بس پولو کھیلتے کھیلتے مر گیا۔

۲۔ علاؤ الدین خلجی۔ یہ بڑا علم دوست، ادب نواز بادشاہ تھا۔ "قصہ پدمنی" اسی کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ہندوستانی افسانہ نگاروں کا پہلا طبع زاد افسانہ ہے جو کسی مغربی شاہکار کا ترجمہ نہیں سمجھا گیا۔ تمام شیخے بنلا ... [illegible] ... کام

بلونت سنگھ

چکوری

نزہت گھر میں اکیلی بیٹھی جرابیں بُن رہی تھی۔ ابّا دفتر گئے ہوئے تھے۔ پروفیسر عبداللہ کے ہاں کوئی موت ہو گئی تھی۔ امی کو وہاں جانا پڑا۔ چھوٹا بھائی اور بہن اسکول میں تھے۔ صرف ان کا بارہ سالہ نوکر عمر دو صحن میں بیٹھا دیگچی مانجھ رہا تھا۔ مٹر اور قیمہ تھالی میں رکھے تھے۔ امی سالن تیار کرنے کیلئے کہہ گئی تھیں۔ نزہت نے کئی مرتبہ اٹھنے کا تہیہ کیا۔ لیکن نہ اٹھی۔ آج اس کا دل بس یہی چاہتا تھا کہ جرابیں بُنے جائے۔

انھیں سرکاری مکان ملا ہوا تھا۔ مکان کے ارد گرد چند گز زمین باغ کیلئے چھوڑ دی گئی تھی۔ مکان میں ایک ہی قطب رہائش چار پانچ افراد رہ سکتے تھے۔ دو برامدے تھے ایک باہر کی طرف جہاں سرکنڈوں کی بنی ہوئی بڑی بڑی چقیں پڑی رہتی تھیں۔ ایک برامدہ اندر کی جانب تھا جس کے دونوں سروں پر غسل خانہ اور ایک چھوٹا سا اسٹور بنا ہوا تھا۔ اچھا خاصا صحن تھا جس کے پہلے کونے پر باورچی خانہ وغیرہ۔

ابا یوں تو بڑے خوش مزاج اور البیلی طبیعت کے شخص تھے لیکن انھیں باغ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ باغ ویران پڑا تھا۔ سبزہ بلا کانٹ چھانٹ نہ ہونے کی وجہ سے بے تحاشہ بڑھی اور الجھی ہوئی داڑھی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ بیچ کی چوڑی روش کے دونوں کناروں پر بھی قطاروں میں گڑی ہوئی آڑی اینٹیں بھی ادھر اُدھر گری پڑی تھیں۔ زمین پر جو زرد زرد سوکھی گھاس بہت بھدی معلوم ہوتی تھی۔ وہ چھوٹا سا چوکور تالاب جو آبپاری کے لئے سرکار کی طرف سے بنایا گیا تھا خشک پڑا تھا۔ اس میں تین چار مینڈک نہ معلوم کس طرح گر پڑے۔ کہیں بچوں نے دیکھ پائے۔ ڈھیلے مار مار کر بیچاروں کو شہید کر ڈالا۔ اب تک وہ ڈھیلے اسی طرح بے ترتیب پڑے تھے۔ اور وہ مینڈک اُپلوں کی طرح خشک ہو گئے تھے۔

سردی رخصت ہو رہی تھی۔ موسم گرما کی آمد آمد تھی لیکن صبح کے وقت ہوا خنک ہی ہوتی تھی البتہ دوپہر کو حدت محسوس ہونے لگتی تھی۔ اس لئے دن کا وہ حصہ تو یونہی کھٹ سیدھی کرتے اور کروٹیں بدلتے ہی گذر جاتا تھا۔ البتہ صبح کے وقت جبکہ سب لوگ باہر چلے جاتے تھے اور موسم بھی خوشگوار ہوتا تھا۔ کام کرنے میں دل لگ جاتا تھا۔ اس کی انگلیوں میں سلائیاں تیزی سے ادھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ وہ اپنے ہاتھوں سے لگائے چنبیلی کے چند پودوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پچھلی شام کو ان پر چند کلیاں موجود تھیں آج کھول کھل گئے تھے۔ وہ سوچتی تھی کہ نہ معلوم کتنے پھول ہیں۔ پودے ذرا دور تھے۔ اس لئے وہ پھولوں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہ لگا سکتی تھی۔ اتنے میں تقریباً ایک فرلانگ پرے پکی سڑک سے ایک تانگہ اِدھر کو گھوما۔ اور گرد اُڑاتا ہوا کٹھل کے تین درختوں کے قریب سے ہوتا ہوا بڑھا۔ اس جگہ لاریوں، کاروں اور تانگوں کی ایسی ریل پیل نہ تھی۔ یہ سرکاری جگہ تھی۔ بلا ضرورت کوئی تانگہ اس طرف کا رُخ نہ کر سکتا تھا۔ تانگہ اسی صورت میں نظر آتا تھا جب کسی کو کہیں جانا ہو یا کسی کا کوئی رشتہ دار ملنے کیلئے چلا آئے۔ یہاں سبھی لوگ پردیسی تھے۔ بھلا بغیر کسی خاص ضرورت کے کسی کے رشتہ دار کو کیا پڑی کہ اپنا کام چھوڑ چھاڑ کر اتنی دور ملنے کیلئے چلا آئے...

نزہت پہلے تو برآمدے کی اٹھی ہوئی چق میں سے تانگہ کی طرف دیکھتی رہی لیکن جب تانگہ چقوں کی اوٹ میں آ گیا تو وہ پھر جرابوں پر جھک گئی۔ البتہ اس کے کانوں میں گھوڑے کی ٹاپوں اور تانگے کی کھچا کھچ کی آوازیں آتی رہیں۔ اور پھر دفعتہً تانگہ رُک گیا وہ چونک پڑی۔.... ان کے ہاں تو کوئی آنے والا نہیں تھا لیکن تانگہ یقیناً انہی کے دروازے پر آن کر رُکا تھا۔... اگرچہ وہ جس دروازے کے قریب بیٹھی ہوئی تھی اس پر چق پڑی ہوئی تھی۔ تاہم اس نے احتیاط سے اپنا سر ڈھانپ لیا۔ اور پیڑھی کھسکا کر قدرے پیچھے ہٹالی۔ پھر کان دھر کر سننے لگی..... پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر برامدے کے فرش پر سامان رکھنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد لمحہ بھر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر تانگہ والے کی بیٹھی ہوئی آواز سنائی دی "سلام صاب!"

نزہت نے دروازے کے پٹ بھیڑنے شروع کئے۔ ابھی وہ دروازہ پورے طور پر بند بھی نہ کرنے پائی تھی کہ لوٹوں کی چُرمُر کا شور بہت قریب سے سُنائی دیا۔ اور وہ بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔ کیا کسی اجنبی نے اسے دیکھ پایا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ لرزتے ہوئے سینے پر رکھ لیا۔ اس کی سانس نسبتاً تیز تیز چلنے لگی۔ اس کی بڑی بڑی شربتی آنکھیں پھیل کر اور بھی بڑی ہو گئیں۔ اس کے نچلے ہونٹ کا ذرا سا حصہ اس کے دانتوں تلے دب گیا۔ لیکن نہیں اجنبی نے اسے ہرگز نہ دیکھ پایا ہوگا۔

"خاں صاحب! ... خاں صاحب!!"

آواز سے اجنبی نوعمر ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آواز بھرائی نہ تھی۔ نہ اس کی آواز میں پختگی اور بھاری پن ہی پیدا ہوا تھا۔ .. نزہت کونے میں چُپ چاپ دبکی کھڑی رہی۔ وہ جواب نہ دے سکتی تھی۔ اجنبی کی آواز بھی اس قدر مدھم تھی کہ صحن میں بیٹھے ہوئے نوکر کے کانوں تک بھی نہ پہنچ سکتی تھی۔ شاید وہ یہ سمجھا ہو کہ کمرے میں کوئی نہ کوئی تو ضرور ہوگا۔ دروازہ ابھی کچھ کھلا ہوا تھا۔ دروازہ کے آگے چق ہی سہی۔ لیکن۔ لیکن۔ اجنبی آگے سے ہٹے تو وہ صحن میں جاکر نوکر کو باہر بھیجے۔ اجنبی مدھم سُروں میں آوازیں دیتا ہی چلا گیا۔ نزہت بھی بے جان بُت بنی کھڑی رہی۔ پھر قدرے سکوت کے بعد بوٹوں کی چرمر کی آواز پرے ہٹنے لگی۔ اس نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔ اور پھر پنجوں کے بل لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی نوکر کے قریب پہنچی۔ اور ہانپتی ہوئی کانپتی آواز میں کہنے لگی۔

"عمرو، عمرو!"

عمرو باہر گیا، پھر اندر آیا۔ پھر باہر بھیجا گیا۔ پھر جواب لیکر اندر آیا۔ اس طرح پانچ سات منٹ اسی ہیر پھیری میں گذر گئے۔ لیکن عمرو اس قدر احمق لڑکا تھا کہ اس کی باتوں سے نزہت کے پلے کچھ بھی نہ پڑا۔ بس یہی معلوم ہو سکا کہ نووارد آپا کے کسی دوست کا لڑکا ہے۔ نزہت بیچاری عجب مخمصے میں گرفتار تھی۔ آپا کا ڈر کہ کہیں ڈانٹیں کہ اندر کیوں نہ بٹھلایا۔ اور پھر اس نے اخباروں میں یہ بھی پڑھا تھا کہ کس طرح بعض دھوکے باز ٹھگ مہمان بن کر لوگوں کے گھروں میں پہنچ جاتے ہیں ـــ ہار کر اس نے اسے کونے والے کمرے میں جسے گھر کی بیٹھک کہنا چاہیے مہمان کو بٹھلایا۔ اور اس کا سامان، ایک بستر، ایک سوٹ کیس اور ایک بیگ ـــ اندر منگوا لیا۔ اور پھر گھر کے بیچ دروازے سے اندر سے بند کر کے باورچی خانہ میں عمرو کے پاس جا بیٹھی۔

"ارے عمرو! کون ہوگا بھلا؟ تم نے کبھی پہلے بھی دیکھا ہے اسے؟"

تھوڑی دیر بعد امی آگئیں۔ وہ دونوں باورچی خانہ میں دبکے بیٹھے تھے۔ انھوں نے مہمان سے پانی تک کیلئے نہ پوچھا تھا۔ امی کو یہ سب باتیں معلوم ہوئیں تو انھوں نے فوراً عمرو کو مہمان کے پاس بھیجا۔

امی کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ نوجوان مہمان آپا کے کسی دوست کا لڑکا تھا۔ اور اس جگہ امتحان دینے کیلئے آیا تھا۔

عمرو نے واپس آکر زور زور سے چلاتے ہوئے کہا "جی وہ پانی مانگتے ہیں۔ لوٹا مانگتے ہیں۔ تولیہ مانگتے ہیں"

امی ہاتھ جھٹکا کر بولیں "کلموہے چلاتا کیوں ہے۔ دیکھ تو کھڑا ہانپ رہا ہے۔ . . ."

پھر امی نے نزہت کو ٹرنک میں سے دھوبی کا دھلا ہوا تولیہ نکالنے کے لئے بھیجا۔ وہ آنچل سنبھالتی ہوئی پڑھی پھُرتی سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چل دی۔ اس کے پیچھے پیچھے عمرو ناک سرسراتا ہوا لپکا چلا جا رہا تھا۔ اندر والے کمرے میں پہنچ کر نزہت نے مٹھائی کا بڑا بکس کھولنے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ عمرو بولا "انھوں نے کہا تھا میرے ٹرنک میں سے نکال کر دو"

"انھوں نے کس نے؟ امی نے!"

"جی نہیں" عمرو نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے خاصی بلند آواز میں کہا "انھوں نے ...... وہ .... جو آئے ہوئے ہیں ...."

نزہت اس کی اس قدر بلند آواز سن کر لرز گئی۔ چپت مارنے کے انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی "تجھ سے آہستہ نہیں بولا جاتا کیا؟"

عمرو اپنے ہونٹوں پر خود ہی انگلی رکھ کر خاموش ہو گیا۔ نزہت دل ہی دل میں سٹ رہی تھی "بیوقوف عمرو۔ مردود کیسا گلا پھاڑ کر چلاتا ہے"

چمڑے کا سوٹ کیس ابھی تک پلنگ پر جوں کا توں دھرا تھا۔ کمرے کے باقی جانے پہچانے سامان میں یہ چاکلیٹ رنگ کا سوٹ کیس بالکل اجنبی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے دونوں کونوں پر قلعی کئے ہوئے لوہے کے ٹکڑے چمک رہے تھے۔ ... وہ آگے بڑھی۔ سوٹ کیس کے لمس سے اس کی انگلیوں میں ایک ہلکی سی تھرتھراہٹ

کی رَوسی دوڑ گئی۔ اس نے اس کے بٹن پر انگوٹھا رکھ کر دبایا لیکن اسے اپنی جگہ سے جنبش نہ ہوئی۔ اس نے اور زور سے دبایا۔ پھر بھی وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اسی کش مکش میں اس کے سیدے دو بٹن کھسک گیا لیکن وہ مُنہ سے کھولنے پر تُلی ہوئی تھی۔ بٹن زور سے دبانے کی وجہ سے اس کا انگوٹھا پیچھے کی جانب گھوم گیا۔ اور اس کے پوروں پر گہرے سُرخ رنگ کی لکیریں نمایاں طور پر دکھائی دینے لگیں۔ اور پھر دفعتہً انگوٹھا ہٹا اور کنڈا اپنا شکنجے سے کھل کر اس کے ہاتھ سے ٹکرایا اور وہ ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ... عمرو کی تیلیسی نکل آئی۔

نوکر تولیہ لیکر چلا گیا۔ اور وہ کھلے ہوئے سوٹ کیس ہی کے قریب کھڑی رہی۔ سوٹ کیس میں سے فنائل کی گولیوں اور خوشبودار تیل کی ملی جُلی بو آرہی تھی۔ کپڑے لتے کھلے کھٹسائے نظر آرہے تھے تین چار رنگ برنگ کی فوٹل ٹائیاں، ایک کونے میں چار پانچ کالر، سفید رومالوں کی تہیں خراب ہوگئی تھیں۔ فونٹن پن، لوٹ بک اور چند رنگین لفافے بکھرے پڑے تھے۔

شام کو جب آپا گھر آئے تو مہمان سے بڑے تپاک سے ملے اور اندر آکر پوچھتے رہے کہ کہیں اس کی خاطر داری میں کوئی کسر تو نہیں اٹھا رکھی۔ ان دونوں کی عمر میں تفاوت بھی ہوا تو کیا وہ چھوٹے چھوٹے بچوں تک میں ہل مل جاتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد بچے بھی اسکول سے واپس آگئے۔ خوب ہنگامہ رہا۔ مہمان کی آمد سے گھر میں خوب چہل پہل ہو رہی تھی — رات کیلئے دو قسم کا گوشت سبزی اور دال وغیرہ کا حکم ملا۔ مردانہ میں سے آپا کے قہقہوں اور بچوں کے چہچہوں کی صدائیں آرہی تھیں ... تھوڑی دیر بعد نوسالہ توفیق بھاگتا ہوا اندر آیا۔ "امی — امی ہم نمائش دیکھنے کیلئے جائیں گے۔ خوشی بھی چلے گی۔ آپا کہتے ہیں کپڑے پہن کر آؤ تمہیں ممتاز بھیا کے ساتھ نمائش میں لے چلیں۔ ... امی بس جلدی کیجئے، بہت جلدی"

امی نے توفیق کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے نزہت سے کہا کہ بچوں کو کپڑے پہنا دے۔ نزہت آنچل سنبھالتی ہوئی اندر چلی گئی — پیچھے پیچھے چیختے چلاتے بچے۔

نزہت نے کپڑے ٹرنکوں میں سے نکالے۔

"بچے اُنپ رہے تھے، اُن کے گال تمتما رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ممتاز بھیا سے ان کی کافی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ ممتاز بھیا کی یہ بات، ممتاز بھیا کی وہ بات ... !" "اور پھر آپا! ... آپ جانتی ہیں ممتاز بھیا کیسے بیٹھتے ہیں ؟" یہ کہہ کر وہ اسٹول پر ٹانگ پہ ٹانگ اور ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر بڑے دلکش انداز سے بیٹھ گیا۔ اور مسکرانے لگا ... نزہت اسے کنکھیوں سے دیکھتی رہی ... اور پھر ... "آپا آپ کو معلوم ہے کہ ممتاز بھیا ..."

رات کے ساڑھے دس بجے کے قریب وہ لوگ نمائش گاہ سے واپس آئے۔ بچے چیختے چلاتے گاتے ہنستے اور رنگدار غبارے اڑاتے ہوئے صحن میں داخل ہوئے۔ بیچاری خوشی کچھ تھک سی گئی تھی۔ اچھا تو ہماری ننھی خوشی کیا شے خرید کر لائی ہے ایک گڑیا۔ جتنی بڑی وہ خود ہے اتنی ہی بڑی اس کی گڑیا! اور یہ کیا؟ خوشی بیٹا، یہ کیا ہے؟ خوشی پھونک مارتی ہے اور کاغذ میں لپٹا ہوا سانپ سیٹی کی سی آواز نکالتا ہوا دفعتہً امی کی ناک چھو لیتا ہے خوشی کی نیند کی ماتی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔ لیکن ... تھوڑی ہی دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔ باقی لوگ بھی کھانا وانا کھا کر رفتہ رفتہ سو جاتے ہیں۔ نزہت کھڑکی کے قریب اپنے بستر پر لیٹی ہے ... موسم بیحد خوشگوار ہے۔ تارے دُھلے ہوئے موتیوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں اُٹھا جا رہا ہے۔

صبح !!

بچے اسکول جانے کے لئے تیار ہونے لگے۔ گھر کے پچھواڑے ان کی اُجڑی ہوئی بگیا میں ٹماٹر کے چند پودے اُگے ہوئے تھے۔ ان کی ٹہنیوں سے چند ٹماٹر توڑے گئے۔ بچوں کو آلو ٹماٹر دینے تھے۔ اور پھر اس کے بعد "ممتاز بھیا" کے لئے کیا چیز پکے گی؟ یہ معلوم نہیں انھیں کونسی چیز مرغوب ہے۔ ان سے کون پوچھے! نزہت خود یہ بات عمرو سے کہنا مناسب نہ سمجھتی تھی۔ اور امی کو اس بات کا خیال ہی نہ آسکتا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ نومبر کے مہینے میں اس نے گوبھی بکھائی تھی شاید وہ رکھی ہو۔ اس خیال سے وہ اٹھی۔ جب وہ صحن سے گذر کر برامدے میں پہونچی تو عمرو مردانے سے سرپٹ بھاگتا ہوا نکلا اور اس سے ٹکرا گیا۔ ہکلا ہکلا کر بولا "آپا جی! غضب کیا ہوتا ہے۔ جی وہ جو آئے ہیں وہ کہتے ... کہتے ...!"

"مجھے ٹوتھ پیسٹ چاہئے۔ میرے بیگ میں ..."

مردانہ سے یہ آواز سن کر نزہت دم بخود رہ گئی۔ پہلے

وہ اُلٹے پاؤں دوڑنے لگی۔ اور پھر وہ کمرے کی طرف . . . لیکن امّی کہاں ہیں؟ . . . اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کسی نے دیکھا تو نہیں۔ . . . بڑی مشکل سے جا کر اس نے بیگ میں سے ٹوتھ پیسٹ اور برش نکال لو کر سے جان چھڑائی۔ اور خود جلدی سے باورچی خانہ میں چلی آئی۔

امّی سر جھکائے بیسن کی تریاں چھیل رہی تھیں۔ نزہت کے کان ابھی تک بج رہے تھے۔ . . . مجھے ٹوتھ پیسٹ چاہیئے۔ اس کے جسم میں سنسنی خیز لہریں دوڑ رہی تھیں۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا اس کے کانوں میں آواز کی بازگشت مدھم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کے کانوں میں نہایت میٹھا اور رسیلا ترنم سا گونجتا رہ گیا۔

وہ آواز اسے دن میں کئی مرتبہ سنائی دیتی تھی۔ مختلف لہجوں اور لوچ کے ساتھ۔ کبھی بلند قہقہے، کبھی دبی دبی ہنسی — گھومتے پھرتے آشنا آوازوں میں اس کے کانوں کو یہ آواز بھلی معلوم ہوتی تھی۔ وہ صرف آواز ہی سن کر کئی طرح کے تصورات باندھتی تھی۔ ہر تصور دلفریب ہوتا تھا۔ اسے سنتے رہنے کی دبی دبی سی تمنا اس کے دل میں کروٹیں لیا کرتی۔ چوری چھپے مردانہ میں جھانکنے کی اُسے جرأت ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ بلکہ اس کے دل میں اس کا خیال تک نہ آیا تھا۔ . لیکن کوئی نازک سا رشتہ اس خیال سے پیدا ہو گیا تھا۔

جب وہ اِدھر اُدھر کے کاموں میں مصروف ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتی تو زیرِ لب وہ کچھ گنگنایا کرتی۔ اس نے کبھی کوئی کام کا گیت یا شعر یاد نہ کیا تھا۔ لیکن دل میں سے کوئی گیت بن کر اس کے لبوں تک آتا تھا۔ لیکن اس قدر مبہم اور دھندلا تاثر الفاظ میں نہ ڈھلتا تھا۔ ان جانی اور ان سنی دھن میں صرف ایک گنگناہٹ سی پیدا ہو کر رہ جاتی تھی۔

شام کے وقت جب ان کے باورچی خانہ کی ٹین کی چادروں والی چھت سورج کی روشنی میں جگمگا اٹھتی تھی۔ تو اس وقت صحن کی دیوار کے ساتھ باہر کی جانب وہ سب لوگ مل کر بیڈمنٹن کھیلا کرتے تھے۔ نزہت سوکھے ہوئے کپڑوں کو رسیوں سے اتار اتار کر ان کی تہیں بٹھاتی تو اس کی نگاہیں دیوار کے اوپر اٹھ جاتیں۔ جہاں ریکٹ ایک لمحہ کیلئے گھومتے ہوئے نظر آتے اور پھر گم ہو جاتے۔ کھلاڑیوں کے پاؤں تلے سے گرد اُٹھ کر ہوا میں منڈلانے لگتی۔ اور نزہت سوچنے لگتی۔ اسی گرد میں وہ گرد بھی مل گئی ہو گی جو . . . بچوں کے شور مچانے اور تالیاں بجانے کی آوازیں سنائی دیتیں "آہا . . . اب ممتاز بھیا کی سروس ہے . . . اب ممتاز بھیّا . . . ممتاز بھیّا" اور کبھی "چڑیا" اُچھل کر صحن میں آن گرتی۔ اور اگر کوئی آس پاس موجود نہ ہوتا تو وہ "چڑیا" کو اٹھا لیتی۔ اور پھر عجیب الجھن میں گرفتار ہو جاتی کہ اسے باہر پھینکے یا نہ پھینکے . . . .

کبھی زینت صحن کے ایک کونے میں باورچی خانہ کے سائے تلے بیٹھی انگلیوں کے ناخن ہموار کیا کرتی۔ عمرو چولھا لیپنے کے لئے مٹی گوندھنے میں مگن ہوتا۔ اور امی اسے ہدایتیں کرتیں۔ مردانے سے آواز آتی "عمرو! . . . عمرو!!" وہ اس آواز کو ہزاروں آوازوں میں سے پہچان سکتی تھی۔ لیکن عمرو بے خبری کے عالم میں ناچ ناچ کر پاؤں سے مٹی گوندھے جاتا۔ امی لاپرواہی سے ہاتھ سے پاؤں کو مل مل کر میل کی بتیاں بناتیں اور پھر انھیں جھاڑ دیتیں۔ کیا مجال جو ان کے کان پر جوں بھی رینگ جاتے نزہت دل ہی دل میں کڑھتی . . . .

ایک روز ممتاز بھیّا کا کوئی امتحان نہیں تھا شاید۔ گھر ہی پر بیٹھے رہے بالکل چپ چاپ۔ نزہت کچھ گھبرائی اور کچھ لجائی ہوئی۔ کچھ سہمی ہوئی اور کچھ لڑکھڑاتی ہوئی اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ جب وہ باورچی خانہ سے اندر کی طرف یا اندر سے باورچی خانہ کی جانب جانے کے لئے مردانہ کے قریب سے ہو کر گذرتی تو اس کا دل اچھلنے لگتا۔ لیکن مردانہ میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ کوئی آواز، پاؤں کی چاپ، کاغذوں کی کھسر پھسر، گیت کی گنگناہٹ، سیٹی یا کچھ — کچھ بھی نہیں — . . . عمرو مردانے کی طرف جاتا تھا۔ اور لوٹ آتا تھا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ پھوٹتا تھا . . . . . . پھر کوئی کس قدر مطمئن نظر آتا تھا۔

جب دوپہر کے وقت امی سو گئیں . . . . تو نزہت نے اندر باہر کے کئی چکر لگائے۔ اور کووں کی کائیں کائیں سنتی رہی۔ . . . . اس نے صبح سے غسل ہی نہ کیا تھا۔ وہ بڑے آئینہ کے سامنے بیٹھ گئی۔ ہفتہ بھر سے اُسے بال تک دھونے کی فرصت نہ ملی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ بال دھو ہی ڈالے۔ . . . چوٹی کھول کر وہ آئینے میں اپنے بالوں کو دیکھنے لگی —

یہ بال کیسے ہیں؟ بڑے [illegible] اچھے [illegible] بہت اچھے ہیں۔ [illegible] اگر بالوں کی [illegible] اس [illegible] یا ایک۔ لطف جون کی [illegible] اور [illegible] تو؟ اس نے [illegible] اس کی نیتیں کے سب بٹن کھلے ہوئے تھے۔ [illegible] تو گریبان کا کچھ حصہ بھی اوپر [illegible] گیا۔ [illegible] کو دیکھے ہی اتنی سو رہی تھیں۔ عمرو گھر [illegible] [illegible] دور تک [illegible]

پھر وہ غسل خانہ میں نہانے کے لئے گئی۔ وہ چُپ تھی۔ کچھ مطمئن تھی، کچھ خوش تھی۔ کچھ بے چین سی تھی۔ غسل خانہ کی دیوار کا پلستر ادھر ادھر سے اکھڑ گیا تھا اور پانی کے چھینٹوں سے عجیب عجیب صورتیں بن گئی تھیں۔ جن پریاں، جنگل، پہاڑ، دریا، جھیلیں سبھی کچھ بنا ہوا تھا۔ وہ دیر تک ان نقوش کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے پہلے کبھی ان کی طرف دھیان ہی نہ دیا تھا۔ لیکن اب جوں جوں وہ غور کرتی ان سے ڈھیٹ خطوط کی نئی سے نئی صورتیں بنتی چلی جاتی تھیں۔ ٹھنڈ کی کے قریب جس جگہ صابن دانی پڑی رہتی تھی صابن کی جھاگ بہہ جانے سے طویل لکیریں ایسے دکھائی دیتی تھیں جیسے سفیدے کے درخت تنے کھڑے ہوں۔ وہ کچھ دیر ان کی طرف دیکھتی رہی۔ . . .

پھر اُس نے قمیص اتار [illegible] کے [illegible] سے لٹکے ہوئے تھے۔ ان میں سے [illegible] ابھر [illegible] کا پیٹر نظر آرہا تھا۔ ان میں سے دو تو بالکل پک گئے تھے۔ گول، گول، چکنے، باہر سے سخت اندر سے نرم۔ ان کا رنگ بھی کیسا دلکش تھا۔ کم از کم یہ دونوں تو اس قابل تھے کہ انہیں توڑ لیا جاتا۔ پیڑ کے بڑے بڑے پتے ہل رہے تھے۔ جب پتے لرز کر ادھر اُدھر ہو جاتے تو دھوپ کھڑکی کے باریک رنگ کے شیشوں میں سے گزر کر اندر داخل ہوتی۔ اور اس کے خوش وضع سفیدی مائل گندمی رنگ کے شانے پر جھلملانے لگتی۔ اس نے جسم کی جلد کا رنگ نارنجی رنگ میں گھل مل کر نیا روپ دھار لیتا تھا۔

مسافر کے امتحانات ختم ہو گئے۔

آخری پرچہ دیکھتے ہی اس نے واپس جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اس کے آبا نے ہدایت کر دی تھی کہ امتحانات ختم ہوتے ہی واپس چلے آنا۔ اس کی جو چھوٹی بڑی چیزیں

گھر کے اندر پڑی رہ گئی تھی وہ عمرو ایک ایک کر کے مردانہ میں لے گیا۔ اس کا تولیہ، کوئی کپڑا، اور بال یا تائی یا پینا — ہر چیز عمرو بڑی بے خبری سے اٹھائے لئے جا رہا تھا۔ اس وقت وہ چھوٹے میاں نہ نادر خاں یا چنگیز خاں بنا ہوا تھا۔ پھر اُسے تانگہ لانے کے لئے بھیجا گیا۔ اس دوران میں آبا کے بے باک مسرت انگیز اور بلند قہقہے سنائی دیتے رہے۔ تانگہ آنے پر اس میں سامان رکھا گیا اور پھر تانگہ چرخ چوں کر کے چلا اور گلمل کے درختوں کے قریب سے گزرتا ہوا پکی سڑک کی طرف گھوم گیا۔

اور نر ہت . . . .

ساقی بُک ڈپو کی مطبوعات

چالے سمتیر سنگھ نرولا کے بارہ افسانوں کا مجموعہ۔ نرولا جزئیات نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتے وہ ایک ماہر سائنٹسٹ کی طرح باریک سے باریک اور خفیف سے خفیف جزئیات کا تجزیہ کرتے چلے جاتے۔ مجلد قیمت عہ

جزیرے مشہور افسانہ نگار محمد حسن عسکری ایم۔ اے کے آٹھ افسانوں کا مجموعہ۔ عسکری صاحب نے اردو افسانہ نگاری میں ایک جدید و لذیذ طرز بیان کا اضافہ کیا ہے۔ ان کا تخیل بے باک اور طریقہ اظہار بے لاگ ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل افسانے شامل ہیں۔ کالج سے گھر تک۔ پھسلن۔ حرام جادی۔ میلا دشریف۔ چائے کی پیالی۔ اندھیرے کے پیچھے۔ ایک معمولی خط۔ وہ تین۔ کتاب مجلد اور رنگین سرورق سے آراستہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

سائے شیر محمد اختر کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ۔ اختر کے افسانے زندگی کی تصویر ہوتے ہیں۔ طرز بیان نہایت دلکش اور کہانی نہایت موثر ہوتی ہے۔ قیمت عمر

ملنے کا پتہ :-

ساقی بُک ڈپو۔ دھلی

فراق گورکھپوری

جمالِ یار

سر بسر سوز و ساز کا عالم
تیرا نظارہ راز کا عالم

بل پہ بل کھائے جیسے قوسِ قزح
تیرے قدِ دراز کا عالم

رنگ امواجِ رقصِ صبحِ بہار
روپ، لو دیتے ساز کا عالم

عنبریں زلف میں سمٹ آیا
مہکی راتوں کے راز کا عالم

مد میں ڈوبی لقائے رنگیں میں
یہ گنسر کے جو از کا عالم

نرم دوشیزگی نگاہوں کی
ایک مانوس راز کا عالم

مد میں ڈوبی فضائے نیم شبی
چشمِ عشوہ طراز کا عالم

پچھلی شب کو وہ جسم سرتاسر
آہوئے نیم باز کا عالم

خم بہ خم گیسوئے مسلسل میں
شبِ افسانہ ساز کا عالم

ان نگاہوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں
گل ستاروں کے راز کا عالم

مسکراہٹ کے نیم شعلوں میں
مثلِ شبنم گداز کا عالم

کیف انگیز مست اداؤں میں
دستِ پیمانہ ساز کا عالم

جسمِ رعنا تمام راز و نیاز
سربسر ساز باز کا عالم

ناز و انداز کے شگوفوں میں
نرگسِ فتنہ ساز کا عالم

چشمکِ برقِ حسنِ کافر میں
نگہِ پاکباز کا عالم

قدِ رعنا میں گم نکلتا ہے
تیری زلفِ دراز کا عالم

میرے نغموں کی نرم لے میں دیکھ
جنبشِ پائے ناز کا عالم

ہم نے دیکھا ہے نرم اداؤں میں
نگہِ دل نواز کا عالم

سربسر سوز و سازِ پنہاں میں
شیشۂ مینا گداز کا عالم

پیچ در پیچ گیسوئے شب تاب
تیری عمرِ دراز کا عالم

کیف و کم ہیں گلابی آنکھوں کے
بادۂ خانہ ساز کا عالم

ڈھونڈھتا ہوں نظامِ ہستی میں
تیرے راز و نیاز کا عالم

گاہ گاہ اس لقائے رعنا میں
ایک قلبِ گداز کا عالم

ہم نے دیکھا ہے دیر تک کھو کے
غم کی عمرِ دراز کا عالم

نگہِ شوخ کے سبھاؤ نہ پوچھ
لبے چلے رنگ ناز کا عالم

میرے اشعار کے کناؤں میں
حسن کے نیم ناز کا عالم

ایک عالم ہے خلوتِ شب میں
انکشافاتِ راز کا عالم

تیری آواز نور کا تڑکا
نرم آہنگ ساز کا عالم

ان نگاہوں میں گاہ گاہ فراق
جیسے عرضِ نیاز کا عالم

نشور واحدی

زندگی خواب کے اوہام نہیں میرے لئے

لوگ کہتے ہیں کہ ہے زیست بھی اک عالمِ خواب
اور اک غنچۂ نورس کا تبسم ہے شباب
تشنگی اور سراب
دست بازیِ خزاں شعبدۂ فصلِ بہار
اس گلستاں کا ہر اک پھول جراحت کی پکار
ہر نشہ اپنا اُتار!
میں یہ کہتا ہوں کہ دُنیا کی کہانی پہ نہ جا
خوں رگوں میں ہے تو صہبا کی روانی پہ نہ جا
ذوقِ فانی پہ نہ جا
عشق کا چہرہ بدستور سفید اور سیاہ
سو گیا حشر مگر جاگ رہا ہے یہ گناہ
دل ہمہ چشم و نگاہ
زندگی خواب کے اوہام نہیں میرے لئے

دیکھتا ہوں میں پسِ پردۂ دیبا و حریر
حُسن کی خندہ جبینی میں شقاوت کی لکیر
زر خرید ایک تبسم کی طرب خیز بہار
عشوۂ ہوش شکار
تنگ میرے لئے جلووں کی بھی آغوش نہیں
میں کسی ہونٹ کی صہبا سے بھی مدہوش نہیں
جادوئے نرگسِ بیمار سے خاموش نہیں
غم فراموش نہیں

قحطِ بنگال مری چشمِ جہاں بیں میں ہے بند
اور سسکتی ہوئی لاشیں جو جواں میر ہیں چند
اُن کی بالیں پہ ہوں اک کاسۂ بے آب لئے
حسرتِ ناب لئے!!
غم کی کھڑکی میں سے جھانکوں مجھے یہ وقت کہاں
اور جلووں کی فضا دامنِ احساس کشاں
توڑ سکتا ہوں میں یہ زینتِ گلشن کا در و بام
رفعتِ انساں کا مقام!
آج تہذیب کی بنیاد ہے ساماں طلبی
مقصدِ زیست نہیں پھر بھی یہی ناں طلبی
کارواں دل کا دھڑکتا ہوا جاتا ہے کہیں
کوئی منزل ہو وہیں
بے محبت نہیں ممکن یہ جہنم کا عذاب
نغمۂ جوش سے خاموش ہے جنت کا رباب
لذتِ خونِ جگر ہستیٔ ایجاد کا راز
خاک کی عمر دراز!
زندگی خواب کے اوہام نہیں میرے لئے

لوگ کہتے ہیں کہ ہے زیست بھی اک عالمِ خواب
اور اک غنچۂ نورس کا تبسم ہے شباب!!

انصار ناصری

سنسکرت ناٹک اور اُس کے کردار

بعض قدامت پسند بزرگوں کا کہنا ہے کہ جب سے ہمارے ملک میں انگریزی تعلیم رائج ہوئی ہے ہم نے اپنے ملک کی ہر چیز سے نفرت کرنی شروع کر دی۔ ممکن ہے کہ ان کی اس رائے میں مبالغہ کے ساتھ ساتھ حق ناحق کی بدگمانی بھی شامل ہو جس پر آپ کا جی چاہے تو ان کی جتنی اڑا دیجئے۔ لیکن یہ بات دل کو لگتی معلوم ہوتی ہے کہ جب انگریزی حکومت کے قائم ہونے کے ساتھ ہی مغربی اور مشرقی تہذیبیں ٹکرائیں تو مشرقی تمدن کا تمام جام چکنا چور ہو گیا۔ مگر انگریزیت نے ہمارے ہوش و حواس پر تسلط جما لیا۔ یوں تو حاکم کے سکھلائے ہوئے ہر سبق پر آمنا و صدقنا کہنا محکوم کیلئے ہر حال میں ناگزیر ہے ہی پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئی نویلی تہذیب کی چمک دمک نے کچھ ایسا جادو پیدا کیا کہ ہم اپنی ہر چیز اور ہر فعل کو انہی کی آنکھ سے دیکھنے اور ہر بات کو انہی کی طرح سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ رفتہ رفتہ یہ شوق ایسا لاحق ہوا کہ روزمرّہ کی زندگی میں بھی بغیر انگریزی کے نوالہ توڑنا محال ہو گیا۔ یہ نہیں کہ اس طرح ترے گھاٹے ہی میں رہے۔ فائدہ ہوا اور بہتیرا ہوا۔ پر اس کا کیا علاج کہ اپنی بہت سی انمول چیزوں کو جو مغربی عینک سے کچھ بونگی بیڈھنگی سی نظر آئیں دھڑا دھڑ طاقِ نسیاں پر سجاتے رہے۔ اور پھر ہمیشہ کیلئے ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ ہمارے بہت سے بیش بہا فن اسی لے فکری کی نذر ہو گئے۔ جن کا کھوج آج ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ ہاں اگر کبھی ہماری کسی گری پڑی چیز کی جھوٹے منہ تعریف ہو گئی تو ہم بھی اس کی طرف بغلیں بجا بجا کر لپکے اور اپنی خوبیٔ قسمت پر ناز کرنے لگے۔ عمر خیام بیچارے کو زندگی بھر اور اس کے بعد بھی کسی نے دو کوڑی کو نہ پوچھا۔ پر جیسے ہی اس کی نظموں کا انگریزی ترجمہ مغربی کسوٹی پر پورا اترا، اور دو ایک مغربی ادیبوں نے پورے دل سے اس کی تعریف کر دی ہم بھی اس کے جائز وارث بن بیٹھے اور لگے تعریفوں پر تعریفیں کرنے۔ یہی حال ٹیگور کا ہوا۔ مگر شکر ہے کہ ان کی زندگی میں ہی ان کے انگریزی قدردان پیدا ہو گئے۔ جن کی وساطت سے ہم بھی انہیں پہچاننے لگے ورنہ وہ بھی اپنی طرح کے سیکڑوں بدنصیب پیشروؤں کے ساتھ آج تک بن بوجھی پہیلی ہی بنے رہتے۔

کچھ ایسی ہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جب ۱۷۸۹ء میں سر ولیم جونس نے کالی داس کے ناٹک "شکنتلا" کا انگریزی میں ٹوٹا پھوٹا ترجمہ کیا تو مغربی دُنیا میں ہلچل سی مچ گئی۔ اور انھیں یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ "ہیں! سنسکرت زبان میں بھی ڈرامے ہوتے ہیں"۔ سر ولیم جونس نے سنسکرت زبان کا جلدی ہی آدھا کچا اور آدھا پکا جیسا کچھ بھی اوندھا سیدھا علم حاصل کیا تھا اُسی کے سہارے انھوں نے شکنتلا کا ترجمہ کر ڈالا۔ یوں بھی شاعری کا ترجمہ کرنا قریب قریب ناممکن ہے اور پھر کالی داس کی شاعری کا۔ اس لئے یہ کیسے امید کی جا سکتی تھی کہ ان کا ترجمہ، ترجمہ کہلانے کے لائق بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس ٹوٹے پھوٹے ترجمے کو دیکھ کر یورپ کے اکثر ادیب مچل گئے۔ اور جب جرمنی کے سب سے بڑے شاعر گوئٹے نے اس کی تعریف کر دی تو اس کی مقبولیت میں اور بھی چار چاند لگ گئے۔ یہاں گوئٹے کی رائے کا انگریزی ترجمہ دلچسپی کیلئے نقل کرتا ہوں۔

Wouldst thou the young year's blos-
-soms and the fruits of its decline,
And all by which the soul is charmed,
enraptured, fed,
Wouldst thou the earth and Heaven
itself in one sole name combine,
I name thee O, Shakuntala: and all
at once is said.

"کیا آپ بہار کی نوشگفتہ کلیوں اور خزاں کے
پکے ہوئے پھلوں کے خواہاں ہیں۔ کیا آپ کسی
ایک ہستی میں دُنیا جہان کی ایسی نعمتیں چاہتے
ہیں جن سے رُوح وجد میں آئے اور اُسے
فرحت اور بالیدگی نصیب ہو تو سنئے میں "شکنتلا"
کا نام لیتا ہوں جس میں یہ ساری خوبیاں موجود ہیں"

گوئٹے کی ان سطروں نے سنسکرت ڈرامے کے مطالعہ کو ترقی دینے میں بڑا کام کیا۔ سچ پوچھیے تو ادبی دنیا میں سنسکرت ڈرامہ کا بھرم ہی گوئٹے کی اس رائے سے قائم ہوا۔ اس کے بعد سنسکرت ڈرامے کو مطالعہ کا شوق ابھرنے لگا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ آج ہم ہندوستانیوں میں بھی اُن کی طرف جو ذرا سا شغف نظر آتا ہے۔ وہ بھی سر ولیم جونس اور گوئٹے کی بدولت ہے تو اسے مبالغہ نہ سمجھیے۔

(اسی کے، بھاؤکھی اور بھی چند ناٹکوں کے انگریزی ترجمے ہونے شروع ہوئے۔ جن میں، اُچ شودرک کا مرچھ کٹیک خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آرتھر سائمن نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا پھر جرمنی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ لندن، برلن اور میونخ میں یہ ڈرامہ کئی بار اسٹیج ہو چکا ہے۔)

لفظ حسرات کی توجہ کے باوجود سنسکرت ڈرامے کو جو اہمیت اور مقبولیت حاصل ہونی چاہیے تھی وہ نہ ہو سکی۔ سب پڑھنے والے گوئٹے نہ تھے۔ جو انگریزی یا دوسری زبانوں کے ترجموں سے اصل کی خوبیوں کا اندازہ لگا سکتے۔ اس کے علاوہ انگریزی کا مذاق جو ہمارے رگ و ریشے میں رچا ہوا ہے اس نے سنسکرت ڈرامہ کی اصل خوبیاں سمجھنے میں اُن سے لطف اندوز ہونے میں رکاوٹ ڈالی۔ کسی ملک کے ادب یا فن کو دوسرے ملک کے ادب و فن کے معیار اور اصولوں پر پرکھنا بے انصافی ہے۔ اور سنسکرت ڈراموں کے ساتھ جان بوجھ کر یہ بے انصافی روا رکھنے کا سبب ہماری وہی "انگریزیت" کی لے ہی ہے جو بُری طرح لاحق ہے۔

اس معاملہ میں ایک طالب علم کو جن مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان میں سب سے بڑی یہ ہے کہ اور زبانوں کو چھوڑ خود سنسکرت زبان میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں ہے جس سے سلسلہ وار یہ پتہ چل سکے کہ سنسکرت ڈرامہ کس طرح شروع ہوا۔ وہ کون سے اصول تھے جن کی بنیاد پر پہلا سنسکرت ڈرامہ لکھا گیا۔ کس کس نے اس میں سُدھار کیے۔ کون کونسی نئی راہیں نکالیں پھر کس طرح سنسکرت ڈرامہ اپنے عروج تک پہنچا۔

بنیادی اصولوں اور ڈرامے کے ڈھانچے کو سمجھانے والی دو چار کتابیں تو ہیں لیکن ترتیب وار اس کے تمام پہلوؤں کی تدریجی ترقی کا پتہ دینے والی ایک بھی کتاب نہیں۔ اس طرح [illegible]

کھیچاتانی سے آجکل کام لیا جا رہا ہے ایسا نہ ہوتا۔ نام نہاد محققوں کو یہ میدان ایسا اچھوتا مل گیا ہے کہ اپنی اپنی بساط بھر کھل کھیل رہے ہیں اور قیاس کے گھوڑے دوڑا رہے ہیں۔ نت نئے نظریے قائم کیے جا رہے ہیں۔ اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر دُور دُور کی کوڑیاں لانا اہم کی جا رہی ہیں۔ پھر بھی ٹھیک ٹھیک یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ سنسکرت ڈرامہ کب اور کس طرح شروع ہوا اور کن دَوروں سے گذرتا ہوا ایسی شکل میں آیا جو کالی داس۔ بھوبھوتی اور راجہ ہرش کے ڈراموں میں نظر آتی ہے۔ ابھی تک اس بارے میں بہت سی الجھنیں ہیں اور محقق کسی ایک رائے پر اتفاق نہیں کرتے۔ یہاں دو ایک ایسے نظریوں کا ذکر دور از کار نہ معلوم ہوگا۔ جو عام طور پر مشہور ہیں۔

سب سے پہلا نظریہ اُن یورپی مستشرقین کی طرف سے پیش کیا گیا ہے جو البتیلیکے ہر کمال علم و فن کا ماخذ آنکھ بند کر کے ایشیا کے باہر دیکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سنسکرت ڈرامہ سر تا سر یونانی ڈرامے کی نقل ہے، بلکہ جوش میں یہاں تک کہہ گئے کہ ہندوستان میں ڈرامہ آیا ہی یونان سے۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں سب سے بڑی دلیل جو یہ لوگ پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ سکندر اعظم کے حملہ کے بعد موریہ اور گپت راجاؤں کے تعلقات یونانی فرمانروا سیلوکس وغیرہ سے بڑھے۔ ساتھ ہی تمام مشرقی بندرگاہوں اور تجارتی مرکزوں پر یونانی نوآبادیاں قائم ہوئیں۔ جہاں کہا جاتا ہے کہ یونانی تفریح طبع کیلئے ڈرامے کیا کرتے تھے۔ وہیں سے ان کی نقل پر سنسکرت ڈرامے کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اگر یہ ممکنات تسلیم بھی کر لئے جائیں تو بھی یہ نتیجہ لازم نہیں آتا کہ سنسکرت ڈرامہ یونانی آرٹ کی نقل ہے۔ کیونکہ اور باتوں کو چھوڑ دونوں ملکوں کے ڈراموں میں ان کے بنیادی اصولوں اور ترتیب وغیرہ میں اس قدر تضاد ہے کہ ان کے مابین کوئی وجہ اشتباہ باقی نہیں رہتی۔ پھر سنسکرت ڈرامہ تو سکندر کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے سے بہت پہلے موجود تھا۔ کئی ڈرامے لکھے جا چکے تھے جن کا ذکر رامائن اور مہابھارت میں ملتا ہے۔ یہ نظریہ محض تعصب پر مبنی ہے۔ اور چند روشن خیال عالموں (ڈاکٹر پیکڈ ول۔ ڈاکٹر نیتھ وغیرہ) نے اسے بے طرح غلط ثابت کر دیا ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ قدیم ہندوستان میں آریہ اپنے ہاں یگ اور مگ وجنرہ کیا کرتے تھے جو کئی کئی دنوں کے بعد ختم ہوتے تھے۔

ان میں شریک ہونے کیلئے دور دور سے عالم، گیانی اور ماہرینِ فن آتے تھے۔ دن اور رات کے تپ کے بعد جب یہ یگیہ ختم ہو جاتے تھے تو لوریاں گانے بجانے کے جلسے ہوتے تھے۔ سام وید اور سنسکرت کی لمبی لمبی نظمیں سر کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں۔ (روایت ہے کہ والمیکی نے رامائن کو گا کر پڑھنا پہلے لَو اور کُش کو سکھایا تھا۔ اور جب یہ دونوں رشیوں کی محفل میں گا گا کر سناتے تھے تو سب جھوم جھوم اٹھتے تھے) غرض اس طرح اس محفل میں گانا اور ناچ رنگ ہوتا تھا۔ جس نے آہستہ آہستہ ناٹک کی شکل اختیار کر لی جو اتنے مقبول ہوئے کہ یگیوں کو چھوڑ مذہبی تیوہاروں اور میلوں میں بھی جاری ہو گئے۔ ابھی جاتراؤں سے ناٹک کا آغاز ہوا۔ بہت سے ایسے ناٹک ہیں جو اسی طرح کے میلوں اور جاتراؤں کے موقع پر کھیلے گئے۔ بھوبھوتی کے بیشتر ڈرامے پہلی بار جاتراؤں میں ہی پیش کئے گئے۔ بہت سے ڈرامے بسنت اور ہولی کے تیوہاروں پر کھیلے کے لئے لکھے گئے۔ ان ڈراموں میں بھی اس بات کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے بہت سے لوگ یہ مانتے ہیں کہ ہندستان میں ناٹک پہلے جاتراؤں کیلئے لکھے گئے بعد میں رائج ہو گئے۔

تیسرا نظریہ بھرت کی مشہور کتاب "ناٹیہ شاستر" میں ملتا ہے۔ سنسکرت ڈرامے پر سنسکرت میں جو سب سے پرانی اور مستند کتاب ملتی ہے وہ یہی ہے۔ باقی جتنی کتابیں لکھی گئیں وہ سب اسی سے ماخوذ ہیں۔ اس کتاب میں ناٹک شروع ہونے کی داستان اس طرح بیان کی گئی ہے :۔

"ترتیا یُگ میں جب برھما (قادرِ مطلق) نے دیوتاؤں کو حواسِ خمسہ کی نعمت عطا کی تو مخلوق پھولی نہ سمائی مگر کچھ ہی دنوں بعد اُداسی سی چھانے لگی کیونکہ کوئی چیز ایسی نہ تھی جو بیک وقت جسم و گوش کی ضیافت کا سامان بہم پہنچا سکتی۔ آخر ایک دن سب دیوتا مل کر اندر مہاراج کے پاس گئے اور عرض کی کہ من کی پیاس بجھانے نہیں بجھتی۔ خالی بیٹھے بیٹھے زندگی اجیرن ہو گئی۔ آپ برھما کے حضور میں عرض کریں کہ وہ کسی ایسے سامان کا ڈول ڈال دیں جو جنت نگاہ اور فردوس گوش بن سکے۔ اندر مہاراج تو رنگیلے رسیا ہیں ہی فوراً گئے اور برھما کے حضور میں ساری بپتا بیان کر دی۔ اور کہا کہ چاروں ویدوں سے معمولی آدمی پڑھ کر فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ کوئی ایسی تدبیر کیجئے کہ یہ سب لوگ آسانی سے فائدہ بھی اٹھا لیں۔ اور چاروں ویدوں کی اچھی اچھی باتیں بھی سیکھ لیں۔

برھما نے چپ سے گمان دھیان کیا اور غور و فکر سے ایک پانچواں وید "ناٹیہ وید" نکال لائے۔ انھوں نے رگ وید سے حوشِ الحانی، سام وید سے موسیقی، یجر وید سے حرکات و سکنات نقل کرنے کا فن اور اتھر وید سے جذبہ و اظہار کی قوت لیکر یہ پانچواں وید مرتب کیا۔ اور کہا کہ اس وید میں تمام علم و فن کہانی کی صورت میں پیش کئے جائیں۔

जग्राह पाठ्य मृग्वेदात्सामभ्यो गीत मेव च।
यजुर्वेदादभिनयान रसानाथर्वणादपि ॥

جب ناٹیہ وید کی تدوین مکمل ہو گئی تو برھما نے سورگ کے سب سے بڑے معمار وشوکرم کو حکم دیا کہ اندر اس میں ناٹک گھر تیار کریں۔ برھما نے بہت سے دیوتاؤں اور اپسراؤں کو اداکاری کا فن خود سکھلایا اور بھرت نامی رشی کو اسٹیج کا مہتمم مقرر کیا۔

مذہبی روایتوں سے قطع نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ہندستان کے قدیم حکما یہاں کے تمام علوم و فنون کو غیر معمولی اہمیت دینے کیلئے اُن کے ماخذ کو دیوتاؤں سے منسوب کرتے تھے۔ اسی طرح بھرت جی نے بھی اپنی تمہید میں ڈرامے کی ایجاد کا سہرا دیوتاؤں کے حوالے سے اپنے سر باندھنے کی کوشش کی۔ جیسے ہماری اُردو والے سببِ تالیف کتاب میں مدائے عیبی اور ہاتف سے استصواب کرتے ہیں۔

رنگ شالا میں کس قسم کے ڈرامے کھیلے جاتے تھے ان کا ذکر بھی لطف سے خالی نہیں۔ بھرت جی یوں بیان کرتے ہیں :۔

त्रैलोक्यस्यास्य सर्वस्य नाट्यं भावानुकीर्तनम्
क्वचिद्धर्मः क्वचित्क्रीडा क्वचिदर्थः क्वचिच्छमः
क्वचिद्धास्यं क्वचिद्युद्धं क्वचित्कामः क्वचिद्वधः

लोक वृत्तानुकरणं नाट्यमेतन्मया कृतम्।
उत्तमाधममध्यानां नराणां कर्म संश्रयम्
सर्वोपदेशजननं नाट्यं लोके भविष्यति ॥

दुःखार्तानां, श्रमार्तानां, शोकार्तानाम् तपस्विनाम्
विश्रान्तिजननं काले नाट्यमेतद् भविष्यति॥

न तज्ज्ञानं न तच्छिल्पं न सा विद्या न सा कला

नासौ योगो न तत्कर्म, नाट्ये ऽस्मिन् यन्न दृश्यते

योऽयं स्वभावो लोकस्य सुखद· खसमन्वितः
सोऽङ्गाद्यभिनयोपेतो नाट्य मित्यभि धीयते॥

"ناٹک میں دُنیا کے تمام لوگوں کے جذبات پیش ہونے لگے۔ کہیں مذہبی باتیں، کہیں کھیل، کہیں ہنسی، کہیں لڑائی، کہیں محبت، کہیں عالم اسباب کی بے ثباتی۔ کہیں ترک دُنیا۔ سب ہی باتیں اس میں پیش کی گئیں۔ دنیا والے جن راستوں پر چلتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں اچھے آدمی اور معمولی آدمی اور بڑے آدمی جو جو کچھ اور جس جس طرح کرتے ہیں اس کی نقل اس طرح پیش کرنا کہ وہ اصلی معلوم ہوں اور اس میں نصیحت بھی ہو اور لُطف بھی آسکے۔ یہ ناٹک کا مقصد ہے۔ دل بھر کے تھکے ہوئے دُکھی اور غمگین لوگوں کے دلوں میں یہ ناٹک تازگی، لطف اور خوشی پیدا کرتے ہیں۔ دُنیا کا کوئی ایسا علم نہیں۔ کوئی ایسا فن نہیں اور کوئی ایسا کام نہیں اور نہ ایسے جذبات ہیں جنہیں ان ناٹکوں میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لوگوں کے سُکھ دکھ، چال ڈھال، بات چیت اور ساری عادتوں کو جسمانی حرکتوں سے، لفظوں کے ذریعے، گانوں میں اور بلا بولے صرف ناچ کے ساتھ پیش کرنے کو ناٹک کہتے ہیں۔"

"سبب تالیف کتاب" کچھ ہی ہو اس میں شک نہیں کہ بھرت مُنی کی ناٹیہ شاستر سنسکرت کی اہم ترین تالیف ہے۔ اور سنسکرت ڈرامہ کے بارے میں یہی کتاب مُستند مانی جاتی ہے۔

اس کتاب سے ناٹک کے آغاز کے بارے میں ایک اور نظریہ کو تقویت ملتی ہے۔ اور یہ چوتھا نظریہ یہ قرار پاتا ہے کہ ناٹک۔ ناٹیہ یعنی ناچ کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ یہی نظریہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اور عام طور پر سنسکرت کے عالم اس پر اتفاق رائے بھی رکھتے ہیں۔

کم و بیش سب ہی ناٹکوں میں شاعری کے ساتھ ساتھ سنگیت اور ناچ کا بہت بڑا عنصر ہوتا ہے۔ بھرت کے ناٹیہ شاستر کے مطالعے سے یہ اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ پُرانے زمانے میں ناچ کا فن اپنے شباب کے کمال کو پہونچا ہوا تھا۔ اسی کے بارے میں استادی پنڈت گنگا دھر جی کی رائے ہے کہ:۔

"عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ جسم کی حرکت ترنگ پھڑک۔ طرح طرح کی بنک ٹھنک، آنکھیں تیوڑانا، کمر لچکانا، کولھے مٹکانا، ہاتھ ہلانا ساتھ ساتھ پیروں کی چھما چھم سے بول نکالنے کا نام ناچ ہے ۔۔۔ مگر جس طرح ایک نظم میں الفاظ چست اور میٹھے ہوں۔ زبان میں روانی ہو۔ بحر بھی ٹھیک ہو اور قافیہ کا بھی تک سے تک ملا ہوا ہو لیکن مطلب کچھ نہ ہو تو یہ تُک بندی نظم نہیں کہلائی جا سکتی۔ اسی طرح جس ناچ میں سب ساز و سامان ٹھیک ہو لیکن کسی جذبے کو پوری اداکاری کے ساتھ نمایاں نہیں کیا گیا ہو تو وہ ناچ نہیں ایک طرح کی ہلکی پھُلکی ورزش ہو سکتی ہے۔ دل کے اندرونی جذبے کو زبان ہزار کوشش سے بھی پوری طرح بیان نہیں کر سکتی۔ ناچ میں ذرا سی جنبش، ہاتھ یا کمر کے لطیف اشارے سے اس جذبے کا ٹھیک ٹھیک نقشہ کھینچ سکتا ہے۔ گویا جذبات کی مجسّم تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے قدیم حکما نے ناچ کو سب سے بڑا فن مانا ہے جس کے ذریعے خاموشی مکمل تصویر بن جاتی ہے۔ جس کے مقابلہ میں کلام و بیان کی کوئی حقیقت نہیں۔"

بھرت مُنی نے ناٹیہ شاستر میں ایک سو آٹھ ناچوں کا پوری تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اور تصویریں اور نقشے بھی دیئے ہیں۔

روپک کی تین قسمیں مانی گئی ہیں:۔

ناٹیہ:۔ ایسا ناچ جس میں اداکاری کے ساتھ کچھ بولنا بھی ہو۔

نرتیہ:۔ ایسا ناچ جس میں اداکاری ہو۔

نرت:۔ صرف ناچ۔

ان میں پہلی دو قسموں یعنی ناٹیہ اور نرتیہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ شاعری اور مکالمے بھی ترقی کرنے لگے اور یوں بھاس اور مہاراجہ شودرک سے لیکر کالیداس، بھوبھوتی اور راجہ ہرش دیو اور ان کے بعد کے دو ایک مصنفین کے ہاتھوں ڈرامے نے ترقی پائی۔

نفس مضمون ناٹک کے کردار اور اس میں بنیادی جذبے یا کیفیت کے اعتبار سے سنسکرت ڈرامہ کی ہزارہا قسمیں ہیں جو صبر آزما تفہیم چاہتی ہیں۔ اصول صرف یہ ہے کہ ہر قسم کے کردار اور ہر ایک رس کیلئے ایک علیحدہ قسم کا ڈرامہ ہوتا تھا۔ چند موٹی موٹی قسموں کا ذکر کرتا ہوں۔

۱۔ ناٹک۔ یہ ڈرامے کا مکمل اور اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اس کا قصہ تاریخی ہو یا فرضی یعنی خیالی۔ یا پُرانوں یا دیومالا سے اخذ کیا گیا ہو اس ڈرامے کے بڑے کردار اعلیٰ طبقے کے ہوں یعنی دیوتا

اوتار یا راجہ وغیرہ۔ اور زبان نہایت فصیح و بلیغ ہونی چاہیئے۔
کالیداس کے تینوں ڈرامے شکنتلا، وکرم اور وشی اور مالویکاگنی مترا اور بھوبھوتی کے دو ڈرامے اتر رام چرتر اور مالتی مادھو اسی قسم کے ہیں۔

۲۔ پرہسن۔ اس کا تعلق ہجو ملیح سے ہے۔ موضوع حد درجہ مسخرآمیز ہو۔ اسے انگریزی، فارسی اور برلسک کا مترادف سمجھئے۔ اس قسم کے ڈراموں میں بالعموم ناستک، دہریئے اور لالچی برہمنوں کا خاکہ کھینچا جاتا ہے۔ اس میں کرداروں پر کوئی پابندی نہیں۔ پیٹو برہمنوں سے لیکر سپاہی، خواجہ سرا، قاصد اور چور اچکے جواری سب ہی طرح کے لوگ شامل ہوسکتے ہیں۔ مکالمے مزاحیہ ہوتے ہیں اور زبان جان بوجھ کر ادنیٰ قسم کے لوگوں کی غلط سلط لکھی جاسکتی ہے۔

۳۔ سموکار۔ دو یا تین ایکٹ کا سیدھا سادا ڈرامہ جس میں کسی دیوتاؤں اور راکشسوں کی جنگ کا قصہ پیش کیا جائے۔ اس قسم کے ڈرامے میں جنگجوئی اور جانبازی کے کارنامے ہونے چاہئیں۔

۴۔ ڈیم۔ اس کا مضمون ہول آفریں، ڈراؤنا اور دہشت انگیز ہوتا ہے۔ محبت اور مسرت کا اس میں نام کو بھی ذکر نہیں ہوتا ظلم اور بھیانک حرکتیں ضروری ہیں۔ مار دھاڑ۔ پاگلوں کی سی حرکتیں۔ چاند اور سورج گرہن کے مناظر سب جائز ہیں۔ اس کے کردار دیوتا یا راکشش اور شاذ و نادر کوئی بہادر راجہ ہوسکتا ہے۔ ہریشچندر اسی قسم کا ڈرامہ ہے۔

۵۔ بھان۔ ایک ایکٹ کا ڈرامہ۔ اس میں ایک ہی شخص آپ بیتی سناتا ہے۔ اگر کہیں مکالمے بھی ہیں تو خود ہی دوسرے کی آواز بنا لیتا ہے۔

۶۔ پرکرن۔ یہ ناٹک سے ملتا جلتا ہے صرف اس فرق کے ساتھ کہ ہیرو کیلئے دیوتا یا راجہ ہونا ضروری نہیں۔ کوئی اوسط درجہ کا اہلکار، امیر برہمن، دکاندار، ساہوکار یا سوداگر اس کا ہیرو ہوتا ہے۔ اور ہیروئن بھی اپسرا یا اپسرا کی بیٹی کی جگہ کوئی اعلیٰ خاندان کی لڑکی یا ویشیا ہوسکتی ہے۔ ویشیا سے مراد فاحشہ نہیں بلکہ ایسی صاحب عصمت آزاد خیال لڑکی سے مراد ہے جو ناچ گانے کی شوقین ہو اور مردوں کی صحبت میں شریک ہوتی ہو۔

۷۔ کھلی۔ اعلیٰ درجے کی ظرافت کا نمونہ۔ کرداروں کی تعداد دو یا تین جس میں ہیروئن یا عموماً چالباز، مکار اور رموز عشق

سے واقف ہوتی ہے۔ جو لاگ لپیٹ کی باتوں سے اپنے چاہنے والے کی آتش محبت کو بھڑکاتی ہے۔

۸۔ اہام برگ۔ سنجیدہ قسم کا ناٹک جس میں ہیرو کوئی دیوتا اور ہیروئن کوئی رانی ہوتی ہے۔ مضمون درد انگیز لیکن خوش انجام۔

اس تقسیم سے ظاہر ہوگا کہ موضوع سخن اور افراد ڈرامہ کا کس التزام سے خیال رکھا جاتا تھا۔ بعض مضمون میں کرداری اور اس میں خفیف سا ردّ و بدل بھی سرے سے ڈرامے کی قسم ہی کو بدل دیتا تھا۔ اس لحاظ سے کسی ڈرامے کی قسم کو جانچنے کیلئے ان تینوں باتوں کا پورا پورا لحاظ رکھا جانا ضروری ہے۔ اوّل وستو یعنی پلاٹ۔ دوم نیتا یعنی ڈرامہ کا ہیرو۔ اور سوم رس یعنی ڈرامہ کا اصل جذبہ۔

وستو یعنی پلاٹ کی ترتیب کے ۵ ارکان ہیں۔

۱۔ مکھم یا آرمبھ۔ ایسے ابتدائی واقعات جن پر قصے کی بنیاد ہو۔ یا کوئی ایسا فعل جس سے قصہ شروع ہوتا ہے (مثلاً رتناولی میں منتری ساگاریکا کو راجہ کے حرم میں داخل کرنے کی تدبیریں کرتا ہے۔ یا وکرم اور وشی میں پریوں کے کوہر کے دربار سے آتے ہوئے کیسی راکشش کا اروشی کو اڑا لے جانا۔)

۲۔ پراتی مکھم یا تین۔ قصہ کی ترقی۔ ایسی باتوں کا ظہور میں آنا جو آئندہ واقعات کا پیش خیمہ ہوں۔ (رتناولی میں داسیوں کو اس کا علم ہونا کہ راجہ ساگریکا پر فریفتہ ہے۔ مہارانی کا بھی ماتھا ٹھنکتا ہے۔ وکرم اور وشی میں اروشی کا راجہ کے باغ میں آکر ملنا)

۳۔ گربھ۔ ایسے واقعات کا جمع ہونا جن سے امید کے خلاف نتیجہ نکلتا نظر آتا ہے۔ (رتناولی میں لباس کی یکسانیت کی وجہ سے راجہ غلطی سے ساگریکا کے بدلے خود رانی سے اظہار عشق کرتا ہے۔ ——— وکرم اور وشی میں اروسی اندر کی محفل میں لکشمی سوئمبر کے ڈرامے میں پارٹ کرتے ہوئے پرشوتم کی بجائے پرور اس کا نام ... ہے۔ بھرت جی ناراض ہوکر شراپ دیتے ہیں)

۴۔ اومرش۔ ایسے واقعات جن سے معلوم ہو کہ قصہ بظاہر رُک گیا اور اب حسب توقع نتیجہ کی کوئی امید نہیں۔ (رتناولی میں رانی کو سارا حال معلوم ہوتا ہے۔ وہ بُری طرح ناراض ہے اور سب حیران ہیں کہ اب کیا ہوگا۔ وکرم اروشی میں اروشی بیل میں بدل جاتی ہے۔ اور بظاہر مایوسی ہی نظر آتی ہے۔)

۵۔ نِروہن یا نردھن۔ تکمیل کار۔ سارے واقعات کے شمول

سے ایک شخص نتیجہ مرتب ہوتا ہے اور دفعتہً مسی جوتی ختم ہو جاتا ہے
(ر ماولی - غم کے بادل چھٹ جاتے ہیں - اسرار اور بھید
کھلتے ہیں او طالب و مطلوب مل جاتے ہیں - وکرم اروشی - احمد
کو سنگ میا ملتا ہے جس کی وجہ سے اروشی بیل سے پھر انسان بنی
و سب میں آسانی سے - اور دو وں بسی خوشی مل جاتے ہیں)
تقسیم مضامین اور وستو کی ترتیب ذہن نشین کر لے کے بعد
کرداروں کے نقش و نگار اچھی طرح سمجھ میں آ سکتے ہیں) -
کسر اس :- ناٹک کے اہم ترین افراد ہیرو اور ہیروئن
ہی ہیں - کم ذہنیت سا سے ہی ڈراموں میں انہی پر زیادہ زور دیا
جاتا ہے اور باقی کردار وں کی طرف اسی توجہ نہیں دی جاتی - چونکہ
ناٹک کی ہزار ہا قسمیں مقرر ہیں - اس لئے سرسری کیریکٹر کے لئے
گنجائش ہے - کہ وہ کسی نہ کسی ڈرامے کا ہیرو بن سکے - لیکن اعلیٰ
درجے کے ہیرو (ناٹک) صرف دیوتا، اوتار، راجہ مہاراجہ ہوتے
ہیں - ذاتی اوصاف کے اعتبار سے ناٹک کی چار قسمیں مقرر ہیں -
للت :- رندہ دل، حلیم، خوش مذاق، فنون لطیفہ کا
دلدادہ (جیسے اٹولی)
ودات :- سنجیدہ، عالی حوصلہ، اعتدال پسند، مستقل
مزاج (جیسے اوتھیلو)
ودت :- بلند نظر، پُرجوش، مغرور اور طاقتور (جیسے رچرڈ
سوم میکبتھ)
شانت :- حلیم اور نیک مزاج (جیسے بروٹس)
ان چار اقسام کی تقسیم در تقسیم ہوتی چلی گئی ہے اور انسانوں
کے علاوہ دیوتاؤں کو ملا کر ہیرو یعنی ناٹک کی کل ۱۴۸ قسمیں مقرر ہیں -
جن پر تبصرہ کرنا محال ہے - اصول صرف یہ ہے کہ چونکہ ڈراموں
میں عام طور پر حسن و عشق کا ذکر ہوتا ہے - اس سے ایک عمدہ
ناٹک میں یہ چند صفات لازمی طور پر ہونی چاہئیں -
طاقت، شجاعت، روشن دماغی، فصاحت، خوش اخلاقی،
قبول صورتی، خوش طبعی اور عیش پرستی -
ناٹک کی طرح نائکہ یعنی ہیروئن کی بھی سیکڑوں قسمیں ہیں
چند کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا -
۱- سوادھین پتیکا - سیویا یا پتی ورتا - یعنی جو اپنے خاوند
کی فرمانبردار ہو -
۲- وسکا سیجا - تو خیز و شیو سنگار کی دلدادہ، عاشق

کی منتظر -
۳- ورہ ت کنٹھیا - عاشق کی دوری اور فراق سے شکستہ حال
پریشاں -
۴- کلہاں ترتیا - اکھڑ مزاج، ہر وقت ناک بھوں چڑھائے
کوئی نہ کوئی رونا روتی ہے -
۵- ابھی سار یکا - جو ملنے میں پہل کرے - عاشق کو
بلائے یا خود اس سے ملنے جائے -
ہیروئن کیلئے چند الگ الگ صفات مقرر ہیں - مثلاً
ستر کھاس و تماس -
دھیریا - وفاداری -
بھاؤ اور ہیلا :- جذبات قلب کے خفیف اور قوی اظہار
کی قدرت - مثلاً چہرہ کا رنگ اڑ جانا اور بیم عشق آجانا -
لیلا :- عاشق کے کلام، لباس اور چال ڈھال کی نقل
اتار کر خود عاشق کا یا اپنی سہیلیوں کا دل بہلانا -
وچھتی :- پریشانی اور انتظار کے سبب سنگار سے
بے پروائی -
وااس :- طرز نگاہ - قول یا فعل سے عیش کی خواہش
ظاہر کرنا -
للت :- غرور حسن اور لذت وصال کا اظہار - ناز سے
اٹھلا کر چلنا - بناؤ سنگار کرنا - پُرتکلف کپڑے پہننا وغیرہ -
ہیرو اور ہیروئن کے علاوہ ڈرامے کے دیگر کردار جن سے
ڈرامے کا رنگ بنتا ہے یہ ہیں :-
۱- پیت مرد :- ہیرو کا رفیق اور مددگار -
۲- پرتی ناٹک - ہیرو کا مخالف یعنی ولین جیسے رام
کا پرتی ناٹک راون - سری کرشن کا استیال، یدھشٹر کا دریودھن
وغیرہ -
۳- ودوشک :- ہیرو کا رازدار ندیم اور مصاحب خاص
بلا کا ذہین اور منہ پھٹ، اپنی بونگی حرکتوں سے اور مصنوعی ظرافت
سے ہیرو کا دل بہلاتا ہے اور خوش تدبیری سے معاملات عشق میں
مدد دیتا ہے - ساتھ ہی سہو و خطا کا مجموعہ بھی ہوتا ہے - کبھی ایک
شخص کی بجائے دوسرے کا نام لے دیتا ہے - کبھی کبھی دینا فرض
بھول جاتا ہے - جو چیز اس کو چھپانے کیلئے دی جائے وہ کسی نہ
کسی طرح اس کے ہاتھ سے نکل ہی جاتی ہے - کھانے کا شوقین

ہر وقت بھوک سے بیتاب، سنجیدہ سے سنجیدہ مسائل پر گفتگو کرتے کرتے ایک دم رسوئی کی طرف لپکتا ہے۔ ہر وقت کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار نظر آتا ہے۔ روتوں کا ہنسانا اس کا کام ہے۔ ودوشک کا کردار سنسکرت ناٹک کے سارے کرداروں میں نمایاں کشش رکھتا ہے۔ قریب قریب تمام ڈرامہ نگاروں نے اس کا کردار ڈھالنے میں اپنے فن کی پوری قوت صرف کر دی ہے۔ کچھ تو یوں کہ طنز کیلئے اس کے علاوہ اور کوئی آلۂ کار نہ تھا۔ کچھ یوں کہ قصے کے اتار چڑھاؤ میں اس کی وجہ سے ہر طرح کی آسانی میسر ہے۔ جو بات بعید از قیاس معلوم ہو اس کے سر چپکی جا سکتی ہے۔ رتناولی کا تو سارا کھیل اسی کے دم سے ہے۔ ودوشک کو نکال لیجئے تو قصہ دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔

ہیرو کی طرح ہیروئن کی اطاعت کیلئے کسی نہ کسی محرم راز کا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ خدمت سوتیلی بہن، کسی عزیز سکھی یا داسی کے سپرد کی جاتی ہے۔ جیسے شکنتلا کی ولنواز سہیلیاں پریموا، انوسویا یا رتناولی کی سسیم، اردشی کی چتر لیکھا وغیرہ۔

یہ ہیں مختصراً سنسکرت ڈرامے کے کردار لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ سنسکرت ناٹک میں سب سے زیادہ اہمیت اگر کسی چیز کو دی جاتی ہے تو وہ رس یعنی جذبہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں نہ کردار نگاری کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے نہ پلاٹ کی باریکیوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ زیادہ زور اسی بات پر ہوتا ہے کہ کسی ایک جذبے کا پورا پورا نقشہ کھنچ جائے۔ اسی وجہ سے ناٹکوں میں شاعری موسیقی اور گانے کا حصہ کردار نگاری سے کہیں زیادہ ہے۔ کسی ایک ہی جذبے پر اتنی گہری روشنی ڈالی جاتی ہے کہ اس کی چکاچوند میں دوسری تمام ضروریات ماند پڑ جاتی ہیں۔ اس طرح کہ اگر آپ کسی کردار کا جائزہ لینا چاہیں تو اس کی پوری تفصیل آپ کو نہ مل سکے گی۔ ہاں اس کے جذبات کی باریک سے باریک باتیں آپ کے سامنے آ سکیں گی۔ مثلاً اگر کسی راجہ کے عشق کا کردار ہے تو یہ ذکر اس قدر شد و مد سے کیا جائیگا اور جذبۂ عشق کی ایسی باریکیاں پیش کی جائیں گی کہ ہیرو کے راجہ پن کی تمام شخصی خصوصیات مدھم پڑ جائیں گی۔ اور یہ کسی طرح نہ معلوم ہو سکے گا کہ یہ راجہ دوسرے راجاؤں سے کن کن باتوں میں مختلف ہے۔

شاید اسی سبب سے بعض نقادوں نے سنسکرت کے عام کرداروں کو محض صرف بے جان Mere Types کہا ہے۔ ہر ایک کردار کی عام بگی بندھی خصوصیات مقرر ہیں اور یہ مان لیا جاتا ہے کہ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔ اگر راجہ ہے تو بس راجہ ہی ہے جیسے راجہ ہونے چاہئیں۔ البتہ یہ دکھلانے کی کوشش کی جائیگی کہ راجہ کا محبت میں کیا حال ہوا۔ راجہ کو غصہ آیا تو غم و غصے کو ظاہر کرنے کے سارے ارکان ادا ہوئے یا نہیں۔ اسی سبب سے کردار نگاری کا جو مفہوم انگریزیت کی بنا پر ہمارے ذہن میں ہے ویسی کردار نگاری سنسکرت ڈرامے میں تلاش کرنی نہیں اور نہ اس معیار پر سنسکرت ڈرامے کو جانچنا چاہیئے۔ اصل نکتہ یہی ہے سنسکرت کا ناٹک نگار کسی کردار کو اس کی شخصی خوبیوں یا کمزوریوں کا نمونہ بنا کر نہیں پیش کرتا بلکہ ایک جذبہ کو انتہائی حد تک دکھانا چاہتا ہے۔ اور اس کیلئے جو کردار بھی اُسے موزوں ملتا ہے اسے اپنا آلۂ کار بنا لیتا ہے۔

اس طرح سنسکرت ڈرامے سے صحیح طور پر لطف اندوز ہونے کے لئے رس یعنی جذبے کی کارفرمائی کا سمجھنا از بس ضروری ہے۔ اور یہ ایک طویل داستان ہے جو پھر کبھی پیش کی جائیگی۔

ساقی بکڈپو کی مطبوعات

آتاترک یہ وہ منفرد اور معرکۃ الآرا کتاب ہے جس سے بہتر کتاب غازی مصطفٰے کمال آتاترک بانیٔ جمہوریہ ترکیہ کے حالات پر آجتک ہماری زبان میں نہیں لکھی گئی۔ یہ غازیٔ اعظم کی تمام و کمال سوانحعمری ہے۔ اور ان کی زندگی کے ہر پہلو اور کارنامہ سے بحث کی گئی ہے۔ مصنفہ محمود مرزا دہلوی۔ قیمت دو روپیے۔

چار چاند ناصر نذیر فراق کے مضامین کا مجموعہ۔ دلی کی ٹکسالی زبان اور قلعہ معلی کی نتھری ستھری بول چال اس مجموعہ میں ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت ۱۲؍

لال قلعہ کی ایک جھلک سید ناصر نذیر فراق کی تصنیف ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے زمانہ میں لال قلعہ کی کیا حالت تھی۔ اور اس انتہائی انحطاط کے زمانہ میں بھی وہاں کی دلچسپیوں کا کیا عالم تھا۔ قیمت ۱۲؍

مینیجر ساقی بک ڈپو۔ دہلی

ن م راشد

دوری

مجھے موت آئے گی۔ مرجاؤں گا میں،
تجھے موت آئے گی۔ مرجائے گی تو
وہ پہلی شبِ مہ۔ شبِ ماہ دو نیم بن جائے گی
جس طرح سازِ کہنہ کے تارِ شکستہ کے دونوں سرے
دو اُفق کے کناروں کے مانند
بس دُور ہی دُور سے تھرتھراتے ہیں اور پاس آتے نہیں ہیں!
نہ وہ راز کی بات ہونٹوں پہ لاتے ہیں
جس نے پہلی کو دورِ زمان و مکاں سے نکالا تھا
بخشی تھی خوابِ ابد سے رہائی!
یہ سچ ہے تو پھر کیوں
کوئی ایسی صورت کوئی ایسا حیلہ نہ تھا
جس سے ہم آنیوالے زمانہ کی آہٹ کو سُن کر
وہیں اس کی یورش کو سینوں پہ یوں روک لیتے
کہ ہم تیری منزل نہیں۔ تیرا ملجا و ماویٰ نہیں ہیں!
یہ سوچا تھا شاید
کہ خود پہلے اس بُعد کے آفرینندہ بن جائیں گے
(اب جو اک بحرِ خمیازہ کش بن گیا ہے)
تو پھر از سرِ نو مسرت سے، نورسِ نئی فاتحانہ مسرت سے
پائیں گے بھولی ہوئی زندگی کو!
وہی خود فریبی، وہی اشک شوئی کا ادنیٰ بہانہ!
مگر اب وہی بُعد سرگوشیاں کر رہا ہے
کہ "تو اپنی منزل کو واپس نہیں جا سکے گا
نہیں جا سکے گا . . . . "
یہ عفریت تجھ سے بھی چُپ چاپ یوں کہتا ہوگا
"وہ اب تیرے پہلو میں واپس نہیں آئے گا
اب نہیں آئے گا . . . . "
مجھے موت آئے گی مرجاؤں گا میں
تجھے موت آئے گی۔ مرجائے گی تو
مگر مجھ کو اس کا یقیں ہے
یہ عفریت پہلے ہزیمت اُٹھائے گا مٹ جائے گا تو!

"ناکارہ"

خندۂ تقدیر

دفتر میں جائیداد کے اُمیدواروں کا انٹرویو تھا۔ بورڈ کے ایک رکن نے ایک اُمیدوار کی ذہانت اور حاضر دماغی کا امتحان لینے کی غرض سے بڑی سادگی سے یہ سوال کیا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہندوستان کی آبادی گھٹتی کیوں جا رہی ہے؟" حاضر جواب اُمیدوار نے برجستہ جواب دیا "میری سمجھ میں تو اس کی وجہ یہ آتی ہے کہ ہندوستان کے لوگ ضبطِ تولید پر کاربند ہو گئے ہیں!"

اس لطیفہ کا حقیقت سے بہت کم لگاؤ ہے۔ لیکن جو جو ترقی پسند ہندوستانی مرد و زن ضبطِ تولید پر عمل پیرا ہیں اُن میں مشتاق اور اس کی بیوی شامل تھے۔ بیوی اپنی مرضی سے، شوہر بھی اس کی مرضی سے۔

مگر جب مشتاق نے وہ خوشخبری سُنی تو مارے خوشی کے پھُولا نہ سمایا۔ آنے والی چیز کے تصوّر میں ڈوب گیا۔ لڑکا ہوگا یا لڑکی؟ بچّہ خوبصورت ہوگا۔ کیونکہ دونوں میاں بیوی اپنی اپنی جگہ حسن کے اعلیٰ نمونے تھے جو تہذیب و تمدّن کے شوکیس میں رکھے ہوتے تھے۔ لیکن بچّہ ماں پر جائے گا یا باپ کا ہم شبیہ ہوگا؟ لڑکے تھے تو باپ کے تابع رہے۔ نوکر ہوئے تو اعلیٰ افسروں کے تابع رہے۔ شادی ہوئی تو بیوی کے تابع رہے۔ اب زمانہ آ رہا تھا کہ کوئی ہمارا تابع فرمان بن کر رہے۔ واہ وا! باپ بننا بھی کیا مزے کی بات ہے۔!

لیکن پھر وہ اپنے آپے میں آ کر سوچنے لگا۔ اس کی بیوی نفیس کے تاثرات کیا ہیں؟ کیا وہ اس رضاکارانہ مسرّت و انبساط کو غیر مہذبانہ قرار دے گی؟ یعنی بیوی کی اجازت کے بغیر اظہارِ مسرّت چہ معنی دارد؟ وہ ایک بیحد مرنجان مرنج بلکہ نیازمند قسم کا شوہر تھا اس کی بیوی کی آرزو تھی کہ بچّہ چار چھ سال تک نہ ہو ورنہ عیش میں خلل پڑ جائے گا۔ وہ "دیر آید درست آید" کی قائل تھی۔ مشتاق کو اس باب میں اختلاف تھا۔ جھٹ پٹ باپ بن جانا چاہتا تھا۔ ضبطِ تولید کو غریب غربا کے کام کی چیز سمجھتا تھا۔ مگر حسبِ عادت بیوی کے سامنے "جو حکم سرکار" کہہ کر ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو گیا۔ چنانچہ وہ سب تدبیریں اختیار کی گئیں جو میاں بیوی کو اس نعمت سے محروم رکھنے کے لئے طبِ جدید تا حال مہیّا کرنے کے قابل ہوا ہے۔ اس زمانے میں ضبطِ تولید پر اچھا خاصہ لٹریچر مسز مشتاق کے کمرے میں بکھرا نظر آنے لگا۔ فضا اس موضوع پر بحث سے گونجنے لگی۔ وہ لیڈی ڈاکٹر جو اس باب میں سند کا درجہ رکھتی ہیں ان سے مشورے ہونے لگے۔

مگر قدرت ستم ظریفی پر آمادہ تھی۔ اللہ میاں اب اتنی جلدی یہ تحفہ بھیج رہے تھے۔ مشتاق نے سوچا اس ناپسندیدہ صورتِ حال پر نفیس کا تبصرہ کیا ہوگا؟ کیا وہ اپنی مراد کے بر نہ آنے پر دلگیر نہ ہوگی؟ کیا وہ اتنی بے حس ہے کہ جس ننھی منی جان نے اپنی آمد کا تار دیا تھا اس کے استقبال کی تیاری نہ کرے؟ کیا وہ فطرت کے خلاف ہو سکتی ہے؟

مشتاق نے دیکھا، نفیس سسرال، میکے اور ملنے جلنے والیوں کے سامنے تو خوشی ظاہر کرتی ہے، حسبِ ضرورت شرماتی بھی ہے۔ لیکن اپنے دل کی گہرائیوں میں اس آنے والے کو ناخواندہ مہمان خیال کرتی ہے۔ ایسا مہمان جس کو دیکھ کر مروت سے تو کہتے ہیں "آہا! خوش آمدید! کدھر بھول پڑے؟ عید کا چاند ہو گئے!" مگر دل میں کہتے ہیں "کمبخت کیسے بے وقت آ مرا!" یہ دیکھ کر مشتاق کو یہ شعر بار بار یاد آ رہا تھا۔

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی ٭ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

غرض مشتاق محسوس کر رہا تھا کہ وہ کیا محسوس کر رہی ہے۔ اور نفیس بھی محسوس کرنے لگی تھی کہ مشتاق محسوس کر رہا ہے کہ وہ کیا محسوس کر رہی ہے۔

لیکن جیسے جیسے دن گذرتے گئے، مشتاق کو غیر محسوس طور پر خوشگوار تبدیلی نظر آنے لگی۔ یہ تبدیلی یقیناً مشتاق کی رنجیدگی کا نتیجہ نہ تھی۔ نفیس کے متعلق ایسا نیک گمان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تبدیلی اندر سے ہو رہی تھی۔ نفیس کے پہلو میں جب ننھا دل دھڑکنے لگے تو اسے سپر ڈال کر اپنے آپ کو سپرد کر دینے کے سوا کوئی اور چارۂ کار نظر نہ آیا۔ اکثر وہ جانے کس خیال میں آپ ہی آپ مسکراتی رہتی۔ مشتاق پر غیر معمولی طور پر مہربان نظر آنے لگی۔ اور وہ دل میں پکار اُٹھتا "واللہ یا ہم بھی کچھ ہیں!"

مشتاق کی شادی محبت کا ایک کرشمہ تھی۔ کم از کم خیال تو

اس کا یہی تھا۔ لیکن خانہ آبادی کے بعد رفتہ رفتہ اسے محسوس ہونے لگا کہ عشق کا وہ اگلا سا جوش و خروش گھٹتے گھٹتے صفر کے قریب آگیا ہے البتہ روزمرہ کی سی دوستی دونوں میں قائم رہی۔ بہرصورت اب اسے آس بندھی کہ عنقریب آبادی کا باعث بننے والی معصوم مخلوق کی بدولت محبّت کے رشتے پھر مضبوط ہو جائیں گے، انشا اللہ۔

اب نفیس کا کمرہ نگار خانہ بن گیا۔ خوبصورت سے خوبصورت آدمیوں کی تصاویر جمع کی گئیں۔ جن میں ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصاویر کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا خوبصورتوں کی ایک عالمگیر کانفرنس منعقد کی گئی ہے۔ ایلم، فریم، کیلنڈر ان سب کی ایک دوکان سی لگ گئی جو نمائش کے اعتبار سے ہیر کٹنگ سیلون کی ہم پلہ نظر آنے لگی۔ مشتاق نے نفیس کو شوہرانہ مشورے دینے شروع کئے۔ "دیکھئے خوشگوار خیالات سے دل بہلایا کیجئے غم و غصہ پیدا کرنے والے خیالات کو دل میں پھٹکنے نہ دیجئے اچھی اچھی فرحت و انبساط پیدا کرنے والی کتابیں پڑھا کیجئے لطف و مسرت لانے والے گانے ریڈیو پہ سنا کیجئے اور خود گایا کیجئے۔" وغیرہ وغیرہ۔ وہ جانتا تھا بلکہ دونوں جانتے تھے کہ اس قسمت ساز دور مجبوری میں خوبصورت تخیلات و تصورات بچّے کی شکل و صورت اور سیرت پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔

لیڈی ڈاکٹر سے پہلے کچھ اور مشورے لئے جاتے تھے۔ اب بالکل مختلف بلکہ متضاد مشورے لئے جانے لگے۔ غذا میں احتیاط کی جانے لگی نفیس پہلے بھی کوئی کام کاج نہیں کیا کرتی تھی۔ اب تو زیادہ چلنے پھرنے کا بھی پرہیز ہو گیا۔ سورج گہن کے روز تو وہ تمام وقت بے حس و حرکت لیٹی رہتی۔

بالآخر اس تہذیب زدہ گھرانے پر ایک بدنما موقع ایسا بھی آیا جبکہ بے پردہ نفیس کو اپنے میکے جا کر بالکل پردہ نشین ہو جانا پڑا گھر کی چار دیواری میں مقید ہو جانا پڑا۔ آزادیٔ نسواں اور مساواتِ مرد و زن کے نظریے بس اس حد پر آکر بے بس ہو جاتے ہیں۔

اور جب وہ خوشگوار مگر نازک مرحلہ قریب آنے لگا تو گھر میں بحثا بحثی ہونے لگی کہ یہ مرحلہ کس جگہ طے ہو کسی نے کہا، فلاں عیسائی دائی کو گھر ہی پر بلا یا جائے۔ کسی نے کہا، فلاں لیڈی ڈاکٹر کے نرسنگ ہوم میں یہ کام انجام پائے۔ کسی نے کہا فلاں زچگی خانہ ٹھیک رہے گا۔ کسی نے کہا۔ فلاں ہسپتال کا انتظام اچھا ہے۔

افراد متعلقہ سے رائے لی گئی۔ مشتاق نے رُکتے رُکتے رائے ظاہر کی کہ فلاں نرسنگ ہوم مناسب رہے گا۔ لیکن نفیس کی رائے تھی کہ فلاں ہسپتال مناسب ہے گا اُس کی کئی سہیلیاں اسی ہسپتال کی ہوا کھا چکی تھیں اُس کے انتظام اور آرام کی تعریف کرتی تھیں چنانچہ یہی طے پایا اور مشتاق عادتاً راضی ہو گیا۔

جس طرح ریل سے آنے والے کو لینے لوگ اسٹیشن جایا کرتے ہیں، اُسی طرح مشتاق صاحب نووارد کو لینے وقت سے پہلے ہسپتال پہنچ گئے اور ٹہلنے لگے۔ ہسپتال میں جانے سے ہی مشتاق کو ایک وحشت ہوتی تھی۔ مریضوں کی چیخ پکار، آہ و بکا، دواؤں کی بینر بدبو۔ آواز اس طرح گونجتی تھی جس طرح گنبد والے مقبرے میں۔ اور پھر یہ سفیدی جس سے کفن کا تصوّر آتا تھا۔ در و دیوار سفید، پلنگ سفید، زمین سفید، آسمان سفید، نرس کا لباس سفید، رنگ سفید، خون سفید۔ ہسپتال برف کا سرد پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ ویسے بھی وہ اپنی بیوی کی وجہ سے پریشان تھا۔ مگر یہ ماحول اس کی وحشت بڑھ گئی اور وہ اور تیزی سے ٹہلنے لگا۔ یہ مالدار معزز نوجوان جس نے ہسپتال کا سب سے زیادہ کرایہ والا وارڈ لیا تھا، جب اس کو دیکھ کر نرسیں دل لبھانے والی مسکراہٹ میں بجھے ہوئے تیر چلاتیں تو وہ گھبرا اُٹھتا۔ یہ سفید تیتریاں جو عام وارڈ کے غریب مریضوں سے بے رُخی اور بے صدی کی بدتہذیبی اور بدکلامی کے لئے دُور دُور مشہور تھیں۔ اپنی ساری ہمدردی اور خلوص ذرا بڑی قسم کے مریضوں اور تیمارداروں کے لئے محفوظ رکھتیں۔ جب ان کے جوتے کی اونچی ایڑی پکّے فرش پر کھٹ کھٹ بولتی تو مشتاق کو محسوس ہوتا کوئی ہتھوڑے لگا رہا ہے گو اس کے ایک دل پھینک دوست کا خیال تھا "تم کیا جانو؟ اس بول میں بڑی موسیقی ہے۔ ان کے ساتھ کبھی تفریح کرو تو روشن ہو۔"

بالآخر ایک نرس مژدۂ جانفزا لائی۔ "مبارکباد۔ لڑکی ہوئی خیریت سے ہے۔" نرس کے چہرے پر مسکراہٹ کا نقاب پڑا ہوا تھا۔ اندر سے آواز آرہی تھی "ٹیں ٹیں ٹیں۔" مشتاق نرس کی مسکراہٹ پہ گھبرانا بھول گیا۔ مارے خوشی کے جامے سے باہر ہو گیا۔ خدا کا شکر اور نرس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ اُس نے پوچھا "کیا میں اندر جا سکتا ہوں؟"

نرس نے وہ نقاب آتارتے بغیر جواب دیا۔ "ابھی نہیں بچّہ کو نہلانے لے جا رہے ہیں۔ پھر زچہ بچّہ کو ہال سے وارڈ میں پہنچا دیا جائے گا فکر نہ کیجئے خیریت ہے۔"

مشتاق نے شکریہ ادا کرنے کے خیال سے اُس ڈاکٹر کو پوچھا جس نے یہ فریضہ انجام دیا تھا۔ جواب ملا۔ وہ اندر ہی ہیں۔ ابھی کئی اور زچگیاں ہیں۔ بڑی دیر بعد زچہ بچّہ کو وارڈ میں منتقل کیا گیا۔ مشتاق کے والدین آ گئے تھے۔ نئے باپ کے باپ بیٹے کو سُنانے کی خاطر کہ کہیں رنجیدہ خاطر نہ ہو کہنے لگے "بیٹی کیا بیٹا کیا۔ خدا کی دین ہے۔" اور والدہ تشریحاً بولیں۔ "بیٹی رحمت ہے۔"

مشتاق جھینپ رہا تھا۔ نفیس نقاہت سے مُسکرا رہی تھی۔ مشتاق کے والد جن کو مذہب سے ابھی تھوڑا بہت لگاؤ باقی تھا، پوتی کو دیکھ کر آیتیں پڑھ پڑھ کر دم کرنے لگے۔ اُس کے کان میں اذان دی، پھر دعا۔

مشتاق نے بڑے اشتیاق سے جھک کر جھولے میں بچّی کو دیکھا۔ رنگ صاف تھا۔ شباہت کس کی تھی یہ ابھی ظاہر نہ ہوتی تھی۔ تھوڑے سے دن بعد ظاہر ہو جائے گا۔ بچّی آنکھیں بند کئے کسی گہری سوچ میں پڑی تھی۔ خواب میں اس معصوم کی ہنسی کبھی کبھی ہچکی بن کر سُنائی دیتی تھی۔

ہسپتالوں میں چھوٹی موٹی بدعنوانیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جن کی افرادِ متعلقہ کے سوا دوسروں کو خبر نہیں ہوتی۔ مگر ایک دفعہ ایک ہسپتال میں بلّی نے بچّے کو چبا ڈالا تھا۔ اس حادثہ پر اخباروں میں ایک اودھم مچا تھا۔ اس لئے نرسوں کو تاکید کی گئی کہ بچّی کی خاص حفاظت کی جائے۔

لڑکی کا نام جلیس رکھا گیا۔ مشتاق کے والد نے کلامِ مجید کھول کر ایک دوسرا نام تجویز کیا تھا۔ مگر آزاد اور بے قافیہ شاعری کے اس دور میں بھی قافیہ پیمائی ہی کو نفیس کے گھر والوں نے مناسب سمجھا۔

ڈاکٹروں اور نرسوں کو پھل پھلاری اور تحفے تحائف اور ملازمین کو انعام واکرام دینے کے بعد نفیس میکے آ گئی۔ خوشیاں منائی گئیں۔ رسمیں ہوئیں، دعوتیں ہوئیں، عقیقہ کی دعوت تو بڑے زور کی ہوئی۔ لیکن نفیس کی سمجھ میں نہ آتا تھا عقیقہ میں سر کیوں منڈایا جاتا۔ بچّی خفا بھی ہوا اور پہلی بار بال کٹوائے گئے زمانے میں اس رسم کو عقیقہ کیوں نہ کہا جائے۔

چار سال گذر گئے۔ جلیس نہ ماں پر گئی تھی، نہ باپ کی شباہت لائی تھی۔ کھلا رنگ تھا۔ ناک نقشہ اچھا ہی تھا۔ نفیس کو بے حد اور مشتاق کو ایک حد تک افسوس تھا کہ اتنی محنتوں کے باوجود لڑکی نسیم یا لیلا دیسائی بن کر نہیں آئی تھی۔ دُبلی پتلی لڑکی تھی۔ شروع ہی سے ڈاکٹروں کی تجویز کردہ مقوی غذائیں دی جاتی رہیں۔ مگر بچّی موٹی ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ خاموش طبیعت کی لڑکی تھی۔ مگر بلا کی ذہین تھی۔ نفیس کی ممی اس کی بلائیں لے کر کہا کرتی تھیں۔ "بیٹی، تجھے نظر لگتی ہے۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ تیری ماں بھی تو تیری عمر میں اتنی سمجھ والی نہ تھی۔"

مشتاق تو اپنی بچّی کو بُری طرح چاہتا تھا۔ نفیس سوچتی اس صورت پر یہ کیفیت ہے، وہ بہت خوبصورت ہوتی تو خدا معلوم حضرت کا کیا حال ہوتا۔ مشتاق ویسے بھی بچّوں سے بڑی محبت کرتا تھا۔ اُن کو دیکھتے ہی گود میں لے کر پیار کرتا اور میٹھی میٹھی بے معنی باتیں کرنے لگتا۔ اور یہ تو خاص اپنی بچّی تھی اسے جتنا پیار کرتا کم تھا۔ وہ جلیس کے ساتھ کھیلتا ہوا شوخی چلا کر بچّوں کی سی حرکتیں کرنے لگتا تو جلیس کی دادی خوش ہو ہو کر اپنے شوہر سے کہتیں۔ "یاد ہے اپنا زمانہ؟ ایک وقت آپ بھی تو ایسے ہی دیوانے بنے ہوتے تھے۔" اسی محبت پدری کا نتیجہ تھا کہ جلیس ممی سے زیادہ پاپا سے لگاؤ رکھتی۔

عہدِ حاضر کے بچّوں کا ایک قومی ترانہ آپ نے بھی سُنا ہوگا۔ اس کو یہاں نقل کرنا تحصیل حاصل ہے۔ اس کا یہ ٹیپ کا مصرعہ غالباً آپ کو یاد ہوگا:

مری پیاری آیا مری جان آیا

ایک دوسرا ترانہ بھی ہے جس کا صرف ایک شعر مجھے یاد ہے۔

آیا کی گود میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

ایک زبان زدِ خاص و عام مقولہ ہے، آیا کی گود بچّے کی پہلی تربیت گاہ ہے۔ مندرجہ بالا شعر اسی مقولہ کی تفسیر ہے۔ آیا کی مامتا پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اسے یہاں بلا حوالے نقل کروں تو سرقے کا الزام آئے گا۔ اُردو کی پہلی کتاب کا وہ جدید ایڈیشن آپ کے بچّے بھی پڑھتے ہوں گے جس کا پہلا سبق یہ ہے "آیا بچّے کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ ماں سینما یا شاید کانفرنس یا شاید کلب گئی ہے۔ باپ سگار پی رہا ہے اور خوش ہو ہو کر آیا کو دیکھ رہا ہے ....."

نفیس نے بھی جلیس کے مطابق ایک آیا رکھی تھی۔ وہ بچی کی پرورش اور پرداخت کے معاملے میں اپنے دماغ اور حکومت سے رکھی تھی۔ جوان آیا پاک صاف ستھری تھی پاپا جب جلیس کو پرام میں بٹھا کر سیر کو لے جاتی تھی تو خواہ مخواہ لوگ مسکرا مسکرا کر دیکھتے تھے۔ میرا مطلب ہے جلیس کو دیکھتے تھے گھر میں آیا اور کسی دوسرے ملازم میں جھگڑا ہوتا تو نفیس ہر دفعہ آیا کے حق میں فیصلہ دیتی تھی۔

چار سال، چار مہینے، چار دن ہونے تو جلیس کی بسم اللہ بڑے دھوم دھڑکے سے ہوئی۔ بسم اللہ میں مشتاق کا چھوٹا بھائی اشرف جو فوج میں لفٹننٹ تھا چھٹی لے کر شریک ہوا تھا۔ بچی کے دادا نے بسم اللہ پڑھائی۔ جلیس نے اس طرح فرفر سورۂ اقرا اپنی توتلی زبان میں پڑھی کہ تمام حاضرین "ماشاء اللہ" "ماشاء اللہ" کہنے لگے۔ بے شمار دعائیں دی گئیں، اور بلائیں لی گئیں۔

جلیس میں ذہانت جتنی قریب تھی شرارت اتنی ہی دور تھی نفیس بچپن میں بہت شوخ و شریر تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنی بچی بھی ویسی ہی شرارتیں اور کلیلیں کرتی پھرے۔ نفیس کبھی کبھی جلیس کو سامنے بٹھا کر اپنی بڑی بڑی مست آنکھوں سے اس کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی اور پھر دراز سے کہتی ہے "تو میری بیٹی نہیں" اور جلیس معصومانہ انداز سے جواب دیتی "میں پاپا کی بیتی (بیٹی) ہوں" اور مشتاق خوشی کے مارے بے حال ہو کر جلیس کو گود میں لے لیتے اور تمام چہرے پر چومتے ہوئے ٹہل ٹہل کر بوسوں کی بارش کر کے قہقہے لگا لگا کر کہتا جاتا "یہ میلی بتی (میری بیٹی) ہے۔ یہ میلی بیتی ہے۔"

انواع و اقسام کے کھلونے جلیس کے لئے جمع کئے گئے تھے۔ کاغذ کی گڑیاں، چھوٹی موٹریں، موٹر لیس، ٹرک، جیپ، ملٹی تمر، پھولوں کی سائیکل، ہوائی جہاز، غرض جو اعلیٰ لے گیا گیا مگر ان کھلونوں سے جلیس کی دلچسپی رفتہ رفتہ گھٹتی گئی۔ وہ تنہائی میں خاموش سی کسی سوچ میں رہتی۔ گویا زبان بے زبانی سے کہہ رہی ہو ؎

کھلونے دے کے بہلائی گئی ہوں

رشتہ داروں اور دوستوں کے بچے آجاتے تو اس کا دل بہل جاتا۔ وہ ان سے کھیلنے میں مشغول رہتی۔ مگر جب گھر پھر ان سے خالی ہو جاتا تو وہ اپنے خول میں سکڑ آتی۔ خدا جانے کس سوچ میں پڑ جاتی، مٹی میں کھیلتی۔ ہاتھ اور کپڑے میلے کر لیتی۔ درخت، آسمان کا سمندر، ابر کے ٹکڑے، چڑیاں، کوّے، چیل، ان سب کو غور سے دیکھتی اور جب ہوائی جہاز کی آواز آتی تو دوسرا کام چھوڑ کر اُسے دیکھنے آجاتی۔ دوسرے بچے ہوائی جہاز کو دیکھتے ہی ناچ ناچ کر تالیاں بجا بجا کر چلاتے ہیں "ہوائی جہاز! ہوائی جہاز!" لیکن جلیس خاموش کھڑی ہوائی جہاز کے غائب ہونے تک اُس کو تکتی رہتی۔ پھر اپنا ہوائی جہاز نکال کر اُلٹ پلٹ کر دیکھتی، مشتاق سے منہ پھلا کر شکایت کے لہجے میں کہتی "پاپا میلا (میرا) ہوائی جہاز اُلتا (اُڑتا) کیوں نہیں؟" مشتاق بیٹی کی آزردگی پر پریشان ہو کر جوابات دینے کی کوشش کرتا۔ توجہ پلٹانے کے لئے دوسری پیاری باتیں کرتا، مگر وہ مطمئن نہ ہوتی۔ پلٹ پلٹ کر وہی سوال دُہراتی "میلا ہوائی جہاز اُلتا کیوں نہیں؟" چچا جب تک رہے وہ بھی اپنی فوجی لیاقت بگھار کر جواب دیتے مگر بھتیجی بے اطمینانی کی حالت میں انہیں اس طرح دیکھتی گویا کہہ رہی ہو "اتنے بڑے ہوئے۔ اتنی بات نہیں معلوم" پھر منہ بنا کر رونے لگتی۔ بیحد حساس اور زود رنج تھی۔ کوئی بات ذرا بھی ناگوار ہوتی تو رو دیتی۔

بھتیجی کی اس متانت اور اس تجسس کو دیکھ کر فوجی چچا ہنس کر مشتاق سے کہتے "بھائی مبارک ہو صاحبزادی بڑی ہو کر فلسفی نکلے گی۔ دُنیا کی پہلی فلسفی عورت" اور مشتاق جواب میں کہتا "شکر ہے کہ وہ فوجی نہیں بنے گی"

آیا بھاگ گئی۔ جاتے ہوئے چاندی کی ڈبیہ، جلیس کی ایرنگ اور کچھ روپیوں پر ہاتھ صاف کر گئی۔ ایک ہڑ مچا۔ لیکن جلیس آیا کی یاد میں رونے لگی۔ آیا کو واپس بلانے کی تدبیریں کی گئیں لیکن وہ عہد رفتہ بن کر گئی تھی۔ اب ایک نئی آیا کے تقرر کا مرحلہ پیش آیا۔ لڑکی کے لئے انگریزی کے اُستاد کا مسئلہ بھی کئی دن سے زیر بحث تھا۔ چنانچہ اخبار میں "ضرورت ہے" کے کالم میں دونوں کے لئے اشتہار دئے گئے۔

ضرورت ہے آیا کی

ایک اعلیٰ خاندان کی بچی کے لئے ایک آیا کی فوری ضرورت ہے۔ شوہر والی کو ترجیح دی جائے گی۔ تنخواہ پچیس روپے اور کھانا۔

ضرورت ہے ایک اُستاد کی

ایک اعلیٰ خاندان کی بچی کے لئے ایک اُستاد کی ضرورت ہے۔ انگریزی اور اُردو کی ابتدائی تعلیم دو گھنٹے دینی ہوگی۔ گریجویٹ کو ترجیح دی جائے گی۔ فیس پندرہ روپے۔

مشتاق نے ان اشتہارات کو دیکھ کر سوچا، یہ اُستاد اور یہ آیا حیثیت اور تنخواہ کے اعتبار سے انہوں نے ایک دوسرے کی جگہ کیوں لے لی ہے؟ اسی پر کیا موقوف ہے؟ دُنیا میں ہر شخص غلط جگہ پر چپکا ہوا ہے۔ مشتاق نے دبی زبان سے اس ناانصافی کی طرف اشارہ کیا۔ مگر نفیس نے "ادنھ" کی رولنگ دیکر بحث ختم کردی۔

بات یہ ہے، نفیس متوسط طبقہ کے ایک اُستاد کے لئے اس سے زیادہ مالی زیرباری اُٹھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کو متوسط طبقہ سے نفرت تھی۔ یہ جذبہ کچھ تو اُس نے ورثہ میں پایا تھا اور کچھ اس کے کبر و نخوت نے اس کو جلا دی تھی۔ اسکول اور کالج میں وہ متوسط طبقہ کی بعض ہم جماعت ذہین لڑکیوں سے مدد لیا کرتی تھی، اور اوپری دل سے ان سے محبت سے پیش بھی آتی تھی۔ مگر دل میں ان سے نفرت کرتی تھی۔ اسے اپنی ساس سے بھی کد تھی محض اس لئے کہ ان کے آبا و اجداد اسی طبقہ کے لوگ تھے وہ اکثر تنہا اور کبھی اپنے شوہر کے ساتھ باہر نکلتی اور معزز طبقہ کے مرد اسے گھورتے تو وہ دل میں خوش ہوتی۔ لیکن جب متوسط طبقہ کے نوجوان یہی حرکت کرتے تو غصّہ کے مارے اس کا چہرہ تمتما اُٹھتا۔ اور شوہر صاحب جو ایسے موقعوں پر فطری شرمیلے پن کے باعث نظریں نیچی کئے رہتے تھے وہ بھی ضرورتاً ان نوجوانوں پر خفگی کی نظر ڈال لیا کرتے حالانکہ ان کا دل بیوی کی اس دوعملی کو حق بجانب ثابت کرنے میں ناکام رہتا تھا۔

نفیس کہتی تھی، اس طبقہ کے وجود کی غرض و غایت؟ نہ اِدھر کا ہے نہ اُدھر کا۔ بیچ اَدھر ہے۔ آدھا تیتر آدھا بیٹر تقال ہو ہمارا مُنہ چڑاتا ہے۔ ہمارے طبقہ کی تقلید اس کا وظیفہ ہے۔ ہمارے مرتبہ پر آنا اس کی آرزو ہے۔ بندر رہتے رہتے کوا بن گیا ہے جو ہنس کی چال چلا تھا یہی وجہ تھی کہ جب جلیس کا اُستاد انور بی۔اے کبھی کبھی ناغہ کرتا تو نفیس اتنے دن کی فیس کاٹ کر دینے پر مائل رہتی تھی۔ وہ متوسط طبقہ کے اس خستہ حال نوجوان کو دیکھ کر کراہت سے مُنہ پھیر لیتی تھی۔ وہ مذاق سے کبھی کبھی اپنی بچّی کو یہ سبق پڑھاتی۔ "الف۔ بے کی تختی۔ استاد کی آئی کمبختی"۔ لیکن اس مذاق کے معنے بہت گہرے ہوتے، اور یہ معنے فقط مشتاق سمجھ سکتا تھا۔

نئی آیا آئی، بچّی جلد ہی اس سے مانوس ہوگئی۔ وہ روز شام کو جلیس کو گاڑی میں باغ لے جاتی۔ ہر دوسرے تیسرے ایک نیا مرد اس کے ساتھ دیکھا جاتا۔ جلیس دن کو گھر میں گھبراتی رہتی اور شام کی سیر کی منتظر و مشتاق رہتی تھی۔ باغ میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ اُدھر آیاؤں کی کانفرنس ہوتی جس میں چند شوفر بھی شامل ہوجاتے اور سب اپنے اپنے صاحب بیگم صاحب اور گھر والوں کے راز اور اندرونی حالات کی رپورٹیں ایک دوسرے کو دیتے۔ بہرحال نفیس اس آیا کے کام سے مطمئن تھی، مگر وہ پہلی آیا کے کام سے بھی تو مطمئن تھی۔

جلیس کا اُستاد بلا اطلاع غائب ہوگیا۔ نفیس نے کہا چلو چھٹی ہوئی، خس کم جہاں پاک۔ مشتاق نے دوسرے اُستاد کے تقرر کی ضرورت جتلائی۔ مگر اب نفیس ایسے ٹیوٹروں کی روادار نہ تھی، جو کام چور اور فرض ناشناس ہوں۔ اُس نے بچّی کی تعلیم کے لئے ایک گورنس کو رکھ لیا۔

اِس طرح جلیس کی تعلیم و تربیت ہونے لگی۔

نفیس کی باچھیں یہ دیکھ دیکھ کر کھلی جاتی تھیں کہ بچّی انگریزی خوب سیکھتی جارہی ہے۔ بالکل انگریزنیوں کے لب و لہجہ میں بات چیت کرنے لگی ہے گویا کہ انگریزی اس کی گھٹی میں پڑی ہے۔

مگر پھر بھی جلیس گھر میں اجنبی کی طرح کسی خیال میں ڈوبی رہتی۔ اسے انگریزی طرز کے ایک مدرسے میں بھیجدیا گیا کہ وہاں اِس کا دل بہل جائے گا، میل ملاپ، ملنساری آجائے گی۔ پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہوگا۔ نئی نئی باتیں، سیکھنے انگریزی گیت اور کہانیاں سیکھ کر آئے گی۔ شوخی شرارت آجائے گی۔ جس کے نہ ہونے کا نفیس کو قدرے ملال تھا۔

اوّل اوّل نفیس دن بھر اس کے خیال میں ڈوبی رہتی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی جدائی کی عادی ہوگئی۔ ملاقاتیوں کے سامنے وہ اپنی بچّی کو لپٹا کر، بھینچ بھینچ کر اور بوسے لے کر کہا کرتی "میری بچّی، میری جان۔ جگر کا ٹکڑا، کلیجہ کی کور"۔ لیکن کبھی کبھی اُس کے دل میں خیال آتا تھا، بچّی سے کیوں مجھے اتنی شدید محبت نہیں ہے جتنی مشتاق کو ہے؟ کس لئے باوجود کوشش اپنی اولاد سے دیوانہ وار محبت کرنے میں ناکام ہوں؟ کیا اس لئے کہ وہ اتنی خوبصورت نہیں جتنی میری بچّی کو ہونا چاہیئے تھا؟ کیا اِس لئے کہ وہ شوخ اور چلبلی نہیں؟ کیا اس لئے کہ ضبطِ تولید کی تدبیر کے باوجود تولد ہوگئی؟ کیا اِس لئے

کہ لڑکی ہوئی، لڑکا نہ ہوا۔ کیا اس لئے کہ میں اُن عورتوں میں ہوں
جو فقط نا اہل اولاد دیتی ہیں مصروفیت قائم ہوتی ہیں اور اس سے
لفظ و احسن ۰ اپنی محبت ۔ری ہر
ایسے سوالات وہ اسے رہتے کیا کرتی تھی؟ لیکن کوئی
نتیجہ نہ نکلا۔ جواب اسے نہیں ملتا۔

تیرے بدقسمتی دی جا سکتی ہے۔ مد لمسہ تقدیر کے خصمہ
یہ لڑکی جس کا نام حسن رکھا گیا تھا اور جسے وہ اپنا سمجھ کر پال
رہی تھی درحقیقت اس کی اپنی لڑکی نہ تھی۔ جو لڑکی اس کے
بطن سے پیدا ہوئی تھی وہ پیدائش کے دن ہسپتال میں
نہلاتے وقت نرسوں کی غلطی سے بدل گئی تھی اور یہ لڑکی جلیس
جو یہ سوال کیا کرتی تھی "میلا ہوائی جہاز الٹا کیوں نہیں؟"
متوسط طبقہ کے ماں باپ کی اولاد تھی۔

ساقی بک ڈپو کی مطبوعات

شکست: ملک کے مشہور افسانہ نگار مسٹر کرشن چندر ایم۔ اے نے یہ ناول لکھا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ شکست کو اردو کی ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ناول کا پس منظر بہشت نظیر کشمیر ہے۔ کرشن چندر نے اس سرزمین حسن میں زندگی کے رومانی پھول کھلائے ہیں۔ قیمت تین روپے!

نئے افسانے: یہ مجموعہ مسٹر کرشن چندر ایم۔ اے نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب ہندوستان کے جدید افسانوی ادب کی تصویر ہے، اردو، ہندی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تلگو، بنگالی، بہاری وغیرہ افسانہ نگاروں کے تیس بہترین نقوش اس میں شامل ہیں۔ جان لیمین کہتا ہے "انگریزی افسانہ زوال کی انتہائی پستیوں کی طرف جا رہا ہے" برعکس اس کے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستانی افسانے پر شباب بہار آ رہی ہے۔ ضخامت ۲۵۴ صفحے، کتاب مجلد
قیمت چار روپے!

گھونگھٹ میں گوری جلے: کرشن چندر کے چودہ طنزیہ مضامین، افسانوں اور ڈراموں کا منتخب مجموعہ انہیں مرتب کرنے میں مصنف نے پورے دو سال صرف کئے ہیں۔ ... سے آراستہ۔ مجلد قیمت ایک روپیہ بارہ آنے!

غزل

جو نظر ہے مطمئن ہے جو نفس ہی شادماں ہے
کہ بقیدِ جورِ پیہم کوئی مجھ پہ مہرباں ہے

تری اک نظر کا حاصل عدم و وجودِ جاں ہے
کہیں زندگی کا عالم کہیں مرگِ ناگہاں ہے

ترے حسنِ ضو فگن سے یہ فروغِ گلستاں ہے
نہ ہو جس میں تیرا پرتو وہ بہار بھی خزاں ہے

مرے تیرے سوزِ دل کا نہیں بوالہوس تقابل
مری آگ میں شرر ہیں تری آگ میں دھواں ہے

کبھی پاؤں لڑکھڑائے تو کہا یہ مجھ سے دل نے
وہ چمک رہی ہے منزل وہ غبارِ کارواں ہے

تری بزم میں رہوں کیا ترے سامنے کہوں کیا
نہ مری نظر نظر ہے نہ مری زباں زباں ہے

جو ہوا اذنِ اہلِ گلشن تو میں ہر کلی سے کہہ دوں
ترا مضمحل تبسم مرے ذوق پر گراں ہے

یہی رنگ ہے تو کیونکر ہو رسائی تا بہ منزل
کہیں اہلِ کارواں ہیں کہیں میرِ کارواں ہے

رہوں ترکِ معصیت پر میں شکیل کیسے قائم
ابھی دل میں ولولے ہیں ابھی آرزو جواں ہے

شکیل بدایونی

اشرف صبوحی دہلوی

روپا چمار

آج سے پچیس تیس سال پہلے تک دلّی کے چھوٹے بڑے، امیر غریب سَو میں سے ستّر ضرور دیسی جوتی پہنتے۔ بلکہ بعض خاندانوں میں تو انگریزی جوتا پہننے کی قسم تھی۔ بلیماروں کے حکیموں کا بچہ بچہ سلیم شاہی سپاٹ جوتی پہنتا۔ سب سے پہلے مرحوم حکیم اجمل خاں نے انگریزی جوتا استعمال کیا۔ پھر کیا تھا اوروں بھی پہننے لگے اور اب اُن کے ہاں بھی آدھے تیتر آدھے بیٹر ہیں۔

کوئی ہنر ہو قدردانوں اور شوقینوں کے ہاتھوں میں پلتا اور ترقی کرتا ہے۔ جب تک انگریزیت نے دیسیت پر فوقیت حاصل نہیں کی تھی چمار بھی کاریگریاں دکھاتے اور طرح طرح کی نُدرتیں پیدا کرتے تھے۔ ان میں کبھی شبرازوں کا زور ہوتا تو کبھی عام چماروں میں سے دو چار ایسے نکل آتے جن پر شہر کے سارے شوقین اُمنڈ پڑتے۔ شبرازوں کو شبراز کے رہنے والے نہ سمجھنا یہ لفظ دراصل سراج کا بگڑا ہوا ہے۔ یعنی ان کے باپ دادا کبھی گھوڑوں کا ساز بنایا کرتے تھے۔ گرتے گرتے جوتیاں بنانے لگے۔ لیکن اپنا لقب سراج ہی رکھا اور عام چماروں سے اپنے کو ہمیشہ اونچا سمجھا۔

روپا تھا تو ٹھیٹ چمار مگر اس نے سلیم شاہی جوتی بنانے میں ایسا کمال دکھایا اور اس کی کاٹ کچھ ایسی خوبصورت رکھی کہ اپنے وقت میں شہر بھر میں مشہور ہو گیا۔ دصلی کی زری اور ریشم کے کام کی جوتی اس قدر سُبک اور حسین بناتا کہ سدا کام کی بھرمار رہتی۔ جو ہے روپا کے ہاتھ کی جوتی کا عاشق۔ فرمائشوں سے فرصت نہ ملتی۔ جبکہ دوسرے چمار بمشکل دھیلی بارہ آنے کی مزدوری کرتے روپا ڈیڑھ روپیہ روز کما لیتا۔ اس کی عادتیں بھی چماروں جیسی نہ تھیں۔ کبھی اسے کلال خانے میں نہیں دیکھا۔ رئیسوں کے ہاں حاضری دینا یا اپنا کام کرتے رہنا۔ چال چلن اچھا تھا اس لئے اپنے بال بچوں کے ساتھ اطمینان سے رہتا۔ اوروں سے اچھا کھاتا پہنتا اور کچھ پس انداز بھی کر لیتا۔

پہلے اس کی بیوی بھی محنت مزدوری کیا کرتی۔ گوبر تھپتی۔ بساریوں کے ہاں مسالہ کوٹتی چکی پیستی۔ گھر پیسے بٹنے کا کام کر کے دو چار آنے کما کر لاتی اور گھرستی میں اپنے مرد کا ہاتھ بٹاتی۔ اب اس کے دن بھی پلٹ گئے تھے۔ گھر ہی میں رہتی۔ گھر ہی کے دھندوں میں صبح سے شام تک لگی رہتی۔ روپا نے ایک گائے خرید لی تھی۔ اس کی خدمت کرتی۔ دودھ دہی مکھن نکالنا اس کے ذمے تھا۔

اولاد میں صرف موتی ایک لڑکا تھا ماں کی آنکھوں کا تارا۔ باپ کا دلارا، گھر کا اُجالا۔ سارے دن کھیل کود میں گزرتا۔ بہت ہوتا تو گائے کو جنگل میں لے جاتا وہ چرتی رہتی۔ یہ گدکڑے لگاتا اور شام کو گھر آ جاتا۔ روپا نے ہر چند چاہا اور بیوی سے کہا کہ عمر بیتی جاتی ہے لونڈے کو آوارہ نہ پھرنے دے، میرے پاس بٹھا، کچھ اپنا کام بھی سیکھ لے، کھانے کمانے کا دھندا بھی کرنا چاہیئے۔ میں کب تک ہڈ باں پیلوں گا۔ دُکھ بیماری ساتھ لگی ہوئی ہے۔ ابھی تو میں موجود ہوں اگر ایسی ویسی ہو گئی تو کس کا ہاتھ تکتا پھرے گا۔ لیکن ماں کی مامتا گوارا نہ کرتی تھی کہ اپنے لاڈلے کو دھندے کی قید میں پھنسا کر اس کی تمام خواہشوں کا خون کر دے وہ کہہ دیا کرتی کہ ایسی کیا اتاولی (جلدی) پڑی ہے۔ سب سیکھ لے گا ابھی عمر ہی کیا ہے۔ اور کہیں سیکھنے تو جانا نہیں کچھ دن کھیلے کھالے دو پھر سکھا دینا۔

محنت مزدوری کی کمائی، سستا سماں، اخراجات کم آمدنی زیادہ، پس انداز کرتے کرتے روپا نے ایک چھوٹا سا مکان بھی اپنا بنا کر کھڑا کر لیا۔ کرایہ کے جھنجھٹ سے فرصت مل گئی تھی مزے سے رہتے سہتے تھے۔ مگر گزرتا ہوا وقت ہوا سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ خدا کی قدرت ہوا کا رُخ پلٹا۔ دیسی جوتوں کا رواج کم ہونے لگا۔ جسے دیکھو انگریزی جوتوں کا دلدادہ۔ روپا کا بھی وہ اگلا زمانہ نہ رہا۔ یا تو گھر بیٹھے فرمائشیں آتی تھیں رئیس امیر اس کی خاطریں کرتے تھے۔ گاہکوں سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ شوقین اس کے گھر کا طواف کرتے۔ ٹھوڑیوں میں ہاتھ دیتے کہ پہلے ہماری ادگی تیار کر دے یا اب یہ وقت آ گیا تھا کہ وہ جوتی بنا کر

خود بازار میں بیچنے کے لئے جاتا کوئی موقعہ نہ رہ۔ آنکھ بھر کر دیکھتا دیکھتا بھی تو لاگت سے کم دام لگاتا۔ دلیسی جوتی کی قدر جاتی رہی تھی۔ یمپ ٹائی شو، سو نے اس کا بازار ٹھنڈا کر دیا تھا۔ روپا نے بہت چاہا اور کوشش بھی کی کہ جیسی مانگ ہے ویسے جوتے وہ بھی بنانے شروع کر دے لیکن اوّل تو ہندوستانی وضع اور انگریزی طرز میں زمین آسمان کا فرق۔ اِن کی ساخت اور اُنکی سیب اور۔ ساری عمر دلیسی کام کیا انگریزی پر ہاتھ جمنا دشوار مشق بہم کرنے کے لئے برس دو برس کی مدت چاہیئے۔ نئے کام میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ پڑی دوسرے لیپ شو وغیرہ بنانے میں ایک سینے کی مشین کی ضرورت اور مشین کا خریدنا اس کی بساط سے باہر تھا۔ اِس لئے وہ اپنی قسمت پر بھروسہ کر کے اپنا ہی کام کرتا رہا۔ اور شم پشم گزر ہوتی رہی۔

رفتہ رفتہ دلیسی جوتوں کے خریدار کم ہوتے گئے جس میں جتنی کاریگری ہوتی قیمت زیادہ گر گئی گرا کیا معنی گئی کسی دن کوئی خریدار ہی پیدا نہ ہوتا۔ آخر کار گاہے بگاہے بڑی ہوئی کا لوم جھلا مٹ میں چلا گیا یہاں تک کہ مکان پر قرضہ لینے کی نوبت آ گئی۔

روپا کے گھر کے سرا سر انسانوں کا خون چوسنے والے مارواڑی لے برجو تنے سے ترقی کرتے کرتے شہر کے ایک اچھے ساہوکار کی حیثیت پیدا کر کے سب بڑی حویلی کھڑی کر لی تھی۔ روپا اِن ہی سے قرض لیا کرتا تھا۔ بنئے عام طور پر بہت خود غرض اور بے رحم ہوا کرتے ہیں۔ انہیں کسی کی مصیبت سے واسطہ نہیں ہوتا بلکہ ان کی اسامیوں پر جس قدر زیادہ بپتا پڑے اس کا فائدہ ہے۔ سیٹھ جی کے دانت روپا کے مکان کو کھا جانے کے لئے ہمیشہ کھٹکھٹانے رہتے تھے انہوں نے کئی بار روپا سے باتوں باتوں میں کہا بھی کہ "ارے اس کھنڈرے کو بیچ کیوں نہیں ڈالتا۔ کب تک اس پر قرض کا بوجھ لادے جائے گا" بظاہر تو یہ صلاح نیک تھی مگر اصل مطلب یہ تھا کہ اصل و سود میں السیٹ ڈال کر غریب کے مکان پر قبضہ کر لیں۔

روپا سمجھانے کیا سوچتا تھا کہ ہر دفعہ عاجزی سے انکار کر دیتا اور کہتا کہ "سیٹھ جی ابھی قرضہ ہی کونسا ہے۔ انگریزی کام بنانے کی کوشش کر رہا ہوں اگر بھگوان نے دیا کر دی تو بیسے دو مہینے میں اتر جائے گا۔ سر چھپانے کا ایک ٹھیکرا ہے۔ اسے بھی بیچ ڈالا تو کہاں ٹھوکریں کھاؤں گا" سیٹھ جی بھی بظاہر مسکرا کر جواب دیتے کہ "اچھا بھئی بھگوان تمہاری کمائی میں جس دے۔ ہمیں بھی تمہارے پڑوس سے کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہے" مگر دل میں کہتے کہ سمجھا تا کہاں ہے۔ سود ہی سود میں مکان برابر ہو جائے گا۔ رہ لے اور جتنا رہا جائے۔

حقیقت میں ایسے غریبوں کا مال یہ زر ہیں اور مسکین ڈاکو یونہی ڈکار جاتے ہیں۔ سیٹھ جی کے سامنے جس دن روپا نے ہاتھ پسارا ہے اسی روز انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ ہلدی لگی نہ پھٹکری اور مکان ہتھیا بیٹھے جس وقت وہ ان کے پاس جاتا اس کی بڑی آؤ بھگت ہوتی۔ ہنس ہنس کر بات کرتے۔ روپا بچہ نہ تھا۔ ایسے تماشے اس نے بہت دیکھے تھے۔ مگر بگڑی کا سودا تھا۔ سیٹھ جی کی خاطر داری اس کی آنکھوں میں خار معلوم ہوتی۔ ان کے سینے پر دہ اندر ہی اندر آٹھ آٹھ آنسو روتا۔

خدا کسی کو نہ لگاڑے اور دُنیا میں کسی کا محتاج نہ کرے۔ مطلب اور غرض کے لئے گدھے کو بھی باپ بنا لیا جاتا ہے۔ روپا سمجھتا سب کچھ تھا کہ سیٹھ جی کی یہ للّو پتّو خالی از علت نہیں۔ پھر تقدیر کے آگے اس کی سمجھ کیا کام دیتی۔ غریب کر ہی کیا سکتا تھا۔ اُدھر ان کے جنگل میں پھنس چکا تھا۔ ادھر اپنے بننے کی کوئی صورت نہیں بنتی تھی۔

خرچ چاہے دھیلی روز کا ہو مگر جب آمدنی چار پیسے بھی نہ ہوگی تو چند روز میں کنوئیں خالی ہو جائیں گے۔ روپا جتنا ہو سکتا کفایت شعاری سے کام لیتا۔ ہفتوں گوشت کو ہاتھ نہ لگاتا۔ نئی ترکاریاں بھی لانی چھوڑ دی تھیں۔ ایک وقت دال ایک وقت چٹنی۔ پھر بھی گزر نہ ہوتی۔ مہینے بیس دن میں دو چار روپے سیٹھ جی سے ضرور قرض لانے پڑتے۔ کام کا بالکل مندا ہو گیا تھا۔ سلیم شاہی کے دام نہ اُٹھتے۔ انگریزی لیپ دو چار دفعہ بنائے تو انگھڑ۔ جو دیکھتا ہنستا۔ شہر میں چار دن کے لئے مزدوری کی کیا کمی ہے مگر ایک تو اُس نے ساری عمر کوئی دوسرا کام نہیں کیا تھا۔ دوسرے غموں نے اندر ہی اندر گھُلا کر اس کی طاقت سلب کر لی تھی۔ آئے دن بیمار رہتا۔

کم بختی جب آتی ہے تو چاروں طرف سے۔ ادھر روپا کو بخار آنے لگا۔ اور اُس کی عورت کو بیٹھے بیٹھے دست آنے لگے شہر میں ہیضے کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ روپا کے پیر تلے کی زمین

نکل گئی۔ اپنے لئے تو وہ کبھی دمڑی کا شربت بھی نہیں لایا تھا۔ یونہی بنجار کو ٹال دیتا مگر بیوی کا یہ حال دیکھ کر ڈر گیا۔ سوچنے لگا کیا کروں؟ حکیم وید، ڈاکٹر کوئی مفت دوا نہیں دیتا۔ خیراتی ہسپتالوں میں بیچاروں کی کیا پرسش۔ وہاں موٹی اسامیاں پوچھی جاتی ہیں۔ گھر میں زہر کھانے کو چار کوڑیاں نہیں ہائے ہائے کرتا ہوا اُٹھا کہ چلو سیٹھ جی سے کچھ روپیہ اور مل جائے تو دوا دارو کا کام چلے۔ اپنے بس تو اپنا گھر اُجاڑنا چاہئے نہیں۔

آہستہ آہستہ سیٹھ جی کی بیٹھک میں پہنچا۔ منیم جی بہی کھاتہ کھولے حساب کیا اُلٹے کے سٹے ملا رہے تھے۔

روپا۔ منیم جی۔ بندگی۔

منیم:۔ (بغیر آنکھ اوپر اُٹھائے) کون روپا ہے؟

روپا۔ ہاں جی۔ سیٹھ جی کہاں ہیں؟

منیم:۔ گھر میں گئے ہیں۔

روپا:۔ کب لوڑی آئیں گے۔

منیم:۔ اُن کے من کی موج ہے۔

روپا:۔ تو میں بیٹھوں۔

منیم:۔ تیری خوشی۔

روپا ایک طرف بیٹھ گیا اتفاق سے زیادہ دیر بیٹھنا نہیں پڑا۔ سیٹھ جی توند سہلاتے ہوئے آگئے۔

سیٹھ جی:۔ (ذرا بے رُخی کے ساتھ) کہو چودھری روپا؟ آج کیسے آنا ہوا۔ کہیں رستہ تو نہیں بھول گئے۔

روپا:۔ مہاراج میری حالت بہت خراب ہوتی جاتی ہے۔ کل رات سے لونڈے کی ماں کو بھی دست آرہے ہیں۔

سیٹھ:۔ (جلدی سے) ارے تو کیا اُسے اُلٹیاں بھی ہوتی ہیں۔ تھو تھو۔

روپا:۔ اُلٹیاں تو نہیں ہوتیں۔ سستی روٹی کھائی تھی۔ وہیں حالوں پچی نہیں۔

سیٹھ:۔ ویسے تو اچھی ہے؟

روپا:۔ ہاں مہاراج۔

سیٹھ:۔ کوئی دوا داری ہوتی۔

روپا:۔ کہاں سے دوں مہاراج۔ زہر کھانے کو تو پھوٹی کوڑی پاس نہیں۔ آج چودھواں دن ہے بنجار میں پڑا ہوں، چار پیسے کی مزدوری نہیں ہوسکی۔

سیٹھ۔ (منیم سے) منیم جی دیکھنا چودھری کی مدت کب ختم ہوتی ہے؟

روپا۔ میری تو سُن لو۔

سیٹھ:۔ کیا سُنوں۔ اچھا کہو۔

روپا:۔ کچھ روپے کی اور پرورشتی ہو جائے تو بڑی دیا ہو۔

منیم جی نے بھی عینک کی آڑ میں سے دیکھا اور بولے "چودھری دینے میں تو کوئی حرج نہیں۔ برکس برتے پر"

روپا:۔ منیم جی میں لے لوٹ نہیں۔ وخت (وقت) کی بات ہے اُدھر میرا کام لوٹ گیا اِدھر بیماری نے دُکھی کر دیا ہے۔ بیاج کو کہتے ہو گے؟ ذرا ٹھیک ہو جاؤں۔ کوڑی کوڑی چکا دوں گا۔ دوسرے اپنے مکان پہ مانگتا ہوں مفت تو نہیں لیتا۔

سیٹھ جی پاؤں پھیلا کر دل ہی دل میں ہنسے۔ چکا دوں گا۔ اس سے سات جنم بھی اصل تو کیا بیاج بھی ادا نہیں کیا جاسکے گا" اور کہنے لگے "بھئی چودھری یہاں روپے کی ٹکسال تو ہے نہیں۔ سدا برت نہیں بٹتا۔ بیوپار ہے۔ پچھلا دیتے جاؤ۔ آگے لو جتنا چاہو۔ ہم بھی جانیں کہ تم لین دین کے کھرے۔ ہمارا بھی دینے کا حوصلہ ہو۔ رہا تمہارا مکان۔ اس میں اب مال کیا رہا ہے۔ پھر بھیا جھگڑے میں کون پڑے۔ تم ہی اپنے دل میں سوچو آج تک تم نے بیاج کا بھی تو ایک دھیلا ادا نہیں کیا۔

روپا:۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) کیا ڈر ہے مہاراج۔ میں کہیں بھاگا تو جاتا نہیں۔ دوں گا۔ جان رہتے پائی پائی نہ چکا دوں تو سسر کا بیٹا نہیں۔ اس وقت تو کچھ پرورشتی ہو جاتے۔

سیٹھ۔ (منیم سے کچھ آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کر کے) اچھا خیر۔ تم ہمارے پڑوسی ہو۔ تین روپے لے جاؤ۔ اپنا کام چلاؤ۔ پر آگے تکلیف نہ کرنا۔ جب تک مول بیاج ادا نہ کر دو گے ہم چار دھیلے بھی دینے کو تیار نہیں۔ (منیم سے) منیم جی چودھری کو تین روپے دے دو۔ آیا ہے تو خالی ہاتھ نہ جائے۔

روپا کے دل میں تو آیا کہ تین روپے اُلٹے سیٹھ جی کے منہ پر مار دے۔ کچھ خیرات مانگنے نہیں آیا تھا۔ اپنے مکان پر لے رہا تھا۔ لیکن بُرا ہو مفلسی، ناداری، کساد بازاری اور ضرورت کا۔ وہی مثل تھی کہ ؎

آنکہ شیراں را کند روباہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

اگر اس وقت ذرا اکڑ فوں دکھاتا تو سیٹھ جی تین روپے بھی

تجوری میں بند کر کے سوکھا جواب دے دیتے۔ پھر وہ کیا کرتا۔ دوسری جگہ سے دو کوڑیاں بھی ملنے کی اُمید نہ تھی۔ مجبور قہر درویش بجانِ درویش، اپنا روپیہ آٹھ میں لگا۔ نیچی نظر لئے ہائے ہائے کرتا ہوا اپنے گھر آ گیا۔

رَدّیا کا بیٹا ہوش سنبھال کر اب کچھ کچھ زندگی کی مشکلات کو سمجھنے لگا تھا۔ گائے بک چکی تھی جسے چرانے لے جاتا باپ کے ساتھ بیٹھ کر اُس کا ہاتھ بٹاتا۔ سُتاری چلانا جوتی پلاستا۔ باپ جیسا کاریگر ہونے میں تو مدّت چاہیئے تھی۔ ہاں صبح سے شام تک لگے رہنے کے بعد معمولی ایک جوڑا تیار کر لیتا۔ بازار بھی جاتا۔ مگر چار ہاتھوں کے کام سے بھی دو وقت کا پورا نہ پڑتا۔ دیسی جوتیوں کی قیمت بہت گر گئی تھی۔ جوڑے بیچے دو چار آنے مشکل سے ملتے۔

رَدّیا کام تو کرتا مگر ہائے ہائے کر کے۔ بیماری نے اسے جکڑ لیا تھا۔ آخر چند ہی روز کے بعد کھٹیا پر پڑ گیا۔ اور بہت جلد بیوی اور لڑکے کو اپنے حال اور ایشور کے بھروسے پر چھوڑ دُنیا سے رخصت ہوا۔ قیامت آ گئی۔ مثل ہے کہ آدمی کو بیٹھے بٹھائے روزی کی فکر ہو۔ یہاں ایک ساتھ دونوں بپتائیں پڑ گئیں۔ مگر بیچاروں کی کیا بات تھی۔ کھڑے بیٹھو یا پڑے اللہ میاں کی بے نیازی کو ٹھیس نہیں لگتی۔ وہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔

سود خوار پٹھان ناحق بدنام ہیں۔ اُن کی سخت گیری میں شک نہیں۔ قرض دار کے مُردے پر بھی عذاب کے فرشتے کی طرح آ بیٹھتے ہیں لیکن بنیا تو اپنے قرض دار کے پسینے تک کا خون چوس کر بھی دم نہیں لیتا۔ میٹھی چھری چپکے ہی چپکے دیمک کی طرح کھا جاتا ہے۔ رَدّیا جب کھٹیا پر پڑا ہے تو سیٹھ جی کے گھر میں گھی کے چراغ جلنے شروع ہو گئے تھے۔ اب اِدھر اُس کا دم نکلا اُدھر منیم جی آ موجود ہوئے۔

رَدّیا کا بیٹا (یہ سمجھ کر کہ شاید اُٹھاؤنی میں مدد کرنے آئے ہیں) منیم جی آپ نے بڑی کرپا کی۔

منیم:- ارے بھئی مجھے تو سیٹھ جی نے یہ پوچھنے بھیجا ہے کہ مرنے والا ہماری رقم کا کیا بندوبست کر گیا۔

رَدّیا کی بیوی:- منیم جی کئی مہینے سے بیمار تھے۔ دوا ٹھنڈائی کو کوڑی بھی نہیں سیٹھ کے قرضہ کا کیا بندوبست کرتے۔

منیم:- پھر تو بڑی مشکل ہوئی۔ اب تم کہاں سے دو گے؟

رَدّیا کا بیٹا:- محنت کریں گے، مزدوری کریں گے۔ او منیم جی اس وقت تو ہمیں اس کی اُٹھاؤنی کا فکر ہے۔

منیم:- بھیا۔ سیٹھ جی کے قرضہ کا فکر کرو۔

رَدّیا کی بیوی:- (جل کر) آگ لگے سیٹھ جی کے قرضہ کو۔ ہمارے تو گھر میں آگ لگ گئی اور سیٹھ جی کو اپنے قرضہ کی پڑی ہے۔

اور اس نے ایسی صلواتیں سُنائیں کہ منیم جی کان دبا کر چلے گئے۔ لیکن وہاں چراغ بتّی سیٹھ جی نے پہلے ہی سے تیار کر رکھی تھی اُسی دن نالش داغ دی اور دو چار پیشیوں کے بعد سیٹھ جی نے اپنے مول بیاج کی رقم کے بدلے مکان قرق کرا لیا۔ دونوں ماں بیٹے جس مصیبت کا مدّت سے انتظار کر رہے تھے سر پر آن موجود ہوئی۔

باپ کی موت اور مکان کی قرقی نے نوجوان موتی کی ذمہ داریوں میں بے حد اضافہ کر دیا۔ وہ اپنی رنڈیا دُکھیا ماں کو لیکر چمرواڑے کی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں رہنے لگا جسبِ معمول جوتے بناتا اور بیچتا۔ ماں بھی اِدھر اُدھر چلی جاتی۔ دو چار پیسے کی مزدوری کر لیتی اور جس طرح بنتا دونوں بیٹے گزارہ کرتے۔

جس زمانے میں رَدّیا پر لکشمی مائی کی دیا تھی وہ اپنے گھر جنم اشٹمی بڑی دھوم دھام سے منایا کرتا تھا۔ اس تقریب کے لئے کئی کئی ہفتے پہلے وہ تیاریاں کرتا۔ گھر کو لیپتا پوتتا۔ پنڈول پھرتا۔ سجاتا اور بھگوان کا جنم دن منا کر پرشاد بانٹتا۔ برادری کی ساری عورتیں اور مرد اکٹھے ہوتے بھجن گاتے، دف بجاتے رات کے بارہ ایک بجے تک خوب چہل پہل رہتی۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔

جب تک رَدّیا زندہ رہا۔ نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جب تک اُس کے ہاں خوشحالی کا دور دورہ تھا جنم اشٹمی کی یہ تقریب بھی جاری رہی۔ پچھلی جنم اشٹمی پر البتہ اس کی مالی حالت ایسی کمزور ہو گئی تھی کہ وہ یہ تقریب نہ منا سکا تھا۔ پھر اس کے مرنے کے بعد تو بھگوان نے اس کے بیٹے اور بیوی کو اس قابل ہی نہیں رکھا کہ دو پیسے بھی بھگوان کے نام پر خرچ کر سکتے۔ گھر کو آگ لگ گئی۔ اپنا ہی پیٹ بھرنا دشوار تھا۔ پرشاد کہاں سے بانٹتے۔ دُنیا کے ہر شعبے میں دولت کی بہار ہے۔ غریب انسان مذہب کی رسوم بھی ادا نہیں کر سکتا۔

رَدّیا کی بیوی اور بیٹے کے لئے رَدّیا کے مرنے کے بعد جنم اشٹمی کا پہلا تہوار تھا۔ دونوں اپنی پچھلی اچھی زندگی کے دن یاد کر کے رو

رہے تھے۔ ادھر مندروں میں انتہا کی رونق آ رہی تھی۔ دروازوں پر سنکھ اور نفیریاں بج رہی تھیں۔ ہر طرف پھول ہی پھول بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی مہک اور اگر وغیرہ کی خوشبو سے فضا معطر تھی۔ عقیدت مند پوجا کرنے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ باہر سے اندر تک لگے ہوئے تھے۔ گانے بجانے کی آوازوں نے ایک عجیب سماں باندھ رکھا تھا۔

یہ بہار روپا کے بیٹے کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ وہ چاروں طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا اور چپ ہو جاتا۔ ماں آج کے دن اندھیرے سے اٹھتی اور سویرے سویرے جھاڑو بہارو سے فراغت پاکر کڑھائی چڑھا دیتی۔ گلگلے حلوا پوری اور کئی قسم کے پکوان تلنے میں لگ جاتی۔ چولھے سے ہٹتی تو گھر کو سجاتی۔ اس وقت اس کے دل کی عجیب حالت تھی۔ ٹوٹی ہوئی کوٹھڑی، میلے کپڑے اور ٹکا گرہ میں نہیں۔ ٹھنڈے ٹھنڈے سانس لیتی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر تصور میں بھگوان سے سوال کرتی کہ "ہے دیا سندھو ایسا مجھ سے کیا پاپ ہوا جو میرے اوپر یہ بپتا پڑی۔ سر کا وارث اٹھا۔ روزی میں آگ لگی گھر بار سب لٹ گیا۔" اس کے اندر سے کوئی جواب دیتا کہ "پچھلے کرموں کا پھل" آتما کے اس جواب سے دلوں کی تڑپ میں ایک قسم کا سکون ہو جاتا ہے۔ بیوہ بھی آسمان کی طرف دیکھ کر آنسو پونچھ ڈالتی۔

اسی طرح دن گزر گیا۔ رات آئی۔ مندر جگمگانے لگے۔ گھنٹوں کی صدائیں آسمان تک گونجنے لگیں۔ ماں نے ٹھنڈا سانس لے کر گھٹنے سے سر اٹھایا، آنسو پونچھے اور بیٹے کی طرف دیکھ کر بولی۔ "بیٹا اپنے ہاں تو اب جیتے جی کہاں بھگوان کا اتسو منانا نصیب ہوگا۔ جاؤ کسی مندر سے اگر مل سکے تو تھوڑا سا پرشاد لے آؤ۔ شگون تو کر لیں۔ دیکھو۔ کوئی روکے ٹوکے تو اڑ یو نہیں۔ مندر نہ گھسیو۔ باہر ہی سے پرشاد مانگ لیجیو۔ ہم غریبوں سے بھگوان بھی روٹھے ہوئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تاؤ میں آکر کسی سے کچھ کہہ سن بیٹھے۔ میرے لال، ہم اچھوت ہیں۔ نیچ سے نیچ۔ ایشور نے ہمیں اونچی ذات والوں کے پاؤں کی خاک بنایا ہے۔ ہمیں خاک ہی کی طرح رہنا پڑے گا۔ سر چڑھنا ہمارے لئے اچھا نہیں۔

لڑکا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے کے بعد کسمسا کر اٹھا اور ایک چھوٹا سا انگا اس لے کر مندر کی طرف چلا۔ مندر کے دروازے پہ بڑی بھیڑ تھی، مگر یہ نیچی گردن کئے دروازے میں داخل ہو ہی گیا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ہر قدم پر ٹھٹکتا اور دیکھتا کہ کوئی روکتا ٹوکتا تو نہیں۔ لیکن نہ کسی نے روکا نہ ٹوکا بلکہ اس کی طرف نگاہ بھر کر بھی نہیں دیکھا۔ اس جیسے میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑے پہنے بہت سے آدمی وہاں موجود تھے۔ شاید وہ سب اونچی ذاتوں والے ہوں گے، کیونکہ باوجود غریب ہونے کے ان میں سے ہر ایک بلا خوف مندر میں اہلا گہلا پھر رہا تھا۔ یہ بھی ایک کونے میں سمٹ کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ گانا بجانا زوروں پر تھا۔ لوگ بڑے دھیان سے سن کر سر اور چٹکیوں سے تال دے رہے تھے۔ کسی طرف کوئی ایسی بات نہ تھی جو مندر کی دلچسپ فضا میں کھنڈت ڈالتی۔ روپا کے بیٹے کا یکایک آپ ہی آپ دل دھڑکنے لگا۔ خوف سا معلوم ہوا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے تو سیٹھ جی چلے آتے ہیں جنہوں نے پڑوس کا یہ حق ادا کیا تھا کہ بیوہ کے رونے پر خیال کیا نہ لڑکے کی منت سماجت پر، اور کھڑے کھڑے ان کا گھر نیلام کر کے دن کے دن نکال دیا۔ اتنا بھی ترس نہ آیا کہ دوسری جگہ غریب تلاش کر لیتے۔ ان کی صورت کچھ ایسی ڈراؤنی نظر آئی کہ بیچارے کی سٹی گم ہو گئی۔ اِدھر اُدھر منہ چھپانے کی کوشش کی، مگر اس بھیڑ میں، اونچی ذات والوں کی بھیڑ میں اسے کہاں پناہ ملتی۔ کوئی کپڑا بھی ایسا پاس نہ تھا جس سے چہرہ چھپا لیتا۔ سیٹھ جی اس کو کڑوی کڑوی تیز تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

لڑکا سیٹھ صاحب کی خونی آنکھوں سے ڈر گیا اور کسی آنے والی مصیبت کا خیال کر کے دل ہی دل میں کانپ اٹھا۔ بھاگ جانے کا ارادہ کیا۔ قدم نہ اٹھے۔ غریب بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیوں کر جان بچاؤں۔ اتنے میں ایک طرف سے غل مچا، مارو سالے کو۔ جانے نہ پائے۔ مزے سے سب کی آنکھوں میں دھول ڈال کر اندر گھس آیا ہے۔ ڈھیٹ کہیں کا۔ یہ بھی نہ جانا کہ بھگوان کی جنم اشٹمی کا دن ہے۔ کم بخت نے سارے مندر کو اپوتر کر دیا۔

گانا بجانا موقوف ہو گیا۔ لوگوں میں گڑبڑ پڑ گئی۔ دھواں دھوں ہونے لگی۔ بیچارے پر چاروں طرف سے لاتیں، گھونسے، تھپڑ، جوتے پڑ رہے تھے۔ دو چار نیک دل آدمیوں نے اسے بچانے کی بھی کوشش کی مگر کٹروں کے آگے ان کی کیا چلتی۔ مارنے والے یہ کہتے ہوئے کہ "یہ بھی اچھوت ہیں، ان کی

بھی خبر لینا۔" ان کی طرف بڑھے۔ اب کون ایسی کریا کرتا۔ سب چُپ ہو کر ادھر اُدھر ٹل گئے۔

رُدیا کے بیٹے کا بیٹھے بیٹھے یلیقس نکل گیا۔ گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں گر پڑا۔ کرتے کی دھجیاں اُڑ گئیں۔ دھوتی کے بیرے لگ گئے۔ سارا بدن چوٹوں سے نیلا ہو گیا۔ کان ناک اور مُنہ سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ اس حالت میں بھگوان جانیں وہ خود کسی نہ کسی طرح مندر سے باہر نکل آیا یا لوگوں نے دھکّے دے کر نکال دیا۔" اب وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں کھڑا لڑکھڑا رہا تھا چاروں طرف آدمی جمع تھے۔ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ کوئی ترس کھا کر اس کی طرف داری میں کچھ کہتا تو دوسرے اول فول بکنے لگتے اور ہمدردی کرنے والوں سے اُلجھ پڑتے۔

اسی اثنا میں اسے ذرا ہوش آیا اور اُس نے ایک دفعہ ہی جھرجھری سی لی اور بھیڑ کے بیچ میں سے نکل ایک طرف کو بھاگا۔

رات گزرنے کے بعد صبح ہوئی تو سارے شہر میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ ایک چمار کا لڑکا کرشن مندر کے میدان میں دوسری طرف اپنی دھوتی کا پھندا گلے میں ڈال درخت پر لٹک کر مر گیا۔

ہر شخص کی زبان پر رُدیا کے بیٹے کی موت کا چرچا تھا۔ اور یہ بھی سب کہتے تھے کہ اس نے خودکشی کی۔ مگر اس کی خبر کسی کو نہ تھی کہ کیوں اس کو اس طرح جان دینی پڑی۔ اِس بھید کو جاننے والے صرف دو تھے۔ ظالم سیٹھ یا مرنے والے کی آتما۔

جس وقت بھگوان کرشن کے جنم کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں ایک نوجوان بھگتی اور دھرم کی بندی پر اپنا جیون بلیدان کر رہا تھا۔

پائل

آلتمیں نغموں کا شاعر سلام آپ کیلئے گیتوں کا تحفہ لایا ہے۔ گیت جو آگ سے زیادہ گرم اور شہد سے زیادہ میٹھے ہیں۔

"پائل" آرٹ پیپر پر چھپی ہے۔ کتاب مجلد اور دلفریب جلد پوش سے آراستہ ہے۔

قیمت ایکروپیہ بارہ آنے۔ علاوہ محصولڈاک؛

ناشر:۔ ساقی بُک ڈپو، دہلی؛

خمکدہ

غمِ دل کا اُنہیں بھی کچھ یقیں سا ہوتا جاتا ہے
مرا ذوقِ محبّت ہائے رسوا ہوتا جاتا ہے

خیالِ یار آ اور دیکھ یہ کیا ہوتا جاتا ہے
مری اُمید کا ہر رنگ پھیکا ہوتا جاتا ہے

اُدھر اُنکی تجلی ہے کہ پنہاں ہوتی جاتی ہے
اِدھر ذوقِ تماشا ہے کہ رسوا ہوتا جاتا ہے

مری ناکامیوں پر آج وہ بھی رو دئے آخر
مری مجبوریوں میں درد پیدا ہوتا جاتا ہے

بجھا ہی چاہتا ہے اب چراغِ زندگی شاید
تمنّاؤں کی دُنیا میں اُجالا ہوتا جاتا ہے

زمانے کی ہر اک شے اُن کا پردہ بنتی جاتی ہے
مگر حُسن اور رسوا، اور رسوا ہوتا جاتا ہے

نہیں ہوتا اگر کوئی شریکِ غم، نہ ہو کیا غم
یہ کیا کم ہے کہ غم دل کا سہارا ہوتا جاتا ہے

نہیں کرتا نہ کر لطف و عنایت اپنے بندوں پر
ہمارا کیا ترا برتاؤ رسوا ہوتا جاتا ہے

ضرورت ہی نمک پاشیِ پیہم کی ضرورت ہے
کہ دل مرہونِ احسانِ مداوا ہوتا جاتا ہے

ٹھہر اے صبح کے تارے کہ دل لذّت کشِ غم ہے
مدد اے شامِ تنہائی سویرا ہوتا جاتا ہے

خمارؔ اب دیکھتے ہیں وہ کچھ ایسی مست نظروں سے
کہ دل ہی بے نیازِ جام و صہبا ہوتا جاتا ہے

خمارؔ دہلوی؛

وقار عظیم

کچھ کڑوی گولیاں — افسانہ نگاروں کیلئے

نئے افسانے اور نئے افسانہ نگار کی بھی عجیب حالت ہے۔ فن اور فن کار دونوں مدح و ذم کے اچھے خاصے نرغے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ایک طرف تو ان کے نام پر عقیدت اور محبت کے پھول برسائے جاتے ہیں اور دوسری طرف اس کے راستے میں ہر طرف کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ ایک طرف سے مدح سرائی اور قصیدہ خوانی ہے، دوسری طرف سے ہجو و دشنام۔ لیکن مدح سرائی میں کچھ ایسا نشہ ہے کہ ہمارا نیا افسانہ نگار دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے بنائے ہوئے راستہ سے، اپنی خود ساختہ بہشت (اور میرے نزدیک اکثر صورتوں میں دوزخ) کی طرف تیزی سے قدم بڑھائے چلا جارہا ہے۔ اس نے اپنے کانوں کو ہجو و دشنام کی طرف سے قطعی بند کرلیا ہے۔ اس کی "طبع حزیں" پر اب "دشنام یار" گراں نہیں گذرتی۔ یا ممکن ہے سب کچھ سُن کر اور سمجھ کر بھی وہ بے خبر رہنا چاہتا ہے۔ اُسے اپنے گریبان میں جھانکتے ڈر معلوم ہوتا ہے، جھجک محسوس ہوتی ہے۔ شاید اس لئے کہ اُس نے ادب کے بازار میں کھوٹے سکوں کی ساکھ قائم کرلی ہے اور اُسے کسی قیمت پر بھی کھونے کے لئے تیار نہیں۔ اس مرض کا علاج میٹھی باتوں سے ممکن نہیں۔ کڑوی گولیاں ہی ممکن ہے، اس مہلک مرض کا مداوا بن سکیں۔ یہ "کڑوی گولیاں" کھا کر اگر مریض اپنے گریبان میں مُنہ ڈالنا سیکھ لے، اور کھوٹے سکوں کو کھوٹا سمجھنے کا عادی ہوجائے تو ممکن ہے "مرض" "وبا" بننے سے پہلے ہی ختم ہوسکے۔ یہ "کڑوی گولیاں" میٹھی تو بے شک نہیں، لیکن کچھ ایسی کڑوی بھی نہیں۔

اِس نسخہ کی سب سے پہلی گولی بے شک ذرا زیادہ کڑوی ہے۔ زیادہ کڑوی اس لئے کہ اس کی کڑواہٹ ہمارے یوپی، پنجاب اور بمبئی سب کے حلق کو کڑوا کرتی ہے —— زبان و بیان کا مسئلہ اور ہمارے نئے افسانے سے اس کا رشتہ ناتا! بڑی پُرانی بات ہے۔ گڑے مُردوں کو اُکھاڑنا پڑتا ہے۔ لیکن میرا ارادہ مُردے اُکھاڑنے کا بالکل نہیں۔ مجھے تو دو ایک سیدھی سادی باتیں کہنی ہیں۔ اگر آپ کو (یعنی افسانہ نگار کو) کڑوی لگیں تو تھوک دیجئے۔ زبان و بیان کا مسئلہ اُردو میں ہمیشہ سے لڑائی جھگڑے کا گھر رہا ہے۔ وَلی سے لے کر داغ تک شاعری کی ساری داستان اِسی اُلجھاوے میں پھنسی ہوئی ہے لیکن یہ تو شاید وہی گڑے مُردے اُکھاڑنے والی بات شروع ہوگئی۔ اس لئے اِسے جانے دیجئے۔ اپنے افسانوں کو دیکھئے۔ ان افسانوں میں ہمارے "ترقی پسند" (ترقی معکوس) افسانہ نگاروں نے زبان اور بیان کی اِصلاح اور اُس کے نظم و نسق کا ایسا زبردست بیڑا اُٹھایا ہے کہ شاید تھوڑے دن میں اس کی صورت شکل کا پہچاننا بھی آسان نہ رہے۔ اس اُصلاحی مقصد کی تاویلیں بھی بہت سی ہیں اور جواز کے مسئلوں کی بھی کمی نہیں۔ "ہم اس لئے یہ محاورہ استعمال کرتے ہیں کہ ہمارے صوبے میں اسی طرح بولا جاتا ہے۔" "ہم نے یہ لفظ اس لئے ان معنوں میں استعمال کیا ہے کہ ہماری والدہ کی زبان پر یوں ہی چڑھا ہوا ہے۔" "ہم نے یہ لفظ پُرانے نہیں بلکہ ایک نئے معنی میں استعمال کیا ہے۔" "ہم زبان و بیان کو نہیں، خیال کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔" "ہمیں فرسودہ تشبیہوں اور استعاروں سے نفرت ہے۔" "ہم ترقی پسند ہیں۔" "ہم انقلاب کے حامی ہیں۔" "ہم رجعت پسندی اور قدامت کو فنا کردینا چاہتے ہیں۔" —— نئی طرح کی زبان، نئے طرح کے بیان اور نئی اور انوکھی تشبیہوں اور "بے حد لطیف" استعاروں کے استعمال کے جواز میں یہ یا اس سے ملتی جُلتی بہت سی باتیں کہی جاتی ہیں —— بدقسمتی سے یہ کہنے کی جرأت کسی میں نہیں کہ ہم نے کبھی صحیح زبان بولنے اور لکھنے کی کوشش ہی نہیں کی، ہماری نظر زبان و بیان کے اُس بے پایاں خزانہ تک پہنچی ہی نہیں جس پر نظر ڈالے بغیر زبان و بیان کے اونچ نیچ کا پتہ ہی نہیں چلتا، ہم نے اپنے پُرانے ادب کا مطالعہ ہی نہیں کیا اور اس لئے ہم عاجز اور بے بس ہیں اور جو کچھ کہہ رہے ہیں مجبور اور بے اختیار ہو کر کہہ رہے ہیں۔ مانا کہ ہمیں جو کچھ کہنا ہے، اصل میں اہم وہی ہے، لیکن جو کچھ کہنا ہے اگر اُسے سلیقہ سے نہ کہا جاسکے تو

اُس میں اثر بھی تو پیدا ہونا ممکن نہیں۔ پھر کیوں ہم اپنے دل کے چور کو چھپائیں؟ کیوں اپنی بے بضاعتی کے احساس سے شرمائیں؟ اور کیوں دُنیا کے سامنے قدامت، رجعت اور انقلاب کے نام سے بےسا رہے ڈھونگ رچائیں۔ بے شک نئے زمانہ کو نئے خیالات کی ضرورت ہے۔ زندگی کے مسئلوں میں بے پایاں وسعتیں پیدا ہوئی ہیں اور یہ بے پایاں وسعتیں پُرانے طرزوں میں نہیں سما سکتیں۔ اِس لئے نئے طرز کی، نئے انداز کی، نئے بیان کی، نئی زبان، نئی تشبیہوں، نئے اشاروں، کنایوں اور استعاروں کی ضرورت ہے۔ لیکن جو کچھ نیا ہے اُسے بھی پُرانے ہی سوتوں سے نکالا جاتا ہے۔ زبان وبیان کو ایک مُسلسل تاریخی حقیقت سمجھے بغیر اُس میں نیاپن پیدا کرنے کی کوشش، بھدّے، بے ڈھنگے نمونے پیدا کرتی ہے، مضحکے کے موقعے دیتی ہے اور زبان کو پستی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس لئے ذکر وبیاں میں نیاپن پیدا کرنے کا دعویٰ کرنے اور ایسی نئی کوششوں کے جواز میں تاویلیں پیش کرنے سے پہلے، افسانہ نگار کو اپنے پُرانے ادبی سرمایہ کا پاسبان بننا پڑے گا۔ اُسے اپنی زبان کے سارے ادبی جواہر پاروں سے باخبر ہونا پڑے گا، اُسے اپنی نظر میں زبان وبیان کے مُسلسل سفر کی پوری تصویر رکھنی پڑے گی اُسے اپنے دل کے ہر گوشے میں زبان کے قومی سرمایہ کی کھٹک، کسک اور گھلاوٹ محسوس کرنی پڑے گی۔ اُسے بڑی سختیاں جھیلنی ہوں گی، جب کہیں وہ زبان کو اپنے بڑھتے ہوئے خیالات کا ہم نوا بنا سکے گا، جب کہیں وہ ہجو و دُشنام سے بچ سکے گا۔ اپنے پرائے کا فرق مٹائے بغیر زبان کو نئی راہوں پر لگانا جان جوکھم کا کام ہے۔ جب یہ سب کچھ ہولے جب اس بات کا دعویٰ ہو سکتا ہے کہ ہم زبان کو اپنے نئے خیال کے ساتھ چلانا چاہتے ہیں ــــ بڑی کڑوی گولی ہے، لیکن اس کے کھائے بغیر کام نہیں چلتا۔ زہر ہے لیکن دوا جان کر اسے کھانا ہے۔

زبان وبیان کا مسئلہ اُن بہت سے مسئلوں میں سے صرف ایک ہے، جن پر ہمارے نئے افسانہ نگار کی گمراہی کی بنیادیں قائم ہیں۔ تجربہ، اصلاحی مقصد، جدّت اور ترقی (اس کے مقابلہ میں قدامت اور رجعت) جوائس، لارنس، ذلف اور پروست کا فن، مارکس کا معاشی نظریہ، فرائڈ اور اڈلر کی نفسیات، ان بہت سی چیزوں اور ان کی آن گنت تاویلوں نے نئے افسانہ نگار کے لئے کچھ ایسے راستے کھول دئے ہیں جن پر چل کر وہ اپنے آپ کو تو بے خطر محسوس کرنے لگا ہے، لیکن اُس سے ادب کی میراث بڑے خطرے میں پڑ گئی ہے اور یہ خطرہ چھوٹا موٹا نہیں، اس میں جان جانے کا ڈر ہے، اب تک جو کچھ کیا دھرا ہے اُس کے مٹ جانے کا اندیشہ ہے، ادب کے تاریخی تسلسل میں رخنہ پڑ جانے کا خوف ہے۔ لیکن نیا افسانہ نگار صرف "واہ واہ" کے نعروں سے مطمئن ہو کر ادب کی حیات وممات کے اندیشہ سے بے نیاز آگے بڑھا چلا جا رہا ہے۔ اور بظاہر اُس کے اِس مالیخولیا کا کوئی علاج نظر نہیں آتا ــــ سوائے اِن کڑوی گولیوں کے۔

تجربہ کسے کہتے ہیں؟ "جو کچھ آپ نے دیکھا، سُنا یا محسوس کیا"۔ ادب کی دوسری اصناف کی طرح افسانہ بھی انسانی تجربہ کا ترجماں ہے۔ بظاہر بڑی آسان سی بات ہے، لیکن عمل میں آ کر یہی بے حد آسان بات، حد سے زیادہ دشوار بن گئی ہے۔ تجربہ کے اس مفہوم نے نئے افسانے کو سو فی صدی (اسے ریاضی کی تحقیق نہ سمجھئے) رطب ویابس سے بھر دیا ہے۔ ہر وہ چیز جو دیکھی گئی، سُنی گئی یا شاید محسوس بھی کی گئی، گویا افسانے کا موضوع بن سکتی ہے۔ بن سکتی ہے، اس لئے بنائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں گفتگو کے دو پہلو پیدا ہوتے ہیں۔ ایک میں تو گریبان میں مُنہ ڈالنے کی ضرورت پڑے گی، لیکن دوسری بات یوں ہی سرسری طور پر کہی جا سکتی ہے۔ اس لئے پہلے یہی دوسری بات سُن لیجئے: تجربہ کا مفہوم جو کچھ آپ نے بیان کیا وہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔ لیکن سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ کیا ہر تجربہ اِس قابل بھی ہے کہ وہ افسانہ بن سکے۔ افسانہ کی نزاکت ہر تجربہ کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتی اور نہ ہر بات ایسی ہوتی ہے کہ اسے کہہ دینے کے بعد بھی اُس میں لطافت باقی رہے۔ اسی لئے ہزاروں برس کے ادبی تجربہ میں یہی ہوتا آیا ہے کہ اچھا فن کار جو دیکھتا، سُنتا یا محسوس کرتا ہے اُسے فن کی لطافت اور نزاکت کی کسوٹی پر بھی کسنا ضروری جانتا ہے۔ اس کسوٹی پر کسے بغیر تجربہ کے متعلق یہ پتہ چلانا کہ وہ کھرا ہے یا کھوٹا، ممکن نہیں یہی لطیف اور نازک کسوٹی ہے جو فن کار کو یہ بتاتی ہے کہ اس تجربہ کا پورا پورا تجزیہ کرو۔ اس کے بال کی کھال نکالو۔ اس کے ہر باریک سے باریک اور چھوٹے سے چھوٹے پہلو پر نظر رکھو اور پھر اس بہت سے مسالے میں سے جو کچھ تھوڑا بہت اپنے

کام کا نکلے اُسے لے کر باقی کو کوڑا سمجھ کر پھینک دو۔ صحیح نقطۂ نظر یہی ہے۔ لیکن ہمارے نئے افسانہ نگار نے اس کی طرف سے شرمناک غفلت برتی ہے۔ اُس نے اس تجربہ کو جو اتفاقاً کبھی اُس کے ساتھ بیتیں آیا ہے، افسانہ بنانا ضروری سمجھا۔ اور اس لئے اُس کے افسانے زندگی سے قریب رہ کر بھی زندگی سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ اُن میں تاثیر نام کو بھی نہیں۔ اور تاثیر یا لذّت کی کمی کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ ایک وجہ تو یہی کہ افسانہ نگار موزوں اور غیر موزوں تجربہ میں فرق کئے بغیر اُسے افسانہ بنا لینا چاہتا ہے اور دوسری اُس سے بھی زیادہ اہم یہ کہ وہ کسی تجربہ کو اپنی شخصیت کے رنگ میں نہیں ڈبوتا۔ زندگی کا کوئی تجربہ انسان کی شخصیت، اُس کی انفرادیت اور اُسکے جذباتی میلانات میں گھلے ملے بغیر ادبی تجربہ نہیں بنتا۔ تجربہ کو اپنی اندرونی زندگی کی گہرائیوں میں جذب کر لینے کے بعد ہی اُس میں فنی تجربہ، کی نزاکتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ دُنیا میں ہر قدم پر انسان کے لئے افسانے کے اَن گنت موضوع موجود ہیں لیکن ان اَن گنت موضوعوں میں سے انتخاب کی ضرورت ہے اور پھر انتخاب کے بعد اس پر اپنی اندر بسی ہوئی جذباتی دُنیا کا رنگ چڑھانا ہے۔ جو افسانہ نگار کسی تجربہ کو افسانہ بنانے سے پہلے اُسے ان منزلوں سے نہیں گذار لیتا، وہ افسانوی اور ادبی تجربہ کی اہمیت سے بے بہرہ ہے۔ اور اسی لئے اُس کے افسانے نہیں، اور چاہے جو کچھ بھی ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ تتے افسانہ نگار جو کچھ بھی لکھتے ہیں، افسانہ ہی سمجھ کر لکھتے ہیں۔ پھر تجربہ، جو ہر افسانہ کی بنیاد ہے، اس کی طرف سے یہ بے خبری، یہ بے نیازی کیوں؟ اس بے خبری اور بے نیازی کو دور کرنے میں دل پر جبر کرنا پڑے گا، اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

تجربہ انسان کو کچھ دکھاتا، سُناتا یا محسوس کراتا ہے۔ اس دیکھی، سُنی یا محسوس کی ہوئی چیز میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو جس سے افسانہ نگار کے دل پر چوٹ لگی ہے —— یہ بات زندگی کے کسی پہلو سے بھی تعلق رکھ سکتی ہے۔ یہ پہلو خواہ سیاسی سماجی یا معاشی، خواہ مذہبی، اخلاقی یا نفسیاتی —— خواہ اس میں پوری قوم کے دُکھوں کا درد شامل ہو، خواہ کسی فرد کے دل کا۔ دیہاتی کسان، کارخانہ کا مزدور، رکشا چلانے والا، بھیک مانگنے والا، دفتر کا بابو، متوسط طبقے کا کوئی شریف اور باعزّت انسان یا محض کسی جذباتی یا نفسیاتی مرض کا کوئی مریض، اور ان کے مقابلہ میں، زمیندار، ساہوکار، افسر اور حاکم یا عام انسان جو کسی کے دُکھ درد کے شریک نہیں ہوتے، جن میں سے ہر ایک محض اپنی ہی غرض میں مبتلا ہے۔ افسانہ نگار ان سب کے گرد گھومنے والی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھتا ہے اور اُس کے دل میں ایک تڑپ سی پیدا ہوتی ہے۔ وہ اس سارے نظام کی دھجیاں اُڑا دینے کے لئے بے قرار نظر آنے لگتا ہے جس نے انسانیت کو اس مستقل عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے، وہ انقلاب چاہتا ہے، پُرانی دُنیا کو بدل کر اُسے ایک نیا رنگ روپ دینے کی ”تڑپ“ سے بے چین کرتی ہے۔ اُس کے دل میں اس ساری بُرائی کو بھلائی سے بدل دینے کا ایک غیر محسوس اور غیر معلوم جذبہ کروٹیں لینے لگتا ہے۔ اچھے فن کار کا ہر افسانہ اسی جذبہ کی پیدا کی ہوئی تڑپ میں رچ بس کر نکلتا ہے —— لیکن رونا یہ ہے کہ ہمارے افسانہ نگاروں نے یہاں بھی غفلت اور لاپرداہی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے یہ سمجھ کر کہ افسانے میں کسی نہ کسی مقصد کا ہونا ضروری ہے۔ کسی نہ کسی اجتماعی احساس کی ترجمانی اور اس احساس کی پیدا کی ہوئی اصلاحی تحریک اُن کے نزدیک افسانہ کا لازمی جزو ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سچّا احساس ہمیشہ اصلاح کا طالب ہوتا ہے لیکن فن کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں اصلاح کا جذبہ ہمیشہ فنی تقاضوں کا تابع رہتا ہے۔ اصلاح خاموشی اور نرمی سے اپنا کام کرتی رہتی ہے، وہ اشاروں، کنایوں کو اپنا ہم سفر اور ہم صفیر بنا کر آگے کو بڑھتی ہے اور پھر فن اس خاموش اور نرم آگ کو آہستہ آہستہ سلگا کر شعلہ بنا دیتا ہے۔ شعلہ کو بھڑکانا افسانہ نگار کا کام نہیں، اس کا کام تو کسی دبی ہوئی چنگاری کو کُرید کر دلوں میں اس کا احساس پیدا کرنا ہے۔ احساس اس چنگاری کو خود بھڑکائے گا، وہ خود ہر چیز کو جلا کر خس و خاشاک کر دے گا —— پھر افسانہ نگار اپنا منصب کیوں چھوڑے؟ کیوں وہ خطیب اور مُلّا بن کر سامنے آئے؟ کیوں وہ مجمع میں کھڑا ہو کر ”انقلاب زندہ باد“ کے نعرے لگائے؟ کیوں وہ خود ہی تلوار کو ہاتھ میں لے کر آگے بڑھے؟ اُس نے یہ سب کچھ کیا تو اُس کا سارا جوش دودھ کے اُبال کی طرح پیدا ہو کر خود ہی فنا ہو جائے گا۔ دوسروں پر اس کا کوئی اثر نہیں! افسانہ پر اس کا کچھ احساس نہیں۔ مگر یہ سب کچھ کرنا ذرا دشوار ہے۔ یہ کرنے کے لئے اپنے دل پر، اپنے خیال پر اپنے قلم پر قابو رکھنے کی ضرورت ہے۔ بڑی سخت آزمائش ہے، بڑی کڑوی گولی ہے لیکن یہ کڑوی گولی بڑے مہلک مرض کا علاج ہے۔

اور اس مرض میں ہمارے بہت سے افسانہ نگار مبتلا ہیں۔ وہ چھوٹے حوش کو فن کے نرم اور گہرے اثر سے زیادہ اہم جانتے ہیں۔ اور اسی لئے بہت سوں کے محسوس نہ کرکے بھی وہ محبوبی کے قابل نہیں۔ یہ محبوبی عارضی اور بہت جلد مٹ جانے والی ہے۔ پھر دل کو قابو میں رکھکر کوئی ایسی دولت کیوں نہ حاصل کی جائے، جو ابدی ہو اور سرمدی ہو مگر کہے کون؟

پھر کچھ بغیر کام کئی ہیں جلا مرض بڑھ رہے ہیں اور مریض دوا پاکر بھی اُسے کام میں نہیں لاتے ——— لیجئے ایک سامرض اور ! جدت پسندی! ہر چیز میں، ہر بات میں کوئی نیا پہلو پیدا کرنے کی کوشش۔ یہ جذبہ بُرا نہیں، محمود اور قابل ستائش ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اِسے مناسب حدوں میں رکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی، بلکہ شاید ضرورت محسوس کرنے کے باوجود اعتدال اور توازن کی طرف سے لاپرواہی برتی گئی۔ افسانہ فنی حیثیت سے پچھلے دس برسوں میں بہت آگے بڑھا ہے۔ اور یقیناً اسی لئے آگے بڑھا ہے لوگوں نے اس میں نئی نئی راہیں پیدا کیں۔ لیکن بعض حیثیتوں سے یہ آگے بڑھنے کی جگہ پیچھے بھی ہٹا ہے اور یہ بھی یقیناً اسی لئے کہ لوگوں نے اس میں نئی نئی راہیں نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نئے کام میں سمجھ سے کام نہیں لیا۔ اور بہت سی باتوں کو چھوڑ کر نا سمجھی کی بس ایک مثال لے لیجئے۔ پچھلے چند برسوں سے انگریزی مصنف جوائس، لارنس، ورجینیا الف اور پروست (کیسلے کا نام میں نے جان بوجھ کر چھوڑ دیا ہے) کے نام بے شمار طریقوں سے اور بے شمار موقعوں پر ہمارے کانوں میں ڈالے ہیں۔ ہمارے کچھ افسانہ نگاروں نے ان لکھنے والوں کی کہانیوں کو پڑھا اور فنی نقطۂ نظر سے ان سے متاثر بھی ہوئے۔ ان سے متاثر ہو کر کچھ کہانیاں بھی ایسی لکھیں جنہوں نے اُردو کے افسانے کو ایک انقلابی راہ دکھائی۔ یہ مانا کہ ان کی ابتدائی کوششوں میں جا بجا مختلف طرح کی خامیاں بھی ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے یہ کام سراہنے کے قابل ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ بجائے خود فن کا کوئی بلند نمونہ ہے، بلکہ اس لئے اس نمونہ نے افسانہ کی فضا کو ایک انقلابی انداز سے روشناس کرایا۔ نئے افسانہ نگار نے ان نمونوں کو پڑھا، یا زیادہ سے زیادہ اُن تنقیدوں کو جن میں انگریزی اور فرانسیسی کے اُن لکھنے والوں کے طرز پر مفصل تبصرے تھے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ اکثر صورتوں میں صرف پہلی چیز، اور شاذ و نادر دوسری چیز بھی، ان جدت کے متوالوں کے لئے شمع ہدایت بن گئی۔ اور ایک انجان مسافر نے اس اندھیرے راستے پر صرف اس ٹمٹماتی ہوئی شمع کے بھروسے اور سہارے پر چلنا شروع کر دیا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ایسی ٹھوکریں کھائیں کہ خود بھی زخمی ہوئے اور ادب کے جسم پر بھی بدنما داغ دھبے لگائے۔ ایک نئے فن کے نام سے افسانہ کو بھول بھلیاں بھی بنایا، اور ایک تنگ، تاریک اور گندی، سڑی ہوئی گلی بھی۔ اس بھول بھلیاں میں کھو کر یا اس تاریک گلی میں جا کر مسرت کسی کو بھی نہیں، لیکن جلن اور بے چینی بہت سوں کو ملتی ہے۔ جوائس نے، لارنس، ورجینیا ولف نے اور پروست نے ایک خاص زمانہ کے حالات سے متاثر ہو کر اور ان تاثرات کو اپنی انفرادی جذباتیت میں ڈبو کر افسانہ کے فن کو ”انقلاب“ کی راہ دکھائی ہے۔ اور اس راہ میں ہمارے لئے بھی بہت کچھ کام کا ہے۔ اور جو کچھ کام کا ہے اُس سے ہمارے افسانے کو فائدہ بھی پہنچا ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ فائدہ اُس صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ افسانہ نگار ان سب کو خود جاننے پہچانتے۔ پہلے اُن حالات سے واقف ہو جن میں رہ کر یہ فن پیدا کیا گیا، پھر اُس جذباتی کیفیت کا رازداں بنے جس نے حالات کو فن کی یہ نئی شکل دی۔ اُس ادبی سرمایہ کو اپنے تجربہ کا جزو بنائے جو ایک خاص زمانہ کے حالات اور خاص قسم کی جذباتی کیفیتوں کا آئینہ بن کر نکلا ہے۔ نئے افسانہ نگار کو اگر جوائس، لارنس، ورپروست سے کچھ حاصل کرنا ہے تو اُن کی تنقیدیں پڑھ کر نہیں، بلکہ اُن کی کتابیں پڑھکر حاصل کرنا چاہیئے۔ اس میدان میں آنکھ مچولی کھیلنے سے کام نہیں چلتا، نظر کو تیز، ذہن کو فراخ اور جذبات کو آزاد رکھکر مجاہدانہ شان سے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ مجاہدانہ شان سے میری مُراد بے جھجک گہرا تنقیدی مطالعہ ہے، لیکن اس گہرے تنقیدی مطالعے کے بعد بھی ساری مشکل حل نہیں ہوتی۔ جوائس، لارنس اور پروست نے جو کچھ لکھا وہ ایک خاص قسم کے حالات میں رہنے والے لوگوں کے لئے لکھا، ایک خاص طرح کے سماجی ماحول میں رہ کر لکھا، اور ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے کہ اس سماجی ماحول کی معاشی اور اخلاقی قدریں ہماری قدروں سے بالکل مختلف ہیں جس بات کو مغرب کا

اخلاق حسن سمجھتا ہے وہ ہمارے معیار پر ایک بار گراں ہے۔ اس لئے ان مصنفوں کے مطالعہ کی پوری دردسری کے بعد بھی افسانہ نگار اُن کی واقعہ نگاری کو اپنے لئے نمونہ نہیں بنا سکتا۔ جو کچھ وہاں واقعہ کی فنی مصوری ہے وہ ہمارے ادب میں آکر عریاں نگاری بن جاتی ہے۔ اس لئے اُن سے بہت کچھ لے کر بھی ہمیں اُسے اپنی ضرورت اور پسند کے مطابق سلیقے سے برتنا ہے لیکن کیا ہمارے افسانہ نگار نے اب تک یہ سلیقہ برتا ہے؟ جواب کا انتظار کئے بغیر مجھے یہ کہنا ہے کہ خیر اب تک نہ سہی، اب ہی۔ اچھے کام کے لئے کبھی بھی دیر نہیں ہوتی۔ جوائس، لارنس، ورجینیا وُلف اور پروست ــــــ نام ان کے علاوہ اور بھی ہیں۔ لیکن جن ناموں نے ہمارے نئے افسانہ نگار کو گمراہی میں مبتلا کیا ہے اُن میں ایک نام "مارکس" کا بھی ہے۔ "مارکس" تو شاید نام ہی نام ہے۔ اس لئے کہ اس نام کی مالا جپنے والے اور اس کے بتائے ہوئے منتروں کو اپنی معاشی فکر کی بنیاد بنانے والے افسانہ نگاروں میں سے اکثر نے بس "مارکس" کا نام ہی تو سنا ہے۔ یا شاید اِدھر اُدھر تاکا جھانکی کر کے اُس کے معاشی نظریوں کے کچھ یوں ہی سے خد و خال دیکھ لئے ہیں، اور لے اُڑے اس نام کو۔ اور اُڑتے اُڑتے کسی ایسی بلندی پر پہنچ گئے، جہاں سے سوائے مارکس کے اور کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا ــــــ مزدور کے جسم میں وہ حلول کر گیا ہے، کسان کی روح پر اُس نے قبضہ کر رکھا ہے، دفتر کے کلرک کی فائلوں میں وہ گھسا بیٹھا ہے، اور زمیندار، ساہوکار اور حاکم کی گردن پر وہ سوار ہے۔ آنکھ پر ایسا پردہ پڑا ہے کہ کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔ حالانکہ "مارکس" نے خود آنکھوں پر پردہ ڈالنے کی سخت مخالفت کی ہے۔ اُس نے دنیا کو چلتے پھرتے مسافر کی طرح دیکھا ہے اور اُس کی نظر حال اور مستقبل سے بھی زیادہ ماضی پر ہے۔ ماضی کے رشتہ کو توڑ کر حال اور مستقبل بے معنی بن کر رہ جاتے ہیں۔ پھر کارل مارکس کے نام کا جپ کرنے والے کیوں ماضی کی طرف سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں؟ کیوں اُنہیں گئے ہوئے زمانہ اور آنے والے دنوں میں گہرا تعلق نظر نہیں آتا؟ کیوں وہ زندگی کو اتنا گھرا ہوا، اتنا محدود اور صرف مادی حقیقتوں سے بھرا ہوا سمجھتے ہیں۔ افسانے کو مارکس کے نظریوں کا ترجمان بنانا ضروری ہے، اُس سے انسان کے بہت سے دُکھ دُور ہوں گے، لیکن پہلے یہ جاننا بھی تو ضروری ہے کہ یہ نظریے کہتے کیا ہیں۔ مارکس، مارکس کہتے سے زبان میں تو ممکن ہے کہ روانی آجائے، لیکن دل پر چوٹ نہیں پڑ سکتی۔ اور یہ چوٹ مارکس کو سمجھے بغیر پڑ بھی نہیں سکتی۔ اس لئے اور بہت سے ناموں کی طرح اس نام کو بھی نام کیلئے نہیں بلکہ کام کے لئے زبان پر لانا ہے۔ کیا افسانہ نگار یہ کریں گے؟ ممکن ہے کر لیں، مگر ابھی کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے دو ناموں پر اور نظر ڈال لیجئے ــــــ اڈلر اور فرائڈ۔ بلکہ پہلا نام تو محض تکلف ہے۔ اصل میں لیس کی گانٹھ تو یہ دوسرا نام ہے۔ ہمارے نئے افسانہ نگار نے "فرائڈ" کے نام کو بہانہ بنا کر افسانہ میں جو جو گل کھلائے ہیں وہ کسی دوسرے نام سے نہیں کھلائے۔ نئے افسانے میں زمانہ بھر کی عریانی، فحاشی اور لغویت ـــ بدی اسی ایک نام کے بہانہ سے داخل ہوئی ہے اور ایک لطیف اور نازک علم (نفسیات) کی آڑ میں اُردو کا افسانہ کوک شاستروں کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس کی بھی دو وجہیں ہیں ــــــ پہلی تو یہی کہ فرائڈ کے نام کے عاشقوں نے شاید فرائڈ، اور اُس کے جنسی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی، یا اگر اُسے سمجھا بھی تو اس کی ترجمانی کرتے وقت اپنے تمدن، اپنی معاشرت اور اپنے سماج کے اخلاقی معیاروں کی طرف سے قطعی آنکھیں بند کر لیں۔ اس طرح آنکھیں بند کر کے چلنے والے افسانہ نگار ادب کے دشمن ہیں، اور سماج کے مجرم۔ اور نئے افسانہ نگاروں میں ایسے دشمنوں اور مجرموں کی کمی نہیں ــــ اور اس مرض کا علاج صرف یہ کہ اُنہیں آنکھیں کھول کر چلنا سیکھنا ہے۔ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو کر سپاہیوں کی طرح آگے بڑھتے رہنے میں بھی ایک بات ہے، لیکن ادب میں نہیں۔ یہاں آنکھ سے آنکھ کا، دل سے دل کا اور دماغ سے دماغ کا پورا کام لینے کی ضرورت ہے۔ بڑی سخت آزمائش ہے لیکن اس آزمائش پر پورا نہ اُتر سکے اُس کے کلنک کا ٹیکا لگتا ہے، اُس کی جگ ہنسائی ہوتی ہے۔ اُسے شہر بدر کر دیا جاتا ہے۔

نئے افسانہ نگاروں کے پاس اس ساری بات کا یہ جواب ہے کہ ہم نے جو جی میں آیا کیا۔ نئی نئی اصطلاحوں کو بہانہ بنا کر، بڑھتے ہوئے فن کی آڑ لے کر اور بڑے بڑے ناموں

کے سہارے پر زندہ ہیں سب کچھ لکھ دے ایک آواز برا کہہ رہی ہے— لیکن نہ ہمارے کاسہ کا ٹھیکہ لگا، نہ ہماری جگ ہنسائی ہوئی اور نہ کسی کی۔ سمت ہوئی کہ ہمیں سچ مدد کر دے ہم تو دنیا کے محبوب ہیں۔ دنیا ہماری بھی ہوئی باتوں کو اپنے دلوں میں جگہ دیتی ہے۔ رسالوں کے ایڈیٹر شاداں لوگوں کے ساتھ ہمارے افسانے چھاپتے ہیں، ہمارے پاس تعریفوں سے بھرے ہوئے خط پہنچتے ہیں، ہماری خوشامد کرتے ہیں اور ہمیں منہ مانگے دام دیتے ہیں۔ ناشر ہماری کتابوں کے بھوکے ہیں روپے پہلے اور کتاب بعد میں، لیکن وہ اس پر بھی ہمارے احسان مند ہیں۔ بازار میں ہماری کتابوں کے ایڈیشن پر ایڈیشن نکل رہے ہیں، ادبی مجلسوں میں ہمارے فن پر مقالے پڑھے جا رہے ہیں۔ اور پڑھنے والے ہمارا نام لے کر جیتے ہیں۔ پھر کسی کو ہم سے یہ سب کچھ کہنے کا کیا حق ہے؟ مریض ہم نہیں ہیں، ہمیں کچھ کہنے والا مریض ہے — کڑوی گولیوں کی [illegible]
لیکن ان جوشیلی باتوں کے بعد، کبھی کبھی [illegible] احساس ہمیں ہوتا ہے اُسے معلوم ہے کہ یہ چار دن کی چاندنی ہے۔ ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ یہ سب دعوے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے، اور دعویٰ کرنے والوں کو وقت کے فیصلے کے آگے سر جھکانا پڑے گا۔ وقتی ہوس اور ولولے، وقتی پسند اور مدح سرائی ہمیشہ سے بنتے مٹتے رہے ہیں، لیکن ان چیزوں کی عمر تھوڑی ہے، انہیں ثبات نہیں۔ ان کڑوی گولیوں سے گھبرا کر کسی بے ثبات چیز کا سہارا لینے کا معنی ہے سب سے بڑا سہارا اپنی سوجھ بوجھ کا، اپنی سوجھ بوجھ کا اپنے مشاہدے اور مطالعے کا اور اس مشاہدہ اور مطالعے سے بھی زیادہ غور و فکر کا۔ تھوڑے دن قائم رہنے والی تعریفوں کو سچا، دولت کی طمع اور شہرت کے دلاسے تسلی سے دور بھاگنا، دوسروں کی رہبری سے زیادہ اپنی شخصیت، انفرادیت اور جذباتی خلوص کی دکھائی ہوئی راہ پر چلنا اچھے فنکار کا منصب ہے۔ افسانہ نگار کا اس لیے اور بھی زیادہ کہ حالات نے اسے سنگار کی ان سارے جالوں میں پھنسا دیا ہے، ان جالوں سے نکلنا آسان نہیں، لیکن حوصلہ کی مردانگی فکر کی توانائی اور جذبات کی سچائی سارے بندھنوں کو، ساری قیدوں کو سارے جالوں کو توڑ سکتی ہے۔ کیا ہمارے افسانہ نگاروں کو یہ قیدیں گراں نہیں گزرتیں؟

غزل

محبت موج بن کر یوں دلِ انساں سے ٹکرائی
کہ گویا کشتیِ بے ناخدا طوفاں سے ٹکرائی

نگاہِ اولیں ان کی جگر کی چوٹ تھی یعنی
جوانی کی جبیں سنگِ درِ جاناں سے ٹکرائی

پلائی وہ مئے بے جام ساقی نے سرِ محفل
کہ توبہ تڑپ کر شیشۂ ایماں سے ٹکرائی

خدائے عشق نے جب جذبِ کامل قلب کو بخشا
تجلّی ہر قدم پر دیدۂ حیراں سے ٹکرائی

ملا ساحل نہ جب دل کو کہیں بحرِ حوادث میں
یہ کشتی تنگ آ کر موت کے طوفاں سے ٹکرائی

چھلک اٹھا مئے رنگیں سے جامِ زرفشاں اُس کا
نگاہِ مستِ جاناں جب گلِ خنداں سے ٹکرائی

طفیل احساس کی دُنیا میں شعلے سے بھڑک اٹھے
نظر تنہائیوں میں جب مہِ تاباں سے ٹکرائی

طفیل ہوشیارپوری

دیویندر ستیارتھی

لاوارث

کوچ بہار کے پلیٹ فارم پر گاڑی ایک چیخ کے ساتھ رُک گئی اور ہری توش کھڑکی کے راستے جھٹ ایک ڈبے میں گھس گیا نیچے سے سانیال اور بوس سب سامان اُسے تھماتے چلے گئے اور بار بار تاکید کرتے رہے کہ وہ ایک پوری سیٹ پر قبضہ جما لے۔

سانیال ہنس ہنس کر کہہ رہا تھا "ہری توش ہمارا بھائی ہے۔ وہ ناراض نہیں ہو سکتا۔" بوس یونہی مسکرا رہا تھا۔ اور ہری توش ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔

پورے ڈبے میں دھکا پیل ہو رہی تھی باہر کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ وہی لوگ جو کچھ دیر پہلے پلیٹ فارم پر کھڑے اندر والوں کی منت سماجت کئے جا رہے تھے اب باہر والوں کو اندر آنے کی اجازت دینے کو تیار نہ تھے۔

سامنے کی سیٹ پر پُرانے چیتھڑوں میں لپٹی سمٹی ایک زندہ لاش نظر آ رہی تھی جس کے چہرے پر ایسی مُردنی ٹپکتی تھی کہ ہر دیکھنے والے کو خواہ مخواہ گھن آنے لگتی اور وہ سوچتا رہ جاتا کہ دراصل اس ہڈیوں کے ڈھانچے میں زندگی ہے بھی یا نہیں اس زندہ لاش کے پاؤں کی طرف ایک زرد چہرے والا انسان اکڑوں بیٹھا نہ جانے کس سوچ میں کھویا ہوا تھا۔

اُدھر ایک کونے میں سفید دھوتی اور قمیص پہنے ہوئے ایک بھاری بھرکم شخص بڑی بے تکلفی سے سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگا رہا تھا اُس کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی پنشن یافتہ ہے۔ وہ اپنے سگریٹ کیس کو کبھی کبھی یوں ہاتھوں میں اُچھالنے لگ جاتا جیسے وہ بیڑیوں اور سستے سگرٹوں کے دھوئیں میں لپٹی ہوئی فضا سے چڑ کر اب مہنگے تمباکو کی تعریف میں ایک زوردار تقریر کیا چاہتا ہو۔ پھر اُس کے چہرے پر ایک تلخی نمودار ہوئی جس کا تعلق اُس قحط سے تھا جو بنگال کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ اس قحط نے امیروں کو بھی کچھ کم تنگ نہیں کیا۔ میں ہمیشہ پانچ سو پچپن کے سگریٹ پسند کرتا تھا اور اب کو نمبر سے ہی کام چلا رہا ہوں۔

ڈبے میں ایک طرف فوجی جمے بیٹھے تھے۔ وہ اپنے قہقہوں سے اس فضا میں کچھ عجیب سی بے معنی رنگینی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہری توش نے سوچا کہ پاس کے سپاہی سے آسام کے محاذ کے حالات دریافت کرے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ کچھ سوچ کر چُپ ہو گیا۔

سانیال اور بوس نے بھی ایک ایک سگریٹ سُلگا لیا لیکن بار بار جب اُن کی نگاہیں اُس زندہ لاش کی طرف اُٹھتیں تو اُنہیں ایسا محسوس ہونے لگتا کہ سگریٹ میں تمباکو کی جگہ گوبر بھرا پڑا ہے سانیال نے بوس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا جیسے کہہ رہا ہو آؤ سگریٹ باہر پھینک دیں اور اس سکھ سپاہی کو یہی سمجھنے کا موقع دیں کہ ہمیں اُس کے مذہبی جذبات کا احترام منظور ہے۔ لیکن بوس بے جان بُت کی طرح بیٹھا رہا۔ جیسے تیسے وہ زہر مار کرتے گئے۔ ایسے ماحول میں سگریٹ کے بغیر بھی چارہ نہ تھا۔

پھر ہری توش کی طرف دیکھتے ہوئے بوس کے چہرے پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ تھرک اُٹھی۔ سانیال بولا۔ "ہری توش کو شاعر کس کمبخت نے بنایا تھا؟ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ سگریٹ پیئے بغیر وہ کیسے گیت لکھ لیتا ہے۔"

بائیں طرف سے ایک آواز آئی "یہ کہ ہم تباہ ہو گئے ہیں" بوس نے زور کا کش لگاتے ہوئے کہا "ہری توش، اُدھر بھی تمہارا ایک بھائی بیٹھا ہے۔ عجیب بکواس ہے۔ آخر تم لوگوں سے کوئی پوچھے کہ بتاؤ تم کیوں تباہ ہو گئے۔ اُدھر تو تم دھیان ہی نہ دو گے یونہی خواہ مخواہ چلاتے رہو گے۔"

ہری توش اس کے جواب میں اونچی آواز سے اخبار پڑھنے لگا ـــــ کلکتے میں ایک ہفتے میں ایک ہزار سے اوپر موتیں ہوئیں۔

سانیال نے بیچ سے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "مر گئے سو مر گئے تم کیوں اُن کا رونا روتے ہو؟"

بوس نے ہری توش کے ہاتھ سے اخبار چھین کر کہا: "بنگال میں لاشیں ہی لاشیں نظر آ رہی ہیں۔"

بیمار نے اپنے زرد چہرے والے ساتھی کی طرف اپنا مریل ہاتھ

اُٹھا، لیکن یہ اُس کے اپنے سینے پر گر گیا۔ شاید وہ کہنا چاہتا تھا
مجھے مکھیاں دق کر رہی ہیں اور تم انہیں اُڑا بھی نہیں سکتے۔
سب لوگوں کی نگاہیں اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ سب حیران تھے
کہ ابھی تک یہ لاش کس طرح زندہ رہنے کی کوشش کئے جاتی
ہے۔ اُس کے جسم پر میل کی تہ سی جمی ہوئی تھی۔ اُس کے بال
کبھی زمانے میں اپنے گھونگھروں پر ناز کرتے ہونگے لیکن اب
تو اُن سے بڑی کھٹی سی بُو آ رہی تھی۔ شاید یہ بیمار اپنے
گاؤں میں پہنچ کر مرنا چاہتا تھا لیکن وہ اب بھی کہاں زندہ
تھا، لاش ہی تو تھا۔ اُس نے پھر ہاتھ پاؤں ہلائے۔ جیسے وہ
بدقسمت انسان یہ کہنا چاہتا ہو — مجھے لاشوں میں کیوں
شمار کرتے ہو۔ میں زندہ ہوں، میں زندہ رہونگا
ستانیال کہہ رہا تھا "برتی توس کے گیت ایک دن سارے
دیس میں گونج اُٹھیں گے"
توس بولا "مجھے برتی توس کا وہ گیت بہت پسند ہے۔
بکھر جائے گا بنگال"
سب یہی سوچ رہے تھے کہ جانے گاڑی کب چھوٹے گی۔
سب کے حلق خشک ہو رہے تھے۔ لعاب نگلنے کو بھی کسی کا جی نہ
چاہتا تھا۔ ڈبے کی گھٹی گھٹی سی فضا اور اُس پر اس زندہ لاش
کی سڑاند نے بُری طرح ناک میں دم کر رکھا تھا اور ہر کوئی یہی
محسوس کر رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں اُسے متلی ہونے لگے گی۔
برتی توس نے سوچا سب خوشبوئیں مٹتی جا رہی ہیں اور
زندگی کو قے سی آ رہی ہے۔ یقیناً میرے گیت اِس دُکھ درد
کا مداوا نہیں کر سکتے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ سنگترے والے
کو آواز دیتا۔ بنگال مر رہا ہو اور وہ گاڑی میں بیٹھا مزے
سے سنگترے کھائے، اُسے کبھی بھی صورت منظور نہ تھا۔ آج
ریفریشمنٹ روم میں ستانیال اور توس پورا ایک کیک ختم کر گئے
تھے۔ لیکن اُس نے تو ایک کپ چائے تک قبول نہ کیا تھا۔ اب
پلیٹ فارم سے آتی ہوئی خوانچہ والوں کی صدائیں اُس کے
دماغ پر بُری طرح ہتھوڑے چلا رہی تھیں۔
سکھ سپاہی اپنی پگڑی پر ہاتھ پھیرتا ہوا آس پاس
کے لوگوں کا خیال اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ
کہہ اُٹھا "ہم لوگوں کو سب سے زیادہ دو پھول والے تنگ کرتے ہیں"۔
ستانیال اور توس چونک کر بولے "جی یہ دو پھول والے
کیا بلا ہیں؟"
اُس وقت سکھ سپاہی ستانیال اور توس سے زیادہ باتیں
نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسے عجیب آدمی
ہیں جنہیں زندہ جسم سے بھی مُردہ گوشت کی سڑاند آتی ہے۔ ہمیں
تو کبھی مہینے مہینے کے مرے ہوئے جسموں سے بھی ایسی بدبو نہیں
آتی۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ آخر وہ اُس کی باتوں میں دلچسپی دکھا رہے
ہیں وہ کہہ اُٹھا "یہ لوگ جو بی۔ اے، ایم۔ اے پاس کر کے اپنے
کوٹ پر دو پھول لگا لیتے ہیں اور فوج میں بھرتی ہو کر لفٹن
بن جاتے ہیں۔ لیکن وہ بندوق اُٹھانا بھی نہیں جانتے۔ وہ
صرف قلم اور حکم چلانا جانتے ہیں"
برتی توس نے سوچا، کیا خوب قلم اور حکم یعنی دو پھول۔
اُسے خیال آیا کہ اِس سپاہی سے پوچھے آسامیوں کو اُس نے
کیسا پایا اور کیا آسام میں بھی کسی شاعر سے اُس کی ملاقات
ہوئی تھی۔ لیکن یہ سوچ کر کہ دو پھول والوں نے اُسے کب یہ
اجازت دی ہوگی کہ وہ محاذ کے کام سے فرصت کی گھڑیوں
میں آسامیوں سے میل جول بڑھائے، وہ چُپ بیٹھا رہا۔
بیمار کے چہرے پر مکھیاں بدستور بھنبھنا رہی تھیں۔
جنہیں وہ کمزور ہاتھوں سے اُڑانے کی ناکام کوشش کئے جاتا
تھا۔ اُس کا ساتھی جانے کس سوچ میں گُم سُم بیٹھا اُونگھ رہا تھا۔
برتی توس نے سوچا کہ ستانیال اور توس بھی تو دو پھول
والے ہیں اور بی۔ اے، ایم۔ اے پاس کرنے کے سبب تو میں بھی
دو پھول والا کہلا سکتا ہوں۔ لیکن میرا تو محض قلم چلتا ہے۔
اُن کے حکم نے میرے قلم کو خرید لیا ہے۔ میرے گیت اب اُن کی
جائداد ہیں۔ چاہے میں پنجرے میں نئے پھنسے ہوئے پنچھی کی طرح
لاکھ پھڑپھڑاؤں اِس سے اب کیا حاصل؟
بیمار نے پھر ہاتھ پاؤں ہلائے۔ مکھیاں بدستور بھنبھنا
رہی تھیں۔ اب جیسے کوئی اُس کی طرف دیکھنے کا بھی نہیں۔ سب نے
مُنہ پھیر لیا تھا۔ لیکن برتی توس اور سکھ سپاہی کی نگاہیں بار
بار بیمار کی طرف اُٹھ جاتیں۔ وہ اُس کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ برتی توس
نے سوچا یہ سپاہی تو اتنا بھی کر سکتا ہے کہ اب چھٹی پر گھر جانے
کی بجائے اس بیمار کو گاڑی سے اُتار کر کسی ہسپتال میں لے
جائے اور جب تک یہ اچھا نہیں ہو جاتا اپنی چھٹی میں اضافہ
کرتا رہے۔ لیکن میں تو اتنا بھی نہیں کر سکتا۔

سانیال نے بیمار کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا؛ "اُس اُمس میں ہم مرے جا رہے ہیں اور ابھی نہ جانے یہ گاڑی کب تک رُکی رہے گی۔" دراصل اُس کا اُمس سے اِتنا بُرا حال نہیں ہو رہا تھا جتنا کہ اُس زندہ لاش کی موجودگی سے۔ وہ چاہتا تھا کہ اگر کچھ اور نہیں ہو سکتا تو یہ تو ضرور ہونا چاہیئے کہ اُسے سامنے کی سیٹ سے اُٹھوا دیا جائے۔

اُمس سے بچنے کے لئے بھاری بھرکم پنشن یافتہ ایک مصوّر رسالے سے اپنے منہ پر پنکھا کرنے لگا۔ اُس نے رسالے کو اُلٹا پکڑ رکھا تھا۔ پرتی توش نے محسوس کیا کہ یہ آدمی دو پھول والوں کا بھی دو پھول والا ہے اور اُس نے اس رسالے کو نہیں بلکہ بنگال کو اُلٹا پکڑ رکھا ہے۔

سانیال بولا "بوس کیا کوئی ایسا قانون نہیں بنا جس کی رُو سے علیل بیماروں کو گاڑی میں سفر کرنے سے روکا جا سکے ..." وہ کچھ اور بھی کہتا مگر یکایک گاڑی کے چل پڑنے سے اُس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔

سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ بیمار نے بھی اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں ہلائے۔ مکھیاں کچھ دیر کے لئے اُس کے مُنہ سے اُڑ گئیں لیکن تھوڑی دیر بعد پھر اُس کے مُنہ پر بھنبھنانے لگیں شاید وہ موت موت کی رٹ لگا رہی تھیں۔ لیکن بیمار ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی تو اُس کا خیال تھا کہ اُس کا خُون کافی گرم ہے اور اُس کی ہڈّیاں بھی چلنے پھرنے کے قابل ہو سکتی ہیں۔ لیکن مکھیاں تھیں کہ برابر اُسے یقین دلائے جا رہی تھیں کہ اب جینے کی حرص بیکار ہے۔

پرتی توش نے ایک اور کروٹ لی اور وہ سوچنے لگا کہ دراصل بنگال ہی نہیں کُل ہندوستان اِسی قسم کا ایک مریض ہے۔

بھاری بھرکم پنشن یافتہ نے رومال سے چہرہ پونچھ کر نیا سگریٹ سُلگایا اور اب وہ رسالے کے سرورق کی حسینہ کا ملاحظہ کرنے لگا۔

فوجی سپاہی جنگ کی باتیں بھلا کر گھر کی باتیں لے بیٹھے تھے۔ اُنہیں یقین تھا کہ گاڑی قحط زدہ بنگال سے گزر کر جلد اُن کھیتوں میں پہنچ جائے گی جہاں آج بھی سُنہری بالیاں خوشحالی کا پیغام سُناتی ہیں۔

بیمار کا ساتھی اُسی طرح سر گھٹنوں میں دبائے سہما اونگھے جا رہا تھا۔ شاید وہ مکھیوں سے خوف کھاتا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہی ایک روز میرے مُنہ پر بھی بھنبھنائیں گی۔

سِکھ سپاہی نے اُس کا کندھا جھنجوڑ کر کہا؛ "کہاں جاؤگے تم لوگ؟"

اُس نے جیسے خواب سے چونک کر سپاہی کی طرف دیکھا اور جب سپاہی نے ایک بار پھر اپنا سوال دُہرایا تو وہ کہہ اُٹھا؛ "رنگپور"۔ "رنگپور؟ — رنگپور تو اب نزدیک ہی ہوگا۔"

لیکن اس کے بعد اُس نے کچھ اس طرح سپاہی کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو؛ تمہیں ہماری کیا فکر پڑی ہے؟ تم آرام سے بیٹھے رہو۔

پرتی توش اپنے خیالات میں مگن سوچ رہا تھا کہ یہ دیس کتنا وسیع ہے۔ لیکن یہ غلام کیوں ہے؟ یہ غلام ہے اسی لئے آج یہ قحط کا شکار ہو رہا ہے۔ ہر طرف چور بازار گرم ہے۔ ہر طرف کمینے رذیل نفع بازوں کی چاندی ہے۔ اُس نے سارے ڈبے کا جائزہ لیا۔ اُس وقت سِکھ سپاہی کبھی مزے سے کچھ چبا رہا تھا پھر اُس نے سوچا کہ شاید اب یہ سپاہی اس لئے گھر جا رہا ہے کہ اس کی بیوی نے بیٹا جنا ہے۔ بیوی اور بیٹے کو دیکھ کر وہ آسام کے محاذ پر لوٹ آئے گا۔ وہ سپاہی سے کہنا چاہتا تھا کہ آج تم مُردہ دیس کی حفاظت کر رہے ہو، کل تمہارا بیٹا زندہ دیس کی حفاظت کرے گا۔

بار بار پرتی توش کی نگاہیں اُس بیمار کی طرف اُٹھ جاتیں۔ سپاہی کے بعد وہی دوسرا شخص تھا جسے بیمار سے گھن نہیں آ رہی تھی۔

بھاری بھرکم پنشن یافتہ نے جانے کیا کیا فیصلے کرتے ہوئے کہا؛ "سردار صاحب، وہ دو پھول والوں کی بات تو بالکل غلط معلوم ہوتی ہے تعلیم تو بُری چیز نہیں!"

سِکھ سپاہی ایک دم ہنس دیا۔ اور بولا؛ "چھوڑو جی بی۔ اے، ایم۔ اے ہی تو دو پھول والے نہیں۔ دو پھول والے تو ہر جگہ موجود ہیں۔ عدالت کے منشی، چپراسی، گاؤں کے پٹواری، زمیندار کے گماشتے اور پولیس والے — یہ لوگ بھی تو دو پھول والے ہیں!"

بھاری بھرکم پنشن یافتہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھرک اُٹھی۔

جیسے کہہ رہا ہو۔ شکریہ کہ از کم مجھے تم نے دو کھوپڑیوں میں شامل نہیں کیا۔

فوجی سپاہی اب سیٹیاں بجا رہے تھے جیسے پہلے کے بعد وہ اپنے گھروں کے نزدیک پہنچے جا رہے ہوں بندوقوں سے چھوٹی ہوئی سسانی آوازوں کی بجائے اب ہم دنارک کلائیوں پر کھنکتی چوڑیوں کا تصور اُن کی آنکھوں میں نشہ پیدا کر رہا تھا

سانیال نے سرسراتے انداز میں کہا۔ پوتس ہری توس اپنی قیمت نہیں جانتا۔ وہ جوہر ہے جوہر کی قیمت جوہری ہی جانتا ہے۔"

توس نے ایک بار ہری توس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی کہ اُس پر کیا اثر ہوا ہے۔ لیکن وہ تو گم سُم بیٹھا تھا۔ سانیال نے پھر سے دہرا دیا "ہری توس کے گیت اپنا جواب نہیں رکھتے۔"

توس کہہ اٹھا۔ "مجھے تو اُس کے کال گیت ہی سب سے زیادہ پسند ہیں۔ یہ ہمارے دیس کے دُکھ درد کا ہداشتہ ہیں۔ ذرا انہیں شائع تو ہو لینے دیجئے۔ پھر ہم انہیں انگریزی میں بھی پیش کریں گے۔"

"ہم ہری توس کو نوبل پرائز دلائیں گے۔"

"ایک ہی شرط پر کہ یہ ایک لاکھ بیس ہزار کی رقم ہمارے شونار بانگلا ساہتیہ پریشد کے فنڈ میں آجائے۔ رابی بابو نے بھی تو اپنا انعام شانتی نکیتن کو دے دیا تھا۔ ہری توس بھی قربانی کر سکتا ہے۔"

"قربانی کا کیا مطلب توس؟ ہری توس ہمارا بھائی ہے۔"

توس نے اب کے پھر ہری توس کے چہرے پر اس گفتگو کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ اُس کی پیٹھ تھپتھپانے لگا اور کہتا گیا "ہری توس تمہارے گیت ہمارے گیت ہیں۔"

ہری توس نے چونک کر اپنے دوستوں کی طرف دیکھا اور پھر زندہ لاش کی طرف جیسے وہ اپنے دردِ دل مسافروں سے کہنا چاہتا ہو "ایسی ہی ایک لاش پر بھی تو میرا ایک گیت ہے۔"

توس کہے جا رہا تھا "تمہارے گیتوں پر دُنیا فخر کرے گی ہری توس۔ اِن کی نشر و اشاعت ہمارا کام ہے۔"

ہری توس کے جی میں تو آیا کہ اپنے ہمسفروں سے صاف صاف کہہ دے کہ وہ اپنے گیت شائع نہیں کرانا چاہتا کیونکہ گیتوں سے قحط نہیں مٹ سکتا۔ اور یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی مُردے کے کان میں ڈھول بجا کر توقع کرے کہ وہ جی اُٹھے گا۔

سانیال اور توس کھڑکی سے اُفق کی طرف دیکھنے لگے۔ شاید وہ "شونار بانگلا ساہتیہ پریشد" کے روشن مستقبل کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ہری توس کو طالب علمی کا زمانہ یاد آگیا جب وہ تینوں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ اُسے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ وہ روٹی کے لئے اپنے ہم جماعتوں کا محتاج ہو کر رہ جائیگا۔ اُس کے ذہن میں یہ خیال بجلی کے کوندے کی طرح پیدا ہوا کہ اُن سے صاف صاف کہہ دے کہ میرے گیت مجھے واپس دے دو۔ میں انہیں کسی بھی قیمت پر نہیں دے سکتا۔ میں شاعر بھی نہیں بننا چاہتا۔ میں اب اپنے لئے کوئی نئی راہ تلاش کروں گا۔ لیکن پھر اُس کے ذہن میں ملک کے سب سے بڑے شاعر کے الفاظ گونج اُٹھے — ہری توس کے گیت ہمیشہ زندہ رہیں گے وہ چکرا گیا۔ وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔

بیمار کے چہرے پر مکھیاں ایسے جم گئی ہوں معلوم ہوتا تھا یہ مکھیاں نہیں، چیچک کے داغ ہیں۔ سب سے پہلے اُس ہی نے بیمار کی موت کو آتے دیکھ لیا تھا۔ زندہ لاش مُردہ لاش میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اُس کے ساتھی نے اُسکے سر کو اپنے زانو پر رکھتے ہوئے چلّا کر کہا: "دادا! — دادا! —"

زندہ لاش نے دم توڑ دیا۔

لوگ گھبرا گئے۔ چند نوجوانوں کو تو اس قدر غصّہ آیا کہ لاش کو چلتی گاڑی سے نیچے پھینک دیں۔ لیکن وہ لاش کو چھونا بھی تو نہ چاہتے تھے۔

لاش کے ساتھی نے روتے روتے اپنی جیب سے ایک ٹکٹ نکال کر مرحوم دادا کی جیب میں ڈال دیا۔ وہ رو رو کر کہہ رہا تھا: "میرے پاس کچھ نہیں۔ مجھے بچا لو۔ پرماتما کے لئے دادا کو اگلے سٹیشن پر ہی اُتروا دو۔"

سکھ سپاہی حیران ہو کر بولا: "تو رنگپور کون جائیگا؟"

لاش کا مُنہ کھُلا ہوا تھا جیسے وہ مُردہ مریض مر کر بھی یہ کہنا چاہتا ہو — میں زندہ ہوں۔ میں زندہ رہونگا۔

پرتی توش سوچنے لگا کہ یہ ملک کبھی نہیں مر سکتا۔ اس کی چھپی ہوئی قوتیں کبھی ختم نہیں ہونگی۔ میرے گیت انہی قوتوں کے مرہونِ منت ہی تو ہیں۔

لاش کا ساتھی رو رو کر کہہ رہا تھا: "مجھے بچا لو۔ مجھے پولیس پکڑ لے گی۔ پولیس مجھے پیٹے گی۔ میں مر جاؤنگا۔ وہ میرا خون پی لیں گے۔"

پرتی توش نے اُس کے زرد چہرے کا ملاحظہ کرتے ہوئے سوچا کہ اس ستم رسیدہ شخص کے جسم میں اب اور کتنا خون باقی ہوگا۔ سانیال توس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا: "میرے گیت تو جب شائع ہونے ہونگے ہو ہی جائیں گے۔ آؤ اس آدمی کی مدد کریں۔"

لیکن سوائے سِکھ سپاہی کے کسی نے اُس کی ہاں میں ہاں نہ ملائی۔ دونوں نے لاس کے ساتھی کو سمجھایا کہ وہ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رُکتے ہی کسی دوسرے ڈبے میں چلا جائے۔ اور وہ سامنے سے یوں احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو مجھے اس مدد کی بہت پہلے سے اُمید تھی۔

جونہی گاڑی اگلے سٹیشن پر رُکی، وہ لپک کر نیچے اُتر گیا اور نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔

پھر بھاری بھر کم پنشن یافتہ ایک تھانیدار کو بُلا لایا۔ لاش کے متعلق تفتیش کرنے کی غرض سے گاڑی تھوڑی دیر کے لئے اور رُک گئی۔ سپاہیوں کو آوازیں دی جا رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے دو سپاہی موقع پر نمودار ہوئے۔ سپاہی بھنگیوں کو آوازیں دینے لگے۔ لیکن وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے

سِکھ سپاہی پرتی توش کے کان کے پاس مُنہ لے جا کر بولا: "یہ سب دو پھول والے ہیں۔"

پرتی توش نے سِکھ سپاہی کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے سانیال سے کہا: "آؤ ہم لاش کو کندھا دیں۔"

"ہم لاس کو کندھا دیں؟" سانیال نے ناک سکوڑتے ہوئے کہا: "یہ کام تو قلی بہت آسانی سے کر سکتے ہیں۔"

"قلی؟" توس نے چڑ کر کہا۔ "لیکن پیسے کون دیگا؟"

بھاری بھر کم پنشن یافتہ نے کہا: "یہ لوگ مرتے وقت اتنا پیسہ بھی تو نہیں چھوڑ جاتے کہ قلی کے دام چُکائے جا سکیں۔"

لاش جیسے ہنس رہی تھی اور اُسکے خاموش قہقہے اس فضا میں عجب پھبتیاں کس رہے تھے۔ جیسے وہ مکروہ مریض کہہ رہا ہو — میں چاہوں تو خود بھی اُٹھکر پلیٹ فارم پر لیٹ سکتا ہوں مجھ میں ابھی اتنی طاقت باقی ہے۔

سِکھ سپاہی کہہ اُٹھا "محاذ پر ہم نے سینکڑوں لاشیں اُٹھائی ہیں۔ یہ بھی اپنے بھائی کی لاش ہے اور یہ کچھ وزنی بھی تو نہ ہوگی۔"

پرتی توش اپنی جگہ سے اُٹھکر کھڑا ہو گیا اور اُنہوں نے لاش اُٹھا لی۔

وہ لاش کو پلیٹ فارم پر رکھکر اُس کے سرہانے اور پائنتی کھڑے رہ گئے۔ لوگ جمع ہو رہے تھے۔ طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ تھانیدار، اسٹیشن ماسٹر اور گارڈ لوگوں کو لاش سے پرے رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ سپاہی بھنگیوں کو لے کر ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔

پرتی توش اور سِکھ سپاہی کی طرف لوگ یوں گھور رہے تھے جیسے وہی دراصل اِس اِنسان کی موت کے لئے جواب دہ ہوں۔ طرح طرح کی آوازوں کو چیرتی ہوئی گارڈ کی وِسل ایک احتجاجی چیخ کی طرح گونج رہی تھی۔ اُس وقت بجلی کے کوندنے کی طرح گھر والوں کے چہرے سِکھ سپاہی کی آنکھوں میں پھر گئے اور وہ لپک کر گاڑی میں جا بیٹھا۔

پرتی توش لاش کے سرہانے کھڑا تھا۔ بھیانک سناٹے دبے کی لو کو نگل چکے تھے۔ موت نے لوری گا دی تھی۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ یہ دیا تو دوبارہ روشن کیا جا سکتا ہے اور موت کی لوری کو جھٹلانا بھی کٹھن نہیں۔

سانیال نے کھڑکی سے مُنہ نکالا اور چلا کر کہا: "یہ تو محض ایک لاش ہے پرتی توش۔ ہمارا دیش تو ایسی لاکھوں لاشوں سے پٹا پڑا ہے —"

توس جو اُس وقت گاڑی سے اُترنے کے انداز میں کھڑا تھا، اپنے ہاتھ میں "کال گیت" کا مسودہ سنبھالتے ہوئے رعونت سے لبریز لہجے میں بولا: "تمہارے گیتوں سے ان لاشوں کا مداوا ہو جائے گا، پرتی توش۔ تم آ کیوں نہیں جاتے؟"

گارڈ نے آخری وِسل دی اور گاڑی چل پڑی۔

ساآنیال اور لوتس بدستور بڑی توش کو پکار رہے تھے۔ یکبارگی بڑی توش کے قدم گاڑی کی جانب اٹھے، جیسے وہ بھاگ کر ساآنیال کے ہاتھوں سے "کال گرل" کا مسودہ چھین لینا چاہتا ہو۔ لیکن دو قدم چل کر ہی وہ رک گیا۔ اُسے خیال آیا کہ اُس کا شاہکار ریلٹ فارم پر اُس کے

قدموں میں بے حس و حرکت پڑا ہے۔ اور اُسے اِس بے حس گیت کے خنک سکر کو ایسا گرم خون دے کر گرمانا ہے۔ اور اگلے ہی پل وہ ایک مائل پرواز سارس کی طرح بازو پھیلائے ہوئے اُس لاش پر جھک گیا۔

Look Out!

چالیس سال کے بعد آپ کو

نیا خون

دیکھا ہے اس عمر میں اگر اپنی صحت کے متعلق آپ نے ذرا بھی غفلت کی، تو جلد ہی آپ کی کمر جھک جائے گی، بڑھاپا آپ کی زندگی کو تلخ بنا دے گا، تن درست ہوں یا مریض۔ دونوں حالتوں میں آپ کو ہمدرد کے ماءُاللحم کی ضرورت ہے، کیونکہ

It's a Blood Bank in a Bottle

MAULLAHAM

ہمدرد کا

ماءُاللحم

دوا نہیں ہے، بلکہ تازہ خون کا خزانہ ہے۔ یہ حلق سے اترتے ہی خون بن جاتا ہے: اسے تازہ پھلوں اور مقوی میووں اور صحت بخش غذاؤں اور خاص قیمتی دواؤں کے جوہر سے دواسازی کی جدید ترین مشینوں سے جدید اصول پر تیار کیا جاتا ہے۔ دل، دماغ اور اعضاء رئیسہ میں نئی زندگی پیدا کرتا ہے۔ معالج استعمال کراتے ہیں: یہ جنرل ٹانک ہے۔ ہر عمر کے لوگ استعمال کر سکتے ہیں، قیمت فی بوتل پانچ روپے۔

Hamdard

اپنے کیمسٹ یا ہمدرد دواخانہ دہلی سے طلب کیجئے



ریزۂ مینا

اُردو کے بہترین پچاس افسانوں کا مجموعہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۵ء تک ساقی میں سینکڑوں افسانے شائع ہوئے انہی منتخب افسانوں میں سے شاہد احمد دہلوی نے پچاس افسانے انتخاب کئے ہیں۔ مشہور نقادوں کی رائے ہے کہ جدید اُردو افسانے کا ایسا کوئی اور مجموعہ شائع نہیں ہوا جو ہمارے افسانے کی تدریجی ترقی کا آئینہ دار ہو۔ ریزۂ مینا افسانوی ادب اُردو کے برج دعا میں ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔

پچھلے سال نایاب تھی۔ اب پھر بڑے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ ضخامت ۵۵۰ صفحے بہترین لکھائی چھپائی۔ مجلد اور خوشنما پوستر سے آراستہ۔

قیمت پانچ روپے (ﷲ)

علاوہ محصول ڈاک

اپنے شہر کے مشہور کتب فروشوں یا ساقی بکڈپو، دہلی سے طلب فرمائیے۔

حسرت موہانی کی تلمیحات

محمد نعیم الرحمٰن

حضرت حسرت موہانی نہ صرف شعر و سخن کی دُنیا میں بلکہ سیاست کے میدان میں بھی، ایسی وسیع اور زبردست شہرت اور ناموری کے مالک ہیں، کہ انہیں کسی تعارف اور تقریب کی حاجت نہیں ہے غالبًا اتنا تعارف پھر بھی ضروری ہے کہ اُن کا نام فضل الحسن ہے اور یہ کہ کبھی کسی قدیم زمانے میں انہوں نے بی۔ اے کی ڈگری بھی کہیں سے لی تھی۔ اور معاف کیجئے گا، میں پورا نام بتانا بھول رہا تھا، یعنی "سیّد" بھی ہیں، سبحان اللہ! یہ سب اس لئے عرض کیا ہے کہ ایسے حقیقی باکمال شاعروں کے تخلص اس قدر مشہور و معروف ہو جاتے ہیں کہ اکثر خود محبّوں کو بھی ان کا نام یاد نہیں رہا کرتا، بلکہ ان کے نام کے معلوم کرنے کی پروا بھی نہیں ہوا کرتی۔ ان بزرگوں کے نام "نامی" نہیں ہوتے کیونکہ انکے تخلص بہت "سامی" ہوتے ہیں۔

اس وقت ہمیں اُن کی سیاست نوازی سے غرض نہیں ہے، بلکہ سخن آرائی پر توجہ ہے، اور وہ بھی خاص اس نگاہ سے کہ ان کے کلامِ معجز نظام میں ـــــ اس معجز نظامی پر بزرگانِ ادب و آداب شاہد عدل ہیں۔ تلمیحات کیا اور کیسی ہیں۔ اس موضوع پر مختصرًا ہی کچھ عرض کرنے کا ارادہ ہے۔ تاکہ نہ آپ کو میری تقریر سے ملال ہو، نہ آں جناب سلمہٗ اللہ تعالیٰ کے ارشادات کی طرف سے (نعوذ باللہ) کلال ہو۔ میں نے "سلمہ اللہ تعالیٰ" اس لئے کہا کہ آں قبلہ ابھی باکرامت سلامت ہیں، اور دُعا ہے کہ ابھی تا دیر سلامت رہیں۔ یعنی ان کے کلام شریف کا یہ ۳۰۸ صفحے کا مجموعہ جو حیدرآباد کے انتظامی پریس نے سنہ ۱۹۴۳ء میں شائع کیا ہے (اور وہی اس وقت میرے سامنے ہے) آں جناب کے پورے کلام پر (خدانخواستہ) حاوی نہیں ہے، اور انشاء اللہ ہم تا دیر تازہ الہامات سے فیض یاب رہیں گے۔ آمین۔

اس پر شاید یہ کہا جائے کہ چونکہ ابھی حسرت کا کلام بہت سا ایسا باقی ہے جو آہستہ آہستہ غیب سے شہود میں آتے گا، اس لئے ان کے کلام کی تلمیحات پر گفتگو ابھی قبل از وقت ہے۔ یہ خیال بالکل بے جا نہیں ہے، مگر جو کچھ کہ از بہار رشش پیداست ہے، وہ یہ ہے کہ (خوش بختانہ!) جناب حسرت تلمیحات کے بہت شوقین نہیں ہیں، کہیں کہیں لاتے ہیں اور وہ بھی بے ادبی معاف، کسی خاص براکت یا جدت کے ساتھ نہیں لاتے۔ لہذا نہ تو یہ اندیشہ ہے کہ آن کے کلام پر، مثلاً امتحانوں کے پرچوں میں، یہ سوالات ہوں گے کہ اس میں کیا کیا تلمیحات ہیں، اور نہ یہ زیادہ شبہ ہوتا ہے کہ آئندہ کے ارشادات میں علم بدیع کی یہ وضع شریف اپنے دل دادگان کو دماغوں کے ابتذال کو زیادہ نمایاں کرے گی! مگر کلام حسرت میں تلمیحات کی اس کمی سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہئے کہ "خاک بدہن معترض" اس خاص لحاظ سے اس کلام میں وقعت زیادہ نہیں ہے۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ تلمیح کی تعریف میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں کسی ایسی بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے "جس کے معلوم ہوئے بغیر کلام کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔" اگر ایسا ہے، تو پھر تلمیح کا لانا ہی چہ ضرور؟ اس سے تو پڑھنے والا اور بھی پریشان ہوگا، اور جب تک کسی فاضل مولوی صاحب سے نہ دریافت کیا جائے شعر اس کی سمجھ ہی میں نہ آئے گا۔ ظاہر ہے کہ جو شاعر تلمیح سے کام لئے بغیر اپنے مافی الضمیر، اپنے احساس، اپنے جذبے کو اس خوبی سے بیان کردے کہ پڑھنے والا آسانی سے، اور پوری طرح اسے سمجھ لے، تو یہ اس شاعر کا کمال ہوگا۔ حسرت کو یہی کمال حاصل ہے! ان کا طرز کلام شاذ ہی تلمیح جیسی چیز کا محتاج ہوتا ہے، وہ "از دل خیزد بر دل ریزد" کی شان سے شاندار ہے، اور اس میں ذرہ بھر شبہ نہیں کہ اس لحاظ سے حسرت نہ صرف اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہیں بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اپنے متقدموں میں بھی ایک نمایاں حیثیت، بلکہ ان پر فوقیت رکھتے ہیں۔ میرے اس خیال سے شاید اہل رائے اور "اہل علم" بزرگ اتفاق نہ فرمائیں گے، مگر ایسے اس اختلاف رائے سے ہمیں خائف بھی نہ ہونا چاہئے!

تلمیح کا ذکر ہو۔ ہاں تو، آخر تلمیح ہے کیا؟ ایک فارسی لغت نگار بزرگ[1] نے بتایا ہے کہ تلمیح یہ ہے کہ کلام میں کسی قصے کی طرف اشارہ کیا جائے، یا نجوم اور موسیقی وغیرہ کی اصطلاحیں لائی جائیں، یا قرآن مجید یا احادیث (کے فقرے، جملے، الفاظ) لائے جائیں۔ ایک مشہور و معروف عربی عالمِ بدیع کہتا ہے ——— اور وہی حق دار ہے کہ اس کی تعریف بتائی کیونکہ وہ اسی علم کا ماہر ہے ——— کہتا ہے کہ تلمیح یہ ہے کہ کلام کے مضمون میں کسی قصے یا شعر یا مثل کی طرف بغیر اس کے بیان کئے ہوئے اشارہ کیا جائے۔ ایک فارسی بدیعی[2] فرماتے ہیں کہ تلمیح "اس طرح پر ہے کہ کلام مشعر ہو کسی واقعہ مشہور پر یا ایسی چیز پر اشارہ کیا جاوے کہ کتب مستعملہ میں مذکور ہو" اور اس کو انھوں نے مصرعہ "ما را زلبِ یار ولے وز اس لئے لوٹے ہے خاک بر غنچہ" (مرضِ استسقا کا علاج) کی مثالوں سے واضح کیا ہے کس قدر جامع ارشاد ہے کہ "ایسی چیز جو کتب مستعملہ میں مذکور ہو"۔ ایک اردو اہلِ بدیع[4] کی رائے میں "تلمیح اثنائے کلام میں کسی مشہور قصے یا مسئلے کی طرف اشارہ کرنا" ہے۔ ایک اور بزرگ[5] نے ان دونوں کو بڑی خوبی سے جمع کیا ہے کہ "تلمیح یہ ہے کہ کلام میں اشارہ کسی قصۂ مشہورہ کی طرف کیا جاوے یا ایسے مسئلے کا ذکر کریں جو کتب مستعملہ میں مذکور ہو"۔

بظاہر پیغمبر گویائی کی اُمت کا یہ اختلاف رحمت نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اگر ان سب آرائے عالیہ کو یکجا جمع کر کے تلمیح کا مفہوم سمجھا جائے تو یہ زحمت ختم ہو جاتی ہے۔ تاہم مولانا غیاث الدین کا اصطلاحاتِ علمیہ کو، اور (تقریباً اسی طرح) قبلہ صہبائی کا علاجِ استسقاء کے اشارے کو تلمیح میں شامل کر دینا کچھ زبردستی سی معلوم ہوتی ہے، اور اسے تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا لیکن ان قبلہ گاہوں پر ایمان بالقلب نہ رکھیے تو خوف ہے کہ ان کے پجاری آپ کو ادبی زندیق اور بدعتی اور غیر مقلد بنا کر "علمائے کرام" کو تکفیر و تفسیق کے بانے تیار کر لینے کا حکم دے دیں گے! حتراً مسطور رہی، مگر طوعاً نا منظور ہی ہے۔ طول کے خوف کے باوجود تلمیح کے اوضاع کی ذرا سی تفصیل کرنے کو جی چاہتا ہے تلمیح میں اشارہ ہوتا ہے ذیل کے امور کی طرف:

(۱) مشہور اشخاص و افراد انسانی اور ان کے کام۔

(۲) مشہور نباتات و حیوانات اور ان کا انسان یا انسانی واقعات سے تعلق۔

(۳) خشکی اور تری کے مشہور مکان و مقام، جو کسی واقعے سے متعلق اور اس خاص قوم میں کسی سبب سے اہم ہوں۔

(۴) واقعات، دیو مالا، خرافات، روایات، تاریخ، انساب۔

(۵) مشہور مُرسِلوں یعنی شاعروں، اور کاتبوں[6] کے اقوال۔ اسی میں "آسمانی" کتابوں کی آیتیں اور ان کے جملے، ترکیبیں اور الفاظ بھی شامل ہیں۔

(۶) تمثیلیں اور مثلوں میں جو اشخاص مذکور ہوں ان کے نام۔ اور آخر میں آپ کا جی چاہے تو (۷) اصطلاحات علمیہ کو بھی شامل کر لیجئے۔

انسانوں کے تلمیح میں شامل ہونے کا حال یہ ہے کہ ایک طرف تو اس فہرست میں وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے انسان کی تاریخ عالم میں کارہائے نمایاں کئے ہیں اور ایک وقت میں واقعی گوشت و پوست کے بنے ہوئے، جیتے جاگتے، کھاتے پیتے اور بازار میں چلتے پھرتے ہوئے انسان تھے، اور دوسری طرف وہ انسان بھی اس زمرے میں ہیں جو خود ان مشہور بزرگوں کی کتابوں میں خود ان ہی کے پیدا کئے ہوئے اور بالکل فرضی انسان تھے، جیسے سرشار کے میاں خوجی اور بوا زعفران، طلسم ہوش ربا کے لندھور اور گنجا ب بن گنجور، سرو آزاد کا دونی کبوتر وغیرہ۔ یہی حال فرضی مقامات کے ناموں کا بھی سمجھئے اور یہ سب کارگزاری اور تخلیق انہیں بزرگوں کی ہوتی ہے جن کی شان خود اس قدر بلند ہے کہ وہ خود بھی تلمیح کے مضمون بن گئے ہیں۔ اور کیوں نہ ہو؟

[1] صاحب غیاث اللغات۔ [2] تفتازانی: مختصر المعانی [3] صہبائی حدائق البلاغۃ [4] سجاد میرزا بیگ: تسہیل البلاغۃ [5] ذوالفقار علی: تذکرۃ البلاغۃ۔

[6] شعر کہنے یا لکھنے والے کو جیسے شاعر کہتے ہیں، ویسے ہی اصطلاح میں نثر لکھنے والے کو کاتب کہتے ہیں۔

آج یہ بھی حالی ہیں۔ اسی طرح اِن قابل تلمیح افراد اور مقامات وغیرہ کی زندگی بھی اسی قدر طویل ہوتی ہے جس قدر بلند، وسیع اور دیرپا قدر و قیمت اُس کے خالق (مصنف، شاعر، کاتب وغیرہ) کی ہوتی ہے۔ خالق جتنا بڑا ہوگا، وہ اپنے مخلوق کو بھی اتنا ہی بڑا کر دے گا۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین! اس کی ایک بدیہی سی مثال یہ ہے کہ ہماری دُنیا میں مسلمان مصنفوں کی کتابوں کی قرآنی تلمیحات کا شمار یا احاطہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اور جس طرح قرآن کو زوال نہیں ہے، اسی طرح اس کے الفاظ، تراکیب، جملات، آیات اور مضامین کی طرف تلمیحات بھی زوال سے مستغنی ہیں!

حسرت کے کلام میں، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، تلمیحات زیادہ نہیں ہیں: حتیٰ کہ انھوں نے انسان کے افراد و اشخاص کو بھی زیادہ نہیں نوازا ہے، اور ان کی فہرست میں ماضی بعید سے زمانۂ حال تک کے زمان کو جو نسبت ہے اسی طرح ان افراد کی تعداد میں بھی نسبت ہے، یعنی ماضی بعید کے افراد کم ترین اور زمانۂ حال کے (ہم عصر) زیادہ ترین مذکور ہیں۔ چنانچہ فہرست ملاحظہ ہو:

اَ۔ (۱) حضرت موسیٰ عم۔ (۲) حضرت خضر سلمہٗ اللہ تعالیٰ (۳) حضرت الیاس طال عمرہ۔ (۴) حضرت یوسف عم (۵) جناب کرشن عم، جن کو نبواری، گردھاری، نندلال، مراری رادھے شیام کے لقبوں سے بھی یاد فرمایا ہے اُن کی آفت جان بانسری کا بھی ذکر فرمایا ہے، اور گوکل، برساز اور نندگام (گاؤں) کو بھی نہیں بھولے ہیں جہاں، من جملہ اور مقامات کے، سرکار کرشن کے چرنوں سے جوت پھیلا کرتی تھی۔ (۶) حضرت عیسیٰ عم۔ (۷) حضرت خاتم الانبیا رحمۃ للعالمین محمد صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ، جن کو داعی، شاہد، سراج منیر، رحمۃ اللعالمین، شفیع المذنبین، خیر المرسلین، حبیب کبریا، شافع روز شمار، بدرالدجیٰ، شمس الضحیٰ کے القاب کریمہ سے یاد کیا ہے۔ (۸) دمن (۹) فرہاد و شیریں۔

ب۔ (۱) مجنوں (قیس)، و لیلیٰ۔ (۲) خاندان رسالت: حضرت علی کرم اللہ وجہہ (جن کا شیر خدا، شاہِ مرداں، باب علم کے معروف القاب سے بھی ذکر کیا ہے) حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ (جن کو شبیر، نورِ چشم فاطمہ، مہر درخشانِ علی، شہید معرکہ کربلا، حسین ابن علی، شاہ نجف، شہ کرب و بلا، نوجوانانِ خلد کے سردار نورِ چشمِ علی، جانِ بتول بھی لکھا ہے) حضرت موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ (۳) جناب شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ (جن کو غوث اعظم شاہ جیلان بھی کہا ہے) (۴) خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ (جنھیں خواجۂ اجمیر اور کبیر الاولیاء کے القاب گرامی سے بھی یاد کیا ہے) (۵) ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ (۶) منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ (۷) حضرت سلمان رضی اللہ عنہ (۸) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ۔

ج۔ جامی، رومی، شمس تبریز، عراقی، فغانی، نظیری، حافظ، سعدی۔

د۔ غالب، میر تقی میر، نسیم دہلوی، مومن، قائم،

ہ۔ شاد، مصحفی، شوق، وفا، ضامن، محشر، وحشت، نظر، انوار، شمیم، برق، بسمل، عزیز، رزاق (رزاق بیا، شہ رزاں) دہاب، والی، عبدالصمد (شہ عبدالصمد) رسوا، اقبال، تلک، ابوالکلام، لینن، گاندھی، مسز گولڈبلی۔

یہ ہیں تمام "اشخاص" حسرت کے۔ ان میں سے ضمیمہ (ہ) کے افراد حسرت کے ہم عصر حضرات ہیں۔ اور ان میں سے بھی بعض ایسے بزرگ ہیں، جن سے اکثر پڑھنے والے واقف نہیں ہیں۔ ایسے حضرات کے بارے میں یا تو کلیات حسرت میں حواشی میں، اگر مفصل نہیں تو مختصر طور پر ہی، کچھ حالات لکھ دینا چاہیئے، یا ان کے حالات پر مختصر مضامین شائع ہونا چاہیے۔ یہ ایک ایسا امر ہے جس میں ارباب زبان اُردو سخت، بلکہ مجرمانہ سہل انگاری سے کام لے رہے ہیں؟ اور وہ وقت دُور نہیں ہے کہ جب (مثلاً ہمارے فوراً بعد آنے والی نسل تک) ہمارے نہایت ممدوح اور مقتدر بزرگوں کے ممدوح و موصوف اشخاص ہماری اس سہل انگاری کے سبب سے بالکل گم نام ہو جائیں گے اور سب کو جانے دیجئے، اُردو کے مشہور شعراء (مثلاً ولی، میر، سودا، جرأت، سوز، ذوق، غالب، اکبر، اقبال) کے کلام میں جن "اشخاص" کا ذکر ہے ــــ اور اکثر جگہ مفید اور بامعنی طور پر بھی ہے ــــ اور جو اُن کے ہم عصر تھے، اُن میں سے کتنے ایسے ہیں جن کے حالات سے (وہ مختصر اور محض متعلق بہ بیان ہی سہی) ہم آج واقف ہیں؟ اس باب میں میں خصوصیت کے ساتھ اکبر الہ آبادی کے "اشخاص" کی

طرف آپ کو توجہ دلاتا ہوں۔ کلیات اکبر کے "اشخاص" کی اہمیت اس سبب سے اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ اکبر کا کلام بہ یک وقت اپنے زمانے کی معاشرت، معاش، سیاست اور تاریخ کا آئینہ دار ہے۔ جب تک کہ ہم ان "اشخاص" کے حالات اور کوائف سے واقف نہ ہوں گے، نہ اکبر کا قول ہماری سمجھ میں آسکتا ہے اور نہ ہم اُس کلام سے وہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جو اُس شاعرِ عظیم کا دلی مقصد تھا[۱]۔ ضرورت ہے کہ اہلِ اُردو اس امر کی طرف جلد سے جلد توجہ کریں!

معاذ اللہ، میں کسی اور طرف بہکا جا رہا ہوں۔ ان تمام بزرگ "اشخاص" کے بارے میں مجھے صرف یہ عرض کرنا تھا کہ یہ سب (الا ماشاء اللہ) مشہور و معروف اور معظم ہستیاں ہیں، جن کے حالات سے کلیات حسرت کے ناظرین عموماً واقف بھی ہیں، اور ان کے حالات آسانی سے "کتبِ مشہورہ" میں مل بھی جاتے ہیں لہٰذا میں ان جملہ حضرات کی طرف تلمیح کی تشریح نہ کروں گا۔ البتہ ان میں سے دو چار اسماء اور القاب ضرور توجہ کے مستحق ہیں، اور ان ہی پر کچھ گفتگو کی ضرورت ہے، وہو ہذا:

اس کو تیمناً حضور نبی کریم صلعم کے ذکرِ مبارک سے شروع کرنے کی غرض سے پہلے آں حضرت والا کے القاب پر گفتگو کرتا ہوں۔ مولانا حسرت نے حضورؐ والا کو جن القاب سے یاد کیا ہے اُن میں سے صرف چند ایسے ہیں جو براہ راست قرآن کریم سے ماخوذ ہیں، باقی سب افرادِ اُمت نے محبت کے جوش میں بنائے ہیں۔ ایسے القاب کی تعداد تقریباً بے انتہا ہے۔ محبت کے ولولے نے مسلمانوں کے دل و دماغ نے اَن گنت نعتیں نظم اور نثر میں پیدا کی ہیں، اور ہر ایک نے ایسے ایسے القاب پیدا کئے ہیں کہ اس محبت و عقیدت کے جوش اور اس کی ہمہ گیری اور ناپیدا کناری پر حیرت ہوتی ہے۔

حسرت کے القابِ نبوی میں سے قرآنی القاب یہ ہیں:۔

داعی (بلانے والا): یہ قرآن مجید کی دو آیتوں سے ماخوذ ہے: (۱) "اے نبی! اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے تجھے گواہ (شاہد) اور خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا، اور اللہ کی طرف اُسی کے حکم سے، بلانے والا (داعی) اور روشن کر دینے والا چراغ بنا کر بھیجا ہے۔" (احزاب ۴۵-۴۶) (۲) "اے ہمارے لوگو! اللہ کی طرف بلانے والے (داعی) کے بلاوے کو سُنو اور اس پر ایمان لاؤ۔ وہ تمہاری خطائیں تمہیں معاف کر دے گا، اور ایک دردناک عذاب سے تمہیں بچائے گا۔ اور جو کوئی اللہ کے (اس) بلانے والے کی بات نہ سُنے گا وہ زمین میں اللہ کے کام کو بگاڑ نہیں سکتا، اور نہ اسے اُس (اللہ) کے سوا اور کوئی بچانے والا ملے گا۔ یہی لوگ تو کھلی گُمراہی میں مبتلا ہیں!" (احقاف ۳۱-۳۲)

رحمت للعالمین (تمام جہانوں کے لئے رحمت): یہ ایک آیت میں ہے: "ہم نے تو تجھے تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔" (انبیاء ۱۰۷)

سراج منیر (روشن کر دینے والا چراغ): یہ لقب صرف ایک آیت میں نازل ہوا ہے (احزاب ۴۶)، جس کا ذکر اوپر داعی میں ابھی گذرا ہے۔

شاہد (گواہ): یہ صفت شریفہ تین آیتوں میں مذکور ہے: (۱) جس کا بیان داعی کے ماتحت اوپر گذرا۔ (۲) "بے شک ہم نے تجھے گواہ (شاہد) و خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے" (فتح ۸) (۳) "بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک پیغمبر بھیجا ہے، جو تمہارے بارے میں گواہ (شاہد) ہے، بالکل جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک پیغمبر بھیجا تھا۔"

اسی تعلق سے لفظ شاہد کی ایک اور صورت شہید پر بھی غور کر لینا چاہیئے، شہید کے معنی بھی گواہ کے ہیں۔ جن آیتوں میں یہ کلمہ حضور نبی کریم صلعم کے بارے میں نازل ہوا ہے، وہ یہ ہیں: (۱) "یوں ہم نے تمہیں بہترین (بیچوں بیچ کی) اُمت بنایا ہے، تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور یہ رسولؐ تم پر گواہ (شہید) رہے۔" (بقرۃ ۱۴۳) (۲) "تو کیوں کر ہوگا جب ہم ہر ایک اُمت میں سے ایک گواہ لائیں گے،

[۱] حضرت اکبر کے فرزندِ ارجمند مکرمی و محترمی جناب سید عشرت حسین صاحب مرحوم و مغفور سے راقم نے کئی بار عرض کیا کہ اس طرف توجہ فرمائیں، مگر یہ استدعا درجۂ قبولیت کو نہ پہنچی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اہم اور نازک کام خوبی، حسنِ اسلوب اور قابلِ اعتماد طور پر آں ممدوح ہی انجام دے سکتے تھے۔ انا للہ!

اور تجھےؐ اِن سب لوگوں پر گواہ بنائیں گے (نساء ۴۱) (۳) ایک دن ہم ہر ایک اُمت میں، انھیں میں سے اور انھیں پر، ایک گواہ اُٹھائیں گے، اور تجھےؐ ان سب پر گواہ بنا کر لائیں گے، اور ہم نے تجھؐ پر ایک کتاب اُتاری ہے، جس میں ہر ایک بات کو کھول کر سمجھا دیا گیا ہے، اور جو مسلموں کے لئے ہدایت اور رحمت اور خوش خبری ہے (نحل ۸۹) (۴) اور اللہ کے لئے جتنا کچھ کوشش کا حق ہے خوب کوشش کرو۔ اسی نے تم کو چُنا ہے، اور دین کے بارے میں تمہارے اوپر کوئی سختی نہیں رکھی۔ یہ تو تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے: اسی نے تمہارا نام "مُسلم" رکھا ہے ـــــ اس سے پہلے بھی، اور اب بھی! ـــــ تاکہ یہ رسولؐ تم پر گواہ رہے اور تم لوگوں پر گواہ رہو۔ ہاں، صلوٰۃ کو قائم رکھو، زکوٰۃ دو۔ اور اللہ کو تھامے رہو: وہی تو تمہارا آقا ہے! (حج ۷۸)

حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں بھی یہ لفظ شہید دو جگہ پر وارد ہوا ہے: (۱) اور اہل کتاب میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے اُس (یعنی عیسیٰ) پر اس کی وفات سے پہلے ایمان لانا نہ پڑے، اور قیامت کے وقت وہ ان پر گواہ ہوگا (نساء ۱۵۹) (۲) سورہ مائدہ میں ایک جگہ (آیت ۱۱۹) میں یہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ بن مریمؑ سے پوچھے گا کہ "کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کو چھوڑ کے مجھے اور میری ماں کو دو خدا بنا لو؟" اس کے جواب میں آں جناب فرمائیں گے کہ "میں ایسی ناحق بات کہنے والا کون ہوں؟ اور اگر میں نے کہا بھی ہوتا تو تو ضرور جان لیتا۔ میں نے تو اُن سے صرف وہی کچھ کہا تھا جو تو نے مجھے حکم دیا تھا، یعنی یہ کہ میرے اور اپنے پروردگار، اللہ، کو پوجا کرو۔ اور جب تک میں ان لوگوں میں زندہ رہا تو اُن پر گواہ تھا، مگر جب تو نے مجھے وفات دی تو تو اُنکا نگہبان تھا، اور تو تو ہر ایک چیز پر گواہ ہے" (۱۱۹ ـــ ۱۲۰)

اسی طرح ہر قوم (اُمت) میں ایک گواہ ہوتا ہے۔ سورہ قصص (آیت ۷۵) میں ارشادِ الٰہی ہے کہ "ہم ہر ایک اُمت میں سے ایک گواہ نکالیں گے اور کہیں گے کہ اپنے ثبوت پیش کرو۔" تب انہیں پتا چلے گا کہ پورا سچ اللہ ہی کا ہے، اور انہوں نے خود جو جھوٹے تراش رکھے ہیں وہ سب اُن کے ہاتھ سے جاتے رہیں گے!"

دو من خطاب اور قابل توجہ ہیں:

بابِ علم: علی آگاہ جس سے ہو کے بابِ علم کہلائے، وہ رازِ عشقِ علم کو بھی بتا دو یا رسول اللہ! (ص ۲۰۴[1]) یہ خطاب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ہے، اور اس حدیث نبویؐ سے ماخوذ ہے جس کے الفاظ ہیں: "میں علم کا شہر ہوں اور علی اس (شہر) کا دروازہ (باب) ہے"۔ یہ حدیث بہت مشہور ہے، مگر یہ یقینی امر نہیں ہے کہ یہ بالکل "صحیح حدیث" بھی ہے۔

شَبّیر

تھے حق یہ وہ بے شک کہ نہ ہوتے تو نہ ہوتا۔ دُنیا میں بپا ماتمِ شبیر ابھی تک (ص ۲۱)

یہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا ایک نام ہے اصل میں یہ عربی نہیں، بلکہ سریانی لفظ ہے، جہاں اس کا تلفظ پ (تین نقطوں والی) سے ہے۔ عربی میں پ کو ب کر لیا گیا، کیوں کہ اس میں پ نہیں ہوتی۔ اس لفظ کے معنی بالکل حُسین (چھوٹا سا خوبصورت لڑکا) کے بتائے جاتے ہیں۔ اسی نام کی نسبت سے سرکار ممدوح کے برادر بزرگوار حضرت امیر المومنین حَسَن رضی اللہ عنہ کا نام مبارک شَبَّر بھی رکھ لیا گیا ہے، اور شبّر کے معنی بھی حَسَن (خوبصورت آدمی) بتائے جاتے ہیں۔

شہِ کرب و بلا

ہو سنو دی فجار کے پیرو ہیں یزیدی۔ تقلید شہِ کرب و بلا میرے لئے ہے (ص ۱۴۴) یہ "درد اور آزمائش کا بادشاہ" بھی حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس لقب میں کرب و بلا کے الفاظ مقام کربلا کے حروف کے تجزیے سے شاعرانہ طور پر بنا لئے گئے ہیں، گو کربلا میں صرف ایک ہی ب ہے، مگر سرکارِ عالی کو جن مصائب سے اس میدان میں واسطہ

---

[1] یہ شعر اور اس کے آخر میں یہ عدد حسرت کے باتلمیح اشعار اور اُن کی کلیات کے صفحوں کے عدد ہیں!

بنا ان کے لحاظ سے ایک دو تہ کر کے ایک مسلسل سوانح مرتب ہو گیا ہے، جو ہر طرح قابل داد ہے۔ اس سلسلے کے متعلق آئندہ کسی خاتمہ پر ملاحظات کی کچھ عرض کروں گا۔

دو حضرات جن کو حق تعالیٰ نے حیات جاودان عطا فرمائی ہے گوشت و پوست میں تا امروز زندہ ہیں[1] اول کی حیات کے حالات نہ کبھی ختم ہوں گے۔ ضبط تحریر میں آ سکتے ہیں۔ تاہم ان جاویدان مطولوں کے ذکر سے اس مختصر کے لئے کچھ تبرک تو ضروری ہے۔

خضر

بارہا کھائی ہو جس نے لب جاناں کی قسم
خضر کھاتے ہیں نہ کیا چشمۂ حیواں کی قسم (ص ۲۰۱)

حضرت خضر (خَ ضِرْ) کا نام قرآن مجید میں تو کہیں مذکور نہیں ہے، البتہ احادیث شریفہ میں سے چند کو آں جناب کے ذکر شریف سے مزین ہونے کا شرف ضرور دیا گیا ہے۔ ان کی وجہ تسمیہ (سبز) بہت دلچسپ ہے، محققین فرماتے ہیں کہ آں جناب جس جگہ بیٹھتے تھے وہاں سبزہ اگ آتا تھا۔ حضرت مجاہدؒ سے روایت کی جاتی ہے کہ حضرت خضر جہاں نماز میں مشغول ہوتے تو سجدے کی جگہ اور حصہ کے اطراف میں سبزہ جم جاتا تھا۔ اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ نے ایک روایت حضرت خاتم النبیین صلعم تک پہنچائی ہے (!) کہ خضر کو خضر (سبز) اس لئے کہتے ہیں کہ آپ ایک سفید تختہ پر بیٹھے تو وہ بھر پور سے لہلہانے لگا[1]۔ آپ کا اسم مبارک بلیا ابن بلکان ہے۔ جناب بلکان حضرت نوح علیہ السلام کے پوتے کے پوتے تھے۔ بعض کے نزدیک آپ کا اسم شریف الیاس یا عامر یا خضرون یا ارمیا بھی ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ آپ ایرانی تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت الیاس کے بھتیجے تھے۔ بعض کی رائے ہے کہ بنو اسرائیل میں سے تھے، اور بعض کا ارشاد ہے کہ آپ اسکندر کے خالہ زاد بھائی تھے۔ مگر قبلہ و کعبہ

جناب ابو المحسن حسن کاکوروی صاحب[1] نے بجا فرمایا ہے کہ "یہ سب ضعیف ہے قابل اعتبار نہیں، لیکن جو بعض اہل حدیث نے حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں میں بیان کیا ہے اس کا عجب سبب ہے[2]۔ آپ کا زمانہ بہ روایت بعض بعد حضرت صالح علیہ السلام قبل از ابراہیم علیہ السلام تھا، اور بعض بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام بتاتے ہیں۔ الغرض تعین زمانہ میں اختلاف ہے۔ بیضاوی میں ہے کہ افریدون کے وقت میں تھے اور ذوالقرنین اکبر کے ساتھ سیر ربع مسکون میں موجود تھے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد تک ظاہر رہے۔ معالم التنزیل میں ہے کہ جب ذوالقرنین بہ طلب آب حیات روانہ ہوا تو خضر علیہ السلام آگے تھے کہ ان کو وہ چشمہ ملا۔ انھوں نے اس سے پانی پیا، اور غسل فرما کر دوگانہ شکر ادا کیا اور درازی عمر پائی، اور ذوالقرنین محروم واپس آیا ۔ ۔ ۔ یہ قول ضعیف ہے۔ اگر ہمراہی سکندر اکبر یا سکندر رومی پر مامور ہوئے ہوں تو عجب نہیں، لیکن آب حیات سے درازی عمر کا پانا معتمد نہیں ہے۔ کیوں کہ حضرت عیسیٰ و الیاس علیہم السلام کہاں ملازم آب حیات کرنے گئے تھے؟ ۔ ۔ ۔ بیمار بھی ہوتے ہیں اور معالجہ اپنا کرتے ہیں ۔ قبل بعثت آں حضرت صلعم پانسو برس کے بعد دندان مبارک ان کے از سر نو نکلے تھے، اور بعد بعثت ایک سو بیس برس کے بعد نکلنے لگے تھے، اور آں جناب نیک خلق و جوان مرد و مشفق تمام خلائق کے ہیں، اور جود و عطا میں بے نظیر۔ ایثار آپ کی عادت ہے۔ علم کیمیا سے بخوبی آگاہ۔ اور خود قرض لیتے دیتے ہیں، اور بازار میں دلالی بھی کرتے ہیں اور اجرت پر کام کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صحیح یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی، معمر و محجوب قیامت تک ہیں، بعد رفع قرآن شریف وفات پاویں گے۔ مگر اکثر محدثین، مثل بخاری و ابن مبارک و ابن جوزی حیات خضر علیہ السلام کا انکار کرتے ہیں[3]۔"

---

[1] ان دونوں کراماتی روایتوں میں بیان کے افعال کا صیغہ (ماضی) ضرور ذہن میں رکھئے گا، اور یہ بھی نہ بھول جائیے گا کہ جناب خضر علیہ السلام ہمیشہ زندہ رہیں گے، یعنی آج بھی زندہ ہیں!

[1] مصنف کتاب تفریح الاذکیاء فی احوال الانبیاء (۲ جلد)

[2] یہ فیصلہ بالکل درست ہے دعا قبول ہو یا رب! کہ عمر خضر دراز۔ آمین۔

[3] ایضاً، ص ۵۴۳، ۵۴۴، ج ۱

یہ ہے بہت مختصر سا حال آں جناب کا جو "کتب صحیحہ" میں ملتا ہے، اور اس پر (بحمد اللہ) مزید اور استزاد بھی ہے۔ قرآن کریم کی سورۂ کہف (آیات ۶۰-۸۲) میں حضرت موسیٰ عم کا ایک واقعہ تمثیلی طور پر بیان ہوا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آں حضرت نے اپنے ملازم سے فرمایا کہ میں دو دھاراؤں کے سنگم تک جانا چاہتا ہوں اور ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ چلتے چلتے جب وہاں پہنچ گئے اور ناشتہ شکنی کے لئے اس سے کھانے کو مچھلی مانگی تو معلوم ہوا کہ وہ تو پہلے ہی کہیں ایک چٹان پر سے جہاں دم لینے کے لئے بیٹھے تھے، کود کے پانی میں جا گری تھی۔ حضرت موسیٰ عم سے صبر نہ ہوا، اور وہ اسے ڈھونڈھنے کے لئے واپس چلے۔ راستے میں ایک بھلے مانس ان کو مل گئے اور ان کے ساتھ ہو لئے اور درخواست کی کہ مجھے بھی کچھ بتائیے۔ اُن قبلہ نے کہا کہ آپ میرا ساتھ کہاں تک دیں گے؟ آپ سے میری حرکتوں پر صبر نہ ہوگا، اور بے سمجھے آپ مجھ سے سوال کریں گے۔ انھوں نے صبر کا وعدہ کیا، تو انھوں نے ساتھ لے لیا۔ راستے میں اُن جناب نے تین بار کچھ ایسے ایسے کام کئے جن پر حضرت موسیٰ عم نے اعتراض اور سوال کیا۔ یہ شرط جو ٹوٹی، تو وہ حضرت بگڑ گئے، اپنا طرزِ عمل حضرت موسیٰ کو سمجھایا، اور انہیں چھوڑ کے اپنے راستے پر لمبے ہوئے اللہ اللہ خیر صلّا ح!

اِن بزرگوار کو حضرات کرام نے تجویز فرمایا ہے کہ یہی خضر علیہ السلام تھے، اور یہی وہ بزرگ تھے ——— اور ہیں ——— جو سکندر کے ساتھ ایک تنگ و تاریک مقام پر ایک چشمے سے آبِ حیات لے کے پی گئے تھے، جس کی برکت سے ابدی زندگی پا گئے، مگر وہ بیچارہ کم نصیب ہی رہ گیا! اسی لئے تو ان کے سپرد اللہ تعالےٰ نے یہ خدمت کر دی ہے کہ پانی میں بھولے بھٹکوں کو راستہ بتایا کریں۔ گم کردہ راہ کو راہ پر لانے سے بہتر کون سی خدمت ہو سکتی ہے؟

الیاس

بحرِ عرب میں بہ سکونِ تمام
مرکبِ الیاس ہوا خوش خرام (نظم آلبح، ص ۲۰۴)

قرآن مجید میں حضرت الیاس عم کو رسول (مرسل) بتایا ہے۔ سورہ صافات (آیات ۱۲۳-۱۳۲) میں کچھ تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔ "اور بے شک الیاس بھی رسولوں میں سے تھا۔ (یاد ہے) جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ "تو کیا تم (اللہ سے) نہیں ڈرتے؟ کیا تم سب سے اچھے پیدا کرنے والے کو چھوڑ کر بعل کو پکارو گے؟ اللہ کو چھوڑ کر، جو تمہارا بھی پروردگار ہے اور تمہارے اگلے باپ دادا کا بھی؟" مگر انھوں نے اسے جھٹلا دیا، اور وہ لوگ ضرور پکڑ کر حاضر کئے جائیں گے، سوا اُن کے جو اللہ کے خالص کام کرنے والے بندے ہیں۔ اور ہم نے (یہ نعمت) اس سے اور بعد کے آنے والوں تک باقی رکھی۔ الیاس پر سلام ہو! ہم اچھا کام کرنے والوں کو اسی طرح انعام دیا کرتے ہیں، کیوں کہ وہ ہمارے ایمان دار بندوں میں سے تھا۔" پھر سورہ انعام (آیت ۸۵) میں اور پیغمبروں کے ساتھ ساتھ اِن کا بھی نام لیا ہے: "اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس ان میں سے ہر ایک اچھے اور سچے لوگوں میں سے تھا۔" ان مقامات کے علاوہ اور کہیں ذکر نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ ان آیتوں میں کہیں سے یہ بات نہیں پیدا ہوتی کہ حضرت الیاس عم ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور خشکی میں انسانوں کی راہ نمائی کا فرض انجام دیا کریں گے۔ مگر "اہلِ تحقیق" کے ارشادات ہیں:

حضرت الیاس عم (جیسا کہ اوپر خضر کے بیان میں ہم کہہ آئے ہیں) حضرت خضر کے چچا تھے۔ یہ بھی خیال ہے کہ حضرت الیسع عم کے چچیرے بھائی تھے، اور حضرت یوشع بن نون کے نواسے تھے (اور نواسوں کا درجہ ہمیں معلوم ہی ہے کہ کتنا زبردست ہوتا ہی!) اور حضرت ہارون عم کی اولاد میں سے تھے۔ ان کا نام الیاس اور الیاسین دونوں طرح بیان کیا جاتا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں (صافات ۱۳۰) بھی الیاسین مذکور ہے۔ یہ بھی خیال ہے کہ صحیح نام الیاس ہے اور ان کے والد ماجد کا نام یاسین تھا، گویا باپ اور بیٹے دونوں کے ناموں کی ترکیب سے الیاسین ہو گیا۔ آپ شہر بعلبک کے لئے مبعوث ہوتے تھے، جہاں بعل دیوتا کی پوجا ہوتی تھی۔ اُس وقت وہاں اخی اب بادشاہ تھا، جس نے بعل کا ایک زبردست بُت بنایا تھا، اور بقولِ مصنفِ تورات (۱-سلاطین باب ۱۶ آیت ۳۰ بعدہ) اُس نے "خداوند کے حضور زیادہ بدکاریاں کیں" ——— اور بادشاہ اتبعل کی بیٹی ایزبل سے بیاہ کیا اور جا کے بعل کو پوجا اور اس کے آگے سجدہ کیا۔ اور

بعل کے لئے ایک مذبح تیار کیا اور اخی اب نے خداوند اسرائیل کے خدا کو ان سب اسرائیلی بادشاہوں سے جو اس سے آگے تھے غصہ دلانے میں زیادہ کام کیا" اخی آب نے اُن پر بڑے بڑے ظلم توڑے، اور آخر وہ تنگ آ کر پہاڑوں میں جا چھپے بادشاہ نے ہر چند بلایا، مگر آں حضرت اس کے مکر و فریب کے دغدغے سے بے فکر نہ تھے اس لئے اس کے سامنے تشریف نہیں لائے اپنی گردش میں ایک روز آپ ایک بڑھیا کے گھر پہنچے جس کا لڑکا سخت بیمار تھا۔ آپ کی دُعا سے اُسے صحت ہو گئی، اور وہ لڑکا آپ کا ایسا گرویدہ ہوا کہ آپ کے ہمراہ ہو لیا اور برابر ساتھ ہی رہتا تھا۔ یہ لڑکا بعد میں آپ کا خلیفہ اور پیغمبر ہوا — یہی حضرت الیسع علم تھے! یہ دونوں حضرات ایک شدید قحط کے دوران میں، جس نے تین برس سے ملک کو تباہ کر رکھا تھا، بادشاہ اخی اب کے دربار میں پہنچے حضرت الیاس نے اس مردود سے کہا کہ "اگر تیرا خدا اب تجھے اور تیری رعایا کو بھوک سے نجات دے سکتا ہے تو خیر ورنہ میں اب پھر تجھے بنو اسرائیل کے خداوند کی طرف بلاتا ہوں، اس پر ایمان لا، اور میں اس سے دعا کروں گا کہ وہ تجھے اس قحط کے عذاب سے نجات دے" اخی اب نے یہ تجویز منظور کی اور بعل کے بُت کو توڑ کر شہر کے باہر پھینکوا دیا خداوند نے حضرت الیاس کی دُعا قبول کی اور بارش بھیجی جس سے ملک سیراب اور شاداب ہو گیا۔ مگر حضرت الیاس زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ ایلیاہ[1] ہر وقت چلتے پھرتے رہتے ہیں، ہمہ وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتے ہیں، اور نہایت سخی مزاج ہیں۔ وہ ہر جگہ امن اور سلامتی کا پیغام لے جاتے ہیں، کم ہمتوں کو ہمت دلاتے ہیں، جاہلوں کو علم سکھاتے ہیں، حاجت مندوں کی حاجت روائی کرتے ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک دن آئے گا جب وہ بنو اسرائیل کی نجات کا ذریعہ ہوں گے اُن کو موت نہیں آئے گی، وہ ہمہ جا حاضر ہیں!!

یہ خیال شاید زیادہ بے جا نہیں ہے کہ مسلمانوں کے عوام نے یہودیوں کے اس جہان گشت پیغمبر کو خضر قرار دے دیا ہے، ایک کو دو شخص میں تقسیم کر دیا ہے۔ مگر اس ضمن میں غالباً سب سے زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ مسلمان ان اسرائیلی روایات اور داستانوں کو بلا تأمل اس مخبر صادقؐ رحمتہ للعالمینؐ سے منسوب کر دیتے ہیں "جس نے کبھی اپنی من مانی بات منہ سے نہیں نکالی!" (قرآن مجید، سورہ النجم، ۳) وائے گر در پس امروز بود فردائی!!

تلمیح کے اس شعبہ رجال کو ختم کرتے ہوئے پوری جماعت پر بھی ایک نظر ڈال لینا چاہئے، جسے حسرت نے قرآن عظیم کی زبان میں "حزب اولیاء" کہا ہے۔

حزبِ اولیاء

مائلِ حزبِ اولیاء نہ ہوا
وہ جو بے خوفِ ماسوا نہ ہوا (ص، ۵۶)

حق یہ ہے کہ حسرت کا یہ پورا مطلع قرآنی آیات کی طرف تلمیح ہے۔ جیسا کہ ابھی معلوم ہوگا، ہمارے باکمال شاعر نے قرآن کریم کی دو اصطلاحوں کو اپنے مرکب "حزبِ اولیاء" میں بڑی خوبی سے جمع کر دیا ہے: حزب اللہ اور اولیاء اللہ کلام اللہ میں حزب اللہ کی تعریف اور اس کا بیان یوں ہے۔ حضرت رسول کریم صلعم سے خطاب ہوتا ہے کہ "جو لوگ اللہ اور آخری وقت پر ایمان رکھتے ہیں، تو انہیں نہ دیکھے گا کہ وہ ایسوں سے دوستی رکھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے برخلاف ہیں، گو وہ ان کے باپ بیٹے یا بھائی یا کنبے کے ہی کیوں نہ ہوں۔ ان لوگوں کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو مضبوطی سے جما دیا ہے اور اُن کو اپنے فیض سے قوت دی ہے، اور وہ (اللہ) ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں چلتی ہوں گی اور جن میں وہ رہیں گے۔ اللہ ان سے خوش ہوگا اور وہ اللہ سے خوش ہوں گے۔ یہی لوگ ہیں اللہ کا گروہ (حزب اللہ)! اور خوب سمجھ لو کہ اللہ ہی کا گروہ زندگی میں کامیابی پانے والا ہے!!" (مجادلہ، ۲۲)

مگر اس "حزب اللہ" کی صفت آپ پر پوری طرح واضح نہ ہوگی جب تک آپ اس کی ضد یعنی "حزب الشیطان" کی تعریف

---

[1] تورات میں یہی نام ہے۔ اہل رائے کا قول ہے کہ اسی (اصلی) نام کا یونانی تلفظ الیاس ہے۔

بھی سُن لیں۔ اسی سورت (کی آیات ۱۴ – ۱۹) میں حضور (وحی الیہ صلعم سے خطاب ہوا ہے "کیا تو نے ان لوگوں پر نظر نہیں کی جو ایسے لوگوں سے دوستی رکھتے ہیں جن پر اللہ نے غضب کیا ہے۔ یہ لوگ (منافق) نہ تو پوری طرح تم میں ہیں اور نہ اُن ہی میں ہیں، اور جھوٹی بات پر قسمیں کھاتے ہیں ــــ اور اس بات کو وہ خود بھی جانتے ہیں! اللہ نے اُن کے لئے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے، کیوں کہ اس میں شک ہی نہیں کہ وہ بُرے بُرے کام کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی قسموں کو اپنے بچاؤ کا ذریعہ بنا رکھا ہے، پھر اللہ کی راہ سے (لوگوں کو) روکتے رہتے ہیں۔ اس لئے اُن کے واسطے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ اُن کے مال اور اُن کی اولاد اُن کو اللہ کے عذاب سے ذرا بھی نہ بچا سکیں گے۔ یہی لوگ آگ میں رہنے والے ہیں اور اُسی میں رہیں گے! جس دن اللہ ان سب کو پھر زندہ کرے گا، تو یہ لوگ اس کے سامنے بھی ایسی ہی (جھوٹی) قسمیں کھا جائیں گے جس طرح تمہارے سامنے قسمیں کھا جاتے ہیں اور سمجھیں گے کہ بڑی اچھی طرح ہیں۔ خوب سُن لو کہ یہ لوگ بڑے ہی جھوٹے ہیں، ان پر شیطان نے پورا قبضہ جما لیا ہے، اور ان کو اللہ کی یاد بھُلا دی ہے۔ یہی لوگ شیطان کا گروہ (حزب الشیطان) ہیں! اور خوب سُن لو کہ شیطان کا گروہ برباد ہونے والا ہے!!"

یہ تو حزب اللہ کی تعریف ہے۔ "اولیاء اللہ" کا ذکر بھی وحی کی زبان نے یوں کیا ہے؛ صرف تین آیتیں ہیں (سورہ یونس؛ ۶۲ – ۶۴) "خوب سمجھ لو کہ اللہ کے دوستوں (اولیاء اللہ) کے لئے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے! یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور بہت برائی سے بچتے رہے۔ اُن کے لئے یہی خوش خبری ہے، اِس وقت کی زندگی میں بھی اور اس کے بعد کے لئے بھی اللہ کی باتوں (وعدوں) میں کوئی فرق نہیں ہوا کرتا، اور یہی (خوش خبری) بڑی کامیابی ہے!"

اللہ کا حزب ایسا ہے، اور اللہ کے اولیاء ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو کسی جانب سے کوئی خوف نہیں ہوتا اب اِس شعر کا کچہ مزہ لیجئے ؎

لائق حزبِ اولیاء نہ ہوا
وہ جو بے خوف ما سوا نہ ہوا

اِس سلسلے کی صرف ایک چیز ــــ اور وہ بھی "حزب اولیاء" کی تعریف میں ــــ رہی جاتی ہے جس کی طرف حسرت نے بڑے جوش سے تلمیح کی ہے، اور وہ یہ ہے

اَعلَون

اَعلَوں کی تصدیق ہیں پست ہو حسرت
مُسلم ہیں تو دب کر نہ رہیں گے کبھی ہم (ص ۲۷۶)

پہلے مصرعے کو اعلون (سب سے اونچے درجے کے لوگ) سے شروع کیا تھا، تو کاش کہ ہمارے مولانا دوسرے مصرعے کو بھی بجائے "مسلم" کے قرآنی لفظ "مومن" سے شروع کرتے! مگر میرا کیا مُنہ ہے کہ صلاح دوں، توبہ توبہ۔ امور شاعری خویش شاعران دانند!

یہ لفظ مبارک قرآن مجید میں دو جگہ وارد ہوا ہے (۱) اور تم ہمت نہ ہارو، اور رنج مت کرو، اور اگر تم پورے مومن رہے، تو تم ہی سب سے اونچے رہو گے (آل عمران، ۱۳۸)

(۲) تو تم ہمت نہ ہارو، اور ان (کافروں) کو صلح کی طرف مت بلاؤ۔ اور تم ہی سب سے اونچے رہو گے۔ اور اللہ تمہارے ساتھ ہے، اور تمہارے (اچھے) اعمال کو کم نہیں کرے گا! (محمد، ۳۵)۔

معلوم ہوا کہ "اعلون" ہونے کے لئے "مومن" ہونا شرط ہے۔ رہا یہ کہ مومن قرآن کے محاورے میں کسے کہتے ہیں، سو اس کا بیان کتاب پاک میں جگہ جگہ موجود ہے۔ اس کے علم کے لئے سورۂ مومنون (نمبر ۲۳) کی پہلی چند آیتیں ہی پڑھ لینا کافی ہوگا۔

اِن پہلے پہلے "مومنوں" ہی کا ذکر ہے جہاں، بہ الفاظِ حسرت "دستِ یزداں" کا ذکر ہوا ہے۔

دستِ یزداں

ملتزم کو چاہئے گر فی المثل آغوشِ حق
سنگِ اسود کو بہ شانِ دستِ یزداں دیکھئے (ص ۳۰۹)

اب یہ دستِ یزداں (اللہ کا ہاتھ) دیکھئے: حضرت داعی الی اللہ صلعم سے خطاب ہے کہ (۱) "بے شک یہ جو لوگ

آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ (اصل میں) اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔ پھر جو کوئی یہ عہد کرنے کے بعد اسے توڑے گا اس کا وبال اسی پر پڑے گا، اور جو کوئی اپنے اس عہد کو پورا کرے گا، اللہ اسے جلد ہی بڑا اجر دے گا! (فتح، ۱۰) (۲)" "کہہ دے کہ بے شک ہر طرح کا فضل اللہ کے ہاتھ (قبضے) ہی میں ہے۔ وہ اسے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، اور اللہ بڑی وسعت والا اور بہت جاننے والا ہے، اور اپنی رحمت جس کے لئے چاہتا ہے خاص کر دیتا ہے" (آل عمران، ۷۳) (۳)" "بے شک سب طرح کا فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ اُسے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، اور وہ بڑے فضل والا ہے۔" (حدید، ۲۹)۔ یہودی لوگ اللہ کو طعنے دیا کرتے تھے: (۴) "یہودی لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کا ہاتھ بند ہے۔ انہیں کے ہاتھ بند ہیں، اور ایسا کہنے کے کارن وہ رحمت سے راندے گئے —— بلکہ اللہ کے ہاتھ تو دونوں کھلے ہوئے ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔" (مائدہ، ۶۷)

اور یہ ہاتھ اس کا ہے جو "نور ارض وسما" بلکہ "نور بالائے نور" ہے:

نور ارض وسماء

نور ارض وسما کو ناز یہ ہے
کہ تری شکل میں ظہور کیا (ص ۱۴۹) اور

نور بالائے نور، علیٰ نور

پھر نہ کیوں وصل حسن وعشق سے ہو
نور بالائے نور جلوہ نما (ص ۱۶)
کھنچ گئی نور علیٰ نور کی تصویر جمیل
بعد کعبے کے جو آنکھوں نے مدینا دیکھا (ص ۲۷۰)

اِن دونوں نوروں کو قرآن مجید کی ایک ہی آیت (سورہ نور، ۳۵) میں دیکھئے: "اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق ہے، اور اُس میں ایک چراغ ہے، اور وہ چراغ ایک شیشے کی قندیل میں ہے، اور وہ شیشہ ایسا (صاف شفاف) ہے جیسے ایک چمکتا ہوا ستارہ ہو، اور وہ (چراغ) ایک بڑے مفید درخت (کے تیل) سے روشن کیا جاتا ہے —— زیتون سے —— جو نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ مغرب کی طرف ہے، اور اس کا تیل ایسا ہے کہ اگر اُسے آگ بھی نہ چھوئے تب بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود روشن ہو جائے گا، (اور روشن ہو گیا تو پھر) روشنی کے اوپر روشنی (نور علیٰ نور) ہی روشنی ہے! اللہ اپنے نور تک جس کو چاہتا ہے راہ دکھاتا ہے۔ اور اللہ لوگوں (کی ہدایت) کے لئے یہ مثالیں بیان کرتا ہے، اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے!"

کچھ ایسا ہی "جلوۂ حق" تھا (بقول حسرت):

جلوۂ حق سے بے خبر رہا
محو تسنیم وسلسبیل ہیں سب (ص ۶۴) جو "جلوۂ طور" اور "تجلی طور" بنکر حضرت موسیٰ عم کو نظر آیا تھا۔

جلوۂ طور

نظر آتا ہے پیش رُوئے حضور
اہل بینش کو نورِ جلوۂ طور (ص ۲۶۴) اور

تجلی طور

تجلی طور پر جس نور کی دیکھی تھی موسیٰ نے
ہمیں بھی اک جھلک اُس کی دکھا دو یا رسول اللہ (ص ۲۲۰)

اس کا حال پہلے توراۃ کے مصنف سے سُنیئے: "اور موسیٰ اپنے سسرے یترو کے، جو مدیان کا کاہن تھا، گلّے کی نگہبانی کرتا تھا۔ تب اُس نے گلّے کو بیابان کی ایک طرف ہانک دیا، اور خدا کے پہاڑ حُرِب کے نزدیک آیا۔ اس وقت خداوند کا فرشتہ ایک بوٹے میں سے آگ کے شعلے میں اس پر ظاہر ہوا۔ اُس نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بوٹا آگ میں روشن ہے اور وہ جل نہیں جاتا۔ تب موسیٰ نے کہا کہ میں اب نزدیک جاؤں اور اس بڑے منظر کو دیکھوں کہ یہ بوٹا کیوں نہیں جل جاتا۔ جب خداوند نے دیکھا کہ وہ دیکھنے کو نزدیک آیا، تو خدا نے اسے بوٹے کے اندر سے پکارا اور کہا کہ "اے موسیٰ اے موسیٰ! وہ بولا: میں یہاں ہوں! تب اس نے کہا: یہاں سے نزدیک مت آ۔ اپنے پاؤں سے جوتا اُتار، کیوں کہ

یہ جگہ جہاں تو کھڑا ہے مقدس زمین ہے۔ پھر اس نے کہا کہ میں تیرے باپ کا خدا اور ابرہام کا خدا اور اضحاق کا خدا اور یعقوب کا خدا ہوں۔ موسیٰ نے اپنا منہ چھپایا، کیوں کہ وہ خدا پر نظر کرنے سے ڈرتا تھا۔" (خروج : ۳، ۱-۶)

قرآنِ مبین کا بیان ہے: (۱) حضرت محمد صادق صلعم سے خطاب ہے "کیا آپ کو موسیٰ کی خبر پہنچی ہے، جب کہ اس نے ایک آگ دیکھی اور اپنے گھر والوں سے کہا، تم لوگ ٹھیرے رہو۔ میں نے آگ دیکھی ہے، شاید اس میں سے تمہارے پاس کوئی انگارا لا سکوں یا آگ کے پاس راستے کا پتا مجھے مل جائے۔ سو جب وہ اس (آگ) کے پاس پہنچا، تو اُسے پکارا گیا: اے موسیٰ! میں تیرا رب ہوں۔ پس تو اپنے جوتے اتار ڈال، کیوں کہ تو طُویٰ کی پاک وادی میں ہے۔ اور میں نے تجھے چُن لیا ہے، تو اب جو کچھ تجھے وحی کی جاتی ہے اُسے سُن: بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو تو میری ہی عبادت کر، اور میری ہی یاد کے لئے صلوٰۃ قائم کر۔" (طٰہٰ ۹-۱۴) (۲) "یاد ہے جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے، میں ابھی جا کر وہاں سے یا تو (راستے کی) کوئی خبر لاتا ہوں یا تمہارے پاس انگارے کا شعلہ لاؤں گا کہ تم سینکو۔ تو جب وہ اس (آگ) کے پاس پہنچا تو اُسے پکارا گیا کہ برکت ہو اس پر جو اس آگ کے اندر ہے اور اُس پر جو اس کے پاس ہے، اور رب العلمین پاک ہے۔ اے موسیٰ! بات یہ ہے کہ میں ہی اللہ ہوں، غالب اور حکمت والا...." (نمل، ۷-۹) (۳) "غرض کہ جب موسیٰ اس مدّت کو پورا کر چکا اور اپنی بی بی کو لے کر چلا تو اس نے طور کی طرف سے آگ دیکھی۔ اُس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم لوگ ٹھیرے رہو، میں نے کچھ آگ دیکھی ہے، شاید میں وہاں سے تمہارے لئے (راستے کی) کچھ خبر لاؤں یا کوئی دہکتا ہوا انگارا لے آؤں تاکہ تم سینکو۔ تو جب وہ اُس (آگ) کے پاس پہنچا تو اُسے اس وادی کی داہنی طرف سے اس مبارک سرزمین میں ایک درخت میں سے آواز سُنائی دی کہ: اے موسیٰ! میں ہی تو اللہ رب العالمین ہوں...." (قصص، ۲۹، ۳۰) (۴) "اور جب موسیٰ ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر آیا، اور اُس کے رب نے اُس سے باتیں کیں، تو اس نے کہا: اے میرے رب! تو مجھے دکھا دے کہ میں تجھے ایک نظر دیکھ لوں۔ اس نے کہا: تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا (لن ترانی) لیکن اس پہاڑ کی طرف دیکھ۔ تو اگر یہ اپنی جگہ پر قائم رہا تو (خیر) تو بھی دیکھ سکے گا۔ غرض کہ جب اس کے رب نے پہاڑ پہ تجلی کی تو اس پہاڑ کے پرخچے اُڑا دیئے، اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ پھر جب وہ ہوش میں آیا تو اُس نے کہا: تو پاک ہے، میں نے تیری طرف توبہ کی، اور میں سب سے پہلے یقین کرنے والوں میں سے ہوں۔ اس نے کہا: اے موسیٰ! میں نے سب لوگوں میں سے تجھے چُن لیا اپنے پیغام اور کلام کے لئے۔ اب جو کچھ میں نے تجھے دیا وہ لے لے اور شکر کرنے والوں میں سے ہو۔" (اعراف ۱۴۳، ۱۴۴)

یہ تھی تجلی طور! مگر ہمارے واعظین[1] کرام نے جو سُرمہ طور کے پتھروں کا بنا کے بریلی کے بازاروں میں فروخت کر کے چشم خریدار پہ احسان فرمانے کا بندوبست کر رکھا ہے، اس سُرمے کا کہیں کسی روایت میں پتا نہیں چلتا۔ حضرات شعرائے عظام نے بھی برخوردارانہ سرِ تسلیم خم کر کے سرمۂ طور سے اپنے سخن کی بصارت افزائی کے لئے صدیوں سے استعمال کر رکھا ہے۔ مولانا حسرت بھی اس سنت کے سالک ہیں:

سرمۂ طور میں کہاں وہ اثر
دشتِ یثرب کے جو غبار میں تھا (ص ۴۵) اور

نہ ملے، گر ملا نہ سرمۂ طور
کیا تری خاکِ رہ گزر بھی نہیں (ص ۱۵۲)

رہی مولانا کی "کوہ طور کی بات"!

میں دل کی آنکھ سے دیکھوں نہ چشمِ سر سے اُنہیں
کہ پھر نہ پیشِ نظر ہو وہ کوہ طور کی بات (ص ۱۲)

اُس کا حال آپ ابھی "تجلی" کے بیان میں سُن چکے مزید تفصیل

---

[1] اصل میں یہی حضرات فسانچوں کے موجد ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں نے ناحق ہی تو لستائی اور چیخوف اور موپاساں (اور نہ معلوم کس کس کو) اپنا امام بنا رکھا ہے۔ (رجعت پسند ریا پرست) ادیب اگر حضرات واعظین کے افسانچوں کو قلمبند کر کے دہلی کے ساقی اعظم کی وساطت سے زیورِ اشاعت سے مزیّن کر دیں تو دورِ حاضر کے معرکہ میں ان کی فوزِ عظیم یقینی ہے!

کے لئے وہی حوالے اور بعد ملاحظہ ہوں۔

اور اسی کے ضمن میں "لن ترانی" بھی آ جاتی ہے، جیسے مولانا نے 'دعویٰ' قرار دیا ہے

ستوں کامل جو ہو وے سو ہو
ان کے دعوائے لن ترانی کا (ص ۵۰)

اب ہم تلمیحات کی دوسری صف یعنی ساتھ و حیوان کے ذکر میں آتے ہیں۔ اس صف میں حضرت نے صرف منّ و سلویٰ کا ذکر کیا ہے۔

منّ و سلویٰ

من و سلویٰ سے بھی ہے بہتر اگر ملتی رہے
یا رسول اللہ ترے در پر ہمیں نانِ جویں (ص ۳۹)

توریت کی کتاب خروج میں ہے کہ "خداوند نے موسیٰ سے کہا: میں نے بنی اسرائیل کا بڑبڑانا سنا۔ انہیں کہہ کہ تم درمیان زوال اور غروب کے گوشت کھاؤ گے اور صبح کو روٹی سے سیر ہو گے، اور تم جانو گے کہ میں خداوند تمہارا خدا ہوں۔ اور یوں ہوا کہ شام کو بٹیریں اوپر آئیں اور ڈیرا ڈالے کو چھپا لیا، اور صبح کو لشکر کے آس پاس اوس پڑی، اور جب اوس پڑ چکی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول چیز، ایسی سفید جیسے برف کے چھوٹے ٹکڑے، زمین پر پڑی ہے اور بنی اسرائیل نے دیکھ کے آپس میں کہا کہ منّ ہے کیونکہ انھوں نے نہ جانا کہ وہ کیا ہے۔ تب موسیٰ نے انہیں کہا کہ یہ روٹی ہے جو خداوند نے کھانے کو تمہیں دی ہے۔ یہ وہ بات ہے جو خداوند نے نہیں فرمائی تھی، ہر ایک اس میں سے بقدر اپنے کھانے کے آدمی پیچھے ایک اومر جمع کرے ہر ایک اپنے لوگوں کا شمار کر کے اُن کے لئے جو اس کے خیمے میں ہیں لے۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے یوں ہی کیا۔" (باب ۱۶، آیات ۱۱-۱۷) اس کے بعد یہ حکم مذکور ہے کہ کوئی زیادہ نہ لیا کرے، اور یہ کہ سبت کے دن منّ نازل نہیں ہوتا تھا مگر اس سے ایک دن پہلے دو دن کا حصہ نازل ہوا کرتا تھا۔ "اور بنی اسرائیل چالیس برس تک جب تک کہ وہ بستی میں آئے منّ کھاتے رہے۔ جب تک کہ وہ زمین کنعان کی نواحی میں آئے منّ کھاتے رہے۔" (آیت ۳۵) کتاب گنتی میں ہے: "اور [illegible] نے جو ملی جلی قوموں سے جو ان میں ملے ہوئے تھے حرص سے خواہش کی، اور بنی اسرائیل بھی پھرے اور روئے اور بولے: کون ہے جو ہمیں گوشت کھانے کو دے گا؟ ہم کو وہ مچھلی یاد آتی ہے جو ہم مفت مصر میں کھاتے تھے، اور وہ کھیرے اور وہ خربوزے اور وہ گندنا اور وہ پیاز اور وہ لہسن پر اب تو ہماری جان خشک ہو چلی، یہاں تو ہماری آنکھوں کے سامنے کچھ بھی نہیں مگر یہ منّ۔ اور منّ دھنیے کے بیج [illegible] تھا اور اس کا رنگ موتی کے دانے کا سا تھا۔ لوگ ادھر ادھر جا کر اسے جمع کرتے تھے اور چکی میں پیستے تھے یا اوکھلی میں کوٹتے تھے اور تاووں پر پکاتے تھے اور پھلکیاں بناتے تھے۔ اس کا مزہ تازہ تیل کا سا تھا۔ اور رات کو جب خیموں پر اوس پڑتی تھی تو منّ بھی اس پر گرتا تھا۔" (باب ۱۱، آیت ۴-۹) اس کے بعد کتاب استثنا (باب ۸، آیت ۳) اور کتاب نحمیاہ (باب ۹، آیت ۲۰) میں خدا کے اس فضل و کرم کا ذکر ہے کہ اس نے بنو اسرائیل کو منّ کی سی نعمت دی۔ پھر زبور کے باب ۷۸ میں (بھی) یہی کہا ہے کہ خدا نے بنو اسرائیل پر "منّ برسایا کہ کھائیں اور اُن کو آسمانی غلہ بخشا۔ ایک ایک نے امیروں کی غذا کھائی۔ اس نے انھیں خوراک بھیج کر آسودہ کیا۔ اور اس نے ان پر خاک کی مانند گوشت اور دریا کی ریت کی مانند پردار مرغ برسائے۔ اور اس نے انہیں ان کے خیموں کے بیچ میں اور ان کے مسکنوں کے آس پاس گرایا۔ سو انھوں نے کھایا اور خوب سیر ہوئے۔" (آیات ۲۴-۲۹) [illegible] انجیل میں بھی [illegible] (باب ۶، آیت ۳۱ اور ۴۹) میں منّ کا ذکر ہے۔

قرآن حمید میں، اس کے دستور کے مطابق، ان سب باتوں کی اتنی تفصیل نہیں ہے، مگر تین جگہ منّ و سلویٰ (بٹیر) کا ذکر آیا ہے: (۱) یہودیوں کو یاد دلایا جاتا ہے کہ "ہم نے تمہارے اوپر بادلوں کا سایہ کیا، اور تمہارے لئے منّ اور بٹیریں بھیجیں۔ کھاؤ نفیس چیزوں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں" (البقرہ، ۵۷) پھر اسی سورت میں یہودیوں کو ان کی یہ بے جا حرکت اور ضد یاد دلائی کہ "جب تم لوگوں نے کہا کہ اے موسیٰ! ہم (ہر روز اس) ایک

ہی قسم کے کھانے پر ہرگز نہ رہیں گے۔ تو ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کر کہ وہ ہمارے لئے ایسی چیزیں پیدا کرے جو زمین سے اُگتی ہیں، جیسے ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز۔ موسیٰ نے کہا: کیا تم ایسی چیزوں کے عوض میں جو اچھی ہیں ادنیٰ درجے کی چیزیں لینا چاہتے ہو؟ اچھا، تو کسی شہر میں جا اُترو، وہاں تمہیں وہ چیزیں ملیں گی جو تم مانگتے ہو (آیت ۶۱)

(۲) یہودیوں کے ذکر میں فرمایا ہے کہ "...... اور ہم نے ان پر بادلوں کا سایہ کیا اور ان کے لئے منّ اور سلویٰ بھیجیں۔ کھاؤ ان نفیس چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں دی ہیں"۔ (اعراف، ۱۶۰) (۳) "اے بنواسرائیل! ہم نے تمہیں تمہارے دشمنوں سے بچایا، اور تم سے طور کی داہنی طرف (آنے) کا وعدہ کیا، اور تمہارے لئے منّ اور سلویٰ بھیجے۔ کھاؤ جو نفیس چیزیں ہم نے تم کو دی ہیں، اور اس کے کھانے میں حد سے باہر نہ نکلو، کہیں میرا غضب تم پر پڑے! اور یاد رکھو کہ جس پر میرا غضب ٹوٹا بس وہ گیا گذرا ہوا!" (طٰہٰ، ۸۰-۸۱)

یہ ہے منّ وسلویٰ کی حقیقت اور کیفیت جو تورات زبور، انجیل اور قرآنِ کریم سے معلوم ہوتی ہے۔ تورات کی آیات سے اس کی ماہیت بھی معلوم ہوگئی۔ اہلِ علم نے منّ کے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ ترنجبین یا شیرخشت کی قسم کی کوئی چیز تھی، اور سلویٰ تو خیر بٹیر چڑیا کا نام ہے۔ منّ کے بارے میں یہودیوں کے یہاں اور بھی لطیف روایتیں ہیں، مگر اس مختصر میں اُن کے بیان کی سمائی کہاں!

اب وقت ہے کہ جناب حسرت کی ان تلمیحات کا مطالعہ کیا جائے جو مقامات، مکانات اور زمین کی طبیعی اشکال سے متعلق ہیں۔ سب سے پہلے طور ہی کو لیجئے، کہ اس کے متعلقات کا ذکر ابھی ذہن میں تازہ ہی ہے۔

طور

دل بھی پابندِ تمنا ہے اسی دیدار کا
طور پر جو نور چمکا تھا جمالِ یار کا (ص ۲۶۹)

(اور اسی کے ساتھ وہ اشعار بھی ذہن میں رکھیئے جو اس سے قبل جلوۂ طور، تجلی طور اور سرمۂ طور کے متعلق تھے)

عربی زبان اور محاورے میں لفظ طُور کے معنی پہاڑ کے ہیں۔ یوں ایران اور ہند کے عجمیوں کا "کوہ طور" کہنا بالکل ویسا ہی ہے جیسے حیدرآباد دکن (صانہا اللہ عن الفتن) کے لوگ اپنے شہر کے نواح کی ایک پہاڑی کو "کوہ مولاعلی کا پہاڑ" کہتے ہیں۔ اس معروف پہاڑ کا اصلی نام سَینار (س کے زبر سے، آخر میں ہمزہ کے ساتھ) ہے، گو عرب لوگ سِینار (س کے زیر سے) بھی بولتے ہیں۔ ہمارا ہندی تلفظ سِینا (س کے زیر سے اور بغیر ہمزہ کے) اصل میں اس عربی نام کا یونانی تلفظ ہے۔ عبرانی (یعنی توراتی) تلفظ سِینَیْ ہے، جس سے دوسرا عربی تلفظ سِینِیْن بنا ہے۔ عرب کے ایک محاورے میں شام کے پورے ملک کو بھی طور کہتے ہیں۔

قرآن مجید میں لفظ طور دس جگہ وارد ہوا ہے[1]، انہیں میں سے ایک جگہ طور سینار آیا ہے[2]، اور ایک جگہ طور سینین ہے[3]۔

طورِ سینا، اُس چھوٹے سے جزیرہ نما کے تقریباً وسط میں واقع ہے جو بحرِ احمر کی دو شاخوں کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ اس میں سرخ اور بھولے رنگ کے پتھروں کے پہاڑ ہیں، اور یہ جزیرہ نما سطح بحر سے آٹھ اور نو ہزار فٹ تک کی بلندی لئے ہوئے ہے۔ اس کی عمومی شکل یہ ہے کہ اس کے پہاڑ باقاعدہ سلسلے اور چوٹیوں کی صورت میں نہیں ہیں، بلکہ وہ ایک سطح مرتفع ہے جس میں ان گنت وادیاں اور جگہ جگہ چوٹیاں ہیں۔ ان کو تین بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) شمال مغربی سمت کا حصہ جس میں فیران کی وادی ہے اور جو سمندر کی سطح سے سوا چھ ہزار فٹ اونچا ہے۔ (۲) وسطی اور مشرقی حصہ جس کا

---

[1] بقرۃ ۶۳، ۹۳، نساء ۱۵۴، مریم ۵۱، طٰہٰ ۸۰، مومنون ۲۰، قصص ۲۹، ۴۶، طور ۱، تین ۱۔ آٹھ جگہ محض طور نہیں بلکہ الطور ہے یعنی وہ مخصوص پہاڑ۔ [2] مومنون، ۲۰ میں [3] التین، ۱ میں یہاں یہ بھی عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اس سورت کے شروع میں جو تین اور زیتون کا ذکر ہے اس سے انجیر اور زیتون (پھل) مراد نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں پہاڑوں کے نام ہیں!

سب سے اونچا پہاڑ کاتہرین سمندر سے آٹھ ہزار فٹ سے کچھ زیادہ بلندی پر ہے اسی میں وہ پہاڑ ہے جسے جبلِ موسیٰ کہتے ہیں اور جو تقریباً سات ہزار فٹ (سطح بحر سے) بلند ہے۔ (۳) جنوب مشرقی حصہ جس کی سب سے اونچی اُمّ شومر ہے کاترین موسیٰ اور ام شومر کو اگر ایک خط سے ملایا جائے، تو یہ سب ۹ میل کے اندر اندر ہیں۔ اس خط کے عمود (تقریباً بیس میل تک) سے اس جزیرہ نما کا بلند ترین علاقہ بنتا ہے، اور اسی کے شمال میں تیہ کا علاقہ ہے، جہاں موسائی قوم چالیس برس تک رہی۔ تورات میں طورِ سیناء کا ذکر کئی جگہ ہے[۱]:

(۱) "اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا" (استثنا) (۲) "پہاڑ خداوند کے آگے پگھلے، اور کوہِ سینا بھی خداوند اسرائیل کے خدا کے آگے"! (قاضیوں) (۳) "اور بنی اسرائیل زمین مصر میں سے باہر ہو کے تیسرے مہینے کے اسی دن سینا کے بیابان میں آئے" (خروج) (۴) مختلف قسم کی قربانیوں[۲] کے نام گنوا کر فرمایا ہے کہ یہ وہی حکم ہے "جو کوہِ سینا پر خداوند نے موسیٰ کو کیا تھا جس دن کہ بنی اسرائیل کو فرمایا کہ سینا کے بیابان میں خداوند کے لئے اپنی قربانیوں کو گذرانیں" (احبار) (۵) "جب مصر کی زمین سے بنی اسرائیل نکلے تب دوسرے برس کے دوسرے مہینے کی پہلی تاریخ سینا کے بیابان کے بیچ جماعت کے خیمے میں خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا" (گنتی) احبار کی کتاب کا بالکل آخری فقرہ (باب ۲۷: ۳۴) ہے کہ "وہ احکام جو خداوند نے بنی اسرائیل کے لئے کوہِ سینا پر موسیٰ کو فرمائے یہ ہیں"

[۱] (۱) کتاب استثنا، باب ۳۳: ۲ (۲) قاضیوں باب ۵: ۵ (۳) خروج باب ۱۹: ۱ (۴) احبار باب ۷: ۳۸ (۵) گنتی باب ۱: ۱ [۲] کتاب احبار تورات کی کتابوں (صحیفوں) میں سے تیسری ہے۔ اس کے ۲۷ باب ہیں جن میں کھانے کی حلال و حرام چیزوں اور قربانیوں کا ذکر ہے۔ کئی طرح کی قربانیاں ہیں۔ ان کا خلاصہ اس کتاب کے ساتویں باب کے آخر میں آتا ہے "سوختنی قربانی کا اور نذر کی قربانی کا اور خطا کی قربانی کا اور تقصیر کی قربانی کا اور مساحت کا اور سلامتی کے ذبیحے کا حکم یہی ہے جو کوہِ سینا پر خداوند نے موسیٰ کو کیا تھا۔" مسلمان اسرائیلیوں سے کیوں پھٹے رہتے، انھوں نے کبھی حج بیت اللہ کرنے نہ دیا۔

بیستون اور جوئے شیر

شوق کی تاثیر سے گریاں جو ہر دہ سنگدل
جوئے شیر اک طرفہ پیدا ہو میان بیستون (ص ۱۳۰)

بیستون، بغداد سے ہمدان جانے والی سڑک پر قصبہ کرمان شاہ سے بیس میل کے فاصلے پر ایک پہاڑ ہے۔ قدیم عربی مصنف اسے بَغِستان (غ کے زبر سے اور زیر سے، دونوں طرح) لکھتے ہیں۔ بَغ کے معنی "خدا" کے ہیں، اس لئے بغستان خانۂ خدا ہوا[۱]۔ اسی بغستان سے بہستان، پھر بہستون اور آخر میں (آج کل) بیستون بن گیا ہے۔ چوٹی کے قریب ایک غار کے پاس دارائی اعظم کی ایک فتح کی یادگار اور دامن کے قریب گودرز کی یادگار اب بھی موجود نظر آتی ہے۔ اس پہاڑ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ شمال مغربی ایران کا سب سے زیادہ خوبصورت پہاڑ ہے۔

جوئے شیر کے نام ہی سے عیاں ہو کہ اس کو شیریں سے کچھ نسبت ہے، جو ایران کے قدیم بادشاہ خسرو پرویز کی ملکہ تھی۔ خسرو، اپنے باپ کے سالار فوج بہرام چوبین کو (جس نے ملک دبا لیا تھا) شکست دے کر اور قتل کر کے سنہ ۵۹۰ء میں ایران کا بادشاہ ہوا تھا، اس کی ملکہ شیریں کے بارے میں یہ قیاس غالباً صحیح ہے کہ وہ موریس (شاہِ یونان) کی بیٹی تھی، اس کا اصلی نام ایرین تھا، جس کی ایرانی شکل شیریں ہو گئی تھی۔ خسرو نوشیرواں کے خاندان کی شان و شوکت خسرو پرویز ہی پر ختم ہو گئی، جب اس کا بیٹا شیرویہ اپنے ۱۸ بھائیوں اور باپ کو سنہ ۶۲۸ء میں قتل کرا کے خود تخت نشین ہوا، مگر خود بھی آٹھ مہینے سے زیادہ بادشاہی سے لطف اندوز نہ ہو سکا۔ یہی وہ خسرو ہے جس کے نام سرکار رحمۃ اللعالمین صلعم نے عطوفت نامہ اور پیغام اسلام بھیجا تھا، اور یہی وہ بدنصیب بد بخت تھا جس نے اس رحمت نامے کی توہین کی پاداش میں خود کو

[۱] بغداد (= بَغ داد) میں بھی یہی بَغ ہے۔ "مولوی صاحب" لوگ جو اس نام کو "باغِ داد" بتایا کرتے ہیں یہ خاص انہیں کے دماغ کا تمردانہ ہے، اور بس۔

نیست کیا، مگر اپنے ملک کو رحمۃ للعالمین عربوں کیلئے چھوڑ گیا۔

شیریں اور خسرو، اور شیریں اور فرہاد کے معاشقے کے افسانوں سے فارسی، ترکی اور اُردو شعراء کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ شیریں خسرو کی باہمی محبت تو جائے عجب نہیں ہے البتہ شیریں اور فرہاد کے افسانہ محبت میں کافی شیرینی ہے۔ قصہ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شاہی حکم سے کوئی نہر کھودی جا رہی تھی جو بہستان کی پہاڑیوں میں سے گذرتی تھی۔ کھدائی کے کام پر کوئی مزدور تھا جس کا نام فرہاد تھا۔ ایک روز بادشاہ اور ملکہ معائنہ کے لئے وہاں تشریف لے گئے۔ فرہاد ملکہ کو دیکھتے ہی "ہزار جان سے" عاشق اور متوالا ہو گیا۔ انجام محبت یوں ہوا کہ کم بخت عاشق نے جان دی۔ بس اسے افسانہ کر دیا!

بیت الحزن

فرقت میں ان کی بوئے گل اے بادِ نو بہار
آئے کبھی تو ہے مرے بیت الحزن سے دور (ص ۴۸) اور
جلوۂ جاناں سے ہے دار السرور
خانۂ جاں اب نہیں بیت الحزن (ص ۱۷۱)

قرآن عظیم میں حضرت یوسف ؑ کے قصے میں ان کے والد کریم حضرت یعقوب ؑ کا اپنے عزیز فرزند کے فراق میں غم والم سے جو بُرا حال ہو رہا تھا اس کا نقشہ ان جامع الفاظ میں کھینچا گیا ہے: "...... اس نے کہا: ہائے رے یوسف! اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور وہ غم (حزن) سے گھٹنے لگا۔ (گھر والے) کہنے لگے: اللہ کی قسم، تو (یعقوب ؑ) ہمیشہ یوسف ہی کو یاد کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ تو کمزور یا ہلاک ہو جائے۔ (یعقوب ؑ نے) کہا: میں تو اپنے رنج و غم (حزن) کی صرف اللہ سے شکایت کرتا ہوں، اور اللہ کی باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔" (یوسف، ۸۴-۸۶) یوں حضرت یعقوب ؑ کا گھر، جس میں رہتے ہوئے انھیں اس جاں کاہ غم (حزن) سے واسطہ پڑا تھا، بیت الحزن یعنی غم کا گھر کہلانے لگا، اور اللہ کے مومن بندوں کو ایک شاداب مضمون مل گیا۔

بیت الحرام

حاصلِ حسرت یہ سفر ہو مدام
بیت نبی سے سوئے بیت الحرام (ص ۲۶۵)

صحیح عربی میں البیت الحرام ہے، نادان عجمیوں نے بیت الحرام کر دیا۔ اس کے معنی ہیں وہ گھر جسے اللہ نے قابلِ احترام بنایا ہے، اور یہ وہی ہے جسے عام طور پر بیت اللہ شریف اور خانہ کعبہ کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں صرف ایک جگہ اسے البیت الحرام کہا ہے، اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کعبے کا دوسرا نام ہے: "اللہ نے کعبے کو حرمت والا گھر بنایا، اور لوگوں کے قائم رہنے کا سبب بنایا۔" (مائدہ، ۱۰۰) اسی کو ایک جگہ البیت المحرم فرمایا ہے، جہاں حضرت ابراہیم ؑ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہیں اور فرماتے ہیں: "اے ہمارے رب! میں اپنی اولاد کو تیرے حرمت والے گھر کے قریب ایک میدان میں، جو کھیتی باڑی کے قابل نہیں ہے، آباد کرتا ہوں....." (ابراہیم، ۳۷) یہ دُنیا میں سب سے پہلا گھر ہے[1] جو ساری دُنیا سے آنے والے لوگوں کے لئے بنایا گیا ہے (آلِ عمران، ۹۶) اسی کا ایک اور نام البیت العتیق (یعنی قدیم گھر) بھی ہے جیسا کہ سورۂ حج کی آیات ۲۹، ۳۳ میں مذکور ہے۔ اس کو محض البیت[2] (خاص گھر) بھی فرمایا ہے، اور بیتی (میرا گھر) بھی۔

خیف، عرفات، مزدلفہ، منیٰ

پھر مسجد خیف میں پہنچ کر ۔ حظ کیف صلوٰۃ کا اٹھایا
مژدہ عرفات نے پھر اک بار ۔ غفران ذنوب کا سُنایا
مزدلفہ کی راہ سے منا تک
پھر شوقِ طواف کھینچ لایا (ص ۲۶۴)

(۱) خیف ایسی جگہ کو کہتے ہیں جو پہاڑ کے دامن میں ڈھلوان

---

[1] اس موقعہ پر عام اور متداول ترجمہ کیا جاتا ہے "غم سے اس (یعقوب ؑ) کی آنکھیں سفید ہو گئیں"۔ شاعروں کو موقعہ ہاتھ آیا، خوب خوب افسانے بنا ڈالے۔ دلّی والے غالب نے زنداں یوسف کیلئے دیدۂ یعقوب ہی کو سفیدی پھیرنے کا سامان کر دیا تھا! سچ ہے کی کل داد نہیں ممنون!!

[1] اقبال لاہوری: "دُنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا"۔ [2] بقرہ ۱۲۵، ۱۲۷، ۱۵۸، آلِ عمران ۹۷، مائدہ ۲، حج ۲۶، قریش ۳۔ [3] بقرہ ۱۲۵، حج ۲۶۔

ہو اور پانی کے بہنے کی جگہ سے اونچی ہو منیٰ کی مسجد کو مسجدِ الخیف کہتے ہیں۔ شہر مکّہ کے قریب خونشیب کی زمین پہاڑ کے دامن میں ہے وہ خیف ہے خیف بنی کنانہ ایک مقام ہے جہاں ایک مرتبہ حضورِ نبی کریم نے بھی نزول اور قیام فرمایا تھا۔ اسی طرح خَیف سَلّام (بہ تشدید لام) خیف الحمراء، خیف الجبل، خیف ذی القبر خیف النعم بھی مختلف مقاموں کے نام ہیں۔

(۲) عرفات، مکّہ سے بارہ میل پر ایک مقام ہے جہاں بیت اللہ کے حاجی عرفہ (یعنی ذوالحجہ کی نویں تاریخ) کو ٹھہرتے ہیں۔ عرفات کے نام کے لئے مختلف وجہیں بتائی جاتی ہیں، جو بہت دلچسپ ہیں: (ا) یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت جبریل عم نے حضرت ابراہیم عم کو حج کے قاعدے بتائے تھے، اور اس دوران میں جب وہ انھیں عرفہ پر لے کے پہنچے تو اُن سے پوچھا "تم نے یہ جگہ پہچان لی (عَرَفتَ)" اُنھوں نے کہا ہاں۔ اس لئے اس جگہ کا نام عرفہ (عرفات) ہوگیا (ب) یہ وہ جگہ ہے جہاں آدم و حوّا عم جنت سے نکل کر جُدا ہونے کے بعد آپس میں ملے تھے اور ایک دوسرے کو پہچانا تھا (تعارفا) (ج) یہ وہ جگہ ہے جہاں لوگ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں (د) وہاں تک پہنچنے میں لوگ صبر کرتے اور تکلیف اُٹھاتے ہیں عُرف کے معنی صبر کے ہیں۔ اس لفظ (عُرف) کے بارے میں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عُرف عربی میں ہر اونچی اور اٹھی ہوئی جگہ کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع اَعراف ہے، اور یہی اَعراف قرآن مجید میں مذکور ہے[1]

(۳) مُزدَلِفہ وہ جگہ ہے جہاں حاجی لوگ رات بسر کرتے ہیں اور عرفات سے نکل کر وہاں با جماعت نماز ہوتی ہے۔ یہ مقام "مشعرِ حرام" شمار ہوتا ہے امام وہاں عشاء، مغرب اور فجر کی صلوٰۃ ادا کراتا ہے اس مقام کی وجہِ تسمیہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ (ا) اِزدِلاف کے

[1] یاقوت حموی: معجم البلدان از برعرف [2] سرکار حسرت نے اپنے شعر میں اسکا تلفظ لؔ کے سکون سے کیا ہے، حالانکہ یہ لؔ مکسور ہے۔ مگر "شاعر" کو ان تصرفات سے کون روک سکتا ہے؟ فرما دیں گے "میں اسے جائز سمجھتا ہوں، محرّدتی!" سلمنا۔

معنی ہیں اکٹھا ہونا۔ یہاں سب جمع ہوتے ہیں اس لئے مزدلفہ نام ہوا۔ (ب) ازدلاف کے دوسرے معنی قریب ہونا ہیں۔ یہاں انسان اللہ سے قریب ہوجاتا ہے۔ (ج) یہاں عشاء کی نماز میں سب اکٹھے ہوتے ہیں: زلف اللیل کے معنی رات کو اکٹھا ہونا ہیں (د) آدم اور حوا عم عرفات میں ایک دوسرے کو پہچاننے سے پہلے یہاں ملے تو تھے مگر اکٹھے نہیں ہوتے تھے، ملے ضرور تھے! (ہ) یہاں سے حاجی لوگ سب ایک دم سے (زُلفۃً واحدۃً) اکٹھے ہوکر نکلتے ہیں۔ واللہ اعلم!

(۴) مِنیٰ — صحیح املا مِنیٰ — اس وادی میں ہے جہاں حاجی لوگ "رمی جمار" کرتے ہیں۔ اس کی وجوہ تسمیہ ملاحظہ ہوں: (ا) یہاں خون بہائے جاتے ہیں (یُمنیٰ بہ) (ب) حضرت آدم عم نے یہاں پہنچ کر جنّت کو واپس جانے کی تمنّا کی تھی۔ (ج) یہاں مینڈھے کو ذبح کیا جاتا ہے، (مُنِیَ بہ)

حسرت کے کلام میں مکّہ اور مدینہ کے نام بھی آئے ہیں۔ مگر ہم ان سے اس خیال سے صرف نظر کرتے ہیں کہ یہ اس قدر معروف، مشہور اور واضح ہیں کہ خاص شرح و بیان کے محتاج نہیں ہیں۔ البتہ کربلا کا ذکر اہمیت اور تبرک سے خالی نہیں ہے۔

کَربَلا

جن کے روضے پہ رحمتِ حق کا
رور ہوتا ہے کربلا میں نزول (ص ۲۰۱)

عربی میں اس نام کے آخر میں ہمزہ بھی بولا جاتا ہے مگر بلا ہمزہ بھی مستعمل ہے۔ شہر کوفہ کے قریب دریائے فرات کے مغربی کنارے پر ایک مقام کا نام ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ میں کَربَلہ (دو پاؤں کے مابین کشادگی — یعنی یہ کہ وہاں کی زمین ڈھیلی ڈھالی سی ہے) — اور گیہوں صاف کرنا (یعنی وہاں کی زمین میں کنکریاں نہیں ہیں) سے مدد لی گئی ہے۔ پھر کربل ایک گھاس کا نام بھی ہے جو شاید اس علاقے میں کثرت سے ہوتی ہے۔ روایت[1] ہے کہ جب

[1] یاقوت، المعجم، زیر کربلا،

سرکار امام حسین رضی اللہ عنہ یہاں پہنچے تو آپ نے کسی سے پوچھا کہ اس سرزمین کا کیا نام ہے؟ اس نے کہا: عَقر۔ آپ نے فرمایا، اللہ عَقر سے بچاتے رکھے۔ آپ نے پھر پوچھا کیا نام ہے؟ کہا گیا کربلا آپ نے فرمایا: یہ کَرب و بَلا کی سرزمین ہے، اور وہاں سے تشریف لے جانا چاہا۔ مگر آہ، کہ یوں مقدر نہ تھا۔ اور دسویں محرم (سنہ ۶۱ ہجری) نے وہ دردناک نظارہ دیکھا جو تاریخ انسانی میں اللہ نہ کرے کہ پھر دہرایا جاتے نعوذ باللہ منہا۔

اس زمیں کی کارسازی کے بعد آیئے اب ذرا آسمان بردازی بھی کریں، جہاں حسرت کا آسمان ساخیال پہنچا ہو پہلے باغ نعیم کی سیر کی جائے:

باغِ نعیم

میں بھی اُمیدوار ہوں باغ نعیم کا
آخر گناہگار ہوں کیسے کریم کا (ص ۲۸۲)

یہ قرآن مجید کی اصطلاح "جنۃ نعیم" کا فارسی ترجمہ ہے، یعنی نعمت کا باغ۔ قرآن شریف میں یہ کئی طرح سے وارد ہے: (ا) جنت نعیم: واقعہ ۸۹، معارج ۳۸۔ (ب) "جنۃ النعیم: شعرا ۸۵ (ج) جمع کے صیغے میں، جنات النعیم: مائدہ ۶۵، یونس ۹، لقمان ۸، صافات ۴۳، حج ۵۱، واقعہ ۱۲، نون ۳۴۔ (د) جنات و نعیم: طور ۱۷، (ہ) محض نعیم کا ذکر: توبہ ۲۱، تطفیف ۲۲، انفطار ۱۳، انسان ۲۰۔ عالم لوگوں نے قرآن کریم کو غور سے مطالعہ کرنے کے بعد اُس میں سے اُس جگہ کے، جسے قدیم ایرانی (زرتشتی) "بہشت" کہتے تھے، آٹھ نام نکالے ہیں، اور سب کو ملا کے "ہشت بہشت" (آٹھ بہشتیں) کہتے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک "جنت نعیم" بھی ہے ہشت بہشت کے نام یہ ہیں: خُلد، دارالسلام، دارالقرار، جنت عدن، جنت الماویٰ، جنت النعیم، فردوس، اور علیّون۔

"بہشت" میں تین چشمے ہیں۔

تسنیم، سلسبیل، کوثر

جلوۂ حق سے بے خبر زاہد
محوِ تسنیم و سلسبیل ہیں سب (ص ۶۴)

طالبِ کوثر و تسنیم جو ہوں حضرت شیخ
خواہشِ بادہ کی توہین گوارا نہ کریں (ص ۱۳۱)

کفیل تھا کرمِ حق جو مے گساروں کا
ہجوم ہے لبِ کوثر گناہ گاروں کا (ص ۱۵۰) اور

اس قدر تاکید کیوں ترکِ مے و ساغر میں ہے
محتسب خود بھی تو فکرِ جنت و کوثر میں ہے (ص ۴۲)

یہ تینوں نام قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں۔

(۱) تسنیم۔ قرآن شریف میں صرف ایک مقام پر مذکور ہے سورہ تطفیف میں "جنت" کے ایک تمثیلی بیان میں "مُہر کی ہوئی خالص شراب" کے بارے میں فرمایا ہے کہ "اس کی ملونی تسنیم سے ہے: وہ ایک چشمہ ہے جس سے مقرب بندے پئیں گے (آیت ۲۷-۲۸) علماء کا بیان ہے کہ اللہ کے خاص مقرب بندوں کو تو اس چشمے کا پانی خالص حالت میں پینے کو دیا جاتے گا، مگر اور اہل جنت کے لئے ملونی کر کے دیا جائے گا تسنیم ایک خاص قسم کی پینے کی چیز (شراب) ہوگی۔

(۲) سلسبیل: اس چشمے کا ذکر بھی صرف ایک جگہ وارد ہوا ہے۔ سورہ انسان میں جنت کے انعامات کے بیان میں ہے کہ اہل جنت کو "ایسا جام پلایا جائے گا جس میں سونٹھ (زنجبیل) ملی ہوئی ہوگی، ایسے چشمے سے جس کا نام سلسبیل ہوگا" (آیت ۱۷-۱۸) اس نام کی تشریح میں کہا جاتا ہے کہ اس چشمے کا پانی صفائی اور سلاست کے ساتھ جاری ہوگا برابر لگاتار (سلسلہ وار) بہتا ہوگا، پینے والے جدھر چاہیں اسے پھیر دیں گے، پیتے ہوئے یہ پانی حلق میں سے آسانی (سلاست) کے ساتھ پیٹ میں جائے گا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے یہ مرکب لفظ ہے: سَل (پوچھ لے) اور سبیل (راستہ) سے مل بنا ہے، یعنی اے مومن تو اللہ تک پہنچنے کا راستہ دریافت کر لے! اب اللہ تک پہنچنے اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھا

لہ یہ تاریخ سنہ ۶۸۰ء کی دسویں اکتوبر کے مطابق ہے۔ کربلا شریف کا عرض بلد تقریباً جموں (کشمیر) کا سا ہے۔ اس موسم میں اور پھر دریا کے کنارے، جو سردی کا عالم ہوگا اس کا تصور مشکل نہیں ہے۔ مگر جب تک ہمارے اردو شاعروں کو یہ خبر ملی ہے تب تک گرمی بلا کی پڑنے لگی تھی، مجبوراً انھوں نے لو، ... بگولوں کا ذکر فرما کر ہزاروں صفحے سیاہ کر دیئے، جن میں روشنی طبع بھی کارگر نہیں ہوتی۔

کا ذکر آیا ہے، واللہ اعلم۔

(۳) کوثر: اس کے لفظی معنی بہت زیادتی "کثرت" کے ہیں، یعنی ہر قسم کے مال اور جاہ و برکت اور رحمت کی زیادتی اور بہتات۔ اس کا ذکر صرف سورہ کوثر (پہلی آیت) میں ہے۔ "ہم نے تجھے کوثر دیا۔" کہتے ہیں کہ جنت میں ایک چشمہ ہے، جس کی صفات یہ ہیں کہ قیامت کے روز جب آدمی "پل صراط" کو پار کر کے ادھر پہنچیں گے اور انہیں پیاس لگے گی تو کوثر کا پانی پینے کو ملے گا۔ وہ ایسا بڑا حوض ہے کہ ایک مہینے چلنے کی راہ ہے۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ شیریں، مشک سے زیادہ خوشبودار ہوگا۔ اور جتنے آبخورے اس میں وہ سامان کے گا وہ ایسے ہوں گے جیسے آسمان کے تارے، جو کوئی ایک دفعہ اس کا پانی پی لے گا پھر کبھی پیاسا نہ ہوگا، مگر وہ سوا مومنوں کے کسی کو نہ ملے گا!

یہ سب نعمتیں اور انعام ان کے لئے ہیں جو "راہِ صبر و حق" پر چلتے ہیں۔

راہِ صبر و حق

جنت بڑا دو رکہیں راہِ صبر و حق کی تلاش

ہر کیا سامنے ہے جنت تو کہا سلام علیک (ص ۱۷)

اس میں قرآن کریم کی آیت شریفہ (عصر ۳) "اور ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے کی نصیحت کرتے رہو اور ایک دوسرے کو صبر (استقلال سے کام کرنے اور لڑنے) کی نصیحت کرتے رہو۔"

اور جو لوگ یہ نہیں کرتے، اور قوانین الہیہ کی خلاف ورزی کرتے ہیں، ان کے لئے سقر ہے۔

سَقَر

نہ کچھ فکرِ جناں رکھی نہ کچھ خوفِ سقر رکھا
خیالِ یار نے دل کو یہاں تک بے خبر رکھا (ص ۵۱)

عالم لوگوں نے جس طرح قرآن مجید سے جنت کے آٹھ نام نکال لئے ہیں اسی طرح "دوزخ" کے بھی سات نام نکال کر "ہفت دوزخ" تیار کیا ہے۔ ان سات دوزخوں کے نام ہیں:۔ سَقَر، سَعیر، لَظیٰ، حُطَمَہ، جَحیم، جَہنّم، اور ہاویہ۔ سقر آگ کا نام ہے۔ دوزخ کے اس نام کے بارے میں دو روایتیں ہیں[1] (۱) سقر ایک عجمی نام ہے جس کا اشتقاق معلوم نہیں ہے۔ (۲) سقر نام اس لئے رکھا گیا کہ اس کے معنی پگھلانے کے ہیں۔ قرآن مجید میں چار جگہ یہ "نام" وارد ہوا ہے: تین دفعہ سورہ مدثر میں (آیت ۲۶-۲۷، ۴۲) اور ایک جگہ سورہ قمر (آیت ۴۸) میں۔ مدثر (۲۷-۳۰) میں اس کا حال یہ بتایا گیا ہے کہ "نہ تو وہ باقی رہنے دیتی ہے نہ چھوڑتی ہے، اور جھلس کر جلد بگاڑ دیتی ہے اور اس پر انیس (۱۹) ہیں، یعنی قوائے انسانی) مقرر ہیں۔"

مقام و مکان سے گذر کر اب ہم زمان میں آتے ہیں:۔

زمانِ رحمتِ حق

اے زمانِ رحمتِ حق الفراق!
اے محبِ اہلِ عصیاں الوداع! (ص ۱۹)

شاعر نے اس سے رمضان کا مہینہ مراد لیا ہے۔ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں، خود بقول قرآن مجید کے، قرآن نازل ہوا ہے (بقرہ، ۱۸۵) اور قرآن شفا، ہدایت اور رحمت ہے۔ لہٰذا رمضان کا زمانہ رحمتِ حق کا زمانہ ہے۔

شبِ اسرا، شبِ معراج

در بردہ جو شد بہ شبِ اسرا
فاق الرسلا فضلاً و علا (ص ۲۲۳)

شبِ معراجِ مردانِ خدا ہے
بقولِ شیخ، روزِ نامرادی (ص ۱۷۷)

شبِ اسرا قرآن مجید میں سورہ بنو اسرائیل کی پہلی آیت میں یوں مذکور ہے: "پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے (محمد صلعم) کو شب کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک، جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں کر رکھی ہیں، لے گیا، تاکہ ہم اسے اپنے کچھ عجائبات قدرت دکھا دیں۔ بے شک وہ (اللہ) بڑا سننے والا بڑا دیکھنے والا ہے۔" اسی کو شبِ معراج بھی کہتے ہیں۔

روزِ جزا

حسرتِ غلام شافع روزِ شمار ہے کب سے فکر پرستشِ روزِ جزا کی ہے (ص ۲۹۸)

---

[1] یاقوت، المعجم، زیر سقر۔

روزِ جزا قرآن کریم کے الفاظ یوم الدین کا فارسی ترجمہ ہے
یوم الدین قرآن مجید کی سب سے پہلی سورت (فاتحہ) کے شروع ہی میں مذکور ہے، جہاں اللہ کی صفت میں رب العالمین، الرحمٰن الرحیم اور یوم الدین کا مالک فرمایا گیا ہے۔ اس کے بعد شعراء ۸۲، صافات ۲۰، ذاریات ۱۲، واقعہ ۵۶ اور انفطار ۱۵، ۱۷۔ ۱۸ میں آیا ہے۔ سورہ ذاریات میں ہے: "وہ (یعنی دروغ باف کافر لوگ) پوچھیں گے کہ روزِ جزا کب ہوگا؟" فوراً ہی اس کا جواب ہے (آیت ۱۳): "اس دن جب ان لوگوں کو آگ پر تاپا جائے گا!" سورہ انفطار میں فرمایا ہے کہ "بدکار لوگ جہنم میں ہوں گے، جس میں وہ روزِ جزا کو جلیں گے، اور اس سے باہر نہیں نکلیں گے! اور تم کیا سمجھے کہ روزِ جزا کیسا ہوگا؟ (اور ہم) پھر (پوچھتے ہیں) کہ تم کیا سمجھے کہ روزِ جزا کیسا ہوگا؟ وہ ایسا دن ہوگا کہ کسی کا کسی کے لئے کچھ بس نہ چلے گا، اور اس روز حکومت اللہ ہی کی ہوگی!" (آیت ۱۴۔ ۱۹)

صبر و صلوٰۃِ عشق

صبر و صلوٰۃِ عشق سے ہیں سب کے دل قوی
ثابت قدم ہیں سلسلۂ مریدانِ اولیا (ص ۹۷)

یہ قرآن مجید کی اُن آیتوں کی طرف اشارہ ہے جن میں ارشاد ہوا ہے کہ "صبر اور صلوٰۃ سے مدد لو" (بقرہ: ۴۵، ۱۵۳)۔

صبغۃ اللہ

ہر سو عیاں ہے صبغۃ اللہ کی بہار
رونق پہ ہے خزاں میں بھی بستانِ اولیا (ص ۹۷)

قرآن مجید کی ایک آیت میں ہے کہ ہمارے دین کا رنگ (حال، صبغۃ) "اللہ کا رنگ ہے، اور اللہ کے رنگ سے بہتر کون ہے؟ اور ہم اسی کی پوجا کرتے ہیں!" (بقرہ، ۱۳۸)
اللہ کی خالص عبادت کرنے والوں کی شان یہ ہے کہ: لاخوف علیہم ولاہم یحزنون۔

لاخوف علیہم یحزنون

اہلِ ایماں رکھتے ہیں کامل بہ فتوائے جنوں
شانِ لاخوف علیہم شیوۂ لایحزنون (ص ۱۳۰)

قرآن شریف میں کئی جگہ مومنوں کی یہ شان بیان ہوئی ہے کہ "ان کے لئے کوئی خوف نہیں، اور نہ وہ غم زدہ ہوتے ہیں!" چنانچہ یہی فقرہ ان موقعوں میں دہرایا گیا ہے۔ بقرہ ۳۸، ۶۲، ۱۱۲، ۲۶۲، ۲۷۴، ۲۷۷، آل عمران ۱۷۰، انعام ۴۸، اعراف ۳۵، یونس ۶۲، احقاف ۱۳۔

وعدۂ لیعطیک

ہر دم رضائے یار سے نزدیک ہم رہے
اُمیدوارِ وعدۂ لیعطیک ہم رہے (ص ۲۴۴)

وعدۂ لیعطیک (یہ وعدہ کہ وہ تجھے دے گا) میں قرآن مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ نے حضرت رسول کریم صلعم سے یوں وعدہ فرمایا ہے کہ عن قریب تیرا رب تجھے دے گا، اور تو خوش ہوجائے گا!" (ضحیٰ ۵)

عین الیقین، حق الیقین

حسنِ بتاں سراج طریق صفا بنا
حق الیقین تک آگئے ہیں عین الیقین سے ہم (ص ۲۷۲)

(۱) قرآن شریف نے دُنیا کی دولت اور نعمتوں کو جمع کرکے رکھنے والوں اور ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے اور ڈینگیں مارنے والوں کو مخاطب کرکے ایک جگہ فرمایا ہے کہ "تم لوگ ضرور ضرور آگ کی جلن دیکھو گے! ہاں تم ضرور ضرور پورے یقین کے ساتھ اپنی آنکھ سے اسے دیکھو گے!" (تکاثر ۶۔ ۷)
(۲) اسی طرح ایک مقام پہ آگ کی جلن کے لئے فرمایا ہے: "بے شک یہ ضرور سچے یقین کی بات ہے!" (واقعہ ۹۵)
مگر گمراہ (ضالین) اور غضب زدہ (مغضوب) لوگ ان باتوں کو کیوں ماننے لگے۔!

ضالین و مغضوب

ما گام زن صراطِ عشقیم
دور از راہ ضالین و مغضوب (ص ۲۴۰) اور

فتنہ جور نہ کرنا مجھے یارب ان کا
جن کو گمراہ کیا تو نے کہ مغضوب کیا (ص ۱۲۳)

یہ اشارہ ہے سورۂ فاتحہ کے آخری جملے کی طرف جس کے

الفاظ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین بہت معروف ہیں۔ دُعا یہ ہے کہ اے اللہ تو ہمیں سیدھا راستہ (صراطِ مستقیم) دکھا، اُن لوگوں کا راستہ جن کو تو نے نعمتیں دی ہیں، اُن کا نہیں جن پر تو نے غضب کیا ہے اور جو گمراہ ہوگئے ہیں۔"

اب حسرت کی چند تلمیحات ہی باقی رہ گئی ہیں اور یہ معاملہ پایانِ کو پہنچ رہا ہے حقیقت میں تو یہ کام کسی عیسیٰ نفس کے کرنے کا تھا جس کے دمِ قلم سے بیان میں جان پڑجاتی۔ مجھ ظلوم و جہول سے جیسا کچھ بن پڑا رہی ہے تمام قصور کے اعتراف کے ساتھ ان صفحوں میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ اُمید کہ ناظرین کرام میری لغزشوں اور کوتاہیوں سے غضِ بصر فرمائیں گے مگر دُعائے مضطر تو اللہ ہی سُنا کرتا ہے، لہٰذا استغفر اللہ اس حقیقی ناظم و کاتب کی بخشش سے مایوس نہیں ہوں جس نے لا تقنطوا فرمایا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اُسی کی توفیق شاملِ حال تھی ورنہ ایسا بھی کیوں کر ہوتا۔ وللہ الحمد!

عیسیٰ نفس

حسانِ جہاں کو اُن کے ہوتے میں نہ چاہوں گا
کوئی عیسیٰ نفس کیوں ہو کوئی یوسف لقا کیوں ہو (ص ۱۴۹)

قرآنِ عظیم کی سورۃ مائدہ میں حضرت عیسیٰ ابن مریم کو جنابِ خالقِ کائنات جل جلالہٗ کی طرف سے یاد دلایا جا رہا ہے کہ ہم نے تجھے اور تیری ماں کو نعمتیں دیں، تجھے پاک نفس بنایا، مقرر اور خطیب بنایا، حکمت اور توریت و انجیل تجھے سکھائی، اور یاد ہے "جب تو گارے سے ایک پرندے کی سی شکل بناتا تھا میرے حکم سے، پھر تو اس میں پھونک مار دیتا تھا اور وہ شکل میرے حکم سے پرندہ بن جاتی تھی! . . . ." (۱۱۳)

انجیلِ مقدس میں مریضوں کا چنگا کرنا اور مُردوں کو جِلانا تو مذکور ہے، مگر محض دم سے ایسا کرنا مذکور نہیں ہے۔ یہ دمِ عیسیٰ قرآن ہی کی بخشی ہوئی کرامت ہے۔

ظلوم و جہول

نہ کیا بارِ غم کسی نے قبول
غیر انساں کہ تھا ظلوم و جہول (ص ۲۰۰)

ظلوم و جہول (بڑا ظالم یعنی غلط کار، اور بڑا جاہل) قرآنِ مجید نے انسان کو قرار دیا ہے۔ سورہ احزاب کی آخری آیتوں میں فرمایا ہے کہ "ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کو پیش کیا۔ انھوں نے اس میں خیانت کرنے سے انکار کیا، اور وہ اس (خیانت) سے ڈر گئے۔ اور انسان نے اس (امانت) میں خیانت کی۔ بے شک وہ بڑا ہی ظالم بڑا ہی جاہل ہے۔" (۷۲)
اللہ نے جس بار کو امانت فرمایا ہے، ہمارے شاعر نے اسے غم بتایا ہے، صرف یہ فرق ہے۔

مسئلۂ غضِ بصر

اب کہے کوئی کہ ہم اہلِ نظر جائیں کہاں
ہر طرف مسئلۂ غضِ بصر ہی در پیش (ص ۱۰۳)

"نگاہ نیچی رکھنے کا مسئلہ" قرآن شریف کی سورۂ نور میں وارد ہوا ہے عورتوں کے پردے کے مسئلے اور بحث میں یہ آیتیں ہمیشہ معرضِ گفتگو میں آتی ہیں۔ ارشاد ہوا ہے کہ "مومن مردوں سے کہہ دے کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ اُن کے لئے زیادہ پاکیزگی کی بات ہے۔ بے شک اللہ خوب جانتا ہے کہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ اور مومنہ عورتوں سے کہہ دے کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا سنگھار ظاہر نہ کریں سوا ایسے حصّوں کے جو کھلے رہتے ہیں۔" (۳۰-۳۱)

دُعائے مضطر

فریادِ غم نہیں ہے میری دُعائے مضطر
اب نام بھی نہ لوں کیا میں ناصبور تیرا؟ (ص ۵۸)

بے قرار آدمی کی پکار (دُعا) قرآنِ مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے: "وہ جو بے قرار آدمی کی سُنتا ہے جب کہ وہ اسے پکارتا ہے اور وہ اس کی مصیبت دور کرتا ہے، اور تم کو زمین میں جانشین کرتا ہے، کیا (اس) اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ مگر تم لوگ بہت ہی کم یاد رکھتے ہو!" (نمل، ۶۲)

استغفر اللہ

میں اور دِلائے کفارِ گم راہ
استغفر اللہ، استغفر اللہ! (ص ۸۰)

کلمہ استغفر اللہ (میں اللہ سے بخشش گناہ چاہتا ہوں) سے ہر مسلمان واقف ہے۔ اللہ سے خطاؤں اور لغزشوں کی بخشش مانگنے کا حکم قرآن شریف میں کئی جگہ آیا ہے: "میں اپنے رب سے تمہارے لئے بخشش مانگوں گا" (یوسف ۹۸) ابراہیم علیہ السلام نے کہا: "تم پر سلام ہو، میں ابھی اپنے رب سے تیرے لئے بخشش مانگوں گا۔" (مریم ۴۷) داؤد نے "..... اپنے رب سے بخشش مانگی اور سجدے میں گر گیا اور توبہ کی" (ص ۲۴) رسول کریم صلعم کو حکم ہوتا ہے: "اور اللہ سے بخشش مانگ، وہ بڑا بخشنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے" (نساء ۱۰۶) اور "اپنے رب کے حکم پر عمل کر اور اس سے بخشش مانگ" (نصر ۲) مومنوں کو حکم ہے کہ "اپنے رب سے بخشش مانگو اور توبہ کرو" (ہود ۶۱، ۹۰) اسی طرح استغفار کا ذکر قرآن کریم میں ستائیس جگہ پر موجود ہے۔ اسی سے استغفر اللہ (بصیغہ متکلم، مضارع) یہ کلمہ بن گیا ہے۔

لا تقنطوا

نہ کھولا گھر کے اعدا میں بھی حسرت
ترے فرمودۂ لا تقنطوا کو (ص ۱۳۳)

لا تقنطوا (تم مایوس مت ہو) قرآن مجید کے الفاظ ہیں۔ سورہ زمر (آیت ۵۳) میں ارشاد ہوا ہے: "اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو، بے شک اللہ سب گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، وہ تو بڑا بخشنے والا رحیم ہے!"

توفیق الٰہی پر ہمارے شاعر نے خوب فرمایا ہے کہ (رباعی)

ہو کر ہی رہا ہمیشہ میرا چاہا
جب جو، مرے دل نے اس سے چاہا چاہا
توفیق اسے کہتے ہیں کہ چاہا بھی وہی
میں نے، جو کچھ اس نے مجھ کو دینا چاہا (ص ۲۳۵)

یہ رباعی قرآن کریم کی اُس آیت کا لاجواب ترجمہ اور اس کی لاثانی تشریح ہے، جس میں ارشاد ہوا ہے: ماتشاؤن الّا أن یّشاء اللہ۔ یہ دو جگہ وارد ہے: (۱) سورۃ الانسان میں، "اور تم نہیں چاہتے ہو، مگر یہ کہ اللہ چاہتا ہے۔ بے شک اللہ بڑا جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے" (آیت ۳۰) (۲) سورۃ تکویر میں "اور تم نہیں چاہتے ہو، مگر یہ کہ اللہ چاہتا ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے" (آیت ۲۹)

للہ الحمد

پھر تری یاد ہوئی موجب آرائش دل
للہ الحمد پھر آباد یہ ویرانہ ہوا (ص ۶۱)

یوں تو کلمہ الحمد للہ قرآن مجید میں کم و بیش اکیس جگہ پر وارد ہوا ہے، مگر کلمہ للہ الحمد سورۃ جاثیہ (آیت ۳۶) میں آیا ہے: "بات یوں ہے کہ سارا حکم (اور سب تعریف) آسمانوں کے پروردگار، اور زمین کے پروردگار، اور تمام جہانوں کے پروردگار کے لئے ہے"

اس نظم میں......

اس کتاب کی جدت اس کے نام سے شروع ہو جاتی ہے۔ میراجی اُردو کی جدید شاعری کے سب سے ممتاز شاعر ہیں انہوں نے اس کتاب میں ایک نقاد کی حیثیت سے بتایا ہے کہ جدید اُردو شاعری کیا ہے؟ اس سوال کا جواب میراجی سے بہتر اور کوئی نہیں دے سکتا۔ انہوں نے اس موضوع پر برسوں غور کیا ہے اور وہ اس صف اول کے جدت طراز شاعر ہیں۔ اُردو کی تقریباً پچاس جدید نظمیں انتخاب کر کے میراجی نے ان پر اس طرح تبصرہ کیا ہے کہ اِنکے مفہوم کے ساتھ ساتھ ان کی فنی باریکیاں اور خوبیاں بھی ذہن نشین ہو جاتی ہیں۔ آپ چاہے جدید اُردو شاعری کے مخالف ہوں چاہے موافق، اس کتاب کے مطالعہ کے بغیر جدید شاعری کے محاسن یا معائب سے آپ کما حقہ واقف نہیں ہو سکتے۔

اِس حد درجہ ضروری موضوع پر اب تک کوئی ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔

مجلّد اور جلد پوش سے آراستہ۔

قیمت دو روپے آٹھ آنے (عہ/۲) علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ:۔

ساقی بک ڈپو، دہلی،

پریم پجاری

سچی کہانی

"نیا ادب زندہ باد"

(نوٹ۔ بعض اشخاص اور مقامات وغیرہ کے نام فرضی ہیں)

پچھلے سال ایک ضرورت سے مجھے رانچی جانا پڑا۔ وہاں میرے ایک دوست ہیں مسٹر ریاض احمد، رانچی کے ہر دل عزیز وکیل انہیں کے یہاں قیام کیا۔ خدا جانے کیا سبب ہے؟ ہمت سے مجھے دیوانوں کے ساتھ ایک خاص دل چسپی ہے اِس بنا پر آپ کا جی چاہے تو مجھے بھی دیوانہ سمجھ لیجئے۔

ایک دن میں نے ریاض صاحب سے کہا کہ کھتا آسانی سے ممکن ہو تو یہاں کے [illegible] دماغی ہسپتال (یا پاگل خانہ دیگر پاگل خانہ) کی سیر کرا دیجئے اُنہوں نے کہا اچھا پرسوں چلیں گے ہمارا بھی ایک بدنصیب دوست وہاں ہے تیسرے دن ہم لوگ وہاں گئے۔ ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر اسٹرلنگ سے ریاض صاحب کی خاص دوستی تھی۔ اُنہوں نے ہمیں خوب سیر کرائی طرح طرح کے پاگل دیکھے مرد بھی عورتیں بھی۔ بوڑھے بھی، جوان بھی، کچھ کپڑے پہنے ہوئے کچھ نیم برہنہ کچھ بالکل ننگے اُن کی طرح طرح کی باتیں بھی سُنیں اکثر سراپا، کچھ سنجیدہ، کچھ بظاہر دانشمندانہ۔ ایک وارڈ کے سامنے سے جب ہم گذر رہے تھے تو ریاض صاحب نے کہا "چلئے اب آپ کو اپنے دوست رشید سے ملائیں"۔ رشید کا کمرہ قریب ہی تھا ہم وہاں پہنچے آہ کتنا خوبصورت جوان جو خوبصورت بھی، خوش اندام بھی۔ آنکھیں بلا کی جاذب مگر چہرہ حسرت و اندوہ کا مرقع۔ بکھرے ہوئے بال، بڑھا ہوا خط، پھٹے ہوئے کپڑے۔ بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ اپنے خیالات میں غرق، دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہم پاس جا کھڑے ہوئے اُس نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ریاض صاحب نے نام لے کر پکارا تو چونکا پھر کھڑا ہو گیا اور چلا کر کہا۔

"وہ مارا! قسم خدا کی وہ مارا! ریاض بھائی میں کامیاب ہو گیا۔ واللہ کامیاب ہو گیا۔ آگئی مچھلی جال میں۔ بس پھنسی ہی سمجھو۔ اب کہاں جائے گی بچ کر۔ فرائڈ زندہ باد۔ نیا ادب زندہ باد۔ میں نے اُسے خط لکھا ہے۔ یہیں آئے گی دوڑتی ہوئی۔ دیکھ لینا تم"۔ پھر خط اُٹھا کر ریاض صاحب کو دکھایا۔ میں نے بھی دیکھا چند بے ربط اور ٹوٹے پھوٹے جملے لکھے تھے۔ ریاض صاحب نے کہا ماشاء اللہ بہت خوب لکھا ہے۔ پھر خدا جانے اچانک کیا اُس کے جی میں آئی دوات اُٹھا کر دیوار سے دے ماری۔ خط ریاض صاحب کے ہاتھ سے چھین کر پُرزے پُرزے کر ڈالا۔ ریاض صاحب نے آہستہ سے کہا اس کا جنون تیز ہو رہا ہے۔ اب یہاں ٹھیرنا مناسب نہیں ہم چلے آئے

راستے میں میں نے ریاض صاحب سے کہا "قدرت کی ستم ظریفی دیکھنا چاہئے ایسا خوب رُو جوان اور اس طرح برباد"۔ ریاض صاحب نے اندوہناک لہجہ میں کہا "ہاں بھائی قدرت کے بھید کون جانے"۔ میں نے پوچھا آخر یہ دیوانہ ہوا کیونکر؟ اُنھوں نے کہا یہ بڑی دُکھ بھری کہانی ہے گھر چل کر اطمینان سے سُناؤں گا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ میں نے کہا ہاں ریاض صاحب وہ رشید کا قصہ تو سُنائیے۔ رشید کا نام سُن کر ریاض صاحب کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ وہ آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے، اُٹھ کر بیٹھ گئے اور اس طرح کہنا شروع کیا:-

"جس وقت ابّا کی بدلی الہ آباد کی ہوئی اُنہوں نے ہم سب لوگوں کو بھی وہیں بُلا لیا۔ اور مجھے اسکول میں داخل کرا دیا۔ وہیں رشید سے ملاقات ہوئی۔ میں اور وہ چھ برس ہم سبق رہے۔ دو برس اسکول میں، چار برس کالج اور یونیورسٹی میں۔ ساتھی تو ہمارے اور بھی بہت تھے مگر رشید جیسے ذہین، شوخ، طرار اور ہنس مکھ انسان میں نے کم ہی دیکھے ہیں جیسی اچھی صورت، ویسی ہی اچھی سیرت۔ ہم دونوں

کے مذاق بالکل جداگانہ تھے۔ وہ شعر و سخن کا عاشق۔ ادبیات کا پرستار۔ اور میں سائنس کا طالب علم پھر بھی خدا جانے کیوں ہم دونوں میں بے حد خلوص ہو گیا تھا۔

رشید ابھی بچہ ہی تھا کہ اُس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا انہوں نے اپنی یادگار چھوڑے۔ بڑی بہن سعیدہ رشید سے عمر میں بہت بڑی تھیں۔ ماں کے مرنے کے بعد انہیں نے رشید کو پالا۔ مگر چند سال بعد لاہور کے ایک رئیس خان بہادر میاں عبدالحکیم سے اُن کی شادی ہو گئی اور وہ اپنے گھر چلی گئیں۔ خدا کی شان، برسوں اولاد کے لئے ترستی رہیں لیکن اُن کی گود نہ بھری۔ آخر بڑی منتوں مُرادوں کے بعد، شادی کے پانچویں سال خدا نے انہیں ایک بیٹی عنایت کی۔ مگر اس ننھی گڑیا نے ابھی مُسکرانا بھی نہ سیکھا تھا کہ وہ خود چل بسیں۔ میاں صاحب کے لئے ننھی بچی کا سنبھالنا مصیبت ہو گیا۔ مرحومہ کی وفات کے دو مہینے بعد ہی اُنہوں نے رشید کی دوسری بہن راشدہ سے شادی کا پیغام دے دیا۔

میاں صاحب عمر میں راشدہ سے بہت بڑے تھے راشدہ کی اس وقت مشکل سے اُنیس سال کی تھی اور میاں صاحب کا سن چالیس کے پار۔ اس بنا پر رشید کے والد اس رشتے پر راضی نہ ہوتے۔ میاں صاحب کو اپنی دولت اور پوزیشن پر بڑا ناز تھا۔ اِس انکار کو اپنی توہین سمجھے اور زندگی بھر کے لئے ان لوگوں سے تعلقات منقطع کر لئے۔

رشید کی ایک خالہ بھی تھیں جو لکھنؤ میں رہتی تھیں۔ وہ رشید کو بہت چاہتی تھیں۔ اُن کی خواہش تھی کہ رشید کی شادی اُن کی لڑکی ربیعہ سے ہو جائے۔ جس وقت میں اور رشید انٹرمیڈیٹ پاس کر کے یونیورسٹی میں داخل ہوئے رشید کی منگنی ربیعہ سے ہو گئی اور طے یہ پایا کہ شادی اُس وقت ہو جب رشید بی اے پاس کر لے۔ ربیعہ اسی سال میٹرکولیشن کا امتحان دینے والی تھی۔ ربیعہ کو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اُس کی تصویر دیکھی تھی۔ خاصی قبول صورت لڑکی تھی۔ رشید نے اُسے بارہا دیکھا تھا۔ بارہا اُس سے ملا تھا۔ وہ شروع ہی سے اُسے پسند کرتا تھا اور اب اِس خیال سے مسرور تھا کہ دو سال بعد ربیعہ اُسکی رفیقِ زندگی بن جائے گی۔

منگنی ہو جانے کے بعد خاندان کی رسم کے مطابق رشید سے ربیعہ کا پردہ ہو گیا۔ مگر نام کا پردہ تھا۔ دونوں برابر ملتے تھے، مگر چھُپ چھُپ کر خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ مگر خفیہ طور پر۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رشید کو ربیعہ سے والہانہ محبت ہو گئی۔ مگر یہ خیال اکثر اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا کہ ربیعہ اُسے اُتنا نہیں چاہتی تھی جتنا وہ ربیعہ کو پیار کرتا تھا۔ سال بھر گذر گیا ربیعہ میٹرکولیشن کا امتحان پاس کر کے آئی۔ ٹی کالج لکھنؤ میں داخل ہو گئی۔ اب ہم دونوں بی اے کے آخری سال میں تھے۔ اتفاق سے رشید بیمار ہو گیا اور کئی مہینے تک ربیعہ سے ملنے لکھنؤ نہ جا سکا۔ اس درمیان میں ربیعہ کے خط بھی بہت کم آتے۔ ہر وقت ایک مبہم سا خوف رشید پر چھایا رہنے لگا۔ اکثر مجھ سے کہتا۔ "ریاض بھائی، خدا خیر کرے آثار اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ نہ جانے قدرت کو کیا منظور ہے"۔ میں اُسے تسلی دیتا کہ کچھ بھی نہیں، محض تمہارا واہمہ ہے۔ ربیعہ تمہاری ہے۔ اور شادی میں اب دن ہی ایسے کونسے باقی ہیں۔ چھ مہینے بھی تو نہیں۔

آخر وہ ایک دن لکھنؤ گیا۔ اُسی دن مجھے بھی ایک ضرورت سے وطن (پٹنہ) جانا پڑا۔ لکھنؤ سے اُس نے مجھے جو خط لکھا اسے پڑھ کر میرے ہوش اُڑ گئے۔

یہ کہہ کر ریاض صاحب اُٹھے اندر گئے اور خطوں کا ایک پیکٹ ہاتھ میں لئے ہوئے واپس آئے اس میں سے ایک خط نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔

"ریاض بھائی میں لُٹ گیا۔ تباہ ہو گیا قسمت نے میرے ساتھ دغا کی۔ ربیعہ نے میرے ساتھ دغا کی۔ اب وہ میری نہیں ہو سکتی۔ اُس نے مجھ سے ملنا بھی گوارا نہ کیا۔ کیوں؟ اِس لئے کہ اب اس نے کچھ اور ہی جی میں ٹھانی ہے۔ یہاں مقامی کالج کا ایک پروفیسر ہے احمد کبیر، نئے ادب کا بڑا حامی ہے۔ فرضی نام سے افسانے لکھتا ہے اور بہت عُریاں لکھتا ہے اس کی عُریاں نگاریوں نے جوان لڑکیوں کے جذبات میں آگ لگا دی ہے ربیعہ بھی اسی جال میں پھنس گئی۔ پہلے نادیدہ پرستار ہوئی اور اب "وہ" دیوتا ہے اور یہ پجارن۔ شادی طے ہو چکی ہے۔ خالہ اماں سے بھی اُس نے کہہ دیا ہے کہ کوئی بھی میرے معاملے میں دخل انداز ہوا تو اچھا نہ ہو گا۔ میں ہر انجام کے لئے تیار ہوں۔

کسی کی غلام نہیں کہ اپنی مرضی کے خلاف جس کے دامن سے باندھ
دی جاؤں اُس کے ساتھ ہو لوں۔ دنیا کی کوئی طاقت اب اُسے
اس کے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ میں اپنی حالت کیا لکھوں
حواس کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے۔ ہوش نہیں۔ ایسا محسوس
ہو رہا ہے جیسے میری روح ہی جان نکل گئی ہے۔ دل میں نفرت
انتقام کی ایک آگ بھڑک اٹھی ہے۔ مستقبل کے لئے میں نے ایک
طریق کار سوچ لیا ہے میں بھی وہی کروں گا جو تمہارے کمینے کیا
جو رشید نے کہا۔ شہوانی جذبات کو ابھارنے والے جنسیت
بھڑکانے والے عریاں افسانے لکھوں گا اس طرح نوجوان
لڑکیوں کو اپنی ہوس کاری کے جال میں پھنساؤں گا اور
اپنے نفس کی تسکین کے بعد نہایت بے حسی اور اطمینان کے
ساتھ انہیں رسوائی اور بربادی کے غار میں دھکیل دوں گا۔"

دو ہفتے کے بعد جب میں الہ آباد واپس آیا تو رشید
سے ملاقات ہوئی۔ اب وہ پہلا سا رشید نہ تھا۔ اس کی
شوخیاں افسردگی میں تبدیل ہو گئی تھیں مزاج میں تلخی آ گئی
تھی۔ احباب سے ملنا جلنا تقریباً ترک کر دیا تھا مجھ سے
بھی ملاقات ہوتی تو زیادہ تر خاموش ہی بیٹھا رہتا جیسے
کچھ سوچ رہا ہے ایک دن میں نے کسی بات کے ضمن میں رعنا
کا کچھ ذکر کیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے بچھو نے اُس کے ڈنک
مار دیا۔ تلملا اُٹھا اور کہا "ریاض بھائی خدا کے لئے اُس زہریلی
ناگن کا نام نہ لیجئے۔ آپ تھوڑا سا صبر کیجئے۔ دیکھئے تو کیا ہوتا
ہے۔ میں نے جال بچھا دیا ہے رعنا جیسی درجنوں چھوکریاں
رشید کے التفات کی بھیک مانگیں گی۔"

رشید میں افسانہ نگاری کی بڑی صلاحیت تھی شعر
بھی خوب کہتا تھا تقریباً دو برس سے اس کے افسانے ملک
کے ممتاز رسالوں میں شائع اور عام طور پر مقبول ہو رہے
تھے۔ مگر اس کے افسانے نہایت پاکیزہ جذبات کے حامل
ہوتے تھے اور وہ ہمیشہ بلند اخلاق کرداروں کی تخلیق
کرتا تھا۔ لیکن اب اُس نے اپنا رنگ بدل دیا تھا اب وہ
"آفتاب" کے فرضی نام سے افسانے لکھتا تھا۔ اس قدر عریاں،
اس قدر جذبات کو مشتعل کرنے والے کہ خدا کی پناہ اس کے
قلم میں زور تھا۔ بیان پر قدرت تھی اس رنگ میں بھی وہ جلد
ہی نمایاں ہو گیا۔ کئی بار میں نے اُسے ٹوکا کہ رشید افسوس ہو

تم پاکیزہ اخلاق کی رفعتوں سے پھسل کر معصیت کے تاریک غار
میں جا گرے۔ کاش تم اس پر غور کرتے۔ اس نے کہا ریاض بھائی
آپ دیکھتے جائیے پستیوں کے بعد پھر بلندیاں آئیں گی۔
تاریکیوں کے بعد پھر روشنیوں کا ظہور ہو گا۔

لکھتا وہ پہلے بھی بہت تھا مگر اس انہماک اور اس کثرت
سے نہیں۔ اب تو بیداری کے ۱۸ گھنٹوں میں سے تقریباً ۱۲ گھنٹے
وہ افسانہ نگاری کی نذر کر دیتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ امتحان
میں فیل ہو جائے گا مگر قدرت نے اُسے بلا کا حافظہ عنایت
کیا تھا۔ اس پر غیر معمولی ذہانت۔ پاس ہوا اور مجھ سے زیادہ
نمبر لے کر پاس ہوا۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد اباجان کی
صلاح ہوئی کہ میں قانون پڑھوں۔ لہذا میں نے لا کلاس میں
داخلہ کرا لیا۔ رشید کا اب تمام وقت افسانہ نگاری میں صرف
ہوتا تھا۔ ایک دن سر شام وہ میرے یہاں آیا۔ رعنا والے
حادثے کے بعد میں نے اُسے اتنا شگفتہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔
کئی خط اُس کے ہاتھ میں تھے۔ سامنا ہوتے ہی چلا کر کہا۔

"وہ مارا! قسم خدا کی وہ مارا! ریاض بھائی میں کامیاب
ہو گیا۔ واللہ کامیاب ہو گیا۔ آ گئی مچھلی جال میں۔ بس پھنسی
ہی سمجھو۔ اب کہاں جائے گی بچ کر۔ فرائڈ زندہ باد۔ نیا
ادب زندہ باد۔"

میں نے کہا کچھ پاگل تو نہیں ہو گئے۔ آخر کچھ بتاؤ تو سہی
کیا ماجرا ہے کس بات میں کامیاب ہو گئے۔ کہیں ملازمت
کی درخواست دی تھی؟ انٹرویو کے لئے بلائے گئے ہو؟
آخر ...

"لاحول ولا قوۃ" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "ریاض بھائی
آپ بھی کس قدر غیر شاعرانہ باتیں کرتے ہیں" یہ کہہ کر اُس
نے چھوٹا سا نیلے رنگ کا ایک خوبصورت لفافہ میری طرف
بڑھایا اور کہا اسے پڑھئے۔ میں نے کہا تم ہی سناؤ میری
عینک اندر ہے اُس نے سنانا شروع کیا

ریاض صاحب نے پھر اسی پیکٹ میں سے ایک اور خط
نکالا اور پڑھنے لگے:

"مسٹر آفتاب! تسلیم، میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں
کہ آپ افسانہ نگار ہیں یا جادوگر۔ آپ مصور ہیں یا خالق؟
تصویروں میں رنگ بھرتے ہیں یا مجسموں میں جان ڈالتے ہیں؟"

"شہاب" کے تازہ پرچے میں آپ کا افسانہ "بھولی بسری باتیں" پڑھا۔ خدا شاہد ہے۔ پڑھ کر جھوم جھوم گئی۔ کیسی کیسی زندہ تصویریں آپ نے اس میں کھینچی ہیں کس قدر حسین ہے یہ ٹکڑا:-

"سہانی شام تھی اونچی نیچی پہاڑیاں اُن کے چاروں طرف دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ بلندی سے ایک نشیب کی طرف اُتر رہے تھے۔ اُن کے ساتھی پیچھے رہ گئے تھے پگ ڈنڈی پتلی تھی۔ اور وہ دونوں آگے پیچھے چل رہے تھے۔ شہلا پیچھے پیچھے تھی۔ سہارا لینے کے لئے اُس نے اپنے دونوں ہاتھ عارف کے کاندھوں پر رکھ دیئے تھے۔ گردن کے بالکل متصل۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے اور اس پُرکیف منظر سے لُطف اُٹھاتے آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ اب وہ ایک پیچ دار راستے سے اُتر رہے تھے۔ احتیاط سے چلنا ضروری تھا۔ عارف ایک لمحہ کے لئے ٹھہرا۔ یکایک اُس نے شہلا کی گداز باہوں کی گرمی اپنی گردن کے گرد محسوس کی۔ وہ سہانی شام وہ نرم نرم ٹھنڈی ہوا، وہ خاموش پہاڑیاں، وہ پُرسکون فضا، وہ چشمے کا دھیما دھیما راگ، وہ دل نواز منظر، وہ آزاد تنہائی ایک بے خودی سی اس کے حواس پر چھا گئی بے اختیار ہو کر اُس نے شہلا کو اپنے آغوش میں کھینچ لیا۔ اب اُن کے لب آبِ حیات پی رہے تھے۔ شہلا کی آنکھیں بند تھیں، عارف کے بازو پر اس کی گردن پیچھے کو ڈھلک گئی تھی۔ اس کا بند بند کانپ رہا تھا پھر وہ سنبھلے ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ شہلا نے ایک سنگریزہ اُٹھایا اور دوسرے سنگریزہ سے اُس پر عارف کا نام لکھ دیا۔ شہلا کو خبر نہیں لیکن محبت کی یہ یادگار آج بھی عارف کے پاس محفوظ ہے"۔

میں نے اپنی کتنی سہیلیوں کو آپ کا یہ افسانہ سُنایا۔ سب نے یہی کہا "قیامت کی ہے ظالم نے"۔ معاف کیجیے گا میں نے دوسروں کی ایک پرائیویٹ بات آپ سے کہہ دی۔ قیامت پر قیامت یہ ہوئی کہ اتفاق سے ہماری سہیلیوں میں سے ایک کا نام ہی شہلا۔ وہ ابھی پہاڑ سے آئی ہے۔ سب نے اُسے بنانا شروع کیا کہ سچ بتا شہلا! کون ہیں یہ عارف صاحب؟ کہاں ملاقات ہوئی تھی؟ اور شہلا تھی کہ کٹی جاتی تھی۔ معاف کیجیے گا میری اس بے سروپا تحریر کو۔ اس قدر لکھنے کا ارادہ نہ تھا۔ کہنا صرف یہ تھا کہ میں اپنے آپ کو اس قابل تو نہیں سمجھتی کہ آپ جیسے ایک سحر طراز ادیب کے ایک شاہ کار کی داد دوں مگر جی نہ مانا اور بے اختیار یہ سطریں قلم سے نکل گئیں۔ رسید کا انتظار کروں گی۔ کیا آپ اپنی رنگین تحریر سے شادکام فرمائیں گے۔ اور ہاں اگر مضائقہ نہ ہو تو اپنا پتہ بھی عنایت کیجیے۔ رسالے کی معرفت خط بھیجنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔

منتظر التفات

خاکسار شاہدہ

بارک ۵ یوپلیس۔ میرٹھ

خط پڑھنے کے بعد میں نے کہا رشید تم نہایت تیزی کے ساتھ تباہی کی طرف جا رہے ہو۔ اُس نے کہا اچھا نصیحت بعد میں کیجیے گا پہلے خط تو سُن لیجیے' یہ کہہ کر اُس نے دوسرا لفافہ کھولا اُس میں خط کے ساتھ کسی رسالے کا کٹنگ بھی تھا۔

ریاض صاحب نے اپنے پیکٹ میں سے وہ خط اور کٹنگ نکالا اور خط پڑھنا شروع کیا:-

گل افشاں، بیڈن روڈ۔ لاہور

۷ ستمبر ۱۹۴۱ء

جناب آفتاب صاحب! معاف فرمائیے گا، میں خواہ مخواہ دخل در معقولات کی مرتکب ہو رہی ہوں۔ کل میری ایک سہیلی نے اس مہینے کا رسالہ "آوازہ" مجھے دیا۔ اور بڑی تعریفوں کے ساتھ آپ کا افسانہ "تجربہ" پڑھنے کی سفارش کی۔ میں نے اُسے پڑھا اور میں بیان نہیں کر سکتی کہ اسے پڑھ کر مجھے کتنا رنج اکتنا صدمہ ہوا۔ خدارا بتائیے کہ سوسائٹی نے آپ کا کیا گناہ کیا ہے جو آپ اس قسم کی زہریلی تحریروں سے اُس کی اخلاقی فضا کو مسموم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ اس قسم کی عریاں اور جذبات میں ہیجان پیدا کرنے والی تحریروں کو پڑھ کر نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں پر کیا اثر ہوتا ہوگا۔ کاش آپ سمجھتے کہ اس قسم کے افسانے لکھ لکھ کر آپ کتنے معصوم دلوں کو معصیت کے غار میں دھکیل رہے ہیں۔ کتنے شریف گھروں میں رسوائی اور بدنامی کے بیج بو رہے ہیں۔ کتنی پُرسکون زندگیوں میں جذبات کا طوفان برپا کر کے اُنہیں تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ کاش قانون کا شکنجہ اتنا وسیع ہوتا کہ آپ اُس کی گرفت میں آ سکتے اور قدرت نے آپ کو جو صلاحیتیں دی ہیں اُنہیں اس طرح برباد نہ کرتے۔

آپ کے افسانے کا ایک ٹکڑا "آوارہ" میں سے تراش کر بھیج رہی ہوں ذرا اور آپ اسے سنجیدگی کے ساتھ پڑھئے اور دیکھئے کہ آپ نے خود اپنے اوپر اور دوسروں پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے

خدا حافظ

آپکے حساب کی سزاوار

صبیحہ

میں نے ریاض صاحب سے کہا۔ رسالے کا وہ کٹنگ بھی تو سنائیے، دیکھیں تو اس میں کیا لکھا ہے۔ ریاض صاحب نے کہا سنیئے۔

"آہ، جاوید میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ ہونٹ کیسے تھے" میں نے گلابی ہونٹ بھی دیکھے ہیں اور سُرخ بھی۔ میں نے ان کی تعریفیں بھی کی ہیں کبھی لعل و یاقوت سے تشبیہ دی کبھی مرجان سے کبھی گلاب کی پنکھڑی سے، کبھی شراب سے، مگر سلمیٰ کے ہونٹ! اُف کیا قیامت تھے سلمیٰ کے ہونٹ۔ میری طرح سلمیٰ بھی کبھی پان نہیں کھاتی مگر اُس دن خود بھی کھایا اور مجھے بھی کھلایا۔ پان کی لالی نے غضب کیا۔ گلاب کی پنکھڑیوں کو دہکتے ہوئے انگارے بنا دیا۔ جاوید، ٹھنڈی آگ! تم نے سُنی ہوگی مگر کبھی دیکھی نہ ہوگی۔ پر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی اور اپنے لبوں سے محسوس کی۔ جاوید، کن لفظوں میں بیان کروں اُن ہونٹوں پر پان کی سُرخی کا رنگ۔ تمہیں یاد ہوگا ایران میں ہم نے پہاڑی چکور دیکھا تھا اُس کی سُرخ منقار دیکھ کر تم حیران ہوگئے۔ بس سلمیٰ کے ہونٹ بھی کچھ ایسے ہی ہوگئے تھے مگر اس سُرخی میں ایک عجیب قسم کی چمک تھی جیسے ہیرے کی جوت۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُن میں رس بھرا ہوا ہے کہ چھوتے ہی ٹپک پڑے گا۔ بالکل پکی چیریوں Cherries کی طرح۔ وہی سُرخ رنگ، وہی میٹھا رس۔ مگر چیری کے رس میں وہ مستی کہاں جو سلمیٰ کے ہونٹوں کے رس میں تھی۔ امرت کے یہ ساگر بے اختیار میرے لبوں کو اپنی طرف کھینچے لیتے تھے ضبط دشوار تھا اور جلد ہی ناممکن ہوگیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بیان کی حدوں سے خارج ہے تصور کے آئینہ میں تم اُس تصویر کا صرف ایک رُخ دیکھ سکتے ہو، یعنی ظاہری۔ وہ باطنی کیفیت جو اس وقت میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی وہ نہ تم سمجھ سکتے ہو نہ میں سمجھا سکتا ہوں۔

تم کہہ سکتے ہو آخر وہ ایسی کونسی نئی کیفیت تھی جو دُنیا میں کبھی کسی نے محسوس نہیں کی؟ یہی نا کہ دو چاہنے والوں کے لب باہم پیوست ہوگئے تھے۔ بھئی یہ تو کوئی ایسی نئی بات نہیں۔ ہر روز ایسا ہوتا ہے، ہر وقت ایسا ہوتا ہے۔ ہاں! تم سچ کہتے ہو جاوید! آرزومند لبوں کا آپس میں ملنا کوئی نئی بات نہیں خود میرے لئے بھی یہ تجربہ نیا نہیں۔ میں نے بند کلیاں بھی چوسی ہیں۔ تازہ کھلے ہوئے پھولوں کا رس بھی لیا ہے۔ میرے لبوں نے اُن پھولوں کے مخملیں لمس سے بھی تسکین پائی ہے جو ہنوز شاخ سے جُدا نہیں ہوتے۔ اور اُن پھولوں سے بھی جو ہار میں گوندھے جا چکے۔ جسم میں ایک سنسنی، ایک ارتعاش۔ روح میں ایک بے خودی، ایک اہتزاز یہ سب کیفیتیں میں نے محسوس کی ہیں مگر جاوید سلمیٰ کے ہونٹوں نے مجھے جس عالم میں پہنچا دیا تھا وہ میرے لئے بالکل نیا تھا وہ کیفیت اُن تمام کیفیتوں سے بالکل جُدا تھی جو میں نے ابھی زندگی میں محسوس کی ہیں اسی لئے میں نے کہا تھا کہ نہ تم اُسے سمجھ سکتے ہو نہ میں سمجھا سکتا ہوں

جس وقت سلمیٰ کا سر میرے زانو پر اور اُس کا جسم میرے آغوش میں تھا۔ اس کے چہرے کی چمک دمک رہی تھی جس وقت میں نے جھک کر اپنا منہ سلمیٰ کے منہ پر رکھ دیا اسوقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہزاروں بجلیاں میری رگوں میں دوڑ گئیں اور لاکھوں ستارے میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔ ایک نیم بیہوشی کی سی کیفیت میرے حواس پر چھائی ہوئی تھی، سلمیٰ کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک خماری کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی اور اس کا خوبصورت سینہ موجوں کی طرح بار بار بلند ہوتا تھا میرے سینے سے مل جانے کیلئے۔"

رسالہ کا کٹنگ ختم کرنے کے بعد ریاض صاحب نے صبیحہ کا خط سُن کر رشید سے کہا: دیکھا تم نے، کیسا طمانچہ لگایا اس شریف لڑکی نے ہمارے مُنہ پر۔ اور رکھو عریاں تجربے۔ رشید مسکرا کر بولا: "ریاض بھائی آپ تھوڑا سا صبر کیجئے۔ یہی اخلاق کی معلّمہ رشید کے انہیں بے پناہ تیروں سے گھائل ہوگی اور رشید کی ایک نگاہِ لطف پر اپنا سب کچھ مٹا دینے کے لئے تیار ہوجائے گی۔ اب میں ساری توجہ اسی آہوئے وحشی کے رام کرنے میں صرف کروں گا۔" یہ نئے

کہا رشید! اس خطرناک کھیل میں شرمساری اور ندامت کے سوا اور کچھ بھی تمہارے ہاتھ نہ آئے گا۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چار مہینے گذر گئے اور اس اثنا میں اس ظالم نے خدا جانے کیا سحر کیا کہ صبیحہ نادیدہ اس پر جان دینے لگی۔ آپس میں تصویروں کا مبادلہ ہوا۔ اس نے طرفین کے شوق کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا۔ صبیحہ کی تصویر میں نے بھی دیکھی تھی۔ بڑی پیاری صورت تھی۔ بس تصویر تھی۔ صیّاد اپنے بچھائے ہوئے جال میں خود ہی پھنس گیا۔ یوں تو وہ صبیحہ کی تحریروں ہی پر لٹّو تھا لیکن تصویر دیکھنے کے بعد تو وہ اُسے اپنے قلب و روح کی انتہائی گہرائیوں سے چاہنے لگا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو تحفے بھی بھیجے۔ صبیحہ نے رشید کو لاہور بلایا۔ لاہور جاتے وقت وہ بے انتہا مسرور تھا۔ میں نے کہا رشید! قدرت کو تمہاری نامرادی پر ترس آ گیا۔ اُس نے کہا ہاں ریاض بھائی آپ سچ کہتے ہیں آج مجھے اپنی قسمت پر ناز ہے۔ میں کہتا تھا قسمت نے میرے ساتھ دغا کی مگر آج معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ میری بہتری کے لئے تھا۔ ربیعہ کو نہ کھوتا تو صبیحہ کو کیونکر پاتا۔ قدرت نے ایک پھول چھین کر میرا دامن پھولوں سے بھر دیا۔ ایک ستارہ لے کر مجھے کہکشاں کا مالک بنا دیا۔ وہ لاہور گیا۔ ایک ہوٹل میں ٹھہرا۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر اس درجہ خوش ہوئے گویا انہوں نے اپنے حاصلِ زندگی کو پا لیا۔

صبیحہ اپنے باپ کی اکلوتی اور بہت ہی لاڈلی بیٹی تھی۔ دولت کی فراوانی تھی۔ عمر بھر ناز و نعمت کے گہواروں میں پلی تھی۔ اس نے اپنے باپ کو سب کچھ بتا دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ ابا میری زندگی اور زندگی کی کوئی مسرت اب "آفتاب" کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی"۔ باپ نے بیٹی کی خوشی کو ہر چیز پر مقدم سمجھا۔ آخر تینوں کی ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔ گل افشاں میں "آفتاب" کی دعوت ہوئی۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُس وقت فرطِ مسرت سے رشید کا کیا حال ہوا ہوگا۔ وہ تینوں ملے اور چند ہی منٹ کے بعد انہیں معلوم ہو گیا کہ سورج پچھم سے نکل سکتا ہے۔ پانی بلندی کی طرف بہہ سکتا ہے۔ ہر ناممکن چیز ممکن ہو سکتی ہے۔ مگر صبیحہ اور رشید قیامت تک ایک دوسرے کے شریکِ زندگی نہیں بن سکتے۔

پوچھنے پر جس وقت رشید نے اپنا اصلی نام بتایا اور اپنے والد کا نام لیا تو صبیحہ کے والد پر ایک بجلی سی گری معلوم ہوتا تھا انہوں نے کوئی سخت بھیانک خواب دیکھا ہے۔ اُن کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ صبیحہ اور رشید اُن کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔ بس انہوں نے اتنا کہا "ہائے بدقسمت ماں کی بدقسمت بیٹی"۔ اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ پھر بے اختیار اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ رشید اور صبیحہ دونوں سخت پریشان تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا معمّہ ہے۔ آخر انہوں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "رشید تم مجھے نہیں جانتے؟ جان بہادر میاں عبدالحکیم کا نام تم نے کبھی سُنا ہے؟" اتنا سُننا تھا کہ معلوم ہوا رشید کی روح کسی نے سلب کر لی۔ خدا جانے وہ کیوں یکایک کھڑا ہو گیا۔ ایک آہ کی اور تیورا کر گرا۔ سر ایک کرسی سے ٹکرا کر شق ہو گیا۔ فرش پر خون ہی خون تھا۔ پھر جو ہوش آیا تو ہوش ہمیشہ کے لئے اُس سے رخصت ہو چکا تھا۔ بہتیری دوا دارو کی گئی بے سود۔ اب کتنے دنوں سے یہاں رانچی میں ہے مگر اُس کی حالت میں کوئی فرق نہیں۔ دن رات بیٹھا خط لکھا کرتا ہے۔ کبھی کبھی میں اُسے دیکھنے جاتا ہوں۔ اُس نے میری صورت دیکھی اور چلاّیا کہ وہ مارا، قسم خدا کی وہ مارا، ریاض بھائی میں کامیاب ہو گیا، واللہ کامیاب ہو گیا۔ آ گئی مچھلی جال میں"۔ فنِ ادب زندہ باد سبادب زندہ باد"

کولتار

اس کتاب میں پندرہ انتہا سے زیادہ دلچسپ اور مزاحیہ افسانے ہیں اور یہ سب افسانے مل کر کتاب کو پورا پورا مزاحیہ ناول بنا دیتے ہیں۔ مزاحیہ نگاری اور افسانہ نویسی کا اگر کمال دیکھنا ہو تو یہ کتاب ضرور پڑھیئے، اپنی طرز کا پہلا ناول ہے۔ شاہدہ کی زبردستی شادی کے لطیفہ نے قصہ میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ حکم والی کی داستانِ محبت بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ قصہ مختصر اس دلچسپ اور مزاحیہ ناول کو شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر رکھنا مشکل ہے۔ قیمت دو روپے (ع۲) علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ: ساقی بک ڈپو، دہلی۔

فضل حق قریشی دہلوی

"زندگی میں دُو دفعہ"

ابتدائیہ:- جمعہ کے روز شام کے وقت جب میرے دوست احباب کُتب خانہ علم و ادب پر جمع ہو کر کچھ دیر گپ شپ کرتے اور پھر رات کا کھانا کھانے کے لئے ایک ساتھ کسی ہوٹل میں جانے لگتے ہیں تو اصولاً مجھے بھی شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ ایک صاحب کہتے ہیں

"بندۂ خدا! آؤ۔ ہمارے ساتھ چلو بھلا آج کے دن گھر میں کیا رکھا ہوگا۔ مدمرہ کھچڑی جو صرف بیماروں کے لئے تجویز کی جاتی ہے پتلی دال جو لالہ بھائیوں کا کھاجا ہے اور جس سے پٹھان بہت جلتے ہیں یا پھر آخری صورت آلو میتھی کی بھجیا جسے غریب لوگ کچھ نہ ملنے کی صورت میں غنیمت سمجھ لیتے ہیں۔ بھلا ان میں سے کونسی چیز تمہیں مرغوب ہے جو کشاں کشاں گھر لے جاتی ہے اور تم کبھی عنوان ہمارا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے ہو۔ خدا گواہ ہے کہ گوشت کے بغیر پیٹ تو بھر جاتا ہے مگر طبیعت کی آسودگی ہرگز نصیب نہیں ہوسکتی۔ نہ جانے دہلی کے قصائیوں نے جمعہ کے دن کمیلا نہ کرنے کی قسم کیوں کھا رکھی ہے۔ کوئی بھلا مانس ان سے جا کر کہتا بھی نہیں کہ تھوڑا بہت کفارہ ادا کر کے یہ قسم توڑ دو۔ جمعہ کے دن گوشت مل جایا کرے تو ہم بھی ہوٹل کا جانا چھوڑ دیں۔"

دوسرے بزرگ اُس فالتو انجن کی طرح جو مزید زور لگانے کی غرض سے کالکا کی گاڑی میں کے اسٹیشن ہی سے جوت دیا جاتا ہے، مجھے اغوا کرنے کی کوشش کو ناکام جاتے ہوئے دیکھ کر کہتے ہیں:-

"معلوم ہوتا ہے یہ اپنی بیگم جان سے بہت ڈرتے ہیں اسی لئے باہر کے کھانے سے بہت پرہیز رہتا ہے اور شام کو سویرے سے گھر بھاگ جانا بھی چاہتے ہیں!"

جب یہ حملہ بھی بے اثر رہتا تو تیسرے کرم فرما زیادہ سخت طنزیہ پیرایہ اختیار کرتے ہوئے لب کشائی کرتے۔

"اماں! کس کنجوس سے کہہ رہے ہو۔ ہم جانتے ہیں یہ پہلے درجے کا یہودی واقع ہوا ہے۔ ہوٹل کے خرچ کو اسراف بے جا سمجھتا ہے۔ بھلا پھر کس طرح تمہارے ساتھ شریکِ طعام ہو جائے۔"

یہ سُن کر جو کچھ مستحق میرے ذاتی جذبات کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے مالی سنتے کہتے ہیں:-

"اگر یہ بات ہے تو اسے مہمان بنا کر لے چلو۔ ان کے حصے کی رقم ہم سب مشترکہ طور پر ادا کر دیں گے۔"

اس آخری مسقفانہ رائے کو سُن کر میرے تن بدن میں آگ تو ضرور لگتی ہے مگر میں ہمت غصّے کو پی جاتا ہوں کیونکہ میں کسی قیمت پر بھی وہ راز ظاہر کرنا نہیں چاہتا جو مجھے ہوٹل میں جانے سے ہمت مانع رکھتا ہے۔ لہذا میں ایسے مت ختے جیسے تراش کر جن کی اساس حقیقتاً کچھ بھی نہیں ہوتی، انکے سامنے اپنی مجبوریاں پیش کرتا ہوں جن کو وہ تھوڑی بہت رد و قدح کے بعد تسلیم کر لیتے ہیں اور مجھے بآسانی ان سے چھٹکارا نصیب ہو جاتا ہے۔

یہ بالکل حقیقت ہے کہ جمعہ کی شام کو میں بھی گھر کا کھانا بالکل بے دلی سے کھاتا ہوں۔ نیز میں نہ تو اپنی شریکِ حیات سے ڈرتا ہوں اور نہ وہ غریب کم سخن میرے گھر سے باہر رہنے پر معترض ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں انہی دوستوں کے ساتھ اکثر سنیما جاتا اور کبھی کبھی تھیٹر میں ایسے کھیل دیکھ کر رات کی سیاہی کو دن کے اُجالے سے ملاتا ہوں جو اوّل شب سے شروع ہو کر نمودِ سحر تک کی خبر لاتے ہیں۔ پھر میرے بڑھے ہوئے اخراجات کی فردِ حساب آسانی سے اس الزام کی تردید کرسکتی ہے کہ میں کنجوس ہوں۔ میں بارہا اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کر کے مقروض ہوجاتا اور فالتو رقم کو قسط وار کئی ماہ میں ادا کرتا یا کسی اور ذریعۂ آمدنی سے اس خلیج کو پُر کرنے کی صورت نکالتا ہوں۔

اصل بات یہ ہے کہ میں ہوٹل کے کھانے سے نہیں بلکہ ہوٹل کے نام سے، اس کی چار دیواری سے اور اس کے مجرمانہ ماحول سے دُور رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنی زندگی میں دُو دفعہ ایسے تلخ

تجربے اٹھانے پڑے ہیں کہ میں نے ہمیشہ کے لئے تہیہ کرلیا کہ کبھی بھول کر بھی ہوٹل کے اندر قدم نہیں رکھونگا۔ میں نے ان تلخ تجربات کی رُوداد اپنے کسی دوست کے سامنے بیان نہیں کی، محض اس لئے کہ وہ اُلٹا میرا ہی مذاق اُڑائینگے۔ وہ کہینگے کہ یار تم اچھے خاصے عقلمند ہوکر خوب اُلّو بنے۔

میں ان دونوں موقعوں کی تفصیل آپ کے سامنے اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ آپ نے ضرورت سے زیادہ اصرار کیا ہے اور آپ کے الفاظ کا احترام کرنا میرا فرض ہے۔ لیکن دیکھئے۔ شرط یہ ہے کہ آپ اس راز کو اپنے سینے میں اچھی طرح محفوظ رکھیں۔ میرے کسی دوست کے کانوں تک اس کی بھنک بھی پہنچی تو نتیجہ بُرا رہے گا۔ وہ زبردست احتیاط جواب تک برتی گئی ہے، آپ کی ذراسی لغزش سے خاک میں مِل جائے گی۔

پہلی دفعہ:- دو تین سال پہلے کا ذکر ہے۔ گرمی کے دنوں میں جب لُو کے تھپیڑے میدان کی فضا کو ناقابلِ برداشت بنا دیتے ہیں، میری شریکِ حیات شملہ پہاڑ پر اپنی بڑی بہن کے ہاں بطور مہمان مقیم تھی اور میں دفتر سے چھٹی نہ مل سکنے کے باعث شریکِ سفر نہ ہوسکا تھا۔ اِس لئے دونوں وقت کا کھانا حسبِ موقع کسی ہوٹل میں کھالیتا تھا۔ صرف ایک ہوٹل کو مخصوص کرنے کی ضرورت اِس لئے لاحق نہیں ہوئی تھی کہ میری نگاہ میں وہ سب کے سب ہر لحاظ سے خصوصاً نقائص کے اعتبار سے یکساں تھے۔

ایک روز جمعہ کے دن میں "شاہ بڑے" کے قریب لگنے والا دنگل دیکھکر لوٹا تو پہلوانوں کے داؤں پیچ پر دل ہی دل میں تبصرہ کرتا ہوا "نشاط سینما" کے قریب تک پہنچ گیا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ "شریف ہوٹل" سامنے تھا، اِسلئے اسی میں چلا گیا۔

بڑے ہال کی سب میزیں پوری کرسیوں کے ساتھ رُکی ہوئی تھیں البتہ ایک کونے والی میز پر ایک بڑے میاں تنہا بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے سامنے کی کرسی خالی پڑی تھی۔ میں اُن کی طرف بڑھا اور میز کے قریب جاکر کہنے لگا:-

"اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس خالی کرسی پر بیٹھ جاؤں"

اُنھوں نے نظر اُٹھاکر میری طرف دیکھا، میری ظاہری حالت کا جائزہ لیا اور بڑی شرافت سے کہا:-

"ضرور ضرور۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے آپ تشریف رکھیں اور ما حضر تناول فرمائیں"

میں شکریہ ادا کرتے ہوئے بیٹھ گیا اور بیرائے کا منتظر رہا کہ ان میں سے کوئی فارغ ہوکر میری طرف آئے تو کھانوں کی تفصیل دریافت کرکے اپنی فرمائش پیش کروں۔ لیکن حد سے زیادہ بڑھی ہوئی مصروفیت کے باعث ان میں سے کوئی بھی میری جانب متوجہ نہ ہوا۔ حتیٰ کہ وہ بڑے میاں مُصر ہوئے کہ میں کچھ دیر کے لئے انہی کے ساتھ شریکِ طعام ہوجاؤں۔ دل تو نہیں چاہتا تھا مگر اُن کے اصرار نے مجبور کردیا۔ اور میں بڑے تکلف کے ساتھ آلو کی ایک ٹکیہ علیحدہ رکابی میں لے کر کھانے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد بیرائے آیا تو میری لب کشائی سے قبل انہی نے میری جانب سے چند چیزوں کی فرمائش کردی۔

کھانے کے دوران میں ہم دونوں خوب گھل مِل کر باتیں کرتے رہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ بڑے میاں کافی دلچسپ انسان ہیں۔ پہلوانوں کے دنگل سے لے کر شاعروں کی محفل تک وہ ہر موضوع پر تبادلۂ خیال کرسکتے تھے۔ اگرچہ اُن کی بے پر کی باتوں میں کوئی وزن نہیں تھا بلکہ بہت سے خیالات بے سرو پا تھے مگر میں ان سے اُکتا نہ سکا۔ میں اپنے اس میلان پر خود متعجب تھا کیونکہ بعض احباب سے یہ بھی سُن رکھا تھا کہ ایسے بوڑھے اور نحیف و کمزور لوگ مُشتبہ اور خطرناک ہوتے ہیں۔ وہ نوجوانوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارے پھرتے ہیں اور اپنے دام میں پھنسا کر خوب اُلّو بناتے ہیں۔ لیکن اس خوف کے باوجود کسی قسم کا اجتناب کرنے کی بجائے ان کے ساتھ اس طرح بے تکلف ہوتا چلا گیا گویا ہم دونوں میں کوئی وقتی نہیں بلکہ دیرینہ واقفیت ہے۔

چونکہ میں بہت دیر بعد شامل ہوا تھا۔ اس لئے وہ بزرگ قدرتی طور پر مجھ سے پہلے اُٹھ گئے اور نل پر ہاتھ وغیرہ دھوکر منیجر کی میز کی طرف بڑھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرے کھانے کی قیمت بھی اپنی جیب سے ادا کرنی چاہتے ہیں۔ میں نے ارادی طور پر نگاہیں نیچی کرلیں اور جلدی جلدی آخری لقمے کھانے میں مصروف ہوگیا۔ ایک ہی لمحہ بعد وہ میرے قریب آئے، بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور اپنی چھتری اُٹھاکر مجھے "شب بخیر" کہتے ہوئے چلے گئے۔

میں نے خواہ مخواہ اپنے دل میں فرض کر لیا کہ وہ ضرور میرے بل کی رقم بھی ادا کر گئے ہیں اور اسی لئے خوش تھا کہ چلو آج مفت کی دعوت رہی۔ لیکن کچھ دیر کے بعد جب بوائے کھانے کا بل لایا تو میرے ہوش اُڑ گئے۔ ایک سو دو پورے ساڑھے نو روپے درج تھے میں نے گھبرا کر کھانوں کی تفصیل پر نظر ڈالی۔ بریانی، قورمہ، شاہی ٹکڑے، مچھلی کے کباب، آلو کی ٹکیاں، پراٹھے، چپاتیاں، دال اور حسَلہ لکھا ہوا تھا۔

ان میں سے آخرالذکر تین معمولی چیزیں تو کی تھیں کے سامنے میں نے کھائی تھیں۔ باقی کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس لئے میں نے ذرا گھبرا کر بوائے سے کہا۔

"نہیں غلط فہمی ہو گئی ہے۔ یہ بل میرا نہیں ہے۔ بھلا اتنی چیزیں میں نے کب کھائی ہیں؟"

"بے شک!" بوائے نے ادب سے کہا۔ "آپ نے نہیں کھائیں لیکن آپ کے چچا جان تو سب کچھ کھا گئے ہیں۔"

"میرے چچا جان!" میں نے انتہائی حیرت کے عالم میں دریافت کیا۔ "وہ کب؟"

"ابھی ابھی آپ کے ساتھ ہی تو کھانا کھا رہے تھے۔ جاتے وقت اُنہوں نے منیجر صاحب سے کہہ دیا تھا کہ میرا بھتیجا کھانے سے فارغ ہو کر بل کی ساری رقم ادا کر دیگا۔"

مجھے ایک دم ڈر ہوا کہ کہیں میرے دل کی حرکت بند نہ ہو جائے۔

اُس وقت تک میں نے جو کچھ کھایا تھا، مجھے زہر ہو کر لگنے لگا اور جو بچا کھچا میز پر باقی تھا، وہ زہر سے بھی زیادہ خطرناک نظر آنے لگا۔

میں نے خاموشی سے اُٹھ کر ہاتھ دھوئے اور بادلِ ناخواستہ بل کی رقم ادا کر کے باہر چلا گیا۔ منیجر سے بحث کرنی فضول تھی۔ قریب بیٹھنے والے سبھی لوگ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے۔ کوئی بھی یہ باور کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا کہ وہ شخص جس سے میں اس قدر ہنس ہنس کر بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا، میرے لئے بالکل انجان تھا۔

میں تیزی سے باہر نکلا کہ شاید وہ بوڑھا کھوسٹ کہیں نظر آ جائے تو اُسکی خبر لوں۔ مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔

دوسری دفعہ دوسرا واقعہ بھی تقریباً انہی دنوں کا ہے۔ آفتاب کی تیزی کم نہیں ہوئی تھی۔ شریکِ حیات بدستور شملے کی خوشگوار فضا میں براجمان تھیں اور میں دہلی کی سڑی گرمی میں جل بھن رہا تھا۔

میں نے جاتے وقت انہیں کافی رقم نقد دیدی تھی تاکہ خرچ میں کسی قسم کی تنگی نہ ہو مگر ان کی فرمائشوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اس لئے آئے دن مجھے کچھ نہ کچھ بذریعہ پارسل بھیجنا پڑتا تھا۔ کبھی سلیپر فیتے اور ریشم۔ کبھی زردہ چھالیہ اور پان۔ اور کچھ نہیں تو عبدالحمید کی دُکان کا حبشی حلوا سوہن جو ساری دُنیا میں اپنی نظیر آپ ہے۔ نتیجہ یہ کہ مہینے کے آخر تک بجٹ میں گنجائش نہ رہی۔ میری جیب تقریباً خالی ہو گئی۔ صرف دس روپے کا ایک نوٹ باقی تھا۔ اور تنخواہ ملنے تک ڈھائی دن باقی تھے۔ ناشتے کے علاوہ پانچ وقت کا کھانا ہوٹل میں کھاتا تھا۔ یہ رقم صرف کھانے کے لئے تو کافی ہو سکتی تھی مگر مجھے کئی ضروری چیزیں بھی خریدنی تھیں۔ اس لئے میں نے تہیہ کر لیا کہ ذرا کفایت شعاری سے کام لوں گا۔ اور اس کی عملی صورت یہی ہو سکتی تھی کہ چند دن کے لئے دوسرے درجے کے ہوٹلوں میں جانا شروع کر دوں۔

میری قیام گاہ سے کچھ دُور نیو کنگسن سے ذرا آگے بڑھ کر ایک معمولی ہوٹل ہے "نشاط ہوٹل" جس میں نام کے سوا کوئی خاص جاذبیت نہیں ہے۔ مگر میں نے ان ڈھائی دنوں کے لئے اس کو پسند کیا۔ اس کے سوا چارہ کار بھی کیا تھا۔

اُنیس مارچ کی صبح کو نو بجے کے قریب میں اس ہوٹل میں گیا تو وہاں تقریباً سناٹا تھا۔ مشکل سے دو یا تین آدمی الگ الگ بیٹھے کچھ کھا پی رہے تھے۔ میں بھی ایک دور افتادہ میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ اور ملازم کو بُلا کر بہت جلد کھانا لانے کے لئے کہا۔ کیونکہ دفتر پہنچنے میں دیر ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ میں نے قورمے کی نصف پلیٹ، چار چپاتیاں اور آلو کا تھوڑا سا سالن منگایا لیکن یہ چیزیں ابھی آئی بھی نہیں تھیں کہ ایک اور صاحب تشریف لائے جو بوڑھے تو نہیں بلکہ ادھیڑ عمر کے ضرور تھے۔ میرے سامنے کی کرسی خالی پڑی تھی۔ میرے قریب آ کر وہ آہستہ سے بولے:-

"اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس خالی کرسی پر بیٹھ جاؤں۔"

پچھلے واقعہ کی بہت سی باتیں میرے ذہن میں تازہ ہوگئیں۔ میرے دماغ کی فکری صلاحیتوں نے بڑی تیزی سے کام کرنا شروع کیا۔ میں نے سوچا کہ آج کیوں نہ اس نووارد کو اسی طرح بے وقوف بناؤں جیسے اُس روز وہ بڑے میاں مجھے اُلّو بنا کر چلتے بنے تھے۔ لہذا میں نے بالکل وہی رویّہ اختیار کرتے ہوئے کہا:۔

"ضرور۔ ضرور۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ آپ تشریف رکھیں۔ میں نے کھانے کا آرڈر دیدیا ہے۔ آپ میرے ساتھ شریک طعام بھی ہوسکتے ہیں۔"

اس نے اپنی جیب سے اخبار نکالتے ہوئے میری "دعوت" کا شکریہ ادا کیا اور کہا:۔

"میں صرف چائے پیونگا۔"

"تو پھر کیا مضائقہ ہے۔ میں چائے کی فرمائش بھی کردیتا ہوں۔"

اُس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا کہ آخر یہ نوازش کیوں ہورہی ہے۔ اور پھر میرے مسلسل اصرار پر ہار مان لی۔ میں نے بآوازِ بلند ملازم سے کہا:۔

"بھئی دیر نہ کرو۔ کھانا جلدی لاؤ۔ اور چائے کی ایک پیالی بھی ساتھ لانا۔"

نووارد نے اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ دہلی کا مشہور اخبار "انجام" جو تازہ پھلوں کی طرح بازار میں آتے ہی ہاتھوں ہاتھ بِک جاتا ہے۔

"کوئی تازہ خبر؟" میں نے آغازِ گفتگو کے لئے ایک بہانہ ڈھونڈا۔

"ابھی مطالعہ نہیں کیا۔ خرید کر سیدھا چلا آرہا ہوں۔" اور پھر بیچ کا صفحہ نکال کر میرے سامنے میز پر پھیلاتے ہوئے کہا۔ "لیجئے آپ خود شوق فرمائیں"

لیکن عین اُس وقت ملازم کھانا اور چائے لے آیا۔ اور میں نے اخبار کا صفحہ ایک طرف رکھکر کھانا شروع کر دیا۔ تاہم باتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ تاکہ وہ اطمینان سے اخبار نہ پڑھ سکے اور میرے جانے کے وقت تک بیٹھا رہے۔ میں نے تہیّہ کرلیا کہ منیجر سے یہ کہکر چلے جانیکی کوشش کرونگا کہ بل کی رقم

میرے چچاجان ادا کریں گے۔ میں دو تین بار پہلے بھی اس ہوٹل میں کھانا کھاچکا تھا اور منیجر مجھے پہچاننے لگا تھا۔ اس لئے یہ بات اسے باور کرادینی کچھ مشکل نہیں تھی۔

دو چار لقمے لینے کے بعد ہی میں نے محسوس کیا کہ کھانے میں مرچیں غیر معمولی طور پر زیادہ ہیں۔ میں کم مرچ کا عادی ہوں نتیجہ یہ کہ میری آنکھ ناک سے پانی بہنے لگا اور انہیں صاف کرنے کے لئے مجھے کئی بار اپنی جیب سے رومال نکالنا پڑا۔

میری یہ حالت دیکھکر میرے "متبنیٰ چچاجان" نے مسکرا کر کہا:۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم دہلی کے باشندے نہیں ہو۔ یہاں تو بہت زیادہ مرچیں کھائی جاتی ہیں اور اس سالن میں کچھ بھی زیادہ معلوم نہیں ہوتیں۔ منہ ٹھنڈا کرنے کے لئے کوئی میٹھی چیز منگالو نا۔"

اور اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے خود ملازم کو آواز دیکر کہا۔ "بھئی۔ فرنی کی ایک پلیٹ لے آؤ۔ آج تمہارے سالن میں مرچیں بہت ہیں۔"

"اور چائے کی ایک پیالی بھی۔" میں نے فوراً ملازم سے کہا۔ کیونکہ ان کی پیالی میں چائے ختم ہوگئی اور مجھے اندیشہ تھا کہ وہ اُٹھ کر چلے نہ جائیں۔

میں اپنے دل میں خوش تھا کہ چچاجان کی زبان سے فرنی کی فرمائش سُننے کے بعد منیجر کے لئے جلدی سے یہ تسلیم کرلینا آسان ہوجائے گا کہ ہم دونوں کے درمیان کوئی قریبی تعلق ضرور ہے۔

دوسری پیالی ختم کرنے کے بعد اُنھوں نے خود ہی ایک پیالی اور منگالی اور میں نے فرنی کی پلیٹ پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ لیکن اس سے قبل کہ میں کھانا ختم کروں، میری نگاہ محض اتفاق سے میز کے نیچے گئی اور میں نے دیکھا کہ وہاں ایک نوٹ تہ کیا ہوا پڑا ہے۔

میرے سارے بدن میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے سوچا کہ اس روز میرے ساڑھے نو روپے خرچ ہوگئے تھے۔ آج یہ دس روپے آرہے ہیں۔ گویا پچھلا نقصان سود سمیت پورا ہوجائے گا۔

اس موقعہ پر مجھے فوراً کسی کا یہ زرّین قول یاد آگیا کہ اگر تم کو میز کے نیچے یا سڑک پر گرا ہوا کوئی نوٹ یا سکہ نظر

تنے لوسٹ سے پہلے اپنا پاؤں اس پر رکھ دوں تاکہ دوسروں کی نگاہ نہ پڑ سکے۔ چنانچہ میں نے فوراً دایاں پاؤں ذرا آگے بڑھا کر اس پر رکھ دیا۔ اور پھر یہ سوچنا شروع کیا کہ اسے اٹھایا کس طرح جائے۔ حقیقتاً یہ آسان کام نہیں تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اپنا پاؤں وہیں جمائے رہنے دوں گا تاوقتیکہ وہ شخص اپنی چائے ختم کر کے وہاں سے چلا نہ جائے جیسے جیسے لمحے پہلے میں اپنا نیچا حال ظاہر کرنے کے منصوبے کا سوچ چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ میں اس کے جانے کے بعد ہی نوٹ کو آسانی سے اٹھا سکتا تھا۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور ساتھ ہی غصہ بھی آیا جب اس نے چائے کی تیسری پیالی ختم کر کے ایک اور منگالی۔ میں نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"چائے کی زیادتی ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے میرا خیال ہے کہ تین پیالیاں آپ کے لئے بہت کافی ہیں۔ اگر اس سے زیادہ پی تو چائے خشکی کریگی۔ سردی کا موسم ہوتا تب بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ آج کل گرمی ہے اور وہ بھی شدید قسم کی۔"

وہ یہ بات سن کر مسکرایا اور اپنی جیب سے پیکٹ نکال کر سگریٹ جلاتے ہوئے بولا۔

"جی نہیں۔ میں بچپن سے اس چیز کا عادی ہوں اور گرمی جاڑے یکساں طور پر پی سکتا ہوں۔"

اب میرے لئے خاموش ہو جانے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد میں اپنے واسطے بھی چائے کی پیالی منگوانے کے لئے مجبور ہو گیا کیونکہ پھر ہوٹل میں بیٹھے رہنے کی صورت صرف اسی طرح ممکن ہو سکتی تھی۔ مگر میری پہلی پیالی کے ساتھ اس کی پانچویں پیالی بھی ختم ہو گئی۔

وہ مسلسل چائے پیتا، سگریٹ کے کش لگاتا اور اخبار پڑھتا رہا۔ میرے لئے بڑی مشکل تھی۔ ایک طرف دفتر جانے کو برابر دیر ہوتے جا رہی تھی اور دوسری طرف پاؤں ایک ہی جگہ جمے جمے سُن ہو چلا تھا۔

میں نے خواہ مخواہ اپنی جیب سے پنسل نکالی اور کاغذ کے ایک ٹکڑے پر کچھ ہندسے اس طرح لکھنے شروع کئے گویا اپنے پچھلے اخراجات کی تفصیل یادداشت کے لئے درج کر رہا ہوں۔

حالانکہ ایک لحاظ سے میں یہ حساب لگا رہا تھا کہ ان مفت کے دس روپوں کو کس طرح خرچ کیا جائے۔ میں نے سب سے پہلے تین روپے لکھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک سیر حبشی حلوا سوہن ملنے جانے والے کسی واقف کار شخص کے ہاتھ شریک حیات کو بھیج دوں گا۔ تاکہ "مال غنیمت" میں کم سے کم تیس فیصدی کی شریک وہ بھی ہو جائے۔

میں نے سوچا کہ آج ہی شام کسی دوست کو مدعو کر کے سینما بھی دیکھوں گا۔ اور جب وقفہ ہوگا تو اسے بتاؤنگا کہ یہ فیاضی کیوں کی جا رہی ہے۔ وہ یقیناً میری خوش قسمتی کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ میری عقل و دانش کی تعریف کرے گا۔

مجھے ریشمی ٹائی، موزہ کی جوڑی، جیبی رومال، گھڑی کا تسمہ اور ایسی ہی دو چار چیزیں بھی خریدنی تھیں۔ غرض یہ کہ اس نوٹ کو جلد سے جلد ختم کر دینے کے لئے فردِ حساب تیار کر لی گئی۔ مگر بڑھا جانے کا نام نہیں لیتا تھا۔

میری چائے ختم ہوتے ہی اس نے ساتویں پیالی اپنے واسطے منگالی کیونکہ وہ بہت دیر پہلے ہی چھٹی پیالی ختم کر چکا تھا۔ اس نے تیسرا سگریٹ جلاتے ہوئے پیکٹ میری طرف بڑھایا اور میں نے بھی اس کو نقصان پہنچانے اور کچھ دیر بیٹھے کی غرض سے قبول کر لیا حالانکہ میں سگریٹ پینے کا عادی نہیں ہوں۔

اس نے چائے پینے اور سگریٹ کے کش لگانے کے ساتھ ساتھ اخبار کا مطالعہ جاری رکھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ پہلے اور دوسرے صفحات کی اہم خبریں ختم کر لینے کے بعد اس کی نظریں امراض جنسی کی دواؤں کے اشتہارات پر جم گئی ہیں جو سینما کے اعلانات کے ساتھ تیسرے صفحہ پر شائع ہوئے تھے۔

"آج الفنسٹن سینما میں کون سا فلم چل رہا ہے؟" میں نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے پوچھا۔

"زمبو کا نواسہ داماد" اس نے نظر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

"آپ یہ فلم دیکھ چکے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی نہیں آج جانے کا ارادہ ہے۔" اس نے بدستور جواب دیا۔

"میرا بھی خیال ہے۔" میں نے اس فردِ حساب پر نظر ڈالتے

ہوئے کہا جو دس روپے خرچ کرنے کے سلسلے میں تیار کی گئی تھی۔
"پھر کیوں نہ اکٹھے چلیں۔ فلم اگر تنہا دیکھا جائے تو پورا لطف حاصل نہیں ہوتا۔"

"میں خوشی سے آپ کی دعوت قبول کرتا ہوں۔" اس نے ایک لمحے کے لئے اخبار سے نظریں ہٹائیں۔ "بتلایئے ہم لوگ شام کو کس جگہ ملیں۔ میں دفتر سے عموماً ساڑھے چار بجے واپس آجاتا ہوں اور شام کو بھی اسی ہوٹل میں چائے پیتا ہوں۔"

"آپ دفتر سے ساڑھے چار بجے واپس آتے ہیں لیکن جاتے کب ہیں؟" میں نے گھنٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ دس بجنے میں دو منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ اور پہنچتے پہنچتے آپ کو کافی دیر ہو جائے گی۔"

"جی۔ کوئی پروا نہیں۔" اس نے "ضرورت شادی" کے اشتہارات دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں عموماً دیر سے جاتا ہوں، کیونکہ ہیڈ کلرک میرے بہنوئی ہیں اور ویسے بھی وہ آجکل چھٹی پر ہیں۔ اگر سارے دن نہ جاؤں تو کوئی جواب طلب نہیں کر سکتا۔"

میری طبیعت تو پہلے ہی اکتا گئی تھی۔ یہ جواب سن کر غصہ بھی آنے لگا۔ ظاہر ہے کہ میں صاف لفظوں میں اس سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ آخر ایک ترکیب سمجھ میں آگئی۔ میں نے ارادتاً اپنی پنسل نیچے گرا دی تاکہ اسے اٹھانے کے لئے جب جھکوں تو نوٹ پر بھی قبضہ کر لوں۔ مگر عین اس وقت مجھ سے پہلے وہ جھکا اور پنسل اٹھا کر مجھے دیتے ہوئے بولا۔

"غنیمت ہے۔ نوک نہیں ٹوٹی۔ آجکل پنسلیں بہت کچی آرہی ہیں۔ غالباً یہ لڑائی سے پہلے کی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے چائے کی ایک پیالی اور منگوا لی مجبوراً مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ تاہم میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ کم بخت جاتا کیوں نہیں۔ میری ٹانگ بری طرح سُن ہو کر باقی جسم سے کہیں زیادہ بارعب ہو گئی اور اس لئے کپکپانے بھی لگی تھی۔

"آج دھوپ کی تیزی ابھی سے بڑھتی جا رہی ہے" میں نے کچھ دیر کے بعد نزاکتِ وقت کا احساس دلانا شروع کیا۔ "گرمیوں کی یہ جھلسا دینے والی دھوپ۔ خدا جانے کب کم ہو گی باہر نکل کر چند قدم چلنا دشوار ہو جاتا ہے اور آپ کے پاس چھتری بھی نہیں ہے۔ بھلا آپ دفتر تک کس طرح پہنچیں گے۔" میں نے اپنی چھتری پر نظر ڈالتے ہوئے بات ختم کی۔

"کوئی فکر نہیں۔" اس نے چائے کی اور پیالی منگاتے ہوئے کہا۔ "میرا گھر یہاں سے قریب ہے اور میں دفتر جانے سے پہلے گھر جا کر چھتری لے لوں گا۔ لیکن آپ — کیا آپ دفتر نہیں جائے گے؟"

"جی نہیں۔" میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ "میں نے آٹے کے راشن کی دکان کر رکھی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ آج پیر ہے۔ آج کے دن عموماً سب دکانیں بند رہتی ہیں۔"

یہ سن کر وہ کسی قدر کسمسایا اور اخبار کو لپیٹنا شروع کر دیا۔ میں دل ہی دل میں خوش تھا کہ چلو یہ فقرہ کامیاب رہا۔ اب اس مشکل سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ اخبار کو جیب میں رکھتے ہوئے وہ جھکا اور معنی خیز نظروں سے فرش کا جائزہ لینے لگا۔

میرے تمام جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔
"کیا آپ کی کوئی چیز گم ہو گئی ہے؟" میں نے سادگی سے دریافت کیا۔

"جی نہیں۔" اس نے اپنی نظریں فرش سے اٹھاتے بغیر کہا۔ "لیکن کچھ دیر پہلے یہاں دس روپے کا نوٹ لیٹا پڑا تھا۔ نہ جانے کہاں چلا گیا۔"

میں نے بھی اس کا ساتھ دینے کی غرض سے نیچے جھک کر دیکھنا شروع کیا۔ لیکن عین اس وقت، معلوم نہیں کیوں شاید دلی گھبراہٹ کی وجہ سے، میرا پاؤں ایک طرف کو کسی قدر کھسک گیا۔ اور نوٹ کا کنارا نظر آنے لگا۔ اب اسے دبائے رکھنا غیر ممکن بلکہ نامناسب بھی تھا۔ لہٰذا میں نے جھک کر اسے اٹھا لیا اور میز پر رکھتے ہوئے کہا:۔

"کیا آپ کا مطلب اس سے ہے؟"

"جی ہاں۔" وہ بولا۔ "کافی دیر ہوئی میری نظر اس پر پڑی تھی۔ نہ جانے کس شخص کا گرا ہو گا۔"

"لیکن اب کیا کرنا چاہئے؟" میں نے بڑے بھولے پن سے دریافت کیا۔

"میری تجویز یہ ہے۔" اس نے بھی سیدھے سبھاؤ کہا۔ "ہم دونوں

کے بلوں کا حساب چکتا ہونے کے بعد جو رقم بچے وہ دو برابر حصوں میں تقسیم کر لی جائے۔"

فیصلہ نہایت معقول تھا۔ اس سے بہتر ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے فوراً ملازم کو بلا کر وہ نوٹ دے دیا۔

دونوں بلوں کی رقم پونے دو روپے ہوئی تھی۔ چونی ملازم کو دیدی۔ چار چار روپے ہم دونوں نے لے لئے۔ اس کے بعد اُس نے گھنٹے پر نظر ڈالی اور مجھ سے پہلے اُٹھ کر چلا گیا غالباً اسے پہلی بار ضرورت سے زیادہ دیر ہو جانے کا احساس ہوا تھا۔ ایک دو منٹ بعد میں بھی میز اور کرسی کا سہارا لیتا باہر نکل گیا۔ دو چار دفعہ حرکت دینے سے ٹانگ کی کیفیت ٹھیک ہو چلی تھی۔

باہر جا کر میں نے ایک ایک روپے کے چاروں نوٹ اپنی جیب میں رکھنے چاہے لیکن یہ معلوم کر کے مجھ پر بجلی سی گر پڑی کہ وہ دس روپے کا نوٹ جو ڈھائی دن کے اخراجات پورے کرنے کے لئے میرے بجٹ میں باقی رہ گیا تھا، جیب میں نہیں ہے۔ زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ معاملہ بالکل واضح تھا۔ یعنی جب مرچوں کی زیادتی کے باعث میری ناک سے پانی بہنے لگا اور میں نے دو تین بار رومال نکال نکال کر اسے صاف کیا تو کسی ایک دفعہ نوٹ بھی اس کے ساتھ لگ کر نیچے گر پڑا۔ اور وہ نوٹ وہی تھا جس کے حصے کر دئے جانے کے بعد اب صرف چار روپے میرے پاس تھے۔ لے دے کے یہ میری غلطی تھی کہ رومال اور نوٹ ایک ہی جیب میں کیوں رکھے۔ لیکن ایسی غلطیوں کا احساس بھی تو وقت گذر جانے کے بعد ہی ہوا کرتا ہے۔

میں مغموم و پریشان تمام واقعات پر غور کرتا دفتر کی جانب چل پڑا۔ زیادہ دُور نہیں گیا تھا کہ دھوپ کی تپش نے ناک میں دم کر دیا اور معاً مجھے اپنی چھتری کا خیال آیا ـــــ چھتری! وہ تو ہوٹل ہی میں رہ گئی تھی۔

میں تیزی کے ساتھ واپس لوٹا لیکن وہ اس جگہ موجود نہیں تھی۔ منیجر سے دریافت کیا تو وہ کسی قدر ترش روئی سے بولا۔

"واہ کیا خوب! وہ تو اُسی وقت آپکے والد صاحب لے گئے۔"

"میرے والد صاحب!" میں آنکھیں نکال کر غضبناک لہجہ میں کہا، اور اس وقت سے بیس سال پہلے اپنے والد کا مرنا یاد آ گیا۔

"بہرحال وہ جو کوئی بھی ہوں۔" منیجر نے کہا۔ "تھے تو آپ کے بزرگ۔ اب والد ہوں یا چچا۔ یا محض واقف کار۔ مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہاں سے جاتے وقت چھتری انہی کے ہاتھ میں تھی۔"

ہوٹل کے ملازم نے اس بیان کی تائید کی۔

"لیکن چھتری تو میری تھی۔" میں نے کسی قدر بگڑ کر کہا۔ "میں اپنے ساتھ لایا تھا۔"

"مجھے کیا معلوم" منیجر نے کہا۔ "آپ ایک ساتھ مل کر اس طرح کھانا کھا رہے تھے کہ یہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ آپ کی کسی چیز کو اُٹھا کر لے جائیں گے۔ اگر ان کا گھر معلوم ہو تو وہاں جا کر لے آئیے۔"

بھلا میں اسے کس طرح سمجھاتا کہ یہ اس مردود سے پہلی ملاقات تھی۔ مجبوراً مجھے خاموش ہو کر چلا جانا پڑا۔ تاہم میں نے ہمیشہ کے لئے قسم کھائی کہ اب کسی ہوٹل میں قدم بھی نہیں رکھوں گا۔"

اختتامیہ:- ان واقعات کو سُن کر آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں جمعہ کے دن اپنے عزیز دوستوں کی بات ٹالتے ہوئے ان کے ساتھ ہوٹل جا کر شریک طعام نہ ہونے میں حق بجانب ہوں یا نہیں۔ پھر یہ راز میرے دوستوں کو معلوم ہو جائے تو ظاہر ہے کہ وہ کسی نہ کسی جمعہ کو مل کر مجھے مجبور کریں گے کہ ہوٹل میں چلو، اپنی قسم توڑ دو اور اس کا کفارہ ادا کرتے ہوئے اپنی جیب خاص سے ہمیں پیٹ بھر کر کھانا کھلاؤ۔

اگر یہ صورت کبھی پیدا ہو گئی تو آپ کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ وہ میری زندگی کا تیسرا تلخ تجربہ ہوگا۔ جسے میں کسی قیمت پر بھی حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ اسی لئے آپ سے التجا ہے کہ آپ اس راز کو اپنے سینے میں اچھی طرح محفوظ رکھیں۔ میرے کسی دوست کے کانوں تک اسکی بھنک بھی پہنچی تو نتیجہ بُرا رہیگا۔ وہ زبردست احتیاط جو اب تک برتی گئی ہے، آپ کی ذرا سی لغزش سے خاک میں مل جائے گی۔

ابواللیث صدیقی

اُردو شاعری میں اشاریت

استعارہ اور کنایہ شاعری کی جان ہے۔ اس کے نمونے اور مثالیں کم و بیش ہر دور اور دنیا کی ہر زبان میں ملتے ہیں، اُردو بھی اس سے محروم نہیں۔ مرزا غالب نے ہمارے شعرا کے اس مسلک کو اس طرح واضح کیا ہے۔

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں بادہ و ساغر کہے بغیر

اُردو کے متقدمین شعرا کا دور خاص طور پر استعاروں اور کنایوں کا محتاج تھا، شخصی حکومت کا دور دورہ تھا، اور شعر و ادب کی ناقدردانی نے شعرا کو ایسا مجبور کر دیا تھا کہ سخن ہائے گفتنی بھی لب تک نہیں لا سکتے تھے، یوں غزل گو شعرا کا کلام خارجی واقعات اور معاملات سے بظاہر غیر متعلق نظر آتا ہے لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے ماحول میں رہ کر اس سے متاثر نہ ہوں۔ شاعری کے لئے حساس طبیعت پہلی شرط ہے، شاعر کا دل ایسا نازک آئینہ ہوتا ہے کہ معمولی واقعات اور واردات بھی اس پر گہرے نقوش مرتسم کر دیتے ہیں پھر جس سیاسی خلفشار، ذہنی اُلجھن، معاشی بدحالی اور نفسا نفسی میں انہوں نے اپنے دن گزارے اس کا اثر کس طرح قبول نہ کیا ہوگا، لیکن اس وقت آج سے بہت زیادہ محفل میں زبان بندی کا دستور تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے اشاروں اور کنایوں میں کہا ہے۔

گل و بلبل، شمع و پروانہ، قیس و فرہاد، ساقی، بادۂ خمار، محتسب، اور اس قبیل کی دوسری علامات سے ہمارے شعرا کی کیا مراد تھی، اسکی تشریح کیلئے ایک شعر دیکھئے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اس میں غزال، مجنوں، دوانہ، ویرانہ سب خاص علامات ہیں۔ شاعر دراصل عرب کے تاریخی مجنوں اور اُس کی وفات کا ذکر نہیں کر رہا ہے نہ اُس کے مرنے سے ویرانے پر کچھ گزر سکتی ہے۔ نہ خود شاعر دیوانوں کی طرح غزال صحرائی سے ہمکلام ہے۔ ایک ہندوستانی شاعر نے سراج الدولہ کی بیکسی اور بے بسی کی موت کی خبر سن کر ایک مجمع میں اسے پڑھا تھا، سراج الدولہ کی وفات کے بعد بنگال پر جو کچھ گزری وہی عالم ہے جو مجنوں کے بعد ویرانہ پر گزرنا تصور میں آتا ہے۔ چند اشعار اور ملاحظہ ہوں، تاریخی واقعات کی طرف لوگوں نے توجہ نہیں کی ہے لیکن جذبات کی شدت اور اُن کے عام ماحول کو پیش نظر رکھیں تو ان اشعار میں لفظوں کے ماوری کچھ اور ہی نقوش نظر آتے ہیں۔

ویراں ہوا ہے باغ خزاں سے یہاں تلک (حزیں)
چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں

گنجشک و بلبل اب نہیں گل شاخسار پر (میرحسن)
کیا اوس پڑ گئی ہے چمن میں بہار پر

اے باغباں نہیں ترے گلشن سے اب غرض (میرحسن)
ہم کو قسم جو توڑیں ترے برگ بر کہیں

اتنا ہی چاہتے ہیں کہ ہم اور عندلیب (راقم)
آپس میں دردِ دل کہیں ٹک بیٹھ کر کہیں

پوچھے ہے پھول پھل کی خبر اب تو عندلیب (سودا)
ٹوٹے جھڑے، خزاں ہوئی میوے کھلے گئے

دل بستگی قفس سے یہاں تک ہوئی مجھے (فغاں)
گویا کبھی چمن میں مرا آشیاں نہ تھا

ہم اسیروں کو بھلا کیا جو بہار آئی نسیم (قمر)
عمر گذری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات (میر)
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

گل کی جفا بھی دیکھی دیکھی وفائے بلبل (میر)
اک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل

بے بسی سے تو تری بزم میں ہم بیٹھے ہیں (میر)
نیک و بد کوئی کہے ہم بیٹھے سنا کرتے ہیں

اس کے کوچے میں نہ کر شورِ قیامت کا ذکر (میر)
ایسے ہنگامے تو یاں روز ہوا کرتے ہیں

ذروں میں کس کے رقص سے پیدا ہیں بیتابیاں (ممتاز)
ہیں اب خزاں تو موج روؤں بہار میں لطافا

چھوٹے اگر قفس سے تو خاموش ہم صفیر (محمد ...)
تمہارے سنے نہ ترانہ تو ہم رہے

یہ چند اشعار ہیں جو سرسری طور پر اپنے حافظے سے لکھ دئے ہیں۔ ان میں قدیم پرانے استعارے اور علامتیں ہیں جو اُردو شعرا دکنی دور سے عہد جدید تک [illegible] زمانے تک استعمال کرتے رہے لیکن [illegible] شدت سے اس سیاسی اور ملکی [illegible] کی طرف اشارے ملتے ہیں جس کی تفصیل تاریخوں میں مذکور ہے اور جس میں ان شعراء نے اپنے دن گزارے۔

متقدمین کو چھوڑ کر دور جدید پر آئیے تو [illegible] پنچ کے رنگ میں طنز و ظرافت سے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور طنز و ظرافت میں شدت پیدا کرنے کے لئے نئی [illegible] علامات کا استعمال کیا۔ اونٹ، کالج، مولوی، بابو، [illegible] کمسریٹ، بسکٹ، ہوٹل، کلب، مدعو، چمن، لسانی، شیخ صاحب، لاٹ صاحب، گزٹ، ڈارون، کالج، [illegible] کونسل، [illegible] یہ سب ایسے محور ہیں جن پر اکبر کا شاعرانہ تصور گردش کرتا رہتا ہے۔ ان میں سے ہر لفظ چند خصوصیات کا حامل اور ترجمان ہے۔ بڑی حد تک اکبر کی شاعرانہ فنکاری انہیں مکمل علامات کی بدولت کامیاب ہے۔

موجودہ دور میں اقبال نے اُردو شعرا میں غالباً سب سے زیادہ ان علامات شعری سے کام لیا ہے۔ اقبال کے متعلق انتہا پسندوں کی دو رائیں ہیں اور دونوں صحیح نہیں، بعض لوگ انہیں صرف شاعر یا بڑی حد تک شاعر سمجھتے ہیں اور بعض انہیں سرتاپا فلسفی یا پیغمبر مانتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس شخص نے میر کو شاعری کا پیغمبر نہیں بلکہ خدا بتلایا ہے اُس نے اقبال کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ کیونکہ اقبال ہی شاعری اور پیام کے باعث اس خطاب کے مستحق ہیں۔ اُنہوں نے اُردو کو نہ صرف گہرے خیالات سے باوزن اور گرانبہا بنایا بلکہ شاعری کے پیکر کو بھی نیا ملبوس عطا کیا اور اس کی تیاری میں شاعرانہ علامتوں سے خاص کام لیا۔ بعض پرانی علامتوں کو نئے معانی بخشے اور بعض نئے اشارات استعمال کئے۔ ان میں سے بعض علامات کی تکرار کلام میں جا بجا ملتی ہے اور دراصل یہی تکرار ان کے فلسفے کی تشریح اور تفصیل ہے۔ ان استعاروں اور علامتوں میں کس قدر وسعت اور معنوی گہرائی ہے اس کا اندازہ اس تشریح سے ہوتا ہے جو خود اقبال نے شاہین کے بیان میں فرمائی ہے۔ اپنے ایک خط (مطبوعہ علی گڑھ میگزین اقبال نمبر) میں لکھتے ہیں۔

"شاہین محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں (۱) خوددار و غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا (۳) بلند پرواز ہے (۴) خلوت پسند ہے (۵) تیز نگاہ ہے۔"

شاہین کے علاوہ فرہاد و پرویز، قیس و لیلیٰ، جام و مینا، ساقی و بادہ کش، گل و بلبل، شمع و پروانہ بعض ایسے پرانے استعارے ہیں جو نئے مفہوم ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ شہباز، کبوتر، ممولہ، زاغ و زغن، قصرِ سلطانی، خضر و راہی، کلیم و ضربِ کلیم، ابراہیم و نارِ نمرود نئے نئے مطالب ادا کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض علامتیں دریا کی اس خاموش سطح کی طرح ہیں جس پر بظاہر کچھ نظر نہ آتا ہو لیکن جس کی تہ میں ہزاروں طوفان موجیں مار رہے ہوں۔ اقبال کا یہ آرٹ ان کی پہلی کلیات بانگ درا کے تیسرے حصے سے ہی شروع ہو جاتا ہے اور بتدریج ترقی کرکے بال جبریل اور ضرب کلیم میں منتہائے کمال کو پہنچ جاتا ہے۔

اقبال کے بعد وہ دور شروع ہوتا ہے جسے جدید ادب اور ترقی پسند ادب کے عہد کہتے ہیں۔ میری مراد ۱۹۳۵ء کے بعد کی نظم سے ہے۔ حسبِ دستور اس جماعت کے شعرا اپنی ہر تحریک اور رجحان کا سلسلہ نسب براہ راست مغربی تحریکات اور میلانات سے ملاتے ہیں۔ ان کے بقول جدید شاعری میں اشاریت کا آغاز فرانس میں ہوا، جہاں انیسویں صدی کے

نصف آخر سے اس تحریک کے علمبرداروں نے اس میں نئے نئے تجربے کرکے آخرکار ایک نئے فن کی بنیاد ڈالی، اس جماعت کے پیشرو یا پہلے فنکار Verlaine, Baudelaire اور Mallarmé ہیں یہ لوگ صاف اور سادہ شعر کو حسن سے معرا سمجھتے تھے، ان کے نزدیک شعر کی خوبی یہ تھی کہ اسے پڑھکر سامع کا ذہن الفاظ کی تہ میں پوشیدہ معانی کی تلاش و جستجو میں مصروف ہو جائے، ان کے نزدیک سادہ بیانی اور صاف گوئی شعر کے کم از کم تین چوتھائی حسن کو زائل کر دیتی ہے کیونکہ اس طرح تخیل کی جولانی کے لئے کوئی میدان باقی نہیں رہتا جس میں سامع لطف اندوز ہو سکے۔ اچھے شعر کے لئے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ وہ عوام کی سطح سے بلند بلکہ معمہ و چیستان رہے، تاکہ پڑھنے والے اپنی دماغی صلاحیتوں سے کام لے کر تخیل کی بدولت اشیاء کی تخلیق اس طرح کر سکیں جس طرح فنکار نے کی ہے۔ کیونکہ یہی ادب اور مطالعہ ادب کا مقصد ہے۔ اشاریت کی اس تحریک کا مغرب میں سب سے نامور علمبردار مترلنک ہے جس کی نظمیں عام طور پر بھول بھلیاں معلوم ہوتی ہیں انہیں پڑھکر یہ بتانا کہ شاعر آخر کیا کہنا چاہتا ہے ناممکن ہے اشاریت اگر اس منزل پر پہنچ جائے تو ابہام کی صورت پیدا ہو جاتی ہے میرے خیال میں یہ اشاریت کی ایک انتہائی شکل ہونے کے باوجود صحیح اشاریت سے جدا اور آرٹ کی کامیابی میں حائل ہے۔

آرٹ کیا ہے؟ اور اس کا مقصد کیا ہے؟ آرٹ اظہار expression ہے لیکن اس کا مقصد صرف اظہار ہی نہیں ترجمانی communication اور تصور زائی suggestion بھی ہے آرٹ کی تکمیل بڑی حد تک ترجمانی communication کے تناسب پر منحصر ہے۔ بعض آرٹسٹ ضرور ایسے بھی مل جائیں گے جو اپنی انفرادیت میں اس حد تک غرق ہوں کہ ان کو اپنے مخاطب کے وجود کا احساس اور اس کی صلاحیتوں کا اندازہ نہ رہے۔ وہ بیشک ان سب کی طرف سے آنکھ بند کرکے جو کچھ کہتا سنتا ہے اپنے ہی لئے کہا کرتا ہے۔ اور اس پر اصرار کرتا ہے۔ مرزا غالب ایک حد تک اپنے پہلے دور میں اسی جذبے کے ماتحت مشکل پسندی اختیار کرتے ہیں اور بار بار سہل گوئی کی فرمائش پر بالآخر کہہ اٹھتے ہیں۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن کتنے دن وہ اس روش پر قائم رہ سکتے، آخرکار انہیں آرٹ کے اصلی مقصد (communication) ترجمانی کے سامنے جھکنا پڑا۔

قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر ان علامات میں الجھن اور پیچیدگی پیدا کیوں ہوتی ہے؟ جواب ظاہر ہے۔ علامات اور اشارات میں داخلی رنگ کی کثرت یا بہ الفاظ دیگر تمثیلی رنگ کی فراوانی، مرزا غالب کے یہاں آخرالذکر سبب کارفرما ہے غالب نے ابتدائی دور میں جن فارسی گو شعرا کے کلام کو پیش نظر رکھا ان کا طرۂ امتیاز ہی تمثیل نگاری ہے۔ موجودہ دور میں تمثیل سے زیادہ داخلی رنگ کی زیادتی نے علامات کے استعمال کو چیستان بنا دیا ہے جس کا ایک نمونہ میراجی کے یہاں ملتا ہے۔ ان کا کلام موضوعات کے اعتبار سے بھی خرافات کے تحت میں آتا ہے، اس پر داخلی اشاریت مستزاد ہے۔ ایک نظم کا عنوان ہے "لبِ جوئبارے" کیوں؟ اس نظم میں ایک عورت کا ذکر ہے جو سڑک پر پیشاب کرنے بیٹھی اور اٹھ کھڑی ہوئی عنوان سے مفہوم میراجی یا ان کے واقف کار ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ایک اور نظم میں محبوبہ کی آنکھوں سے پھیل جانے والے کاجل کو کالا کلوٹا کوا کہا ہے، ایک اور نظم میں جس کا عنوان لگاوٹ ہے اس قسم کی کئی علامتیں استعمال ہوتی ہیں جنسی ہیجان کے اظہار اور اس کی تسکین کے وسائل میں میراجی نے خاص طور پر ان علامات اور اشارات سے کام لیا ہے۔

ن۔م۔ راشد اور فیض کی شاعری شہاب ثاقب کی طرح گزر گئی۔ تاہم ان کے عمدہ کلام میں یہ اشاریت بڑی حد تک اشاریت ہی رہتی ہے۔ فیض نے راشد کی ایک نظم کا ذکر کیا ہے:۔

جاگ اے شمع شبستانِ وصال
محفلِ خواب کے اس فرشِ طربناک سے جاگ
لذتِ شب سے ترا جسم ابھی چور سہی

آمری جان مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوارِ سحر چومتے ہیں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنا کا خیال آتا ہے

اس میں مسجد کے میناروں کو عالی ہمتی اور بلند خیالی کی علامت قرار دیا ہے، ایک اور نظم جس کا عنوان خودکشی ہے ملاحظہ ہو۔

کر چکا ہوں آج عزمِ آخری
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
میرا عزم آخری یہ ہے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج
آج میں نے پا لیا ہے زندگی کو بے نقاب
جی میں آئی ہے لگا دوں ایک بیباکانہ جست
اس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئے بام تک
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
آج تو آخر ہم آغوشِ زمیں ہو جائے گی

اس نظم کو میں ترقی پسند رجحانات کا آئینہ دار تو نہیں سمجھتا کیونکہ اس میں زندگی سے فرار کا شائبہ موجود ہے لیکن غلامی کی دیوار کو سدِ سکندری اور اپنی سیاسی جد و جہد کو یاجوج و ماجوج کے عمل سے مشابہ بتایا ہے جو دن رات اس دیوار کو چاٹتے رہتے ہیں اور وہ اسی قدر بلند ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں ذہن علامت کی طرف بآسانی منتقل ہو جاتا ہے اور یہ جدید اشاریت کا ایک صحت مند نمونہ ہے۔

ایک مثال خود فیض کے یہاں ملاحظہ ہو:۔

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ
رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرم ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جا بجا نور نے اک جال سا بُن رکھا ہے
دُور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے
تیرا سرمایہ۔ تری آس یہی ہاتھ تو ہیں
اور کچھ ہے بھی ترے پاس؟ یہی ہاتھ تو ہیں
تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دل
رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے۔

اس قسم کی مثالیں اس جماعت میں ڈاکٹر تاثیر، یوسف ظفر، احمد ندیم قاسمی، مختار صدیقی وغیرہ کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ سلام مچھلی شہری کو میری رائے میں اس جماعت سے نکال کر میراجی کے ساتھ شمار کرنا چاہیئے۔

تصانیف مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم

روحِ ظرافت:۔ چغتائی صاحب کے آٹھ دلکش افسانوں کا مجموعہ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے اس کتاب کا دیباچہ اس قدر پُر لطف لکھا ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ پہلا افسانہ "انگوٹھی کی مصیبت" وہ مشہور و معروف افسانہ ہے جو چغتائی صاحب کی شہرت کا باعث ہوا۔ اسی طرح یکّہ، الشذری اور شاطر کی بیوی وغیرہ بھی ہر نوعیت سے تفریح دماغ کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ قیمت دو روپے؛ علاوہ محصول ڈاک؛

روحِ لطافت:۔ چغتائی صاحب کے آٹھ چیدہ چیدہ افسانوں کا مجموعہ۔ پہلا افسانہ "مہارانی کا خواب" ایک بہت ہی عجیب و غریب رومانی افسانہ ہے جس میں راجپوت مہارانیوں، انکی خواب جیسی زندگی، محلات کی جگمگاتی تصویریں، عشق و محبت کے دلدوز مناظر وغیرہ پڑھنے کی چیزیں ہیں۔ اس خونچکاں داستان نے پڑھنے والوں کو تڑپا کر رُلا دیا ہے، باقی سات افسانے اسقدر ہنسانے والے ہیں کہ ہنستے ہنستے آپ بے حال ہو جائیں گے۔ قیمت دو روپے؛ علاوہ محصول ڈاک؛

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بک ڈپو؛ دہلی؛

غلام عباس

ناک کاٹنے والے

تین شخص چُغے پہنے سر پر آڑی ترچھی پگڑیاں باندھے ننھی جان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور چاندنی پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ گئے۔

"مزاج تو اچھے ہیں سرکار!" رنگ علی نے کہا۔

ان تینوں میں سے کسی نے اُس کی مزاج پُرسی کی رسید نہ دی۔

گلابی جاڑوں کے دن تھے۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ رات خاصی جا چکی تھی۔ ایک منٹ تک خاموشی فضا پر چھائی رہی۔ جس کے دوران میں تینوں آدمی تیز تیز نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتے رہے۔ اِس کمرے سے ملا ہوا ایک چھوٹا کمرہ تھا۔ جو خواب گاہ کا کام دیتا تھا۔ انہوں نے اپنے کیچڑ بھرے چپل نہیں اُتارے تھے۔ جس کی وجہ سے اُجلی چاندنی پر دھبے ہی دھبے پڑ گئے تھے۔

"جبار خاناں" اُن میں سے ایک نے دوسرے سے کہا "تو پوچھو نہ کہ تمہارا رنڈی لوگ کدھر ہے؟"

"تمہارا رنڈی لوگ کدھر ہے؟" جبار خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"باہر گیا ہے" رنگ علی نے کہا۔ جس وقت وہ آئے تو یہ پان بنا رہا تھا۔

"باہر کدھر؟" جبار خاں نے پوچھا۔

"سینما دیکھنے سینما۔ بائیسکوپ" رنگ علی نے کہا۔

"کیا کہتا ہے؟" پہلے آدمی نے جبار خاں سے پوچھا۔

"کہتا ہے باہر گیا ہے بائیسکوپ کا تماشہ دیکھنے"

"خو تماشہ دیکھنے جاتا ہے!" پہلے آدمی نے کہا۔

"بائی جی تو جاتی بھی نہیں تھیں" رنگ علی بولا۔ "وہ تو چشتی صاحب زبردستی لے گئے"

"کیا کہتا ہے؟" پہلے آدمی نے جبار خاں سے پوچھا۔

"کہتا ہے چشتی صاحب زبردستی لے گیا"

"خو چشتی کے ساتھ جاتا ہے!" پہلے آدمی نے کہا۔ وہ ڈیل ڈول میں اپنے دونوں ساتھیوں سے کم تھا۔ مگر اُسکے خدوخال دونوں سے زیادہ درست تھے۔ گلے میں سیاہ دھاریوں والے سُرخ گلوبند کے دو بل دے کر، سرے چُغے کے اندر کر رکھے تھے اُس کے دانت پیلے پیلے تھے۔ چوڑا دہانہ، بائیں رُخسار پر آنکھ سے ذرا نیچے ایک گہرے زخم کا نشان تھا۔

"خو رنڈی منڈی کوئی نہیں تو اتنا روشنی کس واسطے کیا؟" اُس نے رنگ علی سے پوچھا۔ جب وہ بات کرتا تو اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو فقرے کے ادھ بیچ میں آدھا بند کر لیتا۔

رنگ علی نے کوئی جواب نہ دیا۔

"بولو!" جبار خاں نے کہا "ہم تم سے کیا کہتا ہے؟" اس کا رنگ سانولا تھا۔ عمر میں وہ اپنے دونوں ساتھیوں سے کافی بڑا تھا۔ اُس کے اوپر کے ایک دانت پر پلٹینم کا خول چڑھا تھا۔ جو کافی گھس چکا تھا۔ اور ہڈی نظر آنے لگی تھی۔

رنگ علی اب بھی خاموش رہا۔

"ہم اتنا سیڑھی کس واسطے چڑھ کے آیا؟" تیسرے آدمی نے پوچھا۔ اپنے دونوں ساتھیوں کی طرح اس نے بھی گلے میں گلوبند لپیٹ رکھا تھا۔ اس کی پیشانی تنگ تھی۔ اور ناک پر ایک بڑا سا مسّا۔ اُس کی آنکھوں میں سُرخی اس طرح نظر آتی تھی جیسے لہو کی چھینٹ پڑ گئی ہو۔ ان میں سے کسی کی ڈاڑھی بھی ہفتے بھر سے کم کی مُنڈی ہوئی نہیں تھی۔

رنگ علی بے وقوفوں کی طرح ایک ایک کا مُنہ تک رہا تھا۔ اُسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے۔

"خو تمہارا مُنہ میں زبان نہیں ہے؟" تیسرے آدمی نے کہا۔ پھر وہ پہلے آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔ "صحبت خاں اسکا مُنہ میں زبان نہیں ہے!"

لہ اِس افسانے میں امریکن افسانہ نگار ہیمنگ وے کی پیروی کرنے کی کوشش کی گئی ہے طرز انشا میں بھی اور انتخاب موضوع میں بھی۔

"سرکار کیا عرض کروں۔" رنگ علی نے کہا۔ "بائی جی تو جانی بھی نہیں تھیں۔۔۔"

"جبار خاں" صحبت خاں نے کہا "اس سے پوچھو کب آئے گا؟"

"تمہارا رنڈی لوگ کب آئے گا؟" جبار خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"تو ساڑھے بارہ بجے ختم ہوتا ہے سرکار۔" رنگ علی نے دیوار پر لگے ہوئے کلاک کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بس کوئی گھنٹے پاؤ گھنٹے تک آ جائے گا۔"

"کیا کہتا ہے؟" صحبت خاں نے جبار خاں سے پوچھا۔

"کہتا ہے تین پاؤ گھنٹے میں آ جائے گا۔"

"حسینی صاحب کی دیوار سے سر ہو رہے تھے" رنگ علی بولا۔ "بائی جی ہر بار نہیں جایا کرتی رہیں۔ آج تو بہت ہی مصر ہوئے کہنے لگے قلم ایک مرتبہ بڑی منتوں سے سب ریکارڈ کرائی ہیں اجازت دے دیجئے۔"

میں اس وقت شہبوں میں کچھ آہٹ ہوئی، تینوں آدمی چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"جبار خاں" صحبت خاں نے کہا۔ "اس مدبخت کو کہو چپ ہو جائے۔"

"چپ ہو جاؤ۔"

کچھ لمحے خاموشی میں گزرے کہ حسین بخش ڈھیلے کی شلوار پہنے بائیسوری کی دھن گنگناتا داخل ہوا۔ تینوں کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا اور کمرے میں داخل ہوا اور ان سے ذرا ہٹ کر جا دری کے پاس جہاں سارنگی غلاف کی ہوئی رکھی تھی بیٹھ گیا۔

"سلام سرکار" حسین بخش نے کہا

"یہ کون ہے؟" صحبت خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"یہ حسین بخش ہیں۔"

"کیا کرتا ہے؟"

"یہ سارنگیے ہیں۔"

"سارنگیے کیا؟"

"سارنگی بجاتے ہیں۔ سارنگی جو ساز ہے۔"

"خو تو سازندہ کیوں نہیں کہتا۔"

"ہاں ہاں وہی۔"

"اور تم خود کیا کرتا ہے؟" جبار خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"میں طبلہ بجاتا ہوں۔" رنگ علی نے کہا۔

"خو تو تم بھی سازندہ ہے؟"

"جی ہاں۔"

"جبار خاں" صحبت خاں نے جبار خاں سے کہا۔ "پوچھو، ادھر کون کون رہتا ہے!"

"بائی جی ہم دو سازندے اور ایک نوکر تھی" رنگ علی نے جواب دیا۔

"خو نوکر کدھر ہے؟" صحبت خاں نے پوچھا۔

"بائی جی کے ساتھ گیا ہے۔" رنگ علی نے جواب دیا۔

"ہوں۔ ہوں۔"

باہر بوندیں کبھی ذرا تیزی سے پڑنے لگی تھیں۔ نیچے سڑک پر سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد تانگے کے گھوڑے کی ٹاپ جس میں گھنگھروؤں کے سُر بھی شامل ہوتے۔ سنسانی میں جب گیلی سڑک پر گھوڑے کا سُم پڑتا تو بڑی پاٹ دار آواز نکلتی۔

"تم نے لوگا ابھی تمان تین پاؤ گھنٹے میں آئے گا؟" صحبت خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

حسین بخش سہما ہوا بیٹھا تھا۔ اس نے جواب دینا چاہا:

"کیا پتہ۔۔۔"

"تم مت بکو" صحبت خاں نے درشتی سے کہا۔ پھر وہ رنگ علی کی طرف متوجہ ہوا "تمہارا بائی تین پاؤ گھنٹے میں آ جائے گا؟"

"آ تو جانا چاہیئے۔" رنگ علی نے کہا۔

"چاہیئے نہیں جانتا۔" صحبت خاں نے کہا "ہاں کہو یا نہ"

"دیکھیئے سرکار" رنگ علی نے کہا۔ "تماشہ ساڑھے بارہ بجے ختم ہوتا ہے اور اس وقت ہوئے ہیں گیارہ بج کر پچاس منٹ۔ اگر بائی جی سیدھی گھر کو آئیں۔۔۔"

"اگر مگر نہیں جانتا" صحبت خاں نے کہا۔ "صاف بولو۔"

"آخر بات کیا ہے خان صاحب؟" حسین بخش سے چپ نہ رہا گیا۔ "کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے۔"

اس کے جواب میں تیسرے آدمی نے یکبارگی آگے بڑھ کر زور کا ایک مکا اس کے منہ پر مارا۔ اس ناگہانی ضرب پر حسین بخش کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ آنسو اس کی آنکھوں میں چھلکنے

لگے۔ اُس نے سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر تک گم سُم بیٹھا رہا۔ پھر اُٹھ کر دہلیز کی طرف جانے لگا۔ جہاں اُس کا جوتا پڑا تھا۔

"اوخنزیر" جبار خاں نے کہا۔ "ٹھہرو۔ کدھر جاتا ہے؟"

حسین بخش نے ایک پاؤں جوتی میں ڈال لیا تھا۔ وہ ٹھہر گیا۔

"ادھر دیکھو" جبار خاں نے ڈپٹ کر کہا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کمانی دار چاقو تھا جس کا پھل آٹھ انچ سے کم لمبا نہ تھا۔ بجلی کی روشنی میں اُس سے شعاعیں سی نکل رہی تھیں "اگر تم پیچھے جانے کی کوشش کرے گا تو ہم تمہارا پیٹ چاک کر دے گا۔ سُن لیا۔ دروازے میں کنڈی لگا دو اور ادھر ہمارے پاس آکر بیٹھو۔"

حسین بخش کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر اُس نے جوتی سے پاؤں نکال لیا اور دروازے میں کنڈی لگا کے اسی جگہ پر آ بیٹھا۔

"شاباش۔ شاباش" صحبت خاں نے کہا۔ پھر وہ تیسرے آدمی سے کہنے لگا۔ "گلباز خاں یار ہم نے تان سین کے بیٹے کو ناراض کر دیا اب وہ ہم کو گانا نہیں سنائے گا۔"

"ہم اس کو منائے گا" گلباز خاں نے کہا۔ "ہم اسکے گدگدی کرے گا۔ تان سین کا بیٹا ہنسے گا۔ تان سین کا بیٹا پھر قوالی سنائے گا۔"

"جبار خاں" صحبت خاں نے کہا۔ "اس سے بولو ہم گانا سننے نہیں آیا۔"

"پھر کیسے آنا ہوا سرکار؟" رنگ علی نے پوچھا۔

"کیا کہتا ہے؟" صحبت خاں نے جبار خاں سے پوچھا۔

"پوچھتا ہے ہم کیوں آیا؟" جبار خاں نے کہا۔

"خود پوچھتا ہے ہم کیوں آیا؟" صحبت خاں نے کہا۔ "اُس سے پوچھو ہم کیوں آیا۔"

"تو تم بتاؤ ہم کیوں آیا؟" جبار خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

رنگ علی مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

"کیا کہتا ہے؟" صحبت خاں نے جبار خاں سے پوچھا۔

"کچھ نہیں کہتا" جبار خاں نے کہا۔

"کچھ نہیں کہتا؟"

"مسکراتا ہے۔"

"مسکراتا ہے؟" صحبت خاں نے رنگ علی سے کہا۔ "تو تم مسکراتا ہے! مسخری کرتا ہے!"

"خان صاحب بھی کمال کرتے ہیں" رنگ علی نے کہا۔ "میری مجال ہے کہ میں آپ سے مسخری کروں!"

"تو تم اچھا آدمی ہے" صحبت خاں نے کہا۔

"تان سین کا بیٹا اچھا آدمی نہیں ہے" گلباز خاں نے کہا "وہ روتا ہے۔ تان سین کا بیٹا روتا ہے۔"

کلاک میں گھرر گھرر ہوئی۔ اور اُس نے ٹن ٹن کر کے بارہ بجانا شروع کیا۔ حسین بخش کے سوا سب کی نظریں اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ کلاک سے ذرا ہٹ کر دیوار پر ایک بڑا سا رنگدار فوٹو تھا۔ جس میں چوتھائی صدی پہلے کی کوئی ادھیڑ عمر کی گانے والی گلے میں اشرفیوں کا ہار ڈالے طنبورا چھیڑ رہی تھی۔ ماتھے پر بڑی سی لونگ تھی۔ اور سیدھی مانگ نکال کر جوڑا باندھ رکھا تھا۔

"تو دیکھو" صحبت خاں نے رنگ علی سے کہا "ادھر قلیان ملیان بھی ہے؟"

"قلیان تو نہیں حقہ ہے سرکار" رنگ علی نے کہا۔

"ہم حقہ نہیں پیئے گا۔"

"پان پیش کروں؟"

"ہم پان نہیں کھاتا۔"

"سگرٹ؟"

"سگریٹ بغیر چرس کا سگرٹ کا مضائقہ نہیں ہے۔"

"چرس تو یہاں کوئی بھی نہیں پیتا سرکار" رنگ علی نے کہا۔

"رنڈی منڈی نہیں۔ قلیان ملیان نہیں چرس نہیں۔ یہ تمہارا کیسا طوائف کا مکان ہے؟" گلباز خاں نے کہا۔

"اچھا روغن کدو ہے؟" صحبت خاں نے پوچھا۔

"روغن کدو تو نہیں" رنگ علی نے کہا۔ "آنولے کا تیل ہوگا"

"خیر وہی لاؤ" صحبت خاں نے کہا

رنگ علی ایک الماری کے پاس گیا جس کے دونوں پٹوں کے چوکھٹوں میں دو لمبے لمبے آئینے جڑے ہوئے تھے۔ اور الماری کھول کر تیل کی بوتل لے آیا۔

"دیکھو تم بہت اچھا آدمی ہے" صحبت خاں نے کہا۔ "تھوڑا

تیل ہمارے سر پر ملو۔ پھر ہم تم کو بتائے گا ہم کس واسطے آیا۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنی پگڑی اُتار دی۔ معلوم ہوتا تھا یہ پگڑی بہت دیر سے اُس کے سر پر تھی۔ کیونکہ کلاہ نے اُسکی پیشانی پر گہرا نشان ڈال دیا تھا۔ اُس کے سر پر بال صرف کنارے کنارے تھے۔ بیچ میں چاند ایسی لگ رہی تھی جیسے انگور آیا ہوا پھوڑا۔

رنگ علی اُس کی پیٹھ کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑا سا تیل ہتھیلی پر ڈالا اور سر پر ملنے لگا۔

"شاباش۔ شاباش۔" صحبت خاں نے کہا۔ "ہم تم کو بتاتا ہے کہ ہم کیوں آیا۔" مگر وہ کہتے کہتے رُک گیا اور گلباز خاں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"گلباز خاں تم بتاؤ۔ یار ہم تیل ملواتا ہے۔"

"ہم بتائے گا۔" گلباز خاں نے کہا۔ "مگر پہلے تان سین کا بیٹا ہمارا ٹانگ دباتے۔"

"تان سین کا بیٹا۔" صحبت خاں نے کہا "گلباز خاں کا ٹانگ دباؤ۔"

حسین بخش بدستور سر جھکائے بیٹھا رہا۔ وہ سخت کوشش کر رہا تھا کہ ان کی طرف دیکھے۔

"تان سین کا بیٹا ہمارا ٹانگ نہیں دباتا!" گلباز خاں نے جیسے فریاد کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے ایک دھپ لگاؤ۔" صحبت خاں نے کہا۔

"ہم دھپ نہیں لگائے گا۔" گلباز خاں نے کہا۔ "ہم اس کا کان مروڑے گا۔ تان سین کا بیٹا اپنا کان ادھر کرو۔" اُس نے حسین بخش سے کہا۔

"حضور معاف کر دیجئے۔" رنگ علی نے لجاجت سے کہا۔ پھر وہ حسین بخش سے مخاطب ہوا۔ "بھائی حسین بخش ضد نہ کرو۔ اُٹھ بیٹھو اور خان صاحب کی ٹانگ دبا دو۔ اُٹھو اُٹھو بچے نہ بنو۔ موقع محل دیکھا کرو۔"

حسین بخش سخت لاچاری کے ساتھ اُٹھا اور گلباز خاں کے پاس بیٹھ کر اُس کی ٹانگ دبانے لگا۔ آنسو ابھی اس کی آنکھوں میں خشک نہیں ہونے پائے تھے۔

"ہاہا۔" گلباز خاں نے حسین بخش کی پیٹھ پر زور سے تھپکی دے کر کہا۔ "تان سین کا بیٹا اب اچھا ہو گیا۔ اب ہم بتائے گا ہم کیوں آیا۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔

"تمہارا سخی جان ہے نا؟" گلباز خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"ہاں سرکار۔" رنگ علی نے کہا۔

"اُس کا نام سخی جان ہے نا؟" گلباز خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"ہاں سرکار۔" رنگ علی نے کہا۔

"تو بس ہم اُس کا ناک کاٹنے آیا ہے۔" گلباز نے کہا۔

"اُس بیچاری کا قصور؟" رنگ علی نے پوچھا۔ مالش کرتے کرتے اس کے ہاتھ تھم گئے تھے۔ چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور آواز گلے میں اٹک اٹک گئی تھی۔

"قصور مصور کچھ نہیں۔" صحبت خاں نے کہا۔ "تم اپنا کام کرو۔"

"پھر کیا بات ہے سرکار؟" رنگ علی نے گلباز خاں سے پوچھا۔

"ہم سنا اُس کا ناک بہت لمبا ہے۔" گلباز خاں نے کہا "اچھا نہیں لگتا۔ چھوٹا ہو جانے سے خوش رو ہو جائے گا۔"

"خدا کے واسطے خان صاحب۔" رنگ علی نے گڑگڑا کر کہا "ایسا غضب نہ کیجئے گا وہ بیچاری تو بہت شریف ہے۔"

"جبھی تو ہم اُس کو خوش رو بنائے گا۔" گلباز خاں ا۔

"ہم بہت کو خوش رو بنا چکا ہے۔" جبار خاں نے کہا۔

گھڑی میں بارہ بج کر ۳۵ منٹ ہوئے تھے۔ کہ سیڑھیوں میں کئی قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ تینوں آدمیوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

رنگ علی صحبت خاں کے قدموں میں گر پڑا۔

"رسول کے واسطے خان صاحب۔" اُس نے بسورتے ہوئے کہا۔ "ہم پر رحم کیجئے۔ ہم بہت ہی مسکین لوگ ہیں۔"

دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ گلباز خاں نے رنگ علی کی کلائی مضبوطی سے پکڑ کر اسے اُٹھایا اور دروازے کے پاس لے گیا۔ پھر اُسے دروازے کے سامنے کھڑا کر کے خود اُس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

"پوچھو کون ہے؟" گلباز خاں نے رنگ علی کے کان میں کہا۔

"کون ہے؟" رنگ علی نے پوچھا۔
"دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو۔" کئی آوازیں سنائی دیں۔
"نام پوچھو" گلباز خاں نے رنگ علی کے کان میں کہا۔
"کون صاحب ہیں؟ نام بتلایئے۔" رنگ علی نے کہا۔
"ارے بھئی میں ہوں سلیم اللہ۔" دروازے کے اس طرف سے آواز آئی "جلدی کھولو دروازہ۔"
"پوچھو آپکے ساتھ کون ہے۔" گلباز خاں نے رنگ علی کے کان میں کہا۔
"اچھا شیخ صاحب ہیں!" رنگ علی نے کہا۔ آپکے ساتھ اور کون لوگ ہیں شیخ صاحب؟"
"میرے دوست ہیں بھئی۔" دروازے کے اس طرف سے آواز آئی "آخر تم دروازہ کیوں نہیں کھولتے؟"
رنگ علی نے پلٹ کر گلباز خاں کی طرف دیکھا جس نے سر ہلا کر نہیں کا اشارہ کیا۔
"شیخ صاحب معاف کیجئے گا۔" رنگ علی نے کہا۔ "اس وقت دروازہ نہیں کھل سکتا۔ بائی جی مجرے گئی ہیں۔ صبح کو آئیں گی۔ اس وقت خان صاحب وزیر خاں کے ہاں سے کچھ ہو تیں آئی ہوئی ہیں۔ ان کی وجہ سے دروازہ نہیں کھل سکتا۔ آپ کو زحمت تو ہوئی مگر مجبوری ہے۔ آپ کل تشریف لایئے گا۔"
اس پر سیڑھیوں میں کچھ دیر کھسر پھسر ہوا کی۔ پھر اترتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ جو دھیرے دھیرے دھیمی ہوتی ہوئی گم ہو گئیں۔
"شاباش" صحبت خاں نے گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھتے ہوئے کہا "تم بہت عقل مند آدمی ہے۔"
"عقل مند اس سے بنا!" گلباز خاں نے چاقو دکھاتے ہوئے کہا "اگر پدر سگ ذرا بھی چوں کرتا تو ہم اس کا نوک اس کی پیٹھ میں اتار دیتا۔"
ایک بج گیا مگر ننھی جان نہیں آئی۔ تینوں آدمیوں نے جمائیاں لینی شروع کر دیں۔ جبار خاں نے چغے کی جیب میں سے نسوار کی ڈبیا نکالی جس میں سے چٹکی چٹکی تینوں نے لی۔
سوا بجے صحبت خاں نے رنگ علی کو گلے سے پکڑ لیا۔
"او خنزیر بچہ سچ بتا!" صحبت خاں نے پوچھا۔ "وہ تماشے گیا ہے یا اور جگہ گیا ہے؟"
"قسم ہے پنجتن پاک کی خان صاحب!" رنگ علی نے اپنا گلا چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "وہ تماشے ہی گیا ہے۔"
"پھر وہ آیا کیوں نہیں؟" صحبت خاں نے پوچھا۔
"اللہ جانے کیوں نہیں آیا۔" رنگ علی نے کہا۔ پھر وہ لمحہ بھر خاموش رہ کر بولا "میں جانوں چشتی صاحب اس کو اپنی کوٹھی لے گئے ہوں گے۔ اب تو وہ صبح ہی کو آئے گا۔"
"تم جھوٹ کہتا ہے۔" گلباز خاں نے کہا۔
"نہیں میں سچ کہتا ہوں۔" رنگ علی نے کہا۔
"ہم نہیں مانتا۔" گلباز خاں نے کہا
"آپ یہیں رہیئے پھر جھوٹ سچ معلوم ہو جائے گا۔" رنگ علی نے کہا۔
"پہلے بھی کبھی ایسا ہوا؟" صحبت خاں نے پوچھا۔
"کئی بار۔" رنگ علی نے کہا۔
ڈیڑھ بجے تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جمائیاں لیتے لیتے ان کے جبڑے تھک گئے تھے۔ اور آنکھ اور ناک سے پانی بہنے لگا تھا۔ باہر بوندیاں تھم گئی تھیں۔ تینوں میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے پھر وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔
"اچھا ہم جاتا ہے۔" صحبت خاں نے کہا۔
جس وقت وہ دہلیز کے پاس پہنچے تو صحبت خاں نے رنگ علی سے کہا۔
"بخدا تمہارا ننھی جان کا قسمت بہت اچھا ہے۔ اچھا سلام"
"تان سین کے بیٹے کو بھی سلام۔" گلباز خاں نے کہا۔ اور وہ سیڑھیوں سے اتر گئے۔
چند لمحے خاموشی رہی۔
"یا خدا یہ کیا مصیبت ہے!" رنگ علی نے کہا۔
"ایسے کام کی ایسی تیسی۔" حسین بخش نے کہا۔ "لعنت ہے ایسی کمائی پر۔ میں تو کل ہی یہاں سے چل دوں گا۔ کسی فلم کمپنی یا ریڈیو میں نوکری کروں گا۔ اور جو نوکری نہ ملی تو ٹیوشن کر لونگا۔ بھیک مانگ لونگا۔ مگر اس کوچے کا نام نہیں لوں گا۔"
رنگ علی نے کوئی جواب نہ دیا۔
ٹھیک دو بجے مکان کے نیچے ایک موٹر آ کے رکی۔ اور پھر موٹر کا دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز آئی۔ ذرا سی دیر میں ننھی جان ٹھمک ٹھمک کرتی سیڑھیاں چڑھتی کمرے میں داخل

ہوئی۔ اُس کے پیچھے پیچھے ... تھا جس سے ایک لچھا اُٹھا رکھا تھا۔ تھی جو سامنے ساڑی کے اوپر لمبا ... پہن رکھا تھا جس کا کالر ادھر ... کے تھے۔ سُرخ ساڑی کی مناسبت سے پاؤں میں سُرخ سینڈل تھے۔ آدھے سر اور کانوں کو ایک سفید باریک سلک کے مفلر سے ڈھک رکھا تھا جس میں سے صرف کانوں کی لوئیں نظر آتی تھیں۔ ان لوؤں میں روپہلی ٹوپس دو ننھے ننھے نور سے ستاروں کی طرح دمک رہے تھے۔ اُس کے رخساروں پر ... سُرخ دھول کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے جسم اور لباس سے خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں اُس کی عمر ... برس ... تھی۔ چال ڈھال سے وہ ایک ... معلوم ہوتی تھی آنکھوں سے مسکرانے والی ... لیے ...۔

رنگ علی اور حسین بخش کی نظریں سب سے پہلے بے ساختہ اُس کی ... جیسے والی ایک کمل چمک رہی تھی۔

"... آپ ... مگر ..." رنگ علی نے کہا۔

"سینما کے بعد ... ہی ... ہوٹل لے گیا" ننھی جان نے کہا۔

"... اچھی ہے!" رنگ علی نے کہا۔

"... سے ... کیوں ہو؟" ننھی جان نے پوچھا

"بائی جی" حسین بخش نے کہا "مجھے تو آپ چھٹی دلا دیجیے!"

"آخر ہوا کیا؟"

"آپ گھر پر ہوتیں تو شامت ہی آجاتی" رنگ علی نے کہا۔

"کچھ کہو تو آخر ہوا کیا؟"

"آپ کے پیچھے تین پٹھان آئے تھے" رنگ علی نے کہا "بڑے وحشی سے۔ اُن کے پاس لمبے لمبے چاقو تھے۔ ہمیں مار ہی ڈالتے۔ بات بات پر چاقو نکال لیتے تھے۔ کہتے تھے ـــــ"

"کیا کہتے تھے؟" ننھی جان نے پوچھا

"کہتے تھے اُن کے ... ہم ننھی جان کا گلا کاٹنے آیا ہے"

لمحہ بھر کے لئے ننھی جان کے چہرے کی رنگت کی ایسی کیفیت ہوئی۔ جیسے کوئی بلب فیوز ہوتے ہوتے دوبارہ روشن ہو جائے۔ پھر اُس نے نگاہیں اپنی انگلیوں کے سُرخ رنگے ہوئے ناخنوں پر گاڑ دیں۔

"میں نے کہا بھی" رنگ علی نے کہا "بائی جی رات کو واپس نہیں آئیں گی۔ پھر بھی ڈیڑھ بجے تک ہلنے کا نام نہیں لیا!"

"میرے منہ پر اس زور کا تھپڑ مارا کہ دو دانت ہل گئے" حسین بخش نے بسورتے ہوئے کہا۔

ننھی جان نے کچھ جواب نہ دیا۔

"آخر اب کیا ہوگا؟" رنگ علی نے پوچھا۔

"جانے کیا ہوگا!" ننھی جان نے کہا۔

"تھانہ میں رپٹ نہ لکھوا دیں؟"

"کچھ فائدہ نہیں۔ اُلٹی بدنامی ہوگی۔ پھر پولیس والوں کے ناز معشوقانے!"

"کہیں اور نہ چل دیں؟"

"کہاں؟"

"کسی اور شہر!"

"کچھ فائدہ نہیں۔ سب جگہ ایسا ہی حال ہے!"

"آخر پھر کیا کریں؟"

"کیا ہو سکتا ہے؟"

"کچھ نہیں ہو سکتا؟"

"کچھ نہیں ہو سکتا!"

پل بھر خاموشی رہی۔ اس کے بعد ننھی جان نے انگڑائی لی۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک تھکی تھکی سی اُداس مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"صلبہ جی" اُس نے رنگ علی سے کہا "اس وقت تو تم لوگ آرام کرو۔ صبح دیکھا جائے گا"

یہ کہہ کر وہ اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

پانچ منٹ کے بعد سب کواڑ بند کر دیئے گئے تھے۔ اور روشنی گُل کر دی گئی تھی۔ دونوں اُستاد اور حسین فرش پر پاس پاس بستر بچھا کے لیٹ گئے تھے۔

"یہ پٹھان ضرور کسی کے بھیجے ہوئے تھے" رنگ علی نے حسین بخش سے کہا۔

"مگر کس کے؟" حسین بخش نے کہا۔

لمحہ بھر خاموشی رہی۔

"ہو نہ ہو یہ جیکر والے حاجی کی کارستانی ہے"۔ رنگ علی نے کہا۔ "وہ بڈھا نکاح کے لئے بائی جی کے پیچھے پڑا ہوا تھا"۔

"ہُوں"۔ حسین بخش نے نحیف آواز میں جواب دیا۔

پل بھر کو پھر خاموشی رہی۔

"یا شاید یہ نواب صاحب کی بدمعاشی ہے"۔ رنگ علی نے کہا۔ "اُس کو یہ چڑ تھی۔ کہ ظفر صاحب کیوں آتے ہیں"۔

"ہُوں"۔ حسین بخش نے پہلے سے بھی نحیف آواز میں جواب دیا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔

"پھر خیال آتا ہے"۔ رنگ علی نے کہا۔ کہیں یہ اُس فیض آباد کے کنگلے تعلقدار کی شرارت نہ ہو۔ جس کو بائی جی نے بے عزت کر کے مکان سے اُتار دیا تھا"۔

حسین بخش نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے مُنہ دُھسّے کے اندر کر لیا تھا۔ اور لمبے لمبے سانس، جو ابھی خرّاٹے نہیں بنے تھے۔ لینے شروع کر دئے تھے۔ مگر رنگ علی کی آواز برابر سُنائی دے رہی تھی۔

"میں جانوں یہ راؤ صاحب کا کیا دھرا ہے۔ وہ کانا مارواڑی جو بائی جی کو بنارس لے جانا چاہتا تھا۔۔۔۔"

تصانیف مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم

شریر بیوی:۔ چغتائی صاحب کا سب سے پہلا اور سب سے مقبول مزاحیہ ناول۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

کمزوری:۔ "اے عورت تیرا نام کمزوری ہے"۔ اس مقولے پر ایک بڑی حیرت ناک داستان چغتائی صاحب نے لکھی ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

مسز کرٹھلے:۔ کالج کے لڑکوں کی شرارتیں اور گیدیوں کی خانہ بدوش زندگی کی تصویر۔ یہ ناول ایک عبرتناک داستانِ محبت ہے جس کا جواب شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم کی کہانی بھی نہیں دے سکتی۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بُک ڈپو۔ دہلی۔

غزل

سرمایۂ بہارِ چمن در چمن ہوا
گویا لباسِ گُل بھی مرا پیرہن ہوا

تنہائیٔ خیال سے گھبرا گیا، کہ دل
ہر انجمن میں خلوتیٔ انجمن ہوا

ساری نمودِ حُسن جنوں پر ہی منحصر
گُل سینہ چاک ہو کے بہارِ چمن ہوا

بے تابیوں کا حال نہ کچھ اُن پہ کھُل سکا
ہر حرفِ مدعا مجھے زخمِ دہن ہوا

اِک شاخِ گُل بھی مجھ کو چمن میں نہیں نصیب
یہ اُس کا حال ہے جو بنائے چمن ہوا

ملتی نہیں ہے عشرتِ منزل لُٹے بغیر
رہبر ہی میرا کیوں نہ مرا راہزن ہوا

تابش بھلا یہ نازِ غمِ عیش کون اٹھائے
دل آشنائے عشرتِ رنج و محن ہوا

تابش دہلوی؎

حرام

قیسی رامپوری

اُس کو برادری، شریعت اور رسم کی چادر میں لپٹ کر سلیمان کے گھر بھیج دیا گیا اور سلیمان نے ایک سدھے ہوئے گھوڑے کی طرح بغیر کان ہلائے خاموشی سے اس کو قبول کر لیا۔ وہ ٹھیکیدار تھا۔ عمارتوں کے ٹھیکے لیا کرتا تھا۔ صرف تعمیر کے نہیں شکست و ریخت کے بھی۔ بعض عمارتیں اس کو وقت بے وقت گرا کر دینی پڑتی تھیں۔ مسالہ، چونا، پانی، اینٹیں اور مزدوری ہی تو یکجا ہو کر عمارت کھڑی کرتی ہیں اور پھر انہی عمارتوں پر سرمایہ شادیانے بجاتا ہے، افلاس نوحہ پڑھتا ہے اور آخر میں، بالکل آخر میں بوم نوبت زنی کرتا ہے۔

یہ عمارتیں صدیوں تک قائم رہتی ہیں، گنبدِ افراسیاب کی حیثیت اختیار کر لینے کے بعد تک قائم رہتی ہیں مگر رواں صدیوں کے تسلسل میں تمام عمارتیں ایک حال پر برقرار نہیں رہتیں۔ بعض تو ان میں سے پوری کی پوری مذاقِ وقت سے خارج ہو جاتی ہیں اور بعض کے چند حصوں کو بخیالِ کفایت شعاری کبھی ضرورتاً اور کبھی پرستشِ قدامت کی خاطر رہنے دیا جاتا ہے جس کو یادگار سمجھئے یا آثارِ قدیمہ۔

مگر بہت سی پرانی عمارتوں کو ڈھا دینا پڑتا ہے۔ سلیمان ٹھیکیدار نے بھی ایسی بہت سی عمارتوں کو منہدم کیا تھا۔ وہ گریں، مسالہ بھی ان میں سے نکلا مگر نام بدل کر چونا سا لخورده، اینٹیں باد و باراں دیدہ اب یہ ملبا تھیں۔ اور ان میں پانی اور مزدوری اس طرح خشک ہو چکی تھی، جیسے یہ چیزیں کبھی عمارت میں صرف ہی نہیں کی گئی تھیں یہ قبروں کے خول، یہ شمشان بھومی کی خالی خالی چھتریاں — کیا واقعی ان میں کبھی دُنیا کے ناموروں کے جسم دھرے گئے تھے؟ کس کو یاد۔

سلیمان کو جس طرح بعض عمارتیں وقتِ مقررہ پر بنوانی پڑتی تھیں اُسی طرح ایک معین عرصے میں اس کو بعض مسمار بھی کرانی پڑتی تھیں۔ یہ وقت کا ٹھیکہ تھا اور جب وقت ٹھیکے لیتا ہے تو تمام ماحول اُس کا مطیع ہو جاتا ہے۔

لاکھ وقت کو ٹھہرا دیجیے مستقبل کا ہر لمحہ حال کی چکنی سطح پر چشم زدن میں ڈگمگاتا ہے اور ماضی کی گہرائیوں میں جا گرتا ہے پھر اسکو نہ زمانہ آواز دے سکتا ہے نہ وقت۔ یہ ماضی ہی میں قدرت ہے کہ وہ اگرچہ قدرت کی شریکِ ابدیت تو نہیں مگر شریکِ ازلیت ضرور ہے۔ کتنی گہرائی ہے ماضی کی اور کس قدر وسعت ہم — ہم کیا ہماری تہذیب، ہمارا تمدن، ہمارا مذہب، ہماری سیاست، ہمارے مرنے کے طریقے خواہ عشق کے سلسلے میں خواہ موت کی غلغلی سے، ہمارے جینے کی دُھن یہ نہ حال ہیں نہ مستقبل بلکہ تمام تر ماضی۔ دور دھندلکا کھرا تا نظر آتا ہے، اندھیرے میں پچھلے نقوش کچھ دکھائی نہیں دیتے لیکن جب بھی ہم نقشِ ثانی بنانے کھڑے ہوتے ہیں تو اعتقادِ باری کی طرح اپنے کو ماضی یا قدامت سے وابستہ پاتے ہیں۔

مگر یہ ناممکن ہے قطعی ناممکن کہ ہم پوری کی پوری ماضی سے چمٹے رہیں، تمام کی تمام پرانی عمارت میں نئے مذاق اور جدید جسموں کے ساتھ آسودگی محسوس کرتے رہیں اور ساری کی ساری زندگی کو زندگی سمجھتے رہیں۔ زندگی کا وہی مقام تو زندگی ہے جہاں احساسِ حیات یا کربِ زندگی محسوس ہو۔ جب وہ برادری، شریعت اور مراسم کی چادر میں لپیٹ کر سلیمان کے گھر بھیجی گئی تو اسکو سلیمان کو اُس کے آتے ہی احساسِ حیات ہوا۔ مگر یہ احساس ٹھیکے سے ماورا تھا، وہ کوشش کرتا تب بھی اس احساس کا ٹھیکہ نہیں لے سکتا تھا۔ یہ تو بڑا کنٹریکٹ تھا۔ ہاں اس نے ٹھیکیداری کی لمبی اور طوفانی زندگی میں برادری، شریعت اور مراسم کی چادر میں لپٹی ہوئی آنے والی کے آتے ہی اپنی مبہم زندگی کے ایک سرے پر نشان لگا دیا تھا۔ جیسے وہ ایک سنسان سڑک پر چلا جا رہا ہو جس کے گرد و پیش کوئی چونکا دینے والا منظر نہ ہو لیکن دفعتاً کسی درخت کے نیچے اس کو کوئی بہات نظر آگئی ہو یا کسی انسان کو قتل کر دیا گیا ہو اور اس نظارے نے سنسان سڑک کے اُس

مقام سے اس کو آگاہی بخشی ہو۔

وہ اس کی بیوی تھی حلال بیوی کیونکہ برادری، شریعت اور مراسم نے اس کو بھیجا تھا۔ اس نے سات سال میں چار بچے دیئے جو سب حلالی تھے۔ وہ حلال بھیجی گئی تھی اس لئے حلال رہی اور سبکو حلال کرتی رہی۔ سلیمان کو سلیمان کے گھر کو، اس کے دل و دماغ کو اس کی روح کو اور تمام ماحول کو۔

"آج اتنی دیر میں کیوں آئے؟" اُس نے گرج کر سلیمان سے دریافت کیا۔

"مزدوروں کو تنخواہ بانٹی تھی۔" سلیمان نے تکان سے پلنگ پہ گرتے ہوئے کہا۔

"یا جوان مزدورنیوں کے دل بہلا رہے تھے۔" اس نے سلیمان کے منہ پہ تکیہ پھینکتے ہوئے پوچھا۔

"اسکا مجھکو اچھی طرح علم ہے کہ میں ——"

"کہ تم نہایت پاکباز ہو۔ یہی کہنا چاہتے تھے نا؟"

"بڑی بی میز پر کھانا چُن دو۔" سلیمان نے تکان و حقارت سے اس کی طرف سے مُنہ پھیرتے ہوئے ماما سے کہا۔

"کھانا اس وقت ملے گا جب میری بات کا جواب دوگے۔"

"تمہاری بات ایسی ہے جسکا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔"

"خدا مجھے موت کیوں نہیں دیتا۔" اُس نے چھوٹے بچے کو زور سے جھولے میں پٹک کر کہا۔

"کیونکہ موت اچھے لوگوں کو جلد آتی ہے۔"

"تمہارے گھر میں میں نے ایک گھڑی سُکھ کی نہیں گزاری ہمیشہ قسمت ہی کو روتے میری زندگی کٹی ہے یہاں۔"

سلیمان نے کراہت سے مُنہ بنایا اور کراہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ حلال بیوی تھی اس لئے اس نے سلیمان کے گھر میں ایک حلال جہنم بنا رکھی تھی۔ اس سات سال کی مدت میں شاید ہی کوئی گھڑی ایسی گزری ہو کہ اس نے سلیمان کو زندگی سے بیزار نہ کر دیا ہو۔ سات سال سے اب اس ویران سڑک پر برابر قتل ہو رہے تھے اس لئے سلیمان اس سڑک کے ایک ایک ذرہ سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اب اس راستے پر کسی نشان دہی کی ضرورت نہ رہی تھی۔

ایک کالی اور ادھیڑ سی مزدور عورت اکثر اوقات فرصت میں اس کو پانی پلاتی تھی اور کبھی کبھی پیر بھی دبا دیتی تھی عمارتوں کے ٹھیکوں کے ساتھ وہ بھی منتقل ہوتی رہتی تھی۔ پھر اُس کی عمر و صورت سلیمان کے لیے اور حلال ٹھیکے کو توڑ ڈالنے کے ہر امکانی خطرے سے معرّا تھی اس لئے سلیمان اگر اس کو اپنے جور جور جسم کے مسالہ کے لئے منتخب کر رہا تھا تو اُس کو ذوقِ تعمیرِ نو سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

"جمّن کہو میں ایمان لاتی ہوں خدا پر، ملائکہ پر، کتاب پر اور رسولؐ پر۔" سلیمان نے ایک روز اس کی جھونپڑی میں جا کر کہا۔

"میاں میرا تو پہلے ہی سے ان پر ایمان ہے۔" جمّن نے اپنے منتشر بالوں کو جوڑے میں لپیٹتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"پھر دہراؤ اِن الفاظ کو۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہی دہراتا ہوں اتنے اضافہ کے ساتھ کہ میں عمر بھر تمہارا رہوں گا اور تم کو بھی میرا ہو کر رہنا ہے۔" سلیمان نے کہا۔

"یہ سلیمان جیسے سمجھدار آدمی کو کیا ہو گیا ہے۔" پندرہ روز بعد مستری نے دوسرے کاریگر سے کہا۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"اُس نے جمّن کو ناجائز طریقہ سے گھر میں ڈال لیا ہے۔" مستری نے حقارت سے کہا۔

"اچھا! اب کیا ہوگا؟" کاریگر نے اظہارِ حیرت کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہوگا کیا حرام۔" مستری نے اُسی اندازِ تحقیر سے جواب دیا۔

تصانیف مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم

جنّت کا بھوت:- اِس دلکش قصّے کے تین باب ہیں۔ نہایت ہی پُر مذاق پلاٹ ہے۔ اور قصہ اس قدر ہنسانے والا دلچسپ اور دلآویز ہے کہ شروع کر کے ختم کئے بغیر ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ قیمت آٹھ آنے۔

مرزا جنگی:- یہ ایک نہایت ہی مضحکہ خیز اور حد سے زیادہ دلچسپ اور ہنسنے ہنسانیوالا مزاحیہ ڈرامہ ہے۔ پلاٹ اس قدر عجیب و غریب، تمسخر آمیز اور مذاق میں ڈوبا ہوا کہ ہر سین دو مرتبہ پڑھنا پڑے گا۔ قدیم لکھنؤ کی مضحکہ خیز تہذیب کا عبرتناک مرقع۔ قیمت ۱۲/

ملنے کا پتہ:- ساقی بک ڈپو، دہلی۔

قتیل شفائی

ماضی کے کھنڈر

وہ مکاں جس کے دریچے مدتوں سے بند ہیں
کچھ دنوں سے چھا رہا ہے میرے احساسات پر

زندگی کی دھڑکنیں آلودۂ تاثیر ہیں — آہ وہ خونیں سحر میری محبت کی رقیب
وقت کے ماتھے پہ اک تازہ چمک پیدا ہوئی — اُف وہ غرّاتی ہوئی موٹر کا بل کھاتا دھُواں
تیرہ و تاریک راہوں میں ستارے بجھ گئے — آخری آہوں میں وہ ڈوبا ہوا لمبا سفر
ان اُجالوں میں اندھیرے لائقِ تعزیر ہیں — ایک نادیدہ وطن میں کھو گیا میرا حبیب

زندگی نے دو قدم پیچھے کو پلٹا کھا لیا — دیکھ کر کُٹیا میں مجھکو کروٹیں لیتے ہوئے
پھر وہی پیماں وہی سہمی ہوئی سرگوشیاں — غرق ہو جاتے ہیں احساسات گہری سوچ میں
سُن رہی ہوں اب بھی ماضی کے رسیلے قہقہے — رینگتی ہے دل کے اک تاریک گوشے میں امید
ٹمٹما تا ہے ابھی تک میری کُٹیا کا دیا — آ رہے ہوں جیسے وہ مجھکو صدا دیتے ہوئے

وہ گٹھیلا سا بدن ابریشمی ملبوس میں — جن کے پس منظر میں میری جنتیں آباد تھیں
آتے جاتے آنکھوں آنکھوں میں سندیسے پیار کے — مُسکراتے ہیں ابھی تک اُن دریچوں کے کواڑ
بھول سکتے ہیں مجھے وہ اُنکو بھلا سکتی ہوں میں — جیسے میری زندگانی مضحکہ انگیز ہے
اُف وہ آنکھیں، دو دیے جلتے ہوئے فانوس میں — جیسے میرے جھونپڑے کا کوئی مستقبل نہیں

میں نے دیکھی تھی انہیں آنکھوں میں تاروں کی چمک — میرا ننھا ہے کہ فردوسِ بریں کا پھول ہے
اِک مُسلسل کیف، اِک مبہم مسرت کی نمود — رات کی تنہائیوں میں دے کے اُسکو لوریاں
والہانہ عشق کی اِک غیر فانی یادگار! — "لو وہ ابا آ گئے" کہتی ہوں جانے کس لئے
ہلکی ہلکی سی خلش اِک میٹھی میٹھی سی کسک — وہ نہ آئینگے، نہ آئینگے یہ میری بھول ہے

وہ مکاں جس کے دریچے مدتوں سے بند ہیں
کچھ دنوں سے چھا رہا ہے میرے احساسات پر

مرزا فہیم بیگ فہیم چغتائی

چکری کا میلہ

دنیا کا کون سا خطہ ہوگا، جہاں لوگوں نے اپنے جذبات، تمدن، معاشرت، اور عقائد کے مطابق میل ملاپ، سیر و تفریح، سامانِ کمالات خرید و فروخت، اظہارِ عقیدت یا حصولِ ثواب کی غرض سے تیج تہوار میلے تماشوں، عرس یا یاترا وغیرہ کا دستور نہ باندھ رکھا ہو۔

وہ کون صاحب ہیں جنہوں نے اس قسم کے عجیب و غریب نظارے نہ دیکھے ہوں جنہیں طرح طرح کے اثرات سے خالی کہا جا سکے۔ خاص کر بعض طبائع تو ایسے ہنگاموں کی بے حد دلدادہ پائی جاتی ہیں بلکہ اکثر اس مزاج کے لوگ بھی دیکھنے میں آتے ہیں، جنہیں ان تقریبوں کے تفصیلی حالات معلوم کرنے کا بڑا شوق اور دلی لگاؤ ہے۔

اس بنا پر آج میں ایک ایسے میلے کا ذکر کرتا ہوں جس کی مثال سوائے گوالیار کے کہیں نہیں ملتی۔

. . . .

اُس وقت جبکہ دو مہینے کی بارش سے کرہ دھرا کی گرمی بہت کچھ اعتدال پر آ جاتی ہے گوالیار کے پہاڑی قلعہ پر کھڑے ہو کر نگاہ دوڑائیں تو چاروں طرف لہلہاتے کھیت، ہرے بھرے سبزہ زار، جھیل تالاب اور ندی نالے نظارہ نوازی کرنے لگتے ہیں تو سلونو کی شام کو حضرت محمد غوث صاحبؒ کے حظیرے کی شمالی جانب والے میدان میں ایک میلہ بھرتا ہے، جسے "چکری کا میلہ" کہتے ہیں۔

جب ہوش سنبھالا میں نے تو اسی مقام پر یہ سیر دیکھی، البتہ گوالیار کے پرانے خاندانوں کی روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے اس طرف ایک پُررونق محلہ آباد تھا، اور میرے بچپن میں کتنے ہی بزرگ یہاں کوئی عظیم الشان کاٹھ کا محل بھی بتلاتے تھے، اب وہ سب کچھ ملیا میٹ ہو کر ایک بڑا میدان نکل آیا ہے، صرف وہ مسجد جس کی خود حضرت محمد غوث صاحبؒ نے اپنے دستِ مبارک سے بنیاد رکھی تھی، نیز اس مسجد اور حظیرے کے درمیان اکبری دربار کے مشہور گویئے میاں تان سین کا مزار اور اسی قطعہ میں خوشنما جالیاں لگے ہوئے نہ جانے کن کن بزرگوں کے بیجکے باقی رہ گئے ہیں۔

اس شہر خموشاں کے بائیں یعنی جانب جنوب ایک کچا نالا بہتا ہے جسے غوثی نلا۔ غوثی تلیا کہتے ہیں۔ اس تلیا میں اگلے وقتوں میں سلونو کے دن عورتیں بھُجریاں سرانے آیا کرتی تھیں، اور موجودہ اسٹیشن جانے والی سڑک کے دوسری طرف برائی ماتا کے مندر کی طرف مرد چکریاں بھرایا کرتے تھے۔

مرہٹی راج قائم ہونے کے بعد ایک بار سرگ باشی عالیجاہ بہادر مہاراجہ دولت راؤ صاحب سیندھیا نے جو اس میلہ میں شرکت کی تو کھلاڑیوں کے کرتب سے بہت محظوظ ہوئے انعام و اکرام سے کھلاڑیوں کو شاد کام فرمایا، اور کیونکہ اس وقت حظیرے کی اس سمت جس کا ذکر کر چکا ہوں، کافی میدان نکل آیا تھا۔ یعنی گوالیار سے مرار جانے والی سڑک اور حظیرے کے درمیان کوئی عمارت حائل نہ رہی تھی لہذا زنانہ انبوہ سے بچ کر چکری پھرانے والوں کا جماؤ ادھر ہونے لگا۔ جس نے بہت جلد اس درجہ میلے کی صورت اختیار کر لی کہ اسلامی تہواروں عید اور بقرعید وغیرہ کی طرح مذکورہ بالا تقریب کے موقع پر مکتبوں کے مُلّا مولوی صاحبان اپنے طالب علموں کو عیدی دیا کرتے تھے، چنانچہ چکری کے میلے کی ایک مُلّا شاہی عیدی میاں جی خیرالحق صاحب مرحوم سے مجھے بھی پہنچی تھی، ملاحظہ فرمایئے:

سلونو سادن و خوش و بہار است ٭ کہ میلہ چکریاں در پہلے بار است
ہمن طاقت کر گنبد ٭ پھیراتیں ٭ کہ گنبد در بلندی بے شمار است

٭ ٭ ٭

. . . .

کسی زمانے میں مٹو یا ٹھک ایک کلال جس کا نام معلوم نہ ہو سکا، جیجی لال ایک مسلمان، دو تیلی مجھن اور بلدیو نامی چکری کے بڑے اُستاد مانے گئے تھے، ان کے بعد گنگا بڑھئی لشکر والا، شیام لال کا لیسٹہ گوالیاری، دُلارے لال برہمن اور دُھاکن بنیا۔

او لذکر مٹو یا ٹھک کے والد گوپال پا ٹھک بھی خوب چکری

پھراتے رہے، اس وجہ سے مہارانی سجابائی سرگ باشی نے علاوہ سالانہ انعام کے چار آنہ یومیہ ان کا آزوقہ باندھ دیا تھا، مہارانی صاحبہ کا انتقال ہو نے کے بعد بھی عالیجاہ بہادر رگھوا جی مہاراج نے دو آنے روزانہ تجویز کر دیئے، دوالی میں گیارہ ڈھکر مٹو پاٹھک جے پور جانے لگے، اور سمت ۱۹۳۵ سے سمت ۱۹۴۲ بکرمی تک اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے رہے۔

یہ صاحب یعنی مٹو پاٹھک پچاس ہاتھ ڈور کی چکری کے ڈیڑھ ڈیڑھ سو ہاتھ نکالتے تھے، اس عجیب استادی پر سرگ باشی مہاراجہ رام سنگھ جی صاحب والئی جے پور نے ان کو ایک روپیہ روزانہ حبو کا لگا دی۔

چند سال بعد نہ جانے کیوں پاٹھک جی موصوف نے اپنے بھائی سالگ رام کے فرزند بالا رام کو اس جگہ مقرر کر دیا، لیکن یہ تقرر ایک روپیہ کے بجائے بارہ آنہ یومیہ پر ہوا، جب بالا رام نہ رہے تو ان کے بچے مدن گوپال کے نام آسامی کر دی گئی، مگر چونکہ ابھی وہ نابالغ ہے اس کا فرض انجام دیتے ہیں بلدیو سنگھ ڈبریا، انہیں ساون میں گجریا تیج اور جیت شدی کو جے پور حاضر ہو کر گنگوری بازار کے میدان میں چکری پھرانے جانا پڑتا ہے۔

یہ حالات ابھی تک کسی نے قلم بند نہیں کئے، بڑی جستجو کے بعد خاص خاص ذرائع سے مجھے معلوم ہو سکے ہیں، لاکھ کوشش کی اس سے زیادہ کچھ نہ ملا، اب ذرا میں اپنے چشم دید حالات عرض کرتا ہوں!

میرا بچپن ریاست کے دیگر اضلاع میں گذرا، سنہ ۱۸۹۹ء میں جبکہ میری عمر تقریباً گیارہ سال ہوگی والد ماجد کے تبادلہ پر خاص شہر گوالیار آیا۔ اس وقت سے لے کر سنہ ۱۹۱۵ء تک اس میلے کی شرکت کا موقعہ ملتا رہا، اور کچھ عجیب عجیب تماشے دیکھنے میں آئے۔

سنتا ہوں کہ دولت راؤ مہاراج کے بعد موجودہ مہاراج صاحب دام اقبالہ کے جد معظم سرگ باشی مہاراجہ جیواجی راؤ صاحب بھی ہر سال بکی پور کے راستے چکری کا میلہ دیکھنے تشریف لاتے اور کھلاڑیوں کو انعام و اکرام سے نہال کرتے رہے، میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ سرگ باشی عالیجاہ بہادر سر مادھو راؤ صاحب نہ تو اس وقت سن بلوغ کو نہ پہنچے کی وجہ سے با اختیار تھے، اور نہ اٹھارہ بیس سال اس میلے میں رونق افروز ہوئے، تاہم یہ میلہ خوب دھوم دھام سے برابر جاری رہا، ہر سال لوگ چکریاں پھرائی گئیں۔

یہ چکریاں بارہ بارہ چودہ چودہ انگل قطر کی ہوتی ہیں۔ اور ان کی ڈور پچیس تیس ہاتھ سے لے کر پچاس ہاتھ تک، اس ڈور کے سرے پر ایک گھتی سی ہوتی ہے، جسے کھلاڑی سیدھے ہاتھ کی کسی کھائی میں اٹکا کر الٹے ہاتھ سے چکری نیچے گرا کے آسمان کی طرف پھینکتا ہے، ڈور ختم ہونے پر جھٹکا لگنے سے وہ چکری ڈور میں لپٹتی ہوئی نیچے آتی ہے، جوں ہی ہاتھ ڈیڑھ ہاتھ ڈور رہی کہ دوسرا ہاتھ لگائے بغیر کھلاڑی نے ذرا ترچھے ہو کر زور سے اچھالی، آخر میں جھٹکا لگا، چکری ڈور میں لپٹتی ہوئی نیچے آئی، پھر اسی طرح اچھالی گئی، بس جب تک اوپر جانے نیچے آنے میں چکری ٹیڑھی نہ ہو یا کھلاڑی تھک نہ جائے متواتر چکر لگتے رہتے ہیں، جس کی ڈور لمبی ہو اور شمار میں چکر بھی زیادہ دے سکے وہ ہی کھلاڑی میر رہتا ہے، اس کرتب میں قوت جسمانی کے علاوہ دھیان قائم رکھنے اور بدن سادھنے کی مشق سخت ضروری ہے، جہاں نظر چوکی یا اونچا نیچا پیر پڑ کر کھلاڑی کا توازن تاؤ بھاؤ ہوا کہ بندھا بندھایا طلسم ٹوٹا۔

چکریاں پھراتے وقت خوب میدان دیکھ کر کڑی نگرانی رکھی جاتی ہے کہ کہیں حاضرین کی قطار ٹیڑھی نہ ہو جائے کیونکہ اگر کوئی شخص ادھر ادھر ہو تو بڑی گڑبڑ پھیلتی ہے۔

چنانچہ میرے لڑکپن کا واقعہ ہے، میں اس وقت اگلی صف میں موجود تھا، ایک کشیدہ قامت تنومند جوان نے نہایت انہماک سے چکری پھرانی شروع کی، سامنے کے آدمیوں میں سے مرار کے کوئی بھٹناگر تھے بالو جی کھڑے تھے، یکایک نہ جانے ان کے جی میں کیا آئی کہ آپ وہاں سے اچک کر دوسری جگہ جانے لگے، ادھر جھر جھر جھر جھراتی ہوئی چکری جو ایک زنّاٹے میں اٹھی تو کھٹ سے بالو جی کی ٹھوڑی سے جا ٹکرائی، ہڈی تک نوبت پہنچی، بالو جی صاحب تھے کہ لڑکھڑا کر گھٹنوں ہتھیلیوں کے بل زمین پر گرے، خون کا فوارہ چھوٹنے لگا، فوراً لوگوں نے انہیں سنبھالا، آناً فاناً ایک ہجوم پہنچ گیا، لیکن کیونکہ چکری کی

دُھن میں ہونے کے سبب سے کھلاڑی بے قصور تھا۔ اس سے کسی نے آدھی بات بھی نہ کہی، اور وہ بھی جلد جلد ڈور سمیٹتا افسوس کرتا بابوجی صاحب کی سنبھال کرنیوالوں میں شامل ہوگیا۔

....

جب ہمارے سرگ باشی مہاراجہ سرمادھو راؤ صاحب سیندھیا بااختیار ہوئے اور پکری کے میلے میں سواری آئی کھلاڑیوں کے دل شیر ہوگئے میلے کا رنگ ہی کچھ اور نظر آنے لگا۔

اس سے پہلے شہر کی پولیس ہی اپنے طور پر انتظام کر کرا لیتی تھی، اور آپس کے صلاح مشورے سے کھلاڑی چکریاں پھرا پھرا کر چلے جایا کرتے تھے، اب جو شہریار کی تشریف آوری ہوئی تو جناب عالی! باقاعدہ کھلاڑیوں کی فہرست تیار ہوئی اور سب ایک قطار میں کھڑے کر دیے گئے۔

صبح کی موسلا دھار بارش سے زمین تر بتر، خطیرے کے میدان میں ہری بھری دُوب کا سبز قالین سا بچھا ہوا، درمیان میں مہاراجہ عالیجاہ بہادر جلوہ افروز دائیں بائیں سرداروں اور اراکین ریاست کی کرسیاں قرینہ قرینہ سے نقیب چوبدار حضور کے جلو در و غیرہ استادہ کچھ ایسا دلکش سماں تھا کہ کیا کہوں۔ مغربی سمت رنگ برنگے بادل ہوا کے فراٹوں میں اُڑے جاتے تھے، قلعے کے کنگوروں سے لب بام آفتاب کی گھر بار کرنیں بکھر بکھر کر اس منظر کو بے پناہ بنا رہی تھیں، مہاراجہ کے حکم سے چکریاں پھرنی شروع ہوئیں، اور باری باری ہر ایک کو ارمان نکالنے کا موقعہ دیا جانے لگا، چند کھلاڑیوں نے خوب خوب ہاتھ دکھلائے، اتنے میں آواز پڑی:-

بھوجا حلوائی . بھوجا حلوائی گوالیار والا۔

اب حضور معلیٰ عالیجاہ بہادر اور صغار و کبار نے دیکھا کہ ایک سوکھا ساکھا سا بڈھا دھندلی دھندلی آنکھوں میں بہت بہت سا کاجل لگائے، اونچی چولی کا انگرکھا پہنے، بسنتی پگڑی ڈاٹے، اُلٹے ہاتھ میں بانا تی تھیلی لٹکائے ٹخنے سے گھٹنا لڑاتا، کبڑی ٹیکتا، کھلاڑیوں کے گروہ سے برآمد ہوا، ایکدم تالیوں اور مخلوق کے شور و غل سے خطیرہ گونج گیا کہ واہ بڈھے یہ تیرے ٹھاٹھ آج تو خوب دھجا بنائی۔

اِدھر بھوجا جو اُلٹے سیدھے پیر ٹیلتا میدان میں پہنچا تو کبڑی تھیلی پھینک کر تن گیا، مہاراج کی جانب رُخ کر کے آداب کورنش بجا لایا، زمین چھو چھو کر اپنے کان ملے، خاک بانی تھیلی میں سے چار پانچ چکریاں نکالیں، اُن میں سے ایک چھانٹ کر دو تین بار آزمائی اور جناب عالی! پھر جو بڈھا پینترہ بدل کر شروع ہوا ہے تو کچھ نہ پوچھئے وہ بند سے ہاتھ نکالے کھلاڑیوں کے چھکے چھڑا دیئے اور دیکھنے والوں کو دنگ کر دیا۔

بھوجا حلوائی دودھ دہی بیچتا تھا، لوہا منڈی گوالیار میں پولیس چوکی کے پاس اُس کی دکان تھی، یہ تیجا تیجا سا بڈھا اُکڑوں بیٹھتا تو اس کے گھٹنے کانوں سے کچھ اوپر نکل جاتے تھے، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں، پچکے ہوئے گال، کوئی پون پون انچ کے دو دانت باہر نکلے ہوئے، ایک ایک پسلی الگ، بڑے بڑے ناخونوں والے شتر مرغ کے سے پنجے اور اُنکے پاؤں، گدّی کے چھدرے چھدرے بال چھوڑ کر چندیا کا تامڑہ صاف، کنپٹیوں میں کوئی دو دو پور گہرے گڑھے، لغیر گوشت والے جسم پر تانت سی رگیں اُبھری ہوئیں مارے دمے کے بیچارے کا برا حال، کھانس کھانس کر ہانپا کرے ہم سب لڑکے اُسے مرگھٹ مرگھٹ کہتے تھے، مگر صاحب وہ مرگیا اور ہمیں مرنا ہے، اس شرارت پر ہم نے بھوجا کو مسکرانے کے سوائے کبھی خفا ہوتے نہیں دیکھا۔

غرض یہ کہ جب بڈھے کو مٹریل مریل جان کر لوگوں نے تالیاں بجائیں اور قہقہے اُڑائے تھے، اس نے اپنے کمال سے وہ عقلیں چرخ کیں کہ بڑے بڑوں کے ہوش بھلا دیئے اُسکے بعد کسی کی ہوا نہ بندھی، بعض عاقبت اندیش کھلاڑی بلا مقابلہ ریٹائر ہوگئے، دو ایک نے ہمت کی بھی تو اپنے زور میں آپ مارے گئے۔

کھیل ختم ہونے پر عالیجاہ بہادر نے کھلاڑیوں کو فخر بازیابی بخشا، اور بدست مبارک سے انعامات مرحمت فرمانے لگے، معلوم ہوا ہمارا گوالیار والا بھوجا حلوائی میر رہا، اس کو پہلا انعام ملا ہے، واہ کیا سیر رہی جب خود بدولت مہاراجہ صاحب نے اس سوکٹ بڈھے کی پیٹھ ٹھونکی، شاباش دی، اور سب خوش ہو ہو کر تالیاں بجائیں۔

....

حسب دستور چراغ جلے تک یہ ہنگامہ ختم ہوگیا اور میں بھوجا کی عظمت کا گہرا اثر لے کر پلٹا، اب اُس محترم کو جس نے آج

شہر کی ناک رکھ لی "مرگھٹ" کہنا ہو در کنار یہ خیال رہ رہ کر تکلیف دے رہا تھا کہ میں نے اس کو ایک نحیف و ناتواں بڈھا سمجھ کر دوسرے لوگوں کی طرح اسی ہمدردی کیوں کی۔

دوسرے دن ادھر سے گذرتے وقت جو بھوجا کا آمنا سامنا ہوا، تو میں نے اسے ادب سے سلام کیا، اور کہا :-

واہ بھئی سیٹھ اکل تو تم نے کمال ہی کر دیا، تو بھلا ہمیں کیا خبر تھی، کیوں سیٹھ یہ مشق کب کی؟

سیٹھ جی نے اکڑ کر جواب دیا۔ ارے میاں کیا پوچھتے ہو، اب کیا ہے، لنگر لنگوٹے کھولے مدت ہو گئی، جوانی میں دیکھتے تو معلوم ہوتا، ہم نے بڑے بڑے مال ہستان چرسے ہیں، سیروں دودھ کھڑے کھڑے چڑھا جاتے تھے، جس کی لطف پڑتی تھی کہتا تھا واہ کیا دلاور جوان جا رہا ہے۔

۱۹۱۵ء تک بھوجا جوں کا توں رہا تیل گھٹا نہ رائی بڑھا، البتہ انعام حاصل کرنے والے چکری کے میلے کے بعد میں نے اسے وہاں کبھی نہ دیکھا،

۱۹۱۵ء کے شروع میں مجھے گوالیار چھوڑنے کا اتفاق ہوا، مختلف شہروں میں گھومتا سیر سپاٹے کرتا ۱۹۱۸ء میں گوالیار پلٹا جب بھی بھوجا کو اسی دکان پر کھانستے کھنکارتے پایا۔

چند مہینے گذارنے پر ایک لمبا بجوگ پڑا کہ ۱۹۳۴ء میں وطن کی پھیری ہوئی، اب یہاں کی دنیا بدل چکی تھی، کتنے ہی محلے ایسے اجڑے جن کی نسبت ایک اجنبی کو سمجھانا مشکل ہے کہ یہاں کیسے مکانات تھے اور ان کے مکینوں کی کیا کیفیات تھیں، علی ہذا القیاس بیسیوں عمارتیں ایسی نظر آئیں جو میرے لئے نئی تھیں، یہ سب کچھ ہوا مگر بھوجا حلوائی تو کیا اس کی دکان اور لوہا منڈی کی پولیس چوکی کا نام و نشان نہ ملا۔

اتنا ردوبدل ہونے کے باوجود چکری کا میلہ اپنے وقت پر ہوا، البتہ ہمارے جواں سال خوش اقبال مہاراجہ صاحب کیونکہ اس وقت تک با اختیار نہ تھے خود بدولت نے شرکت نہ فرمائی، اراکین ریاست نے کھلاڑیوں کو انعامات تقسیم کئے۔

میلا میاں کتنی ہی جگہ سے تشنہ رہ گیا، اور کیسا ہی مفصل عرض کروں پھر بھی "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" جن صاحبان کو پورا پورا لطف اٹھانا ہو ساون سدی پورن ماشی یعنی سلونو کے دن گوالیار میں موجود ہوں، اور بچشم خود ملاحظہ فرما کر دیسا پورا لطف اٹھائیں۔

یہ میلہ ہمیشہ جاری رہے گا، سرگ باشی مہاراجہ سر مادھو راؤ صاحب سیندھیا اپنی پالیسی میں جو اٹھارہ ضخیم جلدوں میں ہے تحریر فرما گئے ہیں کہ "چکری کا میلہ" کبھی بند نہ کیا جائے۔

مطبوعاتِ ساقی بُک ڈپو

خانم۔	قیمت للعہ	ستاروں سے آگے مکمل۔	قیمت عا	سائے۔	قیمت عہ
روحِ ظرافت	،، عا	ماسور۔	،، عا	جلسے۔	،، عہ
تسریر بیوی۔	،، عہ	قفس۔	،، عہ	جزیرے۔	،، عا
کولتار۔	،، عا	گدرگاہ خیال	،، عا	میرا بہترین افسانہ۔	،، عا
کمزوری۔	،، عہ	دریچے۔	،، عا	گرداب۔	،، عہ
مسکراہٹے۔	،، عہ	تعلیم زدہ بیوی۔	،، ۸/	مضراب۔	،، عہ
آدم خور۔	،، عہ	فرعون۔	،، عہ	آئینۂ حیرت۔	،، عا
جنّت کا بھوت۔	،، ۸/	ریڈیو ڈرامے۔	،، عہ	نغمۂ نور	،، عہ
مرزا جنگی۔	،، ۸/	لیڈر۔	،، ۶/	کیف و سرور۔	،، ھ
سوانح کی روحیں	،، ۸/	چار چاند۔	،، ۸/	چراغِ طور۔	،، عہ
جیلنی کی انگوٹھی	،، ۸/	لال قلعہ کی جھلک	،، عہ	موجِ طہور۔	،، عہ
ملفوظاتِ ٹالی۔	،، ۱۲/	بد قدرت۔	،، ۶/	موجِ نور۔	،، عہ
مضامین چغتائی	،، عہ	سرودِ ثریا۔	،، عہ	بیانِ حضور	،، عہ
قرآن اور پردہ	،، عہ	چندر امکھی۔	،، علا	گھونگھٹ میں گوری جلے	،، عہ
حدیث اور پردہ	،، علا	وحشی۔	،، عہ	بلقیس۔	،، عا
سلامبو۔	،، للعہ	میراجی کی نظمیں۔	،، عا	شمع انجمن۔	،، عا
نجم السحر۔	،، ستے	گیت ہی گیت۔	،، عا	سپنے۔	،، ستے
پالمیس۔	،، عا	شکست۔	،، ستے	شاہد رعنا۔	،، ستے
ہیر دیاس۔	،، عا	نئے فسانے۔	،، للعہ	پھانسی۔	،، عا
انطونی کلابطرہ۔	،، عہ	محبت و نفرت۔	،، عا	نو شباب۔	،، عہ
نرگس۔	،، عا	اتاترک۔	،، عا	قمر جہاں۔	،، عہ
کلیاں۔	،، ستے	دھنک۔	،، عا	دوشیزۂ صحرا۔	،، عا
ضدی۔	،، عہ	کہکشاں۔	،، ستے	شمع فروزاں۔	،، عہ

مہندر ناتھ

بہلاوے

سورج سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ دور مغرب کی جانب آسمان کی دوشیزہ کے رخساروں کی طرح سرخ تھا، اجالا آہستہ آہستہ ہچکیاں لے رہا تھا، اور اندھیرا اپنا دامن پھیلاتے آگے بڑھ رہا تھا۔ ادیتش نے تازہ، ٹھنڈی ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں داخل کیا اور سڑک پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ سڑک پر موٹریں بھاگی جا رہی تھیں۔ امریکن سپاہی اپنی معشوقاؤں کو ساتھ لئے، سڑکوں پر ٹہل رہے تھے۔ لڑکیوں کے غول کے غول سمندر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اس کے قریب سے ایک جوڑا گزرا۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، کندھے سے کندھا لگائے، قدم سے قدم ملاتے کسی طرف نہ دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گیا، اور وہ دیر تک اس خوبصورت جوڑے کو دیکھتا رہا، حتیٰ کہ شفق آکاش سے غائب ہوگئی، اور پھیلا ہوا سمندر اندھیرے میں غرق ہوگیا لیکن لڑکی کی جسمانی دلکشی اس کے ذہن پر مرتسم ہوگئی۔ اس شہر میں اس نے بہت کم خوبصورت عورتیں دیکھی تھیں۔ پہلی لڑکی تھی، جس کے خوبصورت جسم کو وہ ایک عرصہ تک نہ بھلا سکا۔ لڑکی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تھی لیکن اس کے خوبصورت جسم کی مہک ادیتش کی روح میں تحلیل ہوگئی، اور وہ اسی حالت میں چلتا گیا کبھی آہستہ آہستہ اور کبھی تیز۔ اب وہ کچھ کھانا چاہتا تھا۔ یونہی کوئی لذیذ سی چیز جس سے یہ مہک کم ہو جائے، اور وہ قریب ہی ایک ریستوراں میں داخل ہوگیا۔

ریستوراں میں بیٹھ کر سامنے والی لڑکی کی طرف دیکھنے لگا لڑکی کے ننگے بازو، اس کے عارض پر لٹکتی ہوئی لٹ، اور اس کے ہونٹوں کی سرخی اسے دعوت نظارہ دے رہی تھی، یونہی اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس لڑکی سے لپٹ جائے اور اپنا سر اس کے گول اور گداز بازوؤں میں رکھ دے، اور کہے "آہ ماں جن! میری محبوب، میں کتنے دنوں سے بھوکا ہوں"

لیکن محبوب نے اس کی طرف نہ دیکھا۔ محبوب امریکن کے ساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے لگی محبوب کا ہاتھ امریکن کے ہاتھوں میں تھا۔ اور وہ آہستہ آہستہ دبا رہا تھا۔ وہ اس دباؤ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ محبوب کے ہاتھوں کو دبا رہا ہو۔ اور محبوب کے ریشمیں ہاتھوں کے لمس سے محظوظ ہو رہا ہو، لیکن محبوب امریکن کیلئے تھی، اور وہ میز پر اکیلا تھا محبوب اپنے خوشنما ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی زبان پھیرنے سے ہونٹوں کی سرخی اور چمک گئی۔ لیکن جوش کی بھوک کم نہ ہوئی۔ بلکہ اور بڑھتی گئی۔

وہ چلایا: "آملیٹ اور کچھ توس"

بیرے نے سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا جو میز اس کے سامنے تھی۔ وہ آسمان کی طرح نیلی اور شفاف تھی۔ ریستوراں میں ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا اور ہر منٹ کے بعد بیرہ آتا، اور جیسے ہی وہ خالی میز دیکھتا، اسی پر کپڑا پھیر کر چلا جاتا۔ شیشے کی بڑی بڑی بوتلوں میں چاکلیٹ جھانک رہے تھے۔ کچھ بوتلوں میں رنگین گولیاں رکھی ہوئی تھیں، سرخ، پیازی، نیلی نیلی، پیلی پیلی گولیاں، —— یہ گولیاں کچھ اس طرح رکھی ہوئی تھیں، کچھ اس طرح بیٹھی ہوئی، اس کی طرف جھانک رہی تھی جیسے کسی محفل میں عورتیں حسین کپڑوں میں ملبوس دعوتِ نظارہ دے رہی ہوں۔

کہنیوں کو میز پر رکھ کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا

اس رنگین گولی اور اس لڑکی میں کوئی فرق نہ تھا۔ اس نے سوچا۔

گولی بوتل میں بند تھی۔

اور لڑکی کے ساتھ ایک امریکن تھا۔

گولی کا رنگ سرخ تھا۔

اور لڑکی کے رخسار، شفق کی طرح سرخ اور تابناک۔

گولی مسکرا مسکرا کر اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

لڑکی امریکن کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔

وہ گولی کو فوراً خرید سکتا تھا۔

لیکن اس لڑکی کو؟

امریکن!

ہندوستانی!!

یہ سوچ کر وہ آملیٹ پر جھک گیا، جو چیز ہاتھ میں ہو اُسے چھوڑنا نہ چاہیئے۔ بڑوں کا یہی قول ہے۔ اور ایک عرصے سے وہ اس قول پر کاربند تھا۔ جوں جوں وہ کھانا جاتا، اس کی بھوک بڑھتی جاتی، جن کپڑوں میں وہ ملبوس تھا ان میں آرام کم اور تکلف زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ اکڑا ہوا بش شرٹ اور صبح کی ورزش نے اسے سیدھا بیٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگر ذرا بھی وہ جھکتا تو بش شرٹ کی کریز خراب ہو جاتی اس خیال کے آتے ہی وہ اور اکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور آملیٹ کھانے لگا۔

"بیرہ ایک اور آملیٹ!"

آج وہ جی بھر کے کھائے گا، صرف آملیٹ ہی نہیں، بلکہ مچھلی، ٹماٹر،

مکھن، توس، پیسٹری، اور یہ رنگین گولیاں کافی، بسکٹ، فروٹ کریم، کٹلیس،
اس کے ذہن میں ہر لذیذ چیز ابھر رہی تھی، جیسے جسم کا ہر ذرہ کہہ رہا ہو، آج جی بھر کر کھاؤ تاکہ پھر کوئی حسرت نہ رہے۔ وہ اسی خیال کی کھوج میں مستغرق ہوگیا۔ وہ کھا رہا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک مبہم سی اُداسی اس کے دل و دماغ پر طاری تھی، یہ خوبصورت ریستوران جس کی دیواروں پر ننگی عورتوں کی تصویریں تھیں اور میزوں پر چلتی جاگتی لڑکیاں، اپنے دوستوں کے ساتھ گپیں ہانک رہی تھیں، آج اس کے جی کو بہلا رہی تھیں، اس کے ذہن میں سرک رہی تھیں، اور طرح طرح کی کھانے کی چیزیں جس سے اس کی بھوک اور تیز ہوگئی تھی، تیس سال کی لوچی سیدیں نے اُسے ان چیزوں کا دلدادہ بنا دیا تھا، یہ چیزیں اس کی زندگی کا ایک حصہ بن گئی تھیں، اس کے خون میں رچ گئی تھیں، وہ کسی صورت میں ان چیزوں کو نہ چھوڑے گا، وہ نہیں چھوڑ سکتا۔ جیسے ان چیزوں کی تلاش میں اُس کی روح اتنے عرصے سے سرگرداں تھی —

یہ کشادہ خوبصورت ریستوران،
یہ چمکتی ہوئی کانچ کی بہریں،
یہ میز پر جھانکتے ہوئے بسکٹ،
املیٹ کی تیز مہک،
پلیٹ میں رکھے ہوئے سُرخ ٹماٹر،
نیلی سی پلیٹ میں پیسٹری کے ٹکڑے،
مکھن،
توس،
مچھلی،
مرغ کی ٹانگیں
اور پھر روح کا Orange Squash

اور پھر چاروں طرف گہما گہمی، اگر روح میں اُداسی تحلیل ہو جائے، تو یہاں آکر ضرور کم ہو جاتی ہے ان چیزوں کو کھا کر، ان لڑکیوں کو دیکھ کر دماغ کو سکون ضرور ملتا ہے، وہ یہی باتیں سوچ رہا تھا کہ ایک مرہٹی لڑکی اپنے دوست کے ساتھ قریب والی کرسی پر بیٹھ گئی لڑکی کی موٹی موٹی آنکھوں میں شباب جھانک رہا تھا، اور جوڑے میں گیندے کے پھولوں کا ہار تھا، موٹے موٹے لبوں پر ایک لنواز تبسم اور دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے، لب کچھ کچھ انجان، اور کچھ بے لس،
یہ ہونٹ ابھی تک چُوسے نہیں گئے۔
ان پر کسی نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ نہیں رکھے۔
بجلی کے قمقمے اسی طرح روشن تھے، لوگ ریستوراں میں آ رہے تھے، کچھ سگرٹ کو تشریر ل ادا کر رہے تھے،

آنے والوں میں خوبصورت کرسچین لڑکیاں بھی تھیں۔
لیکن بہت سی بدصورت بھی تھیں، جن کا شباب قبل از وقت ضائع ہو چکا تھا، انہوں نے ملٹری ڈریس پہن رکھا تھا، چہروں پر زردی اور لبوں پر اداسی کی جھلک نمایاں تھی۔
اور کالی کرسچین لڑکیاں، جن کی پنڈلیاں کالی اور سیاہ تھیں، لیکن ساتھ ساتھ گول اور گداز بھی۔
اور پھر پارسی لڑکیاں، سفید، ننھی منی، نازک اندام، چلتے چلتے جھک جاتیں جیسے کوئی نازک ڈالی بوجھ سے لچک جائے
اور پھر انگریز اور امریکن لڑکیاں، اینگلو انڈین لڑکیاں، خوبصورت، توانا، صحت مند، اکڑ اکڑ کر چلتی ہوئی غلاموں کی طرف نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہوئیں اپنے حُسن سے نگاہوں کو خیرہ کرتی ہوئیں آگے بڑھ رہی تھی۔
اور پھر اپنے دیس کی لڑکیاں، جن کے بالوں میں موسم بہار کی خوشبو تھی جن کی آنکھوں میں جوانی کی چمک تھی، جن کے جسموں میں ہرن کے نافے کی مہک تھی۔

. . . .

تیس سال پہلے۔
وہ ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ اپنی ماں اور بہن کے ساتھ۔ اُسے گاؤں کی زندگی سے نفرت ہو گئی تھی، اُسے گاؤں سے نفرت نہ تھی، بلکہ اس زندگی سے جس کا اُسے اس گاؤں میں سامنا کرنا پڑتا تھا گاؤں کا خیال آتے ہی اس کے ذہن میں گاؤں کا ماحول اُبھرنے لگا۔
ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں،
کچے گھر،
گندگی کے انبار،
لوگوں کے چہرے زرد اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے۔
کسان پھٹے ہوئے کپڑوں میں، اِدھر اُدھر پھرتے رہتے تھے
رہٹ کی اُوں اُوں،
بیل گاڑیوں کا شور،
کچی سڑکوں پر اُڑتا ہوا غبار،
لڑکیاں، گندی، کمسن، کمزور، ملیریا سے جسم نحیف و نزار۔
بوڑھی عورتیں، میلی، گندی، موت کے دروازے پر دم توڑتی ہوئیں،
چرخے کی گھوں گھوں۔
کھاد کی سڑاند۔
اور پھر گھر میں اُپلوں کی بھرمار۔ ہر طرف اُپلے، یا اُپلوں کا دھواں۔ گھر

میں مارا مارا پھرا کرتا تھا، ادھر اُدھر اُٹلیوں کی تجارت۔

صبح و شام پوجا پاٹ۔

مندر کی گھنٹی۔

مسجد کی اذان۔

یہ سب کچھ تھا، اور اس ماحول میں روشن نے عشق بھی کیا لڑکی کے گھر کے ارد گرد چکر لگائے۔

کھیتوں میں انتظار کیا، کنوئیں پر جاکر آہیں بھریں، رات بھر جاگا،

جب کبھی وہ ملی، روشن اُسے دیکھ کر مسکرایا۔

وہ بل کھاتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ کیونکہ گاؤں کے گھاگ رالجھگر دلال نے انہیں ایک دوسرے سے آنکھیں لڑاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

پھر ملی۔

اس کا دل دھڑکنے لگا

اور وہ مسکرائی۔

اس بار بی بی فاطمہ نے دیکھ لیا۔

اور اسی دوڑ دھوپ میں دنیا کی دوسری عظیم الشان جنگ چھڑ گئی۔

اور وہ بھرتی ہو گیا۔

شروع میں روشن کو کئی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا۔ صبح کی پریڈ اور شام کی چاند ماری، گو اس کے لئے نئی چیزیں تھیں۔ لیکن جو کچھ ان کے عوض ملتا تھا وہ بھی تو اس کے لئے نیا تھا۔ اُس نے یہ چیزیں کب کھائی تھیں، اُس نے ایسے کپڑے کب پہنے تھے، اس نے ایسی زندگی کب دیکھی تھی۔ گھر میں مچھروں کیڑوں مکوڑوں کی وجہ سے جان عذاب میں آجاتی تھی، لیکن یہاں مچھر دانی ملی ہوئی تھی، مچھروں کو دور رکھنے کے لئے مچھر مار تیل، مچھر مار کریم، مچھر مار پوڈر۔ اگر بیمار ہو جاؤ تو ڈاکٹر حاضر۔ صبح چائے، دوپہر کو کھانا، شام کو چائے، رات کو کھانا اور پھر بیماری کے لئے ٹیکے — نئے نئے شہروں کی سیر کی، طوائفوں کے بازاروں میں چکر لگائے۔ کسی طوائف کو زبردستی چھیڑا۔ کسی لڑکی کو آنکھ ماری۔ اور اسی طرح کئی نئی باتوں سے اُسے اس دوران میں دوچار ہونا پڑا۔ تین سال کے عرصے میں وہ ایک بار بھی بیمار نہ ہوا۔ دن بدن اس کی صحت اچھی ہوتی گئی۔ اُسکے جسم پر گوشت کا غلاف چڑھتا گیا اور وہ خوبصورت ہوتا گیا۔

صرف یہی نہیں، بلکہ اس دوران میں وہ روپے گھر بھیجتا رہا گھر والوں کی حالت بہتر ہو گئی۔ اس کی ماں جسے ایک سال سے بخار آرہا تھا اچھا علاج سے اچھی ہو گئی۔ اس کی بہن جو سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ اچھی غذا کھانے سے اُس کی صحت میں بھی فرق پڑ گیا۔ گھر والوں نے مچھر دانیوں کا استعمال شروع کر دیا تھا اور زندگی آرام اور آسائش سے گذر رہی تھی۔

بیرہ۔ فروٹ کریم لاؤ۔

فروٹ کریم آگئی۔ اور وہ کھانے لگا۔ فروٹ کریم عجیب چیز ہے۔ خود بخود حلق سے نیچے اُتر جاتی ہے، اور زبان پر ایک عجب ذائقہ چھوڑ جاتی ہے اس نے سوچا۔

روشن چاہتا تھا کہ وہ گھر والوں کو بلائے، اور اس بڑے شہر کی سیر کرائے۔ یہ فلک بوس عمارتیں، یہ پھیلا ہوا سمندر۔

یہ کاریں،

یہ بجلی سے چلتی ہوئی ریلیں۔

سنگل جاتے

اور سمندر میں تیرتی ہوئی لڑکیاں

ناریل کے لانبے لانبے درخت، آسمان سے باتیں کرتے ہوئے۔

اور دور۔ دور ابھرتا ہوا چاند۔

یہ دہکتے ہوئے عارض،

یہ لہراتی ہوئی چوٹیاں، سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی چوٹیاں۔

توس!

مکھن!

پیسٹری!!

اور مئے ناب!

وہ چاہتا تھا کہ گاؤں کا ہر شخص یہاں آئے، تاکہ وہ سب اس زندگی کو دیکھ سکیں۔ یہ ایک نئی زندگی تھی۔

یہ لوہے اور سمنٹ کی زندگی، یہ صاف نکھری ہوئی زندگی، یہ خوشی اور مسرت کی زندگی یہ ناچ اور رنگ کی زندگی، یہ سینما اور تھیٹر کی زندگی، یہ نیلے پیلے پردوں کی زندگی، یہ کیف و سرور زندگی، یہ شراب اور بیر کی زندگی، ریشم و کمخواب کی زندگی یہ روپوں کی زندگی۔ کھنکتے ہوئے سکوں کی زندگی!! لیکن یہ لمحے بیت گئے۔ جب آنکھ کھلی، تو جنگ ختم ہو چکی تھی، اور فتح کا پرچم لہرا رہا تھا۔

بیرہ۔ کچھ اور لاؤ۔

کیا لاؤں سرکار۔

پھل کیلے، شریفے، سنگترے، سیب، سب کچھ لاؤ۔

اور بیرہ چلا گیا۔ روشن کی اُداسی بڑھتی گئی اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ چیزیں اس سے چھن جائیں گی۔

یہ زندگی اس سے چھن جائے گی۔ جنگ ختم ہو چکی تھی، اور ایک مہینہ کے بعد اُسے اس نوکری سے جواب مل جائے گا۔ اور پھر اُسے واپس جانا ہوگا

اپنے گاؤں سے۔ جہاں بھوک اپنے خوفناک جبڑے کھولے ہوئے اُس کی راہ دیکھ رہی تھی جہاں گندگی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی، تاکہ گاؤں کے ہر شخص کو دق ہو جائے، چہرے کی سُرخی زردی میں تحلیل ہو جائے، بھرا ہوا جسم سوکھ کر کانٹا ہو جائے۔

اس خیال کے آتے ہی اُس کے سارے جسم میں ارتعاش سا پیدا ہوا۔ اب اس کی ماں اور بہن کا کیا ہوگا وہ انہیں کہاں سے کھلائے گا۔ وہ خود کہاں سے کھائے گا یہ جنگ کیوں بند ہوئی۔ یہ جنگ شروع کیوں ہوئی تھی۔ کیا یہ جنگ ابد تک جاری نہیں رہ سکتی یا کم از کم جب تک وہ زندہ ہے یہ جنگ جاری رہے۔

اس جنگ کو جاری کرنے والے کون ہیں؟

فتح کا پرچم لہرانے والے کون ہیں؟

یہ کیسی فتح ہے یہ کس کی فتح ہے جس کے پرچم تلے بھوک بڑھ جائیگی بیکاری بڑھ جائیگی کارخانے بند ہو جائیں گے دفتر بند کر دئیے جائیں گے، لاکھوں آدمی بیکار ہو جائیں گے۔ ماں کو بخار آنے لگے گا بہن سوکھ کر کانٹا ہو جائے گی نہ کھانا ملے گا نہ کپڑے۔ نہ آنکھوں میں چمک ہوگی نہ چہرے پہ مسرت۔ اور روشیش سوچنے لگا کہ وہ کس سے پوچھے کہ اس فتح کا مقصد کیا ہے، وہ موت سے نہیں ڈرتا، وہ میدان جنگ میں مرنے سے نہیں ڈرتا لیکن وہ بھوک اور افلاس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ گندگی اور گاؤں کی متعفن فضا کو سہار نہیں سکتا۔

کیا یہ جنگ دوبارہ نہیں چھڑ سکتی

ایک جنگ!

دوسری جنگ!!

تیسری جنگ!!!

اس خیال کے آتے ہی اُسکے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی یاس کے سمندر میں آس کی لہر ابھرنے لگی، اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کس سے پوچھے۔

رستوراں میں ایک خوش باش جوڑا آیا اور سب کی نگاہیں اس جوڑے پر مرکوز ہو گئیں۔

لڑکی کی آنکھوں میں فتح اور کامرانی کی چمک تھی۔ اُسے اپنی خوبصورتی کا احساس تھا۔ اس کا جسم نیم عریاں تھا۔

روشیش اس لڑکی سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ جھجک گیا۔ اُسے ان دونوں کو دیکھ کر یہ محسوس ہوا جیسے فتح کا اُن پر کوئی اثر نہیں ہوا جنگ سے پہلے بھی خوش تھے اور جنگ کے بعد بھی۔

ایک اور جوڑا داخل ہوا۔ ایک مارواڑی سیٹھ اور اُسکی کنبری عورت۔ عورت بدصورت ہو چکی تھی، اور سیٹھ موٹا پے سے عاجز تھا۔ دونوں ساتھ والے فیملی روم میں چلے گئے۔ دراصل اس وقت روشیش اپنے سوال کا حل چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی اسکے کان میں آکر کہہ دے، چپکے سے کہہ دے کہ یہ جنگ پھر چھڑ جائے گی، یا کوئی کہہ دے کہ جب تک تم زندہ رہو گے، انہیں اس نوکری سے کوئی برطرف نہیں کر سکتا۔

. . . .

دو عورتیں اور تین مرد رستوراں میں داخل ہوئے اور میز کے قریب ہی بیٹھ گئے وہ عورتوں کے دمکتے ہوئے چہروں کو جی بھر کے دیکھنا چاہتا تھا۔ ولن خوبصورت بالوں کو آخری بار دیکھنا چاہتا تھا جی بھر کے۔ وہ ان ننگی باہوں کو چھونا چاہتا تھا لیکن اُسکی بے بسی کا شاید ان کو علم نہ تھا۔

کیوں ڈارلنگ۔ یہ جنگ تو ایک عذاب تھی، ایک عورت بولی

کوئی بس لیگا، تو جیل میں ٹھونس دیگا۔ کھاؤ، پیو، اور مزے سے بال روم میں ناچو، چھوڑو، اس جنگ کے قصّے کو

کیوں ڈارلنگ کیا ہو گئے ڈارلنگ ڈیر کی طرف دیکھنے لگا ڈیر کے بالوں کی طرف، ڈیر کے رُخساروں کی طرف، جن پر سرخی زیادہ تھی اور خون کم

اب ہزاروں لوگ بیکار ہو جائیں گے۔

روشیش ذرا غور سے سننے لگا۔

دوسرا مرد چُپ تھا۔

تیسرے مرد نے کھدر کی قمیص اور کھدر کا پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ ہاتھ میں چمڑے کا بیگ تھا۔

کیوں کامریڈ، تمہارا کیا خیال ہے، دوسرے مرد نے پوچھا۔

کامریڈ اب تک چپ تھا۔ وہ مزے سے چائے پی رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی، چہرہ زرد تھا۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں مگر پیشانی پر عزم اور استقلال کی لکیریں تھیں وہ جب کبھی بات کرتا تو نہایت پرسکون لہجہ میں، اُسکی آواز میں ایک ٹھہراؤ تھا۔

"کامریڈ، اس جنگ میں جنتا کو کچھ فائدہ ہوا! دوسرے مرد نے لفظ جنتا پر زور دیا، جیسے وہ کامریڈ کا مذاق اُڑا رہا ہو۔

کامریڈ چُپ نہ رہ سکا۔ اسکے لبوں کے گوشے کانپنے لگے۔ اسکی آنکھوں میں بجلی کی چمک عود کر آئی، اسکے ہاتھوں میں جنبش ہوئی، اور وہ کہنے لگا "حالات بدل چکے ہیں، اب ایک اور جنگ ہوگی جس میں اس بات کا فیصلہ ہوگا کہ اس کرۂ ارض پر انسانوں کا راج رہیگا یا حیوانوں کا۔ یہ جنگ انسانوں کی آخری جنگ ہوگی۔ اور اگر جنتا جیتی، تو کوئی وجہ نہیں کہ بھوک اور بیکاری ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مٹ جائے

"اور اگر سرمایہ دار جیتے۔ تو ــ"

"تو انسانیت ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جائیگی، لیکن میرا اٹل وشواس

(بقیہ بر صفحہ ۲۴۲)

اختر اورینوی

سورداس اور تلسی داس پر اُردو کا حق

تاریخ ادب کے بے لاگ مطالعہ سے اکثر ایسی صداقتیں ظاہر ہوتی ہیں کہ کئی جڑ سے مگر باطل مسلمات کی بنیادیں ہل جاتی ہیں اور کئی اکھاڑ پھینکے جاتے ہیں۔ میں نے جب بھی اُردو اور ہندی ادب کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا ہے میں اس اطمینان بخش اور عبرت انگیز نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی ریشہ دوانیوں سے پہلے اُردو اور ہندی میں کوئی فرق نہ تھا۔ اُردو ہی کے ابتدائی نام ہندی اور ریختہ تھے اور بس۔ سارے ملک کی معیاری ادبی زبان ایک تھی۔ چاہے اُسے آپ جو کچھ کہہ لیجئے۔ اس وقت اُسے ہندو مسلمان اُردو ہی کہنے لگے تھے۔ اس معیاری ہندوستان گیر ادبی زبان کے علاوہ صوبے صوبے کی اپنی مقامی بولیاں تھیں۔ ان مقامی دیس دیس کی بولیوں کے تجزیہ اور لب ولہجہ کے جائزہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی صوبائی خود مختاری کا رنگ لئے ہوئے اُردو ہی کی مختلف شکلیں تھیں۔ سامراجی بس کی گانٹھیں جب سمندر پار سے ہندوستان میں درآمد کی گئیں تو اُن کا ایک شوشہ ہندوستانی ادب کو بھی دیا گیا جس طرح سامراجی رہبر سے ہماری قومی زندگی کے ادارے تباہ و برباد ہو گئے بالکل اسی طرح ملکی ادب کو بھی موت کے گھاٹ اُتارا اور فرنگستانی ڈائنامیٹ لگا کر متحدہ زبان کے مضبوط رشتے کو توڑ دیا گیا۔ ملک کی فضا خراب ہوئی اور اب تک خراب ہے۔ بہت دھواں اُٹھا، بہت گرد و غبار اُڑا، بہت شور و شر ہوا۔ اہل وطن کی آنکھیں چندھیا گئیں، بھائیوں پر پردے پڑ گئے۔ فورٹ ولیم کالج میں اُردو ہندی کی خدمت نہیں ہوئی۔ "ڈائمنڈ ہاربر" کے دریب ہمارے ادب و زبان کو ہیرے کی کنی کھلائی گئی۔

میں نے جہاں تک غور و فکر کیا ہے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اس زہر کا تریاق اُردو ہندی کے ادب کی تاریخ کا متحدہ مطالعہ و تنقید ہے۔ اور دراصل دونوں کی تاریخ کی جڑیں ایک ہی ہیں، وسطی تنا بھی مشترک ہے اور اُن کی شاخیں بھی ایک ہی ہیں۔ اغیار کی ستم آرائیاں تو خیر، اپنوں کی بے اعتنائیوں نے غضب کیا ہے۔ دوسروں کی ابلہ فریبیاں ستم مگر اپنی تنگ نظری کو کیا ہوا تھا۔ اُردو اور ہندی تاریخ ادب لکھنے والوں کی نگاہ خطرناک طور پر چوکی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ملکی ادب کے ابتدائی صنف [illegible]

دو قوموں کے اتحاد سے یہ متحدہ زبان ہندوستان میں کس طرح پیدا ہوئی اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ تاریخ ادب سے ابتدائی واقفیت رکھنے والا شخص بھی یہ باتیں جانتا ہے۔ میں صرف اس حقیقت کے چند اہم پہلو پیش کر کے کچھ نتائج اخذ کروں گا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد پہلے پہل فاتح کی حیثیت سے نہیں ہوئی بلکہ تاجر اور مبلغ اسلام کی حیثیت میں ہوئی۔ سواحل سندھ، گجرات، کونکان، مالابار وغیرہ پر عرب چھا گئے اور ان علاقوں کو مرکز بنا کر اندرون ملک میں بھی پھیل گئے۔ اس طرح عربی زبان کا ہند کی مختلف بھاشاؤں سے میل ہونا شروع ہوا۔ فارسی بولنے والے تاجر بھی ہندوستان آیا کرتے تھے۔ غرض ملک میں وہ فضا جس نے متحدہ اُردو زبان تدریجاً پیدا کی، مسلمانوں کے سیاسی عروج سے پہلے موجود تھی۔ سندھ اور پھر پنجاب اور دوسرے خطوں کی فتح کے بعد مذکورہ بالا فضا سارے ملک پر کم و بیش چھا گئی۔ لیکن یہ ایک مغالطہ ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی عروج نے اُردو زبان کی تخلیق میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ سیاست نے اکثر ترویج اسلام اور تخلیق اُردو میں دانستہ و نادانستہ رکاوٹیں پیدا کی ہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ حکومت کی وجہ سے بالواسطہ متحدہ ماحول پیدا ہونے میں مدد ملی۔ اس ماحول میں اُردو زبان کی انکھوریاں نکلیں، پتیاں بڑھیں، کونپلیں پھوٹیں، ٹہنیاں ہری ہوئیں اور رفتہ رفتہ یہ پریم اور پیار کا پودا پروان چڑھ کر سرسبز و شاداب درخت بن گیا۔ اس میں نت نئی شاخیں نکلیں، پھول پھل آئے جو دیس والوں کو اپنی خوبصورتی اور مٹھاس سے لُبھاتے رجھاتے رہے۔ اُردو زبان کا بیج تو بہت قبل مبلغوں اور تاجروں نے ہند کے علاقے علاقے میں لگا دیا تھا۔ پھر ارتقائے اُردو کے لئے سازگار متحدہ ماحول پیدا کرنے میں بھی ان مبلغین اسلام و صوفیائے کرام نے سلاطین اور حکام سے کہیں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان باصفا مبلغینِ کرام اور صوفیائے عظام کی برکت سے جو اثرات پڑے وہ ہندوستان گیر، وسیع اور پائندہ تھے۔ سارے ہندوستان میں نومسلموں اور ہندو معتقدین کے مستقل دائرے بن گئے جو ہر بھاشاؤں اور فارسی عربی کے میل جول سے متحدہ زبان بڑی چاہ اور

... کی ترقی کی باری
... کی وجہ سے ہیں دلبری

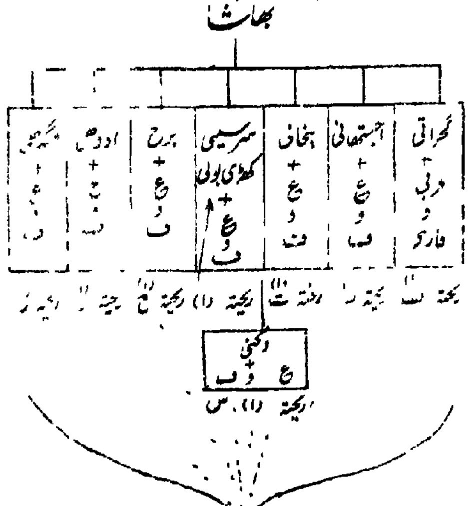
... مرحلے میں
... اساط چلتے سے ... ساہیتر
... کی ایک ہی صورت
... اتحاد کو میں "آمیزش"
... میں سامنے ... میں ریختہ دو آمیزش
... ترکیب آیا یعنی ریختہ اب
... اور عربی فارسی کے امتزاج
... تھا ملکی اور غیر ملکی
... ایک ہو گئے تھے صورت
... پنجابی، سرسینی، برج، اودھی
... عربی و فارسی سے ترکیب
... زال ...
ایک معیار قائم کر دیا ...
... (۱)
... ثقافت کا
... کے نمونہ
... پہلے اور ...
...
...
... وہ تبدیلی ...
... قرب و جوار میں
... کے میل سے جو سانچہ ...
... ظاہر ہو ... روزمرہ
... جیسے ... کی ساکھ قائم ہو گئی یہ ساکھ اور
... اس کے علاوہ اس کی ساخت اور
... معتدل تھی۔ ایک طرف پنجابی لب و
... دوسری طرف بنگالی لب و لہجہ کی نرمی کھنچاؤ،
اور ... کھڑی بولی ان دونوں انتہاؤں کے درمیان تھی
... بنگال پر لیٹی ہوئی تھی۔ بلکہ ...
... موجودہ الفاظ کا جائزہ لیجئے تو یہ بات ظاہر

ہو جائے گی ... ملاحظہ ہو۔

(۱) تہاڈا ⟵ تمہارا ⟵ تمہار ⟵ تمار

پنجابی ⟵ کھڑی ⟵ پوربی ⟵ بنگالی

عرض مرکزیت، مشابہت اور اعتدال کے سبب ... کی ... معیاری
حیثیت حاصل ہوگئی اور مقامی ریختے بھی جگہ پر رہے۔ جب ... ہوئیں تو
تخلیق ادب کے لئے آسانیاں پیدا ہو گئیں یہ معیاری سانچہ ... کی ...
کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھا۔ ہر چند کہ ادب اردو کی تخلیق ... دور
میں مقامی سانچوں کا رنگ بھی جاری رہا تاہم رفتہ رفتہ معیاری ...
ایسا اثر پیدا کیا خصوصاً جب فارسیت کے ... ولی ... کا
چرچا عام طور پر شروع ہوا۔ عہد مغلیہ کی ابتدا اور وسطی ...
لحاظ سے فارسیت کا زور ... اور دو ... زیادہ ...
ریختہ میں ادب پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا مثلاً گجرات، ...
غرض ریختہ یعنی ابتدائی اردو کے کئی سانچے ...
کی ساخت و تراش میں کھڑی بولی، کے سانچے کو ...
معیاری حیثیت حاصل ہوئی۔ ملاحظہ ہو نقشہ۔



ہندی (ہندوستانی)۔ **ریختہ** (ابتدائی) اردو

(۱) کھڑی بولی + عربی + فارسی = معیاری ریختہ = اردو سے معنے۔ ریختہ (۱) الف۔
ریختہ (۱) ب ریختہ (۱) ت۔ ریختہ (۱) ج۔ ریختہ (۱) د۔ ریختہ (۱) ر۔ ریختہ (۱)
س، اور ریختہ (۱) یہ سب ریختے ہی تھے مگر ریختہ (۱) کو مرکزی اور معیاری

[illegible] حاصل ہوئی

یہ ضرور ہوا کہ بعض دیار میں ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے امتزاج کا عمل آمیزش کی حالت سے ترقی کر کے ترکیب کی حالت تک نہ پہنچا۔ یہ دائرہ علاقوں کے ریختوں [illegible] نہیں آئی مثلاً بنگالی اور متعلق بھاشاؤں میں عربی اور فارسی الفاظ [illegible] مقامات کھڑی، برج، اودھی، مگدھی اور دکن کے [illegible] [illegible] اور یہ سب [illegible] اس کے علاوہ یہ بھی ہوا کہ [illegible] [illegible] بولی والے ریختہ کو لسانی اور ادبی معیار کی حیثیت سے [illegible] [illegible] سے کھڑی بولی کے ریختہ سے سارے ہندوستان [illegible] مقامی بولیوں والے ریختے بھی قائم رہے۔ ان میں [illegible] مثلاً موجودہ بنگالی، گجراتی، مراٹھی وغیرہ۔

[illegible] نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ابتدائی دور [illegible] پیدا ہوئی ابتدائی اردو ادب بھی [illegible] اور متحدہ اردو دور [illegible] اور جب زبان و ادب عہد عروج تک پہنچا بلوغت کی سرحد [illegible] کی صورت [illegible] [illegible] ادبی معیار [illegible] مرکز سے پرے اور [illegible] اور مرید برقرار رکھا گیا۔

[illegible] نقطہ نگاہ سے اردو ہندی ادب کی تاریخ دیکھتا ہوں تو مجھے ایک خلا [illegible] ہے۔ متحدہ زبان تو پیدا ہو چکی تھی اور اپنی ارتقائی منزلیں [illegible] کی تحقیقات کی روشنی [illegible] متحدہ ادب [illegible] شروع ہوتی ہے [illegible] درمیان کا [illegible] موجودہ تاریخی کتابوں کے مطابق شمالی ہند میں ادبی لحاظ سے خاموش و بے اثر سا دکھایا جاتا ہے۔ جدید لکھنے والے بھی اس دور میں دکن کی ادبی سرگرمیاں تو پیش کرتے ہیں مگر شمال کو ساکت بتاتے ہیں۔ اسی طرح ہندی ادب [illegible] تاریخ تو [illegible] تلسی داس، سورداس، [illegible] رحیم خانخاناں، [illegible] کبیر و نانک اور رودیاس اور میرابائی کا تذکرہ تو [illegible] اسکے بعد [illegible] جاتے ہیں۔ یہ عجیب بات [illegible] اور [illegible] پڑتی ہے۔ درمیان میں غیر مسلسل طور پر بھوشن اور بہاری کا تذکرہ ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں [illegible] اور عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ دکنی شعرا اور ادبا کے ادب پاروں پر دکنی بولی کا اثر ہے اور دوسرے یہ کہ تلسی، سور، کبیر اور میر وغیرہ کھڑی بولی کے نہیں ہیں۔ پھر بھی اول الذکر گروہ کو اردو کا علمبردار سمجھا جاتا ہے اور ثانی الذکر کے تذکرے ہندی ادب کے سلسلے میں بڑی دھوم دھام سے

ہوتے ہیں حالانکہ علم السنہ کے ماہروں، [illegible] اردو ہندی [illegible] اردو ہندی ادب اور زبان کی معیاری [illegible] نظر میں تضاد کیوں؟ دوسرا سوال یہ [illegible] کے اعتبار سے [illegible] اور مطہر جانجاں کے [illegible] دور متحدہ ہند کا [illegible] ہے [illegible] اعلیٰ منزلیں طے کیں فن تعمیر، فن موسیقی [illegible] پیدا ہوئے اور اسی شمالی ہند میں پیدا ہوئے [illegible] تاج محل کلچر کے امتزاج کی ابدی یادگار [illegible] مکان کو فتح کر کے آج بھی اپنی لہروں سے [illegible] پیدا ہوتا ہے کہ سورداس [illegible] داس اور [illegible] درمیانی عہد کا ادبی خلا ہندی [illegible] کی تاریخ [illegible]

ان تین سوالوں کا ایک جواب [illegible] ہو جاتا ہے اور اردو ہندی تاریخ ادب [illegible] سنیے اور غور فرمائیے۔ میرے خیال [illegible] تک کا وسیع عہد اردو ہندی کی [illegible] کی معیاری اہمیت تسلیم کرتے ہوئے، گو کہ اردو ہندی کا پہلا [illegible] ریختہ ہو چکی تھی سلطان، [illegible] وغیرہ [illegible] سورداس اور تلسی داس کی زبان [illegible] تفصیل ایک علیحدہ مضمون کی طالب ہے [illegible] ادبا و شعرائے دکن، شمالی ہند کبیر، سورداس سوامی [illegible] بہار اور [illegible] اور [illegible] لئے ویسے ہی اہم ہیں جیسے [illegible] کھڑی بولی کے ادبا و شعرا مثلاً ولی دکنی، [illegible] مومن، غالب، نذیر احمد، میر امن، [illegible] کے رجحانات سے قطع نظر کیجئے حالانکہ [illegible] [illegible] رنگ کی شکل میں جھلکتی رہتی [illegible] [illegible] تلسی داس [illegible] ادب ہندی میں شمار کئے [illegible] ہو کہ کھڑی بولی کے شاعر [illegible] دکنی بولی میں لکھنے والے قدیم شعرا [illegible] [illegible] جاتے ہیں تو پھر برج بولی میں لکھنے والے [illegible] والا تلسی داس کیوں بے اعتنائی کا [illegible]

قدیم کی تاریخ وسیع (یعنی ۱۲۰۰ء سے ۱۸۰۰ء) میں سمجھنے کے لئے خسرو، نانک، کبیر، سور، تلسی، عبدالرحیم خانخاناں، ملک محمد جائسی، تخی، اس شاطی ستار، بہاری وغیرہم کی یکساں اہمیت ہے۔ اور اردوئے وسطیٰ و عہدِ وسطیٰ کی سمجھ بوجھ کے لئے میر، مومن، غالب، میر انیس، نظیر، للو لعل اور بھارتیندو کا مطالعہ بیحد ضروری ہے۔ بغیر اس نقطۂ نگاہ کے اردو اور ہندی زبان و ادب کی مربوط، مسلسل، منطقی اور معقول تاریخ لکھنی ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں سورداس اور تلسی داس پر اردوئے جدید کا وہی حق سمجھتا ہوں جو آج کی ہندی والے جتاتے ہیں۔ عہدِ مغلیہ کے متحدہ کلچر کی یہ دونوں شعرائے جلیل بھی یادگار ہیں۔

خسرو کی زبان ملاحظہ ہو:-

اوپر سے ایک تریا اتری۔ جس نے بہت رجھایا
پی کا نام مرتیم پیارے۔ اپنا نام نہ بولی

اور ستاؤ۔ نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ آویں، نہ بھیجیں پتیاں۔

کبیر کہتا ہے:-

کرم کریاں لکھی رہا
اب کچھ لکھیا نہ جاسے۔

کبیر "ہستی" بندگی، وغیرہ الفاظ بکثرت استعمال کرتا ہے۔ اور حضرت نانک علیہ الرحمۃ کے یہاں تو اسلامی اصطلاحاتِ مذہبی اور بیانات صوفیانہ کے سلسلہ میں بے شمار عربی فارسی الفاظ برتے گئے ہیں۔ مثلاً حج، زکوٰۃ، اسلام۔ ودیاپتی (۱۴۰۰ء) کی زبان حسب ذیل ہے۔

سکھی ہے ہمر دُکھک نہیں اور
ای بھر بادر ماہ بھادو سُون مندر مور　　(میتھلی)

سورداس (۱۴۸۳ء تا ۱۵۶۳ء)۔ یہ شاعر برج بھاشا میں شاعری کرتا تھا۔ اور کرشن بھگتی سے اپنا الہام شاعری حاصل کرتا۔ کہتا ہے:

جسودا ہری پالنے جھولاوے
ہلراوے دُلراوے ملہاوے　　(برج)
جوئی سوئی کچھو گاوے　　جسودا ہری پالنے جھولاوے
میرے لال کو آوے نیندریا
کاہے نا آنی سواوے　　"　"　"　"　"
توں کا ہے نابیگی سی آوے　　(بیگی۔ جلدی)
تو کو کانہ بلاوے　　جسودا ہری پالنے جھولاوے۔

برج بھاشا اور کھڑی بولی میں تو بہت ہی زیادہ قربت پائی جاتی ہے۔ محمد حسین آزاد نے تو برج بھاشا ہی کو سرچشمۂ اردو قرار دیا ہے۔

میرابائی کی بھگتی ملاحظہ ہو:-

بسو میرے نینن میں نندلال
ساونی صورت موہنی مورت　　(برج راجستھانی)
نینا بنے بسال ــــ بسو میرے نینن میں نندلال

میرابائی تلسی داس کی ہمعصر جودھپور کی راجکماری تھیں۔

تلسی داس (۱۵۳۲ء تا ۱۶۲۳ء) اپنی نظم "رام راجیہ" میں کہتا ہے۔ یہ اودھی بھاشا کا شاعر ہے۔

نہیں دَرِدر کوئی دکھی نہ دینا
نہیں کوئی اندھ نہ بچھن ہینا
سب گیانی گن آگنیاں پنڈت
سب کرتگیہ نہیں کپٹ سیانی

خسرو، سورداس، تلسی داس، عبدالرحیم خانخاناں، نانک، کبیر، ملک محمد جائسی، ودیاپتی، وغیرہم کی شاعری ہمارے ادب کا بے بہا خزانہ ہے اور ہم اس کے صحیح حقدار ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ بغیر ان شاہوار دُرِ دانوں اور تابدار جواہر پاروں کے مکمل نہیں کہی جاسکتی۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ اپنا کھویا ہوا حق حاصل کریں۔

یاد رکھیئے؟

(۱) اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیئے ورنہ نہ جواب دیا جائے گا اور نہ پرچہ بھیجا جائے گا۔

(۲) ساقی میں شائع ہونے کیلئے جو مضامین بھیجے جاتے ہیں انہیں حتی الوسع محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم اُن کی واپسی کی ذمہ داری ادارہ ساقی نہیں لے سکتا اس لئے آپ اپنے مضمون کی نقل اپنے پاس رکھ لیا کیجئے۔

(۳) جواب طلب امور اور واپسی مضامین کیلئے محصول ڈاک بھیجا کیجئے (۴) ساقی کے نہ پہونچنے کی شکایت ہر مہینے کے دوسرے ہفتے میں کرنی چاہیئے۔ اسکے بعد پرچہ قیمتاً بھیجنا بھی مشکل ہے۔ نمبر خریداری لکھنا نہ بھولئے ورنہ پرچہ نہیں بھیجا جائے گا۔

(۵) سالانہ چندہ چھ روپے بذریعہ منی آرڈر بھیجا کیجئے وی پی واپس کرنے میں آپکو چار آنے زیادہ دینے پڑیں گے۔

نمونے کا پرچہ نو آنے ٹکٹ بھیجکر طلب کیجئے۔ اور اپنا پتہ خوشخط تحریر فرمایئے۔

منیجر ساقی۔ دہلی

سرلا دیوی۔

تاریکی بڑھتی جارہی ہے

اس سگائی کرو۔ بڑا اچھا گھر ہے ماں باپ کی اکلوتی لڑکی ہے۔ چار بھائی ہیں اور سب کے سب افسر۔ دیکھئے کیا؟ ـــ وہ اکلوتی بیٹی ہے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ سگائی میں چار ہزار خرچ کریں گے۔ شادی میں لڑکی کی ماں اپنا تمام زیور اور نقد دس ہزار روپیہ دیں گے اور چاہتے کیا ہو لڑکی دیکھ لینا چاہیئے؟ ـــ تو کیا سگائی کرلوں گی اپنے لال کی اور بنا دیکھے ہوئے۔ واہ جی۔ کیا کہا۔ پڑھی لکھی ہوئی ہے لڑکی۔ اور میٹرک بھی۔ صرف؟ کیا مطلب ہے تمہارا۔ تم بھی سرے بدھو ہی نکلے ارے ہندی کا بی۔ اے اور انگریزی کا انٹرنس۔ ہنس کیوں رہے ہو؟ کیا کہا ڈھونگ رچ رکھا ہے پرائیویٹ کرکے تین سال بعد انگریزی کا بی۔ اے کر سکتے ہو۔ یعنی چار سال میں بی۔ اے کتنا آسان اور بیوقوفانہ طریقہ ہے آخر میں پوچھوں تم کہاں تک پڑھو۔ صرف دسویں پاس کی تھی جنگی میں ملازم ہو گئے۔ ہاں لکشمی کی کرپا تھی آج سب کچھ بن گئے۔ پر کیا ایم۔ اے پاس لڑکی لو گے؟ زیادہ منہ مت کھولو۔ میں کہتی ہوں تم آگے چل کر پچھتاؤ گے۔ لو میں تو چلی ـــ بس میں تو چلی جب کوئی میری سنتا نہیں تو

”جی دو سو روپے کماتا ہوں۔ سرکار کی کوارٹر ملا ہے۔ بیچ میں بکنے لگے ہیں“

”اجی ہاں میں کیا نہیں دیکھ رہی ہوں میری لڑکی تو آرام سے سوئیگی باقی لڑکی بھی تو بالکل گاتے ہیں۔ ڈنڈے پیٹنا پر محال کیا جو زبان ہلا جائے۔ گھر کے کام کاج میں ایسی کہ مجھے خبر ہی نہیں گھر میں ہوتا کیا ہے۔ تمام کام اس کے ہاتھوں گذرتا ہے۔ بھائی بہنوں کو نہلاتی دھلاتی ہے کپڑے سیتی ہے، اسکول پڑھنے جاتی ہے۔ کبھی تو ایسے نکالتی ہے کہ بس۔ اور یہ چادر جو آپ کے بستر پر بچھی ہے، یہ تو وہ بائیں ہاتھ سے نکال لیتی ہے۔ میٹرک ابھی سال پاس کرلیا، پڑھنے کا اسے بڑا ہی شوق ہے۔ پر جوان ہو گئی، اب اس کے پتا جی اسکول نہیں جانے دیتے۔ تو آپ کی کیا صلاح ہے آپ تو بڑے ہونہار ہیں۔ آپ کی ماں نے تو ہیرا پایا ہے“

”مگر میری نوکری عارضی ہے اور۔ ۔ ۔“

”نہیں بیٹا ہوا کیا بھگوان جب منہ دیتا ہے تو نوالہ بھی ساتھ دیتا ہے۔ پھر میری بیٹی تو لکشمی ہے۔ جب پیدا ہوئی تھی تو اس کے باپ کو ایک ہزار روپیہ رشوت میں ملا تھا۔ ہمارے تو جب سے پیدا ہوئی دیا سا چلتا

گیا ہر آدمی اپنی قسمت بھی تو ساتھ لاتا ہے۔ اور پھر ہم بھی تو ہر قسم کی امداد کو تیار ہیں۔ لاج رکھ لو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ آپ آخر چپ کیوں ہو گئے؟!“

”چپ۔ گم سم۔ ہر وقت مریض کی طرح پڑے رہنا۔ دیکھ ذرا آج تو ہی دھوتی پہن لے ان سے ذرا سلیقے سے پیش آنا۔ تمہیں دیکھنے کو آرہے ہیں نا۔ ارے سہم کیوں گئی۔ چہرا ہلدی سا کیوں ہو گیا نہ بیٹی مغموم نہ ہو۔ ورنہ سارا کیا دھرا رہ جائے گا چہرے پر ذرا مسکراہٹ لا۔ منہ اوپر اٹھا کر ہنس۔ میری چندا۔ اگر تجھے انہوں نے پسند کرلیا تو تیری ماں کی چھاتی کا بوجھ ہٹ جائے گا دیکھ اپنی آنکھوں میں آنسو مت لا۔ ماں کے اشاروں کو سمجھ لے۔ یہی دستور ہے اچھی لڑکی کا۔ کیا کہا؟ تجھے میری باتیں پسند نہیں! ارے تو میری ماں ہے یا میں تیری شرم نہیں آتی یہ باتیں کرتے ہوئے تیری پسند اور ناپسند کو یہاں پوچھتا ہی کون ہے؟“

”تو یہ ہے آپ کی لڑکی ـــ ہوں ذرا چلا کر دکھائیے تو۔۔۔ ارے یہ ان کا چہرہ کیوں مرجھا گیا۔ ماتھے پر ننھی ننھی پسینے کی بوندیں کیوں چھلک آئیں۔ کیا کچھ بیماری ہے۔۔۔ دق وغیرہ تو نہیں ہے۔ ہاں مجھے تو خوب ٹھوک بجا کر اپنے لال کا رشتہ لینا ہے۔ اوہ گھبرا گئی ہیں۔ تو آپ نے پرائیویٹ کب پاس کیا۔ ۱۹۴۲ء میں۔ اور میٹرک ۱۹۴۳ء میں۔ اندرپرستھ کالج سے۔ ہوں یہ میز پوش، یہ چادر، غلاف، رومال سب تمہارے ہاتھ سے نکالے ہوئے ہیں ہوں“

”کچھ کھائیے نا۔ لیجئے نا جائے۔ یہ رکھے انگور، انار، کیلے، گلاب جامن۔ جا بیٹی ذرا تو اندر جا کر دیکھ آ۔ تیرا بھائی کیا کر رہا ہے ـــ تو آپ کو میری لڑکی پسند آئی؟ ـــ کیا کہا دبلی ہے۔ جی، مگر آپ کے گھر جائے گی تو موٹی ہو جائے گی۔ بیٹی کی ذات ہی دوسرے گھر پھولتی پھلتی ہے۔ جوان ہو گئی ہے دوسری لڑکیوں کی طرح تیتری سی اڑتی نہیں پھرتی آپ کے گھر کیسے کھاتی تو آپ چلنے لگیں۔ بیٹھئے تو سہی۔ آپ نے تو کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ ایک دفعہ پھر دیکھ لیجئے۔ چلا پھرا کر، الٹ پلٹ کر، اتنی دبلی تو نہیں ہے کہ۔۔۔۔!“

[illegible] میرا دل بیٹھ
کا گھر ہے، اس مکان [illegible] بات کہلا رہی
پڑتی رہے گی اور یہ کچھ نہ کا جاتی ہے اور رکھی [illegible] ہے
صرف [illegible] ہم [illegible] کی [illegible] شبہ سا کیا۔
[illegible] ہی [illegible] ایک بار [illegible] کہا ہے
شبہ لڑکی [illegible] اور [illegible] آدمی

ہاں اس نے کھڑکی سے [illegible] یہ رسالہ [illegible] دیا
ہوتا اب اُن کی صلاح [illegible] نہیں ہوتی [illegible] تو کیا
ڈالی [illegible] کھاٹ توڑتے رہے [illegible] ڈال [illegible]
نہیں معلوم شادی [illegible] مگر ان سامنے [illegible] کوئی
عمر کٹ جاتا ہے۔ دو سال پہلے [illegible]
معلوم ہوتی تھی۔ کپڑے پہنتی تھی تو [illegible] میں کھلتی [illegible]
شادی کو تو بڑا اچھا [illegible] کر دو سال سے
اسے گھر میں گھونٹ کر رکھا ہے۔ شام کو باہر گھومنے [illegible] وقت [illegible]
سے اٹھا کر اس کی کونپل سی اٹھان کو روک [illegible] دیا [illegible]
دیا۔ یہ کرامت ہمیں ہمارے [illegible] تو موٹا تھا اور [illegible] باہر جاتی، تو
میں قبلہ کی [illegible] سے [illegible] ساتھ
ساتھ جاتی ہوں میں تم سے پوچھتی ہوں کیا دوسروں [illegible]
ناچتی پھرتی ہیں کیا کہا، کہ [illegible] سائیکل چلاتی
ہیں، سیر کرنے کے لئے جاتی ہیں [illegible] وقت [illegible] اور
اپنی پسند کا کپڑا خرید کر لاتی ہیں [illegible] باپ [illegible]
ایسی باتیں کرتے شرم نہیں آتی۔ [illegible] لڑکیوں کی عزت [illegible] اور پھر وہ [illegible]
لوگ [illegible] تم [illegible] کارنامہ۔ [illegible]
وہ ہمیشہ [illegible] کیونکہ [illegible] کیا وقت آگیا ہے۔
کتنے منہ کھل گئے ہیں میری لڑکی ہوتی تو گلا گھونٹ دیتی۔ [illegible]
ان لڑکیوں نے [illegible] اور [illegible] ڈھونگ رچا رکھا ہے ——
ارے تم [illegible] مجھ سے پوچھتے ہو [illegible] اور [illegible] ڈھنگ
ہوتی تھی تو [illegible] اپنی لڑکی کو ان عورتوں کے سامنے پیش کرانے کے لئے
سجائی تھی، وہاں بھی تو پسند اور ناپسند کا قصہ تھا اگر لڑکے نے لڑکی [illegible]
دوسرے کو منتخب کر لیا تو کیا غضب ہو گیا۔ تمہارے باپ ہی [illegible] نا قابل
گردانتے ہیں۔ میں صاف کہے دیتی ہوں کہ گھر میں اگر ایسی باتیں نہ کیا کرو۔
ہائے میں کیا کروں،" اس ڈائن نے تو میری جان کھا رکھی ہے۔ مر جائے

تو مکتی ملے"

بھاگ گئی ؟ ارے کون بھاگ گئی۔ اور کس کے ساتھ ؟ [illegible] بھاگ
گیا لڑکا۔ جگدیش کا چھوٹا بھائی۔ وہ جس کی عمر کوئی بارہ سال کے قریب تھی۔
ٹھیک ہوا۔ اگر بھاگ رہا تا تو [illegible] سوتیلی ماں کے خوف سے بھاگ کر
وہ اپنے بھائی کے پاس آیا تھا [illegible] کے چند ٹکڑوں کے ساتھ اسکو [illegible]
شفقت اور محبت کی کیکپی کا بھی احساس ہو [illegible] غلطیوں کی [illegible] وہ [illegible]
کرتے ہوئے کوئی [illegible] اس کے [illegible]
نوکری طرح نہ [illegible] تھوڑی ٹکا [illegible] اس لئے [illegible] رات کا [illegible]
[illegible] کروائے اسکول کے واسطے [illegible] کپڑے اور [illegible]
کر دے مگر بھائی کے پاس آکر [illegible] بھائی [illegible]
ایک حسین بیوی اسے اپنی بدصورتی کے عوض میں مل گئی [illegible] اور
تعلیم کی کمی بھی کچھ اسی طرح پوری ہو گئی تھی۔ [illegible]
شکوہ نہ تھا۔ والدین سے تعلیم نہ دلانے کا گلہ [illegible]
ذہنیت سے بیزاری نہ تھی۔ دن رات [illegible] کو لئے پارکوں [illegible]
گھروں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ وہ دونوں اس کو گھر کی [illegible]
[illegible] اس بچے کی طرح جس کو تانے کے [illegible] ایک [illegible] باندھا [illegible]
لڑنے کیلئے چھوڑ دیا جاتا۔ اور وہ دن کے گھنٹے اور رات کا [illegible]
گنوا دیتا۔ ایک چوکیدار [illegible] ڈیوڑھی [illegible]
والے خارش زدہ کتے کی طرح۔ یہ بجا ہے کہ گھر کے تحفظ کا اہم کام محض معتبر
آدمی [illegible] اور خود خدا نے اس لڑکے کو صورت بھی جو کیا
[illegible] کیا کہا۔ اس کا بڑا بھائی بھی تو کچھ صورت [illegible] اس سے زیادہ
[illegible] تھا [illegible] اسکے ساتھ ایک ضمیمہ تو تھا خوبصورت، عقلمند،
مغرور، چالاک۔ وہ عورت تو جانتی تھی کہ گوشت کی "رسوت" کا اثر کتنا ہوتا
[illegible] انگڑائی توڑ کر اس کی طرف کچھ ایسے دیکھ کر
کہتی کہ اسے تو [illegible] پسند ہے تو فوراً وہ کہتا۔ بالکل بجا ہے۔ اور
ڈاکٹری [illegible] یا رات کے دو بجے وہ بستر سے
اٹھ کھڑا [illegible] سنو تو [illegible]
ہی ٹھنڈ لگ جاتی ہے [illegible] مگر وہ اوور کوٹ پہننے میں کچھ دیر سینے کے بٹن
بار بار لگا کر کھولنے میں لگاتے ہوئے کہتی میرا جی تو سیر کرنے کو چاہ رہا ہے
تو وہ فوراً بالتو کتے کی طرح دم ہلا کر کھڑا ہوتا۔
کیا شاعرانہ تخیل ہے تمہارا لیکن اگر اسی وقت وہ کہہ دیتی کہ دیکھو اندھیرا
گہرا ہے۔ اور سڑکوں پر رات کو گھومنا شریفوں کا کام نہیں تو جناب فوراً بول

اٹھتے۔ سچ میری جان تم کتنی عقلمند ہو۔ میں بھی یہی کہنے والا تھا۔ ناشتہ پر صبح کو وہ دونوں خود مکھن اور توس چپڑ چپڑ کھاتے رہتے اور وہ پیتل کے گلاس میں خالی چائے کے گھونٹ بے جا ظلم کی طرح پیتا رہتا۔ کیا بیہودہ سوال مجھ سے پوچھتے ہو کہ وہ ایسا برتاؤ لڑکے کے ساتھ کیوں کرتے تھے۔ آخر وہ انکا بھائی تھا۔ اسکا خون تھا۔ .. آہا ہا۔ کیا احمقانہ سوال کرتے ہو۔ کل پوچھنے لگو گے کہ لوگ طوائفوں کے دام میں گرفتار کیوں ہوتے ہیں اور ہوتے بھی ہیں تو اپنے خاندان کو جہنم میں جھونک کر ساری دولت کیوں لٹا دیتے ہیں۔ بنگال میں مارواڑیوں اور مہاجنوں کی دکانوں کے آگے لاکھوں مرد عورت اور بچے کیوں مر گئے اور مرے بھی تو ان کے گوداموں سے چاولوں کی بوریاں باہر کیوں نہ نکلیں۔ ہندوستانی غلام کیوں ہیں اور اگر غلام بھی ہیں تو سرکاری خطاب کیوں قبول کرتے ہیں۔ خطاب قبول کرتے ہیں تو سان فرانسسکو میں جا کر خود اپنے ملک کی تذلیل کیوں کرتے ہیں؟ کیسی بے ترس کاری کا ثبوت دیتے ہو۔

جی میں ایک ترقی پسند ادیب ہوں اور شاعر بھی۔ آپ نے کیا دریافت کیا: اور سے بولیے۔ آپکی آواز مہرلوں کی طرح مدھم ہے۔ اوہ آپ نہیں جانتیں ترقی پسند کسے کہتے ہیں۔ تعجب ہے کہ آپ ابھی تک اس لفظ سے ناواقف ہیں۔ ترقی پسندی۔ ترقی پسندی۔ جی آپ نہیں سمجھ سکیں گی۔ یہ ایک تحریک ہے۔ رو گئی ہے۔ ماد ہے۔ رجعت پسندوں کے لئے ایک کارگر تازیانہ ہے۔ بس آپ یوں سمجھئے کہ بھوکی اور مظلوم انسانیت کے لئے تیر بہدف ہے۔ اور آپ محض ہندی جانتی ہیں۔ دراصل ہندی بڑی شیریں زبان ہے۔ اور آپ کی آواز میں ایسے سر ایک ایسا لوچ پیدا ہو جاتا ہے جیسے بھرنے کے شور میں مدھم مدھم سر دل میں بج رہا ہو۔ دراصل مجھے ہمیشہ عورتوں کے لہجہ میں ایک انوکھی شیرینی اور نغمگی کا احساس ہوتا ہے جو میری روح پر حسابی خط کی اندر دھنش بکر چھا جاتا ہے۔ ہاں تو تیر بہدف کا ترجمہ بس رام بان سمجھ لیجئے۔ جی رام بان سرجن کا اشتہار آپ نے بار بار دیکھا ہوگا۔ ہم سب لوگ یعنی ترقی پسند ادیب زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کے حامی ہیں اور خصوصاً عورتوں کی ترقی کے۔ دیکھئے آپ خود ہی کو لیجئے۔ کتنی گھٹی گھٹی سی شخصیت ہے آپ کی۔ آپ کو آزادی حاصل نہیں ہوئی۔ اخلاقی قیود نے آپ کے زندہ جذبات کو جکڑ کر مردہ کر دیا۔ آپ مردوں سے گھبراتی ہیں۔ انکے ساتھ سیر کرنے نہیں جا سکتیں۔ ہم ایک ایسے نظام کے متلاشی ہیں جہاں مرد اور عورت بآسانی اپنے فطری جذبات اور خیالات کی تسکین و تکمیل حاصل کر سکیں۔ میرے سامنے افسانے عورت پر ہی لکھے گئے ہیں۔ میں نے اپنے تمام افسانوں میں سماج کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا ہے۔ میرے افسانوں میں عورتوں کے غیر تسکین شدہ جذبات کی سسکیاں ہیں۔ مردوں کی زیادتیوں کے خلاف جہاد ہے۔ میں عورتوں کے ساتھ انصاف کا حامی ہوں۔ آپ تنی دور کیوں بیٹھی ہیں۔ میں نے خود اپنے ایک افسانے میں عورتوں کے اس طرح دور بیٹھے رہنے کے خلاف بھی آواز بلند کی ہے۔

جی ہاں میں نے تین شادیاں کی ہیں۔ ایک عورت مر گئی۔ دوسری۔ دوسری کو میں نے چھوڑ دیا۔ صرف دو مہینے شادی کے بعد — جی نہیں آپ غلط سمجھیں کہ عورت دو ماہ کیا صرف ایک دن بعد مرد کے لئے کچھ نہیں رہتی۔ وہ بیکار۔ باسی اور بے لذت ہو کر رہ جاتی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ مجھے وہ عورت پسند نہ تھی۔ شادی کیوں کی تھی؟ — جی ماں باپ سے مجبور ہو گیا تھا۔ آپ میرے افسانے پڑھئے۔ آج تک میرے افسانوں میں سوائے شادی بیاہ کی بیچیدگیوں کے کہ کس طرح ماں روئی، بیٹے نے بغاوت کی، پنڈت آئے۔ ویدی رچائی گئی، منتر پڑھے گئے اور "گربہ کشتن" والی رات آئی اور بہت ہی کم چیزیں ہیں جو سوہیم کیسے کا کام دیتی ہیں۔ ماں سے مجبور ہو کر اگر شادی کر لی تھی تو پھر میں نے اس کو کس لئے چھوڑا تھا۔ دو ماہ تک کیوں اس کی عصمت کو لوٹتا رہا تھا اور گھر سے نکالتے وقت اسے ایک بچہ کیوں مرحمت فرما دیا۔ آپ یہ نہیں سمجھ سکیں گی، آپ کو کچھ غصہ آگیا ہے۔ دراصل میں شاعر ہوں۔ حساس ہوں، مجھے ایک دوسری لڑکی سے عشق تھا۔ میں اس سے شادی نہ کر سکا تھا۔ مگر وہ عقلمند تھی، ہوشیار تھی۔ شادی کے بعد بھی وہ مجھے نہ بھلا سکی۔ میں دو ماہ تک اپنی بیوی کو تعلیم دینے کی ناکام کوشش کرتا رہا — جی یہ آپ نے ٹھیک فرمایا کہ وہ ایف۔ اے تھی، اور کافی حسین تھی۔ مگر وہ بیوقوف تھی۔ یہ ہندوستان کی یونیورسٹیاں — ریڈیو پر آپ میرا ایک ڈرامہ سنئے۔ بالکل اسی موضوع پر۔ ہاں تو یہ ہندوستان کی یونیورسٹیاں یونہی ڈگریاں دے دیتی ہیں۔ وہ حسین ضرور تھی مگر ایک ادیب محض سعید کھال ہی نہیں چاہتا۔ وہ کچھ اور چاہتا ہے۔ اور۔ اور کھلتی ہوئی پو کی روشنی کی طرح انوکھی .. اوہ ڈوبتے ہوئے سورج کی شراب آپ کے رخساروں میں گھل رہی ہے... گلابی۔ گلابی۔ دراصل میں ارغوانی رنگ کے سلسلہ میں بہت حساس ہوں۔ میری روح میں اس رنگ کو دیکھ کر ایک تشنگی سی بھڑک اٹھی ہے۔ میرے ہونٹ چومنے کے لئے بیوہ عورت کے جذبات کی طرح تڑپنے لگتے ہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مجھے اس لڑکی سے نفرت تھی، میں نے اسے چھوڑ دیا۔ میں سماج کی پروا نہ کرتا تھا۔ پرانی روایات کو توڑنا میرے نزدیک ایک مقدس فرض ہے۔ میں نے دنیا کی پروا نہ کی۔ میں نے اس سے شادی کر لی۔ اور پھر آپ خود جانتی ہیں کہ ادیب کو ہر چیز جائز ہوتی ہے۔ وہ اوتار ہوتا ہے۔ پیغمبر کا رتبہ رکھتا ہے۔ آپ نے خود میری بیوی کے افسانے پڑھے ہوں گے۔ جی وہ بھی افسانے لکھنے لگی ہے۔ اس کے افسانے بڑے منجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ لوگوں کو ان افسانوں پر میرے لکھے ہوئے ہونے کا شبہ

ہوتا ہے رنگ گو کہ میرا ہی ہے۔ مگر لوگ حسد کرتے ہیں نا۔

دنگا ہو گیا؟ —— ہاں ہندو مسلمان دنگا جو نکٹ اٹھے تم۔ تاریخ نہیں پڑھی۔ دنگے فساد ۱۸۵۷ء کے بعد خصوصاً شروع ہوئے ہیں۔ ارے تم کو نہیں معلوم ۱۸۵۷ء میں کیا ہوا تھا ٹھیک کہتے ہو کہ اسکولوں میں پڑھائی جانے والی تاریخ سچ ہے اس میں سچ کم ہے۔ وہ ایک ... ہو مجرموں کے دھبے مٹائے جا سکتے ہیں ان کے "احسان" کو نہیں مٹایا جا سکتا۔ ہاں تو ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا تھا جب ہندو مسلمان ایک ہو کر ہندوستان کی آزادی کے لئے شعلوں کی طرح اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مگر سکھوں اور گورکھوں نے ساتھ نہ دیا اور ہندوستان غلام ہو گیا۔ اس دن کے بعد سے دنگے فساد شروع ہو گئے۔ کیا کہا ۱۸۵۷ء کے اتحاد کے بعد اب یہ دونوں قومیں کیوں لڑتی ہیں اور جنگ کرتی ہیں۔ میں کیا بتا سکتا ہوں۔ ہاں غلام دونوں ہیں —— کیا کہا کوئی تیسری طاقت ان فسادوں کے پس پردہ سرگرم عمل ہے؟ —— کیوں سفید جھوٹ بولتے ہو۔ سرمایہ داروں کے اخبار ہندوستان ٹائمس کو پڑھنے لگے ہو کیا؟ —— سر فیروز خاں نون کے بیان کو بھول گئے جو انہوں نے سان فرانسسکو میں اخباری نمائندوں کو دیا تھا۔ تم نے نہیں پڑھا؟ —— سرمایہ داروں کا اخبار پڑھتے ہو نہ۔ انہوں نے صاف کہا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے راستہ میں کوئی تیسری طاقت حائل نہیں یہ محض مہاسبھائی کانگریس پریس کا ہمہمہ ہے۔ اچھا چھوڑو اس بات کو۔ دنگے میں کسی کو چوٹ تو نہیں آئی۔ نہیں تو زیادہ جانی نقصان نہیں ہوا۔ صرف ایک ہندو نے دوسرے ہندو کو مسلمان سمجھ کر مار ڈالا۔ ہندوؤں نے ایک مسلمان کو ٹھکانے لگانے کے اعزاز میں اس مجاہد کا جلوس نکالا شام کو معلوم ہوا اس نے ایک ہندو ہی کو جان سے مار ڈالا۔ سنا ہے وہ مندر میں دو رات سے بھگوان کے سامنے پڑا اپنے "گناہ" کی تلافی کر رہا ہے۔ بار بار وہ چلا کر کہتا ہے "مجھے معاف کرو بھگوان میں نے اپنے ہی بھائی کا خون کر ڈالا"۔ دو دن پہلے وہ اس مندر میں ایک مسلمان کا خون کرنے کی خوشی میں گھنٹیاں بجانے آیا تھا۔

تم کو کیا۔ یہ آدمی اس اسٹیشن پر اداس مغموم، اس بنچ پر ایک مدت سے کیوں بیٹھا رہتا ہے۔ اس کے پاؤں ننگے ہیں۔ پیروں پر گرد جم کر کھال کے رنگ میں مل کر بھوری ہو گئی ہے۔ اس کا چہرہ خزاں کے سوکھے پتوں کی طرح زرد اور مرجھا گیا ہے۔ ہونٹوں کے ہوتے ہوئے یہ موم کے پتلے کی طرح کیوں خاموش رہتا ہے۔ اس کی مغموم، اداس اور پژمردہ نگاہ ہر آنے جانے والے کے چہرے پر پہنچ کر کیوں خود پشیمان ہو کر جھک جاتی ہے۔ تم کو آخر ان تمام چیزوں سے کیا مطلب؟

آؤ۔ ڈارلنگ آگے چلو۔ دیکھو یہ پگڈنڈی تمہاری مانگ کی طرح سیدھی کھجور کے ان جھنڈوں کے اور جاتی ہے۔ آؤ۔ آگے چلو۔ ارے تمہارے قدم کیوں رک گئے۔ تم کیوں سر کھپاتی ہو۔ یہ کہاں رہتا ہے۔ کہاں کھاتا ہے۔ ارے پگلی، خدا کی دی ہوئی اتنی زمین ہے۔ اوپر اتنا وسیع آسمان ہے۔ دعوتوں سے پھینکے جانے والے جھوٹے ٹکڑوں کا بھی کوئی کال ہے۔ دیکھو کھجور کے درخت ہم کو جھوم جھوم کر بلا رہے ہیں۔ جھیل کی نیلی لہریں تمہاری ساری کی لہروں میں گھل رہی ہیں۔ خدا کی دی ہوئی زندگی ہی کتنی ہے۔ آؤ۔ دیکھو سورج ڈھل رہا ہے۔

اور سورج ڈھل گیا۔ تاریکی کھجوروں سے برس پڑی۔ گھپ اندھیرا چھا گیا۔

تاریکی بڑھتی جا رہی ہے کتنا بھیانک خول ہمارے گرد چڑھ گیا ہے۔

تم مجھے نعص اپنی کمر میں ہاتھ ڈال لینے دو۔

تصانیف مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم

سوانہ کی روحیں:- سرزمین مارواڑ کے پُر اسرار حالات۔ راٹھوروں کا جنگی بانکپن، راجپوت کماریوں کی جرأت کے کارنامے اُن کے حسن و جمال کی رعنائیاں اور فسونِ محبت کی دلکش سحر کاریاں، رزم بزم کی ہو شربا داستان، جگر پاش اور جاں گسل واقعات۔ قیمت آٹھ آنے!

ملفوظاتِ ٹامی:- ایک کتے کی خود نوشت سوانح عمری ایسے مزاحیہ رنگ میں لکھی گئی ہے کہ کتوں اور دوسرے جانوروں کی ذہنیت کے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے جو اُن کے ہنسا دینے والے اور تمسخر آمیز افعال سے متعلق ہے۔ ہر فعل اس خوبی سے بیان کیا گیا ہے کہ گویا افسانہ ہے اور ہر افسانے کا پلاٹ اس قدر ہنسانے والا اور تفریح سے پُر ہے کہ بہترین افسانوں کا لطف آئے گا۔ قیمت صرف بارہ آنے!

چینی کی انگوٹھی:- یہ ایک نوجوان اور خوبصورت بیوہ کی انتہا سے زیادہ دلچسپ اور خوبصورت داستان ہے پھر ایک لوٹے نے اس قصہ میں کس دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا ہے۔ قیمت ۸/

مضامینِ چغتائی:- مرزا عظیم بیگ چغتائی کے مضامین اور افسانوں کا مجموعہ۔ اس میں ۳۲ مضمون اور افسانے شامل ہیں۔ قیمت ایک روپیہ!

ملنے کا پتہ:- ساقی بک ڈپو، دہلی!

آغا محمد اشرف

ریڈیو کے دس سال

پورے دس برس ہوتے کہ یکم جنوری ۱۹۳۶ء کو شام کے پانچ بجے دلی ریڈیو اسٹیشن سے پہلا باقاعدہ پروگرام ہندوستان میں سنا گیا تھا۔ اگرچہ آزمائشی پروگراموں کا سلسلہ اکتوبر ۱۹۳۵ء سے جاری تھا اور ڈھائی مہینے سے تمام ہندوستان میں ہر روز رات کو چند گھنٹے کے لئے لوگ دہلی ریڈیو کی آواز سنا کرتے تھے۔

ماضی ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستان کے پایۂ تخت دہلی میں اس قدر طاقتور ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا کہ اس کی آواز ہندوستان کے علاوہ افغانستان۔ برما۔ ایران اور ملایا کے دور دراز علاقوں تک پہونچ سکتی تھی۔ بمبئی اور کلکتہ میں چھوٹے چھوٹے ریڈیو اسٹیشن ۱۹۲۷ء میں قائم کئے گئے تھے لیکن ان کی آواز اس قدر نحیف اور کمزور تھی کہ چند میل کے احاطے کے سوا اُسے کسی اور جگہ کے لوگ مشکل سے سُن سکتے تھے یہ دونوں ریڈیو اسٹیشن ایک تجارتی کمپنی نے قائم کئے تھے اور سرمایہ کی کمی کی وجہ سے ان کے پروگرام کبھی اس قابل نہیں ہوئے کہ انہیں بمبئی اور کلکتہ جیسے شہروں کے شایان شان کہا جا سکتا۔ بعد میں گورنمنٹ نے بھی ان ریڈیو اسٹیشنوں کی مالی مدد کی لیکن ان کمپنیوں کا تجربہ کامیاب ثابت نہیں ہوا حالانکہ انگلستان میں بی۔ بی۔ سی ۱۹۲۳ء میں ایک تجارتی کمپنی کی حیثیت سے قائم ہو چکی تھی مگر ہندوستان میں یہ تلخ حقیقت سب کو ماننی پڑی کہ جب تک گورنمنٹ آف انڈیا ریڈیو کا محکمہ اپنے ہاتھ میں نہیں لیتی اور مرکزی حکومت کے خزانے سے گراں بہا امداد اس محکمہ کو نہیں ملتی اس وقت تک ہندوستان کی سرزمین پر ریڈیو کا پودا پروان نہیں چڑھ سکتا۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں انڈین اسٹیٹ براڈکاسٹنگ سروس کے نام سے گورنمنٹ آف انڈیا کے انڈسٹریز اور لیبر کے محکمے نے ریڈیو کی سرپرستی قبول کی۔ اور پانچ سال بعد اس ادارے کی ساخت و پرداخت کے لئے ۱۹۳۵ء میں بی۔ بی۔ سی کے ایما پر مسٹر لائنل فیلڈن کو اس کا کنٹرولر مقرر کیا گیا۔

اسی دوران میں گورنمنٹ آف انڈیا نے دہلی میں پچیس کلوواٹ کی طاقت کا ایک ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کی اسکیم منظور کی جو بمبئی اور کلکتہ کے موجودہ اسٹیشنوں سے کئی گنا طاقتور تھا۔ اگرچہ دہلی ریڈیو اسٹیشن میڈیم ویو پر پروگرام براڈکاسٹ کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ مگر امید یہ تھی کہ جب سردی کے موسم میں جب فضائی حالات معتدل اور سازگار رہیں گے تو اس وقت دہلی کی آواز ہندوستان اور آس پاس کے علاقوں میں بھی سُنی جا سکے گی، اور یہی ہوا بھی۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں جب دہلی ریڈیو نے آزمائشی پروگراموں کا سلسلہ شروع کیا تو سننے والوں نے اس کی آواز کشمیر سے لے کر راس کماری تک اور قلات سے لے کر برما تک سُنی۔ اور کچھ سننے والوں کے خط ملایا اور مشرقی افریقہ تک سے آئے۔

ریڈیو کے پروگرام اگرچہ ہندوستان کے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھی کیونکہ جن لوگوں کے پاس ریڈیو سیٹ تھے وہ لندن۔ برلن پیرس ہالینڈ اور ماسکو کے پروگرام اکثر سنا کرتے تھے۔ مگر عام لوگوں کے لئے یہ نئی بات تھی کہ دہلی ریڈیو سے ہندوستانی گانے، ہندوستانی میں خبریں اور تقریریں براڈکاسٹ ہوتی تھیں اور اسی انوکھی بات کی وجہ سے چند مہینے کے اندر دہلی ریڈیو کی شہرت تمام ملک میں پھیل گئی۔ سننے والوں کے ہر ہفتے سینکڑوں خط آنے لگے۔ اخباروں نے ریڈیو کے متعلق خبریں نہایت فراخدلی سے چھاپیں اور دُور دُور سے لوگ دہلی ریڈیو اسٹیشن پر صرف اس غرض سے آنے لگے کہ ان لوگوں کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیں جن کی آواز ہر روز وہ ریڈیو پر سنا کرتے ہیں۔

جنوری ۱۹۳۶ء میں شاہ جارج پنجم کی بیماری کی خبر نے تمام ہندوستان میں بے چینی سی پھیلا دی اور ہر روز بادشاہ کی صحت کا حال سننے کے لئے ہزاروں لوگ ریڈیو کے گرد جمع ہونے لگے۔ شاہ جارج پنجم کی موت، ان کے جنازے کا لندن میں جلوس۔ شاہ ایڈورڈ ہشتم کی تخت نشینی کا اعلان اور نئے بادشاہ کی پہلی تقریر۔ یہ ایسے تاریخی واقعات تھے کہ جنہوں نے عوام کی ریڈیو میں دلچسپی بہت زیادہ بڑھا دی۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں لارڈ ولنگڈن نے حکومت ہند کی باگ ڈور لارڈ لنلتھگو کو سونپی اور ہندوستان کی تاریخ میں پہلی دفعہ دہلی ریڈیو نے وائسرائے کو نئی دہلی کے ریلوے اسٹیشن سے رخصت کیا اور نئے وائسرائے کی آمد کا حال، وائسریگل لاج سے تمام ہندوستان میں سننے والوں کو گھر بیٹھے سنایا۔ آج کل ریڈیو پر اہم واقعات کا آنکھوں دیکھا حال سننا ایک معمولی سی بات ہے لیکن اپریل ۱۹۳۶ء میں اس بات کے لئے دہلی ریڈیو کو جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اُن کے خیال سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ کئی دن رات تک ریڈیو انجینیر وائسریگل لاج کی چھت پر بجلی اور ٹیلیفون کے تاروں

تانا بانا بنتے رہے، کئی بار یہ تار ٹوٹے اور کئی بار انجنیئروں نے انہیں نئے سرے سے جوڑا۔ آخر جب وائسرائے کا جلوس وار میموریل آرچ میں داخل ہوا تو سب سننے والوں نے اس کی آمد کا حال انگریزی اور اُردو میں سُن لیا انگریزی میں یہ حال انگلستان کے مشہور مصنف میجر ٹِس براؤن (Major F. Yeats Brown) بیان کر رہے تھے اور اُردو میں ... دہلوی تھی۔ نہ معلوم سننے والوں کے دلوں پر اس پروگرام کا کیا اثر ہوا مجھے تو اتنا یاد ہے کہ میرے پاؤں بجلی اور ٹیلیفون کے تاروں میں الجھے ہوئے تھے اور میں وائسرگل لاج کی چھت پر سے ٹھوکی اس جلوس کا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا تھا۔ اسی دوران لارڈ لنلتھگو نے اپنے عہدہ کا حلف اٹھانے کے بعد ایک تقریر بھی براڈکاسٹ کی اور دہلی ریڈیو کی زندگی میں یہ ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔

حال

جون ۱۹۳۶ء میں انڈین اسٹیٹ براڈکاسٹنگ سروس کا طویل نام آل انڈیا ریڈیو کی شکل میں تبدیل ہوا۔ اور اس کا اختصار اے آئی۔ آر کے نام سے آج تمام ہندوستان میں مشہور ہے دہلی ریڈیو کا تجربہ کامیاب ثابت ہوا اور اس کی دلیل یہ تھی کہ چند مہینے کے اندر ریڈیو لائسنسوں کی تعداد چند ہزار سے پچیس ہزار تک جا پہنچی اور اب گورنمنٹ نے ہندوستان کے دوسرے شہروں میں ریڈیو اسٹیشن کھولنے کی اسکیم پر غور کیا ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو کی زندگی میں شباب کا زمانہ کہنا چاہیئے کیونکہ اسی عرصہ میں پشاور لاہور، لکھنؤ۔ مدراس اور ترچنا پلی اور ڈھاکہ میں نئے اسٹیشن کھولے گئے۔ بمبئی اور کلکتے کے پرانے اسٹیشنوں کی طاقت بڑھائی گئی اور دہلی، مدراس، بمبئی اور کلکتے میں میڈیم ویو کے ساتھ شارٹ ویو کے اسٹیشن بھی قائم ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ریڈیو اسٹیشنوں کا جال تمام ہندوستان پر چھا جائے گا اور ہندوستان کے ہر حصے میں اپنا ریڈیو مرکز نظر آئے گا۔ ہندوستان جیسے بڑے ملک کے لئے اس قسم کے مرکز ضروری بھی تھے کیونکہ جس ملک میں چالیس کروڑ باشندے (تمام دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ) بستے ہوں، جس ملک کا رقبہ روس کو چھوڑ کر تمام براعظم یورپ کے برابر ہو اور جہاں جغرافیائی لحاظ سے باشندوں کی لسانی اور سماجی ضروریات ایک دوسرے سے بہت بڑی حد تک مختلف ہوں وہاں ایک مرکز یا صرف چند ریڈیو اسٹیشنوں سے کام نہیں چل سکتا۔[1]

شمالی ہندوستان کے گانے جنوبی ہندوستان والوں کیلئے عذاب جان ہیں اور جنوبی ہندوستان کی موسیقی مشرقی ہندوستان کے لئے ایک بے معنی شور و شغب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ دہلی ریڈیو کی اُردو میں خبریں مدراس کے لوگ نہیں سمجھ سکتے اور کلکتہ سے اگر تجارتی خبریں بنگالی میں سنائی جائیں تو بمبئی کے تاجر اور سوداگران سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ایسی صورت میں یہی ممکن تھا کہ ملک کے ہر حصے کے لئے ایک علیحدہ ریڈیو اسٹیشن بنایا جائے۔ اگرچہ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ دہلی میں ایک یا چند شارٹ ویو اسٹیشن قائم کر دیئے جاتے (کیونکہ میڈیم ویو کا پروگرام زیادہ دُور کے علاقے نہیں سن سکتے) اور ان شارٹ ویو اسٹیشنوں پر تمام ملک کے لئے گانے خبریں اور تقریریں صوبجاتی ضرورتوں کے لحاظ سے براڈکاسٹ ہوتیں۔ لیکن سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ شارٹ ویو کا پروگرام سننے کے لئے ریڈیو سیٹ بہت قیمتی چاہئیں جو ہندوستان جیسے غریب ملک کے لئے مشکل بات ہے۔ دوسرے اگر ایک ہی ریڈیو اسٹیشن سے تمام ہندوستان کے لئے پروگرام براڈکاسٹ کئے جائیں تو اس کی حیثیت مینار بابل کی سی بن جاتی ہے کہ جہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں مگر انہیں سمجھتا کوئی نہیں ایسی حالت میں بہترین حل یہی تھا کہ صوبجاتی ضرورتوں کے لحاظ سے جگہ جگہ ریڈیو اسٹیشن کھول دئے گئے۔ اگرچہ بہار، سندھ، سی پی۔ اور آسام کے صوبوں کو مرکزی حکومت سے شکایت ہے کہ ریڈیو اسٹیشن قائم کرتے وقت ان صوبوں کی ضرورتوں کو دہلی نے نظر انداز کیا۔

جنگ اور ریڈیو

ابھی آل انڈیا ریڈیو کی ترقی کا پروگرام پوری طرح سے سنورنے بھی نہ پایا تھا کہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا اور تین ستمبر کو برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر چیمبرلین نے برطانوی حکومت، نو آبادیوں اور ہندوستان کی طرف سے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان لندن ریڈیو کے ذریعے تمام دنیا کو سنا دیا۔ اس تاریخ سے آل انڈیا ریڈیو کی مختصر زندگی میں ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ جنگ کے اعلان نے تمام ملک میں ایک آگ سی لگا دی۔ اور جنگ کی خبروں کے اشتیاق نے لوگوں کو اخباروں اور ریڈیو کا محتاج بنا دیا۔ "جنگ کی تازہ خبر کیا ہے؟" یہ لفظ ہر شخص کی زبان پر تھے اور اس سوال کا جواب دن میں کئی بار صرف ریڈیو ہی دے سکتا تھا۔

اسی دوران میں جرمنی اٹلی اور جاپان نے ہندوستانی زبانوں میں خبریں سنانے کا بندوبست کیا اور بی بی سی لندن سے گیارہ مئی ۱۹۴۰ء سے ہر روز اُردو میں خبریں براڈکاسٹ ہونے لگیں۔ دوران جنگ میں ریڈیو کو جو مقبولیت ہندوستان میں حاصل ہوئی ہے اس میں غیر ملکی ریڈیو اسٹیشنوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ کیونکہ جنگ کے زمانے میں لوگ جس اشتیاق سے برلن۔ روم۔ ٹوکیو۔ سائیگون۔ سنگاپور (شونان) انقرہ ماسکو۔

---

[1] اس وقت تمام ہندوستان میں تیرہ ریڈیو اسٹیشن کام کر رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں روس کے ریڈیو اسٹیشنوں کی تعداد پانسو ہے۔ حالانکہ تمام روس کی آبادی ہندوستان سے آدھی ہے۔

اور لندن کی خبریں سنتے تھے وہ آل انڈیا ریڈیو کے حصّے میں بہت کم آتا تھا۔[1]

جنوری ۱۹۳۸ء سے آل انڈیا ریڈیو دہلی کی خبریں انگریزی اور اُردو میں دوسرے اسٹیشنوں سے بھی ریلے کی جاتی تھیں مگر جنگ کی وجہ سے اب ساری زبانوں میں خبروں کا مرکز دہلی کا دفتر بن گیا۔ چنانچہ انگریزی اور اُردو کے علاوہ بنگالی۔ مرہٹی۔ گجراتی۔ پشتو۔ تامل۔ ملیالم۔ اور تلگو میں بھی خبریں دہلی سے براڈکاسٹ ہونے لگیں۔ کچھ عرصے کے بعد جب جنگ کے شعلے شمالی افریقہ، مصر اور مشرق قریب تک آن پہونچے تو عربی اور فارسی زبانیں بھی اس فہرست میں شامل ہوگئیں۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کیا اور چند مہینے کے اندر ملایا اور برما پر جاپانی فوجوں کا قبضہ ہوگیا۔ تو برطانی حکومت کے فار ایسٹرن بیوریو نے آل انڈیا ریڈیو کے سائے میں پناہ لی۔ اور فیصلہ یہ ہوا کہ برٹش منسٹری آف انفرمیشن کی نگرانی میں دہلی سے جاپانی۔ ملایائی۔ برمی۔ چینی۔ سیامی۔ فرانسیسی اور اطالی زبانوں میں بھی خبریں براڈکاسٹ کی جائیں۔ گویا جنگ کے طوفان نے آل انڈیا ریڈیو کو ایک بین الاقوامی درجہ دیدیا اور اس کے باقاعدہ سننے والے صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ مشرق قریب اور مشرق بعید تک کے علاقوں میں پھیل گئے۔ ہندوستانی فوجیں لڑائی کے مشرقی اور مغربی مورچوں پر پہونچیں تو ہندوستانی سپاہیوں کے لئے دہلی سے خاص پروگرام براڈکاسٹ ہونے لگے۔ ادھر ضرورت کے لحاظ سے نئے اور طاقتور ٹرانسمٹر دہلی میں برابر جمع ہوتے رہے۔ اور شارٹ ویو پر دہلی کی آواز مغرب میں لندن اور مشرق میں ٹوکیو تک جا پہونچی۔ ان میں سے کچھ ٹرانسمٹر برطانوی گورنمنٹ نے اپنے محکمہ کے لئے بھیجے تھے اور باقی کے ٹرانسمٹر آل انڈیا ریڈیو کی ملکیت تھے ان میں سے دو کی طاقت ایک ایک سو کلو واٹ ہے کہ جنہیں ایشیا میں سب سے زیادہ طاقتور مانا جاتا ہے۔ غرض اس وقت خاص دہلی میں ایک میڈیم ویو اور نو شارٹ ویو ٹرانسمٹر کام کر رہے ہیں اور اس لحاظ سے دہلی کا شمار دُنیا کے بہت بڑے ریڈیو مرکزوں میں ہونا چاہیئے۔

یکم جنوری ۱۹۳۶ء کو شام کے پانچ بجے دہلی ریڈیو نے ایک نحیف اور کمزور آواز میں نوزائیدہ بچے کی طرح اپنی آمد کا ڈرتے ڈرتے اعلان کیا تھا۔ وہی بچہ آج دس سال بعد طاقت کے اعتبار سے ایک تندرست و توانا نوجوان بن چکا ہے جس کی آواز مشرق اور مغرب کی فضاؤں پر حاوی ہے اور ترقی کا بہت بڑا میدان اور اس کی وسعتیں اس کے سامنے کھُلی پڑی ہیں۔

یہاں تک میں نے آل انڈیا ریڈیو کی تاریخ مختصر لفظوں میں آپ کے سامنے پیش کی ہے۔ اس کے پروگراموں یا اس کی خدمات کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ ہندوستان میں ریڈیو کو اس تیزی سے ترقی ہوئی ہے کہ ہر نیا قدم اُٹھاتے وقت اُسے سوچنے کا بھی موقع نہیں ملا بلکہ ریڈیو ایک سیلاب کی طرح ہندوستان میں آیا اور اس کی رو میں تناور درخت، حسن و خاشاک، عمدہ اور خوبصورت مکانات اور تاریخی بستیاں سبھی بہہ گئیں۔ کسی کو اتنا موقع نہیں ملا کہ اس زبردست سیلاب کو بند باندھ کر روکا جاتا۔ اس کی طاقت سے نکلی ہوئی اس سیلاب کا زور توڑنے کے لئے نہریں کاٹی جاتیں تو بنجر اور بیابان علاقوں کو شاداب اور زرخیز بناتیں، اس کی لہروں پر خوبصورت کشتیاں چلتیں، تجارت کا سامان لانے کے لئے جہاز رانی ہوتی۔ اور خلقت حیرت سے یہ دیکھ کر خوش ہوتی کہ ہندوستان میں اس سیلاب نے کیسا خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا۔ مگر اس سیلاب کی ترکتاز اور شدّت کو رُکنے کا کہیں موقع ہی نہ ملا۔ خلقت اب بھی حیرت سے اس کا تماشہ دیکھتی ہے مگر ایسی حیرت سے جو زبردست طوفان اور سخت آندھی کے بعد لوگوں پر طاری ہوتی ہے۔ یا ایسا استعجاب اور سہم جو یادو باراں کی سخت گرج اور کڑک کے بعد لوگوں کے دلوں پر چھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ریڈیو نے ایکا ایکی آکر ایک ایسا زبردست نقارہ بجایا کہ اس کی آواز سے سننے والوں اور سُنانے والوں کے کان گنگ ہوگئے۔

چند اعتراض

آل انڈیا ریڈیو پچھلے دس سال سے اعتراضوں اور نکتہ چینیوں کا نشانہ بنا رہا ہے۔ یہ اعتراض کس حد تک صحیح ہیں اور کہاں تک ان میں ذاتیات کو دخل ہے، اس امر سے مجھے اس وقت بحث نہیں۔ لیکن اس بات سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ ملک میں لوگوں کو ریڈیو سے دلچسپی ہے اور سب ہی چاہتے ہیں کہ ریڈیو کی طاقت سے مفید کام لیا جائے۔

آل انڈیا ریڈیو پر سب سے زیادہ اعتراض اس کی زبان کے بارے میں کئے جاتے ہیں۔ شمالی ہندوستان کے ریڈیو اسٹیشنوں سے جو زبان ہندوستانی کے نام سے منسوب کی جاتی ہے اُسے باری باری سے اُردو اور ہندی دونوں کیمپوں نے اپنے اپنے معیار کی کسوٹی پر کسا ہے اور دونوں طرف سے اس پر اعتراض ہوتے ہیں۔ ریڈیو کی زبان دُنیا کے ہر ملک میں تنقید کا نشانہ بنی ہے۔ حد یہ ہے انگریزی زبان کہ جس کی قدیم روایات اور تاریخی اسناد کا سب کو اعتراف ہے جب شروع شروع میں ریڈیو کے لئے استعمال ہوئی تو اس پر بھی سب نے اعتراض کئے مگر بیس پچیس سال

[1] جنگ کے زمانہ میں ریڈیو کی مقبولیت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۳۳ء میں ریڈیو لائسنسوں کی تعداد ہندوستان میں ۹۲۷۸۲ تھی اور فروری ۱۹۴۲ء میں یہ تعداد ایک لاکھ نوّے ہزار تک جا پہونچی۔ برطانیہ میں نومبر ۱۹۴۲ء میں چھیانوے لاکھ لائسنس لئے جاچکے تھے۔

محنت کے بعد بی۔بی سی کی زبان کو اب بجائے خود سند کا درجہ مل چکا ہے اور بی بی سی کا انگریزی تلفظ معیاری مانا جاتا ہے۔ ہندوستانی زبان عمر کے لحاظ سے انگریزی کے مقابلہ بالکل بچہ ہے۔ اس کی روایات اور تاریخی اسناد ابھی پوری طرح سے قائم نہیں ہوئیں۔ نئے خیالات اور نئے حالات کے لئے ہمارے پاس لفظوں کا کافی ذخیرہ نہیں اس لیے ہماری زبان کا انگریزی، فرانسیسی، جرمن، عربی یا اسی قسم کی دوسری بلند پایہ اور قدیم زبانوں سے مقابلہ کرنا بے سود ہے۔ البتہ یہ ماننا پڑے گا کہ ریڈیو اور سینما نے ہماری زبان کو عام رواج دینے میں بہت مدد دی ہے اور اعتراض کرنے والوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ریڈیو کی زبان بولنے کی زبان ([illegible]) ہے۔ یہ زبان علمی اور ادبی نہیں۔ اس میں انہیں لفظوں اور ترکیبوں کی کھپت ہو سکتی ہے کہ جن کا چلن عام ہے۔ غیر مانوس اور ثقیل لفظوں کو ہوا کی لہروں پر چاہے کتنی بار دہرایا جائے عوام انہیں ہرگز قبول نہیں کریں گے اور علم زبان کا یہ پہلا اصول ہے کہ جس لفظ پر قبولیت عام کی مہر نہ لگے وہ زندہ نہیں رہ سکتا چنانچہ نئے خیالات اور نئے حالات کو ادا کرنے کے لئے ہم قدیم زبانوں کے مردہ لفظوں کو زندہ کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے اور نہ اس میدان میں ایران و عرب سے مانگی ہوئی غیر مانوس ترکیبیں ہمارے کام آ سکتی ہیں۔ سائنس کی ایجادیں اپنے نام اپنے ساتھ لائیں گی۔ جنگ کے نئے ہتھیار جن ملکوں نے ایجاد کئے ہیں ان کے نام بھی ہمیں ان ہی ملکوں سے مانگنے پڑیں گے۔ ہندوستان کی سڑکوں پر جب ٹینک چلیں گے تو مجبوراً ہمیں انہیں ٹینک ہی کہنا پڑیگا۔ اور جو شخص ایٹم بم کا ترجمہ کرنے کی کوشش کریگا اس کی محنت کا جوہر بیکار جائے گا۔ ریڈیو سیٹ کے لئے آلۂ نشر، ستر الصوت۔ لاؤڈ اسپیکر کے لئے آلۂ مکبر الصوت اور اناؤنسر کے لیے معلن کے لفظ اگرچہ ہم اپنے ہمسایہ ملکوں سے ادھار لے سکتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ جب ہمیں ایک نیا لفظ اپنی زبان میں شامل کرنا ہو تو ایسا لفظ کیوں نہ لیں کہ جسے زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں اور جس کا تلفظ ہمارے کانوں پر گراں نہ گزرے۔

ہمیں ریڈیو کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ اس کی بدولت ہماری زبان کے سرمایہ میں اس قدر لفظوں کا اضافہ ہو گیا اور اسی بہانہ سے ڈبکی کشتی، ہوا مار توپ، کٹ پتلی گورنمنٹ، دور لورب اور ناظر فدار جیسی ترکیبیں ہماری زبان میں شامل ہو گئیں۔ بی۔بی سی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے انگلستان والوں کے لئے ایک معیاری زبان قائم کی ہے۔ چنانچہ ویلز یا یارک شائر کے رہنے والے گھر میں اپنی اپنی بولی ([illegible]) بولتے ہیں۔ لیکن جب اپنے گھر سے باہر دوسرے علاقے کے رہنے والے سے بات چیت کرتے ہیں تو انکی زبان بی بی سی کی تقلید کرتی ہے۔ کاش ایسا وقت ہمارے ملک میں بھی آجائے کہ آل انڈیا ریڈیو کی زبان تقلید کے قابل معیار کا درجہ حاصل کر لے۔[1]

ریڈیو کے وقت کا زیادہ حصہ موسیقی کی مد میں صرف ہوتا ہے چنانچہ ۱۹۴۳ء کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ سال بھر میں دہلی ریڈیو نے چھ ہزار پانسو اڑتالیس گھنٹے کا پروگرام براڈکاسٹ کیا اور اس میں دو ہزار چھ سو پندرہ گھنٹے ہندوستانی موسیقی کے تھے۔ ہندوستانی گانا سننے والے بھی دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور کچے اور پکے گانوں کا جھگڑا کسی طرح بھی اردو اور ہندی کے قضیے سے کم نہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ عوام کا رجحان سینما کی بدولت پکے گانوں کی طرف کم ہے اور اسی لئے ہر ریڈیو اسٹیشن اس جنس کو زیادہ پیش کرتا ہے کہ جس کی پبلک میں مانگ زیادہ ہے۔

ایک اور اعتراض ریڈیو کے پروگراموں پر یہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کے سب اسٹیشن ایک ہی وقت میں ایک ہی قسم کا پروگرام براڈکاسٹ کرتے ہیں اور دہلی۔ لکھنؤ۔ لاہور اور پشاور کے پروگراموں میں مشکل سے کوئی فرق ملتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی کمزوری ہے اور پروگرام بنانے والوں کو اس کھائی سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس کی صورت یہی ہے کہ ہر اسٹیشن اپنی مقامی خصوصیات قائم کرنے اور پروگراموں کی ترتیب اس ڈھنگ پر قائم کی جائے کہ کم از کم شمالی ہندوستان کے سننے والے اگر چاہیں تو مختلف قسم کے پروگرام سن سکیں۔ اس بات کے لئے موسیقی سے ہٹ کر دوسری تفریحی اور اصلاحی مدوں کو وسعت دینی پڑے گی۔ اس سلسلہ میں بی۔بی۔سی اور امریکی ریڈیو اسٹیشنوں نے بہت سی بارآور کوششیں کی ہیں اور ہم بہت کچھ ان سے سیکھ سکتے ہیں۔ پروگرام میں تنوع پیدا کرنے کے لئے تقریروں۔ ڈراموں۔ دیہاتی پروگراموں اور تعلیمی پروگراموں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ ڈرامے کے میدان میں آل انڈیا ریڈیو نے بہت نمایاں ترقی کی ہے مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ دوسری مدیں ابھی ہم مغربی ملکوں کے مقابلے میں

[1] ۴ر فروری ۱۹۴۴ء کو گورنمنٹ آف انڈیا نے سلطان احمد کمیٹی کی رپورٹ آل انڈیا ریڈیو کی ہندوستانی زبان کے بارے میں شائع کی ہے اور ہندوستانی زبان کو معیاری درجہ حاصل کرانے کیلئے اس کمیٹی کی تجویزیں قابل قدر ہیں۔

پیش نہیں کر سکتے۔ ان میں ترقی کی گنجائش ہے اور یہ میدان ریڈیو کے لئے ابھی نیا ہے۔

ریڈیو کے پروگراموں میں یک رنگی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کے تمام اسٹیشن ایک مرکزی نظام کے ماتحت ہیں اور اسٹاف کو اس بیدردی سے ادلا بدلا جاتا ہے کہ کسی ایک اسٹیشن کا کوئی خاص مقامی رنگ قائم نہیں ہونے پاتا اور قسم قسم کے رنگ مل کر ایک عجیب قسم کی بدرنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ہر صوبے کے ریڈیو اسٹیشن کا نظام صوبجاتی گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہو اور اس پر کام کرنے والے اپنے صوبے کی مخصوص روایتوں کو قائم رکھنے کے ذمہ دار ٹھہرائے جائیں تو یقین ہے کہ ہر اسٹیشن مقامی رنگ قائم رکھ سکے گا۔ فی الحال تو اکثر صوبجاتی مرکزوں پر ایسے افسروں کا تعین ہے کہ انہیں اس صوبہ کی روایات سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اگر کلکتہ میں پنجاب کے رہنے والے اسٹیشن ڈائرکٹر ہیں تو بمبئی میں پشاور کے ایک بزرگ، اور دہلی میں بمبئی کی ایک خاتون۔ کچھ عرصہ ہوا کہ مدراس میں صوبہ سرحد کے ایک باشندے کو اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر کے طور پر تعینات کیا گیا تھا۔ حالانکہ انہیں وہاں کی زبان یا صوبجاتی ضرورتوں سے دُور کا واسطہ بھی نہیں ہو سکتا۔

اس مرکزیت کا اثر خبروں پر بھی پڑتا ہے اور مقامی خبریں اکثر نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔

مستقبل اگر صوبجاتی ریڈیو مرکزوں کا نظم و نسق صوبجاتی حکومتوں کے ہاتھ میں آگیا تو جن صوبوں کو اب تک مرکزی حکومت سے بے رُخی کی شکایت رہی ہے، یہ بھی جاتی رہے گی۔ ہندوستان جیسے بڑے ملک کے لئے ریڈیو کے محکمے کا مرکزی رہنا سخت غلطی ہے۔ کیونکہ چالیس کروڑ باشندوں کی ضرورتوں اور ہر صوبے کی لسانی اور سماجی گتھیوں کا ایک حل ناممکن ہے۔ ریڈیو اب اس منزل سے گزر چکا ہے کہ جب اسے صرف تفریح اور دلبستگی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ آئندہ ہماری قومی ترقی کے لئے ریڈیو ایک زبردست ہتھیار کے طور پر استعمال ہوگا۔ ہر صوبے کی گورنمنٹ اپنی ترقی کا علیحدہ اصلاحی پروگرام بنائیگی۔ اور اس پروگرام کی اشاعت کے لئے اُسے اپنے ریڈیو پر اور اس کی پالیسی پر پورا اختیار ہونا چاہئے۔ دوسرے صوبجاتی ریڈیو مرکز سننے والوں کے لئے بہترین پروگرام اسی صورت میں پیش کر سکتے ہیں کہ ان میں آپس میں مقابلہ ہو اور یہ مقابلہ موجودہ مرکزیت کے دور میں صرف تنخواہوں اور عہدوں کی ترقی کی دوڑ بن گیا ہے۔

صوبجاتی خود مختاری کے باوجود دہلی ریڈیو کی مرکزی حیثیت ایک حد تک قائم رہ سکتی ہے۔ اس وقت ہزاروں ہندوستانی مشرقی افریقہ۔ جنوبی افریقہ۔ برما اور ملایا کے علاقوں میں آباد ہیں۔ دہلی ریڈیو ان سمندر پار کے ہندوستانیوں کے لئے باقاعدہ پروگرام براڈکاسٹ کر سکتا ہے۔ یہ ہندوستانی بھائی غیر ملکوں میں رہنے کے باوجود ہندوستان سے رشتہ قائم رکھنا چاہتے ہیں اور اس رشتے کو قائم رکھنے کے لئے ریڈیو بہترین ذریعہ ہے۔

ہندوستان کے تمام ریڈیو مرکز آل انڈیا براڈکاسٹنگ فیڈریشن کی شکل میں جمع ہو کر آپس کے مسئلوں کو حل کر سکتے ہیں اور اس ادارے میں ہندوستانی ریاستیں بھی شامل ہو سکتی ہیں۔ ہندوستان جیسے غریب ملک کے لئے ریڈیو لائسنس کی فیس دس روپے سالانہ بیحد زیادہ ہے۔ فیڈریشن میں اس سوال کو بھی طے کیا جا سکتا ہے۔ سستے اور عمدہ ریڈیو سیٹوں کی ملک میں مانگ ہے اور فیڈریشن کے پروگرام میں ریڈیو کی صنعت کو ترقی دینا بھی شامل ہونا چاہیئے۔

بہرحال ہندوستان کے سیاسی دستور میں آئندہ تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ آل انڈیا ریڈیو کی موجودہ حیثیت پر ضرور اثر پڑے گا۔ اور ہمیں اُمید رکھنی چاہیئے کہ ہندوستان میں قومی حکومت قائم ہونے کے بعد اس زبردست طاقت کا صحیح طور پر استعمال کیا جائے گا پچھلے دس سال کے اندر ریڈیو ترقی کی بہت سی منزلیں طے کر چکا ہے، اب وقت آگیا ہے کہ ہم ماضی کا جائزہ لیں اور مستقبل کے لئے ایسا راستہ بنائیں کہ جو دیرپا اور مفید ہو۔ جنگ نے ریڈیو کی ہنگامی ترقی میں بہت مدد دی ہے مگر یہ ترقی دیرپا بنیادوں پر قائم نہیں ہوئی۔ اب ریڈیو کے سیلاب کا زور اُتر چکا ہے مگر اس سیلاب نے جن مبداؤں میں راستے بنائے ہیں ان پر ہم مستقل عمارتیں قائم کر سکتے ہیں۔ یکم جنوری ۱۹۳۶ء کی نحیف اور کمزور آواز آج ہاتھی کی چنگھاڑ بن چکی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس ہاتھی کے دانت صرف دکھانے کے ہیں یا انہیں کھانے کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے؟

---

[1] پاکستان میں براڈکاسٹنگ کے سوال پر میں نے ایک اور مضمون میں بحث کی ہے جو انگریزی اخبار "ڈان" کی اشاعت بابت ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔

پرتھوی ناتھ شرما۔

رات کی رانی

اور اب وہ پھر رات کی رانی کے جھنڈ کے پاس باڑ کی بیرونی حد پر اُوس بھیگی گھاس پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ اور مست خوشبو اس کے نتھنوں میں ٹھونس ٹھونس کر تر و تازگی بھر رہی تھی

سرد اور گھٹے گھٹے گھر میں اضطراب اُس کے سینے پر لوہے کے ہتھوڑے کی ضرب سی لگا رہا تھا اور اُس کی ماں چولھے کے پاس آگ سینکتے سینکتے اُونگھ رہی تھی۔ سفید راکھ میں چند سرخ انگارے چمک رہے تھے، اور باقی کبھی کے سو چکے تھے۔ پاس والے مکان میں پنڈت جی نے پرماتما کی تعریف میں گایا گیا لمبا چوڑا بھجن ختم کر دیا تھا اور کتے کی کرخت تنقید بھی سرد پڑ چکی تھی۔ سڑک پر سفید کپڑوں میں فقیروں کی زندہ لاشیں ایثار اور کا سبق دُہرا پھر نیند کے خول میں گھس گئی تھیں۔ شہر کا دل آہستہ آہستہ سرد پڑتا جا رہا تھا اور رات کی رانی کا دل مگن ہو کر کھل رہا تھا۔ اس کی مہک خاموشی کے ساتھ اندھیرے میں سوچنے والے انسانوں کو اُمید دلا رہی تھی ہر کالے بادل میں ایک سفید کمل بھی ہوتی ہے، اور ہر شہر کی سڑی بسی گلی میں رات کی رانی کا ایک جھنڈ ہے — یہ حقیقت اور منطق کا لازوال جگر

دُنیا رات کی رانی کی مہک سے بے نیاز اپنے سالوں پرانے لحافوں کو اوڑھے سو رہی تھی۔ شیتل کی ماں خود چولھے کے پاس بیٹھی بیٹھی اُونگھ رہی تھی۔ لیکن شیتل کو خود نیند نہیں آ رہی تھی۔ اور زور کی مانند رات کی رانی کی خوشبو اس کے نتھنوں سے آ کر ٹکرا رہی تھی۔ اور اس کی شعور کی سطح پر ننھے ننھے سفید دھبے زیادہ شدت کے ساتھ چمک رہے تھے اُن کی روشنی دھڑوں سے فروں تر ہوتی جا رہی تھی۔ سفید دھبے پھیلتے جا رہے تھے اور سیاہ دھبے تنگ پڑتے جا رہے تھے۔ یہ روشنی اور سائے کا کھیل نہیں تھا۔ کھڑ پُوکا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کی خوشی رات کی رانی کے موافق مہک رہی تھی اور وہ نتھنے پھیلا پھیلا کر مہک کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں اس لات کی تعفن بھری کوٹھری میں گھسنے کی دعوت دے رہا تھا۔

ماں کو چولھے کے پاس آگ سینکتے سینکتے اور شیتل کو لحاف کے اندر رات کی رانی کی خوشبو سونگھتے سونگھتے گھنٹہ بھر سے زیادہ ہو چلا تھا۔ اُس کی ماں نہ جانے گھنٹہ بھر پہلے بکواس کر کے خاموش کیوں ہو گئی تھی۔ یہ اُسے معلوم نہیں تھا۔ لیکن اس گھنٹہ بھر پہلے کی بکواس نے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا اس نے ارادہ تک کر لیا تھا کہ وہ ایک بڑی گرز کی مدد سے خدا اور انسان کے مابین کھڑی ہوئی دیوار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے توڑ ڈالے گا اور خود خدا سے سوال کرے گا کہ آخر اس کی ماں کا دماغ اتنا خراب کیوں ہے۔ وہ خدا کی بچی کیوں نہیں صحیح طریقے سے سوچتی ہو

دن بھر بڑبڑاتے رہنا۔ ریکارڈ ہے کہ سوئی چڑھنے کے بعد بولنے سے نہیں رُکتا۔ کوئی بات بھی ہو۔ آج پھر گلی میں باجہ بجا تھا۔ پی پی پی۔ پوں پوں ... اور اُس کی ماں کا دماغ یکلخت گرم ہو گیا تھا۔ اس عورت کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ اور پھر ریکارڈ شروع ہو گیا تھا۔

"آج پھر باجہ بج رہا ہے شیتل — قسمت والوں کے ہاں بجتا ہو باجہ؟"

"ہاں ماں۔ تاکہ بد قسمت لوگوں کے کان کے پردے پھٹ جائیں۔ اس باجے کو سنتے سنتے میرے کان پک چلے۔ کہیں میں بہرہ نہ ہو جاؤں۔ مرنے میں بھی باجہ اور خوشی میں بھی باجہ۔ سماج نے لوگوں کو بہرہ بنانے کا ٹھیکہ لے لیا ہو" شیتل نے لحاف سے مُنہ نکالتے ہوئے کہا۔

"کمبخت۔ شادی کے ساتھ موت کا کیا ذکر۔ جب دیکھو الجھن بھری بات کرتا۔ کبھی عقل بھی آئے گی تجھے۔ جب میں نرک لوک میں پیاسی ماری ماری پھروں گی تو مجھے پانی کون دیگا؟"

"میں ماں۔ اور میرے بعد۔ اور میرے بعد . . ."

"تیرے بعد — تیرے جیتے تو پانچ پانچ بچوں کے باپ ہو گئے اور تُو میرے کلیجے کو کھاتے جا رہا ہے۔ تجھے پرماتما نے کیسا بنایا ہے۔ ماں پر دیا نہیں آتی —"

اُف شیتل نے تھوڑی دیر سوچا۔ آخر اُس نے ماں پر ایسا کونسا ظلم کیا ہو۔ بس یہی کہ وہ اُسے سخت محنت اور مشقت کے بعد ریشمی ساری نہیں پہنا سکا۔ اس گھٹے گھٹے گھر کو چھوڑ کر نئے ہوا دار مکان میں نہیں لے جا سکا۔ اور وہ اپنی ماں کو روز دودھ نہیں پلا سکا اور . . . سونے کے زیور نہیں گھڑا سکا۔ اور . . . بس یہی ظلم ہو جو اُس نے اپنی ماں سے روا رکھا ہے۔ لیکن وہ کرے بھی کیا۔ اس نے اپنی ماں کے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا ہے اُس نے اپنے ساتھ بیشک ناانصافی کی ہے۔ اس لے دونوں کے ساتھ ناانصافی نہیں کی ہے۔ لہٰذا اُس نے اپنی ماں کا کلیجہ نہیں کھایا ہے۔ اس سطح کو ہرگز ہرگز خیالات کی تلواروں سے نہیں نوچا ہے جس سے فدا اوپر چڑھ کر اُس نے دودھ پیا ہو، اور زندگی کا پہلا سبق سیکھا ہو۔ "کیا کہتی ہو ماں، میں نے تمہارا کلیجہ نہیں کھایا۔ سچ سچ تم کو غلط فہمی ہو گئی ہو۔ میرا فرض ہے کہ جہاں تک ہو سکے تمہاری خدمت کرتا رہوں۔"

"خدمت۔ رام کرے میں اُٹھ جاؤں۔ یہ باجے والے کمبخت جان جان کر بجاتے ہیں میرا بس چلے تو اُنکے باجوں کو توڑ ڈالوں۔ پچیس سال سے اس گھڑی

کے لئے ترس رہی ہوں"

"اس گھڑی کے لئے جب باجہ بجے۔ یہ کون سی بات ہے۔ میں بھی ایک دن دو تین آدمیوں کو بلالاؤں گا اور کہوں گا خوب باجہ بجاؤ۔ میری ماں اپنے دروازے پہ باجہ بجتا ہوا سننا چاہتی ہے۔ اسکی طبیعت باغ باغ ہو جائیگی۔ زور سے بجاؤ یار اور زور سے ۔۔ ۔۔۔ آماں باجے والو تم کو میری ماں کی خوشی منظور نہیں ہے۔ ابے یارو ۔۔"

"چپ گدھے۔ اس طرح کام چلتا ہے۔ برات چڑھے، سمدھنیں آرتا گائیں۔ دُلہن دروازے کی طرف ہار لیکر بڑھے۔ ڈیوڑھی پر باجہ بجے۔ اڑوس پڑوس والے دیکھیں۔ گلی چلتے راہگیر رک جائیں۔ پھلجڑی چھوٹے۔ اور دعوت ہو۔ اور ۔ ۔" اور کا سلسلہ ختم ہوگیا گاڑی یکایک رک گئی۔ نچلے منہ بیٹھنے والے مسافر کو کھلے جنگل کی ہوا کھانے کا موقع ملا۔

"اور پھر بچے ہوں۔ اُن بچے کے بچے ہوں۔ اور اُن بچوں کے بھی بچے۔ پتروں کو پانی ملے، اور ساری دنیا میں شانتی کا راج ہو جائے۔ بھگوان تیری مایا اٹل ہے۔ تو ہی سب دکھوں کا نشٹ کرنے والا ہے۔ دیالو پرمیشور تیری مایا اپرمپار ہے۔ چلتا رہے سرشتی کا چکر ۔۔۔۔"

"بے شرم۔ کیوں اپنی زبان کو زیادہ کھول رہا ہے۔ انہیں پھسوں کی خاطر تو تیری اب تک شادی نہیں ہوئی۔ پہلے لوگ باگ لڑکی کے باپ والوں کے سامنے کاجل ڈال کر منہ ہاتھ دھو کر، نئے کپڑے پہن کر سلیقے سے بیٹھتے تھے، چپ چاپ۔ اور تو ہر دفعہ سیدھے سادے کپڑے پہن کر بیٹھ گیا۔ اور اول فول بکنے لگا اب سوچ کر و بیٹا۔ لڑکیاں کوئی مشین میں تو بنتی نہیں ہیں"

"ہاں سوچ تو کروں گا ماں۔ تو بتلا میں کب غلط طریقہ سے لڑکی کے باپ کے سامنے جا کر بیٹھا۔ میں نے ہر ایک کو ٹھیک آدمی سمجھ کر بات کی۔ میں ہر وقت یہی سمجھتا رہا کہ وہ میرے کپڑے اور اُجلے لباسوں کو دیکھنے نہیں آئے ہیں۔ بلکہ میری لیاقت اور سیرت کا مطالعہ کرنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ لیکن تھے تمام کے تمام بیوقوف، انہوں نے بیرونیات 'میرا مطلب' باہر والی باتوں کو دیکھا۔ اس میں میرا قصور — کیا کیا خوبصورت باتیں کرتے ہیں لوگ ۔ کیوں جی تمہارا گھر کا مکان ہے آپ نیک ٹائی اور سوٹ پہنتے ہیں۔ میری لڑکی کو سینما کا شوق ہے آپ کو ہے؟۔ میری نھی نے میٹرک پاس کیا ہے۔ وہ فر فر انگریزی بولتی ہے۔ میری لڑکی میز پر کھانا کھاتی ہے۔ میری لڑکی بچے خود نہیں کھلائے گی۔ میری لڑکی یہ ہے اور میری لڑکی وہ ہے۔ افلاطون ہے اور ارسطو ہے۔ سچے جناب، لیکن میری لڑکی ہرگز ایک صحیح قسم کی بیوی بننے کے قابل نہیں ہے۔ میری لڑکی کھانا پکانا نہیں جانتی۔ میری لڑکی ساس کی خدمت سے گریز کرے گی۔ میری لڑکی شوہر کو جانو بےجا کے لئے مجبور کرنا نہیں سیکھی ہے۔ میری لڑکی اتنی ہمت والی نہیں کہ برے دنوں کو صبر سے کاٹ سکے۔

اب تم ہی بتاؤ ماں جب ان باپوں میں کسی ایک کی لڑکی بھی۔ گھر کی بہو بننے کی اہل نہیں تھی تو میں شادی کر کے کرتا ہی کیا۔ وہ تو تمام مشروط مطلب یہ کہ شرط باندھ کر گرہست میں داخل ہونا چاہتی تھیں۔ گرہست میں کوئی شرط ہوتی ہے۔ کوئی نہیں سوائے اس کے کہ سکھ اور دکھ میں جیون کسی نہ کسی طرح ہمت کے ساتھ بیت جائے، اور بس ۔۔۔"

بے صبر ماں نے بیچ میں ہی ویاکھیان میں دخل در معقولات کی: "انوپ کمار کو بھول گیا بیٹا۔ اس نے کیا کہا تھا معلوم ہے بھلا"

"انوپ کمار تینیسواں آدمی تھا ماں۔ اس نے جو کچھ کہا تھا ٹھیک ہی کہا تھا۔ لیکن ۔ ۔ ۔"

"تو نے انکار کر دیا۔ اب وہ لڑکی بھی بیاہی گئی۔ تو نے انکار کی رٹ لگا دی۔ نہیں! نہیں!! نہیں!!! بس ہر ایک کو انکار کر دیا۔ انوپ کمار کی لڑکی سب طرح سے چوکس تھی۔ تو نے نہیں دیکھا اس کو۔ تو ہی بتلا۔ کیا کمی تھی اس میں۔ سوہنی سندر، روپ وتی شوشیل، بھولی اور سمجھدار۔ آج میرا گھر اس سے چمک جاتا۔ لچھمی کو لات مارنا اچھا نہیں۔ تو نے کتنی بار لکشمی کو لات ماری ہے۔ جبھی تو اس گھر میں دلدر کا پہرہ ہے۔ لڑکی، سونے کا ڈلا ۔ ۔"

"ہاں تھا تو سونے کا ڈلا لیکن تجوری چاہیئے تھی رکھنے کے لئے۔ میں نے شروع شروع میں سوچا بھی کہ چلو شادی کر لوں، ماں بہت دنوں سے آس لگائے بیٹھی ہے، اس کا تمام دکھ دور ہو جائیگا۔ گو میں نہیں سمجھتا کہ دکھ تم کو تھا یا مجھے۔ پھر بھی میں نے ایک بار سوچا کہ میں شادی کر لوں۔ لیکن معلوم کیوں پھر ٹھیک راستے پر پڑ گیا۔ شادی کر لینا تو آسان تھا لیکن شادی کے بعد اس ہرے بھرے پھولوں کی طرح شگفتہ جسم والی لڑکی کو کیا میں سکھ پہونچا سکتا تھا۔ ہرگز نہیں۔ اس کا کنول سا چہرہ مرجھا جاتا۔ گھر کا کام کاج کرتے کرتے وہ تھک کر چور ہو جاتی۔ اس کی مسکراہٹ مرجاتی اور گیت فنا ہو جاتے۔ یہ سب بات مجھے اچھی نہیں لگتی۔ میں کسی پھول کو مرجھاتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتا۔ اور اب اس لڑکی کا بیاہ ایک اچھی جگہ ہو گیا ہے تو میں بہت خوش ہوں۔ کم از کم وہاں اُسے اچھا کھانا نصیب ہوگا۔ اچھے کپڑے پہنتی ہوگی۔ اس کی باہوں میں سرخ خون جھلکتا ہوگا۔ چہرہ میں دمک ہوگی۔ فیروزی رنگ کی ساری پہن کر اس کا بدن کتنا کھلتا ہوگا۔

ایسا! ۔ ۔ ۔"

"چل ہٹ رے — بکواس کرنے کے سوائے اور کچھ سیکھا بھی ہے۔ تو خود ساری لا کر پہناتا تو کیا وہ اچھی نہیں۔ پرماتما نے دو ہاتھ دو پاؤں دئے ہیں۔ ہاتھوں سے کماتا اور پاؤں سے چل کر ساری خرید کر لاتا۔ چالیس پچاس روپلی پہ ہی صبر کئے بیٹھا ہے۔ دنیا میں لوٹ کھسوٹ مچ رہی ہے اور تو اپنی ایمانداری ہی پہ صبر کئے بیٹھا ہے۔ ساری عمر ایماندار بنا رہیو۔ نہ شادی نہ بیاہ۔ جگہ جگہ

جوتے کھلا مجھکو عورتیں مجھ سے ہر روز پوچھتی ہیں۔ شیلو کی کہیں سگائی ہوئی۔ اے لڑکا اتنا بڑا ہوگیا۔ کچھ تو خیال کر اس کا۔ ان نیولی کوٹھے والیوں کے پاس جانے لگا تو گھر کا ستیاناس کر ڈالے گا۔ مجھے تو فکر لگ گیا شیل، تیرے نہیں ہیں ہیں ہے میرا کلیجہ چاٹ لیا۔ اب میں کہاں جاؤں۔ ہائے ربے میں تو مرگئی رے۔ بھگوان مجھے اٹھا لے پرمیشر۔ اب میں کیا کروں" ماں نے چھاتی کوٹنی شروع کردی۔

"چھاتی نہ کوٹ ماں۔ آئندہ جو کوئی آئے گا اُس سے ہاں کہدونگا"

"تیرا کیا بھروسہ" ماں نے اپنے مگرمچھی آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا "اچھا۔ پرماتما کرے تیرے منہ سے ہاں نکلے۔"

اور پھر وہ خاموش ہوگئی اس کے ذہن سے ایک بھاری بوجھ ہٹ گیا تاپتے تاپتے وہ اونگھنے لگی لیکن شیل کا دماغ زہرآلود ہوتا گیا۔ آخر سماج کو کیا حق تھا کہ وہ اُس کی چالیس پچاس روپے کی نوکری کی طرف کھینچ کر لڑکیوں کے باپ کے روپ میں چلی ہی چلی آتے۔ اگر ماں پرانے خداؤں کو پوجتی ہے تو اُسے کیا ضرورت ہے۔ اگر اُس کی قسمت میں سہاگ کا راگ لکھا ہے تو اُس میں ماں چھوڑ ساری سماج دخل در معقولات نہیں کرسکتی۔ لوگ مانگ اپنی لڑکیوں کو غریب آدمیوں کے ساتھ شادی کے دھاگے میں باندھ کر بعد میں روتے رہتے ہیں کہ اُن کی لڑکی کو سکھ نہیں ملتا۔ انھوں نے فلاں آدمی سے اپنی لختِ جگر نور چشمی کی شادی کرکے سخت نالائقی کی ہے۔ رام کی بیٹی خاوند کے ساتھ موٹر میں سیر کرتی پھرتی ہے، اور شیام کی بیٹی چولھا پھونکتی ہے۔ ساس کو گالیاں دیتی ہے اور خاوند سے پٹتی ہے۔ رام کی لڑکی کی گود میں بچہ نہیں ہے۔ اور شیام کی لونڈیا چار چار دُبلے مرگلے بچوں کی ماں ہے..... اور اجتماعی طور پر سب مطمئن نظر نہیں آتے۔ یہ بہت دکھ کی بات ہے۔ ذرا سوچو اگر وہ کالج سے بی۔ اے پاس کرتے ہی تحصیلدار کی سانولی اور موٹی قسم کی لڑکی کا رشتہ اس شرط پر منظور کرلیتا کہ اُسے ایک رشوت سے بھرپور ملازمت کو قبول کرنا پڑے گا تو اس کی زندگی میں سکھ نصیب ہوتا۔ کبھی نہیں۔ تحصیلدار کی سانولی موٹی قسم کی لڑکی ہر وقت اپنے باپ کے احسان کا گیت گاتی رہتی۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے۔ ہاں بابا یہ تمہارے باپ کی ہی بدولت ہے۔ اَن داتا، مائی باپ، حضور بندہ پرور تمہارے سنگ مرمر ایسے ہاتھوں کی قسم آج میں تمہاری بدولت ہی زندہ ہوں۔ میری بُری دنوں کی ساتھی ــــ جی، اسی طرح ان داتا کی خوشامد کرتے کرتے اس کے دن پست ذہنیت کے شکار ہوکر نہایت ذلیل طریقہ سے گذر جاتے۔ سانولی موٹی سی لڑکی اس کے نکھرے خیالات کو سیاہی میں ڈبو ڈالتی اور بنک کے دُبلے پتلے کلرک کی دُبلی پتلی سینک سی لرزہ براندام لڑکی باپ کو اس کے پاس ہرگز نہیں آنے دیتی۔

"بینک کی نوکری اب سند ہے؟"

"جی نہیں۔ سُنا ہے آدمی کو نامرد بنا دیتی ہے۔ دن بھر خوب رگڑائی ہوتی ہے اور رات کو تھکن کے مارے سونے کے سوائے اور کچھ نہیں سوجھتا۔"

"بہرحال کچھ تو کریں گے آپ"

"ہاں خالی بیٹھے کبوتروں کی ٹولیاں تو لڑانی نہیں ہے کچھ نہ کچھ تو کروں گا ہی۔"

"اچھا نمستے"

"نمستے!"

سینک سی پتلی لڑکی بھی لاشعور میں ڈوب گئی۔ اور آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے کتنی ہی اور لڑکیاں سطح سے اُبھرنے لگیں۔ ہر ایک کا ڈھنگ جدا تھا۔ ہر بات جدا اور ہر رنگ جدا۔ اگر کوئی بھجن کیرتن کی شوقین تھی تو اُسے پرماتما کی جانو بھگتی میں وشواش تھا اگر کسی کو ہارمونیم آتا تھا تو اُسے گانے کی ایک لائن بھی یاد نہیں تھی۔ ایک صاحب بہ بانگِ دہل فرمانے لگے، کہ میری لڑکی نے دنیا کا سارا لٹریچر پڑھا ہے اس کا یقین ہے کہ دنیا میں دو طرح کے منش ہیں ایک تو وہ جو عیش کرتا ہے اور دوسرا وہ جو عیش کرنے والوں کو عیش و عشرت کا سامان مہیا کرنے کے لئے خود فاقہ کرتا ہے اور دوسروں کو آرام پہنچاتا ہے۔ ٹھیک اور اس کے بعد ایک صاحب چھاتا بغل میں دبائے ٹھیک دوپہر میں تشریف لائے بدن سے پسینوں کے ساتھ ساتھ باتیں بھی خارج ہونے لگیں۔

"میں نے پہلی لڑکی کی شادی میں پینتالیس تولے سونا دیا تھا"

"بہت خوب"

"اجی ذرا رنگ پکا ہے۔ لڑکی ویسے ہوشیار ہے، تندرست، صحت مند، اور..."

"اور اب آپ کا کتنے تولے سونا دینے کا ارادہ ہے؟"

"کیا بتاؤں تین سو روپے کا لونڈا تھا نوکر، پینتالیس تولے سونا نہیں دیتا تو ناک کٹ جاتی۔ اب تو میرا ارادہ بیس تولے سونا دینے کا ہے"

"جی غلط۔ پینتالیس کو چھ سے تقسیم کیجئے۔ پچاس اور تین سو بھی۔ اگر کوئی لونڈا اتفاق سے چھ سو روپے ماہوار کماتا ہوگا تو آپ کو نوے تولے سونا دینا پڑیگا۔"

"جی ہاں، مجھے تو معلوم ہوا تھا آپ کی تنخواہ ڈیڑھ سو روپے ماہوار ہے۔ میں تو...."

"غلط خبر دی ہے کسی نے آپ کو"

سماج کا حساب کتاب چلتا رہا۔ اس کی پچاس روپے کی نوکری کے لئے دہیز میں سونے کی اینٹ کے بجائے چاندی کی گھڑی تھی اور [illegible]

کے بجائے سکینڈ ہینڈ گراموفون۔ اس کے لئے نگینے کی انگوٹھی کے بجی گھاٹے تھے۔ بغیر شیشے کے جڑا ہوا پلنگ۔ معمولی سا سوٹ۔ نقلی ریشم کی قمیص۔ ملمع ہوئے سونے کے بٹن ــــ براتیوں کے لئے میز کرسی کا انتظام ندارد .. بھئی مجھے تو لڑکی کے ہاتھ رنگنے ہیں۔ جیسا لڑکا مل جائے ٹھیک ہے۔ اُف۔ تو وہ چھٹا ہوا مال تھا۔ جب آدمی ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک جاتا ہے۔ تو اُسے مجبوراً ناقص قسم کا مال خریدنا پڑتا ہے۔ جب سماج میں شادی کے قابل امیر لڑکوں کی تعداد میں کمی پڑ جاتی ہے تب جاکر غریب لڑکوں کی باری آتی ہے۔ جی ہاں! انسان اس ذلت کو برداشت کرنے کے لئے بھی پیدا ہوا ہے کہ وہ چھٹا ہوا مال بنے۔ در جنوں امیر گھرانوں میں ٹھوکر کھانے کے بعد لوگ چار و ناچار احسان توڑنے کے لئے اس کے پاس آئیں۔ سراسر گراوٹ ہے اور کیا ہے۔ نہیں! شیل نے نہیں کا لفظ سیکھ لیا۔ وہ کتنا ہی کمتر انسان صحیح لیکن وہ نہیں تو کہہ سکتا تھا۔ اس کا باپ معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ ستی مجسٹریٹ تھا۔ لیکن ساری دولت جوئے، شراب، عورت میں لٹ گیا تھا۔ تب ہی اس کے خون میں برتری کی جھلک ہے۔ وہ اس طرح گر کر شادی نہیں کریگا۔ اور وہ ایک عظیم باہمت نہیں کے سہارے اپنی کمتری کے احساس کو دباتا رہا۔ آخر ایک روز ایک عاجز انسان اس کے دل کے دروازے کھٹ کھٹاتے۔

"میں تمہارے دادا کو جانتا تھا۔ شریف آدمی تھے۔"

"شکریہ۔"

"میرا نام انوپ کمار ہے، میں آپ کی خدمت میں اس واسطے حاضر ہوا ہوں . . ."

"فرمائیے۔"

"میری ایک لڑکی ہے۔ سیدھی سادی غریب۔ اگر آپ اُسے منظور کریں تو تمہاری ماں سے آگے بات چلے۔"

"آپ کٹھ پتلیوں والے محلے میں رہتے ہیں میں نے آپ کا گھر دیکھا ہے۔ میں اکثر دفتر جاتے اس راستے سے گذرتا ہوں۔ گلی کی طرف چھجا سا ہے۔ اونچی ڈیوڑھی۔ باہر کی طرف کھلنے والی بیٹھک میں اکثر ایک لڑکی اور ایک تین سال کا بچہ بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ لڑکی مجھے نہایت نیک و معصوم معلوم ہوتی ہے۔ آپ کی کسی رشتہ دار کی لڑکی ہے کیا ـــ؟"

"نہیں تو میری ہی بچی ہے، شکنتلا۔"

"اوہ۔ اچھا آپ یہاں سے شوق فرماتے ہیں۔ میں اکیلا آدمی ہوں نوکر رکھنے کی ہمت نہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں گلی کے پنواڑی سے لے آتا ہوں ـــ"

"رہنے دو مسٹر شیل۔ تکلیف نہ کرو۔ تمہاری ماتاجی کہاں ہیں؟"

ماتاجی اوٹ میں بیٹھی سن رہی تھیں۔ محبت کے جوش کے مارے انوپ کمار کے سامنے آگئیں۔ اور نمستے کا جیتے رہو جواب دیکر جم کر فرش پر بیٹھ گئیں۔

"میں نے تمہاری لڑکی دیکھی ہے جی۔ دیوی سمان روپ، ہمارے بھاگ ...."

"اجی آپ شرمندہ کرتی ہیں۔"

انوپ کمار اور شیل کی ماں بات کرتے رہے۔ شیل کمرے سے اُٹھ کر تنگ صحن میں چہل قدمی کرتے کرتے اُن کی باتوں کو سنتا رہا۔ انوپ اور ماں کی باتیں بیٹھک میں بیٹھنے والی خوبصورت معصوم لڑکی سے مدغم ہوتی گئیں۔ جیوں جیوں انوپ اور ماں کی تعریف ایک مرکز کی طرف بڑھی تیوں تیوں شیل کے ذہنی اُفق پر لڑکی نکھر نکھر کر نمودار ہونے لگی۔ ایک صحیح قسم کی بیوی۔ نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں کا جاذب امتزاج نظر میں کھب جانیوالی شے، جسکی موجودگی سے جنت کی سرد ہواؤں اور کوثر و تسنیم کے فرحت بخش بہاؤ کا احساس ہو۔ ایک ایسا بت جو خدا ایک دفعہ بنا کر رک گیا ہو تاکہ تکمیل کو شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ اُف! وہ سُرخ دھاریوں والے مرمریں ہاتھ۔ ابہام ابتدائی منازل کو طے کرتے ہوئے ناک کے دونوں جانب کھلنے والے پھول ـــ ایک پھول، ایک احساس، ایک نغمہ، ایک بھینی خوشبو میں بسا ہوا خیال۔ اور یہ سب کچھ اُسے بلا کوشش کئے ہوئے مل رہا ہے۔ وہ اسی خوبصورت شے میں جذب ہو کر خود خوبصورت بن جائیگا۔ خوبصورت اور غیر مرئی اور آسمان کے دیوتا پھولوں کی بارش کرتے کرتے تھک جائیں گے۔ ماں کو زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ دیر لگانا فضول ہے۔ بے سود اور بے مطلب۔ بس پھولوں کے مانند نازک دلہن کو آہستہ سے پلنگ پر لاکر رکھ دینا چاہیئے۔ اور اس کے بعد ــ اس کے بعد ـــ اس کے بعد آسمان سے تارے توڑ کر بندوں کی طرح آویزاں کر دینے چاہئیں، سورج سے سنہری رنگ مانگ کر زلفوں کو رنگنا چاہیئے۔ ہاتھوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں پاؤں میں پازیب، کان میں کرن پھول اور چوٹی میں گندھے ہوئے گلاب، ناک کی نوک تک آیا ہوا سرخ گھونگٹ، گھنٹوں دلہن کو دیکھے جاؤ۔ بری نگاہ پھول کی نزاکت کو مار دیتی ہے۔ چھوا اور مرجھایا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ پھول چھوا ہی نہ جائے اس کی شگفتگی مر جائے گی، اس کی خوشبو فنا ہو جائے گی، اور یہ مرجھا جائے گا۔ ابہام کے وقت کے حملوں کو سہتے سہتے تنزل ہو جائیگا۔ بہار کے بعد ویرانی کا عالم، ہو کا سناٹا، رات کے پچھلے پہر کتوں کے بھونکنے کی آواز اور چوکیدار کی جاگنے والوں کو جاگنے کی ہدایت ـــ ایک شے صرف

ہم کو یوں عزیز ہے کہ تم اسے برباد کر ڈالیں۔ ہم پھول یوں پسند کرتے ہیں کہ انکو اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں مَل ڈالیں۔ انسان وقت کی چکی کے دو پاٹوں کے درمیان ایک بار نہیں مرتا۔ ہزار بار فنا ہوتا ہے۔ عورت لاکھوں بار مرتی ہے، مر کر جیتی ہے اور جی کر مرتی ہے۔ جتنی بے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے اتنی ہی کر وڑہا گندی زمانہ کی گردشیں اس کو پیس ڈالنے کا ارادہ کرتی رہتی ہیں۔ اور خدا نے پہلے ہی اپنے عظیم کانوں کو آسمان کے نیلے غلاف سے ڈھانپ لیا ہے تاکہ ظلم کے خلاف احتجاج کی آواز سنائی نہ دے سکے۔

نہیں وہ یہ ظلم برداشت نہیں کر سکتا۔ قدرت بیوقوف ہے۔ آخر وہ اپنے آدمیوں کو کیوں اتنی کڑی اذیت اٹھانے کی سزا دیتی ہے۔ دھرتی کا سینہ بار بار کھدتا ہے۔ دھرتی کے سینے کو بار بار کھودنے سے دھرتی کی اذیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ دھرتی کے سینہ پر ظالم انسان عتاب کے کلہاڑے چلاتا رہتا ہے۔ دھرتی کراہتی ہے۔ دھرتی روتی ہے، دھرتی بے بس ہے۔ دھرتی کے سینے پر خیالات کے محلات کھڑے ہیں۔ انسان کی عیش و عشرت کے محلات قائم ہیں۔ دھرتی کو آرام چاہیئے۔ نہیں!۔

"تو پھر معاملے سمجھو" انوپ نے کہا

"شکیل سے پوچھوں" ماں نے جواب دیا۔

"جی نہیں میں مجبور ہوں" شکیل نے جواب دیا۔ "شاید میں اس ذمہ داری کا اہل نہیں۔ میں اتنا بڑا بوجھ سنبھال نہ سکونگا آپ کو بہت تکلیف ہوئی"۔

"نہیں تو" انوپ بولا

اور معاملہ ختم ہو گیا۔ شکیل کی ماں عظیم بامسرت نہیں کے سامنے خاموش ہو گئی۔ سمندر کی لہریں اُوپر اُٹھیں اور پھر سطح سے جبت کر رہ گئیں۔ سردی کا راج ہو گیا۔ وقت حسب معمول تیزی سے گزرنے لگا۔ تئیسویں آدمی کے بعد چوبیسواں آدمی نہیں آیا۔ ماں نے پنے دکھ کو خاموشی کے ساتھ سہی رہی۔ اُس نے مشا میں کب تک چولہا پھونکونگی کب تک برتن مانجھوں گی۔ کب تک گھر کی جھاڑو دونگی، شدت کے ساتھ سوچ کر بھی شکیل سے نہ کہا۔ بلکہ وہ اندر ہی اندر جلکر راکھ ہو جانے کا سپنا دیکھتی رہی۔ نرک کے دیوتا اُسے جلتی ہوئی بھٹیوں میں کھینچ کر ڈالنے لگے۔ وہ بھیر مرتی بن کر جگہ جگہ پیاس کے مارے تڑپنے لگی۔ اس کا حلق جلنے لگا۔ اس کے دماغ کے باریک ریشے آپس میں ٹکرا ٹکرا کر گرم ہونے لگے۔ لیکن تب بھی وہ چپ رہی۔ تب بھی وہ کڑھتی رہتی۔ لیکن گلی میں کمبخت شادی کا باجہ بجا۔ پُرانی بات نئی ہو گئی۔ بات پر بات اُٹھی۔ شکیل کا دماغ گرم ہوتا گیا۔ خیال سوج گیا۔ اور بغاوت کا جذبہ برانگیختہ ہونے لگا۔ اگر اس کا بس چلے تو وہ خدا اور انسان کے درمیان کھڑی دیوار کو چکنا چور کر دے اور خدا سے جا کر کہے کہ ماں کا دکھ بیکار ہے، اگر وہ کسی خوبصورت شے کے ساتھ ظلم روا رکھنا نہیں چاہتا تو سماج ایسا کیوں چاہتی ہے۔ کیا دُنیا کا سارا انتظام ظلم کی بنیادوں پر رکھا گیا ہے۔ کیا ظلم محرک ہے۔ رحم ایک اضافی شے ہے اور بزدلی کا نتیجہ ــــ کاش اُس کے اِس رحم کے باوقار جذبہ کو کوئی سمجھے، کوئی جانے۔ اُسے اپنے قدم چھوانے کی تمنا نہیں۔ اُسے صرف اپنا کیس دُنیا کے سامنے رکھنا ہے۔ رحم اور انصاف کے دیوتاؤں کے سامنے پیش کرنا ہے۔ آگ کے پاس بیٹھی ہوئی کھتی ہوئی ماں کو بچانے کے لئے سارے نظام قدرت، نظام معیشت کے سامنے رکھنا ہے۔ خدا نام ہے محبت اور رحم کا۔ ایک محبت، ایک خدا۔

ہاں! دم گھٹنے لگا۔ میز پر جھکی لڑکی سخت قسم کا حیوان بنتی گئی۔ مصر کے اہرام وقت کے حملوں کے باوجود قائم ہے۔ لوہا کمزور ہے اور دھرتی سخت۔ ایک ننھے سے ایٹم کو لاکھوں کروڑوں ہارس پاور سے دو ٹکروں میں جدا کیا جاتا ہے جب جا کر انسان کو فنا کرنے کی شکتی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن دھرتی وقت وقت کے حملے سہتے سہتے بھی زندہ ہے۔ اس میں پودے پھوٹتے رہتے ہیں۔ مرتے ہیں اور پھوٹتے رہتے ہیں۔ مرتی کا چکر چلتا رہا ہے۔ سرشٹی کا چکر چلتا رہے گا۔ سیاہ بادلوں میں سعد بجلی اکثر چمکا کرتی ہے۔ اُمید اور قناعت کی بجلی۔ تخریب تعمیر کا دوسرا نام ہے۔ ایک پھول کو فنا کر دو دوسرا پھول پیدا ہوتا ہے اور آسمان کی مطمئن مسکراہٹ ازل سے ابد تک قائم رہتی ہے۔

دماغ کا جلنا بند ہو گیا۔ رات کی رانی کے پھولوں کی مہک نتھنوں اور جسم کے مساموں تک گھسنے لگی۔ ہزار خوبصورت لڑکیاں رات کی رانی کی خوشبو کے احساس کو فنا نہیں کر سکتیں۔ پھولوں کی مہک ظلم کو فرو کر سکتی ہے۔ ایک پچاس روپیہ ماہوار کے عزت والے انسان کو ظلم سے روک سکتی ہے۔ اُسے پھولوں کی مہک کے نزدیک چلا جانا چاہیئے۔

پھول مہکتے رہے، کتے بھونکتے رہے۔ اور سڑک کے سہارے مہک کو سونگھتے سونگھتے اُسے یقین ہو گیا کہ وہ اب کسی کو ایذا نہیں پہونچا سکتا۔

بہلاوے:۔ (بسلسلہ صفحہ ۲۲۴)

ہے۔ کہتا ہے جیت جنتا کی ہوگی عوام کی جیت ہوگی۔" روشن یہ سُنکر خوش ہوا کہ ایک اور جنگ ہوگی وہ اس جنگ میں شامل ہوگا۔ اور فتح بھی عوام کی ہوگی۔ کیا وہ عوام میں شامل ہے۔ لیکن وہ فتح جس میں بھوک اور بیکاری ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دی جائے گی۔ یقیناً ہر انسان کی فتح ہوگی۔ وہ دوبارہ گھر روپے بھیج سکیگا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اور کونٹر پر پیسے دیکر باہر کھلی فضا میں آگیا چاروں طرف قمقموں کی روشنی تھی، اور ہوا میں نمی تھی، قریب ہی ایک گورا ایک لڑکی کو سینہ سے لگائے، اُسے بار بار چوم رہا تھا۔

بلونت گارگی۔

گِدھ

افراد۔

فضلو ——— ایک مرد جس کے سرخ گل مچھے ہیں
رحیمہ ——— ایک مرد جس کا چہرہ پتلا دُبلا ہے
نوری ——— " " " "

منظر۔ بنگال کا ایک ویران گاؤں زمانہ۔ دسمبر سنہ ۴۳ء کی ایک شام

پردہ اُٹھتا ہے، اسٹیج پر تاریکی ہے

ایک بے چھپر کا جھونپڑا، بائیں طرف والی بیرال کی دیوار گر گئی ہے۔ مٹی کا فرش خستہ اور ناہموار ہے۔ جگہ جگہ پر گڑھے ہیں جیسے چھڑا چل کر سکڑ جاتے۔

فضلو زمین پر گھٹنا ٹیکے بیٹھا ہے۔ اُس کا دوسرا گھٹنا ٹیڑھی ترچھی شکل بنا رہا ہے۔ وہ ایک دُبلا پتلا آدمی ہے۔ کنپٹی کی رگیں پھولی ہوئی ہیں۔ آنکھیں بے دھیان اور اندر دھنسی ہیں۔ اس کے جسم پر قمیص نہیں۔ صرف ایک دھوتی ہے، وہی اسکی ہڈی پسلی ڈھانپ رہی ہے۔ لکڑی کے چھیلن سے وہ مٹی کے ایک برتن کو اندر سے کھرچ رہا ہے۔

رحیمہ، اس کی بیوی، آلتی پالتی مارے اس کے پاس بیٹھی ہے۔ اس کی چمڑی سیاہ ہے۔ لیکن چہرے کی کلونس پرانے روی کھنڈ گئی ہے۔ اس کے دونوں بازو ننگے، بھونڈے اور سکڑے ہوتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کون دقتوں کی بھوک ہے۔

ایک کونے میں کسی چیز کا ڈھیر لگا ہے۔

ایک گھڑا جس کا مُنہ ٹوٹا ہوا ہے، اوندھا پڑا ہے۔ آس پاس سوکھے اور کچلے ہوئے پتے بکھرے ہیں۔

فضلو۔ (مٹی کے برتن کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ اس کے کونے بچالوں میں ہاتھ مارتا ہے۔ اُسے ہلاتا ہے۔ پھر اوندھے مُنہ نیچے رکھ دیتا ہے) اس میں تو کچھ بھی نہیں، چاول کا ایک دانہ بھی نہیں۔

رحیمہ۔ پچھلے سال تو فصل خوب ہوئی تھی۔

فضلو۔ ہاں! بھرپور دن تھے۔ لیکن ویسے دن اب کہاں، شاید کبھی نہ آئیں۔

رحیمہ۔ آخ۔ ہوا میں کیسی بدبو ہے۔ چاروں طرف تعفن پھیل رہا ہے۔ قبروں سے مُردوں کی سڑاند آتی ہے۔ (کھانستی ہے) آخ۔

فضلو۔ (ادھر اُدھر دیکھتا ہے) سوکھے کھیتوں پر اندھیرا چھا گیا ہے۔ زمین بنجر اور اُجاڑ پڑی ہے۔ اب وہاں گدھوں کا راج ہے۔ وہ زور زور سے چلاتے ہیں اور بڑے بڑے پر پھڑپھڑاتے، بھدی چال میں پھدکتے پھرتے ہیں۔ بچی ہوئی ہڈیاں اندھیرے میں چمک رہی ہیں۔

رحیمہ۔ ہر چیز کیسی سنسان ہے، کیسی ڈراؤنی! (کھانستی ہے)

فضلو۔ گاؤں کے لوگ ایک ایک کر کے چلے گئے۔ اب تو وہی لوگ رہ گئے ہیں جنہوں نے اناج ڈھیر کر رکھا ہے۔ منافع باز۔ ہماری محنت کا پھل کھانے والے — رت چوس —

رحیمہ۔ چلو ہم بھی اُٹھ چلیں، یہاں سے چلے جائیں۔ آخر ہم ہی مصیبت کیوں اُٹھائیں؟

فضلو۔ وہ لوگ جو یہاں سے شہر میں چلے گئے، وہاں سے نکال دیے جائیں گے۔ پولیس سڑکوں پر راستہ روکے کھڑی ہے اور بھوکوں پر لاٹھیاں برساتی ہے۔ گھروں کے دروازے ان پر بند ہیں۔ اور وہ لوگ کلکتہ کے گلی کوچوں میں تڑپ تڑپ کر مر رہے ہیں۔ مَیں ویسی موت نہیں چاہتا۔ میں یہیں مروں گا، اپنے جھونپڑے میں، اپنے کھیت میں، جسے میں نے بویا۔ یہاں کی موت اُس موت سے آسان ہے۔ میں نے برسوں دھرتی کی سیوا کی ہے۔ تو کیا ایک چپہ زمین مجھے نہ ملے گی؟

رحیمہ۔ ایسا نہ کہو، تم ہمیشہ موت کی باتیں کرتے ہو۔ (ایک ہاتھ سے چھاتی کو دبا کر، دُکھ بھری آواز میں) موت — ہمیشہ موت —

فضلو۔ کیا تم بہت کمزور ہو گئی ہو؟

رحیمہ۔ ہاں!

فضلو۔ تم کراہ رہی ہو۔

رحیمہ۔ ہاں جب بچہ مرنے لگا، تو اس نے میری چھاتی میں کاٹ کھایا ایک قطرہ دودھ کے لئے وہ تڑپ تڑپ کر مرگیا لیکن دودھ کہاں۔ اب تو جسم میں بالکل طاقت نہیں، شاید یہ زخم کبھی اچھا نہ ہوگا

فضلو۔ آہ، تمہاری کیا حالت ہوگئی ـــ میں بھی کتنا کمزور ہوں!!

(باہر سے آواز آتی ہے)

آواز۔ اندر کون ہے؟ میں پوچھتا ہوں اندر کون ہے؟

(دو آدمی اندر داخل ہوتے ہیں۔ ایک کی ڈاڑھی پر خضاب لگا ہے بڑی بڑی سرخ مونچھوں پر تاؤ چڑھا ہے۔ چہرے پر رعونت اور سختی ہے۔ اس کا لباس یہ ہے ـــ تہ سد ململ کی قمیص اور سبز رنگ کا کھلا کوٹ۔ ہاتھ میں ایک نوکیلی چھڑی ہے، جس میں لوہے کی میخیں لگی ہیں۔

دوسرا آدمی پتلا دبلا اور رنگ چڑھا ہے۔ بات کرتے وقت اوپر کے دانت باہر نکل آتے ہیں۔ دونوں تیور کرتے اندر داخل ہوتے ہیں۔)

سرخ مونچھوں والا۔ اٹھو۔ (چھڑی گھماتے ہوئے) جلدی کرو۔ اٹھو۔

رحیمہ۔ (حیرانی سے) ابھی اٹھے سرکار!

سرخ مونچھوں والا۔ (فضلو کے جسم میں چھڑی کی نوک چبھوتے ہوئے) دیکھو تو۔ کیسے آرام سے بیٹھے ہیں مشٹنڈے۔

رحیمہ۔ (مسکین صورت بنا کر) سرکار اس طرح بے رحمی سے چھڑی نہ چبھوئیے۔ بے چارہ کمزور اور بیمار ہے آٹھ دن کا بھوکا ہے۔ چاول کا ایک تنکا بھی پیٹ میں نہیں گیا۔

ترش رو آدمی۔ بک بک بند کرو، کیا تم نہیں جانتے کہ زمیندار کا لڑکا پلیگ میں مرگیا ہے۔ اٹھو ـــ چلو میرے ساتھ ـــ جانور کہیں کے۔

فضلو۔ سرکار میں تو چل پھر نہیں سکتا۔ میرے گھٹنے کام نہیں کرتے۔

سرخ مونچھوں والا۔ سب بدمعاش اسی طرح باتیں بناتے ہیں۔ میں انہیں خوب سمجھتا ہوں۔ چلو، اٹھو، ہمارے زمیندار آج سوگ منا رہے ہیں، اُن کے بیٹے کی لاش قبرستان تک پہونچائی ہے اٹھو جا کر قبر کھود دو، سب گورکن بھاگ گئے ہیں، تھڑدے کہیں کے۔

رحیمہ۔ (منت سماجت کے ساتھ) سرکار انہیں چھوڑ دیجئے، میں ہاتھ جوڑتی ہوں، ہم آپ کے پاؤں کی دھول ہیں۔

ترش رو آدمی۔ (دانت نکالتے ہوئے) بھونکتی کیوں ہو، چپ رہ!

فضلو۔ سرکار ہمارے ہاتھ پاؤں میں طاقت کہاں۔ اب تو ہڈیوں کا ڈھانچ رہ گیا ہے۔

سرخ مونچھوں والا۔ بڑے منہ پھٹ ہو، کترنی کی طرح زبان چلتی ہے۔ (گرج کر) چلو اٹھ کر قبر کھود دو۔ (چھڑی سے ٹھوکا دیتا ہے) چلو۔

فضلو۔ میرے ہاتھوں میں پھاوڑا پکڑنے کی طاقت نہیں۔

ترش رو۔ (اوپر کا ہونٹ لٹکاتے ہوئے) میں تمہارے فریب خوب سمجھتا ہوں، لوگ لالچی اور حریص ہو۔ ابھی تمہارا پیٹ بھردو، ابھی پھر خالی ہو جاتا ہے۔

رحیمہ۔ (دکھ بھری آواز سے) میرا بچہ بھوک سے مرگیا اور اس کی ہڈیاں کتے گھسیٹ کر لے گئے۔ اب تو اس کا نام و نشان بھی نہیں رہا۔ کتے اس کا گوشت کھا گئے اور ہڈیوں کو چوس چوس کر ختم کر دیا۔ میں دکھیا ہوں۔ میرے خاوند کو رہنے دیجئے۔ یہ مر جائے گا۔ اسے رہنے دیجئے۔

سرخ م۔ والا۔ (دونوں میاں بیوی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر) تمہارا کنبہ کیا ہوا۔ گھر کے اور لوگ کہاں گئے؟

رحیمہ۔ کچھ مرگئے۔ رہے سہے شہر بھاگ گئے۔

سرخ م۔ والا۔ (غصے سے تمتما کر) تو وہ لوگ بھاگ گئے، ذلیل، کمینے، زمین پر رینگنے والے جانور، کہتے ہیں طاقت نہیں۔ طاقت نہ تھی تو شہر تک کیوں کر چلے گئے۔ بے شرم۔ بے شکرے۔

رحیمہ۔ میرے خاوند کو چھوڑ دیجئے، میں ہاتھ جوڑتی ہوں، پاؤں چھوتی ہوں۔

ترش رو۔ سبھی بھکاری اسی طرح مانگتے ہیں، اسی طرح ناک رگڑتے ہیں ـــ (دانت نکالتے ہوئے) حرامی اولاد۔

رحیمہ۔ سرکار آپ گاؤں کے کرتا دھرتا اور پنچ ہیں۔ آپ کی بات کوئی نہیں موڑیگا۔ بھلا آپ کا حکم کون ٹال سکتا ہے۔ آپ جسے کہیں وہ کرے گا۔ گاؤں میں اور بھی لوگ ہیں سرکار آج کے روز اُن سے کام لیں۔

سرخ م۔ والا۔ نہ جانے وہ گدھے کہاں بھگئے۔ عمر بھر آقا کی روٹیاں کھا کھا کے پڑے پڑے اینڈتے رہے۔ لیکن وقت پڑا تو سب بھاگ گئے۔ ایک بھی کھائی نہیں دیتا پاجی مردود۔ (نفرت سے زمین پر تھوکتا ہے) چلو، اٹھو۔

فضلو۔ میں نہیں اٹھ سکتا۔ (جھوٹ پنے سے) میں میں نہیں اٹھونگا ـــ

ترش رو۔ (فضلو کی جھکی ہوئی گردن پر ٹھوکر لگا کر) بکو نہیں۔

فضلو۔ (سخت لہجہ میں) ایک بار کہہ چکا، میں نہیں جاؤنگا۔

ترش رو۔ (فضلو کی جھکی ہوئی گردن پر ایک اور ٹھوکر لگاتا ہے) کام چور، ہیرمرے ـــ!

فضلو (گردن اٹھاتے ہوئے) مجھے پیٹنے والے تم کون؟ ـــ تم ـــ تمہاری اوقات کیا ہے؟ کمینے! آقا کی جوٹھن کھانے والے ـــ

رحیمہ۔ (ڈر سے) خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کہو۔ وہ گاؤں کا مالک ہے۔ اسکے خلاف کچھ نہ کہو۔ اس کا غصہ برا ہے۔

سُرخ مُم والا (ہونٹ چباتے ہوئے) جی چاہتا ہے اس پاجی کو مزا چکھاؤں۔ (چھڑی اُٹھا کر فضلو کو مارتا ہے۔ فضلو زمین پر گر پڑتا ہے۔) اب یہاں چوہے کی موت مر۔

(دونوں باہر چلے جاتے ہیں)

فضلو: (اپنی زخمی گردن اُٹھا کر) چلے گئے بدمعاش؟۔

رحیمہ: آہ! لاؤ میں تمہارا خون پونچھ دوں ــــ ادھر لاؤ۔

فضلو: (خون سے لتھڑا ہوا چہرہ اُٹھاتا ہے) خدا کا عذاب نازل ہو ان پر، اور ان کی توندوں پر انصاف کا ہل چلے۔ بدمعاش!

رحیمہ: پانی لاؤں؟ پیو گے؟۔

فضلو: ہاں تھوڑا سا لے آؤ۔

رحیمہ:۔ یہ لو!

فضلو:۔ (پانی کا ایک گھونٹ پی کر) میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں، ان کے گناہ اور ظلم بہت بڑھ گئے ہیں، ان کی زندگی اب اتنا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ یہ لوگ کھا کھا کر پھٹ جائیں گے۔

رحیمہ: (دھیرے دھیرے اس کی گردن سہلاتی ہے۔ زخم پر پٹی باندھتی ہے) اب شانت ہو جاؤ ــ وہ تو چلے گئے۔

فضلو: (غصّہ سے بھڑک کر) تم جانتی ہو وہ کہاں گئے؟ کہیں اور لوٹ کھسوٹ کرنے ــــ ہم نے زمین جوتی، گھنٹوں پانی میں کھڑے ہو کر چانول کے کھیتوں میں کام کیا۔ سورج کی گرمی سے ہمارا پنڈا جھلس گیا۔ اس کے باوجود ہمارے پاس اناج کا ایک دانہ بھی نہیں۔ ہم بھوکوں مر رہے ہیں۔ لیکن وہ ہیں کہ امن اور قانون کی رٹ لگا رہے ہیں۔ ہونہہ۔ قانون، میں کہتا ہوں قانون کیا ہے؟۔

رحیمہ: قانون کی طاقت سے ٹکّر نہ لو۔ قانون بہت ڈراؤنا ہے۔ وہ لوگ تمہیں پھر پیٹیں گے۔ بھوک تمہارے جسم کو چَر گئی اور تمہارا ذہن کھوکھلا ہو گیا۔ اس جھگڑے میں نہ پڑو ــــ مجھے قانون سے ڈر آتا ہے۔ اور اُن کی لاٹھیوں سے جیسے سروں پر پیتل کے سم چڑھے ہیں۔

فضلو: مجھے نہ ڈراؤ، میرا ڈر خوف جاتا رہا۔ اب میں ہر ایک سے ٹکّر لوں گا۔ اور ہر بات بے دھڑک کہوں گا۔

رحیمہ: اس سے فائدہ؟ میں کہتی ہوں اس سے فائدہ؟ وہ لوگ تمہیں پیٹیں گے تمہاری سوجی ہوئی پیٹھ، زخمی گردن اور پھٹے ہوئے ہونٹوں پر ٹھوکریں لگائیں گے۔ یہی اس کا حاصل ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔

فضلو: (غصّے سے) اس سے فائدہ ہے۔ اس سے فائدہ ہوگا۔ تمہاری نظر کیسی تنگ ہے۔ ٹوٹی پھوٹی کُلیا سے باہر نہیں جاتی۔ مجھے وہ دیس نہیں بھولا، جہاں مزدوروں کو پیٹ پیٹ کر ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ پھر وہ مزدور اُٹھے، بند توڑ دیئے خون کی ندیاں بہا دیں۔ ساری دھرتی اُن کے خون سے سرخ ہو گئی۔ اب اُن کے ہاتھوں میں درانتیاں ہیں، اور دیس کی لہلہاتی کھیتیاں اُن کا دھن۔

رحیمہ: بھوک سے تمہاری سوچ کو پر لگ گئے۔ کیسے عجیب خواب دیکھتے ہو؟ بھلا کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ امیروں کے ہوتے سوتے یہ کیسے ممکن ہے؟۔

فضلو: اب وہاں کوئی امیر نہیں، کوئی غریب نہیں، سب ایک ایسے ہیں۔

رحیمہ: ایسی باتیں نہ کہو، وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔

فضلو: مجھے مارنے دو۔ میں اُن سے ڈرتا نہیں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔

رحیمہ: میں سمجھی، یہ پٹی تمہیں کھادی پوش سمر یندر نے پڑھائی ہے۔ اس دن وہ ہمارے گاؤں میں آیا تھا۔ ہماری گلیوں میں سے گزرا اور انہیں اور بھی اُجاڑ کر گیا۔ لیکن آخر پولس نے پکڑ لیا اور اس کے جبڑوں پر ایسا تنا ہوا مکّا مارا کہ خون بہنے لگا۔

فضلو:۔ (انگلیاں بھینچ کر) دیکھتی ہو یہ تنا ہوا مکّا ہی ان لاکھوں کا انتقام لے گا، جو بھوک سے مر رہے ہیں۔

رحیمہ:۔ تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں تو ایک ہی بات جانتی ہوں۔ غریب بھوک سے مر رہے ہیں۔ لیکن امیر موج اُڑا رہے ہیں۔ اُن سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ اپنے کتّوں کا بچا کھچا ایک ٹکڑا روٹی غریبوں کو پھینک دیں۔ تم بھوکے ہو، نوری بھوکی ہے، میں بھوکی ہوں۔

فضلو: نوری کہاں ہے؟

رحیمہ: یہیں کسی کونے کھدرے میں سو رہی ہوگی۔

فضلو:۔ آہ میری بچّی! کیا وہ ابھی تک سو رہی ہے؟۔

رحیمہ: کہیں نہ کہیں دبکی ہوگی۔ بےچاری کے پاس تن ڈھانپنے کو کپڑا بھی نہیں۔ بے چھت کے جھونپڑے میں گزر بڑی مشکل ہے۔ رات کو اوس پڑتی ہے اور ٹھنڈی ہوا بے روک ٹوک آتی جاتی ہے۔

فضلو (پکارتا ہے) نوری! میری بچی! یہاں آؤ۔

(اندھیرے کونے میں کپڑے کے نیچے دبکا ہوا ایک گیدڑ چیختا چلاتا باہر بھاگ جاتا ہے)

فضلو: نوری کہاں ہے؟

رحیمہ: شام کو یہاں لیٹی تھی، اس وقت نہ جانے کہاں ہے؟

فضلو: نوری! ــ وہ یہاں تو نہیں۔

(باہر سے گیدڑ کی چیخ سنائی دیتی ہے)

رحیمہ: اُس کے جسم پر کپڑے کی صرف ایک لیر تھی۔

فضلو: کیا تم نے اُسے بُرا بھلا کہا تھا؟۔

رحیمہ: نہیں تو ــــ میں درد سے کراہ رہی تھی۔ وہ بار بار چانول مانگتی

تھی۔ میں نے صرف اتنا کہا شرم کرو۔ اٹھارویں میں آپڑی۔ دودھ پیتا بچہ نہیں ہاتھ پیر ہلاؤ اور زمیندار کی دُکاں سے مانگ تانگ کر لاؤ۔ وہ تڑ بڑائی۔ میرے جسم پر کپڑا نہیں، چھاتیاں ننگی ہیں۔ لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں ۔۔۔ میں خاموش رہی لیکن وہ بڑبڑاتی رہی۔ ابھی اندھیرا نہیں ہوا وہ مجھ پر پھبتیاں کسیں گے۔

فضلو، تو کیا وہ بھیک مانگنے چلی گئی؟ کیا وہ بھیک مانگے گی؟؟۔

رحیمہ: نہ جانے وہ کہاں چلی گئی؟

فضلو: بھلا وہ کس سے بھیک مانگے گی؟ ان گِدھوں سے جو ہماری آخری بوٹی بھی نوچ کر لے گئے۔ ہمیں زندگی سے محروم کر گئے۔ بھلا وہ کیا دیں گے۔ اور وہ کیسے مانگے گی؟

رحیمہ: معلوم نہیں وہ کہاں گئی ۔۔۔ اب کیا وقت ہوگا؟

فضلو۔ سامنے کا سایہ ہماری دیوار کی اوٹ میں چلا گیا ۔۔۔ کیا وہ ابھی نہیں آئی؟

رحیمہ: نہیں تو۔

فضلو: نہ جانے وہ کہاں ہے۔

(دروازے کے راستے نوری داخل ہوتی ہے۔ اس کی قمیص سامنے اور پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے۔ گالوں پر سوکھے آنسوؤں کے نشان ہیں۔ شلوار میلی کچیلی اور پھٹی ہوئی ہے۔ وہ کمر جھکائے چلتی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں چاول اور مٹھائی ہے۔ کھڑی کھڑی بے کسی دھیان سے دیکھتی ہے۔)

فضلو: آ، میری بچی۔

رحیمہ: بہت دیر میں آئی؟۔

نوری: (کمزور آواز میں) ہاں!

رحیمہ: اتنی دیر کہاں رہی؟

فضلو: یہاں آ، میری بچی، تو کہاں تھی؟

رحیمہ: اور اتنی رات گئے تک!

نوری: میں بھیک مانگنے گئی تھی۔ دُکاندار نے کہا کھڑی رہو ابھی دیتا ہوں۔ اور میں انتظار کرتی رہی، یہاں تک کہ مجھے غش آگیا۔ (سسکیاں لیکر) پھر دُکاندار مجھے اندھیرے میں گھسیٹ کر لے گیا۔ اور ....

فضلو۔ (پیچ و تاب کھا کر) آہ! گِدھ! میری ہڈیاں ٹھونگتا ہے!!۔

نوری۔ اس کا موٹا تازہ کتا بھونکتا رہا اور وہ مجھے گھسیٹ کر لے گیا۔

فضلو۔ (غصے میں) میں اس گِدھ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ اور اس کی آنکھیں نکال لونگا۔

نوری۔ پھر وہ ہنستا رہا۔ اور اس نے میرے گال بھینچ بھینچ کر شروع کر دئے۔

قمیص پھاڑ دی۔ اور میری چھاتیاں مسلنے لگا...

(ہاتھوں میں پکڑی ہوئی خوراک زمین پر گر پڑتی ہے۔)

فضلو۔ (لڑکھڑاتے ہوئے) میں اس کی چونچ میں سوراخ کر دوں گا ۔۔۔ میں اُسے زندہ نہ چھوڑوں گا ۔۔۔ میں اس سے انتقام لونگا۔

(باہر نکل جاتا ہے)

رحیمہ۔ کہاں گیا بھوک سے اس کا دماغ چکرا گیا ہے۔ (چاول اور مٹھائی کو بھوکی نظروں سے دیکھتی ہے) یہ مٹھی بھر دودھیا مٹھائی اور چاولوں کے سفید دانے، آہا! تو انہیں کیوں گرلائی۔ کہو۔ کیوں گرلائی؟؟۔

نوری۔ آہ! یہ مٹھی بھر مٹھائی اور چاولوں کے دانے ۔۔۔ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ۔۔۔ مجھے غش آرہا تھا۔ میرے گھٹنے جواب دے گئے ۔۔۔ اور میں نیچے گر پڑی۔ پھر ۔۔۔ پھر اس کا گرم گرم سانس میرے پیٹ سے چھونے لگا۔

(رحیمہ بے صبری سے مٹھائی کو منہ میں ڈالتی ہے)

(ہا ہو ہو ہو کی آواز ۔۔۔ اور بے شمار پر پھڑپھڑاتے ہیں)

نوری۔ (خوف سے) آہ! وہ ویرانے میں گیا ہے۔ جہاں گِدھ مُردوں کا گوشت کھاتے ہیں۔ باہر اندھیرا ہے۔ اور وہ ویرانے میں چلا گیا ۔۔۔ ماں ۔۔۔ ماں ۔۔۔!!

رحیمہ۔ (آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی ہے) اندھیرے میں ۔۔۔ اس وقت ۔۔۔

نوری۔ میں اُس کے پیچھے جاتی ہوں۔ وہاں ۔۔۔ قبرستان میں، جہاں مُردوں کے ڈھیر لگے ہیں اور گیدڑ لاشیں گھسیٹتے ہیں۔ وہ وہیں لڑکھڑا رہا ہے۔ میں اس کے پیچھے جاتی ہوں۔

(باہر جاتی ہے)

رحیمہ: تو کہاں چلی ۔۔۔ تو کہاں چلی؟ (اپنے منہ کی بچی کچی مٹھائی پھینک دیتی ہے، اور نفرت سے تھوکتی ہے) آخ! اس مٹھائی میں مردار کی بو ہے!!

(ماتھے پر ہاتھ مار کر رونے لگتی ہے)

پردہ گرتا ہے

دوسرا سین

پردہ اٹھتا ہے۔

اُجاڑ اور بنجر زمین ۔۔۔ جگہ جگہ قبریں بنی ہیں۔ دُور ایک دو جھاڑیاں پرچھائیں کی طرح کھڑی ہیں ۔۔۔ فضلو داخل ہوتا ہے۔ اسکے بازو پھیلے ہوئے ہیں۔ پیٹ ہڈیوں کے ساتھ لگا ہے۔ اور گردن جھکی ہوئی ہے۔ اس کے منہ سے خون نکل نکل کر گردن پر بہہ رہا ہے۔

فضلو:۔ اُڑ گئے؟ آہ! سارے گدھ اُڑ گئے۔ اُن کے پر ہوا میں پھڑپھڑا رہے ہیں — میں اُن کے پیچھے بھاگوں گا — آہ! ہوہوہو — میں اس گدھ کو کچل دوں گا — اس گدھ کو — لاشوں کا کیڑا —

(پروں کی پھڑپھڑاہٹ)

دفع ہو! — سڑی ہوئی لاشوں سے پیٹ بھرنے والے اُلّو دفع ہو!

(لڑکھڑا کر نیچے گر پڑتا ہے)

(نوری آتی ہے)

نوری:۔ بابا!

فضلو: ہاں — ایک گدھ! (زمین پر سے ایک پر اُٹھا کر) میں نے اُس کے پر نوچ لئے۔ ہاہاہا!!

نوری: بابا! رات کتنی بھیانک ہے اور سرد، گیدڑ چیخ رہے ہیں۔

فضلو: یہ لو۔ اس پر کو پکڑو، یہ پر میں نے نوچا ہے۔ گیدڑ سے نہ ڈرو۔ اُسے چیخنے دو، اس کا کام ہی یہی ہے۔ چیختا چیختا . . .

(اس کی آواز ایکا ایکی مدھم پڑ جاتی ہے اور وہ ہانپنے لگتا ہے)

نوری: بابا تمہاری آنکھیں سُرخ ہیں۔ تمہیں بخار ہے۔

فضلو: ہوا کرے، ہونے دو، وہ دیکھو سامنے کا تارا سُرخ ہو گیا ہے۔ اُس طرف دیکھو۔ سُرخ تارے کی طرف جہاں آسمان کا پورب اور پچھم ملتا ہے۔

نوری: بابا! ہمیں واپس چلنا چاہیئے۔

(اُسے سہارا دیکر اُٹھاتی ہے۔ وہ بہت جتن کر کے اُٹھتا ہے پہلے زمین پر ہاتھ رکھتا ہے۔ پھر گھٹنوں پر بوجھ ڈالتا ہے لیکن اپنا آپ سنبھال نہیں سکتا اور گر پڑتا ہے)

فضلو: رات کی تاریکی میرے ذہن میں انوکھے خواب بُن رہی ہے اور دیکھو سامنے ہماری ٹوٹی پھوٹی دیوار کے اوپر۔ ہلکا سبز تارا اب سُرخ جھلکیاں دے رہا ہے۔

(نوری اس کے ہاتھ سے گدھ کا پر لے لیتی ہے اور اپنے بازو سے اس کی گردن تھامتی ہے)

فضلو: میرے ہاتھ سے گدھ کی گردن نہ چھوٹی! آخر میں نے پکڑ ہی لی۔ گدھ کی گردن — !

نوری: بابا تمہارا چہرہ پیلا ہو گیا ہے۔ تم کانپ رہے ہو۔ لاؤ میں تمہیں سہارا دوں — ! (سسکیاں لیتی ہے)

فضلو: (مٹھی بھینچ کر) دیکھو، میں نے اس کی گردن مروڑ دی اور اس کے خون سے میری ہتھیلیاں تر ہو گئیں — گرم اور سرخ جیسے وہ تارا — وہ دُور گدھ کے خون میں ڈوبا ہوا تارا — (وہ کھانستا ہے اور زمین پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ اُس کا چہرہ

[illegible]

غزل

چاندنی رات سوگ وار نہیں
کیا کسی کا اب انتظار نہیں

اپنی ہی آرزو میں مرتا ہوں
اُئے خوشا، اُن کا انتظار نہیں

اب جنوں ہے مرا تمام ہوش
اب گریبان تار تار نہیں

پرسشِ غم کا شکریہ لیکن
اب کسی حال میں قرار نہیں

ہائے بے چارگی محبّت کی
ضبطِ گریہ پہ اختیار نہیں

دامنِ ناز کی دُہائی ہے
میرے دامن میں کوئی تار نہیں

دل کی بے کیفیوں کو کیا کیجے
فصلِ گُل ہے مگر بہار نہیں

عشق وہ نشہ ہی کہ جس میں رازؔ
کیف و مستی تو ہے خمار نہیں

رازؔ مرادآبادی

؎ حافظ نے لکھا ہے اس لئے صحیح ہے!

میرے اشعار اور انکی شانِ نزول

پریم پجاری

نوٹ:۔ پریم پجاری کے افسانوں کی طرح پریم پجاری کے اشعار بھی سچی کہانیاں ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ ایک ہی داستان کے مختلف اجزا ہیں۔ جنہیں تشریحی نوٹوں نے باہم مربوط کرکے افسانہ کو مسلسل بنادیا ہے یہ اشعار کیسے ہیں اس کے متعلق ہمیں کسی اظہار رائے کی ضرورت نہیں، پڑھنے والے خود ہی ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کر لیں گے۔ ہمیں صرف اس قدر کہنا ہے کہ نثر کے ٹکڑوں نے ان آب دار نگینوں اور نشتروں کو سان پر رکھ کر زہر میں بجھا دیا ہے۔ پریم پجاری نے اپنے پورے کلام کو اسی طرح مرتب کیا ہے جو بہت جلد کتابی صورت میں شائع ہوگا اور یہ "داستانِ رنگیں" ساقی میں بھی بالاقساط شائع ہوتی رہے گی۔ غالباً دنیا کی کسی زبان میں عاشقانہ شاعری کی ایسی کوئی مثال موجود نہیں کہ شاعر نے جو کچھ کہا ہو کسی نہ کسی آتی جذبہ یا واقعہ سے متاثر ہو کر حقیقت نگاری کی ہو۔ اس اعتبار سے "میرے اشعار اور اُن کی شانِ نزول" ادب میں ایک بالکل نئے باب کا اضافہ ہو۔

سننے والا کہے گا، اللہ ری خود ستائی! آپ کے اشعار گویا کسی آسمانی صحیفے کے آیات ہیں جن کی "شانِ نزول" بیان کرنا ضروری ہے۔ اپنے مُنہ سے اپنی تعریف! اور پھر اتنی۔ خدا کی پناہ!

میں اس کا جواب کیا دوں۔ کاش معترض کے پاس احساس کی آنکھیں ہوتیں۔

زندگی ایک کتاب ہے کچھ لکھی جاچکی۔ کچھ باقی ہے۔ جتنی لکھی جاچکی وہ ماضی ہے۔ جو باقی ہے وہ مستقبل ——— حال تو ایک آنی کیفیت ہے۔ اس کا ذکر کیا۔ دن اور راتیں اس کتاب کے اوراق ہیں کچھ روشن۔ کچھ تاریک۔ اور اچھے بُرے۔ چھوٹے بڑے دلچسپ غیر دلچسپ۔ اہم اور غیر اہم واقعات اس کے ابواب ہیں۔

انسان کی زندگی کے دو ہی سہارے ہیں۔ ایک آئندہ کامیابیوں کی اُمید، دوسرا گذشتہ کامرانیوں کی یاد۔ لیکن حالات نے جس نامراد کے مستقبل پر مایوسیوں کے سیاہ پردے ڈال دیے ہوں، اور اُمید کی ایک مضمحل سی کرن بھی اُسے کہیں نظر نہ آتی ہو، وہ، عارضی طور پر زندگی کی تلخیوں کو بھول جانے کے لئے اگر ماضی کے دامن میں پناہ نہ لے تو کیا کرے۔

دل جب بہت اُداس اور جی نراس ہوتا ہے تو میں ماضی کی اس کتاب کے ورق الٹنا شروع کر دیتا ہوں۔ اس میں کیا کیا کچھ آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ کہیں چاندنی راتیں۔ کہیں تاروں کی چھاؤں۔ کہیں شفق۔ کہیں دھنک۔ کہیں صحنِ چمن۔ کہیں دامنِ کوہسار۔ کہیں دوستوں کے جھمگھٹے۔ کہیں فقط ہم اور وہ اکیلے ہائے کیا کیا تصویریں ہیں اس مرقع میں۔ جہاں نظر پڑ گئی وہیں اٹک کر رہ گئی۔ حال اور مستقبل دونوں ماضی میں گم۔ گذرا ہوا زمانہ پھر لوٹ آیا۔ نامرادیاں کامرانیوں میں تبدیل ہوگئیں۔ جاگ رہے ہیں مگر خواب کا سا عالم ہے۔ دُنیا و مافیہا سے بے خبر برسوں کے بعد بچھڑے ہوئے پھر ایک بار مل گئے۔ اور کس آزادی و بیباکی کے

ساتھ کوئی درمیاں میں حائل نہیں۔ آنکھیں بھی آزاد۔ ہونٹ بھی آزاد۔ جسم بھی آزاد۔ رُوح بھی آزاد۔ مگر آہ! یہ خود فراموشی پائدار نہیں۔ ابھی سب کچھ تھا۔ ابھی کچھ نہیں۔ پھر دل میں خلش ہے۔ پھر کوئی کلیجہ مسل رہا ہے۔ پھر جی بھر آتا ہے۔ پھر آنکھیں چھلکنا چاہتی ہیں۔ اسی عالم میں خود بخود شعر موزوں ہونے لگتے ہیں ظاہر ہے کہ ان اشعار کے لئے دماغ نے مضامین پیدا نہیں کئے۔ ان میں کچھ گذرے ہوئے واقعات کا بیان ہے اور کچھ محسوس کی ہوئی کیفیات کا "شانِ نزول" کا مطلب صرف یہ بتانا ہے کہ کونسا شعر کس واقعے سے متاثر ہو کر کہا گیا ہے۔ تاکہ ان چھوٹی چھوٹی سچی کہانیوں کا سننے والا پورے طور پر لطف اندوز ہو سکے۔ خودستائی کو اس سے کیا علاقہ اور خود فروشی کو اس سے کیا سروکار۔ پڑھنے والا خود ہی اندازہ کرے گا کہ لکھنے والے کی غرض کیا ہے۔

میری زندگی کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ دو چیزیں ہیں۔ چند تصویریں اور چند سو خطوط۔ زندگی کی تلخیوں سے جب اور کہیں پناہ نہیں ملتی تو میں ان تصویروں اور ان خطوں کے دامن میں پناہ لیتا ہوں۔ یہ تصویریں اور یہ خط مجھے ایک دوسری دُنیا میں لے جاتے ہیں۔ آہ کیسی دُنیا!

پھولوں کی دنیا۔ نغموں کی دنیا تاروں کی دنیا۔ ٹھنڈی سہانی
اک روح پرور خوابوں کی دُنیا جس کی بہاریں ہیں جاودانی

کئی برس گذرے بہار کا موسم تھا۔ چاندنی رات اور خاموش تنہائی۔ دھیمی دھیمی ہوا کے جذبات انگیز جھونکے دیوانہ بنائے دیتے تھے۔ دل بہت بیقرار تھا۔ جی نے اپنا صندوقچہ کھولا۔ ایک تصویر نکالی۔ دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کسی نے حسرت و اندوہ کا ایک حسین پیکر تراشا ہو۔ پھر قیامت یہ کہ اس اُداسی نے جو مہجوری کا لازمی نتیجہ تھی، اس موہنی صورت کو اور بھی جاذب نظر بنا دیا تھا یہ حقیقت

وہاں اُس طرف کھنچا جاتا تھا۔ اُسی عالم میں یہ شعر موزوں ہوا۔
جاگ اُٹھیں نا شیر بجراں سے بہاریں حسن کی
اللہ اللہ، جلوۂ غمگین تری تصویر کا

میں نے اُسے سینے سے لگالیا۔ پھر خوب پیار کیا۔ دل میں ایک عجیب کیف و سرور کا عالم پیدا ہوگیا۔ سرخوشی بلکہ ایک بے خودی سی حواس پر چھاگئی۔ کچھ دیر کے بعد میں نے ایک خط نکالا۔ اُسے پڑھنا شروع کیا۔ میں اپنے گردوپیش سے بالکل بے خبر اُس فضا میں سانس لے رہا تھا جہاں اس وقت سے کئی برس پہلے اُس بھونوں کی ڈالی کو جھومتے دیکھا تھا۔ جب اس مقام پر پہونچا۔

"آج کل چاندنی راتوں میں اگر کوئی مجھے گھنٹوں چاند کی طرف ٹکٹکی لگاکر تکتے ہوئے دیکھے تو یقیناً دیوانی خیال کرنے لگے۔ میں لگاتار چاند کی طرف دیکھتی رہتی ہوں۔ کیسی اچھی ہوتی ہے یہ خنک چاندنی۔ آدھی رات کا سناٹا۔ چاند سے زیادہ سفید و شفاف چاندنی۔ پورا چاند نگاہوں کے سامنے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی نہایت لطیف اور کیف آور شے چاند کی کرنوں سے نکل کر مجھ میں سرایت کر رہی ہے۔ یہ خواب آور شے مجھے کچھ دیر کے لئے کسی اور عالم میں لے جاتی ہے اور نہ جانے کب تک اس بے خودی کی حالت میں پڑی رہتی ہوں۔ وہ لطیف شے کیا ہوتی ہے؟ صرف یہ احساس کہ یہ جرم نورانی۔ یہ خوش نما چاند۔ ہم دونوں کی نگاہوں کا مرکز ہے۔ ایک دُور افتادہ اور ناکام تمنا کے لئے یہ احساس کس قدر دل خوش کن ہے کہ جس چیز کو وہ دیکھے، اُسی شے کی طرف عین اُسی وقت، اُس کی محبوب ترین ہستی کی مسحور کن نگاہیں تک رہی ہوں۔ آہ۔ پریتم۔ نگاہوں کا یہ اتصال گو ہزاروں میل دور ہی سے ہو؟ لیکن تھوڑی دیر کے لئے تسکین دہ تصور میں کھو دیتا ہے۔"

تو میری نظریں بے اختیار چاند کی طرف اٹھ گئیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرے ستاروں کی طرح چاند کی کشتی میں بیٹھی میری حسرت بھری نگاہوں سے [illegible] دیکھ رہی ہے۔ آہ نشتر سے کیسے دل پر محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے خط کو تہ کر کے لفافہ میں بند کیا اور صندوقچے میں رکھ دیا۔ دل و دماغ میں ایک عجیب قسم کا ہیجان برپا تھا۔ دفعتہً یہ شعر زبان پر جاری ہو گیا۔

اب نقطے پہ مل جاتی ہیں مہجور نگاہیں
میرا چاند نہیں، اس کی نظر دیکھ رہا ہوں

پھر بہت دیر تک ٹکٹکی باندھے چاند کو دیکھتا رہا۔ اس مرتبہ ایسا معلوم ہوا جیسے چاند کی اوٹ سے کوئی مجھے جھانک رہا ہے۔ اس طرح کہ اب بہت حسین دراز پلکوں پہ آنسو کا ایک قطرہ صبح کے ستارے کی طرح جھلملا رہا ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر میرا کلیجہ ٹکڑے ہوا جاتا تھا۔ آخر یہ حال بھی منظوم ہو گیا۔

شب کو چاند کے پردے سے وہ یوں جھانک کے مژگاں پہ ترے انجم سحر دیکھ رہا ہوں

بہت دیر تک طبیعت پر ایک خاص کیفیت طاری رہی کبھی ایک شعر اور کبھی دوسرا شعر فضا میں گونجتا ہوا سنائی دیتا تھا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی چاند ڈھلک گیا۔ ستارے چلتے چلتے کہیں سے کہیں پہونچ گئے۔ ساری دنیا [illegible] راحت میں مصروف تھی۔ مگر ایک نامراد مہجور۔ رہ رہ کے دل کے [illegible] ٹوٹتے تھے خدا جانے موزوں طبع اُس وقت کیوں اپنے عروج پر تھی۔ کسی کوشش کے بغیر شعر موزوں ہو رہے تھے۔ جیسے قلم کی [illegible] تصویریں کھینچتا چلا جائے۔ چنانچہ اس منظر کی تصویر بھی کھنچ گئی۔

[illegible] میں سرشار جہاں [illegible] رات
اب تک میں ستاروں کا سفر دیکھ رہا ہوں

پھر چاند میں کسی سے نگاہیں مل گئیں۔ پھر کسی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہہ دیا۔ پھر ایک شعر موزوں ہوا۔

ہاں میرے لئے چاند پیامی ہے کسی کا
کرنوں میں کوئی تار نظر دیکھ رہا ہوں

پھر تصور کی دُنیا آباد ہو گئی۔ پھر دل قرب کی لذتوں میں ڈوب گیا۔ پھر وہ آثار سحر نمودار ہوئے۔ پھر وہ جدائی کا منظر آنکھوں میں پھر گیا۔ پھر دل دھک دھک کرنے لگا۔ آہ۔

آ [illegible] رخصت [illegible] کی تمہید [illegible]
سہما ہوا آثار سحر دیکھ رہا ہوں

لو صبح ہوتی۔ وہ خیالی محفل درہم برہم ہو گئی مگر ایک خاص اثر [illegible] پر چھوڑ گئی۔ بار بار دروازے کی طرف نگاہ اٹھ جاتی ہے جیسے کسی سے وعدہ ہو۔ جیسے کوئی آنے والا ہے۔ اب آیا۔ اور اب آیا کون آئے گا؟ کوئی نہیں۔ چاند [illegible] آسمان سے اتر کر زمین پر آیا ہے؟ یہ سب [illegible] شوق کی کارفرمائیاں ہیں۔

اللہ رے دیوانگی شوق کا عالم
وعدہ نہیں اور جانب در دیکھ رہا ہوں

آخر یہ طلسم بھی ٹوٹ گیا۔ [illegible] کر خشک ہو گئیں اور جلنے لگیں۔ چنگاریاں سی نکلنے لگیں [illegible] تصویر بھی کھنچ گئی۔

آنسو جو ہوئے خشک تو جلنے لگیں آنکھیں
گہوارۂ شبنم میں شرر دیکھ رہا ہوں

رات بھی تمام ہو گئی۔ غزل بھی تمام ہو گئی۔ [illegible] ہیں۔ اور اب جب کبھی میں انہیں پڑھتا ہوں تو یہ پھر مجھے [illegible] کی دُنیا میں کھینچ لے جاتے ہیں۔

مدتیں گذریں، طویل مدتیں، جب کی یہ باتیں ہیں۔ آرزو کا پھول کبھی کھلا تھا۔ نامرادی کی آندھیوں نے اسے توڑ کر بکھیر دیا۔ پتی پتی منتشر کر دی۔ مگر اس کی نکہتیں، اس کی رنگینیاں، اس کی لطافتیں آج بھی دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہیں۔ آہ زندگی کی وہ یادگار ساعتیں۔

حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ سلسلہ جنبانی کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ چکور کے لئے چاند کی تمنا جرم ٹھہری۔ برس گذر گئے ملنا کیسا ملنے کا تصور بھی محال ہو گیا۔ نامہ و پیام کی کوئی صورت نہ رہی۔ اسی زمانہ میں ایک نظم کہی تھی جس میں بے بسی کی تصویر کھینچی تھی۔ وہ نظم بھی کہیں گم ہو گئی۔ صرف پہلا بند یاد رہ گیا ہے۔

اُن کی نظر سے دُور
نغمائے سحر سے دُور
آہ کا گذر سے دُور
حلقۂ نامہ بر سے دُور
دُور نہ اثر سے دُور
کچھ مجھے خبر بھی ہے تجھ پہ کیسی گذرتی ہے

اکثر سوچتا ہوں کہ اُن کے دل میں بھی اس زمانے کیا کیا خیال آتے ہوں گے — "بے مروت اسے وہ۔ کبھی پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔ کون کسی کو یاد رکھتا ہے۔ اور کہیں دل لگا لیا ہو گا۔ کسی نہ کسی طرح جی بہلا لیا ہو گا — ایسی یاد جس میں دکھ ہی دکھ ہوں کیوں اور کب تک کوئی اپنے سینے سے لگائے رکھے" یہ سب کچھ سوچ کر اُن کے دل کو کتنا رنج ہوتا ہو گا۔ مری ٹوٹنے والی خاموشی طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا کر کے انہیں کتنا آزار دیتی ہو گی۔ آہ میری مجبوریاں "سعی طلب" کا تو ذکر ہی کیا۔ زبان سے اُن کا نام لینا بھی جرم تھا اُدھر اپنی بے بسی۔ اُدھر اُن کی بدگمانی اور آزردگی کا اندیشہ۔ دل خون ہوا جاتا تھا۔ اسی عالم میں ایک غزل کہی تھی۔ مطلع یہ تھا۔

کیا کروں میں جو دلِ سعی طلب یار نہ ہو
ڈر ہے کچھ اور گماں دل شکن ناز نہ ہو

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب تک امید کا سہارا اعتبار رہتا ہے تمنائیں پھولتی پھلتی ہیں۔ مگر جہاں یاس کی گھنگھور گھٹائیں چھائیں اور نامرادی کی آندھیاں چلنی شروع ہوئیں، آرزو کا چراغ جھلملا کر بجھ گیا اور "چاہت" کی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ یہیں سے ہوس اور محبت کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ جہاں مرادیں نہ ملیں، ہجوم کیا اور مایوسیوں نے گھیرا، ہوس کے پاؤں اکھڑے پھر نہ وہ جوش، نہ وہ ولولے، نہ وہ بے تابیاں۔ مگر ناکامی، محبت کی آگ کو اپنے دامن سے ہوا دیتی ہے۔ مایوسی اس پر پٹرول کا کام دیتی ہے اور وہ اور بھی زیادہ بھڑک اٹھتی ہے

اور اس وقت تک نہیں بجھتی جب تک محبت کرنے والا خود جل کر راکھ کا ڈھیر نہ ہو جائے۔ انہوں نے سمجھا کہ شاید میری محبت بھی دنیا کی رسمی اور نام نہاد محبت کی طرح آنی اور فانی تھی مایوسیوں نے اسے مٹا دیا ہو گا۔ مگر درحقیقت یہ اُن کی بھول تھی۔ وہ "ننھی کلی" جس دن پہلی بار مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی، اُس دن سے آج تک

ایک شعلہ ہے کہ سینے میں لپکتا ہے مدام

نامرادیوں سے دل کا خون ہوتے دو برس گذرے، چار برس گذرے، دس برس گذرے۔ مگر احساس کی شدت میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ اس معصوم محبت کا حال آگ کا سا ہے کہ وہ شمع کو جلاتی بھی ہے اور اُسے روشن بھی رکھتی ہے۔ اسی طرح محبت کا وہ شعلہ جو ہر وقت سینے میں تھرتھراتا رہتا ہے۔ دل کے لئے آگ بھی ہے اور زندگی بھی۔ یہ نہ ہو تو دل پر ایک بے حسی چھا جائے۔ بظاہر وہ زندہ رہے مگر درحقیقت مر جائے۔ موت میں اور بے حسی کی زندگی میں ایسا فرق ہی کیا ہے،

زندگی کیا، جب نہ ہو دل میں خلش
موت بھی اک بے حسی کا نام ہے

تو میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میری طویل خاموشی کی بنا پر جو درحقیقت میری مجبوری اور بے بسی کا نتیجہ تھی انہیں میری محبت سے بدگمانیاں ہونے لگیں۔ اُن کے شکوک دُور کرنے کے لئے ایک شعر کہا تھا۔ اور چونکہ اس شعر کو اُن تک پہونچانے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اس لئے عالمِ خیال میں انہیں مخاطب کر کے آپ ہی آپ اکثر اس کی تکرار کیا کرتا تھا۔ یہ ہے وہ شعر۔

کیا محبت کو مری، تم نے ہوس سمجھا ہے
کہ ہوئی یاس تو سرگرمی آغاز نہ ہو

زمانہ گذرتا گیا حالات بدلتے گئے مگر دنیائے محبت کی مجبوریاں اللہ اللہ

کہنے کو یوں دور رہے یہ آزادی کا، مختاری کا
چاہت کی دنیا میں جو مجبوری کل تھی آج بھی ہو

اپنے متعلق تو میں مطمئن تھا کہ میرے کسی انداز سے بھی کسی کو ہمارے راز کا پتا نہیں چل سکتا۔ دل کے زخموں کو میں نے تبسم کے پردوں میں چھپا لیا تھا۔ مگر ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں خود اُن کی آنکھیں ان کی غمازی نہ کر دیں۔ ان کنول کے پھولوں پر کسی نے شبنم پھیلتے دیکھ لی تو قیامت ہی ہو جائے گی۔ مجھ سے زیادہ انہیں افشائے راز کا خوف تھا لکھا تھا "اللہ! کوئی ایسی بات نہ کرنا کہ کوئی کچھ سمجھ جائے۔ دشمن گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ بہت ہی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ذرا سی بھنک بھی ان بیدردوں کے کان میں پڑ گئی تو میری موت یقینی ہے۔" جواب میں ان کی تسلی کیلئے یہ شعر لکھا تھا مگر یہ بھی ان تک نہ پہونچ سکا۔

میں تو مر جاؤں مگر رازِ محبت نہ کھلے
کاش تیری خلشِ دل ترا غماز نہ ہو

(باقی آئندہ)

قاضی نذرالاسلام کی پانچ نظمیں

بیداری

(حافظ شیرازی کی مشہور نظم "یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور" کا ایک عکس۔)

ہمدم! مسرت و شادمانی کے گم ہو جانے کا کیا غم؟
پھر وہ خوشیاں تمہارے قدم چومیں گی،
پھر ایک دن کچلی ہوئی تمنائیں اور لٹی ہوئی آرزوئیں گلستاں بن کر لہلہا اٹھیں گی،
ان ماتم گسار آنکھوں کے آنسو بند کر دو — کیونکہ
تمہارے صد چاک دلوں میں پھر آہنی ارادے ابھر آئیں گے:
ہمدم! جب پھر بہار چمن کی گود میں طاؤس ناچ سکتا ہے —
تو کیا تمہارے گرد آلود تاج میں نشاط و انبساط کی تابش جگمگا نہیں سکتی ہے؟

ہمدم! یہ ناامیدی کیسی؟
مستقبل کا پردہ الٹنے دو — اس کے پیچھے شیرینیاں پوشیدہ ہیں!
خودکشی اور تشدد کیوں؟
یہ تو ہمارے مذہب میں حرام ہے،
ڈرپوک نہ ہو — خدا کی یہ حسین دنیا وسیع ہے!
ہمدم! مسرت و شادمانی کے گم ہو جانے کا کیا غم —؟
پھر وہ خوشیاں تمہارے قدم چومیں گی۔

ہمدم! اگر تمہاری تمام خواہشیں پوری نہیں ہو سکتیں
تو چند دنوں کے اندر یہ تکلیفیں دور ہو جائیں گی —
دیکھو وہ دن بہت قریب ہے جب ظالم کی استبدادیت کا خاتمہ ہو جائیگا!
جو انسان مقدس مقامات کی زیارت کو جاتے ہیں
ان کا واپس آنا محال ہے — کیونکہ راستے کی دشواریاں جو پیش نظر ہیں؛
ہمدم! مسرت و شادمانی کے گم ہو جانے کا کیا غم!
پھر وہ خوشیاں تمہارے قدم چومیں گی،

اگر سیلاب کی تباہ کاریاں بھی ہماری راہوں میں حائل ہو جائیں،
ہمیں کیا ڈر — ہم تو دریائے حقیقت کے تیراک ہیں! عادی ہو جائیں گے
ان مشکلات پر،
ہماری راہوں میں بزدلوں کا ہجوم ہے تو کیا ہوا
اور بھی کتنی جانی پہچانی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ ہم آگے بڑھتے ہی جائیں گے
ہمدم! مسرت و شادمانی کے گم ہو جانے کا کیا غم!
پھر وہ خوشیاں تمہارے قدم چومیں گی!

خودکشی اور تشدد کیوں؟
یہ تو ہمارے مذہب میں حرام ہیں!
ڈرپوک نہ ہو — خدا کی یہ حسین دنیا بہت وسیع ہے!
خوف کیسا ہمدم!
اگر مفلسی و غریبی ہی ہماری تاریکیوں کا ریگستان ہیں
تو یہی سہی — یہیں ہم اپنی حقیقی اور آزاد روحوں کی پرستش کرینگے،
ہمدم! مسرت و شادمانی کے گم ہو جانے کا کیا غم؟
پھر وہ خوشیاں تمہارے قدم چومیں گی!

شاعر کا سلام

ہمدم! آج شب دروازے پہ کیا سن رہا ہوں —
آزادی کی چیخ پکار، زنجیر غلامی کے ٹوٹنے کی آوازیں!
قید خانہ کی آہنی سلاخوں کے اندر۔
آزادی کے شیریں قہقہے —!
کیا کمزور دلوں کے اندر خوف کی زنجیریں چور چور ہو رہی ہیں؟

دیکھو سیاہ مقدر میں خون کا چاند جھانک رہا ہے
جس کے سینے میں سنگریزے ہیں، ہاتھوں میں مہندی ہے
جس کی آنکھوں سے حقیقت کی شعاعیں نکل رہی ہیں
اور آزاد ملک کو پرجوش نغمہ سنا رہا ہے

اس [illegible] سے ہلمٹ ولسن کے کروڑوں دل تڑپ رہے ہیں۔

دیکھو ریت کے دیوانے موت کی گود میں
غلامی کی زنجیریں توڑتے ہوئے جا رہے ہیں
[illegible] آزادی [illegible] بجنا شروع ہو گیا
[illegible] بھی فتح کے راگ کا آغاز کیا
[illegible] اُس پاس سیلاب بڑھتا جا رہا ہے
[illegible] تحریب کی آنکھیں جھانک رہی ہیں۔

[illegible] یار [illegible] آزادی [illegible] بھیجا جا چکا ہے
[illegible] بندھنوں کو توڑ کر رکھ دیا۔
[illegible] تمام [illegible] شاعر مقید [illegible]
[illegible] اور [illegible] موت [illegible] مر سکتے!
[illegible] آج [illegible] راگ جیتہ جیتہ سے پھوٹ رہا ہے!

[illegible] شادیانے بجنا شروع ہو گئے ہیں۔
[illegible] کا سارا [illegible] غرق ہے!
[illegible]
بھار [illegible]
اور [illegible] نکلے [illegible] کا بار بین کر
بڑھنے لگے،

[illegible] وہ قید خانہ [illegible] وہاں تو
بجلی کی وفنا [illegible]
[illegible] زنجیریں [illegible] موت بھاگ گئی [illegible] کیا!!!
[illegible] آزادی کی، دائمی حریت کی،
[illegible] ابھی [illegible]!

ہم اُن کا گیت گاتے ہیں

[illegible] شمشیر حریت سے غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالی ہیں
[illegible] ہم [illegible] کروڑ انسان اُسی کا گیت گاتے ہیں!
[illegible] ہماری سرور رگوں میں دوڑنے لگی ہیں
[illegible] حقیقی [illegible] کا باجا بجا رہے ہیں،

جس کی مساوات [illegible] آہیں اور سسکیاں نہیں ہیں
ہم [illegible] شاعر کو خیرباد کہہ کر اُسی کی راہ پر چل رہے ہیں
جس نے شمشیر حریت سے غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالی ہیں
ہمدم! ہم چالیس کروڑ انسان اُسی کا گیت گاتے ہیں!

بتاؤ آزادی کا غلام کون ہے؟
ہم سب آزاد ہیں ہمدم — ہم سب آزادی کے پرستار ہیں!
ہم قید خانہ [illegible] سلاخوں سے غلامی کی زنجیریں توڑ کے نکلے ہیں
دیکھو ہمارے ضمیر کا خدا جاگ اُٹھا ہے
کون ہے جو اس خدا کے گلے میں [illegible] غلامی پہنا دے
جس نے شمشیر حریت سے غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالی ہیں
ہمدم! ہم چالیس کروڑ انسان اسی کا گیت گاتے ہیں

چلو ہمدم جاؤ قید خانہ کو سلام کرو،
[illegible] ہماری آنکھیں اشکبار نہیں ہوں گی
ہم بھی چالیس کروڑ انسان اس رعد و برق میں پیش قدمی کرتے چلے جائیں گے۔
جس نے آزادی کی خاطر اپنی جان کی بھینٹ چڑھا دی ہے
[illegible] ہندو مسلمان اُسی کی فتح کا گیت گاتے ہوئے جا رہے ہیں!
جس نے شمشیر حریت سے غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالی ہیں
ہمدم! ہم چالیس کروڑ انسان اسی کا گیت گاتے ہیں،

بیڑیاں

یہ بیڑیاں جو ہمارے پاؤں میں پہنا دی گئی ہیں
دھوکا ہیں فریب ہیں!!
یہ بیڑیاں ایسا [illegible] ہم تمہاری بیڑیوں کے لئے قیامت ثابت ہوں گے!
[illegible] تمہارے قید خانہ اور ستم رانیاں بھی ہم سے پناہ مانگتی ہیں!
ہم تمہارے بندھنوں سے نہیں ڈرتے۔ انہی بندھنوں میں فتح پوشیدہ ہے
احمق ہمارے پاؤں میں تم نے بیڑیاں پہنا دی ہیں لیکن یہ نہ سوچا کہ
یہ پاؤں مشین ہیں جو بیڑیوں کو چور چور کر دیں گے۔

تم ہمیں اپنی سلاخوں میں بند کر کے ہنس رہے ہو۔
اور خوش ہو رہے ہو کہ ڈنڈا دھمکا کر ہماری [illegible] چھین لو گے

یاد رکھو ہم شیطان سے بھی نہیں ڈرتے، اُسے بھی کچل ڈالیں گے
ہوشیار! ہوشیار!!
بزدلی بھاگ رہی ہے ــــ اور بلند عزائم جاگ رہے ہیں!

درحقیقت تم ہمیں دھمکا کر حکومت کر رہے ہو ــــ یہ فتح کی حکومت کیسی،
سُن لو اس خوف کی تمہ رنگ پکڑ کر اسے برباد کر دیں گے!
ہاں ہم آپس میں لڑ کر ہی دائمی سکون حاصل کریں گے۔
تم ہمیں پھانسی پر لٹکاؤ تو کیا ہوگا
اس وقت بھی موت کو فتح کا تبسم ہمارے لبوں پر لہرائیگا!

بیوقوف یہ غلامی کی آہ و زاریاں نہیں ہیں
یہ تو زنجیروں کے جھن جھنے ہیں جو ہر طرف بج رہے ہیں!
دیکھو پتھروں سے آزادی جھانک رہی ہے!
اور ہماری ذلت و خواری نے کبھی سر اُٹھایا ہے ــــ!
اب ہم اپنی ہڈیوں کے روغن ہی سے وطن کی مشعلیں روشن کریں گے!!

پاگل راہی

یہ کون پاگل راہی ہے ــــ؟
جس کے ہمراہ چالیس کروڑ ہمراہی موت کا راگ الاپتے ہوئے قیدی ماں کے صحن میں بڑھے آ رہے ہیں؟
بتاؤ تو سہی یہ کون ہے؟
جو غلام ملک کے سارے بند عضو کو توڑنے آ رہا ہے!
جو زنجیروں سے جکڑی ہوئی اس کی چھاتی میں آزادی کا صور پھونک رہا ہے ــــ!
دیکھو یہ مغرور اور نڈر انسان ــــ آج مردہ ماں کی لاش کو دفنانے آ رہے ہیں!
آج ان میں سے بھولوں نے سوگند کھا لی ہے کہ
اپنا در چھوڑ کے غیر کے در پہ نہیں جائیں گے ــــ کیونکہ
آزادی تو اپنے دلوں کے اندر جلوہ فگن ہے ــــ بھکاریوں کی التجاؤں میں کہاں؟
جو حق ہے اُسی کو بقا ہے ــــ اُسی کی دُنیا میں طبلِ آزادی بجتا ہے۔
اور باطل تو اپنے تجانیش سے فنا ہو جاتا ہے!

آؤ حسد و بغض سے کنارہ کش ہو جاؤ ــــ انسان بنو، انسان!
وقت کا کارواں منزلیں طے کرتا جا رہا ہے!
اے موت سے ڈرنے والے مرنے کی طرح مرو ــــ ایسی موت، کتنے مرتے ہیں ــــ؟
سنو صور اسرافیل طوفان اور بجلی کے ساتھ بجنا شروع ہو گیا ہے
تم بھی قیامت کا راگ چھیڑو ــــ احمق کیا بھیرویں کے راگ سے وطن آزاد ہو سکتا ہے؟
آؤ خوبصورتی اور حُسن کو پاؤں سے روندتے ہوئے بڑھے آؤ!
یہ آہ و فغاں کیسی ــــ؟ آج تو خواب سے بیداری کا دن ہے ــــ
آؤ علمِ حریت لیکر آزادی کا راگ گاتے ہوئے بڑھے چلیں!

مترجمہ محمد یونس احمر

تصانیف مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم

آدم خور: کیا آج کل بھی آدم خوری ہوتی ہے۔ اور آدمی کو آدمی مار کر کھا جاتا ہے؟ اس کا جواب کہاں اور کیسے، کس طرح آدمی آدمی کا شکار کرتا ہے۔ لاش کو کس شوق سے تندور میں بھونتے ہیں۔ کس طرح گوشت تقسیم کر کے کھاتے ہیں۔ کس طرح عورت اپنے پیارے بچے کو بھون کر کھا جاتی ہے اور اس کے گوشت کا حصہ اپنی بہنوں اور ملنے والیوں میں تقسیم کرتی ہے۔ عجیب و غریب خوفناک رسمیں اور رواج۔ جس طرح دولہا انسانی گوشت اور کلیجی کے ثابت ٹکڑے نگلتا ہے اور مُنہ سے ٹکڑا اگر نہیں کہ خود دولہا ذبح ہو کر باراتیوں کی خوراک بن جاتا ہے۔ ایک شوہر بیوی کو بطور سزا یا تفریحاً بھون کر کھا سکتا ہے۔ کس طرح انسان کا انسان کھانے سے پہلے خون چوس کر پی جاتا ہے۔ والدین اپنی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو مار کر خود اپنے ہاتھوں سے انگاروں پر اوندھا لٹا دیتے ہیں، اور جب چربی پگھل پگھل کر نکلتی ہے تو کمر در لڑکے کے بدن پر اس کی مالش کرتے ہیں۔ اور پھر بہن کا گوشت بھائی کو کھلاتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ:
ساقی بک ڈپو، دہلی

یشپال

طوفان کا دیو

جس مقام پر یہ پہونچ کر انسان کا دماغ اور سکت جواب دے جاتے دنیا سے بھگوان اور دیوتاؤں کا راج شروع ہوتا ہے۔ ہمالیہ پہاڑ کی اتنی اونچائی عظمت و تکریم اسی سے ہو کر وہاں آدمی کا گذر آسان نہیں۔ ہمالیہ دیوتاؤں کی بستی ہو۔ ہمالیہ کے دشوار گذار راستوں اور تنگ گھاٹیوں میں رہنے والے جو مصیبت زدہ بھی شامل دو دوسرے دیوتاؤں سے قائل دنیا میں ایک ... ہیں۔

گھنے بادلوں کی وجہ سے ٹھیک معلوم نہ ہوتا تھا کہ آفتاب غروب ہوچکا ہے یا نہیں۔ شام ہو گئی تھی شام ہوتی تھی۔ وگر کھیتوں سے لوٹ آئے تھے۔ سارو اٹل میں چیرتیل دیا کر سر ہاتھ ملا کر بھوسی اور دانہ روند کر کھا رہے تھے آنے جانے والے مسافر سرائے میں پتھر کے چولھوں میں آگ جلا چکے تھے۔

بے موسم کی دھیمی دھیمی جھڑی لگ گئی تھی۔ گھروں میں لوگ کمبل کے کپڑے پہنے آگ کے چاروں طرف بیٹھے چلمیں دم کھینچ کھینچ کر گڑگڑا رہے تھے۔ آگ پر رکھے ہوئے سماوار میں بر کا نمک کی کئی تہیں جمی ہوئی تھیں، اپنا سر ہلا رگ گنگنا رہے تھے۔ اس میں ابلتی ہوئی چائے کی تیز بھاپ کے بادل پھیل پھیل کر چاروں طرف بیٹھے ہوئے مصیبت زدہ انسانوں کو دلاسا دے رہے تھے۔

سوتی، تنگ، اور ہاتھ ہاتھ بھر چوڑی گلیوں میں لکڑی اور پتھر کی نیچی ڈھالو چھتوں سے لگاتار گرتی ہوئی پانی کی بوندیں اور گلیوں میں بہتے ہوئے برساتی پانی کے پتلے دھارے گھروں کے دروازے پر لگے کوڑا کرکٹ اور میلے کے ڈھیروں کو کم کر رہے تھے۔

"جھاماموچی" میں ایک دم سناٹا تھا۔ سلیٹ اور تختوں کی چھتوں پر بارش کی بوندوں کے گرنے کے علاوہ اور کوئی آواز کہیں سنائی نہیں دیتی تھی۔ چمنیوں کی غیر موجودگی میں چھتوں کے کناروں سے پھوٹتے ہوئے دھوئیں کے بادل کی ایک کشادہ تہہ چھا گئی تھی۔ اس سے گاؤں کی خموشی دوبالا ہو گئی تھی۔ پہاڑ کی ڈھلوان پر کھڑے ہوئے اپنی بانہیں پھیلا کر بارش سے گاؤں کو بچانے کی کوشش کرنے والے درخت بھی خیمے سے لگے۔ صرف ایک آواز سنائی دے رہی تھی گاؤں کے کنارے بنے ہوئے، کافی اونچے چبوترے پر رہنے سے سبز پڑ جانے والے تتھاگت بدھ کے مندر سے ہوا آ رہی تھی یعنی آسن باندھے بدھ کی مورت کے سامنے مندر کے پجاری ہاتھ جوڑے سنجیدہ دھیمی

آواز میں ایک خاص منتر کی گنجار کر رہا تھا۔

ٹھنڈی اور تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اس سے آندھی کی شکل اختیار کر لی۔ اور پھر طوفان آسمان سے پتھر برسنے لگے۔ ہوا کی تیزی کے باعث وہ اڑتے تیروں کی طرح چوٹ کر رہے تھے۔ گویا مہابھارت کے میدان کی کوروں اور پانڈوں کی بے شمار فوجیں "جھاماموچی" گاؤں پر تیروں کی بارش کر رہی ہوں۔ پتھروں کی مار سے جھاماموچی تڑپ اٹھا۔

فصل پک کر تیار ہوچکا تھا۔ بھیڑیں بیاہ چکی تھیں۔۔ فصل کا کیا ہوگا؟ ننھی ننھی بھیڑوں اور ان کے میمنوں کا کیا ہوگا؟ ..

گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ ہو ہو کرتی ہوئی تیز ہوا چھتوں میں گھسنے لگی۔ بچے رونے لگے، کتے بھونکنے لگے۔ ماؤں نے بچوں کو کمبلوں میں لپیٹ دیا وہ باہر نکل کر چھت کو ہوا میں اڑ جانے سے بچانے کے لئے اس پر پتھر رکھ دینا چاہتی تھیں، مگر بچے رو رو کر ان سے لپٹ جاتے تھے۔ ہو ہو شور تھا۔ یا! طوفان کا دیو!!

چیختے چلاتے لوگ گلیوں میں نکل پڑے۔ "بیگیو! بینگپو!" چلاتے ہوئے وہ لوگ تتھاگت کے مندر کی طرف دوڑے۔ سب لوگوں نے چلا چلا کر مندر کے پجاری کو طوفان کے دیو کا سامنا کرنے کیلئے پکارا۔

مندر کے پجاریوں کا کام طوفان اور دوسرے خوفناک دیوؤں سے گاؤں کی حفاظت کرنا ہے۔ یہی ان کی غایت ہو۔ گھنٹوں طوفان کے دیو سے لڑ کر یہ لوگ گاؤں کی حفاظت کرتے ہیں۔ تین سال قبل، جب پوس میں برف کا طوفان آیا تھا یہی بینگپو تلوار اور نیزہ لیکر رات بھر طوفان سے لڑتا رہا، مگر یہ نہ پا سکا۔ آخر جب نیزے سے بھی تیز برف کے ٹکڑوں سے اسکا چہرہ لہولہان ہوگیا اور اس کے کمل کے کپڑے تر ہو کر ٹپکنے لگے، وہ بیہوش ہو کر گر پڑا مگر دیو کا زور کم نہ ہوا۔ اس روز انسان کی طاقت طوفان کے دیو کو زیر نہ کر سکی۔ بینگپو ہار مان کر ٹیلے سے نیچے اتر آیا۔ سب فصل خاک میں مل گئی۔ سینکڑوں بھیڑیں اور میسوں چمر گائے مر گئیں، اور مکانوں کی چھتیں اڑ گئیں۔ سنتوا ہوتی مندر میں نہیں گیا۔ کسی نے پجاری کو سیدھا نہیں دیا۔ گاؤں والے پجاری کو غصہ اور حقارت بھری ترچھی نظروں سے دیکھ کر منہ پھیر لیتے۔

جب پجاری طوفان کے دیو سے لڑ کر گاؤں کی حفاظت نہیں کر سکتا تو

ملہ بیل کے باندھنے کے چھپر

اسے کھلا کھلا کر موٹا کرنے سے فائدہ؟ مہینوں میں گاؤں والوں کا غصہ اُترا۔

آج پھر بِنگپو کے امتحان کا دن تھا۔ ڈر کے مارے اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں لمبی تلوار اور دوسرے میں نیزہ لیکر طوفان سے لڑنے کے لئے وہ ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ دوسری بار دیوتا سے ہار کر لوٹنے کا مطلب ہوگا دیوتا بِنگپو سے خفا ہیں جس کی وجہ سے گاؤں کو دیوتا نے بددعا دیدی ہے۔ یہ اس کیلئے موت کے منہ میں جانا ہوگا۔

بھیانک آواز میں زور سے "ہل ہل" چلاتا اور نیزہ گھماتا وہ چوٹی کی طرف دوڑ پڑا۔ جھاماوچی کے لوگ خوف سے کانپتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ کر بِنگپو اور طوفان کے دیو کی جنگ کے نتیجہ کا انتظار کرنے لگے۔

طوفان کی ڈراؤنی "ہو ہو" کے بیچ کبھی کبھی بِنگپو کی پتلی آواز بھی سنائی پڑجاتی تھی۔ وہ للکار للکار کر طوفان پر نیزے اور تلوار سے وار کر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں پتھر گرنے کی آواز اچانک بند ہوگئی۔ صرف ہوا کا زور باقی رہ گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی ختم ہوگیا۔ دروازوں اور چھتوں کی درزوں سے چاند کی سفید کرنیں اندر آنے لگیں۔ طوفان سے نجات پاکر سب لوگ مکانوں سے باہر نکل آئے۔

چاروں طرف دُھنی ہوئی روئی سی صاف شفاف برف کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ سفید چاندنی میں آنکھیں چُندھیا رہی تھیں۔ رہے سہے بادل آسمان میں اُڑے چلے جارہے تھے۔ وہ بھی صاف شفاف روئی کے ڈھیر کی طرح معلوم ہوتے تھے۔

گاؤں والے مندر کے صحن میں جمع ہونے لگے۔ انہوں نے دیکھا بِنگپو تلوار کندھے پر رکھے اور نیزے کی لکڑی کو پتھروں پر ٹیکتا ہوا ٹیلے سے اُتر رہا ہے۔ اس کے بھرے چہرے، چوڑی پیشانی اور چپٹی ناک پر پسینہ کی لکیریں چاندنی میں چمک رہی تھیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں فتح اور خوداعتمادی چمک رہی تھی۔ صحن میں جمع ہونے والے عوام نے جھُک جھُک کر اس کا استقبال کیا اور اپنی اپنی نذر اسکے سامنے رکھ دی۔ گاؤں والے خوش تھے۔

کتنی جلدی بِنگپو نے طوفان کے دیو کے دانت کھٹے کر دیئے۔ بِنگپو یقیناً بھگوان کا نمائندہ ہے۔ وہ ہمارے گاؤں کی حفاظت کرتا ہے۔ دیو نے نقصان بہت پہونچایا مگر بِنگپو نے ہماری حفاظت کی ورنہ دیو ہم سب کو برباد کر دیتا۔

بِنگپو نے نیزہ اٹھا کر کہا۔ "آج طوفان کے دیو کو شکست دیکر میں سمجھ رہا ہے کہ اس کی پوجا کا حصہ۔ لال جوار کا آٹا، چربی کا مکھن، بھیڑ کا گوشت اور نمک اُسے ہر ملوش[1] اور پورنوشی[2] کو بھینٹ کر دیا کرو۔ اب اُسے گاؤں میں آنے کی ضرورت نہیں"

گاؤں والوں نے عقیدت سے سر جھکا کر پابندی وقت کے ساتھ نذر پہونچانے کا وعدہ کیا۔

* * * * *

"کیا تمہیں اب بھی بِنگپو کی روحانی طاقت میں شک ہے؟"

---

[1] ہندی مہینے کی پندرھویں تاریخ۔ [2] ہندی مہینے کی تیسویں تاریخ۔

مترجمہ، گوکل چند رستوگی۔

نئی مطبوعات

تلخ و شیریں:- صلاح الدین قریشی کے بہترین افسانوں کا مجموعہ۔ زندگی کتنی تلخ ہے اور ساتھ ہی کتنی شیریں! اس کا ثبوت آپ کو ان افسانوں میں ملے گا۔ قیمت دو روپے۔

نور و ظلمت:- صلاح الدین قریشی کی تازہ ترین کتاب، زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں۔ اُردو میں اپنی قسم کی نرالی اور اچھوتی چیز ہے۔ قیمت ایکروپیہ چار آنے۔

باغی:- بہترین انقلابی نظموں کا مجموعہ، ابھی کچھ دن ہوئے ان نظموں نے دُنیائے ادب میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ قیمت ایکروپیہ چار آنے۔

دُلہن کی سیج:- جبران خلیل جبران کے افسانوں کا تازہ مجموعہ۔ ہر افسانہ سوسائٹی کے اہم نقائص کے خلاف ایک ضرب کاری ہے۔ مترجمہ حبیب اشعر دہلوی۔ قیمت دو روپے۔

ٹوٹے ہوئے پَر:- خلیل جبران کا ایک المیہ ناول، مترجمہ حبیب اشعر دہلوی۔ قیمت ایکروپیہ آٹھ آنے۔

راز و نیاز:- حبیب اشعر دہلوی کی غزلوں کا مجموعہ۔ قیمت چھ آنے۔

یہ اور دوسری مشہور کتابوں کے ملنے کا پتہ:-

ایوانِ ادب، چوڑی والان، دہلی

ڈاکٹر نصیر الدین

اپنی ڈائری سے

ایک دن علی الصباح چاء پی کر اپنے چھوٹے سے احاطہ میں چہل قدمی کر رہا تھا پاس ہی ایک آم کا درخت بور سے لدا پھدا کھڑا تھا جس پر کوئل بیٹھی کوک رہی تھی نسیم سحری کہیں سے بھینی بھینی خوشبو چرا کر لائی تھی اور اسے مٹھیاں بھر بھر کر نثار رہی تھی۔ جی آپ ہی آپ کنول کی کلی کی طرح کھل کر پھول بنا جا رہا تھا اور دل کسی لامعلوم جذبہ سے مرعوب ہو کر دھڑکنے لگا تھا اور جیسے کوئی میٹھا مریض کی آمد کے مژدے سنا رہا تھا اور دل کہہ رہا تھا کہ آج میری ستاندار زندگی کا آغاز ہوگا۔

عین اسی وقت احاطہ کا پھاٹک کھلا اور ایک دبلا پتلا، پھٹے حال آدمی قدرے لنگڑا کر اندر داخل ہوا۔ وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹکا اور جہاں تھا وہیں رک کر میری طرف اُمید بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ میرا دل خوشی سے آہستہ آہستہ تھل تھل کرنے لگا۔ "مریض واقعی مریض، از سر تا پا مریض، میرا معزز مہمان، میری زندگی کو شاندار بنانے والا پہلا معمار" میں لپک کر آگے بڑھا اور بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے بولا "آیئے۔ آیئے تشریف لایئے، ہاں آپ چل کر اندر بیٹھیے۔ آپ بیمار اور کمزور دکھائی دے رہے ہیں، گھبرایئے نہیں، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

نو وارد مجھے یوں تپاک سے اپنا خیر مقدم کرتے دیکھ کر ٹھٹکا، گھبرایا، گھبرایا، نظریں نیچی کر لیں اور معذرت خواہ ہو کر بولا "جی جی، میں کمزور ہوں بیمار ہوں مگر اس قابل نہیں۔" ابھی وہ اپنا جملہ پوری طرح تمام کرنے نہ پایا تھا کہ میں اس کا بازو تھام کر اسے اپنے بنگلہ کی طرف لے چلا۔ وہ چلنے میں لنگڑا رہا تھا اور اس کی چال دیکھ کر میں نے دل میں کہا "یہ Gout یا Rheumatism کا مریض ہے" کچھ آگے بڑھا تو اس کی زرد بے رونق اور پھیکی پھیکی سی آنکھوں اور چہرہ پر نظر پڑی۔ دل نے خوشی سے اچھل کر فوراً یہ تشخیص پیش کی کہ یہ Anaemia, Jaundice, Cirrhosis یا ورم جگر کا مریض ہے۔ کچھ آگے بڑھا تو اس کے بازو کی حدت معمول سے زیادہ محسوس ہوئی۔ حساب سے فوراً ایک اور تشخیص پیش کی کہ یہ Rheumatic malaria یا Typhoid ... رومیٹک بخار، ملیریا یا موتی جھرہ کا مریض ہے۔ الغرض اسے اس چھوٹے سے احاطہ سے گزرنے کی مدت میں میرے دماغ نے اس کے نامعلوم مرض کی سینکڑوں تشخیصیں کر ڈالیں اور جب تک وہ برآمدہ تک پہنچا میں نے اس کے لئے نسخہ، غذا، پرہیز، دوا کی تجویز بھی مکمل کر لی۔ میں نے اسے ایک آرام دہ کرسی پر اس کی مرضی کے خلاف بٹھایا اور ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا "کہیئے آپ کو کیا تکلیف ہے گھبرایئے نہیں، میں آپ کو جلد اچھا کر دونگا، پہلے آپ مجھے اپنا پورا حال سنایئے۔"

وہ پہلے بہت ہچکچایا کر تھوکا مگر میرے ہمت دلانے سے اپنا حال یوں بیان کرنے لگا "ڈاکٹر صاحب، میں اپنا حال کیا سناؤں۔ آہ! حسبا کے لئے میں نے اپنی ملازمت تیاگ دی، اپنے بھرے گھر کو خاک میں ملایا اور آج دانہ دانہ کو محتاج ہوں۔ افسوس وہ نیک بی بی آج نہ رہیں۔ آپ کے آنے سے چند دن پیشتر وہ اس دنیا سے چل بسیں اور مجھے اور پانچ بچوں کو یوں در در کی ٹھوکریں کھانے کو چھوڑ گئیں۔ ڈاکٹر صاحب، میں کس کس مصیبت کو بیان کروں، میری اس ٹانگ کو دیکھئے، ایک سال ہوتا ہے کہ مرحومہ کے لئے ڈاکٹر بوس کے ہاں سے دوا لانے کے لئے جا رہا تھا پھسل کر گرا اور گھٹنا اُتر گیا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر گھوش کو پانسو روپے دئے، مرحومہ کے علاج کے لئے ڈاکٹر سمن داس کو چار سو حکیم گیلانی کو سو سو کو پراج مدھو سودن کو ڈھائی سو روپے دئے اور دعا تعویذ اور گنڈے میں تقریباً پانسو روپے صرف ہوئے۔ الغرض ڈاکٹر صاحب کیا بتاؤں کہ اس بیماری میں ساری پونجی حتیٰ کہ آبائی مکان تک فروخت کر ڈالا مگر قسمت کا لکھا اٹل تھا۔ آج میں اپنے بچوں کے ساتھ ایک درخت کے سایہ میں پڑا ہوں اور روٹی اسے کسی کے منہ میں کھیل تک اڑ کر نہیں گئی ہے۔" وہ تھا کہ پھکر رونے لگا اس کی دکھ بھری کہانی سُن کر میرے ہوش اُڑ گئے کہاں تخیلات کی دنیا میں مریض دوسرا نام تھا ہر درد جواہر کا اور کہاں دنیائے حقیقت میں ایک مفلوک الحال فاقہ مست مریض سے سابقہ پڑ رہا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا اور ہاتھ پاؤں سے ٹھنڈے پسینے چھوٹنے لگے۔ وہ ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ میں بے اختیار بول اٹھا "بھائی، آپ اپنے مرض کا حال سنایئے، مجھے آپ کی تباہ حالی سے پوری ہمدردی ہے۔"

وہ میری صورت تکنے لگا اور بولا "ڈاکٹر صاحب، میرا مرض تو انہیں اسباب کی بنا پر ہے۔ افلاس نے مجھے لوٹ لیا برباد کر دیا۔ یہ انہیں کی بدولت آج فاقہ مستی میں مبتلا ہوں، میری یہ نقاہت، یہ بخار، یہ کمزوری تو اسی لئے ہے کہ میں اور میرے بچے ہفتوں سے برائے نام غذا پر گزار رہے ہیں۔ تب آپ کے پاس بغرض علاج کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔"

اس کی صورت سوال بن کر رہ گئی۔ میں سر جھکائے اُٹھا اور اس کی ہتھیلی پر پانچ روپے رکھکر بولا "یہ تو مختصر سا نسخہ آپ کے مرض کے لئے ہے قبول کیجئے۔"

وہ اٹھ کر چلنے لگا۔ وہ جس وقت لنگڑا کر میری سیڑھیوں سے نیچے اتر کر جانے لگا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے خواب کے تمام سنہرے نقوش زرد ہو کر پیلے پڑ گئے ہیں اور اپنے خوبصورت چوکھٹوں سے لنگڑاتے ہوئے نکل نکل کر باہر چلے جا رہے ہیں! آج میری آنے والی شاندار زندگی کا پہلا معمار آیا۔ مگر وہ لنگڑا تھا، بھوکا تھا اور مجھ سے زیادہ محتاج تھا۔ کالج میں حاصل کئے ہوئے غلط قسم کے سنہرے خیالات کا طلسم آنکھوں کے سامنے ٹوٹ رہا تھا۔ مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ ڈاکٹر سے رجوع کرنے والے زیادہ تر ایسے مفلوک الحال اور پریشان انسان ہوتے ہیں جو فاقہ کے سبب سے متعدد امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ دق امراض، افلاس اور غربت کے تباہ کن دائرہ میں گھرے ہوتے ہیں۔ ان کی ملازمتیں اور ذرائع آمدنی مسدود ہو کر مفقود ہو جاتے ہیں اور ان کا صبر و قرار مستقل پریشانی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اُن کے گھر دوزخ کے نمونے بن جاتے ہیں جہاں ہر وقت دلوں میں آگ لگی رہتی ہے اور سسکیوں کا دھواں منڈلاتا رہتا ہے۔ ایسے مفلوک الحال اور افلاس زدہ بدقسمت انسان کو اپنا ذریعہ آمدنی بنانا انسانیت سے خارج بات ہے اور ان بیچاروں کے پیسوں سے اپنے لئے عالیشان محل سوا، اور موٹریں خریدنا نہایت خطرناک شیطانی حرکت ہے۔ میرا دل انسان کی بدقسمتی اور دُکھ درد کو دیکھ کر رونے لگا۔ کچھ دیر پہلے سیٹی بجانے کو جی چاہتا تھا اور اب آنکھوں سے خود بخود آنسو اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ انسانی زندگی کے مدوجزر کا یہ پہلا سبق تھا جسے تجربہ کے خرانٹ مولوی نے ایسا ڈنڈا مار کر میرے ذہن نشین کرایا تھا۔

اس طرح زندگی کے کھردرے دل لیں وہار کی کھرل میں خوب باریک طرح سے گھس گھس کر پستے رہے۔ ہر لمحہ ایک نئی صورت پیش کرتا رہا اور ہر ساعت کتاب زندگی کے سفید ورق پر تجربہ کی ایک موٹی لکیر کھینچتی رہی۔ میں نے وہ تمام چیزیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں جن کو دل صرف کبھی کبھی محسوس کرتا تھا اور ان واقعات سے بھی دوچار ہوا جس کا وجود وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ڈاکٹر کی زندگی صبح سے شام تک مزیدار تجربوں کی لیبارٹری ہے جس میں طرح طرح کے تجربے خود بخود حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر انسانی فطرت کو اس کی برہنہ حالت میں دیکھتا ہے اس کے سامنے ڈاکٹر جیکل مسٹر ہائڈ بن کر آتے ہیں۔ وہ اپنے گھر ہی میں بیٹھا انگلا لگت، برگ ریشمیں صفت، گرگ باران دیدہ اور حوا کی بیٹیوں کے گھناؤنے کرتوت دیکھتا ہے اور اپنے دل میں عش عش کرتا ہے۔ کو اس صفحۂ ہستی پر ایک نہیں، دو نہیں، ہزاروں کیگ کانگ اور فرانک سٹائن بستے ہیں مگر ان کے قصے نہ تو لکھے جاتے ہیں اور نہ پردۂ سیمیں پر پیش ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر کا دل ساری دنیا کے رازوں سے بھرا ہوتا ہے۔ انواع و اقسام کے فرزندان آدم آ کر پاس آتے ہیں، اس کی سمع خراشی کرتے ہیں اور آخر میں اپنے گناہوں کی پوٹلی باندھ کر اس کے صندوق میں رکھ جاتے ہیں۔ سوسائٹی کا سب سے زیادہ مفید ممبر ڈاکٹر ہے مگر پھر بھی سوسائٹی جتنی پھبتیاں اس پر کستی ہے کسی اور پر نہیں کستی! یہ کیوں؟

یہ انسانی فطرت کا ایک راز سربستہ ہے۔ آپ اپنے دل سے پوچھئے۔ کیا آپ کسی ڈاکٹر کے زیر بار احسان نہیں ہیں مگر ساتھ ہی کیا آپ کو کسی ڈاکٹر سے شدید شکایت نہیں ہے! یہ کیوں؟۔

ڈاکٹر کے پاس دو طرح کے مریض آتے ہیں، ایک جو واقعی بیمار ہوتے ہیں اور ڈاکٹر کی صحیح ہمدردی اور توجہ کے مستحق ہوتے ہیں۔ یہ بیچارے خاموشی سے آتے ہیں اپنا لگا کر علاج کراتے ہیں، ڈاکٹر کے کہنے پر عمل کرتے ہیں اور آخر میں اچھے ہو کر چپ چاپ چلے جاتے ہیں یا مر کر خاموشی سے قبرستان پہنچ جاتے ہیں۔ مریضوں کی دوسری قسم حسب ذیل گروہ میں بانٹی جا سکتی ہے۔

(۱) خیالی مریض۔ جو صرف اپنے خیال میں بیمار ہوتا ہے۔
(۲) جنسی مریض۔ جس کے مرض کا سبب جنسی تعلقات ہیں۔
(۳) مالی مریض۔ 〃 〃 〃 مالی نقصان یا منفعت ہو۔
(۴) سیاسی مریض۔ 〃 〃 〃 کوئی سیاسی چال ہو۔

دسمبر کا مہینہ تھا اور اندھیری رات کا وقت، موسلادھار بارش ہو کر رُکی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹا کر آواز دی "ڈاکٹر صاحب، جلد باہر تشریف لائیے" میں شب خوابی کے لباس میں باہر نکلا، دیکھا خان بہادر ــــ کا ملازم موٹر لئے کھڑا ہے۔ خان بہادر کے خیال سے بد گھبرایا، مگر جب ملازم نے مریض کی نازک حالت بتائی اور یہ کہ دم کوئی دم کے مہمان ہیں تو نادل نخواستہ جانا ہی پڑا کہ اک کی سردی میں پانچ میل کی مسافت کھلی موٹر میں طے کرنا پڑی۔ واللہ ہاتھوں کی انگلیاں مفلوج ہو کر جم گئیں۔ آنکھوں سے گرم گرم آنسو رواں ہو گئے اور ناک تو ایسی ٹھٹھری کہ گویا چہرہ پر سے بالکل غائب ہو گئی۔ خان بہادر کی عظیم الشان حویلی میں پہنچ کر اُن کے کمرے میں داخل ہوا۔ دیکھا کمرے کے تمام دروازے کھڑکیاں بند ہیں، آتشدان میں آگ بھڑک رہی ہے خان بہادر کے عالیشان چھپر کھٹ کے دونوں طرف دو دہکتی ہوئی انگیٹھیاں رکھی ہیں اور خان بہادر موٹی رضائی، کمبل اور دُھسے کے پہاڑ جیسے ڈھیر کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ ان کے سر پر ابرو تک اونی ٹوپی چڑھی ہے، ہاتھ پاؤں میں اونی دستانے اور موزے لگے ہیں اور جسم پر دو دو موٹے اونی سوئٹر چڑھے ہیں۔ چار ملازم چھپر کھٹ کے چاروں طرف کھڑے ہو کر اُن کے جسم، ہاتھ، سر اور بازو کا کچومر نکال رہے ہیں۔ میں جب باہر کی شدید سردی کے بعد اُن کے کمرے میں داخل ہوا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں دہکتے ہوئے دوزخی کمرے میں آ گیا ہوں جہاں یہ جہنمی فرشتے کسی گنہگار کی تکا بوٹی کر رہے ہیں!

میں نے خان بہادر کے پلنگ پر بیٹھ کر اُن کی مزاج پرسی کی۔ وہ بہت دیر کے بعد بڑی نحیف اور کراہتی ہوئی آواز میں گویا ہوئے: "اوہ! اوہ! برا حال ہے! دم گھٹ رہا ہے، خدا کے لئے میری جان بچائیے، میں مر رہا ہوں، آہ! آہ!"

میں نے ان کی نبض دیکھی، دل اور صدر کی آوازیں سنیں۔ ماشاء اللہ سب کے

سب حسب معمول بڑے دھک کر رہے تھے اور اپنی صحت اور طاقت کا ڈنکے کی چوٹ اعلان کر رہے تھے میں دل ہی دل میں مسکرایا میں ان کے مزاج اور مرض سے واقف تھا۔ جانتا تھا کہ جب تک ان کے خیالی مرض کا سائنٹفک طریقے سے علاج نہ کیا جائے گا یہ اچھے نہ ہوں گے چنانچہ میں نے اپنا ڈرامہ شروع کیا ان کی نبض دیکھکر اُن کے پلنگ سے اُچک کر کھڑا ہو گیا اور اپنی ہر حرکت سے یہ ظاہر کرنے لگا کہ اُن کی حالت واقعی بہت نازک ہے۔ نوکروں کو گھبرا کر جلد گرم پانی، ٹھنڈا پانی، برف، سوڈا، صابن، تولیہ، سلابچی وغیرہ وغیرہ بھاگ کر لانے کو کہا اور خود اپنا بڑا کوٹ اُتار کر دُور پھینکا اور چستی سے اپنی قمیص کی آستینیں کہنیوں تک چڑھا لیں۔ جیسے مجھے جلد اور بہت بڑا آپریشن کرنا تھا۔ اسی درمیان میں میں نے خود ہی بھاگ بھاگ کر کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں انگیٹھیوں کو باہر لے جانے کا حکم دیا اور خان بہادر کے پلنگ پر محض ایک دوسری لحاف چھوڑ کر باقی تمام کمبل وغیرہ دُور ہٹا دئیے اور اُن کی اُونی ٹوپی، مفلر، دستانے اور موزے بھی اتروا ڈالے اس کے بعد میں نے ایک میز پر کسی جادوگر کی طرح اپنے بیگ کا تمام الم غلم سامان نکال کر سجا دیا مگر اس طرح کہ ان پر خان بہادر کی نظر پڑے اور وہ دیکھیں کہ ان کے علاج کے لئے بہت سی دواؤں اور آلوں کی ضرورت پڑ رہی ہے نوکر جب میری منگوائی ہوئی چیزیں لا چکے تو میں نے جلد جلد اپنے ہاتھ دھوئے، سوئی کی پچکاری میں دوا چڑھائی اور دوڑ کر خان بہادر کے بازو میں سوئی لگا دی پھر بھاگتا ہوا آیا اور سوڈا واٹر دکھانے پانی میں چند دواؤں کو ملا کر ان کو پلا دیا یہ کام کرنے کے بعد میں نے ڈرامائی انداز سے خان بہادر کی نبض دیکھی جو بدستور تندرست ستار کی طرح بج رہی تھی اور میں نے فدائیقین کے ساتھ پوچھا "کہئے خان بہادر صاحب! اب تو طبیعت ٹھیک ہوئی؟"

خان بہادر صاحب ہنستے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گئے اور متشکرانہ نگاہ سے میری طرف دیکھکر بولے "بھائی، تم نے کمال کیا، واللہ فوری علاج میں مسیحا ہو مسیحا، اس بدقسمت شہر میں ڈاکٹر ہیں گراں سکٹ رہے ہیں، مودی مجھے دیکھکر کہتے ہیں کہ مجھے کوئی مرض نہیں۔ بھائی، جس کی جان پر بنتی ہے وہی جانتا ہے، یہ گھسیارے کسی کے مرض کو کیا سمجھیں۔"

میں جب اُن کو دوبارہ یقین دلا کر جانے لگا تو وہ اُٹھے اور میری جیب میں کچھ ڈال کر مجھے تکلیف دینے کی معافی چاہنے لگے اور بولے کہ بڑا اوقت ہو گیا ہے۔ میں جب اپنے ہاں لوٹ کر آیا تو رات کے تین بج چکے تھے، میں نے جیب سے "کچھ" نکال کر دیکھا، دس دس روپے کے دس نوٹ تھے میں نے پلنگ پر لیٹ کر جب جماہی لی تو ضمیر نے لعنت بھیجکر کہا "پانی کی سوئی کے سو روپے، یہ تو کھلی بے ایمانی ہے" مصلحت بولی "چُپ کرو، اب سو جاؤ، راستیِ فتنہ خیز سے دروغِ مصلحت آمیز بہتر ہے"

برسات کی ایک کاجل جیسی کالی رات میں جبکہ ہر طرف کالے کالے بادلوں کی یلغار ہو رہی تھی اور کوئی دم میں چھاجوں پانی برسنے والا تھا ایک صاحب فیشن سے آراستہ اور نک سک سے درست گھبرائے ہوئے تشریف لائے، رات کے بارہ بج چکے تھے اور میں اپنا مطالعہ ختم کر کے اُٹھنے ہی والا تھا۔ وہ آئے اور اس طرح چُپ ہو کر بیٹھ گئے کہ ہزاروں سوال کا ایک جواب دیتے اور وہ بھی دور دور سے اور ادھورا۔ آخر میں جب میں تنگ آ گیا تو بہت جھجھک کر بولے "اب کیا عرض کروں محترم، پانی پانی ہوا جا رہا ہوں، آج چوک کے ایک کوٹھے پر ایسی غلطی سرزد ہو گئی ہے کہ کہیں میرے گناہ کا خمیازہ میری نئی نویلی دلہن کو بھگتنا نہ پڑے جسے میں گذشتہ ماہ بیاہ کر لایا ہوں ڈاکٹر صاحب اب میری دلہن کی عزت آپ کے ہاتھوں میں ہے، کچھ کیجئے ورنہ میں تو کہیں کا نہ رہوں گا"

یہ سنکر میرا جی چاہا کہ کسی مولوی کی طرح اس پر حلق سے غصہ کروں اور اسے نار جہنم کے التہاب میں چھوڑ کر خود جنت کی حوروں کے ساتھ گلچھرے اُڑانے کو چلدوں مگر یاد آیا کہ میں ڈاکٹر ہوں جس کا کام کسی کی تکلیف کو مٹانا ہے نہ کہ گرتے ہوئے کو اور گرانا ہے مجھے اس نوجوان کی نئی نویلی دلہن کا گھونگھٹ میں چھپا ہوا چہرہ دکھائی دینے لگا جو عنقریب اپنے شوہر کی نفس پرستی کی قربانگاہ پر مدت العمر کے لئے بھینٹ چڑھنے والی تھی۔ مجھے اس معصوم ہستی اور اس ناتجربہ کار نوجوان پر شدید رحم آیا اور میں نے کوئی دو گھنٹہ میں وہ تمام محافظ تدبیریں کر ڈالیں جن کے بعد امراض کے ہونے کا کوئی خدشہ باقی نہیں رہتا۔ آخر میں میں نے اس سے کہا "میاں پھر ایسی کبھی کوئی غلطی نہ کرنا۔ آج تو آپ محض اپنی دانشمندی کی وجہ سے بچ گئے۔ یاد رکھئے آپ کی لغزش سے نہ صرف آپ کی بیوی کی صحت برباد ہوگی بلکہ آپ کے ہونے والے بچے بھی بیمار ہوں گے"

ایک دن سہ پہر کے وقت میں ٹینس کھیلنے کی تیاری کر رہا تھا کہ رائے بہادر ــــ کے آنے کی اطلاع ملی۔ رائے بہادر صاحب ساٹھ سالہ دُبلے پتلے جسم کے معدے کے دائمی مریض تھے اور مجھ سے عرصہ سے علاج کرانے کے سبب سے کافی بے تکلف ہو چکے تھے۔ مجھے آتا دیکھکر لپکے، میرے شانہ پر ہاتھ رکھکر برآمدہ سے کمرہ میں لے آئے اور ایک کرسی پر مجھے بٹھا کر خود دوسری پر بیٹھ گئے۔ اور رازدارانہ لہجہ میں پوچھنے لگے "آج آپ نے میری کہارن کو دیکھا ہے، کہئیے اسکے مرض کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

یہ کہہ کر رائے صاحب نے مجھے اس شاطر کی نگاہ سے دیکھا جو عنقریب اپنے مخالف کو پیدل کی مات دینے والا ہے، میں گھبرایا، پہلو بدل کر نظریں نیچی کر لیں اور مشکوک ہو کر دل میں کہا کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہے۔ ٹالنے کے لئے میں نے جواب دیا "کچھ خاص مرض تو ہے نہیں البتہ قے اور متلی کی شکایت ہے جو غالباً بدہضمی کی وجہ سے ہے، یہ بھی دوا ایک دن میں جاتی رہے گی"

میرا یہ جواب سُن کر رائے بہادر صاحب خوب ہنسے۔ آنکھ معنی [illegible]

کاسٹ قہقہہ کے تلاطم میں ناؤ کی طرح ڈگمگانے لگا۔ وہ جوانوں کی طرح آنکھیں میچ کر اور میرے زانو پر دھول رسید کرکے بولے "واللہ، اجی ڈاکٹر صاحب، رہے آپ بھی کالج کے کچے شلغم، کچھ نہیں سمجھے، اجی حضرت اس لونڈیا کے تو پاؤں بھاری ہیں، پاؤں۔ کوئی پندرہ دن سے قے پر قے کرتی رہتی ہے، متلی سے اس کا بُرا حال ہے، اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے الگ پڑ گئے ہیں، کیا تصدیق کیلئے مزید علامتوں کی ضرورت ہے؟!"

میں نے اظہار حیرت کرتے ہوئے کہا "مگر رائے صاحب وہ تو ابھی کنواری ہے!"

میرا یہ جواب سُنکر رائے بہادر صاحب خوب ہنسے، اپنی تیر والی کے بٹن کھول کر دیر تک فاتحانہ انداز سے ہنستے رہے۔ پھر بولے "میں نہ کہتا تھا کہ ڈاکٹر ابھی تم کو دُنیا کا تجربہ نہیں ہوا ہے کیا تمہاری کسی کتاب میں لکھا ہے کہ کنواری حاملہ نہیں ہوسکتی؟ اگر لکھا ہو تو اس کتاب کو پھاڑ کر پھینک دو۔ تمہاری نظروں کے سامنے اس لونڈیا کی زندہ مثال موجود ہے۔ چلو بھائی۔ یہ بھی اچھا ہوا، خدا کی اسی میں مصلحت تھی کہ وہ مجھے اس عمر میں ایک عدد بچے کا باپ بنائے۔ ڈاکٹر تمہارے ان انجکشنوں نے واللہ جادو کا کام کیا، اچھا دیکھو، کل سے تمہاری ڈیوٹی ہوگئی کہ لونڈیا کو روزانہ جاکر دیکھو اور ہر احتیاطی تدبیر کو کام میں لاؤ تاکہ بچہ اور زچہ دونوں خیریت سے رہیں۔"

رائے بہادر یہ کہہ کر ہنستے ہوئے اُٹھے، میری میز پر جھک کر "کچھ" رکھ دیا اور اپنی رولس میں بیٹھ کر چلے گئے۔ میں اُن کو حیرت اور خوف سے حد نظر تک دیکھتا رہا۔ میں تقریباً ایک سال سے ان کے ضعف پیری کا علاج کر رہا تھا اور ان کو اچھی طرح سے جانچ کر اس نتیجہ پر پہونچ چکا تھا کہ ان میں اولاد پیدا کرانے کی صلاحیت کبھی بھی نہیں آسکتی۔ ایک ماہ بعد جب مجھے کامل یقین ہوگیا کہ اس کہارن کی چھوکری کو واقعی حمل ہے تو میں اُس کی عیاری کا قائل ہوگیا۔ اللہ اللہ ایک سولہ سالہ جاہل مطلق کنواری لڑکی میں بھی ایک ہوس پرست بڈھے کھوسٹ کو احمق بنانے کی اتنی صلاحیت ہوتی ہے۔

شام ہونے والی تھی اور میں سینما جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں جب موٹر میں بیٹھ چکا تو میرے ایک دیرینہ ملاقاتی منہ پر رومال رکھے بھاگتے ہوئے آئے اور بولے "بھئی ایک منٹ ایک دانت میں کل رات سے سخت درد ہے، کوئی دوا فوراً تجویز کرو!"

میں جب نسخہ لکھنے لگا تو میرا قلم پکڑ کر بولے "یہ دوا نہیں، کوکین کا لوشن لکھ دو، اس سے پہلے بھی فوری سکون مل چکا ہے"

میں نے نسخہ لکھکر ان کے حوالے کیا اور جا تپور تصویر دیکھنے کے لئے چلا گیا۔ دوسرے دن شہر کا ایک کیمسٹ جس کے ہاں میرے نسخے بننے کے لئے جایا کرتے تھے آیا اور رازدارانہ لہجہ میں بولا "کل آپ نے فلاں صاحب کیلئے کوکین کا نسخہ لکھدیا تھا یہ حضرت نوٹیراے کوکین خوروں میں سے ہیں اور شہر کے تمام محکمہ آبکاری والے ان کی کرتوت سے واقف ہیں، جو ڈاکٹر اُن کے لئے کوکین کا نسخہ لکھتا ہے وہ بھی اُن کے ساتھ بدنام ہوجاتا ہے۔ آپ اس شہر میں نو وارد ہیں، ذرا احتیاط سے کام لیجئے۔"

کیمسٹ کی اس ہدایت سے مجھے بڑا فائدہ پہونچا۔ میں نے دیکھا کہ دانت کے درد کے ساٹھ فی صدی اور آنکھ کے تیس فی صدی مریض حقیقت میں کوکین خور تھے جو صرف اسی بہانے سے مجھے دھوکہ دینے آتے تھے۔

شہر سے باہر ایک نوابوں کا خاندان آباد تھا جن کی آبائی دولت دن بدن کم ہوتی جاتی تھی، اور عنقریب فاقہ مستی کی نوبت آنے والی تھی۔ اسی خاندان کے ایک بزرگ تھے جو اوروں سے ذرا مختلف تھے اور اپنے حصہ کی جائداد پر سانپ کی طرح بیٹھے ہوئے اسے خود اپنی اولاد کے حملوں سے بچا رہے تھے۔ یہ مجھ سے اکثر ملتے تھے اور میں بھی اُن کی کفایت شعاری اور سوجھ بوجھ کا قائل تھا۔ ایک بار رات کا ان کا ملازم بھیجا اور وہ خود گھبرا کر مجھے بلا کر لے گئے۔ ان کے بنگلہ یا محل کی پُشت پر کچھ ٹوٹے پھوٹے مکانات تھے اور انہیں مکانات میں ایک کوٹھری تھی جس میں مجھے لے جایا گیا۔ لالٹینوں کی مدھم روشنی میں دیکھا کہ ایک چودہ سالہ لڑکی خون میں لت پت پڑی ہے اور درد سے کراہ رہی ہے۔ نبض دیکھی تو ساقط ہونا چاہتی تھی، خون کثرت سے نکل چکا تھا۔ میں نے اشارہ سے کچھ کہنا چاہا کہ نواب صاحب نے جھک کر میرے گھٹنے پکڑ لئے اور بولے "ڈاکٹر صاحب! اب کچھ نہ کہیئے، شیطان کے بہکانے میں آگیا، غلطی ہوگئی ہے، نادم ہوں، خدا کیلئے اسے بچائیے ورنہ میں تو کہیں کا نہ رہونگا۔"

اُن کی بزرگ صورت اور مونچھوں پر ندامت والے آنسو دیکھکر رحم آگیا۔ جس طرح بھی بن پڑا بہتے ہوئے خون کو روکا، گرم گرم سلائن (نمکین پانی) ورید میں چڑھایا، سوئیاں دیں، آخر اللہ آمین کرکے صبح کے قریب تک اور مجھے اطمینان ہوا کہ یہ ننھی سی جان اب بچ جائیگی۔ میں منہ اندھیرے جب کوٹھری سے باہر نکلا تو دیکھا کہ نواب صاحب وہیں باہر تسلی بچھائے سجدے میں پڑے ہیں۔ روتے روتے گھگی بندھ گئی ہے اور اللہ میاں کو محض اپنی گریہ وزاری کی حد تک سے مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ انسان کی جنسی کمزوری اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے، میری نظروں کے سامنے اس وقت کچھ عجیب قسم کا اجتماع ضدین تھا۔ کوٹھری کے اندر گناہ کبیرہ کا ارتکاب اور کوٹھری کے باہر اظہار تقدس و ندامت۔ کیا ہر انسان کی زندگی کے دو رُخ نہیں ہیں؟

میں ایک دن صبح کے وقت مریضوں کے ہجوم میں گھرا ہوا تھا کہ ایک بگھی دوڑاتی ہوئی احاطہ کے اندر گھس آئی میں نے ملازم سے کہا کہ اس بگھی کو باہر

کردوسے۔ یہ میرا ان حرف کہ دے گی مگر اس کی بات کی کسی نے پرواہ نہ کی۔ کنگھی کے اندر سے کسی زنانہ آواز نے اُسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ مجھے اتنی جلدی یہ پتہ لگ گیا کہ اس کمرے میں معقولات کو رد کرنا میں نے جب مریضہ کو دیکھنے کے لئے بلوا بھیجا تو وہ نہ آئی اور کہلا بھیجا کہ جب سب لوگ چلے جائیں گے تب آئے گی کوئی دو گھنٹے بعد جب تنہائی ہوئی تو وہ آئی۔ اس کی بوڑھی ملازمہ باہر بیٹھ گئی اور وہ خود اندر آ گئی۔ اس کی کوئی اٹھارہ سال کی عمر ہوگا، چہرہ خوبصورت اور آنکھیں نمکین، اور رنگت کھلی ہوئی۔ کپڑے بھی صاف ستھرے اور نہایت موزوں پہن رکھے تھے۔ وہ ایک شان استغنا سے آئی اور بغیر میری اجازت کے میرے سامنے بیٹھ کر مسکرانے لگی، اور اپنی آنکھوں میں لگاوٹ کی چمک پیدا کر کے بولی "ڈاکٹر صاحب آپ تو مجھے دیکھ کر حیران ہو گئے کہ میں کون ہوں، میرا نام ــــــ ہے اور میں فلاں میں رہتی ہوں۔ یہاں خاص آپ سے ملنے آئی ہوں۔ سُنا ہے آپ بڑا اچھا علاج کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ خیپ ہو گئی اور غور سے دیکھنے لگی کہ اس کے آری حملہ کا مجھ پر کیا اثر پڑا۔ میں نے اس کا دل خوش کرنے کے لئے جواب میں کہا "آپ کی مہربانی ہے جو آپ نے میرے متعلق اس قدر عمدہ رائے قائم کر لی، ورنہ مجھ جیسے ڈاکٹر تو آپ کے اس شہر میں بہتیرے ہیں۔ ہاں تو بیان کیجئے کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟"

وہ یہ سُن کر مسکرائی اور بولی "اجی آپ ڈاکٹر کاہے کے ہیں، صورت دیکھ کر پہچانئے کہ مجھے کیا مرض ہے؟ پہچانتے، پہچانتے، نہیں پہچانتے ہیں تو لیجئے میں آپ سے روٹھی جاتی ہوں" یہ کہہ کر اس نے اپنا منہ پھیر لیا اور اپنے چہرہ پر گھونگٹ نکال کر مجھ سے ذرا کھنچ ہو کر بیٹھ گئی۔ میں ہنس پڑا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بیمار کی جگہ ایک زبردستی کی معشوقہ لے لی تھی۔ میں حیران تھا کہ خدایا یہ کیا ماجرا ہے اور یہ کس طرح کی معشوقہ ہے۔ کھلا گدرایا ہوا جسم، مدبھری شرابی پینے بلانے والی آنکھیں، سانولا سلونا رنگ، ابھرا ہوا دلربا سینہ، رس میں ڈوبے ہوئے سرخ سرخ ہونٹ، تھرکتی اور ڈولتی ہوئی چال۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا کہوں اور کس طرح لال بجھکڑ بن کر ایک تندرست انسان کو بیمار بنادوں۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ آپ ہی گھونگٹ کے اندر سے بولی "بس ختم ہو گئی آپ کی ڈاکٹری، ذرا میری نبض تو دیکھئے، دل ہے کہ نگوڑا آپ ہی آپ بیٹھا جاتا ہے۔ نہ دن کو چین ہے اور نہ رات کو قرار۔"

میں نے نبض دیکھی۔ اس کی تسلی کے لئے اس کے دل، سینہ، جگر، طحال کا معائنہ کیا سب ٹھیک، سب اپنی اپنی جگہ پر گھڑی کے پرزوں کی طرح ٹھیک ٹھیک چل رہے تھے۔ میری عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا میں حیران و پریشان ہو کر ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ آخر میں ٹالنے کے لئے اسے ایک نسخہ دے کر کسی طرح اپنی جان چھڑائی۔

اس کے بعد اُس نے روز آنا شروع کیا، وہی شوخی و طنازی وہی ناز و عشوہ وہ ہر روز اپنے ترکش میں سینکڑوں نئے نئے زہر میں بجھے ہوئے تیر لیکر آتی اور ان کو یکے بعد دیگرے مجھ پر چلا کر جھنجھلا کر خفا ہو جاتی اور آخر میں میری تشخیص میں سینکڑوں عیب نکال کر چلی جاتی۔ میں نے ایک دن اس سے کہا "آپ زیادہ تکلیف نہ کریں، آپکا مرض لاعلاج ہو چکا ہے۔"

میرے اس فیصلہ کو وہ سُن کر ہنسی اور اس کا شوخ چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس کی بڑی بڑی کاجل لگی آنکھوں میں آنسو کے قطرے موتی کی طرح جھلملانے لگے۔ وہ بولی "آہ، آپ نے میرے مرض کو نہ پہچانا میرا دل کسی کی یاد میں ہر گھڑی روتا رہتا ہے۔ جب سے سنا ہے کہ ــــ صاحب آپ کے معتقد اور اکثر آپ کے زیر علاج رہتے ہیں میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ ان کے ملنے کے لئے آپ سے سفارش کراؤں گی۔ آہ ڈاکٹر صاحب، ان کے بغیر میری زندگی ناممکن ہے، کسی کمینے نے ان کے کان میری طرف سے بھر دئے ہیں اور انہوں نے تین ماہ سے میرے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا ہے۔ خدا کے لئے آپ میری مدد کیجئے، سُنا ہے وہ آپ کی بات بہت مانتے ہیں۔"

میں یہ سُن کر حیرت زدہ ہو گیا۔ میرے پاس ایسی فرمائش کا کوئی اور جواب نہ تھا۔ ٹالنے کے لئے میں نے ہاں کر دیا اور اُسے یقین دلا کر گیا واپس کر دیا کہ میں ہفتہ عشرہ میں ان صاحب کو راضی کر کے اسکے ہاں ضرور بھیج دوں گا۔

اُوپر کے چند نمونوں سے ناظرین کو ایک ڈاکٹر کی پریشانیوں کا کچھ حال معلوم ہو جائے گا۔ غریب ڈاکٹر کی ایک جان ہے مگر اس کے گاہک سینکڑوں ہیں۔ یہ گاہک بھی عجیب عجیب قسم کی امیدیں لیکر ڈاکٹر کے پاس آتے ہیں۔ اگر بیچارہ بھلا یا ہوا ڈاکٹر اپنے ہر مہربان کو خوش نہیں کر سکتا تو اس میں کسی کو ناراض نہ ہونا چاہیئے ایک شریف طبیعت، ہمدرد اور ایماندار ڈاکٹر اس آدم کا سچا مخلص اور دوست ہوتا ہے۔ اس نے انسان کے دُکھ درد اور تکلیف کو رفع کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے اور اس کے اس مبارک ارادہ میں ہر شخص کا یہ فرض ہے کہ اس سے ہمدردی کرے، اس کی مشکلات کو سمجھے اور پیٹھ پیچھے ہمیشہ اُسے کلمہ خیر سے یاد کرے۔

نوٹ:- اس مضمون کا ہر نام فرضی ہے۔ کوئی صاحب کسی ایک واقعہ کو بھی اپنی طرف منسوب نہ کریں، ایسا کرنے میں انہیں کا نقصان ہوگا۔

نرگس

یہ ایک ناول ہے جس میں ایک طوائف کی دردناک و عبرت انگیز زندگی کے حالات پیش کئے گئے ہیں۔ نہایت غمناک کہانی ہے جسکے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی گناہ آلود زندگی گذارنے والی کے پہلو میں ایک حساس اور محبت کرنے والا دل دھڑکتا رہتا ہے۔ اور جب ایسا ہوتا ہے تو اُس کی تباہی و بربادی کس طرح ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ آپ کو نرگس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔ قیمت دو روپے۔ علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ:- ساقی بُک ڈپو، دہلی۔

ساحلی

ایک تھے راجہ

جاڑے کا زمانہ تھا۔ راجہ صاحب دُبلے پتلے سانولے، دھوپ میں ننگ دھڑنگ لیٹے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹی سی دھوتی پہنے ہوئے، حجام تیل کی مالش کر رہا تھا۔

"حضور، بڑے راجہ صاحب کے زمانہ میں رنگ ڈھنگ دوسرے تھے۔ جلسے جمتے تھے ناچ، گانا دعوتیں۔ ملنت خود حاضر رہا کرتے تھے۔ مگر آپ تو سادھو ہیں، سادھو۔ البتہ ... یا سب کچھ ہے۔ دھن، دولت، اتنا بڑا علاقہ۔ ایک سے ایک مال حاضر ہو سکتا ہے حضور کے حکم کی دیر ہے۔"

راجہ صاحب مسکرائے۔ سانولی رنگت پر سرخی تو کیا، ایک نیلاہٹ دوڑ گئی۔ لیکن حکم نہ ہوا۔

"بابو جانکی پرشاد حضور کے ایک معمولی اہلکار ہیں۔ لیکن سُنا ہے شہر میں بڑی کوٹھی بنوا رہے ہیں۔ اور عیاشی میں تو راجاؤں مہاراجوں سے نمبر لے جاتے ہیں۔ کلکتہ بمبئی سے بڑی بڑی نامی رنڈیاں بُلائی جاتی ہیں۔ صاحب لوگوں کے ساتھ شراب پیتے ہیں . . ."

"ہوں، تو جانکی پرشاد نے بہت پر نکالے ہیں۔"

"حضور کے حکم کی دیر ہے۔ جانکی پرشاد جیسے کتنے نپٹ چکا ہوں۔ بڑی رانی کا ڈر نہ ہوتا تو کب کا خاتمہ کر چکا ہوتا . . ."

"خاموش رہو۔"

بڑی رانی اور بابو جانکی پرشاد کے تعلقات کا تذکرہ سارے قصبہ میں ہو رہا تھا۔ راجہ صاحب اپنی ماں سے بہت ڈرتے تھے۔ اس لئے دخل نہ دے سکتے تھے لیکن اب یہ سُنا جاتا تھا کہ بزرگوں کی جمع کی ہوئی دولت بھی جانکی پرشاد کی عیاشیوں کے حوالے ہو رہی ہے اس لئے راجہ صاحب کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔

"کل شام کو بابو جانکی پرشاد علاقہ پر سے تحصیل وصول کر کے واپس آ رہے ہیں۔ راستہ خطرناک ہے، اور ڈاکہ پڑ جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ آج سورج ڈوبنے کے بعد ٹھاکر کرشن سنگھ کو میرے پاس لے آنا۔ باغیچہ میں ملوں گا۔"

آفتاب غروب ہونے کے بعد راجہ صاحب چہل قدمی کے حیلہ سے باغیچہ میں چلے گئے۔ اور تھوڑی دیر بعد اُن کے مشیر کار بھی ایک ایک کر کے پہونچ گئے۔ جانکی پرشاد کے قتل کی پوری سازش ہو گئی۔ ڈاکہ میں جو رقم ہاتھ لگنے کی اُمید تھی اُس کے علاوہ کرشن سنگھ نے کچھ روپیہ اور طلب کیا۔ جس کا راجہ صاحب نے وعدہ کر لیا پولیس سے پورا بندوبست کر لینے کا بھی ذمہ لیا۔ حجام نے اپنی کاربرداری کا صلہ پہلے ہی وصول کر لیا تھا۔

راجہ صاحب کھانا کھا رہے تھے کہ بڑی رانی آ گئیں۔ نوکروں کو کمرہ سے باہر کر دیا۔

"سریندر، تم نرے پاگل ہی ہو۔ اپنے بھائی کے قتل کا انتظام کر رہے ہو؟"

راجہ صاحب متعجب ضرور ہوئے، لیکن کچھ نہ کہے

"میں نے سوچ رکھا تھا کہ مرتے وقت تم کو یہ بھید بتاؤں گی، لیکن تم نے مجھ کو ایسا مجبور کر دیا ہے کہ اب کوئی بات چھپانے کا وقت نہیں۔ تم بیوقوف سمجھتے ہو کہ جانکی پرشاد سے مجھ سے ناجائز تعلقات ہیں میں اب بڈھی ہوئی۔ اور ان سب باتوں کا موسم کہاں۔ پھر جانکی پرشاد میرے بیٹے کی برابر ہے۔ کیونکہ وہ راجہ صاحب یعنی تمہارے پتا جی کا بیٹا ہے۔ راجوں مہاراجوں کے یہاں یہ کوئی انوکھی بات نہیں جانکی کی ماں بڑی سُندر تھی۔ شاید اب تم یہ سکو کہ کیوں میں تمہاری نابالغی کے زمانہ سے اس کو بہت کچھ دولت دیتی رہی ہوں۔ ایشور کے یہاں جتنا تمہارا حق ہے، اُس سے کہیں زیادہ اُس کا ہے کیونکہ تم راجہ کے بیٹے نہیں ہو۔ یہ بھی سُن لو میں بھی انسان تھی، جب راجہ صاحب مدتوں میری طرف توجہ نہیں کرتے تھے تو میں نے بھی دوسری جگہ دل لگا لیا اور ایشور کا کرنا یہ کہ میرا بیٹا راجہ بن گیا۔ اور راجہ کا بیٹا اُس کا ایک ادنیٰ اور نمک حرام اہلکار ہے۔"

"ماں جی، تم سے بڑا پاپ ہوا۔ یہ تو گنگا نہانے بھی نہ جائیگا!"

"اگر تو راجہ کا بیٹا ہوتا تو ایسا نہ کہتا مگر تو تو ایک سادھو کا بیٹا ہے خیر۔ میں تو اب تیرتھ کو چلی جاؤں گی اور واپس آنا بھی مشکل ہے۔"

راجہ صاحب دھوپ میں ننگ دھڑنگ، دُبلے پتلے سانولے لیٹے ہوئے تھے۔ حجام تیل کی مالش کر رہا تھا۔ اور آج اُس کا چہرہ بہت بشاش تھا۔ کیونکہ راجہ صاحب اور بڑی رانی دونوں کے پاس سے رقم وصول کر کے بیٹھا تھا۔

"حضور۔ آپ تو سادھو ہیں۔ سادھو۔"

چھتیس ۳۶ افسانوں کا مجموعہ، ساقی کا افسانہ نمبر [illegible] [illegible]
نظم کے بیش بہا افسانے!
قیمت ایک روپیہ چار آنے! ساقی بکڈپو، دہلی سے طلب کیجئے!

صلاح الدین قریشی

یہ بھی ایک جنون ہے

لطفی بک حسب معمول اوپیرا گراؤنڈ کے مشہور قہوہ خانے میں پہنچا۔ مطلع صاف تھا اور ہوا کچھ بند تھی اس لئے وہ باہر ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بوائے سے برف کا پانی لانے کو کہا۔ اُس نے جیب سے گھڑی نکالی، شام کے پانچ بجے تھے وہ سوچنے لگا:

—— ساڑھے چار بجے کا وقت دیا تھا اور اب تک نہیں آئے، یہ کیا معاملہ ہے؟

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے سے اس کا دوست عفت بک آتا نظر آیا اسے دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور رسمی سلام دعا کے بعد دونوں بیٹھ گئے۔ لطفی نے بوائے سے کچھ پینے کے لئے لانے کو کہا مزاج پرسی کے بعد تھوڑی دیر تک کچھ صحت کے متعلق گفتگو ہوتی رہی اور پھر موسم کا ذکر چھڑ گیا۔ اس کے بعد عفت نے اپنی جائداد کے لمبے جوڑے مقدمے کی تفصیل بیان کرنی شروع کر دی اور اس بحث میں تقریباً آدھا گھنٹہ صرف ہوگیا۔ آخر جب سارے موضوع ختم ہوگئے تو دونوں نے اخبارات خریدے اور دیر تک بیٹھے پڑھتے رہے۔ بیچ میں وہ خالص سیاسی معاملات پر کچھ گفتگو کرتے جاتے تھے اور مطالعہ جاری تھا۔

اسی دوران میں ایک دُبلا پتلا لیسٹ قد نوجوان ان کے قریب آکر کھڑا ہوگیا اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی اور بالکل سپٹے بال تھا۔ سر پر ایک لمبی سی ترکی ٹوپی تھی اور پاؤں میں عورتوں کی قسم کی اونچی ایڑی کی جوتی پہنے ہوئے تھا۔ وہ سیدھا لطفی کی طرف بڑھا اور ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا:

—— ہیلو! مسٹر لطفی! کیا حال ہے؟

لطفی اچانک اُچھل پڑا، وہ الاہرام میں بیرونی ممالک کے کلید شعبے انہماک سے پڑھ رہا تھا۔ اس نے سر اُٹھایا تو سامنے نصری کو کھڑا پایا، پہلے تو وہ اسے دیکھ کر کچھ ناراض سا ہوا لیکن پھر بناوٹی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا:

—— تشریف رکھئیے!! مزاج تو اچھے ہیں؟ بڑی خوشی کی بات ہے تشریف رکھئیے۔

اُس نے پھر بوائے کو آواز دی۔ نصری کرسی پر اطمینان سے پاؤں پر پاؤں رکھ کر بیٹھ گیا اور بوائے سے خود ہی پیسٹری، مکھن، توس، اور چائے وغیرہ لانے کو کہا۔

لطفی دم بخود بیٹھا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا:

—— ارے کمبخت! تیرا مطلب یہ ہے کہ آج شام کے کھانے کی قیمت تیری طرف سے میں ادا کروں۔

لیکن پھر بھی اس نے بے پروائی کا اظہار کرتے ہوئے سیٹی بجانی شروع کی۔ وہ ذرا دھیمی آواز میں اپنی پسندیدہ دُھن الاپ رہا تھا۔ نصری تک اس کی آواز نہ پہنچ سکی تو اس نے ذرا اونچی آواز میں سیٹی بجانی شروع کی۔ اس پر نصری نے لطفی کو سیٹی بجانے سے روکا۔ لطفی چپ ہوگیا اور زبردستی مسکراتے ہوئے اُس نے اپنے دوست عفت کی طرف اشارہ کیا، پھر پوچھنے لگا:

—— بھئی! کیا تمہارا ان سے کوئی تعارف نہیں ہے؟ نصری نے ذرا شائستہ لہجہ میں جواب دیا:

—— میں تو بیرسٹر صاحب کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں لیکن شاید وہ مجھے نہیں جانتے، کیوں بیرسٹر صاحب؟

عفت نے نصری کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا:

—— واقعی، بدقسمتی سے مجھے کبھی آپ سے ملنے کا موقع نہیں ملا۔

—— لیکن جناب مجھے کئی بار آپ کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے ایک دفعہ یونیورسٹی کی سوسائٹی میں آپ کی تقریر بھی سُنی تھی۔

عفت نے بات کاٹتے ہوئے ذرا تعجب آمیز لہجے میں پوچھا:

—— جی ہاں! آج سے کوئی دس سال پہلے؟

—— جی، جی، آپکی تقریر کا عنوان تھا "مصر میں جرائم کی حقیقت"

—— اوفوہ! یہ تو بہت پُرانی باتیں ہیں۔

—— اس کے بعد میں نے بارہا آپ کو عدالت میں دیکھا۔ پھر ایک دن آپ اوپیرا ہاؤس میں نظر آئے جہاں مصر جدید کا ایک ڈرامہ کھیلا جانے والا تھا۔ دو سال ہوئے جب آپ اپنے کسی عزیز کو جو ڈاکٹری کی تعلیم کیلئے انگلستان جا رہے تھے رخصت

پر رخصت کرنے آئے تھے وہاں میں نے آپ کو دیکھا۔ کچھ دنوں بعد میں نے "المقطم" میں آپ کا ایک مضمون پڑھا اور پھر۔۔

یہاں نطفی نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا:

—— تو یوں کہیئے آپ تو بیرسٹر صاحب کی سوانح حیات سے تفصیلی طور پر واقف ہیں۔

اس کے بعد ہی وہ اپنے دوست عفت کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا:

—— بیرسٹر صاحب! میں آپ سے اپنے دوست مسٹر نصری کا تعارف کراتا ہوں۔ یہ موسیقی کے دلدادہ اور شیدائی ہیں۔ پوسٹ آفس میں ملازم ہیں علاوہ ازیں انہیں چلتا پھرتا اخبار سمجھئے اور ملک کے تمام بڑے لوگوں کے حالاتِ زندگی تو گویا انہیں ازبر ہیں۔

عفت نے نصری کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:

—— آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی میری خوش قسمتی ہے کہ آپ سے ملاقات کا موقع ملا۔

نطفی اپنے دل ہی دل میں کہنے لگا:

—— بلکہ یوں کہیئے کہ بڑی بد قسمتی ہے جو آپ کی منحوس صورت دیکھنی پڑی۔

بوائے ہاتھ میں پیسٹری وغیرہ کی ٹرے لئے آ پہنچا۔

نصری اپنی جگہ پر سنبھل کر بیٹھ گیا اور کھانے کا سامان اپنے سامنے چُنتے ہوئے کہنے لگا:

—— میں چاہتا ہوں کہ آج رات کا کھانا نہ کھاؤں کیونکہ میں آج ایک محفل میں مدعو ہوں۔

نطفی نے ذرا طنز آمیز لہجہ میں کہا:

—— اور وہاں آپ یقیناً گائیں گے بھی۔ اسی لئے شاید آپ باقاعدہ کھانا نہیں کھانا چاہتے۔

نصری نے جلدی جلدی بڑے بڑے لقمے حلق سے اُتارتے ہوئے کہا:

—— اگر مجھ سے اصرار کیا گیا تو گانا ہی پڑے گا۔

نطفی کو معلوم تھا کہ نصری کی آواز نہایت بُری ہے اور کوئی گانے کے لئے اُس سے اصرار نہیں کر سکتا۔

اچانک نصری نے عفت کی طرف رخ کیا اور کہنے لگا:

—— میں آج آپ کو اپنا ایک نیا گیت سناؤں گا ابھی کھانا کھا کر! میں نے یہ گیت شروع سے آخر تک بالکل تیار کر لیا ہے جس نے بھی میرا یہ گیت سُنا اسے شیخ سلامہ مرحوم کا گانا ذرا نہیں جچا۔ لوگوں کو میری بنائی ہوئی طرز اور خوبصورت دُھنوں پر بڑا تعجب ہوتا ہے۔۔۔۔ مسٹر نطفی کیا آپ نے میرے نئے گیت نہیں سُنے جو ابھی حال میں میں نے تیار کئے ہیں۔

اس کے ساتھ وہ پیسٹری کا ایک بڑا سا ٹکڑا نگلتے ہوئے اپنا نیا گیت سُنانے کے لئے گنگنانے لگا۔ جب وہ گیت ختم کرنے لگا تو نطفی کو مجبوراً خوشی کا اظہار کرنا پڑا۔ وہ کہنے لگا:

—— بھئی واہ! کیا تیاری ہے؟ کمالِ فن کا کتنا عمدہ نمونہ ہے۔

عفت کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے بھی اپنے نئے دوست کی آواز کی تعریف کرتے ہوئے کہا:

—— واقعی آپ تو بلاشک شیخ سلامہ مرحوم کے صحیح جانشین ہیں۔

—— شکریہ! شکریہ! بیرسٹر صاحب۔ آپ میرا بالکل تازہ گیت سُنیئے جو میں آپ کو خاص طور پر سُنانا چاہتا ہوں۔ آپ کو بالکل یہی معلوم ہوگا کہ شیخ سلامہ خود آپ کے سامنے گا رہے ہیں۔

اس کے بعد اس نے اپنی بھونڈی آواز میں ایک اور گیت شروع کر دیا۔ اتفاق سے عفت کی کرسی نصری کے بالکل قریب تھی۔ ہر دفعہ سم پر وہ اس بیچارے کو گھور گھور کر دیکھتا تھا تاکہ اس کے کمالِ فن کی داد لی جائے اور عفت بیچارہ ہر دفعہ زبردستی جھوم جھوم کر بلند آواز سے داد دینے پر مجبور تھا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا:

—— سبحان اللہ! سبحان اللہ گلے میں کتنی مٹھاس ہے! گانے میں کتنا رس ہے!!

خوش قسمتی سے گاتے گاتے نصری کو ہچکیاں آنے لگیں اور دونوں کی جان چھوٹی۔ وہ گاتے گاتے خاموش ہو گیا۔

نطفی نے موقع کو غنیمت سمجھا۔ جلدی سے بل ادا کیا۔ دیر سے وہ دل ہی دل میں گُھٹ رہا تھا۔ نصری ابھی تک کھانا کھا رہا تھا۔ آخر اس نے کہا:

—— اچھا! مسٹر نصری خدا حافظ۔ ہم لوگوں کو چونکہ بہت ضروری کام ہے اس لئے اجازت چاہتے ہیں انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔

اسکے بعد ہی عفت بھی اٹھا اور کہنے لگا:

—— جناب بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر امید ہے پھر آپ سے ملاقات ہوگی اور کچھ سننے کا موقع ملے گا۔

قہوہ خانہ سے نکلتے ہی عفت نے لطفی کو لتاڑنا شروع کیا۔

—— واہ حضرت اچھی مصیبت میں پھنسا دیا آج آپ نے مجھکو؟ اُف یہ زہریلا راگ ابھی میرا تو دم گھٹنے لگا واللہ۔

لطفی نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے معذرت کرنی چاہی۔

—— بھئی یہ بیچارہ گانے کے جنون میں بری طرح مبتلا ہے بدقسمتی سے گانا وانا کچھ آتا نہیں ہے اور آواز بالکل بھونڈی ہے مصر کے اکثر رہنے والوں کو جانتا ہے یہی نہیں بلکہ ان کی زندگی کے تمام حالات بالتفصیل اسے معلوم ہیں۔ اور سب سے زیادہ رونا یہ ہے کہ باوجود ایک ایک کوڑی کو محتاج ہونے کے انتہا درجے کا فضول خرچ ہے۔

اب لطفی کو اس کے خاندانی حالات کے متعلق جو کچھ معلوم تھا، بیان کرنے لگا۔

—— نصری بیچارہ ایک اچھے اور کھاتے پیتے خاندان سے ہے اس کے والد محکمۂ عدالت میں بڑے اچھے عہدے پر ملازم تھے۔ جب اُن کا انتقال ہوا ہے تو کافی سرمایہ موجود تھا لیکن ان حضرت نے والد کے مرتے ہی ایک دو سال میں سارا مال و متاع لُٹا دیا۔ شادی بھی بڑے اچھے خاندان کی لڑکی سے ہوئی تھی آخر میں اس کی جائداد وغیرہ بھی رہن ہو گئی اور وہ بیچاری دیکھتی رہ گئی۔ چار چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور ایک معمولی سے مکان کے نچلے حصے میں یہ سارا خاندان رہتا ہے اب جو رہی سہی سو پچاس روپے ماہوار کی آمدنی ہے وہ مہینے کے شروع میں ہی یار دوستوں میں خرچ ہو جاتی ہے اور پھر سارا مہینہ مجھ سے تجھ سے بھیک مانگتے گزرتا ہے۔ ذرا سوچنے کی بات ہے دوست! ایک لڑکی جس نے دولتمند گھرانے میں آنکھ کھولی آج اُس کی قسمت پھوٹ گئی جو اس منحوس کے ساتھ مصیبت بھری زندگی کے دن پورے کرنے پڑ رہے ہیں۔ اب وہ بیچاری اپنی محنت کی روٹی کھاتی ہے اور سلائی کے کپڑے سی سی کر سب کا پیٹ پال رہی ہے۔

نصری کھا پی کر قہوہ خانے سے نکلا اس کے چہرے پر مایوسی چھائی ہوئی تھی اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا:

—— آج کچھ موقع ہی نہیں ملا کہ لطفی سے کم از کم گھر کے کرائے کے لئے ہی کچھ قرض مانگ لیتا۔ مکاندار میری جان کھا رہا ہے اور میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا اب میں کیا کروں گھر پر بیوی بچے بھوکے مر رہے ہیں۔

وہ ازبکیہ پارک کے جنگلے کے ساتھ ساتھ بڑھا چلا جا رہا تھا۔ قریب سے ایک خوبصورت سی لڑکی گزری۔ نصری کی رفتار تیز ہو گئی اور ساتھ ہی اُس نے بے سُری آواز میں حسبِ عادت آہستہ آہستہ گانا شروع کر دیا۔ گاتے گاتے وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ جیب سے رومال نکالا اور پسینہ پونچھتے ہوئے چیخ اُٹھا:

—— کرائے ورائے کا کیا غم ہے۔ کسی بار کی طرف چلنا چاہیئے ممکن ہے کوئی دوست ہی مل جائے آج رات اس کے ساتھ ہی کچھ پی لونگا۔ اچھا ہے اس طرح رات تو ذرا آرام سے گزر جائے گی۔

یہ سوچ کر وہ شہر کے مشہور شراب خانوں کی طرف چلا لیکن وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ آخر مایوس ہو کر اس نے دوسری تفریح گاہوں کا رُخ کیا۔ ایک جگہ وہ کچھ دیر کے لئے چند خوش باش نوجوانوں کی محفل میں زبردستی شامل ہو گیا اور بڑی محنت سے اپنے بے تکے گیت سُناتا رہا۔ بڑی مشکل سے ان بیچاروں نے اپنی جان چھڑائی۔ یہاں سے نا اُمید ہو کر وہ ایک اور پارک میں پہنچا اور وہاں لوگوں کو اپنے گانوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دینا چاہا لیکن وہ بھی بھاگ نکلے۔ اب دنیا اس کے لئے تنگ تھی۔ وہ دیر تک یونہی آوارہ پھرتا رہا اور آخر کار مجبوراً اپنے گھر کی طرف مُڑ گیا۔

اسی حالت میں وہ گھر پر پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹایا کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی بیوی آئی اور کواڑوں کے پیچھے سے کہنے لگی کہ مکاندار نے باہر سے قفل لگا دیا ہے اور کنجی اُسی کے پاس ہے۔ وہ آج قسم کھا کر گیا ہے کہ جب تک کرایہ نہیں ملے گا وہ ہرگز قفل نہیں کھولیگا۔ یہ سُن کر نصری غصے سے کانپنے لگا۔ اُس نے کواڑوں کو ہلا ڈالا اور غصہ میں دھڑ دھڑ پیٹنے لگا۔ آخر مایوس ہو کر وہ چیخنے لگا اور مکاندار کو گالیاں دے کر بھڑاس نکالتا رہا۔ پھر شکست خوردہ آواز میں بولا:

—— آج پھر کہاں رات گزاروں میں؟ کیا سڑک پر جا پڑوں؟

(دیکھیے صفحہ ۲۷۲)

ظفر قریشی

"جے ہند"

جُمعہ کی رات

(یہی مہینہ، یہی سال)

ابن آدم کو دخترِ افتادہ بنتِ حوّا کی طرف سے پرسشِ احوال کا مژدہ پہنچے۔ دیکھو آج مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں اس لئے تھکن کا بہانہ نہ کرنا۔ ورنہ میں ناراض ہو جاتی ہوں۔

آج صبح جب بیدار ہوئی تو بہت تھکی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری رات "کٹھ پتلیوں" کا تماشہ دیکھتی رہی ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے نکمے پن کی وجہ سے جلد تھک جاتی ہوں۔ یہاں اس غدّار شہر میں میرے جاننے والے بہت کم ہیں۔ اور بغیر کسی "کامریڈ" کے میری زندگی کیسی اُداس اور بے مزہ سی رہتی ہے۔ اس کا تمہیں اندازہ ہوگا۔

مگر اس سب سے بڑھ کر وہ میرے چچا ہیں جو اس شہر میں میرے نگراں سمجھے جاتے ہیں۔ سخت گیر، آہنی شکنجے پر یقین رکھنے والے اور اس کے مقابلہ میں ان کی جبدّ بھتیجی بے پروا۔ انقلابی، بیہودہ اور رسم و رواج سے بیگانہ ہر وقت بغاوت پر آمادہ!

پہنچنے کے بعد صبح کو ناشتہ پر چچا جان سے دو دو ملاقات ہوئی۔ پہلے ہلکی سی دیر میں جھپٹ ہوتی رہی۔ پھر "دوگن" ہونے لگی۔ غرض چند ہی منٹ بعد مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ ہم دونوں دو الگ الگ دائروں میں گھوم رہے ہیں۔ اور اگر ایک دوسرے کے کبھی قریب نہیں آسکتے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

یکایک وہ برس پڑے "اگر تمہیں میرا حکم ماننا ہے تو یہاں رہو ورنہ میرے گھر میں تمہارا کوئی کام نہیں ہے!"

"بہت بہتر۔ لیجئے میں یہ چلی۔ آپ کا جی چاہے تو روک لیجئے گا" میں نے جھپٹ کر کہا اور جھنجھلا کر اُٹھ بیٹھی۔ سمجھتی تھی کہ شاید روکیں گے مگر چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ میں بھی پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں گھس گئی۔ فوراً اپنا ٹرنک کھینچا۔ کپڑے وپڑے جلدی جلدی ٹھونسنے شروع کئے۔

ابھی ٹرنک آدھا بھی نہیں بھرا گیا تھا۔ کہ یکایک میرا ہاتھ رُک گیا۔ در اصل دماغ رکا تھا۔ سوچ یہ تھا کہ آخر میں یہ کیا کر رہی ہوں۔ کیا واقعی میں گھر سے نکل جاؤں گی۔ کیا آدمی واقعی گھر سے نکل سکتا ہے۔ میں جب کبھی اس قسم کی لغو حرکتیں کرنی ہوں کرنا چاہتی ہوں کوئی اندرونی طاقت میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتی ہے ــــ شاید یہ میری مرحوم ماں کی روح ہو۔ اور جھنجھلا کر کہتی ہے "احمق تو نہیں ہو گئی ہے؟"

چنانچہ کچھ حیلہ کر کے باہر آئی اور مختصر یہ کہ قدیم اور جدید میں عارضی صلح ہو گئی۔ ناشتہ کا بقیہ حصہ ختم کیا۔

اب میں سوچ رہی تھی کہ اگر آج میرا انتقال ہو جائے تو میری لاش کیسی خوبصورت معلوم ہوگی۔ کسی کھلی۔ جیسے ابھی نہا کر سوئی ہوں۔

کاش ابنِ آدم تم اس وقت حوّا کی اُس بیٹی کے پاس ہوتے جو تمہیں بُلا رہی ہے۔ ہزار میل ادھر۔

پیر کا دن، رات کے ساڑھے نو بجے

آج صبح تمہارے تین خط اور حلوے کی ایک پلیٹ نپٹکنف خاموشی کے ساتھ میرے سامنے کھسکا دی گئی۔ چچا کن انکھیوں سے میرا ردّ عمل دیکھ رہے تھے۔ میں نے تمہارے تین خط ایک طرف اٹھا کر رکھ دیئے۔ پہلے حلوے کی پلیٹ پر ہاتھ مارا۔ کیونکہ دونوں کی طرف بیک وقت متوجہ ہو کر میں تمہاری ہتک کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اور چونکہ بھوک غالب تھی اس لئے اوّل طعام کے مصداق پہلے حلوے سے رجوع کیا۔ یہ چیز میرے چچا کے لئے ذرا عجیب تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ کس کے خط میں پہلے پڑھ لوں گی اور بعد میں ناشتہ کروں گی۔ مگر چچا کو کیا معلوم ہے ہم "ترقی پسند" کس قدر افادیت پرست ہوتے ہیں۔

گھر میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرہ چاروں طرف سے بند کر لیا اور تم سے باتیں کرنے لگی۔

اس آدم ——— پورا ایک ہفتہ ہو گیا مجھے یہاں آئے ہوئے۔ آج بری طرح گھر کی یاد نے ستایا۔ دلی بہت یاد آئی۔ سواد رومۃ الکبریٰ میں اقبال کو بھی جب یاد آئی تھی۔

اف یہ شہر۔ الٰہی توبہ۔ ہر دم بارش۔ جب دیکھو کپڑے گیلے۔ سڑکیں نم آلود۔ لوگوں کے چہرے بیگانگی سے متوحش۔ ہر شخص اپنی دھن میں چلا جاتا ہے۔ جیسے دیکھو روپیہ پیدا کرنے کے سوا اسے یہاں کسی اور چیز کی سُدھ ہی نہیں۔ پہلی بار جب میں یہاں اسٹیشن پر نکلی تو عجیب گھٹن محسوس کی۔ لاکھوں انسانوں کے سمندر میں ایک قطرہ کی مانند۔ ایک سمندر انسانی دلدلوں کا اس میں ایک بہت چھوٹی سی بات سمیٹ رکھی۔

آج میں اپنے کام پر روانہ ہوئی۔ فلم کمپنیوں کے پتے معلوم تھے ہی۔ ایک جگہ طبع آزمائی کیلئے گئی۔ قسمت آزمائی کیلئے پھر بھی جاؤں گی۔

اس کمپنی کے پروڈیوسر صاحب کے کمرے کے سامنے ایک برآمدہ تھا جس میں کلرک بیٹھے تھے۔ مجھے بڑے تپاک سے بٹھایا گیا۔ ان کلرکوں کے چہرے کہہ رہے تھے کہ تم اکیلی کیسی ہو۔ ایک کلرک تو منہ پر کہہ رہا تھا "کسی کام کی نہیں ہے۔"

میرے خیال میں اس کا خیال زیادہ درست تھا۔ ایک اور کلرک نے بتایا کہ بغیر وقت مقرر کئے پروڈیوسر صاحب سے ملنا نہیں ہو سکتا۔ ملاقاتیوں کی ایک برات سی بیٹھی ہوئی تھی۔ مرد بھی اور عورتیں بھی۔ عورتوں کے چہرے مصنوعات حسن کے عجائب خانے تھے۔ مردوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میرے نزدیک ان میں سے کوئی بھی مقبول فلم اسٹار بننے کے لائق نہ تھا۔ کسی کو "آرٹ" اور "فضا" سے دلچسپی نہ تھی۔ ہر ایک یہ بات کہہ رہا تھا کہ ایک دفعہ فلم میں داخل ہونے کا موقع مل جائے خواہ کیسا ہی پارٹ دیا جائے۔

میں ایک ایک کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ کاش کوئی مجھ سے پوچھتا کہ میں یہاں کس تقریب میں آئی ہوں۔ مگر کسی نے نہیں پوچھا۔

"خود پسندی خدا بن جائے ——" (اتنے تالیاں)

ایک کلرک آیا۔ اور اس نے ایک ایک "ہونے والے اسٹار" کو اندر داخل کرنا شروع کیا۔ ایک صاحب باہر نکلے تو سرخ انگارہ تھے۔ ایک صاحبزادی اندر سے حد سے زیادہ ہنستی ہوئی نکلیں۔ ایک دو کے علاوہ جس قدر بھی آدمی اندر سے باہر دھکیلے گئے کسی کے چہرے پر کوئی جذبہ یا تاثر نہ تھا۔ جیسے کورے گئے تھے ویسے ہی باہر آ گئے۔

جب میں نے دیکھا کہ اب میری باری آنے ہی والی ہے میں جھٹ کرسی سے اٹھی اور کلرک سے "رومال کہیں گم کر دیا ہے" کا بہانہ کر کے باہر جھپٹی۔ دوسری سیڑھی پر رکھ کر بھاگی۔ سڑک پر آ کر دم لیا۔ میں اس وقت ایسی بھاگی جیسے شیر پھاڑ کھانے کیلئے میرے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ "بہادر لڑکی!"

سچ تو یہ ہے آدم زاد! بات یہ ہے کہ میں اس ذلت کو برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی۔ خیر کوئی بات نہیں ہے۔ میں اپنے خیالی اسٹوڈیو میں بیٹھی ہوں۔ سمجھو اسے سمجھنے کیلئے میں نے کمرہ بند کر رکھا ہے۔ تم ایک کمرے میں دبکے بیٹھے ہو۔ میں بھی کوئی گمبھیر افسانہ سنا رہی ہوں۔ کبھی کبھی ہیروں کو اکٹھا کرنے کیلئے ہمارا ذہن ایسے پیر گھسا دیتی ہوں۔ اور تم محبت سے کہتے ہو وہ عرب کے اونٹ کی کہانی یاد ہے جس نے میزبان کے جذبہ سے متاثر ہو کر اونٹ کو اپنی گردن خیمہ میں داخل کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اور اس کہانی کا انجام بھی معلوم ہے۔ تم بس ذرا جھلا کے بیٹھ پڑے ہو۔ اتنے میں رات کے گیارہ بجتے ہیں۔ تم کہتے ہو چلو اب چل کر سوئیں۔ ہندستان کی اداکاری اور فلمی افسانہ نگاری کو بالائے طاق رکھ کر ہم سو جاتے ہیں۔

(بنت حوا)

بڈھے سندرہ صفحے بھی لکھے تھے کہ تمہارا خط آیا۔ اس کے بھی پندرہ صفحے تھے۔ اور میری تحریر کی طرح ایک دم لغو۔ بالکل لغو۔ ہم دونوں اس قدر لغو پسند کیوں ہیں۔ آخر ایسی بھی کیا ہم خیالی۔ مگر بات یہ ہے کہ تم ہی جیسے دماغ ایسی بلند لغویتیں ایجاد کر سکتے تھے۔ بقراط کتنی جلدی مر گیا۔ اگر زندہ ہوتا تو ہمارے دماغوں سے کچھ فائدہ ہی اٹھا لیتا۔

اصل میں بات یہ ہے کہ ہم میاں ہی بہت قائل ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد یہ خط لکھ رہی ہوں تاکہ فکر کی خاموشی اور کچے کیلوں کے سالن سے پیدا ہونے والی "طمانیت قلب" میری تحریر میں "اسٹائل" پیدا کر سکے۔

کل میں نے اپنا کام شروع کر دیا یعنی اپنے سے

بہت زیادہ امیر آدمیوں کی نفسیات کا مطالعہ۔ چنانچہ کل میں ایک خاندان سے ملنے گئی تھی جنھیں اس شہر میں اونچا درجہ حاصل ہے۔ فرض کرلو ان کا نام جمیلی تھا۔ بیگم جمیلی اور ان کی دونوں لڑکیاں بڑی مہربانی سے پیش آئیں۔ بالخصوص یہ جان کر کہ ہم لوگ ان کی نسبت کہیں غریب ہیں۔

اس گھر میں دو لڑکیاں ہیں۔ عشرت اور فرحت ان کے نام سمجھو۔ دونوں اچھی لڑکیاں ہیں۔ اعلیٰ پوشاک، اعلیٰ تعلیم، خاصی معقول تربیت، بہت عمدہ ساڑیاں باندھ سکتی ہیں۔ بولنے کا بھی سلیقہ ہے۔ بڑی لڑکی کی شادی ہوچکی ہے۔ ایک بہت ہی امیر آدمی سے شادی کی ہے۔ چاندی سے (یاد رہے چاندی تک نہیں!) غریبوں کیلئے محتاج خانے جاری کرنے کی ایک سکیم کا خاکہ انھیں ازبر یاد ہے۔ ان کے پانچ بچے ہیں۔ پانچ ہشاش بشاش بچے — اچھی لڑکی ہونے کا آخری انعام قدرت یوں دیدیتی ہے۔ ایک ہم ہیں۔ اور ایک وہ ہیں جنھیں اصولوں ہی تصویریں سا آتی ہیں۔ ایک جوڑ پانچ جیسے "آدم کی کتاب" سے ہو بہو نقل مطابق اصل!

بعض دفعہ میں سوچتی ہوں گھریلو زندگی میں آخر ہرج ہی کیا ہے۔ مگر گھریلو زندگی کے سکھ کیلئے عورت جو قیمت دیتی ہے کیا وہ کچھ نفع کا سودا ہے؟

کیا عشرت بھی سوچتی ہے کہ میں نے کیا پایا اور کیا کھویا۔ کبھی کبھی آدمی کو ماننا پڑتا ہے۔ بہت سی اچھا لڑکا! اچھی لڑکی سے رہنے سے ان کا جی نہیں اکتاتا۔ مگر میں بھی عجیب لڑکی ہوں — طوفان میں کبھی ادھر جا پڑتی ہوں کبھی ادھر۔ ایک نئی دنیا میں ہے ایک پرانی دنیا میں۔ مگر کس قدر پرجوش ہے۔

ہاں تو میں کیا ذکر کر رہی تھی۔

میں ان لوگوں سے ملنے گئی تھی۔ بڑی گرمجوشی سے ملے۔ اصل میں میرا استقبال اس اہتمام سے یوں کیا گیا تھا کہ ایک "مرد" بھی اس پارٹی میں جلد آنے والا تھا۔ اور یہ سب اس کی آمد کیلئے "فضائے بعید" تیار کرنے کی ذیل میں تھا۔ یہ مرد بھی امیر تھا۔ اور کوشش کی جا رہی تھی کہ مس فرحت سے وہ سلسلہ مناکحت پیدا کرلے۔

چنانچہ — چنانچہ کی داد چاہوں گی۔ ابن آدم! — چنانچہ مس فرحت نے آج اپنے بالوں کو بجلی کی جدید ترین مشین سے "لہریا" گیا تھا۔ بہت خوبصورت ساڑی زیب تن تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ مس فرحت مجھے سب سے زیادہ پسند آئی ہیں۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی۔ ہونی ہی چاہیئے تھی۔ مجھے مزید عزت بخشنے کے لئے انھوں نے اپنی دستخطوں والی کتاب نکالی جس پر سونے کے حروف سے ان کا نام کندہ ہے۔

دستخطوں کی بیماری بھی بڑی پرانی ہے۔ اس کتاب میں بڑے بڑے آدمیوں کے دستخط اور ان کے لکھے ہوئے فقرے یا اشعار وغیرہ تھے۔ مجھ سے کہنے لگیں "آپ بھی اس میں کچھ لکھ دیجئے"۔ میرا دماغ اس وقت نہ جانے کس نامعلوم آرزو میں کلبلا رہا تھا۔ بہتیرا سوچا کہ کوئی شعر یاد آجائے مگر شعر دلیسپ کہاں یاد آتا۔

آخرکار حالیؔ نے مدد کی۔ یہ شعر لکھ دیا ؎

"اے ماؤں، بہنو، بیٹیو،
دُنیا کی عزت تم سے ہے!"

دو ایک صفحے پلٹ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک دو اور دستخط کاروں نے بھی اس ہی قسم کے اشعار قلم بند کئے ہیں۔ خدا جانے مظلوم بندوں کی اس ہی طرح مدد کرتا ہے۔ حالیؔ جیسے لوگ اس وقت میری مدد کو پہنچے۔ تیری روح سکون سے رہے۔

لو وہ آگیا۔ میرا مطلب ہے وہ مرد آگیا۔ ایک اور "ابن آدم"۔ مگر دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ میں سمجھتی تھی کوئی توانا کھلا ہوا انسان ہوگا۔ مگر نہ تو میں ہی۔ سوئے کا ساگ جیسا آدمی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کسی ناٹک کا مسخرا ہے۔ میں سمجھ گئی کہ اس قسم کے شوہروں کی ان کی دولتوں کی وجہ سے بڑی مانگ ہے کیونکہ انھیں احمق بنانا آسان رہتا ہے۔

میں نے اس شخص کی بابت تفصیل سے یوں عرض ہے کہ آتے ہی اس نے ایک غلطی کی۔ اور وہ غلطی یہ تھی کہ بجائے مس فرحت کی طرف مائل ہونے کے جھٹ میری طرف ڈھلک گیا میں نے مسز جمیلی کی کڑی نگاہوں کے باوجود اُسے اس قدر اُلو بنایا کہ عرصہ تک یاد کرکے روتا رہے گا۔

تم جل گئے؟ ارے جلتے کیوں نہیں۔ خدا کیلئے جل مرو، مردوں کو اور آتا ہی کیا ہے۔ جنسی جلن بھی خدا کیا کمال کی چیز بنائی ہے۔

جب وہ چلا گیا تو میں پھر سب مرنجان مرنج اور بھلی بن گئی۔ پرانے سبق پھر یاد آنے لگے۔ یعنی اگر کسی نے کو

بات کی تو اس کا جواب دے دیا۔ ورنہ خاموشی بہترین پالیسی ہے
میں فرصت کے کئی سوالوں کا جواب جلد ہی جلدی دیا۔
میں نے اس سے پہلے کوئی لمبا سفر نہیں کیا تھا
میں کبھی علم ایڈفلس سے نہیں ملی۔ مجھے کبھی کسی
نے نہیں چوما! (؟)
اگلے ہفتے ہم میرے چچا وغیرہ سب سمندر کے کنارے
کسی پرفضا مقام پر جائیں گے۔ اور چند دن وہاں گذاریں گے۔
میں چاہتی ہوں کہ ـــ
میرا خیال ہے کہ ـــ

(ست حوّا)

جمعرات (دوپہر)

سمندر کے کنارے لکھے گئے بڑی مشکل سے جان چھڑا کر بھاگی ہوں۔ تنہائی ملتی ہی نہیں شرمئی رنگ کی صبح ہے۔ معلوم نہیں لوگ صبح کو سفید کیوں کہتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آج ایسی صبح ہوئی ہے کہ کسی افسانہ کی ہیروئن "کمرہ سے نکل کر معطر و مسرور فضا میں سانس لینے کیلئے سمندر کے سپ پر مستِ خرام" ہو سکتی تھی۔ مگر افسوس یہ ہے کہ نہ میں کسی افسانہ کی ہیروئن ہوں نہ یہاں کی فضا معطر و معنبر ہے۔ البتہ ایک سی سادی سمندری فضا ہے۔ اور خدا نے سمندر کو جیسا سادہ ماہے اپنے طرز کے مطابق دنیا کو دکھ شکھ پہنچانے کی سعی کرتا رہتا ہے۔

اے آدم جانتے ہو میرا اس وقت کیا جی چاہ رہا ہے۔ بس یہ چاہتی ہوں کہ تم بھی یہاں ہوتے۔ سمندر تم نے آج تک نہیں دیکھا ـــ پہاڑ اور صحرا بھی تو تم نے نہیں دیکھے ـــ خیر سمندر تو دیکھ لیتے۔ اور جب کوئی فلمی کہانی بیندرہ ہزار کی مک جاتی تو تم پہاڑ پر بھی چلے جاتے ـــ کاش تم یہاں ہوتے، پھر ہم دونوں سمندر میں نہاتے۔

تم کیا سمندر میں نہا سکتے ہو۔ آج تک دیکھا تک نہیں، خیر یہ جی چاہ رہا ہے اور جی چاہے میں منطق بیچ میں بولنے والی فقطمہ کون ہوتی ہے ـــ! خیر کاش تم یہاں ہوتے۔ ہم سمندر میں نہاتے میں باہر نکل کر بال خشک کرتی۔ تم گھونگے جمع کرتے۔ تھک کر چُور ہو جاتے اور دوپہر کو کھانے کے وقت جب سمندر کی تلی ہوئی مچھلی کھانے کو ملتی تو خدا کا شکر ادا کرتے اور ملحدانہ خیالات ترک کرنے کیلئے خدا کی قسم کھانے۔ کیا تعریف کی جائے۔ اس خدا کی جس نے تلی ہوئی مچھلی کا ذائقہ آدم کو سکھایا۔ اب بھی تم اس کے وجود سے انکار کئے جاؤ تو جاؤ سمندر میں۔

تو پھر ایک دفعہ ایسی ایک بک رہے۔ اصلی سمندر کے کنارے ... نہیں کہ بس میں بیٹھ کر او کھلے ہو آئے اور سمجھ گئے کہ پانی کا کنارہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

اچھا اس دن کے دھندوں میں پھنسنے کا وقت قریب آ رہا ہے۔ اس لئے خدا حافظ!

خوابوں کے جزیرے میں رہنے والے آدم زاد،
خدا حافظ!

(ست حوّا)

مکرّر جس جگہ میں بیٹھی ہوں وہاں ایک ٹوٹی ہوئی کشتی پڑی ہے میں نے اُسے قریب سے جا کر دیکھا۔ پہلے اس پر "روزی" لکھا ہوا تھا۔ پھر روغن کر کے اس کو "جاسمین" کا خطاب دے دیا گیا کلاس ہو یا جیسلی۔ لوگ سونگھ کر دونوں کو پھینک دیتے ہیں۔ مردانی دوا کا یہ نمونہ بھی قابلِ داد تھا۔ جب تک "روزی" دماغ پر حاوی رہی کشتی بھی اسی سے منسوب رہی۔ جب اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی تو "جاسمین" کا لقب دیا گیا ـــ اور پھر بیرہ مانے کے سمندر کی لہروں کے آگے بول گئی۔ اب ٹوٹی پڑی ہے خدا کرے "روزی" اب اچھی حالت میں ہو اور "جاسمین" کو بھی کوئی اچھا ملاح مل گیا ہو۔

میں اس قدر جذباتی کیوں ہوتی جا رہی ہوں ـــ اچھا ہاں ٹھیک ہے۔ اب نہری رہاں سدسو جانی چاہئے۔ بہت تھکی رہتی ہوں۔ تو نہیں تو بہ سمندر آگئی ـــ!

(ست حوّا)

ہفتہ کی رات آج کی رات تم یہاں کیوں نہیں ہو؟ اختر الایمان کہتا ہے "آج کی رات ذکر تم مت کر"۔ مگر ایسے نہیں ہو سکتا۔ میرے کمرے میں اس وقت بیس ہزار رباعیوں سے بھی زیادہ بافنوں نے دھاوا بول رکھا ہے۔ نیند نہیں آتی۔ رات کو نہیں آتی۔ اور یوں نہیں آتی کہ دُ ساہیں کچھ زیادہ اور "تم" کم ہو۔

سُنا ہے کسی جنگل میں ایک شہزادی جوگن بنی ہوئی رہتی تھی۔ ایک جوگی آیا اس نے اسے ہمیشہ کیلئے نیند کا ماتا بنا دیا۔

مگر ایک روز "پری کنڈل" قائم ہوا۔ سبزہ پریاں اس منڈل میں آکر ناچنے لگیں۔ تیرھویں پری کی نظر اس جوگن شہزادی پر پڑی۔ اور وہ جادو کے زور سے آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو گئی۔ اور آج تک اس کی آنکھ نہیں جھپکی ہے۔ ہر دم ٹکٹکی باندھے اپنے شہزادے کے آنے کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ کاش مجھے بھی کوئی جوگی ایسی ہی نیند سُلا دے یا تیرھویں پری مجھے خواب بیداری سے جگا دے۔

ہوا بہت تیز چل رہی ہے۔ نیچے کی منزل میں کوئی شخص رباب بجا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ رباب کے تار پر اپنا دل رکھ کر دو ٹکڑے کر دے گا۔

— تم یہاں کیوں نہیں ہو۔ خواہ مستقبل کچھ بھی ہو درخشاں یا تاریک، تمہیں میرے پاس ہونا ہی چاہیئے۔

کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے قسم کی منازل ہم بہت گذار چکے ہیں۔ اب کچھ کام کی باتیں کرنی چاہئیں۔ مصمم ارادہ کر لو اور یہاں آجاؤ۔ مگر اپنی کشتیاں جلا کر آنا۔

تمہارا خط میرے پاس رکھا ہے اس میں تم لکھتے ہو — "مجھے تم سے محبت ہے" لیکن آخر اس جملہ کا مطلب کیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی۔ میں تو سمجھتی ہوں سفید کاغذ پر روشنائی کے نشانوں کے سوا اس فقرے کا اور کوئی مطلب نہیں ہے۔

آج کی رات تم یہاں کیوں نہیں ہو؟

اگر میں تمہاری طرح مرد ہوتی تو اس ہی وقت کوٹ وٹ پہن کر باہر نکلتی۔ ہر چیز کو بھول کر۔ ہر بات سے بے پروا ہو کر اور خوب لطف حاصل کرتی — شہر کی نیم روشن سڑکوں پر بلا وجہ گھومتی پھرتی۔ کسی بڑی عمارت میں داخل ہو کر پوچھتی۔ یہ ہوٹل تو نہیں ہے وہاں سے نکالی جاتی۔ اور کسی ہوٹل میں پہنچ کر پوچھتی۔ یہاں مالوجی جی تو ٹھہرے ہوئے نہیں ہیں۔ غرض عجب عجب قسم کے پاگل پن کرتی پھرتی — خوب پھرتی، خوب ہنستی — تھوڑی سی پی بھی لیتی — مرد کہتے ہیں پینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ مگر میں مرد کہاں ہوں — ایک عورت ہوں — محض عورت اور وہ بھی ابھی شروع ہوئی ہوں۔ ابھی پوری طرح ہونے نہیں پائی ہوں — اور آج کی رات میں بہت اچھی معلوم ہو رہی ہوں — مگر کوئی بھی تو دیکھنے والا نہیں ہے۔

کمرہ گرم ہے، بہت گرم۔ شاید یہ سارے وسواس اِلتماس جو اس وقت میرے دل میں آ رہے ہیں سب بند اور گرم کمرے کا نتیجہ ہیں۔ شاید ایک آدھ مچھر بھی میری بے محل بیباکی کو بڑھانے والا ہو۔

ابنِ آدم، میں اس وقت اپنے آپ سے ڈر رہی ہوں — مجھے اپنے نزدیک اور نزدیک کھینچ لو۔ کیونکہ اس ساری تاریک دُنیا میں تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہے جو مجھے سمجھ سکے — مگر تم یہاں نہیں ہو۔

شب بخیر!

(بنتِ حوّا)

(یہ خط بنت حوّا نے نہیں بھیجا۔ وہ جو ایک چیز اس کے امتحان میں تھی اور ایسے موقعوں پر کہدیا کرتی تھی "احمق مت ہو"، شاید اس نے کہا ہوگا۔ یہ خط بھیجنے کا نہیں ہے اس لئے نہیں بھیجا گیا۔)

اتوار ابنِ آدم میں نے تمہیں کل رات ایک بہت وحشیانہ خط لکھا تھا۔ مگر ڈاک میں نہیں ڈالا۔

کیوں۔ تمہیں رنج ہوا؟

میرا خیال ہے تم اسے پڑھ کر مزا لیتے۔ میں کہتی ہوں — خیر۔ میں کچھ کہنا نہیں چاہتی کہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ جب تک دُنیا میں ملکہ وکٹوریہ مرحومہ کے اسٹیچو لفلب ہیں نیکی برباد نہیں ہو سکتی۔

تو پھر زمین ہلی نہ زلزلہ آیا۔ نہیں کوئی ملٹری وھیکل گذری ہے۔ میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں۔ رات کا بڑا حصّہ جاگتے میں گذرا اس لئے نیند آ رہی ہے۔

اور ہاں خوب یاد آیا تم یہاں کب آ رہے ہو؟

(بنتِ حوّا)

ابن آدم پتہ نہیں، تمہیں بتاؤ میری زندگی کا حاصل کیا ہے۔

پیر میں فلم یا اسٹیج کے مطلب کی نہیں ہوں۔ یہاں دُنیا اور ہے یہاں تو وہ آدمی جی سکتا ہے جو شیکسپئر کے *As you like it* کے عنوان سے جینا پسند کرے۔ اس میں شک نہیں کہ مجھے بوہمین طرزِ زندگی پسند ہے۔ تم ایکٹر ہو۔ میں ایکٹریس بنوں۔ تم کہانی لکھو میں اسے منتقل کر دوں۔ مگر یہ سب باتیں کھیل کی حد تک تو ٹھیک ہیں۔ میں تو زندگی سے بھاگنا چاہتی ہوں۔ آگے بہت گڑھے ہیں۔ بہت سی جنبشیں ہیں جو اگر پیر ڈھیلے کر دینگے۔ میں بزدل ہوں اور حقیقت کی شکل دیکھتے ہی دُم دبا کر بھاگنے پر تُلی رہتی ہوں۔

کاش مجھ میں وہ شے ہوتی جسے "مالعہ کی قوت ادراک"

کہتے ہیں۔ مگر مجھ میں وہ چیز ہی نہیں ہے۔ خواہ مخواہ (Intellectual) سی ہوئی ہوں۔

مسز جمیلی اور ان کی ساتھیاں سب عمدہ سماجی اسباط ہیں۔ جس پر دو چار بار یاں دل کھول کر کھلی جا سکتی ہیں۔ مگر وہ لوگ اس قدر اونچا اڑتے ہیں کہ یہاں طاقتِ پرواز نہیں۔ اور وہ اس قدر اونچے اٹھ چکے ہیں کہ نیچے اُترنے سے پر جلتے ہیں۔ میرے سٹوڈیو میں بھی روپئے ہی روپے ہوتے اور وہ ایک سے ایک فضول کا عدد سے لبریز ہو مالوم ہی یہاں کی مجلس زندگی کا ستارہ بن سکتی تھی۔ یہاں اپنے کالج کی بہت سی لڑکیاں ملیں مگر کسی نے رُخ دیکر بات نہیں کی۔ ہر لڑکی کو کسی نہ کسی "سوشل" میں جانا ہوتا ہے کوئی نہ کوئی سی تحریک ملک میں پیدا ہی ہوتی رہتی ہے۔ ان سب کو چلانے کا بار ان تعلیم یافتہ امیر گھرانے کی لڑکیوں کے سر ہے۔ ورنہ تہذیب ہندستان کہیں کا نہ رہے۔ ایک اعلیٰ درجہ کا سا ہو کا لڑکا مجھے بھی مل جائے تو میں بھی باہر کھدر پہن کر "جے ہند، جے ہند" پکارتی پھروں۔

اور پھر ستم یہ ہے کہ تم دُور ہو!

میں چاہتی ہوں۔ میرا خیال ہے۔ میرے سارے خط اسی قسم کے جملوں سے پُر نظر آتے ہوں گے۔ دراصل میرا مطلب یہ ہے کہ میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ جو کرنا چاہتی ہوں میں ستار نعرے میرے بس کی بات نہیں۔ یہ احساس جو کچھ دیکھ بھال کر پایا ہے۔ مگر دُنیا دو الگ الگ حصّوں میں بٹی ہوئی ہے۔ میں اس مشین کا پُرزہ بننا چاہتی ہوں جسے کارگاہ زندگی سمجھتے ہیں۔ میں اس مشین کے ہر حرکت کے ساتھ نبض کی طرح دھڑکنا چاہتی ہوں میں ادب اور آرٹ کی دُنیا میں کچھ بننا چاہتی ہوں۔ بڑے بڑے دماغوں سے کُشتی لڑنے کی فکر میں ہوں۔ بڑے۔ بہت بڑے انقلابی دستور آئین کو سمجھنا چاہتی ہوں۔ چاہتی ہوں کہ میرے گرد مصوّر، شاعروں، سائنس والوں، آرٹسٹوں، مصوّروں، نوجوان ترقی پرست ذہنوں کا ہجوم ہو۔

ایسے لوگ جو زندگی سے گُتھ جانے کیلئے بے صبرے پڑتے ہوں جو چند ہزار روپئے کی تنخواہ پانے کے باوجود انسان اور دوست رہنے میں تکلف نہ کرتے ہوں!

ہاں تم نے یہ خوب لکھا کہ ہم دونوں کے درمیان ایک بند دروازہ حائل ہے۔ ہاں ہے۔ مگر دونوں جھرّیوں میں سے جھانک کر ایک دوسرے کو دیکھ لو رہے ہیں۔ کبھی کبھی روشنی ہوتی ہے تو ایک دوسرے کے خد و خال اچھی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ مگر زیادہ تر "جے ہند" کا دھواں چھایا رہتا ہے۔ اور یہ دُھند چھٹ جائے تو زندگی کو اس کے صحیح نقش و نگار میں دیکھنے کا لطف آئے۔ خیر فکر نہ کرو۔ ایک روز یہ دروازہ خود بخود کھل جائیگا۔

"آجکل کی لڑکی" یہ ہے میرا عنوان۔

عجیب شے ہے۔ آج کی لڑکی۔ زمین آسمان کے قلابے ملانے میں طاق منطق پر حاوی۔ فلسفہ سے آشنا۔ آرٹ کی گود میں کھلائی ہوئی سیاست کی روش پر کبھی کبھی چل نکلنے والی۔ دُنیا جہان کے اسرار معلوم کرنے۔ سوچ بچار۔ پڑھنے لکھنے۔ نظریوں سے گتھم گتھا کرنے کے بعد جب وہ میدان کارزار میں آتی ہے۔ میرا مطلب اور انجنیئر بن جانے یا پرہات پھیریوں میں شامل ہو جانے سے نہیں ہے۔ بلکہ اس سے ہے کہ جب فی الحقیقت اصلی لب گرم شعلہ ریز لب جب اس کے قریب آتے ہیں۔ زندگی جب اس سے "مُنہ زبانی امتحان" لینا چاہتی ہے۔ تلخ و شیریں حقیقتِ حیات جب ایک دفعہ ہی سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اس وقت میں میری تا ہی کی سب لڑکیاں ہی بدحواس ہو جاتی ہیں۔ ہم پھر شرمانے لجانے والی کنواری لڑکی بن جاتے ہیں۔ ہر چہرے سے معصومانہ بیخبری نمودار ہونے لگتی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ہم پھر وہ ہو جاتے ہیں جسے طنزاً 'Early Victorian' کہا گیا ہے۔

جدید ابن آدم اس تمام طلسم کو سمجھنے سے واقعی قاصر رہتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم جس قدر دوہری زندگی بسر کرتے ہیں، لڑکے اسے نہیں کہتے کاش ہم ستی ساوتری ہو جاتے یا ایک طرف کو فلم اسٹار بن کر ہی کوچے میں پڑ جاتے۔ مگر ایک قدم سٹوڈیو میں ایک قدم "جے ہند" کے مظاہرہ میں، دھڑ گھر میں۔ دماغ محنت زار میں۔ یہ نہیں سمجھ میں آتا۔ جب آدمی واقعی جذباتی ہو جائے "نعرۂ بے یقین" رکھنے لگے تو روح بوجھل رہنے لگتی ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ہم تہذیب کے عبوری دَور میں سے گذر رہے ہیں۔ یہی سبب ہے جو سینۂ آدم پر گراں ہے۔ اور اس بھول بھلیاں میں سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے آرٹ، ادب یا سیاست کا غیر جذباتی مطالعہ "جے ہند"، یا ساڑھے تین روپئے ماہوار مشاہرہ دونوں آدمی کو جذباتی بنا سکتے ہیں۔ مگر تمہارے سونے نے بھی حد کر دی ہے۔

مرے طویل خط نے تمہارے لئے لوری کا کام کیا ہے۔
لو دیکھو اسٹیج پر یہ کون لالہ پوش آیا۔ یہ قرمزی شگوفے کیا کہتے ہیں؟
یہ سب ہمارے خواب ہیں!
کاش میں آج کوئی خواب دیکھوں۔

(بنتِ حوّا)

میرا خیال ہے تم یہاں نہیں آؤ گے۔ میرا یقین ہے کہ تم پیدا ہی نہیں ہوئے۔ اچھا تو میں خود دلی آتی ہوں۔ امید ہے اس وقت تک تمہارا انزلہ "جے ہند" کا بخار اور کا مد کا کنٹرول ہلکا ہو جائے گا۔ مگر ہم دنیا میں کر بھی کیا سکتے ہیں۔ تم سُست، میں بُزدل! آؤ پھر نعرے ہی لگائیں — افلم میں نوکری مل جائے تو اچھا ورنہ "جے ہند" تو ہے ہی!

غزل

شعیب حزیں

جستجو محرومیوں سے معتبر ہوتی گئی
میری منزل خود چراغِ رہگذر ہوتی گئی

جس قدر بڑھتی گئیں قلب و نظر کی جرأتیں
زندگی مجبور تر محدود تر ہوتی گئی

شوق کو خود حیرتِ نظارہ بن جانا پڑا
بے سہارا ہر تمنائے نظر ہوتی گئی

پرورش پاتا رہا ترکِ تمنا کا خیال
ہر تمنا اک سعیِ معتبر ہوتی گئی

دل کچھ اس انداز سے دیتا رہا نظروں کا ساتھ
زندگی خود معنیٔ ذوقِ نظر ہوتی گئی

ہر نظر بنتی گئی شرحِ شکستِ آرزو
یہ کہانی رفتہ رفتہ مختصر ہوتی گئی

وہ کرم کرتے رہے اور میں حزیں بنتا گیا
شوق کی ایذا پسندی معتبر ہوتی گئی

ساقی بکڈپو کی مطبوعات

محبت اور نفرت مصنفہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری پی ایچ ڈی (علیگ)، ساہتیہ النکار۔ ڈی لٹ انسانی فطرت کے دو زبردست رُخ محبت اور نفرت۔ سولہ افسانوں کا مجموعہ قیمت دو روپیے۔

نئے فسانے یہ مجموعہ مسٹر کرشن چندر ایم۔ اے نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب ہندستان کے جدید افسانوی ادب کی تصویر ہے۔ اردو، ہندی، مرہٹی، گجراتی، تامل، تلگو، بنگالی، بہاری وغیرہ افسانہ نگاروں سے تیس بہترین نقوش اس میں شامل ہیں۔ جان لیمین کہتا ہے "انگریزی افسانہ زوال کی انتہائی پستیوں کی طرف جا رہا ہے" برعکس اس کے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندستانی افسانے پر اب بہار آ رہی ہے۔ یہ کتاب دو سال کی کاوش کے بعد مرتب ہوئی ہے۔ ضخامت ۴۲۵ صفحے۔ مجلد قیمت چار روپیے۔

گیت ہی گیت میراجی کے گیت دلآویزی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ایسے مدھر گیت آپ نے کبھی نہیں پڑھے ہوں گے۔ اس میں ہر قسم کے گیت ہیں۔ قیمت دو روپیے ۱۲؎

ساقی بکڈپو دہلی سے طلب فرمائیے

سعادت حسن منٹو

بی زمانی بیگم

زمین شق ہو رہی ہے۔ آسمان کانپ رہا ہے۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں ہے۔ آگ کے شعلوں میں دنیا اُبل رہی ہے زلزلے پر زلزلے آ رہے ہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے ؟

"تمھیں معلوم نہیں ؟"

"نہیں تو"

"لو سُنو۔ دُنیا بھر کو معلوم ہے"

"کیا ؟"

"وہی زمانی بیگم — وہ موئی چڈو"

"ہاں ہاں۔ کیا ہوا اُسے !"

"وہی جو ہوتا آیا ہے۔ لیکن اس عمر میں شرم نہیں آئی بدبخت کو"

"یہ بدبخت زمانی بیگم ہے کون ؟"

"ہائیں۔ وہی اسکندر کی ہوتی سوتی۔ موئی ٹکھیائی۔ چنگیز کے پاس رہی۔ ہلاکو کی داشتہ بنی۔ کچھ دن اس لنگڑے تیمور کے ساتھ مُنہ کالا کرتی رہی۔ وہاں سے نکلی تو نپولین کی بغل میں جا گھسی — اب یہ موا ہٹلر باقی رہ گیا تھا۔"

"تو کیا اب ہٹلر کے گھر ہے ؟"

"بوا گھر گھاٹ کیسا۔ بیاہ ہو سکتا ہے کبھی ایسی عورت کا"

"طلاق ہو گئی کیا ؟"

"تم کیسی باتیں کرتی ہو بُوا — طلاق تو وہاں ہو جو سہرے جلوؤں کی بیاہی ہو۔ اور پھر ایسے مردوں کا بھی کیا اعتبار رہے۔ دو دن مزے کئے اور چلو چھٹی"

"تو اب ہو کیا رہا ہے۔ یہ فضیحتہ کس بات کا"

"فضیحتہ کیا ہے۔ پورے دنوں سے ہے۔ بچہ پیدا ہونے والا ہے"

"تو ہو کیوں نہیں چکتا"

"ہاں سچ تو ہے کوئی پلوٹھی کا تو ہے نہیں"

"ڈاکٹر آ رہے ہیں۔ دیکھو آج یا کل ہو جائیگا"

ڈاکٹر آتے رہے لیکن بی زمانی کے بچہ پیدا نہ ہوا۔ درد کی لہروں میں اضافہ ہو گیا۔ لرزے اور زیادہ زور سے آنے لگے۔ شعلوں کی زبانیں اور زیادہ تیز ہو گئیں۔

ڈاکٹروں نے کانفرنس کی۔ حکمت کی ساری کتابیں چھانی گئیں۔ طے ہوا کہ حاملہ کو طہران لیجائیں۔ وہاں روس کے ماہر ڈاکٹر کو بلایا جائے اور اس سے مشورہ کیا جائے۔

طہران میں خاص طور پر جلدی جلدی ایک میٹرنٹی ہوم تیار کیا گیا۔ بی زمانی بیگم درد سے تڑپتی رہی اور دُنیا کے تین بڑے ڈاکٹر مشورہ کرتے رہے۔

ایک بولا "صاحبان۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہونے والا بچہ ہمارا نہیں لیکن انسانیت کے نام پر ہمیں مریضہ کو اس مشکل سے نجات دلانا ہی پڑے گی"

دوسرا بولا "ہم تینوں بڑے ڈاکٹر تین قسم کے طریقۂ علاج کے ماہر ہیں۔ سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایک طریقۂ علاج پر متفق ہوں — اگر ایسا ہو گیا تو بی زمانی بیگم کے بچہ پیدا ہونا کوئی مشکل نہیں"

تیسرا بولا "بالکل درست ہے۔ آئیے ہم فوراً یہ نیک کام شروع کر دیں"

تینوں طریقے ملا کر ایک اور طریقہ بنایا گیا جس پر تینوں ڈاکٹر متفق ہو گئے۔ دُنیا کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ مگر بی زمانی بیگم کے بچہ پیدا نہ ہوا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے — بچہ پیدا کیوں نہیں ہوا ابھی تک"

"بچہ تو پیدا ہو رہا تھا مگر اُسے روک دیا گیا ہے"

"کیوں ؟"

"ڈاکٹر سوچ رہے ہیں کہ اسے گود کون لے گا"

"ہوں !"

"تو فیصلہ کیا ہوا ؟"

"تم کیسی باتیں کرتی ہو بُوا۔ ایسے معاملوں کا اتنی جلدی فیصلہ کیسے ہوسکتا ہے۔ خیر چھوڑو اس قصّے کو۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائیگا۔ جس کے ہاں اولاد نہیں وہ غریب گود لے لیگا۔"

اولاد ہر ایک کے تھی۔ کسی کے ہاں چار بچّے تھے کسی کے ہاں پانچ اور کسی کے ہاں سات۔ اب فیصلہ کیسے ہو۔

ایک اور کانفرنس ہوئی۔ ڈمبارٹن اوکس میں ایک اور میٹرنٹی ہوم افراتفری میں بنایا گیا۔ تینوں بڑے ڈاکٹر وہاں جمع ہوئے۔ ہر ایک نے سوچا۔ ہر ایک نے معاملہ کی اہمیت سمجھنے کی کوشش کی۔

اور بی زمانی بیگم بستر پر پڑی درد سے کراہتی رہی۔

ایک بولا "صاحبان۔ ہم صاحبِ اولاد ہیں۔ اس بچّے کے وجود کے ہم ذمہ دار نہیں۔ لیکن انسانیت کا تقاضا ہے کہ ہم اس کی پیدائش میں ہر ممکن طریقے سے مدد کریں۔ آخر اس میں ہونیوالے بچّے کا کیا قصور ہے۔"

دوسرا بولا "ہم ڈاکٹر ہیں۔ ہمارا مذہب دوا ہے۔ ہم چاہیں تو اس ہونے والے ناخلف بچّے ہی کو جس سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں۔ ایک فرمانبردار۔ اطاعت شعار۔ آزادی پسند اور انسانیت دوست نوجوان بنا سکتے ہیں۔"

تیسرا بولا "بالکل درست ہے۔ اس بچّے کی پیدائش سے دُنیا کا ایک بہت بڑا بوجھ دُور ہو جائے گا۔ ہم ڈاکٹر ہیں۔ اپنے فرض سے ہمیں غافل نہیں رہنا چاہیئے۔"

طے ہو گیا۔ ایک دستاویز پر انگوٹھے لگا دئے گئے کہ ہونے والے بچّے کو یہ تینوں ڈاکٹر گود لیں گے۔ تینوں مل کر اسکی پرورش کریں گے۔ لیکن بی زمانی بیگم کی تکلیف پھر بھی رفع نہ ہوئی۔ وہ پڑی درد سے کراہتی رہی۔

"آخر یہ مصیبت کیا ہے ؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"قصّہ یہ ہے کہ بچّے کو گود لینے کا تو فیصلہ ہو گیا ہے لیکن اس بی زمانی کا بھی تو کچھ بندوبست ہونا چاہیئے۔"

"میں تو کہتی ہوں۔ سات جھاڑو اور حقّہ کا پانی۔"

"لعنت بھیجیں موئی حرّافہ پر۔"

"نہیں بوا۔ وہ سوچ رہے ہیں کہ یہ کم بخت کہیں کچھ ..."

"اوہ ..."

ایک اور کانفرنس ہوئی۔ تینوں بڑے ڈاکٹر ... ماریولسٹڈیم میں جمع ہوئے۔ جلدی جلدی ایک میٹرنٹی ہوم تیار کیا گیا۔ بی زمانی بیگم درد سے پیچ و تاب کھاتی رہی اور ادھر کانفرنس ہوتی رہی۔

"ایک بولا "صاحبان! دُنیا کی فلاح اور بہبودی کے لئے آج اس بات کا قطعی طور پر فیصلہ ہو جانا چاہیئے کہ بی زمانی ... کا یہ بچّہ اس کا آخری بچّہ ہو۔"

دوسرا بولا "دُنیا کے کتنے اس عورت کے لاتعداد حرامی بچّوں کو دودھ پلا پلا کر سوکھ گئے ہیں۔ اب ہمیں اس کو بانجھ کرنا ہی پڑے گا۔"

تیسرا بولا "بالکل درست ہے۔ ہونیوالے بچّے کی صحت اور تندرستی کا خیال رکھتے ہوئے بھی ہمیں ایسا کرنا ہی چاہیئے۔"

طے ہو گیا کہ بچّہ فوراً پیدا کیا جائے اور بی زمانی بیگم ... کے لئے بانجھ کر دیا جائے۔

عمل جراحی شروع ہوا۔ میٹرنٹی ہوم کے باہر دُنیا کی ساری قومیں جمع ہو گئیں۔ بہت دیر تک سنّاٹا چھایا رہا۔ اس کے بعد میٹرنٹی ہوم کا دروازہ پھٹ سے کھُلا۔ ایک سفید پوش نرس باہر نکلی اور اس نے اپنی باریک آواز میں اعلان کیا "مبارک ہو۔ بی زمانی بیگم کے بچّہ پیدا ہو گیا ہے۔ زچّہ اور بچّہ دونوں بیہوش ہیں۔"

دُنیا کی ساری قومیں فکر و تردّد میں غرق ہو گئیں۔ ایک بوڑھا لنگوٹی پہنے۔ کھانستا، کھنکارتا نرس کی طرف بڑھا۔ نرس نے پوچھا "تم کون ہو ؟"۔ بوڑھے نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور لرزاں آواز میں کہا "میرا نام ہندوستان ہے۔"

"اوہ۔ کیا چاہتے ہو تم۔"

"میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ لڑکا ہوا ہے یا لڑکی ؟"

دُنیا کی ساری قومیں بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

(اے۔ آئی۔ آر۔ بمبئی سے منشور)

جنازے
جب موت نے دنیا کے بڑے بڑے عاشقین کو دبوچا تو ان پر کیا گزری۔ منٹو نے دس مرثیے پیش کئے ہیں۔
قیمت ... ساقی بکڈپو دھلی سے طلب فرمائیے۔

از
سیف الدین سیف

مثنوی

مُسافر لوٹ جاتے ہیں خزاں میں!

بہار آئی لئے لمحوں کی رجبر
کہیں اس خطۂ جنت نشاں میں
تمنائے سیاحت دل میں لیکر
وہ تھا فطرت کے نظّاروں کا شیدا
اُسے تھا صرف شوقِ نغمہ خوانی
وہ اک دن سیر کرتا گنگناتا
کسی چشمے کی جانب جا رہا تھا
یکایک اس نے دیکھا سر اٹھا کر
خراماں تھی کوئی مستِ جوانی
تھرکتی جھولتی لہرا رہی تھی
دمادم کاکلیں بکھرا رہی تھی
رُکی، وادی نے دیکھا مست ہوکر
وہ اتری حیرتِ نظارہ بن کر
ہوا کی چھیڑ سے دامن بچاتی
شرابی لالہ زاروں سے گذرتی
مثالِ ابر بل کھاتی ہوئی سی
چلی جب ناز سے گاگر اٹھا کر
کچھ ایسی بیخودی سے گیت گائے
چھلک کر جب گرا گاگر سے پانی
چپک کر رہ گئی ساری بدن سے
مُسافر نے کہا اے رُوحِ کشمیر
کہاں سے آگئی تو اس دمن میں
ترے رُخ پر بہاروں کے نشاں ہیں
سپنے تسکینِ دل اتنا بتا دے
وہ دوشیزہ یہ سنکر مسکرائی
نہیں پردیسیوں سے کام اپنا

چہک اٹھا ترنم زار کشمیر
ہجومِ رنگ و بُو کے گلستاں میں
وہاں پہنچا کوئی تنہا مُسافر
گلوں کا اور کہساروں کا شیدا
سراپا نگہت تھی اس کی جوانی
زمیں کو عرش کے نغمے سُناتا
فضاؤں پر اندھیرا چھا رہا تھا
چناروں سے پرے پربت کے اوپر
سیہ زلفیں دوپٹہ سر پہ دھانی
شفق کی سُرخیاں دہکا رہی تھی
چھنا چھن پائلیں کھنکا رہی تھی
جھکی، پانی بھرا گاگر ڈبو کر
وہ اتری نکہتِ آوارہ بن کر
نظر سے آسمانوں کو جھکاتی
گلوں میں مستیاں تقسیم کرتی
وقارِ کوہ ٹھکراتی ہوئی سی
پہاڑی ندیوں نے دف بجا کر
صنوبر کے قدم بھی لڑکھڑائے
بدن سے پھوٹ کر نکلی جوانی
حیا سی آگئی اس بانکپن سے
مرے خلد آشنا خوابوں کی تعبیر
کلی بن کر کھلی ہے کیا چمن میں
شفق کی سُرخیاں لب پر عیاں ہیں
فقط نام و نشاں اپنا بتا دے
کہا ہنس کر بطرزِ دل ربائی
بھلا ہم کیوں بتائیں نام اپنا

یہ شوخی سے کہا اور مسکرا کر
مگر ناکام پردیسی مُسافر
وہیں شفاف چشمہ کے کنارے
پھر ایسی بانسری منہ سے لگائی
لپک تھی آگ کی نالوں میں جیسے
دبائے کاہش رحمِ جگر کو
مگر آئی نہ اس کو نیند شب بھر
ہوئے جب صبح کے آثار پیدا
زمیں شاداب تھی سبزہ ہرا تھا
گلوں نے عنبری آنچل اٹھا کر
مگر حیراں تھا اس کا دیدۂ تر
قریبِ شام چشمے کو سدھارا
وہی ابریشمی لب ہل رہے تھے
سنبھلتی، جھولتی، لہرا رہی تھی
دمادم کاکلیں بکھرا رہی تھی
دہن سے پھر تکلم کھل رہا تھا
مثالِ بوئے گل چشمے پہ آئی
اُفق کی تیرگی میں کھو گئی وہ
غم و اندوہ کو دل میں دبائے
وہ روزانہ یونہی چشمے پہ جاتا
مگر پہلی سی اب حالت کہاں تھی
سسکتی بانسری کی لے میں کھو کر
یونہی اک رات وہ بیتاب ہو کر
فروزاں چاندنی میں ساحرانہ
سُرودِ دلنواز کا مسکن تھی وادی
مگر وہ بانسری مُنہ سے لگائے

وہ رخصت ہوگئی گاگر اٹھا کر
غمِ اُلفت کی گہری چوٹ کھا کر
کھڑا تھا نرم شاخوں کے سہارے
عجب اک بیخودی میں دُھن بجائی
لگی ہو آگ ارمانوں میں جیسے
بوقتِ شام لوٹ آیا وہ گھر کو
بڑی مشکل سے کاٹی شب تڑپ کر
مُسافر سر جھکائے گھر سے نکلا
سُہانا دشت پھولوں سے بھرا تھا
بہارِ صبح دیکھی مسکرا کر
نہ دیکھا حُسنِ فطرت آنکھ اٹھا کر
نگاہوں نے وہی دیکھا نظارا
کہ وہ مبہوت غنچے کھل رہے تھے
شفق کی سُرخیاں دہکا رہی تھی
چھنا چھن پائلیں کھنکا رہی تھی
ترنم میں تبسم گھل رہا تھا
ہنسی پانی لیا گاگر اٹھائی
شفق کے ساتھ رخصت ہوگئی وہ
مُسافر لوٹ آیا سر جھکائے
زمیں کو عرش کے نغمے سُناتا
تبسم کی جگہ لب پر فغاں تھی
ترانے رہ گئے فریاد ہو کر
اُٹھا اور آ گیا پربت کے اوپر
سنایا سوزِ اُلفت کا ترانہ
حریفِ وادیٔ ایمن تھی وادی
کمالِ بیخودی میں سر جھکائے

تمناؤں کا ماتم کر رہا تھا
نظامِ دہر برہم کر رہا تھا
شکستِ شوق آتش زیرِ پا تھا
جنونِ نے نوازی چاہتا تھا
دکھے ہونٹوں پہ انگارے اچھالے
تڑپ کر سینۂ نے پھونک ڈالے
فغاں کو آہ میں تبدیل کرتے
فضا میں سسکیاں تحلیل کرتے
اٹھیں جب بیخود و مخمور تانیں
محبت بن گئیں سنگیں چٹانیں
رخِ گل سے شرارے پھوٹتے تھے
ستارے آسماں پر ٹوٹتے تھے
ہوائیں رک گئیں مدہوش ہو کر
فضائیں رہ گئیں خاموش ہو کر
بیک جاگ اٹھا وادی کا منظر
تبسم چھا گیا تابانیوں پر
ترنم بس گیا ہر ایک شے میں
ہوا گانے لگی مدہوش لے میں
ہوا سے مرمریں عنبر اڑایا
مسافر نے سنبھل کر سر اٹھایا
خوشا اے جذبۂ سوزِ نہانی
خوشا اے زخمۂ سازِ نہانی
جلو میں نکہتِ گل کی روانی
خراماں تھی وہی مستِ جوانی
سنبھل کر روکتی پائل کی چھن چھن
چلی آتی تھی وہ مسرور ناگن
پریشاں گیسوؤں میں برہمی تھی
سیہ آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی
قریب آ کر رکی وہ ہولے ہولے
ہنسی ہنس کر لبِ اعجاز کھولے
کہا اے بجلیاں برسانے والے
سکوتِ نیم شب میں گانے والے
بہت شعلے اچھالے بانسری سے
خدارا لب ہٹا لے بانسری سے
تمہاری حدتِ سوزِ فغاں سے
شرارے اڑ رہے ہیں قلب و جاں سے
مسافر نے کہا یہ خواب ہے کیا
مری آغوش میں مہتاب ہے کیا
نگاہوں کو یقیں آتا نہیں ہے
حقیقت ہے کہ خوابِ دل نشیں ہے
کوئی نغمہ پریشاں ہے کہ تم ہو
فریبِ چشمِ حیراں ہے کہ تم ہو
کہا دوشیزۂ بربط نوا نے
ہٹاؤ رنج و کلفت کے فسانے
چلو اگلی جفائیں بھول جاؤ
کوئی راحت فزا نغمہ سناؤ
ہواؤں نے شرابی گیت گائے
پہاڑی ندیوں نے دف بجائے
غزل خواں ہو گیا فطرت کا ہر ساز
بلندی سے گری جھرنے کی آواز
اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است
غرض جذب و وفا سے رفتہ رفتہ
ہوا رنگین امیدوں کا نقشہ
وہ باہم چاندنی راتوں میں مل کر
بنانے خلوتوں کو خلد منظر
جھکی وادیوں میں جھومتے وہ
خیاباں در خیاباں گھومتے وہ
ابھرتے یوں چٹانوں پر وہ تنہا
فضا میں جیسے جوڑا سارسوں کا
کبھی خاموشیوں کا ساز سنتے
شرابی خلوتوں میں خواب بنتے
جواں سینوں میں شعلے سے بھڑکتے
خموشی میں فقط دو دل دھڑکتے
چمکتی چاندنی میں دشت و کہسار
دمکتے لالہ رخ کلیوں کے رخسار

جوانی کے لبوں سے ہوک اٹھتی
گھنے پیڑوں میں کوئل کوک اٹھتی
کوئی طائر پروں کو پھڑپھڑاتا
طلسمِ خامشی کو توڑ جاتا
کبھی وہ بانسری منھ سے لگاتا
رسیلی مدھ بھری تانیں اڑاتا
ادھر وہ ساحرہ پربت کی رانی
برنگِ پیکرِ تصویرِ مانی
کچھ اس انداز سے نغمے سناتی
دھڑکتی پتھروں کی سرد چھاتی
وفاؤں کے علم لہرائے جاتے
جوانی کے ترانے گائے جاتے
حریمِ شوق میں آباد تھے وہ
غم و اندوہ سے آزاد تھے وہ
وہ رت ساری ملاقاتوں میں گذری
فروزاں چاندنی راتوں میں گذری
مگر دن آ گئے پھر سردیوں کے
چلے ٹھنڈی ہوا کے سرد جھونکے
گلستاں، گھاٹیاں، گلزار، گلبن
بگڑ کر بن گئے ماضی کے مدفن
لٹے غاروں کی ویرانی کے سائے
ہوا میں خشک پتے سرسرائے
برہنہ سرد اور سنسان کہسار
کسی اجڑی ہوئی بستی کے آثار
چلیں پچھم سے برفانی ہوائیں
ہوئیں پربت پہ یخ بستہ گھٹائیں
مسافر نے اسے خلوت میں اک روز
کہا اے نازنینِ حسنِ دل افروز
میں اب واپس وطن کو جا رہا ہوں
نہ ہونا تم مرے جانے سے محزوں
نہ ٹھہروں گا وہاں بے مدعا میں
بہار آنے کے ساتھ آ جاؤں گا میں
تڑپ کر رہ گئی سن کر وہ مہ رو
بھر آئے سرمگیں آنکھوں میں آنسو
کہا رو کر کہ اے امیدِ راحت
یہی ہونا تھا انجامِ محبت

نہ آیا تھا مرے وہم و گماں میں
مسافر لوٹ جاتے ہیں خزاں میں

نہ رو کے رک سکا لیکن مسافر
امیدوں کے حسیں سپنے دکھا کر
تڑپتا چھوڑ کر اس سیم تن کو
وہ آخر چل دیا اپنے وطن کو
اجڑ کر رہ گیا من کا شوالہ
اسیرِ دامِ غم تھی وہ غزالہ
سحر ویران شب ویران تر تھی
شبیہِ یاس تا حدِ نظر تھی
تلاشِ حسنِ ماضی میں کئی بار
وہ جا کر دیکھ آتی دشت و کہسار
ترائی میں بسانِ حیرت ساز
کسی پر سوختہ بلبل کی آواز
دلِ معصوم پر نشتر چلاتی
سلگ اٹھتی فضا کی سرد چھاتی
کبھی چپکے سے یہ اکثر آتے جاتے
اسے گذرے ہوئے دن یاد آتے
کبھی خلوت میں وہ آنسو بہاتی
کبھی وادی میں آ کر گنگناتی
"مرے محبوب جس دن سے گئے ہو
بہاریں ساتھ اپنے لے گئے ہو
ستاروں میں چمک باقی نہیں ہے
گلوں میں وہ مہک باقی نہیں ہے
قرارِ زندگی بن جاؤ، آ جاؤ
بہارِ زندگی بن جاؤ، آ جاؤ"
امیدوں نے دیا لیکن سہارا
خیالِ عیشِ ماضی نے ابھارا

خزاں نے رنگ بدلا آخر کار
زمیں پھر ڈھک گئی ہریالیوں سے
ہوا میں زمزمے شادابیوں کے
سیہ شاخوں نے لے لے کر ہلورے
حسیں وادی میں غنچے مسکرائے
مگر غم نے عجب نقشہ دکھایا
سحر کی روشنی جب مسکرائی
غضب کی کشمکش میں دن گذرتا
مگر جب پھیل جاتا تھا اندھیرا
عجب حادثہ معلوم ہوتی
غرض آئیں بہاریں بھی خزاں بھی
رہی گردش میں رادھے کی نیّا
ہوا میں رُک گئی ٹوٹا ہوا پھول
مگر کب تک وہ آخر رنج سہتی
وہ اب دیئے ٹمٹمانے کی روشنی میں
وہاں پر گھنے سائے ریتاں
تصور میں اداسی سو رہی تھی
اسے یاد آئی وہ پہلی ملاقات
تخیل سے پرے راگ اٹھے
قریبِ آرزو چھایا کچھ ایسا
کہ ظلمت ڈھل گئی نورِ قمر میں
تھپیڑے سرد برفانی ہوا کے
صدائیں جاگ اٹھیں شہنائیوں کی
گریں سبزے پہ شبنم کی پھواریں
ستاروں کے دریچے کھل رہے تھے
بڑھا حد سے طلسم ذوقِ دیدار
مثالِ ماہ رنگیں بادلوں میں

خوشی میں لہلہائے زعفراں زار
شگوفے پھوٹ نکلے ڈالیوں سے
فضا میں قافلے مرغابیوں کے
اچھالے سرخ پھولوں کے کٹورے
سیاحت کو ہزاروں لوگ آئے
وہ جس کی منتظر تھی وہ نہ آیا
امیدوں کی نئی بستی بسائی
نگاہوں میں سکوں مٹتا ابھرتا
تو امیدوں کا رشتہ ٹوٹ جاتا
اکیلی بیٹھ کر خلوت میں روتی
ہزاروں آئے شہری نوجواں بھی
نہ آیا بانسری والا کنھیا
غبارِ راہ میں بکھرا ہوا پھول
کہاں تک ناتواں متبد رہتی
گئی چشمے کی جانب بیخودی میں
سکوت آثار تھی شامِ زمستاں
خموشی گھاٹیوں میں رو رہی تھی
شباب و شعر میں ڈوبی ہوئی رات
تصور میں ترانے جاگ اٹھے
نظر نے دل کو بہکایا کچھ ایسا
نظر پہ چھا گئی ہر رہگذر میں
یکایک بن گئے جھونکے صبا کے
کہ جیسے گونج ہو شہنائیوں کی
اٹھیں انگڑائیاں لے کر بہاریں
شگوفے چاندنی میں ڈھل رہے تھے
گلستاں بن گیا دامانِ کہسار
تصور کے سنہری آنچلوں میں

میانِ کہکشاں تارا میں اڑتا
اٹھیں شوقِ ہم آغوشی کو باہیں
خیالوں میں کچھ ایسی کھو گئی وہ
سحر کے وقت کچھ لوگوں نے دیکھا
وہی شفاف چشمے کے کنارے
ہوئے محوِ ہستی میں فسانے
وہیں معصوم کی تربت بنائی
خزاں گذری بہار آئی پھر اک بار
بیا پر وہ میّت نے اٹھایا
گیا چشمے کی جانب وہ سرِ شام
وہاں اک تازہ تربت کا نشاں تھا
لئے بھیڑوں کا گلّہ اک گڈریا
مسافر نے کہا آہستگی سے
کہو تو یہ نئی تربت ہے کیسی
اٹھے پہلو سے آہوں کے بگولے
بہت حسرت زدہ صورت بنا کر
نظر میں برق بن کر یاس کوندی
خلا میں کھو گئیں بے بس نگاہیں
سلگتی بانسری پر بین کرتا
گھنیری ظلمتوں میں کھو گیا وہ

مسافر آ رہا تھا مسکراتا
مگر پتھرا گئیں بے بس نگاہیں
قضا کی نیند آخر سو گئی وہ
سراپا یخ ہوا تھا جسم اس کا
پڑا تھا زرد شاخوں کے سہارے
بہت رو دھو کے اسکے اقربا نے
کہ اس کی آخری خواہش یہی تھی
شہابی ہو گئے کلیوں کے رخسار
مسافر بھی وطن سے لوٹ آیا
نظر میں چھا گیا اک خوفِ گمنام
سکوتِ شام جس پر نوحہ خواں تھا
چلا جاتا تھا پگڈنڈی پہ تنہا
ٹھہر جا او ارے جانیوالے
یہاں کچھ سال پہلے تو نہیں تھی
گڈریا رک گیا بھیڑوں کو روکے
سنایا واقعہ نزدیک آ کر
قضا نے بے طرح امید روندی
سسک کر رہ گئیں سینہ میں آہیں
نشیبوں اور چٹانوں سے گذرتا
حسیں وادی سے رخصت ہو گیا وہ

زمانہ ہو چکا اس داستاں کو
مگر گاتا ہے گڈریوں کی زبانی
کہ اب بھی چاندنی راتوں میں اکثر
بہ رنگِ سایۂ گل جھومتے ہیں

کھلا بیٹھے ہیں لوگ اس نوجواں کو
سنی جاتی ہے یہ بھولی کہانی
گھنے جنگل سے دو سائے ابھر کر
سنہری وادیوں میں گھومتے ہیں

چھلک کر نیم شب کی خامشی سے
بکھر جاتے ہیں نغمے بانسری کے

میراجی کی نظمیں

اردو کے سب سے مشہور شاعر میراجی نے اب تک ہزاروں نظمیں لکھی ہیں۔ یہ ساٹھ نظمیں ان کا نچوڑ ہیں۔ یہ بالکل جدید طرز کی نظمیں ہیں۔ اس شاعر کو جدید شاعری کا امام سمجھا جاتا ہے۔ مجلد قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بک ڈپو، دہلی۔

اندیشے

ناہید عالم

اور مجھے یقین تھا کہ آپ عید پر ضرور آئیں گے۔ اس لئے میں نے بہترین لباس کا انتخاب کیا، وہ ہلکے آسمانی رنگ کا سوٹ جس پر بڑے بڑے پیازی اور ہلکے زرد رنگ کے پھول۔ آسمان پر کھلی ہوئی قوس قزح سے بھی زیادہ دلفریب دکھائی دیتے ہیں۔ آپ کے استقبال کیلئے میں نے چُنا۔ وہی — جسے پہنے دیکھ کر ایک مرتبہ آپ کی نگاہیں بے باکی سے مجھے دیکھنے کی بجائے جھکنے پر مجبور ہوگئی تھیں۔ اور آپکی جھکی جھکی آنکھیں کتنی خوبصورت لگتی ہیں۔ لانبی لانبی کانپتی ہوئی سیاہ پلکیں۔ ایک دوسرے سے مل جانے کے لئے، جیسے ہر وقت بیقرار رہتی ہوں۔ اور اُن کٹورا سی شفاف آنکھوں کے نیچے، ہلکے ہلکے بادامی سے حلقے — جنھیں آپ کے سرخ و سفید رنگ نے اور بھی واضح کر دیا ہے مجھے بیخود بنا دینے کے لئے کافی ہیں۔ اور بعض اوقات تو میں ان حلقوں میں کچھ اس بری طرح پھنس جاتی ہوں کہ نکلنے کا رستہ ہی نہیں ملتا۔ ملتا بھی ہے تو میں دانستہ اسے نظر انداز کر دیتی ہوں۔ پھر اس بھٹکنے میں کتنا مزہ ہے۔ کتنا کیف، جی چاہتا ہے کہ سب کچھ بھول کر ان انجان رستوں میں بھٹکتی پھروں۔ آپکی آنکھوں میں کیا نہیں ہے۔ میں نے زندگی بھر اتنی خوبصورت، اتنی معصوم، اتنی گہری اور اتنی پُرگو آنکھیں نہیں دیکھیں۔ میں اکثر سوچا کرتی ہوں کہ یہ آنکھیں نگاہوں کا بار اُٹھانے کے لئے تخلیق نہیں کی گئیں۔ انھیں جھکا ہی رہنا چاہیئے۔ مبادا کسی کی زہریلی نگاہیں انمیں بھی وہی زہر بھر دیں جو تقریباً تمام مردوں کی آنکھوں میں اس بری طرح گھُلا ہوتا ہے کہ عورتیں ہزار بھاگنے کے باوجود بھی اس کے جان لیوا اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتیں۔ قیوم کی آنکھیں دیکھی ہیں آپ نے؟ وہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن میں کھنچے ہوئے سُرخ سُرخ ڈورے، کسی مست شرابی کی جھومتی ہوئی مستانی آنکھوں کی طرح تیرتے رہتے ہیں — بظاہر کتنی دلکش ہیں۔ مگر ان میں کتنا زہر بھرا ہے۔ یہ ذکیہ سے پوچھیئے۔ وہ اس کی خالہ زاد بہن ہے۔ اور کالج میں بھی وہ اکٹھے پڑھتے ہیں۔ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے ذکیہ کالج میں "کلوپطرہ" کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ اور قیوم — لیکن قیوم سے بھی خوبصورت لڑکے کالج میں موجود تھے۔ بلند و بالا، گٹھیلے، دلکش — مگر قیوم آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا کہ ذکیہ بے بس ہوگئی — اس کا تمام غرور ٹوٹ گیا۔ اور کالج میں بڑی رعونت سے، اپنے کندھوں کو جنبش دے دیکر چلنے کی بجائے اس کی گردن جھک گئی — بے حد عقیدتمندانہ انداز میں — قیوم کی آنکھیں — ایک دن اس نے مجھ سے کہا "کتنا رس ہے اُن میں، سچ بتانا صغرا، تم نے کبھی دیکھی ہیں ایسی آنکھیں؟" وہ مست سی خلا میں تکنے لگی "نہیں تو —" میں نے کہا، اور جی میں کہہ رہی تھی — "ارے، اس سے کہیں زیادہ فسوں ساز نگاہیں خود مجھ پہ اٹھتی رہیں۔ چوری چوری، چپکے چپکے —"

اور وہ گنگنانے لگی — "میں کیا جانوں، کیا جادو ہے، ان دو متوالے نینوں میں"

پھر ایک روز بالکل غیر متوقع طور پر وہ مجھے لارنس گارڈن میں مل گئی۔ لاپرواہی سے شانوں پر پڑے ہوئے، سفید فر کے کوٹ کے درمیان اس کا چہرہ بے حد حزیں دکھائی دے رہا تھا۔ یا شاید میں نے ہی ایسا محسوس کیا۔ کیونکہ اس وقت میں آپکو اسٹیشن پہ رخصت کر کے واپس ہو رہی تھی "کہو — اچھی تو ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں — آں — اور تم؟" وہ لمحہ بھر کیلئے خاموش ہوگئی۔ پھر میری ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں گھورتے ہوئے بولی "میری آنکھوں میں، آجائیں تمہارے آنسو"

"حفظ ماتقدم؟" میں نے پوچھا "اور ہاں یہاں تم کیا کر رہی ہو۔ کس کا انتظار؟"

"نہیں کسی کا ماتم —!" اس نے بڑا سا منہ بنا کر کہا۔

"خیر تو ہے — آج کچھ خفا سی دکھائی دے رہی

ہو۔ کیوں، کیا قیوم کی آنکھوں میں اب وہ رس نہیں رہا؟"

"رس ــــ میں کہتی ہوں اتنی رس بھری آنکھیں میں نے کم دیکھی ہیں!" پھر کہنے لگی: "آج طبیعت اُداس سی ہو رہی تھی اس لئے میں نے سوچا کہ چلو نرگس سے ملتی آؤں۔ وہ لوگ اب یہیں ریس کورس روڈ پہ آ گئے ہیں، ہماری کوٹھی سے یوں تو ریس کورس روڈ کافی دور ہے ــــ مگر لارنس باغ میں سے ہوتے ہوئے بہت قریب پڑتی ہے، اس لئے میں بھی رستے پہ چل پڑی۔ لیکن اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ جب میں سامنے کے موڑ پہ مڑنے لگی تو درختوں کے نیچے جو بنچ رکھا ہے اس پہ نرگس کو بیٹھے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میری شہ رگ پہ کسی نے چپکے سے تیز دھار چاقو رکھ دیا۔ اس کے قدموں میں بیٹھا ہوا قیوم اپنی متوالی آنکھوں سے اُسے اسی مفتونیت اور وارفتگی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ زہریلا سانپ ــــ!" یہ کہہ کر وہ ایک طرف کو چل دی۔ لیکن میں اپنی محویت میں اُسے جانے سے نہ روک سکی۔ اور جب یہ محویت ٹوٹی تو دور ــــ لارنس گارڈن کے دروازے میں اس کا ملاگیری آنچل لہرا رہا تھا۔ یہ لہراتے ہوئے آنچل بھی بعض اوقات مردوں کی راہ میں سنہرے جالوں کی طرح یوں بچھ جاتے ہیں کہ پھر بچ کر نکلنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ آپا جان کے پی، اے کو تو آپ جانتے ہوں گے نا، وحید، جب وہ پہلے پہل ہمارے ہاں آیا تو میں وہیں آپا جان کے پاس میٹرک میں پڑھتی تھی۔ ہمارا امتحان نزدیک آ گیا تھا۔ اس لئے میری ایک سہیلی اسکول کے بعد میرے پاس آ جاتی، اور ہم دونوں مل کے امتحان کیلئے تیاری کیا کرتے۔ وہ ایک کلرک کی لڑکی تھی سانولی سی، بیٹھے بیٹھے نقوش والی، تاہم، اس کا قد اور جسم بڑا خوبصورت تھا۔ شام کو چھ بجے کے قریب جب میں اُسے چھوڑنے پھاٹک تک جاتی۔ تو واپسی پہ وحید کو Rest House کے برامدے میں کھڑا پاتی۔ اس کی نظریں کبھی انوری کے زرد، کبھی سبز اور کبھی گلابی لہراتے ہوئے آنچل پہ جمی ہوتیں ــــ

پھر امتحان سے پندرہ روز پہلے میں یہ خبر سن کر حیران رہ گئی کہ وہ انوری کو بیاہ لایا ہے۔ لیکن شادی سے اگلے روز جب میں نے اُسے دیکھا تو وہ مرجھایا ہوا سا تھا۔ دیوار سے ٹیک لگائے غیر ارادی طور پہ وہ انگلی سے دیوار پہ کچھ لکھ رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا: "بڑا دھوکا ہوا!" وہ بار بار یہی لکھے جا رہا تھا۔

میں پاس ہو گئی۔ اور کالج میں داخل ہونے کے لئے امی کے ساتھ لاہور آ رہی تھی۔ انوری کا خیال میرے ذہن سے رفتہ رفتہ بالکل اُتر چکا تھا۔ تاہم بڑے دن پر جب ہم لوگ آپا جان کے پاس آئے تو اسی شام میں انوری سے ملنے گئی۔ بے چاری بالکل زرد پڑ گئی تھی۔ جیسے اس کی زندگی کا تمام رس نچوڑ لیا گیا ہو ــــ اس نے مجھے بتایا کہ وحید اس کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتا ہے اور اس کے زیور بیچ بیچ کر گلچھرے اُڑا رہا ہے۔ مجھے بڑا افسوس ہوا۔ غریب لڑکی!

اُن دنوں مجھے گلاب کے پھولوں سے عشق تھا۔ اگر کوئی پودے پر سے ایک پھول بھی توڑ لیتا تو میں اس کی جان کو آ جاتی حتیٰ کہ اس سلسلے میں میں بھیا سے بھی کئی بار لڑ چکی تھی ــــ اور پھر اس مرتبہ تو میں نے بڑے ارمانوں سے، بیحد سُرخ پھولوں والے پودے کاشت کرائے تھے۔ جن پہ کھلے ہوئے پھول دیکھنے کے شوق میں، میں سویرے ہی بستر سے نکل پڑتی۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ وحید اُداس سا لان میں بیٹھا گلاب کے ایک نوشگفتہ پھول کی پتیاں مسل رہا ہے ــــ مجھے دیکھ کر گھبرا گیا۔ اور معافی مانگنے لگا۔

"اوہ ــــ" میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "پُرانی بات ہے یہ تو تمہاری ــــ کوئی نئی بات کرو۔"

وہ اور بھی گھبرا گیا: "خدا میں نے تو آج تک ایک پھول کو بھی شاخ سے جُدا نہیں کیا ــــ مجھے تو خود پھول بیحد پسند ہیں!"

"ضرور! ــــ" میں نے طنزیہ کہا ــــ "لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ عورت کا دل پھول سے کہیں زیادہ دلفریب اور نازک ہوتا ہے ــــ!"

"جی ہاں! جی ہاں ــــ" وہ سمجھتے ہوئے اور ــــ اور بھی گھبرا گیا: "مگر سچ بتائیے کہ جسے دور سے دیکھ لینے پر آپ گلاب کا پھول سمجھ لیں ــــ پاس آنے پہ وہی "کنیر" کا بے بو سا پھول نکلے تو کیا آپ کا جی اُسے مسل کر پھینک دینے کو نہ چاہے گا؟"

"لعنت ہے تم پہ ــــ" میں چڑ گئی: "تم لوگ اپنی آنکھوں میں دھول جھونک کر "کنیر" کے پھول کو گلاب سمجھ کے اس سے اپنی امیدیں، آسودگی اور تمنائیں کیوں وابستہ کر لیتے ہو۔ کیوں کھنچے کھنچے جاتے ہو اس کی طرف؟ گلاب کو کنیر سمجھ کے

اس سے کتراتے کیوں نہیں۔ پھول کا کیا قصور؟"

"بگڑ گئیں آپ تو" وہ ہنس دیا۔ ایک عجیب مہذبانہ سی ہنسی۔ "وہ آپکی سہیلی ہے نا؟" اور میں اس کے اس بھونڈے مذاق پہ کڑھتی وہاں سے چلی آئی۔

. . . . . "وحید نے میری حرا کو چوڑیاں بھی بیچ دی ہیں" انوری نے بڑی حسرت سے کہا۔ اُسے یہ چوڑیاں بے حد عزیز تھیں۔ اور چوڑیاں کسے عزیز نہیں ہوتیں۔ انہی کی وجہ سے تو عورتوں کا سہاگ قائم ہے۔ اور بعض اوقات تو چوڑیوں کے مترنم جھنکے، کنواریوں کی مانگیں بھی سُہاگ کی جھلملاتی ہوئی افشاں سے بھر دیتے ہیں۔ آپ نے اکثر میرے ساتھ ایک لمبی سی گوری گوری لڑکی کو دیکھا ہوگا۔ اس کا نام سعیدہ ہے۔ یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب وہ بی۔ اے کی تیاری کر رہی تھی۔ جس کوٹھی میں وہ رہتی تھی اس کے دوسرے حصہ میں راشد چچا کے لڑکے منصور اور مسعود رہتے تھے۔ منصور اور سعیدہ کے کمروں کے درمیان ایک دروازہ تھا۔ جسے مالک مکان نے نوسے کی پتریوں سے ہمیشہ کیلئے بند کر دیا تھا۔

رات کو دیر تک پڑھنے کے بعد جب سعیدہ تکان دور کرنے کیلئے انگڑائیاں لیتی تو اس کی چوڑیاں بجتی ہی چلی جاتیں۔ اور منصور پڑھائی ورڑھائی چھوڑ ان جھناکوں میں مست ہو جاتا۔

"منصور بھائی کی طبیعت بڑی خراب ہے" ایک دن مسعود گھبرایا ہوا سا آیا "مجھے تو پریشان کر دیا ہے۔ آپکو فرصت ہو تو چلئے میرے ساتھ"

اور جب امی سے اجازت لیکر میں ان کے ہاں آئی تو وہ مجھے منصور کے کمرے میں چھوڑ کر خود پڑھائی میں مشغول ہو گیا اور حسبِ عادت منصور لگا مجھسے بھڑنے — "جی — کوئی مر بھی جائے تو آپکی بلا سے۔ آج بھی نہ جانے کہاں سے رستہ بھول پڑیں — وہ تو کہئے کہ ہم ہی ڈھیٹ ہیں جو —" معاً ساتھ کے کمرے میں کسی نے چوڑیوں کی گت پہ فردوسی ترانے چھیڑ دئیے" اور منصور مست ہو گیا۔ بالکل کھو گیا۔

"کتنی دلفریب ہے یہ چوڑیوں کی جھنکار!" میں نے اُسے چھیڑنے کی غرض سے کہا، وہ چونک پڑا "ہاں — لیکن میری امیدوں سے کم" وہ جیسے خواب میں بڑبڑایا۔

اس کے چھ سات مہینے بعد میں نے اسے سعیدہ کے مہندی رچے ہاتھوں میں جھنجھاتی ہوئی لال لال چوڑیوں سے کھیلتے دیکھا۔

"کسی کی چوڑیوں سے کھیلنا بھی کتنا مست کن فعل ہے۔ کتنا رومان انگیز" وہ مسکرایا۔

"ہاں — مگر میری امیدوں سے کم" میں نے کہا۔ اور وہ سمجھا کہ میں اُسے چھیڑ رہی ہوں۔ لیکن میں ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میرے تصوّرات کے دھندلکوں میں ہر گھڑی ایک پیاری سی صورت رقص کرتی رہتی ہے جس کی میں نہ جانے کب سے پرستش کر رہی ہوں۔ نہ جانے میرے دل میں کتنی عقیدت ہے اپنے دیوتا کیلئے۔ نہ جانے کتنا احترام۔ میں نے آجتک مہندی نہیں لگائی۔ کیوں لگاؤں۔ جب تک کہ میرا دیوتا ان دُھندلکوں سے نہ نکل آئے میں سُرخ چوڑیاں بھی نہ پہنونگی۔ پھر بھی کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی میرے مہندی رچے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں دبائے میری سُرخ سُرخ رنگدار چوڑیوں سے کھیل رہا ہے — لیکن میں نے آجتک اسے نہیں دیکھا۔ مجھے اس کا انتظار ہے۔ رات کی سہانیوں میں دوپہر کے سناٹوں میں — گھور اندھیروں میں، بکھرے نور میں، میں اسے پوجتی رہی ہوں — اُس دلفریب نقش کو — اور مجھے یقین ہے کہ وہ عنقریب ہی اُن دھندلے پردوں کو چیر کر باہر نکل آئے گا۔ میں نے سوچا تھا۔

. . لیکن آپ عید پر بھی نہ آئے۔ میں نے آپکے استقبال کیلئے بہترین لباس کا انتخاب کیا۔ اور جب میں اسی رنگ کی چوڑیاں چُننے لگی تو چھن سے رنگ برنگی چوڑیوں کا وہ حسین گچھا میرے ہاتھ سے چھٹ کر فرش پہ آ رہا۔ گیلی گیلی آنکھوں میں کاجل پھیلنے لگا۔ اور پپوٹوں سے ایک خاص زاویہ پر ٹکے ہوئے بال بل کھا کر پُشت پہ جا پڑے۔ میں نے دروازے کے ادھ کھلے پٹ میں لٹکتی ہوئی چک میں نظریں الجھا دیں۔ لیکن یوں تو مجھے اور بھی وحشت ہونے لگی۔ جیسے ان پتلی پتلی درزوں میں سے بے شمار مستہزانہ انداز میں ہنستے ہوئے چہرے مجھے گھور رہے ہیں اور پھر — اُف میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا آپ اپنے محبوب انار کے درخت کے نیچے بیٹھے نفرت سے گردن موڑے مجھے دیکھ رہے ہوں — گویا آپکی آنکھیں کہہ رہی ہوں — "تم کتنی پست ہو، کتنی ذلیل —" میں نے الجھن میں اپنے ریشمی دوپٹے پہ ٹنکے ہوئے لچکے کو اُدھیڑ کر رکھ دیا۔

خالی خالی کلائیاں مجھے بچی کھچی چوڑیاں اٹھا لینے پہ اُکسا رہی تھیں۔
"پگلی یہ بڑا اشگون ہے ــــ ان کا تحفہ ــ"

اوہ! مگر یہ تحفہ نہ تھا یہ تو فرمائش تھی ــــ میرے دماغ میں جیسے کوئی تیز بر چھیوں سے کچوکے دینے لگا۔ جی ہاں یہ وہی چوڑیوں کا لچھا تھا جو پچھلی بار آپ میرے لئے علی گڑھ کی نمائش میں سے لائے تھے۔ نہیں بلکہ جس کی میں نے خود فرمائش کی تھی ــــ وہ بھی اس وقت جب جانے سے پہلے آپ اپنی آنکھوں میں نہ جانے کتنے جادو جگائے، بظاہر فریدہ سے لیکن دراصل مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ کہ ابکی نمائش میں سے آپ اس کے لئے کیا لائیں۔ بس اس وقت رونے کو ہو رہی تھی لیکن سب کے سامنے آنسو بہانا مجھے منظور نہ تھا۔ اس لئے میں نے الفاظ کی آڑ لے لی۔ بخدا میرا مطلب آپ کی کسی کمزوری سے فائدہ اٹھانا نہ تھا۔ آپ ہی بتائیے ــــ میری غیرت مجھے اس کی اجازت کب دیتی کہ میں اپنی محبت کو یوں سستے داموں بیچ دوں۔ ان سستی بازاری عورتوں کی طرح جو محبت کم کرنا جانتی ہیں اور فرمائشیں زیادہ ــــ وہ گری ہوئی عورتیں لیکن کہیں میں بھی تو آپ کی نظروں سے نہیں گر گئی۔ کہیں آپ مجھ سے بدگمان تو نہیں ہو گئے میری محبت کو بھی آپ نے انتہائی سطحی اور کھوکھلا تو نہیں سمجھ لیا۔ بتائیے؟ ــــ اگر نہیں، تو پھر آپ عید پر کیوں نہیں آئے کیوں ــــ ؟

امین حزیں

ممکناتِ اسیری

اسیری میں یہ ناممکن نہیں ہے
لگے شیرِ نیستاں گھاس چرنے
وہ شاہیں تسمہ برپا ہیں یقیناً
چلے چیلوں کی جو تقلید کرنے

(۲)

اسیری میں یہ ناممکن نہیں ہے
کہ طوطی گفتۂ صیّاد گائے
بھی ہے دشمنِ غیرت یہی ہے
شکم کی مار سے اللہ بچائے

(۳)

اسیری میں یہ ناممکن نہیں ہے
کہ شرمائیں نہ دن کو رات کہتے
جمی دیکھی ہیں آقا کی جبیں پر
تجسس کی نگاہیں بات کہتے

(۴)

اسیری میں یہ ناممکن نہیں ہے
کہ دانہ دانہ کی خاطر ہو سرِ خم
قفس میں چہچہے بلبل کے کیا ہیں
امینؔ خوشنودیٔ صیّاد کا غم

گرداب

اختر الایمان کی نظموں کا مجموعہ۔ اختر الایمان جدید شعراء میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے اُردو کے مشہور نقادانِ فن نے اختر کی نظموں کو دورِ حاضر کا بہترین کلام قرار دیا ہے۔ قیمت عہ

منیجر ساقی بک ڈپو دہلی سے طلب فرمائیے

اُفق

احمد ندیم قاسمی۔

چلتے رہو، میرے تھکے ماندے ساتھیو! تمہیں ستاروں کا ساتھ دینا ہے، اندھیرے کی شکایت نہ کرو، راتیں اکثر اندھیری ہی ہوتی ہیں، تم راستہ میں اُبھرے ہوئے پتھروں سے ٹھوکریں کھاتے ہو، تو اپنی بدبختیوں کی داستانیں لے بیٹھتے ہو، میرے مضمحل رفیقو، ٹھوکر ہی مدارِ حیات ہے، میں نے کتابوں میں یہی پڑھا ہے، بڑے بوڑھوں سے یہی سُنا ہے، کہ ؎

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

آس پاس پھیلے ہوئے کھیتوں پر نیندوں کا ہجوم سہی، درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں کے پتے تک حجاب سہی، لیکن میرے عاقبت نااندیش ہم نصیبو، ہوا چلتی ہے تو کھیت سرسراتے ہیں اور پتے کھڑکتے ہیں، چاند نکلتا ہے تو اندھیرے کو غاروں اور گپھاؤں کے سوا اور کہیں جائے پناہ نہیں ملتی، سو چلتے رہو میرے تھکے ماندے مسافرو، اور سفر کی درازی کی باتیں نہ کرو، چیت اور بیساکھ کی اُن چاندنی راتوں کی کہانیاں سُناؤ، جب تمہاری جوانیوں نے بساطِ حیات پر حیات ہی کی بازی لگا دی تھی، اور نارنجی ہونٹوں کے لمس اور کالی بھونرا آنکھوں کی جھپک میں تم نے کائنات اور عرفانِ الٰہی کی ذہنی بھول بھلیاں کا مداوا ڈھونڈ نکالا تھا۔

بھئی خالد۔ تم نے اپنی بانسری کہاں چھپالی؟ اور کوٹ کے کالر اُٹھاؤ۔ ٹوپی کو ماتھے پر سرکاؤ، اور آنکھوں کو نیم وا کر کے لکڑی کے اس موسیقی زار کو دل بھر کے سیراب کرو، تم موڈ میں نہیں ہو؟ ارے بھئی ہم مسافروں کے لئے موڈ کی مجبوریاں بے معنی ہیں، موڈ بنانے کے لئے فرصت چاہیئے اور مسافر کو زیادہ کوئی انسان عدیم الفرصت نہیں ہوسکتا، خلاؤں کی سرمئی پہنائیاں بانسری کی نقرئی لہروں کے انتظار میں ہیں، ہاں، مجھے تمہاری یہی ایک عادت پسند ہے کہ تم ضدی نہیں ہو، تم اپنے احساس کو ایمان کا درجہ نہیں دیتے، احساس میں انقلاب کی گنجائش رکھنا ضروری ہے، اور ایمان سنا ہے کسی غیر منقلب جذبے کا نام ہے!

سنو سنو، بانسری کیا کہہ رہی ہے مسعود کہانسو نہیں، تم میرے بہت بیہودہ دوست ہو، تمہاری زندگی مجسم کھانسی ہے، جھینکے اور دعا کے اور متعفن مواد سے کے چیتے، تمہارے پھیپھڑے خراب ہیں تھے تو تم نے اس طویل سفر پر آمادگی کیوں ظاہر کی؟ اور اب کہ تم ہمارے ہمراہ اتنی دور دراز بستیوں تک آچکے ہو، پھیپھڑوں کی خرابی کا گلہ بے معنی ہے خالد ۔۔۔ خالد، تمہاری بانسری کے سُر خرابیوں سے مملو ہیں، اور ہم مسافر چاہتے ہیں کہ وہ ممکن ہی ہماری سروں کو بلند کرو، تاکہ فضا گونج اُٹھے، اور مسعود کی کھانسی ان سروں کی رفعتوں تلے دب کر رہ جائے ۔۔۔ سُو مسعود بانسری کیا کہہ رہی ہے، کیا؟ بانسری نے کہا ہے کہ اگر کائنات کی تخلیق کا کوئی مقصد ہے تو اس مقصد کی تخلیق کا کیا مقصد ہے! میں نے پہلے بھی تم سے یہی کہا تھا، کہ تمہاری زندگی مجسم کھانسی ہے، بانسری کے سُروں پر مقاصدِ تخلیق کا ٹھپا لگا کر میرے منطقی دوست، مجھے مقصد سے کوئی دلچسپی نہیں، میں وجدان کا قائل ہوں، اور وجدان مقصد کی غلاظت سے مبرا ہے۔

خالد، تم نے بانسری کیوں بند کر دی؟ ہم تمہارے لئے موضوعات پر اُتر آئے ہیں اس لئے؟ ۔ تم بہت حسّاس ہو میرے بھائی، یہ آبگینے کب تک ٹھائے پھرو گے، آبگینے ہمیشہ ٹوٹنے کے لئے بنتے ہیں، اس لئے انتخاب کٹھن ہونا چاہیئے۔

(۵) اندھیرے میں بھٹکی ہوئی تیری بالی بالی کی رٹ لگاتی گھوم رہی ہے پر جوڑ کر بیچ اتر آ محترمہ، اور اختر کی پلکوں کی جڑوں میں اٹکی ہوئی تبسم سے پیاس بجھا لے، اختر، آخر یہ کیا بات ہے کہ تمہاری ہنسی میں بھی آنسوؤں کی سیلن ہوتی ہے، تم اس وقت وجدان کے سب تقاضوں کے لئے اندھیروں کو چیرتے چلے جا رہے ہو، وہ کتنا مبارک، اور مقدس ہے، مگر اس وقت بھی میں تمہاری پلکوں کی جڑوں میں ستاروں کی لَو سے ایک عجیب مبہم سی چمکیلی دھاری دیکھ رہا ہوں، کیا تم نے اب تک اقبال کا مطالعہ نہیں کیا! ۔۔۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم ٹیگور پر شیدا ہو، میں خود بھی ٹیگور کو انسانی فطرت کے نباضوں میں شمار کرتا ہوں۔ مجھے بھی اُس کی خوشبودار نظموں اور منوّر کہانیوں سے محبت ہے، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اُس نے قدیم ہندوستانیت کو جدید رنگوں میں نہایت فنکارانہ طور سے سمو کر بنگالی، اور پھر ہندوستانی ادب پر احسان کیا ہے، مگر میرے بھائی، زندگی صرف خوشبو یا صرف آنسو بھی تو نہیں، تم زندگی کی مجموعی تحریک اور لپک کو کیوں محسوس نہیں کرسکتے؟ تم یہ کیوں نہیں سمجھتے، کہ جب جنگ میں ایک سپاہی مرتا ہے، تو ساری قوم مر جاتی ہے، جب بنگال میں ایک بھوکا دم توڑتا ہے تو ہماری کائنات ہی دم توڑ دیتی ہے، جب ایک زمیندار اپنے مزارعہ کی کنواری بیٹی کی عصمت دری کرتا ہے، تو ساری کائنات کے چہرے پر سے نیکیوں کا نور نچڑ جاتا ہے، اور پھر یہ سپاہی کیوں مرے؟ یہ بنگالی کیوں دم توڑے؟ یہ کنواری کیوں [illegible] جائے؟ کیا سپاہی کو جنگ سے، بنگالی کو موت سے اور کنواری کو لُٹ جانے سے روکا نہیں جاسکتا؟ تمہاری خاموشی سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تم [illegible] رہے ہو،

[illegible] ہوئے ہم جنگوں، قحطوں اور [illegible] کو نہیں روک سکتے، ہیں روئے ہم [illegible] آنکھوں کی [illegible] ہے [illegible] وقت رو [illegible] رات [illegible] — مسعود کیا [illegible] آنسو [illegible] کچھ [illegible] کر سکتی [illegible] — [illegible]

[illegible] دیکھو آسمان [illegible] اس کی [illegible] روشن لکیر [illegible] دوست ستاروں کو دیکھو کہ ان کے رقص میں کوئی الجھاؤ [illegible] تو [illegible] قائم رہتے ہے [illegible]

[illegible]

تم کہتے ہو مسعود کہ محبت کی ناکامی نے تمہیں فلسفہ کی [illegible] دی [illegible] کہ [illegible] تمہارا یہ مفروضہ کہاں تک درست ہے لیکن [illegible] کائنات کی [illegible] کو حل کرنے کے لئے اگر تم فلسفہ کی [illegible] تو کبھی تمہاری گذر ہو جاتی محبت بھی [illegible] کیف ہے، [illegible] دنیا کے دوسرے تمام کام چھوڑ کر صرف محبت کرو اور [illegible] آنسو [illegible] اور آوارگی اور [illegible] اور وہ [illegible] اخلاق [illegible] مذاق برداشت کرو، بے مقصد [illegible] پھرو، [illegible] اور موقع کے [illegible] جب بری طرح تھک جاؤ، تو فلسفہ پڑھنے لگو یا بیمہ کمپنی میں نوکری

[illegible]

مسعود، شاید تم وہ رات نہیں بھولے ہوگے جب سطح کا ریتیلا کنارا چاندنی میں چمک رہا تھا، میں نے تمہیں مشورہ دیا تھا کہ مسعود، وہ نہیں آئے گی، شہر سے تین میل دور، کچی سڑک، ہولناک ویرانہ اور پھر رات کو ——— دیکھو، ڈھیلی ڈھالی لہروں پر ستاروں کے عکس کچھ کہہ رہے ہیں، پڑھو، پڑھو، اس آسمانی تحریر کو پڑھنے کے لئے صرف بصیرت کی ضرورت ہے ——— اور تم نے، میرے فلسفی دوست، بصیرت کا مذاق اڑایا تھا، کچی سڑک کے بعید ترین نقطے کے قریب اگی ہوئی ایک ببول کو تم دیر تک [illegible] دیکھتے بیٹھے رہے، تم نے کشتی میں ایک ننھا سا خوبصورت قالیچہ بچھا رکھا تھا، جس پر تمہارے [illegible] ایستادہ کرتے تھے، اور پھر جب ببول نے اسی جگہ سے حرکت نہ کی، کیونکہ ببولیں بالکل ہوتی ہیں، تو تم نے قالیچہ اٹھا کر ریت پر دے مارا، کشتی کو کنارے سے [illegible] کے حوالے کر آئے، اور میرے تعاقب کرنے پر تم نے پکار پکار کر کہا: چلے جاؤ، خدا کے لئے میرا پیچھا نہ کرو، میں اس بیابان میں بھٹک سا جانا چاہتا ہوں۔

میرے خیال میں تمہاری [illegible] پوری ہوئی، اور تم زندگی کے میدان میں [illegible] [illegible] گئے اور محبت چھوڑ کر فلسفہ پڑھنے لگے، مگر کیا تمہیں سکونِ قلب میسر آیا؟ ذرہ [illegible] دیکھنے والے دوست، تم نے اپنے فہم و ادراک کے لئے کتنے خیالی جہنم پیدا کر لئے ہیں، کیا تمہارے [illegible] اس حقیقت کا احساس کافی نہیں، کہ سورج نکلتا ہے تو دن شروع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے تو رات کی ابتدا ہوتی ہے، مگر تم نے دل کیوں اور [illegible] اور یہ سب کچھ کیوں کی رٹ لگا رکھی ہے، حالانکہ سورج کو تمہاری [illegible] کوئی پروا نہیں، وہ قیامت تک اسی طرح ابھرتا اور ڈوبتا رہیگا، اور تمہارے [illegible] اور [illegible] نسلیں گذر جانے کے بعد بھی ادراک کے [illegible] ہیں پھر کھڑا [illegible] رہیگی۔

[illegible] عالم [illegible] کی قوس پھیل رہی ہے، اور ستاروں کے [illegible] اڑ رہی ہیں، ہوا کروٹیں بدل رہی ہے اور فضا چونک اٹھی ہے، [illegible] کہ اختر کی آنکھیں بھینچ لیں اور مسعود کا جمود ٹوٹ جائے۔

تم بھی [illegible] گے؟ تم [illegible] کو نہیں بہلاؤ گے؟ ہمارے اس نڈھال اور مضمحل دوست کو جس نے اپنی [illegible] اپنی جلتی جاگتی آرزو کو تہہ دل میں گھونٹ دیا، اور اس [illegible] میں اس [illegible] استعمال کیا کہ اب اس کے تیرا بی آنسوؤں کی سیلن بھی [illegible] ٹوٹے ہوئے رشتوں کو ڈھیلا نہیں کر سکتی، اختر، آخر تمہیں کس نے مشورہ دیا تھا کہ اپنے [illegible] رشتہ کی لڑکی سے محبت کرو، کہتے ہیں مشرق کا معیار اخلاق مغرب سے بہت [illegible] اور پاکیزہ ہے، اس لئے اے نوجوان شاعر، بھول جاؤ کہ عورت کے گالوں میں گلاب ہیں، اس کے ہونٹوں میں شفق ہے، اس کی ہنسی میں چاندنی ہے ——— لیکن یہ تم نے زمانہ کے عجیب شعرا جنہوں نے "بنت عم" کی ایسی

گرداں چھیڑی کہ اب تک مشرقی شاعری سینکڑوں "معشوق" کے ناموں کے علاوہ اُن کے گالوں، ہونٹوں، آنکھوں اور سینوں کے مرمریں درشت ہونے کا گلہ مسلسل سے سن رہی ہے۔ ــــ تم نے اختر سے تم سے محبت کر کے کوئی اخلاقی جرم نہیں کیا تھا، مگر میرے بھولے رفیق ــــ یہ تو سوچا ہوتا کہ تم مفلس ہو، اور تمہارا باپ مر چکا ہے اور تمہاری ماں اُپلوں کا دھواں پیتے پیتے دِق کی شکار ہونے والی ہے، تم ڈسٹرکٹ بورڈ کے دفتر میں کلرک ہو، اور تمہیں دفتر کا سیکرٹری اکثر گدھا کہا کرتا ہو، طرفین کی رضامندی مشرق کے علم الاخلاق میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی، یہاں صرف دو جنتیں ہیں، ہیر و رانجھا، شاعر سے لیکر پٹواری تک سب شش جہات کے قائل ہیں، تمہارے علاوہ تمہارے والدین ہیں، تمہارا ماحول ہے، تمہاری سماج ہے، تمہارا مذہب ہے، ان کی رضامندی بھی تو ضروری تھی، اور ان کی رضامندی ضروری نہ ہوتی تو آج مشرق کی نکتہ رس ادبیات شیریں فرہاد اور ہیر رانجھے کی داستانوں سے محروم رہ جاتا، بھائی ہمارے مشرق میں تو محبت ریاضی کا ایک سوال ہے مجھے یقین ہے کہ یہاں کا کیوپڈ رسم سے عاقل کا کوئی آزاد کردہ غلام ہے، جس کے پاس صرف ایک تیر ہے، اور وہ اپنے آقا کی ہوس پوری کرنے کے لئے تیر چلاتا ہے، تو ساتھ ہی تیر کا تعاقب بھی کرتا ہے، اور اس تیر کو ہدف کے کلیجے میں سے نہایت بے رحمی سے کھینچ کر دوسرے ہدف کی تلاش میں نکل جاتا ہے، یہ کسک جو تم اپنے دل میں محسوس کر رہے ہو دراصل محبت کی کسک نہیں، یہ کلیجے میں سے تازہ تازہ کھینچے ہوئے تیر کی سوزش ہے جو جلد مٹ جائے گی، اور تم ڈسٹرکٹ بورڈ کے محکمہ میں ترقی کرنے لگو گے۔

مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتے ہو، دیکھو، الاؤ کا دائرہ لرز رہا ہے ... ستارے ڈوبے جا رہے ہیں، رات کا نظام زوال پذیر ہے، اب اس تخریب سے ایک نئے اور روشن نظام کی تعمیر ہوگی، اسی تعمیر میں ہم اپنا خون کھپانے جا رہے ہیں، ہم ایسے نور سے تھک چکے ہیں جو صرف ملندیوں کی مستعار شعاعوں سے روشن رہ سکتے ہیں، ہمیں ایک ابدی دن چاہیئے، جس کی روشنی ہمہ گیر اور جس کی وسعت کائنات پیما ہو۔

کون جانے منزل کتنی دُور ہے یا کتنی قریب ہے، تم بھی نہیں جانتے، میں بھی نہیں جانتا، کوئی بھی نہیں جانتا، لیکن اس حقیقت سے تمہیں بھی انکار نہیں مجھے بھی انکار نہیں، کسی کو بھی انکار نہیں کہ منزل ہے ضرور، اور یہ اسی منزل کی قوس ہے جو آسمان کو نگلے جا رہی ہے، مسعود، تم کراہ رہے ہو، تم بار بار رک کر ایڑیوں کو دباتے ہو، اور پنڈلیوں کو سہلاتے ہو، تمہارا رنگ زرد ہو رہا ہے، تمہارے لبوں کی پپڑیاں اُچٹ کر آپس میں پھنس رہی ہیں، تمہاری آنکھوں میں مایوسی کی خلا ہے، اور اب تم بیٹھ گئے ــــ ہمت نہ ہارو مسعود، اُٹھو، ارے اُٹھو بھی، دیکھو تو ہم سب کے رک جانے سے الاؤ کی ابھرتی ہوئی قوس ابھی دھندلی نظر آتی ہے، اور پھر ہم سب نے اکٹھے سفر کرنے کا تہیہ کیا تھا، تم نے نہ بیٹھنے کی قسم کھائی تھی ــــ تم بے بس ہو؟ تو آؤ خالد اور اختر، ہم اپنے دوست کو اس اندھیرے کے حوالے کر کے آگے بڑھیں، مسعود، یہ اندھیرا تمہارا نگہبان رہیگا۔ ... الاؤ کا ... آئے گا، اور تمہاری اندھیرے کی ... جائے گی، تو ... وقت ہمارے لئے دعا کرنا، اور اعتراف کرنا کہ الاؤ کی ... تمہارے تینوں دوستوں کی آنکھوں کی روشنی اور چہرے کی گلابی ... رہی ہے۔

اختر، تم بار بار مڑ کر پیچھے کیوں دیکھتے ہو؟ مسعود کو تو اندھیرے ... اب اگر تم اس کی تلاش میں پلٹو گے تو خود بھی بھٹک جاؤ گے، خالد تم ... کوئی گیت یا کوئی دھن۔ خالد، سنتے ہو؟ اس وقت ہمارے دوست کو ... کی ... ہے ... تم خاموش ہو، گاؤ یا گاؤ، آخر کچھ تو کرو کہ تمہارے خیالوں ... بکھرا ہے، تم اپنی محبوبہ کو کالج میں چھوڑ کر آ رہے ہو، اس وعدے پر کہ تم ... جلد پلٹو گے اور راستہ لائبریری کے ایک نیم روشن گوشے میں بیٹھ کر ... کے ان شہزادوں کی کہانیاں ... نکل چکی ہیں جنہوں نے بڑے بڑے جنوں ... کر کے ... سے ... اور شہزادیوں کی ... بڑی شادیاں رچائیں۔

خالد، تمہاری محبوبہ بھی ... ہے ... ایک بار ... نہیں ہوتا کہ ... فروری ... اور کئی مرتبہ وہ تمہارے کمرے ... جب چھوٹی سی دنیا میں ... الیکٹرک ... کر رہی ہے، وہ ... موسیقی کی دلدادہ ہے، اور تم بنگالی ... کی اصل سمجھتے ہو، اس لئے وہ تمہیں بنگالی طرز کے گیت سناتی ... ہے ... انگریزی موسیقی کے بے انداز فہم سُروں کی مشق ... نیلے سوٹ کے ساتھ سفید براق ٹائی لگاتے ہو، صرف اس لئے کہ ... نیلی ساڑی میں سفید پھول ہیں، اور پھر ایک روز وہ اپنی محبوب ... تمام سفید پھولوں پر صرف اس لئے نیلے نیلے گول نشان لگا لائی، کہ تمہارے رومال کے کونے پر سیاہی کا ایک دھبہ گر پڑا تھا۔

اختر ... قدم ... سے کیوں اُٹھ رہے ہیں؟ شاید ... پھر آنسوؤں کی بھیک مانگنے آئی ہے، الاؤ کا گھیرا تیزی سے اُبھر رہا ہے، بہت حیرت ہے بے شمار ستارے مٹ چکے ہیں، اور جو باقی ہیں وہ بھی تھوڑی دیر میں ... کے محیط کے کنارے میں ڈبکیاں مارتے غرق ہو جائیں گے، اور پھر ہماری منزل ... خطوط کی پوری وضاحت سے اُفق کے نیلے پس منظر پر اُبھرے گی، اور تمہارے قدم خود بخود ایک نئی ترتیب سے اُٹھنے لگیں گے۔

تم کہتے ہو اب تم میں ایک بھی قدم اُٹھانے کی سکت نہیں، تو کیا مسعود کی طرح تم بھی ہم سے کٹ جاؤ گے؟ نہیں، تم ایسا نہیں کرو گے، اگرچہ تم ... ہو، اور تمہارے دُکھ ابھی گرم اور تازہ ہیں، مگر اختر، تم نے مسعود کی طرح خلعہ نہیں پڑھا، تم وجدان سے دست کش نہیں ہوئے، ابھی تم اس نامعلوم قوت کے قائل ہو جو ستارے کی چمک اور کلی کی چٹک میں آہنگ پیدا کرتی ہے،

تمہاری روح کی ماندگی یکسر خیالی ہے، ہمت کرو، میرا اور خالد کا ساتھ دو، وہ لقرئی قوس ہماری منتظر ہے۔ وہ ہلکا نیلی دھندلکا ہمارا منتظر ہے، اس دھندلکے کے پیچھے اُفق ہمارا منتظر ہے!

تم تو جھکا کر بیٹھ گئے، تمہاری ٹھوڑی تمہارے سینے کو اور گھٹنے کانوں کو چھونے لگے ہیں، بہت اچھا، پڑے رہو یہیں، اور انتظار کرو اس لمحے کا جب تمہاری ماندگی ایک نئے عزم کی صورت اختیار کرکے تمہیں اور مسعود کو ہمارے پاس لے آئے گی، چلو خالد، اپنے ان بچھڑے ہوئے رفیقوں کے خیال سے ذہن کو خالی کر دو۔

یہ روشنی کی پھوار کہاں سے پڑنے لگی؟ ستارے کدھر گئے؟ اندھیرے نے کہاں پناہ ڈھونڈی؟ اب پگڈنڈی گھنے بالوں کی مانگ کی طرح صاف اور چکیلی ہے، اور پیڑوں کی کونپلوں سے چھٹے ہوئے پھولوں پر مسکراہٹیں برس رہی ہیں۔ پگڈنڈی کے آس پاس گنجان گھاس پر بےتعلق مکھیاں اُڑ رہی ہیں اور فضا میں پرندوں نے ایک رواں برمِ نغمہ حمد رکھی ہے، یہی وہ وقت ہے جب شاعر کو شعر، مصوّر کو تصویر اور خالد کو بانسری کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

مگر ٹھہرنا۔ یہ پگڈنڈی کے اس طرف کھیت کے کنارے کون کھڑا ہے؟ ہوائیں کیوں رک گئی ہیں؟ فضا کیوں دم بخود ہے؟ اور مشرق کی طرف سے پھوٹتی ہوئی روشنی کی لہریں ایک ہی نقطے پر کیوں مرکوز ہوتی جا رہی ہیں!

تو ہم کو حیرت سے تک رہی ہے دہقانی لڑکی، اور ہم تجھے حیرت سے دیکھ رہے ہیں، تو ہمارے گرد سے اُٹے ہوئے پاؤں اور نے خواب سے سوجی ہوئی آنکھوں کو تک رہی ہے، اور ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ تیرے ہاتھ میں اگر درانتی کے بجائے پارکر قلم ہوتا تو کیسا اچھا رہتا، خالد، میں تمہاری بات نہیں کر رہا، میں جانتا ہوں کہ ان دنوں تمہارے جذبہ و احساس کا کوئی دوسرا وجود حقدار نہیں بن سکتا۔ یہ میری ذاتی رائے ہے، کہ اگر اس دھجیاں لگی اوڑھنی اور سیاہ کھدر کے ڈھیلے ڈھالے چولے اور پنڈلیوں کے نصف تک اٹھے ہوئے تہمد کی بجائے یہ لڑکی ساری اور بلاؤز پہنتی، اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگاتی۔ اور بالوں کو شانوں پر کھلا چھوڑ دیتی تو اس کا حسن دوبالا ہو جاتا، اب یہ کھیت کی مینڈ پر اس لباس میں کھڑی کیسی اکیلی اکیلی لگتی ہے بیچاری! خالد، ویسے تمہارا کیا خیال ہے؟

مجھے تمہارا یہ عادت تو قطعی پسند نہیں کہ تم نے جہاں کہیں کوئی اجنبی لڑکی دیکھی، جھٹ ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر، "اللہ جمیلٌ و یحب الجمال" کا ورد کرنے لگے، خدا کے لئے حسن کا کوئی معیار مقرر کرو، یہ بھی آخر کیا اندازِ نظر ہے کہ تمہارے نزدیک پتلے ہونٹوں میں نزاکت ہے اور موٹے ہونٹوں میں دعوت، سفید رنگت میں مرمر ہے اور سانولے میں سلونا پن، گول چہرے میں "مہتابیت" ہے اور بیضوی میں

نسوانیت، اور اب، یہ لڑکی جس کے ایک ہاتھ میں درانتی ہے اور دوسرے میں کسی نامعلوم بوٹی کے ننھے ننھے بے ترتیب پھول، بستر سے اٹھ کر شاید اس نے منہ ہاتھ بھی نہیں دھوئے، ابھی اس کی آنکھوں میں نیند اور بیداری کی جنگ جاری ہے، اسکے گالوں پر جوانی کا گلاب بجائے چٹکنے کے جھینپ کر رہ گیا ہے، اور پھر اسکی باہوں اور ٹانگوں میں تم پانی دوڑ کا تناسب کہاں سے لاؤ گے؟

خالد، خالد، پگڈنڈی سیدھی ادھر جا رہی ہے، اور تمہارے قدم غلط سمت کو اُٹھ رہے ہیں، سنبھلو، سنبھلو میرے دوست، کہ منزل قریب ہے اور پگڈنڈی سامنے ہے، پلٹ کر دیکھو کہ وہاں کالج کی عمارت دستوں میں تمہاری محبت کے مندر کا کلس چراغ کی زبان بن کر چمک رہا ہے، شاعروں کا یہ مقولہ بھول جاؤ کہ حسن کہیں بھی ہو قابلِ پرستش ہے اور عشق زمان و مکان کا پابند نہیں، تم اپنی محبوبہ سے بھی وعدہ خلافی کر رہے ہو، اور مجھ سے بھی، اور اپنے شباب سے بھی، اور ماحول کے ان تقاضوں سے بھی جو تمہیں کالج سے کوسوں دور میرے ہمراہ لے آئے۔

اب میں اکیلا ہوں، اور فضا لامحدود ہے، اور پگڈنڈی سانپ کے سے بل کھانے لگی ہے، اور الاؤ بھڑک اٹھا ہے، آسمان بھڑک اٹھا ہے، سارا اُفق بھڑک اٹھا ہے، کہاں ہیں میرے رفیق، کہ اکیلا شخص روتے بھی ہنستا لگتا ہے، پگڈنڈی الاؤ کے سینے میں گھستی نظر آتی ہے، اس الاؤ کو عبور کرکے مجھے اپنے ذہنی تقاضوں کا اُفق ملیگا، اور اسی افق کی دھار پر میری صدیوں کی پرانی منزل اپنے نیچے سے کنگوروں اور گول گول برجیوں سمیت اپنے محرابی دروازے وا کئے میرے انتظار میں ہوگی!

میری تھکن بے معنی ہے، اور میری ماندگی قطعی بے بنیاد، گلے کی رگوں کا تناؤ اور آنکھوں کے سامنے تیرتے ہوئے بادلوں کے سائے، اور پگڈنڈی کی کروٹوں پر کروٹیں ——

کیا یہ راستہ ہمیشہ ایک ہی سی دھاری ہی رہے گا، کیا یہ پگڈنڈی ایک کھلی اور سیدھی سڑک میں کہیں نہیں بدلے گی، جس پر مجھے کوئی نیا ہمسفر مل جائے، یا جہاں سے کوئی کار گذرے، اور میں اپنی منزل کو توقع سے پہلے پا لوں!

تیری بھرائی پیاس بجھانے آئی ہے، اختر پیچھے رہ گیا ہے محترمہ، اور میرے پاس آنسو نہیں، میری آنکھوں میں الاؤ کے شعلے ہیں، اب الاؤ اُبھر کر فضا میں معلق ہو گیا ہے، کھیت لہلہا رہے ہیں، درختوں کی شاخیں رقصاں ہیں جھاڑیاں پھدیاں اور مولے پھدک رہے ہیں، پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ ایک ننھی سی ندی بہہ رہی ہے، اور پگڈنڈی پھیل رہی ہے، اس پر ان گنت قدموں کے نشان ہیں، یہ کون تھے جو مجھ سے پہلے منزل پہ پہونچے، آواز دو مجھے، میرے اجنبی دوستو! مجھے پکارو، کہ اگرچہ پگڈنڈی ایک صاف اور سیدھی سڑک میں بدل چکی ہے مگر میری پنڈلیوں کے پٹھے کٹ رہے ہیں۔

تم بھول جاؤ کہ ایک شب تمہارے ذہن میں ایک نئی زندگی کا الاؤ بھڑکا تھا، اب تمہارا گھٹ گھٹ کر رینگنا بے معنی ہے، پڑے رہو یہیں، جہاں لاکھوں انسانی ڈھانچے بکھرے پڑے ہیں، مکڑیوں نے انکی پسلیوں میں جالے بُن لئے ہیں، اور کھوپڑیوں میں گھاس اُگ رہی ہے، اس سڑک پر

کوئی کار نہیں آئیگی، کار یہ حقیقت کی سڑکوں پر چلتی ہیں اور یہاں گرد و غبار ہے، دلدلیں ہیں، کھڈے ہیں [illegible]

طاہرہ دیوی شیرازی

تار کے کھمبے

ریاست خیر البشر کی نواب زادی سلیمہ زمانی صاحبہ کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ وہ نہایت ہمدرد اور وسیع القلب ہیں اور ساتھ ہی ساتھ حد درجہ مخیر بھی ہیں کبھی کوئی حاجت مند اپنی مراد پوری کئے بغیر ان کے دروازے سے نہیں لوٹتا۔ وہ غریبوں اور محتاجوں کی مالی مدد کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہیں۔ بیسیوں بیواؤں کے وظیفے اُن کی جیب خاص سے مقرر ہیں۔ سینکڑوں یتیم ان کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں۔ ہر قومی کام کا سوال اُٹھتے ہی چندے کی رقم ان کی طرف سے پہنچ جاتی ہے مگر کبھی کسی پر اپنا نام ظاہر ہونے نہیں دیتیں۔ وہ ہمیشہ اس اُصول پر کاربند رہتی ہیں کہ تم اللہ کی راہ میں ہر چیز اس طرح پوشیدہ طور پر دو کہ دیتے وقت دائیں ہاتھ کی خبر بائیں ہاتھ کو ہونے نہ پائے۔

کچھ انہی باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے "دار الفلاح" نامی یتیم خانہ کے مہتمم خاص نے انہیں دعوت دی کہ کسی روز از راہِ کرم قدم رنجہ فرما کر یتیم خانے کا معائنہ کریں اور اپنے قیمتی مشورے سے ہمیں مستفید فرمائیں کہ قومی خدمات کے سلسلہ میں ہمارا طریقۂ کار کس حد تک درست ہے اور اگر کوئی خامی یا کمی باقی رہ گئی ہو تو اُسے کس طرح پورا کیا جائے۔

نواب زادی صاحبہ نے اپنی بڑھتی ہوئی مصروفیات کے باوجود اس دعوت کو قبول کر لیا اور معائنے کی تاریخ بھی مقرر کر دی تاکہ مناسب انتظامات پہلے سے عمل میں آجائیں۔

علامہ قادری صاحب کئی سال سے یتیم خانے کے مہتمم خاص تھے۔ اُنہوں نے کسی معاوضے کے بغیر اپنی تمام زندگی قومی خدمات کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ سب جانتے تھے کہ موروثی جائداد سے جو تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی تھی، بس اسی پر اکتفا کرتے تھے، اپنے ذاتی خرچ کے لئے نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے اور نہ یتیموں کے نام پر جمع کی ہوئی امدادی رقم پر لالچ کی نظر ڈالتے۔ وہ اپنے آپ کو ان سفلی چیزوں سے بلند رکھتے ہوئے لاوارث بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے اس درجہ مصروف رہتے کہ کبھی کبھی شریکِ حیات سے بدمزگی بھی ہو جاتی۔ اس نیک بخت کو شکایت تھی کہ مولانا یتیم خانے کے ایسے گرویدہ ہوتے ہیں کہ گھر بار کی مطلق فکر نہیں رہی ہے۔ دن تو دن اکثر راتوں کو بھی اپنے مکان پر آنے کی پروا نہیں کرتے میں خواہ مخواہ انتظار ہی انتظار میں دہلیز پر بیٹھی ٹکٹکی لگائے جاگتی رہتی ہوں حالانکہ وہ رات کی تعلیم و تربیت ختم کر کے وہیں یتیم خانہ کی کسی کوٹھری میں پڑ رہتے ہیں۔

یہ غنیمت ہے کہ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی ورنہ ایسی صورت میں اپنے بچوں کی پرورش اور بھی دوبھر ہو جاتی۔

علامہ قادری صاحب نے جب سُنا کہ نواب زادی صاحبہ تشریف لا رہی ہیں تو اُنہوں نے پہلے سے تمام انتظامات شروع کر دئے۔ یتیم بچوں کو حکم دیا کہ اپنی اپنی وردیاں جو محض سستی اور میل خوری ہونے کی وجہ سے سلوائی تھیں، ایک دن میں دھو کر سکھا لیں تاکہ اُن کے سامنے سب صاف ستھری حالت میں نظر آئیں۔ البتہ گھر پر موجود ہونے کے باوجود خود اُنہوں نے کوئی نئی پوشاک اس روز نہیں پہنی بلکہ دھوبی کے گھر کے دُھلے ہوئے معمولی کپڑے پہن لینے کافی سمجھے۔ رنگ برنگ کی کاغذی جھنڈیوں سے عمارت کے صحن کو سجا دیا گیا۔ پھولوں کے دس بارہ گملے اِدھر اُدھر سے منگوا کر قرینے سے رکھ دئے تاکہ رونق بڑھ جائے۔ اور کونے کونے چپے چپے کی جھاڑو دے ڈالی جس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مکڑیوں کے جالے، مچھر اور پسّو لئے جھینگر کم ہو گئے۔

علامہ صاحب نے سب بچوں کو اجتماعی اور انفرادی حیثیت سے مناسب ہدایات دیں کہ نواب زادی صاحبہ کے آنے پر رسمِ خیر مقدم ادا کرنے کے علاوہ یہ کس طرح ظاہر کیا جائے کہ یتیم خانہ میں تعلیم و تربیت کا انتظام نہایت عمدہ اور معیاری ہے۔ اگر کوئی کمی ہے تو محض اس لئے کہ فنڈ میں روپیہ ناکافی ہونے کے باعث بہت سی ضرورتیں پوری نہیں کی جا سکتیں

ان یتیم بچوں نے حالی کی دو تین قومی نظموں اور اقبال کے ترانوں کے علاوہ ایک لمبا قصیدہ بھی زبانی یاد کر لیا جو نواب زادی صاحبہ کی شان میں تھا اور اسی محلے کے ایک شاعر نے علامہ صاحب کی پیش کی ہوئی چائے کی دعوت قبول کر کے اُن کی خاطر نظم کر دیا تھا۔ اس قصیدے کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ نواب زادی صاحبہ پر خاطر خواہ اثر ہو اور وہ یتیم خانہ کے امدادی فنڈ میں کچھ رقم داخل کر جائیں۔

نواب زادی صاحبہ اپنی ایک سہیلی اور دو کنیزوں کے ہمراہ نقاب پوش حالت میں تشریف لائیں۔ سب انتظامات چونکہ مکمل ہو چکے تھے، اس لئے رسمی جلسہ کی کارروائی تلاوتِ قرآن مجید سے شروع ہوئی۔ نظمیں پڑھی گئیں، ترانے ایک سنگت میں گائے گئے اور جب ایک بڑی عمر کے لڑکے نے جو نسبتاً زیادہ سمجھدار تھا خاص خاص الفاظ پر زور دیتے ہوئے قصیدہ سُنانا شروع کیا تو نواب زادی صاحبہ ضرورت سے زیادہ داد دینے لگیں اور جب تفتیش کر کے انہیں معلوم ہوا کہ یہ قصیدہ خود علامہ صاحب کی طرازِ فکر و دماغی کاوش کا نتیجہ ہے تو اُنہوں نے تعریف کرنے کے

ساتھ ساتھ شکریہ بھی ادا کیا۔

اس مختصر سے جلسے کے بعد یتیم خانے کے مختلف حصّوں کا معائنہ شروع ہوا اور نواب زادی صاحبہ نے جلدی ہی تسلیم کر لیا کہ واقعی بہت سی ضروری چیزوں کی کمی ہے۔

سب کمروں اور کوٹھڑیوں کو دیکھتی بھالتی جب وہ کتب خانہ میں پہنچیں تو وہاں تین چار بچّے آپس میں لڑ رہے تھے یہ بات انہیں کسی قدر بُری معلوم ہوئی۔ چنانچہ اصلیت معلوم کرنے کی غرض سے انہوں نے پوچھا۔

"کیوں بچّو! تم کیوں لڑ رہے ہو؟ یہ بات اچھی نہیں ہے۔"

ان میں سے ایک لڑکا بسور کر بولا۔

"میں علی بابا کا قصّہ پڑھ رہا تھا اس شمیم نے کتاب میرے ہاتھ سے چھین لی اور اب واپس نہیں دیتا۔"

اس پر شمیم سے خاموش نہ رہا گیا۔ وہ بھی بول پڑا۔

"کل یہ قصّہ میں نے شروع کیا تھا میں نے کہا کہ پہلے میں ختم کر لوں۔ تم بعد میں پڑھ لینا۔"

اس پر نواب زادی صاحبہ نے پہلے لڑکے سے کہا۔

"بیشک، یہ ٹھیک ہے۔ شمیم کو وہ قصّہ پہلے ختم کر لینا چاہیئے جو شروع کیا جا چکا ہے۔ آج تم کوئی اور کتاب کیوں نہیں پڑھ لیتے۔"

پہلے لڑکے نے اسی انداز سے دوبارہ بسور کر کہا۔

"اور کیا پڑھوں؟ کتب خانے میں صرف پانچ چھ کتابیں ہیں جو کئی کئی دفعہ پڑھ لیں۔ اب ان میں جی نہیں لگتا علی بابا کا قصّہ ایک دفعہ پڑھا تھا اس لئے دوبارہ پڑھنا چاہتا تھا۔"

علامہ صاحب نے نواب زادی صاحبہ کو بتایا کہ یہ بچّے قصّے کہانیاں بہت دلچسپی سے پڑھتے ہیں لیکن ان کا شوق پورا نہیں ہو سکتا کیونکہ ہمارے پاس کچھ زیادہ کتابیں نہیں ہیں۔ نہ فنڈ میں اتنی رقم ہے کہ ہر مہینے چند کتابیں، نئی نہ سہی پُرانی ہی، خرید لیا کریں۔

نواب زادی صاحبہ نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے یقین دلایا کہ مالی امداد کے سلسلے میں ہر ممکن صورت پیدا کر دی جائے گی

اور پھر وہ علامہ صاحب کا شکریہ ادا کر کے تشریف لے گئیں

دس پندرہ دن کے بعد نواب زادی صاحبہ کو ایک زنانے جلسے کی صدارت کھیلوں کے انعامات تقسیم کرنے کا فخر حاصل ہوا۔ اپنی مختصر صدارتی تقریر میں انہوں نے اس امر پر زور دیا کہ "نوجوان لڑکیوں کے لئے کھیل کود بہت ضروری ہے کیونکہ تفریحِ طبع حاصل ہونے کے علاوہ اس سے حُسن و رعنائی اور صحت میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ کھیل کود پر تعلیم کو قربان کر دیا جائے۔ مدرسے کی پڑھائی پہلی چیز ہے۔ البتہ فالتو وقت میں قصّے کہانیوں کی دلچسپ کتابوں کا مطالعہ بھی ہونا چاہیئے۔"

اور عین اس موقع پر انہیں یتیم خانے کے بچّے یاد آ گئے چنانچہ بہ تفصیل تذکرہ انہوں نے بتایا کہ ان یتیموں کو مالی امداد کی سخت ضرورت ہے۔ اس لئے جن بہنوں سے ممکن ہو حسبِ توفیق کچھ نہ کچھ بھیج دیں۔ اگر نقد رقم ممکن نہ ہو سکے تو قصّے کہانیوں کی وہ کتابیں ہی غنیمت ہیں جو کئی کئی بار پڑھنے کے بعد اب دل سے اتر گئی ہوں۔

ہر خاتون نے اپنی اپنی گردن کو اس طرح جنبش دی گویا وہ نواب زادی صاحبہ کی ہم خیال ہے اور بہت جلد ان کے مشورے کو عملی جامہ پہنائیگی۔

جلسے کے دوسرے دن سے لڑکیوں میں کھیل کود کا شوق بڑھنے لگا قصّے کہانیوں کی طرف بہت کم نے توجّہ کی۔ اور ان میں سے صرف ایک کو یتیم خانے کے بچّوں کی ضرورت یاد رہی۔

اُس نے ایک روز موقع پا کر اپنے بھائی سے جو ایک قومی اخبار کے دفتر میں بطور مدیر معاون کام کرتا تھا کہا۔ "بھیّا "دار الصلاح" کے یتیم خانے کے بچّوں کے لئے قصّے کہانیوں کی کچھ کتابیں تفریحی مطالعہ کے واسطے درکار ہیں۔ اگر ہو سکے تو اپنے اخبار میں ایک اعلان چھاپ دو کہ جن بھائیوں اور بہنوں کے پاس دلچسپ اور مفید کتابیں فالتو ہوں وہ یتیم خانے کے مہتمم خاص کے پاس بھجوا دیں تاکہ بچّے انہیں پڑھ کر اپنا شوق پورا کر سکیں۔"

ان بھائی صاحب نے صاف لفظوں میں وعدہ تو نہیں کیا کیونکہ مدیر معاون ہونے کی وجہ سے خود انہیں کوئی اختیار حاصل نہیں تھا اور اخبار میں تمام اعلانات اُجرت پر شائع ہوتے تھے، تاہم انہوں نے وعدہ کیا کہ میں مدیر اعلیٰ سے جو اخبار کے مالک بھی ہیں، ذکر کر کے زور دونگا کہ ضرورتِ قومی کا لحاظ رکھتے ہوئے اس اعلان کو بلامعاوضہ شائع کر دیا جائے تو اچھا ہے۔

تین چار دن تک تو بھائی صاحب اپنے کام کاج میں اس طرح پھنسے رہے کہ اس اعلان کے متعلق گفتگو کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ تاہم ایک روز جب اُنکے مدیرِ اعلیٰ محویت کی حالت میں چند اصلاحی نظمیں اپنے اخبار کے واسطے لکھنے میں مشغول تھے اور قومی خدمت کا احساس ان کے دل و دماغ پر حاوی تھا، انہوں نے اس وقت کو غنیمت جان کر ذکر چھیڑ دیا۔

مدیرِ اعلیٰ نے پہلے تو اُجرت نہ ملنے کے خیال سے ناک بھوں چڑھا کر انکار کر دینا چاہا مگر پھر راضی ہو گئے اور فوراً قلم اُٹھا کر خود ہی اس اعلان کا مسودہ کیفیتِ سکر سے پیدا ہو جانے والی صلاحیت کے ماتحت مناسب الفاظ میں تیار کرنے لگے انہوں

سے لکھنا شروع کیا۔

قوم کے چند یتیم و لاوارث بچے
جن کا آپ کے سوا کوئی نہیں
مع اپنے ذوقِ مطالعہ کو تسکین دینے کے لئے آپ کی نظرِ عنایت
کے محتاج ہیں۔ آپ کی نگاہِ لطف و کرم ان کے مایوس دلوں کو
شادمانی بخش سکتی ہے۔ آپ کی دریا دلی ان کی تشنہ کامی کا
واحد علاج ہے۔ ذرا وسیع القلبی سے کام لیجئے۔ چند دلچسپ
اور مفید کتابیں جو آپ کے لئے بیکار ہوں، ان کے واسطے
نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ یا اپنی آمدنی کا ایک مختصر
حصہ ان کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیجئے تاکہ وہ خود
خرید لیں۔ "دارالفلاح" نامی یتیم خانہ کے مہتمم خاص دستی یا
ڈاک کے ذریعہ بھیجا ہوا آپ کا ہر تحفہ بصد شکریہ قبول کرنے کے
لئے ہر وقت تیار ہیں۔"

اس اعلان کی عبارت کے ساتھ ساتھ مسودہ مل جانے کے بعد نائب مدیر نے مناسب سمجھا کہ صفحۂ اوّل پر مناسب جگہ اس کے اندراج کیلئے مخصوص کر دی جائے۔

کاتب صاحب نے اسے نسبتاً ذرا جلی حروف میں اس طرح لکھ کر کہ اخبار پڑھنے والوں کی توجہ فوراً جذب ہو جائے، اپنا فرض پورا کیا۔ اور اس طرح وہ بھی ثوابِ دارین حاصل کرنے میں برابر کے شریک ہو گئے۔

اخبار فروشوں نے، جو پہلے صفحے کی موٹی موٹی سرخیاں بآوازِ بلند بیان کر کر کے سڑکوں پر اخبارات بیچنے کے عادی ہوتے ہیں، چین کی خانہ جنگی اور جاوا کی لڑائی کا حال سنانے کے ساتھ یہ بھی کہا کہ قوم کے چند یتیم و لاوارث بچوں کا آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ انکی ہر طرح مدد کیجئے۔

معلوم نہیں کس طرح شام کے وقت یہ خبر ریڈیو سے بھی نشر ہو گئی کہ دارالفلاح کے یتیم بچے قصے کہانیوں کے بہت شوقین ہیں۔ اپنی فالتو کتابیں انہیں بھیجکر ثواب حاصل کیجئے۔

چند دن کے بعد ایک مفلوک الحال بوڑھا ایک فاقہ زدہ لڑکے کو ساتھ لئے "دارالفلاح" نامی یتیم خانے کے دروازے تک پہونچا اور مہتمم خاص سے مل کر کہنے لگا۔

"میرے اس بچے کو قصے کہانیوں کا بہت شوق ہے۔ اس کے لئے میں نے یہ کتابیں پچھلے سال خریدی تھیں۔ یہ کئی بار ان کا مطالعہ کر چکا ہے۔ یہ سب کی سب بہت ہی دلچسپ اور مفید ہیں۔ اس نے اخبار میں اعلان دیکھتے ہی مجھ سے کہا کہ یہ کتابیں یتیم خانے کو دیدی جائیں۔ از راہ کرم آپ ان کو قبول کریں۔ اگرچہ یہ کسی لائق نہیں ہیں مگر میرے بچے کی دلی خواہش ہے۔"

علامہ قادری صاحب نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کتابیں قبول کرلیں اور بوڑھے سے اس کا نام پوچھنا چاہا۔

"بھلا اس کی کیا ضرورت ہے؟ رہنے بھی دیجئے۔" بوڑھے نے ٹالتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں۔ ہمیں اپنے رجسٹروں میں اندراج کرنا ہوگا۔"

"صرف کتابیں درج کر لیجئے۔ دینے والے کے نام سے کیا فائدہ۔"

بوڑھے نے یہ الفاظ کہے اور اپنے بچے کو ساتھ لیکر چلا گیا۔

"دارالفلاح" نامی یتیم خانہ وہ خاص مرکز تھا جہاں سے ایک پیغام بھیجا گیا اور مفلوک الحال بوڑھے کے فاقہ زدہ بچے کا دل وہ مقام تھا جہاں اس پیغام کی آواز صحیح ہو کر سنائی دی۔ باقی تمام درمیانی لوگ تار کے کھمبے تھے جو پیغام رسانی کے سلسلہ میں صرف ممد و معاون ثابت ہوئے اور یوں ہی اپنی جگہ بالکل جامد و ساکت اور بے حس رہے۔

ساقی بُک ڈپو کی مطبُوعات

گذرگاہِ خیال:- ظفر قریشی دہلوی کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ۔ ظفر قریشی نے پندرہ سال کے عرصے میں سینکڑوں افسانے لکھے ہیں اور یہ افسانے اُن سب کا نچوڑ ہیں۔ ان کی کہانیوں کے پلاٹ دلچسپ اور طرزِ بیان دلکش ہوتا ہے۔ قیمت عہ

دریچے:- ظفر قریشی دہلوی بی۔ اے کے بارہ نئے افسانوں کا مجموعہ۔ ظفر قریشی نے افسانہ نگاری میں ایک نیا اسلوب ایجاد کیا ہے جو مؤثر اور نہایت دلکش ہے۔ کتاب مجلّد اور نظر فریب سرورق سے آراستہ ہے۔ قیمت دو روپے!

چندرا موہنی:- حُسن و عشق کی داستان غمناک انجام۔ سچی محبت میں چندرا موہنی نے کیسی کیسی مصیبتیں اُٹھائیں۔ یہاں تک کہ موت کی آغوش میں جا سوئی۔ اس کتاب کے مطالعے سے آپکی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑیں گے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصولڈاک!

ملنے کا پتہ:- ساقی بُک ڈپو، دھلی

حبیب اشعر

شیطان

سمعان پادری، روحانیات کی باریکیوں کا عالم تھا اور لاہوتی مسائل کا بحرِ بیکراں، صغیرہ و کبیرہ گناہوں کا رمز شناس تھا، اور دوزخ، اعراف اور بہشت کے رازوں کا امین۔

وہ شمالی لبنان کے ایک ایک گاؤں میں جاتا، وعظ کہتا اور لوگوں کو شیطانی پھندوں سے نکال کر اُن کی ذہنی بیماریوں کا علاج کرتا۔ اُس کی ان کوششوں نے شیطان کو اس کا دشمن بنا دیا اور وہ شب و روز اس سے برسرِ پیکار رہنے لگا۔

دیہاتی سمعان پادری کی بے انتہا عزت کرتے اور سونے چاندی کے عوض اس کی نصیحتیں اور دعائیں حاصل کرکے خوش ہوتے۔ ان میں سے ہر ایک سبقت کرتا کہ اپنے درختوں کے بہتر سے بہتر پھل اور اپنے کھیتوں کی بہتر سے بہتر پیداوار اسکی خدمت میں پیش کرے۔

موسمِ خزاں کا ذکر ہے ایک دن سمعان پادری اپنے گاؤں کی طرف جاتے ہوئے، جو اُن پہاڑوں اور وادیوں میں تنہا واقع تھا، کسی ویران مقام سے گزر رہا تھا کہ سڑک کی طرف سے ایک دردناک آواز اس کے کانوں میں آئی۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ ایک برہنہ شخص پتھروں پر پڑا تھا، اس کے سر اور سینہ کے گہرے زخموں سے جیتا جیتا خون نکل رہا تھا اور وہ التجا آمیز لہجہ میں پکار رہا تھا "مجھے بچاؤ! میری مدد کرو! میں مر رہا ہوں، مجھ پر رحم کھاؤ!!"

سمعان پادری اس منظر سے حیرت زدہ ہوکر ٹھہر گیا اور اس درد سے بے چین شخص کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے دل میں کہنے لگا "یہ کوئی سنگدل ڈاکو ہے! معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کسی راہ چلتے کو لوٹنا چاہا لیکن وہ اس پر غالب آگیا یہ اس وقت نزع کی حالت میں ہے، اگر میری موجودگی میں مرگیا، تو میں ناکردہ گناہ خواہ مخواہ اس جرم میں پکڑا جاؤنگا"

وہ آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ مجروح نے یہ کہہ کر اُسے روک لیا "مجھے تنہا نہ چھوڑ! تُو مجھے جانتا ہے اور میں تجھے جانتا ہوں، اگر تو مجھے چھوڑ کر چلا گیا تو میں یقیناً مرجاؤں گا!!"

پادری کی رنگت پیلی پڑگئی اور ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے خود سے کہا "میرا خیال ہے کہ یہ ان دیوانوں میں کا ایک دیوانہ ہے، جو جنگل جنگل بھٹکتے پھرتے ہیں"

اس نے اپنے خیالات کا رخ بدلا اور پھر اپنے دل سے کہنے لگا "اسکے زخموں کا منظر مجھے خوف زدہ کررہا ہے۔ لیکن میں اس کے ساتھ کیا سلوک کروں؟ روحانی طبیب جسمانی بیماریوں کا علاج نہیں کرسکتا!"

پادری نے جانے کے ارادے سے دو چار قدم اُٹھائے اور مجروح پتھر کو پگھلا دینے والی آواز میں چلّایا "میرے قریب آ! ہم دونوں عرصۂ دراز سے ایک دوسرے کے دوست ہیں، تو سمعان پادری ہے ــــ پاکباز اسقفِ اعظم! اور میں ــــ میں ــــ مجبور ہوں، نہ دیوانہ! میرے پاس آ! اور مجھے اس ویران جنگل میں تنہا مرنے کے لئے نہ چھوڑ! میرے نزدیک آ، تاکہ میں تجھے بتاؤں میں کون ہوں؟"

سمعان پادری مجروح کے پاس گیا اور جھک کر اُسے نہایت غور سے دیکھا، اس کے خد و خال عجیب و غریب تھے، جن سے ذہانت کے ساتھ عیاری، دلکشی کے ساتھ کراہت اور نرمی کے ساتھ خباثت نمایاں تھی۔ پادری جھجک کر پیچھے ہٹا اور چلّایا "تو کون ہے؟"

مجروح نے دھیمی آواز میں کہا "مقدس باپ! خوف نہ کھا، ہم دونوں بہت پُرانے دوست ہیں۔ مجھے اٹھا اور کسی قریبی نہر پر لے جاکر اپنے رومال سے میرے زخم دھو دے!"

پادری نے بلند آواز میں کہا "مجھے بتا کہ تو کون ہے؟ میں تجھے نہیں جانتا کو، مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی تجھے دیکھا ہو!"

مجروح نے جواب دیا، اس طرح کہ موت کی تھرتھراہٹ اسکی آواز میں شامل تھی "تو جانتا ہے کہ میں کون ہوں؟ تو مجھ سے ہزاروں دفعہ ملا ہے اور ہر جگہ تو نے میری صورت دیکھی ہے میں مخلوقات میں سب سے زیادہ تجھ سے قریب ہوں بلکہ میں تجھے تیری زندگی سے زیادہ عزیز ہوں"

پادری نے چلّاتے ہوئے کہا "تو جھوٹا اور فریبی ہے حالانکہ مرنے والے کو سچ بولنا چاہیئے! میں نے اپنی زندگی میں کبھی تیری صورت نہیں دیکھی ــــ بتا تو کون ہے؟ ورنہ میں تجھے چھوڑ کر چلا جاؤں گا اور تو خون بہتے بہتے مرجائیگا!"

مجروح نے قدرے حرکت کی اور پادری کی آنکھوں کو نہایت غور سے دیکھنے لگا۔ اسکے لبوں پر معنی خیز تبسم نمودار ہوا، اور اس نے نرم، شیریں اور گہری آواز میں کہا "میں شیطان ہوں!"

پادری نے ایک ہولناک چیخ ماری، جس سے وادی کا ذرہ ذرہ لرز اُٹھا۔ پھر آنسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اس نے فیصد کی روشنی میں جو گاؤں کے

کلیسا کی دیواروں میں لٹکا ہوا تھا، اُس نے دیکھا کہ مجروح کا جسم اپنی ترکیب اور آثار کی بنا پر ابلیسی ہیئت پر منطبق ہوتا ہے۔ تو کانپتے ہوئے چلّایا " اللہ نے مجھے تیری جیسی صورت اس لئے دکھائی ہے کہ میرے دل میں تیری طرف سے کراہت اور بڑھ جائے! تجھے ابدالآباد تک مردود و ملعون ہی رہنا چاہیئے "۔

شیطان نے کہا "مقدس باپ عجلت بازی سے کام نہ لے اور بیہودہ گفتگو میں وقت ضائع نہ کر! میرے قریب آ، اور اس سے پہلے کہ میری زندگی اخون کی شکل میں میرے جسم سے بہہ جائے میرے زخموں پر مرہم رکھ!"

پادری نے جواب دیا " وہ ہاتھ جو روزانہ خداوندی قربانیوں کے لئے اُٹھتا ہے، تیرے جہنمی شراروں سے بنے ہوئے جسم کو نہیں چھو سکتا تو زمانہ کا دُشمن اور انسانیت کی بربادی کے درپے ہے۔ اس لئے تجھے مرنا ہی چاہیئے اس حالت میں کہ دُنیا کی زبانیں تجھ پر لعنت بھیجیں اور زمانہ کے ہونٹ تجھے ملامت کریں "۔

بے چین ہو کر شیطان نے کہا " تو نہیں جانتا کہ کیا کہہ رہا ہے؟ اور تجھے نہیں معلوم کہ تو کس گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے؟ سُن! میں تجھے اپنی کہانی سناتا ہوں؛ آج میں ان وادیوں میں تنہا چلا جا رہا تھا جب یہاں پہونچا تو کم ظرف فرشتوں کی ایک جماعت سے دوچار ہوا۔ وہ سب کے سب مجھ پر ٹوٹ پڑے اور مجھے بُری طرح زخمی کر دیا۔ اگر ان میں سے ایک فرشتہ کے پاس دو دھاری تلوار نہ ہوتی تو مَیں یقیناً ان سب کو مار گراتا۔ لیکن اسلحہ بند کے مقابلہ میں نہتا کیا کر سکتا ہے؟ "

شیطان تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا اور اُس نے اپنا ہاتھ پہلو کے ایک گہرے زخم پر رکھ لیا۔ دوبارہ اُس نے کہنا شروع کیا "لیکن وہ مسلّح فرشتہ، جس کے متعلق میرا خیال ہے کہ میکائیل تھا، بڑا پھرتیلا اور تلوار چلانے میں کمال رکھتا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر مَیں زمین پر نہ گر پڑتا اور میری حالت مُردوں کی سی نہ ہو جاتی تو میرا ایک ایک عضو علیحدہ نظر آتا "۔

فتحمندانہ لہجہ میں پادری نے کہا "خدا میکائیل کا مرتبہ بلند کرے کہ اس نے انسانیت کو اسکے بدترین دشمن سے نجات دلا دی "۔

شیطان نے جواب دیا " انسانیت سے میری دشمنی اس قدر اندھی نہیں ہے جس قدر تیری دُشمنی خود اپنی ذات سے ہے۔ تو میکائیل کو مبارکباد دے رہا ہے، حالانکہ اس نے تیرے ساتھ ذرہ برابر سلوک نہیں کیا اور بیچارگی کے عالم میں میرے نام پر لعنت بھیج رہا ہے حالانکہ مَیں تیری راحت و کامیابی کا سبب تھا اور ہوں! کیا تو میری مہربانیوں اور احسانوں سے انکار کر رہا ہے؟ ایسی حالت میں جبکہ تو میرے ہی سایہ میں پل رہا ہے؟ کیا یہ میرا وجود نہیں ہے، جس نے تیرے لئے ایک پیشہ وضع کیا؟ کیا یہ میرا نام نہیں ہے، جس نے تیرے اعمال کے لئے ایک ضابطہ بنایا؟ کیا میرے ماضی نے تجھے میرے حال اور مستقبل سے بے نیاز کر دیا ہے؟ کیا تیری دولت و ثروت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ اب اس میں اضافہ کی مطلق گنجائش نہیں؟ کیا تو نہیں جانتا کہ تیرے بیوی بچے اور عزیز اقارب مجھے کھو دینے سے اپنا رزق کھو دیں گے، بلکہ میرے مرنے سے بھوکوں مر جائیں گے؟ تو کیا کرے گا، اگر مشیت مجھے فنا کر دے گی؟ کونسا پیشہ اختیار کرے گا، اگر زمانے کی ہوائیں میرے نام کو مٹا ڈالیں گی؟ تو لوگوں کو میری پیدا کردہ مصیبتوں اور پھندوں سے بچانے کے لئے پچیس برس سے ان کوہستانی گاؤں میں گھومتا پھر رہا ہے اور لوگ تیرے وعظوں کو دولت اور غلّہ کے عوض خرید رہے ہیں۔ بتا! اگر کل انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ ان کا دشمن شیطان مر گیا ہے اور اب وہ اس کے پھندوں سے آزاد ہیں تو وہ تجھ سے کیا خریدیں گے؟ اگر تیرا یہ وظیفہ، جو شیطان سے مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں تجھے ملتا ہے، اسکے مرجانے سے بند ہو گیا، تو لوگ تجھے کس بات کا وظیفہ دیں گے؟ تو کہ لاہوتی مسائل کا رمز شناس ہے، کیا نہیں جانتا کہ شیطان کا وجود ہی اسکے دشمنوں ـــ پادریوں ـــ کی تخلیق کا سبب ہے؟ اور یہ پرانی عداوت گویا ایک مخفی ہاتھ ہے، جو سونے چاندی کو ایمان پرستوں کی جیب سے واعظوں اور مرشدوں کی جیب میں منتقل کرتا ہے؟ تو کہ سمجھ بوجھ والا عالم ہے، کیا نہیں جانتا کہ سبب کے زوال سے مسبب خود بخود زائل ہو جاتا ہے؟ پھر تو میرے مرنے سے کیوں خوش ہے جبکہ میری موت تجھے اپنے مرتبہ سے گرا دے گی، تیرا رزق بند کر دے گی اور تیرے بیوی بچوں کے منہ سے روٹی کا ٹکڑا چھین لے گی؟ "

شیطان ایک منٹ کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر بے تابی کی بجائے استقلال کے آثار نمایاں ہوئے اور اُس نے پھر کہنا شروع کیا،

" دیکھ! او مغرور جاہل! مَیں تجھے اس حقیقت کی تصویر دکھاتا ہوں، جس نے میری ہستی کو تیری ہستی میں ضم کر دیا ہے اور میرے وجود کو تیرے وجدان سے مربوط کر دیا ہے۔ آفرینش عالم کی ابتدائی ساعتیں میں، انسان سورج کے سامنے کھڑا ہوا اور اپنا ہاتھ اُٹھا کر پہلی مرتبہ بلند آواز سے کہا " آسمانوں سے پرے خدائے جلیل ہے جو نیکی سے محبت کرتا ہے "۔ پھر اُس نے روشنی کی طرف پیٹھ کر لی اور زمین پر اپنا سایہ پڑتے دیکھ کر چلّایا " اور زمین کی تہوں میں مردود شیطان ہے، جو بدی سے خوش ہوتا ہے "۔ اس کے بعد وہ اپنے غار کی طرف چلا، دل ہی دل میں کہتا ہوا " مَیں دو ہولناک خداؤں کے درمیان ہوں، ایک خدا وہ ہے، جس سے میں منسوب ہوں اور دوسرا وہ، جو پہلے خدا سے برسرپیکار ہے "۔ زمانہ پر زمانہ گزرتا چلا گیا لیکن انسان دو آزاد قوتوں میں گھرا رہا۔ ایک وہ قوت، جو اُسکی رُوح کو بلندیوں پر لے جا کر برکت دیتی ہے، دوسری وہ قوت، جو اس کے جسم کو تاریکیوں میں گرا کر ملعون بناتی ہے۔ تاہم وہ برکت کے معنی سے واقف تھا، نہ لعنت کے مفہوم سے آشنا، بلکہ وہ ان دونوں قوتوں کے درمیان، اس درخت کی مثال تھا جو گرمی اور جاڑے کے درمیان ہو ـــ گرمی، جو اُسے دھانی پوشاک پہناتی ہے اور جاڑا، جو اُسے ننگا بوچا کر دیتا ہے۔ آخر کار جب وہ صبح تمدن ـــ الفتِ بشری ـــ سے دوچار ہوا تو پہلے اُس نے خاندان کی بنیاد ڈالی پھر قبیلہ کی۔ اب اُس کے مشاغل، میلانات کے فرق کی بنا پر متفرق ہو گئے اور مختلف مزاج و مذاق کے اختلاف کی بنا پر مختلف۔ چنانچہ اس قبیلہ کے بعض افراد نے کھیتی باڑی کا پیشہ اختیار کر لیا اور بعض نے معماری کا، بعض کپڑا بُننے لگے اور بعض کا پیشہ

کھو دیے گئے۔ اسی قدیم زمانہ میں کہانت نمودار ہوئی اور یہ پہلا پیشہ تھا جسے انسان نے بغیر کسی فطری ضرورت کے ایجاد کیا۔"

شعلان ایک منٹ تک خاموش رہا، اس کے بعد اس نے ایک قہقہہ لگایا جس سے وادی کا گوشہ گوشہ گونج اٹھا۔ اس نے کراہتے ہوئے اپنے پہلو کو ہاتھ سے دبا لیا، گویا قہقہے نے اس کے زخموں کے منہ کھول دئے ہیں اور سمعان پادری کو غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا،

"کہانت نے اس زمانہ میں جنم لیا، لیکن کس طرح؟ یہ میں ابھی بتاتا ہوں، دنیا کے ابتدائی قبیلہ میں ایک شخص لاوتیس تھا ــــ میں نہیں سمجھ سکا اس نے یہ عجیب و غریب نام اپنے لئے کیوں پسند کیا تھا؟ ــــ بہرحال وہ بہت ذہین مگر نہایت کھوٹا اور سست آدمی تھا جسے زراعت، معماری، گلہ بانی، شکار غرض ہر اس کام سے نفرت تھی جس میں قوتِ بازو یا جسمانی حرکت کی ضرورت ہو اور چونکہ اس زمانہ میں بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے رزق ملنا دشوار ہی نہیں ناممکن تھا اس لئے اس کی اکثر راتیں بھوک کی شدت سے جاگتے کٹتی تھیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے گرمیوں کی رات تھی، اس قبیلہ کے افراد اپنے سردار کے مکان کے گرد بیٹھے اپنی اپنی زندگی کے واقعات دہرا رہے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ نیند آ جائے اچانک اُن میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور چاند کی طرف اشارہ کر کے خوفناک آواز میں چلانے لگا،

"ذرا چاند دیوتا کو تو دیکھو! اس کا چہرہ کتنا ماند پڑ گیا ہے اور روشنی کس حد تک زائل ہو چکی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ آسمانی گنبد میں ایک سیاہ پتھر لٹک رہا ہے" لوگوں نے چاند پر اپنی نگاہیں جما دیں اور یہ دیکھ کر کہ اُن کی راتوں کا دیوتا رفتہ رفتہ ایک سیاہ کرّہ کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نہ صرف یہ کہ زمین کی رنگت بدل رہی ہے، بلکہ وادیاں اور ٹیلے بھی ایک سیاہ چادر میں چھپتے جا رہے ہیں خوف و دہشت سے کانپنے اور چلانے لگے گویا دستِ ظلمت نے اُن کے دلوں کو دبوچ لیا ہے۔

اس وقت لاوتیس جو اس سے پہلے کئی بار کسوف و خسوف کے مناظر دیکھ چکا تھا، آگے بڑھا اور لوگوں کے وسط میں جا کر ہاتھ اُوپر کی طرف اٹھاتے ہوئے۔ اُس نے بلند آواز میں کہا جس سے اس کی ذہانت، تصنّع اور عیاری صاف نمایاں تھی: "لوگو! سجدہ کرو اور سجدہ کرو اور آسمانی امداد کے لئے دعا میں مانگو!! اپنی پیشانیاں زمین پر رگڑو۔ بدی کا تاریک دیوتا، رات کے روشن دیوتا سے برسرِ پیکار ہے اگر وہ غالب آ گیا تو ہم مر جائیں گے اور اگر مغلوب ہو گیا تو زندہ رہ جائیں گے۔ سجدہ کرو، دعائیں مانگو!! اپنی پیشانیاں زمین پر رگڑ دو، بلکہ اپنی آنکھیں بند کر لو، اور سجدہ سے سر نہ اٹھاؤ!! اس لئے کہ اگر تم میں سے کسی نے تاریکی کے دیوتا کو روشنی کے دیوتا سے لڑتے دیکھ لیا تو وہ اپنی بصارت و بصیرت کھو دے گا اور آخر عمر تک اندھا اور پاگل رہے گا۔ لوگو! سجدہ کرو اور اپنے دلوں کی قوت سے روشنی کے دیوتا کو اسکے دشمن کے خلاف مدد پہنچاؤ!!"

لاوتیس اسی لہجہ میں بولتا رہا، وہ اپنے دماغ سے نئے نئے الفاظ تراش رہا تھا اور وہ مقام کلمات دہرا رہا تھا جو اس رات سے پہلے اُس نے سُنے تھے۔ یہاں تک کہ آدھا گھنٹہ گزر گیا اور چاند اپنی اصلی حالت پر آ گیا اب لاوتیس کی آواز پہلے سے بلند ہو گئی اور اس نے مسرّت و کامرانی کے لہجہ میں کہا،

"لوگو! اٹھو اور دیکھو، رات کا دیوتا اپنے شریر دشمن پر غالب آ چکا اور اب ستاروں کی سیر میں مصروف ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تم نے اپنی نمازوں اور دعاؤں سے رات کے دیوتا کو مدد پہونچا کر خوش کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس وقت تم اسے زیادہ روشن اور تابناک دیکھ رہے ہو!!"

لوگوں نے سجدہ سے سر اٹھایا اور چاند کو بہت غور سے دیکھنے لگے اس کی روشن شعاعوں نے ان کے خوف و اضطراب کو مسرّت و اطمینان سے بدل دیا اور وہ مارے خوشی کے اچھلنے کودنے اور ناچنے گانے لگے۔ وہ اپنی لکڑیوں سے تانبے اور لوہے کے گھنٹے بجا رہے تھے اور وادی کی تمام فضاء اُن کی پُرمسرّت چیخ پکار سے گونج رہی تھی۔

اُسی رات قبیلہ کے سردار نے لاوتیس کو بلایا اور کہا: "آج کی رات تم نے وہ کام کیا ہے جو تم سے پہلے کوئی انسان نہ کر سکا۔ تم زندگی کے ان اسرار سے واقف ہو جو تمہارے سوا ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔ خوش ہو جاؤ! کہ آج سے میرے بعد اس قبیلہ کے سب سے بڑے آدمی تم ہو! میں لوگوں سے اگر اپنی بہادری اور قوت کی بنا پر ممتاز ہوں تو تم اپنی عقل اور حکمت کے لحاظ سے ہم سب پر فوقیت رکھتے ہو، یہی نہیں بلکہ تم میرے اور دیوتاؤں کے درمیان ایک ذریعہ ہو، تم مجھے ان کی مرضی سے باخبر کرو گے، ان کے اعمال و اسرار مجھ پر ظاہر کرو گے اور مجھے مشورہ دو گے کہ میں اُن کی محبت و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا کروں؟"

لاوتیس نے جواب دیا: "دیوتا جو کچھ مجھے خواب میں بتائیں گے میں بیداری میں حضور سے عرض کر دوں گا، اور جو راز وہ مجھ پر منکشف کریں گے میں آپ پر ظاہر کر دوں گا ہاں! میں آپ کے اور دیوتاؤں کے درمیان ایک واسطہ ہوں!"

سردار کی باچھیں کھل گئیں اور اُس نے لاوتیس کو دو نہایت شاندار گھوڑے، سات بچھڑے، ستر بھیڑیں اور ستر بکریاں عطا فرما کر کہا "قبیلہ کے لوگ تمہارے لئے ایک ایسا ہی گھر تیار کر دیں گے، جیسا میرا ہے، اور ہر موسم کے خاتمہ پر اپنے باغوں کے پھل اور کھیتوں کی پیداوار تمہاری خدمت میں نذر کے طور پر پیش کریں گے۔ اس طرح تم سرداروں کی طرح نہایت عزّت کی زندگی بسر کرو گے!!"

لاوتیس جانے کے لئے اُٹھا، لیکن سردار نے اُسے یہ کہہ کر ٹھہرا لیا: "لیکن یہ دیوتا کون ہے جسے تم بدی کا دیوتا کہتے ہو؟ کیا یہ وہی دیوتا ہے جس نے رات کے روشن دیوتا سے مقابلہ کی جرأت کی تھی؟ ہم نے اس کے متعلق کبھی کچھ نہیں سُنا، نہ ہمیں اس کے وجود کا علم ہے!!"

لاوتیس نے تھوڑی دیر سر کھجانے کے بعد جواب دیا "پُرانے زمانہ میں ــــ انسان کی پیدائش سے پہلے ــــ تمام دیوتا کہکشاں سے پرے ایک دور دراز مقام پر نہایت امن و خلوص کے ساتھ رہتے تھے۔ بڑا دیوتا جو ان سب کا باپ تھا علم و کمال میں

ن سب پر امتیاز رکھتا تھا اور اس نے اپنی ذات کے لئے بعض خداوندی اسرار محفوظ کر رکھے تھے، جو ناموس ازلی کے پردے میں روپوش ہیں چنانچہ بارھویں زمانہ کے ساتویں عہد میں بعطار نے، جو مہادیو سے نفرت کرتا تھا بغاوت کی اور اس کے مقابلہ پر آکر کہا

"تو نے ہم سے ہستی، ناموس اور زمانہ کے اسرار پوشیدہ رکھ کر مخلوقات پر اپنا مطلق اقتدار کیوں قائم کر رکھا ہے؟ کیا ہم تیری اولاد نہیں ہیں؟ اور کیا تیری قوت اور دوام میں ہماری شرکت نہیں ہے؟"

مہادیو غصہ سے کانپ اٹھا اور اس نے کہا۔ "میں تمام بنیادی اسرار، مطلق اقتدار اور لامحدود قوت، ابدالآباد تک اپنے لئے محفوظ رکھوں گا، اس لئے کہ میں ہی آغاز ہوں اور میں ہی انجام!"

بعطار نے کہا۔ "اگر تو اپنی قوت و جبروت تقسیم کرنے پر تیار نہیں تو میں اور میری اولاد تیرے خلاف علم بغاوت بلند کرتی ہے!"

شدت غضب سے مہادیو اپنے تخت پر کھڑا ہو گیا اس نے ایک ہاتھ سے کہکشاں کی تلوار کھینچی اور دوسرے ہاتھ میں آفتاب کی ڈھال لے لی۔ پھر نہایت خوفناک آواز میں، جس سے دنیا کا ذرہ ذرہ لرز اٹھا، چلایا۔ "اچھا! اگر یہ بات ہے تو اے شریر باغی! میں تجھے اس پست و ذلیل دنیا میں پھینکتا ہوں، جہاں تاریکی ہے اور بدبختی ہے اور جب تک سورج راکھ کا ڈھیر اور ستارے فضا کے منتشر ذرات میں تبدیل نہ ہو جائیں، وہاں اپنی جلاوطنی کے دن آوارگی و گمکردہ راہی میں گزار!"

اسی لئے بعطار دیوتاؤں کے مسکن سے اس پست عالم میں پھینک دیا گیا، جہاں خبیث روحیں رہتی ہیں۔ اور اس نے مہادیو کے دوامی اسرار کی قسم کھا کر فیصلہ کیا کہ وہ ابدالآباد تک اپنے باپ اور بھائیوں کے خلاف آمادۂ پیکار رہے گا اور ہر اس شخص کو گمراہ کرے گا جو اس کے باپ سے محبت کرتا ہے یا اس کے بھائیوں کا احترام کرتا ہے!

سردار کا رنگ زرد پڑ گیا اور اس نے ماتھا سکیڑ کر کہا۔ "اچھا! تو بدی کے دیوتا کا نام "بعطار" ہے!"

لاوتیس نے جواب دیا۔ "اس کا نام بعطار اس وقت تھا، جب وہ دیوتاؤں کے مسکن میں رہتا تھا، لیکن اس عالم میں پھینک دئیے جانے کے بعد اس نے اپنے بہت سے نام رکھ لئے ہیں۔ مثلاً بعلزبول، ابلیس، سفتاتیل، بلیال، زمیال، اہرمن، مارہ، ابعدان اور شیطان ـــــ لیکن ان سب میں زیادہ مشہور نام شیطان ہے!"

سردار نے شیطان کا لفظ کئی بار دہرایا۔ اس کی آواز اس طرح کانپ رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا جیسے کے جھونکوں سے خشک ٹہنیاں میں سرسراہٹ پیدا ہو رہی ہے۔ اس نے پوچھا

"لیکن شیطان تو دیوتاؤں کا مخالف ہے، پھر اسے انسان سے نفرت کیوں ہے؟"

لاوتیس نے جواباً کہا۔ "شیطان اس لئے انسان کی تباہی و بربادی کے درپے ہے کہ وہ اسکے بہن بھائیوں کی اولاد ہے!"

حیرت آمیز لہجہ میں سردار نے کہا۔ "اچھا! تو شیطان انسان کا چچا بھی ہے اور ماموں بھی!"

تشویش و اضطراب کے عالم میں لاوتیس نے جواب دیا! "جی ہاں! لیکن وہ اس کا سب سے بڑا دشمن اور کینہ پرور نگراں ہے، جو اس کے دنوں کو بدبختی اور راتوں کو خوفناک خوابوں سے گراں بار کرتا رہتا ہے وہ ایک قوت ہے، جو آندھیوں کے ذریعہ انسان کے گھروں کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکتی ہے، قحط سالی کے ذریعہ اسکے کھیتوں کو اجاڑ دیتی ہے، وباؤں کے ذریعہ اس کے مویشیوں کو مار ڈالتی ہے اور بیماریوں کے ذریعہ اس کے جسم کو ناکارہ کر دیتی ہے۔ وہ ایک طاقتور لیکن بے ایمان و دغاباز دیوتا ہے، جو ہماری مصیبتوں سے مسرور اور ہماری مسرتوں سے غمگین ہوتا ہے اس لئے ہم پر فرض ہے کہ اس کی فطرت کے ایک ایک گوشہ کو سمجھیں، اس کی ذہنیت کے ایک ایک راز سے واقف ہوں تاکہ اس کے شر اور حیلہ سازیوں سے محفوظ رہیں!"

سردار نے لکڑی کا سہارا لیتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "اس عجیب و غریب قوت کے مخفی راز آج میری سمجھ میں آ گئے، جو آندھیوں کی صورت میں ہمارے گھروں کو تباہ کرتی اور وباؤں کی شکل میں ہمارے مویشیوں کو موت کے گھاٹ اتارتی ہے۔ لاوتیس! مجھے یقین ہے کہ جو راز آج تو نے مجھ پر منکشف کیا ہے، کل تمام آدمیوں پر ظاہر ہو جائے گا اور وہ سب تیرے حضور ہدیۂ عقیدت پیش کریں گے کہ تو نے انہیں انکے سب سے بڑے دشمن کے اسرار سے آگاہ کیا اور بتایا کہ اس کے پھندوں سے کس طرح بچا جا سکتا ہے!"

لاوتیس نے سردار سے اجازت چاہی اور اپنی عقل و ذہانت سے مخمور و شاداں اپنے گھر چلا گیا۔ لیکن سردار اور قبیلہ کے دوسرے افراد ساری رات پریشان خوابوں اور خوفناک تصورات کی بنا پر چونکتے اور جاگتے رہے!

مجروح شیطان تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ سمعان پادری اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب کا جمود تھا اور ہونٹوں پر موت کا تبسم۔

شیطان نے پھر اپنے سلسلۂ گفتگو کا آغاز کیا۔ "کہانت نے اس طرح دنیا میں جنم لیا اور اس طرح میری ہستی اس کے ظہور کا سبب ہوئی۔ لاوتیس پہلا آدمی تھا جس نے میری دشمنی کو باقاعدہ ایک پیشہ بنایا۔ لاوتیس کی موت کے بعد اس کی اولاد کے ذریعہ یہ پیشہ رواج پا گیا اور رفتہ رفتہ ارتقا کی مختلف منزلیں طے کر کے ایک نازک اور مقدس فن

بن گیا جسے صرف وہی لوگ اختیار کر سکتے تھے، جن کی عقل تیز، رُوح شریف، دل پاک اور خیال وسیع ہو۔ چنانچہ جن میں لوگ اس پادری کو سات مرتبہ سجدہ کرتے تھے، جو اپنے منتروں کے ذریعہ مجھ سے برسرِ پیکار ہوتا تھا۔ نینوا میں اس شخص کو، انسان اور دیوتاؤں کے درمیان ایک سنہری کڑی سمجھتے تھے، جو میرے اسرار و رموز سے واقفیت کا دعویٰ کرتا تھا۔ تبت میں اُسے "چاند سورج کا بیٹا" کہتے تھے، جو مجھ سے برسرِ پیکار ہوتا تھا۔ بابل، افسس اور لاذکیہ میں اس کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے اپنے بیٹا بیٹیوں کو بھینٹ چڑھاتے تھے، جو مجھ سے خصومت رکھتا تھا اور یروشلیم اور روما میں اپنی جانیں اس کے حوالے کر دیتے تھے جو مجھ سے نفرت و دُوری کے اظہار میں طرح طرح کے کمالات ظاہر کرتا تھا۔ غرض یہ کہ ہر شہر میں، جو اس زمین پر آباد ہوا میرا ہی نام، مذہب، علم، فن اور فلسفہ کے دائروں کا مرکز رہا۔ چنانچہ عبادت گاہیں میرے زیرِ سایہ قائم ہوئیں، مدارس اور تعلیم گاہوں کی بنیاد میرے مقصد پر رکھی گئی محلوں اور بُرجیوں نے رفعت میرے مرتبہ کی بلندی سے حاصل کی۔ دوسرے الفاظ میں میں ایک قوت ہوں، جو انسان میں عزم و ارادہ پیدا کرتی ہے۔ ایک تصوّر ہوں جو افکار کی جودت و ندرت کا ضامن ہے۔ ایک ہاتھ ہوں جو انسان کے ہاتھوں کو حرکت دیتا ہے۔ میں ازلی اور ابدی شیطان ہوں۔ ہاں وہ شیطان، جو انسان سے اس لئے مقابلہ کرتا رہتا ہے کہ وہ زندہ رہے ورنہ اگر وہ میرے مقابلہ سے بیکار ہو جائے تو بے شک اُس کے افکار کو زنگ آلود کر دے گی، بے حسی اُس کی رُوح کو گھن لگا دے گی اور راحت اس کے جسم کو فنا کر دے گی۔

میں ازلی اور ابدی شیطان ہوں، وہ پُرجوش لیکن خاموش آندھی جو مَردوں کے دماغ اور عورتوں کے سینہ میں طوفان برپا کر کے اُن کو خلوت اور دلوں کو بتخانوں اور خانقاہوں کی طرف اُڑا لے جاتی ہے تاکہ وہ مجھ سے خوفزدہ ہو کر میرے اقتدار کا لوہا مانیں یا پھر بدمعاشی و بدکاری کے اڈّوں کی طرف، تاکہ وہ میری مرضی کے آگے سر جھکا کر مجھ سے خوش کام کریں۔ چنانچہ وہ پادری، جو رات کی خاموشی میں دُعا میں مانگتا ہے اس لئے کہ مجھے اپنے بستر سے دُور رکھے، درحقیقت اس کسبی کی مثال ہے، جو مجھے اپنے بستر پر بلانے کے لئے گڑگڑاتی ہے۔

میں ازلی اور ابدی شیطان ہوں، جس نے معبدوں اور خانقاہوں کی بنیاد خوف اور دہشت پر رکھی اور شراب خانوں اور چکلوں کو لذت اور شہوت رانی کی اساس پر قائم کیا، اس لئے اگر میرا وجود فنا ہو گیا تو دُنیا سے لذت و خوف بھی فنا ہو جائیں گے، اور جانتے ہو! لذت و خوف کے فنا ہو جانے سے کیا ہو گا؟ یہ ہو گا کہ انسان کے دل کی تمام امیدیں اور آرزوئیں فنا ہو جائیں گی اور زندگی ویران و بے کیف ہو کر رہ جائے گی، جیسے بوسیدہ سارنگی جس کا ایک تار سلامت نہ ہو!

میں ازلی اور ابدی شیطان ہوں، جھوٹ، غمازی، تہمت، دغا اور مسخرگی کا خالق، اور اگر یہ چیزیں دُنیا میں باقی نہ رہیں تو انسانی جماعت اُس اُجاڑ باغ کی مثال ہو جائے گی جس میں فضیلت کے کانٹوں کے سوا کوئی چیز نہ اُگے۔

میں ازلی اور ابدی شیطان ہوں، گناہوں کا سرچشمہ! اور اگر گناہ مٹ گئے تو اس سے مقابلہ کرنے والے بھی مٹ جائیں گے اور اُن کے ساتھ تُو، تیری اولاد، تیرے مُرید اور عقیدت مند بھی۔ ہاں میں گناہوں کا سرچشمہ ہوں! تو کیا تُو یہ چاہتا ہے کہ میرے مٹنے سے گناہ بھی مٹ جائے؟ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میرے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ انسانی حرکت بھی رُک جائے؟ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ سبب کے ساتھ مسبب بھی زائل ہو جائے؟ کیا تُو چاہتا ہے کہ میں، جو دُنیا کی چہل پہل کا بنیادی سبب ہوں، اس ویران جنگل میں مر جاؤں؟ جواب دے! اے لاہوتی مسائل کے عالم بے بہا! کیا تو یہ چاہتا ہے کہ وہ اولین تعلق ختم ہو جائے جو میرے اور تیرے درمیان ہے؟"

شیطان نے اپنے بازو پھیلائے، اس کی گردن آگے کی طرف جھک گئی، اور وہ دیر تک کراہتا رہا۔ اپنے سبزی مائل مٹیلے رنگ میں وہ ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے نیل کے کنارے مصری مجسمہ، جو زمانہ کی دستبرد سے بچ گیا ہو۔ اس نے سمعان پادری کو اپنی شعلہ فگن آنکھوں سے گھورا اور کہا: "گفتگو نے مجھے نڈھال کر دیا ہے، حالانکہ میرے زخموں کا تقاضہ یہ تھا کہ میں تجھ سے زیادہ باتیں نہ کروں۔ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ میں نے تیرے سامنے اس حقیقت کی توضیح کی ہے، جسے تو خود مجھ سے زیادہ جانتا ہے اور وہ باتیں بیان کی ہیں جو میری مصلحتوں کے مقابلہ میں تیری مصلحتوں سے زیادہ قریب ہیں۔ اب جو تیرا جی چاہے کر! مجھے اپنی پیٹھ پر اُٹھا کر، اپنے گھر لے جا اور میری مرہم پٹی کر! یا یہیں پڑا رہنے دے کہ میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤں!"

شیطان گفتگو کر رہا تھا اور سمعان پادری سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ حیرت اور پریشانی کے لہجہ میں ہاتھ ملتے ہوئے اُس نے کہا: "مجھے وہ راز معلوم ہو گیا، جو آج سے ایک گھنٹہ پہلے معلوم نہ تھا۔ میری نادانی کو معاف فرما! اب میری سمجھ میں آ گیا کہ تُو دنیا میں آزمائش کے لئے بھیجا گیا ہے اور یہ آزمائش ایک کسوٹی ہے، جس کے ذریعہ اللہ انسان کی قدر و قیمت پہچانتا ہے، بلکہ ایک ترازو ہے جس میں خدا نے بزرگ و برتر رُوح کو تول کر اس کے ہلکے یا بھاری ہونے کا اندازہ کرتا ہے۔ میں نے جان لیا کہ اگر تُو مر گیا تو یہ آزمائش اور اس کے ساتھ وہ معنوی قوتیں ختم ہو جائیں گی، جو انسان کو پاکبازی کی تعلیم دیتی ہیں، بلکہ وہ سبب بھی زائل ہو جائے گا، جو انسان کو نماز، روزہ اور عبادت کی طرف لے جاتا ہے۔ تجھے زندہ رہنا چاہیئے اس لئے کہ اگر تو مر گیا اور لوگوں کو اس کا علم ہو گیا تو وہ دوزخ کے عذاب سے بے خوف ہو کر عبادت چھوڑ دیں گے اور گناہوں کی دلدل میں جا پھنسیں گے۔ تجھے زندہ رہنا چاہیئے اس لئے کہ تیری زندگی نوعِ انسان کو بُرائیوں سے بچاتی ہے۔ رہا میں! سو انسانی محبت کی قربان گاہ پر اس نفرت کو بھینٹ چڑھا دوں گا، جو مجھے تیری ذات سے ہے!"

شیطان نے ایک قہقہہ مارا، جو کوہِ آتش فشاں کے پھٹنے سے مشابہ تھا اور کہا: "مقدس باپ! تُو کتنا ذہین اور کس قدر لائق ہے! لاہوتی مسائل کے متعلق تیرا

بقیہ صفحہ [illegible]

صدیقہ بیگم

اِندر سبھا

"منیم کی عورت کیسے اچھے اچھے لوگڑے پہنتی ہے — کیوں ماں؟ — تُو نے دیکھی ہے نا — ماں وہی منیم والی ماں۔ کیسی ساجری لگتی ہے؟" راجو بولے جا رہی تھی اور اس کی ماں جیسے کانوں میں تیل ڈال کر بیٹھی ہو — وہ پھر بولی۔

"ماں اُس کے جُوڑے کے پھول کیسے اچھے لگتے ہیں۔ وہ پھول لگا کر باہر سڑک کے پاس کیوں بیٹھتی ہے — ماں تُو بھی لگایا کر، بڑی اچھی لگے گی۔" اس کی ماں برابر چولی میں سے جوئیں پا رہی تھی۔

"اور وہ کچھ کام بھی تو نہیں کرتی — بیڑی کیا بنائے گی پتے تک تو چھتی نہیں —"

"پتے کیوں چھنے؟ — کوئی وہ ہماری نیچ ذات تھوڑی ہے۔ وہ کُرسی پہ بیٹھے ہے۔" راجو کچھ مطمئن سی ہو گئی۔

"ماں — تُو نے وہ گجراتن دیکھی ہے — کتنا لمبا گھونگٹ کاڑھتی ہے؟"

"کون — گجراتن؟" ماں نے ایک لیکھ ناخون پر چٹاتے ہوئے پوچھا۔

"وہی بٹنے والی — ماں اُس کا مرد تو بالکل ہی بُڈھا ہے؟"

"لے اچھا میرا سر ٹٹول۔" اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر کھجلایا۔ راجو نہ جانے کس دھیان میں اُٹھ کر اس کا سر ٹٹولنے لگی۔ مگر اس کے ذہن میں گجراتن بسی ہوئی تھی۔

"ماں — گجراتن کا وہ ننھا سا بچہ کیسا گورا گورا ہے۔ بالکل ویسا ہی جیسا وہ 'مسلمین' اسکے گھر آتا ہے —"

"چپ رنڈی — تجھے کیا پڑی ہے۔" راجو منہ بسور کر الگ جا بیٹھی۔

"چل اِدھر۔" راجو اپنی جگہ سے نہ ہلی اور منہ لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اس کی ماں آنکھیں گاڑ کر جوں مارنے لگی۔

"لے اس میں جوں دیکھ —"

"اُوں — اُوں — میں تو نا دیکھتی۔" راجو لوٹ گئی۔

"اچھا اُٹھ — شام کو منشی سے پیسے لیکر دوں گی۔"

راجو نے اُٹھ کر چولی تھام لی اور ماں اپنی آٹھ گزی ساری کو نیچے سمیٹ کر بیٹھ گئی، جو کپڑا نہ ملنے کی وجہ سے ایک گز کم کر دی گئی تھی ورنہ مہاراشٹی رسم کے مطابق نو گز سے ایک سوت کم کرنا بھی بڑی بُری بات ہے۔

"ماں — اب میں بھی دھوتی نہ پہنوں گی پوری تو بھی لونگی — اور پھولدار چولی۔"

"تڑے تیرے کھسم کی کمائی ہے نا — جو لونگی دھوتی اور پھولدار چولی پہنے گی۔" راجو نے منہ پھلا لیا۔

"دُلاری بھی تو پہنتی ہے — کتنی اچھی لگتی ہے۔"

"دلاری کی تجھے ریس ہے — وہ ہے بھی تو بارہ تیرہ برس کی۔ چار پیسے کماتی ہے۔"

راجو نے ماں کی چولی اُٹھا کر پرے کو ڈال دی — "خود تو ہر دیوالی پر نئی نئی سلواتی ہے۔" اُس نے غصہ سے ماں کی طرف دیکھا جو گھاس پر دھوپ میں پڑی اینڈ رہی تھی۔ پھر راجو ماں کے ننگے بدن کو تکنے لگی۔ پلپلا پلپلا پیٹ — کیسی موٹی ہے ماں — پھر اُس نے اپنے پیٹ کو دبا کر دیکھا — ذرا بھی تو نرم نہیں۔ اس کا جی چاہا کہ جا کر ماں کے نرم نرم پیٹ کو دبائے — پھر اس ڈر سے کہ ماں مارے گی اسکی ہمت نہ پڑی۔ وہ پھر اس کے ننگے بدن کو دیکھنے لگی۔ وہ گجراتن کیسی اچھی چولی پہنتی ہے۔ بڈھا گجراتی لاتا ہوگا — پر وہ تو بڑا غریب ہے — پھر اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ خود بھی ایک ننھی منی گجراتن ہے — پھولدار لہنگا، اور پولکا پہنے ہوئے — پولکے سے باہر تھل تھل کرتی ہوئی توند — جس میں چربی کی وجہ سے ناف کا نشان گہرے غار کی مانند دکھائی دے رہا تھا — اور یہ گجراتی — کھوسٹ — راجو گھبرا گئی — بڈھے گجراتی کی مار اس سے نہ دیکھی جاتی تھی۔ بڈھا تو ہے پر کیسا اڑوکتا ہے — گالی دیتا ہوگا — پھر منشی اور ٹھیکیدار کی گالیاں ایک ایک کر کے اس کے ذہن پر چھانے لگیں۔ گالیاں تو اس کو سب یاد ہو گئی تھیں۔ وہ اکثر للتا اور دلاری کو دے بھی دیتی تھی۔ وہ کھیل کھیل میں منشی اور ٹھیکیدار بنتی اور اپنی ساتھ کی چھوکریوں کو خوب خوب گالیاں اُڑاتی — بڑی عجیب عجیب گالیاں، اُسے بعض وقت ان گالیوں پر ہنسی آتی۔ مگر اس کو کتنا بُرا لگتا جب وہی گالیاں اس کی ماں کو دی جاتیں — پر نہ جانے کیوں اُس کی ماں ذرا بھی تو بُرا نہ مانتی — چھوٹے بھیّا تو اور بھی گندے ہیں، کیسی بُری بُری گالیاں دیتے ہیں اور اُس کی ماں بس ہنس دیتی، اس کا مُنہ تمتما اُٹھتا، وہ ہنستی ہی چلی جاتی۔ جبھی تو چھوٹے ٹھیکیدار نے ماں کا نام "پھلجھڑی" رکھا ہے۔ کل چھوٹے ٹھیکیدار نے ماں کو کتنی گالیاں دیں۔ پھر ذرا دیر بعد دیکھو تو خوب ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے۔ اور شام کو تو ایسے خوش ہوئے کہ اپنا کمرہ بھی اس سے جھڑوایا۔ کتنی ہی دیر کواڑ بند کئے ایک ایک چیز ٹھیک کروائی۔ اور پھر وہ سوچنے لگی۔ آخر کمرہ جھڑواتے وقت چھوٹے ٹھیکیدار دروازہ کیوں بند کر لیتے ہیں — پھر جھاڑنے کی آواز بھی تو سُنائی نہیں دیتی اور نہ ماں کی ہنسی کی آواز آتی ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئی — ماں اتنی خاموشی سے

نہ جانے کیا کیا کرتی ہے؟ ان کواڑوں میں سوراخ بھی تو نہیں جو جھانک کر ہی دیکھتی ——

راجو سوچتے سوچتے تھک گئی، اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا —— وہ یہ سب کیا دیکھتی ہے اور اُس کے کیا معنی —— اور وہ پھر مایوس ہو کر ماں کے پاس لوٹ لگانے لگی۔ آج نہ جانے کیوں اس کے دل میں عجیب طرح کی گدگدی اُٹھ رہی تھی —— سینے میں جیسے چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔ اور پھر وہ سرسراہٹ دھیرے دھیرے اُس کے سارے جسم میں سرایت کرنے لگی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں، جیسے کسی نے نرم نرم گدیاں اُس کے پپوٹوں پر رکھ دیں ہوں۔ پر اس کو نیند نہ آئی اُس نے پھر آنکھوں کے پٹ کھولے، بند کئے، پھر کھولے اور بند کئے —— اس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی —— اور پھر اُس نے سُنا ——

"اری راجو —— اُٹھ تو —— دیکھ تیری ماں بھاگ گئی"

"ماں بھاگ گئی ——؟"

"کہاں؟ —— ماں! ——" اُس نے آنکھیں پھیلا پھیلا کر چاروں طرف دیکھا۔

"اری —— چھوٹے ٹھیکیدار بھگا لے گئے" پھر کیا تھا وہ تو پھاڑ سا منہ پھاڑ کر دہاڑنے لگی۔

"مت رو نچھمی —— چھوٹے ٹھیکیدار لے گئے ہیں۔ ابھی آجاویگی"

"چھوٹے ٹھیکیدار کیوں لے گئے —— وہ میری ماں کا کیا کریں گے؟"

"اری اُس نے نوراً کر لیا —— جانے دے حرامجادی کو۔ تو ہمرے ساتھ چلیو —— مت رو"

اور پھر سب ہنس ہنس کر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگیں۔

"او دو تریا —— بڑا حرامی ہے یہ منسی بھی —— دیکھو نا جھینا کو کیسا پھانس رکھا ہے۔ ویسے تو کھدر پہنتا ہے بڑا سوراجی بنتا ہے —— اب تو جھینا ہی جھینا ہے، اُسی کا راج ہے۔ ہم کو تو کوئی مُنہ ہی نہیں لگاتا —— چھوٹے ٹھیکیدار بھی تو دیکھو —— جب بھی کوئی کام ہوگا تو جھینا ہی کو بلائیں گے"

"پھر کیا ——" دوسری بولی "کیسی نئی چولی پہن کر مٹک مٹک کر چلتی ہے"

کتنی دیر وہ یہی باتیں کرتی رہیں مگر راجو ایک بات بھی نہ سمجھ سکی۔ اُسکو تو ماں کی رٹ لگی ہوئی تھی۔

"کیوں —— مری جاتی ہے" راجو کی ماں نے ایک دھپ رسید کیا۔ اور اُس کی رٹ رٹ دھاڑوں میں بدل گئی —— "اتنی بڑی سنڈی کو روتے ہوئے لاج بھی تو نہیں لگتی" مگر راجو بجائے خاموش ہوتے کے اور بھی نیل بھرنے لگی ——

"مرے پیسہ لے" اسکی ماں نے نیا نیا خول دار پیسہ اُس کی مٹھی میں ٹھونس دیا۔ وہ چُپ ہو گئی اور اُلٹ پلٹ کر پیسہ سے کھیلنے لگی۔

اسی ہما ہمی میں راجو نے جنم لیا، اور اسی ریل پیل بڑھ کر تیرہ سال کی ہو گئی —— دھان کی سوئیاں پھوٹ رہی تھیں جو ابھی چند دنوں بعد لہلہاتی ہوئی کھیتی میں تبدیل ہو جائے گی —— چاند اپنی چودھویں منزل پر پہونچ رہا تھا جس کے بعد ترقی کے منازل ختم ہو جاتے ہیں —— لیکن راجو وہ چاند تھی جو مکمل ہونے سے پہلے ہی گھٹنا شروع ہو جائے تیرہ سال کی راجو بیس سال کی جوان عورت تھی جس کی جوانی، بھوک اور بیماریوں کے درمیان آتی ہی چلی گئی۔ اُس نے اپنے اردگرد کے ماحول کی بھی تو کچھ پروا نہ کی، مگر جوانی یہ کب دیکھتی ہے کہ کوئی اس کا استقبال کرنے کے لئے تیار بھی ہے یا نہیں۔ وہ تو بے دھڑک مدہوش چلی آتی ہے۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدم، تھرتھراتے ہوئے جسم اور بوجھل آنکھیں اس کو خوش آمدید کہتی ہیں —— کس قدر نڈر ہوتی ہے یہ جوانی بھی، آندھی اور طوفان کے بیچ دندناتی چلی آتی ہے —— جیسے سمندر میں طوفان —— ہاں اسی طوفان میں راجو ایک ننھی مچھلی کی طرح تیر رہی تھی، دیکھتے دیکھتے وہ کیا سے کیا ہو گئی۔ اب اس کو منشی اور ٹھیکیدار کی گالیوں میں لذّت محسوس ہونے لگی۔ وہ بگڑتا، نئی نئی گالیاں دیتا اور راجو اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ جانے کیا ڈھونڈتی۔ اس کی اس دلیری پر دوسری چھوکریاں سہم سی جاتیں۔ "کس قدر نڈر ہے یہ راجو، ڈرتی بھی تو نہیں۔ کہیں ٹھیکیدار مار بیٹھے۔ تو ——" مگر راجو کے قہقہوں پر کوئی کنٹرول نہ تھا۔ رونا اور ہنسنا یہ تو اپنی مرضی ہے۔ اور راجو خوب جی بھر کر قہقہہ لگاتی۔

"بہت غصہ آرہا ہے۔ کیوں ٹھیکیدار صاحب" اُس نے شرارت سے آنکھوں کی پتلیوں کو گردش دی، ٹھیکیدار مسکرا دئے۔ اور چپکے سے اُس کے گال پر چٹکی لی "بڑی شریر ہے یہ راجو کی بچی —— چڑیل" —— مگر راجو جیسے قہقہوں میں بہی چلی جا رہی ہو۔

"کتنا ہنسے گی" —— منشی یہ کہہ کر اُس کی چولی پر ہاتھ مارتا ہوا اچھلا۔

"دیکھ کے نہیں چلتے —— واہ یہ بھی کوئی بات ہے کہنیوں ہات مار دیتے ہو"

"چُپ حرامزادی" اور نہ جانے کتنی گالیاں اُس نے چلتے چلاتے سُنا دیں ——

ہاں تو اب راجو جان گئی تھی کہ ٹھیکیدار کی گالیوں پر ماں کیوں نہ ہنستی تھی۔ اس کو بُرا کیوں نہ لگتا تھا۔ اور پھر ماں کا چہرہ کیوں تمتا اُٹھتا، اُسکے ہونٹ

---

[1] مرہٹی میں شوہر کو کہتے ہیں۔ مصر پر بھی بمبئی میں عام طور سے یہ لفظ رائج ہے۔

کیوں کانپتے تھے۔ اور ایک عجیب سی ہنسی جو اُس نے بہت بچپن میں ماں کے ہونٹوں پہ دیکھی تھی وہ آج اس کی آنکھوں میں رقص کر رہی تھی، ہم سب ایک ہی منزل پہ چلتے ہیں۔ سماج کے بنائے ہوئے راستے پر صاف چکنا راستہ ـــ جسکے اِدھر اُدھر کانٹے بچھا دئے ہیں کہ نئی راہیں تراشی نہ جاسکیں۔

راجو نے اپنی ماں پہ نظر ڈالی جس کی آنکھوں میں نہ جانے کتنی ہالیں سیاہ جذب ہو چکی تھیں۔ جیسے یہ ہونٹ مسکراہٹ کو ترس گئے ہوں۔ جیسے ان گالوں نے کبھی ہنس کر حلقے نہیں بنائے۔ جو سدا آج کی طرح بے رس رہے ہیں ـــ'

چھوٹے ٹھیکیدار نے راجو کی طرف دیکھا اور پھر اُس کی ماں کو ـــ

"راجو کی ماں جانتی کو بھیج دے" ـــ اور وہ گردن جھکا کر چل دی۔ مگر پھر اُس نے ایک نظر چھوٹے ٹھیکیدار پر ڈالی، جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی ہو ـــ

"ہاں بھیا، اب ان نینوں کی مدرا میں کوئی نشہ نہیں رہا ـــ اب تو یہ مدرا راجو کی نینوں میں بھری ہوئی ہے"۔

"راجو کدھر گئی چل تو"

اور راجو مسکراتی، اٹھلاتی اس کے ساتھ ہو لی ـــ جیسے چڑھتا ہوا سورج۔ مگر شام ابھی بہت دور ہے۔ بادل کے ٹکڑوں نے سورج کو تاک لیا اور دشمن کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے۔ اندھیارا ـــ بادلوں کی جیت ہوئی اور سورج ہار گیا ـــ بڑا مغرور بنتا تھا یہ سورج ـــ آج دیکھتے ہی دیکھتے اس کی جوانی لٹ گئی ـــ آکاش کے تارے پردے کے پیچھے سے یہ منظر دیکھتے ہی رہ گئے۔

اندھیرے بھاگ میں پورے نو مہینے بعد راجو کی گود میں ایک ننھی منی راجو آگئی۔ اُس کی مانگ میں سیندور نہ تھا مگر اس کی گود بھری تھی، اور راجو کی آنکھیں جیسے مینہ برستے برستے تھما ہو ـــ انسانیت کا ایک چھوٹا پیغمبر جس کو پناہ دینے کے لئے کوئی تیار نہیں ـــ معصیت کا مجسمہ ـــ تہذیب و تمدن کی بجھتی ہوئی شمع ـــ چھوٹی راجو چیخ رہی تھی ـــ سرمایہ اور تہذیب کے ان دیکھے خداؤں کے حضور میں ـــ

اُس کی ماں زمین پہ بیٹھی سامنے پڑی ہوئی بچی کو گھور رہی تھی ننھا سا گوشت کا سرخ سرخ لوتھڑا ـــ اب سے چودہ سال پہلے کی راجو اُسکے سامنے تھی ـــ ایسے اندھیرے بھاگ میں چراغ کی تھرتھرائی ہوئی روشنی میں ننھی راجو نے جنم لیا تھا اور اب سے چودہ سال بعد یہ ننھی راجو بھی ـــ جیسے خیالات کے غبارے نکل نکل کر ہوا میں بہہ رہے ہوں۔ اندھیرے میں چراغ کی لو کانپ رہی تھی ـــ اُجیالے کی گود میں اندھیارے نے جنم لیا۔

اور اب دھرتی اور آکاش اندھیارے کے چرنوں پر سر جھکائے تھے ـــ نہ جانے کب تک سماج کے ان صاف راستوں پر اسی طرح کتنی ہی راجو ایسے ہی اندھیرے بھاگ میں جنم لیتی رہیں گی ـــ چاند چودھویں منزل پر پہونچ کر سدا ڈھلتا ہی رہے گا۔ آکاش کبھی اندھیارے کی حکومت ہوگی کبھی اُجیالے کی۔ پر چاند تو اپنی راہوں پہ چلتا ہی رہے گا۔ ـــ کون جانے یہ وہی چاند ہے یا دوسرا ـــ چاند اور راجو کا یہ لامتناہی سلسلہ خدا جانے کب ختم ہوگا ـــ؟

شیطان

(بسلسلہ صفحہ ۲۹۲)

مطالعہ کس درجہ عمیق ہے! تُو نے اپنی قوت و ادراک سے میرے وجود کا موقع سبب ظاہر کیا ہے، جو میں اس سے پہلے نہیں جانتا تھا۔ اب کہ ہم میں سے ہر ایک ان فطری اور لاہوتی اسباب کی حقیقت کو پا گیا ہے، جو ہماری آفرینش اوّل کے بھی ضامن تھے اور اس نشاۃ ثانیہ کے بھی! ہمیں یہاں سے چلنا چاہیئے!! آ! بھائی میرے قریب آ، اور مجھے اُٹھا کر اپنے گھر لے چل! مجھ میں بوجھ بالکل نہیں ہے ـــ آہ! رات نے اپنا سیاہ پردہ چھوڑ دیا، جبکہ میں اپنے جسم کے تقریباً آدھے خون سے اس وادی کے پتھروں کو رنگین کر چکا ہوں"

سمعان پادری نے اپنی آستینیں کہنیوں تک چڑھا لیں اور عبا کے دامن کو سمیٹ کر پیٹی سے کس لیا، اس کے بعد وہ شیطان کے پاس گیا اور اُسے اپنی پیٹھ پر لاد کر سڑک کا راستہ لیا۔

ان پُرسکوت وادیوں میں، جن کے چہرے پر رات کی سیاہ نقاب پڑی تھی، سمعان پادری اپنی پیٹھ پر ایک برہنہ جسم کو لادے گاؤں کی طرف جا رہا تھا جس کے زخموں سے خون نے بہہ بہہ کر اُس کی ڈاڑھی اور سیاہ کپڑوں کو دھبے دھبان کر دیا تھا۔

(جبران خلیل جبران)

کلیاں
عصمت چغتائی نے طنز نگاری میں ایک نئی شاہراہ خیال اختیار کی ہے جو نہایت دلکش اور حد درجہ موثر ہے۔ کلیاں عصمت چغتائی کے سولہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین ملک کے مقتدر رسائل میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ قیمت تین روپے!

ابو سعید قریشی

قصہ پانچویں درویش کا — سیر

(میر امّن کی روح سے معذرت کے ساتھ)

حیدر ریم، قلندرم، مستم!

اے صاحبو!

کل رات میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں کس طرح اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہوا لیکن شاید مجھے اُس جگہ کے لئے جہاں میں پیدا ہوا تھا وطن کا لفظ نہیں استعمال کرنا چاہئے ——— دراصل قلندر جہاں بھی ڈیرے ڈال دیتا ہے وہی اُس کا وطن ہے۔ سقفِ نیلوفری کے سائے میں پھیلی ہوئی یہ وسیع دُنیا اُس کی جولانگاہ ہے، جس کے مختلف حصّوں کو چند سہولتوں کی خاطر الگ الگ نام دے دئے گئے ہیں آج کی صحبت میں انہیں کا ذکر رہے گا۔

سب سے پہلے اُس سرزمین کا حال سُنئے، جسے لوگ 'کجشک طلائی' کہتے ہیں! یہاں قدرت نے جھولیاں بھر بھر کر خزانے لٹائے ہیں۔ گندم کے کھیت، سونے کے ڈھیر، نیلم کی کانیں، صندل کے جنگل، زعفران کے کھیت۔ غرض کوئی چیز ایسی نہیں جس کی یہاں فراوانی نہ ہو۔ لیکن آپ کو یہ سُنکر حیرت ہوگی کہ اس پر بھی یہاں کے لوگ فاقوں مرتے ہیں اور بہتوں کو تو مرنے کے بعد کفن تک نصیب نہیں ہوتا۔ دراصل اپنے جسم کی بجائے انہیں اپنی آتما کا زیادہ فکر ہے اور وہ خود کو ساری دُنیا کی مصیبتوں سے مکت کر لینا چاہتے ہیں۔

جن دنوں میں اس ملک کی حدود میں داخل ہوا وہاں ایک ہیم مستور انسان کا بہت چرچا تھا۔ اُس کا نام تو میرے ذہن سے اُتر گیا ہے لیکن اس کا مطلب تھا فوق البشر ——— یہ شخص ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا اور اُس نے اپنے نفسِ امّارہ کو کچھ اس طرح مارا تھا کہ اپنی بیوی کو بھی ماں کہنے لگا تھا۔ اس کے بہت سے ہم وطن اسے پیغمبر سمجھتے تھے۔ اس کی قوتِ ارادی اور روحانیت کا یہ عالم تھا کہ دنوں اناج کو نہ چھوتا۔ ایک بار اُس کی حاکمِ وقت سے چل گئی اور اُسے زندان میں ڈال دیا گیا۔ اس پر اس نے اعلان کر دیا کہ وہ بطورِ احتجاج تا دمِ آخریں برت رکھے گا اور اناج کو نہ چھوئے گا اور اس دھمکی کو سچ کر دکھایا۔ بیس روز تک وہ صرف انگوروں اور سنتروں کے رس پر جیتا رہا۔ چنانچہ حاکم نے مجبور ہو کر اُسے رہا کر دیا۔ لیکن فوق البشر اپنی ہٹ کا پورا تھا اُس نے رہائی کے بعد بھی حکومت کی مخالفت جاری رکھی۔ اور ایک دن جب اور کچھ نہ سوجھا تو سوت کا سکّہ ہی چلا دیا۔ اس کے مُریدوں کے گھروں میں چرخے کی گھُمر گھُمر سنائی دینے لگی اور میں نے دیکھا کہ لوگ کچّے سوت کی اٹیاں لئے بازاروں میں گھوم رہے ہیں ——— میں نے ایک راہگیر سے پوچھا کہ بھائی یہ کیا مسخرہ پن ہے؟ جواب ملا میاں اس میں کوئی سیاسی مصلحت پوشیدہ ہے۔ میں نے کہا میں بھی تو جانوں۔ اس پر راہگیر نے کہا کہ سائیں تم اپنی راہ لو، تمہیں سیاست سے کیا کام۔ اب سوچتا ہوں کہ شاید وہ سچ ہی کہہ رہا تھا۔ قلندروں کو سیاست سے کیا کام، وہ تو بس یہی جانتے ہیں کہ جو کام کرنا ہو کر گزرو۔ اور اُس وقت میرے پیشِ نظر صرف ایک کام تھا ——— سیر۔ قیام سے میرا جی اُلجھتا ہے۔ چنانچہ چلتا چلتا ایک دن میں ایک ایسے علاقے میں پہنچا جو دو ملکوں کی سرحد ہے یہاں کے لوگوں کو میں نے دیوانگی کی حد تک مہمان نواز پایا۔ آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ فقیر کو اپنے یہاں مہمان ٹھہرانے کے سلسلہ میں دو چچیرے بھائی ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر اُتر آئے۔ دونوں مجھے مسجد میں ملے تھے اور ان میں سے ہر ایک اس بات پر مُصر تھا کہ میں اُس کی دعوت قبول کر لوں۔ میں نے جب دیکھا کہ بات بڑھ رہی ہے تو اسی میں خیریت جانی کہ دونوں میں سے کسی کے یہاں بھی نہ جاؤں اور مسجد ہی میں پڑا رہوں۔ خون خرابہ تو نہ ہوگا۔ لیکن شاید ان لوگوں کو مہمانوں کی خوشنودی عزیز نہیں ہوتی، مقصد صرف مہمان نوازی کا جذبہ پورا کرنا ہوتا ہے۔ دو میزبان الجھ گئے تھے کہ دشمنی اور موجود۔ آخرکار بہت لے دے کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ قرعہ اندازی کی جائے اور جتنے دن میں وہاں ٹھہروں باری باری دونوں کے یہاں کھانا کھاؤں۔ بات یہاں تک رہتی تو خیر تھی۔ لیکن وہاں ایک اور مصیبت آئی کہ بھوک نہ ہو تو بھی کھاؤ اور ٹھونس ٹھونس کر کھاؤ ورنہ میزبان ناراض۔ اُن کا خلوص میرے لئے وبالِ جان بن گیا۔ اور میرا ہاضمہ کچھ ایسا بگڑا کہ دونوں صاحب فراش رہنا پڑا . . . اس علاقہ کے لوگوں میں کچھ بُرائیاں بھی میرے دیکھنے میں آئیں۔ چند سیمیں سکّوں کے عوض انہیں آسانی سے خریدا جا سکتا ہے اور ایک برّہ کی خاطر یہ کسی انسان تک کا خون بہانے تک کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ اُس خوفناک علتِ غیر فطری میں مبتلا ہیں جس کی وجہ سے قومِ لوط پر عذابِ الٰہی نازل ہوا تھا۔

اس خطرناک خطّے کے جنوب میں ایک اور علاقہ ہے جس کے باشندوں کی یک رخی شبیہ مثل کلہاڑے کے ہوتی ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ لوگ اُن غداروں کی نسل سے ہیں جنہوں نے ایک جواں سال فاتح کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا تھا ——— اپنے بزرگوں کی میراث اُن میں اب تک چلی آتی ہے۔ اور آج بھی یہ لوگ بے تکلفی اور بے حجابی سے ضمیر فروشی کرتے ہیں ——— یہ علاقہ خبیث قسم کی طوائف الملوکی کا آئینہ دار ہے۔ جہاں یہاں کی خصوصیت امتیاز کرتی ہے یہاں [illegible]

بڑے بڑے زمینداروں کو میں نے دیکھا ہے لیکن وکر یا بخشا . . . . تم نہیں جانتے۔ شاید وہ ہمیشہ کے لئے حرص و ہوا کی کمندوں میں اسیر رہنا چاہتے ہیں۔ گھوڑ سواری، نیزہ بازی، کتوں اور شکروں سے شکار اور اپنے کار مردوں کی بہو بیٹیوں کی عزت پر ڈاکے ڈالنا ان لوگوں کے مشاغل ہیں۔

اس دیس سے نکل کر میں ایک ایسی سرزمین میں پہونچا جہاں قدرت نے جی کھول کر جادو جگائے تھے اور چپے چپے پر ایسے جال بچھائے تھے کہ دلِ انسان کا اُس سے بچ کر نہیں جا سکتا تھا ـــــ گاؤں گاؤں پرستان، نگر نگر طلسمات، کوئی جائے تو کدھر کو جائے۔ جدھر آنکھ اٹھتی تھی حوروں کے جمگھٹے، پریوں کے پرے اور معصیوں کے جھمگھے دکھائی دیتے تھے۔ یہ درولیش ہر قدم پر اپنے ایمان کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگ رہا تھا اور ان صورتوں کے بنانے والے کے کمال پر عش عش کر رہا تھا "تجھ میں نہیں رہ" تھا کہ آسمان زمین پر اتر آیا ہے یا زمین آسمان پر پہونچ گئی ہے۔

آخر یہ رہا گیا اور ایک راہگیر سے پوچھا کہ بھائی یہ کون دیس ہے اور میں عالمِ ہوش میں ہوں یا خواب میں؟ جواب ملا۔ دس دریاؤں کی سرزمین ہے اور تم عالمِ بیداری میں ہو۔ اور میری بیداری کا ثبوت دینے کے لئے اُس نے میرے کان پر زور سے کاٹا۔ درد کے احساس سے خود مجھے بھی اعتبار آ گیا کہ میں واقعی جاگ رہا ہوں اور حقیقت سے دوچار ہوں۔ اتنے میں راہگیر تو چلا گیا اور میں یہ سوچنے لگا کہ جس سرزمین کے عام لوگ اس قدر حسین ہیں وہاں کے شاہی خاندان کا نہ جانے حسن کا کیا عالم ہوگا۔ اتنے میں آنکھ جو اٹھی تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے برقی سواروں کا ایک دستہ کھڑا ہے۔ اُن کی دستاروں کے طرّے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں؛ اُن کے چہروں پر نقابیں ہیں، لیکن اُن کی مغرور مونچھیں نقابوں سے باہر جھانک رہی ہیں۔ اُن کے سالار نے چھوٹتے ہی مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کی اور کہا کہ تمہیں سلطان الملک سکندر خضر قاہر شاہ کے حرمِ محترم کے بارے میں بے ادبانہ انداز سے "سوچنے" کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے ـــــ یہ سب کچھ آنکھ کے پلکارے میں ہوا۔ یہ بات کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ کسی مہذب ملک میں "سوچنا" تک ممنوع ہے۔ کوئی اور ہوتا تو یقیناً گھبرا جاتا لیکن قلندر اپنی زندگی میں اتنے صدمے سہہ چکا ہے کہ تھوڑے کیلئے کبھی پریشان نہیں ہوتا۔ چنانچہ میں نے اپنی گرفتاری کا حکم نامہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس پر مجھے گالیوں کی ایک اور باڑھ ماری گئی۔ اور دوستو، کیا بتاؤں کہ وہ کیسی گالیاں تھیں۔ میرا خیال ہے کہ انہیں سُن کر شاید خود شیطان الرجیم بھی شرما جاتے۔ پھر جب گالیوں کا طوفان تھما تو مجھے بتایا گیا کہ دس دریاؤں کی سرزمین میں [illegible] کے لئے حکم ناموں کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک آزاد منش [illegible] ایک نہایت ہی ظالمانہ حرکت تھی جس کے خلاف احتجاج ضروری [illegible] بہت نہ چلی۔ ایک بہت انداز نے لپک کر میرے منہ میں کپڑا [illegible] مجھے کسی گٹھڑی کی طرح اٹھایا اور ایک پرانے قلعہ میں لا کر قید کر دیا گیا جہاں پہلے ہی کئی زندانی موجود تھے۔ سخن گو، داستاں نویس اور فلسفی قسم کے انسان جو آزادی بیگم نامی ایک حسینہ کے عشق کا دم بھرتے تھے حالانکہ بادشاہ نے اُسے صرف اپنے لئے وقف کر رکھا تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی جو قانون فحاشی کی زد میں آئے ہوئے تھے۔ جب میں نے اس جرم کی وضاحت چاہی تو مجھے بتایا گیا کہ یہ عورتوں اور مردوں کو "مقفل کوٹھریاں" اور "پراسرار مکان" نہیں بلکہ گوشت پوست کی جاندار مخلوق سمجھتے ہیں جن کا دل جذبات و محسوسات کا مسکن ہے۔ جس کے اندر کھانے پینے کی خواہشوں کی طرح اور بھی کئی خواہشیں موجود ہیں، جس میں اچھائیاں بھی ہیں اور بُرائیاں بھی۔ انسانیت بھی ہے اور حیوانیت بھی۔ اور اس سلسلہ میں یہ کھری کھری باتیں کہہ جاتے ہیں۔ اور اُن بیہودوں کو چاہیے کی کوشش کرتے ہیں جن کے لکھنے پر بعض لوگوں کی نیرنگی اور پندار کو ٹھیس لگتی ہے، اور اُن کے بھولے بھالے دل سے پارسائی کے خوبصورت نقاب ہٹ جاتے ـــــ ان مجرموں کے اسرار کے سبب ان لوگوں کے لب ہی سی دئیے گئے تھے تاکہ وہ بول نہ سکیں اور کئی ایک کے ہاتھ قلم کر دیے گئے تھے تاکہ وہ لکھ نہ سکیں۔

اس علم دوست، طبقہ کے علاوہ وہاں کچھ بدقسمت ایسے بھی تھے جو اس بوسیدہ قلعہ کی سرد دیواروں کے سایہ میں زندگی کے آخری سانس لے رہے تھے لیکن اب تک اُنہیں یہ بھی پتہ نہیں لگ سکا تھا کہ جس خطا کی انہیں سزا مل رہی ہے وہ خطا کیا ہے۔ ان رکھوالوں کے رویّہ سے مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ میرا بھی کچھ ایسا ہی حشر ہونے والا ہے۔ جو مجھ سے پہلے نہ جانے کتنوں کا ہو چکا ہے۔ نہ قاضی، نہ قانون، نہ مقدمہ، اور قید میں پڑے پڑے اپنے مقدّر کو کوستے ہوئے مر جاؤ۔ اب میں یہ سوچنے لگا کہ اس مصیبت سے کیونکر نجات ملے۔ مثل مشہور ہے کہ جو لوگ اپنی مدد کرتے ہیں خدا بھی اُن کی مدد کرتا ہے۔ اور اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنے ذہن کا کشکول ٹٹولنا شروع کیا اور بہت رات گئے تک سوچتا رہا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں لیکن کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ آخر تھک کر سونے کا ارادہ کیا۔ بانہہ جو سر کے نیچے رکھتا ہوں تو کانوں کی بالیاں چُبھیں اور مجھے یاد آ گیا کہ ان بظاہر موٹی موٹی، کھوکھلی بالیوں کے بیچ ہیرے پوشیدہ ہیں۔ ایک بار ہمالہ کی برف پوش بلندیوں پر میری ایک ہمدرد جوگی سے ملاقات ہوئی تھی جس نے نہ جانے کس بات سے خوش ہو کر وہ بالیاں میرے کانوں میں ڈال دی تھیں اور کہا تھا کہ جا تیرے کام آئیں گی، ان کے اندر ہیرے پوشیدہ ہیں۔ اُس رات کال کوٹھری میں جوگی کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونج اُٹھے میں نے کانوں سے بالیاں اُتاریں اور اُن کے کھلے حصّوں کو ہتھیلی پر اُلٹ دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے روشنی کے چند قطرے منجمد ہو کر تاریکیوں کی گود میں گر پڑے ہوں۔ انہیں دیکھ کر دارو غہ زنداں کی آنکھیں چوندھیا گئیں اور قلندر دم زدن میں قلعہ کے باہر تھا۔ نیلے نیلے آسمان اور ہرے بھرے کھیتوں کو دیکھ کر میں نے اپنے خالق کا شکر ادا کیا اور میرے پاؤں پھر کسی نئی منزل کی تلاش میں

اُٹھے اور سفر کی صعوبتیں سہتا ایک روز میں ایک ایسے شہر میں پہونچا جو ایک عظیم شہنشاہ کی سلطنت کا دارالخلافہ رہ چکا تھا۔

جس طرح ذبح ہونے کے بعد بھی بکرے کے اعضا کافی عرصہ تک پھڑکتے رہتے ہیں بعینہٖ اسی طرح کسی معاشرت کی موت کے بعد اُس کا پالنا کچھ دیر تک جھولتا رہتا ہے۔ اس شہر میں بھی مجھے کچھ ایسی ہی کیفیت کا احساس ہوا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہاں کی ہر چیز دھڑک تو رہی ہے لیکن اُسے دھڑکانے والی طاقت ختم ہو چکی۔ وہ شہر ایک ایسی تہذیب کی لاش تھی جس پر کبھی مشرق کو ناز تھا اور وہ بعد المرگ دھڑکنیں اس زندگی کا پتہ دے رہی تھیں جو اُس کی موت کا باعث بنی تھی ——— یہاں میں نے مَردوں کو عورتوں کی طرح رنگا رنگ کے بھڑکیلے کپڑوں میں ملبوس دیکھا۔ آنکھوں میں سرمہ کی سیاہی، ہونٹوں پہ پان کی لالی، کان میں عطر کی پھُریری، مٹک کے چلتے ہیں، ٹھمک کے بات کرتے ہیں۔ لفظ لفظ پہ کورنش، فقرے فقرے پہ آداب اُن کی ہر ادا سے ادا ٹپکتی ہے اور ہر سانس پدرم سلطان بود پکار رہا ہے ———

شاعری یہاں کسی متعدی بیماری کی طرح پھیلی ہوئی تھی یہاں کے بقال اور کنجڑے بھی سخن فہمی اور سخن گوئی کے دعویدار تھے۔ ہر قدم پہ مجھے تیرِ مژگاں کے شہید اور تیغِ ابرو کے گھائل نظر آتے لیکن کوئی تیر انداز دکھائی دیا نہ تیغ زن۔ بت سادہ نظر آیا نہ نگہ بستہ نہ چہرہ و قد بہادہ۔

اس شہر میں ایک عجیب و غریب مزار بھی میرے دیکھنے میں آیا۔ معمر سفید ریش مجاور اپنی ڈاڑھیوں سے اس مزار کو صاف کرتے ہیں اور سیاحوں کو اس کا حال بتاتے ہیں جو اس کے اندر دفن ہے۔ بادشاہوں کی داشتہ، بیگمات کی منہ چڑھی، رئیسوں کی محبوبہ اور شاعروں کی معشوقہ، اُس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ گنگا کوثر سے نہا دھو کر دنیا میں آئی تھی۔ کتبہ پر نستعلیق حروف میں "زبان مائی" کے الفاظ کندہ ہیں۔

اس مزار کے علاوہ اس شہر کی سب سے مایۂ ناز چیز ایک مسجد ہے اور میرا خیال ہے کہ اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ میں دنیا کا کونہ کونہ گھوم چکا ہوں لیکن فنِ تعمیر کا ایسا نمونہ میرے دیکھنے میں نہیں آیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اُسے انسانوں نے نہیں جنوں نے بنایا ہے اور پریوں نے اُس کی نوک پلک نکالی ہے۔ اُسے دیکھ کر تو ایک بار برہمن کا بھی نماز پڑھنے کو جی چاہے۔ لیکن آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ فنِ تعمیر کے اس عظیم الشان شہکار کی سیڑھیوں پر کبابیوں اور کباڑیوں کی دکانیں نظر آ رہی ہیں۔ یہ کریہہ منظر دیکھ کر ایک روز مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے ایک نمازی سے پوچھا کہ بھائی تم لوگ ان دکانوں کو یہاں سے اٹھوا کیوں نہیں دیتے۔ جواب ملا۔ دکانیں اُٹھ گئیں تو مسجد کے متولی رنگ رلیاں کیسے منائیں گے۔ اسی شخص کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ مسجد کے متولیوں نے مسجد کے نام پر بازارِ حسن میں بھی کچھ جائداد رکھی ہے جس کا کرایہ وہ خود جا کر وصول کرتے ہیں ——— یہ باتیں سُن کر میرا جی اُس شہر سے اسقدر بیزار ہوا کہ پل بھر کو بھی رُکنا وہاں ناگوار ہوا اور شہر بہ شہر ہوتا ہوا میں جادوگروں کے دیس میں پہونچا۔

اور دوستو، کیا عرض کروں کہ اِن دو آنکھوں نے وہاں کیا کیا نہ دیکھا۔ بال دیکھے اتنے گھنے اور اتنے لمبے کہ عورت کا جسم اُن میں چھپ جائے، اور سر پیر سے ننگا ہو بھی یہ نہ جان سکے کہ ان کے نیچے کیا ہے۔ گال دیکھے جن کی ملاحتیں کسی سادھو کے سرد سریر میں بھی کام کی اگنی سلگا دیں۔ نین دیکھے جن میں ساون کی مدہ ماتی راتوں کے رومان سوتے ہیں، جن میں دنیا بھر کی مدھوشالاؤں کا نشہ ہے اور جنہیں دیکھ کر جیون بھر کے جاگے ہوئے تپسوی کو بھی نیند آ جائے۔ بادل دیکھے جو مانند دھنکی ہوئی روئی کے تھے۔ برکھا دیکھی جیسے موتیوں کی چق۔ پنچھی دیکھے جن کے پروں میں قوسِ قزح کے پیوند لگے تھے۔ پھول دیکھے جن کے ست رنگے کٹوروں سے رُوح کو مدہوش کرنے والی خوشبوئیں اُٹھ رہی تھیں۔ قصہ مختصر رنگ اور روپ کا ایک دریا بہہ رہا تھا جسے دیکھ کر مجھ جیسے جہاں گرد کا بھی دل ڈول گیا۔ سمجھا کہ شاید میری منزل آ گئی۔ لیکن مقدر کو کچھ اور ہی منظور تھا ——— اِس خواب آور سرزمین کے مشرق میں ایک اور ملک ہے جس کے بادشاہ کے سر میں بیٹھے بٹھائے جہاں گیری کا سودا سمایا اور اُس نے جادوگروں کے دیس پر حملہ کر دیا۔ کہتے ہیں کہ مصیبت کبھی اکیلی نہیں آتی۔ اُدھر دُشمن سر پہ پہونچا اور اِدھر قحط نے سر نکالا۔ بیماریاں بیدار ہوئیں اور خلقتِ خدا کی وبا زدہ چوہوں کی طرح مرنے لگی۔ اتنے میں خبر پھیلی کہ راجدھانی میں کروڑوں من اناج موجود ہے۔ چنانچہ بھوکے اور بیکس کسانوں کے کارواں اُمید کا آسرا لئے راجدھانی کی طرف بڑھے۔ ہر راہگذار پر کنبوں کے کنبے رینگتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ گرِستاں و گریاں افتاں و خیزاں، روٹی کی امید میں بڑھتے ہوئے قافلے ——— لیکن جو ہونا چاہئے وہ ہوتا ہی کب ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ انہی دنوں وہاں کے امیروں کے دل میں اور بھی امیر بننے کا خیال آیا اور دیکھتے دیکھتے سارا غلہ چھومنتر سے غائب ہو گیا۔ بندگانِ خدا سسک سسک کر مرنے لگے، زمین کے چپہ چپہ سے آہ و بکا کی ایسی صدائیں بلند ہوتیں کہ پہاڑ پگھل پڑیں، زمین شق ہو جائے اور آسمان کے سینے میں شگاف پڑ جائیں۔ لیکن وائے انسان کہ اُس کی آنکھ پُرنم نہ ہوئی، اُس کا دل نہ پسیجا ——— امیروں کی آنکھوں پر دولت کے پردے پڑے ہوئے تھے، وہ دیکھ نہیں سکتے تھے۔ حکام کے کانوں میں سونا انڈیل دیا گیا تھا، وہ سُن نہیں سکتے تھے۔ ضمیر کی آواز "کہ عالم دوبارہ نیست" کے نعروں میں دب چکی تھی، اُس کی سنتا ہی کون ——— نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ کوچہ و بازار، شہر اور دیہات لاشوں سے پٹ گئے

اِن آنکھوں سے دیکھا کہ لاوارثوں کو کتے کھا رہے ہیں اور گدھ ان کے گرد بیٹھے ضیافتیں اڑا رہے ہیں ــــ ابھی دِنوں کا ذکر ہے، ایک شب جب آسمان سے سرمہ برس رہا تھا اور راجدھانی کسی بیوہ کی طرح سیہ پوش نظر آ رہی تھی، میں نے اس کے کوچہ و بازار میں گشت کرنے کا ارادہ کیا اور ان جانی راہوں پر لاوارثی لاشوں سے ٹھوکریں کھاتا ہوا نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گیا۔ اتنے میں نغمہ و سرود کی صدائیں میرے کانوں میں پڑیں۔ اس پر میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور میں یہ جاننے کے لئے بے تاب ہو گیا کہ وہ کون سنگدل انسان ہے جو اس ماتم کدہ میں رقص و سرود سے دل بہلا رہا ہے۔ اور میں نے اپنے دل میں ٹھان لی کہ جب تک اس بھید کو نہ پالوں گا دم نہ لونگا۔ چنانچہ میں کانوں کے بتائے ہوئے راستہ پر چلتا ہوا ایک عظیم الشان حویلی کے سامنے رُکا جس کے دروازے پر دو دربان چمکتے ہوئے کٹارے ہاتھوں میں لئے پہرہ دے رہے تھے ــــ کہتے ہیں "جو بندہ یا بندہ" ــــ معلوم ہوا کہ وہ علاقہ شہر کے رؤسا اور مُلک کے حکام کا مسکن ہے۔ اور وہ حویلی ایک بہت بڑے سوداگر کی نشاط گاہ ہے جس کی جادوگروں کے دیس کے مہامنتری سے گاڑھی چھنتی ہے۔ مہامنتری دیہاتی دوشیزاؤں پر دم دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے دوست سوداگر کے گرگے کچھ "مال" گھیر کر لائے ہیں اور حویلی میں رَت جگے کا انتظام ہے۔ رات بھر امیری غریبی سے لُطف اُٹھائے گی اور صبحدم دونوں کچھ اس ادا سے جدا ہونگے جیسے کبھی ایک دوسرے سے کوئی سروکار ہی نہ تھا ــــ اور دربانوں نے کہا "ہر شب یہاں یہی ہوتا ہے" ــــ راجدھانی کے اس علاقہ کی سیر کرتے وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی اور ہی دُنیا میں گھوم رہا تھا۔ جہاں نہ بھوک تھی نہ عریانی، نہ بیماری تھی نہ موت ــــ لیکن محلوں اور ماڑیوں کی اس دُنیا سے نکل کر مجھے پھر اُن دبکے ہوئے دڑبوں سے دوچار ہونا تھا جنہیں دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ شاید یہاں ڈھور ڈنگر رہتے ہوں گے۔ حالانکہ وہ اُن اَن گنت انسانوں کے گھر تھے جن کے لہو پسینہ سے محلوں اور ماڑیوں کی تعمیر ہوئی تھی۔

بلندی اور پستی کا یہ تضاد دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں خدا کی خدائی سے منحرف ہو رہا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا۔ کوئی میرے کانوں میں کہہ رہا تھا ــــ "قلندر تجھے کیا۔ جہاں تیرا ہے یا اُس کا۔ اس کے بنانے والے کو آپ ہی اس کی فکر ہوگی۔ تو کیوں مفت میں دُبلا ہوا جاتا ہے۔ تیرے لئے تو بس یہی کافی ہونا چاہیئے کہ تو ہے اور بس۔ اگر کسی اور کو زندگی سے شکایت ہے تو وہ اس کے واسطے میں خود ہے ......"

[illegible] میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ دفعتاً پاؤں کسی نرم چیز کے ساتھ مَس ہوئے۔ جھک کر دیکھا تو ایک نومولود بچّے کی لاش تھی۔ ہاتھوں سے زمین کھود کر اُسے دفن کیا اور اُس کی موت کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اتنے میں مشرقی اُفق پر ایک ہلکی سی روشنی نمودار ہوئی اور دُور کہیں دھندلکوں کے دامن سے ناقوس اور اذان کی آوازیں اُبھریں۔ یہ آوازیں کچھ اس خوبصورتی سے ایک دوسرے میں تحلیل ہو رہی تھیں جیسے بندوں کی بپتا دیکھ کر خداؤں کی آپس میں صلح ہو گئی ہو۔ اس وقت میرے جی میں آئی کہ ماتھے پر چندن کا ٹیکہ لگا کر کسی مندر میں نماز ادا کروں لیکن اس خوبصورت خواہش کا وہی حشر ہوا جو اکثر خواہشوں کا ہوتا ہے۔ ایسی آرزوئیں پوری ہونے کے لئے نہیں ہوتیں اور میں اس حسین خیال سے ایک قسم کا ذہنی لطف اُٹھا کر ہی مطمئن ہو گیا ــــ اس مسرت کا اثر آج تک قائم ہے اس بات کو ایک عرصہ گزر چکا ہے لیکن اب بھی رات کے سناٹے میں جب میں اپنے تجربات کا جائزہ لیتا ہوں تو اُمید کی ایک ہلکی سی کرن میرے ذہن میں جاگ اُٹھتی ہے اور مجھے یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ کبھی روز میری وہ حسین خواہش پوری ہو کر رہے گی۔ اور انسانیت کے درمیان نفرت اور نفاق کی جو کھائیاں نظر آ رہی ہیں ایک روز مِٹ جائیں گی۔

اور اے یاراں اب میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ میرے کشکول میں کہانیاں تو بہت ہیں ــــ آپ بیتیاں بھی اور جگ بیتیاں بھی، اگر چاہوں تو ساری عمر داستان گوئی کرتا رہوں لیکن وہ دیکھئے، مشرقی اُفق پر ایک پُر اسرار روشنی نظر آ رہی ہے۔ اور وہاں دودھیا گنبدوں اور سُنہرے کلسوں کے پیچھے سے ابھی ایک دہکتا ہوا کرّہ نمودار ہوگا جس سے سارا عالم بقعۂ نور بن جائے گا۔ ایسے میں قلندر بیکار نہیں بیٹھ سکتا۔ کوئی نامعلوم منزل اُسے اپنی طرف بُلا رہی ہے۔ اُسے جانا ہے۔ قسمت میں ہوا تو پھر ملاقات ہوگی۔ یار زندہ صحبت باقی ــــ حیدریم، قلندرم، مستم ....؛

لال قلعہ کی ایک جھلک :- سیّد ناصر نذیر فراقؔ دہلوی کی تصنیف ہے۔ جس میں دکھایا گیا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفرؔ کے زمانے میں لال قلعہ کی کیا حالت تھی اور اس انتہائی انحطاط کے زمانے میں بھی وہاں کی دلچسپیوں کا کیا عالم تھا۔ فراقؔ مرحوم دہلی کے مشہور انشا پرداز تھے اور اس اسکول کے لوگوں میں سے تھے جس کا اب ایک فرد بھی باقی نہیں؛ دلّی کی ٹکسالی زبان اور قلعہ معلّیٰ کی ستھری ستھری بول چال اگر دیکھنی ہے تو "لال قلعہ کی ایک جھلک" کا مطالعہ کیجئے۔ قیمت صرف ایک روپیہ؛

Nature's Blood Bank

چالیس سال کے بعد آپ کو

نیا خون

درکار ہے۔ اس عمر میں اگر اپنی صحت کے متعلق آپ نے ذرا بھی غفلت کی، تو جلد ہی آپ کی کمر جھک جائے گی، بڑھاپا آپ کی زندگی کو تلخ بنا دے گا، تن درست ہوں۔ یا مریض۔ دونوں حالتوں میں آپ کو ہمدرد کے ماءاللحم کی ضرورت ہے، کیونکہ

"It's a Blood Bank in a Bottle"

MAULLAHAM

ہمدرد کا

ماءاللحم

دوا نہیں ہے، بلکہ تازہ خون کا خزانہ ہے، یہ حلق سے اترتے ہی خون بن جاتا ہے؛ اسے تازہ پھلوں اور مقوی میووں اور



صحت بخش غذاؤں اور خاص قیمتی دواؤں کے جوہر سے دواسازی کی جدید ترین مشینوں سے جدید اصول پر تیار کیا جاتا ہے، دل، دماغ اور اعضاء رئیسہ میں نئی زندگی پیدا کرتا ہے۔ معالج استعمال کراتے ہیں؛ یہ جنرل ٹانک ہے۔ ہر عمر کے لوگ استعمال کر سکتے ہیں، قیمت فی بوتل پانچ روپے،

Hamdard

اپنے کیمسٹ یا ہمدرد دواخانہ دہلی سے طلب کیجئے

ظریف دہلوی

ہم کیا کریں

" دیکھنا ذرا اِس کلموئی کی تو جا کر خبر لو کہاں مرگئی؟"

ہم :- کون سی کلموئی ؟

بیگم :- یہ کم بخت جمّیا کل سے کمانے نہیں آئی سارا گھر سٹر رہا ہے ذرا جا کے دیکھو تو کیا ہوا۔

ہم :- ہمارے تو دفتر کو دیر ہو رہی ہے تم نے یہ ایک اور کام بتا دیا۔

بیگم :- تم جانو نہ جاؤ۔ یہ بھی سوچا کہ کمایا نہ جاتے گا تو آخر ہوگا کیا۔

خیر ہم بادلِ ناخواستہ اُٹھے محلّے میں گئے لوگوں سے پوچھا سب نے یہی کہا کہ کل سے ہمارے ہاں بھی کمانے نہیں آئی ہم کٹڑے میں گئے دیکھا کہ جمّیا بیٹھی مزے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے ہم نے کہا :

ہم :- بھاگوان! تو نے یہ کیا کیا گھر کو سنڈاس بنا دیا۔

جمّیا :- میاں ہم سے اب اِس محلّے میں نہیں کمایا جاتا تم کوئی اور بندوبست کرلو۔

ہم :- ارے اور بندوبست کیسا ؟ تُو بات تو بتا کیا ہے ؟

جمّیا :- میاں پرسوں تمہاری بیگم صاب نے مجھے جھاڑوؤں سے مارا۔ لو صاب ایک تو ان کا میلا سر پر اُٹھائے اُٹھائے پھرو اوپر سے مار بھی کھاؤ۔ نا صاب یہ ہمارے بس کا روگ نہیں۔

ہم :- ارے تو پھر تو ہی بتا اب کیا ہوگا ؟ ہم خود اپنے سر پہ اُٹھا اُٹھا کر پھینکیں گے ؟

جمّیا :- یہ تو بیگم صاب سے پوچھو جنہوں نے جھاڑوؤں سے مارا ہے۔

ہم نے بہت دیر تک سمجھایا مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئی تو گھر آکر بیوی سے کہا :

ہم :- وہ تو آتی نہیں بیگم۔

بیگم :- آتی کیسے نہیں چوٹیا پکڑ کر لاؤ خطامہ کی۔

ہم :- یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔

بیگم :- آخر بکتی کیا ہے معلوم تو ہو۔

ہم :- وہ کہتی ہے تم نے پرسوں اُسے جھاڑوؤں سے مارا۔

بیگم :- ہاں ہاں مارا۔ اور ماروں گی۔ جھاڑوؤں سے مارا! اُسکے تو جوتیاں لگاؤنگی جوتیاں۔ لو صاحب! ایک تو دو دو وقتی کو نہ آتیں، فرش دھوتیں اپنی شکل کا۔ کنستر منگوا کر دیا فرش دھونے کے لئے کم بخت نے چار دن میں پیندا توڑ دیا۔ پاخانہ دھونے کے لئے پانی لے جاتی ہے تو وہاں جاتے جاتے آدھا کنستر رہ جاتا ہے، وہیں باہر سے کھڑے ہو کر جو پھینکتی ہے تو اِک ذرا سا پانی اندر جاتا ہے باقی سب باہر ہی گر جاتا ہے اور جو کچھ کہو تو ٹرّانا شروع کر دیتی ہے۔ ایک روپیہ مہینے کا ڈیڑھ کروا لیا اور کام ایسا دلدّر۔

ہم :- تو اب کیا ہو؟

بیگم :- ہو کیا ؟ چودھری سے جا کر کہو اُسے ڈانٹو کمیٹی میں رپٹ کرو۔

ہم :- لاحول ولا قوۃ! اب میں دفتر جاؤں یا اس جھگڑے میں پڑوں۔

بیگم :- نہیں جھگڑے ہی دکھائی دے رہا ہے۔ ارے میں کہتی ہوں کچھ بندوبست نہ کرو گے تو اس گھر میں رہ کیسے سکو گے۔

ہم :- بیگم! ہماری تو جان مصیبت میں آگئی۔ اُس دن تم نے دھوبن کے تھپّڑ مار دیا وہ کپڑے پھینک پھانک کے چلدی، بڑی منّت خوشامد سے اُسے راضی کیا اب تم نے یہ دوسرا محاذِ جنگ قائم کر دیا۔ میں ہی رہ گیا ہوں اِن کمینوں کی خوشامد کرنے کو۔ اچھا تم کھانا تو لاؤ میرے دفتر کو دیر ہو رہی ہے۔

بیگم کھانا نکالتی جاتی تھیں اور بڑبڑاتی جاتی تھیں۔ "نوج کسی کے گھر کے مرد ایسے ہوں موئے چومنا اِن موئے کمینوں کو سر پہ ہی چڑھا لیا ہے اور کوئی ہوتا تو اِس

نامُراد کے ایسے ہوتے لگا تا کہ یاد کرتی۔ اِن سے ڈانٹ ڈپٹ بھی نہیں کی جاتی۔" ہم نے جلدی جلدی کھانا کھایا کیا دھکیلا اور دفتر بھاگے۔ اپنی بیگم کی عادت تو جانتے ہی تھے سارا دِن خیال لگا رہا کہ خبر نہیں کیا ہو رہا ہوگا یہ اللہ کی بندی کسی کی خاک نہیں مانتی ہر کسی سے اُلجھ پڑتی ہے۔ خیر دفتر میں کام بھی کرتے جاتے تھے اور دماغ میں ایک چھوٹی سی تقریر بھی تیار کر رہے تھے کہ بیگم کو یوں سمجھائیں گے یہ کہیں گے یوں قائل کریں گے آج دفتر سے ذرا سویرے سے اُٹھ کھڑے ہوئے گھر پہنچے ہی سب سے پہلے بیگم کی صورت دیکھی کہ چہرے پر امن و امان کی فضا ہے یا آثار برہمی ہیں اُنہوں نے بھی آنکھیں چار کیں اور نظروں کے سوال کا جواب زبان سے یوں دیا۔

بیگم :- کچھ اور بھی سُنا تم نے ؟

ہم :- کیا ہوا ؟ کوئی نیا گل کِھلا کیا ؟

بیگم :- وہ سارے محلّے والے بھی تم ہی کو بُرا کہہ رہے ہیں۔

ہم :- مجھے ؟ ارے میں نے کیا کیا ؟

بیگم :- یہ جُمیا کی بچی کہتی ہے کہ سارا محلّہ کماؤ گی مگر یہ جویلی نہیں کمانے کی۔ اور یہ محلّے والے بھی اُسے ڈانٹنے سے تو رہے اور اُلٹی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔

ہم :- یہ تو بُری ہوئی۔

بیگم :- بُری کیسے ہوئی۔ تمہارے مُنہ میں زبان نہیں ہے کہتے کیوں نہیں جاکر۔

ہم :- بیگم سارا دن تو کاغذوں سے سر مارتے گذرا اب اِن سے سر کھپاؤں کیا مصیبت میں جان آئی ہے۔

بیگم :- پہلے زمانے میں بہادر لوگ فوجوں میں گھُس جاتے تھے اور کانی سی پھاڑ کر چلے آتے تھے تم سے اِتنا بھی نہیں ہوتا کہ زبان ہی سے لڑلو۔

ہم :- پہلے زمانے کے لوگ گھی کھاتے تھے دودھ پیتے تھے ہم تیل کھاتے ہیں وہ بھی خالص نہیں اور لسی پیتے ہیں یہ بھی اللہ کی قدرت ہی سمجھو جو دفتر چلے جاتے ہیں اور خیر سے واپس آجاتے ہیں۔

بیگم :- اچھا پھر اِس کا کچھ علاج بھی ہوگا یا نہیں۔

ہم :- ہائے پہلے زمانے کے لوگ کیسے اچھے تھے۔ دیکھنا بیگم! دن بھر روزہ رکھا اور روزہ بھی کیسا ؟ یہ نہیں کہ اس پر مزاج بگڑ رہا ہے اُس پر بک جھک رہے ہیں اُسے پکڑ کر ٹھونک دیا۔ دوپہر بھر پڑے سستاتے رہے اُٹھے مُنہ ہاتھ دھویا بازار نکل گئے کیلے چھانٹ رہے ہیں امرود ہاتھ میں لے لے کر دیکھ رہے ہیں انگور خرید رہے ہیں دو گھنٹے یوں گزار آئے اب بیٹھے ہوئے امرود چھیل رہے ہیں کچالو بنا رہے ہیں بکتے جھکتے بھی جاتے ہیں ہر دم گھڑی پر نظر ہے خدا خدا کر کے مغرب کا وقت ہوا اذان میں ابھی دو تین منٹ باقی ہیں یہ اللہ کے نیک بندے شربت کے بڑے پیالے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں" اِس محلّے کی دونوں مسجدوں کے گھنٹے پیچھے ہیں بھلا دیکھو تو سہی اندھیرا ہو چلا اور مُلّا جی ابھی پڑے اونگھ ہی رہے ہیں اور اس مسجد کا وہ پٹھان مُلّا تو ایسا نا معقول ہے کہ پہلے خود روزہ کھول کر اپنا تل بھر لیتا ہے پھر اذان دینے کھڑا ہوتا ہے جاکر دیکھو تو میٹھا کھا رہا ہوگا حالانکہ صحیح حدیث یہ ہے کہ "روزہ افطار کرنے میں جتنی جلدی کی جائے اُتنا ہی زیادہ ثواب ہوتا ہے۔" خیر صاحب خدا خدا کر کے اذان کی آواز کانوں میں آئی پھر جو آستینیں چڑھا کر ڈٹے ہیں تو کبھی پھلکیوں پر ہاتھ ملتے ہیں کبھی کچالو اُڑاتے ہیں کبھی شربت کا گلاس مُنہ میں اُنڈیلتے ہیں غرض دونالی بھر کے اُٹھے۔ نماز پڑھنے کھڑے ہوتے ڈکاریں لے رہے ہیں اور اُونگھ جھٹک کر رہے ہیں۔ خیال کھانے ہی میں لگا ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کو مسجدوں میں امام صاحب دو ڈیڑھ گھنٹے تراویحوں میں نہ رگڑیں تو یہ سحری کے روزے لگاتے لگاتے پانچ چھ ہی دن میں بیمار ہو کر پڑ جائیں۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ پہلے زمانے کے لوگ کیسے اچھے تھے کہ روزہ رکھا قرآن شریف اور نمازوں میں دن گذارا اکل حلال کی سعی نیک بھی کرتے رہے افطار کا وقت ہوا کھجور سے روزہ کھولا اور جو کی روٹی کھا کر عبادت میں مصروف ہو گئے اور اکثر اللہ کے نیک بندے

ایسے بھی تھے کہ کھجور سے روزہ کھولا اور بغیر سحری کے دوسرا روزہ رکھ لیا۔ تو بیگم میرا مطلب یہ ہے کہ آؤ ہم بھی اللہ کے نیک اور پیارے بندے بن جائیں۔ سیر بھر کھجوریں لے آتا ہوں دو دو کھجوریں روز کھا کر روزہ رکھ لیا کریں گے نہ پیٹ میں کچھ رہے گا نہ یہ بینگن کے نخرے اٹھانے پڑیں گے اور پھر جنت کے حقدار ہوئے سو الگ۔

بیگم:۔ واہ وا واہ! میں تو سمجھی تھی جنے کیا کچھ دفتر سے سوچ کر آتے ہیں کوئی اچھی سی ترکیب بتائیں گے انہوں نے تو ایک دم سے ولی ہی بنا دیا۔

ہم:۔ بیگم! ذرا غور تو کرو کیسی اچھی بات ہے کیسی نیک اور پاکیزہ زندگی ہوگی اور پھر عمر نے عمر دراز نکالا۔

بیگم:۔ اے بس رہنے دو اپنی بات وات کو۔ بات آئی ہے کہیں کی۔ جاؤ کچھ بندوبست کرو۔

ہم:۔ بیگم! میں نے جان کر تم سے نہیں کہا تھا کہ تم اور بھی چراغ پا ہوگی۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میں دفتر سے آج اسی مارے جلدی اٹھ آیا تھا یہاں گھر میں گھسنے سے پہلے میں میر صاحب کے ہاں گیا انہیں ساتھ لیکر شیخ صاحب کے پاس گیا وہاں مرزا جی اور لالہ جی بھی بیٹھے تھے بہت سی باتیں ہوئیں مگر ع مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات۔

بیگم:۔ مقطع کیسا؟ اب لگے یہاں بھی شاعری بگھارنے؟ بات کہو بات۔

ہم:۔ بات کیا کہوں تم بگڑ جاؤ گی۔

بیگم:۔ بات تو کہو۔ سیدھی بات پر کیوں بگڑنے لگی۔ ایسی کیا دیوانی ہو گئی ہوں۔

ہم:۔ سیدھی ہی تو بات نہیں ہے ٹیڑھی ہے جب ہی تو کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔

بیگم:۔ بس بجھواؤ نہ پہیلیاں۔ اب کہہ بھی چکو کسی طرح۔

ہم:۔ بیگم! وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے ہر طرح جمیا کو سمجھایا بجھایا وہ کسی طرح نہیں مانتی اس بات پر اڑ گئی ہے کہ تم معافی مانگو۔

بیگم:۔ تم کیوں معافی مانگو؟

ہم:۔ ارے ہم نہیں تم مانگو تم۔

بیگم:۔ (اچھل کر) کیا کہا؟ میں معافی مانگوں؟ اس چڑیل سے؟ ارے یہ کہا اس نامراد ناشاد نے؟ ذرا لاؤ تو اسے پکڑ کے میرے پاس۔ ارے تم میری شکل کیا دیکھ رہے ہو۔ ذرا لاؤ تو اس کلموئی کی چٹیا پکڑ کے میرے سامنے۔ ارے اٹھو اٹھو! میرے تن بدن میں آگ لگ رہی ہے۔ اور یہ مزے سے بیٹھے مٹر مٹر دیکھے جا رہے ہیں۔ اٹھو نہ تمہیں ہو کیا گیا ہے سنتے نہیں۔

ہم:۔ بیگم! اسی لئے تو میں خاموش تھا تم سے کہتا نہ تھا تم نے میرے حلق میں انگلی ڈال کے بات نکال لی۔ اب کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اِدھر بھی تریاہٹ اُدھر بھی تریاہٹ۔

بیگم:۔ اب تو میں ایک منٹ اس محلے میں نہیں ٹھہر سکتی دوسرا مکان لے لو۔ یہاں سے اٹھ چلو۔

ہم:۔ مکان بھی کیا دوکانوں پر ملتے ہیں کہ گئے اور لے آئے۔ تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ دلی میں مکانوں پر کیا آفت آئی ہوئی ہے ہم اچھے اچھے شریف اور پڑھے لکھے بابو لوگ بڑی بڑی تنخواہوں والے چھوٹے چھوٹے مکانوں میں چھ چھ مل کر رہ رہے ہیں اور بال بچوں کو وطن میں چھوڑ رکھا ہے۔ تم کہتی ہو دوسرا مکان لے لو کوئی اپنا بس ہے۔

بیگم:۔ تو میں تو جاتی ہوں اپنی اماں کے ہاں۔

ہم:۔ اچھا سنو تو سہی۔ تم بس اتنا زبان سے کہدو کہ آئندہ جمیا کو نہیں مارونگی پھر میں سلٹ لونگا اور سب کو راضی کر لوں گا۔

بیگم:۔ مارونگی سو دفعہ مارونگی۔ لو صاحب کام نہیں کریگی اور زبان چلائیگی تو میں اس کی خوشامد کرونگی اسکے آگے ہاتھ جوڑونگی۔ چڑیل کا مار مار کے بھرکس نکال دوں گی۔

ہم:۔ تو پھر اب کیا کیا جائے ؎

ملک الموت کو ضد ہے کہ میں جاں لے کے ٹلوں
سر بسجدہ ہیں مسیحا کہ مری بات رہے

بیگم:۔ یوں تو اس کم بخت کا وہ حشر کرنا ہوا کہ اب تو وہ مجھے لے کے جوتیوں میں بہن ڈالیگی اور خاک بھی کام کرنے دیگی۔

ہم :- نہیں ایسا نہیں ہوگا تم میری بات مان لو۔ ان کمینوں سے دو بدو کرنی بھی نہیں چاہیئے اس لئے کہ ان کی تو کوئی عزت نہیں مار کھالیں اور جھاڑ جھوڑ کر کھڑے ہو جائیں اور جو خدانخواستہ کہیں وہ بھی تمہیں ایک جھاڑو مار بیٹھے تو تمہاری عزت تو دو کوڑی کی رہ جائے نا۔

بیگم :- ارے تم کہہ کیا رہے ہو؟ وہ جوانا مرگ مجھے مارے گی؟ مجھے؟ ذرا مار کے تو دیکھے کھال کھینچ کے رکھدوں نامُراد کی۔

ہم :- کھال کھینچو یا کچھ کرو عزت تو جاتی ہی رہے۔ بیگم ایک دن کا واقعہ سُناؤں بالکل اپنے سامنے کا میں تماشوں کی گلی میں سے جا رہا تھا ایک بھنگن بھرا ہوا ٹوکرا سر پر لئے گذر رہی تھی۔ پہلے زمانے میں بھنگی رستے میں آواز لگاتے چلتے تھے "بھنگی ہے سرکار" "بچ جایئے ماں باپ"۔ "بچے جیتے رہیں حکم بنا رہے سرکار" اور اب تو جان جان کے بھڑ کے چلتے ہیں تو ایک لالہ صاحب اُجلے برت کپڑے پہنے ہوئے جا رہے تھے بھنگن اُن سے بھڑ کر نکلی۔ لالہ صاحب جلدی سے بچ تو گئے مگر کہنے لگے "اری دیکھ کے نہیں چلتی آنکھیں پھُوٹ گئی ہیں"۔ بھنگن وہیں کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی "لالہ مُنہ سنبھال کے بات کرو۔ آنکھیں پھُوٹی ہونگی تمہاری" لالہ صاحب نے خفا ہو کر اُسے دو چار صلواتیں سُنائیں بس یقین ماننا بیگم اُس بھنگن نے آؤ دیکھا نہ تاؤ وہ غلاظت کا بھرا ہوا ٹوکرا لالہ صاحب پر پھینک دیا۔ بیچارے کے سارے کپڑے خراب ہو گئے۔

بیگم :- پھر اُس چڑیل کو مارا نہیں لوگوں نے۔

ہم :- اُس کے بھی طرفدار موجود ہو گئے اور لالہ ہی کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ اِس زمانے میں وہ مقولہ بالکل ہی صحیح ہو گیا ہے کہ "اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے"۔

بیگم :- یہ تم ہی لوگوں نے اچھوتوں کو سر پر چڑھا دیا ہے ورنہ اِن کی مجال تھی کہ آنکھ ملا سکتے۔

ہم :- تو بس اب میں جا کر کہہ دیتا ہوں تم آئندہ اُس سے کچھ نہ بولنا۔

بیگم :- نہیں میں تو فی الحال اماں کے ہاں جاتی ہوں تم اگر کہیں اور مکان کا بندوبست کر لو گے تو آجاؤنگی نہیں تو تم جانو مجھ سے یہ ذلت برداشت نہیں ہو سکی۔

میں نے بیگم کو بہتیرا سمجھایا مگر وہ کسی طرح نہ مانیں اور اپنی اماں کے ہاں چلی گئیں۔ اب ہم کیا کریں۔

تصانیف مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم

دیکھا جائیگا :- مُصنّف کی ادبی کاوشوں میں شاید سب سے زیادہ رنگین چیز ہے۔ ایک لکھ پتی اپنی لڑکی کی شادی کے سلسلے میں اس قدر مضحکہ خیز جنجال میں پھنس جاتا ہے کہ اس کی عقل چرخ ہو جاتی ہے۔ خود لڑکی ایک نہایت ہی عجیب و غریب مخمصہ میں پھنس جاتی ہے۔ بیحد کامیاب اور انتہا سے زیادہ دلچسپ ہے۔ اس کہانی کا ڈرامہ دلّی اور لکھنؤ کے ریڈیو اسٹیشنوں سے کئی بار نشر کیا جا چکا ہے۔ بیحد مقبول تصنیف ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔

فَل بُوٹ :- یہ چھوٹے چھوٹے اکیس باب کا ناول ہے۔ جو تین حصّوں میں منقسم ہے اور چغتائی صاحب کی تصانیف میں خاص چیز ہے۔ بلحاظ پلاٹ اور رنگین بیانی مُصنّف کی یہ بہترین تصنیف ہے۔ تخیّل کی لطافت پلاٹ، عبارت کی ظرافت اور واقعات کی شوخی دیکھنے کے لائق ہے۔ پھر ان تمام باتوں کے ساتھ مُصنّف نے اپنی دلچسپ مگر سلجھی ہوئی عبارت میں جس خوبصورتی سے جذبات بھرے ہیں اس کی تعریف ناممکن ہے۔ ایسی دلکش کہانی آپ نے اب تک نہیں پڑھی ہوگی۔ قیمت ایک روپیہ۔

لفٹنٹ :- یہ ایک انتہا سے زیادہ پُر مذاق طول طویل افسانہ ہے مزاحیہ افسانوں میں خاص چیز ہے۔ مُصنّف کی بہترین تصنیف ہے۔ ایک ڈاکٹر صاحب کی بیوی ہیں جو طب کی قائل ہیں اور ڈاکٹر آنریری لفٹنٹ ہو گئے ہیں۔ بس نہ پوچھئے کیا مزے آئے ہیں۔
قیمت صرف آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ :- **ساقی بک ڈپو، دہلی۔**

بودیلیر کے جملے کا ایک حصہ فرانسیسی میں یوں ہے: ——— .Mon semblable, mon frere جوئس نے اسے یوں بدلا ہے: ——— .My shemblable, my freer یہ لفظ freer بھی بہت مزیدار ہے۔ فن کار اپنی شخصیت کا اظہار براہ راست نہیں کر سکتا، یہ بات صرف کرداروں کے ذریعے ممکن ہے۔ جو آزادی فن کار کو حاصل نہیں وہ کرداروں کو حاصل ہے۔ لہٰذا یہ کردار جوئس کی شخصیت کا زیادہ آزاد حصہ (my freer) ہوا۔ اس کردار کا نام shem ہے، جس کی آواز لفظ Sham سے ملتی جلتی ہے۔ چنانچہ جوئس نے بڑی صفائی سے اپنے آپ کو جعلیا کہہ دیا ہے۔ یہاں پھر نفسیاتی تحلیل کرنے والوں کے جعلے پن سے بچئے۔ اپنے آپ سے یہ بیزاری کوئی ذہنی بیماری نہیں ہے، بلکہ ایک صحت مندانہ اخلاقی تلاش ——— خلوص اور ریاکاری کے معنوں کی جستجو۔ جوئس میں ایک بڑا صحت مندانہ عنصر یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر بڑکر کھل کر ہنستا ہے۔ اور اپنے آپ سے بے اندازہ لطف لیتا ہے۔ میرا تو یہ حال ہے کہ میں جوئس کو جتنا پڑھتا ہوں اس کی شخصیت سے اتنی ہی محبت بڑھتی جاتی ہے۔

جوئس کی اہمیت کے متعلق مجھے ایک بات اور کہنی ہے۔ لیکن اس کے متعلق شہادتیں اور دلیلیں میں نے دو سال ہوئے جمع کی تھیں اور محض اپنے دماغ میں۔ اب تک وہ سب رو چکر ہو گئیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ میری بات بڑی بے بنیاد سی معلوم ہو۔ مگر بہرحال غور کے قابل ہے۔ پچھلے ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں یورپ کے ذہن میں ایک عجیب رجحان نظر آتا ہے، یعنی چیزوں کا شعور کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چیزوں سے میرا مطلب ہے یہی معمولی روزمرہ کی چیزیں، میز، کرسی، اپنے کپڑے وغیرہ۔ اس کی وجہ نظریہ بازی کی زیادتی بھی ہو سکتی ہے۔ بہرحال وجوہات پر غور کرنے کا یہ موقع نہیں۔ اس رجحان کے نشانات یورپ کے ادب میں جابجا ملتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے گرد و پیش سے انسان کی دلچسپی کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ لیکن یہ صورت حال بڑی خطرناک ہے۔ محض مطلقات اور مجرّدات سے محبت کر کے انسان خوشی حاصل نہیں کر سکتا اس لئے موجودہ زمانہ میں آرٹ کا یہ ایک زبردست فریضہ ہے کہ انسان کے شعور میں چیزوں کے احساس اور ادراک کو زندہ رکھے۔ چنانچہ Symbolism, Naturalism, the Parnasse Surrealism, Imagism ——— ہر نئی ادبی تحریک میں کسی نہ کسی حد تک یہ کوشش ضرور پائی جاتی ہے۔ اس چیز میں جوئس موجودہ زمانہ کے ہر یورپین ادیب اور شاعر سے آگے ہے، کیونکہ چیزوں کا احساس چیزوں کی حیثیت سے کسی کے یہاں اتنا شدید نہیں۔ فطرت نگاروں کے یہاں چیزوں کا ادراک سائنس داں کا سا ہے، فن کار کا سا نہیں۔ فلابیر کا ادراک نسبتاً زیادہ جمالیاتی ہے، مگر اس کے یہاں چیزیں بذات خود کوئی اہمیت نہیں رکھتیں، بلکہ اور چیزوں کے ساتھ مل کر کسی ذہنی کیفیت کے اظہار میں مدد دیتی ہیں۔ مارسل پروست کے ہاں چیزوں کا وجود بالکل ثانوی ہے، اُسے تو احساس سے زیادہ دلچسپی ہے، بلکہ اس کے نزدیک تو احساس چیزوں سے زیادہ ٹھوس ہے؛ اس سے بھی زیادہ یہ کہ احساس ہی چیزوں کو اصلیت اور حقیقت بخشتا ہے۔ احساس کے بغیر شاید پروست کو چیزوں کا وجود تک تسلیم نہ ہوگا۔ ایلیٹ اور دوسرے بڑے شاعروں کے یہاں چیزیں اس وجہ سے اہم اور قابل قدر نہیں ہیں کہ وہ چیزیں ہیں، بلکہ علامت ہونے کی وجہ سے۔ یوں تو جوئس بھی چیزوں کو علامت کے طور پر استعمال کرتا ہے، لیکن اُسے چیزوں کی ذات سے بھی بڑی دلچسپی ہے، اور اس کا ادراک بھی خالصتہً جمالیاتی ہے۔ وہ چیزوں کا ذکر کرتا ہے محض اس لئے کہ وہ چیزیں ہیں۔ غالباً یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ جوئس کے نزدیک چیزوں کی مدد کے بغیر احساس ممکن نہیں۔ لہٰذا چیزیں بھی اتنی ہی اہمیت رکھتی ہیں جتنی شعور۔ اس نے خود کہا ہے کہ فن کار اپنے احساس حُسن کا اظہار اسی زمین اور اسی زمین کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے ذریعے کرتا ہے، ہماری روح اپنے قیدخانہ سے رہائی پا سکتی ہے تو آواز، رنگ اور شکل کے دروازوں سے۔ چنانچہ جوئس جتنا ممکن ہو سکتا ہے چیزوں کو حسیاتی اور جمالیاتی اعتبار سے ٹھوس بنا کر پیش کرتا ہے۔ بعض نقاد کہتے ہیں کہ جوئس کا تخیل بصری نہیں ہے، اس کا بیان ہماری آنکھوں کے سامنے کوئی تصویر پیش نہیں کرتا۔ یہ ٹھیک بھی ہو، تب بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جوئس چیزوں کو ٹھوس نہیں بنا سکتا۔ الفاظ آخر آوازیں ہی تو ہیں اور فن کار آوازوں سے ہر طرح کا کام لے سکتا ہے۔ اگر جوئس کے الفاظ تصویر پیش نہیں کرتے تو کیا ہے، اس کے بغیر بھی وہ ہمیں چیزوں کے ٹھوس ہونے کا احساس دلا سکتے ہیں۔ "یولی سیز" میں سے ایک فقرہ مثال کے طور پر لیجیے جہاں جوئس نے سڑک پر گھوڑوں کے

گزرنے کا ذکر کیا ہے: *Hoofirons steely ringing.*

اسی صنعت کی بنا پر جوائس کی آخری دو کتابیں صرف مجموعی حیثیت ہی سے دلچسپ نہیں، بلکہ ان کا ایک ایک فقرہ، بعض حصوں میں تو ایک ایک لفظ عجیب و غریب ہے۔ جوائس کی دنیا اتنی بھری پڑی ہے کہ اگر یورپ کی تہذیب مٹ بھی جائے تو ان دو کتابوں کی مدد سے کم سے کم دماغ میں اسے دوبارہ تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ جوائس کے آرٹ میں یہ آب و رنگ آیا ہے تو میرے خیال میں یہاں پھر خیر و شر کے عیسوی نظریئے کو بہت بڑا دخل ہے۔

اب آخر میں کمیونسٹوں کے ایک اعتراض پر بھی غور کر لینا چاہیئے۔ جوائس کے سر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو آرٹ کے محل میں بند کر لیا۔ اور اپنے زمانہ کی حقیقتوں کی طرف توجہ نہیں کی۔ لیکن جوائس اپنے زمانہ کی حقیقت سے زیادہ دیرپا اور بنیادی حقیقت سے الجھ رہا تھا۔ یعنی فرد اور اس کے مسائل سے جو ہر زمانے میں ایک ہی ہوتے ہیں۔ جوائس کی اخلاقیات وقتی اور ہنگامی نہیں ہیں بلکہ اتنی ہی مستقل ہیں جتنی انسانی زندگی۔ ویسے بھی جوائس کو سیاسیات سے بہت زیادہ انہماک تھا۔ اس نے سب سے پہلے جو چیز لکھی وہ سیاسی پمفلٹ تھا۔ '*Portrait*' اور '*Dubliners*' میں بھی اس نے جابجا آئرلینڈ کی سیاست پر نکتہ چینی کی ہے، اور بڑی تلخی سے۔ آخری دو کتابوں میں وہ سیاست کو نہیں بھولا۔ صرف فرق یہ ہے کہ تھوڑا دوسری طرح سے برتا گیا ہے۔ آخری کتاب میں یورپ کی ہر سیاسی اور علمی تحریک کا ذکر ہے۔ اور سب پر پھبتیاں کہی گئی ہیں۔ مگر، یہ سب پہیلیاں ہیں اور انھیں بوجھنا پڑتا ہے۔ ایک آدھ مثال دیکھئے: بچہ سوتے میں کسی شور سے ڈر کر جاگ اٹھتا ہے، اس پر سونے والے کے دماغ میں یہ فقرہ آتا ہے: *So young & frendened*; اور دیکھئے جوائس نے انگریزوں کے جھنڈے یونین جیک کی کیا گت بنائی ہے۔ *Unionjak and be join to yok.*

متوسط طبقے پر جوائس یوں چوٹ کرتا ہے: "*Muddle crass pupils.*" غرض کہ ایسی سیکڑوں مثالیں ہیں کہاں تک گنواؤں۔ مطلب یہ ہے کہ جوائس کو بھی اپنے زمانہ کے مسائل سے اتنا ہی گہرا تعلق تھا جتنا بڑے سے بڑے کمیونسٹ لیڈر کو۔ لیکن اس کے نزدیک آرٹ بڑی زیادہ حقیقت تھی، کیونکہ بقول فورسٹر کے تاریخ حرکت کرتی ہے، آرٹ اپنی جگہ کھڑا رہتا ہے۔ سیاست ہمارے زمانہ کی بہت بڑی حقیقت سہی، مگر جوائس نے شروع میں ہی سمجھ لیا تھا کہ موجودہ زمانہ کے فن کار کیلئے لازمی ہے کہ اپنی شخصیت کو عامیانہ قسم کے جوش اور مبتذل گرما گرمی کے حوالے نہ کر دے، اگر وہ غلطی کرتا ہے تو وہ فن کار کے شایانِ شان ہونا چاہیئے، کیونکہ اس کا کام زندگی کے مواد سے نئی زندگی تخلیق کرنا ہے۔ ایک جگہ اسٹیون کہتا ہے: "آئرلینڈ میں جب کسی آدمی کے اندر روح پیدا ہوتی ہے تو اُسے پرواز سے روکنے کیلئے جال پھینکے جاتے ہیں۔ تم لوگ مجھ سے قومیت، زبان اور مذہب کی باتیں کرتے ہو۔ میں ان سب پھندوں سے بچ کر اڑ جانے کی کوشش کروں گا۔" یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ فن کار کو اپنے ماحول میں بہت سی چیزیں پسند نہ ہوں، لیکن اس ماحول سے باہر جا کر وہ تخلیقی کام نہیں کر سکتا۔ اسی لئے اسٹیون صاف لفظوں میں اعلان کر دیتا ہے: "اس نسل، اس ملک اور اس زندگی نے مجھے پیدا کیا ہے۔ میں اپنا اظہار صرف اس طرح کروں گا جیسا میں ہوں۔" جوائس کا یہ عزم درحقیقت ایک اخلاقی عزم ہے کیونکہ یہ ذاتی خواہشات اور تعصبات سے بلند ہونے کی کوشش ہے، جو بڑے فن کار کے لئے ناگزیر ہے۔ سیاست سے بلند ہونے کی کوشش کرنا اس سے الگ ہو جانا نہیں ہے۔ اگر جوائس براہ راست سیاسی مسائل کا ذکر نہیں کرتا تو کم سے کم میں اس کی تعریف کرتے ہوئے بالکل نہیں شرماتا۔ کیونکہ جوائس سیاسی مسائل سے زیادہ گہرے مسائل یعنی فرد کے اخلاقی مسائل پیش کر رہا تھا۔ درحقیقت ان مسائل کا حل سیاسی مسائل کا حل بھی ہے۔ اگر بیسویں صدی کے سیاسی لیڈر ان فن کاروں کی طرح اپنے آپ کو ریاکار کہہ سکتے تو سیاسی الجھنوں کا وجود ہی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

آخر میں ایک ضمنی مسئلہ اور پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ایڈمنڈ ولسن کا خیال ہے کہ "یولی سیز" کے آخر میں تینوں بڑے کرداروں میں بڑی زبردست تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ بلوم اور اسٹیون میں صرف ایک لمحہ کیلئے روحانی ہم آہنگی قائم ہوتی ہے، لیکن اس ایک لمحے میں انھیں وہ روحانی سہارا مل جاتا ہے جس کی انھیں تلاش تھی۔ اسٹیون بلوم سے جدا ہو کر اب اپنے شاہکار کی تخلیق کریگا جو اب تک اس کے لئے ناممکن تھا۔ کیونکہ اب تک اسے کوئی روحانی ساتھی نہیں ملا تھا جو اس کی اصلیت کو سمجھ سکتا۔ اسٹیون کو تھوڑی دیر تک اپنا

شمعِ ہدایت

قرآن مجید مکمل صرف (۱۲) روپیہ زبان میں

جن بھائیوں نے قرآن مجید عربی زبان میں نہیں پڑھا۔ یا عربی زبان صحیح نہیں پڑھ سکتے
ان کیلئے یہ تحفہ مبارک طبع کیا گیا ہے تاکہ وہ بھائی جو حروف اُردو ہی جانتے ہوں دین و دُنیا
کی سعادت حاصل کریں۔ ہدیہ قسم خاص ۔ قسم اوّل ۔ قسم دوم ۔ قسم چہارم
یہ گرانقدر تحفہ آج ہی طلب کیجئے ۔ نوٹ : آرڈر دیتے وقت اخبار اور قسم کا حوالہ
ضرور دیں

ملنے کا پتہ: شیخ ظفر محمد اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار ۔ لاہور

عکسی تعویذی قرآن مجید

آپ اسے بغیر کسی تکلیف کے بھی تلاوت کر سکتے ہیں اور اگر اسی کو زیادہ جلی
حروف میں دیکھنا چاہیں تو یہ بیں خوبصورت ڈبیہ میں بند ہے اسمیں تلاوت کرنیوالا
آئینہ جڑا ہوا ہے اس سے آپکو اسکے حروف چار گناہ جلی دکھائی دینگے ۔ آپکو اگر ضرورت
درپیش ہو تو نہایت آسانی سے اس کلام پاک کی تلاوت بھی کرسکتے ہیں اور گلے
میں حمائل یا بازو پہ آویزاں بھی کرسکتے ہیں۔ ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ کلام ربانی سے
بڑھکر دُنیا میں کوئی چیز بابرکت اور شکل کشا نہیں ۔ اسلئے ہر بھائی کا فرض ہے کہ
سب سے پہلی فرصت میں قرآن مجید منگوا کر اپنے پاس رکھے ۔ یہ تحفہ پہلے جرمنی سے
آتا تھا جنگ کے باعث بالکل نایاب تھا۔ اسلئے ہم نے بصرف زرکثیر تیار کیا ہے
شائقین جلد از جلد فرمائشیں بھیج دیں ۔ ہدیہ قسم اوّل کا عمدہ گلیز گلٹ کی ڈبیہ
والا تین روپے چاندی کی ڈبیہ والا چھ روپے ۔ قسم دوئم کا غذ رنگ گلٹ کی
ڈبیہ والا دو روپے ۔ چاندی کی ڈبیہ والا پانچ روپے ؛

(نوٹ) فرمائش بھیجتے وقت قسم کا حوالہ ضرور دیں!

ملنے کا پتہ: شیخ ظفر محمد اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور

روپے ضائع نہ کیجئے

جب کسی کتاب کی ضرورت ہو تو شیخ ظفر محمد اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور سے خرید فرمائیے۔
جہاں کتاب آپکی پسند کے مطابق اور بازار سے با رعایت دستیاب ہوگی ۔ کاغذ اور سامان طباعت
کی گرانی کے باوجود ہم نے اپنی کتابوں کی قیمتوں میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ امید ہے کہ آپ اس سے مستفید
ہی نہ ہونگے بلکہ اپنے احباب کو بھی مجبور کرینگے کہ وہ اپنی ضرورت کی کتابیں ہمارے یہاں سے
حاصل کریں۔ ہمارے یہاں ہر قسم کی نئی و پرانی کتابیں بہت عمدہ اور با رعایت فروخت ہوتی ہیں۔

شیخ ظفر محمد اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار ۔ لاہور

"ہندوستان میں دو کتابیں الہامی ہیں ایک وید مقدس اور دوسری دیوان غالب"
(ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری)

الہاماتِ غالب یعنی شرح دیوانِ غالب

دیوان غالب کی یوں تو بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ "الہامات غالب" جیسی شرح اور اس پیرایہ کی کوئی بھی
وہ اپنی نظیر آپ ہے ۔ دیوان غالب کے مشکل اور پیچیدہ اشعار پر اس خوبی سے نقد و تبصرہ کرکے اس کی گتھیوں کو سلجھایا گیا ہے کہ بے ساختہ منہ سے داد
نکل جاتی ہے۔ صرف اتنا کہہ کر "مطلب صاف ہے" ٹالنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے ۔ بلکہ طلبا کے ذہن و وجدان اور ان کی تعلیمی قابلیتوں کو مدنظر
رکھتے ہوئے ہر ایک لفظ محاورہ تلمیحات، اشارات وغیرہ کو صاف صاف بیان کیا گیا ہے ۔ طلبا نے السنہ شرقیہ کے لئے یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ
ہے ۔ اس کی موجودگی میں کسی شرح یا لغت کی ضرورت نہیں رہتی ۔ کتاب کی خوبی اور سلاست و نفاست کے آپ خود مطالعہ کے بعد معترف
ہونگے ۔ آج ہی سب سے پہلی فرصت میں خریداری کیلئے فرمائش بھیجیے ۔
کتابت و طباعت و کاغذ عمدہ ۔

قیمت صرف تین روپیہ ۔ علاوہ محصول ڈاک ۔

ملنے کا پتہ: شیخ ظفر محمد اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار ۔ لاہور

ایجنسی ۔ آفتاب بک ڈپو موہن لال روڈ ۔ بیرون موری گیٹ ۔ لاہور

ہماری کتابیں

ہماری کتابیں

سلیم

سلیم شاہ

۱:- "ہمیا" اور دوسری نظمیں۔ سیّد مطلبی فریدآبادی۔

۲:- نام ونگ (نظمیں) . . . عبدالمجید بھٹی۔

۳:- سات کھیل۔ . . . راجندر سنگھ بیدی۔

۴:- بہتا دریا (And Quiet Flows the Don) ترجمہ سیّد مطلبی فریدآبادی۔

۵:- پُل پر (Bridge of San Luis Rey) ترجمہ۔ شیر محمد اختر اور ناچو"

۶:- سحر ہونے تک (چرکوف کا ایک روسی ناول) ترجمہ۔ "ابن انشا"

۷:- ایک آدمی۔ (An ordinary Life) ترجمہ سیّد نذیر نیازی۔

سنگم پبلشرز لمیٹڈ۔ گیتا بھون، مکلوڈ روڈ۔ لاہور۔ (فون نمبر ۲۶۲۳۸)

علمی ادبی و صنعتی کتابیں

علم و ادب :-

رنگین راتیں زاہد رضوی کے افسانہ جات کا مجموعہ۔ ادبیات میں ایک نیا اضافہ ہے۔ یہ نومبر ۱۹۴۵ء کی تازہ ترین کتاب ہے جو ابھی ابھی چھپ کر مارکیٹ میں آئی ہے اور بیحد مقبول ہے۔ قیمت صرف ڈیڑھ روپیہ۔

نوک جھونک طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا دلچسپ مجموعہ ہے جو منظور حسین صاحب زیدی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب بھی حال ہی میں شائع ہوئی ہے اور بہت مقبول ہو رہی ہے۔ قیمت صرف عہ

فارسی بول چال فارسی سیکھنے والوں کیلئے اور ان طلبا کے لئے جو میٹرک یا منشی فاضل کے امتحانات کی تیاری کر رہے ہوں فارسی میں مدد لینے کیلئے یہ بہترین امدادی کتاب ہے اسمیں فارسی گرامر کے مفید نوٹ اور جدید فارسی الفاظ و محاورات کی مختصر لغت دینے کے بعد ترجمہ کی مشقیں دی گئی ہیں آخر میں یونیورسٹی کے فارسی پرچہ جات کے سوالات مع جوابات کے دیئے گئے ہیں۔ قیمت صرف دو روپے

صنعت و حرفت

اُستادِ درزیاں مشہور ماہر فن ٹیلر ماسٹر محمد حسین دلاوری کی تصنیف ہے اسمیں مردانہ زنانہ اور بچوں کے ہر فیشن کے کپڑے قطع کرنے اور تیار کرنیکی پوری ترکیبیں ہیں۔ کٹنگ کے نقشہ جات ایچوں کی صحیح پیمائش کے مطابق دیئے گئے ہیں۔ ہر قسم کی تصاویر نہایت واضح اور صاف ہیں جو ایک معمولی سمجھ کا آدمی اور عورت بآسانی سمجھ سکتا ہے قیمت ع۸

اُستادِ روزگار صنعت و حرفت کی کتاب ہے اس میں سینکڑوں ایسی چیزوں کے تیار کرنیکی ترکیبیں ہیں جن کی تجارت سے ہزاروں روپے پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ اس زمانہ میں صنعتی کاموں سے ہزاروں لوگ لکھ پتی بن گئے ہیں۔

آپ بھی اگر صنعت کے کاموں سے دولت کمانا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور منگوائیں۔ قیمت عہ۔ ہر کتاب کا محصول بذمہ خریدار ہوگا

ملنے کا پتہ: قریشی بک ایجنسی (رجسٹرڈ) لاہور

چند ہر دلعزیز مطبوعات

عظمتِ محمدؐ (انگریزی) قدسی بی۔ اے پیغمبر کائنات کے حالات زندگی سادہ زبان میں۔ مجلد عہ

اسپیچز آف جناح (انگریزی) قائد اعظم محمد علی جناح کی تقاریر۔ مجلد ۱۲ر

تاریخ سلطنت خداداد محمود بنگلوری۔ ہندستان کے مجاہدین نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی مکمل سوانح حیات ۹۰ فوٹو بلاک۔ ضخامت ... ۱۲ر

ہندستان کی فیصلہ کن جنگیں محمود بنگلوری۔ مسلمانوں کے سیاسی عروج و زوال کی زندہ اور مکمل داستان مجلد عہ

زمانہ کے انقلابات محمود بنگلوری۔ چند تاریخی افسانوں کا مجموعہ جو لفظ نہیں تاریخ کے مختلف دوروں کے واقعات ہیں۔ مجلد عہ

تحفۃ النسا سید بشارت حسین۔ نسوانی زندگی کیلئے مشعل راہ۔ حفظ صحت غذا، مشروبات، لباس، ورزش، آرائش جمال اور سامان کھانے شربت تیار کرنے کے متعلق دلچسپ ہدایات۔ مجلد عہ

آیاتِ زندگی فارغ بخاری۔ پیمبر حریت۔ شہید اعظم حضرت امام حسینؑ کا فلسفہ شہادت۔ ۱۲ر

عورت گناہگار فارغ بخاری۔ مظلوم عورت کی خونچکاں داستان حیات اور مرد کی ہوسناکی کا شرمناک مرقع۔ مجلد عہ

فلسفہ تاریخ غلام محمد احمد۔ قوموں کی آبادی اور بربادی کے اسباب۔ مجلد عہ

دیہاتیوں کے اوقات فرصت سید شوکت حسین۔ اہل دیہات کی فراغت کیلئے بہترین مشاغل۔ مجلد۔ ۵ر

خطباتِ اقبال سید شوکت حسین۔ علامہ اقبال کے فلسفہ پر نئے پہلو سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ۴ر

جمہوریت خداداد پاکستان ... اختر ۶ر

مکمل فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

ملنے کا پتہ: ملک بکڈپو۔ کوچہ زنیاں اسٹریٹ۔ لاہور۔

دفتر ٦٢ خلاصی پالیم
بنگلور سٹی

نیا دور

ایڈیٹر
صمد شاہین

"نیا دور" نکلتے ہوئے ایک سال ہو رہا ہے۔ اس کے پہلے چار نمبروں میں دوسروں کے علاوہ ان ادیبوں کے مضامین بھی شریکِ اشاعت رہے:
حسرت موہانی۔ جوش ملیح آبادی۔ قاضی عبدالغفار۔ کرشن چندر۔ راجندر سنگھ بیدی۔ احمد علی۔
فراق گورکھپوری۔ عبدالقادر سروری۔ سجاد ظہیر۔ احتشام حسین۔ اوپندر ناتھ اشک۔
سعادت حسن منٹو۔ اختر انصاری۔ احمد ندیم قاسمی۔ آل احمد سرور۔ فیض احمد فیض۔ ن۔م۔ راشد
مدھوسودن۔ معین احسن جذبی۔ اخترالایمان۔ مخدوم محی الدین۔ ممتاز شیریں۔ سلام مچھلی شہری
عطا محمد۔ منیب الرحمٰن۔

اور اس میں غیر ملکی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے شہ پاروں کے تراجم بھی پیش ہوتے رہے ہیں۔ ان ادیبوں کی کہانیاں شامل تھیں:
ماستی وینکٹیش آئینگار (کنڑی) اجیت کمار سین گپتا (بنگالی) رادھا کرشن (ہندی) انسٹ کانیٹکر (مرہٹی) مائیکل شالوخوف (روسی)
اگنسیو سلونے (اطالوی) چینگ تیں سہ (چینی) پرل بک (امریکی) داندا ساسلیکا یوئش۔

ان نمبروں کیلئے ابتک آہی فرمائشیں آرہی ہیں کہ ان سب کا فرداً فرداً جواب دینا ناممکن نہیں اسلئے اطلاعاً عرض ہے کہ پچھلے چار نمبر ختم ہیں۔ اور
اب **نمبر ۵** شائع ہوگیا ہے۔ اسکے مضامین کی فہرست ملاحظہ فرمائیے (سب مضامین غیر مطبوعہ ہیں)۔

مضامین:۔ احتشام حسین "اقبال بحیثیت شاعر اور فلسفی" (۲) عبدالقادر سروری "ظفر علی اور انکی شاعری" (۳) علی عباس حسینی "اردو ناول نویسوں کا نیا عہد" (۴) عطا محمد "نئے نقاد" (۱) فراق گورکھپوری (۵) صمد شاہین "جنگ اور ادب"۔

افسانے:۔ مہندر ناتھ "سالی کسی کہیں کی" (۲) مدھوسودن "شمع پروانے اندھیرا" (۳) امرت رائے "غفار ماسٹر" (ہندی) (۴) قرۃ العین حیدر "ہم لوگ" (۵) سرلا دیوی "کلنک" (۶) س۔م۔ سندرچی (چینی)

نظمیں:۔ احمد ندیم قاسمی۔ وامق جونپوری۔ الطاف مشہدی۔ فکر تونسوی۔ شور علیگ۔ عزیز حامد مدنی۔ خورشید الاسلام۔ اجابر علی۔ ناصر حیدر۔
اور ایک طویل نظم "تاریک ستارہ" از اخترالایمان۔

نمبر ٦ مرتب ہوگیا ہے۔ اور اس کی کتابت ہو رہی ہے۔ اسکے مضامین بھی نیا دور کے لئے لکھے گئے ہیں۔ [illegible]
کرشن چندر۔ احمد علی۔ اختر سلطانپوری۔ اختر اورینوی۔ احمد ندیم قاسمی۔ رامانند ساگر۔ قدرت اللہ شہاب۔ آنور۔ وشوامتر عادل۔
مخمور جالندھری۔ وامق جونپوری۔ منیب الرحمٰن۔ شور علیگ۔ ابن انشا۔ علی سردار جعفری وغیرہ۔ تراجم: ڈی ایس پرچٹ کی بہترین کہانی
(SAILOR) مترجمہ شبلی بی کام۔ اور ایک فرانسیسی کہانی: مترجمہ ممتاز شیریں۔

سالانہ چندہ چھ روپے (للعہ) قیمت فی پرچہ ایک روپیہ چار آنے (عہ/) ۱۶۰ صفحات کتابی سائز
(نمونہ مفت نہیں بھیجا جا سکتا)

دفتر ٦٢ خلاصی پالیم، بنگلور سٹی

مطبوعات کتب خانہ علم وادب دہلی

مسلمانانِ ہند کی حیاتِ سیاسی؟!

ہندوستان کے مسلمانوں کی صد سالہ سیاسی زندگی کا مکمل جائزہ!
اہم وطنی تحریکوں میں مسلمانوں نے کیا شاندار قربانیاں پیش کیں ——؟
ایک شاندار مرقع!!

سیاست ماقبل اور مابعد جنگ پر نہایت بے لاگ مدلل اور بصیرت افروز تبصرہ!! نظریہ قومیت متحدہ کا بطلان خالص سیاسی اور منطقی نقطہ نظر سے، کانگرس کی متعصبانہ سرگرمیوں اور ریاکارانہ سیاسی چالاکیوں کا صحیح ترین نقشہ، خود اس کی اپنی پچاس سالہ زندگی کی تاریخ کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے بعد سے اب تک مسلم سیاست میں جو نشیب و فراز پیدا ہوئے ان پر بڑی جامعیت اور سیاسی بصیرت کے ساتھ ایک بلیغ اندازِ تحریر میں روشنی ڈالی گئی ہے اور ان سب اہم ملکی مسائل کا پوری شرح و بسط کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے جن سے اس وقت جداگانہ مسلم قومیت کی تعمیر ہو رہی ہے۔

مسلم لیگ کے درخشاں کارناموں، اور اس کے سیاسی مسلمات، اور جداگانہ مسلم سلطنت کے قیام کی اسکیم کا صحیح جائزہ اور دوسری نیم سیاسی نیم مذہبی جماعتوں (خلافت، جمعیۃ العلماء، احرار وغیرہ) کی مکمل تاریخ اور ان کا نصب العین بھی پیش کر دیا گیا ہے اور ملک کے حالات و واقعات کی روشنی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ یہ جماعتیں کس حد تک مسلمانوں میں انتشار اور لامرکزیت پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں!

غرض مسلم سیاست پر یہ ایسی جامع کتاب ہے کہ اس سے بہتر کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔ جو مصنف کتاب محمد مرزا صاحب کے سالہا سال کے سیاسی افکار و مطالعہ اور صحافتی تجربہ کا نتیجہ ہے ضخامت ۲۵۶ صفحات کتابت طباعت نہایت پاکیزہ اور دیدہ زیب۔ مجلد قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ۸)

دوسری جنگ عظیم

(مشہور سیاست نویس محمد مرزا دہلوی کے قلم سے)

یہ جنگ عظیم کیوں ہوئی؟ کن عناصر نے اقوام عالم کو متحارب بنایا جنگ اور انسانیت کی تاریخ کیا کہتی ہے۔ مجلس اقوام نے دنیا کے لئے کیا کیا ہندوستان اور مشرق قریب میں اضطراب کن اسباب کی بنا پر ہوا فلانڈرس کا سانحہ سویٹ روس اور جاپان کے سیاسی تعلقات۔

نازی پارٹی۔ محوری طاقتیں اور جنگ عظیم ثانی کے مابعد اثرات۔

غرض اس قسم کے تمام سوالوں کا جواب اس مبسوط تاریخ میں ہے۔ جدید رجحانات عالم اور یورپ کی موجودہ کشمکش کا بہترین مطالعہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپے (عہ)

دیوانِ حالی	حالی	عہ	زلفی۔ مولوی عنایت اللہ عہ
مقدمہ شعر و شاعری	"	عہ	خوابِ پریشاں " عہ

سچی کہانیاں؟

"حقیقت افسانے سے زیادہ دلکش ہوتی ہے" اور اگر یہ دونوں یکجا ہو جائیں تو؟

زندگی آرٹ کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے! پریم پجاری نے اردو افسانہ نگاری میں ایک نئے اسلوب کا اضافہ کیا ہے۔ یہ اسلوب جدید بھی ہے اور لذیذ بھی۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو رومان کی شیرینی میں سمو کر اس طرح پیش کرنا کہ پڑھنے والے کے دل میں یہ کڑوی مٹھاس میٹھا میٹھا درد پیدا کر دے صرف پریم پجاری ہی کو آتا ہے۔ اس شاعر ادیب کی پندرہ سچی کہانیوں کا حسین مجموعہ منگا کر اپنے ذوق لطیف کی تسکین کیجئے۔ مجلد اور نظر فریب گرد پوش سے آراستہ۔ دوسرا ایڈیشن قیمت عہ

جھروکے

وہ زبان جو شاہجہاں کے لشکر میں پیدا ہوئی جس میں بھانت بھانت کی بولیاں جذب ہوئیں، جب نکھر کر منظر عام پر آئی تو اس نے اس غضب کا رنگ روپ نکالا کہ بادشاہ اور بیگمات بھی اس پر فریفتہ ہو گئیں۔ یوں ریختہ "اردوئے معلیٰ" کہلائی۔ لال قلعہ میں پہونچ کر اس کی سج دھج سے سارے ہندوستان کا دل موہ لیا۔ غدر ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ کی بساط لپیٹ گئی انگریزوں کے تسلط کے ساتھ انگریزی نے رواج پایا اور دلی کی ٹکسالی اردوئے معلیٰ معدوم ہونے لگی یہاں تک کہ اب ہندوستان کے معدودے چند نفوس ہی اس کے صحیح خد و خال سے واقف ہیں۔ یونہی ہمارے ایک مولانا اشرف صبوحی دہلوی ہیں جن کا سینہ اس آفتاب کے نور سے منور ہے۔ مولانائے موصوف کی کئی کتابیں شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ لی گئی ہیں "جھروکے" ان کے ——افسانوں کا مجموعہ ہے۔ دلی کی البیلی زبان اور بیگمات کے تیکھے محاورے آپ کو صرف صبوحی صاحب ہی سنا سکتے ہیں۔ کتاب مجلد اور دلکش سرورق سے آراستہ ہے۔ قیمت عہ

بے پر کی

جھوٹ سچ تو سب ہی سناتے ہیں۔ کوئی غپ اڑاتا ہے اور کوئی زٹ چھوڑتا ہے۔ کوئی زمین آسمان کے قلابے ملاتا ہے اور کوئی آسمان پھاڑ کر اس میں تھگلی لگاتا ہے۔ مگر جو لطف بے پر کی اڑانے میں آتا ہے وہ کسی اور میں نہیں آتا بے پر کی اڑانے کے لئے ضروری ہے کہ اصل واقعہ کی کوئی پختہ بنیاد ہو۔ رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد کی چار جلدوں میں بے پر کی اڑائی ہے۔ حضرت "آوارہ" ان ہی کے نقش قدم پر چلے ہیں مگر آجکل کی روشنی میں۔ آوارہ صاحب مضحکہ خیز واقعات کو بڑی چٹپٹی زبان میں لکھتے ہیں۔ ان کا ہر فقرہ ایک مسکراتا پھول اور ہر مضمون ایک کشتِ زعفران

ہوتا ہے۔اس کے مضامین کے دوران مطالعہ میں آپ کے دل میں گدگدی ہو گی، آپ مسکرائیں گے، آپ ہنسینگے اور بے اختیار ہو کر قہقہے لگانے لگیں گے۔ان کے منتخب خندہ خیز مضامین اور افسانوں کا مجموعہ "بے پرکی" شائع ہو گیا ہے۔اگر آپ مصائب و آلام زندگی سے نجات پانا چاہتے ہیں تو "بے پرکی" منگائیے اور غم والم کو قہقہوں میں اڑا دیجئے۔
کتاب مجلد اور دلفریب سرورق سے آراستہ ہے۔قیمت ۱۲ ۱؍

بھابی جان

اُردو میں ہنسانے والی کتابوں کی بہت کمی ہے فضل حق قریشی نے اُردو کے ادب لطیف میں بھابی جان کا پُرلطف کردار پیش کر کے اس کمی کو بہت کچھ پورا کر دیا ہے۔بھابی جان اور ان کے شوہر کی نوک جھونک ایسی مزیدار ہے کہ پڑھنے والا پھڑک جاتا ہے۔مضحکہ خیز واقعات اور عورتوں کی ٹکسالی زبان سے اس کتاب میں ایک مخصوص دلکشی پیدا کر دی ہے۔اس کا ہر باب ایک افسانہ ہے اور یہ سب افسانے مل کر ایک ناول کا روپ دھار لیتے ہیں۔"بھابی جان" کا آغاز مزاح وطنز سے ہوتا ہے۔غیر محسوس طور پر اس میں آہستہ آہستہ واقعات کی کچھ ایسی تبدیلی ہوتی ہے کہ جب ہم کتاب ختم کرتے ہیں تو ہماری آنکھوں میں آنسو بہتے ہیں کیا ہنسنے اور رونے کا واقعی چولی دامن کا ساتھ ہے؟ یہ آپ کو "بھابی جان" کے مطالعہ سے معلوم ہو گا۔کتاب مجلد ہے اور سرورق سے آراستہ۔ قیمت ۱۲ ۸؍

سلمیٰ

ایک دفعہ کا ذکر ہے ——— !" (ایک لبنیدر ومان بغداد)
ہر کہانی بلاشبہ یوں ہی شروع ہوتی ہے اور ملک کے مامور ادیب جناب اشرف صبوحی نے بھی "بغداد کے جوہری" کا قصہ اپنے جدید طرز بیان کے ساتھ یوں ہی شروع کیا ہے۔مگر اردو زبان میں فطرت انسانی کی ایسی لاجواب تفسیر ایسے دلکش انداز میں شاید ہی کبھی پیش کی گئی ہو۔یہ ناول ایک نفیس و دلچسپ نفسیاتی نکتہ کا حل پیش کرتا ہے۔عورت کی شوہر پرستی اور دلداری اسے ہر نوع کی قربانی پیش کرنے کے لئے کیوں مجبور کر دیتی ہے۔ہوس پرست احسن بین، عاشق زار شوہر سے محبت کرنے والی بیوی کو کس جنونی جذبہ کے ماتحت آزمائشوں میں ڈالتا ہے اور عورت اس کا جواب کس ہمت بیدار کے ساتھ دیتی ہے اس کا جواب اس ناول میں آپ سطر بہ سطر پائیں گے۔
بہت سے شوہر بغداد کے احمد جوہری کے آئینہ زندگی میں اپنا مجرم چہرہ پائیں گے۔اکثر نیک نفس بیویاں سلمیٰ جیسی عفت مآب اور دلدادۂ شوہر بیوی بننا پسند کریں گی۔
خلیفہ حمزہ کے حرم کے راز سربستہ۔بغداد کی رنگ ریز زندگی خالص الف لیلائی ماحول۔عیش و تنعم کی دہکتی ہوئی آگ۔روح کی بیباک سنائیں۔عورت کا پیچ پیچا ہوا دل مرد کی ہوس کارانہ جنوں سامانیاں بے تکلف الوان اور دقیق تحاریر

وراحت، مسرت وکلفت پہلو بہ پہلو۔
احمد جوہری اور سلمیٰ کی پُرسوز حیرت انگیز داستان محبت و زندگی آپ کو ایک طلسم بیخودی میں لیجا کر چھوڑ دے گی۔بہت بلند پایہ تصنیف ہے اور بلاشبہ افسانہ طرازی کا ایک اعجاز ہے۔نفیس عبارت۔بلیغ طرز بیان۔چست و رواں، عبارت پڑھنے والے کے حواس پر چھا جاتی ہے۔سرورق بہا بت خوشنما مجلد قیمت دو روپے (عـ؍)

بن باسی دیوی

(از اشرف صبوحی) انسان جب اپنے دور وحشت میں سے گذر رہا تھا اور تہذیب نے اسے کوئی جامہ نہیں پہنایا تھا اس وقت وہ کس طرح رہتا تھا کس طرح پیدا ہوتا، محبت کرتا اور مرجاتا تھا۔ایک حسین عورت کس طرح ایک بڑے قبیلے کی سردار بن کر تاجداری کرتی ہے۔یہ سب عناصر ہیں اس دلچسپ داستان کے جو "بغداد کے جوہری" کے مصنف سید اشرف صبوحی دہلوی نے خاص اپنے انداز تحریر میں تحریر کئے ہیں اس ناول میں انسانی درندگی و جوئی کا اعزاز بڑھانے کے لئے پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب آئی۔ای۔ایس کا بیش قدر مقدمہ شامل کتاب ہے۔دوسرا اڈیشن مع مصور و رنگین تصویر گردپوش۔قیمت تین روپے (عـ؍)

"ٹوٹے ہوئے پر"

سرزمین شام کے آتش نگار شاعر اور سحر کار ادیب جبران خلیل جبران کے ایک المیہ ناول کا ترجمہ، جس میں حسن و عشق کی فسوں کاریوں کو اتنے دلچسپ اور پُراثر انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ آپ اُسے پڑھتے وقت خود کو اس عالم سے دور ——— بہت دور ایک اور عالم میں پائیں گے، جہاں ہر طرف روح کی حکومت ہے اور جس کا ہر ذرہ حساس دل کی طرح دھڑکتا ہے۔
مصنف کا طرز ادا اور اسلوب تحریر اس قدر اچھوتا ہے کہ عربی کے ہر بڑے ادیب نے اس کا اعتراف کیا ہے اور مترجم نے اتنی محنت سے ترجمہ کیا ہے کہ اصل کی تمام خوبیاں اردو میں منتقل کر دی ہیں، یہاں تک کہ جبران کا اسلوب تحریر بھی قائم رکھا گیا ہے۔ہندوستان کے ہر ادیب و ناقد نے تسلیم کیا ہے کہ یہ ترجمہ اردو کے دامن کا ایک سدا بہار پھول ہے۔مترجم حبیب اشعر دہلوی۔مجلد مع گردپوش۔قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (۱؍۸)

نکہت

یہ قیسی رامپوری کا وہ زندہ ناول ہے جس کی آواز آنے والی نسلیں ہمیشہ سنتی رہیں گی بیشک ہمارے اعمال ہمیشہ طہارت و پاکیزگی میں ملبوس نہیں رہ سکتے لیکن وہ بلند اصولوں کے تحت بلند ہو سکتے ہیں۔عکاس فطرت حضرت قیسی رامپوری کا یہ ناول جیتے جاگتے کرداروں کا ایک حسین خاکہ ہے جس میں بدکرداری کا عکس نام کو نہیں ہے۔یہ کتاب بڑے اطمینان سے شریف بہو بیٹیوں کو تحفے میں دی جا سکتی ہے پھر دلچسپ اتنی ہے کہ ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد جب تک ختم نہ ہو جائے۔ہاتھ سے رکھنے کو جی

نہیں چاہتا۔ کتاب مجلد اور خوش نما سرورق سے آراستہ دوسرا اڈیشن قریب الختم ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے (۲؍۸)

جہاں آرا؟

مغلوں کے رنگ محل کی ——— ایک خونبابہ فشاں داستان

ہندوستان میں ایک بادشاہ گذرا ہے شاہجہاں،
وہ اپنی اولاد کے ہاتھوں کتنا نالاں و مجبور رہا!
اس کی ایک لڑکی تھی "جہاں آرا"۔ وہ دنیا میں کیسی دکھی رہی۔!
وہ مغلوں کے حرم جن کی اتنی شہرت ہے اندر کیا تھے اور باہر سے کیا معلوم ہوتے تھے۔
وہ لڑکی روشن آرا اپنی بڑی بہن سے کیوں جلتی تھی۔
مغلوں کے دربار اور حرم کے بیچ میں کون کونسی ہستیاں کیا کیا کام سرانجام دیتی تھیں،
مغلوں کے رسوم و قومی خصائل، بہنوں اور بھائیوں کی آویزشیں
شاہجہاں کی بے بسی۔ "جہاں آرا" کی زندگی کا پاکیزہ المیہ حیات
ہزاروں خواجہ سراؤں، کنیزوں۔ غلاموں۔ خادموں، سپاہیوں۔ نوابوں کی ایک بھیڑ ہے اس قلمی فلم میں آپ کو دکھائی دے گی۔
ہندوستان کے تخت کے لئے بھائی بھائی سے دست و گریباں۔
ایک مجبور حیات بے بس بوڑھا جو بادشاہ وقت تھا۔
ایک شکار زندگی کی آہنی زنجیروں کا۔
"جہاں آرا" کا ہر سانحہ مغلوں کی حرم کی سیر بین ہے۔
نیم تاریخی رومان۔ فلم کے سے واقعات۔ ہر سانحہ نشتر، ہر فقرہ دلگیر!
از ظفر قریشی بی اے دہلوی۔ نہایت خوبصورت گرد پوش مجلد دوسرا اڈیشن۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے (۲؍۸)

سمن پوش

ملک کے نامور فسانہ نگار مجنوں گورکھپوری نے بعض الم ناک افسردہ، پرتاثیر افسانے کچھ اس ڈھنگ سے لکھے ہیں کہ ہم انہیں اردو کا ہارڈی کہہ سکتے ہیں۔ "سمن پوش" اور اس کے ساتھ دوسرے حیرت فزا افسانے ایک دوسری دنیا کی خبر دیتے ہیں جنہیں ظاہری حواس نہیں پہچانتے۔ روحانیت کی دنیا۔ زندگی کی اُسی صبح و شام کا ماورائی پرتو۔ عشق مجبور جب ستاروں سے آگے والی دنیا میں پہنچکر اس جہان کے افسانوں پر اثر انداز ہوتا ہے تو کیا ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ "سمن پوش" ایک عجیب غمناک پُراسرار کہانی ہے اور اس کے ساتھ کچھ اور افسانے بھی اسی دوسری دنیا کے ہیں جسے نہ آنکھ دیکھ سکتی ہے نہ ہاتھ چھو سکتے ہیں مگر درد سے وجدان حاصل ہو سکتا ہے۔ سرورق نہایت خوش نما دوسرا اڈیشن قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے (۱؍۸)

دیوان حالی	حالی ؏	زلفی	مولوی عنایت اللہ ؏
مقدمہ شعر و شاعری	؏	خواب پریشاں	؍؍ ؏

"گردش"

حضرت مجنوں گورکھپوری عرصۂ ادب کے مشہور شہسوار ہیں۔ اُن کا مخصوص موضوع فکر، مخصوص انداز نگارش اور مخصوص اسلوب بیان انگریزی کے عدیم المثال الم نگار ٹامس ہارڈی سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ ہم بلا شبہ انہیں اردو کا ہارڈی کہہ سکتے ہیں۔ "گردش" مجنوں صاحب کا طویل افسانہ (ناولٹ) ہے، جس کی بنیاد ہارڈی کے ایک ناول پر رکھی گئی ہے اس ناولٹ میں دکھایا گیا ہے کہ انسان کی شخصی و اجتماعی زندگی کی خوبیاں اور بُرائیاں، کامیابیاں اور ناکامیاں، لذتیں اور کلفتیں، انفرادی کردار کے گرد گھومتی ہیں انفرادی کردار اگرچہ خارجی اسباب سے بنتا ہے، لیکن اگر وہ مضبوط اور قوی ہے تو اس کی تاثیر خود اسے اور اس کے سارے ماحول کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ زبان صاف انداز بیان سنجیدہ اور اسلوب نگارش دلبذیر ہے۔ کتاب اچھے کاغذ اور اچھی کتابت و طباعت کے ساتھ خوش نما چھاپی گئی ہے مجلد مع رنگین گرد پوش۔ دوسرا اڈیشن قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنہ (۱؍۴)

"پنکھڑیاں"

شیریں کے بارہ افسانوں کا مجموعہ، جن میں شریفانہ محبت کی رعنائیاں بھی ہیں اور سرمایہ دارانہ کمزوریوں پر طنز بھی، نفسیاتی اشارے بھی ہیں اور زندگی کے بعض ٹھوس حقائق کی ترجمانی بھی۔ زبان نہایت صاف اور شیریں۔ انداز بیان سلجھا ہوا۔ کتاب مجلد اور خوش نما گرد پوش سے آراستہ۔ قیمت دو روپیہ چار آنے (۲؍۴)

دوشیزۂ صحرا

صحرائے عرب کی خوں آشام زہرہ کا فسانہ محبت۔ اس پرفسوں و سحر خیز داستان میں مصنف نے سرزمین حسن کا ایک انوکھا قصہ عشق سنایا ہے، جس میں محبت و نفرت، خشم و انتقام، ظلم و ستم اور جنگ و جدل کبھی آپ کے رونگٹے کھڑے کر دیں گے اور کبھی حسن کی سرگوشیاں، عشق کی کارفرمائیاں اور رقابت کی صعوبتیں آپ کو انگشت بدنداں کر دیں گی۔

بنت شیخ کی تعیش گاہ، اجڑی ہوئی خانقاہ کی الوہیت، ہیلن کی جرأت و مردانگی، رائف کا پیمان وفا، الاسد کا جنون رفاقت، نابینا یوسف کا لرزہ براندام کر دینے والا انتقام اور حسین و جمیل زہرہ کا ——— جس کی دہشتناک خونریزی اور بے پناہ قتل و غارت سے ریگستان عرب کا ذرہ ذرہ کانپ اٹھتا ہے ——— ہیلن کے محبوب کی الفت میں گرفتار ہونا، مگر حصول مقصد میں ناکام و مایوس ہو کر کوہ صحرا کو پاؤں تلے روندتے ہوئے فرار شدہ محبت و محبوب کو تہ تیغ کر دینے کی کوشش کرنا ———
یہ سب چیزیں آپ کو ایک نئی دنیا میں لے جائیں گی۔

اس ناول کو پڑھکر آپ عرب اور عرب کے جنگجو لوگوں کے جملہ حالات خصلا ان کے رسم و رواج، ان کی مہمان نوازی، عادات و خصائل بہادری

حرکت فنون حرب سے آگاہی، رہنے سہنے کے طریقے، مذہب و معاشرت وغیرہ وغیرہ سے بخوبی واقف ہو جائیں گے از صادق الخیری ایم اے دہلوی
کتابت طباعت بہترین۔ سرورق نہایت خوشنما قیمت مجلد عـ۲ـہ

لالہ رُخ

مصور اڈیشن:۔ انگلستان کے مشہور شاعر طامس مور کی مثنوی جو خالص مشرقی تصورات اور نازک تخیلات عشق پر مبنی ہے تیس ہزار گنی دے کر لانگ مین کمپنی نے اسے شائع کیا تھا اور تمام انگریزی داں طبقہ اس کو دیکھکر چونک پڑا تھا۔ افسانے کا پلاٹ رومان اور طلسم کی ایسی دنیا میں آپ کو پہنچا دیگا کہ آپ خود اس قصہ کا ایک کردار بننا پسند کریں گے۔ مقنع (نقاب پوش پیغمبر) "آتش پرستاں دارس"، "پری اور بہشت" اور "نور محل" چار قصے ہیں۔ کتب خانہ علم و ادب نے اس کو مصور چھاپنے کے لئے تقریباً تیس درجن آرٹ کی بہترین تصاویر کا اہتمام کیا ہے جو اس کے ایک ماہر ولایتی اڈیشن سے خاص طور پر زر کثیر خرچ کر کے حاصل کی گئی ہیں۔ اُردو میں ایسی بے مثل کتاب نہیں چھپی۔ بہترین کاغذ لے بہا ادب و رومان دل نشیں تصاویر اور دیدہ زیب آرائش کے ساتھ اس نادر ادبی کارنامہ کو شائع کیا گیا ہے
قیمت مجلد معہ خوبصورت گرد پوش قیمت ـے

اُردو کے افسانوی ادب میں ایسی کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی

یک قصہ بیش نیست غم عشق وایں عجب
از ہر کسے کہ می شنوی نامکرر است

سات تارے

یگانگت کا یہ عالم کہ اصل سب کی ایک　　تفاوت یہ کہ جدا شان ہر فسانے کی

ایک ہی پلاٹ پر سات مشہور افسانہ نگار صاحبان

ایم اسلم قیسی رامپوری۔ شاہد احمد۔ انصار ناصری۔ فضل حق قریشی۔ اشرف صبوحی۔ ابوطاہر طالب ردولی کے شاہکار افسانے۔ ہر افسانہ کچھ ایسے پیرایہ میں لکھا گیا ہے کہ اچھوتا معلوم ہوتا ہے ہر افسانہ نگار نے اپنی انشا پردازی کا سارا زور صرف کر دیا ہے اس ہفت رنگ مجموعہ میں ادب لطیف کا کمال دیکھئے۔ پلاٹ ایک ہی ہے لیکن ہر افسانہ نگار کی جنبش قلم نے کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ کہانی بالکل نئی چیز معلوم ہوتی ہے حسن کاری کا ایسا نادر مجموعہ آپ کو غیر زبانوں میں بھی نہیں مل سکتا۔

پلاٹ یہ ہے۔

ایک شخص غیر متعارف خاتون سے خط و کتابت۔ رومانی فضا اور وابستگی ——— ایک حسینہ سے تعارف ——— محبت ——— ازدواج ———
مسرت وانبساط ——— شکر رنجیاں کشیدگی ——— بیزاری ———
ایام گذشتہ کی یاد ——— سابقہ مراسلت کی تجدید ——— تحصیل سکون۔
غائبانہ طور پر انکشاف حقیقت مراسلہ نگار خاتون کی اصل شخصیت ———
شریک حیات!!　　دوسرا اڈیشن

لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ۔ خوبصورت کور کے ساتھ۔ مجلد قیمت ـے ر

بہادر شاہ اور پھول والوں کی سیر　　از مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی قیمت ۶ ر

رقّاصہ

انسان کی شقی القلبی و سفاکی کی حیرت ناک داستانیں پڑھکر آپ ششدر رہ جائیں گے۔ انسان پر جب حیوانیت چھا جاتی ہے تو درندوں سے زیادہ بے رحم اور شیطان سے زیادہ سیاہ کار ہو جاتا ہے۔ ملک کے مشہور ادیب ایم اسلم نے خوفناک جرائم کو افسانوں کے پیرایہ میں لکھ کر اُردو افسانہ نگاری میں ہیبتناک افسانوں کا اضافہ کیا ہے۔

رقاصہ اور دوسرے خوفناک افسانے:۔ جب آپ پڑھیں گے تو سانس بھی روک کر لیں گے۔ بعض مقامات ایسے بھیانک ہیں کہ آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ مثلاً رقاصہ جب اپنے گھر پہونچی تو اس کا دامنہ ہمیشہ کے لئے نیلا ہو چکا تھا۔ کیوں؟ یہ آپکو پڑھنے کے بعد معلوم ہوگا۔ یا "شادی کی رات" میں جنگ بہادر نے سُور ماکو اپنے عاشق اور ہونے والے شوہر کا خون پھاڑ کر پلایا اور جب اس نے منہ بند کر لیا تو اس کے ہونٹ کاٹ کر خون پلایا۔ زندہ آدمی کا گوشت کاٹ کاٹ کر کتّے کو کھلایا۔ انتقام کی آگ سرد کرنے کے لئے چونے کے بھٹے میں زندہ آدمی کو ڈالکر اوپر سے پانی ڈال دیا گیا۔ نار جہنم سے بھی زیادہ شدید تھی یہ آگ! اور خوفناک اذیتوں کی ایک طویل فہرست ہے جو یہاں پیش نہیں کی جا سکتی۔ جب آپ ان سات دہشتناک افسانوں کو پڑھیں گے تو انسانی سرشت کی خباثت دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جائینگے۔

مجلد قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عـ۱ـہ) تیسرا اڈیشن

کھُرپا بہادر

مرزا عظیم بیگ چغتائی نے اس ناول میں ایک عجیب وغریب قصہ پیش کیا ہے۔ ایک بدمعاش بھنگے کی سرگزشت سے اس ناول کی ابتدا ہوتی ہے روزانہ اس کے سر پر پولیس والوں کے جوتے پڑتے ہیں اور کئی دفعہ سزا بھی پا چکا ہے۔ اس بدمعاش کی شادی ایک نواب صاحب نے ضد میں آکر اپنی چہیتی اور بیحد لاڈلی بیٹی سے زبردستی کر دی اور اُسے کھُرپا بہادر کا خطاب دیا۔ اس بدمعاش پر شاہی محلات میں جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ الف لیلیٰ کے سوتے جاگتے (ابوالحسن کے قصے سے بھی زیادہ دلچسپ اور مضحکہ خیز ہے۔ اسی ناول میں ریاست ننکران کے ساتھ ساتھ ریاست کفترہ کے غمناک واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ایک بیگم پر طرح طرح کے ظلم توڑے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اسے کوا ہنکنی بنا دیا جاتا ہے، محلات کی ہنگامہ آرائی فضا میں آپ عجیب عجیب ریگستان دیکھیں گے کہیں ہنسی اور کہیں قہقہے کہیں آنسو اور کہیں خون کی بوندیں "کھرپا بہادر" کو پڑھ کر آپ شہرت سے مور بار حرام پور" کو بھول جائیں گے تقریباً دو سو نہایت دلفریب صفحات کی کتاب ہے اور قیمت عـہ۔ چوتھا اڈیشن

مراۃ العروس	مولوی نذیر احمد	عـ۲ـہ	چند پند	مولوی نذیر احمد	ـ۱ـر
بنات النعش	"	عـ۲ـہ	منتخب الحکایات	"	ـ۱ـر
توبۃ النصوح	"	عـ۲ـہ	معاشقہ نپولین	[illegible]	[illegible]

افسانۂ پدمنی

(از قلم مولوی احتشام الدین دہلوی، ایم اے علیگ)

چتوڑ کی رانی پدمنی سے سلطان علاؤ الدین خلجی کے عشق و اشتیاق کی داستان اور اس کی مؤرخانہ تحقیق و تنقید۔

بناوٹی قصہ پدمنی پر بے لاگ و مدلل جرح۔ اصل قصہ نہایت دلکش انداز میں بے اصل "تاریخی" شواہد کا بطلان۔ وہ کونسا علاؤ الدین تھا جس سے یہ قصہ فی الحقیقت منسوب ہونا چاہیئے۔ غلط تاریخ کس طرح بنتی چلی گئی اس کی دنبالہ داری اور خورد بینی تحقیق کے لئے اس مفکر ادیب و عالم کے نام کی ضمانت میں کافی ہے۔ قیمت عہ ر

شمع انجمن

اس صادق القلم مصنف کا دور رس ذہن اور بے پناہ جائزۂ زندگی ایک ایسا کارنامہ ہے کہ اسے بقول دلفگار "اردو کا جرّاح ادیب" کہا جا سکتا ہے سماج کے جسم بیمار کے لئے اس کا قلم واقعی نشتر بیداد سے کم نہیں۔ حقیقت نگاری کے (۱۶) دل آویز رومانی نمونے۔ تخیل رفیع و بلند زبان، شستہ و شاعرانہ اور نفسیاتی تحلیل و قصہ گوئی کے الف لیلوی طرز سے تو وہ بعض اوقات "اُردو کا ”او ہینری“، معلوم ہونے لگتا ہے! صادق الخیری ایم اے دہلوی۔ مجلد معہ خوبصورت گردپوش قیمت ۱۲؎

بزم آخر

مصنفہ منشی فیض الدین صاحب مرحوم

غدر سے پہلے جب قلعہ لال حویلی کہلاتا تھا — جب اس لال حویلی کا سہاگ اجڑ چکا تھا۔ جب لال حویلی کی چار دیواری میں آخری مغلیہ شمع جھلملا رہی تھی۔ جب مغلیہ خاندان کے آخری تاجدار کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ اُس وقت بھی لال قلعہ میں وردیاں دمامے نوبت اور نقارے بجتے تھے۔ بادشاہ بیگمیں، شاہزادے شہزادیاں عیش و راحت کے گہواروں میں جھولا جھولتی تھیں۔ ان کا کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا، کھیل کود، تیج تہوار، رسم و رواج، بولیاں ٹھولیاں کچھ ایسی عجیب و غریب اور من موہنی تھیں کہ آج تک ان کی یاد دلوں کو گدگدا رہی ہے۔

بزم آخر اسی لال حویلی کی تہذیب و معاشرت، رسم و رواج اور زبان کا وہ زندہ جاوید مرقع ہے جس کی صداقت اور اہمیت سے کسی کو انکار کی جرأت نہیں۔ اس لئے کہ ان باتوں کو ایسے منشی نے رقم کیا ہے جن کی پرورش قلعہ میں ہوئی اور وہیں چھوٹے سے بڑے ہوئے جو کچھ انہوں نے لکھا اس کی تصدیق مرزا محمد سلیمان شاہ صاحب سرپرست خاندان تیموریہ نے خود اپنی قلم سے کی ہے۔ کاغذ عمدہ سفید مجلد قیمت ڈیڑھ روپیہ (عہ ر)

خطوط کی ستم ظریفی

مرزا عظیم بیگ چغتائی نے یہ بہترین اپنے مخصوص رنگ میں لکھا ہے پلاٹ اس قدر عجیب و غریب ہے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے اور ساتھ ہی حیرت و استعجاب کی لہریں دل و دماغ میں دوڑ جائیں گی یہ صرف کتابیں نہیں ہنسنے ہنسانے کا مستقل ذریعہ ہے بہترین کتابت و طباعت کے ساتھ خوبصورت ترین سائز پر شائع کی گئی ہے۔

تیسرا اڈیشن قیمت ۱۰ر۔

سلاسل

(جاں نثار اختر، ایم۔ اے علیگ) اگر آپ قدیم و فرسودہ رنگ غزل سے متنفر ہو چکے ہیں۔

اگر آپ جدید رجحانات ادب و شعر سے ربط رکھنا چاہتے ہیں۔

آنے والے انقلاب کی آواز نغمے سے اگر آپ کی روح چونکنا چاہتی ہو تو رومان و نغمہ اور شباب انقلاب کے اس شعری پیکر کو دیکھئے۔ سماج کے احساس قدامت کے لئے ایک ضرب ہے اور روح کو فردوسی نغموں سے سرشار کر دینے والی پُرجوش شاعری ہے کتابت بہترین طباعتی خوبیوں سے آراستہ ہو کر شائع ہو چکی ہے۔ حضرت اختر نے ہندوستان کی روح کی ترجمانی کی ہے اور کس قدر دلنشیں انداز میں کہ اردو اس پر ہمیشہ فخر کرے گی۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ ر) مجلد مع گردپوش

ایک کہانی

چھ ادیبوں کی زبانی

اردو میں اس طرز کی آج تک کوئی کہانی نہیں لکھی گئی کہ چھ مشہور انشا پردازوں نے مل کر اسے لکھا ہے۔ یہ دلچسپ کہانی اور بھی زیادہ دلچسپ اس وجہ سے ہو گئی ہے کہ ہر انشا پرداز نے اپنا پورا زور بیان صرف کر دیا ہے۔ علامہ نیاز فتحپوری نے قصہ کا آغاز کیا ہے اور پروفیسر علی عباس حسینی، سجاد حیدر یلدرم، لطیف الدین احمد، امتیاز علی تاج اور حکیم احمد شجاع نے کہانی کی مختلف کڑیاں پیش کی ہیں۔ کہانی کا موضوع ہے "نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکر"، دو عجیب و غریب نتائج غایت درجہ دلکش ہیں اور جی چاہتا ہے کہ اس کہانی کو بار بار پڑھا جائے۔

دوسرا اڈیشن کاغذ عمدہ سرورق رنگین۔ قیمت ۱۲ر

دکن کی پری	فراق دہلوی	۶ر	تھوڑی تارا ماسنے چاند	اشرف صبوحی	۴ر
مضامین فراق	"	عہ ر	شہزادہ بے نواز	"	۴ر
دلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ	"	۴ر	فاؤسٹ	شاہد احمد	۱۲ر
سات طلاقنوں کی کہانیاں	"	۴ر	گمنام عورت کا خط	ظفر قریشی	۴ر
بیگموں کی چھیڑ چھاڑ	"	۴ر	عشق کی گولیاں	مرزا فرحت اللہ بیگ	۴ر
صبر بادشاہ زادہ	اشرف صبوحی	۴ر	تماشہ پر تماشہ	ناکارہ	۴ر

مشہور مصنفین کے دلکش ناول

ناول	مصنف	قیمت
بیتی باتیں	ایم اسلم	سے/
رقص بہار	؍؍	للعہ/
شمسہ	؍؍	صہ/
شام وسحر	؍؍	صہ/
طلسم سامری	؍؍	۱۲/
کوشلیا	؍؍	عہ/
آتش دم	؍؍	عہ/
نرگس	؍؍	عا/
شب غم	؍؍	عہ/
ہیر رانجھا	؍؍	عا/
حسن سوگوار	؍؍	سے/
شام غریباں	؍؍	للعہ/
شرم گناہ	؍؍	عہ/
تسنیم	قیسی رامپوری	للعہ/
چوراہا	؍؍	عہ/
نگہت	؍؍	عہ/
اپاہج	؍؍	عا/
بربط	؍؍	عا/
رونق	؍؍	سے/
شیریں	؍؍	عہ/
آخری فیصلہ	؍؍	عہ/
دلکی آواز	؍؍	عہ/
پھندا	؍؍	عہ/
تشنگی	رشید اختر	للعہ/
سودائی	؍؍	عا/
سوز دل	؍؍	عا/
ساز شکستہ	؍؍	عہ/
بن باسی دیوی	اشرف صبوحی	سے/
سلمے	؍؍	عا/
غبن	منشی پریم چند	للعہ/
پردہ مجاز	؍؍	صہ/
کربلا	؍؍	عا/
بیوہ	؍؍	عا/
پھلواری	ٹیگور	سے/
شمع الفت	؍؍	سے/
منزل عشق	؍؍	عہ/

ناول	مصنف	قیمت
طوفان زندگی	ٹیگور	عا/
دلہن	؍؍	عا/
سوال	سرت چندر چڑجی	للعہ/
آوارہ	؍؍	للعہ/
پنڈت جی	؍؍	عا/
بڑی دیدی	؍؍	عہ/
دیوی داس	؍؍	عہ/
دیہاتی سماج	؍؍	عا/
خانہ برباد	؍؍	سے/
عجیب	قاضی عبدالغفار	عہ/
اس نے کہا	؍؍	عہ/
سیب کا درخت	؍؍	عہ/
لیلےٰ کے خطوط	؍؍	عا/
شمع	اے۔ آر۔ خاتون	صہ/
تصویر	؍؍	للعہ/
ثروت آرا حصہ اول	حمیدہ سلطانہ	سے/
بکواس	شوکت تھانوی	عا/
بیوی	؍؍	عا/
سوتیا چاہ	؍؍	عہ/
خانم خاں	؍؍	عہ/
دل پھینک	؍؍	عا/
بڑبھس	؍؍	عا/
معمہ خاتون	؍؍	عہ/
شیطان کی ڈائری	؍؍	عہ/
گرگٹ	؍؍	عہ/
زارینہ	محمد رحیم	عا/
تازیانہ	؍؍	عہ/
چاند سورج کی چوری	؍؍	عا/
گریز	عزیز احمد	للعہ/
ہوس	؍؍	عا/
مرمر اور خون	؍؍	عہ/
ٹوٹے ہوئے پر	جبران خلیل جبران	عہ/
نجمہ	سجاد حیدر	۱۲/
جانباز	؍؍	عہ/
ہما خانم	سجاد حیدر یلدرم	عا/
ستاروں کے کھیل	اوپندر ناتھ اشک	عا/

ناول	مصنف	قیمت
شمع فروزاں	صادق الخیری	عہ/
دوشیزۂ صحرا	؍؍	عا/
نوشابہ	محمود احمد ایم اے	عہ/
کھائی جان	فضل حق قریشی	عا/
فرعون	؍؍	عہ/
سگ لیلیٰ	؍؍	عہ/
بھرے سے ہیرا	ڈاکٹر سعید احمد	عا/
شاہد رعنا	سرفراز حسین	سے/
پھانسی	شاہد احمد	عا/
فاؤسٹ	؍؍	عا/
سرگذشت عروس	؍؍	عا/
باغی	رئیس احمد جعفری	للعہ/
طوفان	؍؍	سے/
دنیا کے تین بہترین ناول	الحسانی ایم اے	سے/
پامال	الیگزینڈر	صہ/
سرنوشت	مجنوں گورکھپوری	عا/
صید زبوں	؍؍	عا/
گردش	؍؍	عہ/
سلامبو	مولوی عنایت اللہ	للعہ/
نجم السحر	؍؍	سے/
تائیس	؍؍	عا/
شاعر کا انجام	نیاز فتحپوری	۱۲/
وحشی	انصار ناصری	عہ/
چندرا موہنی	؍؍	عہ/
جہاں آرا	ظفر قریشی بی اے	عا/
لالہ رخ	طامس مور	سے/
تاجدار رقاصہ	فصیح الدین احمد	عا/
ناہید	آغا شاعر	عہ/
ایک حمام میں	خواجہ محمد شفیع	عا/
ماہ ملک	شرر لکھنوی	سے/
مقدس نازنین	؍؍	عہ/
قیس ولبنیٰ	؍؍	عا/
حسن کا ڈاکو	؍؍	عا/
تنکی کا بیاہ	؍؍	عہ/
زینب دلہن	؍؍	عہ/
ملک العزیز ورجنا	؍؍	عہ/
حسن انجلینا	؍؍	عہ/
منصور موہنا	؍؍	عہ/
الفانسو	؍؍	عہ/

ناول	مصنف	قیمت
بابک خرمی	شرر لکھنوی	عا/
آغا صادق کی شادی	؍؍	عہ/
عزیزہ مصر	؍؍	عہ/
مفتوح وفاتح	؍؍	عا/
طاہرہ	؍؍	عا/
لعبت چین	؍؍	عہ/
چراغ تلے اندھیرا	تیرتھ رام	سے/
نظارہ لندن	؍؍	عا/
ویرانہ ہستی	؍؍	عہ/
ہولناک اسرار	؍؍	عہ/
جویائے حق	زیر طبع	معہ/
شمیم	فیاض علی زیر طبع	معہ/
انور	؍؍	معہ/
آندھی	تیرتھ رام فیروزپوری	عا/
عشق اور موت	؍؍	عہ/
لعل مقدس	؍؍	سے/
نازک کٹار	؍؍	عا/
تلاش اکسیر	؍؍	سے/
خونی چکر	؍؍	سے/
خنجر بیداد	؍؍	سے/
انمول ہیرا	؍؍	عا/
انصاف	؍؍	عا/
دورنگی دنیا	؍؍	عا/
مکافات عمل	؍؍	عا/
کارنامہ جات آرسی لوپن	؍؍	سے/
سنہری لاش	؍؍	صہ/
للتا	؍؍	سے/
قسمت کا شکار	؍؍	سے/
ڈاکٹر نکولا	؍؍	سے/
چڑیا کی تکی	؍؍	سے/
مہر خاموشی	؍؍	سے/
شاہی خزانہ	؍؍	سے/
انقلاب زندگی	؍؍	سے/
ستم ہوشربا	؍؍	[illegible]
دغا کا پتلا	؍؍	سے/
آتشی کتا	؍؍	عا/
گردش آفاق	؍؍	[illegible]
جوہر ظلمات	؍؍	[illegible]
[illegible]		

نقلی نواب — تیرتھ رام — سے ر
اسیر تقدیر — " — عہ ر
پہلا ہیرا — " — سے ر
خودکشی — ٹالسٹائی — سے ر
آخری راستہ — " — عا ر
اسکا گناہ — ٹیگور — عا ر
بیٹے — پرل بک — سے ر
ضیغم — " — عہ ر
اس کی کہانی — پرویز — عا ر
قدرت کے کھیل — سدرشن — عہ ر
محبوبہ — مسولینی — عا ر
کملا — راجہ مہدی علی خاں — عا ر
ان کسی کا — ٹیگور — ۱۲ ر
لیو ٹوت فرانس — اے ایچ آغا — عہ ر
کاروان حیات — سیتا دیوی چڑجی — عا ر
افسانہ زریں — اسرار — عہ ر
ساقی — آتش — عہ ر
نغمہ — آغا اشرف — عہ ر
ٹھوکر — سرت چندر — عہ ر
شمع زندگی — " — عہ ر
راہی — انتصار — عہ ر
رقص و شباب — عا ر

بدلتی دنیا — محمد حسین خاں — عہ ر
الجھن — ٹیگور — عا ر
اس پار — تیرتھ رام — عہ ر
موت کا تحفہ — مرزا ادیب — عہ ر
بیکسی — " — عہ ر
زلزلہ — سرت چندر — عا ر
عورت — " — عا ر
سمرقند کی دوشیزہ — آتش — عا ر
ماہ درخشاں — بیگم احمد علی — سے ر
رزم و بزم دو حصے — للعہ ر
مرد میدان دو حصے — للعہ ر
اسرار حرم — منشی احمد الدین — عہ ر
رسوائیاں — احسان علی شاہ — عا ر
اپنا گھر — مائل ملیح آبادی — عہ ر
آنسو — سیتا دیوی چڑجی — عہ ر
جوانی کے دن — تسکین — عہ ر
راج سنگھ — سدرشن — عا ر
خونی بھید — مرزا رسوا — ۱۲ ر
خونی جورو — " — ۴ ر
فرحت جہاں — ایم اسلم — عہ ر
دل کی آگ — عہ ر
روپ بتی — عہ ر

مشہور نامور مصنفین کے افسانے

نہاں نظارے — ایم اسلم — للعہ ر
جام شکستہ — " — سے ر
... — " — عا ر
... سنگ — " — عا ر
... — " — عا ر
انداز ... — ۱۲ ر
... — " — عہ ر
گنہگار — " — عہ ر
قاتل — " — عا ر
خانقاہ — " — عا ر
تصورات — " — عا ر
خدا کا جواب — " — ۱۲ ر
خاموش گل — " — عا ر
بہشت کی بہشت — " — عا ر
... — " — عا ر

تلخ و شیریں — صلاح الدین — عا ر
نازو — اختر انصاری — عہ ر
اندھی دنیا — " — عہ ر
زادراہ — منشی پریم چند — عا ر
واردات — " — عا ر
خواب و خیال — " — عا ر
دودھ کی قیمت — " — عا ر
آخری تحفہ — " — عا ر
پرانے خدا — کرشن چندر — عا ر
ان داتا قلعے — " — عا ر
دروازہ — " — عا ر
نغمے کی موت — " — عا ر
نئے فسانے — " — للعہ ر
نئے زاویئے دوم — " — سے ر
ان داتا — " — عا ر

گھونگھٹ میں گوری جلے — کرشن چندر — عہ ر
زندگی کے موڑ پر — " — عا ر
سفینے — صادق الخیری — سے ر
شمع انجمن — " — عا ر
پرواز — شفیق الرحمان — سے ر
مدوجزر — " — عا ر
شگوفے — " — ۱۲ ر
لہریں — " — سے ر
ضربیں — قیسی رامپوری — سے ر
غبار — " — عا ر
کیفستان — " — عہ ر
نوک جھونک — کوثر چاندپوری — عہ ر
شیخ جی — " — ۱۲ ر
رنگین رستے — " — عا ر
اشک دانشور — " — ۱۲ ر
موج کوثر — " — ۱۲ ر
آنچل — احمد ندیم قاسمی — عا ر
سیلاب — " — سے ر
کیسر کیاری — " — عا ر
قفس — از سادرنا تھ اشک — عہ ر
ناسور — " — عا ر
ڈاچی — " — عا ر
نئے محل — ظفر قریشی دہلوی — عا ر
سادہ رنگین — " — عا ر
گذرگاہ خیال — " — عا ر
دریچے — " — عا ر
گمنام عورت کا خط — " — ۴ ر
موت کا راگ — مرزا ادیب — عا ر
صحرانورد کے خطوط — " — للعہ ر
صحرانورد کے رومان — " — سے ر
شمع حرم — راجہ مہدی علی خاں — سے ر
سولہ سنگار — سدرشن — سے ر
طائر خیال — " — عا ر
اندھے کی دنیا — " — عا ر
قوم پرست — " — عا ر
اپنے خواب — کاظم علی — عا ر
دلکی باتیں — " — ۱۲ ر
علم ... — تقدیس صہبائی — عا ر

جھروکے — اشرف صبوحی — عا ر
دانہ و دام — مہدی — عا ر
چاندی کے تار — مہندر ناتھ — عا ر
مویسیاں کے افسانے — نصیر حیدر — عا ر
انشائے لطیف — ل۔ احمد — عا ر
جلیئے — آغا اشرف — عہ ر
سلئے — شیر محمد اختر — عہ ر
بھنور — " — عہ ر
بادلوں میں — " — عا ر
کلیاں — عصمت چغتائی — سے ر
چوٹیں — " — عا ر
دفینے — امداد انصاری — عا ر
چہرے — خدیجہ مستور — عا ر
کھیل — ہاجرہ مسرور — عا ر
معاشقے — قمر انبالوی — عا ر
ارضی دیوتا — جبران خلیل جبران — عا ر
آنسو اور مسکراہٹ — " — عا ر
گناہ عزیت — ٹالسٹائی — عا ر
ٹالسٹائی کے افسانے — " — عا ر
ٹالسٹائی کی کہانیاں — " — ۱۲ ر
تازیانے — الطاف مشہدی — عا ر
سچی کہانیاں — پریم پجاری — سے ر
زرد چہرے — ابراہیم جلیس — عا ر
مشرق و مغرب کے افسانے — عاشق بٹالوی — عہ ر
چوار بھاٹا — رامانند ساگر — سے ر
آبگینے — " — سے ر
ستارے — سات مختلف ادیب — سے ر
چند افسانے — خواجہ محمد شفیع — عہ ر
آئینہ حیرت — رفیق حسین — عا ر
دریچے — مرد ... — عا ر
ٹوٹے ہوئے دل — جمیل احمد ... — عا ر
تماثرات — ... — عا ر
خواب و خیال — مجنوں گورکھپوری — عہ ر
سمن پوش — " — عہ ر
وسوسے — فضل حق قریشی — ۱۲ ر
آنچل کے ... — " — ۱۲ ر
آج کل کے افسانے — " — سے ر
ایرانی افسانے — حاجی ... — عا ر

ساقی ...

خوشبوئیں شبلی بی اے
مغربی افسانے ″
شعاعیں ″
تاریخی رومان ″
پرویں عطاء اللہ
ریزہ مینا پچاس ادیب
مسکراتے آنسو بھارت چند
خودکشی پر عبیدی
تار و پود بلونت سنگھ
دنیا ہماری پردیسی
موج نیل منفلوطی
مشعل راہ ٹیگور
ہماری گلی احمد علی
قیدخانہ ″
داستانیں قمر انبالوی
سفید چیتھڑا جمیل احمد
شہید نقیب سیاح شامی
شت چند چڑجی کے بہترین افسانے
سیرت بابو پریم چند
ہمراہ کوئی ہے منظور
شوخیاں ٹیگور
طلسمات عابد علی عابد
عجیب قاضی عبدالغفار
لمحات رنگین زبیدہ سلطانہ
ساغر و مینا اسلم کاشمیری
دل کی تصویریں تڑاپ
پیمانے رشید جاوید
دنیا کی رنگین مزاج عورتیں۔ مہری علی
غریب کی آہ روشن بی اے
باغباں ٹیگور

چینی کی انگوٹھی مرزا عظیم بیگ چغتائی ۸
ملفوظات ثانی ″ ۱۲
خطوط کی ستم ظریفی ″ ۱۰
مقراضی محبت ″ ۶
قدردان ″ ۶
فرزند سرحد ″ ۶
ناتی عشو راشد الخیری ۱۰
ولائتی تحفے ″ ۸
داد الال بھگڑ ۱۰
پطرس کے مضامین پطرس بخاری
روسی ظرافت
لیے پیرکی آوارہ
مضامین لق لق حاجی لق لق
آواز لق لق ″
دراتتی ″
لقلقہ ″
منقار لق لق ″
گہوارہ تبسم ظریف ۴
ایک کہانی چھ ادیبوں کی زبانی ۸
شیش محل شوکت تھانوی
سنی سنائی ″
طوفان تبسم ″
لاہوریات ″
سوتیا چاہ ″
مابدولت ″
مجھے خرید لو ″
کیلے کا چھلکا سید باد جہازی
آب حیات کے لطیفے آغا محمد اشرف
سنگ و خشت کنہیا لال کپور
شیشہ و تیشہ ″
روسی ظرافت مسلم چغتائی
جدید جغرافیہ پنجاب
رنگین مغالطہ ابو تمیم
گدھوں میں بیداری
جنسی کی باتیں
مسکراہٹیں کوثر چاند پوری

مضامین فرحت اللہ بیگ
مضامین فرحت ″
عشق کی گولیاں ″
بیوی کی تربیت آتش
مزاحیہ ڈرامے خلیل احمد
چودھری سلطان کے ڈرامے

مذہب و سیاست

خطبات آزاد ابوالکلام آزاد
مسلمان عورت ″
انتخاب الہلال ″
مضامین ابوالکلام آزاد ″
مضامین البلاغ ″
انسانیت موت کے دروازے پر ″
تصریحات آزاد ″
تعمیر ملت شریف چشتی
مسلمانان ہند کی حیات سیاسی محمد مرزا
دوسری جنگ عظیم
جنگ زدہ ممالک میر حسن ایم اے
عہد حاضر کے بڑے لوگ
اسلام کیسے شروع ہوا عبدالواحد سندھی
اسلام کیسے پھیلا ″
اسلام کے سیاسی تصورات غلام
جرم و سزا باری
خطبات عبید اللہ سندھی
آج کا مصر محمد حسن
سیاست ملیہ محمد دین
سی۔پی میں کانگریسی راج
... آنند لال

مزاحیہ کتابیں

... عظیم بیگ چغتائی

معروضیتیں ہیں۔ اس لئے ان دونوں کے تعلقات میں اور پیچیدگیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہاں صرف دو جسم ہی ایک دوسرے کے مدمقابل نہیں ہیں، بلکہ دو دماغ بھی گتھے ہوتے ہیں۔ انہیں دو دماغوں کے داؤ پیچ سے فراق کی شاعری تشکیل پاتی ہے۔ اس عاشق میں نہ تو اینٹھ اکڑ ہے نہ محبوب کی طرف سے خود پرستانہ بے پروائی ہے۔ جہاں عاشق اپنی ذہانت اور اپنے دماغ کا احترام کرتا ہے وہاں محبوب کے دماغ کا بھی ہے۔ محبت میں جبلت تو خیر اپنا کام کر ہی رہی ہے اور بے ۔۔۔ ن کو بھی معطل نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ بعض جگہ تو دماغ اتنا کام کرتا ہے کہ روایتی تغزل کے عادی تو یہ سمجھیں گے عشق نہیں ہو رہا، کاروباری باتیں ہو رہی ہیں۔ ایک طرح دیکھئے تو اکثر جگہ واقعی ہوتا بھی ہے ایک قسم کا نفسیاتی مول تول، یعنی عاشق یہ فیصلہ کرنا چاہتا ہے کہ کس حد تک اس کا دبنا ایک خوددار کے لئے جائز ہو سکتا ہے۔ فراق کے عاشق کو آپ اس وقت تک پوری طرح نہیں سمجھ سکیں گے۔ جب تک کہ فراق کے محبوب کو بھی نہ سمجھ لیں۔ فراق صاحب نے محبوب کو ایک ایسی معروضی حیثیت دے دی ہے جو اردو شاعری میں اسے حاصل نہیں تھی۔ ایک طرح لکھنؤ اسکول کی شاعری میں محبوب معروضی حیثیت رکھتا بھی ہے، لیکن یہ معروضیت نفسیاتی نہیں ہے کنگھی، چوٹی، انگیا اور جوبن کی ہے۔ اردو کی داخلی شاعری میں محبوب صرف عاشق کا ضمیمہ رہا ہے۔ محبوب یا تو جمالیاتی دلکشی کی وجہ سے اہم بنتا ہے، یا پھر اس کی ہستی پر صرف اس حد تک غور کیا جاتا ہے جہاں تک کہ وہ عاشق کی روحانی نشو و نما کا باعث بنا ہے، یا اس کی وجہ سے عاشق کے اندر داخلی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ دونوں باتیں فراق کے یہاں بھی موجود ہیں، لیکن انھوں نے محبوب کو عاشق کی ہستی سے الگ کر کے بھی دیکھا ہے۔ ان کا محبوب صرف ایک ثانیہ نہیں بلکہ ایک کردار ہے۔ اور اس کردار کی نفسیات بھی سیدھی سادی نہیں ہے ایسی ہی پیچ در پیچ ہے جیسی عاشق کی نفسیات۔

تیرے جمال کی تنہائیوں کا دھیان نہ تھا
میں سوچتا تھا مرا کوئی غم گسار نہیں

یہ عاشق اور معشوق دو نفسیاتی نظام ہیں جن میں ٹکر ہو رہی ہے۔ یہاں سوال محبوب کے مہربان ہونے یا ستم کرنے کا نہیں ہے، بلکہ ان دو نظاموں کو ہم آہنگ کرنے کا، ان دونو کے مطالبات کو اس طرح پورا کرنے کا کہ دونوں کی تسکین بھی ہو جائے اور خسارہ بھی نہ اٹھانا پڑے:

عشق میں سچ ہی کا رونا ہے
جھوٹے ہیں تم جھوٹے ہیں ہم

یہاں اگر عاشق روٹھتا ہے تو اپنے "انداز جنوں" دکھانے کی وجہ سے نہیں، نہ یہ وہ حیاتیاتی آنکھ مچولی ہے جو حسرت موہانی کے یہاں ملتی ہے۔ اس کے ذہنی اور جذباتی اتار چڑھاؤ میں خود آگاہی کو بہت دخل ہے، اور محبوب کی نفسیات سے آگاہی کو بھی:

کل پھر عشق نہ روٹھ سکے گا
آج منالے آج منالے

فراق صاحب کی عشقیہ شاعری کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا محرک ضرور عشق ہے، مگر یہ شاعری صرف عشق نے نہیں کی، بلکہ شاعر کے پورے شعور نے کی ہے۔ فراق نے عشق کو شعور اور زندگی کے دوسرے تجربات سے الگ کر کے نہیں دیکھا، بلکہ عشق کو پوری زندگی کے گرد و پیش میں رکھ کر۔ ان کے یہاں عشق بہت سے ذہنی تجربوں میں سے ایک تجربہ ہے ــــــ دوسروں سے نمایاں اور اہم۔ چنانچہ ان کے اشعار پڑھنے والے کے صرف ایک تجربے (عشق) سے تخاطب نہیں کرتے بلکہ اس کے پورے شعور سے۔ اسی چیز کا ایک پہلو یہ ہے کہ ان کی شاعری میں جذبہ اور خیال ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے ان کے شعور میں یہ دونوں عمل ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری اتنی تہ دار ہے کہ فراق صاحب کبھی عوام میں مقبول نہیں ہو سکتے۔ یہ شاعری ابہام اور صراحت دونوں کا امتزاج ہے۔ جو تجربات اس شاعری کا موضوع ہیں وہ تو حد درجے کے نرم و نازک اور لطیف ہیں لیکن فراق صاحب کیفیت کے اختصاص اور اس کی انفرادی صفت اس طرح گرفت میں لاتے ہیں کہ ان کی تصویر کی لکیریں ہر جگہ صاف اور روشن ہیں، اور بڑی مضبوط لیکن "اس تختی" کے

(بقیہ ۔۔۔)

نکات

امین حزیں

لامکاں گیر آہ پیدا کر ‖ ماوریٰ نگاہ پیدا کر
یعنی اِن ظلمتوں کی وادی میں ‖ دیدۂ جلوہ خواہ پیدا کر

(۲)

سحرِ طوفانِ رنگ و بُو سے گذر ‖ اِس طلسماتِ چار سُو سے گذر
جھاڑ دل کی نگاہ کا دامن ‖ خاکبازی کی آرزو سے گذر

(۳)

ظرف کا امتحان دینا ہے ‖ اور شایانِ شان دینا ہے
یعنی ساقی کے اک اشارے پر ‖ ہمکو ہنس ہنس کے جان دینا ہے

(۴)

قہقہوں کا نہ سرد آہوں کا ‖ زندگی کھیل ہے نگاہوں کا
یعنی بے خضر دشتِ ہستی میں ‖ یہ امیں ڈھونڈنا ہے راہوں کا

(۵)

دلِ مضطر کو سمجھاؤں کہانتک ‖ تری باتوں سے بہلاؤں کہانتک
میں اکثر سوچتا رہتا ہوں پہروں ‖ فریبِ زندگی کھاؤں کہانتک

(۶)

مقدر سنگدل قسمت ہٹیلی ‖ گرو گھنٹال وہ یہ اُنکی چیلی
پھنسے ہیں اور بے ڈھب سے پھنسے ہیں ‖ ہمارا آپ کا اللہ بیلی

(۷)

نہیں انجام ہی جب اپنے بس میں ‖ پھنسیں کیوں دامِ وہم دسترس میں
امیں معلوم کیا میرے چمن کو ‖ گلستاں میں کٹیگی یا قفس میں

(۸)

فضائے دشتِ ہستی کا فسوں ہے ‖ کہ فطرت میں تگ و دو کا جنوں ہے
پڑینگے ہاتھ پاؤں مارنے ہی ‖ رواں جبتک رگوں میں جو خوں ہے

غلام یزدانی

اجنتا کی تصاویر

تاریخی اور فنی پس منظر

سندھ میں جو گذشتہ ربع صدی میں انکشافات ہوئے ہیں ان کے متعلق ماہرین میں اختلاف رائے ہے کہ وہ خالص ہندی تمدن اور تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں یا ان میں مغربی ایشیائی ممالک کی تہذیب اور تمدن کو بھی دخل ہے۔ یہ مسئلہ ظاہرا ان نقوش کی صحیح تعبیر تک حل ہونا مشکل ہے جو سندھ اور متعلقہ علاقوں میں مہروں پر کندہ پائے گئے ہیں۔ سندھ کے تمدن کی تاریخ ڈھائی ہزار سے تین ہزار برس تک قبل از مسیح قرار دی گئی ہے۔ اس زمانے کے بعد ہندوستان کی تہذیب کے متعلق مورخ کو کوئی قابل اعتبار ذرائع سوائے ویدوں یا شاستروں کے نہیں ملتے۔ بعض علماء نے مشہور صرف و نحو کے عالم پانِنی کی معرکۃ الآرا کتاب میں جو جملے بطور مثال دئے گئے ہیں ان سے بھی تاریخی نتائج استنباط کرنے کی جرأت کی ہے۔ چھٹی صدی اور پانچویں صدی قبل از مسیح بودھ کی زندگی کا زمانہ ہے۔ اس مختصر مضمون میں بودھ مذہب کے خاص عقائد پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ لیکن اجنتا کی تمام تصاویر چونکہ اس مذہب سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے اتنا واضح کرنا ضروری ہے کہ حقیقت جو نفوس کو آواگون کا یہ مسئلہ کہ انسان کو پاک زندگی بسر کرنے کے بعد بھی ابدی سکون حاصل نہیں ہوتا اور آئندہ بھی پیدائش میں پھر عذاب میں گرفتار ہونے کا احتمال باقی رہتا ہے تشفی بخش نہ تھا۔ اور بودھ کی تردو نا کی تعلیم اسی عقیدہ کا رد عمل تھی۔ علاوہ ازیں آریائی فاتحین نے نسل و رنگ کے تفوق پر جو ذات پات کے امتیازات قائم کر رکھے تھے۔ وہ بھی ہندوستان کی عام آبادی کو جو قدیم باشندوں پر مشتمل تھی۔ ناگوار معلوم ہوتے تھے اور بودھ نے اپنی تعلیم میں انسانی مساوات اور برادری کو شدت سے ملحوظ رکھا۔

اگر بودھ مت کی روایات کو صحیح مان لیا جائے تو ساکیامنی کی زندگی میں ہی بہار سے لے کر موجودہ گورکھپور کے علاقہ تک کے تمام بڑے بڑے رشی منی اور راجہ اور قبائل کے سردار بودھ کی تعلیم کے زیر اثر آگئے تھے۔ ایسا باور کرنے کے قرائن اس تاریخی واقعہ سے اور مستحکم ہو جاتے ہیں کہ مہاراجہ اشوک تیسری صدی میں بودھ مذہب کا پیرو ہو گیا۔ اس شہنشاہ نے بودھ کی تعلیم کو عالمگیر بنانے کی بیحد کوشش کی اور ہندوستان کے مختلف صوبوں اور بیرون ملک علاقوں میں راہبوں کو تبلیغ کے لئے بھیجا۔ راجہ اشوک کے مذہبی فرمان جو اصطلاحاً مناردات کہلاتے ہیں اب تک ہندوستان کے دور دراز شہروں یہاں تک دکن اور جنوبی ہند میں بھی بعض جگہ موجود ہیں۔ یہ منادرات شمالی ہند اور وسط ہند میں مناروں پر کندہ ہیں۔ جن کی ساخت اور نقش و نگار میں مغربی ایشیائی ممالک کی صنعت کا اثر نمایاں ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ پنجاب کے شمال غرب اور متصلہ علاقہ میں چھٹی صدی عیسوی میں ایرانی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ اور اس کے زوال کے بعد بھی اس علاقہ میں ایرانی نسل اور مغربی ایشیائی ممالک کے لوگ آباد تھے۔ جن میں بہت سے اعلیٰ درجے کے صناع تھے۔ اور جب تیسری صدی قبل از مسیح یا بعد میں بودھ مذہب کو فروغ ہوا تو ان بیرونی بسنے والوں نے نئے مذہب کی انسانیت اور وسیع مشربی سے متاثر ہو کر اسے قبول کر لیا۔ سارناتھ کے ستون کی چلا اور شیروں کی مورتیں آشور کی سنگتراشی کے نمونوں سے بے حد مماثلت رکھتی ہیں۔

نقاشی کے نمونے جو تیسری صدی قبل از مسیح یا اس کی بعد کی قریب کی صدیوں کے ہوں۔ شمالی ہند میں اب تک دریافت نہیں ہوئے ہیں اور نہ مغربی ایشیائی ممالک میں ان کا وجود ثابت ہوا ہے۔ البتہ مصر میں پہاڑ کو تراش کر مقبروں کے بنانے کا رواج عرصے سے تھا اور ان مقبروں میں نقاشی کے نمونے بھی دیواروں پر موجود ہیں۔ دکن اور مغربی ساحلی علاقے میں جو شاندار معابد اور خانقاہیں پہاڑ کو تراش کر بنائی گئی ہیں۔ ان کو اس نوع کے فن تعمیر کے لحاظ سے مصر کے زیر اثر کہا

جاسکتا ہے۔ لیکن تعمیری نقش اور آرائیں کو جب دیکھا جاتا ہے تو مصری مقابر اور دکن کے پہاڑوں میں ترشے ہوئے معابد اور خانقاہوں میں کوئی مماثلت نہیں پائی جاتی۔ نقاشی کے نمونوں میں بھی زمین آسمان کا تفاوت ہے۔ مصر کی نقاشی خطاطی کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اور سوائے لکیروں کے اس میں جسامت یعنی طول، عرض اور حدود کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں۔ اور اجنتا کی نقاشی کا یہ خاص امتیاز ہے کہ اس کے قدیم سے قدیم نمونوں میں بھی طول اور عرض کے ساتھ حجم کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

اجنتا کی تصاویر کے ابتدائی نمونے ہمیں غار نشان ۱۰ کی دیواروں پر نظر آتے ہیں۔ یہ غار ایک عبادت گاہ ہے اور اس کا طرز تعمیر بھاجا۔ کارلا۔ بیڈسا اور کنڈانا کے معابد سے بے حد مشابہ ہے۔ موخرالذکر معابد دوسری صدی قبل از مسیح کے بنے ہوئے تصور کئے جاتے ہیں۔ اجنتا کے غار نشان ۱۰ کی رو کار پر بھی ایک براہمی کتبہ موجود ہے جس کو المانی مستشرق پروفیسر لوڈرز دوسری صدی قبل از مسیح کا حوالہ کرتے ہیں اس عبادت گاہ کی بائیں دیوار پر ایک اور براہمی کتبہ تصاویر کے ساتھ منقوش ہے۔ اس کو بھی پروفیسر موصوف نے دوسری صدی قبل از مسیح کا قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر لوڈرز کی رائے سے ایک بڑی غلط فہمی رفع ہو گئی۔ کیونکہ اکثر ماہرین اجنتا کی تصاویر کو گپتا یا چالوکیا زمانے کا کارنامہ سمجھتے ہیں۔

میں اب مختصر طور سے ان تصاویر کی کیفیت بیان کرتا ہوں جو غار نشان ۱۰ کی بائیں دیوار پر ہیں۔ اس دیوار پر ایک براہمی کتبہ بھی منقوش ہے۔ تصاویر موسمی اثر اور انسانی بے نبریوں کی وجہ سے بہت کچھ ضائع ہو گئی ہیں تاہم جو نقوش اور خدوخال باقی ہیں ان سے فن کی تاریخ کی تحقیق میں بے حد مدد ملتی ہے۔ شروع میں کسی راجہ کے جلوس کے سپاہی نظر آتے ہیں یہ سب مسلح ہیں اور آدھی آستینوں کے کوٹ یا کرتے پہنے ہوئے ہیں۔ نیچے کا حصہ ضائع ہو گیا۔ ہتھیاروں میں برچھے کمان اور تیر اور تبر نمایاں ہیں۔ ان سپاہیوں کے بال لمبے ہیں جن کو چٹلے چٹکوں یا فیتوں سے لپیٹ کر سانپ کے کنڈلوں کی طرح سر کے اوپر جما دیا گیا ہے۔ بالوں کو اس طرح لپیٹنا ہندوستان کے قدیم باشندوں کی خصوصیت تھی کیونکہ بھرہت سانچی کے توپوں اور مغربی ہند کی پہاڑیوں میں ترشی ہوئی عبادت گاہوں میں جو نقشے مسیح سے پہلے کے زمانے کے ہیں ان سب میں بالوں کی وضع یہی ہے بعض کے سروں پر سانپ کا ایک پھن یا سات پھن بھی دکھائے گئے ہیں جس کا غالباً مقصد یہ تھا کہ یا تو یہ لوگ ناگ بنسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں یا کسی زمانے میں ناگ کی پرستش کے قائل تھے اور وہ روایت ان کی آرائش میں بودھ مذہب کے قبول کرنے کے بعد بھی باقی رہی۔ ان لوگوں کے خدوخال بھی آریائی نہیں۔ اجنتا کے غار نشان ۹ اور ۱۰ میں جو قبل از مسیح زمانے کی تصویریں ہیں ان کے نقشے ضلع اورنگ آباد اور مہاراشٹر کے موجودہ زمانے کے باشندوں کے مماثل ہیں مثلاً چہرے تقریباً گول، آنکھیں چھوٹی لیکن روشن، ناک بھی چھوٹی مگر نمایاں دبی ہوئی نہیں۔ ہونٹ رس بھرے ہیں لیے نہ موٹے۔ ٹھوڑی جیسا کہ گول چہرے پر ہونی چاہئے چھوٹی۔ ان تصاویر سے معلوم ہوتا ہے کہ بودھ مت میں اس زمانے میں زیادہ تر قدیم باشندے داخل ہوئے تھے۔

میں راجہ کے جلو کے سپاہیوں کا ذکر کر رہا تھا۔ تصویر کے اس منظر کے بعد ایک اور منظر ہے جس میں راجہ اپنے محل کی عورتوں کے ساتھ ایک پیپل کے درخت کے سامنے کھڑا ہے۔ اس درخت پر بہت سی جھنڈیاں لگی ہوئی ہیں۔ یہ درخت وہی ہے جس کے نیچے بودھ کو نروان حاصل ہوئی تھی اور کنایتاً اس سے خود بودھ کی ذات مراد ہے۔ کیونکہ بودھ مت کے ابتدائی عقائد کے بموجب گوتم کی الوہیت کے مدنظر اس کی تصویر یا مجسمہ بنانا ممنوع تھا۔ درخت کے دوسری جانب مذہبی بھجن پڑھنے والوں کی جماعت ہے یہ سب عورتیں ہیں بعض کے ہاتھوں میں نفریاں ہیں باقی تالیاں بجا رہی ہیں اور تین ناچ رہی ہیں۔ ان میں سے دو کا ناچ تو بالکل آج کل کے ناچ کے مشابہ ہے یعنی ایک ہاتھ کو سہارے کے لئے کمر کے ایک جانب رکھنا اور دوسرے کو انداز سے موڑ کر سر پر رکھنا اور پھر ٹانگوں کو موڑ کر اور کولھے کو جھکا کر ٹھمکنا۔ تیسری عورت کا رقص چکر کا ناچ معلوم ہوتا ہے جو اس زمانے میں بھی ساز کے نغموں کے ددگن اور تگن کی نوبت پر پہونچنے کے وقت عمل میں آتا ہے۔ راجہ کے محل کی عورتوں اور سازندوں اور رقص کرنے والیوں کے لباس میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ بدن کا بالائی حصہ برہنہ نظر آتا ہے۔ اور نیچے کے حصہ میں بھی ساڑی کا مقصد صرف

ستر ڈھانکتا ہے۔ زیور کی البتہ کثرت ہے جھومر، ہار، گلوبند، بازو بند، چوڑیاں، پہونچیاں۔ اور کمر پٹے نمایاں نظر آتے ہیں۔ ساخت سے یہ سب سونے کے معلوم ہوتے ہیں۔ دکن میں اس زمانے میں سونے کی افراط تھی اور غالبًا دساور میں باہر بھی جاتا تھا۔ زیور میں موتی بھی نظر آتے ہیں۔ لباس میں عورتوں کے سر پر اوڑھنیاں بھی ہیں جو اجنتا کی بعد کی تصویروں میں نظر نہیں آتیں۔ جو غالبًا آریائی تہذیب کے اثر سے غائب ہوگئیں۔ عورتوں کے ہاتھ میں چکلی چکلی چوڑیوں کے پورے جوڑے بھی ہیں جو ہاتھی دانت یا سنکھ کے خول کی ہونگی۔ جیسا کہ اب تک دکن کی قدیم اقوام کی عورتوں کے ہاتھوں میں نظر آتی ہیں اور جو میکی اور پٹن کی کھدائی میں کثرت سے ملی ہیں۔ ایک اور امتیاز اس تصویر کا یہ ہے کہ بھجن پڑھنے والی عورتیں بید کے خوبصورت مونڈھوں پر بیٹھی ہوئی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا رتبہ بودھ مت کی سنگت میں کسی طرح بھکشوؤں سے پست نہ تھا اور جو زبوں حالی دیو داسیوں کی قرون وسطیٰ میں برہمن مذہب کی دوبارہ ترویج پر ہوئی اس سے بودھ مت کی منڈلی کی راسباؤں کی زندگی کا مقابلہ کرنا ہرگز درست نہ ہوگا۔ فن کے لحاظ سے اس تصویر کے امتیازات یہ ہیں کہ نقاش کو اجسام کے طول و عرض اور حجم دکھانے پر قدرت حاصل تھی۔ نیز وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مختلف شبیہوں کے رُخ کس طرف رکھدئے جائیں اور ان کو کس طرح ترتیب دیا جائے تاکہ قصے کے اعتبار سے دیکھنے والے کے ذہن میں شبیہوں کی اہمیت واضح ہوجائے۔ یہ تصویر چونکہ بہت مٹ گئی ہے۔ اس لئے یہ اندازہ نہیں ہوسکتا کہ مصوّر شبیہوں میں اندرونی جذبات یا احساسات دکھانے پر قادر تھا۔ رنگوں میں گیرو، سبز پہاڑی مٹی، کاجل کی سیاہی اور چونے کی سفیدی نظر آتی ہیں۔ ہونٹوں اور آنکھ کے کونوں پر ایک قسم کا کھلا ہوا سرخ رنگ ہے جو غالبًا گیرو کو کسی اور رنگ سے ملاکر بنایا گیا ہوگا۔ لاجوردی رنگ جو اجنتا کی بعد کی تصویروں میں نظر آتا ہے اس میں نہیں ہے۔ تصویر میں دو ایک درخت ہیں لیکن پس منظر کی خوبصورتی کا خیال جتنا کہ بعد کی تصویروں میں نظر آتا ہے اس وقت تک شاید پیدا نہ ہوا تھا۔ شبیہوں پر ہلکے اور گہرے رنگ سے پچارے بھی بنے ہیں جو روشنی اور سایہ کو نمایاں کرنے کے لئے بعد کی تصویروں میں موجود ہیں تاہم جو فنی خصوصیات اس تصویر میں ہیں ان سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ نقاشی کی ابتدا دکن میں اس درجہ تک پہونچنے کے لئے ڈیڑھ دو ہزار برس پہلے ہوچکی ہوگی۔ دکن اور مغربی ہند کے پہاڑوں والے معابد کی سنگتراشی کے کمال کو بھی دیکھکر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ صنعت دو ہزار برس کی مسلسل مشق کے بعد پیدا ہوئی ہوگی۔ ان قیاسات کی بنا پر دکن کے فنون لطیفہ کی تاریخ سندھ کی تہذیب اور تمدّن کے زمانے تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن تسلسل کو ثابت کرنے کے لئے سب سے زیادہ توضیح جیسا میں اوپر بیان کرچکا ہوں سندھ کے نقوش کی تعبیر کی ضرورت ہے۔ اور بعدازاں دکن کے قدیم آثار کی تحقیق کی جن میں سونے کی قدیم کانیں بھی شامل ہیں۔ ہٹی میں ایسے آثار موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں سونا چھ سو فٹ کی گہرائی تک نکالا گیا تھا۔ بغیر مشینوں کے اتنی گہرائی پر کام کرنا اور ہوا اور دیگر ضروریات زندگی کا انتظام رکھنا صدیوں کی مشق اور تجربے کے بعد ممکن ہوا ہوگا۔ عہد نامہ عتیق اور پرانے یونانی اور رومی مورخوں کی تحریروں سے بھی سونے کا مغربی ایشیائی ممالک میں جانا ثابت ہے۔ یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ سونا تجارت اور تہذیب کے ترقی دینے میں ہمیشہ معاون رہا ہے۔ دکن کے قدیم آثار سے یہ بات بھی واضح ہے کہ مسیح سے ہزاروں برس پہلے دکن اور جنوبی ہند میں ایشیائی مغربی ممالک کی مختلف اقوام آکر بس گئی تھیں جن میں سیتھی قومیں جو ابتدا میں بحر خزر کے کنارے پر آباد تھیں زیادہ کثرت سے آئیں۔ یہ لوگ سندھ کے مغربی جانب بھی بس گئے اور سستان جس کو عربوں نے سجستان لکھا ہے سکستان کا معرّب ہے یعنی "سکوں کی بستی" یہ ان قوموں کا قدیم وطن بن گیا تھا۔ سنسکرت ادب میں بھی سیتھی قوموں کو سک یا شک لکھا گیا ہے۔ دکن کے شمالی حصے کی آبادی میں سیتھی نسل کا بہت خون ملا ہوا ہے۔ اور اجنتا کی قدیم تصاویر میں جن لوگوں کی شبیہ بنائی ہے ان میں بھی اس نسل کا اثر ہے۔

بیرونی اختلاط کی بحث کو چھوڑ کر اب میں عبادت گاہ نشان ۱۰ کی ایک اور تصویر کا ذکر کرونگا۔ یہ اس معبد کی داہنی جانب کی دیوار پر منقوش ہے۔ قصہ کی خبر ہوچکی ہے: دنیا میں بودھ کے ہاتھی کی صورت میں جنم لینے کا ذکر ہے۔ یہ ہاتھی

نہایت قدآور اور اس کے چھ دانت تھے۔ جس کی وجہ سے اس کا لقب چھ دنتا ہو گیا تھا۔ ہاتھی کی دو بیویاں تھیں جن پر اس کی برابر التفات تھی۔ لیکن سوتن کا بُرا ہوتا ہے۔ ایک بیوی رشک سے گھل گھل کر مر گئی اور مرنے سے پہلے یہ عہد کر لیا کہ اگر اگلے جنم میں وہ بنارس کے راجہ کی بیوی ہوئی تو اپنے خاوند کو سوت کے اوپر خاص التفات کرنے کا مزہ چکھاؤں گی۔ اتفاقاً ایسا ہی ہوا کہ اگلے جنم میں وہ بنارس کے راجہ کی بیوی بنی۔ چنانچہ ایک دن وہ اداس بن اٹھوائی کھٹوائی لے کر پڑ گئی اور راجہ سے کہا کہ جب تک تم چھ دنتا ہاتھی کے دانت اکھڑوا کر نہ منگوا دوگے میں نہ اَن کھاؤں گی نہ پانی پیوں گی۔ راجہ نے بہادر اور مشاق شکاریوں کا انتخاب کیا اور چھ دنتا ہاتھی کے دانت لانے کے لئے ان کو روانہ کیا۔ قصہ بہت طویل ہے آخر میں شکاری جب دانت لے کر آئے تو رانی کو اپنے پہلے جنم کے شوہر کی محبت اور اپنے بدلہ لینے کی ذلت خوری کا احساس ہوا اور ایسا صدمہ ہوا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکی۔ یہ تصویر کتبے کی شان خط کے لحاظ سے تیسری صدی عیسوی کی معلوم ہوتی ہے۔ یعنی پہلی تصویر سے تقریباً پانچ سو برس بعد کی۔ فن اس عرصے میں بہت ترقی کر گیا تھا۔ مصوّر نے ہاتھی کی عادات اور خصائل کو نہایت کامیابی سے منقش کیا ہے۔ گھنے جنگلوں میں رہنا، تالابوں میں نہانا۔ خطرے کے وقت سونڈ کو اوپر اٹھا کر چنگھاڑنا اور ایک جگہ جمع ہو جانا۔ دوپہر کو سایہ دار درختوں کے نیچے آرام کرنا۔ جنگلی پھلوں کو توڑنا۔ بن کے اور باسیوں سے لڑنا۔ مثلاً ایک مگرمچھ کو روند ڈالنا لیکن ایک اژدہے کے مقابل میں جب اس نے ٹانگوں پر بل ڈال کر کسنا شروع کیا تو ڈر کے مارے بچا نہ خطا ہو جاتا۔ یہ سب منظر ایسے ہو بہو دکھاتے گئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ زندہ ہاتھی سامنے پھر رہے ہیں۔ مصوّر کو حرکات کے دکھانے پر پوری قدرت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں بڑ کا درخت جس کے نیچے دوپہر کے وقت چھ دنتا ہاتھی اپنی رانیوں اور غول کے ساتھ آرام کرتا تھا۔ فن کاری کا بہترین نمونہ ہے۔ بڑ کے پتے اس کے پھل، اس کی لٹکتی ہوئی شاخیں پھر ان سب کے مختلف رنگ جن میں بعض خشک پتوں کے بھی رنگ دکھا دئے ہیں اور پتوں کی باریک لکیریں۔ غرض کوئی خصوصیت ایسی نہیں ہے جس کو مصوّر نے منقش نہ کیا ہو۔ مذہبی ایثار کو دکھانے کے لئے نقاش نے قصہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ چھ دنتا ہاتھی جب زخمی ہو کر گر پڑتا ہے تو شکاری اس کے دانتوں کو آری سے کاٹنا چاہتے ہیں لیکن وہ ایسے عظیم الشان اور مضبوط ہیں کہ آری کا ان پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ چھ دنتا کو شکاریوں کی سعی بیکار جانے پر افسوس ہوتا ہے اور باوجود زخموں سے گھائل ہونے کے وہ اپنی سونڈ سے دانتوں کو اُٹھا کر شکاریوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ ایثار اور انسانی خدمت بدھ مت کی تعلیم کے خاص امتیازات تھے اور یہ صفات ہر قصے میں جو اجنتا میں منقوش ہیں ہم کو نمایاں نظر آتی ہیں۔ قصے کے آخر میں نقاش نے ذہنی کیفیات دکھانے کی کوشش کی ہے۔ یعنی رانی دانتوں کو دیکھتے ہی بے ہوش ہو جاتی ہے۔ راجہ صاحب نے اس کی کمر کے پیچھے سہارے کے لئے ایک ہاتھ ڈال رکھا ہے اور دوسرے سے رانی کے شانے کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ ایک خادمہ پنکھا جھل رہی ہے ایک تلوے سہلا رہی ہے ایک برتن میں پانی لائی ہے تاکہ رانی کو ہوش میں لانے کے لئے چہرے پر چھڑکے۔ ایک اور دوا پلانے کے لئے پاس کھڑی ہے۔ ان سب ملازماؤں کو اس طرح تصویر میں ترتیب دیا گیا ہے اور ایسے احساسات کے ساتھ دکھایا گیا ہے بلکہ تصویر کا حزنیہ اثر دیکھنے والے کی نظر میں فوراً آ جاتا ہے۔ مرد اور عورتیں جو اس تصاویر میں دکھائے گئے ہیں وہ سب قدیم باشندے ہیں اور آریائی خدوخال اور شمالی ہند کے لباس کی خصوصیات ان میں موجود نہیں ہیں۔

تیسری صدی کے آخر میں شمالی دکن میں آندھرا خاندان کے راجاؤں کو زوال آ گیا۔ اور ان کی جگہ وکاٹکا خاندان کے راجاؤں نے لی۔ یہ غالباً اس علاقے سے آئے جو دکن کے شمالی حصے میں واقع تھا۔ اور پانچویں صدی عیسوی کے پہلے نصف تک دکن میں حکومت کرتے رہے۔ اس خاندان کا تعلق بیاہ شادی کے رشتوں سے شمالی ہند کے گپتا راجاؤں سے تھا، اور اس طرح گپتا عہد کے فنون لطیفہ کا اثر دکن میں وکاٹکا کے خاندان کے راجاؤں کے عہد میں ہوا۔ اس زمانے کی بہترین تصاویر چار بڑی خانقاہوں میں ہیں۔ جو غار نشان ۱۶ اور ۱۷ اور غار نشان ۱۹ و ۲ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان خانقاہوں کو غار

نشان نمبر ۱۶ یا ۱۷ کہنا بد ذوقی ضرور ہے۔ لیکن پہلے مصنف چونکہ جغرافیائی ترتیب کے مدنظر یہ نام دے چکے ہیں اس لئے حوالہ میں سہولت کی غرض سے ان کو برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ نشان نمبر ۱۶ و ۱۷ کی خانقاہوں میں کتبے بھی ہیں۔ اس لئے پہلے میں انہی کی تصویروں کے امتیازات بیان کروں گا۔ خانقاہ نشان نمبر ۱۶ میں جو کتبہ ہے اس کو دکاٹکا خاندان کے شجرہ کی بنا پر ماہرین نے پانچویں صدی عیسوی کے آخری ربع کا قرار دیا ہے۔ اس حساب سے اس خانقاہ کی تصاویر معبد نشان نمبر ۱ کی دائیں دیوار کی تصویر سے جس کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں صرف دو سو برس بعد کی ہیں۔ لیکن اس عرصہ میں اجنتا کی نقاشی ذہنیت فنکاری کے علاوہ ہر معیار تنقید کے لحاظ سے معراج پر پہنچ گئی تھی۔ نقاش حسن کی تمام اداؤں، ذہنی کیفیات اور رنگوں کی دلپذیر آمیزش پر قادر نظر آتا ہے۔ وہ بدھ مت کے زہد خشک اور رہبانی تعلیم کو نہایت دلکش انداز میں پیش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر میں ایک تصویر کی کیفیت بیان کرتا ہوں جو نند کی بیوی کی ہے لیکن عام لوگ اسے "مرنہار شہزادی" کہتے ہیں۔ نند بودھ کا بھائی تھا۔ اور جب تنویر کے بعد بودھ کپل وستو واپس آیا تو اس نے نند سے دریافت کیا کہ آیا وہ دُنیا کو ترک کرکے حلقہ میں داخل ہونے پر آمادہ ہے۔ نند نے بودھ کے تقدس سے مرعوب ہو کر آمادگی ظاہر کر دی۔ لیکن اسکو راج پاٹ چھوڑنے کا اور سب سے زیادہ اپنی محبوبہ کی جدائی کا بے حد صدمہ ہوا اور گھل گھل کر کانٹے کی طرح سوکھ گیا۔ محبوبہ کو بھی نند کے تارک الدُنیا ہونے کا بے حد رنج ہوا اور جب نوکر نند کا شاہی تاج لائے جو اُس نے حلقہ میں داخل ہونے سے قبل اُتار دیا تھا تو یہ نازنین بے ہوش ہو گئی۔ قصہ در اصل رہبانیت کا ہے لیکن انسانی جذبات نے ان میں جادو بھر دیا ہے اور نقاش نے انہی احساسات کو واضح کرنے کے لئے تصویر کو کھینچا ہے۔ ایک سڈول بدن کی رانی تکیہ کے سہارے تخت پر اس طرح پڑی ہے کہ جسم کا نیچے کا حصہ تخت کے نیچے ڈھلک آیا ہے اور ایک خادمہ تکیہ کے پیچھے سے رانی کی کمر کو پکڑے ہوئے ہے تاکہ وہ عالم بیہوشی میں تخت کے نیچے نہ گر پڑے۔ اطالوی نقاشوں نے عورت کے جسمانی حسن کو لیٹی ہوئی حالت میں مختلف دلربایانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ایسی تصاویر میں وینس کے مشہور نقاش تشان Tiziano Vecellio کے مرقعے بیشک بہت دلکش ہیں۔ لیکن ان سب میں حسن کی دیویوں کو عریاں دکھایا گیا ہے۔ اجنتا کے نقاش نے نند کی بیوی کو ایک چست چولی اور پھنسا ہوا گھٹنا پہنایا ہے اور جسم کو مدہوشانہ حالت میں اس طرح دراز کیا ہے کہ بدن کا لطیف سڈول پن اور تناسب بغیر عریانی کے نمایاں ہو گیا ہے۔ چہرے پر غم سے مردنی چھائی ہے۔ لیکن بالوں کے جوڑے کی آرائش، موتی کے زیور کی افراط اور خدوخال کی نزاکت نے اس اداس بے ہوشی کے عالم میں بھی ایک خاص جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ نقاش کیلئے روشنی کا اثر اور جسامت کو واضح کرنے کے لئے گہرے اور ہلکے رنگوں کے نکھارے بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ لیکن اس تصویر کی سب سے بڑی خوبی داخلی کیفیت کا اظہار ہے۔ اور اس امتیاز کے مدنظر دنیا کے پانچویں صدی تک کے نقاشی کے نمونوں میں یہ تصویر بے مثل ہے۔

گرفیتھ صاحب تو اس خصوصیت کی بنا پر اسکو اطالیہ کے قرون وسطیٰ کے تمام باکمالوں کے مرقعوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ میں ان کی رائے کا ترجمہ آپ کو سُناتا ہوں تاکہ باہر کے نقادوں کا خیال بھی آپ کو معلوم ہو جائے۔ وہ لکھتے ہیں "حزن و غم کے اندرونی احساسات کے اظہار کے لحاظ سے یہ تصویر دنیا کی نقاشی کی تاریخ میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ فلارنس کے باکمالوں نے خطوط و ادوار سے شاید بہتر خارجی حسن دکھایا ہو اور وینس کے استادوں نے رنگوں سے زیادہ دلکشی پیدا کی ہو۔ لیکن دونوں جماعتوں کے ماہر اجنتا کی تصویر کے نقاش کی طرح اندرونی جذبات کو اس خوبی سے نہ دکھا سکے"۔

اجنتا میں صنف لطیف کو مختلف دلفریب انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کہیں کھڑی ہوئی مورتیں نظر کو موہ لیتی ہیں۔ کہیں بیٹھی ہوئی اور کہیں لیٹی ہوئی۔ لیکن ان کو ایسے گرد و پیش اور ایسے احساسات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ اُن کی حیا اور وقار کو کوئی بٹہ نہیں لگتا۔ اکثر جگہ ماں کی ماتا یا شوہر کی والہانہ محبت کو دکھایا ہے۔ خانقاہ نشان نمبر ۱۷ میں جو خانقاہ

* نشان نمبر ۱۶ سے کتبے کے بموجب تقریباً پچیس برس بعد کی بنی ہوئی ہے بودھ کی ایک تصویر ہے جب وہ راج پاٹ چھوڑ کر

بیراگی بن گیا ہے اور خود اپنے ہی گھر پر بھیک مانگنے آتا ہے۔ بودھ کی تصویر اس کی روحانی عظمت کو دکھانے کے لئے انسانی قدو قامت سے بہت بڑی بنائی گئی ہے۔ گیروا جبہ پہنے ہوتے ہے اور ہاتھ میں کاسہ ہے چہرہ نہایت پُرسکون ہے۔ اور جو محبت اس کو کھینچ کر لائی ہے اس کا کوئی اثر نمایاں نہیں۔ سامنے ایک خوبصورت عورت اپنے بچے کو لئے کھڑی ہے۔ بچہ اور ماں دونوں بودھ کو دیکھ رہے ہیں۔ ماں والہانہ محبت سے اور بچہ استعجاب اور فطرتی اُلفت سے۔ عورت یشودھرا بودھ کی بیوی ہے اور بچہ رہولا بودھ کا بیٹا۔ قصے کے بموجب بیوی میاں سے کہتی ہے باعظمت تپی سات برس ہوئے جب رہولا پیدا ہوا تھا تو تم نے دنیوی راج پاٹ کو چھوڑا تھا آج تمہاری بادشاہت کی شان و شکوہ پہلے سے ہزار درجہ زیادہ ہے۔ اس تصویر میں یشودھرا کے کھڑے ہونے اور دیکھنے کا انداز۔ اس کا نفیس بلس اور بالوں کے جوڑے کی آرائش اور زیور کی پھبن نقاش کے تخیل اور حُسن کاری کا ایک لاجواب کارنامہ ہے۔ مسٹر بنین اور ہیول دونوں کی یہ متفقہ رائے ہے کہ "مذہبی شکوہ اور انسانی محبت کو جس موثر انداز میں اس تصویر میں پیش کیا گیا ہے دنیا کی کسی اور تصویر میں نہیں پیش کیا گیا"۔ اجنتا کی پانچویں صدی کے نقاشی کے ایک نمونہ کے متعلق ان دو مشہور نقادوں کی یہ رائے کچھ کم وقیع نہیں یہ تصویر عام طور سے ماں اور بچہ کی تصویر کے نام سے مشہور ہے۔

بودھ مت کی تعلیم میں چونکہ تمام کائنات میں ہم آہنگی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس لئے خود بودھ اپنے پہلے جنموں میں مختلف صورتوں میں دکھایا گیا ہے۔ کبھی ن کے روپ میں، کبھی ہنس کی صورت میں، کبھی ناگ کی شکل میں، لیکن ہمدردی ایثار اور خدمت کا جذبہ ہر قصے میں نمایاں ہے۔ خانقاہ نشان ۱۷ میں اس قسم کے بہت سے قصے منقوش ہیں۔ شاہی شان و شکوہ کو روحانی عظمت و جلال کے سامنے ماند کرنے کے لئے خانقاہ نشان ۱ میں مہا جنکا شہزادے کا قصہ اور خود بودھ کے راج پاٹ ترک کرنے کی تصویریں نہایت موثر ہیں موخرالذکر تو اپنے زمانے کی یعنی پانچویں صدی عیسوی کی بہترین تصویر خیال کی جاتی ہے۔ اس میں نقاش نے بودھ کو جوانی کے عالم میں دکھایا ہے۔ بلند قامت، چوڑا سینہ، کھرا ہوا بدن، کندن جیسا دمکتا ہوا رنگ۔ سب ایک پاک زندگی کی دلیل ہیں۔ مرصع تاج، موتیوں کی کنٹھی اور ہار اور جڑاؤ دستبند شاہی شان و شوکت کو نمایاں کرتے ہیں جسم کا بالائی حصہ برہنہ ہے اجنتا کی تصاویر میں شاہزادوں اور بادشاہوں کے جسم کے اوپر کے حصے کو اکثر برہنہ رکھا گیا ہے۔ حالانکہ انکے خادم اور وزرا پوری آستین کے نیچے انگرکھے پہنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دھوتی البتہ ریشمین پٹہ دار کپڑے کی ہے۔ جو غالباً چین کے کسی نساجی کے کارخانے میں تیار ہوئی ہوگی۔ ریشمین پھولدار کپڑوں کے مختلف نمونے ہم کو اجنتا کی تصویروں میں ملتے ہیں۔ جن میں بعض پھولدار ہمرو یا بوٹی والے کمخواب معلوم ہوتے ہیں۔ بعض لباسوں کے پٹہ دار کپڑوں میں بیلوں اور بطوں کی تصویریں بھی نظر آتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں نساجی صنعت دکن میں کافی ترقی کر چکی تھی۔

میں بودھ کی تصویر کا ذکر کر رہا تھا۔ ظاہری حسن اور شاہی کروفر کے علاوہ ایک باطنی محویت ہے جو اس کے پُرسکون چہرے اور جھکی ہوئی نظروں سے عیاں ہے۔ پاس ہی اسکی بیوی یشودھرا کھڑی ہے۔ اُس کے چہرے سے اُداسی ٹپکتی ہے یشودھرا کا حسن ایک ماں کا سا ہے کیونکہ رہولا پیدا ہو چکا تھا۔ رنگ سیاہ ہے بودھ مت میں کالے گورے کا کوئی امتیاز نہیں تھا سب خدا کی مخلوق تھے اور جسمانی حسن عفت اور صحت پر مبنی تھا۔ اس تصویر میں بودھ کے خدوخال آریائی ہیں۔ اور چوتھی اور پانچویں صدی کی اجنتا کی تصویروں میں آریائی نسل کے لوگ نمایاں نظر آتے ہیں بعض تو ایسے ہیں کہ آج بھی اُن کو بنارس اور الہ آباد کے پنڈتوں یا اڑیسہ اور جنوبی ہند کے برہمنوں سے ممیز کرنا مشکل ہے ان تصویروں میں ایرانی اور ستھی نسل کے لوگ بھی نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس تصویر میں جو سہیلی یشودھرا اور بودھ کے پیچھے نیلا پوری آستین کا جامہ پہنے کھڑی ہے وہ اپنے چہرے اور لباس سے صاف ایرانی نظر آتی ہے۔

اس تصویر میں شاہی تزک و احتشام دکھانے کے لئے اور ملازم بھی ہیں لیکن زیادہ پُرلطف اس مرقع کا پس منظر ہے۔ جہاں مور، بندر، شیر اور جنگل کے رہنے والے انسان بھی ایک خوشی کے عالم میں دکھائے گئے ہیں۔ خوشی کائنات میں اس بات کی ہے کہ بودھ نے ترک دُنیا کا جو فیصلہ حیات کے متعلق

حل کرنے اور ابدی مسرت حاصل کرنے کی غرض سے کیا ہے وہ درست ہے۔ اس فیصلے پر خوشی کا راگ گانے کے لئے آسمانی ساز ندے بھی اترآئے ہیں۔ نقاش نے بودھ کی اس عظیم انسان تصویر میں فقط اپنا زورِ قلم ہی نہیں دکھایا ہے بلکہ مختلف شکلوں کی ترتیب میں جو توازن لکھا ہے اس سے اس کا اعلیٰ تخیلی اور نفیس ذوق بھی عیاں ہے۔ رنگوں کی آمیزش بھی نہایت دلفریب ہے۔ پہاڑیوں کا سُرخ رنگ درختوں کے سبز پتوں سے اچھا تقابل رکھتا ہے۔ موروں کے لاجوردی پَر پتوں میں نمایاں ہیں۔ اور انسانی اجسام کے ملگجے پن کو آبدار موتیوں اور جواہر کی چمک نے بارونق کر دیا ہے۔ فاصلے کے اثر کو نمایاں کرنے کے لئے سر کے پیچھے کے منظر پر باریک باریک سیاہ نقطے لگائے ہیں اسی طرح جسم کی خوبصورتی کو دکھلانے کے لئے گہرے پچالے استعمال کئے گئے ہیں۔

چھٹی صدی عیسوی میں وکاٹکا خاندان کا اثر شمالی دکن سے جاتا رہا اور ان کی جگہ چالوکیا خاندان کے راجاؤں نے سنبھالی جن کا پایۂ تخت بادامی تھا جو اب ضلع بیجاپور میں واقع ہے۔ چالوکیا فرمانرواؤں کے عہد میں برہمنی مذہب پھر سربسبز ہوا اور انھوں نے بادامی میں بدھ مت کی طرز کے مندر بھی تراشے اور ان کی دیواروں اور چھتوں کو تصاویر سے بھی سجایا۔ ان تصاویر کے جو نمونے باقی ہیں ان میں انحطاط کے اثر نمایاں ہیں۔ ایلورہ کے برہمنی اور جینی معابد کی تصاویر میں بھی فن کا زوال پایا جاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی صدی کے آخر میں بدھ مت کے فنکاروں کو ایسی مصیبتیں پیش آئیں کہ رفتہ رفتہ وہ معدوم ہو گئے البستہ ان کے فن کا اثر سیلون میں سیگری کی تصاویر میں وسط ہند میں باگھ کے موقعوں میں، افغانستان میں بامیان کے آثار میں اور وسط ایشیا کے ویران معابد کی تصاویر میں ملتا ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں بدھ مت اور نقاشی کا فن دونوں ہندوستان سے بالکل غائب ہو گئے۔ اور تیرھویں چودھویں صدی کی جو گجراتی قلم کی تصویریں ہمیں کتابوں میں نظر آتی ہیں وہ بلحاظ فن اجنتا کی نقاشی سے بالکل مختلف ہیں۔

اجنتا کی تصاویر میں ہم کو ہندوستان کی مخلوط آبادی اور اقتصادی زندگی کے سچے مناظر دیتی ہیں۔ نقاش نے حسن کاری کے جذبے کے تحت تغیر و تبدل ضرور کیا ہے پھر بھی مناظر کی عام ہیئت قائم ہے۔ مثلاً سانڈوں کی لڑائی۔ مینڈھوں کی لڑائی۔ سانپ کا تماشا۔ پھلوں کے خوشے۔ پھولوں کی بیلیں۔ گھوڑوں کے نمونے۔ اجنبی لوگوں کے خاص خدوخال اور لباس خصوصاً وسط ایشیا والوں کی مچھی ڈاڑھیاں، اچکے ہوئے گلے۔ سمور کے کناروں کی ٹوپیاں، پٹہ دار پاتابے اور لمبے لمبے خفتان۔ بودھ مت کی تعلیم انسانیت سے مملو نظر آتی ہے۔ اور زندگی کا مقصد بجائے یاس و حرماں کے ابدی سرور و مسرت دکھایا گیا ہے لیکن اس سرور و مسرت میں کوئی حیوانی رجحان نہیں جیسا کہ مصر اور قدیم اطالوی تصاویر میں نمایاں طور سے پایا جاتا ہے۔

فن کی ابتدا دکن میں ہوئی اور یہیں یہ پروان چڑھا۔ تیسری صدی عیسوی کے آخر یا چوتھی صدی کے شروع میں یہ آریائی تہذیب و تمدن کے زیر اثر آیا جس سے ذہنی اور فنی معیار اور بلند ہو گئے۔ ممکن ہے کہ یونانی اور مغربی ایشیا کے فنکاروں کے تخیل نے بھی اجنتا کی نقاشی کو عروج پر پہنچنے میں مدد دی ہو۔ لیکن جب بیرونی اثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے تو مماثلت کی نسبت مغایرت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اور یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں رہتا کہ یہ فن ہندی ہے اور موجودہ آثار کی بنا پر اس کی ابتدا دکن میں ہوئی۔

امتدادِ زمانہ اور سیاسی اور مذہبی جور و جفا کی وجہ سے اجنتا کی نقاشی کے انمول خزانے کنج خمول میں پڑ گئے تھے اور تصویروں کی حالت ایسی خستہ ہو گئی تھی کہ اگر سرکار عالی کی فیاضانہ پالیسی نہ ہوتی تو وہ تباہ ہو جاتیں۔ آئندہ نسلیں جب اپنے اس قومی ورثہ پر فخر کریں گی تو حضرت بندگانِ عالی اور ان کی حکومت کی بے لاگ توجہ اور خاص شغف کو بھی ضرور سراہیں گی۔

(بہ اجازت نشرگاہ حیدرآباد۔ دکن)

پائل

آتشیں نغموں کا شاعر سلام آپ کے لئے گیتوں کا تحفہ لایا ہے
گیت جو آگ سے زیادہ گرم اور شہد سے زیادہ میٹھے ہیں۔
پائل آرٹ پیپر پر چھپی ہے۔ مجلد اور نظر فریب جلدپوش سے آراستہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے (۱۲/ ۱ر)
ساقی بک ڈپو۔ دہلی سے طلب فرمائیے!

سید ذوالفقار علی بخاری

حدیثِ بخاری

رنگِ محفل کو سمجھنے کا مجھے ہوش نہیں
کونسا رنگ غمِ دل میں سیہ پوش نہیں

اور کون آئیگا آغوش میں. دل سا محبوب
ترے آغوش میں اے صاحبِ آغوش نہیں

پردے اُٹھتے ہیں رُخِ یار سے سرمستی میں
میرے ساغر میں مگر بادۂ سرجوش نہیں

کسکو یارا کہ ترے حُسن کا ادراک کرے
تیری محفل میں وہی آئے جنہیں ہوش نہیں

وہ بہاراں ہی نہیں جسمیں ہر اک تشنۂ شوق
جام در دست نہیں میکدہ بردوش نہیں

اے خوشا عشق کہ سرمستِ مئے حُسن سے ہی
ہوشمندی کا بُرا ہو کہ بلانوش نہیں

نقشِ امروز بھی ہی صورتِ فردا بھی ہے
زندگی جس سے عبارت ہے وہی دوش نہیں

تیرے الطافِ گذشتہ مجھے یاد آتے ہیں
غم فراموش تو ہوں لطف فراموش نہیں

شورشِ عقل ہی برہم کن جمعیتِ دل
ہمہ تن صرف ہی تو میں ہمہ تن گوش نہیں

دل کی ہر بات خموشی میں ہوا کرتی ہی
وائے بر صاحبِ گفتار کہ خاموش نہیں

ناہید عالم

"کِت گئے ہو کھیون ہار!"

پھر یہ کہتے ہوئے بھی تو لاج آتی تھی۔ جانتی تھی کہ بھابی تو مُنہ اُٹھا کر کہہ دیں گی کہ "کتنی کلجگ ہے کلجگ، جو بھی ہو کم ہے"۔ وہ بھلا کاہے کو دیکھیں گی کہ اُن کا لاڈلہ خود اس حد تک کمینگی پہ اُتر آیا ہے کہ مجھے تو اُس کی شکل سے بھی گھن آنے لگی ہے، کجا یہ کہ میں اُسے اپنا شوہر تسلیم کروں، اور بھیّا ٹھہرے بالکل ہی کورے، اُن کی بلا سے اگر بہن کی زندگی اجیرن ہو جائے گی، انہیں تو کتابیں مل جائیں پڑھنے کو، موٹی موٹی، جانے کہاں سے لے آتے ہیں، میرا تو بس دیکھ کر ہی جی اُلٹنے لگتا ہے، اور کمرے میں جاؤ تو مارے بدبوؤں کے سر پھٹ جائے۔ سبراب، گندھک، ہائیڈروجن، نائیٹروجن، اور جانے کیا الا ملا مرتبانوں میں بند اور پیالیوں پیالوں میں گھلی گھلائی پڑی رہتی ہیں۔ ایک دن تو تیزاب کی پیالی بے خبری میں اُلٹ کر اُن کے پاؤں پہ جا پڑی، اور وہ ایک دردناک چیخ مار کے جو پیچھے ہٹے ہیں تو میرا جی چاہا کہ ان کی لیباٹری میں موٹا سا تالا لگا کر چابی کہیں گم کر دوں، ایسی جگہ کہ پھر ملنا بھی دشوار ہو جائے، انہیں کتنی تکلیف اُٹھانا پڑی تھی، تیزاب جھلستا ہوا گوشت کے اندر تک چلا گیا تھا۔ لیکن وہ تو اُسی وقت ڈریسنگ کروا کے پھر جا ڈٹے وہیں۔ اور میرا دل تھا کہ کتنی ہی دیر تک کچا کچا سا رہا، خیر میں تو بہن ہوں، اُنکی تکلیف پر میں ہی دُکھی نہ ہوتی تو کون ہوگا۔ اور واقعات چاہے میری محبت کے آگے پردہ ڈالدیں، مگر اُس کے آگے دیوار تو نہیں کھینچ سکتے، بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ بھیّا جانتے ہوئے بھی مجھے دُکھوں کے غار میں دھکیل دیتے، شاید تب بھی میں انہیں معاف کر دیتی، اور شاید کیا، اس سے پہلے بھی تو میں انہیں اُتنا ہی پیار کرتی رہی ہوں، اُن کے اتنے بڑے ظلم کے باوجود، میں یہ نہیں کہتی کہ انہوں نے دانستہ ایسا کیا، لیکن ایسا ہوا ضرور، اور بھیّا ہی کی بدولت، تاہم اس کے بعد جب انہوں نے مجھے اُسی لہجے میں پکارا "صغرا سُنو تو — یہ دیکھو، میں تمہاری تصویر کے لئے کتنا اچھا فریم لایا ہوں"۔ تو مجھے محسوس ہوا گویا کہیں دُور سے پرے کوئی قدسی نغمہ الاپا جا رہا ہو، اور میں نے اُن کے گلے میں باہیں ڈالدیں۔ بھیّا، میرے بھیّا۔ اُس وقت اُنکی آنکھوں میں جانے کہاں سے اِتنی محبّت اُمڈ آئی تھی، کہ میں یہ سوچنے پہ مجبور ہو گئی کہ بھیّا کے بغیر یہ زندگی کتنی پھیکی ہوتی، کتنی بے کیف! لیکن جانے کیوں، اِس کے بعد سے، میرے دل میں جو ہر گھڑی پھلجھڑیاں سی چھوٹتی رہتی تھیں، وہ خاموش ہو گئیں، نہ کبھی کھلیں، نہ بکھریں، بس بند بند سی، جیسے سِل گئی ہوں، اور سچ تو یہ ہے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو جیسے پی رہی ہوں، انہیں کہیں نہ کہیں تو جانا تھا، دل ہی میں چلے گئے اور کہاں جاتے، رُسوائی کا ڈر بھی تو کم نہیں ہوتا، اور رسوائی کے بعد تباہی — یوں تباہ ہونے کو میں رہی کب، بھابی تو جانے کب کی دشمنی نکال رہی تھیں، میں تو کہتی ہوں، خدا کسی کا محتاج ہی نہ کرے، سو عیب آ جاتے ہیں، لاکھوں کیڑے پڑ جاتے ہیں، لیکن میں تو اُن کے ہاں تھی چند دن کے لئے، بھیّا تو بس مہینے ڈیڑھ مہینے بعد میری شادی کر دینے کو کہہ رہے تھے، پر خدا جانے یہ عفار کہاں سے آن نازل ہوا، جی کا جنجال بن گیا، پھر خواہ مخواہ میرے پاس گھس گھس کے بیٹھنا، میں تو منہ بھی نہ لگاتی تھی، بھابی کے کہنے سے کبھی بات کر لی تو کر لی، ورنہ دُور کی صاحب سلامت — لیکن کبھی میں نے خوبصورت سا لباس پہن لیا تو عجیب پاگلوں کی طرح مجھے گھُورے جا رہا ہے، بال سنوار لئے تو مصیبت میں جان آ گئی۔ میں نے تنگ آ کر اپنا حال ہی ڈالدیا، نہ کبھی لباس تبدیل کرتی اور نہ بال ہی سنوارتی، اب بھابی کے طعنے سہنے تھے کہ کھائے لیتے تھے، کیا کروں میں بے بس ہو گئی، رفتہ رفتہ وہ ہمارے تمام گھر پہ چھا گیا، بھابی کا لاڈلہ بھتیا تھا۔ اسکی ہر بات مانی جانے لگی، چاہے بالکل بکواس ہی ہو۔ خیر میری بلا سے میں سوچتی، لیکن یہ تو مجھے جب معلوم ہوا کہ یہ سب کس لئے ہے جب اُس نے میرے اور بھیّا کے سامنے افضال کی آوارگی کے قصّے دُہرانے شروع کئے، جان جان کر، نکال نکال کر، بھابی بھی اُس کا ساتھ دیتیں، اور بھیّا اسٹول پہ بیٹھے لمبی لمبی لوریں

ملکیوں میں کبھی کوئی سفید، کبھی زرد، کبھی میلا سا سفوف حل کرتے ہوئے سب کچھ سنا کرتے، پھر ایک دن تو انہوں نے بھی جھنجھلا کر کہہ ہی دیا کہ "پھر گولی مارو کمبخت کے، ہماری بہن اتنی سستی نہیں ہے کہ ہر ایرا غیرا کے حوالے کر دیں"۔ اور بھابی کے ہونٹ پھڑک اٹھے، جیسے مسرت کے دبے ہوئے خزانے، ہونٹ پھاڑ کے باہر نکل آنا چاہتے ہوں، لیکن میرا جی چاہا کہ بھیا سے یہ ملکیاں چھین کر زمین پر ٹپک دوں، پیالیاں اوندھا دوں، مرتبان لڑھکا دوں اور چلا چلا کر کہوں کہ آپ کے تجربے صرف ان ملکیوں تک محدود ہیں، آپ کی عقل اِن پیالیوں میں گھُلی پڑی ہے، اور آپکی تمام قوتِ بینائی اِن مرتبانوں میں بند ہے۔ ذرا باہر آئیے اور دیکھئے کہ بھابی کیا کر رہی ہیں، غفار کیا چاہتا ہے ۔۔۔؟ افضال آوارہ نہیں ۔۔۔ آپکی بہن بے حد حسّی ہے ۔۔۔ لیکن یہ آواز میرے دل کے کسی نامعلوم گوشے سے اٹھی تھی، وہیں دفن ہو کر رہ گئی۔

بھیا کو بات کرنے کا سلیقہ کبھی نہیں آ سکتا، یہ میں نے صرف اُس روز محسوس کیا جب انہوں نے غفار اور بھابی کی موجودگی میں افضال سے یہ کہہ دیا کہ صاحب "ہم آپ سے اپنی بہن کی شادی نہیں کر سکتے، کیونکہ آپ کے متعلق بڑی بُری بُری افواہیں سننے میں آتی ہیں ۔۔۔"

اور افضال ایک دم سُرخ ہو گیا "میں بھی تو سنوں یوسف بھائی وہ افواہیں ۔۔۔" اُس نے کہا۔

"یہی کہ آپ بڑے آوارہ ہیں، اور جب کبھی یہاں آتے ہیں، صغریٰ کی سہیلیوں سے ۔۔۔"

"یہ میں پہلے بھی سُن چُکا ہوں یوسف بھائی، کچھ اور ۔۔۔"

"اب میں نے لکھو کے تو لکھا نہیں، اسی قسم کی تھیں کچھ باتیں ۔۔۔" یہ کہتے کہتے وہ دروازے سے باہر ہو گئے، افضال بھی جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا،

"میں تمہارا بہت ممنون ہوں دوست ۔۔۔" اُس نے غفار سے مخاطب ہو کر کہا۔ "لیکن تم صغریٰ کو مجھ سے اِس کے علاوہ کسی اور طریقے سے بھی چھین سکتے تھے، تم نے غلط راہ اختیار کی ہے بہر حال اِسے نباہے جاؤ، میں بھی تمہاری مدد کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے بگولے کی طرح غائب ہو گیا۔

اِس کے بعد میں یہ دیکھ کر واقعی پریشان ہو گئی، کہ وہ پچ مچ آوارہ ہو گیا ہے۔ گلشن ہوٹل۔ وہ بدمعاشی اور عیاشی کا اڈا اُس کے شب و روز وہیں گذرنے لگے۔ وہ ہر خوبصورت، مگر آوارہ لڑکی سے رومان لڑانے میں بے حد ماہر ہو گیا، اس کی صحت گرنے لگی، دن بدن، مگر اُس نے کوئی پروا نہ کی، سگریٹ پیتے پیتے وہ ہلکان ہو جاتا، شراب سے اُسے انتہائی نفرت تھی۔ مگر اُس نے پی اور جی بھر کے پی، اُس کے رُخساروں کی ہڈیاں اُبھر آئیں، رنگ جل کر سانولا ہو گیا، آنکھیں ۔۔۔ وہ خوبصورت اور کشش انگیز آنکھیں جن میں خوشی کی ہلکی ہلکی دلفریب پریاں مسلسل ۲۶ برس سے رقص کر رہی تھیں، اب غم کے بدصورت اور مکروہ دیو کا ایک ایسا تاریک اور ہیبت ناک غار بن گئی تھیں، جس پر ہر وقت ایک بھیانک اور پُر اسرار خاموشی مسلط رہتی، کبھی کبھی انارکلی یا لارنس گارڈن میں اُس سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو وہ نظریں ملائے بغیر ایک طرف کو چل دیتا۔ ہاں جب کبھی میں بھی اکیلی ہوتی، اور وہ تنہا، تو وہ دُور کھڑا مجھے تکا کرتا، لیکن نہ جانے کیسی عجیب سی نگاہوں سے، گویا وہ مجھے پہچانتا تو ہو، مگر جانتا نہ ہو!

مجھ سے اُس کی یہ تباہی نہ دیکھی جاتی، اور میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی بڑھ جاتی ۔۔۔

اُدھر بھابی تھیں کہ بھیا سے یہ کہتے ہوئے ڈرتی تھیں کہ وہ میری شادی غفار سے کر دیں، مبادا وہ خیال کریں کہ انہوں نے افضال کو اسی لئے تو دھتا نہیں بتائی، مگر اب کیا تھا وہ ڈنکے کی چوٹ آوارہ تھا، بھیا بھی جانتے تھے، بھابی بھی۔ سب ہی کو معلوم تھا۔ لیکن وہ تھیں موقعے کی تلاش میں۔ اور انہیں اس سے اچھا موقعہ کیا مل سکتا تھا کہ ۔۔۔

ایک شام وہ مجھے مال پر، ایک دکان میں مل گیا۔ دُبلا پتلا، گلے میں جھولتی ہوئی ڈھیلی ڈھالی ٹائی، پریشان بال اور شکن آلود پتلون ۔ میں نے حیرت سے دیکھا، پھر دیکھا، اور دیکھتی ہی رہ گئی۔

"یہ کیا ہو گیا تمہیں؟" آخر کار میں پوچھے بغیر نہ رہ سکی!

"دِق!" میرا دل دھک سے رہ گیا، ڈیڑھ سوا سال کے عرصے میں اتنی نمایاں تبدیلی، آنکھیں دھنستے دھنستے اپنی گہرائیوں تک جا پہنچی تھیں۔

"ارے ۔۔۔ تم بھی پریشان ہو گئیں؟" وہ ہنس دیا، سمٹتی ہوئی زردی کھِنڈ گئی، آنکھوں میں آنسو تھے۔

"مگر یقین کرو، میں نہیں مر سکتا، کبھی نہیں، نہیں، کبھی غلطی سے بھی نہیں، ملک الموت کبھی غلطی نہیں کرتا، وہ تو — کاش میں — اے کاش!"

اُس کی آواز گھُٹ گئی، جانے وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔

"مگر یہ سب ہوا کیسے؟ تم تو — تیر تھے بالکل!"

"میں بھولنا چاہتا تھا، مگر نہ بھول سکا" اُس نے زندگی میں پہلی بار میرے سامنے زبان سے اقرار کیا۔

"اقرار —؟"

"اب بھی اقرار نہ کر سکا تو —" اُس کی نظریں اپنے پچکے ہوئے بازوؤں پر سے ہوتی ہوئی، سوکھے ہوئے بدرونق سینے پر جم گئیں۔

"خدا کے لئے یہ تو نہ کہو افضال —" میری آنکھیں چھلک آئیں۔

"آنسو —؟ اوہ دق — مگر لو اب میں جاتا ہوں، غفار آرہا ہے"

وہ سہم کر سامنے کی طرف دیکھنے لگا، غفار ایک سانولی سی لڑکی کے شانے پر ہاتھ رکھے دروازے میں کھڑا، بامعنی انداز میں مسکرا رہا تھا۔

گھر آئی تو بھابی کا منہ سوجا ہوا تھا، خفا سی، وہ برآمدے میں بیٹھی بھیّا کا سوئٹر بُن رہی تھیں، میں بھی پاس ہی جا بیٹھی "لائیے بھابی اب میں بُنوں، آپ نے تو ڈھیروں بُن ڈالا"

"لو —" وہ سلائیاں میری گود میں پٹک کر اندر چلی گئیں، اور میں یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوئی جا رہی تھی، کہ جانے غفار نے نمک مرچ لگا کے بھابی سے کیا کہہ دیا ہوگا، کہ اتنے میں وہ تنہا مسکراتا، میرے مقابل کی کرسی پہ آ بیٹھا، میں چپ تھی —

"افضال یاد آرہا ہے؟" اپنی طرف سے بڑا مذاق کیا تھا کوڑھ مغز نے۔

"نہیں تو تم!" میں یونہی بیزار بیٹھی تھی۔

"اجی ہم کس قابل ہیں —" وہ کھسیا گیا "خدا ٹی بی وارڈ کو آباد رکھے"

اور میرا جی چاہا کہ سلائیاں ولائیاں دے ماروں اس کے منہ پہ، ذلیل کہیں کا، کمینہ!

رات کو بھیّا اور بھابی کی دیر تک باتیں ہوتی رہیں، کبھی تو کوئی جملہ بالکل صاف سُنائی دے جاتا، اُن کے اور میرے کمرے کے درمیان دروازہ تھا نا؟

"— ہاں — یوں تو، دور پھر کسی کی زبان پکڑی کب جاتی ہے، یوں بھی لوگ کسی کی پاکدامنی کو دیکھکر تو کوئی بات نہیں کہتے، وہ تو بے دھڑلک بک دیتے ہیں"

"ایں —" میں سوچ میں پڑ گئی۔

"یہ بھی نہ سہی، آپ یہ تو سوچئے کہ ایک مدقوق مردے میں جھول رکھنے والی لڑکی کے لئے خود ہمارے دل میں کیا خیالات آسکتے ہیں —!"

"اوہ —!"

اور بھیّا سُنتے رہے، کاٹھ کے اُلّو،

"تو پھر میں کیا کروں؟"

"اپنے گھر کا کر دو اسے —"

"لیکن مشکل تو یہ ہے کہ کوئی ڈھنگ کا لڑکا —"

"کیوں غفار کیا بُرا ہے۔ اُسکے تو —"

اور میں تلملا اُٹھی، جیسے میری انتہائی پاکباری کے باوجود کسی نے کوئی موٹی سی گالی دے کر غلیظ سا الزام لگا دیا ہو۔

"یہ سب ہی میں نے سوچا تھا کہ میں بھیّا سے کہونگی "مگر میں غفار سے شادی نہ کرونگی، مجھے چلتا پھرتا کوئی چمار بھی منظور ہے، لیکن غفار —"

مگر کیسے کہوں؟ کئی دن اسی کشمکش میں گذر گئے، اور پھر مجھے خبر ملی کہ افضال مر گیا ہے۔ میری اندھیری دُنیا میں ٹمٹماتا ہوا مدھم سا دیا بھی بجھ گیا" زندگی کتنی بے کیف ہے، موت کتنی سکون بخش" میں ہجوم غم سے گھبرا کے ہر آنے والی صبح، اور جانے والی رات کو اسی پہ غور کیا کرتی۔

"چیں، چیں، چرّرر، چرّرر" جھنجھلا دینے والی آوازیں چلّائے جا رہے ہیں، نزدیک ہی پانی میں چھپے ہوئے مینڈک ہولے ہولے یوں ٹرّا رہے ہیں گویا وہ اپنی دانست میں بستر پہ کروٹیں بدلنے والی بے چین روحوں کے لئے مستقل موسیقی ہیں، دُور — کسی درخت پہ بیٹھی ہوئی برسات کی چڑیا بول رہی ہے، فضا ویران ہے، سیاہ، معلوم نہیں ہو پاتا کہ بارش،

ہو چکی ہے ما ہونے والی ہے، اور پھر آج موسم کتنا مہلک ہے، ہوا نکلی آج ہی جیسے آکر آئی ہی راتوں میں میرے رگوں کے بیچ ... خود کو ... ہوں ... سر ... ادا اس اور عجیب تھکی تھکی سی راتوں ... بارش ... ہو ... ٹوٹے ہوں میں ... روزوں میں ... کی ... روز ... روشنی کو دیکھتی ہوں، ... سے کی ... بہت ... ہوتی پاس ہی آگئی ہوئی ... گئی ... سے ... ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا میرے دماغ میں ... سلگتے رہنے والے انگاروں ... سے ... جانے کو جیسے پانی ڈال دیا ہے، اور شان ——— آن، میری کھوکھلی کھوپڑی میں سناٹے سے گونج اٹھے ہیں، سناٹے، پیلی پیلی مردہ سی، روتی ہوئی سی روشنی، مرجھائی ہوئی نم آلود گھاس، برسات۔ جیسے میرے تمام احساسات گڈمڈ ہو جاتے ہیں، بھولی بسری یادیں ابھرنے لگتی ہیں، میرے دماغ ... لوں ... رینگنے لگتی ہیں جیسے کسی سڑتے ہوئے ناسور میں ترمراتے ہوئے کیڑوں پہ کوئی تیزابی دوا ڈال دی جائے، اور وہ تڑپ تڑپ کے سر اٹھانے لگیں۔ بچنے کے لئے، بھاگنے کے لئے! اور پھر میری تو تمام ہستی ایک ناسور میں تبدیل ہو چکی ہے، ایک ایسا ناسور جو اندر ہی اندر پکتا جاتا ہے، جس میں ... رستا ہی کہاں ہے ——— مگر اب اس کی دکھن اور جلن ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔ میں چلا پڑوں گی۔ اف! اس مدھ بھری نشیلی رات اور خوابناک صبح کا دبیز پردہ خود بخود میری آنکھوں کے آگے آ جاتا ہے میں اسے جھٹک دیتی ہوں، ہٹا دیتی ہوں، مگر وہ نہیں ہٹتا — نہیں ہٹتا!

"... " میں نے کلبلا کے روئی ... ڈھکا لی۔ "رات کو تو سونے دیا کرو!" اور اس سے پہلے ... کے ساتھ کے پلنگ پہ سوتی ہوئی آپا جاگ جائیں، ایک ... سا سایہ برآمدے میں غائب ہو گیا، وہ رات انتہائی سیاہ تھی، بالکل کاجل ایسی کالی کچھ تو یوں ہی چاند کو ڈوبے ہوئے تین چار روز ہو گئے تھے، اور کچھ اس لئے کہ بھادوں کا مہینہ تھا اور آسمان پہ کالے کالے بادل محیط، اور آنکھ مچولی کھیلنے یا چور کو پکڑنے کے یہی تین تو موقعے ہیں، شادی، ... آرٹ، اور ساون بھادوں کی وہ بھیگی بھیگی سیاہ راتیں، جب کالی گھٹا ترسنے کو تیار کھڑی ہو۔

ہاں تو ——— میں نے چور کو عین موقعے پہ چوری کرتے پکڑ لیا، اور چور بھی کیسا ڈھیٹ کہ کسی طرح راہ پر ہی نہ آتا تھا، چوری کرتا تھا اور کرکے مکر جاتا، میں نے نرمی سے پوچھا "افضل تم میرے ہو نا؟" مگر وہ لاپروائی سے کھڑکی میں کھڑا سگریٹ کا دھواں اڑاتا رہا۔ میں نے التجا کی "کاش تم میرے ہوتے!" مگر وہ کرسی پہ آگے پیچھے جھولتے ہوئے مدسنور ڈوما کا ایک ناول پڑھتا رہا، میری طرف دیکھا ہی نہیں، میں زبردستی سر اتر آئی "تم مانو یا نہ مانو، مگر تم یقیناً میرے ہو۔"

"ثبوت ——— ؟" اس نے پنسل پر بلیڈ رکھتے ہوئے رائٹنگ ٹیبل پہ جھک کر کہا۔

"میں تمہاری ہوں" میں نے ہار کر سچ بات کہہ دی۔

"کون کہتا ہے؟" ہٹ دھرمی سے بولا۔

"اچھا، چلو ... دوں" میں اڑ گئی۔

"ہٹو!" مگر اس نے میرا دل توڑ دیا "میں تمہیں منہ بھی نہیں لگاتا" اور پنسل کی نوک باریک کرنے لگا۔

پر اب ——— اب میں نے خود اسے پکڑ لیا تھا، چور ——— اگلے روز سویرے ہی میں نے اسے بے چینی سے باغ میں ٹہلتے ہوئے جا پکڑا ———

"کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے" میں نے اس کی پیشانی پہ آئے ہوئے بال سمیٹ لئے۔

"دق ———" اس نے میری آنکھوں میں گھورا، "مگر یہ ——— یہ" وہ گھبرا گیا،

"کچھ بھی تو نہیں" انتہائی معصومیت سے میں نے اس کی پیشانی پہ اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

"ظالم ——— !" وہ تڑپا۔

"مگر مظلوم تو تم بھی نہیں۔ وہ کل رات! بھول گئے کیا؟"

"ارے ———!" وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

"جی ———" میں نے طعنہ دیا۔

"بکو نہیں!" وہ مسکرانے لگا، اس کے کھلے بازو ہوا میں لپکے، اور میری گردن کے گرد اس کی گرفت سخت ہو گئی۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیئے! (منیجر)

علی منظور

آمیزۂ ادب و سیاست

سُنتا ہوں کہ گزشتہ سے پیوستہ صدی والے بزرگ انگریزوں کے اقبال کی قسم کھانے لگے تھے، یہ روایت جھوٹی ہے تو دروغ برگردن راوی ـــــ لیکن ان رفتگانِ مستقبل نگر کے نظریہ کی تردید آج بھی نہیں کی جا سکتی، جرچل، آئمرے، ساٹمن، کرپس تو خیر کار فرما جیتے جاگتے لوگ ہیں وفادار ہندوستان ان کو کیونکر بھول سکتا ہے؟ بائرن اور اسی قسم کے بیسیوں مُردوں کی چلبلی روحیں بھارت ماتا کے سپوتوں کا "آتا جاتا دم" بنی ہوئی ہیں۔ ہندی ادبیات ناقص ہیں اگر آسکر وائلڈ اور کولرج وغیرہ کے حوالے سپرد قلم نہ کئے جائیں۔ مگر میری نگاہِ حقیقت شناس ایسے "ناپسندیدہ محبیوں" سے شاعرانہ استفادہ کرنا غیر ضروری سمجھتی ہے کسی ایک وجہ سے نہیں بلکہ بہمہ وجوہ۔

ڈاکٹر لیس۔اے لطیف، غالب کو یورپین شعراء کے جرگے میں ذلیل کر سکتے ہیں۔ لیکن غالب کے وطن کو یورپ نہیں بنا سکتے[1] فقط معاشرہ ہی کیا ہم ہندوستانی اپنی ہر بات کو یورپ والوں سے جُدا دیکھنا چاہتے ہیں یہی انسانی فطرت کا تقاضا ہے ـــــ انگریزوں کا مسحور و مرعوب ہندوستانی اِس کُلیہ کا

استثنا

بن کر بھی "شاذ" ہی کہلائے گا، "شاذ" کسی صُورت لائقِ التفات نہیں۔

دیکھئے! ایسا سرگشتہ خمارِ رسوم فرنگ، ہندوستانی اُردو زبان میں انگریزوں کی نقل کس طرح اُتارتا ہے ؎

بے کراں رات کے سناٹے میں
تیرے بستر پہ مری جان کبھی
بے کراں رات کے سناٹے میں
جذبۂ شوق سے ہو جاتے ہیں اعضا مدہوش
اور لذت کی گرانباری سے
ذہن بن جاتا ہے دلدل کسی ویرانے کی
اور کہیں اس کے قریب
نیند، آغاز زمستاں کے پرندے کی طرح
خوف دل میں کسی موہوم شکاری کا لئے
اپنے پر تولتی ہے چیختی ہے
بے کراں رات کے سناٹے میں
تیرے بستر پہ مری جان کبھی
آرزوئیں مرے سینے کے کہستانوں میں
ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی ہیں
ایک لمحے کے لئے دل میں خیال آتا ہے
تو مری جان نہیں
بلکہ ساحل کے کسی شہر کی دوشیزہ ہے
اور مرے ملک کے دشمن کا سپاہی ہوں میں
ایک مدت سے جسے ایسی کوئی شب نہ ملی
کہ ذرا روح کو اپنی وہ سُبک بار کرے
بے پناہ عیش کے ہیجان کا ارمان لئے
اپنے دستے سے کئی روز سے مفرور ہوں میں
یہ مرے دل میں خیال آتا ہے
تیرے بستر پہ مری جان کبھی
بے کراں رات کے سناٹے میں"[2]

ان نقالانِ گرامایہ کا خیال ہے کہ ہم جنٹلمین اُردو کی بے مائگی پر رحم کر کے یورپ کی ادبی دولت ادھر منتقل کر رہے ہیں ان کی یہ حرکت خود غیر شاعرانہ ہے، قیامت تک یہ اسالیب و تراکیب وطن پسند نہیں ہو سکتے ـــــ ہر ملک کے قدرتی شاعر کی رہنما اس کی اپنی فطرت ہے، وہ اپنی قوم و وطن کے مُوافق مزاج انداز میں ماحول سے متاثر ہو کر اپنے محسوسات و مدرکات کا اظہار کرتا ہے ـــــ ملاحظہ فرمائیے! فردوسی نے موضوع کے لحاظ

[1] انگریز ہم میں رہکر بھی بہمہ وجوہ ہم سے الگ تھلگ رہے یا نہیں۔

[2] ماورا صفحہ ۱۱۲، ۱۱۱

سے زبان وبیان کے کیسے کیسے نمونے دکھائے ہیں، رحم کی درخواست کا یہ سادہ ڈھب کتنا اثر آفریں ہے ؎

میازار مورے کہ دانہ کش است
کہ جاں دارد وجان شیریں خوش است

دعوت الی الخیر کا یہ جمیل انداز بھی دامن کش دل ہے ؎

فریدون فرخ فرشتہ نبود ٭ زعود و ز عنبر سرشتہ نبود
ز داد و دہش یافت ایں نیکوئی ٭ تو داد و دہش کن فریدوں توئی

پہلے شعر میں جان کی ہر دلعزیزی کی طرف اشارہ کیا جو اظہر من الشمس ہے، پھر کہہ دیا۔
چیونٹی کو بھی مت ستاؤ۔

یہ مضمون اسی طرح ادا کرنے کا تھا، اشعار مابعد کی بلاغت پوری طرح ظاہر نہیں کی جاسکتی، سرسری طور پر کچھ عرض کرتا ہوں :-

کسی بادشاہ یا بادشاہزادہ کی طرف روئے سخن نہیں، عام مخاطبہ ہے لیکن نام لیا جارہا ہے اعظم ترین سلاطین فرس کا۔ ان اشعار میں کتنی تڑپ رہی ہے ؟! وہی صنادید پرستی کی روح کو کس خوبی طرح کچلا ہے ؟!

تو داد و دہش کن فریدوں توئی

راقم سطور بھی فریدوں ہے اور قاری سطور بھی فریدوں بشرطیکہ داد و دہش کن والی نصیحت پر عمل کیا جارہا ہو۔ فرمائیے! یہ سادگی و پرکاری کے اسالیب ایک ہزار برس قبل فردوسی کو کس نے سکھائے تھے ؟

غالب، انگریزی داں نہیں تھے، ان کے زمانے میں رسائل و تراجم کی یہ کثرت کہاں تھی، لکھنؤ کے شاہی خاندان کی طرح انہوں نے انگلستان کا ناکام سفر بھی نہیں کیا تھا۔ المختصر ہندوستان میں جیئے ہندوستان میں مرے، باوجود اس محدود ماحول کے مرزا صاحب ایک مقام پر الگزینڈر پوپ نظر آتے ہیں :-

Thus let me live, unseen, unknown;
Thus unlamented let me die;
Steal from the world, and not a stone
Tell where I lie.

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

غور کرنے کی جگہ ہے کہ *Ode on Solitude* والی تلخ کامی غالب کے ان شعروں میں کس طرح پیدا ہوگئی ؟۔ بیچ رہا ہے تو پوپ اور غالب بھی ہم آہنگ ہو جائیں۔ مگر عرض کرتا ہوں کہ :

ہر ملک کے قدرتی شاعر کی رہنما اس کی اپنی فطرت ہے۔ مغربی "استعدادات عالیہ" کے ماہرین اپنی افتاد طبع سے مجبور ہو کر یورپین شعرا و ادبا کا قدم قدم پر سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ ڈھونڈیں لیکن ابناء وطن کو بھی اپنی طرح سرتا سر یورپ کا محتاج نہ بنا دیں۔ حقیقی شاعر تو ان کو پوچھتے نہیں البتہ مصنوعی سخنوروں کی موجودہ کثرت ان ہی کی رہین منت ہے ـــــ جن لوگوں کو شاعرانہ ذوق نصیب نہیں ان کا پیکر تقسیم منجملہ عجائب المخلوقات نظر آتا ہے۔ آنکھیں چاسر کی کان شیکسپیر کے گردن براوننگ کی بھویں ملٹن کی، پلکیں کیٹس کی۔ سوئنبرن ہونٹ ہوئیے باوجود سر پیر

کلاہ باپا رخ

یہ اعتراف ہی غالب کے ہم وطن ہونے کا عرض عصر حاضر کے ہر گندم نما جو فروش کا طغرا امتیاز ہے۔ ایجاد بندہ اگرچہ گندہ۔ نہ نکھے خیالات نیچرل نہ انکی زبان نیچرل، طرفہ تماشا دیکھئے کہ یہ مشرقیان مغرب زدہ اپنے آپ کو مجددان شعر و ادب کے سلسلے کی کڑیاں سمجھتے ہیں۔ نقال در مجدد ؟

برعکس نہند نام زنگی کافور

انگریز ہوں یا اور کوئی قوم، میں کسی کو بھی نگاہ حسد سے نہیں دیکھتا، لیکن اپنی قومی اور وطنی خصوصیات کو زندہ و تابندہ دیکھنا چاہتا ہوں ـــ چونکہ اپنی فطرت کو اپنا رہنما مانتا ہوں اس لئے رابرٹ برنز اور پروفیسر براؤن دونوں سے بے نیاز۔ کاش یہ نام میرے قلم کی زبان پر نہ آتے، خیر پروا نہیں، ورنہ تو یہ بند نہیں ہوا۔

سراج حسین نقوی

آپ سے ملیئے

ایک تو حضرت یونہی کڑوا کریلا تھے لیکن جب سے حکومت نے ایک پرائیویٹ سکریٹری کی تختی بھی متصل کمرہ میں لٹکانے کی منظوری دے دی ہے اس پر نیم بھی چڑھ گیا ہے۔ میں نے صاحب کو ٹیلیفون کیا کہ کوئی وقت بتایئے شرف نیاز حاصل کرنے کا۔ جواب ملا "ہمارے پرائیویٹ سکریٹری کو ٹیلیفون کرو، وہ تمہیں مناسب وقت دے دیگا۔ مجھے سوجھی شرارت، عرض کیا جناب یہ تو بڑی نوازش ہے کہ خاکسار کو براہ راست اہلیہ محترمہ سے رجوع کرنے کی عزت بخشی جا رہی ہے بھلا میں اس لائق کہاں!

What do you mean? چیخ کر بولے

میں نے کہا وہی جو آپ نے فرمایا۔ ارشاد ہوا تم کو پرائیویٹ سکریٹری اور بیوی میں فرق نہیں معلوم۔ عرض کیا بیوی کے سوا کوئی فرد مرد کی محرم راز نہیں بن سکتی اور نہ شوہر کے سوا عورت کا کوئی جائز رازدار ہو سکتا ہے۔ کہنے لگے تم بہت گستاخ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ میں نے کہا معافی چاہتا ہوں۔ بولے اچھا کل دس بجے دن کو دفتر میں ملو۔

دوسرے دن وقت معینہ پر دفتر پہنچا۔ ایک شخص نے جس کا حلیہ ڈاروِن کی theory کو ثابت کر رہا تھا صاحب کے کمرے میں جانے سے مجھے روکا۔ یہ شخص دروازے کے باہر ٹھیک اس تختی کے نیچے کھڑا تھا جس پر کندہ تھا "پرائیویٹ سکریٹری" کہنے لگا آپ نے پہلے سے وقت لیا ہے؟ میں نے کہا وقت کا لین دین کیسا! کیا یہ بھی کوئی روپیہ، کپڑا، کتاب، عزت، عصمت، ٹکٹ وغیرہ جیسی خریدنی یا فروختنی قسم کی چیز ہے! وقت تمہارا نہ میرا نہ صاحب کا۔ وہ تو آتا ہے اور گزر جاتا ہے اس کا آنا مسلّم اس کا جانا برحق! یہ آپ وقت کے ٹھیکیدار کہاں سے بیچ میں کود پڑے؟ "پرائیویٹ" صاحب نے ایک مختصر سی کتاب جیب سے نکال کر صفحے اُلٹے پلٹے اور مجھ سے پوچھا۔ آپ کا نام؟ میں نے کہا آپ مجھے سی۔ آئی۔ ڈی قسم کے "کچھ وہ" معلوم ہوتے ہیں۔ پرائیویٹ بڑبڑاتے ہوئے صاحب کے کمرہ میں داخل ہو گئے اور صاحب انکے ساتھ بے تحاشا باہر نکل آئے۔

میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے ٹیلیفون والی گفتگو یاد دلائی۔ ناک بھوؤں چڑھاتے اپنے ساتھ مجھے کمرے میں لے گئے۔ پرائیویٹ کی طرف میں نے مڑکر دیکھا تو مارے غصّے کے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔

کرسی پر بیٹھتے ہوئے صاحب بولے۔ میں آپ کو صرف پانچ منٹ دے سکتا ہوں۔ جلدی کہیئے جو کچھ کہنا ہو، کوئی سفارش کرانی ہے، کسی نوکری کی تلاش ہے، کسی قومی کام کے لئے چندہ لینے آئے ہو، کسی روزانہ اخبار کے ایڈیٹر ہو، الیکشن میں ہمارے اثر سے فائدہ اُٹھانے کی فکر ہے، کوئی خطاب حاصل کرنا چاہتے ہو۔ اور اسی قسم کے بہت سے سوالات..... مختصر یہ کہ پانچ منٹ سے زاید تک صاحب نے سوالوں کا تانتا جاری رکھا۔ خدا خدا کرکے سوالوں کی فہرست ختم ہوئی تو مجھے جواب کا موقع عنایت ہوا۔ میں نے عرض کیا آپ کے ان تمام شکوک میں سے ایک بھی شُبہ دُرست نہیں۔ میں انسان ہوں اور یہ میری بدقسمتی کہ آپکو بھی کچھ اسی قسم کی چیز سمجھکر سوشل تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا۔ قبل اس کے کہ صاحب کچھ کہتے میں نے انہیں گھڑی کی طرف اشارہ کیا اور جلدی سے کمرے کے باہر۔

باہر آیا تو پھر پرائیویٹ سے مڈبھیڑ۔ لیکن اب یہ حضرت ذرا اچھے موڈ میں تھے۔ میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا اور کچھ ایسا روغن قاز ملا یا مقامی اصطلاح میں "اتنا مکھن لگایا" کہ پرائیویٹ بالکل "پبلک" ہو گئے۔ موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے میں نے فوراً چائے کی دعوت یوں دی۔ مگر وہ بھی تھے صاحب کے سکریٹری اور پھر پرائیویٹ۔ جھٹ جیب سے ڈائری نکالی، اُسے اُلٹا پلٹا اور کہنے لگے جی ہاں، میں کل شام کو خالی ہوں۔ میں نے پوچھا آپ خالی ہیں یا آپ کا پیٹ؟ کہنے لگے جی یہ تو محاورہ ہے، صاحب بھی یونہی بولتے ہیں جب انہیں کوئی کام نہیں ہوتا۔ میں نے کہا تو یوں کہیئے کہ جس وقت کام ہوتا ہے اس وقت آپ اور آپ کے صاحب "بھرے" ہوتے ہیں۔ پرائیویٹ بولے، خیر میں کل شام کو آپکے ہاں چائے پر آؤنگا۔ میں نے کہا بھئی یہ

کیا بات ہوئی، گویا جس طرح دانہ پر چڑیاں آتی ہیں، کبوتر پر باز آتا ہے۔ مردوں پر چڑیل اور عورتوں پہ بھوت آتے ہیں، کسانوں اور مزدوروں پر ترس آتا ہے، دولتمندوں پر غصہ آتا ہے، موٹر پر صاحب آتا ہے، ہندوستان پر افلاس آتا ہے اسی طرح جائیے اور کہ لے پر آپ لوگ آتے ہیں۔ ہمارے پرائیویٹ کھسیانے ہوکر بولے۔ ہمارے صاحب یونہی بولا کرتے ہیں لیکن مجھے تو ان سے کام لینا تھا۔ کچھ ہنسنے ہنسانے کے فقرے کہکر چائے کی دعوت قبول کرالی اور گھر واپس آگیا۔

حسبِ وعدہ دوسرے دن پرائیویٹ سہ پہر کو ہمارے گھر آئے اور بڑے تپاک سے ملے۔ کسی قدر بے تکلفی ہوجانے پر میں نے پوچھا، یار پرائیویٹ! یہ تو بتاؤ تمہارا صاحب اپنے دفتر والوں کے ساتھ کس طرح پیش آتا ہے کہنے لگے صاحب کو کسی کا کام پسند نہیں آتا۔ جو خوشامد کرتا ہے اسکی بھی کمبختی اور جو اپنے کاموں میں ہوشیار ہونے کے سبب نڈر ہیں اُن کی بھی بُری گت۔ صبح سے شام تک ایک ہنگامہ سا مچا رہتا ہے۔ اور اپنے حکام بالا کے ساتھ ان کا کیا رویہ ہے۔ میں نے بڑی متانت سے پوچھا۔ پرائیویٹ بولے ایک دن ہمارے صاحب کے بڑے افسر معائنہ کیلئے آئے، وہ تھے بیچارے سیدھے سادے، گو ہمارے صاحب کی طرح وہ بھی ولایت ہو آئے تھے مگر تھے نرے ہندوستانی۔ صاحب کا یہ حال کہ دو دو لفظ کے بعد "سر" "سر" یوں ہوا "سر" ایسا ہوا۔ بس کیا کہوں "سر" کی رٹ لگا دی۔ غلط اعتراض بھی قبول، اپنے ٹھیک کاموں کی بُرائی بھی منظور۔ انکو "نہیں" کہتے تو میں نے سُنا ہی نہیں۔ میں نے کہا بھئی ہر مغرور افسر جہاں خوشامد پسند ہوتا ہے وہاں خوشامدی بھی پلے سرے کا ہوتا ہے۔ افسر کے مغرور ہونے کی دو وجہیں ہوا کرتی ہیں ایک تو احساس کمتری اور دوسرا احساس برتری۔ پست قد افسر اپنے سے اونچے ڈیل ڈول والے ماتحت سے اکڑ کی لیتا ہے اور اس کے کاموں میں اکثر جا و بیجا عیب نکالتا رہتا ہے کریہہ المنظر افسر خوشرو ماتحتوں سے، کم پڑھا لکھا اپنے سے زیادہ اونچی سندوں والے ماتحت سے اسی قسم کے سلوک کرنے کی فکر میں رہتا ہے اور جسکے دماغ میں احساس برتری جاگزیں ہوجاتا ہے وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔

میری اس فلسفیانہ گفتگو سے پرائیویٹ ذرا رُعب میں آگئے اور زیادہ کھُل گئے۔ کہنے لگے جی ہاں! ایکبار ایسا اتفاق ہوا کہ صاحب اپنی ڈائری میز پر کھول کر گھر چلے گئے میں نے کچھ دلچسپ چیزیں اس میں سے نقل کرلیں۔ اتفاق سے اس وقت وہ کاغذ میرے پاس ہے، ذرا سُنئے گا۔ ایک جگہ لکھا تھا۔ آج کلب گیا، کمبخت سب کی منحوس صورت، ایک بھی تو اس قابل نہیں جس سے دل کھول کر بات کی جائے۔ مجھے دیکھکر سب کے سب چمٹ گئے، کوئی حلوائے پیش کر رہا ہے، کوئی شربت سے تواضع کر رہا ہے کسی کی بیوی ساتھ ڈانس کے لئے میری طرف سوالیہ نشان بنی دیکھ رہی ہے، کسی کی لڑکی پیانو کے نغموں سے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی ہے .. ان لوگوں سے ایک مرتبہ خندہ پیشانی سے پیش آؤ تو دوسرے ہی دن سے اپنی اپنی غرضیں اور سفارشیں لے کر جان کو آنے لگیں۔ کسی طرح دوسرے افسر آ ہی نہ چکے، آخر کار اپنے منصبی وقار کو خطرہ میں دیکھکر اس طوفان بے تمیزی سے جان چھڑا کر چلا آیا . . .

ایک اور صفحہ پر لکھا تھا۔ آج قاضی صمصام الدین کی لڑکی کی شادی میں بزم رقص و سرود تھی۔ بہت اصرار تھا کہ میں بھی شرکت کروں۔ اچکن، گھٹنا اور دو پلی ٹوپی پہن کر جلسے میں گیا۔ سارے میری تعظیم کیلئے کھڑے ہوگئے۔ صدر محفل میں مجھے جگہ دی گئی۔ لوگوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں، کوئی کہتا اتنا بڑا آدمی اور ایسے سادہ لباس میں، کیا انکسار ہے کیا اخلاق ہے۔ کوئی کہتا چہرہ پر کیا رُعب و جلال ہے، جاہ و حشمت قدم چوم رہی ہیں۔ غرض جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ بیوقوف ہیں کے! بھلا بڑائی کو لباس سے کیا تعلق۔ ان دونوں میں اگر کچھ واسطہ ہے تو بس اتنا جتنا مذہب کو اخلاق سے، نسل کو آزادی سے یا محبت کو شادی سے .. حاسد ہیں سب کے سب، دیکھ دیکھکر جلے مرتے ہیں!

ایک اور جگہ لکھا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت کہاں جو ایسے جھمیلوں میں پڑوں، لیکن پبلک پر احسان کرنے کی خاطر میں نے صدارت کی دعوت قبول کرلی۔ نئے ادب پر مباحثہ تھا۔ مقرروں نے دل کھول کھول کر نئے ادب کی خوبیاں بیان کیں۔ وہی چیونٹیاں رینگنا، چوہیوں کا پھدکنا، سانپ کا پھنپھنانا، کپڑے کی تہوں میں چھپی ڈھکی چیزوں کے ہاتھ لگنے پر

طرح طرح کے مزوں کا اظہار جیسی لغویات۔ انحطاط اور احتجاج کی مہمل بحث۔ اور ایسی ذہنی عیاشی کا نام رکھا ہے، ترقی پسندی کمبخت ترقی کی بھی مٹی پلید کر رہے ہیں۔ میں نے اپنی تقریر میں ان سب کی وہ چھیچھالیدر اڑائی کہ سارا مجمع سناٹے میں آگیا . . . . آخر میں میں نے کہا۔ آپ لوگ جس طرز تحریر کو ترقی پسندی کہہ رہے ہیں اس سے لفظ ترقی کی توہین ہوتی ہے' آپ لوگوں کا رجحان رجعت قہقہری کہلانے کا مستحق ہے' ترقی پسند تھے انشا' جانصاحب' رنگین اور جرکیں جیسے باکمال جنہوں نے اپنے کلام میں رنڈیوں کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچ دیں۔ نئے ادیب اگر ترقی پسند کا لقب حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیئے کہ ڈھکی چھپی چیزوں کو باہر نکال کر منظر عام پر لے آئیں" تالیوں سے ہال گونج اٹھا ۔ دوسرے دن اخبار میں مجھے ترقی پسندوں کی صف اوّل میں سب سے ممتاز جگہ ملی کمبخت لکھتے ہیں کہ اپنی جان کو روتے ہیں، رنڈیوں کا منہ چڑاتے ہیں منصبی وقار مجھے اجازت نہیں دیتا ورنہ ان سب کو دکھا دوں کہ ترقی پسند ادیب کیسا ہونا چاہیئے۔

ایک دوسرے صفحے پر لکھا تھا۔ آج مسٹر بنواری لال بچوں کے لئے کچھ تحفے لائے تھے مگر مجھ پر کیا احسان؟ تحفے لائے تو یہ ان کا فرض تھا۔ آخر ماتحت ہوتے ہیں کس لئے۔ شاید اس فکر میں ہیں کہ میں ان کی ترقی کی سفارش کر دوں۔ فرض ادائیگی کا بھی کہیں معاوضہ ملا کرتا ہے! بودم کہیں کے!

ایک اور جگہ لکھا تھا میری بیوی ایک زنانہ پارٹی میں گئیں۔ وہاں مسز احمد اللہ بھی تھیں، زرق برق کپڑوں میں ملبوس سر سے پاؤں تک زیور میں لدی ہوئی میری بیوی کو سلام تک نہ کیا، انہیں محفل میں بڑی خجالت ہوئی۔ میں نے سنا تو بیحد غصہ آیا میرے ماتحت کی بیوی ہو کر ایسی گستاخی! دوسرے دن دفتر میں احمد اللہ کو طلب کر کے بہت ڈانٹا.... سی۔ آئی۔ ڈی کے دفتر کو ٹیلیفون کیا کہ مسٹر احمد اللہ کے گھر میں جو ٹھاٹ ہیں وہ اُن کی حیثیت سے کہیں زیادہ ہیں، مجھے شبہ ہے کہ وہ رشوت لیتے ہیں۔ تفتیش ہو رہی ہے...... تگنی کا ناچ نہ نچا دوں تو سہی!

ایک مقام پر لکھا تھا۔ آج کلب میں ایک صاحب ملے۔ نام یاد نہیں رہا مغالطے میں مبتلا تھے۔ بیٹی کی تعریف کر رہے تھے کہ غالب و اقبال کے تمام کلام بر زبانی ہے اور بڑی پیاری ادا سے پڑھتی ہے۔ بھلا یہ بھی کیا کمال ہوا . . میں نے کہا غالب اور اقبال وغیرہ کا کلام تو ہندوستان کے شہر و دیہات میں اکے تانگے والے گاتے پھرتے ہیں۔ میری بیٹی ابھی تیرہ سال کی ہے لیکن شیکسپیئر، ورڈز ورتھ، ٹینی سن اور کیٹس کی شاعری پر اس اعتماد سے تبصرہ کرتی ہے کہ انگریزی کے پروفیسر بھی اپنے گریبان میں منہ ڈال لیتے ہیں، شیکسپیئر کے ڈرامے پڑھتے وقت ایسی اداکاری تخلیق کرتی ہے کہ ہالی ووڈ والے دیکھ پائیں تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیں . . . سب کے سب سُنکر دنگ رہ گئے اور ان حضرت کا تو یہ حال ہوا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ چھچھورے کہیں کے! اترائی تو پاس نہیں اور سب سے آگے ناؤ پر بیٹھنے کی فکر. . .

ایک صفحے پر مرقوم تھا جس طرح ایجاد کے لئے ایک بیان کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ہر دفتر کے لئے ایک افسر کا ہونا ناگزیر ہے۔ ہمارے بغیر نظام شمسی اگر نہیں تو کم از کم نظام دفتر تو ضرور درہم برہم ہو جاتے۔ کل کچھ نزلہ کے آثار تھے دفتر نہیں گیا۔ سارا عملہ باری باری بنگلے پر اُمنڈ آیا۔ کسی کو کچھ دقت۔ کسی کو کوئی مشکل، اسسٹنٹ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے پرائیویٹ کے اوسان خطا ہو گئے۔ ہیڈ کلرک کا ایک پاؤں دفتر میں تو دوسرا بنگلہ میں، مختصر یہ کہ سارا دفتر زیر و زبر ہو گیا...... گدھے ہیں سب کے سب معمولی مسئلوں میں بھی اپنی ذاتی رائے پر اعتماد نہیں کر سکتے . . . . کیا ہو گا اگر میں چلا گیا یہاں سے....

ایک اور صفحے پر لکھا تھا سیٹھ گردھاری سرن کئی کارخانوں کے مالک ہیں، لکھ پتی ہیں، عالیشان کوٹھی میں رہتے ہیں مگر ملاقات کے وقت دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چودھری رفعت اللہ اتنے بڑے زمیندار ہیں پڑھے لکھے ہیں لیکن جب ملتے ہیں تو جھک کر دو تین بار ہاتھ سے آداب کرتے ہیں۔ شیک ہینڈ کرنا بدتمیزی سمجھتے ہیں اور اسمبلی کی ممبری کے امیدوار ہیں۔ پیچھے پڑے ہیں کہ انہیں ووٹ دلواؤں۔ آخر کیوں؟ کہیں ان ایسوں کے گلا پھاڑنے سے پبلک کی رائے موافق ہو سکتی ہے جب تک ہمارے قلم کو جنبش نہ ہوگی کچھ نہیں ہونے کا۔ جب ہی تو آئے دن ڈالیاں لگ رہی ہیں، تحفے پر تحفے چلے آ رہے ہیں دعوتیں ہو رہی ہیں، ناچ گانے

کی محفلوں میں اصرار کر کر کے شریک کیا جا رہا ہے۔ یہ اسمبلی اور کونسل کی ضرورت آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ نہیں تھیں جب بھی ہم تھے، یہ ہیں جب بھی ہم ہیں۔ ان کے بغیر سب کچھ ہے ہمارے بغیر کچھ بھی نہیں۔ کوئی بھی ممبر ہو جائے ہماری بلا سے۔

میں نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور پیارا تیویٹ سے کہا مار لیس کرو، ٹھنڈی ہوئی جا رہی ہے لو چائے پیو!——

تصانیف مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم

خانم:- عظیم بیگ چغتائی کی بہترین تصنیف ہے۔ اس دلچسپ اور دلکش کتاب کا ہر ایک باب ایک چمکتا ہوا مزاحیہ افسانہ ہے ہر افسانہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔ مگر سب کہانیوں کا ہیرو اور کردار ایک ہے۔ ایک سے ایک مزیدار اور ہنستی ہوئی کہانی اس قدر پُرلطف، اس قدر پُر مذاق، اس قدر عجیب اور اس قدر مضحکہ خیز، اس قدر ظرافت اور لطافت آمیز اور مزیدار پلاٹ کہ جو پڑھے ہنسے۔ اس کے افسانے برسوں اخباروں میں نقل ہوئے، ہندی رسالوں میں چھپے۔ بنگلہ زبان میں چھپ گئے گجراتی میں چھپ گئے۔ یہ چغتائی کی بہترین کتاب ہے ضخامت چار سو صفحات۔ جلد پوش سے آراستہ۔ لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب۔ قیمت چار روپے (للعہ)

کولتار:- اس کتاب میں پندرہ انتہا سے زیادہ دلچسپ اور مزاحیہ افسانے ہیں۔ اور یہ سب افسانے مل کر کتاب کو پورا مزاحیہ ناول بنا دیتے ہیں۔ مزاحیہ نگاری اور افسانہ نویسی کا اگر کمال دیکھنا ہو تو یہ کتاب ضرور دیکھئے۔ اپنی طرز کا پہلا ناول ہے، شاہدہ کی زبردستی کی شادی کے لطیفے نے قصّے میں چار چاند جڑ دئے ہیں۔ جم والی کی داستانِ محبت بھی پڑھنے کے لائق ہے۔

قیمت دو روپے (عہ)

شریر بیوی:- چغتائی صاحب کا سب سے پہلا ناول اور سب سے زیادہ مقبول مزاحیہ ناول۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ)

ساقی بک ڈپو۔ دہلی سے طلب فرمائیے!

نقشِ وفا

چشمِ سائل میں کرم بن کے سما اے ساقی
خالی پیمانہ ہے اک دستِ دعا اے ساقی
ہے زمانے میں ترا نام بڑا اے ساقی
خُم لنڈھا، لطف دکھا، رنگ جما اے ساقی
یہ بہاروں کا سماں اور یہ فضا اے ساقی
اب بھی کیا یاد نہ آئیگا خدا اے ساقی
غمِ دوراں کی یہی اک ہے دوا اے ساقی
آبِ آتش سے غمِ دل کو جلا اے ساقی
ہوں شکارِ غمِ ہستی، نہ جلا اے ساقی
انتظارِ مے و مینا نہ دکھا اے ساقی
ابرِ پیغامِ جنوں بن کے اٹھا اے ساقی
نشہ میں جھوم گئے ارض و سما اے ساقی
بادہ ہے مہرِ محبت کی ضیا اے ساقی
بادہ ہے آبِ شفا، آبِ بقا اے ساقی
شیخِ گستاخ کی باتوں پہ نہ جا اے ساقی
شیخ ہے دشمنِ اربابِ صفا اے ساقی
فطرتِ بادہ پرست اور خفا اے ساقی
مٹ نہ جائے کہیں یہ نقشِ وفا اے ساقی

عبدالعزیز فطرتؔ

شکیلہ اختر

"انتخاب"

اپنی الماری میں رکھا ہوا سب سے عمدہ پوڈر لگا کر اُس پر غازہ لگاتے لگاتے سنگار میز کے بڑے شیشے میں آپ ہی آپ مُسکراتی ہوئی شہنا آپا بولیں: "مُنّی تجھے بھی پوڈر لگا دوں؟" "ہُنہ" مُنّی حقارت بھری نظروں سے سنگاردان کی طرف دیکھکر بولی۔ "جا بے نہیں لگاتی میں آپکا یہ اُوڈر پوڈر۔ پرسوں ہی میں نے ذرا سا جو لگایا تھا تو آپ ہی نے تو اماں سے کہکر کتنی ڈانٹ سُنوائی۔ وہ مُنہ چڑھا کر نقل کرتی ہوئی بولی۔ "نہیں لگایا کرتی ہیں یہ سب کنواری بیٹیاں، اب جاتی ہوں آپکی امی سے کہنے کہ شہنا آپا کی تو آج شادی ہوگئی ہے۔" وہ تن تناتی ہوئی کمرے سے نکلنے ہی لگی تھی کہ شہنا اُسے دوڑ کر پکڑ لائی۔ "ارے ذرا سُن تو مُنّی۔ اب ختم بھی کر اپنا یہ غصّہ۔" وہ بڑے پیار سے مُنّی کو لپٹاتے ہوئے بولی۔ "توبہ۔ یہ دیکھ تو کیسے ہو رہے ہیں تیرے بال۔ لا میں خوب عمدہ تیل دیکر تیری اچھی سی چوٹیاں گوندھ دوں۔" شہنا کسی نہ کسی طرح بس سنگار میز کے آئینے کے سامنے ہی کھڑی رہنا چاہ رہی تھی۔ "دیکھ مُنّی، یہ روز پوڈر ہے، یہ صندل، یہ کیوٹی ٹے ہے اور یہ کٹی کورا، بتا تو کون سا لے گی؟ ارے یہ ٹکر ٹکر میرا مُنہ کیوں دیکھ رہی ہے، سچ بتا پوڈر کا ڈبہ دونگی تجھے ایکدم بھرا ہوا۔ کیسی اچھی ہے مُنّی میری پیاری پیاری سی۔" اور مُنّی حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سنگاردان کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں شہنا آپا کا عزیز سرمایہ جسے وہ کسی کو چھونے بھی نہیں دیتی تھیں آج ایسے ہی بند الماری سے باہر میز پر بکھرا پڑا تھا۔ مُنّی کے کندھوں سے نیچے دو سیاہ لمبی لمبی چوٹیاں لٹکنے لگی تھیں جس میں سُرخ رنگ کے ربن کا گچھا پھول کی طرح لٹک رہا تھا۔ آئینہ میں اس کو اپنا پوڈر اور غازہ لگا ہوا چہرہ بہت خوبصورت لگا۔ سفید پوڈر اور ہلکے ہلکے سُرخ لپ اسٹک کے نیچے ٹھوڑی کے پاس کا سیاہ تل نمایاں طور پر چمک رہا تھا۔ اور اماں جو بگڑ بیٹھیں تب آپا؟" دس برس کی مُنّی ایک ننھے سے بچے کی طرح شہنا کا مُنہ تکتی ہوئی بڑی حسرت سے بولی۔ "اُنہہ اماں۔ مت جانا اُنکے پاس سمجھی، بس چھُپتی ہوئی سیدھی چلی جا۔۔۔" "کہاں شہنا آپا؟" مُنّی بیتابی سے کہنے لگی۔ "کہاں۔ بتا ہی دوں تجھے؟" شہنا کی مُسکراہٹوں میں بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ "ارے تو یہ اُلّو کی طرح اتنے سویرے سے کیوں سو جاتی ہے مُنّی؟ جانتی ہے رات کو کون آیا ہے شمّو بھیا کو نہیں دیکھا ہے تو نے؟" "ارے شمّو بھیا آئے ہیں۔" مُنّی خوشی سے مچلتی ہوئی بولی۔ "ہاں تو بس وہیں چلی جا سیدھی شمّو بھیا کے پاس۔" شمّو بھیا کتنے وقت کتنے پیار سے شہنا آپا کے لب پر یہ نام پھسلتا تھا۔۔۔ "تو آپا مجھکو اپنا والا دوپٹہ دیدیجئے نا۔" اور مُنّی دوپٹہ اوڑھ کر بھاگنے ہی لگی تھی کہ شہنا نے اُس کی کلائی پکڑلی۔ "ارے بھاگ ہی چلی۔ اور میں نے جو اتنی ساری چیزیں تجھے دی ہیں تو میرا ایک کام بھی نہ کرے گی مُنّی۔ لے اسے اپنے جمپر کے نیچے چھُپالے، ہاں بس ایسے ہی اور یہ دوپٹہ اسے ابھی ایسے ہی لپیٹ لے پھر اپنا ٹھیک کرلینا مگر چُپکے سے سیدھی چلی جا، دیکھ شمّو بھیا کی گود میں جو تکیہ ہے نا بس اُسی کو لے کر اس کے غلاف کے اندر رکھدینا سمجھی نا؟ مگر جب کوئی نہ رہے وہاں پر تب۔ بڑی اچھی ہے مُنّی میری میں اپنی مُنّی کو اور بہت سی چیزیں دونگی شام کو۔"

نیلے رنگ کا موٹا سا لفافہ اپنے جمپر کے اندر چھپائے دوپٹہ سے لپٹی لپٹائی مُنّی جب کمرے سے نکل کر نیچے جانے لگی تو زینے سے اُترتے ہوئے اُس کے پیر بُری طرح کانپ رہے تھے اور اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایک دفعہ زینے پر سے گرتے گرتے جیسے ہی بچی تھی کہ ٹھیک اُسی وقت ایسا گیند اُچھالتے ہوئے کمّو بھیا اُس کے سر پر پہونچ گئے اور مُنّی مارے ڈر کے پسینہ پسینہ ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کا جی اتنا گھبرانے لگا جتنا آپا کی الماری میں سے چیزیں چُراتے ہوئے بھی نہ گھبراتا تھا۔

"یہ شہنا آپا کی الماری میں سے آج تو نے کیا کیا چُرایا ہے مُنّی۔ چل تو شہنا آپا کے پاس۔" تو یہ کمّو بھیا بھی کیسے گنوار

ہیں جن کو اِتنا بھی معلوم ۔ تھا کہ شمو بھیا اُن لیں گے اور وہ بھی چوری کی بات۔" کمو بھیا جب اس کو گھسیٹ کر لے جانے لگے تو اپنے جمپر کے اندر نیلے رنگ کے لفافہ کو وہ بہت مضبوطی سے پکڑے ہوئے زور سے چیخی "شہنا آپا۔" اور اُس وقت شہنا آپا اُس کے لئے فرشتۂ رحمت بن کر بولیں۔ "ارے کمو اس کو کیوں دق کر رہے ہو چھوڑ دو۔" اور وہ کمو بھیا سے چھٹتے ہی تیر کی طرح سیدھی شمو بھیا کے پاس پہونچ گئی۔ اُس کا دل شاید زندگی بھر میں پہلی بار اتنے زور سے دھڑک رہا تھا اور وہ بدحواس ہو کر ان کی کرسی کو پیچھے سے پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ "منی اب اتنی بڑی ہو گئی ہے تو۔" شمو بھیا بڑے پیار سے اُس کو اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے بولے۔ "اور تجھے یہ اِتنا دُلہن کی طرح کس نے سجا دیا ہے منی؟ کچھ پڑھتی وڑھتی بھی ہے یا جب یہ دو لمبی لمبی چوٹیاں ہی گوندھنی آتی ہیں۔" منی شرما گئی۔ اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو گردش دیتے ہوئے بولی۔

"مجھ کو سب پڑھنا آتا ہے شمو بھیا انگریزی بھی ۔۔۔ اور ماسٹر صاحب آتے ہیں۔" "منی یہ آنکھیں پھرانا تجھے کس نے سکھا دیا ہے" شمو بھیا اس کے غازہ لگے ہوئے گال پر بڑے پیار سے تھپڑ مارتے ہوئے بولے۔ "اور تیری شہنا آپا کیا کر رہی ہیں۔ جا انہیں بلا لا۔" "وہ آئیں گی آپ کے سامنے۔" منی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "لیجئے آپا کو بلا دیا۔" اور وہ تکیے کے غلاف کے اندر نیلے رنگ کا لفافہ رکھ کر بھاگ گئی۔ شہنا آپا زینے ہی پر اُس کی منتظر تھیں منی کو آتے ہی اُنہوں نے لپٹا لیا، بہت دیر تک منی آپا کے دل کی تیز دھڑکن اپنی پیشانی کے پاس محسوس کر رہی تھی۔ وہ جب سے اپنے ماموں جان کے گھر آئی تھی یہ پہلی بار ہی تو شہنا آپا اس سے اتنی محبت کر رہی تھیں۔ نہیں تو اس سے پہلے جہاں جگی اور کملی بھیا کی اس سے لڑائی ہوئی اور آپا جھٹ سے بس منی کے خلاف رائے پاس کر دیتیں۔ کل ہی تو اُلو کی طرح گول گول دیدوں والے جگی نے امرود چھیننے میں اس کا ہاتھ الگ مروڑ دیا اور ناخن سے ایسی ایسی کھرنچیں لگائیں کہ بس خون ہی تو نکل آیا۔ مگر وہ بھی اپنی ضد پر اٹکی ہی رہی امرود کو سامنے سڑک پر پھینک دیا پر اُس ندیدے جگی کو نہ دیا۔ اُس روز وہ دن بھر آپا کے ساتھ لگی لگی پھرتی رہی۔ شہنا کو بھی ایک جگہ قرار

زینہ ابھی اس دریچے کے پاس ہیں تو پھر اس ڈر سے لگ کر کھڑی ہو گئیں کسی بہانے سے شمو کو پکڑ رہی ہیں تو خواہ مخواہ جعلوا کو چڑایا جا رہا ہے۔ شمو بھیا سے وہ پردہ کرتی تھیں مگر وہ اپنے کمرے کے دریچے پر جان بوجھ کر ایسی انجان بنی بیٹھی رہتیں کہ ٹھیک شمو بھیا ان کو نیچے سے بیٹھے ہوئے دیکھتے رہتے، وہ اپنے بالوں کی لمبی لمبی چوٹیاں سامنے ڈال کر آنچل کو اپنے سینے پر سے سرکا کے اُسے پیچھے پھینک دیتیں اور ہاتھ میں کوئی کتاب لئے بس سامنے شمو بھیا کو دیکھتی جاتی تھیں۔ اماں اور ممانی جان کی باتوں کی آواز جب تک صاف طور پر سنائی دیتی شہنا آپا مزے مزے میں آنکھوں اور لبوں کے اشارے سے شمو بھیا سے نہ جانے کیا کیا باتیں کرتی رہتیں مگر جہاں آوازیں آنی بند ہوئیں اور آپا جھٹ سے اپنے پلنگ پر۔ بڑے مزے میں دوپٹہ سے لپٹی لپٹائی ہوئی منی اُن کے خطوط ایک دوسرے کو پہونچاتی رہی تھی۔ کئی بار اس کا جی چاہتا کہ ان کا کوئی خط کھول کر پڑھ لے مگر اُس کو ڈر لگتا تھا کہ کہیں وہ خط پڑھنے لگے اور ٹھیک اُسی وقت کسی نے دیکھ لیا تو پھر کتنی مار پڑے گی اس بیچاری پہ ۔۔۔ مگر جب رات کے وقت شمو بھیا نے اُس کے آنچل میں بھر کر بہت سی سینٹ کی شیشیاں، پوڈر کے ڈبے، خط لکھنے کے پیڈ سبز اور نیلے رنگ کے لفافے آپا کو دینے کو دئے تو اُنہیں دیکھ کر اُس کا جی بھی للچایا تھا۔ کتنی ہی چیزیں ایسے ہی مفت میں آپا کو مل گئی تھیں، جب ہی تو اُن کی الماری میں اتنی چیزیں بھری پڑی تھیں۔ شہنا آپا نے بہت محبت سے پہلے اُن ساری چیزوں کو اپنی گود میں لیا اور پھر اُنہیں چپکے سے اپنے بکس میں چھپا کر رکھ دیا۔ اُس روز رات بھر منی کو اچھی طرح سے نیند بھی نہ آئی وہ یہی سوچتی رہ گئی تھی کہ شمو بھیا کی طرح اتنی ساری چیزیں اُسے کون دے سکے گا۔ بہت سے نام اُس کے ذہن میں اُبھر اُبھر کر مٹتے رہے تھے مگر سب کے سب ایسے ہی نکمے بیکار سے تھے جو اُسی کے پیسے اُچک کر کھا جاتے جگی اور کملی بھیا کو تو وہ کبھی منہ بھی نہ لگاتی تھی اور جس روز ممانی جان کمو بھیا پر بگڑتیں اُس دن بیچاری منی ہی اِدھر اُدھر سے پیسے لا کر کمو بھیا کے سگریٹ کا خرچ چلاتی تھی۔ صبح کو جب وہ سو کر اٹھی تو اُسے شہنا آپا سے ایک ہلکی سی رقابت لگ رہی تھی، اُس کا

جی چاہتا تھا کہ شہناآپا سے ایکدم کچھ نہ بولے اور سیدھے جا کر کہہ دے کہ آپا لے اپنے بکس میں کیا کیا چھپا کر رکھا ہے۔ مگر جب شہناآپا اُسے بڑے پیار و محبت سے پھر سمجھانے لگیں تو پھر وہ اپنی ساری دلی تکلیف اور شکایت کو بھول گئی۔ شہناآپا نے اماں سے کہہ کر نیا جمپر اور اُسی طرح کی پھولدار شلوار بھی نکلوا دی تھی۔ جب وہ اپنا پھولدار سوٹ پہنے، گلے میں چُنا ہوا دوپٹہ لپیٹے پوڈر غازہ اور ہلکا سا کاجل لگائے ہوئے سامنے کی چھت پر اِترا اِترا کر چل رہی تھی تو یک بیک اس کا جی بھی چاہنے لگا کہ شمو بھیّا کی طرح اخبار کے پیچھے سے اس کو بھی کوئی دیکھتا رہتا۔ اس چھت پر اس نے کئی بار چکر لگایا اور وہ کنکھیوں سے دیکھتی بھی جا رہی تھی کہ کوئی اُسے دیکھ رہا ہے کہ نہیں مگر "یہ کوئی" خود اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں سے آکر اُسے شمو بھیّا کی طرح قدم قدم پر دیکھنے لگے گا۔ اپنی چوٹی کے ربن سے کھیلتی ہوئی وہ آنگن کے جالے سے لگ کر کھڑی ہو گئی، پارو کے مولوی صاحب اپنی لال لال آنکھوں سے اُسے گھور رہے تھے اور آنگن کے نل میں سے پانی بھرتا ہوا جھلّو اُسے دیکھ کر کھلکھلا کے ہنس پڑا۔ جھلّو کی ہنسی اور مولوی صاحب کی گھورتی ہوئی آنکھوں پر اُسے بڑا غصّہ آیا۔ "کمینے"۔ اور وہ نفرت سے مُنہ بچکائے وہاں سے ہٹ گئی۔ "تُس تو مِنّی مُماں جی" اِن نے بڑے پیار سے اُسے پُکارا۔ "یہ کل سے تو شمو کو دیکھ کر ایکدم سے دُلہن ہی بن گئی"۔ وہ شرما کر چُپ رہی مگر اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کا بھی سچ مچ کا کوئی شمو بھیّا آتا۔

دوپہر کی گرمی میں سب بےخبر سو رہے تھے۔ شہناآپا چپکے سے نیچے گئیں اور گمّو بھیّا کے کمرے میں چپکے اُن کے دریچے پر بیٹھ گئیں اور دریچے کے اس پار شمو بھیّا بھی آگئے تھے، وہ شہناآپا کا ہاتھ پکڑ کر بہت سی باتیں کرنے لگے اور شہناآپا کی آواز تو جیسے ایکدم سے بدل گئی تھی۔ سُریلی اور لوچدار جیسے کہیں گیت گا رہی ہوں، وہ آہستہ آہستہ آنکھوں اور لبوں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ جنبش دے دے کر ذرا رُک رُک کر شمو بھیّا سے باتیں کرتی جا رہی تھیں اور بیچاری مِنّی کو کمرے کے دروازے پر بس دربانی کا کام ملا تھا۔۔۔۔ اُس کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں مگر وہ آپا کے پوڈر اور غازے کی لالچ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی ہوئی یہ سوچ رہی تھی کہ اپنے کمرے کے در پردہ کس کو کھڑا کرے گی۔۔۔۔ اُس کو شہناآپا کی آنکھوں کی گردش اور لبوں کی تھرتھراہٹ بہت اچھی لگ رہی تھیں، اور بےاختیار اس کا جی چاہ رہا تھا کہ یہی چمک اُس کے چہرے کو بھی روشن کر دے۔ شمو بھیّا آئے اور گئے بھی اور خود اسکی اماں شہناآپا کے یہاں سے اپنے گھر واپس آگئی تھیں مگر بیچاری مِنّی کو اپنا کھویا ہوا سکون نہ ملا۔ اس کی خلش بڑھتی ہی گئی۔ شہناآپا کے یہاں آجانے سے پہلے وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ بڑے شوق سے پتنگ اُڑا اُڑا کر اکثر پینچ بھی لڑاتی رہی تھی۔ اُس نے کتنے ہی پتنگ کاٹے بھی تھے اور لٹّو نچانے کے بعد خود اس کا دل بھی کتنی مسرتوں کے ساتھ رقص کرنے لگتا تھا۔ مگر اب تو ان باتوں کو یاد کرتے ہوئے اُسے شرم آتی تھی۔

اکیلے گھر میں جب اُس کو پڑھنے سے چھٹی ملتی تھی تو کئی کئی بار وہ اپنا سر کھول کھول کر جھاڑتی۔ اور پھر اُسے طرح طرح سے باندھتی رہتی۔ بال بڑھانے کے کئی نسخے اُس نے یاد کر لئے تھے اکثر بیر کے پتّے پیس پیس کر سر دھوئے جاتی، اور کئی قسم کے اُبٹن دن بھر میں کتنی ہی دفعہ مُنہ پر رگڑ رگڑ کر دھوتی رہتی تھی۔ آپا کا دیا ہوا تحفہ اُس کے پاس ایک پوڈر کا ڈبّہ بھی تھا جس کو وہ اپنے بکس میں آنے والے دن کے انتظار میں چھپائے رکھے ہوئے تھی۔ مگر یہ آنے والے دن کہاں سے آئیں گے۔ اس کو اسی کا انتشار تھا۔ وہ گھنٹوں بہت سی صورتوں کو یاد کرتی رہتی مگر اُسے کوئی بھی پسند نہ آتا تھا۔ وہ حسرت بھری ایک لمبی سانس کھینچ کر اپنے دل میں سوچتی "کیسے شمو بھیّا مل گئے شہناآپا کو"۔۔۔ س کو ایسی باتیں سوچنا بڑا اچھا لگتا تھا۔ ہر روز اُس کے جذبات میں نئی کیفیتیں چھاتی گئیں اور ایک لطیف سی کسک کے ساتھ وہ تیزی سے بڑھنے لگی تھی۔ اُس کے ذہن میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی بسا ہی رہتا تھا۔ کبھی وہ مجبوراً شاکی بھیّا ہی کو ہفتوں اپنے پلنگ پر لیٹی لیٹی یاد کرتی رہتی۔ کیسے ہیں وہ؟۔۔۔ آنکھیں بھی تو اچھی سی ہیں۔ چہرے کی ہنسی ایسی ہے۔۔۔ پھر اُنکی باتیں۔۔۔ اور اُنکی ٹائی کا رنگ زیادہ تر

ٹھوہی رہنا ہے نا؟ ـــــ اور پھر جب وہ کئی بار بلّور رنگ کی ساڑیاں اور دوپٹے رنگ رنگ کر پہن لیتی تو اس کا جی اس بلّور رنگ اور شا کی بھیا دونوں ہی سے اُکتا جاتا تھا ـــــ کبھی کبھی اسکو کتنی بھیا کی سنجیدگی پسند آنے لگتی مگر اس کا دل جلد ہی اُن کی خاموشیوں سے بھی گھبرانے لگتا تھا۔ کتنی ہی یادیں ایسی تھیں جیسے چلتے چلتے وہ دم لینے کو کسی درخت کے سہارے کہیں ٹھہر جائے۔ اور پھر وہ اسی لامعلوم منزل کی طرف بڑھنے لگتی تھی۔ یک بیک اس کو سوچتے سوچتے شوکت یاد آئے جو اماں کے دُور کے رشتہ دار تھے ٹھیک شمو بھیا کی طرح لمبے، خوبصورت سے جب وہ اماں سے ملنے آتے تھے تو منّی کو اُن کے بائیں رُخسار پر چمکتے ہوئے دونوں سیاہ تِل بہت اچھے لگتے تھے۔ اور وہ ہنساتے بھی کتنے تھے کتنا ـــــ منّی کو اپنی منزل قریب جھلکتی ہوئی لگ رہی تھی، وہ اکیلے میں اپنی آواز کی مشق کرتی شہد جیسی میٹھی لچکتی ہوئی آواز۔ جیسی شہنا آپا شمو بھیا سے نغموں میں باتیں کر رہی تھیں۔ اور وہ اپنے سامنے آئینے میں اپنی آنکھوں کی چمک اور لبوں کی جنبش کو دیکھتی رہتی، ایک لطیف سی کپکپاہٹ اسکے جسم میں تیرنے لگی تھی اور عجیب طرح کی سنسناہٹیں ٹھیک اس کے کانوں کے پاس گونجنے لگی تھیں۔ اُس کے خواب میں رنگینیاں چھاتی جا رہی تھیں مگر اُس کے خیالات اب بھی ویسے ہی تھے ادھورے کے ادھورے ـــــ تحفوں کی تمنّائیں تیزی سے بڑھتی گئیں اور نیلے رنگ کے لفافے پر کوئی نام لکھنے کو اُسکی اُنگلیاں کب سے ترس رہی تھیں۔ مگر وہ کس کا نام لکھتی ـــــ ایک دن اماں نے جب شوکت کو خط لکھا تو اُس کے ایک کونے پر منّی نے بھی اپنا سلام اور نہ جانے کیا کیا لکھ دیا تھا۔ اور اُس خط کو چپکے سے اُسی نے ڈاک میں بھجوا دیا تھا کہ کہیں اماں نہ دیکھ لیں مگر جب شوکت کا خط آیا تو اماں کی لمبی آواز گھر کے نئے ریفوررس چھتوں میں گونج اٹھی "منّی"۔ اور منّی نے جب اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں شوکت کا خط لے کر پڑھا تو اس میں صاف لکھا ہوا تھا۔ "تم جو یہ لکھتی ہو کہ میں یہ نہ لکھوں کہ تمہارا خط ملا تو اچھا بھئی تمہارا خط نہیں ملا ہے۔" "اماں آپ ہی نے تو منع کیا تھا کہ کہیں خط نہ لکھوں، اسی لئے میں نے سلام لکھ کر منع کر دیا تھا کہ آپ نہ سُنیں۔" شوکت کا شوخ خط پڑھ کر اماں مسکرانے لگیں "بیوقوف اتنی بڑی ہو گئی مگر عقل نہ آئی۔" اور وہ جان چھڑا کر سیدھی اپنے کمرے میں بھاگ گئی "توبہ کیسے ہیں یہ شوکت ـــــ ؟ ایکدم سے اُلّو ـــــ اُنہہ" ـــــ اس کا دل حقارت سے بھر گیا۔ شہنا آپا کی طرح ایک نیلا سا موٹا لفافہ جو اُس نے شوکت کو لکھنے کو سوچا تھا تو کیا ہوتا۔ وہ ضرور اماں کو بھیج دیتے نہ میرا خط۔ اس خیال کے آتے ہی اس کا سارا جسم کانپ گیا۔ "بڑے بنتے ہیں بیچارے۔ جیسے اُن سے بڑھ کر اور کوئی ہے ہی نہیں"۔ اس کی منزل اب پھر بہت دُور ہو گئی تھی مگر کسی طرح گھسٹتی ہوئی اُسے چلنا ہی تھا آخر ـــــ کبھی کبھی شوکت کے خط کی شوخی اُس کو اچھی لگتی مگر کیسی خطرناک تھی یہ شرارت اُن کی ـــــ !

اس کے سُنسان گھر میں خالہ اماں اور ان کی لڑکیوں کے آجانے سے ایک رونق آگئی تھی۔ آنو باجی شادی کے بعد پہلی بار یہاں آئی تھیں، روشن بجیا اور نزہت آپا بھی بڑی بڑی سی ہو گئی تھیں لیکن پھر بھی شہنا آپا کا سا حُسن کسی میں بھی نہیں تھا۔ سب کی سب دبی دبی سمٹی سمٹی ہوئی سی تھیں، منّی کو کوئی بھی اچھی نہ لگیں۔ بس یہی ہوا کہ گھر میں ہنگامے کچھ اور زیادہ بڑھ گئے اور خالہ اماں کی نگاہوں میں تو روشن اور نزہت آپا دونوں کی دونوں مجرم جیسی تھیں، جب بھی خالہ اماں کی تیکھی نگاہیں ان کی طرف اُٹھتیں بس وہ سہم جاتیں۔ ہر گھڑی ایک چوکیدار کی طرح وہ اُن دونوں کی نگہبانی کرتی رہتی تھیں اور اب اُن کی لپیٹ میں منّی بیچاری بھی آگئی تھی ـــــ مگر اسے ان کی آنکھوں کے غصّے اور آواز کی سختی کی ذرا بھی پروا نہ تھی، اور وہ یہ دکھا دینا چاہتی تھی کہ وہ کسی سے بھی نہیں ڈرتی ہے ـــــ بس ڈراتی رہیں اپنی اُنہی دونوں بیٹیوں کو خالہ اماں کے آتے ہی جیسے ہر طرف سرگوشیوں کے بادل سے چھا گئے تھے، ہر گھڑی سر جھکائے باتیں ہو رہی ہیں۔ آنو باجی اماں اور خالہ اماں کی سرگوشیاں کتنی معنی خیز ہوتی تھیں۔ لاکھ کوشش پر بھی منّی ساری باتیں نہ سُن سکی، بیچ بیچ میں شہنا آپا اور کبھی کبھی شمو بھیا۔ تحفہ اور خط کا نام آجاتا تھا ـــــ خالہ اماں کی چوکس نگاہیں بار بار روشن نزہت اور منّی پر

پھسلتیں اور پھر وہ اپنی باتوں میں لگ جاتی تھیں۔ اماں کا شکست اُترا اُترا چہرہ اور ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں اور خالہ اماں کی خشمگیں نگاہیں اور چوکتی ہوئی نگہبانی میں مِنّی کو محسوس ہوتا جیسے گھر کے سارے در و دیوار بھی ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے ہیں "شہناز آپا۔ شمو بھیا"۔ اس کو یہ دونوں نام عزیز تھے اور وہ ان کے خلاف نفرت کا اظہار نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس کو یہ سرگوشیاں بڑی اچھی لگتیں اور کبھی کبھی اس کا جی چاہنے لگتا جیسے کوئی شہناز آپا کی جگہ مِنّی کا نام لیتا ـــ اور اس کے ساتھ۔ وہ سوچ میں پڑ جاتی اور کس کا نام ـــ؟ بلا سے شوکت ہی کا نام کوئی لے لیتا۔ وہ خالہ اماں کو ستا ستا کر زور زور سے قہقہے لگاتی۔ جھوم جھوم کر چلتی اور دوڑ دوڑ کر پھر پتنگ اڑا لے گئی تھی۔ اس طرح وہ اپنی شہناز آپا کا تھوڑا سا بدلہ تو خالہ اماں سے بک بک کرا کے لے لیتی تھی۔ روشن، نزہت اور آنو باجی کو جلا جلا کر وہ شہناز آپا کی باتیں کرتی رہتی "میری آپا کتنی اچھی سی ہیں وہ ـــ اور سب اُنہہ۔ توبہ۔ چھی"۔ وہ ہونٹ بچکا کر کہتی ـــ شہناز کا نام سُن کر تینوں بہنیں مسکرا لگتیں۔ اور مِنّی جل بھن کر کباب ہو جاتی "میری شہناز آپا کا بیاہ ہو گا شمو بھیا سے کتنے خوبصورت سے ہیں میرے شمو بھیا۔ اُنہہ آنو باجی کے دولہا جیسے تو نہیں ہیں نہ بڈھے سے ڈاڑھی والے جن کو دیکھ کے بس گھِن آ گئی"۔

آنو باجی کے چہرے پر ایک کھسیانہ سا غصہ آ جاتا، روشن اور نزہت آپا بیچی نگاہوں سے بس ایک دوسرے کو دیکھ لیتیں اور مِنّی سب سے الگ تھلگ شہناز آپا کی محبت میں تڑپتی رہتی۔

مِنّی بہت دیر سے چھپی ہوئی اپنے کمرے میں پلنگ پر بیٹھی تھی اس کے گھٹنے پر کتاب کے اوپر سفید کاغذ دھرا تھا، دوات قریب ہی اس کے پاؤں کے پاس رکھی ہوئی تھی اور وہ اپنے ہاتھ میں قلم کو پکڑے ہوئے بہت دیر سے کوئی القاب سوچتے سوچتے تھک گئی تھی۔ ایسے ہی تو کل آنو باجی کہیں خط لکھ رہی تھیں شہناز آپا کی طرح خط لکھتے لکھتے وہ بھی دیکھتی جاتی تھیں کہ کہیں کوئی خط تو نہیں دیکھ رہا ہے ـــ مگر بیچاری شہناز آپا اس کو یہ نام کتنا پیارا لگتا تھا۔ آنو باجی کی طرح وہ ڈھیٹ تو نہیں تھیں کہ کمرہ کھُلا ہوا ہے سب لوگ آ جا رہے ہیں بس بنا ہی پردہ کہ کوئی پڑھ لے اور اس کو بھی آخر مِنّی نے پڑھ ہی لیا تھا ـــ کئی بار قلم کو دوات میں ڈال ڈال کر وہ روشنائی سکھا چکی تھی۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ اس سادے کاغذ پر وہ کیا لکھے ـــ اور ایک زمانے سے کچھ نہ کچھ لکھنے کو اُس کا دل سخت مضطرب ہو رہا تھا۔ شہناز آپا کا خط چُپکے سے نہ پڑھ لینے کا اب اُسے افسوس ہو رہا تھا۔ اور آنو باجی کی طرح لکھنے کو اس کا جی نہ چاہتا۔ ایسے ہی بیکار بیٹھے سامنے کی دیوار کو تکتے تکتے اس کا جی چڑچڑا سا ہو رہا تھا "توبہ۔ چھی۔ اب تک اسے ایک خط بھی لکھنا نہ آیا"۔ اس خیال کے آتے ہی اُس نے اپنے قلم کو پھر روشنائی میں ڈبویا اور سر جھکا کر بڑے انہماک سے لکھنے لگی۔

"ارے بے شرم بیہودہ تیرے ہاتھ میں بھی دوات قلم آ گیا"۔ اماں نے کاغذ جھپٹتے ہوئے کہا۔ اور کاغذ پڑھتے پڑھتے جیسے ان پر دل کا پرانا دورہ پڑنا شروع ہو گیا۔ اور وہ زور زور سے ہانپنے لگیں۔ "بول یہ خط تو کس کو لکھ رہی تھی" ـــ؟ انہوں نے اُس کی کلائی پکڑ کر پلنگ پر سے کھینچتے ہوئے کہا ـــ اور بیچاری مِنّی ابھی یہی انتخاب تو نہ کر سکی تھی پھر وہ کیا بتاتی کہ "کس کو" ـــ!

ریزۂ مینا

اُردو کے بہترین پچاس افسانوں کا مجموعہ۔ سنہ ۳۰ء سے سنہ ۴۲ء تک ساقی میں سینکڑوں افسانے شائع ہوئے، انہی منتخب افسانوں میں سے شاہد احمد دہلوی نے یہ پچاس افسانے انتخاب کئے ہیں۔ مشہور نقادوں کی رائے ہے کہ جدید اُردو افسانے کا ایسا کوئی اور مجموعہ شائع نہیں ہوا جو ہمارے افسانے کی تدریجی ترقی کا آئینہ دار ہو۔ ریزۂ مینا افسانوی ادب اُردو کے بحرِ ذخار میں ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کتاب نایاب تھی۔ اب پھر بڑے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ ضخامت (۵۵۰) صفحے۔ مجلّد، جلد پوش سے آراستہ۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ قیمت پانچ روپے (ﷲ)

اپنے شہر کے کتب فروشوں یا

ساقی بُک ڈپو، دہلی سے طلب کیجیے!

ضیا فتح آبادی

فرار

جھنجھوڑ کر یہ کس نے خوابِ ناز سے جگا دیا
میں سو رہا تھا گہری نیند بے خبر مآل سے
نہ ابتدا کا عکس تھا خیال کی نگاہ میں
میں پی رہا تھا پے بہ پے
انڈیل کر شرابِ وقتِ حال کے پیالے میں
حیاتِ مختصر میرے لئے پیامِ عیش تھی
شباب و حسن کی لذیذ چٹکیوں سے گدگدی تھی قلب میں
سجی سجائی اک عروسِ نو کی طرح دل نشیں
بہارِ غنچہ ہائے آرزو کو تھی نکھارتی
بھنور میں ولولوں کے پھنس گئی تھی کشتیِ جنوں

تہِ زمیں مہیب گڑگڑاتا زلزلہ گیا
لرز اُٹھی تمام کائنات — آنکھ کھل گئی
— کھلی جو آنکھ تیرگی ہی تیرگی تھی ہر طرف
شباب و حسن اور بہار میں سے کوئی بھی نہ تھا
رباب و چنگ بھی نہ تھا
دل و دماغ پر طلسمِ انقلاب چھا گیا
اُتر گیا خمارِ بادۂ فسونِ انبساط

نگاہ رفتہ رفتہ تیرگی سے آشنا ہوئی
نقوش ہلکے ہلکے آ گئے اُبھر کے سامنے
وہ صورتیں جنہیں میں جانتا تھا — جانتا نہ تھا
جو میرے ذہن و فکر کی حدود سے بھی دور تھیں
نقاب اُٹھا کے جلوہ گر تھیں اپنے اصلی روپ میں
نڈھال اور مضمحل
کہیں رگوں میں خونِ گرم کا نشان تک نہ تھا
پچک گئے تھے گال اور لبوں پہ تھیں سیاہیاں
سیاہیوں سے ہمکنار زردیاں تھیں موت کی

یہ تشنگی، یہ بھوک، جس کی انتہا کوئی نہیں
یہ جاگتے ہوؤں کے خوفناک لرزہ خیز خواب
یہ چیختی ہوئی فضائیں روز و شبِ حیات کی
یہ بلبلاتی آرزوئیں قلب کے مزار پر
سکوں کا خون بیقراریوں کی مانگ کا سہاگ
یہ وحشیانہ کوششیں حصولِ مدعا سے تنگ
فریب و مکر کے بچھے ہوئے ہر ایک سمت جال
یقیں کے پاؤں اور بدگمانیوں کی بیڑیاں
— ازل سے آدمی اسی طرح اسیرِ زیست ہے

تمام پردے ایک ایک کر کے خود سرک گئے
حقیقتیں جو روشنی میں آنکھ سے چھپی رہیں
وہ ظلمتوں کا سینہ چاک کر کے جگمگا اُٹھیں
کھلا جو رازِ کائنات، دل میں ایک درد اُٹھا
فرار کی تلاش رینگنے لگی دماغ میں
میں سونا چاہتا ہوں پھر — !

اکالی گربچن سنگھ

وہ لال لال شعلے

کسی وسیع سمندر کی لہروں کے مانند اس کھولتے ہوئے سُرخ مادّے کے سمندر سے بھی بھیانک شعلے نکل رہے تھے جو کہ ایک چھوٹی سی دراز سے باہر جھانک رہے تھے۔ باہر کتنا اندھیرا تھا اور ان جھانکنے والے شعلوں کی روشنی کسی حسینہ کے لبوں کی زہریلی مسکراہٹ سے کم نہ تھی۔ اُبلتے ہوئے مادّے کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ برقی قمقموں کی روشنی سے باہر کی دُنیا سُرخ انگارے کی رنگت اختیار کئے ہوئے تھی گیس پروڈیوسر انجنوں کی بھنبھناہٹ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ان کی تیز رفتاری سے مل کی اوپر کی چھتیں کانپ رہی تھیں۔ مزدور گھبرائے پھر رہے تھے۔ انگریز آفیسر آنکھوں پر نیلے رنگ کا موٹا چشمہ چڑھائے ہوئے سرخ شعلوں اور اُبلتے ہوئے مادہ کو جھانکنے کی خاطر اپنی بکھری قوت کا اجتماع کر رہا تھا۔ وہ جیسے موت کے شعلے لپک رہے تھے۔ زندگی کو جھلس دینے والے سُرخ انگارے۔

باہر ایک طوفان برپا تھا۔ ایسا طوفان جو زندگی کی خشک امیدوں سے کھیلا کرتا ہے۔ وہ گھاس پھولس کے چھپر اُڑا دیتا ہے نوشگفتہ کلیوں کو بکھیر دیتا ہے۔ گھر کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کو گُل کر دیتا ہے۔ دُنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک دیتا ہے۔ پھر اندھیرا، اندھیرا۔ . . . چہار سو اندھیرا ہی اندھیرا . . .

پھر اس وقت ہلکی ہلکی تاریکی۔ کارخانہ کی اس جھلسی ہوئی گھاس پر کچھ دیر برسے ہوئے پانی کی ننھی ننھی بوندیں یوں کانپ رہی تھیں جیسے انسان کے حقیر ارادے۔ پھیلی ہوئی وہ روشنی جو کسی عشوہ طراز حسینہ کی زہریلی مسکراہٹ سے کم نہ تھی انھیں جلا کر بھسم کر دینے کو تھی۔ اب کارخانہ کی اونچی فلک بوس چمنیوں نے دھوئیں کے ساتھ ساتھ سُرخ انگارے اگلنے شروع کر دیئے تھے۔ جو اندھیرے کو چاٹنے کی کوشش میں محو . . . کوشاں . . . ایک چتا کی بھیانک لپٹوں کی طرح چاہتے تھے جلا ڈالیں، راکھ بنا دیں [illegible] کر دیں۔ طوفان بھیانک قہقہہ لگا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے آکاش پر آگ لگ گئی ہے۔ وہ پہاڑوں سے گھری ہوئی وادی جیسے جہنم خانہ ہو۔ شعلوں میں لپٹی ہوئی دنیا، شعلوں میں جھلسی ہوئی کائنات انسان کے گہرے خیالات کی تپش، گھبراہٹ کی گرمی۔ نتیجہ یہ کہ مزدور ہانپ رہے تھے شعلوں کی طرح۔ اور ان کے سینوں سے گرم گرم کانپتی ہوئی سانسیں شاید گیس سے زیادہ تیز بہہ رہی تھیں۔ فاسفورس اور ایمونیا کے دھوئیں کی مغلظ اور کڑوی بُو سے دماغ پریشان تھے۔ اُبلتے ہوئے مادہ کو چاہئے تھا کہ اُبل کر بہہ جائے۔ کہیں سرد نہ ہو جائے ورنہ یہ آہنی منجمد مادہ توپ کے گولوں سے بھی نہ ٹوٹ سکتا۔ انگاروں سے بھی نہ گلایا جا سکتا۔ پھر اور کونسی وہ حرارت رہ گئی تھی جو اپنی طاقت سے اس کی سختی نرم کر دیتی۔

انگریز افسر نے پھر ایک مرتبہ اُبلتے ہوئے مادّہ کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھوں پر نیلے رنگ کا ایک موٹا چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ اس کے سرخ چہرے سے پسینہ کی بوندیں ٹپک ٹپک کر گرم لوہے کی چادر پر خشک ہو رہی تھیں۔ جیسے امید دھواں بن کر اڑ رہی تھی۔ پگھلے ہوئے مادہ کا سُرخ دھواں۔ نیچے بڑے سے شگاف کا جمع شدہ لاوا پگھلنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ کیا شعلے اپنی حرارت کھو بیٹھے تھے۔ جلا کر راکھ کر دینے والی آگ ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ کاربون اور ایسیڈ رنگ برنگے دھوئیں چھوڑ رہے تھے۔ فضا میں ارتعاش برپا تھا۔ مزدوروں کے حوصلے پست تھے۔ یہ رنگ برنگ کے شعلے، نیلے پیلے اور سُرخ امیدوں سے کھیل رہے تھے۔ اور وقت گزرتا جا رہا تھا جیسے چمنیوں کی لال لپٹوں والا دھواں بن کر آکاش کا جہنم بن جائے سُرخ جہنم کا آتشکدہ۔ جہاں تاروں کا نام نہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے آگ پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارے سر پر، ہماری دنیا پر۔ جہنم کی آگ۔

افسر نے ایک گہرا سانس لیا۔ کچھ سوچتا ہوا اپنے دفتر میں داخل ہوا۔ فون اٹھایا۔ ایک لمحے کے لئے پھر کسی گہری چنتا میں کھو گیا۔ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ کیا شعلے اس سے بھی زیادہ بھڑک سکتے ہیں۔ کیا چنگاریاں اس سے بھی زیادہ دمک سکتی ہیں۔ مادہ اور بھی زیادہ اُبل سکتا ہے۔ دُھواں اور بھی زیادہ رنگ اختیار کر سکتا ہے۔ اس موجودہ حالت سے بھلا اور آگے کیا ہو سکتا ہے؟ افسر دیکھنا چاہتا تھا۔

"ہیلو! ہیلو!! گیس کا پریشر اور بڑھا دیا جائے"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟"

"گیس کا پریشر اور بڑھا دیا جائے ۔"

"گیس کے پائپوں کے پھٹ جانے کا احتمال ہے ۔"

"نہیں کوئی احتمال نہیں ۔ میں کہتا ہوں گیس کا پریشر بڑھا دیا جائے ۔" افسر نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے مدقوق چہرہ کا پسینہ پونچھا ۔ گیس کے دباؤ سے اب دہکتی ہوئی پلٹیں اپنے تاؤ میں نہ رہ سکیں گی ۔ آہنی مل کا جہنم خانہ کانپتا ہوا نظر آئے گا چھتیں گل کر نیچے آ رہیں گی ۔ یہ مزدور ، یہ کیڑے مکوڑے جو سدا اس کی تنگ نظری کا شکار رہے جھلس کر دھواں بن جائیں گے ۔ برقی قمقموں کی روشنی ماند پڑ جائیگی ۔ امید کے دسیلے ناامیدی کے انگاروں سے یوں ہی چٹکی میں کھیل سکتے ہیں ۔ اس نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا ۔

پھر اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ واقعی مل کی چھتیں کانپ رہی ہیں یا کوئی اور قیامت برپا ہے ۔ سائیں سائیں اور بھائیں بھائیں کی نامراد آوازیں اب سنائی دے رہی ہیں ۔ گھبراہٹ کی وجہ سے لوگوں کے دل بے قابو ہو رہے ہیں ۔ یوں لگتا ہے دماغ پھٹ جائیگا ۔ دلوں کی حرکت رک جائیگی ۔ دوسری مل والے تعجب سے چمنیوں کے سرخ شعلوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں ۔ دانتوں تلے انگلی دباتے ہیں پر کچھ کہتے نہیں ۔

پھر بھی نہ جانے کیوں افسر سر جھکائے ہوئے کسی سوچ میں بیٹھا ہوا تھا ۔ فون کی گھنٹی بجی "ہیلو ، ہیلو"

"گیس !"

"ہاں گیس کا پریشر کم کر دیا جائے ۔" افسر تیزی سے اٹھا اور باہر نکل گیا ۔ دروازہ پر مزدوروں کا ایک کثیر ہجوم کھڑا تھا اس نے پوچھا "کیا بات ہے ۔"

"حضور ، حضور ۔" کوئی کچھ نہ بولا ۔ سب ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھنے لگے ۔

افسر نے ڈانٹ کر کہا "جاؤ ۔ جا کر اپنی ڈیوٹی سنبھالو ۔ تمھیں ڈیوٹی چھوڑ کر آنے کے لئے کس نے کہا ۔" سب خاموش چل دیئے ۔

"موتی ، او موتی ؟ " افسر نے پکارا ۔

"جی حضور ۔" سارے مزدوروں نے منہ پھیر لیا ۔ افسر چیخ کر بولا "میں موتی کو بلاتا ہوں ۔ تم سب اپنی ڈیوٹی پر چلے جاؤ ۔ موتی ! تم ادھر آؤ ۔" موتی قریب آ گیا "چلو میرے ساتھ دفتر میں ۔"

صاحب نے اشارہ کیا ۔

ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے افسر نے کہا "تم ایک کام کر سکتے ہو ؟"

"جی حضور !"

"گھبراؤ گے تو نہیں ؟"

موتی واقعی گھبرا گیا ۔ تعجب سے پوچھا "کیا کام ہے حضور ؟"

"ہلکا سا کام ہے ۔ لیکن ہمت کا ۔"

"جی حضور کروں گا ۔"

"تو تو سنو ۔ " افسر رک گیا ۔ موتی کا چہرہ بھانپا ۔ افلاس اور غریبی و مجبوری کی تار ، بیا جھلک دکھائی دی ۔ اور مجبوری کی تہہ میں میٹھی بھیک ، دو جھوٹے ٹکڑے ۔ کچھ عنایت ۔ ہاتھ پیا سے نہیں ۔ خاموش فریاد ۔ بالکل خاموش ۔ "تو تو سنو ۔" افسر بولا "تمہیں ترقی ملے گی ۔ تمہیں پیسے زیادہ ملیں گے بس میرا ایک کام کر دو ۔" موتی گڑگڑا کر بولا "جی ہاں حضور میں کروں گا ۔ فوراً ابھی حکم دیجئے ۔"

"ہلکا سا کام ہے ۔ لیکن ہے ہمت کا ۔ یاد رہے ۔"

"میں سمجھ رہا ہوں ۔ وہ بالکل معمولی سا کام ہوگا ۔ ہلکا سا ۔ لیکن ہمت کا ۔ آپ حکم دیجئے ۔"

"تمہارا کوئی دشمن ہے ۔"

"نہیں تو ۔"

"ہوگا !"

"نہیں حضور میرا کوئی دشمن نہیں ۔"

"ہوگا ۔ اور ضرور ہوگا ۔ خیال کرو ۔"

"میرا کوئی دشمن نہیں حضور ۔"

"کوئی دشمن نہیں ۔ چمارو ۔ جھو ٹو ۔ بھگتو ۔ کالو ۔ مالی ۔ چرن ۔ کیا تیرا کوئی دشمن نہیں ؟"

"خیال میں نہیں آتا حضور ۔ میں ۔ میں ۔ میرا کوئی دشمن نہیں ۔"

"نہیں ۔ ضرور ہوگا ۔ . . تمہارا دشمن کوئی ضرور ہوگا ۔"

"کیسے کہوں ۔ میرا تو کوئی دشمن نہیں ۔"

"افسر چڑ کر بولا "تمہارا کوئی دشمن نہیں تو کسی کو بنا کیوں نہیں لیتے ۔"

"کیا کہا حضور ؟"

"تم یوں کرو کہ اپنے دشمن سے بدلہ لو۔ اسے اٹھاؤ اور کسی طرح اُبلتے ہوئے مادّہ میں پھینک دو۔ تاکہ . . . . تاکہ . . . . مادہ کے سرد اور خراب ہونے سے پہلے ہمیں ایک بہانہ مل جائے . . . . لاکھوں کا نقصان [illegible] ہے۔ . . . میری نوکری چلی جائیگی۔"

موتی کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی "کیا کہا . . . کیا بولے حضور ؟"

افسر کڑک کر بولا "وہ چرن۔ وہ پیلا، بلا سا انسان۔ دمہ کا شکار، ہڈیوں کا ڈھانچہ، کیڑوں کا گھر، گندگی کا ٹھیکہ دار، یعنی جہنم کا مالک . . . وہ تمھارا دشمن ہے۔"

"میرا دشمن ؟"

"ہاں۔ ہاں تمھارا دشمن، تمھاری تقدیر کا دشمن . . . تمھاری ترقی کا دشمن۔ اسے مرجانا چاہیئے۔"

"لیکن یہ کام تو بڑے جوکھم کا ہے۔"

"جوکھم کا نہیں . . . ہمت۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں، ہمت کا کام ہے۔" افسر نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ پھر مخاطب ہوا۔ "کیا تمھارے بازوؤں میں زور نہیں۔ تجھ میں ہمت نہیں۔ میں نہ کہتا تھا وہ جو کام تمہیں بتایا جائیگا ہمت کا ہے۔ ہمت کا۔"

موتی نے کچھ جھجکتے ہوئے کہہ دیا "حضور آپ کے بازوؤں میں تو مجھ سے بھی . . . زیادہ ہمت ہے . . . لیکن یہ بھڑکتے ہوئے شعلے، یہ خونخوار لپٹیں۔ چرن نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔" . .

یکلخت موتی کہتا کہتا رک گیا۔

افسر موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ اطمینان سے بولا۔ "شاید تم موتی سے خوف کھاتے ہو۔ تم اپنی ہمت سے کام نہیں لے رہے۔ تم یہ نہیں سمجھتے کہ وقت سے عقلمند فائدہ اٹھایا کرتے ہیں۔ تمہاری قسمت جاگ اٹھے گی۔"

"اور مجھے۔ مجھے . . ."

"تمھیں مالا مال کر دیگی۔"

"حضور۔ یہ تو گناہ ہے۔ کیونکہ وہ میرا دشمن نہیں۔"

"وہ تمہارا دشمن ہے۔ اور یہ ہمت کا کام ایک تماشہ ہے گناہ کیسے ہوا۔ پیٹ اور زندگی خاطر سب کام کئے جا سکتے ہیں۔ تم اب بھی اسے گناہ ہی سمجھ رہے ہو۔"

"کچھ بھی ہو۔ چرن تو میرا دشمن نہیں۔"

"تم تو ہو۔"

"میں چرن کا دشمن نہیں۔" مزدور گھبرا اٹھا۔

"تو کیا ہوا۔ تم چرن کے دشمن بن جاؤ۔"

"نہیں۔ حضور نہیں۔ آپ مالک ہیں۔ میں کسی کا دشمن نہیں بن سکتا۔ میں غلام ہوں۔ غلام ہوں . . . غلام !"

"تو جاؤ۔ جاؤ، جا کر میرا حکم بجا لاؤ۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں تم ابھی فوراً چلے جاؤ۔ فوراً سے پیشتر یہ حکم بجا لاؤ۔ جاؤ . . . چلے جاؤ۔"

موتی تیزی سے باہر نکل گیا۔ افسر نے سر تھام لیا۔ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ یہ معمولی کام پھر جس کے کرنے سے موتی گھبراتا ہے۔ پاگل . . . پاجی . . . خونی . . . خونی . . . دغا باز . . بے رحم . لالچی . . . . لیکن فوراً ہی چونک اٹھا۔ وہ کیا بول رہا ہے۔ فون کی گھنٹی بج رہی تھی "ہیلو، ہیلو !"

"پریشر ؟"

"ہاں تھیں کا پریشر تیز کر دو" کچھ دیر کے رُکے ہوئے شعلے پھر بھڑک اٹھے۔ سائیں، سائیں اور بھائیں اور بھائیں بھائیں کی بدمزہ آواز جیسے بھوک سے رونے والے کتوں کی دردناک صدا بن کر جہنم خانہ پر چھا گئی۔

وہ قیامت کی رات . . . !

کچھ دیر بعد دو سائے جو تاریکی میں آہنی دیوار کے سایہ تلے ایک طرف بڑھ رہے تھے ایک پھسپھسایا۔

"چرن! تم یہ آواز سن رہے ہو نا ؟" دوسرا جواب میں کچھ نہ بولا۔

"نہ جانے تم کس خیال میں ہو۔ میں موتی ہوں موتی۔ کسی ٹھیکہ کا مالک نہیں جو تم سے افیون کے پیسے مانگ رہا ہو۔ تم ہو کس جھونک میں۔ کچھ سُنتے ہی نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں یہ آواز سن رہے ہو نا۔"

"یہ کس کی۔ کیا اس انجن کے وسل کی۔ شاید اسی لائن پر آ رہا ہے۔ دیکھو یہ لوہے کی پٹڑی کانپ رہی ہے۔ تیز روشنی سے آنکھیں چُندھیا رہی ہیں۔ انجن کے بھیانک سیاہ چہرے پر روشنی کی آنکھ کس قدر چمک رہی ہے۔ چلو پرے ہٹ چلیں۔"

"تم بڑے ڈرپوک ہو۔ افیون کھاتے ہو نا اسی لئے۔"

"میں افیون بالکل نہیں کھاتا۔ میری دھنسی ہوئی آنکھیں اور کمزور ہانپتی ہوئی چھاتی دیکھ کر شاید تم سمجھ رہے ہو گے۔ لیکن . . .

یہ میری پریشانیوں کا نتیجہ ہے۔ میں ڈرپوک بھی نہیں۔"

"تم انجن کے نیچے آکر مرنے سے ڈرتے ہو۔ شاید تم بڑی بڑی مشینوں سے بھی گھبراتے ہو گے۔"

"بڑی مشینوں کو دیکھ کر گھبراتا تھا نہیں۔ اکثر سوچ میں پڑ جایا کرتا ہوں۔ کہ ایک انسان اپنی ذہنی کاوش سے کبھی کبھی کچھ ایسی چیزیں ایجاد کر لیتا ہے کہ وقت آنے پر خود اس کے آگے ہار ماننی پڑتی ہے۔ اور وہی اس کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔"

"شاید یہ نتیجہ تم نے آج کے اُبلتے ہوئے لوہے کو دیکھ کر نکالا ہے۔"

"نہیں اُبلتا ہوا لوہا تو مجھے ایک تماشا نظر آتا ہے۔ میں اسے کھیل سمجھتا ہوں۔"

"شاید تم نے وہاں جھانک کر نہیں دیکھا۔ ابلتا ہوا مادہ بل کھاتے ہوئے شعلے۔ امڈتا ہوا دھوئیں کا طوفان۔ گیسوں اور دیگر اجزا کی بو کیسی عجیب چیزیں ہیں۔"

"ہاں عجیب چیزیں تو ہیں۔ بو ایسی ہی ہی تو محسوس ہوتی ہے جیسے کوئی مردہ جل رہا ہو۔ شعلے یوں بھڑکتے ہیں جیسے کوئی چتا جل رہی ہو۔ مادہ یوں پگھلتا ہے جیسے انسان کی چربی ڈھل رہی ہو۔ مغز اُبل رہا ہو۔ تمہاری ناک میں کیا کسی انسان کے جلنے کی بو نہیں آرہی۔"

موتی نے ناک سے لمبا سانس کھینچا "ہاں آتو رہی ہے جیسے کوئی انسان جل رہا ہو۔ لیکن یہ بو انسان کے گوشت کی کیونکر ہو سکتی ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں جب میرا بائیس برس کا نوجوان لڑکا، ایک پرانی مشین جسے وہ اپنے بازوؤں سے چلانے کی کوشش کر رہا تھا الجھ کر کٹ مرا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں اسے آگ دی تھی۔ اس وقت بھی تو بھیانک شعلوں کی پروا نہ کرتا ہوا میں چتا کے قریب کھڑا اس غریب کی لاش جلتی دیکھ رہا تھا۔ بس دھوئیں سے ایسی ہی بو آرہی تھی جیسی کہ اس وقت تم محسوس کر رہے ہو۔ یہ انسان ہی کے گوشت کی بو ہے میرے یار!"

"نہیں۔ یہ انسان کے گوشت کی بو نہیں کسی حیوان کے گوشت کی بو ہے۔ شاید کوئی بھٹکا ہوا الو چمنی کے لپکتے ہوئے شعلوں کی زد میں آگیا ہے۔ یہ حیوان کے جلنے کی بو ہے۔ انسان کے جلنے کی نہیں۔"

چرن ان سیاہ رنگ کی اونچی اونچی چمنیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ بولا "پاگل معلوم ہوتے ہو۔ دیکھتے نہیں چمنیوں کے شعلے نیچے دھرتی میں سما چکے ہیں۔ دھواں بھی کم ہو گیا ہے۔ ہلکی ہلکی بھاپ نکل رہی ہے۔ . . . کہیں لوہا سانچوں میں ڈھل تو نہیں رہا؟"

"نہیں، دیکھ نہیں رہے۔ سیاہ انجن کی تیز روشن آنکھ اب بھی اتنی ہی دوری پر گھڑی ہمیں گھور رہی ہے۔ اُسے سانچوں کے ساتھ وہاں پہنچ جانا چاہئے تھا۔"

"ہاں، لیکن کیا وجہ ہے؟"

وہ لو انجن کی بتی گل ہو گئی۔ اب یہاں گھنی تاریکی پھیل گئی ہے . . . انجن بھاپ چھوڑ رہا ہے۔

"ہوں! اب شاید تمہاری ناک جلے ہوئے گوشت کی بو محسوس نہیں کرتی۔"

"جلے ہوئے گوشت کی بو اب بھی آرہی ہے۔ چہار سو فضا متعفن ہے۔"

"یہ خیالی بو ہے۔ تمہارے تصور میں جابجا سینکڑوں چتائیں جل رہی ہیں۔"

"لیکن تم کانپ رہے ہو۔ کیا وجہ ہے؟"

"کچھ نہیں۔ ذرا دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔"

"ایسے ماحول میں دل دھڑکا ہی کرتے ہیں۔ ٹھنڈا پانی پی آؤ۔ طبیعت ٹھکانے لگ جائے۔"

"چلو اس اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آجائیں۔"

دونوں سیاہ دیوار کے سایہ سے ہٹ کر نل کی طرف روانہ ہو گئے۔ انجن کی بھاپ نکلنی بند ہو چکی تھی۔ بتی ابھی تک گل تھی۔ چمنیوں کی وہ عریاں قطار اندھیرے میں کسی پہاڑی کی خشک چوٹیوں کی طرح بے رونق دکھائی دیتی تھی۔ مشینوں کا شور کچھ کم ہو چکا تھا۔ چرخ کو گرمانے والے بلند شعلے دب چکے تھے۔ ایک ویرانی سی پھیلی ہوئی تھی۔ مہیب ویرانی۔ مل کی چھت نے کانپنا بند کر دیا تھا۔ شاید اسی لئے چرن بولا "تو کیا واقعی کسی الو نے چمنی کے دہن دوز آتشی کنوئیں میں گر کر جان دیدی ہو گی۔"

"میرا تو یہی خیال ہے۔"

"تم غلطی پر ہو۔ الو بھلا ان لپکتے ہوئے شعلوں کی روشنی میں کیوں آنے لگا۔"

"شاید کوئی چتا سمجھا ہو۔"

"وہ بھی کوئی تماشا ہے!"

"تماشا تو نہیں لیکن تماشے ہی کی ایک طرح ایک کھیل ہے"

"کیا انسان جل کر نہیں مر سکتا"

"شاید تمھارا مطلب گویا پگھلانے والے بھٹوں سے ہے اس میں آدمی گر نہیں سکتا۔ جبراً گرایا جا سکتا ہے"

"شاید اس بھٹے میں آج کوئی آدمی گرا دیا گیا ہو"

"یوں کبھی نہیں ہو سکتا"

"لیکن میں سمجھتا ہوں یہ کوئی بڑی بات نہیں"

"بہت بڑی بات ہے۔ تم اسے نہیں سمجھ سکتے"

"میں سمجھ کر باتیں کر رہا ہوں"

"تمھیں کچھ علم نہیں"

"میں جانتا ہوں"

"کہنے والا اسے آسان کام کہہ کر حکم دے سکتا ہے۔ لیکن . . . "

"لیکن یہ بات سچ ہے کہ ہمت نہیں پڑتی"

"شاید تمھاری ہمت پڑے"

"اگر میری ہمت ہوتی تو ابھی تک جل کر راکھ ہو گئے ہوتے"

"تب نہ جانے میری ہمت کو کیا ہو گیا"

"تو چلو بھٹے کے قریب ایک دوسرے کی جان سے کھیلیں گتھم گتھا ہو جائیں۔ گر مریں گے تو صاحب کو اچھا خاصا بہانہ مل جائے گا۔ دل ٹھنڈی پڑ جائیگی"

"دیکھو میرا دل پھر دھڑک رہا ہے"

"اب تو ہم روشنی میں آ چکے ہیں۔ یہ لو نل آ گیا ٹھنڈا پانی پی لو۔ دل ٹھکانے لگ جائے"

"دیکھو انجن نے پھر بھاپ چھوڑنا شروع کر دی ہے"

"بتی ابھی تک بجھی ہوئی ہے۔ وہ اس طرف نہ آئیگا"

"شاید ڈرائیور موجود نہیں اسی لئے بتی گل ہے"

"تم پانی پی لو ہم چل کر دیکھتے ہیں"

پانی پی کر وہ انجن کے قریب گئے۔ بھاپ اب بھی نکل رہی تھی۔ واقعی ڈرائیور موجود نہ تھا۔ دونوں اوپر چڑھ کر بیٹھ گئے "اندر بوائلر میں آگ دھیمی پڑ رہی ہے" موتی بولا "ذرا کوئلہ جھونک دو"

چرن کوئلے کے بیلچہ اندر جھونکنے لگا۔

"تمھیں کوئلہ جھونکنا خوب آتا ہے"

"اور تمھیں آدمی جھونکنے خوب آتے ہیں"

"آدمی جھونکنے مشکل ہیں۔ شاید تمھیں اپنوں سے محبت نہیں" فوراً اس نے بات بدل ڈالی۔

"میرا کوئی اپنا نہیں موتی"

"رانی سے تمھاری خوب نبھتی ہے"

"محبت ہے مجھے اپنے دشمنوں سے . . . . . وہ دیکھو پھر چمنی نے شعلے اگلنے شروع کر دیئے ہیں"

موتی نے فوراً مڑ کر دیکھا "ارے یہ کیا"

مل پھر کانپنے لگی۔ شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ سیٹیوں کی آواز پھر تیز ہو چلی تھی۔ سائیں سائیں کا بھیانک شور گونج رہا تھا۔ عین اس وقت ایک کاری ضرب۔ ہاں آہنی سلاخ کا بھرپور ہاتھ چرن نے موتی کی کھوپڑی پر بٹھا دیا۔ دماغ پھٹ گیا۔ خون کی پچکاریاں چھوٹ پڑیں۔ موت نے آہ و فریاد کی مہلت نہ دی۔ چراغ زندگی موت کے ایک جھونکے کی بھی تاب نہ لا سکا۔ اب چرن نے اس کی لاش ریل کی پٹڑی پر رکھ دی۔ انجن نے ہلکی سی جنبش کی۔ سر دھڑ سے علیحدہ ہو گیا۔ اور تب بھی چمنی کے وہ خونخوار شعلے اپنی سرخ زبانیں نکالے للچائی نظروں سے فلک کی طرف گھور رہی تھیں۔ انجن سیاہ دھواں اگل رہا تھا۔ اور چرن کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ لاتعداد الّو آکاش پر منڈلاتے نظر آنے لگے۔ شعلے . . . شاید انسانیت کی لاش کی چتا کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ کچھ دھماکوں کی آواز سنائی دی۔ یوں جیسے بارود میں آگ لگ گئی ہو۔ یہ دیوہیکل چمنیاں کیا انسانی کدے زیادہ سیاہ۔ خود غرضی سے زیادہ سخت اور قہر و غضب سے زیادہ خوفناک ہیں۔ ہر طرف جن اور بھوت ناچتے دکھائی دے رہے تھے اب شور و غل کیسا؟ جیسے جہنم کے دوزخی عذاب سے چیخ رہے تھے۔ وہ مزدور۔ لپکتے ہوئے سرخ شعلوں کو یا موت کو خیر مقدم کر رہے تھے۔ وہ لال لال شعلے . . . وہ لال لال شعلے . . . کیا پیٹ کی آگ سے زیادہ تیز زیادہ خوفناک۔ اور نہیں تو کیا انسانی خون کی حرارت سے زیادہ تیز، زیادہ مہیب۔ لال لال شعلے!

دور کتے بھونک رہے تھے۔ پھر دھماکا ہوا۔ دھما دھم دھماکے ہوئے۔ اور دور کتے بھونکنے لگے۔ کچھ رونے لگے۔ شور مچا ہوا تھا۔ وہ لال لال شعلے۔ وہ لال لال شعلے۔ جن اور بھوت ناچ رہے تھے۔ دوزخی چیخ رہے تھے۔ وہ لال لال شعلے۔ وہ لال لال شعلے!

جاں نثار اختر

دیہات کی شام

ہائے اے دیہات کی معصوم شام
کون سمجھے گا تری رعنائیاں

ڈوبتے سورج کا یہ زریں تھال
یہ افق پر جگمگاتی سرخیاں

دور تک یہ نرم پودوں کی لچک
یہ لہکتی لہلہاتی کھیتیاں

سامنے کھیتوں کی کچی مینڈھ پر
لمبی لمبی ایکھ کی پرچھائیاں

یہ کسانوں کے تھکے قدموں کی چاپ
لوٹتے بیلوں کی بجتی گھنٹیاں

دور میدانوں میں کھیتوں کے پرے
جال سا بنتی ہوئی پگڈنڈیاں

پوکھریا اس کنارے کے قریب
سر نکالے ایک دو پن ڈبیاں

دور تک پھیلی ہوئی پتلی ببول
دور تک پھیلی ہوئی جھڑبیریاں

اودے اودے نیلے پیلے چند پھول
بھٹکی بھٹکی چند پیلی تتلیاں

پاس کے گولر پہ یہ طوطوں کا شور
چہچہاتی گیت گاتی ڈالیاں

فاختہ کی کوک سارس کی صدا
مختلف چڑیوں کی پیاری بولیاں

سر جھکائے اپنے اپنے تھان پر
لوٹ آئیں گائیں بھینسیں بکریاں

یہ برستی سی پھواریں دودھ کی
یہ چھنکتی سی سنہری گگریاں

چند بچے شور و غل کرتے ہوئے
ناچتے گاتے بجاتے تالیاں

گاگریں رکھے کمر پر دیر سے
جمع ہیں پنگھٹ پہ کتنی ٹولیاں

یہ ہنسی یہ ڈل لگی یہ قہقہے
چھیڑ خانی چہل، فقرے پھبتیاں

یہ جگت پر پر سی بچھوؤں کا شور
کانچ کی ہاتھوں میں بجتی چوڑیاں

یہ مسلسل بڑبڑاہٹ ڈول کی
یہ ابر کھلکھلاتی گھرریاں

یہ سروں پر گاگریں جیسے کلس
یہ گلوں میں چاند جیسی ہنسلیاں

یہ کمر کا لوچ، کولوں کی لچک
کان میں چاندی کی ہلتی جھمکیاں

گاگریں کچھ یوں سنبھالے سیس پر
جم گئیں ہوں جس طرح انگڑائیاں

اف یہ رہ رہ کر چھلکتی گاگریں
بھیگتی جاتی ہیں گوری پنڈلیاں

اپنے اپنے موڑ پر لو مڑ گئیں
چلتی پھرتی گاؤں کی رنگینیاں

دفعتاً ساری فضا سنولا گئی
جھونپڑوں میں ٹمٹمائیں بتیاں

خود بخود میدان میں سنکی ہوا
بج اٹھیں جنگل میں کتنی سیٹیاں

آہ اے دیہات کی معصوم شام
کون سمجھے گا تری رعنائیاں

شان الحق حقی

ناداںؔ دہلوی

(مولوی احتشام الدین حقی مرحوم)

حضرت سلامت۔ والد صاحب مرحوم پر مفصل مضمون لکھنے کے متعلق آپ کی فرمائش اس تمام مدت میرے دل پر رکھی رہی۔ ان کے انتقال کو اب کہیں چند روز گزرے ہیں۔ اس عرصہ میں آپ اُن پر کوئی نظم لکھواتے تو شاید میں لکھ سکتا۔ مگر مضمون۔ ایسا جسے پڑھکر آپ میری سعادت مندی ہی کی داد نہ دیں، لکھنا مشکل تھا۔ لہٰذا امید ہے اس ناچیز میں مضائقہ نہ سمجھئے گا۔

عنوان پر آپ چونکے ہوں گے۔ مگر کیا واقعی آپ ان حضرت ناداںؔ سے واقف ہیں جن کا شعر ہے۔

ہائے کیا سانحہ ہے پُرحسرت
آپ بھی جانتے تھے ناداںؔ کو!

اور یہ بھی ؎

دشمنِ داناہی پایا چرخ کو، نادان بھی
یوں جو پُرحسرت گیا، ناداں نہ تھا، داناہی تھا

اتا پتہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ "پُرحسرت" کی تفسیر بہت لمبی چوڑی ہے۔ اس وقت یہ مجھے کاغذ کے ان گھُن کھائے ہوئے پُرزوں پانی کی ڈوبی ہوئی نوٹ بکوں اور ان کے ناقص و ناکارہ اوراق میں نظر آرہی ہے جنھیں میں نے کاغذات کے کئی بکسوں کو کھُدیلنے، الماریوں کو جھاڑنے اور کونوں کھُدروں کو بُہارنے کے بعد جمع کیا ہے آپکو بھی یہ اس روز لغتِ اُردو کی ابنار در ابنار پرچیوں میں نظر آئی ہوگی۔ اپنا یہ سرمایہ تو خیر انھیں کبھی عزیز نہیں رہا۔ مگر لغت کی پرچیاں جان کے برابر تھیں۔ اور اس انبار سے مجھے اور آپ کو خواہ کتنی ہی وحشت ہو۔ انھیں خوب معلوم تھا کہ ناسخؔ کے دیوان سے نکالی ہوئی اسناد اور ساقی کے سالناے یا لوقا کی انجیل یا فلاں افسانہ نگار کے مجموعے سے اخذ کی ہوئی کوئی مثال کونسے پلندے یا کونسی گڈی میں ہے۔

ان منتشر اوراق میں جو مجھے مل سکے کتنے ہی متفرق اشعار، ناقص نظمیں، ادھوری غزلیں، قطعے، سہرے، تاریخیں، منظوم خطوط گیت، ترانے، مختلف زبانوں سے ترجمے، متفرق مضامین کے ٹکڑے غلطنامے، ادبیاد داشتیں، غرضیکہ غزل سے لیکر ہزل تک بہت کچھ موجود ہے۔ اور بہت کچھ سامنے ہوتے پر بھی ناپید ہے یعنی بعض کاپیوں کے اوراق پر یکسر پانی پھرا ہوا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانے نے "پس ماندگان" کی عبرت کے لئے اپنے ہاتھ سے پھیرا ہے۔ ہر چند کہ یہ ناقص و نامربوط اوراق اس وقت باسی پھولوں کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب سے پہلے سامنے آتے اور کسی گلدستہ میں بندھ جاتے تو شاید نگاہ زمانہ کی آبیاری سے تر و تازہ رہ سکتے۔ تاہم دعوتِ نظر ضرور دیتے ہیں۔ اور ان کی ادبی زندگی کا فی دلچسپ نفسیاتی مطالعہ کی گنجائش رکھتی ہے۔ یہ کوئی عہد آفریں شاعری نہیں اور مرتبہ اس کا میری یا آپ کی نظر میں کچھ بھی قرار پائے لیکن اس کی انفرادیت بہت نمایاں ہے۔ اور اسے آپ کسی خاص حلقے یا ذیل میں شمار نہیں کر سکتے (جیسے داغؔ کے بعض شاگردوں کی شاعری کو داغؔ ہی کی شاعری کا ضمیمہ کہہ سکتے ہیں)۔

ناداںؔ کی شاعری کا چشمہ بہت کم عمری میں اور بڑے زور شور سے پھوٹا۔ ذرا سی تحریک پر طبیعت رواں ہو جاتی تھی۔ بات نہیں کرتے تھے شعر کہتے تھے۔ ان کا اپنا بیان تھا کہ ایک زمانے میں سوتے جاگتے دماغ شعر گھڑتا تھا۔ مضمون اور قافیے کانوں میں گونجا کرتے تھے اور میں انھیں مچھروں کی طرح ہنکاتا تھا۔ گو شاعری ذریعہ عزت تو تھی ہی نہیں۔ انھوں نے اسے وسیلۂ شہرت بھی نہ بنانا چاہا۔ جو کچھ کہا علی گڑھ کے مختصر حلقۂ احباب بلکہ اکثر اپنی ہی ذات تک محدود رہا۔ پھر حوادث نے مشقِ سخن تقریباً ترک ہی کرادی۔ ان حوادث میں دیوانِ حافظؔ کے ترجمے کا شغل اور پھر لغاتِ اُردو کی تدوین بھی شامل ہیں۔ یہ دونوں مشغلے طبیعت کے حق میں جو حکم رکھتے ہیں وہ ظاہر ہے۔

نوعمری ہی میں ان کا کلام استادی کے درجے کو پہنچ گیا تھا اس کے بعد صرف اجتہاد کی گنجائش رہ جاتی تھی۔ جو انھوں نے جی بھر کے کیا۔ اس کا اظہار دیوانِ حافظؔ کے ترجمہ سے خوب ہوتا ہے یہ تو شاید آپ کو تسلیم ہوگا کہ اُردو شاعری میں قافیہ سے زیادہ بحر تنگ ہے۔ اور ان ہم نے سب عربی سے لئے ہیں، اور زبان،

خواہ اس میں کتنی ہی عربی، فارسی داخل کیجئے، لازمی طور پر ہندی ہے۔ جس کے اسالیب اور ترکیب فارسی سے زیادہ طویل واقع ہوئی ہیں۔ مثلاً جانش، دلم، گفتش، دیدمت، پدرے بود، پسرے داشت۔ ان کو اُردو کے ہم معنی جملوں کے ساتھ بحر کی میزان میں رکھ کر دیکھئے۔ الفاظ میں جو اندک تصرف فارسی میں روا رکھے جاتے ہیں۔ اُن میں سے بھی بہت سے ہمارے ہاں جائز نہیں۔ مثلاً آپ اگر کی جگہ "ار" نہیں باندھ سکتے۔ اور "کہ از" کی جگہ "کز" کی جگہ کے مشکل ہی سے چند تصرف کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں فارسی سے اردو میں ترجمہ کرنا جس قدر سہل نظر آتا ہے اتنا ہی دشوار ہے۔ پھر ترجمہ بھی دیوانِ حافظ کا اور مترجم بھی مولوی احتشام الدین صاحب جو اس کے ہر شعر اور ہر لفظ میں کتنے ہی معارف ومعانی پاتے تھے۔ چنانچہ انھیں اجتہاد کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ اس کے لئے وہ اپنی ہی زباندانی اور سخن سنجی کو کافی سند سمجھتے تھے۔ دُنیا کا مذاق ویسے بھی مشکل سے بدلتا ہے۔ اور اس سے انھوں نے استصواب بھی نہیں کیا۔

ان کی تعلیم عربی فارسی کے خانگی درس اور نصف حفظ قرآن کے بعد اے۔ بی۔ سی سے ایم۔ اے تک علی گڈھ میں ہوئی۔ شاعری کی داغ بیل بھی وہیں پڑی۔ مقامی واقعات۔ الیکشن کے ہنگاموں یونین کی رونق اور انتخابات کی ہنگاموں پر بہت کچھ کہتے رہتے تھے۔ علی گڈھ میں اپنے وقت میں بڑی دھوم کے شاعر تھے۔ یہ ان کی ابتدائی مشق تھی کوئی بہت رفیع وبلیغ شاعری نہ تھی۔ مگر ان باقی ماندہ یادگاروں میں بھی بہت دلچسپ چیزیں موجود ہیں۔ ایک بہت ابتدائی نظم کے چند اشعار دیکھئے۔ جس پر تحریر ہے کہ یونین کے سالانہ جلسے میں سُنائی گئی۔

للہ الحمد کہ بر آئی ہماری منت
شاملِ حال ہوئی خاص خدا کی رحمت
نیّرِ علم کی ہم تک بھی شعاعیں پہنچیں
دور آنکھوں سے ہوا پردۂ جہل وظلمت
اسے نہ ہے بحث کہ ہم کو بھی ہوا ہے معلوم
قوم کیا چیز ہے کہتے ہیں کسے قومیت
قوم میں اُسکی تعلیم ہوا ہے جاری
گو مرض باقی ہے پر کم ہے مرض کی شدت
کچھ نہ کچھ ہر سمت سے بیمار چلے آتے ہیں
کارگر ہو گیا سید کا فریبِ حکمت

ان مزاجوں نے اطبّاس کے جلّاب لئے
جو کیا کرتے تھے پرہیز ودوا سے نفرت

حیف ہوں گلشنِ حکمت کی ہوا سے محروم
ہم کہ گھر جن کا بنایا ہے خدا نے جنّت
ہمت مور دلِ دانہ کی محتاج نہیں
قوم کے واسطے ہوتے نہیں دس لاکھ بہت
رد دنیا ہی ہے یہ تو زرِ مہتاب بھی ہم
آج لے آئیں فلک سے جو کریں ہم ہمت
ہم کہ بھیجا جنھیں اکملت لکم کا پیغام
ہم کہ ہیں موردِ اتممت علیکم نعمت

ایک اور نظم کہ بر موقع تشریف آوری ڈیپوٹیشن حاذق الملک میموریل فنڈ از دہلی در جلسۂ منعقدہ اسٹریچی ہال خواندہ شدہ وقبول یافتہ" یہ ہے:-

ہر سو پھرے جہاں میں ہر سمت خاک چھانی
دیکھا ہے چپہ چپہ جنگل پہاڑ پانی
انسان ہو کہ حیوان، جاندار ہو کہ بے جان
دہ تھے مگر نہ پائی ہوتی جو غیر فانی

رہتا ہے دائم انساں نام نکو سے اپنے
کچھ موت ہی نہیں ہے پایانِ زندگانی
زندہ ہیں زندہ تر ہیں عبدالمجید خاں بھی
اس حاذقِ جہاں کو مشکل ہے موت آنی
جیتے ہیں اور جئیں گے قائم ہیں اور رہیں گے
کہنے کو کوئی کہہ دے مرحوم آنجہانی
مرنے سے ڈرنے والو اور کچھ نہ کر سکو تو
جذبِ عمل کا صدقہ ہے عمرِ جاودانی
ہرگز نہیں ہے میرا اے صاحبانِ مجلس
مقصود بہرِ داد و تفریحِ شعر خوانی
پُر درد ہے سراسر گویا وہ حاذق الملک
لیکن نہیں ہے مجھ کو رقّت ہتھیں دلانی

اس کے بعد طبّی مدرسے یعنی طبیہ کالج کی تشویق کی ہے قدردانی کے لئے لمبی چوڑی درخواست کی ہے [illegible]

کے قافیہ پر ٹوٹتی ہے۔ قوم کا درد اور لڑکپن کا جوش و خروش شاعری پر حاوی ہے اور مصرعوں سے سنبھالے نہیں سنبھل رہا ہے۔ تاہم مجموعی طور پر یہ ابتدائی مشق بھی خاصی کامیاب ہے۔ اور شاعری ان کی ایک عرصہ تک برابر ترقی پذیر رہی۔ اسی خستہ نوٹ بک میں جس سے یہ اقتباس لے رہا ہوں بتدریجی ترقی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اب کچھ منظوم خطوط کے نمونے دیکھئے۔ بہت دلچسپ ہیں "بات نہیں کرتے تھے شعر کہتے تھے" کچھ مبالغہ نہیں تھا۔

بخدمت منیر الدین صاحب گوشہ محل حیدرآباد دکن

کیا یاد مدت میں بھولے سے یارے
ملے مجھ کو دو پوسٹ کارڈ تمھارے
غنیمت ہے اتنا ہی گر یاد رکھا
بہت منتظر تم نے استاد رکھا
رسید اپنے منظوم کارڈ کی پائی
مگر تم کو وہ نظم شاید نہ بھائی
دیا ہے مجھے نوحہ خوانی کا طعنہ
بہت آگیا تم کو باتیں بنانا
میاں نظم لکھنی کچھ آساں نہیں ہے
کہ ہر شخص دنیا میں ناداں نہیں ہے
ردیف اور قوافی کی بھی قید رکھنی
نہ سمجھے نا۔ آخر کو لکھتے آپ دکھنی

(اس کے بعد کچھ بے تکلف اشعار ہیں جو حذف کرتا ہوں)

یہاں کی سنئیں آپ کیا ہو رہا ہے
نتیجوں سے محشر بپا ہو رہا ہے
کہ ایف تاے میں اٹھارہ کل پاس نکلے
علاوہ ازیں . . . .
مڈل میں فقط سات بی تاے میں اکیس
ہوئے کامیاب انٹرنس میں بھی انیس
ہمارے بھی اب امتحاں ہو چکے ہیں
نتیجے بھی سب کے عیاں ہو چکے ہیں
نہیں اب مری جان خوف و خطر ہیں
تمہاری دعا سے ہوں سیکنڈ ایر میں
نہ کیوں ذکر اس کا بھی ہم تم تک آئے
کہ انعام سالے چہارم میں آئے

تمہارا سلام ان کو پہونچا دیا ہے
انھوں نے بھی وعلیک تم کو کہا ہے
چپت حسب تحریر اک جڑ دیا ہے
اور اپنی طرف سے بھی کچھ گھڑ دیا ہے

مکرر بجانب انعام الحق صاحب:—

عجب کاہل ہو تم انعام حاکر سو رہے شاید
نہ تم آئے نہ خط کوئی تمھارا آج تک آیا
حماقت ہے سراسر تم کو لینے ریل پر جانا
مری قسمت میں تھکنا تھا سو بے دم ہو کے تھک آیا
ہزیمت کھائی رائل پارٹی نے کل الیکشن میں
نہ آیا کام کچھ بھی بر سرکین جب فلک آیا
نہ نائب میر مجلس نے سکتر وائے ناکامی
نہ ساری کیبنٹ میں کوئی ممبر مشترک آیا
چمن میں یونین کے اب کہ سب سید ہی سید ہیں
یہ کہئے دست اہل بیت میں باغ فدک آیا

غرض، 'فدک' کے قافیے کو بھی پیر و کر چھوڑا۔

مکرر بجانب علام دستگیر صاحب بمقام محبوب آباد

مشفق و مہربان و بندہ نواز — پہنچے میرا سلام شوق نیاز
خط تمھارا مجھے وصول ہوا — شاد از حد دل ملول ہوا
بسکہ مرہون مہربانی ہوں — شرمساری سے پانی پانی ہوں
خط نہ لکھنے کا کیا بہانہ کروں — معذرت لکھوں اور روانہ کروں
تم نے مجھ کو اگرچہ خط لکھا — پتہ اس کا مگر غلط لکھا
منفعل مجھ کو مفت کر دایا — پورے اٹھارہ روز میں آیا
اک عجب اس پہ مہر چسپاں ہے — دیکھ کر جس کو عقل حیراں ہے
اس میں لکھا ہے خط لاوارث — نہیں معلوم اس کا کیا باعث
مجھ کو شاید مرا ہوا جانا — کاش سچ ہوتا ان کا فرمانا
اپنا احوال تم کو کیا لکھوں — خیر جیتا ہوں خوش ہوں اچھا ہوں
پر طبیعت کا کچھ عجب ہے رنگ — کیا کہوں تم سے قافیہ ہے تنگ
امتحاں سر پہ آن پہونچا ہے — خیر سے کچھ پڑھا نہ لکھا ہے
کیا کروں اپنی اس طبیعت کا — کورس پر دل ہی اب نہیں جمتا

حیدرآباد ہو اگر جانا — اور ملیں تم کو (ہائے) مولانا
یاد ہے، احتشام، بھی کہنا — اور میرا سلام بھی کہہ دینا

ان کو لکھا تھا ایک خط منظوم ! یہ حقیقیں بھی ہے عالب معلوم
بھیجنا ہی نہیں نصیب ہوا عرصہ چھ ماہ کے قریب ہوا

خط بہت طویل ہے۔ اختصار سے لکھ رہا ہوں۔ آخری ٹکڑا سنئے :-

اب سوچوں کہ تم کو کیا لکھوں ہاتھ آئے اگر کوئی مضمون
اس تکلف کی اک لکھوں تمہید کہ کبھی پہلے دید ہو نہ شنید
ہو یہ تہمت سواری آتی ہے شاہد معنی کی پیاری آتی ہے
دختر دلربائے شاہ سخن ساتھ لیے لئے سپاہ سخن
سیر باغ سخن کو جاتی ہے دیکھو وہ سامنے سے آتی ہے
ہے بلاغت کے ڈالے ہاتھ میں ہاتھ اور فصاحت سے کر رہی ہے بات
کاملان سخن جہاں کے تمام اس کو جھک جھک کے کر رہے ہیں سلام
خوش نویسوں کو کر دو فہمائش خط گلزار سے ہو آرائش
نیکشان سخن کو بلوائیں آب طبع رواں چھڑکوائیں
حسن خاشاک و رگ و کاہ ہوں ہاں گراں لفظ سنگ راہ ہوں

میں بھی کاغذ پہ وہ دکھاؤں بہار باعث رشک صد خط گلزار
خط عارض بھی جس سے شرمائے ہر الف جس کا دل کو برمائے
~~جس کا ہر حرف دلنشیں ہو جائے~~ جیم اک جام آتشیں ہو جائے
سین سوہان روح و جان بنے دائرہ دور آسمان سے بنے
شوخی چشم صاد کرکے یاد نقش حیرت ہوں مانی و بہزاد
بنتے نقطے کہوں سب ستارے ہوں حال رخسار سے بھی پیارے ہوں
کششیں جذب دل کو مات کریں مدّ ہ ابرو سے سیدھی بات کریں
دل میں اعراب خار سے کھٹکیں شو سے آویزے کی طرح لٹکیں
ہائے تحریر لذت تقریر ہو بیاں منہ سے بولتی تصویر

گل نوکشت زار معنی سے سینچ کر طبع کی روانی سے
لا کے ایسا بناؤں گلدستہ دیکھے گر غنچۂ دل بستہ
کھل کے فرحت سے پھول ہو جائے ساری محنت وصول ہو جائے
پر یہ ڈر ہے کہ ہو نہ طول کلام ختم کرتا ہوں بس زیادہ سلام

خط نہیں اچھی خاصی مثنوی ہے۔ جس میں سحر البیان کی روانی در گلزار نسیم کی نازک خیالی دونوں کی جھلک موجود ہے۔ یہ چیزیں محض وقتی تفریح کیلئے تھیں۔ مگر اتنا استقلال ضرور رکھتی ہیں۔ کہ آج تقریباً نصف صدی گزرنے کے بعد بھی ہم اور آپ ان سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔

اس دور کی کچھ غزلوں کا نمونہ بھی ملاحظہ کیجئے۔ کہتے ہیں :-

یاد آں یہ غزل کس کی ہوا اور کس نے کہا تھا
واللہ مجھے شعر ہی کہنا نہیں آتا !

جس بوسیدہ کاپی سے یہ غزل نقل کر رہا ہوں۔ اس میں پہلی غزل یہی ہے۔ اور کچھ شعر سُنئے :-

اللہ رے سرِ بزم تری شوخ متانت
ہونٹوں پہ کبھی نام ہنسی کا نہیں آتا

تم اپنے مکاں سے سگ درباں کو نکالو
کہتے ہیں کہ رحمت کا فرشتہ نہیں آتا

عاجز ہے علاج عشق کا کرنا نہیں آتا
شرمندہ ہے دنیا میں مسیحا نہیں آتا !

اس سے اگلے صفحے پر یہ غزل ہے ؎

اور درکار ہے گر درد غم جاناں کوئی
مفت دیتا ہوں جو لے لے مرے ارماں کوئی

ایک عیسیٰ نہ سہی اور مسیحا ہیں بہت
درد کمبخت بھی ہو قابل درماں کوئی

ایک گم گشتہ بھٹکتا ہوا آ نکلا ہے
جانتا بھی ہے یہاں منزل جاناں کوئی

اور بھی چند شعر ہیں مگر مقطع نہیں۔ اس سے آگے ایک مادۂ تاریخ درج ہے :-

ورزش شروع کر دی (۱۳۱۹ھ)

اس سے اگلے صفحے پر لکھتے ہیں " ۳۔ مارچ سے دودھ شروع ہوا۔ تین پاؤ روزانہ۔ ہر پیشگی دیتے گئے یہ عدد میں نے جوڑ کر دیکھا۔ اس سے تاریخ نہیں نکلتی۔

پھر گھڑی پر ایک نظم ہے۔ اور کئی خانگی تقریبوں پر تاریخیں ہیں۔ مگر میں فی الحال غزلوں کے تجسس میں ہوں۔ غزل کا کچھ اور نمونے لکھتا ہوں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اب کلام بہت پختہ اور اُستادانہ ہو گیا ہے ؎

جبر قضا گوارا نہ امر رضا قبول
گر شرط زیست یہ ہے تو مرنا کیا قبول

کب دل کو ہے یہ جور نوازش نما قبول
ہاں عیش لمحہ بھر کو نہیں غم سدا قبول

ملتا تھا جام بادہ کے بدلے میں عیش خلد
لیکن ہمارے دل کو نہ سودا ہوا قبول

دل کو نوازنے میں تامل نہیں ہے شرط
رکھ لیجئے احتیاط سے بس ہو گیا قبول

ہم میکدہ نشینوں کو حاجت دعا کی کیا
یاں ایک ہی غرض ہے سو وہ برملا قبول

بل بھر رہا ہے غیر بس اتنی سی بات پر
اس نے مرا اسلام بھی کیوں کر لیا قبول

زاہد ہمارے حق میں یہ تیری دعائے خیر
ہم کو ہی کب ہے ہو گی خدا کو تو کیا قبول

کیا موت کو بھی ناز ہیں ہم دل جلوں کے ساتھ
پائی ہے ان اداؤں پہ صورت بھی کیا قبول

ناداں کسے نظارۂ دنیا کی تاب ہے
ہو جام سے تو جام جہاں بیں ہو گیا قبول

لفظ قبول کے کچھ اور معنی خیال میں آتے ہوں تو سمجھئے گا کہ میں نے پورے شعر نقل نہیں کئے ہیں۔ اس غزل کا سلسلہ ان کے آئندہ منصب سے ملتا ہے ؎

انتہائے عالم پرہیزگاری دیکھئے
میکدہ میں آئیے رندی ہماری دیکھئے

یہ شب تاریک وطوفاں بحر ناپید اکنار
ڈوبتی ہے کس جگہ کشتی ہماری دیکھئے

وہ نسبت آجکل ہے آسماں اور میرے نالے میں
جو نسبت شعلۂ آتش میں اور روئی کے گالے میں

گرو میں ہرگز نہ غش کھا کر تمہارے طرح اے موسیٰ
اگر سو بار ہم آئیں اندھیرے سے اجالے میں

ثبوت ہستی خالق ہے یوں اشکال عالم میں
کہ جیسے شکل اوّل تا بہ آخر ہر مقالے میں

وہ کیا پہونچے بھلا باریکیٔ اسرار عالم کو
نگہ کرتی نہیں ہے کام اک مکڑی کے جالے میں

نہیں پابند اپنی بات کا ہرگز وہ ہرجائی
نشاں کعبہ کا بتلائے ملے اکثر شوالے میں

مکمل صانع قدرت ہے ظاہر بے کمالی سے
کہ گل میں خار باقی رہ گیا اور داغ لالے میں

مراقب ہو چکے زاہد ذرا سی مے بھی پی دیکھو
اسی عالم میں پھر دیکھو کہ کیا عالم نکلتا ہے

امید وصل جاناں تم کو اے ناداں مبارک ہو
مگر واضح رہے حضرت یہ ارماں کم نکلتا ہے

کیا ہیں کہاں ہیں اور ہیں کس کام کے لئے
تو جانتا تو اے دل ناکام جانتے

دل جانتے نہیں دل حرماں نصیب کو
پُر خوں آرزو سے ہیں اک جام جانتے

فرہاد خوب کٹتیں یہ گھڑیاں پہاڑ سی
گر ہم بھی تیری طرح کوئی کام جانتے

دل لیجئے گا اس کا ذرا دیکھ بھال کے
ناداں نہ جانئے گا بڑا ہوشیار ہے

غرق دریائے محبت کو کنارہ نہ ملا
اس کی تقدیر کی مٹی بھی تو ساحل ہی تھی

اس کے علاوہ اس کاپی میں بھوپال کے سلطان دولہا اور ملکہ وکٹوریہ کے مرثیے۔ اسکاٹ کی نظم "لے آف دی لاسٹ منسٹرل" میری لیب کی ایک نظم اور ولسن اور گولڈ رچ کی چند لائنوں کے ترجمے چند قطعے، دھوبی کا حساب، کیلی کا سٹے۔ ایک نظم مستزاد اور ایک دلی پر بھی موجود ہے جس میں دلی کے استادان سخن کی طرف لطیف تلمیحات ہیں۔ یعنی ؎

یہیں آسودہ ہے وہ سوختہ سامان سخن
قلس ماہی کی طرح شمع شبستان سخن
(مومن)

ہے یہیں خواب میں وہ شیر نیستان سخن
یعنی وہ روح سخن، جسم سخن، جان سخن
(غالب)

ہے اسی خاک مقدس کے کسی گوشے میں
دفن زیر قدم پاک وہ جانان سخن
(ذوق)

ہے یہیں گلشنِ بے خار کے مالی کا مکاں
یہیں سوتا ہے وہ رضوانِ گلستانِ سخن
(شیفتہ)

اسی ساحل پہ ہوا غرقِ فنا صہبائی[1]
اسی مغرب میں چھپا نیّرِ رخشانِ سخن
عالمِ قدس میں مشغول تھی ہے اس جا
حافظ ریختہ ، سر حلقۂ پیرانِ سخن
(درد)

یہیں پوشیدہ ہے وہ چہرۂ تابانِ خاک
یہیں باقی ہے ابھی حملۂ جانانِ سخن
(مظہر جانِ جاناں)

ہے اسی شہر خموشاں میں تو پیوند زمیں
صدر آرائے سر مسند ایوانِ سخن
(آرزدہ)

ہے اسی خاک کو حاصل شرفِ مسند آں
خسرو ملک سخن ، طوطیٔ لسانِ سخن

یہ سن ۲۶ء یعنی ۲۲ سال کی عمر تک کا کلام تھا۔ اس کے بعد جو کچھ کہا ہو وہ معلوم نہیں کہاں ہوگا۔ البتہ کچھ نمونہ رسالہ خاتون کی سن ۴ء سے سن ۹ء تک کی نامکمل جلدوں میں ملتا ہے جو مجھے دستیاب ہوسکیں۔ یہ رسالہ سن ۴ء سے سن ۱۴ء تک علی گڑھ مسلم گرلز کالج کے بانی (خانبہادر) شیخ عبداللہ صاحب کی ادارت میں علی گڑھ سے نکلتا رہا۔ اور تحریک تعلیم نسواں کا نقیب تھا۔ والد صاحب مرحوم اس تحریک کے سرگرم کارکنوں میں سے تھے۔ شیخ صاحب موصوف نے بھی کالج کی مختصر تاریخ میں ان کی مساعی کو سراہا ہے۔ رسالہ "خاتون" اردو صحافت کی تاریخ میں یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ اسکی جلدوں میں بڑے بڑے نامور اصحاب کے مضامین دفن ہیں۔ مولوی صاحب کی نظم و نثر اس رسالہ میں اکثر چھپتی رہتی تھی۔ مگر ان میں اس دور کی تحریروں کا صرف ایک رخ نظر آرہا ہے۔ یعنی وہ چیزیں جو تعلیم نسواں کی تحریک سے تعلق رکھتی تھیں۔ یا خواتین کی دلچسپی اور تفریح کیلئے تھیں۔ بہرحال دونوں طرح کا کلام ایک ممتاز اسلوب رکھتا ہے۔ اور اصلاحی نظم مطائبات سے کچھ کم شگفتہ نہیں۔ سب سے پہلے ایک نظم 'خاتون' ہی کے عنوان سے ستمبر ۰۴ء کے پرچہ میں نظر آتی ہے :-

خدا کی پیاری بنی کی عزیز　　جہاں کی دُلاری بہ عقل و تمیز
کہیں ماں کی صورت میں ہمدرد ہے　　بہن چاہیئے تو کہیں فرد ہے
رفاقت میں بیٹی کی ضرب المثل　　کہیں جھونپڑے میں ہے رشکِ محل
جہاں ہے تو تیری عبادت سزا　　ترے پانو دھو دھو کے پینے بجا
بہن ہو تو پروانہ ہو تجھ پہ بھائی　　میسر نہیں ہے کہیں ماں کی جائی
خدا کی ہے رحمت جو بیٹی ہے تو　　حقیقت میں تحفہ بہشتی ہے تو
مسلّم ہوئی حکمرانی تری　　میاں کا ہے دل راجدھانی تری
کبھی حُسنِ صورت میں نور جہاں　　کبھی حُسنِ سیرت میں زیب النسا

اس قافیہ کو مولانا حالی کی پُر زور تائید حاصل تھی جو مولوی صاحب کے دل کو لگ گئی تھی۔ آخر میں کہتے ہیں ؎

غرض جس علاقے سے کیجئے نظر　　مجسّم محبت ہے تو سر بسر
بہارِ ارم سے سنوارا تجھے　　محبت بنا کر اُتارا تجھے
وفا میں محبت میں تسکین میں　　ترا پارٹ نازک ہے ہر سین میں
عجب مایۂ دلفریبی ہے تو　　تمام اپنے وصفوں میں یکتا ہے تو
شگفتہ تر اس سے بھی مضمون ہے　　رسالہ کی صورت میں خاتون ہے

اپریل سن ۰۵ء کے پرچہ میں زنانہ اسکول کیلئے ایک ۸ صفحے کی اپیل خارج از بحث درج ہے جو مولوی صاحب کی اس نظم پر ختم ہوتی ہے۔

ہند کی خوش خصال خاتونو!　　اس طرف بھی خیال خاتونو!
پرسشِ اَن سُنی نہ کر دینا　　ہے تمہارا ہی مال خاتونو!
تم ہی لوگی سنبھال خاتونو!

کُل پندرہ بند ہیں۔ چندے کیلئے بڑی پُر زور اپیل کی ہے۔ بلکہ ستیہ گرہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں!

آپ دو اور میاں سے دلواؤ　　گر نہیں دیں تو کھانا مت کھاؤ
کہہ دو واجب نہیں اگر تعلیم　　پھر واجب ہے تم وہی لاؤ
مدرسہ ہو بحال خاتونو!

وعلیٰ ہذا القیاس ۔ ایک اور نظم "آبرو بیگم" نامی ایک خاتون کی توصیف میں ہے۔ جن کی شادی کی اطلاع کے ساتھ یہ خبر بھی ملی تھی کہ شادی کے دو طرفہ فضول اخراجات کی رقم خود دلہن کی استدعا ہے کہ مجوزہ نارمل اسکول کو دیدی جائے ؎ ایڈیٹر صاحب

---

[1] یہ مصرع کہتے وقت شاید یہ واقعہ گوشۂ خیال میں ہوگا کہ صہبائی کو ساحل جمنا پر لے جا کر گولی ماری گئی تھی۔

موضوع کی وضاحت کے بعد اپنے نوٹ میں کہتے ہیں "شاعر بھی اچھا، شعر بھی اچھا، مضمون بھی اچھا۔ اس نظم پر صادق آتا ہے" واقعی ٹیپ کا شعر تو بہت پھڑکتا ہوا کہا ہے ؎

جو ہو کوئی زمانہ میں تو ہو ایسی بہو بیگم
کہ جیسی فخر بیگم، ناز بیگم، آبرو بیگم
گوارا صرف زر جہز کو ہو دولہن کی شہرت پر
نہ مہندی پر نہ ساچق پر، نہ چوتھی پر نہ دعوت پر
نہ جو ترجیح دے اسراف کو قومی ضرورت پر
تعال و مرحبا و آفریں اس کی لیاقت پر
جو ہو کوئی زمانہ میں تو ہو ایسی بہو بیگم
کہ جیسی فخر بیگم، ناز بیگم، آبرو بیگم
کمی ہے اس کا دل لیکن نہ بیہودہ اٹھانے کو
نہ شیخی کو، بڑائی کو نہ دنیا کے دکھانے کو
اسے مقدور ہے اوروں کے آسودہ بنانے کو
پڑھا ہے اس نے گویا اپنی بہنوں کے پڑھانے کو
جو ہو کوئی زمانے میں . . الخ
جو اہل گنج تقریبوں میں بے موقع اٹھاتے ہیں
حقیقت میں وہ گنج ہیں روپے ان کے کھاتے ہیں
نہ دنیا ہی میں کچھ حاصل نہ عقبیٰ ہی میں پاتے ہیں
کوئی خاتون مانے یا نہ مانے کہہ سناتے ہیں
جو ہو کوئی زمانہ میں الخ
نشان اسراف کا ڈھونڈے سے بھی ملنے نہ پائیں گے
یہ جلسے شادیانے آج ہیں کل بھول جائیں گے
مگر دیوار و در اسکول کے انکو جو آئیں گے
ترانہ آبرو بیگم کی شادی کا سنائیں گے
جو ہو کوئی زمانہ میں الخ

اس سلسلہ میں یہ لطیفہ بھی یادگار رہے کہ بعد کو معلوم ہوا کوئی خاتون اس طرح فیاضی کا اظہار کر کے اپنے قول سے پھر بھی گئی تھیں۔ قبلہ نے فرمایا بہتر ہے۔ اب ایک نظم "آخ تھو" بیگم لکھتا ہوں۔

یہ نظمیں زیادہ تر ہنگامی موضوعات پر ہیں۔ اور کہیں کہیں شاعری صرف نثر منظوم ہو کر رہ گئی ہے۔ تاہم یہ اس دور کی شاعری ہے کہ قومی اصلاح کی تحریک زوروں پر تھی۔ نظم علیحدہ صنف سخن کی حیثیت سے تازہ تازہ رائج ہوئی تھی۔ اور "ترقی پسند" نوجوان حالی، آزاد اور نذیر احمد سے متاثر ہو رہے تھے۔ خود مولانا حالی کے کلام میں اس کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔ جیسے شاعر دل کی بات کہہ سنانے کے لئے اس قدر بے چین ہے کہ نظم نگاری کا لطف اٹھانے کے لئے زیادہ دم نہیں لینا چاہتا۔ بلکہ بعض کلام تو ایسا خشک ہو گیا ہے کہ جسے کھڑ تک کہتے ہیں۔ نظم کے خدوخال میں بعد کو جو رنگ اقبال نے بھرا وہ اس وقت تک نہیں رچا تھا۔ بڑی روکھی پھیکی سی صنف سمجھی جاتی تھی۔ اور حلقہ متغزلین میں دراصل جبھی سے بدنام چلی آتی ہے۔ مولوی صاحب نے ان پابیسات میں جس قدر بھی ترنم اور لوچ پیدا کیا ہے بہر حال قابل داد ہے۔ ان میں سب سے معرکہ کی نظم "جوگن" ایک "الگزی" ہے۔ جس کی وجہ لکھنے کی ایڈیٹر صاحب نے ناظرین سے فرمائش کی ہے۔ یہ نظم اگرچہ سراسر تبلیغی ہے۔ مگر اسکی افسانویت اور انداز کی دلپذیری نے اسے خاصا سدا بہار بنا دیا ہے۔ ابھی تو ملک میں عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی ہرگز باسی نہیں ہوا۔ بالم ایک آنکھ سے بدستور کانا ہے۔ کسی قدر اختصار سے نقل کرتا ہوں مگر نظم کا خاکہ جواب کے کافی مربوط اور منظم قائم رہے گا ؎

ہے انگ بھبوت ملے لیاری اور جوگیا برہن ہے ساری
اس دیس ہوا یوں دل بھاری کس دیس سے آنا اے جوگن
کس پی کے دوار سے بہتی تھیں کیا رنج والم ان سہتی تھیں
کیا ساس ننند کچھ کہتی تھیں کو کون گھرانا اے جوگن
کیوں موت سے پہلے مرتی ہو کس کارن جیتا بھرتی ہو
کیا دل کا کہنا کرتی ہو ہے دل تو دوانہ اے جوگن
کیوں پیارا کاجل دھوتی ہیں کیوں جنم میں انکھیاں روتی ہیں
کیوں دم دم گرتے موتی ہیں کیا کھویا خزانہ اے جوگن
کیوں بستی سے من بھایا ہے کیوں جگ سے ہاتھ اٹھایا ہے
کیا پی کا پتہ کچھ پایا ہے ہم کو بھی بتانا اے جوگن
سن جوگن کچھ شرماتی ہے کچھ اس کو حیا سی آتی ہے
پھر بین پہ ہاتھ بڑھاتی ہے یوں حمد خدا کی گاتی ہے
تعریف خدا کو ہے ساری کل دنیا جس نے بنائی ہے
بن پلکے اور دیوار اُدھر یہ نیلی منڈھیا چھائی ہے
پتّی پھول پھل سب نیارے اچرج اکر کام ہیں سارے
من کی آنکھیں کھول کے پیارے دیکھ تو کیا چتر ائی ہے
لو اندھی تا لے رہتے ہیں کیا گرمی سے تنگ جیتے ہیں

منہ کھولے سشیر اور چیتے ہیں کیا موردں بیچ دُہائی ہے
تن کے روکھ کھڑے ہیں سوکھے چھوڑ گئے سب پتے اور کھے
تپنی بھوبل جھوکے لُو کے۔ بن میں آگ لگائی ہے
لو! چھینٹے وہ اک دیکھڑے ہیں پہنے اوڑھو پرکھڑی ہیں
بادل جیسے سشیر لڑے ہیں برکھا کی رُت آئی ہے
پھر ندی نالے بہتے ہیں کچھ اپنی صدائیں کہتے ہیں
ہم اونچے پہاڑوں رہتے ہیں تقدیر بہا کر لائی ہے
لو! چلتے پانی تھم کر ٹھہرے اترے سانپ لوٹیں گھر کر
برکھا رُت کے بدلے پیرے جاڑوں کی بن آئی ہے
جاں واری اس کی قدرت کے دن رات تماشے ہوتے ہیں
کچھ آنکھیں موندے دیکھتے ہیں کچھ دیپ کھولے سوتے ہیں
اس راجہ کی یہ رانی ہے اس آگ میں جنگل چھائی ہے
اس لاج سے پانی پانی ہے اک آنکھ سے بالم کانا ہے
اس لعن سے جلتی چھاتی ہے ان حسن پر جاکٹ اُڑتی ہے
اندھیر نگر سے آتی ہے اور جگنگ نگری جاتا ہے
وال لچھمی جی کے محلوں پر دن رات دوالی ہوتی ہے
نقدیا اگر کچھ ساتھ کرے تو سہل مُرادیں پاتا ہے
ہر چوکھٹ بین بجائیگی کل رام کہانی سُنائیگی
سب سات کروڑ یہ جانیگی کہ تومن کا جل لاتا ہے
اک علم کا دریا بہتا ہے واں بید کناری رہتا ہے
کل عالم اس کو کہتا ہے ہمدرد بڑا اور سیانا ہے
سب دُنیا چھو مستے لوگ رہا ۔ یے تومن کا جل مانگ کے لائے
دُکھ کی دارو رانی پائے بید کا یہ فرمانا ہے
جب تومن کا جل مارے کا تب رانی آنکھ اُٹھائے گا
تو بو جھ کے مورکھ کیا ہے گا یہ تو گن کا اشارہ ہے

لچھمی جی سے مراد بیگم صاحبہ بھوپال اور وید شیخ عبدالستار صاحب ہیں۔ جو گن خود "خاتون" ہے۔ دوسرا رُخ اس دَور کے کلام کا ان نظموں میں ملتا ہے جیسے یہ ۲۳ شعر کا جھولا جسے میں نے حسب معمول مختصر کر دیا ہے

دکھائی راہ بہت اب کی بار جھولے کی
رُت آئی بارسے بس انتظار جھولے کی
کئی مہینے پڑا جھولتا رہا پنکھا
اتاری نقل ہزاروں ہی بار جھولے کی
جتن بہت سے کئے ہاتھ ٹوٹ ٹوٹ گئے
مگر کہاں وہ ہوا خوش گوار جھولے کی

یہ خاص زنانخانہ کے فراشی پنکھے کا ذکر ہے۔ اب ان کا مفہوم گم ہو گیا ہے مگر کسی وقت میں جھولا اور سہرا، ہی رومان کی جان تھے ان ہی ہنگاموں پر گھر کی رونق موقوف تھی۔ ان کی قدر کوئی اُن بے دل کے زندانخانوں میں رہنے والوں سے پوچھتا۔

تمام گرمیوں مینہ کی ہر اک دُعا کے ساتھ
دُعائیں مانگی ہیں بے اختیار جھولے کی
ٹراساحس ہو سبزہ ہو باغ چار طرف
گھٹائیں ہوتی ہوں جھک جھک نثار جھولے کی
جو ایک جھول جکے دوسرے کو وار ملے
نہ جان کو ہو سکون وقرار جھولے کی
کسی کے چھوٹ پڑیں ہاتھ تو کوئی جھولے سے
زمین پہ دھم سے گرے تب بہار جھولے کی

یہ قافیہ تو بہت ارزاں ہے۔ خیر ایک لطیفہ سنیئے "رسّی" کے معنی تو آپ جانتے ہی ہیں۔ دل کو واردات کو اور ہوتے ہیں۔

سنا ہے ورس میں لوگوں سے واعظ خانم
بُرائی کر رہی تھیں یوں ایک بار جھولے کی
کہ لوگو "رسّی" نکالی گئی ہے جنت سے
تو رسّی پھینک دو تم بھی اتار جھولے کی
اسی کے دھوکے نے حوّا کو دانہ کھلوایا
یہی تھی رسّی وہ اللہ کی مار جھولے کی
اترے وہ رائتا جھولا اکڑ بنوالی تھے گھم
یہ مٹی نیچ گئی ہونے سے خوار جھولے کی
سنا کسی جلے تن نے یہ وعظ سُن کے کہا
بڑی بچاری بنیں تو جہاد جھولے کی
وہ اپنی ساس پہ چوٹی کی لیں خبر پہلے
تو ہم بھی پھینک دیں رسّی اتار جھولے کی
خدا بھلا کرے خبر اس زبان درازی کا
کہ جس نے بات رکھی برقرار جھولے کی

ان جلدوں میں "جھولے پر لڑائی" کے عنوان سے ایک مضمون بھی بہت دلچسپ موجود ہے۔ ایک طرف دو بھائی خاصے اخوان الشیاطین ہیں۔ اور دوسری طرف دو بہنوں کی ضعیف البنیا

جوڑی۔ جھولے پر قبضہ کرنے کے لئے کیا کیا جتن نہیں ہوتے ۔
بالآخر فتح پاکر بھائی ذیل کا جھولا شروع کرتے ہیں :۔

وقت فرصت کا ہے اس آن نہیں کوئی کام
دل کو ہے چین طبیعت کو قرار و آرام
نشۂ عیش سے سرشار ہے ہر خاص و عام
آؤ ہم تم بھی چلیں جھولتے بھائی گمنام
دیکھیں اس وقت میں کیا رنگ دکھائے جھولا

"پتلی پتلی اور تیز بچپن کی رسیلی آوازیں۔ سُر ملا کر دونوں ایسے مزے سے گائے کہ بی گلشن (خادمہ) بھی جو دوپٹے رنگنے بیٹھی تھیں، دوپٹے چھوڑ رنگ میں ڈوبے ہوئے ہاتھ لئے ایک طرف الگ کھڑی ہو کر سننے لگیں کہ یہ تو گیت ہی نیا ہے . . ."

باغ عالم میں نئے رنگ سے آئی ہے بہار
اور عجب لطف ہے اس وقت برستی ہے پھوار
سبز بوستان گلستاں کی ہے اک سمت قطار
اک طرف نغمہ سرائی میں ہے مشغول ہزار
ایسی حالت میں نہ کیوں دل کو خوش آئے جھولا

" . . . . . چھوٹی کا دل اس بند سے بھر چکا تھا . . . بھائی آگے بڑھتے ہی نہ تھے۔ آخر نہ رہ سکی۔ ٹپک ہی پڑی۔

چھوٹی:۔ آگے بھی تو کہو یا بس چُھٹ چکی۔

آپا:۔ ہیں! یہ کیا بیہودہ محاورہ تم نے بولا۔

چھوٹی:۔ میں کیا جانوں یہی دونوں بہت بولا کرتے ہیں

بھائی: چھٹ کیوں چکی۔ ذرا ٹھہرو ابھی تم دونوں کی خبر لیتے ہیں۔ . . .

کی جو تدبیر بھی جھولے سے اٹھانے کے لئے
کیا ہی پہونچیں اسے آماں سے نکالنے کیلئے
ہوگیا ان کو بہانہ وہ بٹھانے کے لئے
ہم کہو کیسے رہے تم کو جلانے کے لئے
جھولتے شاد ہوں جلتوں کو جلائے جھولا

" اس زہر ہلاہل بند کو اپنی حرکتوں کے نمک مرچ سے اور بھی چٹ پٹا بنا کر جس جس طرح گایا چھوٹی ہی کا دل جانتا ہوگا جس نے پوچھا تھا کہ بس چُھٹ چکی۔

خاتون کی جلدوں میں ایک آدھ چیز اور بھی ہے۔ مگر اب آپ کی اجازت سے ختم کرتا ہوں۔ افسوس ہے اس زمانہ کا اور کوئی کلام نہیں مل سکا۔ سنہ ۱۹۲۰ء تک میدان صاف ہے۔ پھر کچھ غزلیں ملتی ہیں۔ بعض پر پانی پھرا ہوا ہے۔ تاریخ پڑھی جاتی ہے۔ شعر ایک آدھ سے زیادہ نہیں۔ ایک صاف غزل یہ ہے ۔

عجب زمانہ میں ہے دورنگی نہ پوچھو اسکی مثال کیا ہے
کہ روز و شب ہے یہی تماشہ نظر اٹھاؤ سوال کیا ہے
بنایا صانع نے حسن کو جیسا وہ بے تکلف بنا ہے ویسا
ہمارا اس میں قصور کیا ہے تمہارا اس میں کمال کیا ہے
قریب اتنے کہ شاہ رگ سے بعید ادراک کی بھی حد سے
ہے سہل دشوار ہر معمہ تمہارا ہجر و وصال کیا ہے
یہ دل تمہارا مطیع و فرماں تم اس کو جسطرح چاہو رکھو
جو شکر ہووے سعادت اس کی کرے جو شکوہ مجال کیا ہے
یہ کیسی توبہ تھی کیونکہ ٹوٹی اٹھی شعر گوئی تو ہم سے چھوٹی
خموشی بہتر ہے آدمی کو فضول یہ قیل و قال کیا ہے

معلوم ہوتا ہے شعر گوئی کی قسم کھائی تھی۔ مگر یہ توبہ "ابر شب ماہتاب میں" ضرور ٹوٹتی رہتی ہوگی۔ ان اوراق میں حافظ کے ترجمے بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شوق شروع ہو چکا تھا کچھ اور چھوٹی موٹی چیزیں ہیں اور ایک نعت بھی پڑھی جاتی ہے۔ جسے انھوں نے قصیدے کا رنگ دینا چاہا ہے ۔

اے زہے قسمت کہ ہوں تیرے میسر درشن
تیرے دیدار سے آنکھیں ہوں مکرر روشن

آنحضرتؐ کو مکرر خواب میں دیکھنے کے بعد شاید صبح اٹھ کر قلم برداشتہ لکھی ہے۔ کوئی خاص بات نہیں پیدا ہوئی۔ عین شدت جذبات کے عالم میں اچھی شاعری ہوتی بھی نہیں۔ ایک مناجات کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس کے بعد جو کلام ملتا ہے اس کی تاریخیں سنہ ۳۰-۱۹۲۱ء تک پہنچتی ہیں۔ بعض اصناف کا ذکر آگے کروں گا۔ پہلے غزلوں کو سمیٹتا ہوں۔ کہتے ہیں:۔

گندمی رنگ کے دھوکے میں پھر آئے نادان
پھر وہی میوۂ فردوس بنا ہوتا ہے

مختصر انتخاب سے زیادہ کچھ پیش نہیں کیا جاسکتا۔ جس سے کلام کی روش کا اندازہ ہوسکے ۔ ایک اور شعر اسی زمین میں خوب کہا ہے۔

حسن یوسف ہی نہیں یوسف ثانی کا نشاں
اس کا کچھ تھوڑا سا دامن بھی پھٹا ہوتا ہے

مکرر :۔

ٹوٹنے کیلئے یاں ٹھیس بھی درکار نہیں
شیشہ کیا ہوتا ہے جو عہد وفا ہوتا ہے

مطلع :۔

پہلے سنگ سے بت بت سے خدا ہوتا ہے
یہ تو سب ہو چکا اب دیکھئے کیا ہوتا ہے

ایک اور شعر میں بھی مماثل مضمون ہے :۔

حور کو طعن سے بن پر کی پری کہتا ہے
ہو عداوت سے مگر بات کھری کہتا ہے
زخم پر زخم مگیں آہ کا کرنا کیسا
سانس لینے کو بھی اک بخیہ گری کہتا ہے

پہلے صد ابہت تھے ہوا پھر صدا ہے ایک
کب تک رہے زمانہ کی یہ بھی ہوا ہے ایک

ہے سر شام بلا ہجر میں دیکھا کیا ہے
ابھی نکلے نہیں تارے جو نمایاں ہونگے
کیوں ہٹاتے ہو مدد گار نظر ہیں پردے
تاب نظارہ کسے ہوگی جو عریاں ہونگے
فصل گل لائیگی اک تازہ اڈیشن ہر سال
جمع ہو ہو کے ورق گل کے پریشاں ہونگے

اڑا یا گاہ آہوں میں بہا یا گاہ اشکوں میں
دکھائیں ان کو میں نے صورتیں ہر رنگ میں دل کی
خیال باغ و بستاں لے گیا آوارہ صحرا
دکھا یا قعر دریا آرزو نے امن ساحل کی
جہان عیش و راحت اعتبار عیش و راحت پر
ہوتے ہیں پا تو بھاری دیکھ کر تصویر منزل کی
قدم جاتیں سے بازیچہ طفلاں میں بڑھتا ہے
متانت چاہیئے نادان یہ عادت چھوڑ کھیل کی

اے برق طور کوہ ہمالہ کو پھونک دے
یہ دیر سے وہ نہیں ہیں جو مشتاق رہ گئے

سینکڑوں میدان محشر تک نرے آتے ہوئے
فتنۂ خوابیدہ اٹھے ٹھوکریں کھاتے ہوئے
ڈوبتے پہنچا کنارجو، یہ سرو پائے بسد
وہ قد دل جو کہیں دیکھا ہے اٹھلاتے ہوئے
پیچ زلفوں سے رہے دل لے کیا کیا لبری
عمر گذری اس جھمیلے ہی کو سلجھاتے ہوئے
وہ نہ سمجھا مدعا ناداں قلم گھس گھس گئے
نامہ بر مر گئے آتے ہوئے جاتے ہوئے

خوف دوزخ سے نہ جنت میں ہیں جانے اٹھے
ہم ہیں محشر میں ترے ناز اٹھانے اٹھے
ہاں رہے نقل ذرا حشر میں اس شاطر کی
ہو کے آزردہ جو شطرنج جلانے اٹھے
کیا کہا کہہ تو یہی آگ لگا دی ظالم
اس زباں سے تری عالم میں زمانے اٹھے
احتشام اس نے دم دفن جلایا بن آگ
دوست کو خاک میں کیا دوست ملانے اٹھے

گرچہ صد بار چھپا اور سر تاباں نکلا
جام جم پھر نہ کبھی گردش دوراں نکلا
شاید آجائے کوئی قیس سا پھر آبلہ پا
تیز ہو ہو کے بہت خار مغیلاں نکلا
کیا تماشے تھے تری بزم میں شب کو کہ پھر
شمع کہتے ہیں ملی آئینہ حیراں نکلا
ہم تو نادم ہیں عمل کر کے کیے پر تیرے
تو مگر اپنے کیے پر نہ پشیماں نکلا
احتشام اب نہ رہی مشرک و مومن کی تمیز
اس زمانہ کا برہمن بھی مسلماں نکلا

یہ اشعار کلام کے متعلق رائے قائم کرنے کو کافی ہونگے۔
میں خود بجوید، کے اصول پر تبصرے میں اختصار سے کام لے رہا ہوں ۔ یہ کلام اگرچہ عموماً خوش آہنگ ہے ۔ مگر انھیں نغمہ آفرینی کا چنداں شوق نہ تھا ۔ نظم میں الفاظ کے ساتھ کامل مساوات برتنے کے قائل تھے ۔ اور اپنی فراوانی لغت سے بے روک ٹوک

فائدہ اٹھاتے تھے۔ انگریزی الفاظ بھی ظرافت کے لئے نہیں بلکہ غزل کے سنجیدہ استعمال کر جاتے تھے۔

ان کی شاعری کا بہت بڑا عنصر تراجم پر مشتمل ہے۔ حافظ کا مطبوعہ ترجمہ تو آپ نے دیکھا ہے لہٰذا اس کا تذکرہ چنداں ضروری نہیں۔ انھوں نے بعض اور کلام بھی فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔ منجملہ ان کے خیام کی رباعیات بھی ہیں۔ اور بہت کامیابی سے اردو میں ڈھالی ہیں۔ چند مثالیں دیکھئے:۔

خیام	نادان
ابریق مئے مرا شکستی ربی	پیالہ مری بینوشی کا توڑا یارب
بر من در عیش را ببستی ربی	اک ٹھیکرا مٹی کا نہ چھوڑا یارب
بر خاک ریختی مئے ناب مرا	مٹی میں مئے ناب مری منہ میں خاک
خاکم بدہن مگر تو مستی ربی	کچھ مست نہیں تو بھی تو تھوڑا یارب
آنگہ کہ نہال عمر بر کندہ شود	مٹی سے نہ گو نعش بھی اٹھے گی
و اجزام زیکدگر پراگندہ شود	کھد کر مری مٹی تو کبھی اٹھے گی
زنہار کہ صراحی بکنید از گل ما	اور اس سے صراحی جو بنے گی آخر
حالے کہ پر از بادہ کنی زندہ شود	بھر دو گے کبھی مے سے تو جی اٹھے گی
آں بہ کہ درین زمانہ کم گیری دوست	بہتر ہے بنائے نہ یہاں دوست کوئی
با اہل زمانہ صحبت از دور نکوست	ان دوستوں سے دور کی صحبت ہے بھلی
آنکس کہ بکلی ترا تکیہ بر اوست	جس دوست پہ تکیہ تجھے ہر باب میں ہے
چوں چشم خرد باز کنی دشمن اوست	دیکھ عقل کی آنکھوں سے کہ دشمن ہے وہی
دل سر حیات اکماہی دانست	دل راز ازل تو نے بھلا ہی جانا
در مرگ ہم اسرار الٰہی دانست	مرنے میں بھی کچھ بھید چھپا ہی جانا
امروز کہ با خودی ندانستی ہیچ	زندہ ہے تو آج اور نہیں جانتا کچھ
فردا کہ ز خود روی چہ خواہی دانست	کل مر کے، فنا ہو کے تو کیا ہی جانا
غافل بچہ امیدی بریں شوم سرا	غافل تجھے کیوں بھائی یہ منحوس سرا
حاصل تا ایں دل منہ از بہر خدا	جاں دولت دنیا پہ نہ دے بہر خدا
ہر گاہ کہ خواہی کہ نشینی از پا	آرام اگر لینے کو بیٹھائے گا یاں بس
گیرد اجلت دست کہ بالا بنما	بھیجے گی اجل ہاتھ کہ اٹھ چل، کہا!

بعض رباعیات کے ترجمے میں رباعیات کی بحروں کی پابندی نہیں کی۔ بلکہ قطعہ بند بنا دیا ہے۔ میری رائے میں غلط نہیں کیا رباعی کی نامانوس بحروں کی بجائے اگر دوسری رواں بحروں میں کامیاب ترجمہ ہوسکے تو کیا مضائقہ ہے۔ ان کے علاوہ کچھ اور کلام نظمیں وغیرہ جو ملتی ہیں ان میں کوئی نئی منزل ان کی شاعری نے طے نہیں کی۔ تفکر اور مشاہدہ موجود ہے۔ اور کلام پختہ و پرمغز بھی ہے۔ مگر دھیمی آنچ پر تیار ہوا ہے۔ جذبات کی چاشنی کم ہے۔ اور دل لگا کر نہیں کہا گیا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ شعر و سخن سے نا وابستہ ہو گئے تھے۔ جان جان کر اپنی طبیعت کو اس طرف سے پھیرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک نظم بھی شاعروں کی ہجو میں لکھ ڈالی۔ جو ساقی کے کسی پرچے میں چھپی تھی۔ انھوں نے اپنی مشق سخن باقاعدگی کے ساتھ جاری نہیں رکھی۔ ورنہ مجھے آپ سے ناداں کا تعارف کرانے کی کیا ضرورت ہوتی!

غالب سے وہ بہت ناخوش تھے۔ ان پر کئی ہجویں لکھی ہیں اور اتفاق دیکھیے کہ ان کے قلم کی آخری جنبشوں کا موضوع بھی یہی تھا۔ ایک مضمون "غالب اپنے صحیح آئینے میں" بستر مرگ پر لکھنا شروع کیا تھا مگر صرف شروع ہو کر رہ گیا۔ کچھ شعر "شراجست" کے جواب میں لکھے ہیں۔ ان میں کہتے ہیں:

بات آساں بھی ہو تو مشکل سا کر بولئے
گول کہنا ہو تو ایک انڈا دکھا کر بولئے
پہلوی ماژندرانی اد بد اکر بولئے
کوئی ہندی داں نہ سمجھے منہ بنا کر بولئے
چون ہندی چھوڑ کر ازبک بنا ہو جائیے
اے اسد دلی میں کابل کا گدھا ہو جائیے

ظاہر ہے کوئی سنجیدہ تنقید نہیں۔ ہجو ہی جو ٹھیری۔ مگر غالب کا کلام اس طرح دلوں میں گھر کر چکا ہے کہ اس قسم کے لطیفے اور دوسری قسم کی عبد اللطیفیاں سب ہیچ ہو کر رہ گئی ہیں۔

تاریخ گوئی میں انھیں خاص کمال حاصل تھا۔ اور تاریخیں عموماً ایسی بے ساختہ ہیں کہ چند مثالیں دلچسپی سے خالی نہ ہونگی۔ بعض تعزیات کی تاریخیں دیکھیے ؎

گر اسے تاریخ ہے مطلوب عبارت
ہاتف نے کہا کہد، کہ ہے "خوب عبارت" ۱۲ ۴۴ھ
ہے حفظ حق "شد" برائے مکرر"

سن ساخت تعمیرست سکندر"

اس میں تعبیہ ہے۔ یعنی مکرّر کی ر۲ کے ساتھ تاریخ نکلتی ہے اور اشارہ اس میں یہ بھی ہے کہ یہ دیوار کسی تنازعہ کے بعد مکرر تعمیر ہوئی تھی۔

مبارک کہ ایں تازہ بیت الشرف　　بنا شد سر نو بطرز جدید
پے سال ہاتف بگفت بہ زود　　کہ خلق جدید و بیت سعید

شرف الحق مکان آبائی　　کرد تعمیر و کہنہ اش انداخت
سال تعمیر گفتہ شد بے قصد　　"ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت"

اپنے مسکونہ بالاخانہ کی تاریخ لکھتے ہیں :-

شد اختتام بدستم چہ حاجت توجیہ　　اگرچہ رفتہ اند بسر تمام کنند

ایک عزیزہ کی شادی پر جہیز کی جملہ مدات کی فہرست مادّہ ہائے تاریخی میں لکھ کر دی تھی۔

فرد لباس و پوشاک جمیلہ عروس طالع مند ۱۳۴۰ھ
پوشاک سرہ سادہ و ریشمی و زریں ۱۳۴۰ھ
فرد چاندنی سوزنی دری فراشی ۱۳۴۰ھ
زیور طلائی و نقرئی تارہ عروس ۱۳۴۰ھ
ظروف مسی ۱۳۴۰ھ
فرد سامان چوبی پرکار ۱۳۴۰ھ
چینی اور کانچ کے دلکش برتن ۱۳۴۰ھ
معاوضہ کی زیور لازم الادا ۱۳۴۰ھ
متفرق متمم ۱۳۴۰ھ

ایک شیرخوار کے گذرنے کی تاریخ ہے سہ

مہ پارۂ زدل کرد از جہاں کنارہ
تاریخ مشیرہ سالش "گو بود شیرخوارہ"

اس طرح کی نہ معلوم کتنی تاریخیں کہی ہوں گی۔

۱۹۳۰ء کے بعد تمام توجہات اُردو کی تدوین پر رہی۔ اور شاعری بالکل ہی ترک ہو گئی۔ اس کام کی وسعت کا اندازہ کرنا مشکل ہے یہ خود ان کے اندازے سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر نکلا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"مجھے سال تمام پر اپنا کام ختم کر دینا ہوتا ہے۔ اور کام اس قسم کا ہے جس کی کچھ تھاہ انتہا نہیں۔ الفاظ پر الفاظ اس طرح نکلے چلے آتے ہیں جیسے ۔ ل میں چیونٹیوں کی فوج ۔ شب و روز اسی میں انہماک ہے۔ رات کے دو دو بج جاتے ہیں۔ اسی واسطے میں خلوت نشین ہوں۔ اب کے جمعہ بھی نہیں ہوا۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

"کام کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ایک ایسی وسیع زبان ہے جس کی وسعت و حجم سے کوئی زبان مقابلہ نہیں کر سکتی ۔ اکثر الفاظ اس کے جو بظاہر بہت سادہ نظر آتے ہیں اپنے ساتھ ایک فہرست اور الفاظ کی لیٹر اور یو د رکھتے ہیں ۔ جن سے الفاظ پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ . . پشت ہٰذا پر جو فہرست ہے اس کے الفاظ اور اور مصادر سے مل کر ایسی بہتات پیدا کرتے ہیں کہ ایک ایک لفظ کا ختم کرنا اور معنی لکھنا اور مثالیں درج کرنا کئی کئی دن کھا جاتا ہے۔

پُشت پر لفظ "لگ" کے مشتقات کی یہ فہرست درج ہے۔

لگنا (اس کے ایک سو سے زیادہ معنی ہیں) لگانا، لگاؤ، لگاوٹ لگن، لاگو، لگا، لگنت، لگنتا، لگان، لگائی، لگی، لگو، لگو، لاگ، لاگی، لگونہا، لگاون، لگی، لگوا، لگوائی، لگائی، لگو اڑہ، لگو بدھو، لگ بھگ، لگ ماترا، لگ ماتری، لگے لگے، لگا بندھا، لگا لگایا، لگی لپٹی، لگائی بجھائی، لاگ ڈانٹ، لاگ لپیٹ، لگاتار، لگا سگا، لگے ہاتھ، لگ چلنا، لگا کھانا، لگا لگنا۔ لگے رہنا۔

ایک یادداشت میں لفظ "اچھا" کے معنوں اور محل استعمال کا احاطہ کیا ہے۔ شمارہ ۲۲ تک پہنچتا ہے۔ اور سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا ہوگا۔ عدد اور آگے تک بڑھے ہوئے ہیں۔ بخچہ کرتے وقت یقیناً کچھ اور سلسلہ بڑھایا ہوگا۔ چند مثالیں لکھتا ہوں : قطع کلام کے لئے (اچھا بک بک مت کرو) تسکین کیلئے، کلمہ تشفی (اچھا چلے جانا گھبراؤ نہیں) ۔ اتفاق رائے تسلیم (اچھا تمہارا ہی کہنا منظور) قصہ مختصر آگے کہو (اچھا پھر کیا ہوا) جواب ندا (اچھا سن لیا۔ آتا ہوں) عجیب (یہ بھی اچھا دستور ہے کہ . . .). کلمہ تعجب (اچھا۔ اتنی تیز دھوپ میں اتنی دور پیدل) دھمکی، تہدید (اچھا بچہ مزا چکھاؤں گا)۔ للکار (اچھا دیکھ لیا ہے) ۔ موافق (اس علاج کے لئے یہ موسم اچھا نہیں) تندرست (مریض اچھا ہے)۔ بہتر (یہ کپڑا اس سے اچھا ہے)۔ خالص (یہ گھی اچھا ہے)۔ مناسب (زبانی کہنا اچھا ہے لکھ کر بھیجنا اچھا نہیں) خیر و عافیت سے (کب آیا۔ اچھا ہے) سرخرو (سب کی کاٹ کر کے اور سب سے اچھا رہے) کافی (دو بچے کے لئے بھی مرض اچھا ہے)۔ راضی (خدا اچھا تو جہاں اچھا ہے)۔ حتیٰ کہ اچھا کے معنی بُرے کے بھی ہیں۔ لکھتے ہیں :- بیڈھب۔ بُرا (اچھا عذاب مول لیا)

لُغت لکھنا ان کا منصبی بھی تھا اور تفریح بھی ۔ لے دے کے یہی رہ گئی تھی ۔ مطالعہ کے ہمیشہ سے شوقین تھے ۔ سینکڑوں کتابیں نئی پرانی، نظم و نثر ہر طرح کی محض الفاظ اخذ کرنے کیلئے پڑھیں ۔ ساقی بکڈپو کی کونسی کتاب ہوگی جس سے انھوں نے الفاظ نہ لئے ہونگے ۔ وہ کہتے تھے یہ ضروری نہیں کہ تمام الفاظ و محاورات اپنے جملہ معنوں میں استادوں ہی کی کتابوں، دیوانوں وغیرہ میں مل گئے ہوں ۔ تدوین لغات کیلئے رسالے، اخبار، اشتہار سب کا پڑھنا ضروری ہے ۔ مجھے ان میں چپے چپے پر کام کی چیزیں مل جاتی ہیں ۔ اُردو کے ہر لفظ کے ساتھ مختلف مصادر لاحق ہو کر مفہوم کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں "ہونا" کے کچھ اور معنی ہیں "ہو لینا" کے کچھ اور ہو جاتے ہیں ۔ پھر اس کے ساتھ باندھنا، بندھنا، اکڑنا، لگنا، کھانا (یا کھاؤ!) بگڑنا، ہونا، ہو جانا، غرض مصادر لگتے چلے جاتے ہیں "جواب" کے جو معنی ہیں سو ہیں ۔ (اور یہ اثر کے پرعکس سے پیکر حریف، مقابل، انکار اور بدلے تک گئی ہیں) "جواب دینا" ایک لُغت ہو جاتا ہے (آج ملازم کو جواب دیدیا، ڈاکٹروں نے بھی جواب دیدیا) وعلیٰ ہٰذا القیاس ۔ آپ ایک لفظ "آنا" ہی کے بے حساب معنوں کو خیال میں لا کر دیکھیں ۔ الفاظ و معانی کے اس ٹڈی دَل کو گھیرنا بڑے جتن کا کام تھا ۔ اور انھوں نے اسے ۱۵ برس بنہایت تندہی سے انجام دیا ۔ لُغت انھوں نے حرفِ "ن" تک لکھی تھی ۔ اور پہلی دو جلدیں تک صاف کر کے طباعت کیلئے بھیج بھی چکے تھے ۔ "ن" کا کچھ حصہ نیز "و" "ہ" اور "ی" ناقص رہے ۔ گو ان حروف کیلئے بھی وہ کافی مسالہ چھوڑ گئے ہیں ۔

اپنے مختصر سوانح انھوں نے ایک بار اپنے ہی قلم سے لکھنے شروع کئے تھے ۔ مگر خاندانی حالات سے آگے کچھ بہت نہ لکھ سکے ۔ آپ حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد میں تھے ۔ موصوف کے "اجداد اور اعقاب" پر ایک صاحب میر برکت علی نے ایک مستقل کتاب بھی "مرآۃ الحقائق" تالیف کی ہے ۔ مگر دراصل حضرت موصوف کی تصنیف "اخبار الاخیار" کے ایک حصّے کو نقل کر دیا ہے ۔ اور خاندان کے بزرگوں کے بالکل نام اور بے ربط سا احوال لکھ دیا ہے ۔ والد صاحب مرحوم نے اس کی ایک جلد پر جا بجا نئے حاشیے، ضمیمے اور مختلف کتب تواریخی سے اقتباسات نقل کر کے خاصا مفید بنا دیا ہے ۔ آپ گیارھویں پشت میں حضرت موصوف کے پوتے تھے ۔ ان کے مورثِ اعلیٰ خواجہ آغا محمد عہد علاؤالدین خلجی میں ترکستان سے ہندوستان آئے تھے اور اس وقت کے ممتاز مدبروں میں تھے ۔ ضیا برنی نے آپ کا ذکر بہت تعریف سے کیا ہے ۔ (والد صاحب نے اپنی مختصر لمتید سوانح میں پشت در پشت اور بھی بزرگوں کے فضائل و کمال گنوائے ہیں) دلی سے نسبت قدیم بلکہ قدیم ترین ہے ۔ خود بھی دلی میں ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے ۔ بچپن کا بہت سا حصہ اپنے والد خانبہادر مولوی انوار الحق کی معیت میں کوہ آبو وغیرہ پر گزرا جو ایجنٹ گورنر جنرل راجپوتانہ کے میر منشی تھے ۔ ۱۹۰۲ء میں علیگڈھ سے گریجویٹ ہو کر نواب محسن الملک سکریٹری کالج کے اسسٹنٹ ہو گئے ۔ اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے اڈیٹر بھی رہے ۔ اس کے بعد نواب وقار الملک اور نواب اسحاق خاں صاحب کے ساتھ بھی کئی برس مددگار خصوصی کے طور پر کام کیا ۔ اور کئی برس لٹن لائبریری کے انچارج رہے ۔ ۱۹۱۰ء میں نواب محمد علی سے ٹرسٹیوں کے اجلاس میں کھلم کھلا لڑائی لڑ کر علی گڈھ کی تیرہ سالہ ملازمت اور ۲۵ سالہ تعلقات کو خیرباد کہہ آئے ۔ کسی قدر تنک مزاج واقع ہوئے تھے اور کسی سے دب کر رہنے یا تملق برتنے کے عادی نہ تھے ۔ پھر دو برس نوابزادگانِ جاورہ کے اتالیق رہے ۔ یہ ملازمت بھی اتنے ہی دن نبھ سکتی تھی ۔ اجمیر سے جو خطوط صاحبزادگان کی طرف سے جاورے بھیجے جاتے اکثر منظوم ہوتے ۔ اس کے بعد سات برس بیمار اور خانہ نشین رہے پانو میں فلنگ آگیا تھا ۔ گھٹنے میں سخت درد رہتا تھا ۔ بڑی مایوسی کی صورت پیدا ہو گئی تھی ۔ دن رات طب کے مطالعہ میں غرق رہے ۔ بالآخر مرض کا کھوج لگا کر اپنا علاج آپ کیا اور بفضلہ بھر میں اچھے ہو گئے ۔ دیوان حافظ کا ترجمہ، افسانہ پدمنی اس دَور کی یادگار ہیں ۔ ۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ دہلی میں سرگرمی سے شریک رہے ۔ ان کا دعویٰ تھا کہ علیحدگی سندھ کی تجویز سب سے پہلے انھوں نے ہی پیش کی تھی ۔ ایک پمفلٹ بھی انگریزی میں "ریفارمز اِن دی سلینس" ۱۹۲۵ء میں لکھا تھا ۔ جو مسلم لیگ کی نشأۃ تازہ سے پہلے کی بے رنگ و بے خروش مسلم سیاسیات کا ترجمان ہے ۔ تاہم کچھ تازہ افکار کا حامل ضرور ہے ۔ عرب کالج میں فارسی کے استاد بھی رہے ۔ پھر اپنے ایک "راہ چلتے" دوست کی درخواست پر حیدرآباد گئے ۔ اور کئی برس تک ان کے ایک کڑے مقدمہ میں مشیر قانونی و پیروکار رہے ۔ مقدمہ کی کامیابی کے بعد کوئی معاوضہ اس محنت کا طلب نہ کیا ۔ ۱۹۳۰ء میں مولوی عبدالحق صاحب کے ہاتھ لگ گئے ۔ اور ۱۵ برس ان دونوں بزرگوں میں نہایت خلوص اور قرابت رہی ۔ مولوی صاحب کو لُغت نویسی کے لئے ان سے بہتر آدمی ملنا مشکل تھا ۔ اور ان کی بھی مولوی صاحب ہی جیسے رکھ پت

مکھاپت کے آدمی سے بن سکتی تھی۔ ۱۹۳۹ء تک حیدرآباد میں قیام رہا
آخری زمانہ دلی میں گزرا۔ یکم جون ۱۹۴۵ء کو ۱۰ دن بیمار رہ کر انتقال
کیا۔ دیکھنے میں ہمیشہ سے نازک اندام تھے مگر شاذونادر ہی بیمار
پڑتے تھے۔ اور توانائی اس قدر تھی کہ دن رات لگاتار محنت کرنے اور
ہرگز نہ تھکتے۔ ان کی یہ دھن ضرب المثل ہوگئی تھی۔

ان کی شخصیت کے بعض اور پہلو، ان کی وسیع علمیت تاریخ دانی، قدامت وجدت کا امتزاج، لطیفہ گوئی و بذلہ سنجی زیادہ تفصیل چاہتے ہیں۔ وہ نظم سے زیادہ نثر کے دھنی تھے۔ اور تقریر و گفتگو کے اس سے بھی بڑھ کر۔ خصوصاً تاریخی واقعات کے مرقع اس تفصیل اور اس خوبی سے کھینچتے کہ گھنٹوں سننے والے کا جی نہ بھرتا۔ یہ صرف قصہ خوانی ہی نہ تھی بلکہ تاریخ پر بہت اچھا محاکمہ بھی کرتے تھے۔ کتب خانوں کے چلتے جاگتے کیٹلاگ تھے۔ اکثر تاریخی مقامات کا بالتفصیل مشاہدہ کیا تھا۔ میلوں کی صحرا نوردی کے بعد سیری کی قدیم فصیل کے آثار تلاش کئے تھے۔ گنجائش ہوتی تو ان کے کچھ خطوط ہی کے نمونے آپ کو دکھاتا مگر اس مضمون کو اس سے زیادہ طول دینا ممکن نہیں۔ لہٰذا اجازت!

دو نئی کتابیں

دلہن کی سیج خلیل جبران کے سات بلند پایہ افسانوں کا دلپذیر مجموعہ جن میں سوسائٹی کے گھناؤنے پہلوؤں پر زہرناک طنز بھی ہے اور انسانی ارتقا کے بلند تصورات بھی حسن و محبت کے دلدوز مناظر بھی ہیں اور انشائے عالیہ کے دلکش نمونے بھی۔ اس کتاب کا ہر افسانہ اپنی ایک مستقل قیمت رکھتا ہے۔ ترجمہ بھی نہایت صاف سلیس اور رواں ہے جس میں اصل کی تمام خوبیاں منتقل کر دی گئی ہیں۔ مترجمہ حبیب اشعر۔ قیمت ۲ مجلد و سرورق رنگین

نور و ظلمت آنسہ میّ شام کی مشہور آتش نفس ادیبہ ہے جس کی تحریروں میں زندگی کی تلخیاں اور شیرینیاں گھلی ملی ہیں جو بیک وقت آپ کے ذہن کو متضاد کیفیتوں سے آشنا کرتی ہے صلاح الدین قریشی نے اس نکتہ رس ادیبہ کے بعض قابل قدر مضامین کا ترجمہ نور و ظلمت کے نام سے کیا ہے جس کے مطالعہ سے روحانی لطف محسوس ہوتا ہے جو اصل کے مطالعہ سے۔ مجلد اور سرورق سے آراستہ قیمت ۱۲ؔ

ملنے کا پتہ

ساقی بک ڈپو دہلی

قتیل شفائی

تخاطب

تو نے اک روز شکایت کی تھی — تیری آنکھوں سے ہیں بیزار یہ کاجل
اور اب مجھ کو گلہ ہے سرِ شام — بے سبب ہیں تری پلکیں بوجھل

تو نے آنکھوں سے پکارا تھا مجھے — "آ مسافر مرے ہونٹوں پہ نہ جا"
اور اب ہونٹ ترے کہتے ہیں — "جا مسافر! ہمیں تالے نہ لگا"

تو نے دنیا کی نظر سے بچ کر — میرے آغوش کو مہکایا تھا
عشق اور مشک نہیں چھپ سکتے — کیا کبھی تجھ کو خیال آیا تھا

تو نے شب بھر تو مری باہوں پر — اپنی زلفوں کو بکھیرا ہوتا
رات کٹ جاتی سحر ہو جاتی — پھر بھی ہر سمت اندھیرا ہوتا

تو نے کمخواب کا بستر مانگا — میں نے آنکھوں پہ بٹھایا تجھ کو
ظاہری شان پہ مرنے والی — مطمئن پھر بھی نہ پایا تجھ کو

تو نے بیچی ہے جوانی کی بہار — عیش و عشرت کے پرستاروں میں
مجھ سے مانگے جو محبت کا خلوص — میں بھی ہوں تیرے خریداروں میں

ناصر شمسی

انکار

(ایک مجلسی تمثیل)

افراد

کرامت ——— ساحرہ

(ایک مختصر کمرہ۔ فرش پر ایک مدرنگ دری بچھی ہوئی ہے۔ دری کمرے سے چھوٹی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بڑے سر پر چھوٹی ٹوپی منڈھی ہے۔ پرانی وضع کی ایک مسہری دائیں جانب بچھی ہوئی ہے۔ مسہری کے مقابل وسط میں گول اور دو کرسیاں پڑی ہیں۔ بائیں جانب ایک سنگار میز دیوار سے لگی ہے۔ میز کے آگے ایک کرسی رکھی ہے۔ دیوار پر کوئی تصویر نہیں ہے۔ مسہری کرسیوں کا منہ چڑا رہی ہے۔ کرسیاں میز کو اور سنگار میز آپ اپنے سے بھڑکی جاتی ہے۔ دیواریں کوڑی منہ تک رہی ہیں۔ مسہری پر نہایت پُرتکلف پلنگ پوش بچھا ہوا ہے۔ مسہری کے نیچے جوتوں کے کچھ جوڑے رکھے ہوئے ہیں۔ ایک جوڑا ابھی اتارا گیا ہے۔ اور گرد جھاڑنے پڑا ہے۔ ایک کوٹ اور پتلون کرسی کی پشت پر پڑے ہیں اور ٹائی اور کالر بازو پر۔ سنگار میز پر کچھ سامان بے ترتیبی سے رکھا ہے۔ میز کے آگے کرسی پر ایک اٹیچی کھلا رکھا ہے۔ میز کے برابر دو سوٹ کیس رکھے ہیں۔ یہ مہمان کا کمرہ ہے۔ رات کا وقت ہے اور کمرے میں بجلی روشن ہے۔ کرامت گول میز پر پیر رکھے کرسی پر بیٹھے سگریٹ پی رہے ہیں۔ عمر تیس بتیس سال ہوگی۔ چہرے کے خطوط سُت گئے ہیں۔ لیکن وہ سختی نہیں جو بڑھاپے کی آمد کا پتہ دے بلکہ کچھ ایسی رفعت ہے جو یونانی فن کار کے نقوش میں ہوتی ہے۔ حرکات میں خود اعتمادی ہے۔ اپنے ہاتھ پیروں سے اتنے عرصے کام لینے پر یہ بات پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ طبیعت میں سنجیدگی ہے۔

دروازہ پر آہستہ سے کھٹ کھٹ ہوتی ہے۔ کرامت کچھ خیال نہیں کرتا اور سگریٹ پیتا رہتا ہے۔ کچھ لمحہ بعد پھر کھٹ کھٹ ہوتی ہے:۔)

کرامت:۔ کون؟

(ایک نسوانی آواز آہستہ سے "دروازہ کھولئے گا")

کرامت:۔ (آواز پہچان کر) اچھا۔

(جا کر جلدی سے دروازہ کھولتا ہے۔ ساحرہ داخل ہوتی ہے۔ جوان لڑکی ہے۔ شکل بھی اچھی ہے۔ یوں تو ہر لڑکی کسی نہ کسی کی نظر میں ضرور اچھی شکل کی ہوتی ہے۔ ہونٹ میٹھی میٹھی مسکراتی ہوئی آنکھوں کا انتظار کرتی رہتی ہے ساحرہ کو راہ تکنے میں یہ اعتراف اس کی آنکھوں کی چمک کے جواب میں ایک نرم مسکراہٹ ہی کیوں نہ ہو۔ کبھی سامنے آنکھوں کی چمک سی معصوم حرکت سے آگے بڑھ جاتی ہے اور پھر بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ اس وقت بھی ساحرہ کی آنکھوں کی چمک میں بہت کچھ نظر آرہا ہے۔

ساحرہ:۔ (دبی آواز میں) ابا جان سونے کے لئے لیٹے ہوئے ہیں کتاب پڑھ رہے ہیں۔ اماں جان سونے والی ہیں۔ اور نوکر سب اِدھر اُدھر ہو گئے ہیں۔ یہ نوکر کمبخت ایسے تاکتے رہتے ہیں جیسے ہم چور ہوں۔

کرامت:۔ (استعجاب سے) ساحرہ! تم اس وقت... یہاں ... (بات پوری نہیں کی جاتی)

ساحرہ:۔ اگر آپ زور سے بولیں گے تو ابا جان کتاب نہیں پڑھ سکیں گے۔ اماں جان کو دوبارہ ساڑھی باندھنی پڑے گی۔ اور نوکر سمجھیں گے کہ جاگ ہو رہی ہے۔

کرامت:۔ تو میں دروازہ بند کر دوں۔ آواز باہر نہیں جائیگی۔

ساحرہ:۔ جی ہاں!

کرامت:۔ (دروازہ بند کرکے) آپ بیٹھ جائیے۔ (ایک کرسی ساحرہ کیلئے سیدھی کرتے ہوئے)

ساحرہ:۔ (بیٹھتے ہوئے) شکریہ!... مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ سو

نہ گئے ہوں ۔

کرامت :۔ نہیں ۔ ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں ۔ میں سونے سے پہلے ایک سگریٹ پیتا ہوں (ایک کش لیتے ہوئے) ۹ منٹ ۴۴ سکنڈ ایک سگریٹ جلتا ہے ۔ ان چند منٹوں میں گذشتہ ۲۴ گھنٹے کے واقعات ٹٹولتا ہوں ۔ کچھ دردِ سر ، کچھ اعصاب کیلئے خراب ۔ کچھ معدہ کیلئے بوجھ سب کو سگریٹ کے دھوئیں میں اُڑا دیتا ہوں ۔ عام طور پر باقی کچھ نہیں بچتا ۔ اور پھر اطمینان سے سو جاتا ہوں ۔

ساحرہ :۔ اب آپ سگریٹ ختم کر کے سونا چاہیں گے !

کرامت :۔ میں آج ایک کی بجائے دو سگریٹ پی لوں گا ۔ اتفاق سے ایک سگریٹ ابھی کیس میں ہے بھی ۔

ساحرہ :۔ یہ تو اچھا ہی ہوا ۔

(چند لمحے خاموشی ۔ ساحرہ کرامت کو نظر اٹھا کے دیکھ رہی ہے کرامت کی نظریں ساحرہ کی طرف اٹھتی ہیں اور جھک جاتی ہیں ۔)

کرامت :۔ میں تم سے ایک بات پوچھوں ؟

ساحرہ :۔ ہاں ہاں ۔

کرامت :۔ کسی کو معلوم ہے تم یہاں آئی ہو ۔

~~ساحرہ :۔~~ میں چھپ کر تو آئی نہیں ۔ لیکن کسی نے مجھے دیکھا بھی نہیں شاید بلی نے دیکھا ہو !

کرامت :۔ ہوں ۔

ساحرہ :۔ میں آج دوپہر کو کچھ دیر سو گئی تھی ۔ اب نیند نہیں آ رہی تھی اس لئے باتیں کرنے آپ کے پاس آ گئی ۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ اتنی سی بات کی بھی صفائی طلب کریں گے ۔

کرامت :۔ نہیں میرا یہ مطلب تو نہیں تھا ۔ میرا مطلب تھا . . .

ساحرہ :۔ آپ کی انگلیوں میں سگریٹ کانپ رہا ہے ۔

کرامت :۔ (چونک کر) اوہ ! میں سگریٹ ایش ٹرے میں رکھ دیتا ہوں ۔

ساحرہ :۔ (ہنستی ہے) میں جب انگلیوں میں سگریٹ کانپتا دیکھتی ہوں تو ہنسی آ جاتی ہے ۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی ایک ٹانگ سے رسی پر ٹنگا ہوا ہو ۔ پاؤں پھسلتا ہو پھر بھی سنبھلنے کی کوشش کر رہا ہو ۔ اب گرا اور اب گرا ۔ (ہنستی ہے)

کرامت :۔ تم ہنسیں تو مجھے افسوس ہوا کہ میں نے سگریٹ جلایا کیوں تھا !

ساحرہ :۔ آپ کو یہاں سردی معلوم نہیں ہوتی ؟ کوٹھی کا یہ سب ٹھنڈا کمرہ ہے ۔

کرامت :۔ ہاں کچھ ٹھنڈا ہے تو ۔ اور مجھے سردی لگتی بھی زیادہ ہے زندگی کے جتنے سال گذرتے جاتے ہیں سردی زیادہ لگتی ہے ۔

ساحرہ :۔ اگر ٹھیک ٹھیک بتائیں تو ایک بات پوچھوں ؟

کرامت :۔ کیا ؟

ساحرہ :۔ اب آپ کی عمر کیا ہے ؟

کرامت :۔ ہوں ، تو اس لئے سردی کا ذکر چھیڑا گیا تھا ۔

ساحرہ :۔ نہیں تو ، اور اگر آپ نہیں بتانا چاہتے ہیں تو نہ بتایئے ابا جان کہہ رہے تھے آپکی عمر تیس پینتیس کے درمیان ہوگی ۔

کرامت :۔ میں چاہتا بھی تھا کہ تمہیں میری عمر معلوم ہو جائے ۔

ساحرہ :۔ آپ کہیں تو انگیٹھی رکھوا دیا کروں !

کرامت :۔ نہیں کیا ضرورت ہے ۔ چند دنوں کی تو بات ہی ہے ۔ زمین کی قیمت وغیرہ تو طے ہو گئی ہے ۔ بیعانہ دیدیا گیا ہے ۔ رجسٹری ہو جائے تو کام ختم ۔ میں روپیہ ادا کر کے واپس چلا جاؤں گا ۔ تمہارے ابا جان نے دیکھ بھال اپنے ذمہ لے لی ہے ۔

ساحرہ :۔ اگر آپ چند منٹ اور ایسے ہی باتیں کرتے رہے تو مجھے نیند آ جائیگی ۔

کرامت :۔ (استعجاب سے ساحرہ کی طرف دیکھتا ہے) اچھا !

ساحرہ :۔ (ہنستی ہیں اترا ہٹ سے) مجھے آپکی ایک بات بہت پسند ہے ۔ پوچھئے کیا ؟

کرامت :۔ کیا ؟

ساحرہ :۔ یہ میں نہیں بتاؤں گی . . . اور آپ جانتے تو ہیں . . .

کرامت :۔ معلوم ہوتا ہے تم میرا مذاق اڑا رہی ہو ۔

ساحرہ :۔ آپ میں یہ ایک اور اچھی بات ہے کہ تعریف کو مذاق سمجھتے ہیں ۔ عام طور پر آدمی مذاق کو تعریف سمجھتے ہیں ۔ کیسے چغد ہوتے ہیں ۔

کرامت :۔ شکریہ !

ساحرہ :۔ (بیتابی سے) میں آپ کو ایک بہت ہی پُرلطف بات سناؤں !

کرامت :۔ ہاں ، ہاں ۔

ساحرہ :۔ آج خالہ جان آئی تھیں ۔ خالہ جان ٹھگنے میں کمال نہیں آئیں ۔ ڈر لگتا ہے ۔ اس لئے ان کے صاحبزادے ساتھ آئے تھے دس بارہ سال کی عمر ہوگی ۔

کرامت :۔ [illegible] بھی دیکھا [illegible] تمہارے ابّا جان کے پاس باہر آئے تھے ۔

ساحرہ :۔ معلوم ہے انھوں نے مجھ سے کیا کہا ؟

کرامت :۔ کیا ؟

ساحرہ :۔ میں اپنے کمرے میں لیٹی تھی ۔ پڑھ رہی تھی ۔ کسی نے چپکے سے دروازہ کھولا ۔ میں لیٹی رہی ۔ سمجھی تھی کہ بلی ہوگی ۔ لیکن تھے وہ صاحبزادے ۔ میں نے پوچھا کیا ہے ۔ تو میٹھی میٹھی نظروں سے مجھے دیکھ کر کہنے لگے ۔ آپ بہت اچھی لگتی ہیں ۔

کرامت :۔ (مسکرا کر) ہوں ۔

ساحرہ :۔ مجھے ہنسی آگئی ۔ وہ میرے پلنگ پر آکر بیٹھ گئے ۔ اور کہنے لگے ” آپا جان . . . تیرہ برس بعد . . . . . . میں آپ سے شادی کروں گا “

(زور سے ہنستی ہے ۔ کرامت ساحرہ کی ہنسی میں کچھ ڈھونڈھ رہا ہے)

ساحرہ :۔ معلوم ہے اس کے بعد میں نے کیا کہا ؟

کرامت :۔ ایک چانٹا . . . ہیں !

ساحرہ :۔ نہیں . . . میں نے اپنے ننھے سے دولہا کو چوم لیا ۔ اور وہ گھبرا کر بھاگ گئے ۔

کرامت :۔ ہوں ۔

ساحرہ :۔ میں آج دن بھر اس بات پر ہنستی رہی ۔

کرامت :۔ ہاں ۔ بات بھی تو ہنسی کی ہے ۔

ساحرہ :۔ اوہ ! دیکھئے آپ کی انگلیوں میں سگریٹ پھر کانپ رہا ہے ۔

کرامت :۔ میں سگریٹ بجھائے دیتا ہوں ۔

ساحرہ :۔ اور میرے جانے کے بعد دوسری سگریٹ کے دھوئیں میں یہ سب باتیں بھی اُڑا دیں گے اور ہلکے ہو کر سو جائیں گے ۔

کرامت :۔ (جذبات سے) ساحرہ ۔

ساحرہ :۔ فرمائیے ۔

کرامت :۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں ۔

ساحرہ :۔ شادی ! مجھ سے !

کرامت :۔ (سراسیمہ) اوہ شاید یہ بات مجھے تیرہ برس پہلے کہنی چاہئے تھی ۔

ساحرہ :۔ آپ کا مطلب ہے کہ خالہ جان کے صاحبزادے کی طرح آپ بھی . . . .

کرامت :۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں ۔ ساحرہ !

ساحرہ :۔ (نیچی نظروں تبسم کے ساتھ) آپ بھی خوب آدمی ہیں ۔

کرامت :۔ اس عمر میں شادی کیلئے درخواست کرنا کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے ۔ میں نے تو شادی کا خیال چھوڑ دیا تھا ۔ لیکن اب تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں ۔ بیحد چاہتا ہوں ۔

ساحرہ :۔ آپ نے شادی کا خیال چھوڑ کیوں دیا تھا ۔

کرامت :۔ پہلے کوئی لڑکی سمجھ میں ہی نہ آتی تھی ۔ دل چاہتا تھا کہ لڑکی ایسی ہو اس میں یہ بات بھی ہو ۔ اور وہ بات بھی اور اگر کوئی لڑکی سمجھ میں آتی تھی اس کی شادی کہیں اور ہو جاتی تھی ۔ یہاں تک کہ اتنی عمر ہوگئی ۔ پھر سوچا کہ شادی لڑکے لڑکیوں کا کام ہے اتنی عمر میں شادی کرتا کیا اچھا لگوں گا ۔ اس لئے شادی کا خیال چھوڑ دیا تھا ۔

ساحرہ :۔ آپ کی عمر تو اتنی زیادہ نہیں ۔

کرامت :۔ لیکن ایک دفعہ جب آدمی تیس کا ہو جائے تو پھر عمر کا احساس بڑھتا ہی جاتا ہے ۔

ساحرہ :۔ (ہنس کر) اچھا ۔

(چند لمحے خاموشی ۔ ساحرہ کی ہنسی جھلملا رہی ہے)

کرامت :۔ میں جب تمہیں ہنستا دیکھتا ہوں تو میری طبیعت [illegible] عجیب گدگدی [illegible] ہے ۔ میری طبیعت چاہتی ہے کہ میں بھی ہنسوں ۔ اور جب آدمی ہنستا ہے تو بچپن کے نزدیک آجاتا ہے ۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ پھر سے زندگی حاصل ہو رہی ہے ۔

ساحرہ :۔ آپ کو دن میں ایک بار ضرور ہنسنا چاہئے ۔ پھیپھڑے ٹھیک رہتے ہیں ۔ نہیں تو کسی ڈاکٹر سے پوچھ لیجئے گا ۔

کرامت :۔ میں بھی جانتا ہوں کہ ہنسنا بہت ضروری چیز ہے ۔ اسی لئے تم سے کہہ رہا ہوں کہ . . . .

ساحرہ :۔ (بات کاٹ کر) اب آپ پھر وہی کہیں گے کہ . . .

کرامت :۔ مجھے ڈر ہے کہ تم کہیں انکار نہ کر دو ۔

ساحرہ :۔ (ہنس کر) انکار ! . . . بھلا کوئی انکار کیسے کر سکتا ہے ۔ روپیہ آپ کے پاس ۔ تعلیم آپ کے پاس ۔ شرافت آپ کے پاس ۔ عزت آپ کے پاس ۔ اور کیا چاہئے اس کے علاوہ اور کیا چاہئے ۔ آپ تو جسے چاہیں اشارہ کر دیں [illegible] اپنی بڑی عزت سمجھے گی کہ آپ نے اپنے لئے [illegible] کیا ۔

کرامت :۔ ساحرہ تم مجھے اپنے قابل سمجھتی ہو ۔

ساحرہ :۔ یہ آپ کو کوئی کیسے بتائے۔

کرامت :۔ سچ ساحرہ۔

ساحرہ :۔ آپ کے آنے سے قبل میں سمجھ رہی تھی کہ آپ بھی ابا میاں کے دوستوں کی طرح ہوں گے۔ یا قبال سفید ہوں گے یا ایک دو دانت جھڑ گئے ہوں گے۔ نہیں تو چہرے پر بڑھاپے کی مخصوص لکیریں تو ضرور گہری ہو گئی ہونگی۔ لیکن جب آپ آئے تو میں نے دیکھا کہ آپ . .

کرامت :۔ تمہارا خیال تھا کہ میرے دانت بھی جھڑ گئے ہونگے۔

ساحرہ :۔ لیکن مجھے یہ تو خیال بھی نہ تھا کہ آپ ایسے ہوں گے۔

کرامت :۔ کیسے ؟

ساحرہ :۔ میں کیوں بتاؤں۔ اماں جان کہتی ہیں کہ مردوں کی کبھی تعریف نہیں کرنی چاہیے۔ ورنہ وہ پھول جاتے ہیں۔

کرامت :۔ (ہنس کر) اوہ۔

ساحرہ :۔ (ہنستی ہے) آثار تو اچھے ہیں۔ آپ نے ابھی سے ہنسنا شروع کر دیا ہے۔

کرامت :۔ (جذبات سے) ساحرہ !

ساحرہ :۔ فرمائیے !

کرامت :۔ میں کس قدر خوش قسمت ہوں۔ یہ گھڑی قبولیت کی ہے میں جو چاہوں مل جائیگا لیکن میں صرف تمہیں چاہتا ہوں۔ بس تمہیں۔ تم مل گئیں تو مجھے سب کچھ مل جائیگا مگر

ساحرہ :۔ آپ تو خبر نہیں مجھے کیا سمجھ بیٹھے ہیں۔

کرامت :۔ تم میں کچھ عجیب چیز نظر آتی ہے۔ وہ چیز کیا ہے یہ تو میں بتا نہیں سکتا۔ میرا مطلب ہے کہ تم خوبصورت ہو۔ اچھی معلوم ہوتی ہو تم میں کشش ہے لیکن اس کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے۔ وہ اس قدر واضح ہے اس میں ایسی کشش ہے کہ آدمی فوراً متوجہ ہو جاتا ہے۔ تم عام لڑکیوں سے اس قدر مختلف ہو۔

ساحرہ :۔ عام لڑکیوں سے مجھے خاص چڑ سی ہے۔ ایک آدھ موقع پر جو ہے وہ ان کے فلسفے [illegible] رہی ہو۔

کرامت :۔ ایک بیگم نہ میری طرف دیکھا۔

[illegible] بات ہے ؟

[illegible]

[illegible]

[illegible] حیرت سے) کیا !

کرامت :۔ تمہاری بڑی بڑی سیاہ پتلیاں سفیدی کے اس [illegible] سمندر میں تیرتی پھرتی ہیں۔ ساری موتیوں کی چمک ان پتلیوں [illegible] ہے۔ موج پر موج اٹھتی ہے۔ طوفان اٹھتا ہے اور میں ڈوب جاتا ہوں۔

ساحرہ :۔ (ہنس کر) یہ کیا بات ہوئی ؟

کرامت :۔ میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں ساحرہ۔

ساحرہ :۔ کم از کم آپ کو تو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ مجھے تو خیال بھی نہیں تھا کہ آپ ایسی باتیں کریں گے۔ جب آپ آئے تھے تو آپکے ہونٹ بھنچے رہتے تھے۔ اور اب آپ نے دوسرے کا بولنا مشکل کر دیا ہے۔

کرامت :۔ لیکن میری بات تو تم نے پوری ہونے نہیں دی۔

ساحرہ :۔ تو ابھی کچھ باقی ہے۔

کرامت :۔ ابھی جب تم ہنسیں تو ان پتلیوں میں بھبھوکی سی شمع نکلی تھی جیسے تم نے گیس کا بڑا سا غبارہ دیکھا ہو۔

ساحرہ :۔ آپ مذاق کر رہے ہیں۔

کرامت :۔ (پریشان ہو کر) اوہ ! نہیں میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ لیکن تمہاری آنکھیں . . . . یہ پتلیاں جو ایک کو نے سے دوسرے کونے میں دوڑتی پھرتی ہیں۔ . . . ان میں کیا ہے . .

ساحرہ . . . میں بتا نہیں سکتا ان میں کیا ہے . . . .

ساحرہ :۔ میں اب جا کر سوتی ہوں۔

کرامت :۔ کیوں تمہیں نیند آنے لگی ؟

ساحرہ :۔ میں ذرا گھبرا سی گئی تھی۔ . . . . . میرا مطلب ہے کہ آپ . . . . .

کرامت :۔ اوہ !

ساحرہ :۔ میں اب جاتی ہوں۔ ننھی مسہری میں میرے پائنتی سوتی ہے۔ خالی مسہری دیکھ کہیں اماں جان کی آنکھ نہ کھل جائے۔ اماں جان سمجھ جائیں گی۔ . . . . کمبخت اکیلی [illegible] نہیں سوتی۔

کرامت :۔ اچھا۔

ساحرہ :۔ اچھا شب بخیر۔

کرامت :۔ ساحرہ تمہاری آنکھیں پھر چمکیں جیسے بلی کی آنکھیں اندھیرے میں چمکتی ہوں۔

ساحرہ :۔ (ہنس کر) اگر آپ کے چہرے پر جھریاں ہوتیں اور آنکھیں سیاہ حلقوں میں دھنسی ہوتیں اور ماتھے پر [illegible]



ساقی

ساحرہ
کرامت
ساحرہ
[illegible]
[illegible]
[illegible]
کرامت
ساحرہ
کرامت
ساحرہ
[illegible]
کرامت
ساحرہ
[illegible]
کرامت
ساحرہ
کرامت
[illegible]
مل گئیں تو
ساحرہ
کرامت
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
ساحرہ
[illegible]
کرامت
ساحرہ
کرامت

ادارہ
شاہد احمد دہلوی
محمد حسن عسکری

سالانہ چندہ
چھ روپے
قیمت فی پرچہ نو آنے

جرعات

جلد ۳۳ | ساقی دہلی، بابت ماہ جون سنہ ۱۹۴۶ء | نمبر ۶

حسن عسکری

جھلکیاں

آج کل فرانس کے ادبی حلقوں میں ایک بڑی مزیدار اور گرما گرم بحث چھڑی ہوئی ہے۔ بحث یہ ہے کہ فرانس کے ادیبوں کے حالات تیس سال پہلے کی بہ نسبت بہتر ہیں یا نہیں۔ بحث شروع اس طرح ہوئی کہ ایک ادیب آندرے بلی نے دعویٰ کیا کہ اب ادیبوں کی زندگی پہلے سے کہیں اچھی طرح گزرتی ہے۔ نوجوان نسل کی طرف سے اس کا بڑا پُرزور جواب ایک اور ادیب ماریوس گرو نے دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ لکھنے والے کی زندگی اِس سماج اور اس تہذیب کے درمیان بڑی مشکل سے بسر ہوتی ہے، جہاں دماغی کام کی قدر اور عزت تو بہت ہوتی ہے لیکن زندگی کی ضروریات اور اخراجات کو دیکھتے ہوئے اس کا صلہ بہت کم ملتا ہے۔ لکھنے والے کو جن مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُن کا ذکر کرنے کے بعد مسیو گرو کہتے ہیں:۔

"میں کوئی حق نہیں مانگتا، نہ کوئی دعویٰ کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ روح کو حق مانگنا یا دعوے کرنا پسند نہیں۔ اپنی تعریف کے لحاظ سے ہی روح تو بڑی نادار ہے، اور اُس نے نادار رہنا خود قبول کیا ہے۔"

آندرے بلی نے اس کا جواب دیا، اور اپنی بات دُہرائی۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ ادیبوں کو اتنے پیسے نہیں ملتے کہ اس پیشے میں لوگوں کے لئے کوئی کشش ہو، بلکہ جن لوگوں کے قدم جم چکے ہیں انھیں بھی اپنا معیارِ زندگی برقرار رکھنے کا یقین آسانی سے نہیں ہوتا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اب وہ تنگی ترشی باقی نہیں رہی جو انیسویں صدی میں تھی۔ ادیبوں کا ایک طبقہ تو ایسا ہے جو اپنی روزی اور طریقوں سے کماتا ہے، مثلاً کوئی پروفیسر ہے کوئی وکیل وغیرہ وغیرہ، ویسے تو انہیں روٹی کی فکر نہیں ہے، لیکن ان کی آمدنی بھی بڑھ گئی ہے۔ دوسرا گروہ اُن ادیبوں کا ہے جن کا کام ہی لکھنا ہے۔ ان لوگوں کی بھی اب وہ حالت نہیں رہی جو پہلے تھی، کیونکہ یہ پیشہ اب خاصہ منظم ہو گیا ہے۔ خاص طور پر ہفتہ وار اخباروں کو بہت ترقی [illegible] اس قسم کے [illegible] ادیبوں کو روٹی کی فکر سے آزاد کر دیا ہے۔ اس طرح اُنہیں مُستقل آمدنی کا اچھا خاصہ وسیلہ مل گیا ہے، اور کام بھی کچھ غیر دلچسپ نہیں۔

آندرے بلی نے ادیبوں کی زندگی کے ایک اور پہلو پر روشنی ڈالی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اب حالات پہلے کی بہ نسبت بہت سُدھر گئے ہیں۔ حد سے زیادہ شراب نوشی ادیبوں کی زندگی سے تقریباً غائب ہو گئی ہے۔ اُنیسویں صدی میں مُوسے اور ورلین جیسے شاعروں کو شراب بہت عزیز تھی، اور وہ نشے میں دُھت رہا کرتے تھے، لیکن اب ادیبوں کو ایسے مُحرّکات کی ضرورت نہیں پڑتی۔ آج کل کے نوجوان فرانسیسی شاعر بالکل اپنے ہوش میں رہتے ہیں، اور عام انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے کو حقارت کی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ آج کل کا ادبی ماحول پوری طرح ہوش مند ہے۔ اب وہ پُرانی رندی اور لااُبالی پن باقی نہیں رہا۔ ادیب اب شریف آدمی بن گئے ہیں۔ جب اُن کے بچے نظمیں پڑھتے ہیں تو ماؤں کو اپنا چہرہ چُھپا لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اب تو ادیبوں کو انسان بننے کی زیادہ فکر ہے۔ ادیب اور اس کی پبلک کے درمیان تعلقات بہت خوشگوار ہیں۔ آندرے بلی کہتے ہیں کہ سن ۱۸۷۰ء کے بعد سے فرانسیسی سماج نے دُنیا کے سامنے ذہنی آزادی کا ایسا مثالی نمونہ پیش کیا ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اور اسی وجہ سے ادیبوں کی حالت میں یہ انقلاب پیدا ہوا ہے۔

یہ بحث تو تھی ادیبوں کی مادی حالت کے بارے میں۔ اس کے علاوہ ایک اور بھی زوردار بحث چھڑی ہوئی ہے۔ یہ بحث سماج میں ادیبوں کے مقام کے متعلق ہے۔ اس مسئلے پر کلود آولین نے اپنی کتاب "روح کے فرائض" میں خاص طور پر بحث کی ہے۔ فرانس پر جرمنوں کے قبضے کا زمانہ ادیبوں کے لئے بڑی مشکل کا وقت تھا۔ "غداری کریں" یا "غداری نہ کریں"۔ ان دو فقروں کے معنی ہی نئے ہو گئے تھے۔ ادیبوں کو یہ طے کرنا تھا کہ اپنے اندر جو انسان ہے اُس سے غداری کریں یا اپنے اندر جو فن کار ہے اُس سے۔ کلود آولین نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ روح کو خدمت تو کرنی چاہیئے لیکن اس طرح کہ غلام بن کر نہ رہ جائے۔

کسی آدمی یا کسی حکومت کی خدمت نہیں، بلکہ چند خیالات کی، چند اُصولوں کی جن کے بغیر انسان کی زندگی محال ہے اسی طرح دماغی کام کرنے والے کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ سیاسی مصلحتوں اور ضرورتوں کو اعتقادات یا مذہب کی شکل اختیار کرنے سے روکے۔ یہ آدرش عقل کو بہت اونچا درجہ دیتا ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ عقل کو گرمانے کے لئے اُصولوں سے والہانہ عقیدت اور محبت ضروری ہے۔

دوسرے ادیبوں نے بھی بڑی سرگرمی سے اس بحث میں حصّہ لیا ہے۔ وہ یہ سوال پوچھتے ہیں کہ ادیبوں کو اپنی مرضی سے خود کو کسی مقصد کے لئے وقف کر دینا چاہیئے یا دوسروں کی مرضی کا پابند ہو جانا چاہیئے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ فنکار کا خدا الگ ہوتا ہے، اور صرف وہی خدا اُسے کسی بات کا حکم دے سکتا ہے۔ فن کار کا خدا وہ تخلیقی تحریک ہے جو فن کار کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ ادب بڑے بڑے واقعات کو اپنے طریقے سے استعمال کرتا ہے، اور ان طریقوں کے بارے میں کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ پچھلی جنگِ عظیم کے بعد یوں تو کئی عمدہ وقائع نگار پیدا ہوئے، لیکن عروج حاصل ہوا مارسل پروست اور والری کو جن کے پاس جنگ کے متعلق کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ اب ادیب یہ سوچ رہے ہیں کہ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک کے زمانے سے وفاداری برتنے کے معنی یہ تو نہیں ہوں گے کہ کوئی نیا پروست اور نیا والری پیدا نہ ہو۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ ادیب اپنے آپ کو کس چیز کے لئے وقف کرے۔ سیاست کے لئے؟ یا تخلیق کے لئے؟

یہ سوالات ادب کے لئے ہی نہیں پوری انسانی تہذیب کے لئے اہم ہیں۔ ہم ال———— چاہتے ہیں کہ یہ تہذیب بے غرض انسانوں کی تہذیب ہو۔ کیونکہ تہذیب کو جو چیز بڑا بناتی ہے یہ وہ خیالات اور وہ تحقیقی کام ہیں جن کا مقصد مادّی فائدہ یا قوت حاصل کرنا نہیں تھا۔ مہذب آدمی وہ ہے جو اپنی سرگرمیوں کا ایک حصّہ اُن چیزوں کے لئے وقف کر دیتا ہے جن کا کوئی معاوضہ نہیں مل سکتا، لیکن دراصل صرف یہی چیزیں مانج کے لئے فائدہ مند ہیں۔"

(یہ مضمون تقریباً ترجمہ ہے)

امین حزیں

نکات

حق و باطل کی جب ہو آویزش
نور و ظلمت میں جب چھڑے پیکا
جیت یا ہار تخت یا تختہ
اہلِ بینش کا ہے یہی ہنجا

(۲)

"کچھ اُدھر تم جُھکو اِدھر کچھ ہم"
اس طلسمِ مداہنت سے حذ
وحدہٗ لاشریک کی سوگند
ہے یہ تہذیب کا فریب ولا

(۳)

نور و ظلمت کا جوڑ ناممکن
میل دن رات کا ہوا بھی کبھی
اس حقیقت کی واقعیت کا
معترف کیا نہیں غنی سے غبی

(۴)

سانچ کو آنچ آ نہیں سکتی
سانچ جبتک کہ سانچ ہے ق
جس سے طورِ خودی ہی بقعۂ نور
سانچ دل کی وہ آنچ ہے ق

ایم ۔ ڈی تاثیر

تنہائی

کہو کیسی رہی تقریر مری !—
وزراء قوم کے سرتاج ہیں اور
میں وزیروں میں، مسلمان وزیروں میں، پڑھا لکھا ہوں
ورنہ تم جانتے ہو خوب اُنہیں اور مجھے
کونسی بات ہے وہ جو تمہیں معلوم نہیں۔
"بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو"
بات کرنا تو کجا۔ بات سمجھتے بھی نہیں
مری پھبتی مرے فقروں کو سمجھتے ہی نہیں
اور جو سمجھیں تو خدا خیر کرے
میرا اک ووٹ اسمبلی میں نہیں !—
میں ہی میں ہوں۔ میں جدھر دیکھتا ہوں
کتنا تنہا ہوں میں اس دُنیا میں !
کتنا تنہا ہوں میں۔ تم کو بھی یہ معلوم نہیں !—
تم مری رات کی خوابوں، مری ہنگامہ پرستی پہ نہ جاؤ
[illegible] ہے۔ تلاش ہے وزارت کے لئے
کھوکھلے دبدبے، بے اصل امارت کے لئے

بھولنا چاہتا ہوں میں کہ مرا کوئی نہیں
کتنا تنہا ہوں میں۔ دُنیا میں مرا کوئی نہیں !—
سُست بنیاد وزارت مری اوروں کی طفیل
دبدبہ میرا، امارت مری اوروں کی طفیل !—
میں مگر "میں" ہوں مرا زور مری بات میں ہے
میری تقریر، مری چال، مری گھات میں ہے —
میری تقریر، وہ دریا ہے کہ— تم جانتے ہو،
آج کے جلسے میں کیسی رہی تقریر مری !—
میں نے "سرتاج" کو دو لفظوں کی ترکیب بنایا تو وہ "شخص"
کیسے مُنہ کھولے ہوئے دیکھ رہا تھا مجھ کو
سارے مجمع کی یہی حالت تھی !—
علم اور عقل کی اس دور میں وقعت کیا ہے
ورنہ اُس "شخص" کی بتلاؤ کہ قسمت کیا ہے
کسی تکیئے میں کوئی چلمیں نہ بھرنے دیتا !—
مگر اُس "شخص" کو طاقت ہے نصیب
اس کی طاقت سے مری طاقت ہے

اس کو مبہوت بنائے رکھنا
اس کو ہر روز نئی چال بتاتے رہنا
اس کو تقریر سے، باتوں سے لبھاتے رہنا!—
وہ مرا یار جو کہلائے تو ہر شخص ہے پھر یار مرا
اسکے دربار میں ہے بار تو رونق پہ ہے دربار مرا
"مرا دربار!"— یہ کیا کہدیا میں نے "میرا"؟
میرا کچھ بھی نہیں- کوئی بھی نہیں دُنیا میں!—
یہ جنہیں فرش سے میں عرش پہ لیجاتا ہوں
جنہیں مٹی سے اٹھا تخت پہ بٹھلاتا ہوں
عہدے دیتا ہوں ترقی جنہیں دلواتا ہوں
یہ وزارت کے طفیلی ہیں وزارت کے غلام
یہ سب اپنے ہیں- مرا کوئی نہیں!—
میری تقریر مگر میری ہے- گو لفظ نہیں
لفظ تو لغت میں موجود ہیں- لاشوں کی طرح!—
مری تقریروں کے الفاظ کے لکھنے والے
یہ نہ سمجھیں کہ یہ تقریریں مری- میری نہیں!—
جب میں اسٹیج پہ آتا ہوں بصد عزت و شان
تالیاں بجتی ہیں پہلے تو وزارت پہ مری
مجھ کو معلوم ہے ان پیشہ وروں کے نعرے
نعرے تحسین کے، تکبیر کے، اور "زندہ باد"
یہ دکھاوا ہے "ترقی" کے لئے زینہ ہے—
یہ سبھی کچھ ہے مگر جب مرے مُنہ سے مرے لفظ
ہوں، مرے لفظ، کہ میں ان کو ہوں زندہ کرتا،
جب مرے مُنہ سے مرے لفظ ادا ہوتے ہیں
آنکھیں ہاتھوں کی طرح پھیلتی اور کھلتی ہیں!—
وہ بتانا مرا، وہ میرے تھرکتے ہوئے ہاتھ
میری آواز کا ٹھہراؤ، وہ نازک بم و زیر
جب میں کہتا ہوں کہ "یہ تاج وزارت میرا
تاج ہے تاج- مگر تاج ہے یہ کانٹوں کا
آپکے پاؤں کے صدقے یہ ہے سر پہ میرے"
خاکساری کو ملا دیتا ہوں میں ناز کے ساتھ!—
میں وزیری میں فقیری کی ادا جانتا ہوں
اس طرح رہتے تھے اگلے خلفاء جانتا ہوں
کھینچ لیتا ہوں ہر اک دل کو میں آواز کے ساتھ!—
مری تقریر کو جو سُنتا ہے وہ میرا ہے
میری باتوں پہ جو سر دُھنتا ہے وہ میرا ہے
اور سب اپنے ہیں- اپنے ہیں- مرا کوئی نہیں!!—(لاہور)

وقار عظیم

شاعری اور مظاہرِ فطرت

ادبی حیثیت سے مقامی رنگ کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اور جب کبھی ہم اس کا ذکر کرتے ہیں تو اُس کے تحت میں کسی مخصوص مقام کی سیاسی، سماجی، قومی اور مُلکی تمام خصوصیات کو ذہن میں رکھتے ہیں۔ ادب کے سلسلے میں جب مقامی رنگ کی ترکیب اپنے وسیع مفہوم میں استعمال ہوگی تو اس میں وہ ساری چیزیں شامل ہونگی جن کا تعلق مقامی سیاست، معاشرت اور تمدّن سے ہے۔ لیکن حقیقت میں کسی مُلک کے مقامی رنگ کے سب سے زیادہ دلکش نمونے ہمیں وہاں کے مظاہرِ فطرت میں نظر آتے ہیں۔ جب عام طور پر کوئی کسی مُلک کے مقامی رنگ کا ذکر کرتا ہے تو ہمارے ذہن میں فوراً نہ اُس ملک کے رہنے والوں کی صورتیں آتی ہیں، نہ ہم اُن کے لباس کے متعلق کچھ سوچتے ہیں، نہ اُن کے مخصوص رسم و رواج کی تصویریں یکبارگی ہمارے تصوّر میں پھرنے لگتی ہیں اور نہ ہم ایکا ایکی وہاں کے اقتصادی اور سیاسی حالات اور فضا کی گہما گہمی میں ڈوب جاتے ہیں۔ اس کے بجائے اس چھوٹی سی ترکیب کے سُنتے ہی ہماری آنکھوں میں جس چیز کی رنگینیاں پھرنے لگتی ہیں، ہمارا ذہن جس چیز کے مزے لیتا ہے وہ اس مُلک کے مظاہرِ فطرت ہیں۔ اس ترکیب کے ذکر کے ساتھ نظر کے سامنے صبح و شام، اندھیرے اُجالے، دھوپ چاندنی، گرمی، سردی، خزاں، بہار اور بسنت کی رنگین بہاریں رقص کرنے لگتی ہیں۔ اس کا ذکر اور تصوّر اس مُلک کے زمین و آسمان، پہاڑ، جنگل، میدان، دریا، کھیت اور باغ کے ولولہ انگیز مناظر ہماری نظر کے سامنے لے آتا ہے۔ ان جنگلوں میں اُچھلتے کودتے بھانت بھانت کے جانور لہلہاتے ہوئے کھیتوں اور ہرے بھرے درختوں پر پھدکتی ہوئی چڑیاں، اِن کی فطری موسیقی ان کی آزادانہ پرواز۔ اور نہ جانے کتنی چیزیں ہیں جن کا تصوّر ان دو لفظوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایک ایسا تصوّر جس میں گم ہو کر ہم تھوڑی دیر کے لئے اپنے گرد و پیش کو بھول جاتے ہیں۔

یوں تو ہر مُلک کی سیاسی، سماجی، اقتصادی و مُلکی خصوصیات اُسے دوسرے مُلک سے الگ کرتی ہیں۔ جتنی باتیں یہاں رہنے والوں کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں وہ سب ایک مُلک میں دوسرے مُلک سے علیحدہ ہیں۔ ایک کی فطرت دوسرے سے الگ — ایک کی بات کا انداز دوسرے سے جُدا۔ چال ڈھال، بات چیت، رہن سہن ہر چیز میں اختلاف، ہر چیز میں اپنے اپنے منفرد رنگ اور شخصیت کی جھلک۔ یہی انفرادی خصوصیات ہیں جن کے ذکر کے بعد سُننے والا آسانی سے سمجھ جاتا ہے کہ ان کا مالک کون ہے جس طرح کے لوگوں کی ادا جس طرح کی زندگی کی تصویریں ہمارے سامنے ہیں وہ کسی خاص تہذیب اور تمدّن کے عناصر ہیں۔ یہی چیز مقامی رنگ کی نمایاں خصوصیت ہے۔ زندگی کی ان تفصیلات میں مورّخ کے لئے تو یقیناً سب کچھ ہے لیکن ایک معمولی انسان جس کی پرورش جذبات کی آغوش میں ہوتی ہے، جس کے سارے سرور و انبساط کا سرمایہ چند ایسی چیزیں ہی بن سکتی ہیں جو اُس کی نظر کے لئے جنّت اور کانوں کے لئے فردوس بن سکیں۔ نگاہ کے لئے اُس جنّت اور گوش کے لئے اس فردوس کا سرمایہ مناظرِ فطرت مہیّا کرتے ہیں۔ ان میں ڈوب کر انسان تھوڑی دیر کے لئے اپنی کلفتوں کو بھول جاتا ہے۔ اُس کی تلخ زندگی میں شیرینی احساس پیدا ہوتی ہے، اُس میں لطافت کے جلوے نظر آتے ہیں۔ یہی مناظر اور مظاہر اُسے گناہ کی دُنیا کی پستی سے اٹھا کر روحانیت کی بلندی تک لے جاتے ہیں۔

ہماری شاعری پر برابر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اُس میں ہندوستان کی اِس قسم کی مقامی خصوصیات کو تسلیم کرنے کے بجائے شاعروں نے اپنی محفل کو ایران کے موسم، وہاں کے خزاں و بہار، گُل و بُلبُل، کوہ و صحرا، طیور و حوش کے ذکر سے آباد کیا ہے۔ اور خود اپنی زندگی اور اپنے مُلک میں پھیلے ہوئے گوناگوں مظاہرِ فطرت سے قطعی بے خبری اور بے نیازی برتی۔ اعتراض کرنے والے کسی حد تک سچ کہتے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے شاعر فارسی کے انداز سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ اپنی مُلکی خصوصیات کو بھلا بیٹھے لیکن ساتھ ہی ساتھ

اُردو شاعری کے مختلف دوروں میں ہمیں ان مقامی مظاہر فطرت کی جو جھلک دکھائی دیتی ہے وہ اس اعتراض کو ہلکا ضرور کر دیتی ہے۔ ہماری شاعری کے موجودہ دور میں نیچرل شاعری کی تحریک نے اُسے جس حد تک متاثر کیا اُس سے قطع نظر اگر ہم دکنی کے زمانے سے غالب اور مومن کے زمانے تک اپنی شاعری کی مختلف اصناف پر ایک سرسری نظر بھی ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مرثیوں، مثنویوں، قصیدوں اور غزلوں میں شاعروں نے اِن مظاہر فطرت کے مختلف شاعرانہ پہلوؤں سے طرح طرح کے کام لئے ہیں۔ کہیں ان چیزوں سے محض جذبات کی مصوری کا کام لیا گیا ہے کہیں انہیں تشبیہوں اور استعاروں کے لئے استعمال کیا گیا ہے کہیں ان چیزوں کا تذکرہ محض لطفِ سخن کے لئے ہوا ہے۔ ان جستہ جستہ مثالوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نظیر اکبر آبادی کی تحریک سے بہت پہلے سے قصیدوں، مرثیوں اور غزلوں میں ایران اور توران کی باتوں کی جگہ ہندوستان ہی کی باتیں کی گئی ہیں — ہندوستان ہی کے مظاہر فطرت سے اپنے شعر و سخن کو رنگین، لطیف اور جمیل بنایا ہے۔ لیجئے تھوڑے سے نمونے اپنے پُرانے شاعروں کے کلام کے ملاحظہ فرمایئے۔

سب سے پہلے دو تین شعر ولی کے ؎

نین دیول میں پتلی ہے دیا کعبے میں ہے اسود
ہرن کا ہے یو نافہ یا کنول بھیتر بھنورا ہے

گنہگار رواں کیا ہوں اپس کے نین ستی
آ اے صنم شتاب ہے روز نہان آج

زلف تیری ہے موج جمنا کی
پاس تل اُس کے جوں سناسی ہے

(ولی)

کہیں سبزہ ترے جی جا کے   کہیں سرسوں کا پھول جی کو لگے
نہ پھولی تھی سرسوں نہ تھی کچھ بہار   نہ ظاہر میں اس کے کہیں لالہ زار
ہوا دلکش وہ ہر طرف سبزہ زار   کہ سرسوں نے کی تھی قیامت بہار
کہ خاطر جنوں سے نہ دیکھئے نچنت   خبر بھی ہے تم کو کب آئی بسنت

(میر)

وہ گورا بدن اور بال اُسکے تر   کہے تو کہ ساون کی شام و سحر
وہ رونے میں دو ابر غم یوں ملے   کہ جس طرح ساون سے بھادوں ملے

(میر حسن)

پھر جو شاخوں سے ہر شجر کے اُڑے
تو املتاس ہی کے پھول جھڑے

بھر گئی نبتش و پر سے ہر کیاری
کھٹ کٹ باسی لگ گئی ساری

دل میں سما رہا ہے یوں داغِ عشق اپنے
جس طرح کوئی بھونرا

اپنا دلِ شگفتہ تالاب کا کنول تھا
افسوس تو نے ظالم ایسے کنول کو توڑا

تو نے لگائی آکے یہ کیا آگ اے بسنت
جس سے کہ دل کی آگ اٹھی جاگ اے بسنت

(انشا)

کس کا ماتم ہے یقیں جو اس طرح روتا ہے ابر
کوکتی ہیں کوئلیں اور شور یوں کرتے ہیں مور

چل یقیں بہتر نہیں ہے اس سے جل مرنے کی طرح
کیا ہی پھولا ہے پلاس اور لگ رہی ہے بن میں آگ

(یقین)

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجیب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

(ناسخ)

ساون میں بھی ملنے کا وہ وعدہ نہیں کرتے
باتوں میں بہلاتے ہیں وہ اچھا نہیں کرتے

(رشک)

نیلوفر آنکھ ہے مرے دریائے حسن کی
شب رنگ مردمک نہیں بھونرا کنول میں ہے

(آتش)

ہوئی بُت خانے سے ناقوس کی پیدا آواز
چلے جمنا کو برہمن کوئی لے کر مورت

شاخِ گُل پہنے کلائی میں کلی کا کنگنا
زرد جوڑے پہ بسنت اپنا دکھائے عالم

(ذوق)

زردی چھائی ہوئی رُخساروں پر
سرسوں پھولی ہوئی انگاروں پر

(محسن کاکوروی)

یہ مثالیں زیادہ تر غزلوں کی اور کمتر قصیدوں اور مثنویوں کی ہیں، لیکن اس طرح کی مثالوں کی کمی مرثیوں میں بھی نہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے :-

مقامِ ہو نظر آتا ہے وہ دشتِ بلا سارا
جو شب کو برق چمکے تو اُجالا ورنہ اندھیارا
کہا اساڑھ نے یوں جیٹھ کے مہینے سے
طلسم یہ پوچھ تپش کے مراد سینے سے
(سودا)

ع : ڈھالوں کی سیاہی ہے کہ گھنگھور گھٹا ہے
ع : کالی گھٹا سی چھائی ہے ڈھالوں کی ہر ہر
ع : ایک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار

ڈھالیں ہیں یوں سروں پہ سوارانِ شوم کے
صحرا میں جیسے آئے گھٹا جھوم جھوم کے
ساون نہیں برستا ہے کہ بھادوں نہیں برسا
مینہ برستا ہے ہر سال مگر یوں نہیں برسا
یوں سر برس گئے یہ روانی تھی مارِ دم میں
پڑتا ہے دونگڑا کبھی جیسے اساڑھ میں
(انیس)

اِس کے علاوہ کچھ نمونے چکبست اور اکبر کے کلام کے :-

حکم مالی کا یہ ہے پھول نہ ہنسنے پائیں
جب لیے باغ میں کوئل اگر آرا دیتے ہے
وہی ہوا وہی کوئل وہی پپیہا ہے
وہی چمن ہے پہ وہ باغبان چمن میں نہیں
دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے
جیسے گنگا میں جھلکتی ہو چمک تاروں کی
(چکبست)

بدلی ہوئی رُت محسوس ہوئی بھونرے کی بھی آواز سُنی
فطرت کی سُہانی بے ٹھمری بے ساختہ و بے ساز سُنی
چھیڑا ہے راگ بھونرے کا ہوا کی ہر نئی دُھن بھی
غضب ہے سال کے بارہ مہینوں میں یہ پھاگن بھی
(اکبر)

اِس طرح کی ایک ایک دو دو مثالیں ہمیں اُردو کے قریب قریب سب شاعروں کے یہاں مل سکتی ہیں۔ اور ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی کے رنگ میں ڈوب کر بھی ہمارے شاعر اپنے دیس کی رنگینیوں سے بے خبر نہیں رہے۔ لیکن یہ جستہ جستہ مثالیں اُس وافر سرمایہ کا ایک حقیر سا حصہ ہیں جن سے بعد کے زمانے میں ہمارے شاعروں کا کلام پُر نظر آتا ہے۔ حامی کر آزاد اور حالی کی تحریک کے بعد اس طرح کے سرمایہ کی کوئی کمی نہیں — نظیر اکبر آبادی ان کے علاوہ۔ اور ان سے بہت پہلے میر اور آتش کی مثنویاں، سودا اور ذوق کے قصیدے اور بعد کے شاعروں میں ان گنت ایسے شاعر جنہوں نے اپنے کلام کی ساری محفل کو انہیں مظاہرِ فطرت سے سجایا ہے — محسن کاکوروی، شوق قدوائی، سرور، مہر، محروم اور آگے چل کر جوش اور ہمارے عہد کے بے شمار شاعر — ان سب کے کلام میں مقامی مظاہرِ فطرت کی رنگینیاں اور اس کا حسن و جمال چمک دمک رہا ہے۔

میراجی کی نئی تصنیف

اِس نظم میں

اِس کتاب میں جدید اُردو شعراء کی پچاس منتخب نظمیں اور اُن کے تبصرے جا بجا سے شامل ہیں گذشتہ دس سال کی اُردو شاعری کو سمجھنے اور اُس سے صحیح لطف اُٹھانے کے لئے میراجی کی اِس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ مجلّد اور جلد پوشِ سے آراستہ!
قیمت تین روپے (عہ)

عربی ادب کے شہ پارے

تلخ و شیریں :- صلاح الدین قریشی نے عربی کے چیدہ چیدہ لکھنے والوں کا ترجمہ سلیس اُردو میں کیا ہے۔ قیمت عہ

دُلھن کی سیج :- خلیل جبران کے سات منتخب افسانوں کا مجموعہ مترجمہ حکیم حبیب اشعر دہلوی۔ قیمت عہ

نور و ظلمت :- آسمی اور دوسرے معروف عربی افسانہ نگاروں کے افسانے۔ مترجمہ صلاح الدین قریشی دہلوی۔ قیمت عہ

ساقی بُک ڈپو دہلی سے طلب فرمائیے!

شبیر محمد اختر

"پھجّا بدمَاش"

نصیح الدین کتنا اچھا نام تھا۔ مگر اب سب اُسے پھجّا کہتے ہیں۔ بہت کم لوگ اس کا اصلی نام جانتے ہیں۔ اُس کے سائے سے بھاگتے ہیں۔ جہاں وہ چلا جائے کسی دوسرے کی کیا مجال کہ وہ بات کرنے کی جراٰت بھی کر سکے۔ لوگ یہ کہہ کر کھسک جاتے کہ

"پھجّا جس نے باپ تک کا لحاظ نہ کیا بھلا وہ ہماری پگڑی اُتارنے میں کب دریغ کرے گا"

اُس نے واقعی باپ کا لحاظ نہیں کیا تھا۔ باپ مجبور ہو گیا کہ خودکشی کر لے۔ کنوئیں میں چھلانگ لگا کر جان دیدے بات بھی کتنی بُری تھی۔ اس کا باپ میر فیروزالدین ساری برادری میں باعزت، محلے بھر میں اُس کے نام کی مالا جپی جاتی تھی۔ ہر کوئی اس کے صلاح مشورے پر عمل کرتا۔ یہ ناموری اور عزت محض اس لئے تھی کہ اُس نے اپنا اخلاق ہمیشہ بلند رکھا۔ اس کی زندگی کی اقدار وہی تھیں جن پر سارا زمانہ ناز کرتا تھا۔ فیروزالدین کی نیکی سارے محلے میں ضرب المثل تھی لوگ اسکی قسمیں کھایا کرتے۔

اُس کے ہاں لڑکا کیا پیدا ہوا بے چارے فیروزالدین کی جان ضیق میں آگئی۔ یہ لڑکا فتنہ تھا فتنہ، محلے بھر میں اسکی شرارتیں مشہور، لوگ باپ کے لحاظ کی وجہ سے اسے کچھ نہ کہتے۔ بچہ اس لئے شہ پانے لگا۔ زیادہ شریر ہوتا گیا۔

گھر میں بہت ساری پابندیاں تھیں۔ سارا خاندان دین دار تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر سختی کی جاتی۔ ٹوکا جاتا۔ یوں نہ کرو بیٹا، بات ایسے نہیں کی جاتی، کھانا اس طرح مت کھاؤ یہ بدتمیزی ہے! شریر بچہ بھلا کب ان پابندیوں سے باز آنے والا تھا۔ وہ "یوں نہ کرو" کی رٹ کا متحمل ہو سکتا تھا؟

فیروزالدین یہ بات نہ سمجھ سکا وہ برابر سختی کئے جاتا۔ ماں بچاؤ کے طریق ڈھونڈتی اور بچہ آہستہ آہستہ باغی ہوتا گیا۔

فیروزالدین کی زندگی بالکل ایک مشین کی طرح تھی۔ علی الصبح وقت پر جاگنا اس کے بعد نماز، پھر ناشتہ، پھر سارا دن دفتر۔ شام کو واپسی، جونہی شام ہونے لگتی اُس کے ہاں مردانے میں وہی چند لوگ جمع ہو جاتے۔ روز ایک ایسی باتیں ہوتیں۔ دوسروں کے اعمال و افعال کا جائزہ لیتے۔ نصیح کو بھی زبردستی اس محفل میں شریک کیا جاتا۔ روز ایک ایسی باتیں بُری لگتیں۔ اس کا ننھا دماغ اُسے اُکساتا۔ وہ وہاں سے بھاگنے کے بہانے تلاش کرتا۔ جب بہانے بھی کارگر نہ ہوتے تو وہ محفل میں بدمزگی پیدا کرنے لگتا۔ اور نتیجہ یہ ہوتا کہ اُسے جھڑکیاں ملتیں اور وہاں سے چلے آنے کا موقع مل جاتا۔

اکثر اُس کا جی چاہتا کہ وہ ہر ایک چیز کو توڑ پھوڑ دے۔ جب جی چاہے جاگے اور جب چاہے سو جائے۔ مگر باپ اُسے بار بار ٹوکتا۔ زبردستی علی الصبح ہی جگا دیتا۔ نماز پڑھنے پہ مجبور کرتا اُسے اپنے جاگنے اور سونے پر بھی اختیار نہ تھا۔

نصیح اب گھر کی بجائے باہر کی طرف متوجہ ہونے لگا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے گھر سے کھسک جاتا۔ محلے کے چند بچے اسکے ساتھی بن گئے۔ گھر میں جس قدر اس پر سختی کی جاتی۔ یہاں وہ اتنی ہی آزادی چاہتا۔ اس کا جو ساتھی اس کی آزادی کی راہ میں حائل ہوتا۔ وہ اُسے پیٹنے لگتا۔ کئی بار وہ خود بھی پِٹ گیا۔ مگر آہستہ آہستہ وہ دلیر ہوتا گیا۔ اُس میں جراٰت آگئی۔ اب وہ ہر کسی سے جھگڑا مول لینے لگا۔ ان باتوں میں وہ خوش رہتا۔

جب کبھی وہ گھر جاتا اُس کی بُری حالت ہوتی، سارے کپڑے خراب ہیں۔ مُنہ پر دُھول ملی ہے۔ کبھی سر پھٹا ہے تو کبھی ہاتھ۔ اس وجہ سے گھر میں اس پر اور زیادہ سختی کی جاتی۔ اسے باہر نکلنے نہ دیا جاتا۔ نہلا دُھلا کر اُسے پھر اندر بند کر دیا۔ اب کے ماں کی باری ہوتی۔ "ابّا جان ناراض ہو جائیں گے"۔ "ابّا جان کیا کہیں گے!" "ابّا جان — ابّا جان" وہ ابّا جان سُنتے سُنتے تنگ آ جاتا۔

وہ بڑھتا گیا۔ اب اُس کے اندر بغاوت کے جذبے نے نئی صورت اختیار کر لی۔ اُسے باہر جانے کا زیادہ موقع

وہ سکول میں پڑھتا تھا۔ ذہین لڑکا، اُس نے اپنی ذہانت کو ڈھال بنا لیا۔ وہ اس لئے زیادہ محنت کرتا کہ باپ اسے سکول کی دنیا سے واپس نہ بلا لے۔ اس دنیا میں کتنی آزادی تھی۔ اُس کے ہم عمر لڑکے تھے۔ اُن میں سے کتنے اس کے دوست بن گئے تھے۔ جن سے مل کر اُسے بہت خوشی ہوتی۔ وہ اُن کے ساتھ رہنا غنیمت جانتا۔ وہ ہاکی کھیلتا۔ اُسے کھیلنے میں مزا محسوس ہوتا۔ جب وہ اپنے مقابل کھلاڑی پر حملہ کرتا تو اُسے روحانی لذّت محسوس ہوتی۔ وہ سمجھتا کہ اس کے دل سے ایک بوجھ اُتر گیا ہے۔ کھیلتے کھیلتے اگر اس کو کہیں چوٹ لگ جاتی تو وہ اس وقت تک چین نہ لیتا جب تک مدمقابل سے بدلہ نہ لے لیتا۔

دوستوں میں بھی وہ بے تکلّف ہوتا تو اُنہیں گلے لگا کر خوب زور زور سے کھینچتا۔ وہ چاہتا کہ اُن کی پسلیاں توڑ دے اور پھر جب اُس کے دوست چلّا اُٹھتے تو وہ قہقہے لگانے لگتا۔ وہ خوش ہوتا۔ لڑائی جھگڑا مول لینے سے بھی کبھی نہ جھجکتا۔ میر فیروزالدین اور فصیح کی زندگی دو متضاد سمتوں میں جا رہی تھی۔ فصیح کی ساری باتیں اس لئے برداشت کی جاتی تھیں کہ وہ میر فیروزالدین کا بیٹا تھا۔ اور فصیح اس لئے بچ رہا تھا کہ وہ سکول میں اچھے لڑکوں میں شمار کیا جاتا۔

باپ کا پیار بڑھ رہا تھا۔ بیٹے کی ذہانت کی وجہ سے وہ اُس کی طرف زیادہ مائل ہو گئے۔ اب وہ اُسے ٹوکتا بھی نہیں تھا۔ فصیح میں اپنے آپ شعور آ گیا، وہ جب بھی گھر میں ہوتا اپنے آپ کو کتابوں میں چھپائے رکھتا۔ اُس کا کمرہ ایک آماجگاہ تھا۔ فیروزالدین جب بھی اُسے دیکھنے آتا تو اُسے کتابوں میں مصروف پاتا۔ اُس ڈھال سے وہ باپ کا وار بچا جاتا۔ باپ سمجھتا کہ بیٹا محوِ مطالعہ ہے۔ وہ خوش ہوتا۔ پھر فصیح کا شباب اُسے باپ کی نظروں سے اور زیادہ پسندیدہ بنا رہا تھا۔ اب وہ صرف اُسے دیکھنے آتا۔ اس کا ہونہار بیٹا ـــــ مگر بیٹا ہمیشہ باپ سے بچنے کی کوشش کرتا۔ جب کبھی اُسے بلایا جاتا تو "ابّا جان ذرا پڑھ رہا ہوں" کہہ کر ٹال جاتا۔

فصیح کی دو بہنیں تھیں۔ مگر جب کبھی اُسے موقع ملتا وہ اُن پر حکومت کرتا۔ وہ اُن سے چھوٹا تھا۔ وہ اس پر حکومت کرتیں۔ مگر وہ بھلا کب اُن کا رُعب ماننے والا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ ہمیشہ ان سے بلاوجہ لڑا کرتا۔ بہنیں اُسے محبت سے بھی کوئی بات کہتیں تو وہ اس کا اُلٹا مطلب لیتا۔

بھائی بہنوں کی یہ لڑائی بہت دلچسپ ہوتی۔ لڑنے کے بعد خود فصیح کا جی چاہتا کہ وہ جا کر بہنوں کو گلے لگا لے۔ اس کی بہنیں کتنی اچھی تھیں۔ وہ چپکے چپکے اس کے سارے کام کر دیا کرتی تھیں۔ مگر اس کے باوجود وہ ان سے لڑتا جھگڑتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ اُن سے لڑے جھگڑے فساد کرے، بہنیں اُسے کوسنے دیں۔ اور پھر وہ انہیں اور دبوچے۔ اُن کی ہڈیاں توڑ دے۔ وہ چلائیں، چیخیں اور وہ قہقہے لگائے۔

وہ بہنوں کو کتنا پیارا تھا۔ اُن کا نوجوان بھائی۔ بہنوں کی سہیلیاں بھی فصیح کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتیں۔ جب اُسے علم ہو جاتا کہ اس کی بہنوں کی سہیلیاں اندر موجود ہیں تو وہ جان بوجھ کر اُن کے کمرے میں چلا جاتا۔ انہیں تنگ کرتا۔ سہیلیاں پردے کے بہانے اِدھر اُدھر دوڑنے لگتیں اور یوں شباب سرگرداں کرتا۔ اور جب وہ "معاف کیجئے گا، مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ـــــ" کہہ کر جانے لگتا تو بہنوں سے زیادہ سہیلیاں یہ چاہتیں کہ فصیح نہ جائے ـــــ

"نہیں کہہ دیجئے ہم نے پردہ کر لیا ہے۔"

"فصیح بھیّا، کچھ کام تھا کیا؟" ایک بہن بڑی متانت سے پوچھتی۔

"نازلی بہن" وہ بھی متین بن جاتا۔ "وہ میرا ناول تو تم نہیں لائیں؟"

"کون سا ناول تھا؟" سہیلی نازلی بہن سے مخاطب ہوتی۔ بہانے بہانے گفتگو طویل ہو ہی جاتی۔

فصیح اب ذرا سے خاموش ہو گیا۔ اس کی طبیعت کا وہ لفنگا پن کم ہو گیا۔ اُس کی ساری توجہ اب صرف تین چیزوں پر مرکوز ہو گئی۔ پڑھائی، گھر میں بہنیں اور اُن کی سہیلیاں اور جب اُن سے لڑنے جھگڑنے کا موقع نہ ملتا تو ہاکی کا کھیل۔ جب وہ گھر میں ہوتا تو اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھا کرتا۔ اب بہنوں کی سہیلیاں اکثر آنے جانے لگی تھیں۔ جونہی وہ داخل ہوتیں،

فصیح کے اندر کوئی گدگدی کرنے لگتا۔ اب وہ زنانے میں جانے کا بہانہ سوچتا اور ہر بار اُسے کوئی اچھوتا سا بہانہ مل ہی جاتا۔

یہ بہانے ہی اب سنجیدہ صورت اختیار کرنے لگے۔ اگر ایک دن بھی بہنوں اور اُن کی سہیلیوں سے اس کا سامنا نہ ہو پاتا تو وہ بے قرار ہو جاتا۔ اس کا جی پڑھائی میں نہ لگتا۔ وہ کمرے میں لیٹے لیٹے سوچوں میں ڈوب جاتا۔ اُس کی خاموشی سارے گھر کو دوبھر معلوم ہوتی۔ ماں پوچھتی "بیٹا! تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ چُپ کیوں ہو؟" باپ پیار سے بُلاتا۔

"کل کالج کی ایک بحث میں حصّہ لینا ہے، مضمون سوچ رہا ہوں۔" وہ ٹال دیتا۔ باپ کتنا خوش تھا، اس کا بیٹا فصیح ——!

بہنیں جانتی تھیں کہ فصیح کیوں خاموش ہے، جب ماں باپ اس خاموشی پر اظہارِ ہمدردی کر چکتے تو پھر بہنوں کی باری آتی۔ وہ اس کے کمرے میں جا کر بولنے سے اس کی نقل اُتارتیں۔

"نازلی بہن! یہاں ناول تو نہیں چھوڑ گیا میں۔"

"نزہت آپا۔ وہ میرا قلم تو نہیں دیکھا تم نے۔"

"اوہ! آپ ہیں، معاف کیجئے گا مجھے معلوم نہ تھا۔"

پھر منوں کھلکھلا اُٹھتے۔ وہ اُچھل کر بہنوں کو پکڑ لیتا۔ اُنہیں دبوچتا۔ لڑائی جھگڑے کے بعد سب ہنسنے لگتے۔ اس کے دل سے بوجھ اُتر جاتا —— اور اس کی زندگی یونہی بہے جا رہی تھی۔

ایک دن اُسے ایک نیا تجربہ ہوا۔ ایک ہم جماعت کے ذریعے اُسے "شجرِ ممنوعہ" کا قرب حاصل ہو گیا۔ اس کی حسین اور پُرسکون جنّت میں سانپ داخل ہوا۔ ممنوع پھل چکھنے کے بعد اُسے یوں محسوس ہوا کہ اب وہ ننگا ہے۔ اُسے اپنی اس برہنگی کا احساس بڑی شدّت سے ہونے لگا۔ اس نے زندگی میں ایک نئی کروٹ دیکھی۔ اس نے بہنوں میں ایک نیا پن پایا۔ ایک نئی جاذبیت نے اُسے اُن کی طرف متوجہ کیا۔ "شجرِ ممنوعہ" نیا روپ دھار کر سامنے آ گیا۔ اس کے ذہن میں سانپ بل کھانے لگا۔ لہرانے لگا۔ اس کے دل میں نئے نئے خیالات بیدار ہوتے اور سونے گئے۔ ایکا ایکی اس کے ذہن کے بند کواڑوں میں ایک دھماکہ ہوا۔ بہت زور کا دھماکہ۔ اُس کے کانوں میں آواز آئی "بہن! بہن!!" یہ آواز ایک گرج بن گئی۔ اس نے جانا جیسے کئی ہزار گھڑیال بجا دئے گئے ہیں۔ لاکھوں ڈنکوں پر چوٹیں پڑ رہی ہیں اور ان سب میں سے ایک ہی آواز نکل رہی ہے "بہن! بہن!!"

وہ کانپ اُٹھا۔ خوف زدہ ہو کر لرز گیا۔

اب وہ بہنوں سے شرمانے لگا۔ وہ اُن کا سامنا کرنے سے ڈرتا تھا۔ جونہی وہ انہیں دیکھتا اُس کے ذہن میں ایک ننگی عورت نمودار ہو جاتی۔ وہ چاہتا کہ فوراً وہاں سے بھاگ جائے۔

اُسے شجرِ ممنوعہ کا پھل بہت میٹھا لگا۔ اُسے چسکا لگ گیا۔ اکیلے میں سانپ آ کر اُسے بہکاتا رہتا۔ مگر وہ ہمت کر کے گھر سے باہر بھاگ جاتا۔

ایک دن سانپ نے اُسے اپنے شکنجے میں لے ہی لیا۔

"باہر کیوں جاتے ہو، اسی گھر میں، ہاں اسی گھر میں، نازلی اور نزہت کی سہیلیاں۔"

"میری بہنوں کی سہیلیاں —— بہنیں۔"

"بکتے ہو۔ بہن اصولوں کا ایک ڈھکوسلہ ہے۔ چلو اسے مان لو، مگر سہیلیاں، وہ بہنیں نہیں۔ عورتیں ہیں، عورتیں۔"

"مگر وہ ہمارے ہاں آتی ہیں۔"

"کیا ہوا۔ اُن کی وہ بے باکیاں یاد نہیں۔ تمہاری کتابیں اُٹھا کر لے جانا، دبے دبے مذاق، آنکھ مچولی، وہ دزدیدہ نگاہیں۔"

"حوصلہ نہیں پڑتا۔"

"حوصلے کی ضرورت نہیں۔ ذرا آگے بڑھو، شجرِ ممنوعہ دُور نہیں۔ یہ فاصلہ خود بخود کم ہوتا جائے گا۔"

وہ آگے بڑھنے لگا۔ سہیلیوں کی طرف اس کی توجہ زیادہ ہو گئی۔ اُس کی نگاہوں میں معصومیت کی جگہ ایک اور چمک آ گئی۔ سہیلیوں نے اس نئی چمک کو دیکھا اور وہ ڈر گئیں، سہم گئیں۔ یہ چمک کتنی عجیب تھی، اس کی حرکات میں تبدیلی آ گئی۔ لڑکیاں اس سے ڈرنے لگیں، اُسے دیکھ کر سہم جاتیں۔ اُس سے دُور رہنے لگیں۔ بھولے پن اور معصومیت کا زمانہ ختم ہو گیا۔

ایک شام نہ جانے اُسے کیا ہو گیا کہ اُس نے ایک سہیلی کا

راستہ روک لیا اور پھر ـــــ ایک چیخ سُنائی دی، نازلی اور نزہت بھاگتی ہوئی آئیں اُن کی سہیلی زرد پیلی ہو رہی تھی کانپ رہی تھی، فصیح جلدی سے جاتا ہوا دکھائی دیا۔

بات تو دبا دی گئی مگر اُن کے ہاں سہیلیوں کا آنا بند ہو گیا۔ بہنیں اُس سے نفرت کرنے لگیں۔ اُن کی نگاہیں تیر برسانیں ماں اُسے بات بات پر ٹوکتی اور بالآخر ایک دن باپ نے اُسے بلایا۔ باتیں ہوتی رہیں، دو گھنٹے تک اخلاقیات پر وعظ پلایا گیا۔ دھمکیاں دی گئیں، جزا سزا سے ڈرایا گیا۔ وہ سُنتا رہا۔ وہ تو ایک چکنا گھڑا تھا۔ اس پر پانی کا اثر کیا ہونا تھا۔ بہا اور ڈھلک گیا۔

جوانی اور مستی تو تھی ہی مگر ممنوع پھل کھانے سے ایک خمار سا پیدا ہو گیا۔ وہ بدمست رہنے لگا۔ جوان بیٹا، باپ کی اُمیدوں کا مرکز۔ وہ آج تک اُسے بہت نیک سمجھتا رہا۔ ایک مسلسل فریب میں مبتلا رہا۔ جب فریب ٹوٹا تو باپ کا دل بھی ٹوٹ گیا۔ اس نے باہر آنا جانا بہت ہی کم کر دیا۔ وہ خود اخلاق کا ایک مجسمہ تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اس کا بیٹا بھی اُسی کا نمونہ ہو گا۔ اس کی عزت اور شہرت کو برقرار رکھے گا۔ وہ مقام جو باپ کو حاصل تھا اُسے نہیں کھوئے گا۔ اس نے زندگی میں ناموری کا ایک بُت تیار کیا تھا۔ اس کو مکمل کرنے کے لئے عمر صرف کر دی لیکن وہی بُت اُس کے بیٹے کی ایک ضرب سے پاش پاش ہو گیا۔ فخر، شرافت، اعلیٰ نیکی کا غرور، گھر کی شان، سب کی سب ملیامیٹ ہو گئیں۔ بیٹے نے باپ کا نام پاؤں تلے روند دیا۔

بہنیں ناراض تھیں۔ وہ بھائی کا مُنہ دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں۔ "لچا کہیں کا" بہن کی سہیلی بہن ہی ہوتی ہے۔ اس معیار پر وہ پورا نہ اُترا۔ اب تو وہ لچا ہو گیا تھا لچا۔

وہ واقعی لچا ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ اُن میں خمار بڑھ گیا۔ باپ کی ناراضگی، بہنوں کی نفرت، ماں کی خاموشی، اُس کے خمار کو اور تیز کرنے لگے۔ وہ زیادہ بدمست ہوتا گیا۔

آخر ایک دن وہ ایک جوان لڑکی کو گھر میں لے آیا۔ اُسے اپنے کمرے میں لے گیا کمرہ اندر سے بند ہو گیا۔ گھر میں ایک طوفان مچ گیا۔ نازلی اور نزہت معصوم اور پاکباز لڑکیاں، اُن کی ماں، نیک زاہدہ اور عبادت گزار، باپ اخلاق کا مجسمہ۔ اس نے ماں، باپ اور بہنوں کو ناپاک کر دیا۔ نالی کی کیچڑ اُن کے مُنہ پر مل دی۔ اُس نے سب کو ننگا کر دیا۔

وہ بدمست تھا۔ مگر دوسرے تو ہوش میں تھے۔ مُنہ پر کیچڑ محسوس کر کے فیروزالدین گھبرا گیا۔ اس کا سارا فخر، ساری عزت، ساری نیکی، ساری بڑائی خاک میں مل گئی اور دوسرے دن صبح صبح مسجد کے کنوئیں میں دھڑام کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ میر فیروزالدین کی لاش برآمد ہوئی۔

لوگوں نے جانا اندھیرے میں پانی نکالتے گر گئے ہیں۔ پکے نمازی تھے۔ اُن کی یہ موت شہادت کا درجہ رکھتی تھی۔ کتنے نیک آدمی تھے ـــــ مگر بات کب تک چھپی رہ سکتی تھی۔ اصل حقیقت معلوم ہو ہی گئی۔ لوگ اس سے ڈرنے لگے "بھئی جس نے باپ تک کا لحاظ نہیں کیا بھلا وہ ہماری پگڑی اُتارنے میں کب دریغ کرے گا۔"

باپ کی موت کے بعد فصیح الدین کو بھلا کون روکنے والا تھا۔

بدمستی نے بلانوشی پر مجبور کیا اور اخلاق کی ساری حدود مٹ گئیں باپ کی موت، ماں کے آنسو اور بہنوں کی نفرت کا ردِ عمل اُلٹا ہی ہوتا گیا۔ فصیح الدین پکا بدماش بن گیا۔ اس نے بدنامی میں نام پیدا کیا شریف لوگ اُس سے ڈر کر اس کی عزت کرنے۔ پولیس کے رجسٹرات میں وہ باقاعدہ درج کر لیا گیا۔

میر فیروزالدین ایسے نیک باپ کا بیٹا پکا بدماش!

میں نے جب تھانے کا چارج لیا تو مجھے پکے سے ملاقات کا فخر حاصل ہوا۔ اتنا لکھا پڑھا آدمی اور یوں اس کا نام نمبر دس میں درج ہو۔ میں سمجھ نہ سکا۔ اگر وہ جاہل ہوتا تو اور بات تھی۔ میں اس کی بدمعاشی کا باعث جہالت اور کم علمی کو گردانتا۔ مگر وہ تو لکھا پڑھا تھا۔ جب میں نے اُس سے گفتگو کی تو میں اُس کی ذہانت کا قائل ہو گیا، وہ کتنا سمجھ دار تھا اور کتنا تیز، اس کی حالت پر مجھے ترس آ گیا۔ میں نے اُسے دُرست کرنا چاہا مگر میں ہر بار ناکام رہا۔

وہ پتھر سے بھی زیادہ ٹھوس نکلا۔ میں طرح طرح مذہبی قسم کا

انسان ہوں۔ چونکہ میرے سامنے رات دن زندگی کا تاریک پہلو ہی آتا ہے۔ اس لئے میں ہر آدمی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ اس کے حالات کرید نے لگتا ہوں۔ اسی طرح میں نے کئی کیس برآمد کئے۔ میں نے بچی کے سارے حالات کرید نکالے۔ کتنے افسوسناک حالات تھے۔

میری زندگی میں مذہب کو بہت زیادہ دخل ہے۔ اسی لئے میری طبیعت بہت سخت ہو گئی ہے۔ میں نے اپنے علاقہ میں اتنی سختی کی کہ سارے بدمعاش اور عادی مجرم بھاگنے لگے۔ میں چاہتا تھا کہ سماج کو ان لعنتوں سے پاک کر دوں۔ شریف لوگ امن سے زندگی بسر کر سکیں۔

میرے لئے زندگی دو چیزوں کا نام تھی۔ مجرموں کی درستی اور اپنا تزکیہ۔ میرے سامنے یا تو وہ مجرم تھے جن سے مجھے نپٹنا پڑتا، یا پھر میری اپنی ذات۔ مجرموں کو سزا دلا کر مجھے خوشی ہوتی۔ ان کا قید خانہ کی دیواروں کے اندر رہنا ہی ضروری تھا۔ یہ مجرم کتنے بدحال تھے۔ دیکھنے میں کمزور، پھٹے پرانے کپڑے، بدصورت، بدشکل، اُن کے چہروں پر جرم نمایاں ہوتا تھا۔ جو انہیں دیکھتا وہ اُن سے نفرت کرتا۔ وہ سوسائٹی کے امن کے لئے ایک مستقل خطرہ تھے۔ میں امن عامہ کا ایک محافظ۔ میرا فرض تھا کہ میں اس خطرے کا تدارک کروں۔ مجھے خود ان مکروہ صورتوں سے نفرت تھی۔ میری جان جلتی جب میں ایسے لوگوں کو دیکھتا، دوزخی کتّے۔

اگر میرا بس چلتا تو میں ان کیڑوں کو جو ہماری تہذیب اور تمدن کو گھن بن کر کھا رہے تھے نیست و نابود کر دیتا۔ کیڑوں کا تباہ کرنا ہی صحت کو بحال رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے یہی پالیسی اختیار کر لی۔ میرے سامنے ایسے آدمیوں کی زندگی ایک کھلی کتاب تھی۔ وہ مجرم تھے، قانون شکن، امن عامہ کے لئے نقص کا باعث اور میرے لئے ایک مسلسل خطرہ۔ ان کا مٹ جانا ہی میرا کمال تھا۔ میری ناموری اور ترقی تھی اور میرے محکمہ میں میرے لئے خوشنودی کا باعث۔

میری اپنی زندگی کی نشوونما کا سبب وہ مذہبی ماحول تھا جس میں بس رہا ہے۔ میں دوسروں کو پاک کرنا چاہتا تھا۔ مجھے مطہر کرنے کے لئے مرشد کا فیضان تھا۔ ان کی دعائیں میرے شاملِ حال تھیں۔

میں سمجھتا ہوں میری زندگی کامیاب ہے۔ مجھے اختیارات ہیں۔ میں رشوت نہیں لیتا، اس لئے میری عزت کی جاتی ہے۔ اور چونکہ میری عزت کی جاتی ہے، میں رشوت نہیں لیتا۔ میرے افسر مجھ پر خوش ہیں۔ علاقہ کے شرفا میری تعریفیں کرتے ہیں۔ بدمعاش اور مجرم میرے نام سے بھاگتے ہیں۔ اُن کے لئے میرے دل میں ذرّہ بھر بھی ترس نہیں۔ مجھے سکون سا رہے۔ وہ مجھے تنگ نہیں کرتے۔

جو نیک نہیں وہ مجھے بہت بُرے لگتے ہیں۔ اُن کو آخرت میں کیا ملے گا۔ مانا وہ قانونی طور سے مجرم نہیں ہیں لیکن ہیں تو بُرے۔ میرا اگر بس چلے تو میں اُن کو درست کر دوں۔ ہاں تو میں "کیپٹن بدمعاش" کا ذکر کر رہا تھا۔ کمبخت کتنا ذہین ہے۔ کیا مجال کہ میرا ہاتھ اس تک پہنچ جائے۔ میں نے بہت کوشش کی۔ مگر وہ ہر بار بچ گیا۔ بلا کا ذہین ہے۔

میں نے چاہا کہ میں اُس سے سمجھوتہ کر لوں۔ یوں عزت رہے گی۔ میں نے اُس کو بلا کر باتوں باتوں میں مذہب کا ذکر چھیڑا۔ کمبخت کی زبان تھی یا قینچی۔ کترنے لگا۔ اُس نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ وہ اعتراضات کئے میں جواب نہ دے سکا۔ اُس نے خدا کو بھی نہ چھوڑا۔ دہریہ کہیں کا۔ لاحول ولا قوۃ، اب تو میں اس سے بچتا ہوں۔ جب بھی آتا ہے۔ ضرور ایک آدھ جملہ خدا کے خلاف بک دیتا ہے۔

بعض لوگ مجھے مغرور سمجھتے ہیں۔ میں مغرور تو نہیں لیکن مجھے ان لوگوں سے نفرت ضرور ہے جو دین دار نہیں، میرے اکثر ساتھی خوب روپیہ کماتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہے یہاں ہی ہے۔ وہ لوگوں سے یوں ملتے ہیں جیسے بڑے ملنسار ہوں۔ زبان کے میٹھے، دل کے کھوٹے، گناہوں کو چھپانے کا خوب ڈھنگ ہے۔ مکّار کہیں کے۔ یہی لوگ مجھے مغرور کہتے ہیں۔ بدمزاج سمجھتے ہیں۔ اُن کی مجرموں سے گہری چھنتی ہے۔

مانا میرے پاس اُن ایسے مکانات نہیں ہیں۔ مجھے دنیا آرام میسر نہیں آتا مگر اس کا کیا، یہ دُنیا فانی ہے۔ اور آخرت ابدی، میرے انعامات وہاں ہیں۔ یہ دُنیا مُردار ہی تو ہے اور اس کے طالب کتّے ـــــ کتّے پھر بھی اچھے ہیں۔ وفادار تو ہیں۔ مگر یہ انسان! مادّی اسباب کا سہارا لینے والے، انہیں اپنے اعمال کی ذرّہ بھر پروا نہیں، جب انہیں سزا ملتی ہے تو اس کا باعث

مادّی کو تاہیاں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ اُن کے اعمال کی سزا ہوتی ہے۔

جب کوئٹہ میں زلزلہ آیا۔ سارا ملک کانپ اٹھا۔ نت نئے بیانات چھپے۔ سائنس دانوں نے حد کردی۔ اس کے عجیب غریب اسباب بتائے۔ بیوقوف کہیں کے۔ سیدھی سی بات تھی۔ لوگ خدا اور رسول کو بھول گئے۔ یہ زلزلہ نہیں تھا، بس ایک تنبیہہ تھی۔ میں کئی دنوں تک استغفار کا وظیفہ پڑھتا رہا۔ خدا کا عذاب! اس کے تصور سے بدن کانپ جاتا ہے۔ مگر لوگ ہیں کہ عذاب کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ایک صاحب کہنے لگے اگر یہ عذاب ہے تو اس کا شکار صرف نیک لوگ کیوں ہوئے؟"

میں اُن کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ انہوں نے تشریح کی کہ زلزلے کی زد سے صرف وہی لوگ بچے جو اس رات سینما دیکھ رہے تھے یا چیف کمشنر کے ہاں محفلِ رقص میں تھے۔ بے دین کہیں کا۔ خدا کے عذاب کا تمسخر اڑانے والا دہریہ اگر یہ شخص میرے علاقے میں ہوتا تو میں اس کا نام نمبر دس میں لکھ دیتا۔

موت اور زندگی خدا کے اختیار میں ہے۔ جو کچھ قسمت میں لکھا ہے وہی ہونا ہے۔ اگر ایک شخص کی قسمت میں بھوکوں مرنا ہے تو بھلا اُسے کون بچا سکتا ہے۔ انہیں دنوں بنگال سے قحط کی خبریں آنے لگی ہیں۔ جنگ کا زمانہ ہے، لوگ خبریں یونہی اڑا بھی دیتے ہیں — پھر ان لوگوں کی قسمت میں اگر یہی لکھا تھا تو کون ٹال سکتا ہے۔ لیکن اب مصیبت یہ ہے جہاں جاؤ چندے کی پکار ہے۔ خدا کی تقدیر کو روکنے کی تدبیریں۔ کم فہم لوگ اتنا نہیں جانتے کہ تقدیر نہیں ٹلتی۔

قحط کی خبریں کتنی دہشت ناک ہیں۔ اخبار والوں کو تو ایسی باتیں خدا دے۔ سُرخیاں کتنی سنسنی خیز آنے لگی ہیں یوں اخبار خوب بِکتے ہوں گے۔ مجھے تو اس میں چنداں دلچسپی نہیں۔ اور جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ ہمارے پیر صاحب کا ایک سفیر اس علاقے میں پیغامِ حق لے کر گیا تو وہاں کے لوگوں نے اس کی بات نہ سُنی۔ اچھا ہوا خدا کا عذاب ان بے دینوں پر آیا۔ لیکن میرے پیر صاحب کتنے رحیم ہیں انہوں نے اُن لوگوں کو معاف کر دیا۔ نہ صرف معاف کر دیا بلکہ ایک سو روپے کی زرِ کثیر بھی بھجوا دی۔ اس میں مَیں نے بھی حصّہ لیا۔ دو روپے اپنی حلال کی کمائی سے دئے۔ اس کا اعلان اخبارات

میں بڑی شان سے ہوا۔ حضرت نے دین کو مقدّم رکھا۔ یہ روپیہ صرف مسلمانوں پر خرچ کرنے کے لئے تھا۔ سُبحان اللہ! حضور کا قلب پُر نور! اسلام کا کتنا درد ہے اُس دل میں!

ایک شادی کی دعوت میں یہی پولیس افسر مدعو تھے۔ وہاں نیکی کی تلقین کر کے وقت گزارنے لگے۔ کھانا آنے میں کچھ دیر تھی۔ ان کی نیکی کے چرچے تھے۔ ساری محفل بڑے غور سے اُن کی باتیں سُن رہی تھی۔ اتنے میں کھیچا آگیا۔ اُسے دیکھ کر اُن کا زورِ کلام کچھ کم ہونے لگا۔ اُس نے آتے ہی دو چار چوٹیں کر دیں اور وہ کھسیانے ہو گئے۔

"ارے تو تو دہریہ ہے دہریہ"

"اور دین داروں کے لئے پولیس کا محکمہ —" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اچھا ہوا کھانا چُنے جانے کی اطلاع مل گئی۔ ورنہ بیچارے انسپکٹر کی اور کرکری ہو جاتی۔ لوگ کھانے کے کمرے کی جانب بڑھے۔ انسپکٹر نے موقع پا کر کھیچا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آؤ بھئی ہم دونوں مل کر کھانا کھائیں"

کھیچا مسکرایا انسپکٹر سمجھوتہ کر رہا تھا۔ "ہمارا دونوں کا سانجھا خوب رہے گا"

"تم تعریف را دے ہو" انسپکٹر ہتھیار ڈالنے لگا۔

"شکریہ! اس کا ثبوت تو کھانے کے رجسٹرات بھی دیں گے"

انسپکٹر کھسیانہ ہو گیا۔

کھانا چُنا گیا۔ انسپکٹر کی طرف خاص توجہ کی گئی۔ اُن کے سامنے بہترین کھانا کافی تعداد میں لایا گیا۔ کھیچا بھی تو اُسی میز پر تھا۔ میز کھانوں سے بھر گئی۔ اُن کے سامنے پلاؤ، زردہ، فرنی، متنجن۔ قورمہ، ساگ گوشت، نان ... جانے کیا کچھ رکھا تھا۔ انسپکٹر نے اپنے تئیں درست کیا اور خوب جم کر بیٹھ گیا۔

"خوب ہاتھ بڑھاؤ، کرو بسم اللہ!" انسپکٹر زیادہ بے تکلف ہو رہا تھا۔

"یہ تو پلاؤ سے شروع کرو —"

مگر کھیچا نے خلافِ توقع پلاؤ کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا۔

مگر اُس نے روٹی کا چھوٹا سا ٹکڑا توڑا۔

"ارے پلاؤ کھاؤ نا!" انسپکٹر نے پلیٹ بڑھادی، مگر کھتیا ایکا ایکی خاموش ہوگیا۔ اس کا چہرہ اُتر سا گیا اس نے پلیٹ پرے کردی۔

"میں چاول نہیں کھاتا۔" اس کا لب و لہجہ تبدیل ہوگیا تھا۔

"چاول کہاں ہیں یہ ــــ یہ تو پلاؤ ہے پلاؤ۔" انسپکٹر کا ہاتھ اپنا کام کئے جا رہا تھا۔ "شوربہ ڈال لو ــــ ہر روز عید نیست ــــ" انہوں نے پلیٹ پھر بڑھا دی۔

"میں نے قسم کھا رکھی ہے ــــ"

"قسم! ارے کیسی قسم!"

کھتیا کی اس تبدیلی پر ساتھ والے مہمان بھی چونکے۔ وہ اور یوں خاموش ہوجاتے۔

"جی ہاں! قسم ــــ" وہ رُکا۔ "بنگال میں لاکھوں انسان انہیں چاولوں کے لئے ترستے مرگئے۔ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ اب میں یہی چاول کھاسکوں ــــ میں صرف ایک روٹی پر گزارا کرتا ہوں۔" اس کی آواز اور مدھم ہوگئی۔

مہمانوں کے ہاتھ رُک گئے۔ مُنہ چلنے بند ہوگئے۔

انسپکٹر پولیس کھتیا کا مُنہ دیکھ رہا تھا اور کھتیا نگاہیں نیچی کئے گُم سُم بیٹھا تھا۔ ایک انسان، جس کا دل ہمدردی سے پُر تھا۔

انسپکٹر پولیس حیران تھا۔ بات اُس کی سمجھ میں نہ آئی۔ وہ سوچ رہا تھا "یہی کھتیا نمبر دس کا بدمعاش ہے؟"

میراجی کی نظمیں - اُردو کے سب سے مشہور شاعر میراجی نے اب تک ہزاروں نظمیں لکھی ہیں یہ ساٹھ نظمیں اُن کا نچوڑ ہیں۔ یہ بالکل جدید طرز کی نظمیں ہیں اُس شاعر کی جو جدید شاعری کا امام سمجھا جاتا ہے۔ کتاب مجلد، جلد پوش سے آراستہ۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے (عہ)

گیت ہی گیت :- میراجی کے گیت دلآویزی میں اپنا جواب نہیں رکھتے، ایسے مدھر گیت آپ نے کبھی نہیں پڑھے ہونگے۔ اِس مجموعہ میں ہر قسم کے گیت ہیں۔ مجلد قیمت دو روپے۔ (عہ)

ساقی بک ڈپو دہلی سے طلب فرمائیے!

قتیل شفائی

غزل

گنگناتی بوندیوں کا جال پھیلا یا گیا
ابر کے در پر مجھے ساغر بکف لایا گیا

تیرے آنچل کی ہوائیں دل کو آخر لے اُڑیں
ایک شعلہ تھا جسے کچھ اور بھڑکایا گیا

التفاتِ بے محل کی داد ہو سکتی نہیں
مُند گئیں آنکھیں تو مجھ کو یاد فرمایا گیا

کوئی نادیدہ شکاری جھانکتا ہی چاند سے
ہر کرن کے روپ میں اک تیر برسایا گیا

ہجر کی شب حسرتوں کی ناشکیبائی نہ پوچھ
جو بھی تارہ تھا ترے لینے کو دوڑایا گیا

ترکِ مے تسلیم! لیکن اے بلا نوشِ ازل
تیری توبہ کو اگر بادل سے ٹکرایا گیا

اپنے وعدے کی حقیقت صبح کے تارے سے پوچھ
رات کے ایک ایک لمحے پر ستم ڈھایا گیا

جانے کیا ڈر تھا مرے قاتل کو مجھ سے اے قتیلؔ
قتل سے پہلے مرے ہونٹوں کو سلوایا گیا

(اے۔ آئی۔ آر۔ پشاور)

محمد احسن فاروقی

اُردو شاعری میں تقلید

"ساقی" کے اسی نمبر میں ایک پُرجوش مضمون "آمیزۂ ادب و سیاست" شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں (جیسا کہ ہر پُرجوش مضمون میں ہوتا ہے) ایک قسم کی تقلید کو خواہ مخواہ فطری مان کر دوسرے قسم کی تقلید کو محض دلیل نقالی قرار دے کر بحیثیت اول الذکر کو نہایت بلند اور آخر الذکر کو بہت پست بتایا گیا تھا یعنی پرانی تقلید کے حامی اور نئی تقلید سے نفرت کرنے والے اکثر ایسے معاملات میں جیسی باتیں بے سمجھے بوجھے کرتے ہیں وہ سب اس مضمون میں موجود ہیں۔ اس قسم کے تمام مضامین وغیرہ کی نہایت پُرلطف صفت یہ ہوا کرتی ہے کہ ان میں دو چار عمدہ تنقیدی اقوال کی مدد سے اس اعجاز کے ساتھ غلط مطالب نکال لئے جاتے ہیں جس کو سمجھنا عام انسانی منطق اور علم نفسیات سے بالاتر ہے بادی النظر میں یہ اعجاز اس چیز سے مشابہ ہوتا ہے جسے مغربی علم نفسیات کے قدم بہ قدم چلنے والے کو نفیوزن کہیں گے۔ مگر اس اعجاز کو کسی ذلیل غیر ملکی لفظ سے محدود کر دینا بڑی غلطی ہوگی کیونکہ یہ اعجاز تو محض ان مخصوص ہستیوں میں ہوتا ہے جو اپنے تئیں "نگاہ حقیقت شناس" کا وحدہ لا شریک مالک سمجھیں۔ مارک ٹوین کے ناول ہکلبری فن میں حبشی جم یہ سن کر نہایت متعجب ہوتا ہے کہ فرانس کے رہنے والے فرانسیسی زبان بولتے ہیں۔ اس حبشی غلام کا دماغ صرف ایک ہی زبان کو آدمی کی بولی تصور کر سکتا ہے اور اس لئے وہ ہک سے یہ پوچھتا ہے "یہ فرانسیسی آدمیوں کی طرح کیوں نہیں بولتے؟" بالکل ایسا ہی نفس ان لوگوں کا ہے جو نئے ادب کو اس کر یہ کہیں کہ یہ نئے شاعر قدرتی اور فطری طریقہ پر کیوں نہیں لکھتے۔

"آمیزۂ ادب و سیاست" کا نفس مضمون اس قسم کے اقوال پر مبنی ہے جیسے "ہم ہندوستانی اپنی ہر بات کو یورپ سے جُدا دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہی انسانی فطرت کا تقاضا ہے" یا "ہر ملک کے قدرتی شاعر کی رہنمائی اس کی اپنی فطرت ہے۔ وہ اپنی قوم و وطن کے موافق مزاج و انداز میں ماحول سے متاثر ہو کر اپنے محسوسات و تاثرات کا اظہار کرتا ہے۔" ان اقوال سے کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا۔ ہر ملک کا بہترین ادب وہی ہے جو اپنی قوم اور اپنے ملک کے انفرادی خصوصیات نمایاں کرے۔ مگر کیا اس قسم کے اقوال ہماری قدیم و متوسط شاعری پر صادق آتے ہیں؟ کیا حقیقتاً ان اقوال میں "ہم ہندوستانی" کا مطلب وہ ہندوستانی نہیں ہے جو فارسی کی صدیوں کورانہ تقلید کرتے کرتے یہ احساس کھو بیٹھا ہو کہ عمل فطری کیا ہے اور فارسی تقلید کو امر فطری کہے۔ کیا اوپر کے جملوں میں "انسانی فطرت" کے معنے فارسی کی کورانہ تقلید کے علاوہ بھی کچھ ہو سکتے ہیں؟ کیا اُردو کے کسی قدیم یا متوسط شاعر میں کوئی ایسی چیز دکھائی جا سکتی ہے جس کو بالکل ہندوستانی ماحول سے متاثر ہو کر شاعر نے تخلیق کیا ہو؟ پرانی اُردو شاعری کے محض بناوٹی ہونے کا کیا یہ بڑا ثبوت نہیں کہ اس میں ہندوستانی ماحول سے یکقلم بے اعتنائی برتی گئی ہے ہم سمجھتے ہیں کہ مصنف "آمیزۂ ادب و سیاست" کی یورپین تقلید سے نفرت محض بہمہ وجوہ یا نگاہ حقیقت شناس رکھنے کی وجہ ہی سے نہیں بلکہ کسی خاص منطقی اور صاف وجہ سے ہے۔ اگر وہ اپنے اقوال کے مطابق بجائے فردوسی سے مثالیں لینے کے کسی اُردو شاعر سے ایسی مثال بدقت تمام نکال لاتے جس میں ملک کے موافق انداز میں ہندوستانی ماحول سے متاثر ہو کر شاعر نے اپنے مقصد کو ادا کیا ہو! اور "یہ شاعر کا ماحول سے متاثر ہونا" یا "وطن کے موافق مزاج و انداز کی تخلیق" اینہا چہ معنی دارند؟ یہ نظریہ حالی اور آزاد سے پیشتر کبھی بھی کسی اُردو شاعر کا تھا؟ کیا کسی شعر۔ خط۔ تذکرہ وغیرہ سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ داغ و میر کے زمانہ تک کا شاعر اسی قسم کے کسی نظریہ سے واقف بھی تھا؟ اصل میں یہ نظریہ اسی "مغربی انتقادات عالیہ" کا ہے جس کے ماہرین یورپین شعرا و ادبا کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں" اور جس کے گرے پڑے اصول چاٹ چاٹ کر "مشرقی انتقادات معجز نما" کے حامل اپنی "نگاہ حقیقت شناس" کا ثبوت دیتے ہیں اور خیال نیچرل اور زبان نیچرل" کا غل جب جب کر توہم پرست ادبا کو محظوظ کرتے ہیں۔

میری غرض پُرانی شاعری کو ذلیل کرنا نہیں۔ یوں تو انگریزی شاعری کا پڑھنا اور پڑھانا میرا کام ہے مگر کوئی شاعر میرے دل پر وہ اثر نہیں رکھتا جو غالب مگر طرفداری کو حقیقت کہنا میں نہ سیکھ سکا۔ قدیم و جدید شاعری کو ایک ہی نظر سے دیکھنے پر میں نے یہ رائے قائم کی کہ اُردو شاعروں پر اکبر مرحوم کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

بتوں کے پہلے بندے تھے مسوں کے اب ہوئے خادم
ہمیں ہر عہد میں مشکل رہا ہے باخدا ہونا

یعنی یہ کہ اُردو شاعر فارسی کی پرستش کرتے کرتے اب یورپین مس کا سرونٹ ہوگیا ہے۔ حاتم و آرزو سے لیکر امیر و داغ تک تمام فارسی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی فارسی شعرا کے قصیدے اور غزلیں وغیرہ سامنے رکھکر قصیدہ و غزل کہنا۔ قافیہ، ردیف۔ تراکیب وغیرہ میں فارسی شعرا سے سرمو تجاوز نہ کرنا اُردو شاعری کا محض فرض منصبی رہا۔ اب اُردو شاعر یورپین ادب کی طرف راغب ہے اور اسکی تقلید کرتا ہے۔ اوّل امر فطری اور دوسرا غیر فطری تو محض نگاہ حقیقت شناس ہی کو دکھائی دے سکتے ہیں۔ میرے نزدیک یا تو دونوں فطری ہیں یا دونوں غیر فطری اور اگر موجودہ شاعری محض اس لئے مطعون کی جاسکتی ہے کہ وہ یورپ کی نقل ہے تو پُرانی شاعری بھی محض اس لئے مردود کی جاسکتی ہے کہ وہ ایران کی نقل ہے۔ اس طرح تمام اُردو شاعری نقل و نقالی ٹھہری لہٰذا اُردو کے تمام کلام خلیج بنگال میں پھینک دینا ہی بہتر ہوگا۔ یہ ہی نہیں اگر ہم دُنیا کے کسی ادب کا جائزہ لیں تو ہم کو یہ معلوم ہوجائیگا کہ ہر ملک کی شاعری کسی دور میں ایک غیر ملک تو دوسرے دور میں دوسرے غیر ملک کی تقلید پر زیادہ تر مبنی رہی۔ اگر ہم کسی ملک کی شاعری میں سے وہ سب حصے نکال دیں جو کسی دوسرے ملک کی تقلید سے ظہور میں آئے تو خدا کے فضل و کرم سے تمام دُنیا شاعری سے خالی ہوجائے گی۔ تقلید بُری نہیں ٹھہرتی۔ اعلیٰ شاعری تقلید اور فطرت کی عمدہ آمیزش ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ ہماری اُردو شاعری اس لئے بُری نہ تھی کہ اُس نے فارسی کی تقلید کی۔ ہمارے قدیم و متوسط اُردو شعرا میں کچھ ایسی ہستیاں گذری ہیں جنہوں نے تقلید کا حق ادا کردیا۔ فارسی شاعری کی تمام جکڑبندیاں قائم رکھتے ہوئے بھی اپنی فطرت کو نمایاں رکھا یہاں تک کہ ان کی شاعری محض فارسی تقلید نہیں بلکہ اُن کی ذاتی فطری چیز ہوگئی۔ دورِ حاضر کے شعرا یورپ کی تقلید کر رہے ہیں یہ کوئی بُرا امر نہیں ہے مگر اسی کو ہم بہت اچھا نہیں کہہ سکتے جب تک کہ یہ تقلید بھی اتنی ہی عمدہ طرح بار آور نہ ہوجائے جتنی کہ فارسی تقلید ہوچکی ہے۔ پُرانے شعرا نے فارسی تقلید کو اُردو میں عرصۂ دراز کی مشق کے بعد کھپایا اور موجودہ شعرا نے یورپ کی تقلید پر ابھی پہلا ہی قدم اُٹھایا ہے۔ شاید وہ زمانہ دور نہیں جب کوئی اعلیٰ فطرت شاعر اس تقلید کو اس طرح اُردو میں کھپا دے جیسے غالب نے فارسی تقلید کو کھپایا۔ ہاں یہ کہنا کہ "قیامت تک یہ اسالیب و تراکیب وطن پسند نہیں ہوسکتے" انہیں لوگوں کو زیبا ہے جن کو خدا نے نگاہ حقیقت شناس کے ساتھ ساتھ پیغمبری قوت پیشین گوئی بھی ودیعت کی ہو۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ فارسی تقلید کو چھوڑکر یورپ کی تقلید کیوں اختیار کی جائے؟ ایک تقلید جو ہر طرح ہماری ہوچکی اس کو چھوڑکر دوسری تقلید کا کیوں سہرا دینا جائے؟ اس سوال کا جواب عرصہ ہوا کہ حالی اور آزاد دے چکے۔ آزاد نے ایک جگہ کہا ہے "حور ہو یا پری گلے کا ہار ہوجائے تو اجیرن ہوجاتا ہے اور وہ بھی تو اب سو برس کی بڑھیا ہوگئی"۔ مگر مصنفِ "آمیزۂ ادب و سیاست" کے قسم کے اعلیٰ حضرات اس کو محض نیتی پر مبنی کرتے ہیں اور کسی ایک وجہ سے نہیں بلکہ ہمہ وجوہ۔ ایسی مبہم باتوں سے فن شاعری اور فن تنقید دونوں ذلیل ہوتے ہیں۔ شاعر بھی ان ذلیل افراد میں سے ہوگیا جو گذشتہ سے پیوستہ صدی میں انگریزوں کے اقبال کی یا ۱۹۳۹ء میں ہٹلر کے اقبال کی قسم کھاتے تھے۔ اقبال کی قسم کھانا تو قومی صفت ہے اور یہ "سرگشتۂ خمارِ رسوم قیود" تو کسی چیز کی بھی قسم نہیں کھاتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نیا شاعر انگریزی حکومت سے بہت عاجز نظر آتا ہے اور اکثر انگریزی اقبال یعنی تہنشاہیت سے نفرت ظاہر کرتا ہے اور "مغربی انتقادات عالیہ" نے اس کو یہ درس بھی دیا ہے کہ اہم ادبی تبدیلیوں کے ذلیل سباب بتانا نہایت تنگ نظری کی دلیل ہے۔ نیا شاعر پُرانی لکیروں کو چھوڑکر نئے قاعدوں پر بالکل موافق فطرت اور بہ تمام مجبوری چل رہا ہے۔ آزاد اور حالی نے

نرنی کے میدان میں قدم رکھا تھا مگر یہ لوگ بہت کم آگے بڑھے۔ اقبال ان دونوں سے کہیں زیادہ آگے گئے مگر وہ بھی ایک حد سے آگے نہ بڑھے۔ موجودہ شاعر آزاد۔ حالی اور اقبال کے راستے پر آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کے کلام میں بہت نقائص ہیں۔ اسکی شاعری ابھی اعلیٰ شاعری کی حدود میں داخل نہیں ہوئی اور ہو بھی کیسے سکتی ہے کیونکہ وہ تو خالی خیالات ہی نہیں بلکہ ترکیب بیان و بدیع۔ عروض غرضکہ ہر شے میں اہم تبدیلیاں کرنے کا بار سر پر اُٹھائے ہے۔ یہ اپنی منزل مقصود تک پہونچے یا نہ پہونچے مگر یہ ضرور کہتا ہے ؎

خارہا از اثر گرمیِ رفتارم سوخت
منتے بر قدمے راہ روانست مرا

وہ آئندہ بڑے شاعر کیلئے راہ صاف کر رہا ہے غزل کی کم مائیگی پر غالب بھی پکار اُٹھے تھے ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

وہ ابتدا تھی اور ابھی انتہا نہیں ہوئی ہے ہمارا نیا شاعر وسعت کی تلاش میں ہے اور ہمارے نقادوں کی یہ مسافر نوازی کہ اس کی راہ میں کانٹے بچھاتے ہیں۔

پھر یہ بھی سمجھ لینا بہت بڑی غلطی ہے کہ نئی شاعری یورپ کی محض تقلید ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب علی منظور صاحب قبلہ و کعبہ دام اقبالہٗ نے جتنے بھی انگریزی شعرا کے نام اپنے معرکۃ الآرا مضمون میں لئے ہیں اُن میں سے کسی کی بھی پیروی ہمارا نیا شاعر نہیں کرتا۔ بائرن پوپ۔ جانسن شیکسپیئر۔ براؤننگ۔ ملٹن۔ کیٹس برنز۔ آسکر وائلڈ۔ کولرج میں سے کسی کے کلام کی بھی پیروی مناسب نہیں سمجھتا اور پروفیسر بریڈ لے کے تنقیدی مقالات کو بالکل فرسودہ جانتا ہے۔ ن۔ م راشد کی جو نظم نقالی کی اہم ترین مثال دی گئی ہے اس طرح کی کوئی نظم بیسویں صدی سے بلکہ ۱۹۲۰ء سے پہلے کے انگریزی شاعر میں نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اوّل جنگ عظیم کے بعد سے دُنیا نے نیا پلٹا کھایا۔ ہر چیز بدل گئی۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں انقلاب نہ پیدا ہوا ہو۔ موجودہ شاعر بھی پُرانی راہوں پر نہیں چل سکتا جیسے کہ اب ہمارے دیہاتی بھی بیل گاڑی پر لاری کو ترجیح دیتے ہیں۔

دُنیا کے ہر ملک میں ایک نیا ادب نئے طرزِ زندگی کے موافق وجود میں آرہا ہے میں نے اپنی کتاب دی سکولر لائن کے ضمیمہ "ماڈرن پرشین لٹریچر" میں چند مثالیں ایسی نظموں کی دی ہیں جیسی ایران کے رسائل میں آجکل شائع ہوتی ہیں اور جیسی نظموں کو قاآنی تک کے فارسی ادب و شاعری سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔ یہ ایران والے بھی گندم نما جو فروش ہوگئے ہیں اور ہمارے لئے یہ حکم صادر ہوتا ہے کہ وہی پُرانے گھن لگے گیہوں بیچے جاؤ۔ انگریزی میں دو امریکن حضرات ازرا پاؤنڈ اور ٹی ایس ایلیٹ نے ۱۹۲۸ کے لگ بھگ نئی قسم کی شاعری کا آغاز کیا اور اسی وقت ان ہی کی پیروی میں دو اور نمایاں ہستیاں آڈن اور اسپنڈر انق ادب پر چمکتی نظر آتی ہیں۔ ہمارے قدامت پرست اُردو نقاد شاید ان کے نام سے بھی واقف نہیں ورنہ ہمارے نئے شاعروں کو ان کا نقال بتاتے۔ غرض۔ ادبیات عالم کا انقلاب ہے اور نہ محض شوق نقالی جس نے ہماری موجودہ شاعری کا رنگ بالکل بدل دیا ہے۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا اسپنڈر نے ہورائیزن میں لکھتے ہوئے کہا کہ موجودہ انگریزی شاعری بہت ناقص ہے کیونکہ وہ بہت تیزی سے تبدیل ہورہی ہے۔ نئے اُردو شعرا میں اگر کوئی صاحب انگریزی کی تقلید پر جان دیتے ہوں تو انہیں اسپنڈر کی آواز سے ہوشیار ہوجانا چاہیئے اور محض اپنی آزاد فطرت کو رہنما بنانا چاہیئے۔ یہ آخری جملہ میں نے اس لئے اضافہ کیا کہ ہم ایسے ماحول میں پیدا ہوئے ہیں جس کی غلامی ذہنیت کی کوئی حد ہی نہیں ہے۔ ہم آزادی اور غلامی میں تمیز نہیں کرسکتے ہیں اور اپنے تئیں غلام دیکھتے دیکھتے یہ بھی بھول گئے کہ ہماری اصل فطرت کیا ہونا چاہیئے۔ مثل اس طائر کے جو پنجرے سے نکال دئے جانے پر پریشانی محسوس کرے اور پھر پنجرے میں آجانے کو آزادی اور اطمینان تصور کرے۔ ہمارے ادب داں اور ادب نواز اس قدر دشمن ارباب آزادی ہیں کہ اُن کی نگاہ میں آزادی قیامت تک وطن پسند نہیں ہوسکتی۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ اور جواب طلب امور کیلئے ٹکٹ روانہ کیا کریں۔ (مینجر)

محمد نصیر الدین

ہم بہاری ہیں

چائے کی ایک پارٹی میں میرا تعارف مقامی کالج کے ایک پروفیسر صاحب سے کرایا گیا جو اتفاق سے میرے پاس والی کرسی پر اس انداز سے اینٹھے ہوئے بیٹھے تھے جیسے وہ اپنے کالج کے کسی کلاس روم میں بیٹھے ہوں اور ہم سب انکے ناکارہ، کام چور اور بدتمیز قسم کے طالب العلم ہوں۔ وہ پستہ قد، لاغر اندام اور منحنی قسم کے آدمی تھے اور اپنی ان کمزوریوں کو شاید ڈھیلی شیروانی، دبیز عینک اور خشخشی ڈاڑھی سے چھپانا چاہتے تھے۔ میں چائے پی رہا تھا مگر کنکھیوں سے ان کو بار بار دیکھ لیتا تھا کہ یہ کیا کر رہے ہیں؟ یہ عالم تذبذب میں گرفتار تھے کبھی چائے کی پیالی اٹھا لیتے تھے اور کبھی اُس کو پئے بغیر رکھ دیتے تھے۔ ہر بار پیالی رکھکر اس میں تھوڑا سا اور دودھ ملا دیتے تھے مگر چائے کسی طرح بھی پینے کو تیار نہ ہوتے تھے۔

میں نے اُن کی دماغی اُلجھن کو بھانپ کر کہا "آپ شاید چائے کے عادی نہیں ہیں؟" میرا یہ کہنا تھا کہ یہ مارے خوشی کے گویا اُچک پڑے اور بولے "واللہ آپ نے ٹھیک سمجھا، میں اس منشی، مضر اور واہیات شے کو شراب، افیم اور بھنگ کی قسم کی چیز سمجھتا ہوں جس سے . . ." پتہ نہیں یہ کیا کہنا چاہتے تھے مگر میں نے ان کا جملہ یوں پورا کر دیا "اختلاج ہوتا ہے، سر میں چکر آتے ہیں اور معدہ میں گیس بھر جاتا ہے"۔ میں نے شاید پروفیسر صاحب کے دل کی بات کہدی تھی۔ وہ میری صحیح تشخیص کو سُنکر خوشی اور حیرت کے مِلے جُلے جذبات سے اس درجہ بوکھلائے کہ مفلوج سے ہوکر اپنی کرسی میں ڈھیر ہو گئے۔ میں نے اُن کو یوں بات بات پر گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھکر اپنے دل میں کہا "افسوس صد افسوس کہ اس پارٹی میں ہم خیال اور بے تکلف دوستوں کی کمی ہے ورنہ پروفیسر صاحب کو بٹیر بنا کر پیش کیا جاتا!"

پروفیسر صاحب نے اپنے خیال میں مجھے کام کا آدمی سمجھا اور بڑے اخلاص سے رازدارانہ لہجہ میں مجھے اپنی تمام کہنہ شکایتوں کو بالتفصیل سُنانے لگے۔ ان کی یہ شکایتیں وہی تھیں جو انکے مزاج، شکل و صورت اور قویٰ جسمانی کے آدمیوں کو عام طور سے ہوتی ہیں یعنی یہی مراق کی علامتیں مثلاً جگہ جگہ کا درد، پیٹ میں اپھار اور خلفشار، سوء ہضمی کی تکلیف، بے خوابی اور بدخوابی وغیرہ وغیرہ۔ میں قربانی و ایثار کا مجسمہ بنا اُن کی طویل داستان کو سُنتا رہا اور جب کبھی وہ کسی جملہ کو مکمل کرنے سے قاصر ہوتے تو میں ان کے ناتمام جملے کو پورا کر دیتا۔ میری اس خدمت پر وہ بالکل اس طرح اظہار خوشنودی کرتے تھے جیسے میں انکا ہونہار طالب العلم تھا جو خالی خانوں کو پُر کرنے کی خاص مہارت رکھتا ہو۔

دورانِ گفتگو میں میری بدقسمتی کہئے کہ وہ میرا وطن پوچھ بیٹھے۔ میں نے نہایت معصوم لہجہ میں جواب دیا "بھاگلپور"۔ پروفیسر صاحب اُس وقت بڑے مزے میں تھے اور اپنا سارا جسم ڈھیلا چھوڑ کر اپنی نہایت کشادہ کرسی میں گویا سوئے پڑے تھے۔ اُن کی کرسی ان کے مختصر سے قد کے لئے ضرورت سے کہیں زیادہ بڑی تھی اور ان کو اس کرسی میں یوں لیٹا دیکھکر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بچہ اپنے بزرگ کی نقل اس کی کرسی میں بیٹھکر کر رہا ہے۔ میرے جواب پر پروفیسر صاحب کے اپنے چمگادڑ جیسے کان کھڑے کئے اور ذرا بن کر ایسے ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا جس میں اپنی عدم واقفیت کے لئے تھوڑی سی معذرت بھی شامل تھی "معاف کیجئے۔ یہ شہر یا قصبہ کہاں ہے؟" میں نے بھولپن سے جواب دیا "یہ صوبہ بہار کا ایک شہر ہے" میرے اس جواب پر یہ حضرت اپنی کرسی میں دفعتاً اُچک کر بیٹھ گئے اور بیٹھنے کے بعد پے در پے اتنے سارے پہلو بدل ڈالے کہ میں نے سمجھا ان کو بچھو نے ڈنک مار دیا ہے یا پھر انکی جائے نشست پر انکے شریر طلبا نے ببول کے کانٹے بچھا دئے ہیں!

وہ جب کسی قدر ساکت ہوئے تو میں نے ازراہِ ہمدردی ان سے پوچھا "پروفیسر صاحب، چشم بد دور، کیا خدانخواستہ مزاج دشمناں ناساز تو نہیں ہو گیا؟" وہ میرے سوال کا جواب دئے بغیر اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیر تک بیٹھے دیکھتے رہے۔ میں نے ان کی ننھی ننھی آنکھوں میں حیرت کی سفیدی، استرت

کی سُرخی اور سامنے کا رقص دیکھا۔ اس وقت ہم دونوں ایکدوسرے کے لئے تماشہ بنے بیٹھے تھے ہماری زبانیں بند تھیں مگر ہمارے دل دھڑک کر آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اتنے میں پارٹی ختم ہوگئی اور ہم رُخصت ہونے لگے۔ میں نے پروفیسر صاحب سے کہا۔ "آپ میرے ساتھ چلئے میں آپ کو کالج میں اُتارتا جاؤں گا" وہ خاموشی سے سر جُھکائے ہوئے میرے ساتھ موٹر میں بیٹھ گئے۔

میں نے راستے میں ان سے پوچھا "آپ دفعتاً کچھ اس طرح چُپ ہوگئے کہ میں کچھ سمجھ نہ سکا کہ آپکو کیا ہوگیا؟" پروفیسر صاحب نے جواب دیا "ڈاکٹر صاحب مجھے یہ سُنکر بڑی حیرت ہوئی کہ آپ بہار کے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک بہاری کو دیکھا ہے" ان کے جواب پر میں نے ہنسکر کہا "اوہ تو یوں کہیئے کہ آپ مجھے دیکھکر ہوش وحواس کھو بیٹھے تھے بھائی ابھی آپ کو دُنیا میں بہت کچھ دیکھنا ہے، اگر آپ ہر نئی چیز کو دیکھکر یوں اپنی جان کو ہلکان کرلیں گے تو آپ کا زندہ رہنا دشوار ہوجائے گا" پروفیسر صاحب میری مشفقانہ نصیحت کا اثر لیئے بغیر اپنی سنائے گئے "چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ آپ سے یوں اتفاقیہ ملاقات ہوگئی، مجھے ایک بہاری سے ملنے کی تدید ضرورت تھی، اگر اجازت ہو تو کل دولت خانہ پر حاضر ہوجاؤں" میں نے آنے والے خوشگوار لمحوں کا لطف لے کر تپاک سے جواب دیا "ضرور ضرور، آپ کا آنا میرے سر آنکھوں پر"

پروفیسر صاحب دوسرے دن ٹھیک وقت معینہ پر اپنے ایک شاگرد نما دوست کے ساتھ تشریف لائے میں ان سے ملنے کے لئے خود ہی بے قرار ہو رہا تھا اور انکے انتظار میں اپنے بنگلہ کے پھاٹک کے پاس ٹہل رہا تھا آج وہ اپنی شخصیت کو اور واضح بنا کر آئے تھے۔ انکے سر پر لمبے بالوں والی نہایت بلند قسم کی اُودی ٹوپی لگی تھی جو بیک وقت قائداعظم اور سید سقہ کی یاد تازہ کر رہی تھی۔ ان کے کمزور ہاتھ میں شفتالو کی گہرے بادامی رنگ کی اتنی موٹی چھڑی تھی جو صرف شفتالو کے پیڑ کے تنے کو کاٹ کر بنائی جاسکتی تھی۔ میں نے ان کو آتے دیکھکر تپاک سے پھاٹک کھول دیا اور بڑے احترام سے خوش آمدید کہتا ہوا ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ اکتوبر کا مہینہ تھا اور فضا میں ہلکی سی خوشگوار خنکی روئی کے گالوں کی طرح پھیلی ہوئی تھی مگر پروفیسر صاحب پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ میں نے بجلی کا پنکھا چلا دیا اور شربت روح افزا

منگوا کر ان کو پلایا۔ ان چھوٹے موٹے تکلفات پر پروفیسر صاحب نے ہنسکر اظہار خوشنودی کیا اور مجھ سے بہت جلد گھل مل کر مانوس ہوگئے۔

اُس وقت پروفیسر صاحب بہت خوش تھے اور محض میرے خیال سے اپنے دوست کو تسکا یتاً کہنے لگے "میاں حامد، تم نے بہاریوں کا جو نقشہ میرے سامنے پیش کیا تھا وہ کتنا غلط نکلا۔ تم ہی کہو کہ ان نقشوں میں سے کوئی نقشہ بھی ڈاکٹر صاحب پر چسپاں ہوتا ہے؟ قطعی میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ان کی زبان سے یہ سُنکر کہ یہ بہاری ہیں مجھے بالکل یقین نہ آیا۔ بولو، تم نے تو علی گڑھ میں بہاریوں کو دیکھا ہے اور انہیں کو دیکھکر تم نے مجھے وہ قصے سُنائے تھے" ان کے دوست جو علی گڑھ میں بی۔ اے کر رہے تھے پروفیسر صاحب کے اس اچانک سوال سے بہت گھبرائے اور مجھ سے آنکھیں ملانے میں بھی شرمانے لگے۔ میں نے ان کے دوست کو کئی بار زہر آلود نگاہوں سے دیکھا کہ یہ حضرت وہی تھے جنکی روایت کی بنا پر پروفیسر بہاریوں کو عجیب الخلقت سے سمجھنے لگے تھے!

میں اس وقت عجیب قسم کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ پروفیسر صاحب کی سادہ لوحی پر ماتم کروں یا اپنے بہاری ہونے پر۔ مجھے خاموش دیکھکر پروفیسر صاحب نے بہار اور بہاریوں کے متعلق مہمل سوالوں کا ایک ایسا سلسلہ باندھ دیا جو ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ میں نے نہایت صبر وتحمل سے ان کے تمام سوالات کے جواب دئے۔ ان سوالوں میں سے جو بہت عجیب تھے وہ ابتک مجھے یاد ہیں۔ سُنیئے:

س۔ بہار کی زبان کیا ہے؟

ج۔ اُردو۔

س۔ کیا کہا اُردو، مگر سُنتا ہوں کہ یہ اُردو نہایت عجیب قسم کی ہے۔

ج۔ اُردو ہے اور بالکل غیر عجیب قسم کی۔ صوبہ بہار کے مغربی اضلاع مثلاً گیا، آرہ، پٹنہ، چھپرہ وغیرہ کی اُردو تو بالکل اسی طرح کی ہے جیسی یوپی کے مشرقی اضلاع بنارس، الہ آباد، گورکھپور مرزا پور وغیرہ کی۔ بہار کے ان اضلاع میں وہی بندش الفاظ لب ولہجہ، طرز گفتگو وغیرہ رائج ہے جیسا یوپی کے مشرقی اضلاع میں البتہ عوام کی زبان حسب معمول بگڑی ہوئی ہے۔ بہار کے

ان اضلاع میں عوام بالعموم ر کو ڑ بولتے ہیں مثلاً "دڑی کی حویلی۔ رات مچھڑوں نے سونے نہ دیا۔

لے تھوڑا اس میں ہمارا کیا کسوڑ (قصور)

س۔ (ہنسکر) مگر یہ تو اُردو نہ ہوئی۔

ج۔ آپ شاید بھول گئے ہیں کہ یہ جہلا کی زبان ہے ورنہ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ بہار میں تعلیم یافتہ طبقہ نہایت سلیس اُردو بولتا اور لکھتا ہے۔ جہاں تک زبان کی خدمت کا تعلق ہے صوبہ بہار کا نمبر دہلی اور لکھنؤ کے بعد آتا ہے۔ بہار نے اُردو کو راسخ، شاد، آزاد، اثر، شفق، ناج، یاس اور واقف جیسے عدیم المثال شعرا عطا کئے جن کی صاف ستھری اور کوثر میں دُھلی ہوئی زبان اُردو کے لئے بیش بہا جیز ہے۔ ان باکمال استادان فن نے اُردو کو سنوارنے کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ رہتی دُنیا تک قائم رہے گا۔ بہار نے اُردو کے نثر نگاروں کی صف کیلئے اوّل درجے کے ادیب مہیّا کئے ہیں۔ نواب نصیر حسین خیال کی ٹکسالی زبان اور انشا پردازی خوان اُردو پر خاصہ کی چیز ہے۔ اودھ پنچ کے مشہور مزاح نگار سجاد حسین نے اُردو مزاح نگاری میں ایک اچھوتے باب کا اضافہ کیا ہے۔ موجودہ چوٹی کے لکھنے والوں میں محمد مسلم، محمد محسن، اختر اورینوی، مانوری، سہیل عظیم آبادی وغیرہ کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔ ان تمام مایہ ناز ادیبوں کو اس بات کا فخر ہے کہ وہ بہار کے ہیں اور ان کا جنم استھان وہی ہے جہاں کی خاک سے سیتا، بدھ اور مہابیر جیسی مقدس ہستیاں پیدا ہوئیں۔ اور اشوک، چندر گپت اور شیر شاہ جیسے نیک دل قوم پرور اور وطن پرست حکمراں وجود میں آئے۔

میں نے چاہا تھا کہ اس سلسلے میں کچھ اور نام گنواؤں مگر ان کے دل، کان اور آنکھوں پر تو جیسے اللہ میاں نے مہریں ثبت کر دی تھیں۔ وہ میری ان باتوں سے متاثر ہوئے بغیر اپنی رٹ لگاتے چلے گئے کہ میں بہاری اُردو کے کچھ اور نمونے پیش کروں۔ میں نے محض ان کا دل خوش کرنے کے لئے کہا "جناب سارے بہار کی مادری زبان اُردو ہے اور صرف اُردو، البتہ یاس اُردو میں کچھ مقامی اثرات بھی شامل ہو گئے ہیں مثلاً بہار میں صیغہ واحد متکلم لفظ میں نہیں بلکہ ہم ہے۔ وہاں یہ لفظ بالکل ہیں کی طرح بولا جاتا ہے۔" یہ سُنکر پروفیسر صاحب نے طنزیہ لہجہ میں کہا "اس ہم سے شاید اپنی خودی کو بڑھا کر پیش کرنا منظور ہے؟" میں نے جواب دیا جی نہیں، اس ہم میں جو لطافت ہے وہ آپکے میں میں نہیں ہے مثلاً غالب کا یہ شعر لیجئے ؎ ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار۔ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ آپ ہی کہئے جو لطافت و شیرینی غالب کے اس ہم میں ہے وہ لفظ میں میں کبھی کبھی آ سکتی ہے؟

غالب کا ذکر کرنا تھا کہ حامد صاحب کے پیٹ میں جیسے چوہے کودنے لگے۔ میں نے انکو مخاطب کر کے کہا "فرمائیے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں جس کے لئے آپ کو بے چینی سی ہو رہی ہے۔" آپ نے فاتحانہ انداز سے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ انہیں غالب نے تو اپنے ایک رقعہ میں ان بہاریوں پر جملے چست کئے ہیں جو ہاتھی کو مونث بولتے ہیں۔" میں نے ان کو سمجھایا۔ "بندہ نواز، آپ کا حافظہ شاید سہو کا عادی ہو چکا ہے' غالب نے بنگالہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ غالب جب حیات تھے تو بہار کے نام تک سے کوئی واقف نہ تھا۔" پروفیسر صاحب نے بھی اس وقت میرا ساتھ دیا مگر یہ حضرت حامد علی گڑھ کے طالب علم تھے، یوں آسانی سے اپنی شکست ماننے والوں میں نہ تھے۔ وہ ہوشیار سپہ سالار کی طرح مجھ پر ایک زوردار جوابی حملہ کر بیٹھے۔ مُنہ بنا کر، زنانہ لب و لہجہ میں، ہر لفظ پر ٹھٹھکتے ہوئے بولے "حضور آپکے شاٹل بدھنا ہے؟" حامد صاحب نے اس وقت میری ضیافت اس مشہور جملہ سے کی تھی جو علی گڑھ کے طلبا اپنے بہاری ہم جماعتوں کو چھیڑنے کے لئے کہتے ہیں۔ حملہ کاری تھا جس کی مدافعت ناممکن تھی اس لئے مجھے ہنسکر پسپا ہونا پڑا۔ اگر بہاری طلبا علی گڑھ میں اسی زنانہ لب و لہجہ میں "بدھنے" کی فرمائش کرتے ہیں تو واقعی ڈوب مرنے کی بات ہے!

پروفیسر صاحب شاید ہمیں اپنی کسی جماعت کا طالب العلم سمجھ رہے تھے اس لئے ان کو ہمارا بے تکلفی سے باتیں کر کے ہنسنا ناگوار گزرا۔ وہ حسب عادت بے خبری میں بول اُٹھے "یہ کیا ہے؟" مگر پھر فوراً سنبھل گئے اور اپنی خفت مٹانے کے لئے کہنے لگے "بہار میں اگر اور کوئی مقامی بولی رائج ہو تو سنائیے۔" میں نے ان سے مختصراً کہا "بہار کے مغربی اضلاع کی مقامی بولی دو طرح کی ہے ایک تو وہ

جیسے خالص کھوجھوری کہہ سکتے ہیں۔ سلو بڑک کے اضلاع بہار، سارن، گورکھپور، بلیا، غازی پور وغیرہ میں بھی رائج ہے۔ اس کا ایک جملہ سنئے "روداں کہواں گیل رہلیں (آپ کہاں گئے تھے) ان مغربی اضلاع کی دوسری مقامی بولی وہ ہے جو کسی قدر کھوجھوری اور ہندی زبان کی آمیزش سے بنی ہے، اس میں تقریباً ہر فعل میں س لگا دیتے ہیں جیسے عبدل کہس رہا کہ ہم کل آ دیکئے۔ بہار کے شمالی اضلاع مظفر پور، دربھنگہ، موتیہاری وغیرہ کی مقامی زبان ہندی اور میتھلا بھاشا کے برابر ہے۔ یہاں ایک عجیب بات یہ ہے کہ لوگ ڑ بہت کم بول سکتے ہیں مثلاً سڑک پر گھوڑا دوڑ رہا تھا۔ مدھوبنی، سیتا مڑھی وغیرہ کے علاقوں میں نہایت نرم و شیریں زبان بولی جاتی ہے جو پرانی برج بھاشا، ہندی اور پہاڑی زبانوں کی خوشگوار آمیزش ہے۔"

"بہار کے مشرقی اضلاع بھاگلپور، دمکہ، مونگیر اور پورنیہ میں مقامی بولی پر بنگلہ کا بہت زیادہ اثر ہو گیا ہے۔ اس بولی کا ایک نمونہ سنئے "کیدھے جارہے چھیں (کدھر جا رہے ہو) اسی خیال کو بنگلہ میں یوں کہیں گے "کوتھا جاچھین" ان جملوں کے پہلے لفظ کو لیجئے، کیا کندھے" کدھر اور کوتھا۔ آمیزش کا نہایت اچھوتا نمونہ نہیں ہے؟ پھر ان جملوں کے آخری لفظ کو لیجئے، بنگلہ چھین (ہیں) کا حرف ن بدل کر اسے ن غنہ میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ مشرقی بہار کی زبان پر بنگلہ کا کافی سے زیادہ اثر ہے ایسے بہت سے الفاظ ہیں جو دونوں بولیوں میں عام ہیں ان اضلاع کے بعد بہار کے ان علاقوں کو لیجئے جن میں سنتھال پرگنہ سنگھ بھوم، رانچی، پالاموں، لوہردگا وغیرہ کے اضلاع آتے ہیں یہاں کی مقامی بولی میں کولوں اور سنتھالوں کے بہت سے الفاظ آ گئے ہیں جو بنگلہ الفاظ کے ساتھ مل کر اکثر صورتوں میں ہم لوگوں کے لئے ناقابل فہم ہو جاتے ہیں۔"

پروفیسر صاحب کا جی ان باتوں میں نہ لگا اس لئے میں نے گفتگو کا پہلو بدلنا چاہا۔ ایسے وہ زبان کی بحث سے ہٹ کر بہار کی تہذیب و تمدن اور جغرافیائی حالات پر آ گئے میں نے کہا "جناب، آپ نے تو بہار کو ملک چین کا ایک صوبہ سمجھ رکھا ہے مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہاں آپ جیسے انسان رہتے ہیں جن کی غذا، لباس، تہذیب و تمدن الغرض ان کی ہر شئے آپ جیسی ہے۔ وہاں ریلیں بھی چلتی ہیں، ہوائی جہاز ہیں، وہاں ڈاکخانے بھی ہیں اور تار گھر بھی، وہاں کی زمین نہ صرف سارے ہندوستان میں زرخیز مانی جاتی ہے بلکہ ہندوستان کا صرف یہی ایک صوبہ ہے جس میں لوہے، ابرق، تانبے، پیتل اور کوئلے کی کانیں ہیں۔ یہاں کی خاک سے خدابخش، علی امام، حسن امام، مظہر الحق، راجندر پرشاد اور سچی دانند سنہا جیسے مایہ ناز علم دوست قانون داں اور ماہر سیاست داں پیدا ہوئے۔ خدابخش لائبریری آج تک اسلامی کتب کے نادر نمونوں کے لئے اپنی آپ مثال ہے۔"

پروفیسر صاحب پر میری باتوں کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ ان کے چہرہ پر کچھ ایسے آثار ظاہر ہو گئے جن سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مجھ سے بہار کے متعلق اور طرح کی باتیں سننے کی امید میں تھے میں نے قصہ مختصر کرنے کے لئے ان سے پوچھا "آخر آپ بہار کے متعلق اتنا کچھ جاننے کے لئے اس قدر بے قرار کیوں ہو رہے ہیں؟ آپ کی بلا سے، وہاں وحوش و طیور ہی کیوں نہ بستے ہوں، آپ تو ان سے سینکڑوں میل دور چین سے رہتے ہیں"۔ وہ یہ سن کر قدرے تشویش سے بولے "بات دراصل یہ ہے کہ میرا چھوٹا بھائی جو آئی۔سی۔ایس میں ہے اس کا تبادلہ موتیہاری کا ہو گیا ہے اور کوئی ایک ہفتہ سے اس کی کوئی چٹھی نہیں آئی ہے"۔ میں نے بادل نخواستہ ان کی تسلی کی اور اطمینان دلایا کہ بہار میں ان کے بھائی کی جان اور مال دونوں محفوظ ہیں۔ چٹھی نہ آنے کا سبب سلسلہ ڈاک کی ابتری ہے جو جنگ کی وجہ سے ہو گئی ہے۔"

بعض انسان بھی کس قدر ستم ظریف ہوتے ہیں۔ چھوٹے بھائی کا خط بڑے بھائی کے نام نہیں آیا۔ بس اتنی سی بات تھی جس کی سزا میں پورے ایک صوبہ کے تین کروڑ آدمیوں کو وحشی سمجھ لیا گیا۔ مجھے پروفیسر صاحب کی باتیں محض اس لئے یاد رہ گئیں کہ اس قسم کے حادثوں کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ میں یوپی میں تقریباً آٹھ سال سے رہتا ہوں اور اس قسم کے تصادم کا گویا عادی ہو چکا ہوں۔ اس صوبہ کے مغربی اور جنوبی اضلاع میں زیادہ تر ایسے ناواقف حضرات رہتے ہیں جو بہار کو بنگال کا ایک گمنام شہر سمجھتے ہیں۔ ان ناواقف لوگوں کو تو چھوڑیئے بہار کے جاننے والے لوگوں میں سے ایسے کرم فرما بھی ہیں جن کی نگاہ میں بہار پٹنہ کے گول گھر یا چھتر کے میلے سے باہر کچھ بھی نہیں

میرے ایک ڈپٹی کلکٹر دوست ہیں جو بڑے مخلص اور بے تکلف ہیں۔ یہ الہ آباد کے رہنے والے ہیں مگر بہار کے نام پر اتنا ہنستے ہیں کہ اکثر مجھے ان کو قہقہوں کی مشقتوں سے روکنا پڑتا ہے کہ کہیں اس کشمکش میں ان کا مزاج جہانگیر والا حال نہ ہو جاتے ہیں انکو سمجھاتا ہوں کہ بھائی الہ آباد تو بالکل بہار کا ایک ضلع معلوم ہوتا ہے یہاں کی زبان، یہاں کا رہن سہن سب کچھ بہار جیسا ہے اور اگر آئندہ کبھی ہندوستان کے صوبوں کی سرحدیں بدلی گئیں تو ہم اس ضلع کو یقینی صوبہ بہار میں لے لیں گے، پھر کیا وجہ ہے کہ کم از کم تم بہار کا نام سنتے ہی گنواروں کی طرح چیخ چیخ کر ہنسنے لگتے ہو۔ وہ میرے اس سوال کا یوں جواب دیتے ہیں "کیا کروں مجبور ہوں، بہار کے خیال سے مجھے گدگدی سی ہونے لگتی ہے"۔

میں ایک دفعہ بھوپال سے دہلی جا رہا تھا۔ میرے ہم سفر ایک پنجابی فوجی افسر تھے۔ دورانِ گفتگو میں انھوں نے مجھ سے میرا وطن پوچھا۔ میں نے بتایا "بہار" یہ سُنکر ان حضرت نے اپنے برتھ پر ایک قسم کی قلابازی کھائی پھر ہکا بکا ہو کر بولے "مگر جی، میں نے تو آپ کو ہندوستانی سمجھا تھا"۔ میں نے نہایت فدویانہ انداز میں کہا "جی! الحمد للہ میں ہندوستانی ہوں اور مرتے دم تک رہونگا"۔ میرا جواب سُنکر وہ بے قراری سے اُٹھ بیٹھے اور مجھ پر اپنا مطلب واضح کرنے کے لئے بولے "اجی میرا مطلب یہ تھا کہ آپ یوپی کے ہیں یعنی صوبہ متحدہ کے"۔ میں نے نرمی سے جواب دیا "بندہ نواز، آپ کی عزّت افزائی و حوصلہ افزائی کا بہت بہت شکریہ مگر مجھے تو آپ بہاری ہی میں رہنے دیجئے میں وہاں بڑا راضی خوشی ہوں البتہ ذرا دودھ لسّی کی تکلیف ہے تو اس کے لئے میں اکثر پنجاب آجاتا ہوں۔ بھائی پنجاب کی بھینسوں کا دودھ بڑا چنگا ہوتا ہے"۔

میرا یہ جواب سُنکر میرے ہم سفر بہت چراغ پا ہوئے اور غصّہ سے ڈبّہ کی روشنی ایکدم بند کر دی اور یہ کہتے ہوئے دھڑام سے اپنے برتھ پر لیٹ گئے "بہاری، بہاری، ہندوستانی ہندوستانی۔" میں نے مسکرا کر کروٹ بدلی اور یہ کہتا ہوا سو گیا۔ "ہم بہاری ہیں!"

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔

راحت سعید

"دِلاسا"

کچھ نہیں چاہیئے ای ہمدمِ دیرینہ مجھے
نہ ترا رنج نہ غصّہ نہ محبّت نہ پیار
نہ ترے جسم کی رعنائی نہ آنکھوں کا خمار
نہ ترے ذہن کی جودت نہ طبیعت کا نکھار
اور نہ یہ شعلہ فشاں آتشِ نمرودِ حیات
خندہ زن رقص کناں جسکے جلو میں ہے ممات
اپنی منزل بھی نہیں چاہیئے اب تو مجھکو!
کچھ نہیں چاہیئے ای ہمدمِ دیرینہ مجھے
خود مرا زہر مرے اپنے لئے کیا کم ہے
مے نہیں ہے تو نہ ہو خونِ جگر پی لونگا
چاک ہو جائیگا ہستی کا گریباں جب بھی
اپنی پلکوں کے سہارے سے اُسے سی لونگا
خوگرِ پیکرِ محسوس نہیں میری نظر!

بنگالی افسانہ

"گانا"

از بھبوتی بھوشن مکرجی مترجمہ محمد یونس احمر

ایک چھوٹا سا جنکشن اسٹیشن تھا!

اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہونگے کہیں لائن کی گاڑی سے اُتر کر میں ویٹنگ روم میں داخل ہوا مسلسل دو دن اور دو راتیں ڈبہ میں گذار چکا تھا۔ اور آجکل کا سفر۔۔۔ اُفنہ! اس کے تصور ہی سے جسم کے تمام رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کل صبح آٹھ بجے پھر گاڑی جائیگی۔ کیا مصیبت ہے۔ جان جوکھم میں پڑگئی ہے۔ اچھی غذا کہیں نہیں ملتی۔ سکر اور میدہ تو جیسے عنقا ہوگئے ہیں!

ویٹنگ روم میں جونہی قدم رکھا تھا کہ سبے چھوٹ گئے، کسٹاں گرم ہوگئیں، نتھنے پھول گئے، ایک لمبا تڑنگا، عظیم الجثہ کابلی دو بنچوں کو ملا کر بڑے اطمینان سے لیٹا ہوا تھا اور پھر اس پر سوٹ کیس اور دو تین گٹھریوں کا انبار، اس کے علاوہ ہینگ کی ناخوشگوار بو۔۔۔ دوسری جانب میری نظر ایک آرام کرسی پر پڑی لیکن آہ ری بدبختی اُس پر ملٹری اُوور کوٹ پھیلا ہوا تھا۔

اسی حیص بیص میں تھا کہ قریب کے باتھ روم سے آواز آئی پہلے تو یہ اندیشہ ہوا شاید کوئی شدت درد سے کراہ رہا ہے۔ میں ٹھٹک گیا۔ لیکن جلد ہی میرا خیال غلط نکلا۔ یہ تو ایک گورے کے گانے کی آواز تھی۔ یہ گانا سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ڈھنڈورا پیٹ رہا ہو۔

اور کابلی مُنہ پر گلابی رومال رکھے بڑے اطمینان سے نیند کے مزے لے رہا تھا۔ جب وہ سانس لیتا اس کا جالا جیسا پیٹ اس طرح پھول جاتا جیسے ہوا میں اُڑنے والا غبارہ۔ باتھ روم میں گورے کی کرخت آواز اور ادھر کابلی کے دلخراش خرّاٹے۔ میری جان عجب ضیق میں پڑگئی تھی۔

سوءِ اتفاق جلد ہی کابلی کا خرّاٹا بند ہوگیا لیکن وہ لیٹے ہی لیٹے بڑبڑایا۔ "چپ رہو ذرا!" میں نے سمجھا شاید کابلی کو گورے کے گانے سے تکلیف ہورہی ہے۔ میں نے ذرا ہولے سے کہا "آغا صاحب!" اور ایکا ایکی کابلی منہ سے رومال پھینک کر اُٹھ گیا اور بڑی عاجزی سے بولا "مت گاؤ بابو جی!" میں نے جواب دیا "آغا صاحب ایہ بھی کوئی گانے کا وقت ہے۔ میں کیوں ۔۔۔ مہربانی ہوگی اگر آپ مجھے بھی آرام کرنے کے لیے تھوڑی سی جگہ عنایت کریں"۔

نیند کے ماتے کابلی کو جب معلوم ہوا کہ گانے والا میں نہیں ہوں تو اُسے تسکین ہوگئی۔ پھر اس نے ایک نظر باتھ روم کی طرف ڈالی اور چند ثانیہ کے بعد حسب سابق دراز ہوگیا۔ مجھے کابلی کی بیرخی پر سخت جھنجھلاہٹ ہوئی۔

گویے کا بے ہنگم گانا رفتہ رفتہ اور تیز ہونے لگا جیسے فضا میں توپ داغنے کی آواز گونج رہی ہو۔ میں نے دیکھا کابلی عجیب عالم اضطراب میں کروٹیں بدل رہا ہے کبھی اس کی زبان سے اُف نکل جاتی۔ یہاں تک کہ مجبور ہوکر وہ اُٹھ بیٹھا اور میں قہر درویش برجان درویش ریلوے رہین ہولڈال بچھانے لگا۔ کابلی پھر مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔ "بابو جی گورے کو منع کرو"۔ میں نے جواباً عرض کیا۔ "لیکن وہ میرا کہنا نہیں مانے گا۔ خود جاؤ اس کے پاس"۔

میں ہولڈال ریلوے پر پھیلا رہا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی سوچ رہا تھا۔ گورے کا گانا، کابلی کی ترش روئی، ہنگامۂ نیند تاہم ان باتوں سے قطع نظر میں چادر سے مُنہ ڈھانک کر دراز ہوگیا۔

گانا بدستور جاری تھا اور کابلی کی پریشانیاں بھی بڑھتی جارہی تھیں میرا دل بھی نہ جانے کیوں گھبرا سا رہا تھا۔ عین اسی وقت چاپ سُنائی دی اور دروازے کا پٹ کھلتا نظر آیا میں نے چادر سے مُنہ نکال کر دیکھا۔۔۔ ایک ادھیڑ عمر کا بنگالی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی گٹھری تھی۔ شکل جانی پہچانی معلوم ہو رہی تھی۔ ناک نقشہ بھی وہی تھا اور یکایک جب میں نے آنکھ پھاڑ کر دیکھا۔۔۔ دیکھا یہ تو وہی ہے۔ اور پچھلے سال جو آیا تھا

پیچے بعد دیگرے ذہن میں قلابازیاں کھانے لگے۔

رسمی گفتگو ہونے کے بعد دینو نے مجھ سے کہا "بھئی یہاں کیسا میلا لگا ہوا ہے۔ دیکھئے رات کیسے کٹتی ہے"۔ اور جونہی میں نے دینو کا بچھونا بچھانا چاہا کابلی کی "اُف، اُف" سُنائی دی۔ اس نے چہرے سے رومال پھینک دیا اور دینو کی طرف دیکھ کر عجیب حسرت آمیز آواز میں بولا۔ "بابوجی گورے کو منع کرو"۔

یہ سُن کر دینو کے لبوں پر ہنسی کی لکیریں پھیل گئیں اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "بھئی سو گئے کیا؟ ذرا سنئے تو بھئی" لیکن میں اسی طرح چُپ چاپ چادر کی آڑ سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پھر دینو نے کابلی سے سوال کیا۔ "آغا صاحب ابھی آپ نے مجھ سے کیا کہا تھا؟"

گانے میں اور گرج پیدا ہو گئی تھی۔ کابلی اُٹھ کر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملنا شروع کیں۔ پھر دینو سے بولا۔ "بابوجی ذرا گورے کو منع کرو۔ ہم انگریزی نہیں جانتا"۔

دینو نے زمین پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "آغا صاحب وہ ملٹن کا گورا ہے۔ اسے کیا معلوم منع کسے کہتے ہیں"۔

اور کابلی نے باتھ روم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "اچھا بابوجی ذرا دروازہ تو بند کر دو"۔

میں نے ذرا چادر کھول کر دیکھا۔ دینو کی دونوں آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے اُٹھ کر دروازہ بند تو کر دیا لیکن دوسری طرف سے آواز گونجنے لگی۔

"یا اللہ" کابلی کی زبان سے ایکا ایکی نکل گیا اور اسکے دانت سے دانت بجنے لگے۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر عالم اضطراب میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا اور بولا۔ "بابوجی کیا گورا گھر کے اندر ہے۔ یہ قانون کے خلاف ہے۔ بڑا صاحب اس کو باندھ دے گا"۔

دینو نے لمبی سانس لے کر کہا۔ "برداشت کرو آغا صاحب کرنا کیا ہے۔ قسمت!"

ٹھیک اسی وقت گورا دروازہ کھول کر باہر آیا لال لال چہرہ جیسے خون میں ڈوبا ہوا۔ بالکل توانا اور تندرست۔ ہاف پائنٹ پہنے ہوئے تھا۔ بائیں ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی اور دائیں ہاتھ میں تولیہ۔ اب تک اس کا گانا فضا میں گونج رہا تھا۔

میں نے باریک چادر سے دیکھا۔ کابلی حیرت و استعجاب کی ملی جلی نظروں سے گورے پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ کابلی کی لمبی ناک اور خشم آگیں شکل سے تشدد کے آثار نمایاں تھے۔

پھر گورا آرام کرسی سے اُوور کوٹ اٹھا کر اس پر بیٹھ گیا۔ اس کی حرکت سے اندازہ ہو رہا تھا جیسے اب وہ بڑے اطمینان سے اپنا "راگ" چھیڑے گا۔

تھوڑی دیر تک تو کابلی قہر درویش برجان درویش پر عمل پیرا رہا لیکن جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اس نے ذرا منت کرتے ہوئے گورے سے اُردو میں کہا۔ "او گورا صاحب ذرا گانا بند کرو۔ ہم سوئے گا"۔

میں نے سمجھا کابلی کی اس منت سماجت سے گورا واقعی خاموش ہو جائے گا لیکن نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ اب تو جیسے گورے کے سر پر گانے کا بھوت چڑھ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں شیطان ناچنے لگا۔ بوتل پاس ہی رکھی ہوئی تھی اور دھوئیں کے مرغولے ہوا میں بکھر رہے تھے۔

کابلی کو جب بالکل ناامیدی ہو گئی وہ بستر سے اُٹھ بیٹھا اور گورے کو گھورنے لگا۔ پھر دونوں کانوں کو بند کرتے ہوئے آپ ہی آپ بڑبڑا اُٹھا۔ "یا اللہ......"

مشکل سے چند منٹ گذرے تھے کہ کابلی نے دینو سے کہا "بابو صاحب گورا اُردو نہیں سمجھتا ہے۔ ذرا تم انگریزی میں سمجھا دو۔ ہم اچھا ہینگ دیگا' بابوجی کابلی ہینگ"۔ اور دینو نے جواب دیا۔ "معاف کرو آغا صاحب میں اس جھگڑے میں نہیں پڑینگا"۔

کابلی نے پھر کہا۔ "اچھا بابوجی تو ایک بات سُنو۔ تم ہمیں منع کرنے کا انگریزی بتا دو۔ ہم خود بولے گا گورا کو"۔

"مجھ کو کیوں پریشان کرتے ہو آغا صاحب؟"

"نہیں بابوجی بتا دو۔ ہینگ دیگا' اچھا ہینگ' کابلی ہینگ"۔

"اچھا بابا اچھا۔ سُنو" دینو نے کابلی کو اپنی طرف ہوتے آہستہ سے کہا۔ "بولو۔ ڈونٹ سنگ یو راسکل"۔

کابلی نے کان کو اور قریب کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا؟"

"بولو ڈونٹ"

"ڈونٹ"

"سنگ"

"سنگ"

"یُو"

"یُو"

"ڈونٹ سنگ یُو"

"ڈونٹ سنگ یُو"

"ڈونٹ سنگ یُور اسکل"

"ڈونٹ سنگ یُور اسکل"

دو تین بار اور مشق کرنے کے بعد کابلی نے گورے کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا "ڈونٹ۔ ڈونٹ . . ." یکایک پھر اس نے میری طرف دیکھ کر سوال کیا۔ "بابوجی راسکل کا معنی کیا ہے ؟"

دینو نے جواب دیا۔ "راسکل معنی۔ راسکل معنی۔ یہ ملٹری ٹرم ہے آغا صاحب۔"

اور کابلی کو یہ سُن کر جیسے خوف سا محسوس ہوا۔ "ملٹری ٹرم — یہ ملٹری کیا کہا تم نے بابوجی۔"

"ملٹری ٹرم — یعنی، یعنی — یہ فوجی لفظ ہے۔"

کابلی نے اس درمیان میں نہ جانے کیا سوچا — شاید سے احساس ہو رہا تھا جیسے اس نے یہ انگریزی لفظ کہیں سُنا ہے۔ لیکن بہت دیر تک وہ خاموش نہیں رہ سکا اس لئے پریشان ہو کر پھر دینو سے گویا ہوا۔ "بابوجی ہم بھول گیا بتادو پھر۔ اچھا یہ بابو جانتا ہے۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا اور دینو نے س بلا کے ناگہانی سے بچنے کے لئے میری تعریف کے پُل باندھ دئے۔ اس نے کابلی سے کہا۔ "ارے وہ بابو تو وکیل ہے۔ قانون جانتا ہے۔ شاید جگانے سے . . . . "

وکیل کا لفظ سُن کر کابلی کو جیسے خوف معلوم ہوا اس لئے س نے جلدی سے کہا۔ "چھوڑ دو بابو۔ تم بولو۔ اچھا ہینگ دیگا" کہہ کر غالباً کابلی نے ہینگ نکالنا چاہا تھا کہ دینو نے اسے روک لیا اور عین اسی وقت گورے کا گانا بھی بند ہو گیا لیکن بلی کو اطمینان نہیں ہوا۔ اس نے گہری سانس پھینکتے ہوئے سا۔ "خدا خیر کرے۔"

اور گورے نے اُٹھ کر کھڑکی سے شراب کی خالی بوتل پھینک دی پھر پیشانی پر بل لاتے ہوئے اس نے نئی بوتل الی اور ڈاٹ کھول کر غٹ غٹ پینے لگا۔ پینے کے بعد اُس دینو اور کابلی کی طرف بوتل پیش کی، کچھ بڑبڑایا پھر میز اوپر رکھ کر نئے "راگ" کا افتتاح کیا۔

کابلی نے نظریں اُٹھا کر عالمِ اضطراب میں چھت کو دیکھا اور عبرادی طور پر اس کی زبان سے نکل گیا۔ "یا اللہ پھر شیطان سوار ہوا۔"

میں نے دیکھا دینو کا چہرہ غصّہ سے سُرخ ہو رہا تھا۔ حقیقت بھی یہی تھی اگر کابلی نہ ہوتا تو کم از کم ہم اپنے کان بند کر کے سو رہتے لیکن اس کے برابر تقاضے نے تو ناک میں دم کر رکھا تھا۔

کابلی نے دینو سے پھر التجا کی۔ "بابوجی منع کرو . . ."

اور دینو نے اس کا فرمان سُننے کے لئے اپنے داہنے کان میں ہاتھ رکھ کر کابلی کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے بعد کان سے ہاتھ ہٹاتے کرتے ہوئے بولا۔ "نہیں آغا صاحب! اب تو گانا بدل گیا۔ سو رہو۔ تکلیف نہیں ہوگی۔"

دینو کی یہ بات سُن کر مجھے سخت تعجب ہوا۔ حالانکہ شروع سے اب تک گورے کے حلق میں سے ایک ہی قسم کی آواز نکل رہی تھی۔ میں نے لاکھ سمجھنے کی کوشش کی لیکن ایک لفظ نہ سمجھ سکا۔

اب میں نے خوب کان کھول کر سُننا شروع کیا۔ بہت دیر تک سُننے کے بعد میں صرف اس کے گانے کے دو الفاظ سمجھ سکا۔ [illegible] معلوم ہوتا تھا اس کے گانے میں کئی زبانیں ملی ہوئی ہیں۔

کابلی نے پریشان ہو کر کہا۔ "شیطان کا گیت گاتا ہے بابوجی منع کرو۔"

دینو نے میرے ڈھکے ہوئے چہرے کو دیکھ کر جواب دیا۔ "آغا صاحب وہ یہ گانا کبھی نہیں ختم کرنے کا۔ یہ اُس کے دل کا گانا ہے۔"

اور کابلی نے بڑا استعجاب لہجے میں پوچھا۔ "دل کا؟"

میں نے دیکھا دینو کا چہرہ ہنسی سے کھِل کھِلا اُٹھا۔ "ہاں دل کا۔ وہ اپنی محبوبہ کا گیت گاتا ہے آغا صاحب! لاکھ روپیہ دینے کے بعد بھی خاموش نہیں ہوگا۔"

اور کابلی نے دینو کی طرف بڑی چاہت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بابوجی ہم بھی گیت گائیگا۔"

"آپکی مرضی آغا صاحب۔ کتنا میٹھا گلا ہے آپکا۔" دینو نے ہنستے ہوئے کہا۔

ہوش کر میرا تو دم گھٹنے لگا اور یکایک کابلی نے گلا پھاڑنا شروع کیا۔ کابلی کے اس گانے کو سُنکر گورا خاموش ہوگیا اور اسے خشم آلود نظروں سے گھورنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ نہ جانے کیا بکنا شروع کیا، اس کے بعد اس نے میز سے بوتل اٹھاکر گلاس میں شراب انڈیلی اور غٹ غٹ پی گیا۔ چند منٹ اور کابلی کی طرف دیکھنے کے بعد اس نے گانا شروع کر دیا۔

اس مرتبہ [illegible] کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔

کابلی خاموش ہوکر نہ جانے کیا سوچنے لگا — شاید وہ سوچ رہا تھا کہ گورا اس کے گانے کو بے کیف کر رہا ہے۔ اس لئے اس نے دینو سے کہا۔ "بابو جی اسکو خاموش رہنے کو بولو۔"

دینو نے عرض کیا۔ "صاحب وہ رُکنے کا نہیں۔ اس کو اپنی عورت سے بہت پیار ہے۔ بولتا ہے تمہارے واسطے جان دے دونگا۔"

کابلی نے جسم کو ذرا سا دبتے ہوئے کہا۔ "ہم بھی جان دیگا بابو جی۔"

"تم بھی اپنا عورت کو پیار کرتا ہے آغا صاحب" دینو نے پوچھا۔

"بہت پیار کرتا ہے بابو جی۔"

"تب شروع کرو۔"

لیکن کابلی شروع کرنے کے بجائے غور و فکر میں ڈوب گیا۔ پھر بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "بابو جی یہاں گانے سے بڑا بابو باندھ دیگا؟"

اُسے قانون کا اندیشہ تھا۔

دینو نے قدرے توقف کے بعد دریافت کیا۔ "کون کلاس کا ٹکٹ ہے آغا صاحب؟"

"سیکن (سیکنڈ) گلاس (کلاس) کا ٹکٹ ہے بابو جی۔"

یہ کہہ کر کابلی نے اپنا بٹوہ کھولا اور اس کے اندر سے سبز رنگ کا ٹکٹ نکال دینو کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ اور دینو نے اُچھلتے ہوئے کہا۔ "اب خوشی سے گاؤ آغا صاحب! کیا ناچوگے بھی؟"

"نہیں بابو جی صرف گا یگا۔"

"فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہونے سے ناچ بھی سکتے تھے آغا صاحب۔

اچھا گاؤ۔"

کابلی نے اپنی ڈاڑھی میں کئی بار ہاتھ پھیرنے کے بعد گانا شروع کیا۔ یہ سُن کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ گورے کو اپنی بھاری اور کرخت آواز سے شکست دیدیگا۔

[illegible] گورے کی زبان سے یہ لفظ اتنی تیزی سے نکلا جیسے وہ واقعی کابلی کو نگل جائیگا۔ وہ پریشان ہوکر یکبارگی کھڑا ہوگیا۔ پھر نہ جانے کیا بڑبڑایا اور گھونسے کو میز پر مارتے ہوئے بیٹھ گیا۔

میں اپنے بستر سے اُٹھ گیا اور دونوں کی اداکاری میں دلچسپی لینے لگا۔ دینو سے جب ہنسی ضبط نہ ہوسکی وہ گلا کھنکارتے ہوتے باہر نکل گیا۔ پھر چند منٹ کے بعد میرے پاس آکر کہنے لگا۔ "کہیئے تو میں بھی یہیں بیٹھ جاؤں۔ جان پر بن آئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "بیٹھ جایئے مگر آپ نے اچھا فساد کھڑا کردیا ہے۔"

"تھوڑا اور صبر کیجئے۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں کو یہاں سے ہٹنا پڑے گا۔"

اس وقت گورا کابلی کو بڑے ہی غیظ و غضب کی چتون سے دیکھ رہا تھا اور کابلی بھی چُپ چاپ نہ جانے کس سوچ میں تھا۔ اس کی یہ خاموشی گورے کے خوف سے نہیں تھی۔ پھر گورا اپنی جگہ سے اُٹھ کر پاس ہی رکھی ہوئی بوتل لانے گیا۔ اور دو تین گھونٹ شراب پی چکنے کے بعد اُس نے پھر کابلی کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ یہاں تک کہ گانا شروع ہوگیا۔

اور کابلی نے دینو کو اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بابو جی یہاں بیٹھ جاؤ۔"

دینو نے لبوں پر تبسم لاتے ہوئے مجھے آہستہ سے کہا۔ "دیکھوں کابلی کیا کہنا چاہتا ہے۔ شاید اُسے قانون سے خوف معلوم ہو رہا ہے۔"

میں نے جواب دیا۔ "بھئی کیوں بیچارے کو۔۔۔"

اور دینو نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "دونوں نے ملکر ہمارا سکون چھین لیا ہے۔ چکھاتا ہوں انہیں مزا۔"

جب دینو کابلی کے نزدیک آگیا اُس نے فوراً پوچھا "کیا بڑا بابو نہیں باندھے گا۔ ٹھیک جانتا ہے بابو جی؟"

دینو نے ترچھی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے

حوالدیا۔ "یہی بات تو دکبل بابو سے پوچھنے گیا تھا۔ وہ بابو بھی بولتا ہے کہ بڑا بابو کچھ نہیں کرسکتا۔ سکنڈ کلاس کا ٹکٹ حو ہے نا۔"

"گورا کا کتنا روز کا عورت ہے بابو جی؟"

ڈبو نے کابلی سے کہا "آغا صاحب گورا گا ماہیں بول ہے۔ اے میری محبوبہ! میں تمہارے بغیر پاگل ہو گیا ہوں میں برابر تمہارا ہی نام لیتا رہونگا۔ کوئی دشمن بھی مجھے روک نہیں سکتا۔ میں تمہارا سچا محبوب ہوں یقین مانو۔"

کابلی نے ان باتوں کو بڑے غور سے سنکر پوچھا۔ "کوئی دشمن بھی روک نہیں سکتا؟"

"ہاں آغا صاحب گورا یہی کہتا ہے۔"

کابلی نے فوراً دونوں ہاتھوں کے آستین چڑھالئے اور گورے کے پاس آکر کہنے لگا "ہمکو بھی اپنی عورت سے بہت محبت ہے۔ ہم بھی اس کی یاد میں گا نا گا ئیگا کوئی دشمن ہمکو روک نہیں سکتا۔ تمہاری عورت تو چندہی روز کی محبوبہ ہوگی لیکن ہماری محبت کو ۲۳ سال ہوگئے اور اب تک نو بچے، تین بچیاں ہیں۔ بڑے لڑکے کا نام یوسف منجھلے کا اسماعیل، اس کے بعد سکندر، رسول، ابراہیم، لطیف یار خاں"...... یہ کہتے کہتے کابلی نے گورے کو گھونسا دکھلایا۔

اور پھر دونوں میں کشتم کشتا شروع ہوگئی۔ بنچ کو الٹا کر دونوں کرسی کے اوپر چڑھ گئے۔ جب کرسی ٹوٹ گئی تو میز کی نوبت آئی۔ میز بھی سنبھل نہ سکی۔ اس کے دونوں پائے ٹوٹ گئے۔ گٹھری کے تمام کپڑے کمرے میں منتشر ہوگئے۔ دھینگا مشتی، گالی گلوج، اٹھا پٹخ ایک عجیب ہنگامہ برپا ہوگیا۔ چاروں طرف کے لوگ جمع ہوگئے۔ ان دونوں کو دیکھکر کسی کو ہنسی آرہی تھی کوئی تو ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن گیا تھا۔ لیکن ان کے قریب آتے ہوئے سب ڈرتے تھے۔

آدھ گھنٹہ کے بعد جب کابلی اور گورے کی جنگ ختم ہوگئی میں نے دیکھا گورا اپنے سر پر ہاتھ رکھے ہوئے ہے۔ کہیں کہیں سے خون بھی نکل رہا تھا اور کابلی منتشر شدہ کپڑوں کو سمیٹ کر اس پر سر رکھے اس طرح آواز نکالنے لگا جیسے پھر وہ نیا گانا شروع کردیگا۔

اتفاق سے اسی وقت میں لائن میں ایک گاڑی آکر رکی۔ اسٹیشن کے بڑے بابو سے میں نے کہا۔ "دیکھئے کیا ہیں جناب دونوں کو اسی میں روانہ کردیجئے۔"

اور جب گاڑی چلنے لگی ڈبو میرے پاس آکر بستر پھیلاتے ہوئے بولا۔ "اوہ اب سکون ملا۔ اور سنیئے جب دونوں ڈبہ میں داخل ہوئے میں نے دیکھا دونوں ایک دوسرے کو دیکھکر ہنس رہے ہیں۔ گورے کی داہنی آنکھ پھول چکی تھی، اور آغا صاحب کی بائیں آنکھ۔ اور ادھر گارڈ نے جونہی سیٹی دی دونوں نے گانا شروع کردیا.. "

اور دونوں کی آواز ریل کی چھک چھک پھک پھک میں گھل مل گئی۔ ادھر ہم سبھوں کا ہنسی کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔

ریزۂ مینا

اردو کے بہترین پچاس افسانوں کا مجموعہ سنہ ۳۰ء سے سنہ ۴۰ء تک ساقی میں سیکڑوں افسانے شائع ہوئے، انہی منتخب افسانوں میں سے شاہد احمد دہلوی نے یہ پچاس افسانے انتخاب کئے ہیں مشہور نقادوں کی رائے ہے کہ جدید اردو افسانے کا ایسا کوئی اور مجموعہ شائع نہیں ہوا جو ہمارے افسانے کی تدریجی ترقی کا آئینہ دار ہو۔ "ریزۂ مینا" افسانوی ادب اردو کے بحر ذخار میں ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے یہ کتاب نایاب تھی۔ اب پھر بڑے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ ضخامت (۵۵۰) صفحے۔ مجلد، جلد پوش سے آراستہ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ قیمت پانچ روپے (ہ)

پائل

آتشیں نغموں کا شاعر سلام آپکے لئے گیتوں کا تحفہ لایا ہے گیت جو آگ سے زیادہ گرم اور شہد سے زیادہ میٹھے ہیں۔ پائل آرٹ پیپر پر چھپی ہے۔ مجلد اور نظر فریب جلد پوش سے آراستہ ہے۔ قیمت عہ

پائل ساقی بک ڈپو دہلی سے طلب فرمائیے

گربچن سنگھ

اُلّو

کارواں در کارواں زندگی کے سفر سے تھکے ہوئے مسافر یہاں آکر دم لیتے ہیں۔ اس اِملی کی گھنی چھاؤں تلے جس کے پتّے لاجونتی کی طرح تو ہیں لیکن شرمیلے نہیں۔ کھانے میں کھٹّے مزدار لقمہ۔ لوگ کہتے ہیں کہ جو شخص اکثر اِملی کی چھاؤں تلے رہے۔ اُٹھے بیٹھے اور آرام کرے۔ آخر ایک دن اُس کی ہوا سے اُسے کوڑھ پھوٹ پڑتی ہے۔ پھر نہ جانے کیوں زندگی کے تھکے ہوئے مسافر یہاں آکر دم لیتے ہیں۔ بے خوف و بے خطر۔ یہاں خاؤں میں پر سوتے ہیں۔ جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ مٹّی میں مل جاتے ہیں پھر اُٹھتے نہیں۔ اُٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ ایسی لمبی تان کر سوتے ہیں کہ دنیا اور ما فیہا کی خبر نہیں رہتی۔ شاید اب انہیں کوڑھ کا ڈر نہیں رہتا۔ ذرا دیکھ لوں میرے پَروں میں آگ تو نہیں لگی ہوئی۔

نہیں! یہ میرے ہی خون کی حرارت ہی۔ اس بات کا ذکر کرتے ہی مجھے اپنے آپ میں گرمی محسوس ہو رہی ہے۔ ہاں تو میں اس املی کے پیڑ کا ذکر کر رہا تھا۔ دیکھو اس کالے سیاہ خبیث درخت کی چھال کیسی جھلسے ہوئے مُردے کی کھال کی طرح دکھائی دے رہی ہے۔ اس پر لا انتہا سیاہ چھپکلیاں لال لال زبانیں نکالے کس بے باکی سے رینگ رہی ہیں کہ جنہیں دیکھ کر جی متلا اُٹھتا ہے۔ لیکن یہ سیاہ درخت مستی میں جھوم رہا ہے۔ اسے مطلق خبر نہیں کہ وہ لا انتہا کیڑے مکوڑوں کو اپنے جسم میں پال کو سخت بیوقوفی کر رہا ہے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا ان کیڑے مکوڑوں نے کتنی دفعہ اپنے تیز دانتوں سے اس درخت کی بوٹیاں نوچ کھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ ہے کہ جسے مطلق خبر نہیں۔ میرا اندر ہی اندر مل کھانا ان کیڑے مکوڑوں اور چھپکلیوں کا کیا بگاڑ سکتا ہے! چتا کے لپکتے ہوئے رنگین شعلے جب تانڈو نرتیہ کرتے ہیں۔ سائیں سائیں کی دہشت ناک صدائیں جب زہریلے سانپوں کی پھنکاروں کی طرح سنائی دیتی ہیں، لکڑیاں چٹختی ہیں مُردوں کا گوشت پھوس کی طرح جلتا ہے ایک ناقابلِ برداشت بدبو جب اُڑنے لگتی ہے۔ تب یہ بیہودہ خبیث درخت مستی میں جھوم اُٹھتا ہے۔ ایک عجیب مُردہ اور خزاں رسیدہ ہنسی قہقہوں کی بھدی صدا بن کر گونج اُٹھتی ہے۔ اور میں غصّہ میں چیخ اُٹھتا ہوں۔

"اُلّک! اُلّک!! اُلّک!!!" میرے آشیانہ کی چھوٹی سی دُنیا میں طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ میرے ننھے ننھے بچّے ڈر سے کانپ اُٹھتے ہیں ہائے اُن کے ننھے ننھے دل بیچارے کانپ اُٹھتے ہیں!

میں کہہ رہا تھا سفرِ زندگی کے تھکے ہوئے مسافر یہاں آکر دم لیتے ہیں۔ جہاں شعلوں کی رنگین جلا دینے والی تپش نازو نعم سے پالے ہوئے مختلف اجزا سے تقویت پہنچاتے ہوئے نازک ریشم سے چھپائے ہوئے نفیس کپڑوں سے ڈھکے ہوئے۔ سجائے ہوئے جسم کو جھلس کر جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ واہ! جس تن کی حفاظت کے لئے لاکھوں روپیہ خرچ ہو جاتے ہیں ہزاروں جانیں قربان ہو جاتی ہیں۔ سینکڑوں ارادے اور اُمیدیں بھینٹ ہو جاتی ہیں۔ اُسے مٹھی بھر راکھ کے عوض شعلوں کے سُپرد کر دیا جاتا ہے۔ انسان کس قدر بیوقوف ہے۔ دیکھو مجھے ہنسی آ رہی ہے۔ ایک خزاں رسیدہ قہقہہ کیا انسان بھی اس قدر مجبور ہو سکتا ہے؟ لیکن میں جانتا ہوں دُنیا میں انسان دو طرح کے ہیں۔ ایک جینے سے مجبور اور دوسرا مرنے سے لیکن بوقتِ موت دونوں مجبور ہیں۔ اور ایسا ہونا ہی چاہیئے۔ ورنہ انسان کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔

کچھ دن ہوتے میں اس دریا کے اُس پار رہتا تھا۔ مجھے وہ دُنیا اب بھی نظر آ رہی ہے۔ کچھ اُبھری اُبھری زمین کس مپرسی کی حالت میں بے ترتیب جھاڑیاں، تاریک اور گہرے سوراخ رینگتے ہوئے کیڑے مکوڑے۔ زہریلے سانپ، تیز ڈنک والے بچھو۔ اور کچھ مینڈک۔ لوگوں سے اس کا نام قبرستان سُنا تھا۔ قبرستان!

یہ بھی ایک عجیب نام ہے جس جگہ بہت وحشت سی ٹپکتی رہتی ہے۔ ہاں تو اُس قبرستان میں پُھدکنے والے مینڈکوں ا

سانپوں کو دیکھ کر میرا جی گھبرا اُٹھتا۔ ان دنوں میرا بسیرا ایک ہرے بھرے آم کے سر پر تھا۔ درخت کے اردگرد اُگے ہوئے کچھ پودوں کے پھول جنہیں ایک شخص اکثر جمعرات کے دن توڑ کر ایک اتنی سی کہنہ قبر پر چڑھایا کرتا تھا رات کے وحشت خیز ماحول میں اُن پھولوں کی خوشبو کسی خوف کھائی ناگن کی طرح میرے آم کے درخت کے تاریک سائے تلے سمٹ جاتی تھی۔ میں اپنی ناک اپنے ملائم پروں میں چھپا کر کسی بدبو بھری ہوا کے جھونکے کا انتظار کیا کرتا تھا۔ اور اکثر یہ سوچتا تھا کہ یہ پھولوں کی خوشبو اُن رنگین مزاجوں کے لئے ہوا کرتی ہے۔ جو باغوں سے کھاتے ہیں اور مردوں سے جلتے ہیں۔ مجھے اُس وقت بڑا غصہ آتا تھا جس کی بدولت مجھے یہ دُکھ نصیب تھا کیا مجال جو اُن زمین میں دبے ہوئے متعفن مُردوں کی بُو مجھے فرحت بخش دے!

ایک اندھیری اور ویران رات کس قدر خوشگوار ہوتی ہے۔ کوئی میری آنکھوں سے دیکھے اور میرے دل سے محسوس کرے۔ بشرطیکہ حدِ نظر تک دور چہار سُو سناٹا چھایا ہو۔ وحشت ہی وحشت پھیلی ہو۔ یہی وقت تو لمبی لمبی تانیں کھینچنے اور سُریلے راگ الاپنے کا ہوتا ہے۔ نغمات جن سے کائنات سسکنے لگتی ہے۔ زندگی کا نقش غمناک تصور میں کھویا کھویا سا آنسو بہاتا نظر آتا ہے۔ میرا دل بلّیوں اُچھلتا ہے۔ میرے مُنہ سے بے اختیار خوشی کی چیخیں نکلنے لگتی ہیں۔ لیکن وہ انسان جو مرے ہوؤں کو یاد کرتا ہے۔ اور اُن کی بوسیدہ قبروں پر عقیدت سے پھول چڑھاتا ہے۔ مجھے اس پر غصہ نہ آئے تو کیا کروں؟ کیوں نہ قہر و غضب سے چیخوں۔ کسی ٹوٹنے والی شاخ کی طرح اپنے پر پھڑپھڑاؤں اور بھی زیادہ غضب ناک ہو کر چیخوں کہ ایک دفعہ جھاڑ جھنکاڑ میں بھی حرکت پیدا ہو جائے۔ طوفان برپا ہو جائے اور چہار سُو زہریلے جانور خوف سے رینگتے دوڑتے اور بلوں میں سر چھپاتے نظر آئیں۔ بر افسوس وہ دُنیا مجھ سے بچھڑ رہی تھی میں انسان کے لاغر خیالات اور اُس کے پست حوصلوں کو دیکھ کر خود بھی اپنی جرأت پر شک کیا کرتا تھا۔ اور ایک دن اس جگہ کو اپنی عظمت کے ناموافق پا کر میں نے چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ کیونکہ مجھے افسوس تھا کہ میری آواز پھول چڑھانے والے ایک عقیدت مند انسان کے ارادوں میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ عقیدت مند انسان بے وجہ لڑنے والوں کی بکواس پر کبھی کان نہیں دھرا کرتے۔ انہی دنوں ایک حادثہ نے مجھے اور بھی مجبور کر دیا کہ میں وہ جگہ چھوڑ دوں اور کسی دوسری جگہ جا بسوں۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک رات آکاش پر کچھ کالے بھوتوں کا گزر ہو رہا تھا جسے لوگ بادل کہتے ہیں اُن میں سے بعض اپنے ہاتھوں میں کڑک بجلیاں لئے سیلم دلیپ کے ملک میں تاروں کی نورانی شہزادیاں تلاش کر رہے تھے۔ ایک شعلہ اس درخت پر گرا جو جل کر راکھ ہو گیا۔ میرا گھر اُجڑ گیا لیکن خیریت اسی میں ہوئی کہ میرے پر بال بال بچ گئے۔ ورنہ میرے مجروح ہونے پر مجھے قبرستان کے کالے کالے سانپ اپنی پھنکاروں سے بھسم کر دیتے .. خیر پھر میں اُس املی کے پیڑ پر آ بسا۔ نہ جانے میرے پروں میں پھر یہ حرارت کیسی؟ ذرا دیکھوں تو! کچھ نہیں میرا خوف بیکار ہے۔ یہ خون کی گرمی ہے۔ لوگ کہتے ہیں یہ قلب و جگر کو گرمانے والی حرارت ہے۔ لوگ اسے نوجوانی کا جوش کہتے ہیں۔ یعنی گناہوں کی آگ۔ اس آگ میں عصمت جسے لوگ موتی سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ ایک آنچ میں راکھ ہو جاتی ہے۔ وہ راکھ آہوں سے اُڑائی جا سکتی ہے۔ اسی املی کے درخت سے کچھ پرے ہٹ کر پرسوں ایک ایسے انسان کی لاش جلائی گئی تھی جو کشتہ کھاتے کھاتے خود کشتہ بن گیا تھا۔ حرص و ہوس و طمع و نفس پرستی کی بدولت ایک ناسور اُس کی چھاتی سے پھوٹ پڑا تھا۔ کیونکہ کچھ دن ہوئے کسی فقیر نے اسے صلاح دی تھی کہ بیٹا کشتہ مرجان اور کشتہ طلا کھایا کر۔ یہ مرکّب تجھے تقویت پہنچائیگا۔ جوگی طاقت پیدا کرے گا۔ جسمانی کمزوری دُور ہو جائے گی۔ اس مرکّب نے وہ جوہر دکھائے کہ خود ہی راکھ بن کر رہ گئے۔ کل شہر سے ایک کتّا آیا تھا۔ شاید کسی بچی کھچی ہڈی کی تلاش میں۔ بجھی ہوئی چتا کو دیکھا۔ سونگھا۔ کچھ تلاش کیا۔ کچھ نہ ملا تو مُوت کر چلتا بنا۔ املی کے پتّے ناچ اُٹھے۔ ارے واہ! کیا احمقوں کی دُنیا ہے یہ!! لیکن یقین مانو میری باتوں کو سُننے والو میری اس بات کا بھی یقین مانو کہ مجھے اس بات کا سخت افسوس اور دُکھ ہوا کہ میں حیوان ہوں۔ اور اگر میں انسان ہی ہوتا تو مجھے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ میں طائر ہوں

میرے پَر ہیں اور اُس میں قوتِ پرواز بھی ہے۔ اور اسی طرح انسان انسان ہے تو اُس کے عقل بھی ہے۔ اور اگر عقل ہے تو ساتھ ہی اُس کے قہر و غضب بھی ہے۔ ظلم و ستم بھی ہے۔ مکاری اور فریب کاری بھی ہے۔ طیش ہے غصہ بھی ہے۔ حرص ہے ہوس بھی ہے۔ لالچ اور طمع بھی ہے۔ لوگوں سے سُنا ہے۔ نجابت۔ فراست جبّار شہادت اور نہ جانے کیا کچھ اوصاف اس میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن مجھے کچھ شک گزرتا ہے۔ ممکن ہے یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی انسان مایا کی سُنہری اور من موہنی روشنی میں یوں الٹا پڑا ہو کہ مجھے اندھیرے اور دُھندلکوں کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

ہاں تاریکی کی پوچھو۔ میرے معلومات کا مخزن جس کے وحشت خیز ماحول میں بھٹکتی سسکتی اور سُبکتی ہوئی روحوں کو ہمیشہ بیقرار دیکھا ہے۔ میں نے اُن دودھ پیتے ننھے بچّوں کی لاشیں دیکھی ہیں جنہیں کوئی شہر کے بھوکے کتّوں، گیدڑوں کی خوراک بننے کے لئے ویران نالے میں پھینک جاتا ہے اور مجھے انسان کا اصلی روپ تاریکی کا منہ چڑاتا صاف نظر آتا ہے۔ ہائے میرے ننھے ننھے بے زبان بچے! اُف! کچھ اور رہتے ہوئے دل کا پیتا ہے میں ذرا ان بچّوں کو اپنے پروں تلے چھُپا لوں۔

ہاں تو مجھے یہ کہنے میں کوئی پس و پیش نہیں کہ تاریکی بہت بُری ہوتی ہے۔ ایک سیاہ ناگن کی طرح جو ڈس کر ختم کر دیتی ہے۔ اسی طرح تاریکی میں کسی کے نازک لبوں کی مسکراہٹ لاکھوں فتنے ڈھا دیتی ہے۔ سیکڑوں فساد کھڑے کر دیتی ہے جھومتا ہوا متوالا۔ ہاں ذرا دھیان دے کر سُنو جھومتا ہوا متوالا کوٹھے کی تاریک سیڑھیاں طے کرتا ہوا جب سیر بازار پہنچ جاتا ہے تو پھر ایک مرتبہ نیچے ہی کھڑا کھڑا اُٹھتی ہوئی نگاہ اوپر پھینکتا ہے۔

تو وہ اب بھی مسکرائے جا رہی ہے۔ ہائے دل! پر کیا کرے۔ پیروں میں سکّت نہیں جیب خالی اب آگے ہی بڑھنا ہوگا۔ ہاں آگے بڑھتا ہے اور تاریکیوں میں کھو جاتا ہے۔ چھی! اب بتاؤ؟ تاریکی بُری ہوتی ہے یا اچھی؟ جو کچھ بھی ہو مجھ سے دن کی بات کوئی نہ پوچھے۔ اُجالے کی کوئی نہ کہے بس یہی ہے راز۔ تاریکی اور تاریکی کا بھید جسے میں نے سب کو بتا دیا۔

میں نے رات کے وقت جلتی ہوئی لپٹوں میں ہی اُجالا دیکھا ہے جہاں انسان شعلوں کی لپیٹ۔ چنگاریوں کی بارش، دُھوئیں کے بھبکے یہ سب کچھ صبر و استقلال کے ساتھ سہتا ہے۔ اور اُف نہیں کرتا۔ کاش انسان ہمیشہ اتنا صابر ہوتا!

لیکن میرے ایک رفیق کو صبر کے فلسفہ پر مجھ سے اختلاف ہے۔ وہ کہتا ہے صبر ایک مجبوری اور کمزوری کا دوسرا نام ہے۔ انسان اپنی عقل، حالا کی، ہُنر، فن اور ساری خوبیاں وقت آنے پر جو د بجود گنوا دیتا ہے۔ صبر کا موقع انسانی زندگی میں اس کی سب سے بڑی شکست ہے۔ جبر صبر و تحمل کو عمل میں لانے والے ممکن ہے کچھ اور کہیں اتنا تو میں بھی مانتا ہوں کہ یہ کمزوری بہت فائدہ مند ہے۔ دوا کے اُس کڑوے گھونٹ کی طرح جسکے حلق سے نیچے اُترتے ہی خُشکیوں میں مرض غائب۔ ہر انسان کو اپنی زندگی میں وقت آنے پر صبر کا دامن تھامنا ہی پڑتا ہے۔

ایک زمانہ گزرا لوگ اس ویرانے کو فردوسِ زمیں کہتے تھے۔ اِملی کے درختوں کی بجائے یہاں صنوبر کے گھنے پیڑ سکھیین کی گھنی ڈاریں کھڑی جھولا کرتی تھیں۔ چاروں طرف بہار چھائی رہتی تھی لا تعداد پھولوں سے مہکتے ہوئے پودے۔ سبزہ سے ہری بھری کیاریاں۔ گل و گلزار دلفریب منظر۔ وہ سُہاؤنے شاخ و شجر کیا کچھ نہیں تھا۔ نسیم صبح آتی۔ ذرّہ ذرّہ کو پیغام حق سُناتی۔ کہتی جاگ بے سُدھ جاگ، آنکھیں کھول یہ زندگی ایک رات ہے گناہوں اور آہوں سے لپٹی ہوئی رات جیسے یہ ہر بالی پھول کے پتوں سے چپکی رہتی ہے۔ زہریلی مسکراہٹیں اور پھر خوفناک قہقہے۔ اور یہ موت صبح۔ تاریک زندگی کی صبح گریہ و زاری کے سوا کچھ نہیں جسے دُنیا جان سکے۔ یہ دنیا کی ہر شے اس کا وجود اور انجام سب ایک تماشا ہی تو ہے۔

چتا کی سُرخ لپٹوں کی بجائے یہاں لالہ و سوسن کی ٹہنیاں اندھیرے کنجوں میں دمکتیں۔ ہماری قوم کے کچھ بچھڑے سے یعنی وہ رنگین اور لمبی ٹیڑھی چونچ والے طوطے اور مینائیں جنہیں چند بے حس انسانوں کی طرح غلام بن کر رہنا خوب آتا ہے۔ یہاں غل غپاڑہ مچائے رکھتے تھے۔ کیوں نہ کہوں کہ یہ کبھی راجہ کا باغ تھا۔ راج محل کے اُجڑے کھنڈروں کی دُھول لوگوں کو دن ہی کے وقت اُڑتی دکھائی دے سکتی ہے یہاں ایک نہایت حسین شاہزادی رہا کرتی تھی!

کس قدر حسین تھی وہ؟ کیسی دلفریب تھی وہ؟ تم کو سنا ہی پڑے گا کہ نوشگفتہ سُرخ گلاب کے پھول کی طرح۔ بھولی بھالی نازک اندام۔ دیکھتے ہی آنکھوں کی بھوک جاتے، چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ سینکڑوں دلوں کی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ چتا کی چٹخنے والی لکڑیوں کی صدا متواتر کئی مٹّوں سے میرے کانوں میں ہنگامہ برپا کر رہی ہے۔ یہ اُن بیقرار روحوں کے دلوں کی دھڑکنیں ہیں جنکی ملکیت یہ فردوس بریں یہ بوسیدہ محل۔ الغرض یہ ساری دُنیا ایک دن اِنہی کی تھی۔ جن سے کائنات کا ذرہ ذرہ واقف تھا وہ ہنستے تھے تو یہ پھول کھلتے تھے۔ وہ قہقہہ لگاتے تو یہ تارے اُٹھتے تھے۔ اُنکے قدموں کی آہٹ پاکر یہ قدم بوسی کے لئے بیتاب ہو اُٹھتے تھے۔ پھول مہکنے لگتے تھے۔ اور خوش گلو طیور مدھر راگنیاں چھیڑ دیتے تھے۔ دیکھو تو آج یہاں کچھ بھی نہیں رہت محل ڈھ چکا ہے۔ پرانے پیڑ پودے مُرجھا چکے ہیں۔ پر یہ ناعاقبت اندیش روحیں اب بھی یہیں چکر کاٹ رہی ہیں۔ میں ان سے کچھ پوچھتا ہوں!

سُنیئے، ان میں سے ایک کہہ رہی ہے "اے غلام دیش کے باشندو۔ میں نہ تو کوئی بازی گر ہوں اور نہ ہی کوئی ناصح۔ جو سیاست کی پیچیدہ قلابازیاں دکھا کر تمہیں رجھاؤں اور نہ لمبا سا مفکرانہ لیکچر چھانٹ کر اپنا گرویدہ کر لوں۔ میں تو ایک شعلہ ہوں جس کی آنچ تم محسوس نہیں کر سکتے۔ جیسے کوئی ہوا کا جھونکا سمجھا نہیں سکتا۔ میں ناچیز عرض کرتا ہوں کہ جب کبھی تمہیں ڈینگ مارنے کا موقعہ ملے یعنی طویل لیکچر چھانٹنے اور دُنیا کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کا موقعہ ملے تو سادگی اختیار کر لو۔ زبان کی میٹھی چُھری سے بے بس اور مظلوم لوگوں کے دل چاک کرو۔ اُنہیں ہلاک کرو۔ اُنہیں برباد کرو۔ غریبوں کے نام پر چندہ جمع کرو اور گلچھرے اُڑاؤ۔ ہمیشہ غیر مذہب کے باشندے تمہاری تنگ نظری کا شکار رہیں۔ وقت بے وقت گرگٹ کی طرح رنگ بدلو۔ دیکھو میرے محل کے ان کھنڈروں کو۔ یہ بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلے ہوئے ہیں۔ وقت کا نامُراد سایہ ان کے سر سے ڈھل چکا ہے۔ صبح کی پہلی کرن جب ان کھنڈروں کے تاریک گوشوں میں جھانکتی ہے تو انسان کے کارنامے دیکھکر کانپ اُٹھتی ہے جن کے بل پر انسان اپنے آپ کو عظیم اور عظیم تر انسان کہتا ہے۔ اسی طرح شام کے دُھندلکے میں جب سمد صیارانی اپنے سیاہ گیسو پھیلائے اسے اپنے آغوش میں لے لیتی ہے تو یہاں وحشت برسنے لگتی ہے سیاہ چمگادڑیں دیوانہ وار پر پھیلائے یہاں چکر کاٹتی نظر آتی ہیں میں اُس وقت اپنے کنبہ والوں کے ساتھ اپنی گھر کی یہ بدحالی اور یہ روح فرسا منظر دیکھکر کانپ اُٹھتا ہوں۔ روتا ہوں، سر دھنتا ہوں آہ! کبھی وہ حسین شاہزادی تو یہ میں کیا بک گیا … ہاں وہ حسین شاہزادی.. !"

خاموش اے خبیث روح خاموش۔ میں سب سُن چکا اور میں اب اتنا تو نہیں کہہ سکتا کہ انسان انسانیت کے ہوتے ہوئے افضل ہے یا حیوانیت کے ہوتے ہوئے، انسانیت کے نہ ہوتے ہوئے بھی انسان انسان کہلاتا ہے۔ اور صاف لفظوں میں اس کے ماننے سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ انسان انسان نہیں بلکہ حیوان ہے۔

وہ حسین شاہزادی، میں نے سُن لیا وہی نا جو گلاب کے پھول کی طرح نوشگفتہ بھولی بھالی نازک اندام … اور کچھ… سیاہ بادلوں کی آغوش میں چمکنے والے ایک روشن ستارے کی طرح جھلملایا کرتی، محل کی اس تاریک دُنیا میں۔ میں سب جانتا ہوں۔ کچھ دن ہوئے محل کے سُونے کھنڈروں میں رہنے والی ایک چکوری نے مجھے ساری کہانی سُنائی تھی۔

سناٹے کی طرح تیری زندگی بے حِس اور ساکت ہونے کے باوجود ایک خوفناک ماحول پیدا کر رہی ہے۔ ایسا کیوں؟ کیوں تو اپنے ذہن اور تصور میں گذشتہ واقعات کے مبہم سے کھلونے بنا بنا کر توڑ رہا ہے۔ آخر تیرا مطلب کیا ہے؟

میں نہیں سمجھتا انسان یا اس کے ذہن میں پرورش پانے والے صدہا مکر و فریب آتش فشاں کے لاوے کی طرح اُس کے اندر ہی اندر بل کیوں کھاتے رہتے ہیں۔ کیوں اس کے تاریک دل میں بسے ہوئے غلیظ جذبات کسی جنگلی پھول کی ناقابلِ برداشت بُو کی طرح فضا کو معمور کئے رکھتے ہیں، مروّت، فیض۔ مدح و ثنا خوانی کے ظاہری الفاظ میٹھے زہر سے کم نہیں۔ اُس کی مسکراہٹ بجلی کی طرح روشن تو ہے لیکن شعلہ کی طرح تپاں۔ چتا کی بے باک لپٹ ہے جو جلا کر خاک کر دے … دیکھو یہ چتا کیسی خوفناک دکھائی دے رہی ہے۔ دیکھو اے میری آنکھوں سے دُور رہنے والے انسان دیکھ! تجھے ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔

اے انسان یہ ہے تیرا انجام اگر تیرا ٹھکانا جید ہاتھ مٹی کے تنگ تاریک گڑھے میں ہوگا تو ایک جلتی ہوئی سیج پر تو ہوگا۔ اگر تو اپنے ان گھروں سے گھبرا کر کہیں دُور بھاگ جائیگا تو گیدڑ، کتّے اور تیز منقاروں والے پرندے تیری بوٹی بوٹی نوچ کھائیں گے۔ کیسا حسرت ناک انجام ہے تجھ مٹی کے کھلونے کا۔ تیرے فنکار نے تجھے بنا کر اپنا آپ ظاہر کیا ہے اور تیرا یہ انجام! . پھر اے خبیث روح تجھ سے کیا کہوں!! مجھے کچھ اعتدال سے تو کہنا ہی ہوگا کہ وہ انسان جو اپنی درد و کرب کی آہ بنا کر لٹا دے۔ وہ انسان جو اپنے آنسوؤں کو صبر و ضبط کے خشک ریگستان میں جذب کر دے۔ ایک وہ انسان جو اپنے غرور و عظمت کو قہر و ظلم سے تشبیہ دے۔ ایک وہ انسان جو اپنے ذہن میں دُور کی دُنیا دیکھے۔ چاند ستاروں کا علم سیکھے۔ ایک وہ انسان جو زمین دوز گہرائیوں میں ناسور کے کیڑے کی طرح اُچھلے کودے . اور اس سے آگے بڑھ کر نفرت و بیزاری اُنس و محبّت کے ٹھیکیدار۔ آزاد اور غلام قدم قدم پر تھوکتے روتے اور دھول اُڑاتے نظر آتے ہیں۔ کیا کبھی کسی انسان نے کبھی چاند رہڈی کے ڈھانچہ کو صرف ایک ردی کے ٹکڑے کی خاطر نفرت و بیزاری کے ٹھیکیداروں کی حضوری میں چیختے چلاتے نہیں دیکھا؟

میں اُن ارکین ملک کو کیا کہوں جو کہ انسانوں کے سردار کہلاتے ہیں۔ جن کے وجود کی حقیر بنیاد حرص و ہوس مختلف قوموں کی دل آزاری۔ فریب کاری اور مکاری پر مبنی ہے۔ جن کے ایک اشارے سے صدہا بیڈھنگی تہذیبوں کے پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اور مختلف موسموں کی طرح لسنت میں خون کی ہولی کھیلنے۔ تخریبیت کی خزاں لاتے۔ مارو دو گیسوں کی گرمی برساتے۔ سینکڑوں آنکھوں سے برسات کی جھڑیاں لگواتے ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ اور یہ سب ایک ایسا خطرناک خواب ہے جو اپنی لطافت کے با وجود نقش ذہن سے فنا ہو جاتے۔

یہ ٹوٹے پھوٹے منہدم کھنڈر بیتے دنوں کی عبرتناک تصویریں ہیں۔ جن کا ذرّہ ذرّہ ماضی کی یاد دل میں تازہ کر دیتا ہے۔ دیکھو کہیں کسی رنگین ذرّہ پر خون کی قلعی۔ اور کسی پر خشک آنسوؤں کا لمع..... اور کہیں محبت کی دلگداز داستان چکی پڑی ہے۔ .... انتقام انتقام!! انتقام!!! طوفان کی آہٹ پاتے ہی یہ ذرّے یوں چیخنے لگتے ہیں۔ اُن سے نکلی ہوئی یہ آواز ویرانے میں لولوں کی غول سے دور رہ جانے کیا قیمت رکھتی ہے۔ جسے میرے اور ان روحوں کے سوائے کوئی بھی نہیں سُن سکتا ان باتوں کو سُن سُن کر اکثر کچھ روحیں کہتی ہیں کہ انسان کو اُس قوّت کی جڑ کاٹنا اپنا نصب العین بنا لینا چاہیئے جس نے اُسے غلام اور جانوروں سے بدتر بنا رکھا ہے۔ تشدد اور ظلم کا بار جو ہمیشہ اُن کی گردنوں پر سوار کئے رکھتی ہے۔ جو دھوکے اور دغا بازی سے بھائی بھائی کو لڑا کر اُن کی کھوپڑیوں پر اپنی عالیشان تہذیب کا محل کھڑا کرتی ہے۔ پھر مظلوم انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اُن سرمایہ داروں کی عقل پر پردہ تان دے جس کے خیالات عریاں اور جو بھوکوں اور ننگوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے لئے نت نئے طریقے سوچتے رہتے ہیں۔ جنکی زبان بہت لذیذ کھانوں کی شائق۔ جن کی آنکھیں حسن کی رعنائیاں دیکھنا چاہتی ہیں۔ جن کا سر غرور و نخوت سے اونچا اُٹھا رہنا چاہتا ہے۔ جن کے دل بیباک اور جو تاریکی میں اپنوں ہی کی پاس عصمت لوٹتے رہتے ہیں۔ جو اپنے قوی ہاتھوں سے لاچاروں اور مجبوروں کی گردن مروڑ دینا چاہتے ہیں۔ الغرض جن کی نفس پرستی دُنیا کی تباہی ہے۔ اُن سے بچنے کے لئے انسان کو وہ سب کچھ کرنا چاہیئے جو اُن سے ہو سکتا ہے۔ وہ چاہے انہیں تباہ کر دیں۔ مار دیں یا کسی اور طرح راہ پر لے آدیں۔ لیکن یاد رکھو کہ ظلم سہنا بھی ایک گناہ ہے اور پھر؟

رات کا یہ بصیرت افروز سناٹا کیس قدر دلگداز ہے! کالے کالے بادلوں کے وحشی غول شمالی پہاڑی کی چوٹیوں کی طرف اُڑے چلے جا رہے ہیں۔ اب ہوا کچھ تیز چل رہی ہے پتے پاگلوں کی طرح بے تحاشا تالیاں پیٹ رہے ہیں۔ جب کوئی اُڑتا ہوا پتا کھڑکھڑاتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی سخت ہڈی چتا کے شعلوں میں چیخ رہی ہے۔ ان بانسوں کے جھنڈ تلے وہ انگاروں کا ڈھیر سرد پڑ چکا ہے۔ یہ اُٹھتے ہوئے شعلے اب سو چکے ہیں۔ میری آنکھوں کو دھندلا کر دینے والا لالی شعلوں ہی کے ساتھ ختم ہو چکی ہے۔ اب مجھے صاف نظر آتا ہے وہ خبیث روحیں نہ جانے کیوں آنکھوں سے آنسو بہا رہی ہیں!

اُن کے پیچھے وہ لاتعداد انسانی پنجر سر دُھن رہے ہیں۔ رہ رہ کر سینے میں ہاتھ گھُسانے ہیں اور اپنا دل ٹٹولتے ہیں۔ لیکن اُنہیں اس کھوکھلے تن میں کچھ نہیں ملتا۔ تو نہ جانے کیا سوچ کر وہ خاموش بھی ہو گئے۔ میں اس روح سے پھر مخاطب ہوتا ہوں۔

اے روح تو کھڑی کھڑی کیا جھک مار رہی ہے؟ اپنے ساتھیوں سے کہدے کہ وہ یہ انقلابی جدّت ترک کر دیں۔ آئیں اور آکر چتاؤں سے مُردوں کی بچی کھچی ہڈیاں اُٹھائیں اور چبائیں۔ دُنیا میں غرض مند انسان تو مُردوں پر سے کفن تک اُتار لیتے ہیں۔ پھر تمہاری یہ دگرگوں حالت۔ یہ افسردگی دیکھکر کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ یہ دل کیا ٹٹول رہے ہیں؟ ممکن ہے یہ سب جاننا چاہتے ہوں کہ ہر کام کے لئے انسان کا دل چاہئے۔ دل ہے تو ہمت اور طاقت بھی ہے۔ دل ہے تو خون میں حرارت ہے۔ جوش و جوانی ہے۔ قہر و جبر ہے۔ لوٹ کھسوٹ۔ ظلم و ستم، غریبوں کو ستانا۔ امیروں کو برباد کرنا۔ یہ ساری خصوصیتیں دل کے ہوتے ہوتے قائم ہیں۔ کیوں ہے نہ؟ اور وہ حسین شاہزادی! کتنی حسین تھی وہ؟ کچھ یاد ہے نہیں۔ رعنائیوں کا مرمریں پیکر تب تم بادشاہ تھے۔ وہ تمہاری محبوبہ ملکہ دل میں کچھ سوال کرتا ہوں۔ کیا اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو گے؟

روح ستاروں کے جھلمل شرروں سے بھی زیادہ تاریک اور دل سوز لہجہ میں جواب دے رہی ہے "کیوں نہیں۔ اُن دنوں کی یاد ایک ایسا دلنواز نغمہ ہے جو دل و دماغ پر فکر و تردد بن کر مسلط ہے۔ بولو میرے وجود کی چنگاریاں مشتعل ہو اُٹھی ہیں۔ میری دُھندلی دُھندلی آنکھوں میں بدمستی کی کرنیں سما رہی ہیں۔!" "تو سچ سچ بتاؤ کیا تم اُس سے محبت کرتے تھے؟"

"مجھے اُس سے دلی محبت تھی۔ وہ میرے وجود کی پگھلتی ہوئی حرارت تھی۔ وہ میرے دل کے تڑپتے ہوئے ارمان تھے!"

"وہ تم سے محبت کرتی تھی؟"

"ہاں وہ بھی مجھ سے محبت کرتی تھی! وہ ایک خوبصورت پھول اور میں اُس کی خوشبو تھا۔ خراماں خراماں مستی میں چلنے والی ندی تھی۔ جو میری خشک وسعتوں میں آکر جذب ہو جاتی تھی اُس کی مروں کی دھڑکن میرے دل کے جذبات تھے۔ چاندنی راتیں اُس نے میری ہی خاطر آہیں بھر بھر کر کاٹی تھیں۔ اور تاریک راتیں رو رو کر۔ آخر ایک دن محل کے اُس اونچے گنبد سے کود کر مر گئی جس کی کھڑکی سے ہمیشہ اُس کے دل سے نکلا ہوا آہوں کا دُھواں اوپر اُٹھا کرتا تھا!"

"بے غیرت ہے تو۔ شرم کو گھول کر پی گیا ہے تو۔ میں جانتا ہوں تیرے پیش نظر دولت کی مایا اور دُنیا کی حسین ترین محبوبہ تھی۔ زر پرستی تیرا شیوہ۔ اور حسن کی ناقدری تیرا ایمان تھا۔ تو نے اُس لڑکی کو اپنے اُس فاتح سردار کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ کر لیا تھا جو اُسے اپنی ہوس کا شکار بنانا چاہتا تھا۔ جس کے تن میں پرورش پانے والی نفس کی چنگاری اُس لڑکی کو جلا کر بھسم کر دے۔"

"کاش ایسا ہی ہوتا تو کیا کچھ سکتا ہے۔ بڑے بڑے اونچے محلوں کے ویران ہونے سے تواریخ کا ورق کون سی کروٹ بدلتا ہے۔ حوادثِ زمانہ سے ویران محلوں کے کھنڈر بن جانے سے ماحول اسے دوبارہ تعمیر کرنے کیلئے زمانہ کے ساتھ کون سی نئی چال چلتا ہے!"

"لعنت ہے تم پر۔ تم پر خدا کی مار ہو۔ تم شیطان ہو۔"

"لیکن اسے حقیر بیاد رکھو اگر دُنیا میں کوئی شکھ سے رہنا چاہتا ہے تو وہ صرف شیطان ہی بن کر رہ سکتا ہے۔"

"خاموش بدکار! میں سب جانتا ہوں میں نے ہنس کر جینا سیکھا ہے رو کر نہیں۔ زندگی کو محنت جفاکشی اور صبر و تحمل کے سیدھے راستہ پر رواں رکھا ہے۔ چھل کپٹ اور پیچیدہ چالوں کی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر نہیں۔ جاؤ چلے جاؤ۔ جلی ہوئی چتا سے مُردوں کی ہڈیاں اُٹھاؤ نوچو اور چباؤ۔ یہ رات کا دلفریب سماں۔ املی کے پتے ہلکا ہلکا نغمہ چھیڑ رہے ہیں۔ اور اُمڈنے والا طوفان تھم چکا ہے وحشی بادل آسمان کی وسعتوں میں گم ہو چکے ہیں۔ شہر کا فتنہ سو چکا ہے۔ گیدڑوں کے چیخنے کی آواز۔ ہُوا ہو! ہُوا ہو! سُنائی دے رہی ہے۔ یہ بڑی بڑی چمگادڑیں اپنے سیاہ پر پھیلائے کس آزادی سے اُڑ رہی ہیں۔ جی چاہتا ہے میں بھی ایک اُڑان لگاؤں۔ لیکن میرے پیارے بچے۔ ہائے انہیں کلیجہ سے الگ نہیں کیا جاتا۔ میرا دل انسانوں کے دل سے چھوٹا ہے!

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھئے۔ اور جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ روانہ کیجئے۔

(منیجر)

مسعود حسین

دوگیت

۱

پریم کے ہاتھوں میں بک جاؤں
دیکھتی ہوں یہ راہ
لوگ جو دوش لگاتے مجھکو
وہ کیا جانیں چاہ
رسموں کے پھندے لے لےکر
پھانسنے آئیں مجھکو ڈرائیں
یہ مورکھ پر کیسے پائیں
میرے من کی تھاہ
دوش لگا دیں جو وہ چاہیں
لیکن کیا پرواہ
جو مورکھ ہوں وہ کیا جانیں
پریت کی ریت کو آہ!
ختم ہوا جاتا ہے میلا
مول نہ کر پائے وہ میرا
پریتم! یہ من تو بس تیرا
تیری ایک نگاہ
پریم کے ہاتھوں میں بک جاؤں
دیکھتی ہوں یہ راہ

۲

شام اودھ کی میرا جوبن!
یہ ہی رنگت یہ ہی روغن
یوں ہی جلتا سا میرا من
شام اودھ کی میرا جوبن!
شام کی گہری لمبی سانسیں
میرے جیون کا سونا پن
شام کے پنچھی کا کچھ گانا
جیسے دل کی مدھم دھڑکن
شام کے آنچل میں کچھ تارے
تاروں سے پُر میرا دامن
شام اودھ کی میرا جوبن!
گھٹتا جاتا پل پل چھن چھن

سعیدہ بشیر

"بارش میں"

میں نے کتنا ہی منع کیا مگر وہ چڑیل ماہے والی کب تھی۔ اڑ گئی کہ نہیں چلو گھومنے۔ آسماں پر، نہ زمین پر، دریا میں بادشتی پر۔ لیکن کہیں چلو ضرور۔ دیکھو نا کتنا خوبصورت موسم ہو رہا ہے۔ یہ بھی کوئی گھر میں بیٹھنے کا وقت ہے۔ ارے تو کبھی تو گھر میں بیٹھ لے۔ روز ہی تو جاتے ہیں گھومنے۔ آج نہیں جائیں گے تو کیا ہو جائے گا۔ اُس دن کی طرح بارش آڑے ہاتھوں لے گی سب پتہ چلے گا۔ اور ابھی تو ضرور ہی نمونیہ ہو کر رہے گا۔ "اچھا بکو نہیں اب تیار ہو جاؤ نا جلدی سے"۔ زیور بی نے بڑے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ اور ہم "جو حکم سرکارِ عالی کا"۔ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُدھر خالہ زرینہ چیختی رہیں۔ "دیکھو لڑکیو اب کی اگر تم بغیر چھتری یا برساتی کے گھر سے نکلیں تو ایک ایک کی ایسی خبر لوں گی کہ یاد کرو گی۔ بھیگ بھیگ کر بیمار پڑنے میں مزہ آتا ہے تمہیں کیا"۔ اور ہم تولیہ سے منہ رگڑتے ہوئے۔ منہ کو صابن کے جھاگ میں لپیٹے ہوئے۔ چہرہ پر وینشنگ کریم کا لیپ اور پھر پاؤڈر کا پلاسٹر چڑھاتے ہوئے اور آنکھوں کے کناروں پر کاجل کے خوبصورت گوشے نکالتے ہوئے ایک ساتھ ہی چیخ اُٹھیں۔

"نہیں نہیں، خالہ زرینہ۔ بغیر چھتری کے اب ہم گھر سے نکلنے والے ہیں بھلا۔ کئی بار مزا چکھ چکے ہیں"۔

لیکن صاحب توبہ کیجئے چلتے وقت کی دوڑم بھاگ میں کہاں کی چھتری، کہاں کی برساتی اور کہاں کا اور کچھ۔ کئی شریر لڑکیاں جب ایک ساتھ کہیں نکل پڑیں تو بس سمجھ لیجئے کہ ہر اُس بات کو گھر پر ہی چھوڑ جاتی ہیں جس سے مصلحت یا دانشمندی کو ذرا سا بھی لگاؤ ہو۔ اور پھر زیور اتنی بُری تھی جا کو گھسیٹ لے گئی۔ دیوار ایسی چڑھائی۔ پاؤں دُکھ گئے چڑھتے چڑھتے۔ ابھی پرسوں ہی تو بخار اترا تھا مجھے اور آج اُدھر جو میں نے سفید سفید دھوئیں کی طرح بادل اٹھتے دیکھے تو میری جان سوکھ گئی۔ اور جو ابکی پھر مجھے کڑوی دوا پینی پڑی تو ٹھونس دونگی تیرے ہی منہ میں۔ اس لئے کہ تو ہی تو لائی ہے مجھے۔" میں نے جل کر زیور سے کہا۔ لیکن وہ کب سنتی تھی۔ بندروں کے ایک لشکر کو چنے کھلانے میں مست تھی۔ اور اُس کے ساتھ جلیس، خورشید، ربیدہ سب جل ہی تو گئی ہیں۔

"تم لوگوں کو آنا ہو تو آؤ ورنہ میں جاتی ہوں۔ لیکن یہ وار بھی خالی گیا۔ اور وہ سب ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ ادھر میں ذرا ہی دور گئی تھی کہ بس آ گئی بارش۔ میں تیز تیز قدم چلاتے چلاتے تقریباً بھاگنے لگی۔ آہ میری شیفون کی سبز ساری کتنی بے دردی سے بھیگ رہی تھی۔ بھیگ رہی تھی اور سکڑ رہی تھی۔ سکڑ رہی تھی اور بھیگے جا رہی تھی۔ اتنے میں میری نظر اپنے کالے سویڈ کے واکنگ شو پر پڑی۔ غریب کیچڑ اور پانی میں لت پت۔ میں نے سوچا کیا اسی دن کے لئے تجھے چائنیز بوٹ ہاؤس سے اس قدر شوق سے بنوایا تھا۔ اور اُس پر کے سُرخ ننھے ننھے پھول۔۔۔!

مگر جامیدان والی سڑک تک بھی نہ پہونچی تھی ابھی کہ ایک موٹے تازے پہاڑی بندر نے مجھے آ دبوچا۔ ہائے میرے اللہ۔ میں زور زور سے چیخنے لگی۔ وہ تو خدا بھلا کرے اُس مندر کے پجاری کا کہ اُس نے آ کر مجھے کمبخت سے نجات دلائی۔ میری اتنی خوبصورت ساری کو دانتوں سے نوچ ڈالا تھا اس ذلیل بندر نے۔ اس بے چارگی سے اپنی ساری کا خون ہوتے دیکھ کر اور پھر ایسے زمانے میں۔ جی چاہا کہ رو دوں۔ اور یا تو پھر زیور کی ایک ایسی ہی ساری اسی طرح برباد کر کے رکھ دوں۔ حُسنِ اتفاق تو دیکھئے کہ آج اُن سبھوں نے بڑے ہی معمولی کپڑے پہنے تھے اور مجھے نہ جانے کیا سوجھی جو یہ شیفون کی ساری نکال لی سیر کرنے کے لئے۔ ان لوگوں کا دور تک پتہ نہ تھا اور میں اب بھی اپنی ساری اور جوتے کی سلامتی کی کچھ اُمیدیں لئے بھاگتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اور بارش نے بھی تو آج کھل کر برسنے کی قسم کھالی تھی۔ برستی ہی گئی۔ ذرا بھی رحم نہ آیا ہم پر۔ میں بھاگ بھاگ کر تھک چکی کیسی بے حد ننھے بچے کی طرح بے بسی سے بھیگ کر تر ابور ہو چکی تو گھر آیا۔ پائنچی کا پنچی دھڑ سے اندر گھستی چلی گئی۔ لیکن ہیں۔ یہاں تو نہ امی ابا اور

۔خالہ زرینہ اور یہ گا کون رہا ہے۔ اوہ یہ گانا تو مجھے بہت پسند ہے۔
"کسی طرح سے محبت میں چین پا نہ سکے"

مگر پھر یہ گھر۔؟ ارے یہ تو بالکل ہمارے ہی گھر ایسا ہے۔ بالکل ویسے ہی کمرے۔ اُسی طرح کی چھتیں۔ ویسی ہی دیواریں۔۔۔ میں چھتیں اور دیواریں دیکھتے دیکھتے نہ جانے کہاں پہونچ گئی۔ ایک دم سے جو سامنے نظر پڑی تو ٹھٹھک کر رہ گئی۔ کوئی صاحب بڑے اطمینان سے صوفے پر بیٹھے مصوّری سے شوق فرما رہے تھے اور ساتھ ہی گنگناتے بھی جاتے۔ "تھی وہ آگ ہے سینے میں جو بجھا نہ سکے۔ کسی طرح سے محبت میں"۔۔۔ اور پھر اُس نے میری طرف دیکھا۔ بالکل جیسے مجھے جانتا ہو۔ "اوہ آپ؟" اور میں اُلٹے پیروں واپس بھاگی "معاف کیجیے گا۔ میں۔۔۔ میں غلطی سے"۔ "لیکن آپ ہیں کون محترمہ اور یہاں کیسے گھس آئیں۔۔؟" اُس نے چہرے کو سخت بناتے ہوئے کہا۔ "میں کوئی بھی ہوں اس سے آپ کو کیا غرض۔ اتفاقاً غلطی سے میں یہاں آگئی ہوں۔ مگر اب مجھے جلدی جانا ہے"۔ "تو آپ چلیں کہاں۔ اِدھر تو تشریف لائیے ذرا۔ آج کل ہندوستان آزادی اور غلامی کے بیچ میں لٹک رہا ہے۔ یہاں کے پالیٹکس ایک اہم ترین دور سے گذر رہے ہیں۔ ہندو مسلمان آپس میں ملتے ہی نہیں کہ انہیں انگریز آزادی سونپ کر اپنا رستہ پکڑیں۔ کیا عجب کہ سول وار ہو جائے۔ طرح طرح کے چور اُچکے پیدا ہونے والے ہیں۔ ہمیں کیا پتہ کہ آپ بھی اُن میں سے ایک"۔۔۔ "کیا بکتے ہیں آپ"۔ میں نے جل کر کہا۔ "میں چور اُچکی۔ مطلب کیا ہے آپ کا"۔ "جی میرا مطلب یہ ہے کہ" اور پھر وہ میرا ہاتھ نہایت بے تکلفی سے پکڑ کر لایا اور مجھے صوفے پر دھم سے دھکیل کر بولا۔ "کہ آپ یہاں تشریف رکھیں اور ذرا اطمینان سے اپنا جائزہ لیں۔ یہ پھٹی ہوئی اُنگی اور بھیگی ہوئی ساری۔ کیچڑ میں لت پت پاؤں۔ بال پریشان۔ بھیگے ہوئے چہرے سے چپٹے ہوئے۔ منہ پر ہوائیاں اُڑتی ہوئی۔ اب کوئی آپ کو چور اُچکا سمجھ لے تو کیا تعجب۔ اور اس طرح دن دہاڑے آپ ہمارے گھر میں گھس آئیں۔ نہ آپ سے جان نہ پہچان۔ آخر اس کے کیا معنی؟ مجھے تو شک ہوتا ہے کہ میری سب سے اچھی پینٹنگ جو میں نے بڑی محنت سے تیار کی تھی آپ ہی غائب کرنے گئی ہیں۔۔۔

میں بے کار ہی غریب نوکروں پر برس رہا تھا"۔ "ذرا زبان سنبھال کر بات کیجیے۔ آپ کا دماغ تو صحیح ہے"۔ میں نے واقعی غصّہ میں آکر کہا۔ "یہ آخر آپ مجھے یہاں زبردستی بٹھا لینے والے کون۔ میں جاتی ہوں"۔ اور میں اُٹھی ہی تھی کہ پھر دھم سے صوفے پر۔۔۔ "ٹھیرئیے"۔ وہ بولا۔ "مجھے ذرا آپ کا حُلیہ لکھنا ہے۔ افسوس ہے کہ میرا فون اِن دنوں بگڑا ہوا ہے ورنہ ابھی ابھی آپ پولیس کی حراست میں ہوتیں"۔ اور میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو چھلک پڑے۔ خدایا یہ کیا نئی مصیبت آن پڑی ہے "جانے دیجئے مجھے"۔ میں نے چیخ کر کہا۔ "لیکن آپ ابھی نہیں جا سکتیں"۔ "کیوں"۔ میں نے پھر چلاّ کر پوچھا۔ "بس اسی لئے کہ۔۔ کہ ہائیں آپ رونے لگیں۔ اجی جناب بس اسی بات پر مان لیجئے کہ لڑکیاں سخت بزدل ہوتی ہیں بے حد بزدل! نہ جانے وہ اتنے بڑے بڑے بہادر اور سورما پیدا کیسے کر دیتی ہیں۔ اچھا دیکھئے بُرا مت مانئیے۔ میں نے آپ کو روکا اس لئے ہے کہ ایسی حالت میں آپ گھر گئیں تو بخار۔ نمونیہ یقیناً نمونیہ ذرا دیر ستا لیجئے۔ حواس دُرست کر لیجئے۔ کپڑے سُکھا لیجئے۔ اور دیکھئے میرے کپڑے پہنیں گی آپ؟ بہتر تو یہی ہوتا۔ خواہ کیسی بھی لگیں۔ اِس لئے کہ یہ بھیگے ہوئے کپڑے نقصان"۔۔۔ "معاف کیجئے"۔ میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے ضرورت نہیں"۔ "اچھا میں ابھی آیا ایک منٹ میں"۔ اور وہ چلا گیا۔ میں نے سوچا موقع اچھا ہے نکل بھاگنے کا۔ مگر توبہ کیجئے اتنی مہلت ہی کیسے ملی۔ وہ ایک منٹ بھی آدھا منٹ ہو کر رہ گیا اور وہ پھر آ وارد ہوا۔ اور ساتھ ہی ایک نوکر ہاتھ میں کشتی لئے ہوئے "لیجئے گرم کافی کی ایک پیالی پی لیجئے"۔ "میں نہیں پیونگی"۔ "کیوں؟ پی لیجئے نا"۔ لیکن میں آپ کے گھر۔ یعنی کسی غیر کے گھر کافی کیوں پیوں آخر۔۔۔؟ اور وہ جو نیو انڈیا کافی ہاؤس میں اس قدر اطمینان سے کافی کی کئی کئی پیالیاں چڑھا جاتی تھیں آپ۔۔۔؟ میں ایک دم دھک سے ہو کر رہ گئی۔ تو کیا یہ مجھے جانتا ہے؟ "میں کہتا ہوں پی لیجئے"۔ اُس نے ذرا تیز آواز میں جیسے مجھے ڈانٹا۔ اور میں نے جلدی سے ایک پیالی اُٹھا لی۔ "آپ تو ہمیشہ کریم کے ساتھ کافی پیتی ہیں اِس لئے میں نے کریم منگوائی ہے ورنہ میں تو صرف دودھ ہی"۔ "لیکن یہ سب

آپ کیسے جانتے ہیں؟" عجیب سوال ہے۔ لیکن یہ سب جاننا مشکل کیا ہے"۔ اُس نے کہا۔ "شریف لڑکیوں کا تعاقب کرتے شرم نہیں آتی آپ کو؟" مجھے پھر غصہ آگیا۔ "ارے یہ آپ ذرا سی بات پر چراغ پا کیوں ہو جاتی ہیں۔ ابھی۔ ابھی کچھ دن ہوئے آپ سنو برے پکنک کے لئے گئی تھیں۔ گرجا میدان میں پھرتے ہوئے آپ کو پرسوں ہی میں نے دیکھا، اور کل آپ چارلس بوئر کی "گیس لائٹ" بھی تو دیکھنے گئی تھیں پرنس آف ویلز میں۔ روز ہی آپ کو مال پر چہل قدمی کرتے دیکھتا ہوں۔ تو اسکا مطلب یہ ہے کہ آپکی ہر نقل و حرکت کا جائزہ لیا کرتا ہوں میں — یعنی شریف لڑکیوں کا تعاقب۔ ٹھیک ہے نا؟" پھر وہ چپ ہو گیا اور میں کچھ عجیب چکر میں پڑ گئی۔ پھر بولا۔ "صاحب جہاں آپ جائیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہاں کے تمام دروازے دوسروں کے لئے بند کر دئے گئے ہیں۔ آپ بھی جاتی ہیں۔ ہم بھی گئے اور دیکھ لیا آپ کو۔"

"اچھا تو اب اجازت دیجئے" میں نے بڑی معصومیت سے کہا۔ مگر وہ بولا۔ "اجی بیٹھئے بھی۔ ابھی کہاں چلیں آپ" (گویا میں اس کی سب سے بے تکلف دوست ہی تو تھی) اُس نے پھر کہا۔ "اتنی گھبراہٹ کیوں ہے آپ کو آخر۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر میری جگہ اس وقت کوئی کتا یا بلی یا اسی قسم کا کوئی اور جانور بیٹھا ہوتا تو آپ ہرگز اتنا نہ گھبراتیں۔ میں کوئی کاٹے کھا رہا ہوں آپ کو؟ افسوس کہ دُنیا کی اخلاقی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ ہماری تہذیب۔ تمدن اور معاشرت کو گھن لگا جا رہا ہے۔ انسان انسان کو حیوان سے بھی بدتر سمجھتا ہے۔ خیر تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ آپ لڑکیوں کو یہ فرانسیسی ایکٹر چارلس بوئر اس قدر پسند کیوں ہے مرتی ہیں بس اُس پر۔ پیشانی کیا ہے جیسے سپاٹ میدان رکھا ہے جو ذرا سا ترچھا ہو کر اونچا ہوتا ہی چلا گیا ہے۔ چندیا پر گنتی کے بال۔ ٹیڑھی سی ناک۔ اور ہونٹ؟ دائیں یا بائیں گوشے کو عجیب طرح پھیلا کر اس طرح مسکراتا ہے کہ دوسرا گوشہ اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں۔ اور چھوٹی چھوٹی اُلو کی سی آنکھیں۔ لیکن ہائے ان ہی آنکھوں میں تو آپ کی اُمیدوں اور ارمانوں کی دُنیا بستی ہے۔" "بند کیجئے نا بکواس" میں نے اُکتا کر کہا۔ "آخر آپ مجھے جانے کیوں نہیں دیتے۔" "اچھا دیکھئے ایک تو اپنا نام بتا دیجئے اور پھر چلی جائیے" وہ شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "لیکن میں اپنا نام آپ کو بتانا ہرگز ضروری نہیں سمجھتی۔" "بہت اچھا۔ شاید آپ کو یہ نہیں معلوم کہ میں آپ کو جانتا ہوں اور آپ کے باپ کو بھی جانتا ہوں۔ کل ہی ان کے نام آپکی شکایتوں سے لبریز خط نہ روانہ کیا تو میرا نام بھی ڈاکٹر — مگر میں بھی اپنا نام آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ ہوں تو اب نہیں رحم آ ہی گیا۔ لے جائیے تشریف۔ مگر دیکھئے اپنے ابا جان کے نام اُس خط کا انتظار ضرور کیجئے گا!"

وہ یہ سب بکتا رہا اور میں سر پر پیر رکھکر بھاگی۔ دروازے سے نکل رہی تھی تو آواز آئی۔ "اور ہاں دیکھئے اگر آپ کو مونیہ ہو جائے تو مجھ ہی کو بلوائیے گا۔" مگر میں تو جیل سے بھاگے ہوئے کسی قیدی کی طرح وحشت زدہ دوڑی چلی جا رہی تھی۔ گھر پہونچی اور سیدھی اپنے کمرے میں پہونچ کر دھم سے پلنگ پر گر پڑی۔ میرے اللہ یہ کتنی نئی بات ہوئی تھی میری زندگی میں۔ عجب اتفاق تھا۔ ایک ہی آدمی کے دو مکان۔ بالکل ایک ہی طرز کے بنے ہوئے۔ میں گھبراہٹ کے عالم میں اپنا گھر سمجھ کر گھسی ہی چلی گئی۔ ایک اجنبی شخص۔ کس قدر عجیب طرح سے بول رہا تھا مجھ سے۔ اور — لیکن اتنے میں ستارہ دوڑی آئی — "باجی کہاں تھیں آپ۔؟ باجی زیور اور باجی خورشید وغیرہ آپ کا انتظار کرتے کرتے اپنے گھر چلی گئیں۔" میں تو دوسرے راستے سے شمو کے گھر چلی گئی تھی نا۔ اس لئے دیر ہو گئی۔" میں نے کسی طرح بات ٹالی۔ دوسرے دن زیور اور خورشید وغیرہ نے بھی آکر میری خوب ہی خبر لی۔ "سیدھی طرح ٹھیک ٹھیک بتا دے سُو، ورنہ" دل تو چاہا کہ سب کچھ سُنا ڈالوں مگر پھر خیال آیا کہ ایک آفت ہیں سب۔ نے اُڑیں گی اور پھر میری کچھ سُنیں گی تھوڑی۔ خیر بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر مجھے اُس خط کا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ اُدھر چپراسی نے لاکر ابا جان کو ڈاک دی اور میرا حلق سوکھا۔ ایک روز شام کی خوبصورتیوں سے متاثر ہو کر میں ذرا دُور نکل گئی۔ ذرا دیر بعد باغ سے زینیا اور داؤدی کے پھول توڑ کر لائی اور ڈرائنگ روم میں پہونچ کر پھولدان اُٹھایا ہی تھا کہ ابا جان ایک نیلا لفافہ ہاتھ میں لئے ہوئے دکھائی دئے۔ اور سیدھے امی کے کمرے میں۔ میرے اوپر جیسے بجلی گر پڑی کہیں سچ مچ

تو اُس نے میری جھوٹی سچی شکائتیں ہیں لکھ بھیجیں۔ عجیب پاگل سا انسان ہے۔ اس سے کیا بعید۔ کھڑکی میں کان لگا کر سنا تو ابّا جان کہہ رہے تھے "اُس نے چائے کی دعوت منظور کرلی ہے۔ اب آتا ہی ہوگا۔ مگر آپ خورشید وغیرہ کے ذریعہ سے لڑکی کا منشا جلد ہی لے لیجئے۔ میں اُسے بہت جلد کوئی خاطر خواہ جواب دینا چاہتا ہوں۔ ممکن ہوا تو آج ہی —— لیکن اتنے میں مجھے محسوس ہوا کہ میری بائیں کنپٹی کے پاس جو بالوں کا ننھا سا حلقہ رکھا رہتا ہے اپنے آپ ہی ہلنے لگا ہے اور پھر جیسے کسی کا گرم گرم سانس اور کچھ جانی پہچانی سی خوشبو —— میں نے پلٹ کر جو دیکھا تو اُچھل کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گئی۔ "اوہ — آپ؟ لیکن آپ یہاں کیسے آ گئے۔ نکل جائیے ہمارے گھر سے ابھی ابھی۔ اسی وقت۔" اور اتنے میں ابا جان آگئے۔ بولے "آ گئے آپ؟ آئیے تشریف رکھئے"۔ "جی ہاں معاف کیجئے گا میں ذرا وقت سے پہلے آگیا ہوں۔" وہ کنکھیوں سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ اور پھر جو میں بوکھلا کر بھاگی ہوں تو اپنے پلنگ پر ہی جا کر دم لیا۔ میرے خدا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ جسے میں چپکے چپکے اپنے دل میں جگہ دے رہی تھی وہ سچ مچ ہی اُس پر قابض ہونے والا ہے۔

مطبوعاتِ ساقی بُک ڈپو دہلی

شیر محمد اختر کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ۔ اختر کے افسانے

سائے:- زندگی کی تصویر ہوتے ہیں۔ طرزِ بیان نہایت دلکش اور کہانی نہایت مؤثر ہوتی ہے۔ قیمت عہ/

شمشیر سنگھ نرولا کے بارہ افسانوں کا مجموعہ نرولا

جالے:- جزئیات نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتے، وہ ایک ماہر سائنٹسٹ کی طرح باریک سے باریک اور خفیف سے خفیف جزئیات کا تجزیہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ قیمت عہ/

سید رفیق حسین مرحوم نے وحشی اور گھریلو

آئینۂ حیرت:- جانوروں کے خصائل و شمائل افسانے کے پیرایہ میں پیش کرکے ایک انوکھی طرز کی کہانیاں لکھی ہیں۔ یہ مجموعہ ایسی ہی آٹھ کہانیوں کا قابلِ قدر مجموعہ ہے۔ قیمت دو روپے۔

محمود جالندھری

غزل

اُٹھے نہ جو حجابِ نظر حُسن ہو گئے
جو اُٹھ گئے وہ اپنا بھرم آپ کھو گئے

جنّت سی پیشکش کے تعیّش کے باوجود
ہونے جو تھے گناہ، بہر حال ہو گئے

جلوہ گہِ جہاں کی ہوائیں ہیں تھپکیاں
فتنے ہزار رنگ کے اُٹھ اُٹھ کے سو گئے

مانا کہ ہم سمجھ نہ سکے مقصدِ حیات
صبر و رضا کا کھیل مگر کھیل تو گئے

پہنچے کہاں کہاں ترے آشفتہ جمال
پھولوں میں غرق ہو گئے تاروں میں کھو گئے

امین حزیں

بیادِ پیرِ ہندی علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ

زمیں بدل کے رہی آسماں بدل کے رہے
تری نگاہ جو بدلی جہاں بدل کے رہے

جو ابتدا ہیں سکھائی تھی تو نے اے صیّاد!
ترے اسیر وہ طرزِ فغاں بدل کے رہے

نوائے طائرِ لاہوت[۱] کی ہے یہ تاثیر
چمن وہی ہے مگر باغباں بدل کے رہے

یہ انقلاب مبارک ہو اہلِ کشتی کو
کہ وقتِ نوح کے سب بادبان بدل کے رہے

مہارِ ناقۂ لیلا ہے دستِ مجنوں میں
غبارِ دشت اُٹھے ساربان بدل کے رہے

ہیں آشیاں بھی وہی شاخسار بھی ہیں وہی
درِ چمن کے جو تھے پاسباں بدل کے رہے

اذانِ فجر سُنا دی ہی صبح صادق کی
نمودِ مہرِ یقیں سے گماں بدل کے رہے

خدا کرے کہ ابھی اور رہو جواں ہمت!
وہ پیر[۲] جس کی نگہ سے جواں بدل کے رہے

عطا جنہیں بھی ہوئی دولتِ خرد آگاہی
امیںؔ وہ سود سے اپنا زیاں بدل کے رہے

[۱] علامہ اقبال مرحوم [۲] قائداعظم حضرت محمد علی جناح؟

طاہرہ دیوی شیرازی

بجلی کا لفٹ

زندگی میں پہلی مرتبہ وہ اپنے اصولوں کو توڑ کر جذباتِ عز و نخوت کو پامال کر کے اپنے عاشق سے ملنے چلی گئی —— وہ عاشق جو اس کی نگاہ میں جنسِ قوی کے تمام افراد سے زیادہ پیارا، حسین، دلکش اور دلنشیں تھا۔ جس کی سچی محبت کی وہ دل و جان سے معترف تھی۔

دُنیا میں اس نے سینکڑوں مرد دیکھے تھے، ہزاروں انسانوں سے اسے واسطہ پڑا تھا، لیکن جو خوبیاں اسے رمیش میں نظر آئیں، وہ اس کے خیال کے مطابق کسی دوسرے میں موجود نہیں تھیں۔

اس وقت جب وہ چلی جا رہی تھی، اس کا دماغ ہلکا تھا لیکن پاؤں وزنی ہو چکے تھے۔ ہر پاؤں ایک من سے بھی زیادہ بھاری تھا۔ اس کے باوجود وہ قدم اُٹھاتی چلی ہی گئی اور سوچ کی نگری میں گم رہی —— اس کا خیال اس سے دس قدم آگے بڑھا چلا جا رہا تھا۔

رمیش شادی شدہ تھا اور وہ بھی کنواری نہیں تھی، لیکن دونوں اپنے اپنے جیون ساتھیوں سے بیزار تھے —— اتنے بیزار کہ ایک دوسرے کو چھوڑ دینے کے لئے بالکل تیار تھے۔ رسم و رواج کی پھیلائی ہوئی پگڈنڈیوں کو چھوڑ کر وہ دوش بدوش ایک نئے راستے پر گامزن ہو جانا چاہتے تھے۔ ایک ایسے راستے پر جو ان تنگ گذرگاہوں سے زیادہ وسیع، استوار اور پُرفضا معلوم ہوتا تھا —— اور پُرفضا ہی نہیں، رنگین و دلنواز بھی کیونکہ وہ دونوں جوان تھے، نشۂ شراب میں چور اور بُری طرح بدمست اور بس اسی کیف و سرور کے زیرِ اثر وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے جا رہے تھے۔

انہیں یقین تھا کہ اس راستے پر جسے وہ اختیار کر رہے ہیں، ان منحوس اور بے رنگ پگڈنڈیوں کی طرح سماج کے پُردرد کانٹوں اور قوانینِ ملک کے ڈھالے ہوئے تیروں سے واسطہ نہیں پڑے گا۔ اُلجھا لینے والی ہر چیز سے دامن بچاتے گذرتے رہیں گے، اور اس طرح اس منزلِ مقصود کو پالیں گے جہاں تصوّرات کے بسائے ہوئے من مندر میں ان کے خیالی دیوتا کی مورتی رکھی ہوگی۔ وہاں پہنچ کر وہ اس دیوتا کی پوجا کی آڑ لیتے ہوئے خود ایک دوسرے کی پوجا کرنے لگیں گے۔

ایسے ہی خیالات دل میں لئے وہ بمبئی کے مشہور تاج محل ہوٹل کے صدر دروازے تک گئی اور بجلی کے لفٹ میں بیٹھ کر پانچویں منزل پر جا پہنچی جس کے پُرتکلّف کمروں اور برآمدوں سے نیلگوں مٹیالے سحرِ ہند کی لاانتہا وسعتوں کا نظارہ کیا جا سکتا تھا، جہاں سے سمندر اور آسمان کے کنارے افقِ بعید پر خونِ دلِ معصوم سے زیادہ سرخی مائل شفق کے زیرِ سایہ آپس میں اس طرح ملے نظر آتے تھے جیسے دو محبّ و محبوب کے مرتعش لب گرمیٔ محبت سے رقص ہو کر ایک دوسرے میں مدغم ہو جانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

جب اس نے گیارہ نمبر کے کمرے کے کواڑ آہستہ سے کھول کر مخمل کا رنگین پردہ ہٹایا اور دہلیز پر پاؤں رکھا تو اس کے سارے بدن میں بجلی کی ایک تیز لہر سی دوڑ گئی۔ وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ اس نے ایک لمحے کے لئے چاہا کہ اب بھی لوٹ جائے مگر یہ تو ماؤف دماغ کا مشورہ تھا، دھڑکتے ہوئے دل نے اس کا دامن تھام لیا۔ اس کے دونوں پاؤں ایلورا کے غار میں بنے ہوئے صدیوں پرانے دو ستونوں کی طرح جامد و ساکت ہو کر رہ گئے —— وہ نہ آگے بڑھ سکی —— پیچھے ہٹ سکی۔

رمیش نے آہٹ سُنتے ہی اپنی نظر اُٹھا کر دیکھا۔ اتنی گہری نظر سے دیکھا جو لاشعاعوں کے اثر سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ نفوذ کرتی جسم کے پار ہو جاتی ہے۔ رکمنی کے سینے میں چھپے ہوئے دل کی ضربات میں اور بھی اضافہ ہونے لگا۔ اور بجلی کی تیز روشنی کے باوجود اسے کمرے کی ہر چیز کہر میں ڈوبی ہوئی دُھندلی سی دکھائی دینے لگی، کچھ اس طرح جیسے سینما کا رنگین فلم مسلسل دیکھتے رہنے سے ضعفِ بصر کے مریضوں کی آنکھوں میں پانی کے ننھے ننھے قطرے اُمنڈ آئیں!

اور کچھ دیر کے لئے ان کی تماش بینی کے دلچسپ مشغلے میں رخنہ پیدا ہو جائے۔

اس نے فوراً قریب رکھی ہوئی کرسی کا سہارا لے لیا کیونکہ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اب لفٹ ہرجائی نکلی ہوئی ٹانگوں میں باقی جسم کو سنبھالے رکھنے کی سکت باقی نہیں ہے۔
رمیش سوچ کی نگری میں کچھ دیر کھوئے رہنے کے بعد مسکرایا لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اُٹھ کر اس کے قریب آیا اور اپنے آغوش میں لے کر اسے بہت زور سے بھینچ لیا۔

وہ دونوں دفورِ مسرت سے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔
مرد کی ہنسی بلند، بیباک، نڈر اور پُرجوش تھی ــ عورت کی ہنسی مدھم، محتاط، خوفزدہ اور مضمحل تھی۔ مرد چاہتا تھا کہ اس کی ہنسی کو ساری دُنیا سُن لے۔ عورت نہیں چاہتی تھی کہ اس ہنسی کو خود اس کے کان بھی سُن سکیں۔ مرد کے پیشِ نظر صرف حال کی رنگینیاں تھیں، اور عورت کی نگاہ کے سامنے مستقبل کی تاریکیاں۔

بغل میں ہاتھ ڈال کر رمیش اسے اپنی کرسی کے قریب لے گیا اور زانو پر بٹھا کر بولا:-

"کیا ارادے ہیں رکمنی! کچھ منہ سے تو بولو"

اور جب رکمنی کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکل سکا تو وہ خود ہی کہنے لگا:-

"میں نے ستیا کو خط لکھ دیا ہے کہ جیون کے وہ بندھن جو پنڈت نے اپنی پوتھی کھول کر الاؤ کے قریب باندھے تھے، اب کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ چکے ہیں۔ آئندہ کے لئے ہم دونوں کے راستے جُدا جُدا ہیں۔ میں اپنی منزل کی تلاش میں چل پڑا ہوں۔ تم بھی چاہو تو کوئی دوسری نگری بسا لو۔ بس یہی لکھ دیا ہے۔ اور اب تم بتاؤ کہ تم نے کیا کیا؟"
رکمنی کے لب کپکپائے:-

"خط تو اسی مضمون کا میں نے بھی ساگر کے نام لکھ لیا ہے مگر ڈالا نہیں۔ ذرا سی جھجک ہے۔ سوچ رہی ہوں کہ انجام بُرا نہ ہو"

"ہشت! انجام کی خبر بھگوان جانے"۔ رمیش نے ذرا سنجیدگی سے کہا۔ "اِدھر لاؤ وہ خط۔ میں خود ہی باہر نکل کر ڈال دوں گا"۔

۔ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ بوتل اور گلاس کی طرف بڑھایا۔ ایک بوتل کھل چکی تھی اور ختم ہونے کے قریب تھی۔ دوسری سر بہ مہر برابر کے صوفے پر پڑی تھی۔ اُس نے پہلا جام رکمنی کی طرف بڑھایا وہ پہلے تو ہچکچائی، کچھ قدر گھبرائی، لیکن پھر مجبور ہو کر پی گئی۔

جوں جوں جام خالی ہوئے، نشہ تیز ہوتا چلا گیا۔ دونوں پینے لگے۔ ایک دوسرے کو پلانے لگے۔ تن بدن کا ہوش باقی نہ رہا۔ رکمنی کے لئے یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ پھر بھی عورت تھی کمزور دل کی عورت، اس لئے بہت جلد مدہوش ہو گئی۔ رمیش پہلے سے پی رہا تھا، پہلے ہی سے نشے میں چُور تھا، اس لئے وہ بھی اسی سطح پر آ گیا۔

دونوں ایک مصمم ارادے کے ساتھ اُٹھے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باہر نکل گئے۔ بجلی کا لِفٹ سامنے تھا۔ رمیش نے گھنٹی دبائی اور جب وہ سامنے آ کر رُکا تو دونوں اس میں جا بیٹھے۔ گدیلے والی نرم تپائی ان کی رانوں کے نیچے نہایت سخت محسوس ہونے لگی کیونکہ سروں کے سوا ان کے باقی جسم پھولوں کی مانند ہلکے پھلکے اور نازک ہو گئے تھے۔
"غوں غوں" کی ایک ہلکی گونج کے ساتھ لفٹ منزل زیریں کی جانب اُترنے لگا۔

رمیش نے ایک بار پھر رکمنی کو اُٹھا کر اپنے زانو پر بٹھا لیا اور آغوش میں کھینچ لیا، اس قدر زور سے کہ وہ اس جذبۂ فشار کی تاب نہ لا کر آہستہ آہستہ سسکاریاں سی بھرنے لگی۔
پھر رمیش نے اپنے لب ــــ وہ لب جو شراب سے ابھی تک بھیگے ہوئے تھے اُس کے لبوں پر رکھ دئے۔ کیفیتِ سُکر ایک دم اتنی تیز ہو گئی کہ شاید دس بوتلوں کا نشہ بھی اتنا اثر پیدا نہ کرتا۔ اب وہ جام و مینا کے بغیر ہی پیے گئے تھے۔
"غوں غوں" کی ایک ہلکی گونج کے ساتھ لفٹ منزلِ زیریں کی جانب اُترتا رہا۔

"میرے من مندر کے دیوتا!" رکمنی نے جھُوم کر کہا۔ "وہ نگری بھی کتنی سُندر ہوگی جسے بسانے کے لئے ہم دونوں چل پڑے ہیں۔ بھگوان کرے کہ ہم جلدی ہی اُس تک پہنچ جائیں۔ سچ پوچھو تو ہم وہیں رہ کر پریم کا صحیح مطلب سمجھ سکیں گے جیون کی وہ کٹھن گھڑیاں جنہیں بیاہ کے بعد سے اب تک برتی

مشکل سے گذار رہی ہوں، تمہارے چرنوں میں رہ کر سکھ اور شانتی میں بدل جائیں گی۔ کیوں رمیش! کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

رمیش نے الفاظ کی بجائے ایک طویل لو سے اس سوال کا جواب دیا ــــ اور "غوں غوں" کی ایک طویل گونج کے ساتھ لفٹ منزلِ زیریں کی جانب اُترتا رہا۔

"بہت ہی اچھا ہوا کہ تم وقت سے پہلے آگئیں" رمیش نے بیتابی کے ساتھ رکمنی سے لپٹ کر کہا۔ "اگر ذرا بھی دیر ہو جاتی تو میں آپے سے باہر ہو چکا ہوتا۔ ہزاروں قسم کے شبہات پیدا ہو رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں خیالوں کے محل تعمیر کر کر کے خود ہی ڈھا رہا تھا۔ تم بتاؤ کہ ساگر سے کیا کہتی۔ چلتے وقت اس سے کوئی گفتگو ہوئی یا نہیں؟"

"کیوں نہ ہوتی" رکمنی نے ذرا الگ ہو کر کہا۔ "لباس کی تبدیلی کے وقت اس نے پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے۔ حقیقتاً اس لئے کہ میں یہ جوڑا بہت ہی کم موقعوں پر پہنتی ہوں۔ اس کا رنگ کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ڈیزائن بھی اچھا ہے۔ تم نے کئی بار اس کی تعریف کی ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا رمیش؟"

"ہاں بالکل ٹھیک"۔ اس نے پھر رکمنی کو اپنی طرف کھینچ کر کہا۔ "تمہارا حسن ایک تو ویسے ہی مثالی ہے، پھر اس اس پوشاک کی چمک دمک اسے چار چاند لگا کر تمہیں ایک ایسی سُندر ہستی میں تبدیل کر دیتی ہے جس کا مادی وجود اس دُنیا میں ممکن تو نہیں البتہ اس کا جلوہ صرف موسمِ بہار کی سُہانی راتوں میں دیکھے ہوئے کسی پیارے سپنے میں نظر آجاتا ہے۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ ساگر کے سوال کا کیا جواب دیا؟"

"بھلا اور کیا جواب دیتی" وہ تیوری پہ بل ڈال کر ذرا حقارت سے بولی۔ "میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں جا رہی ہوں جہاں میرا من مجھے لئے جا رہا ہے۔ تم پوچھنے والے کون۔ میں اس گھر کی چار دیواری میں ایک قیدی کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ وہ یہ سُن کر بھونچکا سا رہ گیا اور میں جتنی دیر لباس بدل کر سنگھار کرتی رہی، خاموش بیٹھا مجھے گھورتا رہا۔ نہ جانے کیا کیا خیالات اس کے دل میں آئے ہونگے!"

ایک طویل قہقہہ لگانے کے بعد رمیش نے اپنے لب رکمنی کے لبوں کے ساتھ پیوست کر دیئے اور "غوں غوں" کی ایک ہلکی مسلسل گونج کے ساتھ لفٹ منزلِ زیریں کی جانب اُترتا رہا۔

"جب میں ہر طرح سے تیار ہو کر گھر سے باہر نکلنے لگی" رکمنی بولی۔ "تو اس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر بُری طرح دبا لئے، اس قدر سختی کے ساتھ کہ اس کی تکلیف ابھی تک محسوس ہو رہی ہے۔ اُف! تم نہیں جانتے رمیش! وہ کس قدر اُجڈ، اکھڑ اور گنوار قسم کا انسان ہے۔ میں اس کے ساتھ اب تک بمشکل گذارہ کر سکی ہوں۔ کوئی بھی معقول عورت اسے اپنا پتی بنانا گوارا نہیں کریگی۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میں ہاتھ چھڑا کر باہر نکل گئی۔ وہ ضرور بیکار قسم کی گفتگو شروع کر دیتا، میرے الفاظ کی تفصیل معلوم کرنی چاہتا مگر میرے دلائل کو کبھی قیامت تک بھی نہ سمجھ سکتا۔ وہ نہایت غیر منطقی، غیر مدلل اور بے معنی باتیں کرنے کا عادی ہے۔ مجھے اس کی کٹ حجتی بالکل پسند نہیں۔ اس کی بکواس سے میرا دم اُلٹنے لگتا ہے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ آغازِ گفتگو کا موقعہ دئے بغیر وہاں سے کھسک جاؤں۔ بس مناسب یہی تھا۔ تمہاری کیا رائے ہے رمیش؟"

"بالکل ٹھیک کہتی ہو رکمنی" رمیش نے ہمدردی کے طور پر اس کے سر کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "تم نے زندگی کے دو سال اس پاجی کے ساتھ گذارے ہیں۔ اس کے گدھے پن کو خوب سمجھتی ہو۔ اس کے مُنہ نہ لگنا ہی بہتر تھا۔ شیلا بھی کچھ ایسی ہی اوٹ پٹانگ گفتگو کرتی ہے۔ معقولیت کی بات کبھی اُس کے دماغ سے پیدا نہیں ہوتی۔ وہ جہالت کا مجسمہ اور بے وقوفی کی پوٹ ہے۔ میرا خیال ہے تمہارے ساگر کی شادی میری شیلا کے ساتھ ہونی چاہیئے تھی۔"

"ذرا اپنے جملے کو درست کر لو رمیش" رکمنی نے ایک ادائے خاص کے ساتھ مُسکرا کر کہا۔ "اب نہ وہ میرا ساگر ہے اور نہ وہ تمہاری شیلا۔ سچ پوچھو تو ہمیں ان دونوں سے کیا واسطہ رہا۔ اب تم میرے ہو اور میں تمہاری ہوں۔"

رمیش نے رکمنی کے لبوں سے لذتِ اِستشمام حاصل کرتے ہوئے اس رائے کی تائید کی اور "غوں غوں" کی ایک ہلکی مسلسل گونج کے ساتھ لفٹ منزلِ زیریں کی جانب اُترتا رہا۔

"تم قابلِ رحم ہو رکمی۔ رمیش نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

سچ کہتے ہو رمیش" وہ لمبی ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ میں نے پچھلے دو سال بڑی مصیبت کے ساتھ گذارے ہیں۔ بھگوان ایسی بپتا کسی دشمن پر بھی نہ ڈالے۔ اس کا صحیح تصور کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آ سکتا۔ لیکن جیر شکر ہے کہ میرے جذبات کی قدر کرنے کے لئے تم مجھے مل گئے۔ اب یقین ہے کہ میری زندگی اس طرح بدل جائے گی جیسے پارس پتھری کے لگتے ہی لوہے کا ٹکڑا سونے کا روپ اختیار کر لیتا ہے"۔

"لیکن" رمیش چھیڑنے کے انداز میں بولا "یہ فیصلہ کرنا محال ہے کہ درحقیقت پارس کون ہے۔ تم یا میں۔ کیونکہ خود مجھے بھی یہ یقین ہے کہ تمہاری محبت کی جادو اثری سے میری زندگی کی کایا پلٹ جائے گی"۔

"جیون ساتھی ہونے کا صحیح مفہوم یہی ہے رمیش"! رکمنی نے جذبات مسرت سے بے قابو ہو کر کہا اور پہلی دفعہ نسوانی شرم و حیا کی فطری حدود کو توڑ کر اپنے لب رمیش کے لبوں سے ملا دئے اور "غوں غوں" کی ایک ہلکی مسلسل گونج کے ساتھ لفٹ منزلِ زیریں کی جانب اُترتا رہا۔

اور جب دفورِ جذبات سے پھول جانے والا سانس ٹھیک ہوا اور قوتِ گویائی دوبارہ قابو میں آ گئی تو رکمنی نے دیر تک رک رک کر خیالی دنیا کے مزے لینے شروع کئے۔ وہ بولی۔

"کتنی پُرلطف ہو گی ہماری زندگی اس شاعرانہ فضا میں جہاں کائنات کا ہر ذرّہ ترجمانِ شباب ہوتا ہے، جہاں پھولوں کا تبسم اور چڑیوں کا ترنم دعوتِ رقص دیتا ہے، جہاں چشمے کی روانی اور نسیم سحر کی کہانی نغمہ مجسم بنکر سُنائی دیتی ہے۔ جہاں تاروں کے نور اور چاندنی کے سرور سے دل و دماغ دونوں روشن ہو جاتے ہیں اور جہاں ۔"

"اور یہ سب کیفیات" رمیش نے بات کاٹ کر کہا "صرف میرے اور تمہارے لئے مخصوص ہونگی۔ اس دُنیا کے انسان ہی نہیں، آسمان کے فرشتے بھی ہمیں رشک کی نگاہوں سے دیکھنے لگیں گے"۔

"اور" رکمنی مائیدی اضافہ کرتے ہوئے بولی "جس طرح پاربتی مہیشور کی گود میں لیٹی کوہستان کی چوٹیوں کی سیر کرتی پھرتی ہے، میں بھی تمہارے آغوشِ محبت میں تمہارے اعضا کا ایک لوچ بن کر، بالکل اسی طرح جیسے اب موجود ہوں، ان لطافتوں اور رعنائیوں کے مزے لیتی رہونگی"۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی ان کے لب ایک بار پھر مل گئے حتیٰ کہ اسی طرح کچھ دیر تبادلۂ صہبا کرتے رہنے کے بعد جب ان کے اعضا کی وہ غیر اختیاری تھرتھری جو غلبۂ نفسانیت کے باعث تھی، مائل بہ سکون ہو گئی، جب دماغ کے اندر روتی پھولوں بر چڑھا ہوا ابخارا اتر گیا اور جب جنسی پکار کا جوش ٹھنڈا ہو گیا تو ان کے ہوش و حواس کسی قدر ٹھکانے آئے اور انہوں نے گردوپیش کے ماحول کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ایک ہلکی قوت کا برقی قمقمہ ان کے سروں پر روشن تھا اور "غوں غوں" کی ہلکی مسلسل گونج کے ساتھ لفٹ منزلِ زیریں کی جانب اُترتا جا رہا تھا۔

"آخر اس کا مطلب؟" رمیش نے رکمنی کو اپنے آغوش سے الگ ہٹا کر کہا "آخر یہ لفٹ ٹھیرتا کیوں نہیں؟ ہمیں اس پر سوار ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے۔ منزلِ زیریں اب تک آ جانی چاہیئے تھی"۔

"ہاں۔ میں بھی یہی سوچ رہی ہوں"۔ رکمنی نے تائید کرتے ہوئے کہا "پانچویں منزل سے نیچے تک اُترنے میں پورا ایک منٹ بھی نہیں لگتا اور اب تو کافی دیر ہو چکی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کوئی خرابی ہو گئی ہے"۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا" رمیش نے کسی قدر غور و خوض کے بعد کہا "کل پُرزوں میں خرابی ہو جانے کی صورت میں بھی اسے کہیں نہ کہیں رُک جانا چاہیئے تھا۔ یہ تو برابر منزلِ زیریں کی جانب اُتر رہا ہے"۔

"اس کی مسلسل گونج میرے کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی ہے۔ بھگوان کے لئے رمیش اسے کسی نہ کسی طرح روکو، ورنہ میرا سانس رُک جائیگا۔ میں زندہ نہیں رہ سکونگی"۔

رمیش نے پوری قوت کے ساتھ اس گھنڈی کو دبانا شروع کیا جو چلتے ہوئے لفٹ کو روکنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ مگر بے سود۔ اس کی جسمانی طاقت جس کا جوش و خروش ضرورت سے زیادہ استعمال ہو چکنے کے باعث تقریباً ختم ہو چکا تھا، پورا زور لگانے کے باوجود اسے ٹھیرا نہ سکی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر سب طرف دیکھا کہ شاید کوئی اور ایسی چیز نظر آ جائے جسے تھام لینے یا گھما دینے سے کام بن جاتے مگر چھوٹے سے

قمقمے کی مدہم روشنی میں کچھ بھی دکھائی نہ دے سکا۔ وہ مختصر سا معلق کمرہ جو بجلی کے موٹے رسوں کے سہارے اتر رہا تھا، ان کے لئے کال کوٹھری بن گیا۔ انہیں محسوس ہوا کہ اس کی چاروں دیواریں آہستہ آہستہ کھسک رہی ہیں اور چھت بھی نیچی ہوتی جا رہی ہے۔ اگر یہ حالت قائم رہی تو بہت جلد وہ ان کے درمیان پِس کر اور دب کر اس طرح فنا ہو جائیں گے جیسے اناج چکی کے پاٹوں میں پس کر رہ جاتا ہے۔

"ہائے میرا دم گھٹ رہا ہے رمیش!" رکمنی نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"اور میں جیسے بڑی خوشگوار فضا میں اطمینان کا سانس لے رہا ہوں!" رمیش نے طنزاً کہا۔ "میری حالت تم سے بھی زیادہ خراب ہے۔ تم اس وقت سے بے حس لاش کی طرح تپائی پر بیٹھی ہو۔ واقعات کی اونچ نیچ پر غور کیوں نہیں کرتیں۔ اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے ذرا میری طرح دماغ پر زور دو۔ شاید کوئی تدبیر سمجھ میں آ سکے!"

"رمیش پیارے!" رکمنی نے مضمحل تبسم کے ساتھ دلاسا دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری موجودگی میں میرا دماغ تمہارے دماغ سے الگ ہو کر کوئی بات سوچ نہیں سکتا۔ کیونکہ آج سے ہم دونوں درحقیقت دو قالب اور ایک روح ہو چکے ہیں!"

"چھوڑو اس شاعرانہ طرزِ گفتگو کو!" رمیش نے ذرا جھلا کر کہا۔ "رکمنی! کچھ عملی دنیا کی باتیں کرو۔ وقت کی نزاکت ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ میں اپنے کئے پر حد درجہ پشیمان ہوں۔ وہ نہایت منحوس گھڑی تھی جب میں تمہارے ساتھ اپنے کمرے سے نکل کر اس لفٹ پر سوار ہوا۔ یہ لفٹ جو کسی طرح بھی رُکنے کا نام نہیں لیتا!"

اس نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے اپنا پاؤں چوبی فرش پر مارا۔ ہلکا سا دھماکا ہوا۔ لیکن یہ دھماکا لفٹ کی اصل آواز پر حاوی نہ ہو سکا۔ "غوں غوں" کی ایک ہلکی مسلسل گونج کے ساتھ وہ برابر منزلِ زیریں کی جانب اُترتا جا رہا تھا۔

"رمیش!" رکمنی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "اگر تم اپنے کئے پر واقعی پشیمان ہو تو ابھی اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے اسی جگہ مرنے کے لئے تنہا چھوڑ دو۔"

"لیکن جاؤں کس طرح؟" رمیش نے جز بز ہو کر کہا۔ "اس بلائے ناگہانی سے بچ نکلنا ہی تو مشکل ہے۔ ذرا سی دیر کے لئے تمہارا دامن پکڑ کر ہمیشہ کے لئے قید ہو گیا ہوں۔ اور پھر یہ عجیب و غریب قید جو حبسِ دوام سے بھی زیادہ سخت ہے۔ درحقیقت ہم دونوں گنہگار ہیں اور ہمارے گناہوں کی سزا ہمیں اس صورت میں مل رہی ہے!"

"بے شک تمہارا خیال ٹھیک ہے!" رکمنی بولی۔ "اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تم اپنی بیوی سے بے وفائی کر رہے ہو۔ اور میں اپنے شوہر سے۔ ان دونوں کی زندگی برباد کر کے ہم اپنے جیون سدھار نہیں سکتے۔ اچھے ہیں یا بُرے۔ ہمارے جیون ساتھی مرتے دم تک کیلئے ہمارے شریکِ حیات ہیں۔ سکندر سے بے وفائی کر کے خضر نے آبِ حیات پا لیا لیکن وہ گذرے ہوئے دنوں کی بات ہے۔ اس زمانے کا رنگ ڈھنگ نرالا اور دستور جُدا ہے ہم اپنے ساتھیوں کو آدھے راستے میں چھوڑ کر آخری منزل تک نہیں پہنچ سکتے!"

"بہت خوب!" رمیش بگڑ کر بولا۔ "یہ سب باتیں تمہارے دماغ میں پہلے کیوں نہیں آئیں؟ کیا اس سے پہلے اس کھوپڑی میں بھوسہ بھرا ہوا تھا؟"

"بھوسہ بھرا ہوا نہیں تھا رمیش!" رکمنی نے الفاظ پر زور دے کر کہا۔ "تمہارے رنگین الفاظ کے جادو سے دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ قوتِ امتیاز زائل ہو چکی تھی۔ دل کی وہ کسوٹی جس پر کھرے اور کھوٹے کو پرکھا جا سکتا ہے معمولی پتھر بن کر رہ گئی تھی۔ شکر ہے کہ میری آنکھیں وقت سے پہلے کھل گئیں!"

"اور میں بھی اس خواب سے چونک پڑا ہوں جس کا بظاہر سُہانا اور شیریں ماحول تمہارے حسنِ سحر آگیں سے پیدا ہو گیا تھا۔ تمہارے اس حسن سے جو شاید ہزاروں مردوں کو فریب رنگ و بو دے کر ان کے قدموں کو جادۂ وفا سے ہٹا چکا ہے!"

"چُپ رہو رمیش!" رکمنی کا غصہ حدِ اعتدال سے بڑھ گیا "تم مجھے بُری طرح ورغلا کر اب میری توہین بھی کر رہے ہو۔ تمہیں اپنی زبان کو لگام دینی چاہیئے!"

"نہیں، اب میں خاموش نہیں رہ سکتا!"

"خاموش نہیں رہ سکتے تو پھر بولو، چیخو، چلاؤ، ایک دیوانے اور پاگل کی طرح غل مچاؤ، باؤلے کتے کی طرح بھونکو، خوب بھونکو، اور مر جاؤ!"

رمش جس کے اعضا میں غیظ و غضب کے باعث تشنجی کیفیت پہلے ہی سے پیدا ہو چکی تھی، ان الفاظ کو سن کر بے قابو ہوگیا۔ اس نے انتہائی غصّے کی حالت میں اپنا ہاتھ اُٹھایا اور کس کر ایک گھونسہ رکمنی کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ لفٹ کے تمام کل پرزے چرچرائے، بجلی کے تاروں کی مضبوط رسیاں تھرتھرائیں، مختصر سے قمقمے کی روشنی اور بھی زیادہ مدھم ہوگئی اور وہ دونوں ایک دوسرے کی نگاہوں کے سامنے دھندلے سے ہیولے بن کر رہ گئے۔

عین اس وقت ایک دھچکا سا محسوس ہوا اور بجلی کا لفٹ منزلِ زیریں تک پہنچ کر رُک گیا۔ خود بخود دروازہ کھُلا۔ سامنے دو مرد و عورت اوپر کی کسی منزل میں جانے کے لئے لفٹ کے انتظار میں بیتاب کھڑے تھے۔

مرد کا نام ساگر تھا اور عورت کا نام شیلا۔ وہ حد درجہ مغموم تھے اور ضرورت سے زیادہ اُداس — جیسے دونوں کسی کی تلاش میں کھوئے ہوئے ہوں۔

خانم
مرزا عظیم بیگ چغتائی کی بہترین تصنیف ہے۔ اس دلچسپ اور دل رس کتاب کا ہر ایک باب ایک چمکتا ہوا مزاحیہ افسانہ ہے۔ ہر افسانہ ایک علیحدہ کہانی ہے مگر سب کہانیوں کا ہیرو اور کردار ایک ہے۔ ایک سے ایک مزیدار اور ہنستی ہوئی کہانی اس قدر پُرلطف، اس قدر پُرمذاق، اس قدر محبت، اس قدر مضحکہ خیز، اس قدر ظرافت اور لطافت آمیز اور مزیدار پلاٹ کہ جو پڑھے ہنسے۔ اس کے افسانے بیسیوں اخباروں میں نقل ہوئے، ہندی رسالوں میں چھپے، بنگلہ زبان میں چھپ گئے، گجراتی میں چھپ گئے۔ یہ چغتائی صاحب کی بہترین کتاب ہے۔ ضخامت ۴۰۰ صفحے۔ جلد پوش سے آراستہ۔ قیمت چار روپیہ (للعہ)

کولتار
اس کتاب میں پندرہ انتہا سے زیادہ دلچسپ اور مزاحیہ افسانے ہیں۔ اور یہ سب افسانے مل کر کتاب کو پورا مزاحیہ ناول بنا دیتے ہیں۔ مزاحیہ نگاری اور افسانہ نویسی کا اگر کمال دیکھنا ہو تو یہ کتاب ضرور دیکھئے۔ اپنی طرز کا پہلا ناول ہے۔ شاہدہ کی زبردستی کی شادی کے لطیفے نے قصّے میں چار چاند جڑ دئے ہیں۔ تجم والی کی داستانِ محبت بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ قیمت دو روپیے (عہ)

ساقی بک ڈپو دہلی سے طلب فرمائیے

کمال احمد صدیقی

"بازگشت"

. . . اور گذرگاہیں بھی تھک جاتی ہیں، رُک جاتی ہیں
پیچ و خم کھاتی ہوئی، گھومتی، چکر کھاتی
اُسی منزل پہ، جہاں برف کے آئینوں پر
نظریں اُٹھتی ہیں، — مگر خود ہی ٹھہر جاتی ہیں
ایک کھوئے ہوئے، گھبرائے ہوئے اِنساں پر —!!

سلسلے اور بھی ہیں وادیِ رنگیں سے پرے —!
سلسلے — جنکی کمانوں سے نکلتے ہوئے تیر
دھندلے دھندلے کئی آفاق بنا دیتے ہیں —!!
سلسلے — جن پہ منازل کا گماں ہوتا ہے
ابر کے ڈھلکے ہوئے پردوں کی اوٹوں میں جہاں —
دیوتا، دیویاں، دیوداسیاں رہتی ہونگی —!!!
لیکن ایک اور بھی منزل ہے بہت دور، جہاں —
صبح کی پہلی کرن قوسِ قزح بنتی ہے —!
ایک منزل — جسے منزل تو نہیں کہہ سکتے۔
ایک اِنساں جہاں خاموش کھڑا ہے — لیکن
جیسے حیران و پریشان، کسی سوچ میں گم۔
اپنے ماحول سے بیزار نگاہیں جس کی —
چشمۂ وادی میں کچھ ڈھونڈ رہی ہیں شاید —!!

کون ہے — یہ کون ہے؟؟ — شاید اسے پہچانتا ہوں —!
میری آواز میں یہ کس نے پکارا ہے مجھے —!!!

سید شبیر حسینی

"وہ لڑکی"

وہ پُل کے اُس ٹوٹے ہوئے حصّے کے نیچے کھڑا تھا۔ جہاں ایک کتّے کی پھٹی ہوئی مُردہ لاش بُو کے دھوئیں بکھیر رہی تھی ——— سڑے ہوئے گوشت کی بدبو۔ خواہ وہ انسان کا ہو۔ خواہ کسی جانور کا ——— اُسے سونگھنے کے واسطے پتھر کے نتھنوں کی ضرورت ہے۔ پُل کے اُوپر کی فضا اِس کسیلی اور اندھیری بدبو میں لپٹی ہوئی تھی ——— یہ عام راستہ تھا۔ اِس پُل پر پہنچ کر ہر شخص کی رفتار میں حدّت اور تیزی آجاتی تھی۔ لیکن وہ اِس بدبو کے ڈھیر کے پاس ایک پتھر کی طرح جما کھڑا تھا۔ یا سنگِ مرمر کے اُس کتبے کی طرح جو کسی جوان موت کے سرہانے گاڑ دیا گیا ہو۔ اور جیسے ٹوٹ کر انسان کسی حد تک دہل جاتا ہو ——— وہ بھی ایک کتبہ تھا۔ سنگِ مرمر کا نہیں۔ بلکہ گوشت اور ہڈیوں کا بنا ہوا۔ جس کی زندگی کے سینے پر لکھ دیا گیا ہو ——— بھوک ——— افلاس ——— اور ناکامی محبت۔ انسان کی تین سب سے بڑی بیماریاں ———

وہ اُن لوگوں کو دیکھ دیکھ کر مُسکرا رہا تھا جو پُل کے بالائی حصّے پر پہنچ کر عجیب عجیب حرکتیں کرنی شروع کر دیتے تھے بدبو چیز ہی ایسی ہے۔ جو انسان کی طبیعت میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن اُس کی طبیعت میں ہیجان پیدا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ایک سکون ——— جس کی چھاؤں میں اُس کے بیتے ہوئے دنوں کا اندھیرا رینگ رہا تھا۔ اُس نے اس سے زیادہ کڑوی بدبو کے گھونٹ پیئے تھے ——— اُس نے بھوک کی غلاظت کو سونگھا تھا ——— اُس نے افلاس کے گندے مواد کو پیا تھا۔ اُس نے محبّت کے اندھیرے میں ایک عورت کے جسم کو سونگھا تھا۔

وہ اُن لوگوں کی ذہنیت کو اپنے دل ہی دل میں کوس رہا تھا۔ جن کے دل و دماغ میں اتنی سکت تو ہے کہ وہ کسی بھوکے اور ننگے جسم کو اپنے ساتھ لٹا کر اُسے سونگھ اور چوم سکیں ——— لیکن ایک حیوان کے سڑاندے گوشت کی بدبو اُن کے دل و دماغ پر یوں بھالا بن کر گرے ——— اگر حیوان کے سڑاندے گوشت میں بھی کوئی لذت ہوتی۔ تو یہ انسان ضرور اسے بھی مزے لے لیکر سونگھتے اور کھاتے۔ یہ انسان ———

سورج ایک بہت اونچی بلڈنگ کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ جو شاید کسی مہاجن کی تھی۔ اور اب پُل کے اُوپر اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ ویسے بھی شام ہو رہی تھی۔ اور سردی بھی بڑھنے لگی تھی۔ اِس لئے اُس نے اپنے میلے کچیلے گرم کوٹ کے کالر اپنے سینے پر تان لئے تھے۔ آج اُس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اِس بدبو کے سرہانے کھڑا ہو کر بہت سوچے۔ اِتنا سوچے کہ اُس کا دماغ اور جسم تھکاوٹ سے نڈھال ہو جائے۔

اُس کی سوچ کا موضوع تھی ایک چھوٹی سی لڑکی ——— جس کی یاد ابھی تک اُس کے گلے ہوئے پھیپھڑوں میں سِسک رہی تھی۔ لوگ اکثر ایسی لڑکیوں سے پیار کرتے ہیں۔ جن کے سینوں پر کنول کھلے ہوئے ہوں۔ اور جن کی جوانی رس میں ڈوبی ہوئی ہو ——— لیکن اُس نے تو ایک ایسی لڑکی سے پیار کیا تھا جس کے پاس صرف بچپن تھا ——— وہ اُس کے بچپن سے پیار کرتا تھا۔ اُس کی ننھی منّی باتیں اُس کی زندگی میں مٹھاس بھر دیتی تھیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہی لڑکی ایک دن اُس کی زندگی میں اندھیرا بھر دیگی ——— اُس کی راتوں کو ویران اور مضمحل بنا دے گی۔ ایک دن وہ بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا کہ وہ ننھی سی لڑکی۔ جس کا نام بِلّا تھا۔ پیچھے سے آکر اُس کے بالوں میں اپنی ننھی ننھی معصوم انگلیاں پھیرنے لگی۔ یہ اُس کا روز کا دستور تھا۔ اِس لئے وہ پڑھنے میں مشغول رہا۔ اِتنے میں وہ چھوٹی سی لڑکی بول اُٹھی "بھیا تم بڈھے ہوگئے۔ یہ دیکھو سفید بال!" اُس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سفید بال تھا جو اُس نے ابھی ابھی اُس کے سر کے بالوں میں سے نکالا تھا۔ اُس نے کہا "بِلّا۔ میں بڈھا ہو گیا ہوں۔ تم نہیں جانتیں میری عمر اِس وقت ساٹھ سال کی ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور کہنے لگی "جھوٹے کہیں کے۔ بڈھے آدمی تو عینک لگاتے ہیں۔ ہاتھ میں لکڑی لے کر چلتے ہیں بہت تھوکتے ہیں لیکن تم نہ عینک لگاتے ہو۔ اور نہ تھوکتے ہو۔ سچ سچ بتاؤ نا بھیا۔ یہ سفید بال کہاں سے آیا" ——— سفید بال اُس کی آنکھوں میں سفیدی سی چھا گئی۔ اور بِلّا اس کی آنکھوں

میں بہنا دیکھ کر سہم سی گئی۔ اُس نے پیار سے اُسے اپنے پاس بٹھا لیا اور کہنے لگا "دیکھو بملا جو آدمی جوانی میں بہت سوچتے ہیں اُن کے کالے بالوں کی جگہ سفید بال آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور جوانی میں وہی سوچتا ہے۔ جو بھوکا ہو۔ جس کے پاس پیسہ نہ ہو" لیکن وہ لڑکی عجیب تھی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں کتنی حساس تھی۔ اتنا سن کر وہ ڈر گئی تھی۔ سہم گئی تھی۔ اور اُس نے کہا تھا۔ "بھیا ایسی باتیں مت کیا کرو۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

بملا کتنی اچھی اور پیاری لڑکی تھی۔ وہ جب اُسے اُداس اور پریشان بیٹھے دیکھتی تو کتنے اُداس لہجہ میں وہ اُسے کہا کرتی تھی۔ "بھیا تم سوچا مت کرو۔ تمہارے بال سفید ہو جائیں گے۔" وہ مسکرا کر اُسے پیار کرتا اور کہتا "پگلی کہیں کی تمہیں ہر وقت میرے بالوں ہی کی فکر لگی رہتی ہے۔" لیکن وہ اُسے سوچنے نہ دیتی اور اُس کے سیاہ چمکیلے بالوں سے کھیلنے لگتی۔

اُن دنوں وہ ایک سیٹھ کا کلرک تھا اور اُس کی تنخواہ صرف بیس روپے تھی۔ یہ بیس روپے اُس کی زندگی کے لئے قطعی کفیل نہ تھے اس واسطے اس نے اپنی زندگی کی کئی راتیں بھوک کی گود میں گذاری تھیں۔ وہ کبھی کبھی اپنے سیٹھ کی بابت سوچنے بیٹھ جاتا تھا۔ دونوں انسان تھے۔ لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ سیٹھ کی زندگی میں روشنی تھی۔ اور اس کی زندگی میں تاریکی ——— اور اس تاریکی کا سبب وہ سیٹھ ——— جو اُسے کولھو کے بیل کی طرح استعمال کرنے کے بعد صرف بیس روپے دیتا تھا۔ اور خود ہر رات سینکڑوں روپے شراب اور عورت پر صرف کرتا تھا ——— شراب تو خریدی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اسے دُنیا تیار کرتی ہے۔ لیکن عورت ——— عورت تو قدرت کا بہترین شاہکار ہے۔ اُس کی خرید و فروخت کہاں تک جائز ہے؟ اور پھر قدرت کی بنائی ہوئی چیز انسان کی بنائی ہوئی چیز سے سستی کیوں بکتی ہے۔ اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایک رات سیٹھ نے وسکی کی بوتل تو پچاس روپے میں منگوائی تھی لیکن ایک عورت صرف پندرہ روپے میں۔ شراب کی بوتل تو صرف ایک گھنٹے میں ختم ہو گئی لیکن وہ عورت اُس رات کے بعد بھی زندہ رہی کیونکہ عورت قدرت نے بنائی تھی اور شراب انسان نے ———

بیس روپے اُس کی زندگی کے لئے قطعی ناکافی تھے۔ یہ چھوٹی سی رقم دیمک کی طرح اُس کی زندگی میں سوراخ کرنے لگی مسلسل فاقوں۔ اور ہر وقت کی سوچنے کی عادت نے اُسے دق کی بیماری کا شکار بنا دیا۔ سیٹھ نے اُسے ایک خارش زدہ کتا سمجھ کر دھتکار دیا تھا لیکن اُس کے ایک دوست نے کوشش کر کے اُسے ایک سینی ٹوریم میں بھجوا دیا۔ جب وہ دو سال کے بعد تندرست ہو کر سینی ٹوریم سے باہر نکلا تو اُس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی۔ بملا کو اپنی زندگی میں لانا۔ لیکن ایک دق کا تندرست مریض اپنی آرزو کو پورا نہ کر سکا۔

اُسے سینی ٹوریم کی اندھیری خوفناک راتیں ابھی تک یاد تھیں۔ اُن راتوں میں وہ اکثر بملا کی ننھی ننھی ہچکیوں کی آواز سُنا کرتا تھا اُسکے سینے کا درد بڑھ جاتا تھا اور حلق میں سے کھانسی کے فوارے چھوٹ پڑتے تھے۔

وہ اُس لڑکی کو حاصل نہ کر سکا۔ کیونکہ وہ دق کا مریض رہ چکا تھا۔ دُنیا کی آنکھوں میں اب بھی وہ دق کی کھائی ہوئی سڑی لاش تھا۔ اُسکی زندگی کے تین بڑے مجرم تھے جنہوں نے اُسکی زندگی کو پامال کیا۔ بھوک۔ افلاس اور دق۔ اور اُسکا سب سے بڑا مجرم وہ سیٹھ تھا جس نے اُسے اِن بیماریوں کا شکار بنایا۔ وہ فاقوں کی اذیت برداشت کر سکتا تھا۔ سردی میں ننگا رہ سکتا تھا لیکن ایک لڑکی کی یاد کو بھلانا اُس کے واسطے کتنا دشوار کام تھا۔ تنگدستی بھوک اور اُس لڑکی کی محبت نے اُسے پھر سے دق کا شکار بنا دیا۔ اب وہ کسی سینی ٹوریم میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ وہ دُنیا کی آنکھوں میں ایک مجسم گندگی بن کر جینا چاہتا تھا۔ ایک کتا اُس کے پاس غرّایا۔ اُسکے خیالات بکھر گئے۔ اب اس کے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ بدبو اور سردی نے آپس میں مل کر ایک کثیف سا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ اتنے میں اُسے بملا کے وہ الفاظ یاد آ گئے "بھیا تم سوچا مت کرو۔ تمہارے بال سفید ہو جائینگے۔" اُس کی اندھیری آنکھوں میں آنسو ٹمٹمانے لگے۔ اُس نے سوچنا چھوڑ دیا اور اپنے کوٹ کے پھٹے ہوئے کالروں کو اپنے سینے پر کستا ہوا پُل کے بالائی حصّے پر چڑھ گیا ——— جہاں بجلی کے قمقمے روشنی بکھیر رہے تھے ——— اور اندھیرے کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

شیریں محمد حسین

احساسِ شکست

جلیلاتی گرمیوں میں سفر دوزخ سے کیا کم ہوتا ہے۔ لیکن پھوپھی اماں کے پے در پے تقاضوں کا میں کیا جواب دے سکتی تھی۔ ایک دو بار ٹال بھی دیا، وہ ماننے والی کب تھیں؟ روٹھ جانے کی دھمکی دے ڈالی۔ اور میں نے پست ہو کر ہار مان لی۔ اکلوتی پھوپھی اماں تھیں روٹھ بھی جاتیں تو پھر دُنیا میں کون رہ جاتا تھا اس قدر پیار بھری دھمکیاں دینے والا۔ دادا۔ دادی زندہ تھوڑی تھے۔ کہ ان جیسی ایک اور نعمت سر پر تنی رہتے۔ وہ تو یہی دے سکے اکلوتی پھوپھی ——

ان کے پاس جانے سے میں یوں بھی بدکتی تھی۔ گھر میں جو ہے برابر بھی تو چھوٹا سا بچہ نہ تھا۔ اور میں ٹھہری سدا کی لڑاکا۔ ہر وقت کھیلنے کودنے والی —— اتنی بڑی ہو چلی تھی: بچپن کی عادتیں ایسی ساتھ لگی تھیں۔ کہ کبھی نہ چھوٹ سکیں۔

وہاں دھرا ہی کیا تھا۔ عابد بھائی کالج جا چکے تھے۔ ساجدہ بھی لاہور کی ہوا کھا رہی تھیں۔ جمیل میاں نوکری پر تھے۔ گھر میں پھوپھی اماں بڑیں سارا دن جماہیاں لیا کرتیں اور یا پھر ہاتھ میں سروتہ لئے کٹاک کٹاک، سپاریوں کی طشتریاں بھر بھر انڈیلا کرتیں۔ جب دیکھو جب ہی انکے گلے بھرے ہوتے تھے کنکریوں سے۔ جانے کیسے چباتی تھیں اور کس طرح نگلتی تھیں۔ میرے گلے میں تو ایسے سوکھے پھندے پڑنے لگتے۔ کہ آنکھیں اُبل پڑتیں۔ انہیں تو دن رات میں فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایسے پھیکے پھیکے ماحول میں کیا خاک دل لگتا۔ ہر وقت خاموشی سی چھائی رہتی، جیسے مرگھٹ! وہاں تو زندگی بھی داخل ہو کر مردہ ہو جاتی۔ بالکل بے جان۔ چاہے کچھ بھی ہوتا جانا ضروری تھا۔ پھوپھی اماں کے پاس پہنچتے پہنچتے ایک بار تو سنجیدہ بننا ہی پڑا۔

دیکھتے ہی اُنہوں نے تو شکووں کی بوچھاڑ کر دی۔

"لے ہے ایسا بھی کیا۔ کب سے آنکھیں ترس رہی ہیں۔ یہ نوبی بیٹی بہانے بنا رہی تھیں۔ اب فرصت ملی ہے تمہیں۔ کوئی کام ہی آن پڑا ہوگا ادھر کا تبھی تو آئی ہوگی۔ چلو پھوپھی کے سر پر احسان ہی سہی۔"

"آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہیں۔ بات یہ تھی۔ کہ" میں سوچنے لگی۔

"بات کیا ہوتی۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ یہ سب تمہارے بہانے ہیں۔" وہ ناز کے ساتھ مسکرائیں۔

"دراصل —— اصل میں —— بات یہ تھی کہ ——" میں بیوقوفوں کی طرح دُہرائے جا رہی تھی۔

"اصل وصل کیا یوں کہو دل نہیں چاہتا تھا" —— نہ جانے اُنہوں نے میرے دل کی گہرائیوں سے یہ بات کیسے معلوم کر لی۔ اور میں خفت کو مٹانے پر تُل گئی۔

"نہیں اماں بی —— یہ بات تھی کہ" میں نے آخرکار سوچ ہی لیا۔ "کالج میں چھٹیاں نہیں تھیں۔ امتحان سر پر آ رہے ہیں۔ لیکچر ختم ہونے والے تھے۔ رخصت لینی بھی مشکل تھی۔ بڑی دقت ہوئی —— اب اگر کوئی اپنا حرج بھی کرے تو آپ ماننے والی کب ہیں"۔ انہیں خاک پتہ تھا۔ کہ میں امتحان دے دلا چکی تھی۔ میں نے مُنہ بسور کر رو دینے کی دھمکی دی تو وہ نہال ہو گئیں۔ "پڑھائی میں حرج کے لئے تو میں بھی راضی نہیں۔۔۔۔ اور نہ ہی یہ چاہتی ہوں کہ میری وجہ سے تمہارا تعلیمی نقصان ہو۔ ایسا ہی تھا تو مجھے لکھ دیتیں۔ میں بھلا ایسی بیوقوف تھی۔"

"آپ پھر بھی کہتیں میں بہانے تراش رہی ہوں۔"

"اے واہ —— وہ تو میں نے یونہی مذاق کیا تھا۔ تم نے سچ مان لیا۔"

"اب میں کیا جانوں کہ آپ ——" "اچھا چلو ہٹاؤ اس قصہ کو۔ ہاں یہ تو بتاؤ گھر میں تو خیریت ہے نا!" وہ گویا اُس وقت بھولی ہوئی تھیں۔

"بالکل خیریت ہے"۔ میں اس غیر دلچسپ سوال کا جواب جلدی سے دے کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ جیسے کچھ تلاش کر رہی تھی۔ کوئی ہنگامہ —— کوئی اچانک سا تغیر —— جو ——!

"بی بی جی سلام" —— ایک دم سے میری نگاہیں عجیب ہیئت

کے پُتلے سرحم گئیں۔ "سلام!" میں نے جواباً جیسے پتھر کھینچ مارا اور وہ ہنسنے لگا پاگلوں کی طرح "ہی ہی کھی ہی ہا ہا ہی۔ یہی ہیں وہ بی بی اماں۔ جنکی راہ دیکھتی تھیں آپ ہرروز۔ یہ ہیں وہ ہا ہی ہا ہا" گو میرے سر پر سینگ نکل آتے تھے۔ کتنا بدتہذیب ہے میں نے دانت پیسے "پھر سلام کرتا ہوں بی بی" وہ شرارت سے مسکرایا" اور میرا دل چاہا لگاؤں جوا یز کس کس کے بدتہذیب کہیں کا۔ گدھا۔ پھوپھی اماں نے جیسے میری نگاہوں سے شعلے بھڑکتے دیکھ لئے اور انہوں نے صفائی کے وکیل کی طرح کہنا شروع کیا "یتیم ہے بیچارا۔ ماں باپ مر چکے ہیں۔ رشتہ داروں نے نکال دیا ہے۔ میں نے اپنے گھر پر ڈال لیا ہاتھ سدھے ہو جائیں گے تو کما کھائیگا۔ ہے کچھ دیوانہ سا۔ بڑا ہی بھولا ہے۔ میٹھے بول کے لئے ترستا ہے بیچارا۔ میں نے تو کبھی ایک سے دوسرا لفظ زبان سے نہیں نکالا۔ مجھے امی اماں کہتا ہے۔ ان مصیبت زدہ" پھوپھی اماں کی صدلی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔ ان کا دل تو یونہی پسیج جاتا تھا ہر ایک پر۔

اماں کے لاڈلے نوکر کی شکل تو دیکھو جیسے مرغی۔ بڑی ہنسی آئی مجھے۔ میل سے چپچپاتا ہوا پٹکا۔ بالکل فرسودہ سا۔ جیسے لچھے پیشانی پر لٹک رہے تھے جیسے سہرا۔ سوراخوں میں سے خشخشی بالوں والا چھا کتا ہوا سر بڑا ہی عجیب لگا مجھے۔ دھاری دار قمیص کے نیچے۔ علی گڑھ فیشن کا ٹخنوں سے بھی اوپر پاجامہ۔ عابد بھائی کے بڑے بڑے چپلوں میں کھڑکھڑاتے ہوئے میلے سے پاؤں جیسے بھینس کے کھُر۔۔۔!

اور میں نے نفرت و ہمدردی کے ملے جلے جذبات سے کھور کر نگاہ ڈالی۔ اماں بی کے الفاظ کانوں میں رینگنے لگے۔ "یتیم ہے بیچارا" ۔ واقعی! میں نے سوچا۔ ادھر وہ پھر ہنسنے لگا۔ "جاؤ اپنی بی بی کے لئے کمرہ ٹھیک کرو"۔ اماں بی نے حکم دیا اور وہ تعمیل کے لئے چلدیا۔۔۔!

"یہ دیکھئے۔۔۔ اس طرف اور وہ بھی۔ اُدھر اس کونے میں۔ الماری کس قدر چمک رہی ہے۔۔۔ یہ میز بالکل نئی دکھائی دے رہی ہے۔ یہ بھی دیکھئے" ممو ہر چیز کی طرف میری توجہ دلانا چاہتا تھا۔

وہ بڑی خوشی کے ساتھ سب چیزیں ایک ایک کرکے دکھا رہا تھا۔ اُس نے کتنی محنت سے کمرہ صاف کیا تھا۔ "یہ بھی دیکھئے" وہ بلوریں قلمدان اُٹھا لایا۔ "دیکھئے تو ادھر"۔۔۔ میں ٹھہرا ہوا میں چُپ۔۔۔ اور وہ پھر ضد کرنے لگا "دیکھئے نا کتنا اچھا چمکایا ہے۔"

"بڑا اچھا ہے" میں نے بن دیکھے کہہ دیا۔ "ہونہہ دیکھتی تو ہیں نہیں۔ ویسے ہی "بڑا اچھا ہے" گستاخ نے میری نقل اُتاری۔ اور میں بمشکل اپنا غصہ روک سکی۔

"دیکھیں پھر۔ بس ذرا سا"۔۔۔ میری نگاہیں ایک ننھی سی تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔ بڑی پیاری سی تھی وہ تصویر۔ اور اُسی کمبخت نے پھر میری توجہ ہٹانی چاہی۔ "بس ایک بار دیکھ لیجئے" اُس نے صدا دی۔

"کیا ہے بھئی"۔۔۔ میں ایسا ہو گئی "کتنا چمکایا ہے"۔ اُس نے قلمدان بڑھا دیا۔ "ہاں خوب ہے شاباش!" میں نے اُس کی دل شکنی کے خوف سے حوصلہ بڑھایا۔ اُس کی جرأت تو پہلے ہی کسی اشارے کی منتظر تھی۔ اور وہ لگا بے تکان سوال کرنے "آپ کہاں پڑھتی ہیں بی بی؟" "ولایت میں۔۔۔!"

"ایں"۔۔۔ وہ چونکا۔ "ولایت تو بہت دور ہے۔ سات سمندر پار" "تو گویا تم جانتے ہو۔ کہ لدیت بہت دور ہے۔ سمندر پار پھوپھی اماں کہتی ہیں تم دیوانے ہو" "وہ تو پیار سے کہتی ہیں میں کیوں ہونے لگا دیوانہ۔ واہ بی بی۔ واہ۔!" ممو نے دوبار سر کو خفیف سا جھٹکا دیا۔

"میں نے کیا ہے؟ اپنی اماں سے پوچھو" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"کہا نا۔ وہ تو پیار سے کہتی ہیں" ممو اُٹھلایا۔

"اچھا جاؤ اب۔ کہتی ہو گی لاڈ سے ہی" میں نے چاہا وہ اب چلا جائے۔

"بعد میں جاؤنگا۔ پہلے یہ بتایئے آپ پڑھتی کہاں ہیں"۔

"بتا جو دیا ہے" میں نے اُسے گھورا۔

"جھوٹ بتایا ہے آپ نے۔ اماں بی کہتی تھیں آپ لاہور پڑھتی ہیں"

"جب معلوم ہے تو پھر کیوں پوچھتے ہو" "میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں" وہ فرش پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "واہ بڑے آئے وہاں سے پوچھنے والے۔ چلو ہٹو یہاں سے" میں چڑ گئی۔ میرے غصہ پر اُس نے بات کا رُخ بدلنا چاہا۔ میرا مطلب

بس یہ کہ یہی کہ میں آپ کے منہ سے کہلوانا چاہتا ہوں۔" وہ شرارت سے پھر مسکرایا۔ "آئیے وہاں سے میرے منہ سے سننے والے ہٹاؤ یہاں سے اپنا جھاڑن۔ اور چلتے بنو۔" میں نے مصنوعی غصہ برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

"آپ تو یونہی خفا ہوئی جا رہی ہیں۔" اُس نے کچھ ایسا منہ بنایا کہ میں بے اختیار ہنس دی۔ اُدھر اُس کی جرأت نے پھر سر اُبھارا۔ "چاہے آپ ماریں چاہے کچھ کریں۔ میں تو یہاں سے جاؤنگا نہیں۔ جب تک آپ یہ نہ بتائیں گی کہ آپ لاہور میں رہ کر کیا کرتی ہیں۔ اچھا بی بی یہ بتاؤ تم نے کتنا پڑھا ہے۔" وہ آقا وخادم کی تمیز بھول گیا۔

"خبردار جو آئندہ "تم" کہا تو۔۔ "میں نے ڈانٹا۔"

"اوہو۔ بڑی بھول ہوئی 'تم' نہیں 'آپ'۔۔۔ اور میں نے سوچا کتنا بے باک ہے یہ۔ "بتائیے نا!" پھر اُس نے دُہرایا۔

"بیس درجے" میں نے گلوخلاصی کے لئے گپ ہانک دی۔ وہ کھلکھلا پڑا۔ "ایک اور جھوٹ بیس درجے تو ہوتے ہی نہیں۔ آپ نے کہاں سے پڑھ لئے۔"

"تو پھر کتنے ہوتے ہیں۔" میں نے اُس کا امتحان لینا چاہا۔

اُس نے گننا شروع کیا۔ "دس دو بارہ۔ ایک تیرہ اور ایک چودہ چودھویں جماعت سے آگے تو ہوتی ہی نہیں کوئی جماعت!" وہ اپنے علم پر فخر کرنے لگا۔

"بیوقوف! اسی برتے پر دوسروں کو جھوٹا بتاتے ہو۔"

"اچھا جی ہو گی پھر۔" اُس نے ہار مان لی۔

"آپ کیا پڑھتی ہیں۔" وہ اصل مطلب کی طرف آ گیا۔

"جو کسی کا دل چاہے پڑھ لے۔"۔۔۔ "واہ پڑھائی میں اپنی مرضی ہی تو چلتی ہے نا!"

"اور نہیں تو کیا تمہاری مرضی چلے گی۔"

میری کیوں چلنے لگی۔" وہ کچھ مایوس سا ہو گیا۔

اب کے بار یونیورسٹی سنڈیکیٹ کو تمہاری طرف سے درخواست بھیجو گی کہ نصاب تعلیم تمہارے صلاح و مشورہ سے تیار ہوا کرے۔" میں نے چڑایا۔

"بی بی یہ سنڈی ٹیک کیا ہوتا ہے!"

"ارے پاگل سنڈیکیٹ کہو"۔۔۔ "سنڈی ٹیک" اُس نے پھر غلط دُہرایا۔ "اندھا!" میں جھلاّ ئی۔

"ایسے ہی بی وہ صناب کیا تھا" "کمبخت نصاب کہو" مجھے بے حد غصہ آیا۔ "ہاں ہاں۔ ن۔ نصا۔ ب۔ کیا ہوتا ہے۔"

"کورس"۔ میں نے اُس کے لئے اور بھی مشکل پیدا کر دی۔

"کو۔ کور۔ س"۔ لفظ کی ادائیگی اُس کے لئے مشکل ہو رہی تھی۔

"ایسے بھئی کورس" میں نے اس کے لئے آسانی پیدا کرنی چاہی۔

"ہاں تو یہ کیا ہوتا ہے بی بی۔"

"یہ جو سکولوں اور کالجوں میں پڑھنے کے لئے کتابیں مقرر کی جاتی ہیں نا اُسے کہتے ہیں نصاب۔"

"ہونہہ"۔ ممنو نے گہری فکر میں ڈوب کر کہا۔ اور پھر وہ جیسے یکایک چونک پڑا۔

"آپ تو کہتی تھیں اپنی مرضی سے پڑھتے ہیں!" میں کھسیانی ہو گئی۔ کس طرح نرغے میں لے لیا تھا اُس نے۔ میں نے تو جاہل گنوار سمجھ کر ٹالنا چاہا تھا۔

"تم نہیں جانتے بھئی۔ اف۔ کیا تو بڑی جماعتوں میں اپنی مرضی بھی کرتے ہیں۔ کوئی روکنے والا نہیں ہوتا۔ سمجھے!"

"کرتے ہونگے"۔ اُسے جیسے میری بات کا یقین نہ آیا۔ "تم نہ پڑھے نہ لکھے۔ تم کیا جانو پڑھائی کیا چیز ہوتی ہے۔"

"میں بھی اب پڑھونگا"۔ اُس نے قطعی فیصلہ کر لیا۔

"اسے تو بڈھے ہو گئے اب جاؤ گے سکول میں ننھے منے بچوں میں یہ اونٹ کے اونٹ پھرو گے۔ شرم تو نہیں آئیگی۔"

"میں سکول کیوں جاؤنگا"۔ اُس نے ہاتھ میری آنکھوں کے سامنے نچائے۔

"تو پھر کیا کرو گے؟" میں نے سب کچھ سمجھ کر پھر پوچھا۔

"آپ سے پڑھا کرونگا"۔ خوشی میں اُس کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا۔

مٹیالی سی رنگت میں شفق پھوٹنے لگی۔ وہ بہت ہی بھلا دکھائی دیا۔

"میری بلا پڑھاتی ہے تمہیں"۔ میں جل گئی۔ "شکل تو دیکھو ذرا اپنی۔"

"میں آپ سے پڑھونگا ضرور پڑھونگا اور سچ مچ پڑھونگا"۔ اُس نے ہاتھ نچا نچا کر کئی بار دُہرایا۔

"پڑھ چکے تم"۔ میں نے سر کو پُر معنی جھٹکا دیا۔ اور وہ سچ مچ اپنی بات پر تُل گیا۔

"اماں بی سے کہتا ہوں مجھے منگوا دیں کتاب۔ اور لکھنے کے لئے اور وہ بھاگا اماں بی کی طرف۔

"اماں! بی بی مجھے پڑھائیں گی۔ آ ہا ہا۔ آ۔۔ ہا۔ ہم پڑھینگے۔ اماں دیکھو بی بی مجھے نہیں پڑھاتیں۔" کمبخت نے جھوٹ بک دیا۔

اور پھوپھی اماں باہر ہی سے چلائیں۔ "شمی! شمی بیٹا!"
"جی آئی۔" "دیکھو شمی بیٹی تھوڑا سا وقت نمو کو بھی دیا کرو۔ ساجدہ سے میں نے کئی بار کہا ہے۔ وہ پڑھاتی تو ہے۔ یہ کمبخت اُس سے پڑھتا ہی نہیں۔ آج تم سے پڑھنے کیلئے کتنا خوش ہے۔ آج تک میں اس سے کہتے کہتے ہار گئی تھی۔ اب خود ہی شوق چرایا ہے۔" پھوپھی اماں کلے میں پان دباتی ہوئی بولیں۔

آخر نوکر ہی تو تھا۔ نہ معلوم اُنہوں نے اسے کیوں اتنا سر پر چڑھا رکھا تھا۔ اس طرح کے لاڈ پیار تو اس کا اور بھی ستیاناس کر دینگے۔ پہلے ہی سے بگڑا ہوا ہے۔ اب .... پڑھیں گے جناب تو کام کرنا بھی موت نظر آئیگا۔

کچھ بھی ہو وہاں تو ہاں کرنا ہی پڑی۔ پھر اس میں اپنا کیا بگاڑ تھا۔ مجھے تو زیادہ سے زیادہ ایک یا دو مہینہ رہنا تھا وہاں۔ اپنی بلا سے بگڑے یا سنورے۔ جن کا نوکر ہے خود سنبھال لیں گے ــــ

اپنے کمرے میں بیٹھی میں ایک دلچسپ ناول پڑھ رہی تھی۔ ایک تو کھلی فضا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اور پھر اُس پر سامنے کھلی ہوئی کھڑکیوں میں سے ہریاول کا نظارہ۔ سب چیزیں ملکر مطالعہ کی دلچسپی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ مجھے کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ کتنا غصہ آتا ہے اگر ایسے میں کوئی بے جا دخل انداز ہو جائے اور وہ بھی کون نمو گنوار ــــ

دُور ہی سے چلاتا چلا آ رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحہ دری کتابیں بغل میں دابے دماغ چاٹنے کو موجود۔

ذرا بتائیے نا ایسی غیر رومانی باتیں میں بھلا کیا دل لگتا۔ کہاں تو دلچسپ ناول کی رنگینیاں اور کہاں ــــ اُف توبہ! میں نے نمو کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اُسی انہماک کے ساتھ پھر پڑھنا شروع کیا۔

"بی بی جی!" اُس نے اُٹھ کر میرے کان کے پاس قریباً چلاتے ہوئے کہا۔ جھلا اٹھی۔ اور ایک زناٹے کا تھپڑ رسید کی۔

گال سہلاتا وہ خاموش کھڑا میری طرف دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھوں سے موتیوں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر فرش پر بکھر کر پھیلتی جا رہی تھیں۔
میرے سراپا میں جیسے کسی نے بجلی کی سلائی چھو دی ہو۔ اور میں کانپ اُٹھی ــــ سُنا ہے یتیم کی آہ آسمان میں چھید کر ڈالتی ہے۔
میں نے خوف سے لرز کر نمو کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور خاموش تھا۔ اُس کی نگاہیں بے کسی، حسرت اور خاموش فریاد کا مرقع بنی ہوئی تھیں جیسے تفسیریں کھلی پڑی ہوں، خوف سزا کی۔ جانے کس غیبی طاقت کے ذریعہ میں نے وہ تفسیریں پڑھ لیں۔

" بیچارا یتیم۔" نمو اس طرح گستاخی سے پیش نہ آیا کرو۔ کوئی دیکھے تو کیا کہے۔ پھوپھی اماں کا نوکر ایسا ہی بدتہذیب ہے۔ یوں نہیں کیا کرتے نمو ــــ پڑھنے والے تو بڑے تہذیب والے ہوتے ہیں۔" یہ بھی کوئی ہمدردی کے الفاظ تھے۔ جو اُس کے زخمی دل پر مرہم کا کام دیتے۔ اور بھئی مجھے یاد جو نہیں رہے تھے وہ الفاظ ــــ

غریب کی بساط ہی کیا۔ روتے روتے وہ پھر مسکرا پڑا۔ اُس کی گھنی پلکوں پر اب بھی شبنم کی طرح چمکتے ہوئے قطرے تھرتھرا رہے تھے۔ وہ اسی انداز میں فرش پر بیٹھ گیا۔ اور میں کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گئی۔ کتاب کی لائنیں جیسے نظروں کے سامنے سے کھسکتی جا رہی تھیں۔ اور الفاظ بڑے بڑے دھبے بن کر پھیل رہے تھے بالکل نمو کے آنسوؤں کی طرح۔
میں نے نظریں اُٹھائیں۔ نمو نے جھپاک سے نگاہیں جھکا لیں۔ اور سلیٹ پر ننھی سی لکیریں کھینچنے لگا۔ "تو اب تک یہ کیا دیکھ رہا تھا" میں نے سوچا۔ میرا سوچنا بیکار تھا۔ اس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ یا میرے ہاتھ پر۔ جو کرسی کے ہتھے پر پڑا قدرے اُس کے قریب تھا۔

"نمو ــــ!" میں نے اُسے دھیرے سے پکارا۔ وہ چُپ۔ نمو۔ میں نے پھر اُس کی توجہ سلیٹ کی طرف سے ہٹانی چاہی۔ وہ پھر چُپ۔ میں کھنا گئی۔ "کمبخت تھوتھنی کیوں سُجا رکھی ہے۔ زبان پر آبلے پڑ گئے ہیں کیا؟ مُنہ سے پھوٹتا ہی کچھ نہیں۔ ماتس کے آٹے کی طرح اینٹھے جا رہا ہے۔ اکڑ فوں تو دیکھو۔ ہونہہ، بڑا آیا وہاں سے۔"

میں اُسے کوسے جا رہی تھی۔ اور وہ خاموش تھا بالکل خاموش سر جھکائے وہ دیر تک بیٹھا رہا۔ میں باوجود کوشش

کے ناول اُس دلچسپی کے ساتھ نہ پڑھ سکی۔ سارا مزہ کرکرا کر دیا جزالی نے۔ میں زیرِ لب بڑبڑائی۔ اور اُس نے پھر بھرپور نظروں سے مجھے دیکھا اُس کی آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔

"نمو—!" میں نے بادلِ نخواستہ پکارا۔ ٹپ ٹپ اُس کے آنسو گرنے لگے۔ جیسے رُکے ہوئے دریا کا بند ایکدم ٹوٹ جائے۔

سِسکیاں اور سسکیاں۔ رُکے رُکے الفاظ اس کی زبان سے نکلنے لگے "جب۔ جب میں ساجدہ بی بی تو مجھے اس قدر پیار کے ساتھ پڑھایا کرتی تھیں۔ کہ۔ کہ جو۔ کچھ بھی کر مجال ہے جو کچھ کہہ جائیں۔ ایک ایک غلطی پر وہ دیر تک سمجھاتی رہتی تھیں۔ سکول والے بھی کیا پڑھاتے ہونگے جس طرح ساجدہ بی بی پڑھاتی تھیں۔"

"تو پھر کیوں نہ پڑھ لیا اُن سے"۔ میں جل ہی تو گئی۔

"پڑھتا کیا خاک دل ہی نہیں چاہتا تھا اُن سے پڑھنے کو"۔

"تو گویا وہ تمہیں اچھی نہیں لگتی تھیں تبھی تو—!"

"اب یہ میں کیا جانوں"۔ وہ اُسی طرح اُداس رہا۔

"میرا ہی دماغ خراب کرنا تھا تمہیں۔ کیوں ہے نا؟"

"بی بی جی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ؟ کہ میں۔"

اور وہ پھوٹ پڑا بچوں کی طرح — میں گھبرا گئی پھوپھی اماں سُن پائیں تو کیا کہیں "نمو۔ بھئی ہمیں یہ بات بالکل پسند نہیں۔ کہ تم۔ یا کوئی اور بھی ہو تو وہ بھی بس ذرا ذرا سی بات پر رو دے۔"

"ہونہہ، یہ بھی کوئی بہادری ہے۔ عورتوں کی طرح روئے جا رہے ہو۔ مرد بنے پھرتے ہو۔" میں نے اُسے غیرت دلائی۔

لیکن جب دل زخمی ہو تو پھر غیرت ویرت سب بھاگ جاتی ہے اور اُس وقت انسان کا دل چاہتا ہے کہ وہ سب کے سامنے چیخیں مار کر روئے۔ اتنا روئے اتنا کہ بس—

اور نمو تو شاید پہلے ہی سے جانتا تھا۔

"بس بس بھئی نمو۔ اب بس!" میں نے اُسے دُور ہی سے چمکارا۔ "اونہہ ہونہہ۔ بھئی میرا دم اُلٹ رہا ہے۔ نمو تم چُپ نہیں ہو گے تو میں بھی رو دونگی پھر"— وہ تو جیسے سُن ہی نہیں رہا تھا۔

"نمو۔ لے لو میں بھی روئے دیتی ہوں.... یہ دیکھو۔ واہ

ایسے بھی کیا بھلا" پھوپھی اماں شاید سُن رہی تھیں جتنی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ اللہ میاں سے کہ وہ اپنے لاڈلے کو اس حالت میں نہ دیکھ پائیں۔ اے لو وہ آن دھمکیں۔ اور سیدھی میری طرف لپکیں۔ میں نے گھبراہٹ میں کتاب کے صفحے اُلٹنے شروع کر دیئے۔

"کیا ہو رہا ہے شمی بیٹی؟" وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ "ایک کتاب پڑھ رہی ہوں اماں بی"۔ "ایں — نمو تم یہاں کیا کر رہے ہو"۔ وہ یوں بن گئیں جیسے انہیں خبر ہی نہیں۔ کس قدر مکار ہوتی ہیں بوڑھی امائیں بھی۔ دانستہ انجان بن جاتی ہیں موقع دیکھ کر۔ "میں سمجھی تھی تم باہر ہو گئے" اور وہ جو باتوں کی آواز سُن کر آئی تھیں۔ وہ گویا کوئی بات ہی نہ تھی۔

"پڑھ رہا ہے"۔ میں نے پھوپھی اماں کو ٹالنا چاہا۔ "اونہہ پڑھ رہا ہوں۔ جیسے بہت پڑھا دیا ہے نا؟"

پھوپھی اماں کی موجودگی میں وہ پھر تیز ہو گیا۔ "پڑھا ہی تو رہی تھیں اس وقت تک"۔ اُس کی نگاہوں میں شکایتوں کی بھرمار تھی۔

"نہیں پڑھا تم نے؟" پھوپھی اماں نے لاڈ سے پوچھا۔

"بالکل نہیں"۔ وہ اور بھی تیز ہوا۔ "تو پھر بات کیا ہے؟"

وہ حیران ہو رہی تھیں۔ "کوئی بھی نہیں" "بات کیا ہوتی۔ بس ایسے ہی"۔ "ہونہہ جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی"۔

"واہ — اور لو۔ کچھ ہوا ہی نہیں گویا ان کی نظروں میں"۔

"تو پھر ہوا کیا ہے"۔ پھوپھی اماں زچ ہو گئیں۔ "انہی سے پوچھ لیں"۔ وہ پھر سلیٹ پر لکیریں سی کھینچنے لگا۔ "مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔ اگر اُسے پتہ ہے تو بتا دے"۔ میں نے پھر اسی کی طرف اشارہ کیا۔

"نمو"۔ پھوپھی ذرا سختی سے بولیں۔ "بتاؤ گے کہ نہیں آخر یہ تم پھول کر کُپا کیوں ہو رہے ہو۔ روتے بھی ہو شاید، میں بھی تو جانوں"۔ وہ باری باری دونوں کا مُنہ تکنے لگیں۔

"اماں بی میں بتاؤں"۔ لاڈلا ناز سے پھر اٹھلایا۔ "انہوں نے مجھے مارا ہے۔ یہ زناٹے کی چپت رسید کی تھی۔ یہ دیکھئے میرا گال اب تک کوئلوں کی طرح دھک رہا ہے۔ جیسے میں نے کوئی بڑا ہی نقصان کر دیا تھا ان کا۔ یا بگاڑ دیا تھا کچھ"۔ نمو کے تو جیسے کسی نے چابی بھر دی ہو۔

"چہ چہ"۔ اماں نے پھر مبہم الفاظ میں ملامت کی، "شمی بیٹی

ایک یتیم کو مارتی ہو۔ بیچارے کس، وہ دور کہیں گھورنے لگیں کسی چیز کو۔ جیسے کرسیٔ معلیٰ کا پایہ لچک گیا ہو۔ اور سارا آسمان ایک طرف جھک گیا ہو یا پھر عرش کے کنگورے گر پڑے ہوں۔ دھڑ دھڑ گر رہے ہوں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے بہتی میٹھی لہریں نہ کیا کریں۔ ان کا دل سچا، زخ ہو گئی۔ ہر وقت یتیم سر پر سوار رہنا۔ یہ نہیں دیکھیں کہ یتیم سور کتنا وہ ہے گدھا کہیں کا۔ نہ عقل نہ تہذیب، ہر وقت کی بیوقوفیوں سے زندگی دو بھر بنا دی ہے علیں اس کی حماقت کو تو کرنا ہوا۔ کوئی وہ ہو گیا۔ کہ بس ہر وقت گستاخی اور برابری کا دعویٰ۔

"پھوپھی اماں بڑا گستاخ ہے ادب و لحاظ تو جیسے چھو کر بھی نہیں گیا اسے۔" میں نے بھی جڑ دیا۔

"نمو یہ تمہاری زیادتی ہے ادب سے بولنا سیکھو۔ اور دیکھو شمی بیٹی اب کے اگر اس نے ایسی حرکت کی تو مجھے بتانا پھر میں اسے ٹھوکوں گی۔" پھوپھی نے دونوں کو تاکید کی۔ "اور ہاں نمو اب من منا جاؤ۔ اٹھو ابھی بی بی سے معافی مانگ لو۔ اٹھو شاباش۔"

ڈھیٹ۔ ٹس سے مس نہ ہوا۔ "دیکھ لو اماں کس طرح اینٹھتا ہے آپ کا کہنا بھی نہیں مانتا" میں نے انہیں اکسایا۔

"بڑا ہی اچھا ہے اپنی ماں کا کہنا نہ مانے گا تو پھر کس کا مانے گا۔" نمو کے سینے میں تو بغاوت کا طوفان اٹھ رہا تھا مار بھی غریب کھاتے۔ اور معافی بھی وہی مانگتے۔ صلح کے بعد دو منٹ تک بھی تو پابند نہ رہ سکا۔

"اب یہ اونٹ کی طرح گردن اٹھا اٹھا کر کیا دیکھ رہے ہو، چپکے بیٹھتے ہو تو بیٹھو ورنہ ..." میں نے باقی الفاظ چبا لئے۔

"ورنہ کیا ..." وہ شوخی سے مسکرایا۔ "نکال دیں گی آپ کمرے سے" وہ پھر اچک اچک کر جھانکنے لگا۔

"نمو۔ آخر کیا ہے" میں تنگ آ گئی۔

"آپ پڑھ کیا رہی ہیں؟" اس نے یوں پوچھا گویا اسے میری ہر بات میں دخل انداز ہونے کا قدرتی حق تھا۔

"دکھائی نہیں دیتا۔ کتاب پڑھ رہی ہوں" جواب میں قدرے تلخی تھی۔

"اسے بند کر کے وہاں رکھ دیجئے" اس نے میز کی طرف اشارہ کیا۔ "اور مجھے پڑھائیے"

"کہ خود با نمو اس وقت طبیعت نہیں چاہتی۔ پھر پڑھا دوں گی" میں نے خوشامد کی۔ "اور یہ جو اتنی موٹی سی کتاب پڑھ رہی ہیں۔ اس سے دل نہیں گھبراتا" "تمہیں کیونکر بتاؤں یہ اور چیز ہے بڑی رنگین۔ دلچسپ۔ اور وہ تمہاری کتاب بالکل روکھی پھیکی سی بدمزہ" میں نے منہ بنایا کڑوا سا۔ "تم ان کتابوں کی قدر کیا جانو" "اسی لئے تو کہتا ہوں کہ مجھے بھی پڑھا دیں" وہ بڑی لجاجت سے بولا۔ "تم پڑھ کر کیا کرو گے" میرے سوال پر اس کے دماغ میں کئی ایک خوابات پرورش پا کر الجھنے لگے جنہیں وہ ایک ہی بار کہہ دینا چاہتا تھا۔

"جو کچھ آپ کر رہی ہیں" انداز میں وہی شوخی تھی "تم بھی پروفیسر بنو گے؟" "ہاں!" اس نے پرمعنی انداز سے سر ہلایا۔ "شکل تو دیکھو اپنی۔ بننے لگے پروفیسر۔ لڑکے دیکھ کر ہی بھاگ جائیں" میں نے چڑایا۔

"ساری دنیا پڑھ کر صرف پروفیسر ہی بنتی ہے؟" اس نے بات کا رخ بدلا۔ "یقیناً۔ تعلیم حاصل کرنے سے ہر ایک کا مقصد الگ الگ ہوتا ہے" میں نے پھر الجھن میں ڈال دیا۔ "میرا بھی تو کوئی مقصد ہوگا" اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اظہارِ مدعا کی طرف خود بخود بحث چل نکلی۔ "تمہیں اماں سے روپے مل جاتے ہیں۔ وقت پر کھانے کو مل جاتا ہے۔ اس سے زیادہ تمہاری زندگی کا کونسا مقصد ہے" میں اس وقت تک اسے بیوقوف سمجھ کر باتیں کر رہی تھی۔ "بی بی جی کیا آپ سمجھتی ہیں کہ دو وقت پیٹ بھر لینے سے زندگی کا مدعا پورا ہو جاتا ہے" "اگر ایسا ہی ہوتا ہے تو پھر حیوان اور انسان میں فرق ہی کونسا رہ جاتا ہے" اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہو گئی اور وہ بڑا ذکی و فہیم نظر آنے لگا۔

"بھئی نمو۔ سچ پوچھو تو میں اسی چیز کو زندگی سمجھتی ہوں پیٹ بھرا اور سو رہے۔ اس الجھن میں جتنا کوئی پڑے اتنا ہی تکلیف دیتا ہے"

"کیا آپ سچ کہہ رہی ہیں؟" اسے میری بات کا یقین نہ آیا۔ "اور نہیں تو کیا جھوٹ ہے"

"میں نہیں مان سکتا" اس نے وثوق سے کہا۔ اور میں اپنے سفید جھوٹ پر خود ہی مسکرا دی۔ بڑا ضدی ہے میں نے سوچا۔ میری دلچسپی نمو کے ساتھ بڑھنے لگی۔ "اچھا تو نمو۔ تم زندگی کو

کس رنگ میں لیتے ہو؟" میں اُس سے پھر وہی بات پوچھنا چاہتی تھی جس کو وہ شروع کرتے کرتے رُک گیا تھا۔ "زندگی کے بہت سے رنگ ہیں بی بی جی۔" وہ مجھے سمجھانے لگا۔ "اور ہر رنگ اپنی جگہ خوبصورت ہے۔" میں اُس کی فلاسفی پر حیران رہ گئی۔ کیسا عقلمند ہے ننھو۔ میں تو اسے بالکل پاگل سمجھ رہی تھی۔ کورس کا میٹرک۔

"تم کس رنگ کو پسند کرتے ہو؟" میں نے بے دھڑک پوچھا اور وہ جھجک گیا۔ "میں ——میں——" وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ "ابھی نہیں پھر بتاؤنگا وقت آنے پر۔" "ہم ابھی سُن کر رہیں گے۔" میں نے بضد کہا۔ اور وہ مجھے بچہ سمجھنے لگا۔ "واہ بی بی۔ آپ بھی حد کرتی ہیں۔ ان رنگوں کو اگر ایسے ہی ظاہر کردیا جائے تو پھیکے سے پڑجاتے ہیں۔ جتنے زیادہ پوشیدہ رکھے جائیں اتنے ہی گہرے ہوتے ہیں۔ آپ نہیں سمجھیں۔" اس وقت ننھو فلاسفر دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے اُس کے علمی مشاہدات اور دانائی عقل پر بڑا ہی تعجب ہوا۔ یہ ہی تھا وہ لٹھ گنوار جسے میں نے کبھی باورچی خانے کی چاردیواری سے باہر نہیں دیکھا تھا۔ تو کیا اُس نے سب کچھ انہی دُھندلی سی دیواروں کے اندر سیکھ لیا تھا۔ جسے میں اتنے سال باہر خاک چھاننے پر بھی نہ سیکھ سکی۔

"آپ کیا سوچ رہی ہیں بی بی؟" اُس نے مجھے چونکا دیا۔ "میں سوچ رہی تھی کہ —— کہ تم اتنی باتیں کہاں سے جان گئے ہو۔ جو بڑے بڑے پڑھے لکھے بھی مشکل سے جانتے ہیں۔"

"بی بی! آپ تو مذاق کرتی ہیں۔" وہ ہنس پڑا۔

"ایسا نہیں ننھو۔ میں واقعی میں سچ کہہ رہی ہوں۔" میں نے اُسے یقین دلایا۔

"بی بی۔ حالات سبھی کچھ سکھلا دیتے ہیں۔ حادثات بتادیتے ہیں۔" وہ سنجیدہ ہوگیا۔

"ننھو تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تم زندگی کا کونسا رنگ پسند کرتے ہو۔" میں نے پھر دُہرایا۔

"کہہ دیا نا کہ وقت آنے پر آپ کو خود ہی معلوم ہوجائیگا۔" ننھو کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک جھلملانے لگی۔

"آپ بتائیں۔" اُس نے اپنی بات ٹالنا چاہی۔ اور میں نے کہا:-

"ہمیں تو زندگی کا ایسا رنگ پسند ہے جس میں دُھندلے دُھندلے سائے لرز رہے ہوں۔ آرزوئیں خون ہو ہو کر بہیں خواہشات پس پس جائیں۔ انسان مجسمۂ حسرت بن کر رہ جائے۔ ہر طرف تاریکی ہو۔ سیاہی بکھری ہوئی ہو۔ کبھی کبھی کوئی ستارۂ اُمید چمکے بالکل ویسے ہی جیسے کہ ایک سیاہ اندھیری رات میں بادلوں سے گھرے ہوئے آسمان پر کوئی بھٹکا ہوا شوخ ستارہ آنکھ مچولی کھیلے اور پھر —— پھر غائب ہوجائے۔ کوئی اُس کی طرف لپکے۔ اور وہ فریب دے جائے حسین فریب۔ جانتے ہو اس زندگی کا لُطف! ایسی زندگی شفق سے بھی زیادہ رنگین ہوتی ہے۔ اور اُس کا نام کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ جانتے ہو شفق کیا ہوتا ہے؟ بتاؤ تو بھلا۔ میں سمجھی اُس کی سمجھ سے بالاتر بات کہہ گئی ہوں۔ "جانتا ہوں بی بی،" وہ بولا۔ "بتاؤں۔" "شام کے وقت سورج ڈوبتے وقت آسمان پر جو سُرخی چھا جاتی ہے نا اُسے کہتے ہیں۔" ننھو! میں حیران ہوکر قریباً چلائی۔ "کیوں بی بی جی۔ آپ کو تعجب ہوا۔ میری بات پر۔"

"ہاں تو —— میں سمجھی تھی کہ تم بالکل پاگل ہو۔ جاہل۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" شوقِ تجسس نے ایک قدم اور بڑھایا۔ "ایک دن ساجدہ بی بی۔ ایک شعر گنگنا رہی تھیں۔" "تو تم شعر بھی سمجھتے ہو؟" میں نے کاٹ کی۔ "کچھ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ بی بی پڑھا کرتی تھیں تو میں سُنا کرتا تھا۔ جو لفظ سمجھ میں نہیں آتا تھا پوچھ لیا کرتا تھا۔ اس لفظ کے معنی بھی انہوں نے سمجھائے تھے۔" "اور کیا پوچھا کرتے تھے؟" میں نے کُرید کی۔

"وہ مجھے بہت کچھ بتایا کرتی تھیں۔ کتابوں میں سے پڑھکر۔"

"ہونہہ۔ اب میں سمجھی کہ تم یہ سب کچھ کس طرح جان گئے۔ کتنی اچھی ہیں تمہاری ساجدہ بی بی۔" میں جانتی تھی کہ وہ چونکہ میرے مقابلہ میں اُسے اتنا اچھا نہیں سمجھتا۔ اس لئے میں نے اُسے تنگ کرنا چاہا۔

"آپ جان جان کر ایسی باتیں کرتی ہیں میرا امتحان لینا چاہتی ہیں آپ؟ خیر میں اس سے نہیں گھبراتا۔" وہ کچھ دیر سوچتے ہوئے ایک گہری فکر سے چونک کر بولا۔ "امتحان تو وہ ہوتے ہیں۔ جو کتابیں پڑھکر دیئے جاتے ہیں۔" میں اُسے پھر مات دے رہی تھی۔ اور ادھر اس نے مجھے شکست دی۔ "کتابوں والے امتحانوں کے علاوہ اور بھی امتحان ہوتے ہیں

بی بی جی۔ جو زندگی کے ہر قدم بڑھتے ہیں"۔ میں اُن کی عقلمندی کی اب بھی قائل نہیں ہو رہی تھی۔

"تمہارے خیال میں ایسا ہوتا ہوگا ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ سال بھر کتابیں رٹی جاتی ہیں۔ پھر کوئی چند ایک افراد سے مقرر کر دیئے جاتے ہیں۔ جو ادھر اُدھر سے دیکھ کر پرچے بنا دیتے ہیں۔ پھر وقت اور دن مقرر ہوتا ہے۔ امتحان والے بیچارے ساری ساری رات جاگتے ہیں۔ کتابوں پر جھکے جھکے اونگھتے ہیں آنکھوں میں نیند کا خمار ہوتا ہے صبح ہوتی ہے تو دل میں دعائیں مانگتے جاتے ہیں۔ اے کاش۔ پرچہ آسان ہو۔ اے اللہ۔ اے خدا۔ اور پھر تین گھنٹے کاغذوں پر جھکے صفحے کے صفحے سیاہ کرتے ہیں بس امتحان ختم۔ بعد میں کوئی روتا ہے کوئی ہنستا ہے۔ بھئی ہم تو ایسے امتحانوں کے عادی ہیں۔ تمہارے خیال میں کوئی اور ہوتے ہونگے"

"آپ نہ مانیں تو پھر اس کا کیا علاج"۔ وہ پست ہو گیا۔ میں اپنی سی ہانکے جانے کی شروع سے عادی ہوں۔ اب کے بار جو بحث شروع ہوئی تو ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ پھوپھی اماں کو ضروری کام نہ آ پڑتا تو وہ کب ٹلنے والا تھا اور مجھے دیکھو بیکار میں اتنا وقت ضائع کر دیا اور وہ بھی بے معنی باتوں کے لئے۔

اور پھر اُس روز سے نمو کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ کام میں تو جیسے اس کا جی ہی نہیں لگتا تھا۔ اس کی وہ آنکھیں جن میں شوخی جھانکا کرتی تھی بے رونق سی ہو چلی تھیں۔ بال بکھر کر سیہہ کے کانٹوں کی طرح اُس کی پیشانی پر لٹکتے رہتے تھے۔ اُس نے تو جیسے کچھ پا کر کھو دیا۔ وہ امتحان کی تیاری میں بے طرح مشغول ہو گیا۔ اور میں ناول پر جھک گئی۔ دونوں کی مصروفیات میں کتنا فرق تھا امتحان کی تیاری میں طالب علم کتنا زرد پڑ جاتا ہے۔ سرسوں کے پھول کی طرح۔ آنکھیں اپنی چمک کھو کر دھندلی سی نظر آنے لگتی ہیں۔ بالکل بے نور۔ نمو کے لئے پہلا موقع تھا۔ اس سے پہلے اُس نے پڑھا ہی کب تھا پھوپھی اماں چیخ چیخ کر خاموش ہو گئیں۔ جب بھی انہیں پان اور چھالیا سے فرصت ملتی مجھ سے ہی شکوہ کرتیں "اللہ جانے نمو بیمار پڑ گیا ہے یا کیا۔ اسکی چستی جانے کہاں چلی گئی ہے۔ سارا کام وقت پر کر لیا کرتا تھا۔ اب تو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے اسے"۔

وہ پریشان سی ہو گئیں اپنے بچوں کی طرح چاہتی تھیں اُسے۔

"کسی ڈاکٹر کو دکھلا یئے نا؟" میں نے کہا۔

"ہاں، ہی تو میں بھی سوچ رہی ہوں"۔ "تو پھر آج ہی دکھا دیجئے"۔ "مجھ سے تو جایا نہ جائے گا۔ شمی بیٹا تم ہی لے جاؤ۔ میرے خیال میں اس وقت ڈاکٹر مل بھی جائے گا۔ مجھے تو غریب پر ترس آ رہا ہے۔ کس طرح زرد پڑ گیا ہے جیسے ہلدی۔ خدا جانے کیا تکلیف ہے بیچارے کو"۔

"کہاں لے جا رہی ہیں آپ؟" نمو کے چہرے پر جلال ٹپک رہا تھا۔ "ڈاکٹر کے پاس"۔ میں نے توجہ دئے بغیر جواب دیا "کیوں؟" آواز میں کرختگی تھی۔ "تم بیمار ہو نا"۔ میں نے اُسے وجہ بتائی۔ "بیمار"۔ "کون بیمار ہے۔؟" وہ چلتے چلتے رُک گیا۔

"تم۔ دیکھتے نہیں ہو اپنی حالت"۔ میں نے اُسے پیار آمیز غصہ سے گھورا۔

"بی بی جی آپ بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہیں جس کی اماں بی ہیں"۔ وہ جواب کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے اُس کی بات کی گہرائی تک پہونچنے کی کوشش کی۔ "مطلب۔ مطلب"۔ وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔ "آپ بھی نہیں سمجھ سکیں۔ آپ بھی نہیں سمجھ سکیں"۔ اُس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ "کیا میں بیمار نظر آتا ہوں؟ کیا میں۔ . . .!"

"بیمار نہیں تو کیا تندرست ہو۔ شکل تو دیکھو ذرا۔ چہرہ کس قدر پھیکا پڑ گیا ہے تمہارا"۔ وہ مسکرا پڑا۔ اور اس مسکراہٹ میں یاس و نا اُمیدی نہ جانے کتنی تیزی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔

"یہ بھی تو زندگی کا رنگ ہے۔ اس میں بیت جھڑ کی زردی سہی۔ یہ رنگ بھی تو اتنا ہی پیارا ہوتا ہے جتنا کہ "

"کیسی باتیں کر رہے ہو نمو"۔ مجھے اُس پر رشک آ رہا تھا۔ کتنا فہیم ہے۔ ہم اتنا پڑھ لکھ کر بھی فہم کورے کے کورے رہے۔

"آپ بھی میری باتوں کو پسند نہیں کرتیں کتنی عجیب بات ہے"۔ "اچھا وہاں تک تو چلے چلو ڈاکٹر کی دکان تک۔ یوں راستے میں کھڑے ہو کر باتیں کرنا معیوب معلوم ہوتا ہے"۔

"اس سے فائدہ؟" وہ وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ "چلو نا۔ دیر ہو رہی ہے ڈاکٹر چلا جائیگا مریضوں کو دیکھنے"۔ مجھے اُسکی ضد

اچھی نہ لگی۔

"اُسے چلے جانا چاہیئے۔ مریض اُس کے انتظار میں ہونگے۔"

وہ آہ بھر کر بولا۔ "چلو نا!" میں نے خوشامد کی۔ "گھر چلیں۔ میں تیار ہوں۔" "بڑے ضدی ہو تم۔" میں غصہ میں بھناتی ہوئی وہیں بیٹھ گئی۔ "ضدی ہوں بی بی؟" اُس نے یوں پوچھا جیسے وہ واقعی اس وقت ضد نہیں کر رہا تھا۔ "ہٹو میں نہیں بولتی۔" میں روٹھے ہوئے انداز میں بیٹھی رہی۔

"آپ ناراض ہوگئیں؟ آپ کیا چاہتی ہیں۔" وہ مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ "چلتے ہو تو چلو۔ ورنہ تم جاؤ گھر اور میں خود ہی آجاؤنگی۔" میں نے اُسے دھمکی آمیز لہجہ میں کہا۔ وہ کسی گہری فکر میں پڑ گیا جیسے خواب سے چونکا ہو۔

"آپ خفا نہ ہوں میں چلتا ہوں۔" وہ اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں اس کے پیچھے ہولی۔

"ڈاکٹر۔۔ مریض۔۔۔ نمو بیمار۔۔ زندگی کا رنگ کتنا اچھا اور کس قدر دلفریب؟" وہ آہستہ آہستہ دُہرائے جا رہا تھا اور میں سوچ رہی تھی۔ کتنا عجیب انسان ہے نمو بھی۔ کل تک یہ میرے نزدیک پاگل سا تھا۔ محض ایک بیوقوف۔ لیکن اس کی باتیں۔ معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ٹھوس معاملات پر کئی سال سے غور کر رہا ہے۔ اس کی فکر کتنی گہری ہے اور اُس کے خیالات کتنے بلند اور پاکیزہ ــــــ

ایک بے کس اپنے جذبِ دل کا اظہار تنہائی میں غیر مرئی چیزوں کے سامنے کرتا ہے۔ اس کا دُکھ سُننے والا جو کوئی نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنا غمِ دل چھپاتے چھپاتے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اور مہذب لیڈروں کے پاس اس کے کئی طریقے ہیں جنہیں وہ ہر طرح استعمال میں لاتے ہیں۔ ادھر نمو بھی تو اپنی چھوٹی سی کوٹھری میں بیٹھا جانے کتنے دنوں سے آہوں کے بھبکے چھوڑ کر اس کی دیواروں پر کالونچ پھیرتا رہا۔ مجھے تو کوٹھری کی دیواریں بڑی دھواں دار معلوم ہوئیں۔

"نمو ــــ!" میں نے اُسے خیالی دُنیا سے چونکا دیا۔

"بی بی آپ؟ کوئی کام تھا تو مجھے وہاں بُلا لیا ہوتا۔" وہ چور سا بنا نظریں چرا رہا تھا۔ "ذرا میرے کمرے میں چلو کچھ کام ہے۔" جب اُسے پتہ چلا کہ میں نے اُسے سامان کی تیاری کے لئے بلایا ہے تو وہ اور بھی اُداس ہوگیا۔

"آپ جا رہی ہیں؟" اُس نے میرے کپڑے تہ کرتے ہوئے ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں!" میں کتابیں سمیٹتے ہوئے بولی۔

"اتنی جلدی؟" اُسے دو ماہ کی طویل مدت بھی جلدی ہی معلوم ہو رہی تھی۔ "ہاں بھئی ــــ اماں جان کا خط آیا ہے۔ لکھا ہے اُداس ہوگئی ہوں بس اب آجاؤ۔" "اور جو ہم اُداس ہوں تو۔۔؟" وہ اس بیباکی پر جھٹ شرمانے کے لئے اور بھی مصروف ہوگیا۔ مجھے تعجب ہوا۔ "تمہارا کیا ہے۔" جواب دینا ضروری تھا۔

"تمہارا کیا ہے!" اُس نے اُداسی سے دُہرایا۔ "ہماری پروا کسے ہے۔ ہم ٹھہرے جو غریب۔ لاچار۔" اُس نے ٹھنڈی سانس چھوڑی۔

"یہ بات نہیں۔ مجھے غریبوں سے زیادہ ہمدردی ہوا کرتی ہے۔" "غریبوں کے ساتھ امیروں کی ہمدردی بھی کسی خاص مقصد کے لئے ہوتی ہے۔" وہ زمانے کی بات کر رہا تھا اور میں چڑ گئی۔

"بکومت نمو۔ کیا تم بھی مجھے اُن مطلب پرستوں میں شمار کرتے ہو؟"

"آپ تو خفا ہوگئیں۔ میرا مطلب آپ سے نہیں تھا۔" وہ شرمندہ ہوگیا۔ "اور یوں بھی تو سچ ہے کہ غریبوں کی دُنیا کوئی نہیں، غریبوں کا خدا بھی کوئی نہیں۔ غریب تمام عمر مرتے رہتے ہیں۔ وہ جینا نہیں جانتے۔ اُنہیں جینے کا حق نہیں مرنے کا حق نہیں۔ مرنے کی بھی فرصت نہیں۔" اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "یہاں پر سب سودے امیر کرتے ہیں۔ دکانیں سجتی ہیں۔ وہ نقد دام دے کر سودے خریدتے ہیں۔ وہ سودے پر سودا کرتے ہیں۔ اور دام پر دام دیتے ہیں جیبیں سُنہری سکے اُگلتی رہتی ہیں۔ اُن کی مانگ کی قدر ہوتی رہتی ہے۔ لیکن غریب کے پاس دھرا ہی کیا ہے، وہ کیسے امیرا نہ ٹھاٹھ کی دُکان پر سودا کرے۔۔۔۔ وہ۔" وہ رُک گیا۔

"اگر غریب کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تو وہ پھر سودا کیوں کرے۔" میں نے معلوم نہیں کس خیال میں یہ فقرہ کہہ دیا۔ در اصل میں نے اسکی باتوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش نہ کی، اور ایسے ہی بک دیا۔

"سرمایہ! سرمایہ نے آپ کی آنکھیں اندھی کر دی ہیں"۔ وہ چلایا "سرمایہ کے آئینہ میں سے آپ امیروں کے دل دیکھتی ہیں۔ دلوں کے سودے کے لئے سرمایہ مہلک ہے۔ تباہ کن۔ یہ آگ ہے آگ۔ آپ اس سے کھیلنا نہیں جانتیں بی بی۔ آپ آج تک صرف سکوں سے کھیلتی رہی ہیں" اُس کی آواز مدھم پڑ گئی۔ "یہ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے نمو؟"

میں اُس کی دیوانگی پر حیران تھی۔ "دیوانہ ہو گیا ہوں سٹھیا گیا ہوں۔ دماغ چل نکلا ہے۔ اس لئے کہ میرے پاس سرمایہ نہیں کہ میں کھنکھناتے ہوئے روپیوں سے سودا کر سکوں۔"

"ایسے بھی بعد میں کر لینا سب سودے۔ پہلے چیزیں درست کرو۔ ابھی کافی کام پڑا ہے۔" میں اُس کی باتوں سے تھکان محسوس کرنے لگی۔ "آپ کو تو سکوں کی کھنک پسند نہیں ہے نا؟ آپ کو غریبوں سے ہمدردی ہے نا؟ پھر آپ کیوں میری باتیں نہیں سمجھتیں؟" وہ فرش پر میرے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا۔ "تم کیا چاہتے ہو نمو ـــ؟" میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ بپھرے کے دل میں پتے ہوئے سے نشان نظر آ رہے تھے۔ "میں کیا چاہتا ہوں؟ اگر دل سے یہ پوچھا جائے کہ وہ کیا چاہتا ہے تو پھر وہ شاید چاہنا ہی چھوڑ دے۔" اُس کی نگاہیں مجھ پر جم گئیں۔ میں جھنجھلا گئی۔ نمو ہوا تو کیا۔ تھا تو مرد ہی آخر کو۔ میں نے اُس کے اشارہ کو پا لیا۔ میرے پاس جواب ہی کہاں تھا۔ خاموشی بھی اکثر غلط فہمیاں پیدا کر دیتی ہے۔

نمو سب کچھ بھول گیا۔ شاید میرا جی نا بھی۔ وہ پھر سے چیزیں سمیٹنے میں مشغول ہو گیا۔ لیکن تھوڑے عرصے اور اس دوسری کی حالت میں فرق تھا۔ اضطراب کی جگہ سکون نے لے لی تھی۔ ایک سنسنی سی ... اور بعد میں یہی سکون نے غالباً پہلے طوفان سے زیادہ خطرناک ثابت ہونے والا تھا ـــ کون جانے۔

وہ دو انسانوں کے ہر چیز کے سمیٹنے میں دیر کرتا رہا۔ میں اُس کی ہر حرکت بڑے غور سے دیکھتی رہی۔ اس کے بڑے بڑے بے ڈھنگے آہستگی سے ہلتے رہے۔ کپڑوں کی تہیں جمتی رہیں۔ نمو کے آنسو آستینوں میں جذب ہوتے رہے میں دیکھتی رہی۔ دیکھتے دیکھتے میری آنکھوں میں پانی آ گیا۔ میں نے آنکھیں مسل ڈالیں۔ نمو نے دیکھ لیا ـــ وہ مسکرا پڑا۔ وہ کیا سمجھے گا؟ اب کیا ہو گا ـــ میں نے سوچا۔ میرا سوچنا بیکار تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا نہ جانے کیا۔

چند مہینوں بعد میں بھول بھال بھی گئی۔ ساجدہ نے کالج رہ کر تو کبھی خط نہ لکھا۔ چھٹیوں میں گھر گئی تو تانتا باندھ دیا۔ ہر بار نمو کا ذکر۔ کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ کام میں دل نہیں لگاتا۔ کچھ کہو تو رونے لگتا ہے۔ جہاں دیکھو وہیں ننھی سی لکیریں کھینچتا رہتا ہے۔ جیسے وہ کچھ لکھ کر اپنی تسکین چاہتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرتا رہتا ہے۔

ہر وقت میرے سامنے تمہاری ہی باتیں کرتا۔ گویا اُسے کوئی اور کام ہی نہیں۔ ساجدہ کمینی کو دیکھو۔ بھلا مجھے لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ کوئی پڑھے تو ... ؟ مجھے بڑا غصہ آیا۔ سامنے ہوتی تو مزہ چکھاتی ـــ پھر خط۔ بیمار ہو گیا ہے۔ علاج نہیں کرواتا۔ کہتا ہے مجھے کوئی بیماری نہیں۔ بڑا غصہ آیا۔ میں نے خط پھینک دیا۔ پھر اطلاع ... نقاہت بڑھ گئی ہے۔ اماں اُس کی حالت دیکھ کر رو پڑتی ہیں۔ مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے بیچارا نمو۔ ایک اور خط۔ زندگی کے دن ختم ہوتے نظر آ رہے ہیں۔

"نمو مر رہا ہے۔ نمو۔ مر رہا ہے ـــ!" میرے دل پر کچوکے لگنے لگے۔ بے رونق آنکھیں اُبھریں۔ جلے ہوئے لب اور بڑھی دکھائی دئے۔ کانوں میں جیسے کوئی چیز بھنبھنا رہی تھی ـــ "اگر دل سے یہ پوچھا جائے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ تو پھر شاید وہ چاہنا ہی چھوڑ دے۔"

"نمو بیمار ہے ـــ آپ کو تو غریبوں سے ہمدردی ہے نا؟" پھر کسی نے کہا۔ "ایک غریب کو ہمدردی کی ضرورت ہے نہیں نہیں اُسے کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔ پیار کی۔ محبت کی۔ اُسے بھیک ملنی چاہئے۔ میں اُسے بھیک دوں گی ـــ وہ بھیک لئے بغیر نہیں جا سکتا۔ وہ تسکین کے بغیر نہیں مر سکتا۔"

"نمو! نمو!" ساجدہ نے اُس کو جھنجھوڑا۔ "آنکھیں کھولو۔ بی بی جی آئی ہے۔ وہ دیکھو۔ کھڑکیوں کے پٹ کھلے۔ وہاں تاریکی چھا رہی تھی۔ باوجود کوشش کے میں اندھیرے میں راستہ نہ پا سکی۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمو کے چہرے پر پھیل گئی۔ اُس نے آہستہ سے کچھ کہا۔ میں جھک گئی۔

"آپ کو یاد ہے ... میں نے ایک بار کہا تھا۔ زندگی کے

کئی رنگ ہوتے ہیں" وہ رُک رُک کر بولنے لگا۔ "آپ نے پوچھا تھا۔ تمہیں کونسا رنگ پسند ہے۔ میں نے جواب دیا تھا۔ وقت آنے پر بتاؤں گا" وہ رُک گیا۔ میرے دل پر دھچکا سا لگا۔ "اور میں نے ساجدہ کی موجودگی کو نظر انداز کر دیا۔ "نمو۔ تمہیں اتنا بھیانک رنگ کیوں پسند ہے۔ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔ نمو"! میں نے بے تاب ہو کر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ کانپ اُٹھا۔ اُس کے چہرے پر ایک چمک سی آگئی "امیروں کے پاس روپوں کی جھنکار ہے۔ اور غریبوں کے پاس شکستہ دل کے ساز کی مدھم سی جھنکار۔ ایک غریب کے پاس اگر سرمایہ نہیں تو وہ سودا کرنے کا حق دار بھی نہیں" اس کی سانس اکھڑنے لگی "غریب نے سودا کیا ہے۔ اور اس کی قیمت.. "؟ اُس نے بے نور آنکھیں مجھ پر گاڑ دیں "میں زندگی کے اس امتحان میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ مجھے مبارکباد کہو بی بی" "نمی کہو نمو۔ صرف نمی۔" میں نے اُس کی آنکھوں میں گھورا۔ وہاں زندگی اور موت کے بیچ لڑے جا رہے تھے۔ "نمو—!" میں اُس پر بالکل جھک گئی۔ میری سانس اُس کی اُکھڑی اُکھڑی سانسوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اُس نے مُسکرانے کی کوشش کی۔ زندگی کی ڈور کٹ گئی۔ پتنگ ڈولتی ہوئی تن سے گر پڑی —— میرا سر جُھک گیا——!

گذرگاہِ خیال:- ظفر قریشی دہلوی کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ۔ ظفر قریشی نے پندرہ سال میں سینکڑوں افسانے لکھے ہیں اور یہ افسانے اُن سب کا نچوڑ ہیں۔ ان کی کہانیوں کے پلاٹ دلچسپ اور طرزِ بیان دلکش ہوتا ہے۔ کتاب مجلّد۔ قیمت دو روپے!

دریچے:- ظفر قریشی دہلوی بی۔ اے کے بارہ نئے افسانوں کا مجموعہ۔ ظفر قریشی نے افسانہ نگاری میں ایک نیا اسلوب ایجاد کیا ہے۔ جو مؤثر اور نہایت دلکش ہے۔ کتاب مجلّد اور نظر فریب سرورق سے آراستہ ہے

قیمت دو روپے!

ملنے کا پتہ:-

ساقی بک ڈپو دہلی سے طلب کیجئے!

نصرت آرا نصرت

"عافیت کوشی"

(عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی)

بڑھا دو جام، بجھا دو چراغِ زینتِ شب
ہٹا دو ہونے سے شب رنگ ریشمیں پردے
سحر کا نور جھلکنے لگا دھندلکوں سے
خِرد نے آکے جہالت کے سر د رکھو لے

اُٹھو کہ بیت گئیں حسن و عشق کی باتیں
چلو کہ ختم ہوئی بزمِ داستانِ قدیم
بس اب اُٹھو بھی رفیقانِ بزمِ عشق و نشاط
اُٹھو کہ پھر سے مچلنے لگے یہ عزمِ صمیم

ہمیں شباب نے بخشے ہیں آہنی پنجے
ہمیں جمود کا یہ قفل توڑ دینا ہے
اُٹھو کہ ہم کو منازل پہ پہنچنے سے قبل
سکوتِ ماضی کو نعروں سے پھوڑ دینا ہے

مگر نظام بدلنے سے آخرش حاصل
کہ روز و شب کا تسلسل کبھی نہ ٹوٹے گا
زمیں کے گھومنے گنبد نما چکر کے سے
مے حیات کا گر کر نہ جام پھوٹے گا

وہ دیکھ رات کی تاریکیوں میں رقصِ نجوم
یہ دیکھ جادۂ ہستی پہ حادثات کے داغ
نظامِ کہنہ کے بجھے سے کبھی یہ جلتے رہے
یہ آنسوؤں کے ستارے، یہ ہچکیوں کے چراغ

ہزاروں سالوں سے گرمِ سفر تھا انساں
رہِ نظامِ تصور پہ، ارتقا کے لئے
مگر ہوا ہمہ تہذیب اسکو بتلا دو
ابھی یہ ساحلِ ہستی پہ سنگ ریزے چُنے

تو اب جمود کا تقاضا یہی ہے رُک جاؤ!
اُٹھاؤ طوق، خداؤں کے آگے جُھک جاؤ

از بیگم چندر کرن سونریکسا

زنجیر کی کڑیاں

بدلو مارے ہی جاتا تھا، لات گھونسے، تھپڑ کسی کی گنتی نہ تھی۔

"سالے، حرامی کے پلّے! پھر پئے گا؟ میں تو خون پسینہ ایک کر کے تیرے لئے کماتا ہوں۔ دن بھر بیل سا جتا رہتا ہوں، اسکول کی فیس، کتابوں کا خرچہ، سیاہی، قلم سب ہی کسی نہ کسی طرح مہیا کرتا ہوں اور تیرے یہ ڈھنگ؟ حرام زادے۔ پھر پئے گا؟" اس نے رگھو کے بال پکڑ کر دو ردّے اور جما دئے۔ "آج تیری جان لے کر چھوڑوں گا۔"

"ہائے بابو مرگیا۔ تیری قسم! گنگا مائی کی قسم، تیرے ہاتھ جوڑوں بابو!" رگھو نے تکلیف سے بلبلاتے ہوئے رو کر کہا۔ "چھوڑ دے میرے بال چھوڑ دے!"

پڑوسی بھی اکٹھے ہو گئے تھے، رام لال رگھو کو بچانے کے لئے ہاتھوں کی آڑ کر رہا تھا۔ رمضانی بدلو کو سمجھا رہا تھا "جانے بھی دے بچّہ ہے، یہ تو پھر بھی تیرہ برس کا ہے، آجکل تو آٹھ آٹھ برس کے لڑکے بیڑی پیتے ہیں۔"

"پیتے ہوں گے۔" بدلو نے رگھو کی کمر میں کس کر لات جماتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی کیا ان ہی جیسا نکلے گا؟ ارے بھائی میں تو برباد ہو ہی گیا۔ زندگی ہی خراب ہو گئی۔ سالے سبھی عیب لگے ہوئے ہیں، تاڑی۔ افیم، جوا! تن پہ کبھی ثابت کپڑا نہ پہنا، پیٹ بھر کبھی روٹی نہ کھائی۔ اب یہ تو ایسا نہ نکلے اسی لئے تو اس کو کسی کی مجبوری پر نہیں بھیجتا، نہیں تو اتنے اتنے بڑے لڑکے دھیلی روز کماتے ہیں۔ اسکول میں داخل کر دیا ہے کہ چار حرف پڑھ جائے گا تو کچھ گیان ہو جائے گا۔ دنیا کی خبر ہو جائے گی اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ کسی طرح مڈل کر لیگا تو اچھی نوکری مل جائیگی، چپراسی ہی ہو جائے گا کسی دفتر میں۔ پر اس سالے کی عقل پر تو پتھر پڑے ہیں پتھر۔ مجھے دیکھ کر بھی تو اسے سبق نہیں ملا کہ دیکھو ان لتوں میں پڑ کر میرا باپ کیسا برباد ہو گیا ہے . . . ابھی سے بیڑی پیتا ہے . . آگے چل کر تاڑی پئے گا، شراب پئے گا۔ کیوں بے۔" بات کہتے کہتے بدلو غصہ اور بھی بھڑک اٹھا، پیر کا جوتا نکال کر رگھو کے سر پر جمایا۔

"رام کرے تو مر جاتے، ابھی مر جائے" — رگھو نے بلک کر کہا "تجھے گنگا مائی سمیٹ لے۔"

بدلو نے دوبارہ جوتا اٹھایا مگر رمضانی نے بیچ ہی میں اس کا ہاتھ تھام کر جوتا دور پھینک دیا۔ منوہر نے اس کی مٹھی سے رگھو کے بال چھڑاتے ہوئے کہا "اب کیا جان سے ہی مار ڈالے گا؟ بچّہ ہے قصور ہو ہی جاتا ہے، چلو اب نہیں پئے گا۔"

رگھو جھپٹ کر دور جا کھڑا ہوا۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ ہاتھ سے کہنی ملتے ہوئے سوچا "اتنی چوٹ ماسٹر جی کے ڈنڈے کی بھی نہیں لگتی۔ بابو کا ہاتھ بہت کڑا ہے۔"

بدلو نے جوتا پہنتے ہوئے پڑوسیوں کی طرف مڑ کر کہا۔ "مجھے کیا اسے مارتے درد نہیں آتا؟ سسرے کی ہڈی ہڈی تو چمکتی ہے۔ جانے کس کے بل جیتا ہے! ارے روٹی دال تو دونوں وقت بھر پیٹ جڑتی نہیں، اس پر بیڑی پینا سیکھ گیا ہے! کلیجہ جل کر راکھ ہو جاتا ہے ایک دم۔ یہ نہیں کہ کبھی اگر کبھی کہیں سے دو پیسے ملجائیں تو پیٹ میں کچھ کھا لے۔ امرود بک رہے ہیں، وہی لے لیتا نہیں تو پیڑا لے کر کھا لیتا، برفی کھا لیتا . . . نہیں صاحب بیڑی پئیں گے بیڑی۔"

رمضانی نے رگھو کے سر پر ہاتھ پھیر کر پوچھا۔ "اب تو بیڑی نہیں پئے گا؟"

رگھو نے سر ہلا کر نفی میں جواب دیا "نہیں" وہ اب بیڑی نہیں پئے گا . . . آہ! کہنی کیسی درد کر رہی ہے۔ وہ لنگڑاتا ہوا ایک طرف چل دیا۔

"ابے اسکول کا وقت ہو گیا۔" بدلو نے اسے پکار کر کہا۔ پھر اپنا میلا انگوچھا کانوں سے لپیٹ کر بسولی اٹھا کر مزدوری کرنے چل پڑا۔

عمر کے لحاظ سے رگھو کلاس میں سب سے بڑا تھا اور پڑھائی میں سب سے چھوٹا۔ چوتھی میں ہوتے ہوئے بھی اسے تیسری کے

سوال نہیں آتے تھے، جغرافیہ کے نام اُس کی نانی مرجاتی، لیکن اس میں اُس کا زیادہ قصور نہ تھا۔ جیسے تیسے سال کے شروع میں اس کے باپ نے پُرانی کتابیں دلوادی تھیں۔ سلیٹ کی جگہ اُس کے پاس ٹین کا ٹکڑا تھا، جس پر بدلو نے اپنے ساتھی دیواروں پر لکھنے والے چوتھے درجہ کے پینٹر سے کالا رنگ پتوالیا تھا، اسی پر وہ کھریا سے سوال نکالتا تھا۔ لیکن اسکول کھلنے کے دس دن بعد ہی ایکدن دوپہر کو پانی پینے کی چھٹی میں وہ ڈاکٹر صاحب کے باغیچہ میں املی توڑنے چلا گیا تھا۔ اسی دوران میں کسی نے اس کی حساب اور جغرافیہ کی کتابیں پار کردیں! اس کے باپ میں دوبارہ کتابیں خریدنے کی ہمت نہ تھی۔ رگھو کی پیٹھ پر دوچار جوتے برساکر ہی صبر کرلیا۔

دوسروں کی کتابوں سے تاک جھانک کرکے کبھی اسکول سے غیر حاضر رہ کر اور کبھی مرغا بن کر رگھو نے سال کے نو مہینے گذار دئے۔ لیکن اب سالانہ امتحان آرہا تھا۔ سوتے ہوئے ماسٹر اپنی اگلی پچھلی ساری غفلت اور آرام کی تیزی منتھیوں میں بھر کر پڑھانے میں مصروف ہوگئے تھے۔ روزانہ بیس سوال نکالنے کو دئے جاتے تھے۔ پانچ پانچ سبق کے معنی یاد کرنے ہوتے تھے۔ ایک نظم زبانی یاد کرنی ہوتی تھی۔ ایک بینگن، بالٹی، مرغا یا کتا پنسل سے کھینچ کر گھر سے لانا ہوتا تھا۔ کام کی حد نہ تھی۔

رگھو کے پاس نہ ربڑ تھی نہ ڈرائنگ کی کاپی کاغذ نہ ہونے کی وجہ سے وہ تین سوال سلیٹ پر کرلایا تھا، جس میں دو غلط تھے۔ نظم یاد کرلی تھی، لیکن معنوں کے نام صفا چٹ تھا۔ کلاس کے چھٹوں گھنٹوں میں سے تین میں مرغا بننا پڑا، چوتھے میں تفریح کی چھٹی بند ہوئی، پانچویں میں بید پڑی اور چھٹے میں اسکول ختم ہونے تک کھڑا رہنا پڑا۔

آج جتنی سزا اسے کبھی نہ ملی تھی، اس کے کان اور پیٹھ مدد کر رہے تھے۔ نہیں اب وہ اُس وقت تک اسکول نہ جائیگا جب تک باپو اُسے ساری کتابیں، پانچوں کاپیاں اور ربڑ نہ لادے۔ گھر آکر اُس نے روکر ماں سے ساری باتیں کہیں، ماں بیچاری کیا کرے؟ اُسکے پاس تو زہر کھانے تک کو پیسہ نہیں رہتا، دو دو دن کے فاقے کرکے رگھو کو پالا ہے۔ سُن کر چُپ ہورہی۔ رات کو بدلو گھر آیا۔ رگھو نے خوف ہوکر کہہ دیا۔ "جب تک سب سامان نہ ہوگا میں اسکول نہیں جاؤں گا۔ ماسٹر جی مارتے بھی ہیں اور ناراض بھی ہوتے ہیں۔ خاصکر ڈرائنگ ماسٹر بہت سخت ہیں، اُنھوں نے کہا ہے کہ کل تینوں دن کی چڑیا، لطیخ اور جیبل کا پتہ نہ بناکر لایا تو دو درجن قمچی پڑیں گی۔" بدلو نے مجبور ہوکر کہا "اچھا اچھا! دو چار دن میں سب منگا دوں گا۔ ٹھیکہ دار نے ابھی حساب نہیں کیا ہے۔"

رگھو نے بھنبھنا کر کہا۔ "نہیں کم سے کم ڈرائنگ پیپر اور ربڑ کے بغیر تو میں کل جاؤں گا ہی نہیں۔"

بدلو کا مزاج گرم ہوگیا "سالے جرنیلی حکم چلاتا ہے اور کیوں، پرسوں جو تیرا چچا تجھے اکنی دے گیا تھا اُس کا کیا کیا؟"

"پیبڑے لے کر کھاتے تھے۔"

"او حرامزادے!" بدلو نے گرج کر کہا۔ "اکنی کے پیڑے کھا گیا! کیا کہنے ہیں نوابی کے! ابے ایک پیسہ کھالیتا، تو بھی تین بچتے۔ ایک کی ربڑ لے آتا دو پیسے کے کاغذ۔"

رگھو تنک پڑا۔ "اُس دن تو کہتے تھے کہ پیڑی نہ پیاکر، پیڑے کھالیا کر، آج کہتے ہیں کاغذ لے آتا۔ کیوں لے آتا کاغذ! میرے پیسے تھے ... !"

بدلو نے اُس کی گردن پکڑ کر دو گھونسے جما دئے۔ "بگڑتا جاتا ہے! میں تجھے تیر سا سیدھا کردوں گا۔ تو ہے کس ہوا میں؟ سُسرے چار پیسے کھا گیا۔ پیٹ نہ ہوا کنواں ہوگیا! جنہیں پڑھائی کا شوق ہوتا ہے وہ تو پیٹ کاٹ کر بھی اسکول کا خرچہ پورا کرتے ہیں۔ تو چٹورا کیا پڑھے گا! گھاس کھودے گا گھاس!"

اسکول میں جلسہ ہونا تھا۔ چوتھی کلاس کی وردی خاکی اور جوتے سفید رکھے گئے تھے۔ رگھو وردی کہاں سے لائے؟ اُس نے اُٹھ کر کہا "ماسٹر جی میرے باپو کے پاس کپڑے سلوانے کو پیسہ نہیں ہے۔"

"تاڑی پینے کو پیسے ہیں؟" پڑوسی لڑکے نے طنزیہ کہا۔

رگھو تلملا کر رہ گیا۔

"ہم نہیں جانتے" ماسٹر نے سنجیدگی سے کہا۔ "چاہے کہیں سے لاؤ"۔ رگھو نے کچھ کہنے کو منہ کھولا، لیکن ماسٹر جی کی عجیب سی شکل دیکھ کر چپ ہو گیا۔

گھر آکر وہی ہمیشہ کی جھک جھک اور گالی گلوچ۔ بدلو نے گرم ہو کر کہا۔ "نہیں ہے میرے پاس وردی فردی اچا بھک مانگ، چوری کر اور وردی لا۔ میں تیرے سب بہانے سمجھتا ہوں۔ خود بالو ٹنے کو جو جی کرتا ہے، نام ماسٹروں کا لگا دیا"۔

رگھو بڑی الجھن میں پڑ گیا۔ جلسے کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ نیکر قمیص دینے کا وعدہ اُسکے ایک ساتھی نے کر لیا تھا مگر جوتے کہاں سے آئیں، سفید کریپ کے جوتے؟ وہ بازار جا کر دام پوچھ آیا تھا۔ اُسکے پاؤں کے جوتے پندرہ آنے میں آئیں گے۔ پندرہ آنے! اب سے وہ اتنے پیسے کہاں سے لائیگا؟ اُس نے اپنی گلک اُٹھا کر دیکھی۔ اُس میں کل سوا پانچ آنے تھے جو پیسہ پیسہ کر کے جمع کئے تھے۔ ہار کر اُس نے آخری تدبیر پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ بدلو کے کرتے میں لگے ہوئے چاندی کے بٹن اپنے ہم جماعت کے ہاتھ بیچ کر جوتے لے آیا۔ سوچا باپو سے کہدوں گا "میں نہیں جانتا تمہارے بٹن وٹن جوتے میرے ایک دوست نے دئے ہیں۔ بس"۔

جلسہ ختم ہوا۔ رگھو دوڑ میں اوّل آیا تھا۔ اسے روپیہ کے برابر چاندی کا میڈل انعام میں ملا تھا۔ خوش ہوتا، خاکی وردی اور سفید جوتے پہنے خوش ہوتا ہوا اسکول سے نکلا۔ اچانک بدلو نے آکر پیچھے سے اسکی گردن پکڑ لی۔ "سالے حرامی چوری بھی کرنے لگا۔ گھر چل اب تجھے زندہ زمین میں گاڑ دوں گا"۔ اور پھر ایک، دو، تین، چار ــــ رگھو ان گنت لاتوں گھونسوں اور تھپیڑوں کی مار کھاتا ہوا گھر آیا۔

رگھو کے اسکول کا وہ آخری دن تھا۔

بیس سال بعد رگھو گھسیٹا کو مارے ہی جاتا تھا۔

سالے! حرامی کے پلّے۔ پھر پئے گا بیڑی؟ آج تیری جان لے کر چھوڑونگا۔ شسرے میں تو بغیر پڑھے برباد ہو ہی گیا۔ اب کیا تو بھی گھاس ہی کھودے گا؟ باپو نے پڑھانے کیلئے مجھے کتنا مارا مگر میں نالائق نکل گیا کل پھل بھوگ رہا ہوں! تو تو مڈل کرکے کہیں چپراسی ہو جائے گا! نہیں ... تو تو بیڑی پئے گا بیڑی! یہیں کہ پیسے کا پیڑا ہی کھا لے ... حرامی!" ننھا گھسیٹا کہہ رہا تھا "گنگا مائی کی قسم باپو اب نہیں پیوں گا"

انجم رومانی

مادّیت

اگر کوئی یہ کہے کہ اک عضو جسم دجال ہے۔
تو کون مانے گا بات اُس کی؟
مگر جہاں والے مانتے ہیں!

اگر کوئی یہ کہے کہ اک ذرّے سے ہیں قائم تمام ذرّے،
تو کون مانے گا بات اُس کی؟
مگر جہاں والے مانتے ہیں!

مگر کوئی جب یہ بات کہتا ہے:
"ایک ہستی کے ہاتھ میں ہے نظامِ عالم"
تو کوئی بھی مانتا نہیں ہے!

تین شعر

کہتے ہیں کہ خواب سی ہے دُنیا
افسوس! کہ خواب ہی نہیں ہے
کیا تجھ کو خبر نسیم ہوا کی
تو پھول نہیں کلی نہیں ہے
دلچسپ تو ہے ترا فسانہ
کیا کہیئے کہ گفتنی نہیں ہے

تبصرہ

مصنف کے مذہبی جذبات کی آئینہ دار۔ شاعرانہ اعتبار سے کمی کوئی مسلّم نظر نہیں آتا۔ البتہ کہیں کہیں پختگی کے آثار نمایاں ہیں قیمت ۱۲؎ ملنے کا پتہ اُردو محل حیدرآباد۔ دکن!

تلاطم:۔ محمود جالندھری پنجاب کے مشہور شاعر ہیں وہ ایک حساس دل اور فکرمند دماغ رکھتے ہیں۔ خوابوں کی دُنیا میں رہنے بسنے کی بجائے، زندگی کے طوفانوں سے کھیلنے کی دعوت دیتے ہیں۔ زندگی کو اُس کے اصلی رنگ میں پیش کرنا ان کا فن ہے "تلاطم" ان کی تازہ نظموں کا مجموعہ ہے، جس میں ان کا فن اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ قیمت عہ اعلیٰ اڈیشن ۱۲؎ ملنے کا پتہ مکتبۂ جدید۔ لاہور!

جہانِ آرزو:۔ حضرت آرزو لکھنوی ہندوستان کے مشہور شاعر اور لکھنؤ اسکول کے نمائندے ہیں۔ پچھلے چند برس سے وہ بمبئی میں ہیں اور مختلف فلم کمپنیوں کے لئے گانے لکھنا ان کا شغل ہے "جہانِ آرزو" ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے، جس میں استادانہ فکر کے ساتھ لطف زبان بھی ہے اور حسن بیان بھی۔ اُردو ادب میں آرزو لکھنوی کا ایک مخصوص درجہ ہے اور اس اعتبار سے ان کا کلام اپنے دامن میں افادیت کے بہت سے پہلو رکھتا ہے۔ قیمت مجلّد ۲؎ کلدار ۱۲؎ حالی۔ ملنے کا پتہ۔ نفیس اکیڈیمی عابد روڈ، حیدرآباد۔ دکن!

دامنِ تہی:۔ سید مبارز الدین رفعت ایم۔ اے اُردو کے متوسط درجہ کے افسانہ نگاروں میں ہیں۔ "دامن تہی" ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے، جس میں موجودہ انسانی زندگی کے المناک پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے۔ جس میں زور بھی ہے اور واقعیت بھی۔ قیمت مجلّد ۲؎۔ ملنے کا پتہ: ادارۂ دانش و حکمت حیدرآباد۔ دکن۔

نواب بہادر یار جنگ مرحوم اسلامی ہند کے اور ناقدوں نے ان پر اور ان کے کارناموں پر سیر حاصل لکھے تھے۔ تمام مضامین منتخب ہیں اور اپنے اپنے موضوع کو محیط، ہر مضمون نگار نے علاّمہ مرحوم کی ادبی کوششوں کو سراہا ہے اور اُن کے کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ علاّمہ مرحوم سے دلچسپی اور عقیدت رکھنے والے طبقوں کے لئے یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔ کتابت اور طباعت صاف ستھری، سرورق نہایت جاذبِ توجہ، مجلّد قیمت ۴؎۔ ملنے کا پتہ:۔ خاتون کتاب گھر۔ اُردو بازار۔ دہلی۔

اور بنسری بجتی رہی:۔ دیوندر ستیارتھی کے بارہ افسانوں کا مجموعہ، جس میں ستیارتھی کا فن اپنے عروج پر ہے۔ ستیارتھی کے افسانوں کا پس منظر عام طور پر پنجاب کے دیہات ہوتے ہیں اور ان کا قلم بسا اوقات پرولتاری افکار کی ترجمانی کرتا ہے، وہ خارجی مسائل پر زیادہ توجہ صرف نہیں کرتے بلکہ داخلی کیفیات کی عکاسی کرتے ہیں اور یہی چیز ان کے کمال کو انفرادی رنگ میں رنگتی ہے۔ قیمت ۳؎ مجلّد مع سرورق۔ ملنے کا پتہ: انڈین اکیڈیمی۔ لوہاری گیٹ لاہور!

تعمیرِ نو:۔ مصنفہ اختر حامد خاں۔ اس مختصر سے رسالے میں مصنف نے خاکسار تحریک کی تاریخ اور اُن واقعات کا تجزیہ کیا ہے، جن کی بنیاد پر یہ تحریک ظہور میں آئی۔ قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ: دفتر ریڈینس، بیگم باغ۔ میرٹھ!

عادثے:۔ عروج کونڈردی کے نو افسانے ہیں جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف میں افسانہ نگاری کی صلاحیت ہے اور اگر وہ کوشش کریں تو بہت جلد اچھے افسانہ نگاروں کی صف میں شامل ہوسکتے ہیں۔ قیمت ۲؎ کلدار ۱۲؎ حالی، ملنے کا پتہ: دبستان اُردو۔ ۸۶۷۔ ملمنڈی۔ حیدرآباد۔ دکن!

نسیات:۔ انیسہ ہارون شروانیہ کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جن میں بیشتر نظمیں مذہبی ہیں اور

برطانوی سیاست کو خوب سمجھتے تھے اور اسی سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ان کا ایک خاص احترام تھا۔ یہ محبوب قائد ملت کچھ عرصہ ہوا کہ ہم سے جدا ہو گئے۔ اور اب ان کی سوانح عمری غلام محمد صاحب بی۔ اے نے مرتب اور نفیس اکیڈیمی نے شائع کی ہے۔ مرحوم سے عقیدت رکھنے والوں کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے قیمت مجلد مع حسین سرورق قیمت ۱۲/ کیلنڈر ستے حالی۔ ملنے کا پتہ۔ نفیس اکیڈیمی۔ عابد روڈ حیدرآباد دکن

آپ کی غذا: جنگ نے ہندوستان کے لئے جہاں اور مسائل نئے نئے مسائل ـــــ پیدا کر دئے ہیں، وہاں غذا کے مسئلہ کو بھی نہایت درجہ اہم بنا دیا ہے اوّل تو عام صحت کیلئے بھی ہمیں غذا کے مسئلہ پر احتیاط سے غور کرنا چاہیئے لیکن ایسی حالت میں جبکہ ہماری معمولی غذا بھی پہلے سے مختلف ہو گئی ہے، اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے منو مساقی صاحب نے حالات موجودہ کے پیش نظر اس مسئلہ پر سائنٹفک نقطۂ نظر سے بحث کی ہے، جو امید ہے کہ مقبول ہو گی اس کتاب کا اردو میں ترجمہ جامعہ کے ایک اہم رکن پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم۔ اے نے کیا ہے، جو صاف اور سہل ہے قیمت ۱۲/ ملنے کا پتہ:۔ طاٹا سنس لمیٹڈ!

تار و پود:۔ ملونت سنگھ اُردو کے مشہور افسانہ نویس ہیں۔ ان کے افسانے اُردو کے معیاری ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ "تار و پود" ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے، جس میں پنجاب کے گاؤں کی زندگی کی ترجمانی بڑے اچھے اسلوب میں کی گئی ہے۔ قیمت ۳/ ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ جدید، لاہور

ہتھوڑے:۔ شفیق قادری صاحب نے اُن نظموں کا انتخاب اسی نام سے شائع کیا ہے، جو مختلف شاعروں نے موجودہ حالات سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔ موجودہ حالات سے ہماری مراد وہ حالات ہیں جو غربت، فاقہ کشی اور اسی قسم کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ انتخاب اچھا خاصہ ہے۔ قیمت ۸/۔ ملنے کا پتہ: شمسی پریس بک ڈپو۔ گیا۔

[illegible] کرتے ہیں پھر اتنی ہو جائے گا!
ہیں۔ ...تو تو میری پتنی کا بیڑی ایسیں کے پیسے کا بیڑا ہی کھا لے ... حرامی!
[illegible] ہاتھ [illegible] کی قسم باپ اب نہیں پیوں گا۔

نجم رومانی

مادّیت

[illegible] کوئی یہ کہے کہ اک عضو جسم و جاں ہے۔
[illegible] کون مانے گا [illegible]

سوشل انقلاب کے فطری اصول - اس کتاب میں کامریڈ غلام احمد صاحب نے پہلے انقلاب کی تعریف اور اس کی اقسام بیان کی ہیں۔ اس کے بعد انقلاب کی وجوہ پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ سوشل انقلاب کی تعریف و حقیقت کیا ہے۔ پھر دنیا کے بڑے بڑے انقلابوں کا جائزہ لیا ہے جس میں انقلاب روس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کتاب اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے فائدہ سے خالی نہیں۔ قیمت ۱۲/ ملنے کا پتہ، جے ہند پبلشرز میکلوڈ روڈ۔ لاہور:

تحلیل نفسی اور تعبیر خواب:۔ عبدالحی صاحب جمیل علوی نے سگمنڈ فرائڈ کے نظریات کی روشنی میں خواب کی نفسیات سے بحث کی ہے اور اس ضمن میں اس کی تعبیر سے بھی، اسلوب بیان بھی بجائے خشک ہونے کے شگفتہ اور دلنشین ہے۔ قیمت ۱۲/۔ ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ دانش و حکمت۔ حیدرآباد۔ دکن:

خطبات مشران حصہ اوّل:۔ یہ پنڈت سندر نراین مشران آنجہانی کے لکچرز اور خطبات کا مجموعہ ہے، جس پر نسیم صاحب امروہوی نے دیباچہ لکھا ہے۔ کتاب بڑے سائز کے ۳۶۲ صفحات کو محیط ہے۔ جس میں متعدد آرٹ پیپر پر ہاف ٹون بلاک کی تصویریں ہیں۔ کتابت طباعت صاف کاغذ نہایت نفیس قیمت مجلد للعہ ملنے کا پتہ: جگت موہن نرائن مشران ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج یو۔ پی۔ ۲۶/۷ ونگفیلڈ پارک۔ لکھنؤ:

خط و کتابت: کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ اور جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ بھیجنے ضروری ہیں۔ [illegible]

[illegible] No. L. 2627



Printed at the Mahbob-ul-mataba Press, Delhi & Published by
Shahid Ahmad B.A. Hons from the officeof the "SAQI" Delhi



34(1)
DELHI

قدرت کا شاہکار وہ پیکر جمیل ہے جس کا نام عورت ہے اس کے تخلیقی عناصر ایثار محبت لطافت اور پاکیزگی ہے۔

پروڈیوسر و ڈائرکٹر سبطین فضلی کی کامیاب تخلیق

مہندی

کا انتظار کیجیے۔ جو فضلی فلمز کی ایک ایسی مکمل تصویر ہوگی جسے آپ ہمیشہ یاد رکھیں گے

نرگس اور بیگم پارہ

کیساتھ ساتھ کرن دیوان، سلطان مظہر، غوری، مراد، جانی بابو، زلو، انوری

بے بی شاما جیسے آرٹسٹ مہندی کی زینت ہیں۔

موسیقی	مکالمے	گانے	عکاسی	صدا بندی
غلام حیدر	ساغر نظامی	مجروح سلطان پوری	دلویچہ	اے نادر

مزید:- خاتون گڑیا اور آوارہ کا

انتظار کیجیے

فضلی فلمز - رتن ولا - دادر - بمبئی

ادارہ
شاہد احمد دہلوی
محمد حسن عسکری

جرعات

سالانہ چندہ
چھ روپے
قیمت فی پرچہ نو آنے

جلد ۳۴ | ساقی دہلی۔ بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۴۶ء | نمبر ۱

محمد حسن عسکری

جھلکیاں

یوں تو میں فراق صاحب کے کلام پر دو دفعہ مختصر سا تبصرہ کر چکا ہوں، لیکن وہاں مجھے اِتنا موقع نہ مل سکا کہ فراق کی دو نظموں پر ذرا تفصیل کے ساتھ کچھ لکھ سکوں، حالانکہ اُردو نظم میں ان کی اہمیت اسی کی مقتضی تھی۔ یہ نظمیں ("آدھی رات" اور "ڈھندلکا") اُردو نظم میں بعض نئے عناصر کا اضافہ کرتی ہیں، کم سے کم یہ عناصر اتنی شدّت سے پہلے کبھی دکھائی نہیں دئے تھے۔ ان میں سب سے اہم فطرت کے متعلق بدلا ہوا اندازِ نظر ہے۔ غزل میں تو خیر بات ہی اور ہے، وہاں تو فطرت کا دخل بطور علامت کے ہوتا ہے، شاعر کی ذاتی پسند یا ذاتی تاثرات کو بہت ہی کم دخل ہے اِس لئے غزل سے فطرت کے جیتے جاگتے تاثر کا مطالبہ کرنا تو ایک حد تک غیر ضروری سی بات ہے۔ لیکن ہمیں ایک سوال پوچھے بغیر آگے نہیں بڑھنا چاہیئے۔ غزل میں صرف آفاقیت اور حیات گیر معنویت رکھنے والے شعر ہی نہیں ہوتے، بلکہ سینکڑوں شعروں میں ہلکے پھلکے تاثرات بھی ہوتے ہیں، کہیں محض واقعہ برائے واقعہ تک ہوتا ہے، اور لکھنؤ کی طرف تو ہر شاعر کے لئے کچھ "زبان کے شعر" بھی کہنا لازمی ہیں ــــ میں ان شعروں کو اور ایسی شعر گوئی کو مردود قرار نہیں دیتا۔ ان کی بھی ادب میں جگہ ہے۔ تو جب اُردو غزل علامتی شاعری کے مرتبے سے نیچے اُتر کے اتنی مختلف قسم کے تاثرات اور واقعات کو قبول کر سکتی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہمیں غزل میں تھوڑے بہت شعر بھی ایسے نہیں ملتے جن میں فطرت کا کوئی تاثر، دقیع نہ سہی ہلکا پھلکا ہی، کسی علامتی مقصد سے نہیں بلکہ ایک خوشگوار تاثر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہو؟ مثلاً چین کی شاعری میں بھی فطرت کی یہی حیثیت ہے یعنی علامت کی۔ لیکن اس کے باوجود اندرونی معنویت سے قطع نظر فطرت کی تصویریںات خود بھی دلچسپ ہوتی ہے۔ بعض چینی نظموں میں تو وقتی علامت قائم کرتے ہوئے شاعر روایت کی ایسی پابندی کرتا ہے کہ ان ادبی اور فنی روایتوں سے واقفیت کے بغیر آپ نظم سمجھ ہی نہیں سکتے، لیکن بہت سی نظمیں ایسی بھی ہیں جہاں علامتیں ہیں تو انی ہی روایتی، لیکن شاعر نے بذاتِ خود انھیں نئے سرے سے محسوس کیا ہے، اور انھیں ذاتی اور شخصی جذبے کی مدد سے دوبارہ زندہ کیا ہے چنانچہ ان نظموں میں ایسی اشاریت آجاتی ہے کہ علامت سے بے خبر ہونے کے باوجود آپ نظم سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ یہی بات اُردو غزل میں کیوں نہیں؟ کیا یہ اس اندازِ نظر کا نتیجہ تو نہیں جو بڑی خود اطمینانی اور بے حسی کے ساتھ اس شعر میں پیش کیا گیا ہے:-

ابر و باد و مہ و خورشید ہمہ در کار اند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

اس ذہنیت کا ایک بڑا بُرا نتیجہ یہ نکلا کہ اُردو شاعری انسان تک محدود ہو کے رہ گئی، یا دوسرے لفظوں میں انسانیت زدہ ہو کے رہ گئی۔ نہیں، میں انسان کو حقیر نہیں سمجھتا۔ دُنیا کا بڑے سے بڑا ادب آخر انسان ہی کے بارے میں ہے، اور کس کے بارے میں ہے؟ مجھے ورڈز ورتھ کا یہ قول بھی سر بسر تسلیم ہے کہ انسان کے دماغ کی نگارندگی کے آگے آسمان، فرشتے، عرشِ بریں یہ سب کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ لیکن جب تک انسان اپنے وجود، اپنی ہستی کو وسعت نہیں دیگا، اپنی زندگی اور اس کے متعلقات کو پورے کائنات کے پس منظر میں نہیں دیکھے گا، موجودات کی مستقل، منفرد، ممتاز اور اپنے برابر اہم شخصیت تسلیم نہیں کریگا، عملیت اور افادیت کے چکر سے نکل کے موجودات کو بجائے خود اور اپنے لئے زندہ رہنے کا حق نہیں دیگا، اُس کی اپنی معنویت بھی پوری طرح اُجاگر نہیں ہو سکتی۔ میرا مطلب ہی کیا ڈھونڈنے کو تو وہ کوئی نہ کوئی معنویت ڈھونڈ ہی لے گا، مثلاً جہد للبقا یا بقائے اصلح والی معنویت، لیکن اس معنویت سے اس کی رُوح کو اصلی بالیدگی، مکمل سکون اور شانتی مل سکے گی یا نہیں، یہ بات ذرا مشکوک ہے۔ اپنی ہستی کو کائنات سے الگ کر لینے اور اپنے آپ کو موجودات میں سب سے اہم اور دوسری

چیزوں کی ہستی کو اپنے پر منحصر سمجھنے کا نتیجہ وہی نکلتا ہے جس کی بہترین مثال Pascal کی ہے۔ جو اُوپر خلاؤں کی طرف دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتا، کیونکہ اس پہنائی اور گیرائی کے مقابلے میں اُس کا وجود سکڑ سمٹ کے ذرا سا رہ جاتا ہے اپنے قریب کی مثال ہی کیوں نہ لیجئے، اقبال۔ یوں تو اقبال نے یہ بھی کہا ہے، اور ایک جگہ نہیں بے شمار جگہ:

جانے کہ داد ندد بگر نہ گیر ند
آدم ہمیں۔ دارد یقینی

لیکن اس کے باوجود موت کا خیال اقبال کو بہت تنگ کرتا ہے۔ جدوجہد کرتے کرتے اگر آدمی ستاروں سے آگے والے جہانوں میں بھی جا پہنچا تو کیا ہے، عاقبت منزل ما وادیٔ خاموشاں است۔ فوق الانسان کے فلسفے کا سب سے کمزور پہلو یہی ہے۔ خیر، تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ انسانیت میں کبھی ایسا وقت آتا ہے جب دوسروں کو بھی ایک مستقل وجود رکھنے کا حق دیا جاتا ہے، جب کائنات بھری پُری نظر آتی ہے اور انسان خلاؤں میں یکہ و تنہا بے یار و غم خوار نہ رہ جائے۔ اس احساس کی ٹھنڈک اور رچاوٹ شیکسپیئر کے یہاں دیکھئے:

Daffodils
That come before the swallow dares, and take
The winds of March with beauty

یا دوسری جگہ۔

and jocund day
Stands tiptoe on the misty
mountain tops.

اِس قسم کے احساس سے اُردو شاعری بالکل خالی ہے۔ صرف غزل ہی نہیں بلکہ نظمیں بھی۔ مثنویات تو خیر ہیں ہی کہانی، حالی اور آزاد سے دور کی نظموں میں بھی جہاں کہیں فطرت کا ذکر آتا ہے تو وہاں بھی بیانیہ عنصر قائم رہتا ہے، بلکہ narrative کا سا انداز (میرے خیال میں اس لفظ کا ترجمہ ہونا چاہیئے کہانیہ) ان نظموں میں کچھ مردم شماری کی کیفیت ہوتی ہے، اور ہر شعر میں "آگے بڑھو" کا تقاضہ ہے۔ ان سب نظموں میں فطرت سے کوئی شدید جذبہ، یا کوئی گہرا جمالیاتی احساس، تفکر، قرار، سکون، بالکل ہے ہی نہیں، مثنوی سحرالبیان فطرت کے مرقعوں کی وجہ سے بہت قابلِ ذکر سمجھی جاتی ہے، لیکن اور تو اور اُسکی بحر ہی دیکھیے:

وہ سُنسان جنگل وہ نورِ قمر

کُدکتی سی چال ہے، جس میں ٹھہراؤ اور خواب کی سی کیفیت پیدا کرنے کی گنجائش ہی نہیں۔ البتہ اقبال کے یہاں آ کے ذرا سی خواب ناک فضا، اور ایک جگہ رُک کر کسی منظر کے روح میں جذب کرنے کی صلاحیت نظر آتی ہے لیکن اقبال کے ذہنی نظریے اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کو بالکل دوسری سمت میں لے گئے۔ اقبال کا عقیدہ تھا کہ بیٹھ کر اس قابل نہیں کہ انسان اُن سے اثر قبول کرے، اُسے تو اُن پر اثر انداز ہونا چاہیئے چنانچہ اقبال کے اندر فطرت سے متاثر ہونے کے خلاف ایک قسم کی مدافعت پیدا ہو گئی تھی۔ یہی کیا وہ تو حسیاتی تجربے سے ہی ڈرنے لگے تھے۔ جب اُن کی مدافعت کے باوجود ان کے اعصاب اثر قبول کئے بغیر نہیں رہتے، اور یہ تجربہ اُن کی شاعری میں پھوٹ پڑتا ہی تو اس قسم کی شکل اختیار کر رہے ہے:

لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

بہرحال یہ بہت لمبا موضوع ہے، فی الحال اس پر زیادہ بحث کی گنجائش نہیں.. اقبال کے ساتھ ساتھ کچھ اور شاعر بھی پیدا ہوئے جو فطرت کے بیان کے لئے خاص شرط یہ سمجھتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ تشبیہات بھر دی جائیں۔ بس ان سے تو خدا ہی بچائے، ان کا خیال آتے ہی وہ تکلیف وہ زمانہ یاد آنے لگتا ہے جب امتحان کے لئے ان کی نظمیں پڑھنا پڑی تھیں۔ جوش کی بہت سی شاعری اسی قبیل کی ہے۔ افسوس ہے کہ میں نے جوش کا کلام بہت ہی کم پڑھا ہے، اس لئے ممکن ہے میں کوئی غلط بات کہہ جاؤں۔ لیکن میری کمزوری ذرا یہ بھی ہے کہ محض زورِ بیان کی شاعری مجھ سے نہیں چلتی۔ اور جوش کے یہاں وہ دھواں دھار، وہ دھکا پیل رہتی ہے کہ مجھے تو اُن کی نظم پڑھنے سے پہلے کمر ہمت باندھنی پڑتی ہے، بہرحال جوش کے بارے میں میری رائے ضروری نہیں کہ ٹھیک ہو، البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ جو صفتیں میں نے ابھی گنوائی ہیں وہ جوش کی طبیعت سے مناسبت ہی نہیں رکھتیں، اچھا، آخر میں ایک روحانی مسکول بھی پیدا ہوا تھا جو فطرت کا شیدا رہا تھا،

ان کی نظمیں وہ حیثیت رکھتی ہیں جو کلنڈر کی تصویریں۔ ان کا تصوّر اتنا عامیانہ اور چھچھلا ہے کہ زیادہ غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ البتہ نئے شاعروں نے فطرت کی طرف ذرا زیادہ سنجیدگی سے توجہ کی ہے۔ غالباً ان لوگوں میں سے کسی نے بھی فطرت کے متعلق کوئی بڑی اور گراں مایہ نظم نہیں پیش کی۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ ان لوگوں نے فطرت کو ایک عظیم الشان وجود کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ ان کے یہاں قرار بھی زیادہ ہے، فضا بھی زیادہ خواب ناک ہے، اور بُرا بھلا تفکر بھی شامل ہے۔ خامی ان کے یہاں یہ ہے کہ فطرت پر انسان ضرورت سے زیادہ مسلّط ہے۔ یہ لوگ فطرت کو معروضی حیثیت سے، خالص جمالیاتی حیثیت سے نہیں دیکھ سکتے۔ بلکہ فطرت کے اندر اپنے جذبات ڈھونڈتے ہیں۔ چنانچہ آج کل کے نوجوان کی جذباتی حالت کے مطابق نئی شاعری میں فطرت مغموم، نڈھال، بوجھل مُرجھائی ہوئی اور موت کے قریب نظر آتی ہے۔ نئے شاعر فطرت کے قریب تو آئے، اُنھوں نے اسے ایک جیتی جاگتی حقیقت تو سمجھا، لیکن فطرت کی شخصیت کو اپنے سے الگ کرکے اس پر جمالیاتی اور معروضی حیثیت سے غور نہیں کرسکے۔ اُنھیں فطرت میں بھی اپنی شخصیت کا عکس دیکھنے کی زیادہ دُھن رہی۔ اسی لئے نئی شاعری میں فطرت خوابِ جمال نہیں بن سکی۔ بات یہ ہے کہ نیا شاعر اپنے غموں کا تھوڑا سا بوجھ فطرت پہ ڈال کے کچھ ہلکا ہونا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ فطرت کی طرف سہارے کی تلاش میں جاتا ہے نہ کہ اُس سے جمالیاتی تسکین حاصل کرلے۔ فطرت اُس کی ذات سے اس طرح اُلجھ گئی ہے کہ وہ علیحدہ ہوکر اُس پر غور کرہی نہیں سکتا۔ اسی لئے نئی شاعری بھی بڑی حد تک "بیانیت" کی زد میں آگئی ہے۔

یہ تو تھا اُردو میں فطرت کی شاعری کا پس منظر۔ اب اِس کے مقابل فراقؔ صاحب کی ان دو نظموں کو دیکھئے تو ان کی اہمیت واضح ہوگی۔ سب سے بڑی بات تو یہاں یہ ہے کہ فطرت کی ایک الگ اور مستقل ہستی ہے، اس کی کیفیتیں خود اس کی ہیں، شاعر کی شخصیت سے مستعار لی ہوئی نہیں ہیں۔ یہاں فطرت انسان کے جذبات کے نیچے دبی ہوئی نہیں ہے، بلکہ ایک توانا اور خود مختار وجود ہے، چونکہ شاعر کو فطرت کی یہ حیثیت تسلیم ہے، اس لئے وہ اس پر معروضی حیثیت سے اپنے جذبات کو الگ کرکے غور کرسکا ہے، اور فطرت سے خالص جمالیاتی تاثر حاصل کرسکا ہے۔ یہاں وہ بھاگم بھاگ نہیں ہے، بلکہ شاعر کی آواز بتا رہی ہے کہ اُس کی روح ایک ایک چیز پر منڈلا رہی ہے، اس میں محو ہے، اُس میں جذب ہونا چاہتی ہے۔ فطرت کے لئے بھی فراقؔ صاحب کے یہاں وہی محویت، وہی سپردگی، وہی خود فراموشی ملتی ہے جو محبوب کے لئے۔ بلکہ دوسری نظم یعنی "دُھندلکے" میں تو فطرت اور محبوب دونوں کے تاثرات ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اچھا، فطرت کی شاعری اور محبوب کے متعلق شاعری میں ایک بات اور دیکھنے کی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ شاعر اپنے جذبات سے زیادہ دلچسپی لے رہا ہے یا اپنے موضوع (فطرت یا محبوب) سے۔ ان دونوں باتوں میں وہی فرق ہے جو مثلاً "ہائے میری جان!" میں اور سوداؔ کے اس شعر میں ہے:

بے نمود اور نمودار کہیں دیکھا ہے
اس قدر سادہ و پُرکار کہیں دیکھا ہے

چنانچہ فطرت سے فراقؔ صاحب کی دلچسپی اس لئے نہیں کہ اُس میں اُنھیں اپنا عکس نظر آرہا ہے یا اسے دیکھ کر کسی قسم کے قبضے کی خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے، اس کے بجائے انھیں فطرت سے محض اس کی ذات کے لئے دلچسپی ہے۔ لیکن اس علیحدگی کے باوجود غیریت اور اجنبیت کا نشان تک نہیں ملتا۔ دونوں کی دونوں نظمیں استعجاب آمیز مانوسیت ہم آہنگی، اور اپنے پن کے احساس میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اور ان نظموں کے اندازِ بیان کو دیکھئے تو ایک طرف تو مشاہدے کی گہرائی کے سبب الفاظ بڑے غیر مبہم اور جچے تُلے ہیں، دوسری طرف اُن میں اشاریت اور معنی آفرینی غضب کی ہے ہمیشہ کی طرح یہاں بھی — vowel sounds سے فراقؔ صاحب نے سکون، ٹھیراؤ، وسعت، ہمہ گیری، اور سرشاری کا احساس پیدا کرنے کا کام لیا ہے۔ خصوصاً ایک آدھ تشبیہ تو فراقؔ صاحب ایسی استعمال کرگئے ہیں جو بجائے خود ایک تخلیقی کارنامہ ہے۔ مثلاً ایک تصویر پیش کرتے ہیں:

کنول کی چٹکیوں میں بند ہے ندی کا سُہاگ

حق تو یہ ہے کہ اس ایک مصرع میں پورا ہندو کلچر گونج رہا ہے۔ مٹھاس، نرمی، مانوسیت، فطرت کا تقدس، روزمرہ کی

چیزوں کی پاکیزگی کا احساس ہر چیز یہاں موجود ہے۔

ایک اور مصرع اپنی آوازوں کے لحاظ سے بڑی ندرت رکھتا ہے: "یہ چھب یہ رُوپ یہ سُکمار یہ سکُومل گات"

حرفوں کی آوازیں بالکل یہ ظاہر کر رہی ہیں جیسے کوئی فن کار جیتا جاگتا بدن ڈھال رہا ہو۔ "س" اور "ل" کی آواز سے نرمی اور مٹھاس کا احساس ہوتا ہے "چھ" اور "ر" سے سکیپی بدن کا گٹھاؤ۔ اچیلا ہٹ اور نغمگی پیدا ہوتی ہے "د" کی آوازیں جسم کے دائروں کی غمازی کرتی ہیں۔ یہ آوازیں تو ذرا ٹھوس قسم کی ہیں، چنانچہ انکی مدد سے جسم کا تعیّن تو ہو گیا، اب ایک اثیری سی آواز "ا" کی آتی ہے جو بدن کو کائنات کی فضاؤں سے ملا دیتی ہے، لیکن جسم اڑ کر ہواؤں میں غائب نہیں ہونے پاتا، ایک طرف سے تو "گ" نے روک رکھا ہے، دوسری طرف "ت" نے اُسے زمین سے باندھ رکھا ہے۔

یوں دیکھیے کو تو ان نظموں میں ہر تاثر الگ الگ ہے، ہر چیز کو ایک ایک کرکے غور سے الگ الگ دیکھا گیا ہے لیکن یہ سب تاثرات ایک دوسرے سے اس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ ایک عجیب غریب خواب جمال ابھرتا چلا آتا ہے۔ پہلی نظم "آدھی رات کو" میں ذرا سی کمزوری یہ ہے کہ یہ نظم پوری طرح ہموار نہیں ہے، بعض بعض جگہ شدّت احساس میں کمی آجاتی ہے لیکن دوسری نظم "دُھندلکا سا" تو اتنی گٹھی ہوئی نظم ہے اور اس میں نشوونما کی ایسی شدید کیفیت نظر آتی ہے کہ اُردو میں اس کا جواب مشکل ہی سے ملے گا۔ خصوصاً ایک التزام نے عجیب لطف دیا ہے۔ ہر بند کا پہلا اور آخری مصرع "ک" کی آواز پہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس آواز نے یہاں سے وہاں تک تمام تاثرات کو گویا سی دیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا تخیل تفصیلات میں الجھ تو جاتا ہے لیکن ہر دفعہ لوٹ کے وہیں اصلی مرکز احساس پہ آجاتا ہے فطرت اور محبوب کے تصوّرات جس طرح ایک دوسرے سے شیر و شکر ہوتے چلے گئے ہیں وہ فراق صاحب کے اندر احساس ہی کا کرشمہ ہے۔ حالانکہ اس نظم میں بے جھجک جسم کی تعریف کی گئی ہے اور ایسے لفظوں میں نہیں کہ خواہش کو چھپانے کی کوشش معلوم ہوتی ہو، لیکن اس مادّی جذبے میں بھی فراق صاحب نے فطرت کی ساری معصومیت اور پاکیزگی سمو دی ہے۔

باقر رضوی

عہدِ تشکیل

علوم و حکمت کی تیز حدت سے ہر حقیقت پگھل رہی ہے
کہ وہم و ایمانِ اعتقاد و رسوم کی برف گل رہی ہے

ہے خوف لاحق کہ چارہ گر ہو کہیں نہ یہ موت کا سنبھالا
سُنا ہے میں نے ملوکیت بسترِ مرض پر سنبھل رہی ہے

جوان ہو کر لبھائے گی جو ہر ایک چھوٹے بڑے کے دل کو
ہنوز آغوشِ مادرِ دہر میں وہ تہذیب پل رہی ہے

تمام عالم میں آمدِ صبحِ نو سے اک حشر سا بپا ہے
فضائیں بیدار ہو چکی ہیں، زمین کروٹ بدل رہی ہے

شہنشہِ وقت نے عطا کی ہیں خلعتیں جشنِ دورِ نو میں
نئی پرانی ہر ایک شے آج اپنا چولا بدل رہی ہے

روش روش غیرتِ ارم ہے، بہار کا فضل ہے کرم ہے
نہال پھولے نہیں سماتے، ہوا نئی چال چل رہی ہے

نہال اہلِ ہمم جسے خونِ دل سے سینچا گئے ہیں صدیوں
اُسی درختِ سکون پرور کی آج اک شاخ پھل رہی ہے

نئے شگوفے کھلائے گی وہ، نئے ستارے اُگائے گی وہ
ندی جو کہسار کی بلندی سے سیل بن کر اُبل رہی ہے

تمام اقوام گیت سنگیت گائیں گے صلح و آشتی کے
کہ اب سیاسی چتا میں جنگ و جدال کی لاش جل رہی ہے

امینِ حزیں

نکات

خودی کی موت ہی غیرت کی روسیاہی ہی — وہ صلح جسکی شکستِ اصول ہو قیمت
جو اپنی تیغ کرے نذر بارگاہِ حریف — وہ ننگِ فوج ہی بے آبرو سپاہی ہی

(۲)

اصول ہی سے ہی شیرازہ وجود کا سر سبز — یہی کمند ہی بامِ نمودِ ہستی کی
اسی لئے ہی تو فقدانِ ذوقِ ضبطِ اصول — دلیل ہی سجدہ ذہنیت کی پستی کی

(۳)

ہے مُستتِ خاکِ ستم کیش آفرینش سے — کہ اپنے دل میں قیامت کا کھوٹ رکھتی ہی
یہ دیو اور کسی سے کبھی نہیں دبتا — جکڑ کے اسکو مقابل کی چوٹ رکھتی ہے

(۴)

اصول جس نے بھی توڑا تباہ ہو کے رہا — بنائے فرد یہی ہی بنائے قوم یہی
یہ تیغ ٹوٹ نہ جائے کہیں امینِ حزیں — اِسی کے دم سے ہی قائم جہاں میں شان تری

(۵)

وسعتِ کائنات لامحدود — ممکناتِ حیات لامحدود!
شان جس کی یہ شان ہو واللہ! — لا ز ماً ہے وہ ذات لامحدود

(۶)

حسنِ سحرِ شہود نے مارا! — خوفِ "برقِ نمود" نے مارا
تھا تو جوہر یہ پاک گوہر ہی — زندگی کو وجود نے مارا

(۷)

اس میں جب تک ہی اضطرابِ نمود — زینۂ ارتقا ہے اس کو وجود
منزلیں اس کی ماورائے فلک — فطرتِ زیست ہے جنونِ صعود

(۸)

ابتدا انتہا کا آئینہ — پختگی کا ہیں خامیاں زینہ
بند رہتی ہی بوئے غنچہ امیں! — ریشِ جبتک نہ اُسکا ہو سینہ

ایم۔ ڈی۔ تاثیر

سائے

ایسی راتیں بھی کئی گزری ہیں
جب تری یاد نہیں آتی ہے
درد سینے میں مچلتا ہے مگر
لب پہ فریاد نہیں آتی ہے

ہر گنہ سامنے آجاتا ہے
جیسے تاریک چٹانوں کی قطار
نہ کوئی حیلۂ شیشہ کاری
نہ مداواے رہائی نہ فرار

ایسی راتیں بھی ہیں گزری مجھ پر
جب ترے راہگزر میں سائے
ہر جگہ، چار طرف تھے چھائے
کبھی آئے کبھی بھاگے کبھی بھاگے کبھی آئے!—
تُو نہ تھی تیری طرح کے سائے
سائے ہی سائے تھے، رقصاں رقصاں
میں نہ تھا میری طرح کے سائے
سائے ہی سائے تھے لرزاں لرزاں
سائے ہی سائے، ترے راہگزر کے سائے!—
ایسی راتیں بھی ہیں گزری مجھ پر
جب تری یاد نہیں آتی ہے
لب پہ فریاد نہیں آتی ہے

(پہلگام)

مختار صدیقی

مقطع

غزل اُردو اور فارسی شاعری کی مایۂ ناز صنف ہے اور فنّی اُصولوں کے اعتبار سے مقطع غزل کا ایک ضروری حصّہ گردانا گیا ہے۔ غزل کے صد رنگ موتیوں کی لڑی میں آخری موتی یہی ہے یہی اُن نازک خیالات، اور نازک تر احساسات کا اختتامیہ ہے جنہیں کسی کی رسا طبیعت نے ایک بحر اور ایک زمین میں موزوں کیا، یہیں پر وہ بات قطع ہوگئی جس کے رنگا رنگ جلوے مطلع کی جلو میں سامنے آتے تھے۔

پُرانے سخن فہم جب کسی غزل کے پیرایۂ آغاز یعنی مطلع کی تعریف کرتے، تو کہتے تھے "مطلع، مطلعِ آفتاب ہے"۔ اس استعارے کو اگر طول دیا جائے تو مقطعے کو اسی مطلعِ آفتاب کا زوال یا غروب سمجھنا چاہیئے۔ اُردو اور فارسی غزلوں کے بے کراں دفتر پر ایک نظر ڈالئے تو بہت سی جگہ یہ استعارہ حقیقت کے روپ میں دکھائی دیگا۔ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ اکثر شعرا غزل اسی ترتیب سے کہتے ہیں جس ترتیب میں وہ پڑھنے سُننے والوں کے سامنے آتی ہے تو مقطعے کا شعری زوال بھی فوراً سمجھ میں آجاتا ہے، کیونکہ اس مفروضے کے مطابق پیرایۂ آغاز، یعنی مطلع پر کافی طبیعت لڑتی ہے، اس کے بعد اور خیالات، مضامین، قافیے اور ردیف کی رعایتوں، دل کی کیفیتوں پر کاوش ہوتی ہے، اور پھر کہیں غزل کے آخری فنّی جزو یعنی مقطعے کی باری آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وجدان زوال پذیر ہے، جذبات کا خروش اور خیالات کا جوش ٹھنڈا پڑ چکا ہے۔ اور طبیعت کی اُمنگ کافی سے زیادہ اظہار پا چکی ہے۔ اسی لئے آخری شعر میں چاہے دل کی کیفیت کہو، یا خیالات کا جوش دکھاؤ، اپنی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاؤ یا کوئی مضمون بندی کرو، پڑھنے سُننے والوں کے لئے اس کا لازمی تاثر یہی ہے کہ غزل ختم ہوئی، اب شاعر اجازت چاہتا ہے۔

لیکن عام غزلوں کے مقطعوں کی کمزوری پر یہ مفروضہ حجت کا حکم نہیں رکھتا، وجہ یہ ہے کہ شعرا کا تخلیقی عمل ہمارے سامنے نہیں، یہ کون کہے کہ فارسی میں سنائی اور سعدی سے لیکر سعید نفیسی اور اقبال تک اور اُردو میں میر تقی میر سے لے کر فراق گورکھپوری تک، ہر شاعر نے اسی ترتیب میں غزلیں کہیں جس ترتیب سے وہ ہمارے سامنے موجود ہیں۔ غزل کی داخلی شہادت بھی اس مفروضے کے خلاف بڑی زبردست دلیل ہے، اور وہ شہادت یہ ہے کہ غزل کے مضامین کا آپس میں شاذ ہی کچھ تعلق ہوتا ہے، ہر شعر اپنی جگہ ایک کُل واحد ہے، جس کا دوسرے سے صرف یہی تعلق ہے کہ دوسرے شعر کی طرح وہ بھی اُس غزل کے کُلِ واحد کا ایک جزو ہے ——— اس فردیت اور کلیت کے پیشِ نظر تخلیقی عمل میں غزل کے شعروں کی تقدیم و ترتیب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ممکن ہے مطلع آخر میں سوجھا یا بیچ کا کوئی شعر سب سے پہلے ذہن میں آیا۔ اور ذہن کی شگفتگی نے غزل پوری کروائی۔

اس حجت اور قاطع حجت کے باوجود اگر آپ غزلوں کے بے کراں سرمائے پر ایک نظر ڈالیں تو بہت سے شعرا ایسے ملیں گے جنہوں نے غزل کے ایک ضروری حصّے یعنی مقطعے پر الا ماشاءاللہ زیادہ توجہ صرف نہیں کی۔ اُردو میں بہت کم شعرا ایسے ملتے ہیں جنہوں نے غزل کے اس لازمی جزو کا پورا پورا حق ادا کیا ہے لیکن مقطعوں پر کچھ کہنے سُننے سے بہتر یہ بہتر ہوگا کہ ذاتِ مقطع پر کچھ روشنی ڈالی جائے اور اس کے تاریخی اور نفسیاتی پہلو کا کچھ تذکرہ عرض کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ اُردو شاعری کو غزل کی ہر پہلو سے مکمل صنف فارسی سے ہاتھ آئی، شعرِ ایران نے غزل کے جملہ فنّی اور تخیلی لوازمات کے ساتھ مقطعے کی میراث بھی اُردو کو دی۔ چنانچہ فارسی شاعری کی تقلید میں اُردو شاعری غزل سے شروع ہوئی اُدھر فارسی شاعری عرب کی تقلید میں قصیدے سے شروع ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ قصیدے کی تشبیب کو قصیدے سے قطع کیا گیا تو ایک طرح سے غزل کی داغ بیل پڑی۔ مگر قصیدے کی تشبیب ایک سلسلہ بند چیز تھی، جب یہ سلسلہ بھی موقوف ہوا تو غزل کا وجود تو تیق ہو گیا، چنانچہ فارسی شاعری کے

دلّی دکنی یعنی رودکی کے زمانے میں غزل کی صنف مستقلاً وجود میں آچکی تھی، مگر غزل کی اصل ترقی اُن صوفیوں کے ہاتھوں ہوئی جنہیں مشاہدۂ حق کی گفتگو کے لئے غزل کے ساغر و مینا درکار تھے۔ متقدمین میں یہ دور متصوفین کا ہے، جن میں حکیم سنائی رحمتہ اللہ علیہ نے غزل کو خاص زندگی بخشی۔ یہ زمانہ پانچویں صدی ہجری کا ہے اس کے جلد ہی بعد ابتلا پر تو سریزی اور تباہی کا وہ طوفان اُمنڈ آیا جسے عبرت بینوں نے قہرِ خداوندی اور تاریخ دانوں نے یورشِ تاتار کا نام دیا۔ اِس فتنے سے سلطنتیں زیر و زبر ہوگئیں، رستے بستے شہر مٹ گئے، ہنستی بسہاتی آبادیاں بن ہوگئیں اور ہر وہ چیز فنا ہوگئی جس پر ملکیت کے جذبے سے سرشار ہوکر فانی انسان فخر کرسکتا تھا۔ چنانچہ قصیدے کا چراغ گل ہوا، اور چونکہ طبیعتوں میں ایک قسم کی انفعالیت گداز، احساسِ فنا اور بے ثباتی در آئی، اِس لئے غزل ہی ان جذبات کا ذریعہ قرار پائی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سعدی نے غزل میں اپنی پیمبری کا جھنڈا گاڑا۔

رودکی کے زمانے میں غزل کی صنف اگر مستقلاً وجود میں آچکی تھی تو ظاہر ہے کہ غزل کا ایک فنی لازمہ یعنی مقطع بھی رائج ہوچکا ہوگا، لیکن دولت شاہ، آتشکدۂ خلیل اور خود پروفیسر براؤن اس بارے میں خاموش ہیں، اس سلسلے میں اُنھوں نے رودکی کے نامور معاصر دقیقی کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا۔ لیکن متقدمین کے دوسرے دور یعنی سنائی وغیرہ کی غزلیں مقطعوں کے ساتھ ہیں۔ اور ان کے بعد تو آج تک ہر غزل اِس فنی لازمے سے بہرہ ور نظر آتی ہے۔ عربی شاعری جو فارسی کے لئے مثال بنی، اس بحث سے خارج ہے کیونکہ قصیدے میں مقطعے اور پھر غزل کے مقطعے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لئے قطعی طور پر یہ محکم نہیں ہوتا کہ فارسی غزل میں مقطعے کا رواج، کب سے ہوا اور کیونکر ہوا، صرف ایک نفسیاتی توجیہ سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ مقطع یعنی شاعر کے نام والا شعر اُسی جذبۂ ملکیت کا ایک اظہار ہے جو پہلے پہل گلہ بانی کے دور میں انسان کے ذہن میں نمودار ہوا، گلہ بانی کے بعد انسان نے چراگاہوں کو چھوڑ کر زرعی زمینوں کا سہارا لیا، تو یہ جذبۂ ملکیت اور نمو پایا اور جاگیرداری کے دور میں بالکل مستحکم ہوگیا۔ ایرانی شاعری اِسی دور سے شروع ہوتی ہے جب ایرانی کافی متمدن ہوچکے تھے، چنانچہ شاعری پر بھی ملکیت کے اس جبلّی اور نسلی خاصے نے اپنی مہر چھوڑی، امتیاز اور باہمی سہولت کے لئے لکھنے والوں اور سُننے والوں نے یہ مہرِ ذاتی قبول کرلی۔ اُس وقت چھاپہ خانے اور پریس تو تھے نہیں کہ قلمی تحریریں یا ادبی دستاویزیں اس طرح سے محکم مانی جاتیں کہ اُن میں کوئی دوسرا ترمیم یا تحریف نہ کرسکتا، اور اب جبکہ چھاپہ خانے اور طباعت نے اِس قدر عروج پایا ہے، ترمیم و تحریف یا بیجا تصرّف پر سوائے اپنی ضمیر اور ایمانداری کے اور کیا قیود ہیں؟ — خیر زمانے کے حالات، ذرائع آمد و رفت کی کم مائیگی اور سب سے زیادہ یہ کہ ملکیت کے اس نسلی خاصے نے شعری دستوں پر اپنی یہ مہر لگادی! پھر وسط ایشیا کی چراگاہوں سے گڈریوں کا ایک غول اُٹھا جنہیں خیوا کے خوارزم شاہیوں کی ایک اوچھی سی بات نے نعل در آتش کردیا تھا۔ منگولوں کے یہ ٹڈی دل جب عجم پر چڑھ دوڑے ہیں تو، یہ افسانوی سرزمین، کم سے کم چھ خانوادوں کی سلطنت، اُن کے کلچر، ان کی ثقافت اور تمدن سے مالامال ہوچکی تھی، منگولوں کے لشکروں نے بڑے اہتمام اور باقاعدگی سے اِن تمام آثاروں کو مٹانا شروع کیا۔ بارہ برس تک خوارزم شاہیوں کے خدنگِ آخریں جلال الدین خوارزم شاہ نے اس ٹڈی دل سے ٹکرلی اور اس کشت و خون کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہ ہوا کہ ایران تہ و بالا ہوگیا، متمدن ایرانیوں کی ملکیتیں اور اُن کے مِلک کے جذبے، وحشی منگولوں نے خاک و خون میں ملادئے — یہی زمانہ فارسی غزل کے عروج کا ہے۔ ہاری ہوئی طبیعتوں نے اپنی انفعالیت کو غزل میں آسودہ کیا، اور ما و من کا وہ جذبہ ذہنی اڑانوں اور خالی خولی باتوں میں اور بھی رواج پایا جسے مادّی دُنیا میں چنگیزی تلواروں نے فنا کی نیند سُلادیا تھا۔ اب کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ جاگیر، یہ محل، یہ ملک میرا ہے۔ اب صرف یہی کہنے کی تاب تھی کہ یہ کتاب میں نے لکھی۔ یہ غزل میری ہے۔ اس ذہنی قلابازی، دماغی ہیجان یا تخیلی اُڑان کا مالک میں ہوں!!!

آپ اس استنباط سے یہ نہ سمجھیں کہ فتنۂ تاتار کی بدولت ہی مقطعے رواج پائے اور یہ کہ اس سے پہلے فارسی غزل میں اِن کا رواج نہ تھا۔ میری عرضداشت صرف یہ ہے کہ تاتاری حملوں سے پہلے ایرانی شاعری میں، غزل اور قصیدہ مل کر کی چیزیں تھیں۔ چنگیزی حملوں کے بعد، جب دربار ہی نہ رہے تو قصیدے کون سُنتا، چنانچہ جب صلہ نہ رہا، اور داد و دہش بھی گئی تو قصیدہ کون لکھتا، چنانچہ غزل، اور صرف غزل ہی کا دور دورہ ہوگیا، اور فارسی غزل، اپنے فنی لوازموں، تخیلی پنہائیوں اور تمام تر روایتوں کے ساتھ منظرِ عام پر آئی۔ اسی شکست خوردگی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اسی کو اظہار کا ذریعہ قرار دیا تو لازمی طور پر اس پر اپنی مہرِ ذاتی بھی چھوڑی۔ یا دوسرے لفظوں میں لوگوں کے لئے یہ سراغ مہیا کیا کہ یہ لفظی تصویریں جو ابھی آپ کے سامنے پیش ہوئیں، میری تھیں، اس کے نیچے میرے دستخط موجود ہیں، ملاحظہ کیجئے!!

میں عرض کر چکا ہوں کہ شعرا ایران نے غزل کی ہر پہلو سے مکمّل صنف اُردو کو میراث میں دی۔ چنانچہ اُردو شاعروں نے فارسی غزلوں کے نمونوں پر ہی غزلیں کہنی شروع کیں، اور تکمیلِ غزل، امتیاز، اور باہمی سہولت کے لئے مقطعوں کی پابندی بھی کی۔ ہندستان والوں کے سامنے اس مہرِ ذاتی کا جواز شاید یہی نہیں تھا کہ فارسی غزل کی تقلید لازمی ہے، بلکہ یہ بھی تھا کہ ہندستان کی اپنی شاعری میں بھی اس مہرِ ذاتی کا رواج موجود تھا، مہاکوی کالیداس، تلسی داس، سور داس، بہاری کوی ودیاپتی، چنڈی داس، امرداس، کبیر، میرا رانی میراں بائی۔ چند بردائی سب نے اپنے اپنے شعری کارناموں پر اپنے نام کی مہر ثبت کی تھی، ان کی تقلید میں غیر ہندستانی شعرا مثلاً حضرت امیر خسرو، عبدالرحیم خانخاناں، رس خان۔ شاہ برکت اللہ پریمی بلگرامی ملک محمد جائسی وغیرہ نے بھی اپنی ہندی دوہوں، سجنوں اور گیتوں میں اپنا نام آخری مصرع میں شامل کیا۔ چنانچہ جب ہندستانیوں نے ریختہ کے بولوں میں اپنے دل کے دکھڑے موزوں کئے تو مقطع غیر ارادی اور مسلّم طور پر بھی موزوں ہوتا رہا۔

* * *

اتنی باتوں کے بعد، میں اسی عرضداشت کی طرف لوٹتا ہوں کہ اگر آپ اُردو غزلوں کے بے کراں سرمائے پر ایک نظر ڈالیں تو بہت سے شعرا ایسے ملیں گے جنہوں نے غزل کے اس ضروری حصّہ یعنی مقطعے پر بالا ماشا اللہ زیادہ توجہ صرف نہیں کی، بہت کم شعرا ایسے ہیں جنہوں نے اس پیرایۂ اختتامیہ کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ اُن کے مقطعوں کو دیکھ کر چند باتیں ذہن میں آتی ہیں:

(۱) مقطعے کی خوبی یہی ہے کہ تخلص سے معنوی طور پر فائدہ اُٹھایا جائے، کیونکہ تخلص ہی مقطعے کو غزل کے دوسرے شعروں سے ممیز کرتا ہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ تخلص ایک خارجی عنصر ہے جو اس خاص مضمون کے دائرے میں بحیثیت جزوِ مضمون کے شامل نہیں، اس لئے اگر اُسے جزوِ مضمون بنا کر پیش کیا جائے تو مقطعے کی خصوصیت بھی قائم ہو جاتی ہے اور پیرایۂ اختتامیہ کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے۔ یہ رعائتیں اکّا دکّا مثالوں کی حیثیت سے تو قریب قریب ہر شاعر میں نظر آئیں گی، کیونکہ ہر تخلص پھر بھی ایک بامعنی لفظ ہے، جو کسی نہ کسی مضمون کا جزو یا محور بن سکتا ہے۔ لیکن تخلص کی اس معنویت کو پرانوں میں صرف مومنؔ اور جدید دور میں مرحوم فانیؔ۔ اور نوحؔ ناروی نے اپنا مستقل شعار بنایا اور اس طرح اپنے مقطعوں کو ایک خاص حیثیت دی۔ مومنؔ نے ہر جگہ اپنے نام اور تخلص کے ساتھ معنوی نباہ کیا ہے۔ ان کے ہاں اسی رعایت سے مضمونوں کی بوقلمونی بھی کافی ہے لیکن نوحؔ ناروی سوائے طوفانِ نوح اور اس کے چند پہلوؤں یا تلازموں کے، اور کوئی بات پیدا نہ کر سکے۔ مومنؔ کی چند مشہور مثالیں ملاحظہ ہوں:

دوستی اس صنمِ آفتِ ایماں سے کرے
مومنؔ ایسا نہ کوئی دشمنِ ایماں ہوگا

اُس بُت کی ابتدائے جوانی مراد ہے
مومنؔ کچھ اور فتنۂ آخر زماں نہیں

شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا
تو نے مومنؔ بُتوں کو کیا جانا

مومن اس بت سے بگڑنا ہی ۔ تھا
نہ چکی بات خدا سے تیری!

دشمنِ مومن ہی رہے بت سدا
مجھ سے میرے نام نے یہ کیا کیا!

بہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں!

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

مرحوم فانی کا تخلص اپنے اندر دردِ ہستی، غمِ مرگ، اور اُن کے جاں خراش تلازمات کا ایک دفتر رکھتا تھا جو اُن کے شعری میلان کے عین مطابق تھے، چنانچہ اُنہوں نے دل کے دُکھڑے سُناتے وقت ان تلازموں اور اپنے شعری میلان کے ساتھ اُن کی مطابقت کا بیشتر جگہ پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ ساتھ ہی اپنے بیان میں یہ خوبی رکھی کہ مومن یا نوح ناروی کی طرح تخلص کی معنویت کو صاف صاف اجاگر نہ کیا، گویا اُنہوں نے مقطعے کے مضمون میں تخلص کے معنوی پہلو کو ایک ہلکی جوت کا درجہ دیا، اور مضمون کی بڑی روشنی کو ہی سامنے رکھا۔ مثلاً:

آج روزِ وصالِ فانی ہے
موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

عمر بھر نزع کے عالم ہی میں گزری فانی
زندگی کا نہ ہوا موت پہ احساں کوئی

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جسکو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

فانی بلا سے مرگ سے غم کیجئے غلط
اب جستجوئے راحتِ دنیا نہ کیجئے!!

خود تجلی کو نہیں اذنِ حضوری فانی
آئینے اُن کے مقابل نہیں ہونے پاتے

یہ تو ہوا مومن اور مرحوم فانی کا ذکر، نوح ناروی کے بارے میں مجھے یہ معذرت طلب کرنا ہے کہ وقت کی کمی کی وجہ سے، میں اُن کی مثالیں جمع نہیں کرسکا، اُن کا دیوان بھی آسانی سے دستیاب نہ ہوا، چنانچہ اُن کا ذکر مجھے مثالوں کے بغیر صرف اس مشہور حقیقت کے بل پر ہی کرنا پڑا کہ اُنہوں نے اپنے تخلص کی معنویت کو اپنے مقطعوں میں ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔

(۲) مقطعوں میں ایک دوسری خوبی خطابیہ انداز کی ہے، بعض شعرا نے اپنے کلام میں اکثر و بیشتر جگہ اس انداز یا اس قسم کے مذاکرے سے مقطعے کے معنوی حسن میں کافی اضافہ کیا ہے۔ اس کی مثالیں اچھے شعرا میں کافی ملتی ہیں، مگر میر صاحب کے ہاں خاص طور پر وقیع ہیں میں صرف انہی کی کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں!

نازکی مزاج آپ قیامت ہیں میر جی
جوں شیشہ میرے منہ نہ لگو میں نشے میں ہوں

کیا کہیں میر جی ہم سے معاش اپنی غرض
غم کو کھایا کریں ہیں، لہو پیا کرتے ہیں

میر صاحب کو دیکھئے تو بنے
اب بہت گھر سے کم نکلتے ہیں

ان کے نزدیک کچھ نہیں عزت
میر جی یونہی خوار ہوتے ہیں

میر سدا بیحال رہو ہو، مہر و وفا سب کرتے ہیں
تم نے عشق کیا سو صاحب، یہ کیا اپنا حال کیا

مرگ کا وقفہ اس رستے میں کیا ہے میر سمجھتے ہو
ہارے ماندے راہ کے ہم ہیں کوئی دم کو سولیں ہیں

مرنے سے کیا میر جی صاحب، ہم کو ہوش تھے کیا کرتے
جی سے ہاتھ اُٹھاتے گئے، پر اُس سے دل اُٹھائے گئے!

کل کہتے ہیں اس بستی میں میر جی مشتاقانہ موئے
تجھ سے کیا ہی جان کے دشمن، وے بھی محبت رکھتے تھے

ان شعروں میں خطابیہ انداز کا ساتھ بولتا جادو اس تخاطب میں پنہاں ہے جس میں میر صاحب کا کوئی ثانی نہیں، اُنہوں نے ہر جگہ اپنے آپ کو بڑی عزت آبرو، بڑی تمکنت سے یاد کیا ہے، اپنے لئے میر صاحب، میر جی اور بعض جگہ تو میر جی صاحب کے لفظ استعمال کئے ہیں۔

(۳) مقطعوں کی خصوصیتوں کو دیکھتے ہوئے تیسری بات

یہ ہے کہ بعض شعرائے مقطعے کو بحیثیت مقطع نہیں بحیثیت شعر کاوش سے لکھا ہے، ویسے تو آپ کو ہزاروں مقطعے ایسے مل جائیں گے جو شعر کی حیثیت سے عمدہ ہوں مگر میرا روئے سخن صرف اُن شاعروں کی طرف ہے جنہوں نے قریب قریب ہر غزل کا مقطع خاص توجہ اور کاوش سے لکھا ہے، اِس لئے اگر اُن کی غزلوں کا انتخاب کرنے بیٹھیں تو اچھے شعروں میں اُن کے مقطعوں کا شمار بھی لابدی ہوگا۔ شاید یہی وہ حضرات ہیں جنہوں نے مقطعے کی صحیح اسپرٹ کو سمجھا ہے، اور اسی لئے اُنہوں نے اپنا بسرانہ اختتامیہ صرف اِس قدر نہیں لکھا کہ غزل ہو چکی، اب اجازت دیجئے۔ ان شاعروں میں مصحفی، مرزا غالب، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، اور ریاض خیرآبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں میر صاحب اور مرحوم فانی نے بھی اس دل میں کچھ کم خونِ جگر نہیں کھایا۔ مگر سب سے پہلے مصحفی کے تین مشہور مقطعے سُنئے۔

اے مصحفی تو ان سے محبت نہ کیجیو
ظالم غضب کی ہوتی ہیں یہ دلی والیاں

تلوار کو کھینچ ہمیں پڑے وہ
ہے مصحفی کشتہ اسی ادا کا

اے مصحفی یہ دورِ خزاں بھی گزر گیا
یوں تو اسی سے اپنے دل تھا لگا لیا

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ قربان علی بیگ سالک۔ میر مہدی مجروح، سید حسین تسکین، ظہیر، انور اور مولانا حالی کی طرح اس دور میں پیدا ہوئے جب مومن، ذوق، غالب کا طوطی بول رہا تھا، اپنے دوسرے ہم عمر شعرا کی طرح اُنہوں نے بھی ایک چھوڑ دو دو کی شاگردی کی، لیکن چونکہ اُنہیں اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ سنجیدہ دل اور زیادہ ناقد ذہن عطا ہوا تھا، اس لئے اُنہوں نے یہ دیکھ لیا کہ ان تین صاحب کمالوں کے سامنے یا ان کے جلد ہی بعد اور کسی غزلگو کا چراغ جلنا مشکل ہے، اِس لئے بہت جلد اُنہوں نے شعر کہنا ترک کر دیا۔ اس لئے ان کا اُردو دیوان بہت مختصر ہے یعنی لوح سے لے کر تمت تک صرف ۱۰۹ صفحے ہیں۔ لیکن ان ۱۰۹ صفحوں میں آپ کو ایک بات ہر جگہ نظر آئے گی اور وہ یہ ہے کہ اُن کا ہر مقطع اچھا ہے۔ ان میں خطابیہ انداز یا مذاکرے کا بولتا جادو بھی ہے، مقطع بحیثیت شعر بھی خوب ہے اور دو ایک جگہ تخلص کی معنویت سے بھی فائدہ اُٹھایا گیا ہے، سنیئے:۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

ایسی رغبت سے کیا قتل گماں کا ہے کو تھا
شیفتہ اسکو تو لو تم سے محبت نکلی

تکلیف شیفتہ ہوئی تمکو مگر حضور
اس وقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

میری خاطر سے جاوٴ شیفتہ واں
خبر اں سے نہیں نفرت ہی آہی

افسردہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

دشمن کہیں گیا نہ ہو آنکھوں سے شیفتہ
اس کی گلی میں آج تک اپنا قدم نہیں

اب کے ارادہ ملکِ عدم کا ہے شیفتہ
گھبرا گئے کہ ایک جگہ بسر کیا کریں

لگ جاؤ اب تو آ کے گلے سب چلے گئے
اک شیفتہ رہا ہے سو وہ کچھ مخل نہیں

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

اس نو بہارِ حُسن کو بدنام مت کرو
تھی شیفتہ کے پہلے ہی شورش دماغ میں

شیفتہ کی مثالیں بے شمار ہیں لیکن ابھی ریاض کا تذکرہ باقی ہے، جنہوں نے مقطعوں پر خاص طور سے توجہ کی۔

نقل ہے کہ حضرت ریاض مطلع اور مقطع خاص طور پر کاوش سے کہا کرتے تھے، کہتے تھے' آغازِ کلام تو اچھا ہونا ہی چاہیئے اور اگر انجام اچھا نہ ہو تو سمجھ لو آخرت خراب ہوئی! چنانچہ اُن کے ہاں اکثر مقطعے بحیثیت شعر، غزل کے انتخاب شعروں بلکہ بیت الغزل کی حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً:۔

کیا جانے کیوں رقیب بنا تھا گلے کا ہار
صورت میں وہ ریاض سے اچھا تو کچھ نہ تھا

کیا کام ریاض آنے کو سو بار بہار آئے
ہم کو یہ جنوں پھولنے پھلنے نہیں دیتے

اب مجھے پیرِ خرابات کا ہے حکم ریاضؔ
جا کے آباد کرو مسجد ویراں کوئی

کعبہ سنتے ہیں کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاضؔ
زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا

بڑے نیک طینت بڑے صاف باطن
ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

اے ریاضؔ آپ بھی پیتے ہیں بایں ریشِ سفید
ہائے یہ نور کی شکل اور گنہگاروں میں

کہاں وہ نور کی صورت وہ نور کی آواز
ریاضؔ کون سنائے غزل یہ گا کے مجھے

دے گیا داغِ غم یہ کون ریاضؔ
ہم غمِ سر پا کو روتے ہیں

اٹھو اٹھو میز سے اے شاعر ریاضؔ جلد
آتے ہیں اک بزرگ بُرے حال کے

کس نے دیکھا ہمیں کوچے میں حسینوں کے ریاضؔ
مفت بدنام ہوئے ہم کہیں آئے نہ گئے!!

ریاضؔ کی ان مختصر اور مشہور مثالوں کے بعد کچھ مقطعے میرؔ صاحب اور مرحوم فانیؔ کے سنیئے:-

(میرؔ) کہنا جس سے جو کچھ ہوگا سامنے میرؔ کہا ہوگا
بات نہ دل میں پھر گئی ہوگی منہ پر میرے آئی ہوگی

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

شکر میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

اب حسرت آنکھوں میں اک نومیدانہ پھرتا تھا
میرؔ نے شاید خواہش دل کی آج کوئی پھر رخصت کی

دیر سے اس اندیشے نے ناکام رکھا ہے میرؔ ہمیں
ناؤں جھوٹیں گے اسے ہم تو وہ بھی ہاتھ لگا دیگا

خاک سے میرؔ کیوں نہ کلیاں ہوں
ہم یہ تو آسمان پھوٹا ہو

(فانیؔ) فانیؔ دوائے دردِ جگر زہر تو نہیں
کیوں ہاتھ کانپتا ہے مرے چارہ ساز کا

خود تجلی کو نہیں اذنِ حضوری فانیؔ
آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

اک عمر پرستارِ بت ہجر رہا تھا
اے زلفِ سیہ ماتمِ فانیؔ میں بکھر جا

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا

فانیؔ بلائے مرگ سے غم کیجئے غلط
اب جستجوئے راحتِ دنیا نہ کیجئے!!

مرزا غالبؔ اور اقبالؔ کے اردو اور فارسی مقطعوں کی نسبت کچھ کہنا زیادہ وقیع معلوم نہیں ہوتا۔ عہدِ آخریں شاعروں کا کلام ویسے ہی عام ڈگر سے بہت بلند اور بہت الگ ہوتا ہے، اس لئے ان سے یہ امید بھی کی جاتی ہے کہ انہوں نے پیرایۂ اختتام کے موثر ہونے پر بھی ضرور دھیان دیا ہوگا۔ مگر یہ یاد رہے یہ اُن کے شاعرانہ کمال میں کوئی اہم بات ان اضافہ نہیں اور اگر انہوں نے اپنے اختتامیہ پیرائے صرف اجارت اور والسلام تک ہی محدود رکھے ہیں تو بھی اس سے ان کی شاعرانہ عظمت میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوتی۔ کیونکہ مقطعے زیادہ سے زیادہ وہ ہالے ہیں جن سے ان مہتابوں کے حسن میں چنداں اضافہ ہونے کا امکان نہیں!

(حلقۂ اربابِ ذوق شاخ دلی میں پڑھا گیا)

ریزۂ مینا

اُردو کے بہترین پچاس افسانوں کا مجموعہ: ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۶ء تک ساقی میں سینکڑوں افسانے شائع ہوئے، انہی منتخب افسانوں میں سے شاہد احمد دہلوی نے یہ پچاس افسانے انتخاب کئے ہیں۔ مشہور نقادوں کی رائے ہے کہ جدید اُردو افسانے کا ایسا کوئی اور مجموعہ شائع نہیں ہوا جو ہمارے افسانے کی تدریجی ترقی کا آئینہ دار ہو۔ "ریزۂ مینا" افسانوی ادبِ اُردو کے بحرِ ذخار میں ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کتاب نایاب تھی۔ اب پھر بڑے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ ضخامت (۵۵۰) صفحے۔ مجلد، جلد پوش سے آراستہ! قیمت پانچ روپے (۵؎)

اپنے شہر کے کتب فروشوں یا

ساقی بک ڈپو دہلی سے طلب فرمائیے

مخمور جالندھری

کھٹّے انگور

تجھے شکایت ہے زندگی اپنی ایک صحرا ہے — تپتا، پیاسا
کہ جس کے دامن میں ریزۂ خاک تو ہوں لاکھوں مگر نہ ہوتا بدا ریانی کا اک بھی موتی
تجھے گلہ ہے کہ میرے دامن میں تجھکو غنچے نظر نہ آئے
تجھے تمنا تھی — اپنی اس دورِ ارتقاء میں حیات فرحت طراز ہوتی
ندی کنارے مکان ہوتا، مکان کے آگے باغ ہوتا — ہوا جو چلتی تو لہلہاتا
بکھیرتی کیف — شام آتی چمکتی موٹر میں بیٹھ کر مہمان آتے
ہماری کھانے کی گول میزوں پہ چار سو سرسراتے ملبوس جگمگاتے
طبیعت اپنی جو ہوتی ناساز تو نئی خوش جمال موٹر میں بیٹھ کر سیر کو نکلتے
سلام کرتے تمام احباب پٹڑیوں پر کھڑے ہوتے اور راہ چلتے
ہمارے بیٹے جلیل منصب پہ ہوتے فائز
ہماری سب بیٹیاں معزز بڑے گھرانوں میں بیاہی جاتیں
جہاں مسرت سے چہچہاتیں تمام دن دودھ میں نہاتیں
یہ میرے سینے میں دل ہے پتھر نہیں ہے کرتا رہا ہوں میں بھی یہی تمنا — !

(۲)

تجھے شکایت ہے اپنے دامن کو تیرے دامن کو موتیوں سے نہ بھر سکا میں
تجھے گلہ ہے کہ میرے دامن میں تجھکو غنچے نظر نہ آتے
یہ سچ ہے — دو روزہ زندگی کو نشاط آگیں نہ کر سکا میں
تجھے بتانا ہی پڑ گیا آج کیوں مجھے یہ تکلفات اک نظر نہ بھائے۔
سنو جو بنگلہ بنا بھی لیتا —
میں پکی اینٹوں کی چار دیواروں پر جو سونا چڑھا بھی دیتا —
تو رکھنے پڑتے مجھے ملازم جو دیتے پھولوں میں روز پانی
جو صاف رکھتے تمام سامانِ زینت اپنا
مبالغے کا نہیں ہوں عادی میں صاف کہتا ہوں مجھ سے دیکھی نہ جاتی اُن سب کی بے زبانی
سنو — یہ باورچی، مالی، شوفر
تمام غربت کے پیدا کردہ ہیں اسم فاعل
جو دیتا ہے اپنے گھر کے پھولوں میں پانی اور جو چلاتا ہے اپنے گھر کی موٹر
کسی کی طاقت نہیں کہ اُس کو کہے کوئی مالی اور شوفر
یقین جانو — کہ میں کسی کو سمجھ نہیں سکتا اپنا نوکر
اسی لئے تیرے واسطے کوئی بھی نہ بنگلہ بنا سکا میں

تجھے چمکتی چھتوں کے نیچے ۔ ایک دن بھی سُلا سکا میں
سُنو ــــ جو موٹر منگا بھی لیتا ــــ
"گراج" میں اس کو بند کر کے رکھ بھی لیتا ــــ
محال ہو جاتا تجھکو پیدل اُسی گھڑی اک قدم بھی چلنا
یہ تیرا دم ــــ دو قدم ہی چلنے سے پھول جاتا ــ
جو ہنس کی چال چلتا کوا ــــ تو چال اپنی بھی بھول جاتا ــــ!
میں صاف کہتا ہوں تجھکو موٹی ۔ دن بہ دن ہوتی دیکھ سکتا.
کہ دیکھ سکتا ہوں تجھکو فاقہ کشی سے ہوتے ہوئے میں لاغر
مرے لئے تیری فربہی ہوتی ــــ لیکن اک جانگداز منظر
اسی لئے تیرے واسطے گھر میں کوئی موٹر نہ لا سکا میں
بٹھا کے موٹر کے نرم گدّوں پہ تجھکو سیرِ چمن ۔ سیرِ تمام عالم کرا سکا میں
سُنو ــــ جو میں کاروبار کرتا پھر اس کو فہم و ذکا سے اپنی بڑھا بھی لیتا ــــ
ہر ایک گاہک سے بولنا پڑتا جھوٹ سچ، صبح و شام مجھکو
بنا لیا ہوتا جعلسازی، ریا نے اپنا غلام مجھکو
سسکتی دُنیا تمام اگر بھوک سے مجھے اس کا غم نہ ہوتا
تمام گودام میرے لبریز ہوتے میں لمبی تانے گھر میں مزے سے سوتا ــــ!
ٹھٹھرتی دُنیا تمام سردی سے تن پہ اُس کے نہ کپڑا ہوتا، مجھے کوئی اس کا غم نہ ہوتا
مگر مرے صوفے پر ملائم غلاف چڑھتے میں لمبی تانے مزے سے سوتا
میں صاف کہتا ہوں یہ ریا کار دھندا مجھ سے ذرا نہ ہوتا
اسی لئے کاروبار بھی کوئی تری خاطر نہ کر سکا میں
نہیں ہے جب میرا کوئی بنگلہ نہیں ہے موٹر نہیں ہے جب کاروبار کوئی
جلیل منصب سے میرے بیٹے نہ کیوں ہوں محروم
غریب، حسرت زدہ گھرانوں کی اندرا میری بیٹیوں کا نہ کیوں ہو مقسوم ــــ!

(۳)

جو مجھ سے پوچھے تری تمنا کرے مصائب کا ہے بٹارا
سُنا نہیں کیا یہ تو نے ــــ دُنیا میں زر ہے آلام کا تلاطم
سُنا نہیں کیا یہ تو نے ــــ جو بندۂ ہوس ہیں اُنہی کے ہے واسطے جہنم ــــ؟
تو چاہتی ہے ــــ گناہ کر کے میں عاقبت کو خراب کر لوں.
حیات مابعدِ موت کے واسطے سزا انتخاب کر لوں
سُنا نہیں کیا ۔ تو نے ــــ "دُنیا میں کر غریبی میں نام پیدا"
سُنا نہیں کیا ــــ خدا کے بندوں کی شان ہے دولتِ قناعت ہی سے ہویدا ــــ؟
سُنا نہیں کیا جو صبر تے ہیں ان کو حاصل ہے بادشاہی ــــ؟
تو چاہتی ہے کہ میں غلط راستہ کوئی اختیار کر لوں

جو عارضی نعمتیں جہاں کی ہیں اُن کے پیچھے حیات کو داغدار کر لوں
سُنا نہیں تو نے ـــ سادگی نعمت حسیں ہے مذاق لیکن بلند رکھو
گلیم پوشی میں، فاقہ مستی میں بھی ہمیشہ بلند اپنی پسند رکھو
مجھے خوشی ہے کہ چیتھڑوں میں تجھے بلندی کی آرزو ہے
مجھے خوشی ہے کہ فاقہ مستی میں جاہ و حشمت تجھے امارت کی جستجو ہے
میں خوش ہوں فطرت نہیں تنزّل پسند تیری
سُنا نہیں تو نے حسبِ نیّت مراد ملتی ہے آدمی کو ـــ ؟
مجھے یقیں ہے ضرور آئے گی ایک دن بر یہ آرزوئے بلند تیری ـــ

(۴)

میں اپنی ناکامیوں سے، مایوسیوں سے ہوتا نہیں ہراساں
مکاں بناؤں گا ـــ باغ بھی جس میں ہوگا رنگین، لہلہاتا
مکاں بناؤں لیکن اس وقت جب مکاں میرے ہر پڑوسی کے پاس ہوگا
ہر ایک گھر ـــ جب میں دیکھوں گا بیویوں کو اپنے ہی ہاتھ سے نعمتیں پکاتا
ہر ایک گھر ـــ جب میں دیکھوں گا شوہروں کو پھولوں میں اپنے ہاتھوں سے پانی دیتا
چمکتی موٹر بھی لاؤں گا میں
مگر تجھے اس کے نرم گدّوں پر اُس گھڑی ہی بٹھاؤں گا میں
میں خود اُسے صاف کر سکوں جب ـــ کہ جب اُسے خود چلا سکوں میں
بڑی مشقت سے، شوق سے کاروبار اپنا چلاؤں گا میں
چلاؤں گا کاروبار اپنا مگر میں اُس وقت جب ریا کو شکست ہوگی۔

(۵)

تری جبیں پر شکن نمایاں ہوتی ہے تُو مُنہ بنا رہی ہے
مرے خیالوں سے مشتعل پھر ہوا ہے شاید مزاج تیرا
میں جانتا ہوں ـــ نہ اِن دلائل سے ہو سکے گا علاج تیرا ـــ
میں جانتا ہوں بخوبی ـــ مجھ سے تجھے توقع نہیں ہے کوئی
مگر بتا دوں کہ آج میں یہ نہ سُن سکوں گا کہ میں وہ جنگل کی لومڑی ہوں
"تمام انگور کھٹے ہیں" اِتنا کہکے ہنس کے مٹائی تھی جس نے اپنی خفت
چھپائی تھی جس نے اس بہانے سے اپنی تکلیف دہ ندامت ـــ !

خانم

عظیم بیگ چغتائی کی بہترین تصنیف ہے۔ اس دلچسپ اور دلرس کتاب کا ہر ایک باب چمکتا ہوا مزاحیہ افسانہ ہے۔ ہر افسانہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔ مگر سب کہانیوں کا ہیرو اور کردار ایک ہے۔ ایک سے ایک مزیدار اور ہنستی ہوئی کہانی اس قدر پُر لطف، اس قدر پُر مذاق، اس قدر عجیب اور اس قدر مضحکہ خیز اس قدر ظرافت اور لطافت آمیز پلاٹ کہ جو پڑھے ہنسے! چغتائی صاحب کی بہترین کتاب ہے۔ ضخامت چار سو صفحات۔ جلد پوش سے آراستہ! قیمت چار روپے: (للعہ)
ساقی بک ڈپو دہلی سے طلب فرمائیے!

جلال میرزا خانی

چندہ باز

اگلے زمانے میں لوگوں کا خیال تھا کہ بلائیں آسمان سے نازل ہوتی ہیں۔ لیکن جدید تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بلاؤں کی پیداوار کے لحاظ سے آسمان کے مقابلے میں زمین زیادہ زرخیز ہے۔ بلاؤں کے بارے میں ایک بنیادی عقیدہ یہ بھی تھا کہ ان کے اُترنے کا وقت رات کی تاریک گھڑیوں میں سے کوئی ایک گھڑی ہوتی ہے۔ لیکن یہ خیال بھی آجکل بدلتا جاتا ہے۔ کیونکہ لگاتار اور پے درپے تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ اکثر بلائیں سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اپنے ٹھکانوں سے نکل کر نشانوں کی جگہ پر پہنچ جاتی ہیں۔

یہ بات تو مانی ہوئی ہے۔ کہ زمینی بلائیں سب کی سب انسانی روپ دھار کر پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بلائیں جن طریقوں سے ہم کو آپ کو مبتلا کرنے پر تل جاتی ہیں۔ وہ طریقے ان کی دماغی کاوشوں اور اُپج کے لحاظ سے جُدا جُدا ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ انسانی دماغ نے کائنات کو پیدا کیا ہے یا کائنات نے انسانی دماغ کو۔

علامہ اقبال کا مشہور شعر ہے:۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت سے نہ نوری ہے نہ ناری ہے

جہاں تک پہلے مصرعے کا سوال ہے زمینی بلائیں اس کے مضمون پر بادن تولے پوری آتی ہیں کیونکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ زمینی بلاؤں کا عمل اس مصرعے کی حقیقت اور سچائی کو مکمل کرتا ہے۔ مصرعے کا مضمون ایک عالمگیر حقیقت اور مانی ہوئی سچائی ضرور ہے۔ لیکن جب تک انسان کی نگاہ میں انسانی بلاؤں کے عمل کا نقشہ موجود نہ ہو اس مضمون کی سچائی اور عظمت پورے طور سے دل میں نہیں آتی۔ انسانی بلائیں اگرچہ عمل اور حکمت کا سرچشمہ اور خزانہ ہوتی ہیں۔ انکا ہر عمل ایک حکمت اور ہر حکمت ایک عمل ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ لوگ اکثر عاقل اور حکیم کے نام سے مشہور ہونا پسند نہیں کرتے جس طرح ہر وہ آدمی جو زہر کھاتا ہے مر جاتا ہے۔ لیکن ہر وہ آدمی جو مر جاتا ہے ضروری نہیں کہ وہ زہر ہی سے مرا ہو۔ اسی طرح ہر انسانی بلا اپنی فطرت یا نیچر اور طبعی خمیر کے لحاظ سے عاقل اور حکیم ہے۔

لیکن ہر عاقل اور حکیم کے لئے ضروری نہیں کہ وہ انسانی بلا بھی ہو۔ یہی وہ نقطہ اور آخری حد ہے جو انسانی بلاؤں کو عام انسانوں سے جُدا کرتی ہے۔ اور یہی وہ فنی کمال ہے جو اس شعر کے دوسرے مصرعے کو آنکھیں دکھاتا ہے "یہ خاکی اپنی فطرت سے نہ نوری ہے نہ ناری ہے"۔ انسانی بلائیں اپنی فطرت سے نوری اور اپنی فطرت سے ناری ہوتی ہیں۔ انسانی بلاؤں کو صرف نوری کہنا۔ ان کے عمل پر خاک ڈالنا اور ان کے رتبے سے انکار کرنا ہے۔ اور محض ناری کہنا ان کی حکمتوں کی توہین ہے۔ یہ ہستیاں ایک ہی وقت میں نوری بھی ہیں۔ اور ناری بھی۔ یہ نور اور نار حاصل نہیں کرتیں بلکہ اپنی فطرت کو اپنی منشا کے مطابق بنا کر لاتی ہیں۔ اور اس میں اپنی مرضی سے نور اور نار سموتی ہیں۔ ممکن ہے آپ اسے مشرق کا مبالغہ اور بڑھا چڑھا کر کہی ہوئی بات سمجھیں۔ لیکن کچھ آپ بیتیاں اور کچھ جگ بیتیاں ایسی ہیں کہ ان بلاؤں کے بارے میں جو کچھ کہا جائے اس میں ہمیشہ یہ کمی محسوس ہوتی رہتی ہے۔ کہ کہنے کا حق ادا نہ ہوا۔

کوئی انسان زور بازو سے انسانی بلا نہیں بن سکتا۔ کچھ ہستیاں تھیں جو اپنا حصہ لے گئیں اور بس۔ انسانی بلاؤں کے ایک گروہ کے سامنے آپ خدا کی نعمتوں سے بھرا ہوا طاس رکھ دیجئے، وہ شرمائے گا، لجائیگا۔ ہاتھ تک نہ لگائے گا۔ یہ ہے ایک حکمت۔ فن کار کبھی یہ غلطی نہ کرے گا۔ کہ خود ایک دو مٹھیاں بھر لے۔ وہ ایک کپڑا یا رومال کھول کر پھیلا دے گا۔ اب یہ آپ کا فرض ہے کہ اس شرمائی لجائی سادہ دُنیا کا لحاظ کریں اور اپنے ہاتھ سے رومال کا کونا کونا بھر دیں۔ یہ ہے ایک عمل۔

یہ گروہ آپ کی وردیا دلی کو صرف دیکھے چلا جائے گا اور منہ سے کچھ نہ کہے گا۔ اس کی نگاہ اپنے رومال سے زیادہ آپ کے ہاتھوں کو جنبش اور دل کے جذبات پر ہے۔ یہ گروہ ہاتھوں کی آنے والی جنبش کو بھانپنے میں کمال رکھتا ہے۔ اور ضرورت کے وقت فوراً ایک نکھری اور شستی ہوئی آہ بھرنے پر یا اجلی اور دھلی ہوئی چٹکی لینے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ اور اس سے پہلے کہ آپ ہاتھ کی رفتار کا رُخ موڑیں آپکے دل کی باگیں کھٹ اسی رومال پر کھنچ جاتی ہیں۔ اب آپ ہی فرمائیے کیا یہ روگ ہمارے آپ کے بس کا ہے؟ آپ کو ماننا پڑے گا کہ یہ نیکی بازو کے زور سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ہم چند ایسی بلاؤں کی کھیپ میں مبتلا ہو گئے۔ جو چندہ مانگنے آیا کرتی تھیں۔ اپنی عمر میں سامنا تو بڑی بڑی بلاؤں سے ہوا ہے لیکن چندہ باز جتنی مکمل اور خوبصورت بلا ہوتی ہے۔ اتنی شاید دیکھنے سننے میں نہ آئی ہو۔ جس طرح جانوروں اور انسانوں کی اونچی اور نیچی نسلیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح چندہ بازوں کی بھی مزاجی نسلیں ہوتی ہیں۔ بڑھیا نسل کے چندہ باز بڑھیا باتیں کرتے ہیں۔ اور گھٹیا نسل کے چندہ باز گھٹیا باتیں۔ لیکن ہوتے ہیں دونوں سہل ممتنع یعنی یہ ایسے ایسے فن جانتے ہیں۔ جو دیکھنے میں چٹکیوں میں ہونے والے اور آزمانے لگو تو عمریں گنواجائیں باتوں میں کوئی پیچ نہیں، صورت میں کوئی فریب نہیں، لیکن آنکھوں کا نمطہ سمیت ایسے کہ سانپ نکلا اور لکیر پیٹنا پڑی۔

چندہ باز اگرچہ رنگا رنگ جامے پہنتا ہے۔ لیکن اپنے قد کے انداز سے پہچانا جا سکتا ہے اس صدی کے موجودہ دور میں ہر چیز کا ناپ تول موجود ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ چندہ باز کے قد کا اندازہ نہ ہو۔ پہلے داناؤں نے عاشق کی پہچان کے سلسلے میں تین پیمانے بیان کئے ہیں۔ رنگ زرد و آہ سرد و چشم تر، اس لحاظ سے چندہ باز بھی عاشق کے برابر ہوتا ہے۔ اس کا رنگ عموماً سرخ و سپید ہوتا ہے۔ اگر کھال سیاہی مائل ہو تو بھی خون کی سرخی صاف جھلکی پڑتی ہے۔ باقی دو علامتیں آہ سرد اور چشم تر اپنے اپنے موقعے پر اپنے اپنے جوہر دکھاتی ہیں۔ ودران میں کبھی کوتاہی اور بھول چوک نہیں ہو سکتی۔

چندہ باز کی نگاہ میں فراست اور بلا کی بے پناہ ہوتی ہے۔ جیب سے دل تک اور دل سے جیب تک کے تمام راستے اسکی نظر میں ہوتے ہیں۔ عکس ریز آلہ تو آج کا ایجاد ہے مگر چندہ باز اس زمانے سے دلوں اور جیبوں کو جانتا چلا آرہا ہے۔ جب انسان نے تاریخ لکھنا بھی نہ سیکھی تھی۔ چندہ باز اس بلا کا تاڑنے والا ہوتا ہے کہ نگاہ کی ایک حرکت سے جیب کے تمام سکوں، آپکے دل کی کیفیتوں اور آپکی طبیعت کی ڈھلانوں پر چھا جاتا ہے۔

خیر تو ہم جس زمانے میں چندہ بازوں کے عام بلے میں مبتلا ہوتے اس زمانے کا ذکر ہے کہ چند بے فکرے اِدھر اُدھر کی ہانک رہے تھے۔ ایک صاحب کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ نام اجنبی تھا ہم لوگ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ نو وارد کو بلایا گیا جسم کے امیر صورت کے مسکین آئے اور بیٹھ گئے۔ اِدھر اُدھر کی سفارشیں جان پہچان کے چند نام، جانے کہاں کہاں سے اکٹھے کرتے تھے۔ کتنے باخبر ہوتے ہیں یہ لوگ۔ آخیر میں مطلب سعدی یہ کھلا کہ پیسے ٹکے کی ضرورت نہیں پانچ انگلیوں کی محنت سے کما کر کھانا چاہتے ہیں۔ بے فکروں نے ایک دوسرے کو دیکھا ہم وطن کے ارادوں کو نگاہوں نگاہوں میں سراہا گیا اور جن صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے تھے ان کے نام خط لکھا گیا، کہ ان کی مدد ہر ممکن طریقے سے فرمائی جائے۔ نو وارد صاحب خط لے کر رخصت ہوئے، اور ہمیں بھلائی برائی نیک و بد کمائی، روزگار بھیک ٹھگے وغیرہ مسئلوں میں الجھا گئے اور محفل ہنسی اور بھاری بھرکم باتوں پر ختم ہوئی، کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ ہمارے خط میں جو "ہر ممکن طریق سے مدد فرمائی جائے" لکھا تھا اسے فن کے ماہر نے بنیاد کی پہلی اینٹ بنایا اور اس پر چندے کی عمارت کھڑی کر دی، اب بتائیے کہ کیا ہمیں اور آپ کو چندہ باز بننے کی توفیق مل سکتی ہے۔

ایک اور صاحب کی سنیئے۔ یہ چندہ بازوں کے معتبر طبقے میں سے تھے۔ چندہ بازوں کا معتبر طبقہ وہ ہے جس کی جان پہچان کا دائرہ وسیع ہو جن کے چندے کی وجہ کوئی یتیم خانہ۔ ودوا آشرم چھوٹا موٹا اسکول، قومی عمارت کی اسکیم بیواؤں کے لئے جاڑے کا سامان وغیرہ سلسلے ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ان مدوں میں سے کوئی ایک موجود بھی ہو۔ ضرورت صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ لوگوں کو

ان چیزوں کی موجودگی کا خاک معلوم ہوا جب یہ صاحب تشریف لائے تو ہم چندہ بازوں کے خلاف بھرے بیٹھے تھے۔ اور یوں بھی جب گرہ میں دام نہ ہوں تو انسان نیکی اور بدی کے اُصولوں کی آڑ میں چندہ تو چندہ رہا گھریلو ضرورتوں سے پیچھا چھڑانے کی ترکیبیں سوچتا ہے۔ ہم نے سوچا آج اس چندہ باز کو آڑے ہاتھوں لو۔ آخر یہ کیا بیہودگی ہے کہ کمائیں ہم اور کھائیں یہ، ماہر چندہ باز نے تیور پہچانے اور موقع دیا کہ ہم ہی وار کریں۔ وار تابڑ توڑ ہوئے۔ لیکن اُستاد نے غالب کا وہ سماں باندھ دیا۔۔ وہ۔۔۔

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج
اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

ہم نے اس بیماری کا علاج بیماری کو بڑھا کر کرنا چاہا۔ اور پوچھا فرمائیے کتنا چندہ، وہاں جواب نپا تُلا اور برجستہ موجود تھا۔ بولے جتنا ثواب لینا چاہیئے ہو۔ آخر چندہ باز نے چیل کے گھونسلے سے وہ تنکے بھی لے لئے جن پر "ماس" کی لاگ تھی اور غالب کا یہ سفر ہمارے حصے میں آیا ـــ

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

اللہ بخشے ایک چندہ باز بزرگ اور تھے وہ ملک کے ایسے غیر مشہور حصے سے آتے تھے کہ آج تک جغرافیہ میں اس کا نام نظر نہیں آیا۔ ہندوستان میں لباس سے قوم اور وطن کا بہت کچھ علم ہو جاتا ہے۔ زبان کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا ہے۔ مگر ان صاحب کے لباس اور زبان سے وطن تو وطن قوم تک کا پتہ نہ تھا۔ اب آپ ان کے نام سے میاں بابو کہ لیجئے۔ [illegible] رام کہ لیجئے۔ بابو سنگھ کہ لیجئے زبانیں سمرقند سے [illegible] کماری تک کی ازبر۔ یہ حضرت بچوں میں اتنے ہر دلعزیز تھے کہ مامائیں کیا چیز ہونگی۔ ایک دن محلے میں شور سُنا۔ چندا ماموں، چندا ماموں، کچھ لوگ" باہر لپکے دیکھا تو وہی چندہ باز بزرگ ہیں۔ بچوں تک کو معلوم تھا کہ آپ چندہ لینے آتے ہیں۔ اور ماموں ایک عزیز رشتہ ہے۔ اس لئے یہ چندا ماموں ہوئے۔ بچوں نے ان کا نام یقیناً ایسے ہی اتفاقی حادثے کے طور پر رکھ لیا ہوگا۔

جیسے سائنس کی بڑی بڑی ایجادیں۔ اچانک پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہم نے غور کیا تو یہ لوری ان بزرگ پر پوری اُتر رہی تھی۔ بچوں کی لوری یوں ہے۔ چندا ماموں دور کے بڑے پکائیں بور کے، آپ کھائیں تھالی میں، ہم کو دیں پیالی میں، پیالی گئی ٹوٹ، چندا ماموں گئے روٹھ، پیالی آئی اور چندا ماموں آئے دوڑ، دیکھئے نا۔ اس لوری میں افسانے کے اجزا کتنے مکمل ہیں۔ چندہ! پھر ماموں کی سی گھلی ملی طبیعت۔ دور سے آنا بور کے بڑے پکانا۔ باتوں باتوں میں گھر پورا کرنا۔ آپ تھالی میں کھانا یعنی بڑا حصہ لینا دوسروں کو پیالی میں دینا۔ یعنی تھوڑا حصہ دینا اور اگر کبھی اتفاقی حادثے سے وہ پیالی ٹوٹ جائے تو فوراً روٹھ جانا۔ لیکن یہ روٹھنا مستقل نہیں عارضی ہے۔ کیونکہ پیالی آئی اور چندہ ماموں آئے دوڑ۔ اس لوری میں دو شخصوں کی چاشنی معلوم ہوتی ہے اور جو چیز ظاہر میں لوری ہے وہ اصل میں چندہ بازوں کے بارے میں کچھ حقیقتوں کا بیان ہے۔

چندہ بازوں کے معاملے میں یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ وہ کبھی شکرم پہ نکلتے ہیں اور کبھی ٹوٹا جوتا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ آپ شاید یہ کہیں گے کہ حرام کا مال حرام کے راستے نکل جاتا ہے۔ نہیں۔ یہ آپ کی بھول ہے۔ بات یوں ہے کہ جس طرح ایک ماہر اور فن کار نئے نقش بناتا اور مٹاتا رہتا ہے اور اس طرح اپنے فنی ذوق کی تسکین کر کے دل ہی دل میں نئی چیزیں پیدا کرنے کی لذت سے سرور اور خوشی حاصل کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ خوش حالی اور بدحالی سے کھیلتے رہتے ہیں۔ اور چندہ بازی کے نئے نئے طریقوں اور حربوں کو آزما کر اپنی فنی بھوک دُور کرتے ہیں۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کے خلوص کی وجہ سے یہ لوگ کسی حلے میں ناکام نہیں رہتے۔ ان کے خلاف "رو بلیاں دشمن دوڑ" کا ٹوٹکا۔ بلیات کا حصار اور بھوتوں کا کنٹرول بیکار رہتے ہیں۔ کوئی منتر ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ مگر یہ خود مستقل آزار بنے رہتے ہیں۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔

اعجاز حسین

خانہ آبادی

متواتر چھ مہینے دہلی میں مارے مارے پھرنے کے بعد جب مجھے ایک مکان کرائے پر مل گیا تو میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ ان چھ مہینوں میں میں نے دہلی جیسے وسیع شہر کو شرقاً غرباً ناپ ڈالا تھا اس دوران میں میں تین مختلف ہوٹلوں میں رہ چکا تھا، چند دوستوں کے ہاں کچھ وقت گذارا تھا، ایک اینگلو انڈین خاندان میں اپنا حق نمک ادا کرنے والے مہمان کی حیثیت سے بھی کچھ دن بسر کئے تھے اور اب کچھ عرصے سے ایک ایسے کمرے کی چھت تلے پڑا ہوا تھا جہاں میرے علاوہ پانچ اور بے گھر انسان ہر شام رات بسر کرنے کے لئے آ جاتے تھے۔ کھانا سٹوڈیو کی کینٹین سے لے کر نئی دہلی کے ریستورانوں اور ہوٹلوں سے گزرتے ہوئے فتح پوری کی دوکانوں جہاں مل جاتا ہم اپنا گھر سمجھ کر کھا لیتے تھے۔ اس عرصے میں دہلی کے سات دھوبیوں اور پانچ لانڈریوں کو میرے کپڑے دھونے کی سعادت حاصل ہو چکی تھی۔ زندگی میں کوئی ربط نہ رہا تھا اور اس بڑے شہر کے پُر ہجوم بازاروں میں سے گزرتے ہوئے جہاں ہر شخص اپنی اپنی دُھن میں بھاگتا دکھائی دیتا تھا، جب میں اپنی طرف دیکھتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے مٹر کا ایک حقیر دانہ سمندر میں جا گرا ہو۔ جب اپنی ساری تنخواہ ہوٹل والوں کی نذر کرنے کے بعد بھی مہینے بھر کا بل ادا نہ ہو سکا تو رتیش مجھے اپنے ہاں لے آیا۔ رتیش ایک چھوٹے سے کمرے میں اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ پڑا زندگی کی بے کیف صبحیں اور اُداس شامیں گن رہا تھا۔ دہلی میں آتے ہی میری اس سے ملاقات ہوئی اور تعلقات بغیر کسی کوشش کے خود بخود استوار ہو گئے۔ اس چھوٹے سے کمرے میں چلے آنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کا دم گھٹتا جا رہا ہو۔ اس چھت تلے بسنے والے ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی تھے۔ ہر صبح اس کمرے کے رہنے والے تیار ہو کر کہیں نکل جاتے اور دن بھر اپنے اپنے کولھو پر جُتے رہنے کے بعد شام کو تھکے ہارے سپاہیوں کی طرح آ کر اس چھت تلے پڑ رہتے۔ میں تین چار روز ہی میں زندگی کی اس بے کیفی سے اُکتا گیا اور میں نے رتیش کے ساتھ مل کر سر چھپانے کے لئے کوئی مناسب جگہ تلاش کرنے کی مہم نئے سرے سے شروع کر دی۔ آخر خدا خدا کر کے ایک مکان مل ہی گیا اور اس شام اس کمرے کی بے کیف فضا میں گھرے ہوئے بھی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے دل میں ننھی سی شمع روشن کر دی ہو۔ ان تمام صعوبتوں کو برداشت کرنے کے بعد یکایک ایک پورے مکان پر قابض ہو جانا چاہے وہ نئی اور پُرانی دہلی دونوں سے بارہ میل دُور ہی کیوں نہ ہو کچھ کم معرکہ نہ تھا۔ ہمارے ساتھی ہم پر رشک کر رہے تھے، میں نے اور رتیش نے اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا تھا اور اگلے ہی روز ہم اپنے نئے مکان میں چلے آئے۔

آج سے سینکڑوں برس پہلے لودھی بادشاہوں کے زمانے میں شاید یہاں شاہی قبرستان ہوتا تھا مگر اب سرکار نے یہاں ہزاروں مکان تعمیر کر کے ایک اچھی خاصی نوآبادی بنا دی تھی اور یہ مقام دہلی سے کوسوں دُور ہونے کے باوجود دنوں میں آباد ہو گیا تھا۔ اب یہ اچھا خاصہ قصبہ تھا جسے کلرکوں کی بستی کہا جائے تو بہتر ہو گا۔ لوگ اسے لودھی کالونی کہتے تھے اور شاید اسے آباد کرنے کے لئے ہندوستان کے ہر خطے سے کلرک منگوائے گئے تھے۔ میلوں کے رقبے میں چوڑی چوڑی سڑکوں کا جال پھیلا ہوا تھا اور ان کے دونوں طرف نئی وضع کے صاف ستھرے ایک ہی طرح کے مکان اور ان میں ایک ہی قسم کا فرنیچر۔ ہر مکان پر پہنچتے ہی گھر کا دھوکا ہوتا تھا اور لوگ شاید مکانوں کے باہر لکھے ہوئے نمبروں کی وجہ سے اپنا اپنا گھر تلاش کر لیتے تھے۔ میں نے کئی دفعہ سوچا کہ اگر کسی ذہین انجینئر کو مکانوں پر نمبر لکھ دینے کی تجویز نہ سوجھتی تو یہاں زندگی اس طرح گڈ مڈ ہوتی اور لوگوں کو اپنے مکان پہچاننے میں اس قدر دقت ہوتی کہ چار دن بھی گذارا کرنا مشکل ہو جاتا اور نظر کے اس دھوکے سے آئے دن جو دلچسپ

حادثات پیش آئے وہ الگ۔ اس گنجان آباد بستی میں ہمیں ایک فلیٹ مل جانے میں ہماری خوش قسمتی کو صرف اسی حد تک دخل تھا کہ اس فلیٹ کے متعلق ارد گرد کے تمام لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے چنانچہ فلیٹ کے مالک نے اسے ایک معمولی سے کرائے پر ہمارے حوالے کر دینے میں کوئی لیت و لعل نہ کی لیکن ہمارے وہاں پہنچنے پر چند نیک دل ہمسایوں نے آنے والی مصیبتوں کا نقشہ کھینچ کر اپنی ہمدردی کا ثبوت ضرور دیا۔ لیکن جب رمیش نے ہنستے ہوئے پوری صاحب سے کہا "جناب ہماری زندگی تو پہلے ہی آسیب زدہ ہے اس آسیب کا اس مکان کا کیا اثر ہو گا"۔ تو پوری صاحب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور اس فقرے کو سننے کے بعد انہیں خود اپنے مکان کی فکر ہونے لگی جس کے عین اوپر کے فلیٹ پر ہم قبضہ کرنے والے تھے۔ اسی شام جب ہمارے دوسرے ہمسائے میر شرافت علی صاحب ہم سے ملنے آئے تو انہوں نے بھی اس مکان کے متعلق چند عجیب و غریب قصے سنائے، میں نے تحمل سے کام لیا اور آخر میں یہ نصیحت بھی کی کہ اب جبکہ ہم اس مکان میں آ ہی گئے ہیں تو بچوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے اور انہیں اکیلے ادھر ادھر نہ جانے دیا جائے۔ لیکن جب ہم نے انہیں یہ بتایا کہ ابھی ان بچوں کی ماؤں نے جن کی طرف میر صاحب نے توجہ دلائی تھی ابھی اس گھر کے رہنے والوں کو نہیں نوازا تو میر صاحب کی آنکھوں میں ایک ایسی حیرانی کی جھلک اتر آئی جیسے وہ مافوق الفطرت انسانوں کے درمیان بیٹھے ہوں۔ ایک لمحے کے وقفے کے بعد میر صاحب نے حیرت سے کہا۔ "اچھا تو آپ دونوں گویا۔۔۔"

"جی ہاں کنوارے ہیں"، رمیش نے ان کا فقرہ مکمل کر دیا۔ ان دو ملاقاتوں کے بعد کسی اور ہمسائے نے ہم سے ملنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور دو چار روز کے قیام کے بعد ہمیں ان کے رویّے سے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہم اچھوت ہوں جو برہمنوں کی بستی میں آ بسے ہوں۔ جب پانچ دن اس مکان میں رہنے کے بعد بھی کوئی ایسا واقعہ پیش نہ آیا جو ان کو سنائے جانے کے قابل ہوتا تو ارد گرد کے لوگوں کی نگاہوں میں حیرت بڑھتی ہی چلی گئی، پھر جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ اس گھر میں رہنے والوں میں ایک ہندو ہے اور دوسرا مسلمان اور یہ دونوں رات کو بہت دیر سے گھر لوٹتے ہیں تو ان کے شبہات زیادہ قوی ہونے لگے۔ چند دنوں کے بعد ان کی نظروں سے یوں معلوم ہونے لگا جیسے ہم سے کہہ رہی ہوں "مکان آسیب زدہ ہو یا نہ ہو لیکن تم آسیب ضرور ہو"۔ ایک دن مہترانی نے رمیش سے پوچھا۔ "بابو جی، بی بی جی کب آئیں گی"۔ رمیش نے کہا۔ "کون سی بی بی جی"۔ اور مہترانی نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ "بابو جی آپ کی۔۔۔" اور رمیش ہنستے ہوئے بولا۔ "ارے وہ کبھی نہیں آئیں گی"۔ اگلے روز سے مہترانی نے مکان میں آنا چھوڑ دیا اور اس کے خاوند نے معافی مانگتے ہوئے کہا۔ "بابو جی کیا کیا جائے ہم غریب آدمی ہیں، میں کل سے خود مکان صاف کر جایا کروں گا"۔ اس واقعے کے بعد ہمسایوں کے اس عجیب و غریب رویّے کی تمام وجہیں ہم پر روشن ہو گئیں اور رمیش نے غصے میں آ کر کہا۔ "یہ بے عزتی ہے، صریحاً ذلّت ہے۔ لعنت ہے ایسی سماج پر جو کسی شخص کی شرافت پر اعتبار کرنے سے پہلے بیوی کا سرٹیفکیٹ دیکھتی ہے اور وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بلے بسے ہوئے گھروں میں صبح شام کیا ہوتا ہے"۔ "جانے دو رمیش" میں نے کہا۔ "تم خواہ مخواہ ہی جلا رہے ہو۔ ان لوگوں کے اپنے اصول ہیں۔ انہیں اپنی دنیا میں خوش رہنے دو۔ تم دیکھتے نہیں ہو اس آبادی کے قریب قریب ہر گھر میں ایک عورت ہے اور جب تم زندگی کی اتنی بڑی حقیقت کو ٹھکرا دو تو اس کا انجام یہی ہوتا ہے۔"

ہمارے ارد گرد ایک سے مکان ہی نہیں بلکہ ان میں ایک سی زندگی بھی تھی۔ کلرک، کلرکوں کی بیویاں، کلرکوں کے بچے سب ایک سے سانچے میں ڈھلے ہوئے افراد تھے۔ صبح صبح جب ان کے گھروں میں ناشتے اور کھانے کی تیاریاں ہوتیں ہم خاموش اپنے اپنے کمروں میں بستر پر پڑے شیلے کی نظمیں پڑھتے اور ڈبل روٹی اور مکھن والے کا انتظار کرتے۔ نو بجے سے مردوں کا ایک جلوس پیدل اور سائیکلوں پر شہر کی طرف روانہ ہونے لگتا اور ساڑھے دس بجے تک اس آبادی کے تمام مرد اپنے اپنے قفس میں پہنچ جاتے جسے عرفِ عام میں دفتر کہا جاتا تھا۔ ان کی بیویاں دن بھر گھروں میں فرش دھوتیں، کھانا پکاتیں یا برتن مانجھتیں، بچوں کو مارتیں یا دو دو چار چار جمع ہو کر ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کرتیں جب دن ڈھلنے لگتا اور مکانوں کے سائے لمبے ہونے لگتے اور اس جلوس کے واپس

آنے کا وقت قریب آنے لگتا تو وہ نہا دھو کر بال سنوارتیں اور ہونٹوں پر سستی سی لپ سٹک کی تہیں جما کر کام کاج میں مصروف گھر کے دروازوں کی طرف دیکھنے لگتیں۔ پھر جب صبح کے بھولے شام کو گھر لوٹ آتے تو دن بھر کی باتوں کا باہمی تبادلہ ہونے لگتا۔ ہمسائی کی بے حیائی کا قصہ میاں تک پہنچتا تو وہ زیرِ لب مسکراتے اور حیرت کا اظہار کرتے، سپرنٹنڈنٹ کے مظالم اور ہونے والی ترقی کی بات بیوی کے کانوں تک پہنچتی تو وہ سپرنٹنڈنٹ کو کوستی اور آئندہ ہونے والی دس روپے ماہوار ترقی کے لئے جی ہی جی میں دعائیں مانگتی۔ ان چھوٹے چھوٹے گھرندوں میں زندگی کے غموں اور خوشیوں کی برابر کی حصہ داری ہوتی تھی۔ بچے نہا دھو کر مکانوں کے باہر گھاس کے کھلے میدانوں میں نکل آتے اور کھیل کود میں مشغول ہو جاتے۔ جب سورج غروب ہو جاتا اور سڑکوں پر دُور دُور کھمبوں پر لگے ہوئے بجلی کے قمقمے روشن ہو جاتے تو اکثر لوگ اپنی اپنی بیویوں کو ساتھ لے کر سیر کیلئے نکل آتے۔ اس وقت کئی دفعہ کپور صاحب اور پوری صاحب، مینر صاحب، اور خانصاحب کے خاندان آپس میں گھل مل جاتے۔ بچے بچوں میں مل کر غل مچاتے، عورتیں ذرا الگ ہو کر آہستہ آہستہ کچھ باتیں کرنے لگتیں اور پوری صاحب اور کپور صاحب میں ایندھن کی گرانی اور خالص گھی نہ ملنے کے مسائل پر بحث چھڑ جاتی۔ اس وقت کبھی کپور صاحب پوری صاحب کی بیوی کے کنجوس ہونے پر یا کپور صاحب پوری صاحب کے زیادہ بچے پیدا کرنے پہ کوئی ہلکا سا مذاق بھی کرتے تو ایک دوسرے کی بیوی کو بھوجائی کہنے میں کبھی تاخیر سے کام نہ لیا جاتا۔ سرِ شام آبادی میں سینکڑوں جوڑے ٹہلتے دکھائی دیتے خوبصورت عورتیں، بدصورت مرد، خوش وضع مرد۔ بدشکل عورتیں، دوپٹے اور ساڑیاں، سوٹ اور پاجامے قمقموں کی ہلکی ہلکی روشنی، دبے دبے قہقہے اور شام کی فرحت بخش ہوائیں۔ اس وقت آبادی میں اچھی خاصی رونق ہو جاتی جیسے کسی غریب گھرانے کی چنچل لڑکی پر جوبن آ جائے۔

ہمارے چاروں طرف ایک قناعت تھی، ایک اطمینان، ایک سکون اور ہم اس ماحول میں اپنے آپ کو بالکل اجنبی محسوس کرتے تھے، نئے مکان کی ساری خوشی اس اجنبیت کے غم میں ڈوب گئی تھی۔ ہمیں رات کو اکثر سٹوڈیو سے لوٹنے میں دیر ہو جاتی اور اگر کسی روز ذرا جلدی ہی فراغت ہو جاتی تو گزرتی ہوئی شام اور بڑھتی ہوئی رات کے ساتھ یہ خیال آتا کہ آخر گھر میں کیا رکھا ہے جس کی خاطر کناٹ پلیس کا ایک چکر لگانے کے خیال کو ترک کر دیا جائے اور پھر جب کناٹ پلیس کا ایک آدھ چکر لگانے اور کسی چھوٹے بڑے رستوران میں کھانا کھانے کے بعد جب ہم گھر پہنچتے تو لوگ اکثر شام کی سیر ختم کر کے اپنے اپنے گھروں میں زندگی کی خوشیاں اور غم بانٹنے میں مصروف ہوتے۔ دُور سے رمیش اپنے گھر کی طرف اشارہ کر کے مجھے کہتا۔ "دیکھو آصف اس مکان کے سوا باقی ہر گھر میں روشنی ہے"۔ اور میں کہتا۔ "دل کی روشنی کا انتظام کر لو رمیش گھر میں خود بخود روشنی ہو جائے گی۔ کبھی کبھی رمیش کو اُداسی کا دورہ پڑتا اور وہ سرِ شام گھر لوٹ آتا۔ اس روز مجھے رات کو سٹوڈیو سے گھر تک کا لمبا سفر تنہا طے کرنا پڑتا۔ تغلق روڈ سے ادھر مڑ کر کوئی میل بھر سڑک ایسی بھی تھی جس پر روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ گہری تاریکی میں لپٹی ہوئی سنسان سڑک کے دونوں طرف گھنے درخت اور درختوں کے پیچھے لودھی شہنشاہوں کے پتھر کے بڑے بڑے ہیبت ناک مقبرے۔ اندھیری راتوں میں تاریکی کا وہ عالم ہوتا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے کا محاورہ شرمندۂ معنی ہو جائے۔ ہوا کے تیز جھونکے سے ٹہنیوں میں سرسراہٹ ہوتی اور ایک طویل سائیں سائیں کی منحوس آواز آنے لگتی۔ کبھی کبھی ٹہنیوں کے ہلنے سے دُور کے ایروڈروم کی روشنی کی بھولی بھٹکی شعاعیں اس تاریکی کو چیر کر سڑک پر آ گرتیں اور سڑک اس نیم روشن حصہ پر اس کانپتی ہوئی روشنی میں درختوں کی جھولتی ہوئی ٹہنیوں اور پتوں کے سائے دیوانہ وار رقص کرتے اور عجیب عجیب شکلیں بناتے، اس ویران سڑک پر سائیکل چلاتے ہوئے میرے پاؤں لڑکھڑاتے لگتے اور مجھے ڈر لگتا۔ اندھیرے میں لپٹا ہوا راستہ بالکل دکھائی نہ دیتا اور رات کے نامناسب اوقات پر یہاں سے گزرتے ہوئے مجھے اکثر یہ خیال آتا کہ میں رات کو کبھی کسی درخت کے تنے سے سائیکل ٹکرا کر سر پھوڑ لوں گا یا اس گہرے اندھیرے میں برابر کے قبرستان

میں منڈلاتی ہوئی کوئی آوارہ رُوح مجھ سے آ چمٹے گی یا اگر کچھ بھی نہ ہوا تو کبھی امریکن سپاہی اور اُس کی محبوبہ سے ضرور جا ٹکراؤں گا جو اس رومان انگیز اندھیرے میں ہاتھ میں ہاتھ دئے کبھی کبھی سائیکل کے پاس سے گزر جاتے اور اگر امریکن سپاہی (جن کے سگریٹ اس اندھیرے میں جگنوؤں کی طرح چمکتے رہتے) سگریٹ پینے کے اس قدر شوقین نہ ہوتے تو شاید اب تک کئی دفعہ یہ حادثہ ہو بھی چکا ہوتا۔ میں گھر پہنچتا اور رمیش تنہا چھت پر ٹہل رہا ہوتا۔ "سو کیوں نہیں جاتے رمیش؟" "نیند نہیں آتی۔" وہ بجھی ہوئی آواز میں جواب دیتا۔

ہم رات کو دیر سے سونے کے باوجود علی الصبح اُٹھ کھڑے ہوتے۔ سامنے والے فلیٹ میں سردار جی اور اُنکی بیوی برآمدے میں سوتے تھے۔ سردار جی کی بیوی کا شب خوابی کا لباس بہت دلچسپ ہوتا۔ ایک کھُلے پائنچوں کا پاجامہ اور بغیر بازو کے بلاؤز، صبح کے دھندلکے میں اس کے کسمساتے ہوئے بدن کی کندن میں لہریں سورج کی پہلی کرنوں میں گھُلنے لگتیں۔ اس کے سیاہ بلاؤز میں سے جھانکتے ہوئے دودھ سے سفید بازو آہستہ آہستہ نمایاں ہونے لگتے اور صبح کی ہوا کے نرم جھونکے رات بھر میں بکھرے ہوئے گیسوؤں کی پریشانی میں اضافہ کرنے لگتے۔ وہ اُٹھتی اور گردن کی ایک جنبش سے اپنے شب رنگ گیسوؤں کو جھٹک کر نسیمِ سحری میں آنکھیں کھولنے والی کلی کی طرح کھِل جاتی۔ میں نے رمیش سے ہزار دفعہ کہا تھا کہ وہ مجھے صبح ہی صبح پریشان نہ کیا کرے مگر اُدھر وہ آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھتی اِدھر رمیش مجھے آوازیں دینے لگتا۔ "ارے بدنصیب اُٹھ عبادت کا وقت ہو رہا ہے۔" ایک بجلی تھی جو محض چند لمحوں کے لئے آنکھوں کے سامنے کوندتی اور پھر اچانک اُسکی نگاہیں ہمارے فلیٹ پر پڑ جاتیں۔ پاس ہی پڑا ہوا دوپٹہ وہ عجب بے نیازی سے اُٹھاتی اور اپنے بازوؤں پر ڈال لیتی۔ ادھر اُدھر دیکھتی یا گھبرا کر نوکر کو آوازیں دینے لگتی۔ پاس کی چارپائی پر سوتے ہوئے سردار جی ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑے ہوتے اور وہ مُسکرا کر کہتی "آپ خواہ مخواہ جاگ اُٹھے ہیں میں تو مندو کو بلا رہی تھی۔" رمیش اپنے آپ کو چارپائی پر گرا دیتا

اور گنگنانے لگتا۔ "نیند اسکی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اسکی ہیں"۔

ایک دن اسی منظر کو دیکھ چکنے کے بعد رمیش پر ایک الہامی سی کیفیت طاری ہو گئی اور اس نے نہایت سنجیدہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں نے آخری فیصلہ کر لیا ہے۔" "مگر آخری فیصلے سے تمہاری مراد خودکشی ہے تو میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں۔" "نہیں میرا مطلب ہے کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو ضرور شادی کرنی پڑے گی۔" میں اسکی اس بے محل سنجیدگی پر ہنس دیا۔ "اس کارِ خیر کے لئے تو تم بہت موزوں معلوم ہوتے ہو۔" رمیش کے چہرے پر سنجیدگی کا غلاف بدستور چڑھا رہا اور وہ بولا۔ "اگر تم یہ کہتے ہو تو مجھے یہ بھی منظور ہے۔" اور کچھ دنوں بعد جب رمیش ایک لڑکی کو اپنے ساتھ لے آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس دن اس کی سنجیدگی بے معنی نہیں تھی۔ گرمی کی ایک سخت دوپہر تھی اور میں اپنے کمرے میں بیٹھا والدہ کے شکووں سے بھرے ہوئے خط کا جواب لکھ رہا تھا کہ رمیش کمرے میں داخل ہوا اور اس کے ساتھ ایک لمبے قد اور بکھرے ہوئے بالوں والی لڑکی۔ اسکے چہرے کے نقش بہت متناسب تھے اور وہ ہلکے آسمانی رنگ کی سادہ ریشمیں ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ "اِن سے ملو آصف ان کا نام تسنیم ہے اور تمہارے متعلق میں ان کو سب کچھ بتا چکا ہوں۔" گھبراہٹ میں میں سوائے آداب عرض کے اور کچھ نہ کہہ سکا اور جب وہ جواب میں ہلکے سے مُسکرائی تو اس کی مُسکراہٹ کو دیکھ کر مجھے بجھتے ہوئے انگاروں کا خیال آ گیا۔ ایک لمحے کے غیر محسوس وقفے کے بعد میں نے کہا "آپ تشریف رکھیئے۔" رمیش بولا "نہیں تم اپنا خط لکھو ہم دوسرے کمرے میں جا رہے ہیں۔" رمیش اور وہ ساتھ کے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے خط ایک طرف رکھ دیا اور میرا ذہن خدا جانے کہاں کہاں بھٹکنے لگا۔ ساری دوپہر ساتھ کے کمرے سے پنکھے کی گھر گھر کے ساتھ ان دونوں کی کھسر پھسر کی آوازیں آتی رہیں۔ آخر وہ کیا باتیں ہیں جو ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ میں یہی سوچ سوچ کر اُونگھ رہا تھا کہ رمیش عجیب گھبراہٹ میں میرے کمرے میں داخل ہوا۔ "خیریت ہے" میں نے پوچھا۔ "عجیب مصیبت ہے" اس نے خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "گھر میں کوئی صراحی تک نہیں۔ مہمان کو اگر پیاس لگے تو کم از کم

پانی تو ٹھنڈا ملنا چاہیئے۔" "نل کھول دو۔" میں نے مشورہ دیا "اور اس وقت کا انتظار کرو جب دن بھر کی گرمی سے تپتا ہوا پانی ختم ہونے کے بعد ٹھنڈا پانی آنا شروع ہو جائے۔" "یا گلاس بھر کر پنکھے کے نیچے کیوں نہ رکھ دوں۔" رمیش چیخ اُٹھا "آپ خواہ مخواہ گھبرا رہے ہیں۔" برابر کے کمرے سے ایک مہین سی آواز آئی۔ "رہنے دیجئے مجھے کچھ ایسی پیاس نہیں ہے۔"

"بہت اچھا ہوا" میں نے آہستہ سے رمیش سے کہا۔ "اس گھر میں خوبی یہی ہے کہ یہاں آتے ہی پیاس مر جاتی ہے۔" رمیش ہنستا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ شام کو جب وہ واپس جاتے ہوئے میرے کمرے میں آئی تو میں نے غور سے شیریں کی طرف دیکھا۔ اسکے چہرے پر عمر کے آثار نمایاں تھے لیکن متانت نے اس کے حسن میں ایک سلجھی ہوئی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ وہ باتیں بہت دلکش انداز میں کرتی تھی اور اس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی غمگینی اس کی دردِ آشنائی کی غماز تھی۔ وہ ہنستی تو اس کے کانوں میں آویزے جھولنے لگتے لیکن ہنستے ہوئے بھی غمِ آشنائی کی یہ جھلک اس کی آنکھوں سے رخصت نہ ہوتی۔ میں نے سوچا وہ زندگی کے وسیع سمندر میں بغیر بادبان کی کشتی کی طرح ماری ماری پھر رہی ہے اور جب رات کو رمیش گھر لوٹا تو اس نے بھی میرے اس خیال کی تائید کی اور رمیش نے کہا کہ اب وہ اس کشتی کا ساحل بننے والا ہے۔ میں نے کہا "رمیش ایسے موقعوں پر صرف جذبات سے کام نہیں لینا چاہیئے۔" "تم درست کہتے ہو آصف۔" رمیش نے جواب دیا۔ "لیکن میں سب کچھ سوچ چکا ہوں۔" اور پھر اس کے بعد رمیش نے وہ ساری کہانی کہہ سنائی کہ کس طرح ایک اُداس شام کو شیریں اس کی زندگی کے راستے میں آگئی تھی اور کس طرح دونوں کی اُداسی ان کو ایک دوسرے کے بہت قریب لے آئی تھی۔ رمیش نے آنکھوں میں ارادے کی جھلک لاتے ہوئے کہا۔ "آصف اب یہ کشتی دُنیا کے اس طوفان کے کافی تھپیڑے کھا چکی ہے، اب مجھے اس کا ساحل بننا ہی پڑے گا۔" میرے تمام اصرار کے باوجود رمیش نے اس کی غمناک زندگی پر پڑا ہوا دبیز پردہ نہ اُٹھایا اور یہی کہتا رہا کہ اس کی کہانی کو سُن لینے کے بعد دُنیا میں سوائے میرے کوئی شخص اسے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔"

شیریں اس دن کے بعد اکثر ہمارے مکان پر آنے لگی، اور رمیش اور اس کی شادی کی بات پکی ہو گئی۔ ایک مہینے کے بعد جب رمیش اور شیریں کی شادی ہو گئی اور جب ہم شادی کی قانونی رسمیں پوری کرنے کے بعد عدالت سے باہر نکلے تو میں نے شیریں کو مبارکباد دی۔ شیریں نے مسکراتے ہوئے شکریہ ادا کیا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں غمِ آشنائی کی وہ جھلک بہت مدھم پڑ چکی تھی اور اس کے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ ایک زندہ اور فروزاں مسکراہٹ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ مکان کا تالا کھولتے ہوئے رمیش بولا "عجیب مصیبت ہے گھر میں صراحی تک نہیں ہے۔" "خاموش رہو" میں نے کہا۔ "تم بہت ناشکرے ہو رمیش" اور رمیش نے مارے شرم کے گردن جھکا لی۔ اگلے روز میں نے بنک میں اپنی جمع شدہ پونجی میں سے کچھ حصہ نکال لیا اور رمیش کو ایک انگوٹھی اور شیریں کو ایک ساڑھی خرید دی۔ رمیش نے بنک سے اپنا سارا سرمایہ لے کر شیریں کے لئے کپڑے اور گھر کا سامان خرید لیا۔ شیریں نے گھر کو جنت بنانے میں بہت صنعت سے کام لیا۔ رمیش نے اخبار میں ملازم کے لئے اشتہار دیکر مصیبت میں جان ڈال دی، چند دنوں تک ہر روز دو ایک ملازم اشتہار کے جواب میں آنے لگے۔ شیریں نے کھڑکیوں کے پردے اور صوفہ سیٹ کے انتخاب میں اپنی خوش ذوقی کا ثبوت دیا اور رمیش نے کراکری خریدتے ہوئے اعلان کیا کہ کراکری کے انتخاب میں اس کی سند بے مثال ہے۔ باقاعدگی اس گھر کا اُصول بن گئی۔ ناشتے پر تکلف سے کام لیا جانے لگا۔ رات کے کھانے کے لئے ہر شخص کو وقت پر گھر پہنچنے کی عادت پڑ گئی اور زندگی میں برسوں سے کھویا ہوا ربط واپس آ گیا۔

شام کو جب رمیش اور شیریں سیر کے لئے نکلتے تو میں کسی کام کا بہانہ کر کے رُک جاتا یا ان سے پہلے ہی کہیں چلا جاتا۔ ان کے اصرار کے باوجود میں کئی دفعہ ان کا ساتھ نہ دیتا۔ خدا جانے میں کیوں اپنے آپ کو ان کے لئے ایک بوجھ سا سمجھنے لگا تھا۔ شیریں میری بہت زیادہ عزت کرنے لگی تھی۔ ان دونوں کی موجودگی میں جب میں کمرے میں داخل ہوتا تو شیریں

گھبراکر دوپٹہ سنبھالنے لگتی اور میں کئی دفعہ معاف کیجئے کہہ کر باہر نکل جاتا۔ رئیس ایسے موقعوں پر ہنستا اور کہتا کہ تم کچھ شرمیلے ہوئے جا رہے ہو مگر اس میں شک نہیں کہ مجھے اب اس مکان میں ایک اجنبیت کا سا احساس ہونے لگا تھا۔ ہم مینوں کو اکٹھے گھومتے ہوئے دیکھ کر پوری صاحب معنی خیز نظروں سے کپور صاحب کی طرف دیکھتے اور مجھے خواہ مخواہ شرم آنے لگتی۔ کئی دفعہ شیریں اور رئیس ہنسے تو مجھے محسوس ہوتا جیسے وہ میری اُداسی کو بھانپ گئے ہوں اور اب محض مجھے خوش کرنے کی خاطر ہنس رہے ہوں۔ آخرکار میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں یہ مکان چھوڑ جاؤں گا۔ رئیس نے اس بات کا بُرا مانا اور میرے ہزار بہانوں کے باوجود مجھے جانے نہ دیا۔ ایک دن باتوں باتوں میں اس نے کہا۔ "ہاں اگر تمہیں ہماری وجہ سے کوئی تکلیف ہے تو ہمیں یہ مکان چھوڑنا چاہیئے۔" میرا جی چاہا کہ رو دوں۔ رئیس خدا کی قسم تم بالکل غلط سمجھتے ہو... ..!"

رئیس نے اپنے لئے ایک علیحدہ مکان کا بندوبست کر لیا اور ان کا سامان باندھ دیا گیا۔ وہ جاتے ہوئے میرے نئے گھر کا بہت سا ضروری سامان اور اپنا نوکر چھوڑ گئے۔ الہ دین بہت وفادار ملازم ثابت ہوا تھا۔ شیریں نے چلتے ہوئے اسے میری دیکھ بھال کرنے کی تاکید کی اور میں ان کو چھوڑنے کے لئے انکے ساتھ ہی انکے نئے مکان تک چلا گیا۔ دن بھر ہم نئے مکان کے کمروں کی تقسیم، فرنیچر کے رکھنے اور مکان کی ضروری آرائش میں لگے رہے۔ کھانا کھانے کے بعد رات گئے وہاں سے لوٹا۔ میں نے دُور سے دیکھا گھر میں بالکل تاریکی تھی۔ الہ دین کھاٹ پر پڑا ہوا میری راہ دیکھ رہا تھا۔ "سوئے نہیں الہ دین تم" "سرکار آپ کا انتظار کر رہا تھا۔" "تم تو اب سو رہا ہوا آج سے تم اس گھر کے مالک ہو۔" "میں تو آپ کا خادم ہوں سرکار" "نہیں الہ دین تم میرے شریک حیات ہو" "کیا کہا سرکار" "کچھ نہیں پانی پلاؤ ذرا۔" میں سر جھکائے کرسی پر بیٹھ گیا۔ الہ دین پانی کا گلاس لئے میرے پاس کھڑا کہہ رہا تھا گرمی بہت ہے سرکار آج کل پیاس دن بھر نہیں بجھتی۔"

(حلقہ ارباب ذوق، شاخ دلی میں پڑھا گیا)

سلام مچھلی شہری

"وعدہ"

"آج تمہیں بتلاتا ہوں
میرے پاس تخیل ہے
تم مجھ کو سرمایہ دو۔
میں جس جانب آنکھ اُٹھا دوں
وہ نازک دوشیزہ دو۔
رقص دو۔ ساز و نغمہ دو۔ مینا دو۔ پیمانہ دو۔
میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔
سب سے بڑا فن کار بنا کر
اپنے آپ کو دکھلا دوں —

آج تمہیں بتلاتا ہوں
میرے پاس صداقت ہے
تم اب مجھکو دھوکا دو۔
جب پت جھڑ سے گھبرا جاؤں
کاغذ کا گلدستہ دو۔
اپنے خدا سے کہکر، جب چاہوں، فطرت کا نظارا دو۔
میں تم سے وعدہ کرتا ہوں
اک اَبدی شہکار بنا کر
ہر نغمے کو چمکا دوں۔

آج تمہیں سمجھاتا ہوں
میری فکر جواں ہے لیکن
یہ میری بربادی ہے۔
میری چیخیں کیا کریں گی
"فن" بھی اک شہزادی ہے!
تم مجھکو سرمایہ دو۔
میں تم سے وعدہ کرتا ہوں
دُنیا کو گلزار بنا کر
جنّت کو بھی شرما دوں —— !!"

محمد احسن فاروقی

نئے ادب کی حقیقت

"نیا ادب" نہ صرف اُردو ادب میں بلکہ دُنیا کے ادب میں بالکل نیا کرشمہ ہے اور ساتھ ہی ساتھ نہایت عجیب بھی بلکہ عجوبہ! اس وقت دُنیا کے ہر طالب ادب کی آنکھیں اس کی طرف لگی ہوئی ہیں "نیا ادب" ایک تحریک ہے جس کو اوّل جنگِ عظیم کے لگ بھگ دو امریکن حضرات نے انگلستان میں شروع کیا۔ اس کا آغاز سنہ ۱۹۱۴ء میں ہوا جبکہ مسٹر ازرا پاؤنڈ نے "امیجسٹ انتھولوجی" شائع کی اور جس میں مسٹر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی نظم "الفرڈ پروفراک" بھی شامل تھی۔ مگر اس نئی تحریک کی اہمیت اس وقت بڑھی اور اس نے کافی زور اُس وقت پکڑا جبکہ سنہ ۱۹۲۲ء میں مسٹر ایلیٹ کی نظم "دی ویسٹ لینڈ" شائع ہوئی۔ اس کے بعد سے یہ تحریک دنیا کے ہر ادب میں پھیل گئی اور پھیل رہی ہے۔ اُردو میں اس کا آغاز سنہ ۱۹۳۲ء سے سمجھنا چاہیئے جبکہ "انگارے" نے اُردو داں سوسائٹی کو اس درجہ برانگیختہ کیا کہ گورنمنٹ نے اس تصنیف کو ضبط قرار دیا۔ اس طرح "نئے ادب" نے ہندوستان اور انگلستان دونوں میں تہلکہ مچا دیا۔ دونوں ملکوں میں ہر طرف سے "نئے ادب" کے خلاف صدائیں بلند ہوئیں۔ مگر اُردو ادب میں اس "نئے ادب" کی نوعیت انگریزی ادب سے کہیں زیادہ عجیب ٹھہری۔ اگر انگریزی ادب میں "نیا ادب" ایک ایسے ستارے کی طرح نمایاں ہوا جس کی جگہ اونچائی اور چال وغیرہ عالمانِ نجوم نہیں مقرر کر سکتے تھے تو اُردو ادب میں وہ ایسے دمدار ستارے کی طرح ظہور میں آیا جو تمام اُفق پر چھا جانے والا معلوم ہوتا تھا اور جس کو دیکھ کر تمام اُردو ادیب ایسی نحوست کا اثر محسوس کرنے لگے جو تمام ادب کو تباہ کر دیگی۔

اُردو ادب میں اس کرشمے کے اس قدر زیادہ عجوبہ ٹھہرنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ یہاں یہ پہلا انقلاب ہے۔ انگریزی ادب اپنی سات سو برس کی زندگی میں کم از کم پانچ انقلابوں سے تو ضرور ہمکنار ہو چکا ہے اور آخری انقلاب یعنی انیسویں صدی کا رومانی تحریک تو جیسے کل ہی کی بات ہے۔ مگر اُردو ادب اپنی صرف ڈیڑھ سو برس کی زندگی میں محض فارسی ادب کی تقلید پر چلتا رہا۔ پُرانی روشی والوں کے "نئے ادب" پر تبصروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب اور سخن شناس اس نئے ادب کو سمجھنے تک سے کس قدر قاصر ہیں۔ اسی صدی کے شروع میں آزاد و حالی نے ایک انقلاب برپا کیا تھا اور اقبال اس انقلاب کی اہم ترین پیداوار کی صورت میں نمایاں ہوئے۔ مگر پُرانے ادب کے ماننے والے اب تک اقبال کی ادبی حقیقت کو بھی نہ سمجھنے پائے تھے کہ یہ نیا انقلاب نمودار ہوا جس نے اقبال ہی کو نہیں بلکہ جوش تک کو دقیانوسی ثابت کر دیا۔ ہمارے سخن شناسوں کا اس سے ویسا ہی حال ہوا جیسے کہ اس شخص کا ہو جس کو بم پھٹنے کا دھماکا گہری نیند سے جگا دے۔ پاؤنڈ اور ایلیٹ کی شاعری انیسویں صدی کی شاعری اور ملٹن کی شاعری کے خلاف ہے مگر سترہویں صدی کے شاعر ڈن اور اس کے "میٹا فزیکل" اسکول کی شاعری سے بہت مطابق ہے اور اس لئے پُرانے انگریزی ادب سے بالکل الگ نہیں ہو جاتی۔ پھر جس طرح رومانی انقلاب نے نشاۃ ثانیہ اور ملٹن کے اصولوں کو پھر سے رائج کیا تھا اسی طرح اب نئے شاعر ڈن اور ڈرائیڈن کے کلام کو مشعلِ راہ بناتے ہیں۔ برخلاف اس کے اُردو میں کوئی شاعر یا کوئی دور ایسا ملتا ہی نہیں جس سے نئے شاعر اپنے فن کا مقابلہ کر سکیں اور اُس کے اصولوں سے مدد لے کر اپنے فن کو ترقی دیں۔ نئے ادیب اکثر نظیر اکبرآبادی سے اپنا رشتہ ملاتے ہیں مگر نظیر کی شاعری خیالات کے اعتبار سے نہایت پست ہے اور فن کے اعتبار سے اتنی ہی پُرانی ہے جتنی اور اُردو شاعری۔ اس لئے نئے ادیب کو نظیر سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہو سکتا۔ انگریزی کے نئے شاعر نے اپنی جگہ آسانی سے قائم کر لی ہے اور غیر جانب دار نقاد اس کو بھی عزت کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ مگر اُردو ادب میں نیا شاعر کچھ اس قدر الگ اور کوئی چیز معلوم ہوتا ہے کہ حد سے زیادہ غیر جانب دارانہ نقطۂ نظر سے بھی اس کو بغیر طرفداری یا خلاف ہوئے نہیں دیکھا جا سکتا۔

اُردو میں تو نئے ادب کو ابھی تک کوئی خاص حیثیت حاصل

نہیں ہوتی ہے۔ نہ تو ہمارے یہاں ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ کا سا کوئی عالم ادب و ماہر فن شاعری ہے اور نہ کرائٹیریں اور اسکروٹنی کے سے اعلیٰ پایہ تنقیدی رسالے ہی ہیں جو نا سمجھ عوام کو اپنے رعب سے اور سمجھدار لوگوں کو اپنی حقیقت شناسی سے قابو میں رکھیں۔ ہمارے ہاں ابھی تک بڑی تعداد ان نئے ادب کے مخالفین کی ہے جو میراجی کے اس ریمارک کے مصداق ہیں: "ان کے ذہن میں حسد کی دبی ہوئی صورت کے علاوہ کوئی بھی احساس پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس نے حیوان ناطق کے سامنے وہ خود کو ایک پرانی نسل محسوس کرتے ہیں۔" انگریزوں میں تمام تر مشہور نقاد خواہ وہ نئے ادب کے طرفدار ہوں یا خلاف نئے ادب کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور اس پر صحیح نقادانہ نظر ڈالتے ہیں۔ پاونڈ اور ایلیٹ کے علاوہ ہربرٹ ریڈ۔ لونابی ڈوبرے۔ لبوئیس۔ ڈیلٹن بر سی۔ ایس۔ لیوس۔ ایف ایل لوکس۔ ڈوورولس وغیرہ کو تو طرفدار ہی سمجھنا چاہیئے مگر مخالفین بھی جو زیادہ تر یونیورسٹیوں کے پروفیسران ہیں جیسے گرائیرسن۔ ٹلمبارڈ۔ پیرسل اسمتھ۔ گارنلیز وغیرہ نئے ادب کے موجودہ دور میں اہمیت سے اعتراف کرتے ہیں اور ڈاکٹر برٹنڈ رسل ایسے فلسفی بھی اس کو نئے سوشل حالات کا اہم نتیجہ مانتے ہیں۔ خیر ہمارے یہاں بھی کچھ نقاد ایسے ضرور ہیں جو نئے ادب کی بابت اعلیٰ اور صحیح نقادانہ رائے رکھتے ہیں۔ اس میں خاص طور سے نمایاں مولانا عبدالحق۔ نیاز صاحب فتحپوری۔ حامد حسن صاحب قادری۔ وقار عظیم صاحب اور سید احتشام حسین صاحب رضوی ہیں۔ ان تمام انگریز اور ہندوستانی نقادوں کی مختلف اور اکثر متضاد رائیوں سے نئے ادب کی حقیقت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ اس "نئے ادب" کے دعوے کہاں تک صحیح ہیں۔ اس کا فن کہاں تک کامیاب ہے اور اس کے اثرات آئندہ ادب میں کہاں تک جائیں گے۔

نئے ادب کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ نیا ہے۔ یعنی پرانے کا دشمن اور اوّل اپنے نئے پن کا اور دوم اپنی پُرانے سے دشمنی کا خود دستور سے اعلان کرتا ہے۔ یہ امر فطری بھی ہے اور ضروری بھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی کوئی نیا مذہب، فلسفہ یا ادب ظہور میں آیا تو وہ یہی کہتا ہوا آگے بڑھا: ع جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو۔

کسی ادب یا فلسفہ وغیرہ کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ سب سے پہلے کوئی اعلیٰ پایہ جینیس کوئی نیا طریقہ ایجاد کرتا ہے۔ دُنیا اس کی ایجاد سے چونکتی ہے مگر کچھ ہی عرصے میں اس کے پیرووں کی کافی تعداد ہو جاتی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ پیرو اپنے الگ الگ سکول بنا لیتے ہیں اور اب سے یہ ظاہر ہونے لگتا ہے کہ ع:-

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

یہ اسکول یا فرقے اپنے بنائے ہوئے اصولوں پر چلتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ اس نے حقیقت کو پورا پورا اپنے اصولوں میں بند کر لیا ہے اور حقیقت تک پہنچ کر محض ان ہی اصولوں پر چلنے سے ممکن ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک اسکول دوسرے کو بُرا کہتا جاتا ہے اور اپنی پختگی کے لئے اپنے اصولوں کو زیادہ سے زیادہ تنگ بناتا جاتا ہے۔ آخر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان اصولوں کی پابندی محض پتھروں کی پوجا رہ جاتی ہے۔ اس وقت جینیس پیدا ہوتا ہے اس کا پہلا فرض انقلاب برپا کرنا اور ان پتھروں کو پیس کر برباد کرنا ہوتا ہے جنہوں نے ایک عالم کو حقیقت سے دور کر رکھا ہے۔ اس طرح نئے ادب کی پُرانے ادب سے دشمنی کوئی بیجا بات نہیں ہے۔ کم از کم انگریزی ادب کے لئے کوئی نئی بات بھی نہیں۔ اُنیسویں صدی کے شروع میں ورڈسورتھ نے ایک نئی شاعری کی بنیاد ڈالی اور قریب نصف صدی یعنی ٹینی سن اور براؤننگ کے عروج تک اس فن کی صحیح پیروی ہوئی۔ پھر دو اسکول قائم ہو گئے یعنی ایک "شاعری برائے شاعری" اور دوسرا "شاعری برائے اخلاق" کے نظریوں پر چلتے تھے۔ ان دونوں اسکولوں کے ماتحت روح شاعری فنا ہو گئی۔ یہاں تک کہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے آ کر پھر ورڈسورتھ کی طرح سب پرانے اصولوں کا تختہ اُلٹ دیا۔ مگر اُردو ادب ایسے انقلابوں سے نا آشنا ہے۔ میر و سودا نے جو نیا فن رائج کیا تھا وہ کچھ عرصہ تک اعلیٰ پایہ پر رہا۔ پھر دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول قائم ہو گئے اور ان اسکولوں کی پیروی کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ اس وقت ایک طرف جگر مراد آبادی اور دوسری طرف صفی لکھنوی کی شاعری سے ظاہر ہے۔ ان مثالوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سوسائٹی کے بدلنے ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ محض فنی ارتقا کے نقطۂ نظر سے بھی اس وقت دُنیا کے ادب میں انقلاب

کی ضرورت ہے اور نیا ادب دُنیا کے ہر ملک میں اس ضرورت کو پورا کر رہا ہے۔ مگر اس نئے ادب کی صورت انقلاب میں دو بڑی اہم خامیاں ہیں شاید اتنی اہم کہ اگر وہ اسے لے نہ ڈوبیں تو اسکی ترقی میں عرصۂ عظیم ضرور لگا دیں گی:

اوّل یہ کہ یہ ادب ضرورت سے زیادہ بلکہ حد سے زیادہ پُرانے ادب کا دشمن ہے۔ عام طور پر ہر انقلاب کسی خاص تقلید کو توڑتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ کسی پُرانی تقلید کو پھر سے زندہ بھی کرتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ کسی بڑی ہستی کی تقلید غلط راہ پر لگ کر تمام خرابیوں کا باعث ہوتی ہے لہذا انقلاب پیدا کرنے والا شخص غلط راہوں کو مٹا کر پُرانی تقلید ہی کو صحیح طریقہ پر پھر سے رائج کرتا ہے۔ اسلام نے کعبہ کے بتوں کو توڑا مگر ملت ابراہیم و موسیٰ کو پھر سے زندہ کیا۔ اٹھارویں صدی میں ملٹن کے اصولوں کی غلط پیروی سے انگریزی ادب بے جان ہو گیا تھا لہذا ورڈس ورتھ نے اس غلط پیروی کو مٹایا مگر ملٹن ہی کی صحیح پیروی کو پھر سے رائج کیا۔ برخلاف اس کے نیا ادب پُرانے ادیبوں میں سے صحیح اور غیر صحیح۔ اچھے اور بُرے سب کے ایکدم خلاف ہے۔ مسٹر ایلیٹ اور ان کے ساتھی ملٹن کے خاص طور پر دشمن ہیں اور چونکہ دو صدیوں سے انگریزی ادب کسی نہ کسی طرح ملٹن ہی کی پیروی پر چلتا رہا اس لئے تمام انگریزی ادب کو محض غلط و بیکار ٹھہراتے ہیں۔ پروفیسر پیرسل اسمتھ نے پُرانے ادب سے اس شدید نفرت کی وجہ اس اشتراکی نقطۂ نظر کو ٹھہرایا ہے جو آجکل تمام دُنیا میں ایک مذہب کی طرح پھیل رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اشتراکیت کی سب میں بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ اپنے تئیں استحکام دینے کے لئے ہوا میں قلعہ اور ریت پر عمارتیں بنا رہی ہے۔ اشتراکیت زدہ حضرات کسی فن کے ذرائع اور اثرات میں تمیز کرنے سے اس قدر قاصر ہیں کہ وہ تاج محل ایسی عمارت کی خوبصورتی کو محض اس وجہ سے نہیں محسوس کر سکتے کہ وہ ایک شہنشاہ کی تعمیر کردہ عمارت ہے اور کہہ اُٹھتے ہیں:

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

یہ اشتراکیت زدگی ایک خاص بیماری ہے اور پروفیسر گریرسن کی رائے کے بموجب اس نے مسٹر ایلیٹ اور کمپنی کے ماغوں میں احساس تاریخ کو بالکل ختم کر دیا ہے اور ان لوگوں کی یہ خاص ذہنیت ہو گئی ہے کہ ہر مسلم الثبوت اُستاد کی دھجیاں اُڑائیں اُردو کے نئے ادیب بھی کچھ تو اشتراکیت کی اور کچھ مسٹر ایلیٹ کی چھوت سے اس قسم کی ذہنی بیماری میں مبتلا ہیں۔

دوم یہ کہ یہ ادب ضرورت سے زیادہ بلکہ حد سے زیادہ نیا ہے۔ انگریزی کا نیا ادب تو اس حد تک نہیں، مگر اُردو کا نیا ادب تو ضرور بے تکی حد تک نیا ہے۔ آزادی کے نشہ میں مخمور ہمارے نئے ادیب اپنی ہر بدتمیزی و ہر بد مذاقی کو آزادی سے تعبیر کرتے ہیں۔ قیود کی پابندی سے انگریزی کے نئے ادیب کو بھی اتنی نفرت ہے کہ ملٹن کی بلینک ورس اس کو بنجر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کو اتنا غلو نہیں جتنا کہ اسکے ہندوستانی مریدوں میں پایا جاتا ہے۔ مسٹر ایلیٹ کتنا ہی آزادی کا ڈنکا بجائیں مگر ان کا فن پیروی اور اصولوں سے آزاد نہیں ہے۔ جیسا کہ پروفیسر گریرسن نے ثابت کر دیا ہے ایلیٹ کی شاعری میں بھی بالکل اسی طرح رسوم و قیود ہیں جس طرح کے رسوم و قیود کو ایلیٹ نے ملٹن پر تنقید میں مطعون کیا ہے۔ مثلاً ایلیٹ نے ایک مبہم طرزِ ادا اختیار کی ہے۔ اس طرز کے پیش رو انگریزی میں ڈن وغیرہ ہیں اور پھر اس ابہام کے چند اصول بھی ہیں جو ایلیٹ وغیرہ کے کلام سے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ مگر ہمارے نئے شعرا نے اس ابہام کو یا تو بے معنی بنا کر رکھ دیا ہے یا آزادی کے جھونکے میں اسے بھاتے نبھانے توڑ دیا ہے۔ ہمارے یہاں "میٹا فزیکل" قسم کی شاعری مرزا دبیر کے مرثیوں میں اکثر ملے گی۔ اگر ہمارے نئے شاعر ابہام گوئی میں مرزا دبیر کی مثال سامنے رکھ کر آگے قدم اُٹھاتے تو وہ بھی اس پایہ تک اپنے طریقے پر پہنچ سکتے تھے جس پر انگریزی شاعر ممتاز ہیں۔ ایلیٹ کی "ویسٹ لینڈ" میں باوجود ہمہ آزادی یہ بڑی شاعرانہ خصوصیت ضرور ہے کہ اس کو جتنا زیادہ پڑھا جاتے اتنی ہی زیادہ اچھی معلوم ہوتی جائیگی۔ مگر ہمارے نئے شاعروں میں سے کسی کی کوئی نظم بھی ایسی نہیں جس کا اثر محض وقتی نہ ہو۔ پھر انگریزی شاعری ۱۹۲۲ء سے اپنی آزادی کو بے تکا خیال کرکے پھر کچھ نہ کچھ تقلید پر واپس آ رہی ہے۔ مسٹر آڈن باوجود ہمہ آزادی اور باوجود ایلیٹ وغیرہ کی پیروی کے انگریزی ادب کی پُرانی دیسی صنف بیلڈ کو نئی طرح ترقی دے رہے ہیں۔ یہ بیلڈ

وہی صنف ہے جو عوام میں مقبول رہی اور انیسویں صدی تک ادب
کے درجہ سے گری ہوئی سمجھی جاتی رہی اور آخر جس کو ورڈسورتھ
نے سربلند کرایا۔ یہی انقلابی لیریکل بیلڈز کی ابتدا کی تھی۔ انگریزی
شاعر آزادی کے میدان میں بھٹکنے بھی نہ پائے تھے کہ اس خالص
انگریزی راہ پر آ گئے۔ مگر اردو میں ابتر آزادی ابھی تک
بدحواسی پھیلائے ہوئے ہے۔

اسی سلسلہ میں یہ بھی کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ
نئے ادب کے دشمنوں کا یہ اعتراض کہ نیا ادب یورپ کی کورانہ
تقلید ہے کچھ نہ کچھ صحیح ضرور ہے۔ اکثر ہمارے شاعر انگریزی نئے
ادب کی محض تقلید ہی پر چل رہے ہیں۔ افسانوں میں اکثر اوقات
بہت کورانہ تقلید بھی پائی جاتی ہے۔ انگریزی پڑھے صاحبزادگان
اُن ناولوں سے دلچسپی رکھتے ہیں جن کو "سیکس" ناول کہا جاتا ہے
اور زیادہ تر اسی قسم کی ناولوں کو سچا ادب سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں
میں سے جو افسانہ نگار بنتے ہیں وہ ایسے ہی مذاق سلیم سے
گرے ہوئے افسانوں یا ناولوں کی تخلیق کرتے ہیں۔ "انگارے"
ممکن ہے اسی قسم کے افسانوں کا مجموعہ ہو! خیر زیادہ تر
ہمارا افسانوی ادب تو ضرور اتنا ہی پست درجہ کا ہے۔

"ادب برائے زندگی": یہ نئے ادب کا سلوگن ہے اور نئے
ادیب شدت کے ساتھ "ادب برائے ادب" کے مخالف ہیں۔ یوں
تو یہ دونوں نعرے انیسویں صدی کے آخری نصف میں عام
ہوئے مگر غور سے دیکھا جائے تو ہر زمانہ اور ہر ملک کا ادب ان
کے ماتحت لایا جا سکتا ہے۔ کسی دور کا ادب زیادہ تر "ادب برائے
زندگی" ہوتا ہے اور کسی دور کا "ادب برائے ادب"۔ یہ کہنا غلط نہ
ہوگا کہ ہر نئی تحریک "ادب برائے زندگی" ہی کے معیار کو لے کر چلتی
ہے۔ ہر دور کا شاعر زندگی کے کسی پہلو سے متاثر ہو کر ہی اپنے
نئے فن کی تخلیق کرتا ہے اور اس کا فن برائے زندگی ہی کہا جا
سکتا ہے مگر جب اس کے فن کے اصول بن جاتے ہیں اور اس کے
پیرووں کا کام ان اصولوں کی تقلید رہ جاتی ہے تو ادب زیادہ
تر برائے ادب ہو جاتا ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ
اعلیٰ پایہ جدت پسند ادب برائے زندگی اور تقلیدی ادب
برائے ادب ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر اعلیٰ پایہ شاعر میں
دونوں اصولوں کی پابندی ایک ساتھ پائی جاتی ہے۔ شیکسپیر
کے ڈرامے ادب برائے ادب کے ماتحت لائے جاتے ہیں مگر ان
ڈراموں سے بہتر زندگی کے نقشے تو کہیں بھی نہیں ملتے۔ ملٹن نے
اپنی شاعری کو خدا کے طریقوں کے انکشاف کا ذریعہ بنایا ہے مگر
اس کی تمام نظموں کا بہترین حصہ خالص ادبی ہی ہے۔ ہمارے
یہاں میر صاحب نے بھی ادب برائے زندگی ہی کا علم اٹھایا تھا،
چنانچہ کہتے ہیں:

رکھی تھا شعر کو پردۂ سخن کا — وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

میر کے لئے غزل زندگی کے ایک پہلو یعنی ان کے واردات
قلبی کے اظہار کا ذریعہ تھی مگر محض فن کے اعتبار سے بھی ان
کی غزلوں کے کمال تک شاید ہی کوئی شاعر پہنچا ہو۔ ہم اس نتیجہ
پر پہنچے ہیں کہ سچا شاعر زندگی سے شدت کے ساتھ متاثر ہوتا ہے
مگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ فن کا محض برائے فن عمل اس کے لئے اتنا
ضروری ہے کیونکہ سچی شاعری ان دونوں اصولوں کی آمیزش سے
ہی پیدا ہوتی ہے جیسے کہ آدمی نہ محض روح اور نہ محض جسم بلکہ
دونوں کی آمیزش سے زندہ کہلانے کے لائق ٹھہرتا ہے۔ "نیا ادب"
"ادب برائے زندگی" کا شدت سے پابند ہے۔ پرانا ادب "ادب
برائے ادب" کے اصول پر چلنے کی وجہ سے بالکل مُردہ ہو گیا تھا اور
اس لئے نئے ادب کا زندگی کی اہمیت پر زور دینا نہایت ضروری
ہے۔ مگر یہ عملی ادب نہیں ہو سکتا جب تک کہ "ادب" پر بھی اسی قدر
زور نہ دے جتنا کہ "زندگی" پر دے رہا ہے۔

لیکن روسی ادب کے ہمہ گیر اثر سے اسی فقرہ "ادب برائے
زندگی" نے بہت زیادہ شہرت ہی نہیں بلکہ ایک نئے اور اہم معنی
اختیار کر لئے ہیں۔ اس اصول کا مخرج ٹولسٹوئے کا اہم تنقیدی
شاہکار "فن کیا ہے؟" ہے اور یہی تمام دنیا کے نئے ادیب کے
لئے آسمانی کتاب کی سی اہمیت رکھتا ہے۔ ٹولسٹوئے کے نظریہ
میں اہم ترین بات یہ ہے کہ وہ آرٹسٹ کے ماحول سے تعلق اور
آرٹسٹ کے اپنے ماحول پر اثر کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ فن اس کے
لئے کمیونیکیشن یا وسیلہ ہے۔ یہی کچھ ٹولسٹوئے سے بہت پیشتر
ورڈسورتھ نے بھی کہا تھا۔ مگر ٹولسٹوئے نے اس نظریہ کو ورڈسورتھ
سے زیادہ واضح کیا اور اس کے ادب بلکہ اشتراکیت کی
مقبولیت کے ساتھ ساتھ یہ تمام دنیا میں پھیل گیا۔ ہر ملک کے نئے
ادیب اس نظریہ کو مذہب کی طرح مانتے ہیں یعنی یہ کہ اسے فن کے
متعلق آخری بات سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس

نظریہ میں اہم خامیاں ہیں۔ اس نظریہ کا مفہوم یہ ہے کہ فن کار کا پہلا فرض اپنے فن کے ذریعہ اپنے ماحول کو متحرک کر کے کسی نقطۂ نظر پر لے آنا ہے۔ یہ نظریہ بالکل انقلابی ہے اس لئے کہ ارسطو نے فن کو فن کار کے ذاتی جذبات کے ادا کا ذریعہ بتایا تھا اور دُنیا کا تمام ادب اسی نظریہ سے متاثر ہے۔ اب ٹولسٹوئے کا نظریہ بالکل اس کے خلاف ہے لہذا ٹولسٹوئے سے قبل کا جتنا بھی ادب ہے سب بیکار ٹھہرتا ہے۔ نیا ادیب ٹولسٹوئے کا غلو کے ساتھ پجاری ہونے کی وجہ سے (میں نے ایک نئے ادیب کو ٹولسٹوئے علیہ السلام کہتے سُنا) "ادب برائے زندگی" سے محض ٹولسٹوئے کی پیروی والا ادب سمجھتا ہے تمام دُنیا کے نئے ادب کا یہی دعوےٰ ہے۔ اور یہ دعوےٰ منطق کی رو سے غلط نہیں ہو سکتا کیونکہ یا تو ٹولسٹوئے ہی کا نظریہ صحیح ہو سکتا ہے اور یا پُرانے ادب کا ہی ٹولسٹوئے ادب کی بالکل کایا پلٹ دیتا ہے۔ یورپ کے سب سے بڑے شاعر یعنی شیکسپیر کی بابت اس کی وہی رائے ہے جو نئے ادیب کی پُرانے ادب کی بابت عام طور سے ہوتی ہے۔ شیکسپیر کے اوتھلو کی مثال لے کر ٹولسٹوئے یہ دکھاتا ہے کہ اس ڈرامہ کا قصہ سنتھیو کی ناول میں زیادہ بہتر ادبی پیرایہ سے بیان ہوا ہے کیونکہ شیکسپیر نے کسی خاص خیال سے اپنے سامعین کو متحرک کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جبکہ سنتھیو کے قصہ سے ایک اخلاقی سبق تو ضرور ملتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ٹولسٹوئے کے حساب "ادب برائے زندگی" کی پیروی ابھی تک کسی نے کی ہی نہیں۔ ٹولسٹوئے اور ارسطو کے نظریوں میں قطبین کا فرق ہے اور کوئی درمیانی راستہ نہیں نظر آتا جو ان کو ملا دے۔ ممکن ہے کہ آئندہ کوئی صورت نکلے، مگر فی الحال تو اصولی طور پر عمل میں "نیا ادب" اور "پرانا ادب" ایک دوسرے کے دشمن ہی ہیں!

ایک حد تک یہ نیا نظریہ "ادب برائے زندگی" تمام ادب کے لئے مفید ہے اور پُرانے ادب کے ارتقا کو ایک اہم درجۂ ترقی پر پہونچاتا ہے۔ قرون وسطیٰ کا ادب زیادہ تر افسانہ ہائے دیو و پری تھا۔ نشاۃ ثانیہ سے ادیب انسانی ماحول اور انسانی زندگی کے نقشے کھینچنے لگا۔ اسپین کے ادیب سروانٹیز نے اپنی ناول ڈن کوئیک زاٹ میں پُرانی داستانوں کا مذاق اُڑایا اور ناول نگاری کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد سے تمام ادب زیادہ سے زیادہ زندگی سے قریب تر آتا گیا اور اٹھارویں صدی تک حقیقت نگاری یا ریلزم ادب کی روح رواں ہوگئی۔ ٹولسٹوئے کی ناولوں میں یہ صفت درجۂ کمال پر پائی جاتی ہے کیونکہ اس کے یہاں زندگی پر تبصرہ نہیں بلکہ زندگی کا ہو بہو نقشہ ملتا ہے۔ ٹولسٹوئے کا نظریہ ذاتی ہے یعنی یہ کہ بجائے عام فن کے وہ ٹولسٹوئے کے خاص فن کی تعریف کرتا ہے۔ مگر تمام ادیبوں نے اسی کے نظریہ کو ہمہ گیر مانا اور بیسویں صدی کا ادب زندگی سے اور بھی زیادہ قریب آنے کی دھن میں "ریلزم" سے بڑھکر "سر ریلزم" پر عمل پیرا ہے۔ یعنی یہ کہ موجودہ ادب زندگی کو بذریعہ خوردبین دیکھتا ہے اور ہر چھوٹے سے چھوٹے ذرّے کی حرکت کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس نظریہ کا اثر زیادہ تر نثر اور افسانوی ادب پر ہونا چاہیئے تھا اور انہی اصناف پر ہوا بھی مگر شاعری بھی اس کے اثر میں آ ہی گئی۔ اس طرح "نیا ادب" زندگی اور فن کی ہم آہنگی کو اس کی آخری حد تک پہنچا رہا ہے۔

مگر اکثر اعلیٰ نقادوں کو یہ شک ہے کہ ادب زندگی سے ضرورت سے زیادہ قریب ہو کر کہیں فنا تو نہیں ہوا جا رہا ہے؟ زندگی کی نقاشی کے انہماک نے کہیں ادیب کا دماغی توازن خراب کر کے اسکو خبط کے درجہ پر تو نہیں پہونچا دیا؟ یہ مسلمہ ہے کہ فن زندگی کی نقاشی حسن و لطافت کے ماتحت کرتا ہے یعنی یہ کہ جو چیز زندگی میں تکلیف دہ یا گھنونی معلوم ہوگی وہ پردۂ فن پر آکر خوبصورت معلوم ہونا چاہیئے نہیں تو فن کامیاب نہیں ہے۔ "نیا ادب" اس مسلمہ کے بالکل خلاف معلوم ہوتا ہے اور اپنی نقاشیٔ زندگی کی دھن میں عجیب عجیب راہیں اختیار کر رہا ہے۔ یہ راہیں لاتعداد ہیں مگر ان میں سے حسب ذیل زیادہ نمایاں ہیں :۔

(۱) ایک راہ یہ ہے کہ جدید علم نفسیات کے اصولوں کے مطابق انسانی فطرت کی عکس کشی کی جائے۔ "دماغی کیفیات" کے ہو بہو نقشے اُتارے جائیں۔ کردار کے دماغ میں اُلٹے سیدھے اگرام بگرم جو کچھ بھی خیالات کسی وقت یا کسی حالت میں گذر رہے ہیں ان سب کو جوں کا توں کاغذ پر اُتار دیا جائے۔ مسٹر جیمس جوائس اور مس ورجینا وولف اسی طریقہ کے خاص رہبر فن میں ہیں۔ ان کی ناولیں پڑھنے سے پہلے ایک اُلجھن سی ہوتی ہے۔ پھر نکتے بناتے ہوئے دماغی نقشہ جات پر کچھ تعجب ہوتا ہے۔ ان کی قابلیت اور فن کاری کی عظمت کا بھی کچھ جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

مگر یہ نقشہ جات وہ دائمی لطف اور وہ حسن و خوبی نہیں رکھتے جو پرانے ناول نگاروں کے کردار میں پائی جاتی ہے۔

(۲) دوسری راہ بھی جدید نفسیات سے پہلی کی طرح متاثر ہے۔ مگر اس پر ویانا کے ماہر نفسیات فرائڈ کا اثر زیادہ نمایاں ہے۔ فرائڈ پاگلوں کا ڈاکٹر ہے اور اس نے اپنے پاگلوں پر تجربات سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انسانی محرکات میں سب سے زیادہ اہم جنسی محرک ہے یہاں تک کہ انسان کی ہر حرکت جنسی حرکت ہے۔ مگر سوسائٹی۔ مذہب۔ اخلاق وغیرہ اس محرک کو بے جا دبا ڈالتے ہیں۔ یہ دباؤ انسانی گناہوں کا باعث ہے اور تمام دماغی بیماریوں کا بھی۔ فرائڈ سے اثر لے کر انگریزی شاعر و ناول نگار ڈی ایچ۔ لارنس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اگر جنسی محرک کو آزادی سے کام کرنے دیا جائے تو انسانی فطرت اور اخلاق درست کئے جا سکتے ہیں۔ اس نظریہ کے ماتحت اس نے اپنی ناول لیڈی چیٹرلیز لور لکھی جس میں ایک لیڈی اور اس کے باغباں کے درمیان جنسی تعلقات نہایت عریانی کے ساتھ پیش کئے۔ آخر میں سرکاری حکم سے اس کتاب میں سے تمام عریاں حصے نکال دئے گئے۔ مگر لارنس کی پیروی میں عریاں نگاری تمام دُنیا میں عام ہو گئی۔ اُردو افسانوں میں اور نظموں میں بھی اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ فرائڈ اور لارنس کے نظریوں سے اثر لیں ناواقف مصنفین عورتوں کے پوشیدہ حصّوں کے نقشے کھینچتے ہیں یہاں تک کہ مخالفین نے نئے ادب کا نام کوک شاستر رکھ دیا ہے۔

(۳) تیسری راہ ایسے کردار کی تخلیق ہے جو اخباری کارٹونوں کی طرح نظر آتیں یعنی کردار کی ایک یا دو صفتیں اس طرح سے بیان کر دینے پر اکتفا کی جاتی ہے جس سے ان کی انفرادیت پورے طور پر ظاہر ہو جائے۔ اس میں بہت سے ناول نگار کامیاب ہیں۔ یہ طریقہ زیادہ تر لاطینی اور اٹلی میں رائج ہے مختصر افسانوں اور نظموں میں اس کا عمل زیادہ تر کامیاب ہے۔

(۴) چوتھی راہ یہ ہے کہ موجودہ زندگی کو اشتراکی انقلابی نظر سے دیکھا جاتا ہے یعنی ہر ہر قدم پر پرانی سماجی۔ اخلاقی۔ مذہبی قدروں کی دھجیاں اُڑائی جاتی ہیں۔ جن چیزوں کو انسان نفرت سے دیکھتا آیا ہے ان کا بیان نہایت دلچسپی سے کیا جاتا ہے اور جن اصولوں کو فطری اور اٹل مانا گیا ہے ان کی پول کھولی جاتی ہے۔ اس قسم کے فن میں گندی چیزوں سے لے کر خدا کی ہجو تک تمام باتیں ملیں گی۔ اس قسم کا ادب روسی اور اشتراکی خیالات سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ اس فن میں مسٹر برنارڈ شا دُنیا میں سب سے زیادہ کامیاب ہیں مگر ان کی تقلید میں ادب زیادہ تر اخباری پروپیگنڈا ہوتا جا رہا ہے۔

ان سب راہوں اور طریقوں کی بابت کیا کہا جاتا ہے؟ اگر پرانے اصولوں سے دیکھا جائے تو یہ تمام ادب درجۂ ادب سے گرا ہوا ہے مگر ایسا کہنا پرانے ادب کی نئے ادب کے خلاف طرفداری ہوگی! ممکن ہے کہ آئندہ زمانہ میں یہی ادب ٹھہرے۔ مگر ایک بات سے ہم اس نتیجہ پر آنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ نیا ادب ہی غلط ہے۔ وہ یہ کہ ان تمام تحریکوں کے بانی زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جن کے دماغی توازن کو اس بیسویں صدی کے دھکوں نے ضرور کافی طور پر نادرست کر دیا ہے۔ یہ نیا ادب بگڑے ہوئے توازن کا ادا کار ہے اور اس لئے یہ بدل کر ہی رہے گا۔ یہ اپنے کچھ نہ کچھ اثرات ضرور چھوڑ جائے گا مگر توازن و پختگی بغیر ادب کیا کوئی انسانی عمل کامیاب نہیں ہوتا۔

اُردو میں ان تمام راہوں پر چلنے والے لوگ ہیں اور ہوتے جاتے ہیں۔ یہ لوگ محض تقلید نہیں کیونکہ یہ بھی دُنیا کی مصیبتیں جھیلے ہوئے ہیں مگر ان کا بھی دماغ کسی شدید جذبہ کے ماتحت اپنا توازن کھوئے ہوئے ہے۔ اُردو ادب میں ریلزم ہی کا وجود نہ تھا تو سرریلزم نے پبلک کو چندھیا دیا اور ادیب بھی کیونکہ کسی ریلزم کا زینہ چڑھے بغیر سرریلزم کے کوٹھے پر پہنچنے کی کوشش میں پڑے اس لئے کوئی خاص کامیابی نہ حاصل کر سکے۔ ہمارے یہاں ادب برائے زندگی کے اصول نے اب تک نہ تو کوئی نمایاں ادب ہی پیدا کیا اور نہ پبلک کو ہی اپنے نظریہ کے مطابق متحرک کیا۔

ادب کو زندگی سے قریب تر لانے کے لئے زبان و اسالیب بیان میں بھی اہم تبدیلیوں کی ضرورت پڑی۔ زبان کی بابت نئے ادب نے تین خاص استدلال پیش کئے ہیں۔ اوّل یہ کہ پرانے ادیبوں کی زبان نہیں بلکہ عوام کی زبان مستند سمجھی جائے یعنی لفظوں اور فقروں کے صحیح استعمال پر پرانے ادیبوں کے عمل سے نہیں بلکہ عام رواج سے بحث کی جائے اور علم قواعد بھی رائج اصولوں کے مطابق پھر سے مرتب کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ زبان سے غیر ملکی لفظ ایک سرے سے نکال کر زیادہ تر خالص زبان

استعمال ہو۔ تیسرے یہ کہ ادب و شاعری کی زبان اور روزمرہ گفتگو کی زبان میں کوئی فرق نہ ہونا چاہیئے یعنی اسلوب بیان میں کوئی شاعرانہ تنوع نہ ہو۔ یہ استدلال نئے نہیں ہیں کیونکہ اگر یہی نہیں تو قریب اسی طرح کے اصول انیسویں صدی کے شروع میں ورڈس ورتھ نے پیش کئے تھے اور ان پر کولرج نے نہایت عمدہ تنقید کی تھی اور اس لئے ورڈس ورتھ کے عمل اور کولرج کے دلائل کی مدد سے ان کی بابت صحیح رائے قائم کر لینا مشکل نہیں ہے۔

پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام کی زبان ہے کیا؟ ورڈس ورتھ نے بتایا تھا کہ دیہاتیوں کی زبان عام خرابیاں نکال لینے کے بعد عوام کی زبان ٹھہرائی جا سکتی ہے۔ کولرج نے یہ جواب دیا تھا کہ دیہاتی زبان عام خرابیاں دور کرنے کے بعد وہی زبان ہوگی جو اعلیٰ طبقہ استعمال کرتا ہے اور بڑے اور ادیب استعمال کرتے آئے ہیں۔ لہذا عام زبان کی تلاش فضول ہے۔ آج کل کے نئے ادیب ورڈس ورتھ سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں اور یہاں تک عوام کی زبان کے طرفدار ہیں کہ اس میں کوئی خرابی ہی نہیں پاتے اور یہ کہتے ہیں کہ عوام کی زبان جوں کی توں ادبی مان لی جائے۔ مگر یہ لوگ یہ نہیں بتا پاتے کہ عوام کی زبان ہے کیا؟ کولرج نے اپنی دلیلوں میں یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ کسی ملک میں صوبہ صوبہ۔ ضلع ضلع۔ شہر شہر اور فرد فرد کی زبان میں فرق ہونے کی وجہ سے عام زبان کا کوئی معیار ہی نہیں قائم ہو سکتا۔ کسی نہ کسی طبقہ یا ضلع کی معیاری ضرور ماننا پڑیگا اور جب ایسا ہی کرنا ہے تو پھر وہی معیار کیوں نہ رکھا جائے جو عرصے سے عمل میں آچکا ہے۔ مسٹر ایلیٹ وغیرہ کی دلیل ہے کہ انگریزی قواعد انگریزی عمل کے مطابق نہیں بلکہ لاطینی زبان کے مطابق بنا لئے گئے تھے اور اس لئے ان سے قطع نظر کر کے انگریزی قواعد پھر سے عوام کے استعمال کے مطابق بنانے چاہئیں۔ اردو کے نئے ادیب بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ مگر اس چوتھائی صدی کے اندر تو کوئی قواعد بنانا کیا بنانے کی کامیاب کوششیں بھی نہیں ہوئیں۔

اسی طرح خالص زبان کا نظریہ بھی ابھی تک عملی جامہ نہ پہن سکا۔ ورڈس ورتھ نے صاف کردہ دیہاتی زبان پر اس لئے زور دیا تھا کہ یہ خالص ملکی زبان ہوگی اس مسئلہ پر بھی کولرج کی دلیلیں اہم ہیں کیونکہ اس نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ پرانی زبانوں کے الفاظ رائج زبان میں اس طرح داخل ہو گئے ہیں کہ ان کا الگ کر دینا غیر ممکن ہے اور پھر یہ امر بھی تو غور کے قابل ہے کہ عوام کی زبان میں بھی کتنے زیادہ غیر ملکی پرانی زبانوں کے الفاظ و تراکیب موجود ہیں۔ اس لئے عوام کی زبان میں بھی بہت تبدیلیاں کرنا پڑیں گی۔ اور پھر عوام کی زبان کچھ نہ رہ جائے گی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ نظریہ پہلے نظریہ کے دوش بدوش نہیں چل سکتا۔

کولرج نے ایک طویل بحث سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ادبی زبان کا عام زبان سے مختلف ہونا بالکل ضروری ہے۔ اس کی نگاہ شاعری پر ہے اور اس نے یہ دکھایا ہے کہ طرز تخیل، خوبی زبان، قواعد عروض کی وجہ سے شاعری کی زبان عام زبان سے مختلف ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔ اس نے یہ بھی دکھایا ہے کہ ورڈس ورتھ نے جن نظموں میں اس اصول پر عمل کیا ہے وہاں شاعری بالکل فوت ہو گئی ہے۔ یہی حال اردو میں مولانا حالی کی شاعری کا بھی ہے کہ حد سے زیادہ سادگی پیدا کرنے کی کوشش میں ان کا بیشتر کلام پھیکا ہو گیا ہے نئی شاعری میں بھی اس قسم کی تمام کوششیں ناکامیاب ہی ہیں۔ اکثر نئی انگریزی و اردو نظمیں پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان نظموں کے خیالات اگر نثر میں ادا کئے جاتے تو بہتر ہوتا۔ اکثر میں بالکل کوئی اثر نہیں ہوتا اور ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ ملٹن اور غالب کا فن اس نیچے درجہ پر پہنچ رہا ہے!

حقیقت یہ ہے کہ زبان و طرز ادا کی بابت اس قسم کے نظریئے ہمیشہ غلط ثابت ہوتے رہے اور غلط ثابت ہوتے رہیں گے۔ تو پھر ان سے فائدہ کیا؟ فائدہ ضرور ہے کیونکہ اس قسم کے اصول شاعر کو ایک حد تک ضروری آزادی دیدیتے ہیں پرانے اسالیب۔ تراکیب۔ تشبیہات اکثر کثرت استعمال سے یا غلط استعمال سے یا زمانہ کی تبدیلی کی وجہ سے فرسودہ ہو جاتے ہیں۔ ان کو ایک سرے سے غائب کر دینے کے لئے ہمیشہ نئے شاعر نئے نظریے پیش کرتے ہیں۔ یہ نظریے عموماً بت شکنی کے جوش میں بنائے جاتے ہیں اور اس لئے وہ تمام نقشہائے کہن کو خواہ وہ اچھے ہوں یا برے مٹانے والے ہوتے ہیں مگر ان نظریوں کے بنانے والے جب میدان عمل میں آتے ہیں تو ان کو پرانے ہی اصولوں کو نئے طریقہ پر برتے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ ورڈس ورتھ کی شاعری کا بہترین حصہ وہی ہے جو اس کے نظریے کے

خلاف ہے اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا بھی یہی حال ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان لوگوں کا انقلاب پُرانے بے معنی تراکیب کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔ قدما کی کورانہ تقلید جاتی رہتی ہے اور نئی عمدہ تراکیب ظہور میں آتی ہیں جہاں تک یہ انقلابی شاعر پُرانی تقلید کے بجائے فطرت کو شاعر کا راہ نما بناتے ہیں وہاں تک ان کی تحریکیں مفید اور جہاں تک یہ اپنی شدتِ جذبات کی وجہ سے بالکل انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہاں تک بالکل مضر ہیں۔

نئے شاعروں کے ہاں اکثر ایسی تراکیب تشبیہات استعارات ملتے ہیں جن پر گدھوں کو بھی ہنسی آئے۔ مگر گدھوں کی طرح ہنس دینے سے بہتر انسان کو یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ شاعری کوئی آسان فن نہیں ہے۔ پُرانی تراکیب استعمال کر لینا بہت ہی آسان کام ہے اور نئی عمدہ یعنی حقیقی طور پر شاعرانہ تراکیب بنانا حد سے زیادہ مشکل کام ہے۔ پھر سچا شاعر تو سینکڑوں میں ایک ہوتا ہے اور وہ نہ پُرانی تراکیب کا پیرو ہوتا ہے نہ نئی مضحکہ آمیز تراکیب تراشتا ہے بلکہ وہ پُرانے اور نئے دونوں سے آزاد اگر پُرانی ترکیب استعمال کرتا ہے تو اس میں نئی روح پھونک دیتا ہے اور نئی ترکیب ایسی موزوں ڈھالتا ہے کہ معترضین دنگ رہ جائیں۔ انگریزی میں ایلیٹ پاؤنڈ آوڈن۔ اسپنڈر نے اپنے کافی کلام میں کامیابی کے ساتھ ایسا ہی کیا ہے۔ اُردو میں بھی کہیں کہیں ایسی نظمیں نظر آتی ہیں۔ اُردو میں حقیقی جدت پیدا کرنا شاید زیادہ مشکل ہے!

نئے شاعر شاعری میں موسیقیت کو کوئی خاص اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مسٹر پاؤنڈ ملٹن کی پیروی کو شور و غل کی تقلید کہتے ہیں۔ مسٹر ایلیٹ کی رائے میں ملٹن اندھا ہونے کی وجہ سے قوتِ سامعہ ضرورت سے زیادہ تیز رکھتا تھا اس لئے اس کے کلام میں موسیقیت بہت ہے لیکن اس موسیقیت کی تقلید سے دو صدیوں تک انگریزی شاعری کی ترقی رُکی رہی۔ ان لوگوں کی رائیں بس اس حد تک اہم ہیں جہاں تک یہ ان کے نئے فن کے اصولوں کو ظاہر کرتی ہیں ورنہ موسیقیت ہی تو شاعری کو دوسرے اصنافِ ادب سے ممتاز کرتی ہے۔ اصل میں یہ لوگ موسیقیت کے ایک سرے سے خلاف نہیں ہیں بلکہ پُرانے اصولِ عروض وغیرہ جن پر موسیقیت مبنی سمجھی جاتی تھی ان کے خلاف ہیں۔ ان کی محبوب ترین صنفِ سخن ان سب پُرانے قاعدوں سے آزاد ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسٹر ایلیٹ نے "فری ورس" کو درجۂ کمال پر پہنچا دیا۔ اس قسم کی نظمیں کسی خاص طور پر مبنی نہیں ہوتیں اور ان میں کوئی قوافی وغیرہ کی قید بھی نہیں ہوتی ہے۔ ہاں ان میں ایک سرے سے ایک ہلکا سا ترنم ضرور ہوتا ہے جو خیالات و جذبات کی مطابقت سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ اس قسم کی نظمیں سب میں پہلے فرانس میں لکھی گئیں اور وہاں ان کو "ورس لیبر" کہتے تھے اس کا ترجمہ انگریزی میں "فری ورس" (آزاد نظم) کیا گیا۔ انگریزی میں ایلیٹ وغیرہ سے پیشتر اکثر لوگوں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی مگر ایلیٹ کی طبیعت اور اس کے اصول اس صنف سے اس قدر مطابق بیٹھے کہ انہیں آئندہ نسلیں اس صنف میں کافی بلند پایہ سمجھتی رہیں گی۔ اُردو میں بھی میراجی اور ن۔ م۔ راشد نے اس قسم کی اکثر نظمیں نہایت کامیاب لکھی ہیں اور انہیں پر ناسمجھ اور کم نقاد بے تکے اعتراضات کی بھرمار کرتے ہیں۔ مسٹر ایلیٹ وغیرہ کی غلطی یہ ہے کہ وہ اپنے فن کے ذاتی و انفرادی اصولوں کو تمام فنِ شاعری کے ہمہ گیر اصول بنا دینا چاہتے ہیں۔ انہیں ملٹن کی بلینک ورس خاص قیود کی پابند ہونے کی وجہ سے بالکل کرخت معلوم ہوتی ہے۔ ان کے حساب ملٹن کی یہ سخت غلطی تھی کہ قوافی کی پابندی توڑنے کے ساتھ ساتھ اس نے چند بدیعی اور عروضی پابندیاں اپنے اوپر عائد کر لیں۔ ان کی رائے میں ملٹن کی پابندیوں کا یہ اثر ہوا کہ انگریزی شاعری بنجر ہو کر رہ گئی مگر ان لوگوں کو یہ خیال نہیں پیدا ہوتا کہ ان کے اصولِ آزادی کے اثرات سے غیر ملکوں کی شاعری بالکل ہوا بن کر اڑ جائے۔

نئی شاعری میں "فری ورس" کے علاوہ متعدد اور اصناف رائج ہیں۔ انگریزی میں یہ نئے نہیں مگر اُردو میں یہ اس قدر نئے ہیں کہ پُرانے شعرا ان کو سمجھ تک نہیں پاتے حقیقت یہ ہے کہ اُردو عروض نہایت تنگ اور دقیانوسی رہا۔ ہمارا عروض بالکل اسی پایہ پر ہے جس پر انگریزی عروض سولہویں صدی سے پیشتر تھا یعنی ہمارے شعرا اب تک پابندی سے ترقی کر کے آزادی کی طرف نہیں آئے ہیں۔ بحروں، مصرعوں کی ناپ، قافیوں کی ترتیب وغیرہ کی بابت کچھ پُرانے اصولوں کو کسی استاد سے سیکھ لینے کا نام شاعری ہے اور کوئی بھی ان اصولوں کو

عرصہ تک برتتے برتتے کہنہ مشق اُستاد ہو کر ہے شاعر تراش سکتا ہے۔ ہمارے پرانے شعرا موسیقیت کے چھوٹے سے چھوٹے اصولوں سے بے بہرہ ہیں۔ ان کے حساب موسیقیت کے معنے محض کسی خاص بحر کا سخت پابندی کے ساتھ التزام یا یوں کہئے کہ وہ محض ٹھیک ٹھیک سرگم ہی بھر لینے والے کو کامل اُستاد سمجھتے ہیں۔ اس اعلیٰ موسیقیت سے اُردو داں واقف ہی نہیں ہوتے جس کے مطابق شاعر ضرورت و جذبات کے موافق اپنے راگ کو سرگم سے ہٹا کر یا گھٹا بڑھا کر بالکل نئے اصولوں کے ماتحت ادا کرے اور نیا سا نیا راگ ہو کہ پہلے کبھی سنا ہی نہ گیا ہو۔ مثلاً شیلی کی نظم لو اے اسکا تیسرا رکن کا کوئی بند لے لیا جائے تو اس میں یہ خصوصیات ملیں گی کہ پہلے چار مصرعے تین تین رکن کے پانچواں مصرع چھ رکن کا اور پہلا و تیسرا مصرع ہم قافیہ اور دوسرا چوتھا اور پانچواں ہم قافیہ ہیں۔ اس عروض ترتیب سے یہ بند اسکا نیلا رک کے راگ کی پوری نقل ہو جاتا ہے جو پہلے تین چار مرتبہ چھوٹی چھوٹی آوازیں نکالتی ہے اور پھر ایک لمبی تان کھینچتی ہے اور اسی طرح گاتی رہتی ہے۔ یہ عروض کو آزادی سے استعمال کرنے کی اعلیٰ مثال ہے اور ہر اوّل درجہ کے انگریزی شاعر نے اس طرح کے متعدد بند ضرور تخلیق کئے ہیں۔ ہمارے یہاں اس طرح کی کوئی مثال نہیں مل سکتی کیونکہ ہمارے یہاں تخیل و جذبات ہمیشہ عروض کے غلام رہے اور اس غلامی میں کامل کامیابی کو اعلیٰ فن سمجھا جاتا رہا۔ انگریزی ادب کے درس نے ہمارے نئے شاعر کو آزادی کا خواب دکھایا اور نئی ترقی یافتہ راہیں کھول دی ہیں۔ یہ ہمارے ادب کے ترقی کے آثار ہیں کہ ہمارا نیا شاعر شاعری کو محض دستکاری کے درجہ سے اونچا کر کے اعلیٰ فنون کے دائرہ میں لا رہا ہے۔

یہ نیا شاعر ابھی تک بہت کیا کافی کامیاب بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس ناکامیابی کی دقیانوسی نقاد یہ وجہ بتاتے ہیں کہ یہ نیا فن ہمارے ادب اور ہماری زبان کی ساخت کے موافق نہیں ہے۔ اس قسم کی رائیں بس اتنے معنے رکھتی ہیں کہ یہ پرانے لوگ اپنا وقار جاتا دیکھتے ہوئے اپنے کو بڑا ثابت کرنے کے منطقی حیلے کرتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے آخری نصف میں ڈاکٹر جونسن نے ملٹن کی اعلیٰ مثال سے آنکھ چرا کے ہوئے یہ کہا تھا کہ انگریزی زبان بلینک ورس کے لئے ناموزوں ہے اور انگریزی میں محض کوپلیٹس "(بیت)" ہی کامیابی سے لکھے جا سکتے ہیں۔ بلینک ورس کی ترقی جونسن سے پہلے ہو چکی تھی اور جو اس کے بعد ہوئی اس پر نظر ڈالتے ہی معلوم ہو جاتا ہے گا کہ جونسن کی رائے بالکل غلط ہے۔ ہر زبان میں ہر صنف کھپ سکتی ہے شرط ہے اعلیٰ پایہ کھپانے والے کی۔ ہمارے یہاں ابھی تک کوئی ایسا اعلیٰ پایہ نیا شاعر ظہور میں نہیں آیا جو اپنی اعلیٰ مثالوں سے محض بہانے ڈھونڈھنے والوں کے مُنہ بند کر دے۔ یہ نیا فن دیکھنے میں تو آسان معلوم ہوتا ہے (کوئی قلم اُٹھا کر نئی نظم کہہ سکتا ہے!) مگر حقیقت میں اعلیٰ کامیابی اس فن میں اس فن سے زیادہ مشکل ہے جس میں صرف کچھ اصولوں کو پابندی کے ساتھ برت دینا ہو۔ ہمارے کہنہ مشق اُستاد اگر قلم اٹھا کر کوئی نئے عروض کے موافق نظم لکھیں تو ذرا اِستادعبرہ کی دہائی کامیابی بھی نہیں حاصل کر سکتے۔ شاندان استادوں کا قلم ہی آگے نہ بڑھے کیونکہ ؎

دردِ منزل لیلیٰ کہ خطر ہاست بجاں ۔ شرطِ اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

اور انکے یہاں مجنوں بودن کہاں! انہوں نے تو شاعری اسی طرح سیکھ لی تھی جیسے کہ اگر کسی بڑھئی کے شاگرد کر دیے جاتے تو میز تپائی بنانا سیکھ جاتے۔

اعلیٰ فن پابندی و آزادی کی خوبصورت آمیزش سے پیدا ہوتا ہے۔ بلند پایہ عروض اس شاعر کا کہا جا سکتا ہے جو شیلی کی طرح کسی قدرتی قوت کی مدد سے پابندی و آزادی کو ایجاد کے ساتھ ملا دے۔ ہمارے نئے شاعروں میں فن کے اس اوج پر کوئی بھی پہنچتا معلوم نہیں ہوتا۔ اگر پرانے شاعر پابندی پر تلے ہوئے ہیں تو نئے شاعر آزادی کی حد کئے دے رہے ہیں۔ اعلیٰ شاعری اسی وقت وجود میں آئیگی جب کوئی جینیس ان دونوں کو ملا کر ایک نیا جادو جگا دے۔

باوجود اپنی تمام خامیوں کے اُردو کا نیا ادب ایک اہم خدمت انجام دے رہا ہے۔ یہ ہمارے ادب کا چولا بدل رہا ہے۔ وہ چولا جو داغ تک کے شعرا کے لئے زیبا تھا اور ان کے نقوش اب بھی اس میں سجے ہوئے معلوم ہوتے ہیں مگر جو کثرت استعمال سے اور غلط استعمال سے اب اس قدر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے کہ اس میں پیوند لگانے کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ نیا ادب اب تک کوئی نیا جامہ تراشنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے مگر ابھی اس کی عمر دس ہی برس کی تو ہے۔ میرو سودا نے جو فن رائج کیا تھا اس کی تیاری میں حاتم اور

مختار صدیقی

آخری بات

میں نے اِن آنکھوں سے دیکھی نہیں وہ بربادی — جس سے باقی نہ رہیں سمت و جہت کی قیدیں
مٹ گیا غرب وہ تہذیب کا مینارۂ نور! — شرق تیرہ بھی نہیں آج کے دن دُنیا میں!
(کیا جنوب اور شمال اِن کی نہ دیجے گا مثال
آج تک ان کا چلن ہو نہ سکا شاملِ حال!)

شہ نشینوں میں تصوّر کے بھی اب کیا ہونگے — ہر عقیدے کی سیاست کے وہ سیمیں معبود
بھائی چارے کے، کپٹ راج کے، فوقیت کے! — دیوتا کل کے، مگر ڈھونڈیئے آج اِنکا وجود
آج بربادی ہی دُنیا کی خدا ہے گویا
جس نے بربادی ہی کو خلق کیا ہے گویا

جھماتی ہوئی آبادیاں شمشان ہیں اب — ان گنت شہر ہیں ملبے کے سلگتے تودے
جھلسی دیواریں در و بام پہ ہیں نوحہ کناں — کہتی ہیں — "اپنا مکیں کوئی کہیں ہو تو سُنے
خشت و آہن کے اِس انبار سے وحشت نہ کرو — آؤ! یہ گھر تھا تمہارا، جہاں تم پھولے پھلے
اور اِس راکھ کو آنکھوں کا بنا لو سُرمہ — یہ وہ دانشکدہ مشہور ہو تم جس میں پڑھے
وہ تھا سلطانیِ جمہور کا ایوانِ عزیز — اُس کتب خانۂ نادر کے کھنڈر سے آگے؟
اور مکیں ہو، تو کہے "میرا وطن یہ تو نہیں
وہ تو تلمیح کا مامن تھا، یہ مرگھٹ کی زمیں!"

یہ وہ ہیں جن کا کوئی نام ونشاں ہے تو یہی
ناگاساکی ـــــ جو سجل خواب تھی جل پریوں کا
سر پہ اوتاروں کے رمنے، وہ مقدس پربت
صاف شفاف سی آبادیاں، ـــ نیلے ساحل
اور ہیرو شیما ـــــ وہ صنعت کا نیا گہوارہ

کچھ تو یوں مٹ گئے، جیسے کہ کبھی تھے ہی نہیں!
سیم بر کُہر میں لپٹا ہوا نیلم کا نگیں
پاؤں چھوتی ہوئی ذخار سمندر کی جبیں
ہر سفینے کے لئے طُرفہ طلسموں کی زمیں
یعنی مشرق کی ترقی کا امامِ پیشیں ـــ

زلزلے آئے، نہ آشوبِ قیامت سے مٹے
دو نوں اک ذرے کے جوہر کی کرامت سے مٹے!!

۵۱

اِس کرامت سے مگر مٹ کے بھی جو بچ نہ سکا
اُس عدم زار میں سرگرم ہیں برقی لہریں
دیکھتی آنکھوں ذرا دیکھئے سائے اُن کے
کارکُن، محنتی مزدور، ـــ ہمکتے بچے،
یہ ہے قابیل کی تاریخ کا وہ بابِ فنا

دیکھئے[1] جاکے وہ پگھلا ہوا، اندھا پاتال
جن کی ترکیب سے ماضی کو ملی صورتِ حال
خاک کا جن کی کوئی کھوج لگانا ہے محال
بن گئے دوزخی آسیب کی پرہول مثال
جس پہ عبرت کو بھی ہوتی نہیں رونے کی مجال

تابِ گریہ ہو، تو پھر بھی نہ بہیں گے آنسو
کون خاشست بنے، دین کا، دُنیا کا عُدو

اور اب ٹینک اپاہج ہوئے، تو ہیں ٹھنڈی
خُون سے سینچی ہوئی خاک نے نگلیں فوجیں

پُر شکستہ ہے فلک سیر تباہی کا جُنوں
جو ہر ذرہ نے یوں پھونکا ہے اپنا افسوں

ضامنِ امن اسے مانیئے، جیسے تیسے
خون ہی ہم میں نہیں، خون بہے گا کیسے!!

[1] ہیروشیما۔

محبت کے تار

طاہرہ دیوی شیرازی

دماغ کو تھکا دینے والے دفتری ماحول سے طبیعت اُکتا گئی تو میں دس یوم کی رخصت لے کر شملے چلا گیا تاکہ اس طرح تھوڑا بہت سکون حاصل کر کے دوبارہ تازہ دم ہو جاؤں اور مسلسل کوفت سے جو ناگوار اثر صحت و تندرستی پر پڑ رہا ہے، فوراً دور کر دوں۔

شملے کا موسم، خصوصاً لاہور کی جھلسا دینے والی تپش کے مقابلے میں، بہت ہی زیادہ خوشگوار تھا۔ دوپہر کو دھوپ میں چلتے وقت ہلکی سی گرمی محسوس ہوتی اور گرم کوٹ اُتار ڈالنے کو جی چاہتا۔ ورنہ صبح و شام خنک ہوائیں بڑا لطف دیتیں اور رات موٹے لحاف کے بغیر، خصوصاً جب پہلو میں کوئی موجود نہ ہو، کسی طرح نہیں گذر سکتی تھی۔ لوگوں کی چہل پہل بھی ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی حالانکہ حکومتِ ہند کا کوئی بھی دفتر ابھی دہلی سے منتقل نہیں ہوا تھا۔ تمام افسران اور اہلکاران اس صدر مقام کی شدید گرمی میں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں بھی راجدھانی رہا تھا، آتشی دوزخ کا مزا چکھ رہے تھے۔ حکومتِ ہند کے اس اعلان کے ساتھ ہی کہ امسال کوئی سرکاری دفتر شملے نہیں جائے گا، سیر و تفریح کے دلدادگان رختِ سفر باندھ، شملے کا ٹکٹ خرید چل پڑے۔ سب جانتے تھے کہ ایسی صورت میں اچھے مکان کم کرائے پر مل جائیں گے۔ نتیجہ یہ کہ لوئی کنڈی اور کیتھو جیسے علاقوں میں جہاں کی چڑھائی اچھے بدن کی چولیں ہلا کر رکھ دیتی ہے، کسی قسم کا کوئی گھر خالی رہنے نہیں پایا اور پھر ہر گھر میں اتنے اتنے لوگ آباد ہوئے کہ برساتی مینڈکوں کی طرح نظر آنے والے ہنگامی مہمانوں کے لئے بالکل گنجائش نہ رہی۔ اسی لئے میں کسی دوست یا رشتہ دار کے ہاں ہتیا دینے کی بجائے ہوٹل میں جا ٹھہرا ـــــ لونگ ووڈ ہوٹل میں جو لکڑ بازار کی جانب ایک علیحدہ پر فضا پہاڑی کی چوٹی پر بنا ہوا ہے۔

میرا زیادہ وقت پھرنے گھومنے میں ختم ہو جاتا خصوصاً شام کے لمحے مال روڈ کے چکر کاٹنے میں گذرتے کیونکہ حسینوں کی مختلف ٹولیاں اسی سڑک کے ایک مخصوص حصے پر ٹہلتی نظر آتیں۔ میں زیادہ تر مال روڈ اور گرجا میدان والی سڑک کے سنگم پر آہنی کٹہرے کے پاس کھڑے ہو کر لطفِ دید حاصل کیا کرتا اور جب تاریکی چھانے پر ہوٹل کی جانب لوٹتا تو جسم کے ساتھ ساتھ روح میں بھی ایک تھکن سی محسوس ہوتی۔ میرا جی چاہتا کہ مجھے بھی ان وحشی پریوں میں سے کوئی حسینہ ایسی مل جائے جس کے دوش بدوش ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر میں بھی لطف حرام حاصل کر سکوں۔

چھٹیوں کے تمام دن اسی تمنا میں گھل گئے اور جب روانگی میں صرف ایک روز باقی رہ گیا تو کشمکش شروع ہوئی کہ رخصت میں اضافہ کر دیا جائے یا نہیں۔

عقل نہیں مانتی تھی لیکن دل جو اس فضا میں چند دن رہ کر نسبتاً زیادہ قوی ہو گیا تھا، اس پر غالب آ گیا اور سہ پہر کے وقت میرے قدم خود بخود مال روڈ کے تار گھر کی طرف اُٹھتے چلے گئے۔ میں نے سوچا کہ توسیعِ رخصت کے لئے خط سے زیادہ موثر تار رہے گا اور افسرانِ بالا اسے منظور کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں گے۔

دفتر کے علاوہ والد صاحب کو بھی تار کے ذریعہ اطلاع دی تھی کہ میری واپسی ایک ہفتے بعد عمل میں آئے گی تاکہ وہ میری طرف سے بے فکر ہو کر میرا انتظار نہ کریں۔ مجھے معلوم تھا کہ میری صرف سات دن کی چھٹی ابھی باقی ہے۔ میں اس سے زیادہ کا مستحق نہیں تھا۔ ورنہ اسے بھی لیکر وہیں ختم کر دیتا۔

تار گھر کی کھڑکی پر پہنچ کر میں نے تار کے دو فارم مانگے۔ کرسی پر بیٹھی ہوئی لڑکی کا ایک نازک سا ہاتھ میری طرف بڑھا اور میں نے فارم لے لئے۔ وہ لڑکی مجھے نظر نہ آئی کیونکہ کٹہرا ذرا اونچا، میرا قد ذرا چھوٹا اور اُس کی کرسی ذرا نیچی تھی۔ اس لئے میں نے پنجوں کے بل اُچک کر اُسے دیکھنا چاہا پھر بھی وہ نظر نہیں آئی۔ وہ میز کی طرف سر جھکائے اپنے کام میں بُری طرح مصروف تھی۔

میں نے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کے نام تار لکھا:۔

"سخت علیل ہوں۔ پلنگ سے ہل بھی نہیں سکتا ایک ہفتے کی مزید رخصت عنایت کی جائے"۔

اور والد صاحب کو لکھا:۔

"کالج کے چند پُرانے دوست یہاں مل گئے۔ ان کے بے حد اصرار پر مجھے رُک جانا پڑا ایک ہفتے کی مزید رخصت کے لئے اپنی علالت کا تار دفتر بھیج دیا ہے۔ ویسے بالکل اچھا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں"۔

میں نے پھر سیخوں کے بل ذرا اُچک کر دونوں فارم کھڑکی کے اندر بڑھائے۔ لڑکی نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور فارم لے لئے۔ آنکھیں چار ہوتے ہی مجھ پر بجلی سی گر پڑی—— کتنی حسین لڑکی تھی وہ—— حسین اور نوخیز—— تعریف نہیں کی جا سکتی۔

اُس نے پنسل سے جلد نشانات لگاتے ہوئے میری تحریر کے کل الفاظ گنے، حساب لگایا اور کچھ رقم بتائی معلوم نہیں کتنی۔ میرے جسم کی تمام قوتیں—— قوتِ سماعت بھی—— صرف آنکھوں میں جمع ہو گئی تھیں۔ صرف دیکھتے رہنے کے علاوہ مجھ میں کسی اور قسم کی صلاحیت باقی نہیں تھی۔

وہ مذہبی اعتبار سے نصرانی اور قومیت کے لحاظ سے اینگلو انڈین معلوم ہوتی تھی۔ اس کا لباس بھی مغربی وضع کا تھا۔ اس کے خدوخال یونہی کیا کم خوبصورت تھے کہ غازہ و گلگونہ وغیرہ سے تزئینِ جمال کر کے اور بھی زیادہ جاذبِ نظر بن گئی تھی۔ اسے ایک نگاہ دیکھ لینے کے بعد دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہر شخص میں پیدا ہو سکتی تھی۔

کچھ دیر بعد جب اس نے تاروں کی اُجرت لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر جلدی سے دس روپے کا نوٹ جیب سے نکال کر اسے تھما دیا۔ وہ نوٹ لے کر اپنی پشت کی جانب بچھی ہوئی میز کے قریب پہنچی جس پر ایک عجیب و غریب مشین رکھی تھی۔ اس نے چند نمبر ملا کر تار کے فارم یکے بعد دیگرے اس میں رکھے اور کل گھما دی۔

میں نے اس دوران میں اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ نزاکتوں کا مجسمہ اور رعنائیوں کا پیکر تھی۔ میں اپنا سانس روک کے چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس نے جلدی ہی اپنی میز کی طرف بڑھ کر رسیدیں میرے حوالے کیں اور باقی رقم واپس کرنے کے لئے ریزگاری گننی شروع کی۔ اس کو اس کام میں مشغول چھوڑ کر میں وہاں سے کھسک گیا۔ معلوم نہیں وہ کتنی باقی ماندہ رقم مجھے واپس کرتی جسے وصول کرنا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ میں چاہتا تھا کہ ہوٹل کی خاموش فضا میں پہنچ کر صرف میں ہی اس کی بابت غور و خوض کروں بلکہ وہ اپنی کرسی پر بیٹھی میرے متعلق سوچتی رہے—— بس یہی کہ ایک منچلا نوجوان آیا اور نوٹ کی باقی رقم چھوڑ گیا۔

میں نے تہیّہ کر لیا کہ آئندہ چاہے ضرورت ہو یا نہ ہو روزانہ بلکہ دن میں دو بار اسی تار گھر کی کھڑکی پر جا کر کوئی نہ کوئی تار کسی نہ کسی کو ضرور بھیجا کروں گا—— اس یقین کے ساتھ کہ کبھی نہ کبھی وہ میری طرف مائل ہو جائے گی۔

چنانچہ دوسرے دن صبح میں پھر وہاں گیا۔ وہ بدستور سر جھکائے اپنے کام میں مشغول تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا

"تار کا ایک فارم دیجئے"۔

پہلے کی طرح نازک سا ہاتھ کھڑکی کی طرف بڑھا اور میں نے فارم لے لیا۔ اس کے بعد میں نے سوچنا شروع کیا کہ لکھوں کیا اور تار کس کے نام بھیجوں؟ رشتہ داروں میں سے کسی کے نام فرضی پیغامات روانہ کرنے غیر موزوں تھے۔ اس لئے یار دوستوں کو تختۂ مشق بنانا مناسب سمجھا۔ چنانچہ اپنے ایک دوست نعیم کو لکھا۔

"آپ نے میری منگنی جس لڑکی سے ٹھہرائی ہے وہ مجھے کسی عنوان پسند نہیں ہے اس سے میرا ناطہ توڑ کر مجھے اطمینان کا سانس لینے دیجئے"۔

پہلے کی طرح میں نے تار کے فارم کے ساتھ دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق عبارت کے الفاظ گن کر اُٹھی اور مشین کے ذریعہ رسید بنانے کے لئے پشت کی جانب بچھی ہوئی میز کی طرف چل پڑی۔

اگرچہ وہاں جانے سے قبل میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج خواہ مخواہ اس سے گفتگو کرنے کی صورت نکالوں گا۔ اور کچھ نہیں تو تار کے سلسلے میں چند اہم قاعدے پوچھوں گا لیکن یہ سب کچھ بھول گیا اور ایک اضطراری کیفیت کے ماتحت فوراً

تارگھر سے باہر نکل آیا۔ میں نے سوچا کہ آج بھی باقیماندہ رقم اس کے پاس چھوڑ دینی چاہیئے۔ اس طرح میری امارت کا سکہ اس پر بیٹھ جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ اسی باعث میری طرف جھک جائے۔

تیسرے دن گیارہ بجے کے قریب میں پھر گیا اور تار کا فارم لے کر ایک دوست کے نام حسب ذیل مضمون لکھا اور دس روپے کے نوٹ کے ساتھ اسے دیدیا۔

"شملے کی سرسبز و شاداب پہاڑیاں، نشاط انگیز و فرحت بخش تازہ ہوا کے لطیف جھونکے اور سب سے زیادہ ایک پری تمثال حسینہ کی کشش مجھے وطن واپس آنے نہیں دیتی۔ دل کے ہاتھوں جب تک مجبور رہا، اسی جگہ قیام رکھونگا۔"

اور پھر اسی روز شام کو ایک تار اور دیا جس کا مضمون یہ تھا:۔

" ظالم صیاد نے ایک بھولا شکار پھانس لیا ہے اور اب پلٹ کر اس کی خبر تک نہیں لیتا۔ اس تغافل پر ہزار جان سے قربان ہو رہا ہوں۔ میرے حق میں دعا کیجئے کہ یہ قربانی قبول ہو۔"

حسب معمول شام کو بھی دس روپے کا نوٹ تھما کر میں باہر چلا گیا اور رسید تک نہ لی۔

اس کے دوسرے دن کا معاملہ میں بالکل ہی گول کر گیا۔ میں چاہتا تھا کہ اس دل میں کسی قسم کی فرسودگی پیدا ہونے نہ پائے کیونکہ ایک ہی قسم کے واقعات کی مسلسل تکرار سے ایسی کیفیت ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک دن کا ناغہ اسے کچھ زیادہ سوچنے سمجھنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ اور کچھ نہیں تو وہ صبح سے شام تک میرا انتظار ہی کرے۔ انتظار کی کیفیت بھی طبیعت میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔

پانچویں دن جب میں تارگھر کی کھڑکی پر پہنچا تو وہ خلاف معمول اپنے کام میں مصروف نہیں تھی۔ اس کا سر جھکے رہنے کی بجائے کرسی کی پشت سے لگا ہوا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس سوچ میں مبتلا تھی۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ اس نے مجھے دیکھکر بھی اپنے چہرے سے کوئی کیفیت ظاہر ہونے نہیں دی۔ وہ اسی طرح لاپرواہی سے بیٹھی رہی جیسے میں نے پہلی بار تارگھر کی کھڑکی پر آکر اسے دیکھا تھا۔

دس دس روپے کے نوٹوں یا اُن کی باقیماندہ رقموں کا بھی کوئی ذکر نہ نکل سکا۔ وہ بالکل خاموش رہی اور ظاہر ہے کہ میں اس سلسلے میں لب کشائی کر ہی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے حسب معمول تار کا فارم لیا، مضمون لکھا اور دس روپے کے نوٹ کے ساتھ اس کو دیدیا۔ اس نے الفاظ گننے شروع کئے۔

"آخر کار مجھے میری دل پسند لڑکی مل گئی۔ عنقریب ازدواجی زندگی میں قدم رکھونگا۔ شادی کے انتظامات کے لئے ہزار روپے کی رقم بذریعہ تار بھیجئے۔"

یہ تار بھی ایک دوست کے نام تھا۔ حقیقتاً نہ مجھے روپے کی ضرورت تھی اور نہ اس میں استطاعت کہ وہ میرے تار کے جواب میں اتنی بڑی رقم فوراً روانہ کر دیتا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اسے محض مذاق یا میری دماغی خرابی کا نتیجہ سمجھے گا۔ اور زیادہ سے زیادہ اصلیت معلوم کرنے کے لئے ایک معمولی خط لکھ بھیجے گا۔

اس دفعہ بھی وہ لڑکی نوٹ میں کی باقی رقم پی گئی۔ کیونکہ میں رسید کا انتظار کئے بغیر باہر چلا گیا۔

معاملہ حد سے زیادہ بڑھتا جا رہا تھا، اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اس سلسلے کو ختم کیا جائے۔ یا ہمت سے کام لیکر گفتگو کی جائے تاکہ دلی مراد بر آئے۔ محض دل جلانے سے کیا فائدہ۔ چنانچہ آخری تار کا مضمون میں نے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھ کر پہلے سے تیار کیا اور یقین کر لیا کہ اسے پڑھ کر وہ یا تو برہم ہوگی یا اپنے آپ کو میرے سپرد کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے گی۔ سچ بات یہ ہے کہ میں پانچ چھ دن کی معمولی دل لگی میں ساٹھ روپے برباد کر چکا تھا۔ اور پھر دفتر سے لی ہوئی مزید رخصت بھی دو دن بعد ختم ہو جانے والی تھی۔ اس لئے کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچنا ضروری تھا۔

چنانچہ میں آخری تار کے مضمون کا مسودہ ہاتھ میں لئے تارگھر کی کھڑکی پر پہنچا اور فارم لے کر لکھنا شروع کر دیا مضمون حسب ذیل تھا:۔

"سیاہ بالوں اور بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں والی ایک حسین لڑکی تارگھر کی کھڑکی پر روزانہ جلوہ افروز رہتی ہے۔ اسی غارتگر ایمان ورآگہی نے میرا صبر و قرار چھین

حامد علی خاں

غزل

از خود گزشتہ دل کی کہاں اب خبر ملے
کل کہہ رہا تھا دوست کہاں ہو کدھر ملے

پلٹا ہوں عمرِ رفتہ کی ہر رہگزر پہ میں
شاید اسی طرح سے کچھ اپنی خبر ملے

مجھ کو ہر اک خرابے پہ یہ وہم لے گیا
شاید کسی پتے سے کہیں اپنا گھر ملے

لایا ہوں ایسے طالعِ برگشتہ میں کہ آپ
کھو جاؤں ضد سے مجھ کو اگر راہبر ملے

ممنونِ نکتہ سنجیِ چشمِ حسود ہوں
بخشے ہزار عیب اگر اک ہنر ملے

دل ہو گیا گدائیِ عشرت سے بے نیاز
صد شکر مجھ کو غم ملے اور اس قدر ملے

یوں دل پہ جلوہ بار ہوا آفتابِ عشق
جیسے شبِ دراز سے نورِ سحر ملے

ہر نقشِ پا ہو بتکدہ ذوقِ سجود کا
اُس یارِ باصفا کی اگر رہگزر ملے

عالم میں اتنا بے ہنری کو قبول ہے
اہلِ کمال خوار ہمیں در بہ در ملے

کیا اس رواروی میں بھلا دل سے دل کو راہ
فرصت نہیں یہاں کہ نظر سے نظر ملے

حامد مجھے گلہ نہیں یارانِ راہ سے
مجھ کو نہ وہ سمجھ سکے جو عمر بھر ملے

لطیفہ بیگم

"پُتلوں کا کھیل"

"ابا ــــ بھیا آگئے ــــ لو بھیا آگئے!" میں چیخ ہی تو پڑی ایک دم چیخ پڑتی پورے ایک سال بعد گھر آئے تھے اور پھر سارا گھر جیسے اُمل پڑا محشر برپا ہوگیا۔ بچوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سامان پر دھاوا بول دیا، ہر ایک کو اپنے اپنے حصے بخرے کی فکر پڑ گئی۔ میں ایک کونے میں الگ تھلگ کھڑی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ یہ بچے بھی خدا بچائے کیا وبال ہیں۔

"ارے کمبختو ــــ ذرا دم تو لیا ہوتا۔ کہیں اڑا جا رہا ہے۔"

"کیوں بھیا ــــ میرا باجا لائے؟" شمو نے بکس ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

"اور ہمالی ــــ سیتی!" نعیمہ نے بھی تتلاتے ہوئے اپنی فرمائش جڑ دی۔

"چل ــــ بڑی آئی سیٹی والی۔ جا ناک صاف کرکے آ ٹھیک سے منہ بھی تو نہیں دھوتی ناک تک اُم لیا ہوا ہے۔"

ادھر شمو کے بچے تو بھی ہٹ برے کو نہ سلام نہ دعا آگے باجا لینے" میں نے ایک ساتھ سب کو ڈانٹ پلائی اور بھیا کے ہاتھ سے کوٹ لے کر سامنے والی کھونٹی پر ٹانگ دیا۔

"ہاں ــــ سب نکلو یہاں سے۔ بس خالی رضیہ ہی تو گھر میں ہیں اور کسی کا حق تھوڑا ہی ہے"۔ امی جھنجھلا گئیں۔

"اجی ــــ میرا یہ مطلب نہیں۔ آخر سفر سے تھکے تھکائے آئے ہیں۔ اوپر سے ان چیلی چاپڑوں نے ایک ہنگامہ مچا دیا۔"

"دنیا جہان میں اور کوئی سفر تھوڑا ہی کرتا ہے۔ بس یہی تو ایک انوکھے مسافر ہیں ــــ یہ لونڈیا جب دیکھو جب میرے بچوں کے پیچھے پڑی رہتی ہے وہ تو کہو چوبیس گھنٹے میں اپنے کلیجے سے لگائے رہتی ہوں ورنہ یہ تو ضرور جینے نہ دے"۔ امی کا لکچر شروع ہوگیا۔

"اچھا ــــ چھوڑو بھی ان سکا بانوں کو"

"ہاں ــــ بس کار آمد باتیں تو یہی نو بہار کریں گی"۔ امی نے طنزیہ کہا۔

اب جو بچوں نے ذرا سستہ پائی تو پھر سامان پر پل پڑے۔

دوبارہ میری ہمت نہ پڑی کہ کچھ کہوں۔ اور دل ہی دل میں کڑھتی رہی۔ ادھر امی بھی کھانے وغیرہ کی فکر میں روانہ ہوگئیں۔

"اب پورے دو مہینے نہیں جانے دونگی۔ کتنے دن سے روز یاد کر رہی تھی ــــ اب ہمارے بھیا کا امتحان ہو رہا ہوگا ــــ اب آنے کی تیاری کر رہے ہونگے ــــ اب گاڑی میں ہوں گے"۔ میں نے دوپٹے کی چنٹوں کو انگلیوں سے کریدتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے ــــ بڑی دُبلی ہوگئی میری رضو"۔ بھیا نے سر پر ایک میٹھی سی چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں اور کیا ــــ اب بھابی لا کے دو تو موٹی ہوں"۔

"کیوں بھابی کا کیا دودھ پیئے گی؟" بھیا کچھ موڈ میں تھے ورنہ شادی کے نام سے انکے پتے ہی تو جل جاتے ہیں۔

"ہٹو بھی ــــ جیسے بہت بھابی لا ہی تو دوگے"۔ میں نے چھیڑتے ہوئے کہا۔ اور پھر امی کو آتے دیکھکر بات کا رُخ بدلنا چاہا۔ "کیوں بھیا ــــ میرے بُندے لائے؟"

"ہاں ــــ ابھی تو بچوں کو ٹالتا جا رہا تھا اور اب خود فرمائشیں شروع ہوگئیں"۔ میں چونک پڑی جیسے اچانک کسی جال میں پھنس گئی ہوں۔

"ہاں سلیم ــــ اب تو ایم۔ اے۔ بی۔ اے سب کچھ کر لیا اب شادی کر ڈال"۔ امی سنجیدگی سے پاس آکر بیٹھ گئیں۔

بھیا کا موڈ رفو چکر ہوگیا۔

"شادی ــــ شادی ــــ گھر میں آئے دیر نہیں ہوئی کہ شادی کا وظیفہ شروع ہوگیا۔"

"ارے کمبخت ــــ کر کیوں نہیں لیتا۔ یہ دیکھ بالوں میں بھی سفیدی آگئی۔ کیا جب کریگا جب نہ منہ میں دانت رہینگے نہ پیٹ میں آنت۔"

"ارے بھائی ــــ تم کو اور کوئی کام بھی ہے!"

"کمبخت ــــ کیوں گناہ سمیٹ رہا ہے۔ روحوں کا اتار مارا جاتا ہے۔ تجھے کیا ہوگیا نہ جانے کس ٹھنڈی مٹی کا بنا ہے۔ ایک تیرے باوا تھے جو شادی نہ کئے جانے پر گھر سے بھاگے جا دیں تھے۔

"تمہاری بلا سے — ٹھنڈی مٹی کا ہوں یا گرم کا" بھیا کو اور کوئی جواب نہ بن پڑا تو اُٹھکر باہر چلدیئے۔ امی پیچھے پیچھے دوڑیں مگر وہ یہ جا وہ جا — شادی گویا بھیا کی چڑ ہوکر رہ گئی ہے۔ شادی کا لفظ سُنا اور وہ ہتّے سے اُکھڑے۔ اور امی بڑے فخر سے کہتیں — میرا بچّہ تو بس ہیروں میں تولنے لائق ہے۔

"میں کہتی ہوں لڑکے تجھے کیا ہٹ سوار ہوگئی ہے۔ کیا دُنیا زمانے میں لڑکے لڑکیوں کی شادیاں نہیں ہوتیں۔ جب میں قبر میں گھس جاؤنگی جب کریگا۔ یہ اچھا فیشن نکالا ہے آج کل کے لڑکے لڑکیوں نے۔"

مگر ان سب باتوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا اور امی تھک کر چلی گئیں۔

"رضیہ بیٹھ تجھے رومان سُناؤں۔" اور میرا پیر جو آم کے چھلکے پر پڑا — اڑا ڑا دھم۔

"پیروں میں جان نہیں ہے!" امی باہر سے چلائیں۔ میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔

"ہٹو — میں نہیں سنتی۔ شادی تو کرتے نہیں کہ ایک بھابی لا دو۔ اوپر سے یہ جھوٹے موٹے قصے۔"

"سنتی کیسے نہیں — میں تو سُنا کے دم لوں گا۔"

"امی — یہ دیکھو" میں چلائی۔

"چپ —" بھیا نے میرا منہ بھینچ دیا۔

"مستی مت کرو بیٹا۔" ہماری باورچن مسکراتے ہوئے بولی۔ یہ اُس کا خاص جملہ تھا جو وہ اکثر موقع بے موقع بچوں پر استعمال کردیتی تھی۔ مجھے ہنسی آگئی اور بھیّا جل ہی تو گئے۔ وہ کبھی کسی پر ناراض نہ ہوتے ہاں جب ان کو غصہ آتا ہے تو اُن کے سفید سفید گال انگاروں کی طرح دہکنے لگتے۔ اور وہ باورچن پر دانت پیستے ہوئے باہر چلدیئے۔ یہ باورچن بھی تو اللہ ماری بڑی ہی بدتمیز ہے۔ مگر کہے کون — ہم تو ہم بیچاری امی بھی جن سے سارا گھر لرزتا ہے اُس کے سامنے دم تک نہیں ہلاسکتیں۔ آخرکار بھیا کا رومان یونہی رہ گیا۔

بھیا پر مجھے رہ رہ کے غصہ آتا۔ بے کار باتیں جتنی جی چاہے بنوالو — ایک شادی تک تو ان سے ہوتی نہیں۔ نری باتیں گڑھنا جانتے ہیں۔ میرا جی چاہتا کہ کاش بھیا کسی راستہ چلتی ہی کو کیوں نہ پکڑ لائیں اور میں اُسے دن بھر بھابی بھابی کہتی پھروں۔ ایک عدد بھابی — میری سب سے بڑی آرزو — سب سے بڑی خواہش۔ پہلے تو یہ تھا کہ چلو پڑھ رہے ہیں اس لئے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب ایم۔ اے بھی کرچکے، قانون بھی پاس کرلیا۔

"بڑے ضدی ہو بھیا —"

"کیوں رضو — تجھے کچھ اور کام بھی ہے۔ یا صبح سے شام تک ایک ہی رٹ۔ ارے ہندوستان میں ایسے ہی غلاموں کی تعداد کون کم ہے چاہے کھانے کو ٹکرا نہ ملے پر شادی ضرور کرلی جائے۔ اور پھر دس بارہ رینگتے ہوئے بچے — جیسے کیچڑ کے گندے کیڑے — اللہ کی دین۔ ہونہہ۔ اللہ کی دین کی بھی ایک ہی رہی۔"

میں خاموش ہوگئی۔ مجھے اپنے اوپر غصہ آنے لگا۔ میں پاگل ہوں جو ملا فیس کے مشورہ دیتی ہوں۔ آج سے چاہے دُنیا اِدھر کی اُدھر ہوجائے پر میں بھیا سے شادی کے لئے نہ کہوں گی۔

ابھی بھیا کو آئے کوئی دس ہی دن ہوئے تھے کہ عفت آگئی۔ عفت کا آنا تھا جیسے سارے گھر میں ایک نئی زندگی دوڑ گئی۔ صبح سے شام تک غل غپاڑہ۔ اور بھیا نے تو بس عفت کا ناک میں دم کردیا۔

"اری — تو اتنی بڑی ہوگئی — ڈھو کی ڈھو۔" اور عفت نے شرم سے گھٹنوں میں سر دے لیا۔

"بھیا کو سلام بھی نہیں کیا۔ کتنے برسوں میں تو ملا ہے۔" خالہ بی نے عفت کو ڈانٹا۔ اس نے اور بھی سر گڑو لیا۔

"یہ کیا سلام کرتی گنواری جسے بیٹھنے تک کی تمیز نہیں۔ پلنگ میں گھسی جارہی ہے۔ ارے بھائی نواڑ تو مت توڑو آج کل ملتی نہیں —"

"ارے کیوں بچی کو ستاتا ہے۔ کیا اسی لئے تیرے گھر آئی ہے۔" امی چلائیں۔

"میں کیوں ستاتا۔ کیوں رضو۔ بھلا مجھے کیا پڑی جو کسی کو ستاؤں" اور پھر بھیا نے کنکھیوں سے عفت کی طرف دیکھا جو پیروں کی انگلیوں سے فرش کو توڑنے کی کوشش کررہی تھی۔ اس کا منہ لال انگارہ ہورہا تھا اگر موقع ملتا تو جھٹ اُٹھ کر

دوسرے کمرہ میں بھاگ جاتی۔ مگر بھیّا جو کرسی اڑائے سر پر سوار تھے۔

"ارے نہا دھو کے کپڑے تو بدل ڈال دیکھ کیسا بدن چُپ چپ کر رہا ہے" امی پسینہ پوچھتی ہوئی باورچی خانے سے نکلیں۔

"بس آگئیں۔۔۔ یہ تو نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑتی ہیں۔۔۔ اچھا الگ ہٹو" بھیا نے مُنہ بنایا۔ تمہارے کپڑوں میں کیسی مچھلیوں کی سی "کولانڈ" آ رہی ہے۔۔۔ جاکے نہا تو۔۔ نا"

امی کو کوئی جواب نہ بن پڑا تو کھسیا کر بولیں۔

"کوئی تیری کمائی تھوڑی کھا رہی ہوں لڑکے۔۔ جس دن جورو آ جائے گی تو نہ جانے کیا حال کرے گا"

"اور نہیں تو کیا۔۔" بھیا تڑاخ سے بولے۔ میں چونک پڑی آج زندگی میں پہلی بار میں نے بھیا کی زبان سے یہ سُنا ورنہ شادی کے نام سے تو وہ بھُن ہی تو جاتے تھے۔

پھر دھیرے دھیرے عفت بھی بھیا سے بے تکلف ہوگئی۔ اب وہ بھی ہمارے ساتھ مل کر بھیا کو بار بار شادی کا ذکر کرکے چھیڑتی۔ مگر اب بھیا کے غصّہ کا انداز ہی دوسرا تھا۔

"چُپ۔۔۔ شادی کا نام لیا تو پیٹوں گا۔ چوٹی پکڑکر" اور پھر عفت کی چوٹی پکڑکر خوب ہلاتے۔

"کتنے مضبوط ہیں تیرے بال۔ کون سا تیل لگاتی ہے۔ کیتھرا ڈین، کوکولا۔ بول جلدی" اور پھر ٹھکے سے اُس کے گال پر ایک تھپڑ لگا دیتے میرا جی چاہتا کہ کاش بھیا میری بھی چوٹی پکڑکر اسی طرح ہلاتے۔ مگر ان میں جیسے کوئی بڑی تبدیلی ہوگئی ہو۔ اس عفت کی بچی کو بھی آئے کو ہی زمانہ رہ گیا تھا۔ بھیا میں کتنی تبدیلیاں ہوگئی تھیں اور اس چھٹی میں تو جیسے چولا ہی بدل ڈالا ہو۔ اب امی سے زیادہ لڑائی بھی نہ ہوتی۔ دن بھر کچھ گم سُم سے رہتے اگر بولتے بھی تو صرف عفت سے۔ گویا سارے گھر میں اگر بات کرنے کے لائق ہے تو وہ عفت ہی ہے۔ جب اخبار اور کتابوں سے فرصت ملتی تو بس "عفت۔۔۔ عفت۔۔۔" ہر کام کے لیے اُسی سے کہا جاتا۔ جیسے میں اُن کی بہن ہی نہ تھی۔ بازار جاتے تو بھی عفت ہی کی پکار پڑتی۔۔۔

"کیا منگائے گی عفت۔ ریشم لا دوں میرے تکیئے کا غلاف کاڑھ دینا"

"ہاں۔۔۔ لا دیجئے میں کاڑھ دونگی" میں نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔

"بس رہنے بھی دو۔ تمہیں تو نرا کاڑھنا ہی آتا ہے"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سارے جسم میں آگ لگ گئی ہو۔ سدا عفت ہی تو کاڑھ کر دیتی تھی۔ کہاں ہر تھوکتے کہتے مُنہ دُکھتا تھا اور اب۔۔۔ میں بھی دیکھتی ہوں کیسی تو بہار کاڑھتی ہیں یہ۔۔۔ اور میں گھور کر کبھی عفت کو دیکھتی اور کبھی بھیا کو۔۔ سگی بہن کو تو پوچھتے نہیں اور یہ خالہ کی لڑکی بڑی مُنہ چڑھ گئی ہے۔ خالہ کو تو دیکھو جن کے مُنہ میں دانت تک نہیں۔ پھر خود ہی مجھ کو ہنسی آگئی۔ اس میں بیچاری خالہ کا کیا قصور یہ عفت کی بچی ہی کچھ ایسی ہے۔ زہر کی پوٹلی۔ کہاں تو چارپائی میں دھنسی جاتی تھی اور اب ہردم سر پہ سوار رہتی ہے بھُوت کی طرح کسی وقت بھیا گھر پر نہ ہوں تو جی ہی نہیں لگتا۔۔۔ اور بھیا بھی تو۔۔۔

"لے عفت یہ چوڑیاں۔ یہ بُندے۔ اِدھر تو لا کان ذرا پہنا کے دیکھوں کیسے لگتے ہیں"

"یہ چوٹی ہیں دیدو بھیا"

"تجھے پھر لا دینگے۔ یہ عفت کی ہے"

آج تک لا کے دیتے ہیں۔ بڑی آئی لینے والی عفت کی بچی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا سب کچھ چھن گیا ہے۔ عفت نے جیسے میری ساری پونجی لوٹ لی ہو۔ اور میں دم نہ مار سکی۔

"کس رنگ کا ریشم چاہیئے عفت"

"بھیا کی آواز پھر گونجی اور عفت رنگ دکھانے لگی۔ لال۔ ہرا۔ پیلا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے سر میں دُھواں اُٹھ رہا ہے۔ آندھی چل رہی ہے۔ اور اس آندھی میں لال ہرے شعلے بھڑک رہے ہیں۔

خالہ بی جا رہی تھیں۔ عفت جا رہی تھی۔ جیسے گھر کا سہاگ جا رہا تھا لیکن میں خوش تھی کسی طرح یہ جائے تو۔ یہ چلی جائے گی تو بھیا پھر مجھ سے پہلی سی محبت کرنے لگیں گے۔ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتے تھے پر اب تو عفت ہی اُن کی بہن ہے۔

اور میں کچھ بھی نہیں ـــــ میں بظاہر افسوس کر رہی تھی۔

"اب کب آئے گی عفت؟" بھیا نے الماری میں کتابیں ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

"اب تو آپ کی شادی میں آؤنگی۔"

"میری شادی میں۔ سچ ـــ!" بھیا نے خوش ہوکر پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں۔ اگر بلانا ہو تو جلدی کرنا۔"

"مگر شادی تو آپکی چڑ ہے" میں نے جل کر کہا۔

"خیر عفت کی خاطر کرلوں گا۔ یہ بھی کیا یاد کرے گی۔"

اس پر میں اور بھی بھُن گئی۔ شادی بھی کرینگے تو اُس کے ہی کہنے سے۔ جیسے ہم کچھ ہوتے ہی نہیں۔ اگر میں عفت کی جگہ ہوتی تو بھیا وہ ڈانٹ پلاتے کہ کبھی یاد بھی کرتی۔ مگر وہ تو عفت تھی وہ کتنا بھی مذاق کرے مگر بُرا نہیں لگتا۔ مجھے بھیا پہ غصہ آ رہا تھا۔

"اچھا ــ کب کروگے بھیا؟" عفت بولی۔

"جب تو کہے۔" بھیا آکر اطمینان سے کُرسی پر بیٹھ گئے۔ اور آنکھیں بند کرکے سر کرسی پر ٹیک دیا جیسے تصور میں ہونے والی بیوی کی شکلیں بنا رہے ہوں۔ میں نے میز پر سے اخبار اٹھایا اور چلدی۔ بھیا نے آنکھیں کھولیں۔

"جا رہی ہے۔ رضیہ؟"

"ہوں" میرا دل آپ جل رہا تھا۔ ان کے پاس بیٹھ کر کوئی بیوقوف بنتا ہے۔

"جاؤ ــ" اُنہوں نے عجیب انداز میں کہا۔ اس پر مجھے اور بھی غصہ آگیا۔ یہ تو کسی وقت بھی نہیں چاہتے کہ میں ان کے پاس بیٹھوں۔ ان کو بھلا مجھ سے کیا دلچسپی۔ میں نے کمرے میں جاکر اخبار ایک طرف پھینک دیا اور ٹہلنے لگی۔ مگر طبیعت نہ مانی۔ دیکھوں تو کیا باتیں ہو رہی ہیں اور پھر جاکر عفت کے پاس بیٹھ گئی۔ بھیا اب تک آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے جیسے کوئی جادو کر رہے ہوں۔ مجھے ہنسی آگئی۔

"کوئی عمل ہو رہا ہے کیا؟"

"ہوں ــ" انھوں نے آنکھیں بند کئے کئے جواب دیا۔

"کہیں مجھ پر نہ کر دینا" عفت چونک کر بولی۔ "میں تو جا رہی ہوں اپنی اماں کی اکیلی ہوں وہ تو رو رو کر مر جائیں گی۔ آپ کا کیا بگڑے گا۔"

بھیا نے مُسکرا کر آنکھیں کھولیں جیسے کوئی شراب کے نشے میں ہو سُرخ سُرخ آنکھیں۔ میں ڈر گئی بھیا کی آنکھوں کو کیا ہوگیا۔ پھر انہوں نے عفت کا ہاتھ پکڑ کر میرے قریب بٹھا دیا۔

"یہ دُنیا ہی جادو کی ہے عفت۔ ہر چیز جادو کی۔ تم جادو سے ڈرتی ہو۔ پگلی" بھیا زور سے ہنسے "میں بھی جادوگر ہوں اور تم بھی۔ کیوں رضیہ تو بھی جادو جانتی ہے۔" وہ ہنستے ہوئے کرسی سے اُٹھکر ہمارے قریب آ بیٹھے "میری بہن ابھی معصوم ہے بھولی ہے اور عفت بھی معصوم ہے۔ جب ہی تو جادو سے ڈرتی ہے۔"

کہاں تو شادی کا ذکر ہو رہا تھا اور کہاں جادوگر دلکا۔ مجھے ہنسی آگئی۔ مگر بھیا سنجیدہ تھے ایسی سنجیدگی جو کبھی نہ دیکھی تھی۔ سگریٹ کے کش پہ کش لگا رہے تھے۔ اور اس دھوئیں کے حلقوں میں جیسے کچھ ڈھونڈ رہے ہوں، جیسے انکی کوئی بڑی دولت چھن گئی ہو جس کے لئے وہ پریشان ہوں۔ سامنے قدِ آدم آئینہ لگا ہوا تھا۔ دھوئیں کے غباروں میں ہم دُھندلے دھندلے دکھائی دے رہے تھے۔

"میری دُلہن دیکھی تو نے ــ رضیہ؟" بھیا نے پیار سے میری طرف دیکھا۔

"ہوں۔ شادی تو ہوئی نہیں۔ دُلہن دیکھی ہے" بھیا کے پیار بھرے لہجے سے مجھے کچھ سکون محسوس ہوا۔

"عفت تو نے دیکھی ہے؟"

"اوںہوں" اُس نے بھیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔ بھیا بدستور اُدھ کھلی آنکھوں سے آئینہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور بغیر کچھ کہے میرا اور عفت کا ہاتھ پکڑا۔

"لو پہچانو ــ میری دُلہن کو" بھیا نے دھوئیں کے غبارے اُڑاتے ہوئے کہا۔ آئینہ میں دور بادلوں کے سفید سفید گالوں کے پیچھے ہم تینوں کا دُھندلا دُھندلا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ اور بھیا کی دُلہن جیسے ان بادلوں کے پیچھے جھانک رہی ہو۔ میں ہنس رہی تھی۔ بھیا چُپ تھے۔ عفت پیر کے انگوٹھے سے زمین کرید رہی تھی۔ اُسکے ماتھے پر پسینہ تھا۔ گال لال انگارہ جو دھوئیں کے غباروں میں بھی نہ چھُپ سکا۔

"آپا۔ تم عفت کی رُخصتی میں ضرور آنا۔ ابکی عید کے چاند کروگی۔" یہ خالہ اماں کی آواز تھی۔

"آؤنگی کیوں نہیں۔ ہم سب آئیں گے عفت کے بیاہ میں۔" اماں نے جواب دیا۔ (بقیہ بر صفحہ ۵۳)

علی منظور

اعتراف

نہ شہسوارِ جنگ جو کے راستے کی گرد ہوں
نہ پائمالِ سبزہ خو کے دل کی آہِ سرد ہوں
نہ میکدہ نشیں ہوں میں نہ بادیہ نورد ہوں
نہ محوِ نائے و نوش ہوں نہ شکوہ سنجِ درد ہوں
نہ اُس کی طرح سُرخ ہوں نہ اُس کی طرح زرد ہوں
سیاہ فام قوم کا سیاہ فام فرد ہوں

نہ حاملِ جفا ہوں میں نہ قابلِ فنا ہوں میں
مُجاہدانِ ہم وطن میں لائقِ ثنا ہوں میں
سیاہ فام قوم کا ملاحت آشنا ہوں میں
صباحتِ فرنگ کا تقابلی انا ہوں میں
دغا سے آشنا نہیں دغا میں شیر مرد ہوں
وفا پرست قوم کا وفا پرست فرد ہوں

دکھا رہا ہے آئینہ مجھے بقا طلب انا
صباحتی فریب کا خیال ہو گیا فنا
ہُوا جو نکتہ رس مرا دلِ حقیقت آشنا
گروہ نامور کا میں زعیم نامور بنا
نجات میرا مدعا میں داعیِ نبرد ہوں
نجات خواہ قوم کا نجات خواہ فرد ہوں

ہیں اہلِ ہند مجھ سے خوش میرا وطن بھی ہند ہے
وہی گلا وہی صدا وہی دہن وہی ہے لے
غزل میں تان سُر وہی وہی ہے ٹھمریوں کی لے
فرنگیل سنائے گا بلینک ورس تا بکے
سفید اجنبی کی طرح کیا میں رہ نورد ہوں
سیاہ فام قوم کا سیاہ فام فرد ہوں

جعفر زیدی

"رقاصہ"

کردار

۱ .. .. .. رقاصہ
۲ .. .. اجنبی

منظر

رقاصہ کا کمرہ۔ ہر طرف قدِ آدم آئینے لگے ہیں۔ کمرے کے ایک کونے میں دیوار سے لگی ہوئی ایک چھوٹی میز رکھی ہے۔ میز پر سبز ریشمیں میز پوش بچھا ہوا ہے۔ صراحی اور دو بلوری جام رکھے ہوئے ہیں۔ دروازے پر سفید پردہ پڑا ہوا ہے۔ رقاصہ کمرے میں تنہا ناچ رہی ہے۔ دروازے پر دستک ہوتی ہے لیکن رقاصہ لگاتار ناچتی رہتی ہے۔ چند لمحہ بعد رقاصہ ناچتے ناچتے خود ہی رُک جاتی ہے۔ دوبارہ پھر دستک ہوتی ہے۔

رقاصہ (آپ ہی آپ) ہوا دروازے سے کھیل رہی ہے (پھر دستک ہوتی ہے) برفانی ہوائیں لڑکھڑاتے ہوئے شرابی کی طرح بہک رہی ہیں۔ (پھر دستک ہوتی ہے) میں ان ہواؤں کی برفانی فطرت کو قید کر کے جون کی کراہتی اور دہکتی ہوئی لُو میں منتقل کر دونگی (پھر دستک ہوتی ہے) کیا یہاں بھی کوئی مجھے جانتا ہے۔ (پھر دستک ہوتی ہے) کوئی میرے رقص کا تعاقب کر رہا ہے۔ (مُسکراتی ہے) ہوں۔ یہ میرا جوان وہم ہے۔ (پھر دستک ہوتی ہے) شاید کوئی اجنبی بھٹک گیا ہے (دروازہ کھولتی ہے۔ ایک نوجوان شخص کھڑا دکھائی دیتا ہے) کیا چاہتے ہیں آپ؟

اجنبی:- کیا میں تھوڑی دیر آپکے یہاں قیام کر سکتا ہوں۔ سرد ہوا بہت تیزی سے چل رہی ہے۔ اور میری کار سامنے والے درخت سے ٹکرا کر چور چور ہو گئی ہے۔ بارہ تو بج ہی چکے ہیں۔ صبح ہونے میں صرف چند گھنٹے باقی ہیں۔ میں بہت بہت مشکور ہونگا۔

رقاصہ:- کیا آپکے ساتھ کوئی دوسرا آدمی بھی ہے؟

اجنبی:- نہیں تو۔

رقاصہ:- کیا آپ مجھے پہلے سے جانتے ہیں؟

اجنبی:- بالکل نہیں خاتون۔

رقاصہ:- تو اندر تشریف لے آیئے۔ (اجنبی اندر قدم رکھتا ہے اور رقاصہ چٹخنی چڑھا دیتی ہے)

اجنبی:- (قالین پر بیٹھتے ہوئے) کیا ایک پیالی چاء مل سکتی ہے۔ اس طرف بہت زیادہ سردی ہے۔

رقاصہ:- چاء تو نہیں مل سکتی۔ البتہ شراب موجود ہے پیجئے گا۔

اجنبی:- ضرور۔ بخدا خاتون میں آپکا بہت بہت مشکور ہوں

(رقاصہ صراحی اور جام اٹھا کر اجنبی کے سامنے قالین پر بیٹھ جاتی ہے) کیا آپ مکان میں تنہا ہی رہتی ہیں؟

رقاصہ:- نہیں میں تنہا تو نہیں رہتی۔ میرا آرٹ میرے ساتھ رہتا ہے۔

اجنبی:- (شراب جام میں انڈیلتے ہوئے) اوہو تو آپ آرٹسٹ ہیں (ایک لمحہ خاموشی) کیا آپکو شراب سے شوق نہیں؟

رقاصہ:- جوانی اور سرد راتوں میں شراب کی تمنا کسے نہیں ہوتی۔ کسی نہ کسی صورت میں ہر محفل میں شراب کی روح پہونچ ہی جاتی ہے۔ کہیں عورت کا روپ دھار کر، کہیں رقاصہ کے گھنگھرو کی صدا بن کر اور کہیں بیوی کی سچی محبت کا رنگ بن کر۔ شراب اور شباب کے امتزاج سے ہی تو بہشت تعمیر ہوئی ہے۔ شراب کا رنگتا ہوا سر

جیسے پہاڑی دوشیزہ کا کنوارا گیت۔ شراب کا اترتا ہوا خمار۔ جیسے ناچتی ہوئی رقاصہ تھک کر ڈگمگا رہی ہو۔ شراب کا چھلکتا ہوا جام۔ جیسے دُنیا میں کچھ بھی گناہ نہیں۔ مجھے ان سب چیزوں سے لگاؤ ہے۔

اجنبی:۔ (ہونٹوں سے جام ہٹاتے ہوئے) تو پھر ایک جام آپ رقاصہ ابھی پیجئے۔

رقاصہ:۔ لیکن نہیں (رُک جاتی ہے)

اجنبی:۔ کیا گناہ کرتے ہوئے ڈر محسوس ہو رہا ہے۔

رقاصہ:۔ گناہ (قہقہہ) گناہ سے میں کبھی نہیں ڈرتی۔ میں اس تلاش میں رہتی ہوں کہ کوئی ایسا عجیب و غریب گناہ کروں جو دُنیا میں آج تک کسی نے نہ کیا ہو۔ گناہ جو عام ہوتے ہیں اُنہیں تو میں قریب قریب نیکی ہی سمجھتی ہوں۔ عام گناہ سے ہر آدمی مانوس ہو جاتا ہے اور وہ گناہ اپنی اہمیت کھو بیٹھتا ہے۔ نہ جانے ایسا کیوں ہوتا ہے اور پھر کہیں رقاصہ بھی گناہ سے ڈر سکتی ہے۔ (ٹھٹھک جاتی ہے)

اجنبی:۔ تو آپ رقاصہ ہیں۔

رقاصہ:۔ اوہ۔ یہی بات میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور یہی بات میں نے کہدی ہے۔

اجنبی:۔ اچھا تو میں سمجھا۔ رقص ہی آپ کا آرٹ ہے۔

رقاصہ:۔ رقص ہی میرا آرٹ ہے۔ اور رقص میری زندگی کا شباب۔

اجنبی:۔ لیکن شراب پینے میں کیا پس و پیش ہے

رقاصہ:۔ شراب میرے سوتے ہوئے جذبات کو جگا دیتی ہے۔ جوں جوں خمار چڑھتا ہے میں بدحواس ہو جاتی ہوں۔ پھر میری بدحواسی رقص کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ گھنگھرو کی رسیلی آواز شراب کے خمار میں اور بھی تیزی پیدا کر دیتی ہے۔ میری ہر سانس ناچنے لگتی ہے۔ میرا رُواں رُواں رقص کرنے لگتا ہے۔ میں نے قوس و قزح کے رنگ کو رقص کرتے دیکھا ہے۔ میں نے زمین و آسمان کو محو رقص دیکھا ہے۔ صراحی اور جام ناچنے لگتے ہیں۔ دیوار کے آئینوں میں میرا عکس ناچنے لگتا ہے۔ اس وقت میں اسی لئے شراب نہیں پینا چاہتی کہ اگر میں ناچنے لگونگی تو تم میرے رقص کی تاب نہ لا سکو گے اور باہر نکل کھڑے ہوگے۔

اجنبی:۔ میں خود ناچ میں بیحد دلچسپی لیتا ہوں۔ اپنی زندگی سے تھک سکتا ہوں لیکن جواں عورت کے رقص سے کبھی نہیں اُکتا سکتا۔

رقاصہ:۔ میں کہتی ہوں تاب نہ لا سکو گے۔ لیکن تم مجھے اس قدر غور سے کیوں دیکھ رہے ہو۔ کہیں تمہاری آنکھوں میں میری تصویر جم کر نہ رہ جائے۔ اس طرح دنیا تمہاری آنکھوں میں میرا عکس دیکھ کر مجھے پھر تلاش کرے گی۔ میں دُنیا سے اُکتا کر یہاں آتی ہوں۔

اجنبی:۔ میں کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہونگا۔ لیکن میں حیران ہوں کہ تم اپنے اِس آرٹ کو آخر تنہائی میں کیوں تباہ کر رہی ہو؟

رقاصہ:۔ اِس لئے کہ انسان ابھی ناسمجھ ہے۔ وہ رقص سے محبت کرتے کرتے رقاصہ سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اور رقاصہ رقص میں دلچسپی لینے کے بجائے ایک جوان مرد میں جذب ہو کر رہ جاتی ہے۔ آرٹ ختم ہو جاتا ہے۔ اور عیاشی اپنا ستار بجا کر دونوں کو مدہوش کر دیتی ہے میں اپنے آرٹ کے علاوہ کسی سے محبت نہیں کر سکتی۔ اگر ایسا خیال بھی میرے دماغ میں پیدا ہوا تو میں خود سے انتقام لونگی۔ مجھے خود اپنے وجود سے صرف اس لئے محبت ہے کہ میری ہر ہر جنبش میں میرے آرٹ کا عکس دکھائی دیتا ہے میرا رقص میری زندگی ہے۔

اجنبی:۔ رقاصہ مجھے تمہاری رائے سے اختلاف ہے۔ تم سوسائٹی میں پہنچ کر بھی اپنے آرٹ سے دلچسپی قائم رکھ سکتی ہو۔ اسٹیج کو تمہارے رقص کی ضرورت ہے۔ شباب کی مستی کو تمہارا رقص دیکھنے کی حسرت ہے۔ اور تھکی ہوئی دُنیا ایک ایسی رقاصہ کے رقص کی آرزومند ہے جس کے پیروں کی گردش کی تیزی میں اس زمین کی گردش لپٹ کر رہ جائے۔ اور انسان اس پریشان کن دُنیا کے ماحول سے چند لمحے تو سکون پا سکے۔

رقاصہ:۔ تم میری شربتی آنکھوں میں جھانک کر سب کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم نے معلوم کر لیا ہے کہ میں

رقاصہ ہوں۔ کیا یہ کچھ کم ہے۔ ایک قیمتی راز جو میری یادداشت میں محفوظ تھا آج میں نے تمہارے سامنے کھول دیا ہے۔ میرے پاس اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ میں بھول جانے پر ایمان رکھتی ہوں۔ پھر بھی میں اپنے رقص کو لامحدود نہیں کر سکتی۔ دُنیا کی تمام خوبصورت چیزیں رشک سے تڑپ اُٹھیں گی۔ دریا کا بہتا ہوا پانی اپنی فطرت بدل کر میرا رقص دیکھنے کے لئے منجمد ہو جائے گا۔ ہزارہا آوازیں میرے رقص کی تعریف میں گونجنے لگیں گی۔ ستاروں میں پہلی مرتبہ آواز پیدا ہوگی۔ اور یہی میں برداشت نہیں کر سکتی۔ میں ہر چیز کو مبہوت کر دینا چاہتی ہوں۔ میں چہرہ کے جذبات کی مدد سے تعریف چاہتی ہوں۔ میں تعریف سُننے سے زیادہ اپنے تماشائی کی خاموشی سے خوش ہوتی ہوں۔

تم دیکھ رہے ہو کہ یہ تمام آئینے میری اس حسرت کو پورا کر دیتے ہیں۔ وہ خاموشی سے مجھے مع میرے رقص اپنے سینہ میں اُتار لیتے ہیں اور پھر مجھے اور میرے رقص کو واپس کر دیتے ہیں۔ آئینوں کی خاموشی اور حیرت مجھے میرے آرٹ میں مدد دیتی ہے (جام پھر کر پیش کرتی ہے) ایک جام اور پیو۔ (اجنبی جام لے لیتا ہے) تم کم گو ہو اسی وجہ سے میں تمہارے ساتھ اتنی دیر سے باتیں [illegible] ہوں۔ اگر تم دروازہ پر دستک کے بجائے آواز دیتے تو شاید دروازہ کبھی نہ کھلتا۔ آج سردی کافی ہے۔ اگر تمہیں نیند ستا رہی ہو تو میں جا سکتی ہوں۔

اجنبی:۔ نہیں نہیں رقاصہ، مجھے ذرا بھی نیند نہیں آ رہی ہے۔

رقاصہ:۔ مجھے پیاس محسوس ہو رہی ہے۔

اجنبی:۔ تو پھر ایک جام پی لو۔

رقاصہ:۔ ابھی نہیں۔ میں تم سے کچھ دیر اور باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ ہاں وعدہ کرو تم آئندہ کبھی اس طرف آنے کی کوشش نہ کرو گے۔

اجنبی:۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے رقاصہ، میں تم سے پھر ملنا چاہتا ہوں۔

رقاصہ:۔ ناممکن۔ تمہیں وعدہ کرنا ہوگا۔ میں ایک ہی شخص سے متعدد بار ملنے کی عادی نہیں ہوں۔ میں کل کی ہر بات بھول جانے میں سکون محسوس کرتی ہوں۔ میری یادداشت تاریخ کا ورق نہیں ہے کہ ہر شخص اور ہر حادثہ کو یاد رکھے۔ ماضی میں میرے لئے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرے خیالات اور تصورات ہمیشہ مستقبل کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ تمہیں وعدہ کرنا ہی ہوگا۔

اجنبی:۔ رقاصہ یہ تمہاری بیجا ضد ہے۔

رقاصہ:۔ یوں ہی سہی۔ سوائے میرے جو شخص بھی ایک مرتبہ میرے دروازہ سے باہر نکل گیا ہے وہ پھر دوبارہ اندر داخل نہیں ہوا۔ تم نے جو کچھ یہاں محسوس کیا اور جو کچھ یہاں سُنا ہے۔ وہ سب یہیں چھوڑ کر جانا ہوگا۔ اگر تم میرے راز کو دُنیا کے کانوں تک پہنچا بھی دو گے تو میں اس سے بھی نہیں گھبراتی۔ میں اس شہر سے کہیں اور جا سکتی ہوں۔ صرف چند دن کی بات ہے کہ میں کسی بڑے شہر سے یہاں آ کر ٹھہری ہوں۔ جس کا نام تو مجھے بالکل یاد نہیں۔ اب پانچ بجا چاہتے ہیں۔ شاید تمہیں نیند ستا رہی ہے۔ ایک جام اور پیو۔

اجنبی:۔ تم بولتے بولتے تھک گئی ہو۔ اگر مناسب سمجھو تو ایک جام پی لو۔

رقاصہ:۔ ہاں پیاس بہت شدت سے محسوس ہو رہی ہے اور مجھے آج رات دو گھنٹہ رقص بھی تو کرنا ہے۔

(صراحی سے شراب انڈیل کر یکے بعد دیگرے دو جام پیتی ہے)

(ادا سے اجنبی کو جام پیش کرتی ہے) تم بھی پیو اجنبی۔

اجنبی:۔ اس کمرے کا تمام ماحول مدہوش کن ہے۔ میرا ہر سانس شراب کی خوشبو سے معمور ہے۔ اب میں اور زیادہ نہیں پیونگا۔

رقاصہ:۔ اب میری رات ہونے والی ہے اور سیاہ نقاب سے آفتاب نمودار ہوگا۔

اجنبی:۔ شاید شراب پینے سے تم بہک رہی ہو۔ آفتاب نکلنے سے دن ہوتا ہے رات نہیں۔

رقاصہ:۔ رقاصہ کے رات اور دن میں بہت فرق ہے اجنبی۔

اجنبی:۔ اچھا رقاصہ تمہارا نام کیا ہے؟

رقاصہ:۔ شاید تم بہک رہے ہو۔ میرا نام پوچھنے کا تمہیں کیا حق حاصل ہے۔ اور میں تو اپنا نام بھی بھول گئی ہوں۔ دانشمندی اسی میں ہے کہ تم خاموش رہو تاکہ شراب کے سرور کو جذبات پر رنگ چڑھانے میں زیادہ وقت نہ لگے۔ خاموشی میں بہت سے فائدے ہیں۔ ہر خاموشی ایک راز ہوتی ہے اور ہر راز ایک اہمیت کا مالک ہوتا ہے۔ وہ دیکھو۔ وہ دیکھو۔ اجنبی تم دیکھ بھی نہیں سکتے۔

(آہستہ آہستہ رقاصہ پیر کو جنبش دے رہی ہے اور ساتھ ساتھ جھومتی جاتی ہے۔ اجنبی بہت غور سے اُس کی حرکات کو دیکھ رہا ہے پھر رقاصہ تیزی سے قالین سے اُٹھتی ہے اور رقص کرنے لگتی ہے۔ رقص اجنبی کو مدہوش کر رہا ہے۔ گھنگھرو کی آواز آئینوں اور دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر اجنبی کے دل و دماغ پر سرود بکھیر رہی ہے۔ آئینوں میں کتنی ہی عورتیں رقص کر رہی ہیں۔ ہر آئینہ میں ایک رقاصہ موجود ہے۔ اجنبی کی آنکھوں میں تمام رقص سمٹ کر آ گیا ہے۔ رقاصہ محو ہے جیسے بانسری کی آواز پانی پر تیر رہی ہو۔ وہ ماحول پر چھائی ہوئی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حسن کو بکھیر بکھیر کر سمیٹ رہا ہے۔ وہ ناچتی رہتی ہے اور تمام ماحول پر مسلط ہو جاتی ہے گھڑیال نے کہیں دُور ۶ بجائے اور اجنبی نے جذبات سے بیتاب ہو کر رقاصہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔)

اجنبی:۔ بس کرو رقاصہ۔ تمہارے رقص میں جادو ہے۔ کاش میں تمہیں اپنا کہہ سکتا۔ تم تھک کر چور ہو گئی ہو چند لمحے میرے پہلو میں بیٹھ کر آرام کر لو۔ رقاصہ (رقاصہ ہاتھ چھڑاتی ہے اور قالین پر گر پڑتی ہے)

رقاصہ:۔ اجنبی تم میرے کمرے سے اسی وقت نکل جاؤ۔ تم نے میری توہین کی ہے۔ تم نے وقت سے پہلے مجھے نیند سے چونکا دیا ہے میرا رقص ادھورا رہ گیا ہے میرا خواب بیچ میں ٹوٹ گیا ہے۔ کون سمجھ سکتا ہے میں نے کیا کھو دیا ہے یہ میرے رقص کی توہین ہے اگر تم میں رقص کی تاب نہیں رہی تھی تو تم باہر جا سکتے تھے۔ تم فوراً چلے جاؤ اجنبی۔ تم نے میرے رقص کے شباب کو ضعیف کر دیا ہے۔ ایک نامکمل رقص میری رگ و پے میں نشتر بن کر کھٹک رہا ہے۔ شراب کا سرود باغی بن کر دماغ میں جلن پیدا کر رہا ہے۔ اجنبی تم فوراً چلے جاؤ (اجنبی قالین سے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے) مجھے اپنے وجود سے صرف اپنے رقص کی وجہ سے محبت ہے۔ تم نے میرا ہاتھ پکڑا ہے یہ تم نے مجھے اُس حالت میں مس کیا جب میرا شباب اور رقص دونوں رقص کر رہے تھے تم جسے تعریف سمجھتے ہو۔ وہی میری توہین ہے۔ اجنبی تم فوراً چلے جاؤ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ کیا سوچ رہے ہو۔ اب تم اک لمحہ بھی یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔

اجنبی:۔ رقاصہ مجھے معاف کر دو۔

رقاصہ:۔ میں معاف نہیں کر سکتی میرا رقص تمہیں معاف نہیں کر سکتا۔ تم نے مجھے مس کیا ہے۔ میں تم سے انتقام لے سکتی ہوں بہتر ہے کہ تم چلے جاؤ۔ تم میرے مہمان تھے ورنہ۔ ورنہ بس بہتر ہے کہ تم چلے جاؤ اجنبی۔

اجنبی:۔ (قدم دروازے کی طرف بڑھاتے ہوئے) اچھا رقاصہ مہمان نوازی کا بہت بہت شکریہ۔ اچھا ہوتا اگر چند ساعت کی اور اجازت مل جاتی۔

رقاصہ:۔ یہ ناممکن ہے۔ تم نے مجھے قتل کر دیا ہے۔ تم یہاں سے فرار ہو جاؤ۔ ورنہ تم گرفت میں آ سکتے ہو

(اجنبی آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھتا ہے) جلدی کرو اجنبی۔

اجنبی:۔ (دروازہ کھولتے ہوئے) اچھا رقاصہ تمہارا بہت بہت شکریہ۔

(رقاصہ جلدی سے چٹخنی چڑھا دیتی ہے اور فرش پر گر پڑتی ہے)

رقاصہ:۔ اب میں کسی کے ساتھ سلوک نہیں کروں گی۔ اے میری زندگی کے شباب ہائے میرے شباب کی مستی ہائے شراب سرود

([illegible])

عبدالمتین عارف

مآل

مدتوں دکھ سہے، بجا لیکن،
دیکھ کتنا حسیں ہے اپنا مآل،
گنگنا، گنگنا کہ آج کی رات،
بخش دے گی ہمیں جنوں کا کمال،

ڈھل گئے زندگی کے چہرے سے،
سرد کجلاہٹوں کے گہرے نقوش،
مسکرانے لگی جبینِ حیات،
دب گیا آفتوں کا بڑھتا خروش،

کائنات ایک لرزشِ پیہم،
عالم اک دلنواز افسانہ،
خاک صد رشکِ محفلِ پرویز،
آسماں جم کا رقصِ پیمانہ،

کوہساروں پہ، سبزہ زاروں پر،
حسن پھر کروٹیں بدلنے لگا،
ذرّے ذرّے کی سجدہ گاہوں پر،
عشق پھر بے طرح مچلنے لگا!

چھن چھنا چھن کی دل نشیں آواز،
تیری پائل سے مجھ کو آنے لگی،
میرا احساس جھلملا اُٹھا،
زیست چھناکا بن کے گانے لگی،

دیکھ پیراہنِ فلک کا جمال،
اپنی رفعت سے شرمسار ہوا،
تیرے قدموں کو چومنے کیلئے،
قلبِ آفاق بے قرار ہوا،

کتنی رعنائیاں جلو میں لئے،
راہ پیما ہوا ہے ماہِ تمام،
دیکھ کر جس کو یاد آئے گا،
مجھ کو تیرا فسوں طرازِ خرام،

کہکشاں یوں خمار آگیں ہے،
جیسے تیری حسین انگڑائی،
اس طرح سرخ ہے رُخِ مریخ،
جیسے تو بات کرتے شرمائی،

ایک مدت کے بعد پھر مجھ کو،
مسکراہٹ نے گدگدایا ہے،
مسکرا مسکرا کے ہر ذرّہ،
میرے ہمراہ مسکرایا ہے!

میری محبوب یادِ ماضی سے،
حال کی راحتیں تباہ نہ کر،
بے کفن لاش ہے گذشتہ ما،
بے کفن لاش پر نگاہ نہ کر،

دیکھ اِن نو شگفتہ پھولوں کو،
میرے ہمراہ مسکراتے ہوئے،
دیکھ اِن سیم رنگ لہروں کو،
میرے ہمراہ گنگناتے ہوئے،

مدتوں دکھ سہے، بجا لیکن،
دیکھ کتنا حسین ہے اپنا مآل،
گنگنا، گنگنا کہ آج کی رات،
بخش دے گی ہمیں جنوں کا کمال،

تپش تسفائی

غزل

نہ جانے دل ویراں سے افق پر کس کے غازہ
کہ اک شام حسیں کی یاد پھر سے ہو گئی تازہ

شب فرقت وہ میرے اَن گنت آنسو معاذ اللہ
کوئی کرتا بھی کیا بکھرے ہوئے تاروں کا اندازہ

مری آہوں کے پس منظر سے آنکھیں پھیرنے والے
ہوا کے رخ سے ہوا کرتا ہے طوفانوں کا اندازہ

شب غم کٹ گئی لیکن یہ کیا اندھیر ہی یا رب
موذن نے کسا ہے میری مجبوری پہ آوازہ

تنزل اپنی وہ رہیں۔ ہاں کچھ ایسا یاد پڑتا ہے
کسی نے کھٹکھٹایا تھا کسی کے دل کا دروازہ

تصحیح

ایڈیٹر صاحب ساقی "تنہائی" کے مصرع میں دو لفظ بدلنا چاہتا ہوں لفظ "لعنت" کی عمل کو ساکن کیا گیا تھا تاکہ متکلم کردار کا تلفظ متعین ہو لیکن اس ایک مثال سے یہ خصوصیت واضح نہیں ہوتی اور اس نظم کا پیمانہ اتنا وسیع نہیں کہ متعدد مثالیں دی جائیں۔ ڈر تھا کہ یہ ضمنی خصوصیت بنیادی حیثیت اختیار نہ کرلے۔ اس لئے "لعنت ہیں" کی جگہ "پہلے ہی" کر لیجئے۔ اب مصرع یوں ہو گا۔

لفظ تو پہلے ہی موجود ہیں لاشوں کی طرح

نیاز مند
تاثیر

اِنقلاب آرہا ہے

بین الاقوامی سیاست کو سمجھنے کیلئے اور موجودہ دور کے پیچیدہ مسائل کے فہم و ادراک کیلئے کافی سیاسی مطالعے کی ضرورت ہے۔

مشہور سیاسی رسالہ

"نئی زندگی"

ہی اردو کا واحد ماہنامہ ہے جو محض سیاسیات پر بحث کرتا ہے اور ملکی اور بین الاقوامی مسائل پر مقتدر رہنماؤں کے پر از معلومات مضامین ہر مہینے "نئی زندگی" ہی میں شائع ہوتے ہیں۔ معہ متعدد فوٹو بلاک۔

چندہ سالانہ ششماہی۔ ممالک غیر سے۔ نمونے کے لئے
تین روپے آٹھ آنہ۔ نو شلنگ (۱۲ شلنگ) ۸ کے ٹکٹ بھیجکر طلب فرمائیے۔

نئی کتاب
وزارتی مشن

ادارہ "نئی زندگی" نے بڑی جانفشانی سے وزارتی مشن سے متعلق تمام مواد جمع کرکے یہ دلچسپ کتاب مرتب کی ہے تمام پیچیدہ مسائل پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے یہ کتب گویا ہندوستان کی گذشتہ پنج سالہ سیاسات کا نچوڑ ہے۔

۵۰ فوٹو بلاک ضخامت ۲۲۵ صفحات؛
قیمت دو روپے آٹھ آنہ (۲؍۸)
محصول ڈاک ۶؍ علاوہ

مستقل خریدار بن جائیے؛
ملنے کا پتہ:-
منیجر رسالہ نئی زندگی، الہ آباد

نئے ادب کی حقیقت (بقیہ سلسلہ صفحہ ۴۵)

آرزو کا پورا زمانہ لگا رہا تھا ورڈس ورتھ کے فن کی بھی تیاریاں کافی عرصہ سے ہوتی رہی تھیں۔ یاؤنڈ اور ایلیٹ بھی "امیجسٹ" تحریک کی پیداوار ہیں۔ ہمارا نیا ادب کسی بڑے آنے والے شاعر کے لئے تیاریاں کر رہا ہے۔ یہ کافی تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور "ساقی" و "ادبِ لطیف" کے سالناموں سے پتہ لگتا ہے کہ یہ کس پایہ پر پہنچ گیا ہے۔ اس میں بچپن کی بدتمیزیاں دُور ہوتی جا رہی ہیں اور توازن و سنجیدگی آتی جا رہی ہے اب ضرورت ایسی ہستی کی ہے جو نئے اصولوں کو پُرانے کی روشنی میں پختہ کر کے ایک نئی دُنیا آباد کر دے۔ ایسی ہستی آ کر رہے گی۔ نیا ادب آنے والے روزِ روشن کی نمود ہے ؎

ساحلِ بحر پہ رنگِ شفقِ عنابی ہے ۔ یہ نکلتے ہوئے سورج کی اُفق تابی ہے

محبّت کے تار (بقیہ سلسلہ صفحہ ۴۰)

چھین لیا ہے۔ میں اس کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہوں، اور وہ غرور و نخوت کی دیوی میری طرف رُخ دیکر مجھ سے بات بھی نہیں کرتی۔ خدا کے لئے اس سنگ دل کو موم کی طرح نرم کرنے کے لئے کوئی معقول تدبیر بتاؤ۔"

میں اس دوران میں انکھیوں سے دو تین بار اس کی طرف دیکھتا رہا مگر وہ میری طرف سے بالکل خالی الذہن ہو کر اپنے کام میں مشغول رہی۔ میں نے تار کا مضمون ختم کر کے اسے فارم دیدیا اور اُجرت دریافت کی۔ اس نے اس قدر طویل مضمون پر ذرا تعجب کی نظر ڈالی، شروع سے آخر تک اسے پڑھا اور حسبِ دستور الفاظ گن کر مجھ سے اکتیس ۳۱ روپے آٹھ آنے مانگ لئے۔

میں حیران رہ گیا۔

"آخر کس حساب سے؟" میں نے دریافت کیا۔

"آٹھ آنے فی لفظ"۔ اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"آٹھ آنے فی لفظ"۔ میں اظہارِ تعجب کرتے ہوئے مُسکرایا۔

وہ پھر بے حس رہی۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی جذبہ اپنی جھلک نہیں دکھا رہا تھا۔ میں نے بٹوہ کھول کر سو روپے کا نوٹ نکالا اور اُس کے حوالے کر دیا۔ اس نے نوٹ اپنی جیب میں رکھا اور تار کا فارم پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔

میں نے ہنس کر کہا "اور اس تار کی رسید؟"

"کل ملے گی"۔ اُس نے بدستور سنجیدگی سے جواب دیا۔

میں دل ہی دل میں خوش ہوا کہ اس نے رمزیہ انداز میں کل ملاقات کا وعدہ کر لیا ہے۔ چنانچہ ایک درمیانی رات ہوٹل میں بڑی بے چینی سے گذری اور دوسرے دن میں ضرورت سے زیادہ بن ٹھن کر تار گھر کی طرف روانہ ہوا۔ میں نے سوچا کہ اگر وہ آمادہ ہو جائے تو آج ہی چھٹی دلوا کر اسے اپنے ساتھ لے چلونگا۔ ورنہ بصورتِ مجبوری خود بغیر تنخواہ کی چھٹی اپنے دفتر سے لونگا۔ لیکن جب کھڑکی کے قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ موجود نہیں ہے۔ اُس کی جگہ ایک سردار جی کُرسی پر بیٹھے کام کر رہے ہیں۔

ان سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ دس دن کی چھٹی لے کر گذشتہ شام کی گاڑی سے اپنے وطن چلی گئی ہے۔

پُتلوں کا کھیل (بقیہ سلسلہ صفحہ ۴۵)

ہم تینوں کی آنکھیں ایک ساتھ اُٹھ گئیں۔ دھوئیں کے گالوں میں ہماری شکلیں چھپ گئی تھیں۔ پوری عمارت جیسے جادو کا محل۔ اڑا اڑا دھم۔ ہم پر آتشیں اور ہم تینوں اس کے نیچے دبے ہوئے چیخ رہے تھے "یہ دھرتی جادو کی ہے۔ یہ آکاش جادو کا۔ یہ محل جادو کا۔ یہ آئینہ بھی جادو کا۔ ہم تینوں جادو کے پتلے — یہ سب پُتلوں کا کھیل!"

"رقاصہ" (بقیہ سلسلہ صفحہ ۵)

اے میرے رقص مجھے معاف کر دے میں معافی چاہتی ہوں۔ میں اُس وقت جبکہ تو مجھ سے بغلگیر ہو رہا تھا۔ عین اُس وقت جبکہ تو اور میں ہونٹ سے ہونٹ ملاتے شراب کو جگا رہے تھے ایک ناسمجھ انسان نے تجھے اور مجھے الگ الگ کر دیا۔ معاف کر دے۔ اے رقص تجھے اپنی رقاصہ کی قسم۔ اے رقص تجھے اپنے سرود کی قسم۔ اے رقص۔ اے میری کائنات معاف کر دے۔ اے رقص۔ اے رقص (وہ بیہوش ہو جاتی ہے۔ آفتاب کی کرنیں روشندان سے گذر کر رقاصہ پر رقص کر رہی ہیں۔ رقاصہ کے پہلو میں خالی صراحی اوندھی پڑی ہے)

(پردہ)

شاہد احمد

یہ آل انڈیا ریڈیو ہے

آل انڈیا ریڈیو حکومت کا ایسا واحد ادارہ ہے جس میں معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کو کوئی دخل نہیں ہے۔ حکومت کو غالباً اس سے کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی پروا ہے۔ اس محکمے کی خرابیاں اور بدعنوانیاں آئے دن اخبارات میں طشت از بام کی جاتی ہیں لیکن حکومت نے ان کی طرف سے اپنا ایک کان بہرا اور ایک کان گونگا کر لیا ہے، پبلک مطالبات کو یوں نظرانداز کرنا ایک نہایت غیر ذمہ دارانہ فعل ہے اور ثبوت ہے افسرانِ بالا کی افسوسناک نااہلیت کا۔ ہماری رائے میں یہ سب خرابیاں اس لئے قائم ہیں کہ اب تک کوئی آنریبل ممبر یا محکمہ کا سکریٹری ایسا شخص متعین نہیں کیا گیا جو اس سرکاری محکمے کو غیر سرکاری کارروائیوں سے پاک کرنے کی کوشش کرتا۔ انگریز بو ہیں ہماری ملکی ضروریات اور ریڈیو کی سازشوں کو سمجھ ہی نہیں سکتا، ہندوستانی صاحب لوگوں کے بھی بس کی یہ بات نہیں۔ چنانچہ ایک مسٹر اکبر حیدری آئے اور وہ کچھ نہ کر سکے۔ ان کے بعد مسٹر سلطان احمد آئے اور بہت پھنپھنائے مگر وہ بھی راگ میں آ گئے۔ اب دوسرے مسٹر اکبر حیدری آئے ہوئے ہیں اور ماشاءاللہ اپنے والدِ مرحوم کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ خیر مارا چہ ازیں قصہ؟ کوئی صاحب بھی تشریف لائیں۔ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ ایک تحقیقاتی کمیشن اس کروڑوں روپے سالانہ کی آمدنی و خرچ کے محکمے پر بٹھایا جائے اور معلوم کیا جائے کہ ۱۹۳۶ء سے اب تک اس محکمے نے کیا اُجالا کیا ہے اور اس کا موجودہ طریقِ کار کیا ہے؟ یہاں ملازمتیں کیسے دی جاتی ہیں اور کیسے دی جاتی ہیں؟ یہاں ترقی دینے کا کیا معیار ہے؟ اس محکمے میں نالائق بنانے کی کیا ترکیب ہے؟ کس پرسی کی وجہ سے یہاں حق تلفیاں کس طرح کی جاتی ہیں؟ کس طرح مسلمانوں سے اُردو کو اور ہندوؤں سے ہندی کو حلال کرایا جاتا ہے؟ کس طرح ایک نقلی "ہندوستانی" زبان کو رواج دینے کے لئے اُردو اور ہندی دونوں کو برباد کیا جا رہا ہے؟ ریڈیو کی پالیسی سے اختلاف رکھنے والی بڑی بڑی ذمہ دار پبلک ہستیوں کو کس طرح سیاہ فہرست میں درج کیا جاتا ہے؟ دو آنے اور چار آنے فی غزل معاوضہ دے کر کس طرح شاعروں کی توہین کی جاتی ہے؟ یہاں کے ملازمین کو یہ ہدایت کیوں دی گئی ہے کہ تعریف کبھی کسی کی نہ کریں بلکہ خواہ مخواہ کوئی نقص تلاش کریں؟ آرٹسٹ کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آنے کو ہنر کیوں سمجھا جاتا ہے؟ ہر سرکاری دفتر کے معمولی سے معمولی کلرک کے لئے بھی کوارٹر کا انتظام کیا جاتا ہے، ریڈیو کے ملازمین کے لئے رہائش کا انتظام کیوں نہیں کیا جاتا؟ کسی سرکاری دفتر میں چھ گھنٹے سے زیادہ کام نہیں لیا جاتا اور اگر لیا جاتا ہے تو اس کی علیحدہ اُجرت دی جاتی ہے، ریڈیو کے محکمے میں بارہ بارہ گھنٹے کام کیوں لیا جاتا ہے؟ اور اگر یہ ناگزیر ہے تو اس کی اُجرت کیوں نہیں دی جاتی؟ ادیبوں کو وہی معاوضے کیوں دیئے جا رہے ہیں جو اب سے دس سال پہلے دیئے جاتے تھے؟ یہ اور اس قسم کے بیسیوں سوال ہر اُس شخص کے ذہن میں آتے ہیں جس کا ذرا سا بھی تعلق ریڈیو سے رہا ہو۔ اگر اندرونی حالات کی چھان بین کی جائے تو یقین ہے کہ تحقیقاتی کمیشن اپنے کام کو بہت دلچسپ پائے گا۔

لیجئے اس محکمے کا ایک تازہ ترین کارنامہ سُن لیجئے:۔

ریڈیو سُننے والے حضرات جانتے ہوں گے کہ سال ڈیڑھ سال ہوا اخباروں اور خود ریڈیو کے ذریعہ اعلان کیا جا رہا تھا کہ اچھی آوازوں والے اناؤنسرز کی ضرورت ہے جنہیں تنخواہ سات سو روپے تک دی جا سکتی ہے۔ غور فرمایئے کہ اس آسامی کے لئے کتنے اُمیدوار نہ آئے ہوں گے۔ ہمارا اندازہ بیس ہزار کا ہے کیونکہ یہ آل انڈیا مقابلہ تھا۔ اس مقابلے میں وہ منجھے منجھائے گھاگھ اناؤنسر بھی شریک ہوئے جو سالہا سال سے کام ہی یہی کر رہے ہیں۔ درخواستیں چھانٹی گئیں اور مختلف اسٹیشنوں پر ان ہزاروں اُمیدواروں میں سے سو دو سو اُمیدواروں کا ٹسٹ لیا گیا، انہیں سے ایک صاحب منتخب کئے گئے۔ یہ صوت سرمدی جو بیس ہزار آوازوں میں سے انتخاب کی گئی ہے آپ روزانہ کسی وقت کی خبروں میں سُن سکتے ہیں۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ یہ نہ تو مردانہ آواز ہے اور نہ زنانہ بلکہ دونوں۔ اس میں کچھ وہ رقت پائی جاتی ہے جو جسمانی صعوبت کے ساتھ ساتھ روحانی کرب کا بھی پتہ دیتی ہے اور سُننے والوں کو بے شباتیِ عالم یاد دلاتی ہے اور آل انڈیا ریڈیو کے سامنے ہندوستانی اناؤنسر حیران ہیں کہ آخر ہم کہاں کھڑے ہیں اور وہ سات سو روپے کہاں گئے؟"

ظالم محبّت

محبّت کی چوٹ کتنی ظالم ہوتی ہے؟ یہ آپ

طُغیان

میں ملاحظہ فرمائیے، جو بنگال کے شعلہ بداماں ادیب، قاضی نذرالاسلام کے دلاویز افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ افسانے اُردو میں پہلی بار پیش کئے جا رہے ہیں اور ان کا ترجمہ مشہور انشا پرداز محمد یونس احمر نے براہِ راست بنگلہ زبان سے کیا ہے۔

یہ افسانے اُس "باغی شاعر" کے قلم سے ہیں جو سچی بات کہنے سے کبھی نہیں جھجکتا۔ جو کچھ اُس کے دل میں آتا ہے، بغیر کسی تصنع یا ہچکچاہٹ کے بَرملا کہہ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِس کی متعدد کتابیں ضبط ہو چکی ہیں اور اُسے کئی بار جیل خانے جانا پڑا۔ ظاہر ہے کہ ایسا بے باک مُصنّف جب محبت کے قصّے سُنائے تو وہ کتنے پُرتاثیر، کتنے دلآویز اور کتنے سچے ہونگے!

اِن افسانوں کی چند ایسی خصوصیات ہیں جو انہیں ہندوستان کے دیگر افسانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ مثلاً ان میں ہمیں عشق کی کامرانیوں اور حسرت نصیبوں کے نہایت روشن مُرقعے ملتے ہیں۔ زندگی کی تمام رنگینیوں اور تلخیوں کی اصلی تصویریں ملتی ہیں۔ غریبی اور غلامی کے دل ہلا دینے والے مناظر ملتے ہیں جو شرافت اور آزادی کے نام پر سرفروشی کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ للکاریں ملتی ہیں جو سوئے ہوئے شیروں کو جگاتی ہیں۔ وہ فریادیں سُنائی دیتی ہیں جو دل و دماغ کو برماتی ہیں۔

طُغیان کا دیباچہ، صادق الخیری، ایم۔ اے دہلوی نے لکھا ہے، جس میں وہ ایک جگہ کہتے ہیں "طُغیان گویا قلزمِ عشق ہے جس کی ایک ایک بوند میں بے پناہ جذبات اور عزائم کروٹیں لے رہے ہیں۔ تیغ و سناں کی جھنکاروں کے ساتھ ساتھ روح پرور گیتوں کا آبشار گرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"

بہترین کتابت طباعت۔ عمدہ کاغذ۔ مضبوط جلد اور نہایت خوشنما گرد پوش۔ قیمت عہ/

نیز اُردو کی ہر کتاب خواہ وہ کہیں چھپی ہو بکفایت اور بہ عجلت منگانے کا پتہ:-

خاتون کتاب گھر، اُردو بازار، دہلی،

نقاشِ فطرت حضرت ایم۔ اسلم کے تازہ ترین شاہکار ناول

آخری رات

کا حسین و جمیل مصوّر ایڈیشن ٹری آب و تاب کے ساتھ شائع ہو گیا جن حضرات نے میاں ایم۔ اسلم کے ہنگامہ خیز ناول "تمسنہ" کا مطالعہ فرمایا ہے وہ اس معرکتہ الآرا ناول "آخری رات" کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

آخری رات موجودہ اور حد سے بڑھی ہوئی فیشن پرست سوسائٹی پر ایک خوفناک ضرب ہے اس ناول کا ہیرو ایک مالدار تعلیم یافتہ نوجوان ہے جو اپنی نئی دُلہن کا پردہ اُٹھوا کر اس کا تعارف اپنے احباب سے کراتا ہے اور کلب میں اپنے ہمراہ لے جاتا ہے۔ بیوی نوخیز اور شوخ و شنگ کا فرادا حسینہ بہت جلد کلب کی روحِ رواں بن جاتی ہے۔ ایسے غلط ماحول میں رہ کر اس کا پاک دامن رہنا ناممکن تھا۔ اس لئے وہ ایک شریف بدمعاش کے جنگل میں پھنس جاتی ہے۔

اِس مغرب زدہ ماحول میں زندگی بسر کرنے کا خوفناک انجام دیکھنے کے لئے اِس انتہائی دلچسپ اور عبرت انگیز ناول کو پڑھئے۔

آخری رات اس قدر دلچسپ ہے کہ آپ ایک ہی نظر میں اسکے مطالعہ پر مجبور ہو نگے۔

آخری رات ہزاروں واعظوں کی پُر اثر تقریروں سے زیادہ پُر تاثیر ہے۔

آخری رات مخالفین پردہ کا دندان شکن جواب ہے۔

آخری رات میں اسلامی معاشرت و تمدّن کے مخالفین کی حالتِ زار کی سچّی تصویر پیش کی گئی ہے۔

آخری رات کی تحریر ہندوستان کے چوٹی کے نقادوں کی نظر میں ادبِ عالیہ کا درجہ رکھتی ہے۔

آخری رات کے گرد پوش ابری اور اندرونی دلاویز تصاویر ہندوستان کے دو نامور مصوّروں کی موقلم کا نتیجہ ہیں

پہلی فرصت میں اس تحفۂ روزگار ناول کیلئے براہِ راست ذیل کے پتہ پر آرڈر دیجئے ورنہ آئندہ ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ مجلد معہ رنگین و دلکش گرد پوش قیمت صرف چار روپے (للعٰہ)

حضرت ایم۔ اسلم کی دیگر تصانیف۔ رام کلی ۲/- ۔ شام غریباں ۳/- ۔ شمیمہ ۵/- ۔ رقص بہار ۲/۸ ۔ حسن سوگوار ۳/- ۔ بیتی باتیں ۳/- ۔ رین نظارے ۲/۸
ہیر رانجھا ۲/- ۔ قاتل ۲/۸ ۔ خط کا جواب ۲/۸ ۔ طلسم سامری ۱/۱۲ ۔ شام و سحر ۵/- ۔ جام شکستہ ۳/- ۔ بادۂ گل رنگ ۲/۱۲ ۔

مِلنے کا پتہ:۔ مینیجر دار البلاغ نمبر ۵ محمد نگر۔ میو روڈ۔ لاہور

ادارۂ ساقی

نقد و تبصرہ

شامِ غریباں اور رام کلی:- اُردو پڑھنے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو حضرت ایم۔ اسلم کے نام سے واقف نہ ہو اور جس نے دو چار دس بیس کتابیں ان کی نہ پڑھی ہوں۔ اسلم صاحب پچیس۲۵ سال سے علمی و ادبی مضامین ملک کے مشہور رسالوں میں لکھ رہے ہیں۔ ان کے علاوہ سَو سے اوپر ان کی مختلف النوع تصانیف بھی شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ اسلم صاحب نے مذہب، اخلاق، تمدّن، معاشرت سب پر یکساں کامیابی سے قلم اُٹھایا ہے لیکن انہیں سب سے زیادہ مقبولیت افسانہ نویسی اور ناول نگاری میں حاصل ہوئی ہے۔ منشی پریم چند نے افسانوی ادب میں بہت شہرت پائی لیکن اسلم صاحب ہر دلعزیزی میں منشی جی سے بہت آگے بڑھ گئے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلم صاحب کو اُردو سے عشق ہے اور داستان طرازی ان کا واحد مشغلہ ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کی کتابیں ہر عمر اور ہر ذوق کے پڑھنے والوں کو پسند آتی ہیں۔ ایک تو پبلک کا ذوق و شوق اور قدر دانی، دوسرے پبلشر کی انتھک اور نت نئی کوششیں، اسلم صاحب تقریباً ہر مہینے ہمارے لئے ایک دلکش کتاب لکھ دیتے ہیں۔ اللھم زد فزد۔ انکے پبلشر جناب خواجہ بدالاسلام فرنگی یوں تو ایک پُرانے کام کرنے والے ہیں لیکن دو ڈیڑھ سال سے انہوں نے دارالبلاغ کو ایک جدید ترین پبلشنگ ہاؤس بنا دیا ہے۔ کتاب کو اچھی طرح شائع کرنا بھی ایک ہُنر ہے اور خواجہ صاحب نے اس ہُنر کا بہت اچھا عملی ثبوت اسلم صاحب کی کتابیں شائع کر کے دیا ہے۔ ان کی بیشتر مطبوعات پر ہم تبصرہ کر چکے ہیں۔ آج دو نئی کتابوں کو متعارف کر رہے ہیں۔ پہلی کتاب "شامِ غریباں" ہے۔ یہ دُکھیاری زندگی کی ایک عبرتناک تصویر ہے۔ اسلم صاحب نے پست طبقے کی عکاسی ناول کے پیرایہ میں کی ہے اس لئے جو اصلاحی پہلو اختیار کیا گیا ہے وہ غیر محسوس طریقے پر پڑھنے والے کے ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مزدوروں کی زندگی کے دونوں رُخ پیش کر کے مصنّف نے ناول کی وقعت میں اضافہ اور معاشرت کے اس اُلجھے ہوئے مسئلہ کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ (۳۲۰) صفحے کا یہ ناول آجکل کے ناہموار زمانے میں ایک قابلِ قدر ادب پارہ ہے۔ اس کی قیمت سوا تین روپے ہے۔ دوسری کتاب "رام کلی" ہے۔ یہ بھی ایک ناول ہے جس میں ہندو معاشرت کے اچھے بُرے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سماجی ناول لکھنے میں اسلم صاحب کا اشہبِ قلم پوری جولانی دکھاتا ہے، چنانچہ اس ناول میں بھی بڑے پتے کی باتیں کہی گئی ہیں۔ یہ تقریباً (۳۰۰) صفحے کا ناول ہے اور اسکی قیمت تین روپے ہے۔

خواجہ صاحب اچھی کتاب کو اچھی طرح شائع کرنے کے قائل ہیں۔ چنانچہ یہ کتابیں بھی مجلد اور رنگین جلد پوش سے آراستہ ہیں۔ اس کے علاوہ جلد کے اندر کا رُخ اور اس کے سامنے کا صفحہ بھی ابری اور ایک تصویر سے آراستہ کیا گیا ہے۔ تصویر سے متعلق ایک ایک شعر بھی دیا گیا ہے جسے اصل کتاب کا نچوڑ سمجھنا چاہیئے۔ "شامِ غریباں" پر یہ شعر درج ہے ؎

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

اور "رام کلی" پر یہ ؎

دل لے رہے ہیں پروں سے نشیمن کو رات بھر
کیا کیا چلی ہیں تیز ہوائیں تمام رات

درج ہیں۔ ان اشعار سے ناول کا مقصد ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس جدّت پر خواجہ صاحب مستحقِ تحسین ہیں۔ یہ اُردو کی کتابوں کی خوش نصیبی ہے کہ دارالبلاغ جیسے ادارے ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ دارالبلاغ کا پتہ یہ ہے:-

محمد نگر۔ میو روڈ۔ لاہور

میراجی کی نظمیں۔ اُردو کے سب سے مشہور شاعر میراجی نے ایک ہزاروں نظمیں لکھی ہیں۔ یہ ساٹھ نظمیں اُن کا نچوڑ ہیں۔ قیمت عہ

شکست۔ ملک کے مشہور افسانہ نگار مسٹر کرشن چندر ایم۔ اے نے یہ ناول لکھا ہے۔ ناول کا پس منظر بہشت نظیر کشمیر ہے۔ کرشن چندر نے اس سرزمینِ حسن میں زندگی کے رومانی پھول کھلائے ہیں۔ قیمت ستے ر

ریزۂ مینا۔ اُردو کے بہترین پچاس افسانوں کا مجموعہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک ساقی میں سینکڑوں افسانے شائع ہوئے انہی منتخب افسانوں میں سے شاہد احمد دہلوی نے یہ پچاس افسانے انتخاب کئے ہیں۔ ضخامت (۵۵۰ صفحات) مجلد۔ جلد پوش سے آراستہ۔ قیمت پانچروپیہ (صہ)

پائل:۔ آتشیں نغموں کا شاعر سلام آنچھے نئے گیتوں کا تحفہ لایا ہے۔ گیت جو آگ سے زیادہ گرم اور شہد سے زیادہ میٹھے ہیں۔ قیمت عہ ۲/

دھنک: صادق الخیری ایم۔ اے کے افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت عہ

آدھی سے بھی کم قیمت پر

سالنامہ ساقی ۱۹۴۱ء کی کچھ کاپیاں ہمارے پاس برائے فروخت ہیں۔ اگر آپکو یا آپ کے کسی دوست کو سالنامہ کی ضرورت ہو تو ڈیڑھ روپیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمادیں۔ سالنامہ بذریعہ رجسٹری ارسال کردیا جائے گا۔

اِس سالنامہ کے متعلق صرف اتنا یاد دلانا ضروری ہے کہ اس (۳۲۰) صفحے کے پرچے میں ادبِ جدید کے بہترین نمونے شامل ہیں اور اس میں تقریباً سب مشہور اہلِ قلم شریک ہیں۔ ورنہ اس سالنامہ کی اصل قیمت تین روپے ہی مگر اب صرف عہ میں دیا جارہا ہے۔ چار آنے رجسٹری اور محصولڈاک کے شامل کرکے عہ کا منی آرڈر بھیجئے۔ یا عہ کا وی۔ پی طلب کیجئے۔

منیجر ساقی۔ دہلی۔

نسیم کی سرسراہٹ اور نغمہ کی گنگناہٹ اگر نظم کی حسین مرئی شکل میں دیکھنا ہو۔ شراب کی ترنگیں اور شباب کی اُمنگیں اگر شعر کی لطیف ترین صورت میں دیکھنا ہو تو اُردو زبان کے مقبول انام شاعر حضرت وفا براہی کا مجموعۂ غزلیات "نکہتِ گل" ملاحظہ فرمائیے جس میں نکہتِ گل نورِ شعر میں تحلیل ہو کر ایک دلپذیر شکل اختیار کرگئی ہے۔ اس مجموعہ کی ضخامت تقریباً ۴۴ صفحات، کتابت وطباعت دیدہ زیب۔ کاغذ چکنا۔ اس میں حضرت وفا کا فوٹو بھی شامل ہے۔ قیمت ایکروپیہ آٹھ آنے (عہ)

اس کے علاوہ

عنقریب ہی آپ کے کلام کے دوسرے مجموعے "سحرِ نظر" اور "لوٹتے وقت" شائع ہو کر اُردو ادب میں بیش بہا اضافہ کرنے والے ہیں۔

ملنے کا پتہ۔

پستک بھنڈار۔ لہریا سرائے اور پٹنہ۔

مطبوعاتِ ساقی بُک ڈپو دہلی

خانم:- عظیم بیگ چغتائی کی بہترین تصنیف ہے اس دلچسپ اور دلربں کتاب کا ہر ایک باب ایک چمکتا ہوا مزاحیہ افسانہ ہے۔ ہر افسانہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔ قیمت للعہ۔

کولتار:- اس کتاب میں پندرہ انتہا سے زیادہ دلچسپ اور مزاحیہ افسانے ہیں۔ اور یہ سب افسانے مل کر کتاب کو پورا مزاحیہ ناول بنا دیتے ہیں۔ قیمت عہ۔

روحِ ظرافت:- چغتائی صاحب کے آٹھ دلکش افسانوں کا مجموعہ۔ پہلا افسانہ "انگوٹھی کی مصیبت" ہے۔ قیمت عہ۔

روحِ لطافت:- چغتائی صاحب کے آٹھ چیدہ چیدہ افسانوں کا مجموعہ۔ پہلا افسانہ "مہارانی کا خواب" ہے۔ قیمت عہ۔

پُل بُوٹا:- حسن و عشق کی عجیب غریب داستان۔ ایک جوتے کی وجہ سے کیا ہوا؟ قیمت عہ۔

شریر بیوی:- چغتائی صاحب کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ مقبول مزاحیہ ناول۔ قیمت عہ۔

کمزوری:- "اے عورت تیرا نام کمزوری ہے" اس مقولے پر ایک بڑی حیرتناک داستان۔ قیمت عہ۔

مسز کمر نا ھلے:- یہ ناول ایک عبرتناک داستانِ محبت ہے۔ قیمت عہ۔

آدم خور:- کیا آج کل بھی آدم خوری ہوتی ہے۔ اور آدمی کو آدمی مار کر کھا جاتا ہے۔ قیمت عہ۔

چمکی:- عورت کی فطرت، جان جاتے پر آن نہ جانے غیرت و شرافت کی منہ بولتی تصویر "چمکی" میں دیکھئے۔ قیمت عہ۔

جھینی کی انگوٹھی:- یہ ایک نوجوان اور خوبصورت بیوہ کی انتہا سے زیادہ دلچسپ داستان ہے۔ قیمت عہ۔

ملفوظاتِ حاجی:- ایک کتے کی خود نوشت سوانح عمری۔ قیمت ۱۲ا۔

مضامینِ چغتائی:- اس میں ۲۳ مضمون اور افسانے شامل ہیں۔ قیمت عہ۔

سلامبو:- فلابیر کا شہپارہ، تاریخ و رومان کا حسین مرقع جس میں کئی ہزار سال پہلے کی تہذیب پیش کی گئی ہے۔ قیمت للعہ۔

نجم السحر:- پانچ ہزار سال پہلے کے مصر کی تہذیب، تمدن و معاشرت کا کوئی پہلو مصنف کی نظر سے نہیں بچا ہے۔ قیمت تین روپے۔

تائیس:- اناطول فرانس کا شہپارہ، حیرتناک داستان ہے۔ قیمت عہ۔

ہیرودیاس:- فلابیر کا نایاب افسانہ، سلومی کا رقص موت کا رقص تھا۔ قیمت عہ۔

نرگس:- یہ ایک ناول ہے جس میں ایک طوائف کی درد ناک و عبرت انگیز زندگی کے حالات پیش کئے گئے ہیں۔ نہایت غم ناک کہانی ہے۔ قیمت عہ۔

گنہگار:- ادیبِ شہیر حضرت ایم۔ اسلم کے سات جدید افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت عہ۔

کلیاں:- عصمت چغتائی کے سولہ مضامین کا مجموعہ، جو نہایت دلکش اور حد درجہ مؤثر ہے۔ قیمت تین روپے۔

ستاروں کے کھیل:- اشک نے انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ یہ ناول اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتا ہے۔ قیمت عہ۔

قفس:- اشک کے بارہ منتخب افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت عہ۔

گذرگاہِ خیال:- ظفر قریشی دہلوی کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت عہ۔

فرعون:- یہ جلیل القدر شہنشاہ جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا مصر کی ایک حسینہ پر عاشق تھا اسکی داستان ایک عجیب رومانی کہانی ہے۔ قیمت عہ۔

سالنامہ "آجکل" دہلی

یکم جون ۱۹۴۶ء کا پرچہ رسالہ "آجکل" کا سالنامہ ہے۔ اس میں سات تاریخی، چھ تنقیدی اور دو اقتصادی مضامین ہیں۔ انکے علاوہ ایک ڈرامہ، چھ افسانے اور چھتیس منظومات شریک ہیں۔ تنوع کے اعتبار سے یہ سالنامہ ایک بوقلموں ادبی مُرقع ہے جو ہندوستان میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا۔ لکھنے والوں میں بیشتر جلیل القدر اہل قلم شامل ہیں۔ تین مضمون بطورِ خاص مطالعہ کے قابل ہیں۔

(۱) پرندوں کے احسانات اُردو ادب پر (۲) پتلیاں ممالکِ مغرب میں۔ (۳) صاحبزادی تسنیم کا افسانہ۔ یہ تینوں مضمون اچھوتے موضوعات پر لکھے گئے ہیں اور پڑھنے والے کی معلومات میں بیش قیمت اضافہ کرتے ہیں۔

افسانوی حصہ بہت دلچسپ ہے لیکن اُردو کے موجودہ ترقی یافتہ دَور میں "آجکل" کا معیارِ انتخاب اگر نسبتاً بلند تر ہو تو بہتر۔ حصہ نظم کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ مضامینِ نظم ونثر کے علاوہ چودہ صفحے کی تصاویر بھی پیش کی گئی ہیں اور ایک سہ رنگی تصویر فلم ایکٹرس نسیم کی الگ سے رکھدی گئی ہے تاکہ اگر آپ کا جی چاہے تو اسے فریم کرالیں۔ سب سے بڑی خوبی اس سالنامہ کی یہ ہے کہ ۱۴۴ صفحے کا یہ بھاری بھرکم خاص نمبر صرف بارہ آنے میں دیا جا رہا ہے۔ یقین ہے کہ یہ سالنامہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ ادارہ "آجکل" اس کامیاب پیشکش پر مستحق مبارکباد ہے۔

موت سے پہلے:- پروفیسر احمد علی انگریزی اور اُردو دونوں کے مشہور ادیب ہیں۔ انکی ایک نئی کتاب "موت سے پہلے" اب شائع ہوئی ہے۔ اس میں دو مضمون ہیں۔ پہلا ایک افسانہ ہے جس کے عنوان پر کتاب کا نام رکھا گیا ہے۔ یہ ایک عجیب وغریب افسانہ ہے جو اپنی ہیئت کے اعتبار سے اُردو میں بالکل اچھوتا ہے۔ افسانہ نگار کا تخیل حیرت واسرار کے تہ در تہ لگا کر اُٹھا ہے۔ طرزِ بیان بہت موثر ہے اور احمد علی کے اسٹائل کی خصوصیات کا حامل۔ دوسرا مضمون ہے "آرٹ، سیاست اور زندگی"۔ یہ بطور پس لفظ کے شائع کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں ان تینوں کی خصوصیات پر بحث کی گئی ہے اور جو تنقیدی نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے وہ بہت قابلِ قدر ہے۔ کتاب کی ضخامت (۷۲) صفحے ہے۔ قیمت دو روپے۔

ملنے کا پتہ:- انشا پریس کوچہ پنڈت ۔ دہلی

ن۔م۔ راشد پر:- حیات اللہ انصاری ایک اچھے افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ مگر اس کتاب کو دیکھنے کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے نقاد بھی ہیں۔ ن۔م۔ راشد اُردو میں غیر مقفیٰ اور آزاد شاعری کے امام ہیں۔ ان کا منتخب مجموعہ کلام عرصہ ہوا ماورا کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ حیات اللہ انصاری نے راشد کے کلام کا تجزیہ ہر اعتبار سے کیا ہے اور اس طرح اُردو تنقید میں ایک بیش قیمت اضافہ کیا ہے۔ کتاب (۱۰۲) صفحے کی ہے مجلد اور سرورق سے آراستہ ہے۔ قیمت دو روپے۔

ملنے کا پتہ:- انشا پریس۔ کوچہ پنڈت۔ دہلی۔

بدلیاں:- آغا شاعر قزلباش مرحوم دلی کی اُن ہستیوں میں سے تھے جن پر دلی ہمیشہ فخر کریگی۔ مرحوم کی اولاد نے شعر وادب کا ستھرا مذاق ورثے میں پایا ہے۔ سحاب قزلباش شاعر مرحوم کی صاحبزادی ہیں اور اپنے بھائیوں کی طرح ادب وشعر سے شغف رکھتی ہیں۔ انکے افسانوی مضامین کا مجموعہ "بدلیاں" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ سحاب کی نثر نہایت دل آویز ہے اور بعض جگہ اتنی دلکش کہ نثر ونظم کا فرق اُٹھ جاتا ہے۔ ادب کے جدید رجحانات میں الفاظ کے انتخاب اور فقروں کی ساخت اور ان دونوں کی حسن کاری کو تقریباً نظر انداز کر دیا گیا ہے حالانکہ انشا پردازی بغیر ان کے مکمل نہیں ہو سکتی۔ سحاب قزلباش نے (دانستہ یا نادانستہ) اسکا اہتمام کیا ہے کہ عبارت میں وہ خوش صوتی پیدا ہو جائے جسے ہم ایک اچھے شعر کا خاصہ سمجھتے ہیں۔ سحاب اگر اسی طرح لکھتی رہیں تو اُردو میں ایک اور دل آویز طرز کا اضافہ ہوگا۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ:- ہندوستانی پبلشرز اُردو بازار۔ دہلی۔

Regd. No. L, 2627



Printed at the Mahbob-ul-mataba Press, Delhi & Published by Shahid Ahmad B.A. Hons from the officeof the "SAQI" Delhi



34(3)
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
DELHI.

ادارہ
شاہد احمد دہلوی
محمد حسن عسکری

سالانہ چندہ
چھ روپے
قیمت فی پرچہ نو آنے

جرعات

جلد ۳۴ | ساقی دہلی۔ بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۶ء | نمبر ۳

محمد حسن عسکری

جھلکیاں

سال بھر سے زیادہ ہوا کہ ادب اور آرٹ میں علیحدگی (Detachment) اور معروضیت کی ضرورت پر بحث کرتے ہوئے میں نے یہ شک ظاہر کیا تھا کہ ہو سکتا ہے شیکسپیئر جیسے عظیم شاعروں کے لئے یہ صفت ضروری نہ ہو۔ ساتھ ہی میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ممکن ہے اُن کے یہاں یہ چیز پائی جاتی ہو۔ شیکسپیئر کی شاعری کا اثر اتنا تند و تیز ہے اور اس طرح دماغ پر غالب آ جاتا ہے کہ اس کا تجزیہ آسانی سے نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر میں نے شیکسپیئر کی یہ لائنیں پیش کی تھیں۔

Daffodils
That come before the
swallow dares, and take
The winds of March
with beauty.

ان لائنوں میں وہ علیحدگی اور معروضیت یقیناً نہیں ہے جو فلوبیر کے یہاں ملتی ہے، اور جس کا وہ دیوانہ تھا ـــ اور یہ بھی اعتراف کر لینا چاہیئے کہ پچھلے سو سال کے ادب کا بہت سا حصہ محض اس معروضیت کی کمی کے سبب اپنی پوری بلندی پر نہ پہنچ سکا۔ شیکسپیئر کی ان لائنوں میں نہ تو جذبات اور تاثرات سے ڈر ہے اور نہ اپنے آپ کو عام انسانوں کی سطح سے بلند رکھنے کی خواہش لیکن ساتھ ہی یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ ان میں کسی قسم کی معروضیت ہے ہی نہیں، کیونکہ یہاں جذباتیت، مبالغہ آمیز داخلیت اور خود پرستی، ان چیزوں کا بالکل پتہ نہیں۔ غرضکہ یہاں فلوبیر کی مجنونانہ علیحدگی نہ سہی، لیکن ایک قسم کی معروضیت ضرور پائی جاتی ہے یہ معروضیت کس قسم کی ہے اور اس کی خصوصیت کیا ہے؟ اس کا جواب میں بہت دنوں سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ لیکن ابھی تک کسی نقاد نے میری مدد نہیں کی تھی۔ پہلا تو مڈلٹن مری نے فلوبیر کے نظریۂ ادب پر اعتراض کرتے ہوئے اس احساس کی تعریف فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ بڑے شاعروں میں زندگی اور زندگی کے کاروبار سے بلند ہو کر زندگی پر غور کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے جس کا نام فلوبیر نے غلطی سے علیحدگی رکھا تھا، اور اس نام کے پیچھے ایسا دیوانہ ہوا کہ اپنے آپ کو بھی خراب کر لیا۔ مڈلٹن مری کی یہ تعریف کچھ رہنمائی تو ضرور کرتی ہے، مگر اس سے پوری تشفی نہیں ہوتی۔ اتفاق سے ورجینیا وُلف کی ایک کتاب میں دو چار فقرے نظر پڑے جن کا اس بحث سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں، لیکن ان فقروں میں مسئلے کا بڑا تسلی بخش حل ملتا ہے۔ جہاں تک خیال کا تعلق ہے، ان فقروں میں کوئی نئی بات نہیں کہی گئی۔ یہی بات کئی دوسرے آدمیوں نے بھی بار بار دہرائی ہے، بلکہ اور تو اور پچھلے مہینے میں ہی کچھ اسی قسم کی باتیں کہہ رہا تھا۔ بہرحال ورجینیا وُلف کے فقروں نے میرے ذہن کو بڑے ادب میں معروضیت کے مسئلے کی طرف پھیر دیا۔

ورجینیا وُلف نے لکھنے والے کو نصیحت کی ہے کہ لوگوں پہ اثر انداز ہونے کا خواب نہ دیکھو، بلکہ چیزوں پر اُن چیزوں کی خاطر غور کرو۔ میرے خیال میں اس آخری فقرے میں ورجینیا وُلف نے بڑے ادب کی معروضیت (یا علیحدگی) کی تعریف کر دی ہے۔ لوگوں پر اثر انداز ہونے کا خواب کئی شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ سیدھی سادی بات تو خیر یہی ہے کہ لکھنے والا کسی سیاسی یا معاشرتی مسلک یا فلسفے کی تبلیغ کرے اور لوگوں سے اپنی بات منوانی چاہے۔ اس کے علاوہ دوسری شکلیں بھی ہو سکتی ہیں جو نسبتاً زیادہ ذاتی ہوں گی، مثلاً کسی آدمی سے ذاتی اور شخصی ناراضگی کا اظہار یا زمانے کی شکایت وغیرہ وغیرہ۔ غرضکہ طرح طرح کی چیزیں ہیں جو فن کار کی توجہ کو اپنی طرف کھینچنا اور خالص تخلیقی کام سے ہٹانا چاہیں گی۔ ان ترغیبات سے بچنا ہی مشکل کام ہے اور اسی میں فن کار کی عظمت ہے۔ بلکہ بودلیئر نے تو یہاں تک

کہہ دیا ہے کہ کسی چیز کی مخالفت کرنا، کسی کو الزام دینا، انصاف کا مطالبہ کرنا یہ سب باتیں بدمذاقی میں داخل ہیں۔ خیر اسے بودلیر کی نفسیات یا زمانے کا لازمی نتیجہ سمجھیے یا کچھ اور، بہرحال اوّل درجے کا فن کار کسی خیال یا کسی چیز کو محض اس لئے کارآمد یا دلچسپ نہیں سمجھتا کہ اس سے پرولتاری انقلاب میں مدد ملے گی یا اقلیدس کا پانچواں مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اُس کے لئے چیزیں الگ الگ اہمیت رکھتی ہیں، اور بجائے خود قابلِ قدر ہیں، اور اتنی دلچسپ ہیں کہ اپنے شخصی جذبات کو الگ کر دینے کے بعد میں بھی اُن میں اتنا آب و رنگ باقی رہ جاتا ہے کہ اُن پر محض اُن چیزوں کی حیثیت سے غور کیا جا سکے۔ فلابیئر اور شیکسپیئر کی معروضیت میں یہی سب سے بڑا فرق ہے فلوبیر اپنے جذبات سے لرزتا ہے، اسے اپنے جذبات پر اعتماد نہیں، اُسے یہ معلوم نہیں کہ جن چیزوں پر وہ اپنے جذبات خرچ کر رہا ہے وہ اس قابل ہیں بھی یا نہیں، یہ ڈر اُس کی جان کے ساتھ لگا ہوا ہے کہ میں کہیں مبتذل نہ ہو جاؤں اسی لئے وہ اپنے جذبات سے پیچھا چھڑا کے چیزوں پر غور کرنا چاہتا ہے۔ لیکن شیکسپیئر اپنے جذبات سے بالکل نہیں ڈرتا۔ بلکہ موقع آتا ہے تو اپنے تاثرات کو زیادہ سے زیادہ ڈھیل دے دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ محض اُس کے جذبات کی آمیزش چیزوں کو دلچسپ نہیں بناتی، بلکہ اُن کو بھی ایک علیحدہ اور مستقل شخصیت رکھنے کا حق حاصل ہے، اور اس حیثیت سے بھی وہ دلچسپ ہیں، اور ہماری پوری توجہ کی مستحق۔ یہاں جذبات معطل نہیں ہو جاتے، بلکہ ذاتی اور شخصی استعمال کے محدود دائرے سے نکل کر وسیع تر اور رفیع تر مصرف میں آتے ہیں۔ یہاں فن کار کا دماغ ایک مخصوص فرد کا دماغ نہیں رہتا، بلکہ پوری انسانیت کا دماغ بلکہ ساری کائنات کا شعور اور ادراک بن جاتا ہے۔

دماغ کی یہ صلاحیت محض ایک ادبی خوبی نہیں ہے بلکہ اس کی ایک بہت بڑی ثقافتی اہمیت ہے۔ سارے سیاسی اور معاشرتی حادثے صرف اسی وجہ سے رونما ہوتے ہیں، کہ ایک فرد یا ایک گروہ اپنے آپ کو تمام دوسرے انسانوں اور دنیا کی ساری چیزوں سے زیادہ اہم سمجھنے لگتا ہے۔ جدلیاتی مادیت جو بھی کہتی ہو۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے بحث کرتے ہوئے تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ سیاسی حادثہ ہمیشہ کسی نہ کسی آدمی یا جماعت کی خودپرستی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس خودپرستی کا سب سے بڑا تریاق یہی شیکسپیئر والی معروضیت ہے، مارکسیوں کو یہ بات ذرا گراں گزریگی۔ سیاسی لوگ کہا کرتے ہیں نا کہ جو ہمارے ساتھ نہیں ہے وہ ہمارے خلاف ہے۔ اوروں کا حال تو مجھے معلوم نہیں، بہرحال فن کار کسی کے بھی ساتھ نہیں ہے۔ اور کسی کے خلاف ہونا بدمذاقی ہے!

ورجینیا ولف نے ایک اور بات کہی ہے جو اس پہلی بات سے بہت گہرا علاقہ رکھتی ہے، اور جس سے مارکسیوں کو بڑی الجھن ہوگی۔ انھوں نے لکھنے والے کو دوسری نصیحت یہ کی ہے کہ ہمیشہ اسی پر غور نہ کرتے رہو کہ انسانوں کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے بلکہ اس پر بھی غور کرو کہ انسانوں کا حقیقت سے کیا علاقہ ہے۔ حقیقت کے معنی سرمایہ داری کا انحطاطی دور نہیں ہیں، بلکہ ورجینیا ولف نے بھی حقیقت کی وہی تعریف کی ہے جو کچھ عرصہ ہوا میں نے افسانے اور حقیقت کے تعلق پر بحث کے ضمن میں کی تھی یعنی انھوں نے بھی کوئی تعریف نہیں کی ہے، ہمیں پتہ نہیں ہے کہ حقیقت کیا چیز ہے لیکن کبھی کبھی ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک مخصوص چیز نہیں دیکھ رہے ہیں، بلکہ ساری چیزوں کا جوہرِ لطیف ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ غلط یا صحیح، اسے بعض لوگ حقیقت کہتے ہیں تو جب تک فن کار کے اندر یہ تھرتھری پیدا نہیں ہوتی وہ مکمل ہو ہی نہیں سکتا، مارشل اسٹالن بن سکتا ہے۔ تخصیص اور تعین کی حدود سے نکل کر حقیقت سے ہم آہنگ ہو جانا ——— یہ ہے دوسری صفت شیکسپیئر والی معروضیت کی۔ دونوں باتوں کا مقصد ایک ہی ہے۔ اپنے اندر رہتے ہوئے بھی اپنے آپ سے بلند ہو جانا۔ پہلا قدم یہ ہے کہ دوسری چیزوں کو اپنے برابر اہم سمجھو۔ دوسرا قدم یہ ہے کہ چیزوں کو الگ الگ نہیں بلکہ ایک رشتے میں منسلک سمجھو اور یہ محض ذہنی عقیدہ نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ اعصابی تجربہ۔ تب جا کر شیکسپیئر ترکیب پاتا ہے۔

امین حزیں

"بے ابرِ بہار" اور اُس کی شاعرانہ توجیہہ

ڈالوں کے دلوں میں دھڑکنیں ہیں || شاخوں کی رگوں میں برقِ مضطر
آنکھوں کی نگہ ہوئی ہے لیکن || ماحول کو دیکھ کر مکدّر

۲

سبزے کا نشان تک نہیں ہے || بوٹوں کے بدن ہیں میلے میلے
دامانِ صبا ہے گرد آلود || اور خاک بسر چمن کے چھبلے

۳

موروں کی زباں تشنگی سے || جلتی ہے ہوا بند ہو گئی ہے
آغازِ بہار ہی سمو کی || ناکارہ کمند ہو گئی ہے

۴

گردے سے روش روش اٹی ہے || بے آب و گیاہ کیاری کیاری
آئی ہی نہیں نظر چمن میں || وہ روپ کی شکل پیاری پیاری

۵

اے ابرِ کرم بکھیر رحمت! || پیاسے ہیں بہت نواز ساقی!
ہاں کھل کے برس بہار جھکے || چھڑ جائیں چمن کے ساز ساقی!

۶

شاخوں کا نکھار ہو دوبالا! || ہر مرغِ چمن ملار گائے!
ہنس ہنس کے نقاب اُلٹ اُلٹ کر || بھونروں کو کلی کلی بلائے!

۷

"بے ابرِ بہار" سونی سونی || مفلس کی ہو جس طرح جوانی
سب رس کے بغیر دسترس ہیچ || رس ہو تو ہے لطفِ زندگانی

توجیہہ

۸

آدم کا "بہشتی پٹاخہ"[1] || آدم کو وبالِ جان ہونا
فطرت سے گلوں کی زندگی کا || کیوں خشک کر دیا ہے سوتا؟

۹

مجرم تو کوئی سزا کسی کو || فطرت بھی ہوئی کیا ہمیں، فرنگی؟
جباروں کی اطلسی قبائیں! || مجبوروں کی ماتمی بھوکی ننگی!

[1] ایٹم بم۔

مرزا فہیم بیگ چغتائی

بڑھاپے کا حسن

"حسن کہاں نہیں"! ایک ذرّے سے لیکر آفتاب و ماہتاب تک حسن ہی حسن چھایا ہوا ہے۔ البتہ ع:-

پسند اپنی اپنی نظر اپنی اپنی

کے مصداق حسن کا کوئی معیار نہ قائم کیا جاسکے یہ اور بات ہے، بلکہ حسن کا بھی کیا اعتبار، یہ بھی کوئی مستقل چیز نہیں، پلک جھپکاتے کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے، چنانچہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں، جنہیں عموماً عیب سمجھا جاتا ہے، لیکن وہی کل پر وہ ہی افزائش حسن کا سبب نظر آنے لگتی ہیں، گویا وہ نہ ہوتیں تو یہ حسن پھیکا تھا، جو دلوں کو موہ رہا ہے

چنانچہ سب جانتے ہیں کہ میدہ شہاب رنگ والے گداز جسم کو کسی زخم کا نشان داغ لگا دیتا ہے، لیکن جناب ایک چاند سے مکھڑے میں اسی داغ سے وہ حسن کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ بیان میں نہیں آسکتی۔

اسی طرح خال خال نہیں مسّا کہئے، مسّا کیسی بدنما چیز ہے، اس کے باوجود کسی روشن پیشانی پر ہونے کی وجہ سے اہل دل کی نظروں میں کچھ ایسا کھب جاتا ہے، کہ ہٹائے نہیں ہٹتا، اس کے دھیان میں بیچاروں کی پلک سے پلک نہیں لگتی، کوری آنکھوں سویرا کیا کرتے ہیں۔

دانتوں کو سچّے موتیوں سے تشبیہ دیجاتی ہے، اور کبھی بعض دانت اصل ہوتے بھی ایسے ہی خوشنما ہیں، جنکے مقابلے میں موتیوں کی کیا حقیقت، مگر جناب! یہ کون سی خوبی ہوئی کہ ان میں خواہ مخواہ ایک چھوٹا سا نیلگوں است بھی شامل ہو، اس طرح تو اک رشک مروارید دانتوں کا حسن مارا گیا، لیکن توبہ صاحب وہ ہی ناقص دانت کسی دل میں کچھ ایسا گڑ جاتا ہے کہ سوتے جاگتے ادھر ادھر نہیں ہوتا۔

مدعا یہ کہ بہت سی خرابیاں بھی کبھی محل پر سراپا حسن و خوبی نظر آنے لگتی ہیں، پھر بھلا سچ مچ کے حسن کا تو کہنا ہی کیا۔

عمر طبعی کو پہنچنے تک ہر شے کو تین درجے طے کرنے پڑتے ہیں، ابتدائی زمانہ، درمیانی دور، اور انحطاط یا بڑھاپا، درمیانی ایک ایسا زمانہ ہے جب تمام قوتیں اور ساری رعنائیاں پورے پورے شباب پر ہوتی ہیں، پھر انحطاط ہونے پر سرد و گرم عالم کے تھپیڑے کھا کھا کر جملہ قوتیں مضمحل ہونے لگتی ہیں، اور حسن کی وہ ظاہری چمک دمک نہیں رہتی جو کبھی وقت نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ انحطاط کے اثر سے حسن ہمیشہ ماند ہی پڑ جاتا ہے یا اس کی گزشتہ رعنائیاں بالکل فنا ہو جاتی ہیں۔

جناب من! انسان تو انسان کسی ایسے درخت کو لے لیجیے، جو بہار و خزاں کے الٹ پھیر طے کرتا ہوا ایسی حالت کو پہنچ جاتا ہے، کہ پھول پھل لانا اور مخلوق کو انواع و اقسام کے فائدے پہنچانا تو درکنار، ہری بھری ڈالیاں سوکھنے اور موٹے موٹے گدّے ٹوٹ جانے کی وجہ سے جس میں درخت کا سایہ بھی نہیں رہتا، اگر کہیں کہیں کچھ دبی سی جان باقی ہو بھی تو وہ تازگی و شادابی کہاں جو کسی زمانے میں راہ چلتوں کو کھینچ لاتی تھی، اسکے باوجود دور دور سے جاتری آ آ کر اس پر شردھا سے جل چڑھاتے اور دیوتاؤں کی طرح اسے پوجتے ہیں۔ کہ بڑے بڑے سادھو مہاتماؤں نے اس کے تلے تپسیا کی ہے، یہاں منہ مانگی مرادیں ملیں گی۔

علیٰ ہذا القیاس ایسی بوسیدہ عمارتیں جنکے اولوالعزم اور عالی مرتبت مکینوں کو پیوند خاک ہوئے جگ بیت گئے، بلکہ وہ بستیاں کبھی کی ملیامیٹ ہو گئیں جن کی رونق ان عمارتوں سے تھی، اسوقت وہ شان رکھتی ہیں، کہ ہفت اقلیم کے سیاح انھیں دیکھنے اور سبق آموز نتیجے نکالنے آتے رہتے ہیں، انکے نزدیک انکے ٹوٹے پھوٹے گنبد و مینار، گرے پڑے در و دیوار، اور مٹے مٹے سے نقش و نگار جدید

ساخت کی عالیشان بلڈنگوں اور محلات سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

کچھ عمارتوں ہی پر موقوف نہیں، ادنیٰ ادنیٰ سی چیزیں حتیٰ کہ ایک ایک اینٹ اور ٹھیکری تک کو پرانا ہو جانے کی وجہ سے وہ خصوصیت حاصل ہو جاتی ہے کہ حکومتیں عجائب خانوں کے فینسی شوکیسوں میں نہایت احتیاط سے رکھنا ضروری جانتی ہیں۔

کیوں جناب! کیا اسکے یہ معنی نہیں ہوئے کہ کہنگی یا انحطاط جسے بالفاظ دیگر بڑھاپا کہیئے، کوئی عیب نہیں بلکہ بذات خود ایک اعلیٰ درجہ کا حسن سمجھا جائے اور کیونکہ اس وقت میرا موضوع "بڑھاپے کا حسن" ہے لہذا فی الحال اسی کے متعلق کچھ تھوڑا بہت عرض کرتا ہوں۔

ظاہر بیں نگاہیں عموماً بہتسے کی سطحی حالت یا وقتی کیفیات میں اُلجھ کر رہ جاتی ہیں، لیکن ہمیں سرسری نظر میں کسی بات کا فیصلہ نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اس میں بہت کچھ دھوکے کا احتمال ہے۔

یوں خیال فرمایئے کہ اکثر بڈھے ایسے نظر آتے ہیں جنکے مُنہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، آنکھوں سے دکھائی دے نہ کانوں سے سُنائی دے، کمر دُہری ہو گئی چندیا کے بال جھڑ جھڑ کر ناصرف نکل آیا، ایک ایک پسلی الگ ہے، ہاتھ پاؤں سوکھ ساکھ کر نرا ڈھانچہ رہ گیا۔

ان حالات میں تو ظاہر ہے کہ کسی خوبی یا حسن کا شائبہ نہیں، اس واسطے بڑھاپا ہرگز قابل اعتنا نہیں، اور یہ مقولہ بالکل دُرست معلوم ہوتا ہے کہ "یک پیری و صد عیب" لیکن ذرا غور کیجئے کہ اگر اسی قسم کے لوازم بڑھاپے کیلئے ضروری ہوتے تو اسکے خلاف مثال کاہے کو ملتی، حالانکہ بعض جگہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔ کتنے ہی بڈھے جوانوں کیا نوجوانوں سے کہیں زیادہ توانا موجود ہیں، جن کی بتیسی سلک مروارید کو شرمندہ کرتی ہے آنکھیں بڑی، چہرے پر معصوم بچوں کی سی بشاشت و شگفتگی، جسم میں نہایت چستی و چالاکی، البتہ صرف بال چاندی یا برف کی طرح سفید ہو گئے، جس سے بجائے بدنمائی کے اُلٹا انکا حُسن جگمگا اُٹھا، وہ ایک نُور کے سے پتلے نظر آنے لگے،

بھی یہ بات جوانی میں کہاں حاصل ہو سکتی تھی۔

اور بڈھوں میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں اُن کا سبب دراصل بڑھاپا نہیں بلکہ بقول داغ ع :-

بگڑ جاتی ہے صورت بھی مصیبت ایسی ہوتی ہے

یعنی بیماریاں، تکلیفیں، ناکامیاں، اور مصیبتیں وہ بلائیں جن کے اثر سے ہٹے کٹے جوانوں کا کچھ ایسا افسوسناک حال ہو جاتا ہے کہ دوسرے ہی اُٹھاتے بٹھاتے ہیں۔

تو گویا حُسن کا تعلق صحت سے ہے نہ کہ جوانی یا بڑھاپے سے، جناب عالی! مصیبت زدہ بڈھا ہو یا جوان، ہے تو آخر مصیبت زدہ ہی۔

اب ہمیں بڈھے جوان بیمار اور مصیبت زدوں سے قطع نظر صحیح و سالم صاحبان کو بنظر غور دیکھ کر موازنہ کرنا چاہیئے جب ممکن ہے کہ ٹھیک ٹھیک فیصلہ ہو سکے۔

اچھا جناب عالی! بچپن تو کچھ سند نہیں، کیونکہ وہ یوں ہی بے فکری میں دیکھے بھالے نکل جاتا ہے، بُرے بھلے کی تمیز ہی نہیں ہونے پاتی، جوانی آتی ہے اور جملہ قویٰ مکمل ہو کر شعور رچا کرتا ہے، تو اس کے ساتھ ساتھ جذباتی ہیجان نصف النہار پر ہونے کی وجہ سے ایسے حالات بھی رُونما ہونے ممکن ہیں، کہ ع :-

ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

والا معاملہ صادق آجائے اور شباب کی تمام راحتیں وبال جان ہو جائیں، جیسا کہ آئے دن دیکھنے میں آتا ہے کہ کتنی ہی حسین ہستیاں عین جوانی میں دُنیا کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو جاتی ہیں، گویا جو چیز حُسن سمجھی جاتی ہے وہ بجائے نعمت کے زحمت ثابت ہوئی۔

اب ذرا ادھر بھی توجہ مبذول فرمایئے کہ جو لوگ شباب کے طوفان خیز اور تباہ کن ہنگاموں سے بچتے بچاتے بے داغ بڑھاپے کے پُرامن ماحول تک جا پہنچے، کیسے خوش نصیب رہے کہ جیتے جی جنت کی راحتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، یہاں تک توقیر بڑھی کہ جہاں جائیں آؤ بھگت ہوتی ہے، لوگ ادب سے پیش آتے ہیں، قدموں میں آنکھیں بچھاتے ہیں، اُن کا ایک ایک لفظ بزرگوں کا قول سمجھ کر آب زر سے لکھا جاتا ہے، اور مخلوق کے دلوں میں جگہ پاتا ہے۔

جو باتیں جوانی میں معیوب تھیں وہ اب مباح ہو گئیں۔

جوانی میں ہر وقت گردشِ پیش سے ہوشیار خبردار رہنا پڑتا تھا، کیونکہ ذرا ذرا سی لغزش پر دنیا انگلیاں اٹھاتی تھی اور صاحب خود بھی شرم آتی تھی، کسی طرف دستِ آرزو بڑھانا تو درکنار لب ہلانے کی مجال نہ تھی، پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا، مبادا ایسی ویسی ہوا چھو گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

دل کی وہ حالت کہ ہر چلے ہر بہانے بے قابو ہونے پر تُلا ہوا، اس پر مصیبت یہ کہ جدھر رجوع ہو ٹھکرا یا جائے شکلِ اُمید کہیں نظر نہ آئے۔

یہ ہے جوانی کا حُسن جو اکثر ایسی پریشانیوں کی نذر ہو جاتا ہے!

بڑھاپا ان تمام خرابیوں سے پاک بالکل ستھرا ستھرا نورٌ علیٰ نور ہے، جس پر کسی قسم کی آنچ نہیں آسکتی۔

جیسے ٹھنڈے پہاڑوں کی گل پوش وادیوں میں دن ڈھلے کی دھوپ اور لبِ بامِ آفتاب کا نظارہ کیسا سُہانا ہوتا ہے، کہ ہزار چاندنیاں نثار ہیں۔ اسی طرح بڑھاپے میں جبکہ جذباتی ہیجان سرد پڑ کر طبیعت سہولت پر آجاتی ہے، تو وہ روحانی سکون حاصل ہوتا ہے، جس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ جوان نہ لگا سکیں گے۔

محبت کا جذبہ جو کہ دراصل فطری ہے، جوانی میں تھا اور بڑھاپے میں بھی موجود ہے، مگر نوعیت بدل گئی، یعنی جوانی میں غارتگر اغراض شامل تھیں اب کوئی لاگ لپیٹ نہیں اسواسطے معاملہ ہی کچھ کا کچھ ہو گیا۔

جب ہی تو جوانی میں جنہیں چوروں کی طرح کن انکھیوں سے دیکھنا دشوار تھا وہ خود جھک جھک کر آداب بجالاتے ہیں، جو ہستیاں کسی وقت پرچھائیں سے بھڑکتی تھیں اب کھلے بندوں ساتھ رہتے نہیں ہچکتیں، جو لوگ نظر چُرا کر نکل جایا کرتے تھے انہیں اپنے کندھے پر ہاتھ رکھوا کر برملا چلنے میں باک نہیں، وہ ہی ہاتھ کہ جوانی میں مجبور تھا ایسا بلند و بالا ہوا کہ جوانانِ رعنا اپنے سروں پر رکھوانا عین سعادت جانتے ہیں، بُرا نہیں مانتے ہیں، وجہ یہ کہ ادھر شفقت ہے تو اُدھر عقیدت، کھوٹ کسی طرف نہیں۔

جوانی کی رنگین محفلوں کے بجائے ذرا اس خوشگوار منظر پر بھی نظر ڈالیں، جہاں بڑھاپے کا حُسن کارفرما ہے، جیسے چاند کے گرد ہالہ ہے، کسی شخصیت کے آس پاس خدا کے بندوں نے ہجوم کیا ہے، کوئی بزرگ دُنیا جہان کے جھنجھٹوں سے آزاد ہر طرف سے مطمئن ہاتھوں میں تسبیح لئے آنکھیں بند کئے گاؤ تکیئے سے ٹیکے، اُس کی لگن میں مگن ہیں، ادھر نرم نرم ہاتھوں سے دادا جان کے پاؤں دبائے جارہے ہیں، اُدھر جھوم جھوم کر نانا میاں کو پنکھا کیا جا رہا ہے، خوشبوؤں کی لپٹیں آرہی ہیں، آسمان سے رحمت و برکت برس رہی ہے اور فرشتے نعرے لگا رہے ہیں!۔

بڑھاپے کا حُسن زندہ باد! بڑھاپے کا حُسن زندہ باد!! بڑھاپے کا حُسن زندہ باد!!! (لکھنؤ سے براڈکاسٹ)

ساقی بک ڈپو کی کتابیں

نغمۂ نور، کیفِ شعور، موجِ ظہور، چراغِ طور: ہر مجموعہ میں حمد، نعت، غزلیں، گیت، نظمیں اور بھجن شامل ہیں، ہر کتاب مجلّد اور دلکش سرورق سے آراستہ ہے۔ قیمت ہر مجموعہ کی ایک روپیہ۔

موجِ نور: یہ سو گیتوں کا مجموعہ ہے۔ ایسے رسیلے اور مدھ بھرے گیت آپ نے کہیں نہیں پڑھے ہوں گے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

بیانِ حضور:۔ حضور سرورِ کائنات صلعم سے بہزاد لکھنوی کے والہانہ عشق کا پاکیزہ حاصل "بیانِ حضور" کی صورت میں ظاہر ہوا ہے ایک بہترین منظوم سیرت ہے۔ اب تک اُردو زبان میں اتنی عمدہ منظوم سیرۃ نہیں لکھی گئی۔ مولود شریف کی محفلوں اور مسلمان گھرانوں میں پڑھنے خصوصاً مسلمان خواتین کے لئے اب تک کوئی اتنی دلکش اور موثر سیرۃ نہیں لکھی گئی۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ)

آئینۂ حیرت:۔ سید رفیق حسین مرحوم نے وحشی اور گھریلو جانوروں کے خصائل و شمائل افسانے کے پیرایہ میں پیش کرکے ایک انوکھی طرز کی کہانیاں لکھی ہیں۔ یہ مجموعہ ایسی ہی سات کہانیوں کا قابلِ قدر مجموعہ ہے۔ قیمت دو روپے

دھرتی کی آواز

بادلو! دُھند کی مانند بکھرنا سیکھو!
یہ بھی کیا اوجِ ثریا پہ گرجتے رہنا
زخمی چیتے کی طرح خود پہ بگڑتے رہنا
یا تو آنا ہی نہ دھرتی کی عیادت کے لئے
اور جو آنا تو وہی برق سی بن کر آنا
کسی نادار کے خرمن کو جلانے کے لئے
کسی مفلس کی ٹھٹھرتی ہوئی کٹیا کے قریب
اُس کے معصوم سے بچے کو بھسم کر جانا
بادلو! دُھند کی مانند بکھرنا سیکھو
اِک ردا بن کے بکھر جاؤ مری دُنیا پر
اپنے دامن میں چھپا لو مرے سب بچوں کو
یہ بلکتے ہوئے ہنستے ہوئے معصوم سے لوگ
جن کے ہاتھوں میں کھلونے ہیں زرو سیم کا بار
یوں بکھر جاؤ کہ اک دل کو بھی محسوس نہ ہو
ہمسفر کتنے کھلونوں کا بنا ہی مالک ——
کہ زرو سیم کی تقسیم کا یہ جرم، فریب
میرے بچوں کی ہلاکت کا بنا ہے موجب
بادلو! آؤ اُتر آؤ مری دُنیا پر!

اقبال عظیم

غزل

بے کیف سہی، بے رنگ سہی، افسانۂ غم مبہم ہی سہی
پلکیں تو ہیں نم کچھ آپ کی بھی، تاثیر تو ہے کم کم ہی سہی

جب سامنے تم آجاتے ہو، کچھ مُنہ سے نکل ہی جاتا ہے
تم سے نہ کہیں تو کس سے کہیں، تم اپنی جگہ برہم ہی سہی

اُمید کے دامن کو بڑھ کر ہم تھام نہ لیتے کیا کرتے
جینے کا سہارا بن تو گئی، اُمید کا حاصل غم ہی سہی

تسکین کا ساماں گو نہ رہا، تقدیر پہ شاکر اب بھی ہوں
جو دورِ محبت روٹھ چکا، اُس دور کا اب ماتم ہی سہی

یہ دل کی لگی کب تک جلتی، گھُٹ گھُٹ کے کہاں تک رہتے تم
کچھ جی تو ہوا ہلکا ہلکا، اشکوں کی روانی کم ہی سہی

اک درد کے درماں کی خاطر، نظروں سے کسی کی کیوں گرتے
ہم ترکِ تمنا کر بیٹھے، قسمت میں غمِ پیہم ہی سہی

شکوہ جو زباں پر آہی گیا، کیا آن رہی خودداری کی
تقدیر پہ نازاں ہے اپنی اقبالؔ سراپا غم ہی سہی

احمد ندیم قاسمی

خون

شفق، شراب، شرارہ، گلاب، گال، گلال ‖ یہ سب کبھی مری فن کاریوں کا غازہ تھے
انہیں سے میں نے حقائق کی تلخیاں دھوئیں ‖ انہیں سے رنگ مری شاعری کے تازہ تھے

شباب میرے ترانوں کی شوخ سرخی تھی ‖ مری نظر میں صداقت بھی تھی شراب آلود
مگر ندیم یہ کتنی کڑی حقیقت ہے ‖ کہ میرے ذہن کی انگڑائیاں تھیں خواب آلود

مری نگاہ شبستانِ یار پر تو پڑی ‖ مگر وہیں سے پلٹ آئی لڑکھڑاتی ہوئی
نہ پا سکی وہ اٹل، وہ عظیم سچائی ‖ رواں ہے جو دلِ انساں میں سرسراتی ہوئی

شفق، شراب، شرارہ، گلاب، گال، گلال ‖ یہ رنگ پھیکے ہیں۔ مجھ کو نہ تھا مگر معلوم
اک اور رنگ ہی جو رنگ بھی ہے نور بھی ہے ‖ بغیر اس کے شباب و نگار سب معدوم

سنور چکی ہے اسی رنگ سے عروسِ حیات ‖ یہی سنگار اب اک اور رنگ لائے گا
پھٹے گا قلبِ زمیں، بلبلا اٹھے گا لہو
زمانہ چاہے گا لیکن اماں نہ پائے گا

ن - ل - بس

انسانیت کے پہلو سے

(افسانے کا پلاٹ فرضی ہے)

"ہم آزادی کی آخری منزل تک پہنچ چکے ہیں۔ اب ہمارا پیچھے ہٹنا ناممکن ہے۔ اگر اس دفعہ وزارتی مشن سے ہمارا کوئی فیصلہ نہ ہوا تو ہمیں ایک بار پھر توڑ پھوڑ کی تحریک شروع کرنی ہوگی۔ ایسی تحریک کے لئے ہم صرف خفیہ طور پر ہی کام کر سکتے ہیں۔ اس لئے میری رائے میں ہمیں کہ [illegible] جانے کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے۔"

اخباروں کے نمائندوں کے سامنے اپنی تقریر ختم کرتے ہوتے بابو جگت نرائن نے ایک ہی سانس میں یہ فقرے کہہ ڈالے اور فوراً ہی میز پر سے بکھرے ہوئے کاغذ بیگ میں سنبھالتے ہوئے کرسی سے اٹھ بیٹھا۔

اس نے معزز اخبار نویسوں کا شکریہ ادا کیا اور امپریل ہوٹل کے ملاقاتی کمرے سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر لان میں آگیا۔ مسز سُرتیا نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پورے چھ بجے اپنی گاڑی امپریل ہوٹل بھیج دیگی، تاکہ پریس کانفرنس کے بعد وہ فوراً اُس سے مل سکے۔ اُس نے کلائی کی گھڑی سے وقت دیکھا۔ ابھی چھ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ وہ امپریل ہوٹل کے خوشنما لان میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔

چار سال پہلے ۱۹۴۲ء کے آخر میں وہ اسی ہوٹل میں راجہ رگھبیر دیال کے نام سے ٹھہرا تھا۔ اس وقت پولیس نے اسے گرفتار کرنے کے لئے چھ ہزار روپئے کا انعام مشتہر کر رکھا تھا، لیکن اُن دنوں اُس کی ڈاڑھی اور یہی مسز سرتیا اس کے کام آئی تھیں۔ انہی دو چیزوں نے اسے گرفتار ہونے سے بچایا تھا۔

"یہ مسز سُرتیا بھی خوب عورت ہے۔ ۱۹۴۲ء کی تحریک میں اس نے مردوں کے شانہ بشانہ کام کیا۔ سب گرفتار ہوگئے لیکن وہ آخری دم تک ڈٹی رہی اور تن تنہا تحریک کی رہنمائی کرتی رہی۔ اور جب اس کے خلاف وارنٹ منسوخ ہوئے تو اُس کی پہلی ہی تقریر سے ملک کی زندگی میں ایک نئی لہر دوڑ گئی تھی۔ آج کے پریس انٹرویو میں اس نے جو تقریر کی ہے وہ بھی ملک میں تہلکہ مچا دیگی اور ملک کے بڑے بڑے لیڈر جو شملہ کی خوشگوار پہاڑیوں میں مزے اڑا رہے ہیں اُنکے کان کھڑے ہو جائیں گے۔"

یہ سوچتے سوچتے وہ ایسا محسوس کرنے لگا جیسے وہ دنیا میں اکیلا ہے۔ اس نے سوچا وہ انتہا پسندوں کا لیڈر ہے اور اس کی یہ للکار گورنمنٹ اور اس کے ساتھیوں کے لئے شیر کی دہاڑ ثابت ہوگی۔

یکایک وہ رک گیا۔ موٹر کے ہارن نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا تھا۔ دور سے اس نے مسز سرتیا کے ڈرائیور کو پہچانا، اسے اپنی موجودگی کا اشارہ کیا اور موٹر میں بیٹھ کر ڈرائیور کو چلنے کے لئے کہا۔

"شیر کی دہاڑ" وہ خود بخود مسکرا دیا اور کسی فلمی گیت کے بول گنگنانے لگا۔ خیالات کا سلسلہ اس کی زندگی کے ماضی کے واقعات کرید رہا تھا۔

۱۹۴۳ء کے آخر میں جب توڑ پھوڑ کی تحریک ناکام ہو چکی تھی، تب وہ اور مسز سُرتیا چٹاگانگ کے آس پاس کے جنگلوں میں چھپتے چھپاتے جاپانی فوجوں کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس دن وہ ایک جنگلی کی جھونپڑی میں پناہ گزیں تھے۔ گھنا جنگل، اندھیری رات اور مسز سُرتیا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی ہندوستانی فلم کا ہیرو ہو اور ابھی ابھی کوئی دلچسپ واقعہ ہونے والا ہو۔ وہ دونوں اگلے دن کی منزل طے کر رہے تھے کہ یکایک دور سے کسی شیر نے دہاڑ کر رات کے سناٹے میں اس دہاڑ کو سنکر کون تھا جس کا دل نہ دہل جاتا اور پھر مسز سُرتیا تو ایک عورت تھی۔ اس نے ایک ہلکی سی چیخ ماری اور اس سے

لپٹ گئی اور اس نے اُسے دونوں بازوؤں میں بھینچ لیا۔

نہ معلوم وہ کب تک۔ ایک عرصے سے اس طرح تپتے رہتے سُرتیا کا نرم اور گداز جسم آہستہ آہستہ اس کے جسم میں تحلیل ہو رہا تھا۔ اور وہ اپنے مضبوط بازوؤں سے اس کی حفاظت کر رہا تھا۔ خوبصورت سڈول اور بیباک سُرتیا کی۔ اس وقت اس کے جسم میں جیسے شعلے جل رہے تھے۔ جیسے سارے کا سارا خطا سقوار سمٹ کر اس کے جسم میں داخل ہو گیا ہو اور اس کے دل کو زور سے جھنجھنا دیا ہو۔ اس حرارت کو کم کرنے کے لیے اس نے سُرتیا کو اور بھی زور سے بھینچ لیا تھا۔ اور ...... اور ......

"اُف!" وہ موٹر میں بیٹھا گرمی محسوس کرنے لگا۔

"اُف!" اس نے کہا "وہ بھی ایک کمزوری تھی۔ ملک میں اب انقلاب ہو کر رہے گا ہمیں پھر [illegible] جانا ہی ہوگا۔"

اِتنے میں موٹر رکی اور پھر اس کے خیالات کا سلسلہ منتشر ہو گیا۔ اس نے اپنی ٹوپی کی نوک ٹھیک کی اور موٹر سے اُتر کر مسز سُرتیا کی کوٹھی میں داخل ہو گیا۔

مسز سُرتیا ڈرائنگ روم میں اُسی کا انتظار کر رہی تھی۔

"ہیلو جگت! نہ جانے کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

"شکریہ! کہو بڑھ ریہرسل ہو گئی؟"

"ہاں! لیکن ابھی کافی وقت ہے۔ گاڑی ۱۰ بجے چھوٹے گی۔ کہیے آپ کا پریس انٹرویو کامیاب رہا؟"

"بہت کامیاب۔ ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کا نمائندہ بھی آیا ہوا تھا۔"

"خواب! کیا کہا آپ نے؟"

"بہت کچھ کہہ دیا میں نے۔ میں نے کہا کہ اگر اس دفعہ انگریزوں نے ہمارے ساتھ فیصلہ نہ کیا تو ہماری تحریک ۱۹۴۲ء کی تحریک سے دس گنا زیادہ طاقت ور ہوگی، ہم خون کی ندیاں بہا دیں گے اور ہمیں اس خفیہ تحریک کے لئے ابھی سے تیاری کرنی چاہیئے تاکہ [illegible] وہ کو ہم انگریز کا مقابلہ کر سکیں۔"

"کیا یہ سب کچھ صاف صاف کہہ دیا آپ نے۔ میں نہ کہتی کہ ہندوستان کو آپ سے بہتر لیڈر ملنا مشکل ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ یہ سب تمہاری بدولت ہے مسز سُرتیا ورنہ اس بڈھے گورو جی نے تو میری زندگی تباہ کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔ آبھا کو ...."

"میں سب جانتی ہوں جگت۔ تم بار بار کیوں اسی بات کو دُہراتے ہو۔ بھول جاؤ پرانی باتیں۔ بھولنے ہی میں زندگی ہے۔"

"کاش میں بھول سکتا!"

اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا اور میز پر سے شام کا اخبار اُٹھا کر دیکھنے لگا۔

اخبار کے صفحے پر اُسے حروف ناچتے ہوئے نظر آئے اور اِن حروف کے بے ترتیب رقص میں اُسے آبھا کی تصویر نظر آنے لگی۔ آبھا جو اس کی بیوی ہوتے ہوئے بھی اسکی نہ تھی۔ اخبار کی سُرخیاں آبھا کے جسم کے اُبھرے ہوئے اعضا بن گئیں اور وہ فضا میں تیرنے لگی۔ آبھا کو پکڑنے کے لئے اس نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا لئے، لیکن فوراً ہی سُرتیا کو سامنے دیکھ کر اُٹھے ہوئے ہاتھوں نے انگڑائی کی صورت اختیار کر لی اور اس نے جمائی لیتے ہوئے اخبار کو میز پر رکھ دیا۔

"میں کہتی ہوں کہ جب کل اخباروں میں آپ کا بیان چھپے گا تو تہلکہ مچ جائے گا۔ ایک بار تو گورو جی کی [illegible] بھی جھلا جائے گی" سُرتیا نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

"ہی ہی ہی!" اس نے دبی دبی ہنسی چھوڑتے ہوئے جواب دیا۔

"اور مجھے یقین ہے کہ اس دفعہ ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔ آئی این اے کے سورماؤں سے ہمیں کافی اُمیدیں ہیں۔"

"میں نے بھی کل اپنی تقریر میں یہی کہا تھا! کاش کہ ۱۹۴۲ء میں جاپانی فوجیں ہندوستان پر حملہ کر دیتیں۔"

"لیکن وہ موقع تو ہاتھ سے نکل گیا۔"

"اِس لڑائی میں ہمیں کافی آہوتی دینی ہوگی۔ چاہے لاکھوں جانیں۔"

"لاکھوں نہیں ہم کروڑوں جانیں دے سکتے ہیں ہندوستان کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ بھوک سے تڑپ تڑپ کر مرنے کی بجائے گولی کھا کر مرنا کہیں اچھا ہے۔"

"تمہیں یاد ہے جگت۔ پچھلی تحریک میں جب ہزاروں ہم ایک بہت بڑے ہجوم کے ساتھ رنگ آباد کا ریلوے اسٹیشن جلانے جا رہے تھے گوروں کی فوج نے ہجوم پر گولی چلا دی تھی اور ہم وہاں سے بھاگ کر دارجلنگ چلے گئے تھے۔ نہ جانے کتنی جانیں ضائع ہوئی ہونگی۔"

"ضائع نہ کہو سُرتیا۔ وہ لاشیں ہماری کامیابی کے زینے بنیں گے۔"

"اگر ہماری لاشیں بھی اُن زینوں میں نہ لگ گئیں۔"

ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ تمہیں یاد ہے کہ رنگ آباد میں گولیوں کی بوچھاڑ سے بچ کر ہم کس طرح دارجلنگ پہنچ گئے تھے۔"

"دارجلنگ! کتنی خوبصورت جگہ ہے۔"

"تم اس سے زیادہ خوبصورت ہو سُرتیا۔"

"ایسا نہ کہو جگت۔ میں تمہیں کہہ چکی ہوں کہ پُرانی باتوں کو بھول جانے میں ہی زندگی ہے۔"

"بعض وقت پُرانی باتوں کو یاد کرنے سے ہی زندگی کا سکوت ٹوٹتا ہے۔ اور میں کیسے بھول جاؤں ہمالہ کی اُن مخروطی حسین چوٹیوں کو اور تمہیں جو سراپا ایک مخروطی لاوا ہو۔ ان دونوں کے موازنے نے میری خوبصورتی کی قدریں بدل دیں۔ برف اور لاوا۔"

"تم بہک رہے ہو جگت۔ دیکھو گاڑی کا وقت ہو رہا ہے۔ میں تمہیں ضرور چھوڑنے جاتی لیکن آج میں نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ اُنکے آنے تک گھر پر ہی رہوں گی۔"

وہ آنے والے انقلاب کی تصویر بناتا ہوا ریلوے اسٹیشن کی گہما گہمی سے بے اثر سکنڈ کلاس کے ڈبے کے پاس جا پہنچا۔ مسز سُرتیا کے نوکر نے اس کا سازوسامان قرینے سے رکھ دیا تھا۔ اور بستر سیٹ کے اوپر بچھا دیا تھا۔ پنکھے کا رُخ اپنی طرف کرکے وہ بستر پر لیٹ گیا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ یہ خاوند اور یہ بیویاں۔ انقلاب کے راستے میں کس قدر حائل ہیں ہمیں ان پابندیوں کو بھی توڑنا ہوگا۔ توڑ پھوڑ کی تحریک سے۔ خفیہ طریقوں سے۔ انڈر گراؤنڈ طریقہ کر۔

ریل گاڑی چل چکی تھی۔ اِنہی خیالات اور ریل کے ہچکولوں کے تسلسل سے اُس کی آنکھ لگ گئی اور نہ جانے وہ کب تک سوتا رہا۔ خواب میں اُس نے دیکھا کہ وہ اور مسز سُرتیا باہوں میں باہیں ڈالے کسی اونچے سے زینے پر چڑھ رہے ہیں۔ تب اچانک سُرتیا نے اُسے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ دیکھو ہماری منزل۔ اور اب صرف ایک سیڑھی باقی ہے۔ اور آخری سیڑھی طے کرنے کے بعد اُنہوں نے اپنے آپ کو ہمالہ کی ایک خوبصورت چوٹی پر پایا۔ پھر دونوں نے نیچے نگاہ دوڑائی اور دیکھا کہ لاکھوں لاشوں کے انبار لگے ہیں۔ اور انہیں لاشوں کے زینے سے چڑھکر وہ اپنی منزل تک پہنچے ہیں۔ یہ دیکھکر سُرتیا نے ناک چڑھائی اور زور سے اُسے پکڑ لیا۔ لیکن وہ ابھی تک لاشوں کے آخری زینے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ آبھا کی لاش تھی۔ آبھا جو اسکی بیوی ہوتے ہوئے بھی اُسکی نہ تھی۔

وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملنے لگا۔ صبح ہو چکی تھی اور گاڑی بدستور اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اُسے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ وہ پٹنہ جا رہا ہے۔ پٹنہ اس کا وطن تھا۔ یہیں سے وہ امریکہ گیا تھا اور امریکہ سے واپسی پر اُس کی شادی آبھا کے ساتھ کر دی گئی تھی۔

"شادی" وہ خود ہی خود مسکرانے لگا۔

یہ شادی اس کی تھی یا گوروجی کی۔ یہ وہ آج تک نہ جان سکا تھا۔

جب وہ امریکہ سے واپس آیا تو اُس کے دل میں اُمنگیں تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اُسے نورا ایسی کوئی لڑکی مل جائے۔ کتنی خوبصورت تھی نورا اور کتنی سمجھدار۔ اگر اُسے ویسی ہی کوئی لڑکی زندگی کی ساتھی مل جاتی تو وہ دُنیا کی سوشلسٹ تحریک کا لیڈر ہوتا۔ لیکن....

جب وہ پہلی دفعہ گوروجی کے آشرم گیا تھا تو وہاں بہت سی لڑکیاں تھیں۔ کوئی گوروجی کی مالش کرتی تھی، کوئی آرام کے لئے پلنگ ... [illegible] تیار کرتی تھی۔ کوئی اُن کو سہارا دیتی اور وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھکر ٹہلا کرتے تھے۔ آبھا بھی وہاں موجود تھی اور وہ شروع سے گفتگو کی جان سمجھتا تھا۔

پھر ایک دن گوروجی نے اُسے بُلایا اور کہا۔ "بیٹا تمہیں سُبھا سے شادی کرنی ہوگی۔"

گوروجی کی بات وہ ٹال نہ سکتا تھا۔ شادی ہوئی۔ گوروجی نے اپنے ہاتھوں سے اُن دونوں کی سکھشی کے لئے دُعا کی۔

"خوشی! سُکھ! سُبھا!" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا:

شادی کی رات جب وہ سُبھا کے پاس پہنچا تو سُبھا نے اسے بہت سی باتیں بتائیں۔ گوروجی کے متعلق۔ گوروجی کی بکری کے متعلق۔ گوروجی کی بلّی کے متعلق۔ گوروجی کی روحانیت کے متعلق۔ اور جب وہ سُبھا کو اپنی آغوش میں لینے لگا تو وہ پیچھے ہٹ گئی اور کہنے لگی "گوروجی نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ میں ساری عمر برہمچریہ کا پالن کرونگی۔"

یہ سُن کر اُس کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی تھی اور وہ ایسے محسوس کر رہا تھا جیسے وہ پاتال میں دھنسا جا رہا ہو۔ اور پاتال میں کسی برف کے گلیشیر ..... کے نیچے دبا جا رہا ہو۔

وہ رات اس نے جاگتے کاٹی تھی۔ ساری رات وہ کمرے کے فرش کی لمبائی اور چوڑائی ناپتا رہا تھا۔ اس نے دُنیا کی ساری تاریخ۔ ساری دیومالا پر نظر دوڑائی تھی لیکن اُسے ایسا کوئی واقعہ نہ ملا تھا جہاں کسی ایسے انسان نے جس کے اپنے اعضاء شل ہوچکے ہوں، قدرت سے انتقام لینے کے لئے دُنیا کے نوجوانوں کو یہ شراپ دیدیا ہو کہ ان کے لئے عورت حرام ہے۔ ہندوستان کی دیومالا میں بھی ایسا کوئی رشی نہ ملتا تھا۔

لیکن اسی ملک میں گوروجی ایسے لوگ پوجے جاتے ہیں۔ ان کے بُت بنتے ہیں اور ہندوستان کے جاہل لوگ ان بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ اس ملک کو زبردست انقلاب کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے انقلاب کی جس میں ہنسا ہی ہنسا ہو۔ جس میں خون کی ندیاں بہہ جائیں اور ایسے انقلاب کے لئے ..... تحریک ہی کامیاب ہوسکتی ہے۔

اور پھر اس انڈر گراؤنڈ تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے من ہی من میں نئی نئی تجویزوں پر غور کرنے لگا۔

سوچتے سوچتے اس پر غنودگی طاری ہوگئی اور وہ خوابوں کی دُنیا میں ایک نئی دُنیا کی تعمیر کرنے لگا۔

اُس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑے کنول کے پھول میں گوروجی اور سُبھا فضا میں اُڑتے جارہے ہیں۔ اس نے اُچک کر انہیں پکڑنے کی کوشش کی لیکن گوروجی نے اُسے دھکّا دیدیا اور وہ زمین پر مسز سُرتیا کے قدموں میں ———

اس نے دونوں ہاتھوں سے مسز سُرتیا کو زور سے پکڑ لیا اور پھر وہ دونوں پاتال کی طرف بڑھنے لگے زمین کے نیچے انڈر دی گراؤنڈ۔ (Under The Ground)

ریل کا انجن چل رہا تھا اور پہنچنے کی منزل ابھی تھوڑی ہی دُور باقی تھی۔ (حلقہ ارباب ذوق میں مورخہ ۴۶-۷ کو پڑھا گیا)

مطبوعات ساقی بکڈپو۔ دہلی

آدم خور: کیا آج کل بھی آدم خوری ہوتی ہے۔ اور آدمی کو آدمی مار کر کھاجاتا ہے۔ قیمت عہ

چمکی: عورت کی فطرت، جاں جائے پر آن نہ جائے بغیرت وشرافت کی مُنہ بولتی تصویر "چمکی" میں دیکھئے بہترین کتاب ہے۔ مصنفہ عظیم بیگ چغتائی۔ قیمت عا

چینی کی انگوٹھی: یہ ایک نوجوان اور خوبصورت بیوہ کی انتہا سے زیادہ دلچسپ داستان ہے۔ قیمت ۸ر

ملفوظات طامی: یہ ایک سنکی کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ قیمت ۱۲ر

مضامین چغتائی: اس کتاب میں ۲۳ مضمون اور افسانے شامل ہیں۔ قیمت عہ ر

میراجی کی نظمیں: اُردو کے سب سے مشہور شاعر میراجی نے اب تک ہزاروں نظمیں لکھیں ہیں۔ یہ ساٹھ نظمیں اُن کا نچوڑ ہیں۔ قیمت ۱۸ر

گیت ہی گیت: میراجی کے گیت دلاویزی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ایسے مدھر گیت آپ نے کبھی نہیں پڑھے ہونگے۔ ان مجموعہ میں ہر قسم کے گیت ہیں۔ قیمت عا ر

ضیا جالندھری

ابوالہول

جہانِ ریگ کے خوابِ گراں سے آج تو جاگ
ہزاروں قافلے آتے رہے گزرتے رہے
کوئی جگا نہ سکا تجھ کو، تجھ سے کون کہے
وہ زیست موت ہے جس میں کوئی لگن ہو نہ لاگ
تڑپ اُٹھے ترے ہونٹوں پہ شعلہ سا کوئی راگ
جو تیرے دیدۂ سنگیں سے دود بن کے بہے
یہ تیری تیرہ شبی بجلیوں کے ناز سہے
یونہی سلگتی رہے تیرے دل میں زیست کی آگ

مگر نہیں، تو اگر میرا رازداں ہوتا
ترے لبوں پہ دہک اُٹھتی کوئی پیار کی بات
تو آج دہر کے سینے پہ تُو کہاں ہوتا
ترے سکوں کو کبھی چھو سکا نہ وقت کا ہات
خود اپنی آگ میں ہی جل بجھی ہے میری حیات
وگرنہ تیری طرح میں بھی جاوداں ہوتا

(حلقۂ اربابِ ذوق شاخِ دلی)

فراق گورکھپوری

روحِ تبسم

(مجموعۂ کلام حضرت ظریف دہلوی مطبوعۂ مشہور پبلشنگ ہاؤس دہلی)

حضرت ظریف دہلوی کے کلام کی سیر گلشنِ کشمیر کے نظارے سے کم نہیں ہے۔ ان کی نظمیں ملک کے رسالوں میں شائع ہو کر اہلِ وطن کے لئے ضیافتِ طبع کا سامان فراہم کرتی رہتی ہیں۔ ظرافت بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے اور ہمارے لئے فطری بات ہے کہ ہم اس کمیاب جنس کی قدر کریں۔ یہ جنس بازارِ ادب کی رونق اور چہل پہل میں اضافہ کرتی ہے۔

حضرت ظریف دہلوی کا مزاحیہ کلام واقعی دیکھنے کی چیز ہے۔ انکا پورا کلام نہایت سنجیدہ اور مہذب ہے لیکن تہذیب و سنجیدگی کی رگوں کو انکی شوخی ایک خاموش اچانک پن کے ساتھ اس طرح قدم قدم پر چھیڑ دیتی ہے کہ ہر پڑھنے والے کے دماغ میں گدگدی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کا کلام کوئی [illegible] قہقہہ بار ہے لیکن اسے پڑھ کر ہنسے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔ انکی طنزیات میں کوئی تلخی نہیں، دل آزار عناصر نہیں نا خوشگوار اجزا نہیں۔ وہ زندگی کو زندگی کی طنزیات کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ زندگی پر انکا ایمان ہے۔ وہ اپنی طرف سے انسان پر حملے نہیں کرتے ہیں اور جو چوٹیں زندگی ان پر کرتی ہے یا انسان پر کرتی ہے انہیں وہ ہنستی ہوئی پیشانی سے قبول کر لیتے ہیں۔ یہ مرنجاں مرنج ظرافت کم از کم میرے نزدیک بڑی قابلِ قدر چیز ہے۔ انکی ظرافت میں شگفتگی کے بجائے ایک مسکراہٹ ہے۔ زندگی کی معمولی چھوٹی معذوریاں اور مجبوریاں ہمارے دلوں میں چٹکیاں لیتی ہیں۔ زندگی ہمارے ساتھ جو مذاق کرتی ہے حضرت ظریف کے کلام میں ہم انکا خاموش احساس کرتے ہیں۔ کچھ رک سے جاتے ہیں اور کچھ چونک سے جاتے ہیں۔ حضرت ظریف دہلوی کی ظرافت کبھی شرافت کا دامن نہیں چھوڑتی۔ یہی بیخودی و ہشیاری، سادگی و گلکاری انکے مزاحیہ کلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ انکا مسلک ہے ع:

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

لیکن دبی زبان سے یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ جہاں زمانے کی ہمواری قبول وہاں اسکی متوقع و غیر متوقع چھیڑ چھاڑ بھی سہی۔ وہ یہ کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ ہم اس کی شکایت تو نہیں کرتے کہ زمانہ ہمیں ستاتا ہے یہی کیا کم ہے کہ زمانہ ہمیں ہنساتا ہے۔

حضرت ظریف دہلوی کی زبان و بیان میں بڑی سلاست و روانی ہے۔ آئے دن کی زندگی کے بیوپار میں دِلّی والے سانچے میں ڈھلی ہوئی جو سادہ اور ستھری اردو بولتے ہیں وہی اردو حضرت ظریف دہلوی لکھتے ہیں۔ اس مجموعہ میں کچھ ایسے ٹھیٹ الفاظ فقرے اور محاورے ملتے ہیں جو خاص دہلی کی چیزیں ہیں۔ دہلی کا یہ روزمرہ بڑی البیلی چیز ہے جس کی خصوصیت داغ کی زبان میں ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ ع:

اک ٹیڑھ سادگی میں اک سیدھا بانکپن ہیں

دہلی کے ٹھیٹ الفاظ اور فقروں کا ہلکا ہلکا چھینٹا حضرت ظریف کے پورے کلام میں ملتا ہے۔ جہاں جہاں ایسے الفاظ فقرے اور ٹکڑے آ گئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ نظم میں ایک نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ بیان کی یہ بے تکلفی یہ سادگی، یہ روانی اور یہ روک تھام اس لئے قابلِ توجہ ہے کہ ان کی رواں رواں نظمیں قریب قریب ہمیشہ نظر و سماعت کو اپنی خاموش رَو میں اس طرح بہا لے جاتی ہیں کہ دہلی کی اس بولی اور ٹھیٹھ ٹکڑوں پر توجہ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ لیکن اگر ہم روا روی میں ان چیزوں پر دھیان دیتے چلیں تو ان کے کلام کا مزہ دوبالا ہو جائے گا۔ اور ہماری جیسے دور والوں کے لئے ان کے کلام کا مزہ اور سواد بڑھ جائے گا۔ بہت سے مزاحیہ نظمیں لکھنے والے انگریزی الفاظ و فقرے بھی اپنے مصرعوں میں کھپانا چاہتے ہیں لیکن کھپا نہیں پاتے اور انگریزی الفاظ اور فقروں کو توڑ مروڑ کر محض ٹھونس ٹھانس کی مثال پیش کرتے ہیں لیکن حضرت ظریف جب انگریزی الفاظ یا فقرے اپنی نظموں

میں لائے ہیں تو بہت صفائی کے ساتھ لائے ہیں۔ اردو کا گڑھا پانی ہے نہ انگریزی میں اس کا مدا ہی۔ حضرت ظریف کو مبارکباد دیتا ہوں۔

حضرت ظریف کی ظرافت زندگی کو سراب نہیں بناتی۔ انکے یہاں زندگی کچھ کھٹ مٹھی قسم کی چیز ہے اور کہیں کہیں کچھ سلیقی اور ترش قسم کی چیز ہے لیکن زبان کی حسّاس رگیں ان پھیکی سلیقی لذتوں سے ایک بدمزگی کا لطف لے ہی لیتی ہیں۔ بدمزہ ہونے میں بھی منہ بن یا بگڑ جاتا ہے اور یہ کیفیت بھی لذّت سے خالی نہیں۔ غم حیات و نشاط زندگی کا ایک بعید کا سیدھا پہلو بھی ہے اور اگر ایسے کلام کو سطحیت کا عیب لگایا جائے تو کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ادب میں ایسی سطحیت کی بھی ایک جگہ ہے۔ کوئی بھرپور چیز ان پہلوؤں سے کہاں خالی ہوتی ہے جن کی صفت سطحیت ہے۔ وہاں ہیں اگر نمک کم یا زیادہ پڑ جائے کوئی آدمی اگر ذرا بے ڈھنگا یا بیوقوف ہو، کوئی منظر یا واقعہ اگر ذرا عجیب ہو تو اس وقت ایک زندہ سطحیت ہم کو گدگداتی ہے اور افلاطون کا فلسفہ آڑے نہیں آتا۔

آخر میں میں صرف یہ کہوں گا کہ حضرت ظریف کا کلام اپنی ان کمساہٹوں کی وجہ سے جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں اپنے اندر جمہوریت کے عناصر رکھتا ہے۔ یہ کلام بارود نہیں بھلا مرچ کی اس میں وہ صفتیں نہیں جو بان یا تالو کو پھونک دیں اور نہ اتش یا اکبر کے وہ بے پناہ کونجے اس کلام میں ہیں جو زمین سے ہمارے پاؤں اکھاڑ دیں۔ ان میں تو ہمیں صرف وہ معمولات زندگی ملیں گے جو اس ذرا گرد برد دنیا کے لئے ہمارے دلوں میں پیار پیدا کر دیں اور اگر یہ معمولات زندگی کبھی کبھی ہمارے ماتھوں پر بل ڈال دیتے ہیں تو اس کا نتیجہ بھی یہی ہوتا ہے کہ یہ زندگی جس کی بھول بھلیاں کبھی نہیں سلجھتی ہمارے لئے ایک ایسی چیز بن جاتی ہے جو ہمیں تھوڑا بہت دق تو کرتی ہے لیکن اسے ہم طلاق دینے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔

دہلی

خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں

سلام مچھلی شہری

"انگڑائی"

"زندگی! تیری یہ فردوس بھی بیکار گئی
بیکسی ہائے نشاط ——
میں نے ساقی کو بلایا کہ گھٹا چھانے لگی
پھول سجنے لگے،
نقرئی روحوں نے انگڑائی لی۔
پریاں آراستہ کرنے لگیں مے خانے کو!

میں نے پیمانہ اٹھایا کہ فضا گانے لگی
ساز بجنے لگے،
مہ پاروں نے انگڑائی لی
شمع ہنس ہنس کے بلانے لگی پروانے کو۔

ڈرتے ڈرتے گل نسرین کے قریب آیا تھا
کوئی بے رحم سی ناگن ابھی لہرائے گی
اور مری جرأت بے مایہ پشیماں ہوگی
اور مری وحشت پہ دنیا کو ہنسی آئے گی
بیکسی ہائے نشاط ——
غم سے ٹکرا کے مسرت کی کرن ہار گئی
زندگی! تیری یہ فردوس بھی بے کار گئی ——!!"

بلدیو دیوان

شکست کی آواز

"کرشن بیٹا ذرا جا کر نل سے بڑی بالٹی تو اٹھا لا ئیو" بچے کی ماں نے کہا۔

اُسے غصہ آ رہا تھا۔ کیا صرف وہ ہی کام کرنے کیلئے رہ گیا ہے۔ جب دیکھو یہ بچے کی ماں حکم چلاتی رہتی ہیں، یہ کر وہ کر، یہاں آؤ، وہاں جاؤ۔ جانے میرے ساتھ ان کی کون سے جنم کی دشمنی ہے جب سے بیاہ کی تیاریاں شروع ہوئی ہیں کولھو کے بیل کی طرح جُتا رہا ہوں۔ ابھی تک میرے کام سے ان کا جی نہیں بھرا۔ اگر میں موجود نہ ہوتا تو جانے یہ لوگ کس طرح ہر کام کو خوش اسلوبی سے کرتے۔

اُس نے نل پر جا کر بڑی بالٹی اُٹھالی، اُس کی آنکھوں کے سامنے مہندرو کی شرمیلی صورت گھوم گئی۔ کئی بار اُس نے اُسے یہی بالٹی اُٹھاتے دیکھا تھا۔ اور جب وہ اُسے اس حالت میں دیکھا کرتا۔ تو مہندرو کی آنکھیں مارے شرم کے جُھک جاتیں۔ اور وہ آہستہ سے گھر کی طرف چل پڑتی۔ وہ اسی طرح خیالات کی رو میں بہتا ہوا اُن کے گھر جا پہنچا۔

باہر سے آئے ہوئے مہمان اندر کمروں میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اور وہ دالان میں کھڑا سن رہا تھا۔ ایک جہاندیدہ سفید ریش کہہ رہے "ارے بھائی یہ لڑکا کتنا شریف ہے ہر اک کام کو کتنی تندہی سے کرتا ہے۔ ورنہ کون کام کرتا ہے کسی کے۔ آجکل تو اپنے بھی پرائے ہو رہے ہیں۔ تو غیروں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ جب اپنے رشتوں کو دیکھتا ہوں تو دل جل اُٹھتا ہے۔ وہ بھی وقت تھا جب بیٹے ماں باپ کے سامنے سر تک بلند کرنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ مگر یہ کلجگ ایسا آیا ہے کہ شرم اور غیرت صرف الفاظ ہی رہ گئے ہیں...." نہ جانے اُس سفید ریش نے اُس کی کتنی تعریف کی، وہ خوش تھا، کہ وہ ایک شریف اور قابلِ تعریف نوجوان ہے۔ کہ اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا "آجکل تو سوائے خود غرضی کے رہ ہی کیا گیا ہے۔ ......"

وہ اپنے خلاف کچھ سُننا نہیں چاہتا تھا۔ لہذا وہاں سے چلا آیا۔

وہ سوچ رہا تھا، کیا وہ واقعی خود غرض ہے۔ کیا وہ سب کچھ اس لئے کر رہا ہے۔ کہ اس کے دوست یار اور لوگ سمجھیں کہ اُس نے اپنی محبوبہ کو خوش کرنے کے لئے اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کا خزانہ جمع کیا اور دل پر پتھر رکھا۔ کیا وہ اپنے آپ کو بیسویں صدی کا سچّا فرہاد بنانا چاہتا تھا۔ کیا مہندرو واقعی اس کے روم روم میں سما گئی تھی۔ کیا وہ مہندرو کو اس لئے نہیں اپنا سکا کہ وہ غریب ماں کا بیٹا ہے ـــــ کیا اب بھی وہ اپنا سب کچھ مہندرو کے لئے قربان کر سکتا ہے۔ اب اُسے اپنا سب کچھ ضائع کرنے سے کیا حاصل۔ وہ تو کل سے کسی اور کی ہو جانے والی ہے۔

اُس گلی میں رہتے اُسے تین سال ہو گئے تھے۔ مگر گلی میں رہنے والوں میں سے کسی نے بھی آج تک نہ دیکھا تھا کہ وہ اونچی نظر کرکے بھی چلا ہو سردیوں میں وہ سینما سے لوٹتا تو بازار کی سے گزرتے ہوئے بھنورے کی طرح غالبؔ کا کوئی شعر گنگناتا ہوا آتا، مگر گلی کے موڑ پہ آتے ہی جیسے اُس کی زبان پر تالا سا لگ جاتا۔ نہ جانے کیوں . . . وہ چپ چاپ گلی سے گذر کر اپنے مکان میں داخل ہو جاتا اور چاندنی راتوں میں وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھولے گھنٹوں چاند کو دیکھا کرتا۔ اور بارہا اُس کا جی چاہتا کہ وہ یاد آتے ہوئے محبت کے ایک گیت کو پڑھے جسے کتنا عرصہ پہلے ایک فلم میں سُنا تھا۔ مگر اس وقت تو اُسے ایک فضول سا گیت سمجھتا تھا جسے ہدایت کار نے فلم کو رنگین بنانے کے لئے بڑھا دیا ہو۔

گلی کی عورتیں کام کاج سے فارغ ہو کر جب دھوپ تاپنے بیٹھتیں تو دھرم وتی چادر کاڑھتے ہوئے کہتی "بہنا! بڑے بڑے لڑکے دیکھے، پر اس کرشن جیسا لڑکا تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے نہ ملے گا۔" ننھے جگو کی ماں اپنی مشین کو ساکت کرتی اور آدھ سلے کپڑے کو ایک خاص سلائی کرنے کیلئے مشین میں رکھتے ہوئے کہتی "سچ ہی تو ہے۔ آج تک اُس نے آنکھ اٹھا کر گلی میں دیکھا تک نہیں۔ کوئی کچھ کرے مگر وہ اپنی ہی دُھن میں رہتا ہے اور دیکھو سادہ

کتنا رہتا ہے۔ بزرگ کہا کرتے تھے کہ کالج میں پڑھ کر لڑکوں کے دماغ خراب ہو جاتے ہیں۔ ماں باپ اور بزرگوں کو تو وہ خاطر میں ہی نہیں لاتے۔ سگریٹ تو اُن کے منہ سے چھٹتا ہی نہیں مگر میں تو نہیں مانی۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کالج میں تو پڑھتا ہی نہیں۔"

مہندر کی ماں پاس ہی سے کہہ اٹھتی۔ "بچوں کا تو جی جان ہے، وہ اُن سے بہت پیار کرتا ہے اور ہاں جی بچے ہیں ذرا خلوص سے پیش آؤ، بس اُسی کے ہو رہتے ہیں۔ کل ہی مجھے کہہ رہا تھا، ماں ہم تو تجھے بھائی کے ساتھ (پاس) رہیں گے۔ وہ ہمیں اچھی اچھی چیزیں دیتے ہیں۔"

دھرم دتی اس کی پاس بیٹھی ماں کو کہتی "بہنا! دھن بھاگ ہیں تیرے، جس کے گھر ایسے پتر نے جنم لیا۔" اُس کی ماں کی گردن جھک جاتی اور کبھی کبھی مارے خوشی کے اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے۔

پنڈت جی کی کھڑاؤوں کی آواز نزدیک آتے آتے اُس کے پاس آکر رک گئی۔ "رام رام ــــ رام رام" اور لکڑی کے جوتوں کی ٹلی ٹلی، دراز اُسے معلوم تھا کہ پنڈت جی جب بھی آتے کبھی نہ کسی چیز کی ضرورت ہوتی۔ مگر وہ سوچنے لگا کہ جو چیزیں پنڈت جی نے رسومات کی ادائیگی کیلئے لکھائی تھیں وہ تو وہ کب کی لے آیا تھا۔

"کیسر اور چندن نہیں لائے کرتن"۔ پنڈت جی اپنی توند پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔

"لایا تو تھا مہاراج" وہ دھیرے سے بولا۔ "چاچی کو تو دئے تھے سگری والے ٹوکرے میں تو رکھے تھے انہوں نے۔"

پنڈت جی کی کھڑاؤوں کی آواز دور ہو جانے کی وجہ سے مدہم ہو گئی۔ وہ سوچنے لگا نہ جانے کیسا سال چڑھا ہے میرے لئے۔ ایک منٹ تک کیلئے بھی چین نہیں ملا۔ کبھی یہ لاؤ کبھی وہ لاؤ، تو بس معمول ہی ہو گیا ہے۔ واہ رے ہندو دھرم اور رسوم ...... وہ سماج کا باغی کہہ رہا تھا، کیا کیسر، چندن اور ایسی ہزاروں بے فائدہ چیزوں کے بغیر کیا بیاہ نہیں ہو سکتا . . دو روحوں کا ملاپ نہیں ہو سکتا۔ دو روحیں ۔۔ وہ جیسے اس پھیر چال پر ہنس رہا ہو۔ اگر کسی سے پوچھا جائے تو شاید روح کی تعریف بھی نہ کر سکے یہ شادی تو اجنبی عورت اور مرد کو باندھنے والی ایک رسّی ہے جسے اگنی اور منتروں نے مل کر بنایا ہو۔ بینڈ باجوں کی آوازیں نزدیک ہوتی جا رہی تھیں۔ گھر بھر میں کہرام سا مچ گیا۔ وہ چونک اٹھا۔ اُسے تو بیٹھکارہ کے وقت موجود ہونے کے لئے کہا گیا تھا۔ وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کیا کرے، جائے یا نہ جائے، اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ اور یہاں اس سے پہلے بھی تو کئی بار وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا تھا . . . جب اس کے امتحان نزدیک آ رہے تھے۔ وہ زیادہ وقت اپنے کمرے میں ہی رہتا۔ کھانے پینے کی سُدھ نہ تھی۔ ماں سمجھتی لڑکا امتحان کی تیاری کر رہا ہے۔ بار بار ٹوکتی کہ ایسی ہی کیا پڑی ہے۔ امتحان آ رہا ہے تو صحت کا بھی تو خیال رکھو اور ہاں دیکھو تو کیسا کمزور ہوا جا رہا ہے۔ مگر ان سب باتوں کا جواب اُس کی ایک لرزتی لب تک ہی محدود ہوتا۔ وہ جب بھی سوچتا کہ اُس کی بھولی ماں نے کتنا غلط سمجھا ہے۔ امتحان!۔ محنت! مہندر! ۔ اُس کا جی گھبرا اٹھتا۔

کالج جاتا تو پروفیسر کہتے، وہ روز بروز کمزور کیوں ہوتا جاتا ہے۔ اُس کے دوستوں کو شکایت رہتی کہ وہ گھر سے باہر کیوں نہیں نکلتا۔ وہ سب کچھ سنتا۔ مگر ایک ہنسی میں ٹال دیتا۔ وہ کالج سے واپس آتا تو اپنے کمرے کو اندر سے بند کر لیتا۔ اور ایک کرسی میں گر جاتا، اُس کی آنکھیں فضا میں کچھ ڈھونڈنے لگتیں اور پھر یکلخت ہی جھک جاتیں اور وہ فرش پر لگے ٹائیلوں کے نقوش دیکھنے لگتا۔ پھر کسی خیال کے آتے ہی اُس کی آنکھیں پُرنم ہو جاتیں اور ٹائیلوں کے نقوش معدوم ہو جاتے۔ کالج میں پڑھتے پڑھتے وہ اکثر سوچنے لگتا۔ ایک ماہ بعد مہندر کی شادی ہو جائے گی۔ وہ کہاں اور وہ کہاں، اُسے سنجیدہ بننا ہی پڑے گا۔ ہمراز کیا کہیں گے محبوبہ کی شادی ہو گئی اور وہ پہلے کی طرح خوش ہے تو وہ کہیں گے کہ اُس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ کیا مہندر کی شادی کے بعد مجھے کو نہ بلائے گا، کیا وہ اتنا خود غرض ہے۔ کیا وہ مجھے کو اس لئے پیار کرتا ہے کہ وہ مہندر کا بھائی ہے۔ اگر اُسے مہندر مل جاتی تو زندگی آرام سے کٹتی۔ اس کی زندگی میں دلچسپیاں ہوتیں ــــ مگر زندگی ہے کیا۔ آخر ہی تو جاتا ہے۔ خواہ زندگی خوشی سے کٹے یا بدحالی میں یہ دوامی تو ہے نہیں۔ پھر وہ سوچتا کیا یہ سب اس کے بس کی بات ہے۔

کیا وہ مہندر کو بھول سکے گا وہ تو بالکل خانہ نشین ہو گیا تھا۔ وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکتا تھا۔ نہ تو وہ پڑھ ہی سکتا اور نہ کچھ اور ہی کر سکتا۔۔ ۔ چوہدری کی نہ جانے کتنی دفعہ پانی لینے جاتی، کتنی دفعہ وہ پانی گرا تی اور کتنی دفعہ وہ گرتے گرتے سنبھلتی۔ وہ سمجھتی کہ اُس کی بالٹی گرنے سے آواز پیدا ہو گی اور شاید اُس کا کرشن کمرے سے باہر نکل آئے مگر اُس کی نظریں کرشن کے بند دروازے سے ٹکرا جاتیں۔ وہ دل میں کہتی۔ ۔ دُنیا کیسی عجیب ہے۔ وہ چند روز کے بعد ایک اجنبی کے حوالے کر دی جائے گی۔ مگر کرشن واقعی اُس کے لئے کچھ نہ کر سکتا ہے۔ پھر وہ سوچتی کرشن تو کرشن وہ خود کیا ہے۔ مہندر کو اس اندھے سماج پر غصہ تو بہت آتا۔ مگر وہ صبر کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ پھر وہ سوچتی۔ کرشن بے وفا تو نہیں کیا وہ اجنبی اُس سے خلوص اور محبت سے پیش آئیگا۔ وہ تو پریم کی بھوکی ہے۔ مگر عورت تو ایک ہی بار پریم کرتی ہے ۔ شاید اُسکا خاوند اُس کا دل جیت لے مگر کرشن اسے اتنا اچھا کیوں لگتا ہے۔ اور وہ اُسے اِس قدر چاہتی کیوں ہے۔

اتنے میں اُس کی ماں آواز دیتی "مہندر کیا ابھی تک تیری باری نہیں آئی" اُس کے تمام خیالات حرفِ غلط کی طرح مِٹ جاتے۔ وہ اپنے آپ کو ایک دوسری دُنیا میں پاتی نل کی طرف دیکھتی تو اُس کی بالٹی بھر چکی ہوتی اور پانی اوپر سے بہہ رہا تھا۔ وہ جھٹ سے بالٹی اُٹھاتی اور چل پڑتی۔ راستے میں اُس کی نظریں پھر اُس کے بند دروازے سے ٹکرا جاتیں اور پھر وہ خیالات کے ماحول میں کھو جاتی۔ مگر اُس کے پاؤں مشین کی طرح چلتے چلتے اُسے گھر کی دہلیز پر پہنچا دیتے۔ جو کھٹ سے ٹکرا جاتے اور وہ گرتے گرتے بچتی۔

بینڈ بجنا بند ہو گیا۔ بوڑھے آپس میں گلے مل رہے تھے۔ اُس کا دل جیسے جل گیا۔ کیا یہی تھا اسکا صلہ۔۔۔۔ اُسے پھر سے خیال آیا کہ اُس نے کتنی مدد کی تھی اور وہ بھی اپنا سب کچھ ضائع ہوتے دیکھکر، پھر بھی وہ نازاں تھا کہ اُس نے کچھ تو کیا۔ ذاتی طور پر اگر اُس نے مہندر کو کھو دیا تو کوئی بات نہیں دوستوں میں تو عزت ہو گی۔ مگر اُس کی پڑھائی کا کتنا نقصان ہوا۔ وہ دن پھر اُس کی نظروں میں گھوم گئے۔ اُس کے امتحان نزدیک سے نزدیک تر آ رہے تھے مگر اُس سے پڑھا نہیں جاتا تھا۔ ایک روز وہ دل و دماغ پر جبر کر کے پڑھنے بیٹھا۔ دو چار صفحے پڑھے مگر سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور سمجھ میں بھی کیسے آتا، وہ تو خیالات کے ماحول میں تھا۔ اُسے کتاب کے حروف صرف سیاہ دھبّے نظر آ رہے تھے اور متواتر چند منٹوں تک آنکھوں پر زور دینے کی وجہ سے وہ جھپک گئی تھیں کہ اتنے میں اُس کی ماں نے آواز دی "بیٹا ذرا باہر تو آ، تو یہ چچے کی ماں کب سے بلا رہی ہیں" وہ جیسے ابھی جاگا ہو "آیا ماتا جی" وہ حیران تھا کہ آج اُنہیں کیا کام ہے وہ آنکھوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا باہر نکلا اُسے سوچنے کا موقع ہی نہ ملا کہ وہ آئی کیوں ہیں۔ اور وہ کہنے لگیں "بیٹا آجکل تو تم دکھائی ہی نہیں دیتے" اِس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دے اُس کی ماں نے کہا "کیا بتاؤں بہن۔ رام جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ نہ کھانے کی سُدھ ہے نہ پینے کی۔ جب دیکھو کمرے میں بند پڑا رہتا ہے۔ ہر وقت پریشان سا رہتا ہے۔ پرماتما نہ کرے اسے کچھ ہو گیا تو۔ ۔ ۔ ۔"

تھوڑی دیر کے لئے بالکل خاموشی رہی، ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے پتھر کے مجسمے ہندوستانی آرٹ کو بے نقاب کر رہے ہوں۔ کرشن سوچ رہا تھا کہ بات کیا ہے کہ چچے کی ماں نے کچھ عجیب لہجہ میں کہا "میں اِس لئے آئی تھی بیٹا کہ تم ذرا مدد کرتے رہنا، مہندر کا بیاہ نزدیک آ رہا ہے۔ میں تمہارے آسرے پر ہی تو بیٹھی ہوں ورنہ کون ہے میرا"

اس کا مُنہ کچھ کہنے کے لئے کھلا، مگر کھلے کا کھلا ہی رہ گیا "مہندر کا بیاہ! ۔۔ ۔ کیا وہ سچ مچ مہندر کو چاہتا ہے۔ اُس کی آنکھیں چچے کی ماں کے چہرے پر گڑ گئیں جیسے اُس کی روح قبض کر لی گئی ہو۔ اُس کی ماں نے اُسے چُپ دیکھکر کہا "کام کیوں نہ کرے گا اپنا ہی تو کام ہے"

وہ عجیب کشمکش و پیچ میں تھا، اور اسی حالت میں وہ اندر چلا آیا، کچھ دیر تک اُسے باتوں کی آواز آتی رہی، شاید جہیز کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی جھلک نمودار ہوئی جیسے ایک جواری اپنا بہت کچھ ہار کر جیتنے کا خیال ہی چھوڑ دے۔ وہ سوچتا تھا شاید اس ہار کی وجہ سے ہی وہ کئی اور چیزیں جیت سکے۔

اُسے رہ رہ کر اپنی ماں پر غصہ آتا۔ مگر ماں نے تو کچھ نہیں

نگاڑا۔ اور ماں سے اُس نے کہا بھی نہیں۔ اگر وہ اس سے کہہ بھی دیتا تو وہ کب ماننے والی تھی کہ دیتی ہم اتنی اونچی لات والے اور وہ اروڑ ٹھے۔ اور پھر شکل وصورت کو دیکھا۔ ناک اتنی بڑی ہے۔ رنگ سانولا ہے اور جہیز بھی نو کیا دیں گے۔ وہ سوچتا اُس کی ماں کتنی عجیب ہے۔ شادی اُس کی ہوئی تھی یا کسی اور کی۔ زندگی اُس کو میرے ساتھ گذارنی تھی یا ماں کے ساتھ۔ اس کا تخیّل نہ جانے کہاں تک پرواز کر جاتا۔ مگر دُولھا کی آمد سے سب خیال جاتے رہے۔

مہندرو کی ماں، دولھا کو چھند سنانے کے لئے بار بار کہہ رہی تھیں۔ مگر وہ تھا اُداس چُپ تھی پاس سے مہندرو کی خالہ زاد بہن جوتیوں کے ڈھیر جس پر سفید چادر پڑی تھی) کی طرف اشارہ کرکے کہتی "یہ ایک بزرگ کی ڈھیری ہے۔ ذرا ماتھا تو ٹیکو؟" پاس ہی سے اُس کی بہن بول اُٹھی "گھڑے میں جھلی گر گئی ہے ذرا نکال دو نا۔" دولھا بیچارہ حیران تھا کہ کیا کرے .... اگر آج وہ سہرا باندھے آتا۔ بالکل اسی طرح تو اِن عورتوں کے چھکّے چھڑا دیتا۔ مقدس آگ کے سامنے منتر پڑھے جاتے۔ پھیرے ہوتے اُسکے پلو کے ساتھ مہندرو کا پلو باندھا جاتا اور سات بار اگنی کے ارد گرد چکر لگاتے۔

دُلہن کو بھی الف بیتیں کہے گئے۔ آخر میں وہ ایک ڈبیہ لئے پہنچا۔ وہ چاہتا تھا کہ مہندرو کو مہندرو نہ کہے بلکہ اُسے پورے نام سے پکارے۔ مگر اُسے معلوم بھی تو ہو۔ مہندر پکاش .... نہیں مہندر وتی۔ نہیں نہیں۔ مہندر کور.... نہیں نہیں۔ اُس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا کہ وہ سوچے اِس لئے اُس نے مہندرو کہنے پر ہی اکتفا کی اور کانپتے ہاتھوں سے اُس نے ڈبیہ کھولی۔ انگوٹھی کا ہیرا چمک اُٹھا اور اُس پر ایک چمکتا ہوا آنسو گرا اُس نے ڈبیہ بڑھا دی۔ ہیرا چمک رہا تھا اور مہندرو کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اتنے میں ایک سہیلی آئی اور وہ باہر نکل آیا۔

مہندرو کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے گرے۔ اُن کے گرنے سے ایک خفیف سی آواز پیدا ہوئی۔ یہ تھی اُس کی شکست کی آواز جسے شاید سہیلی نہ سُن سکی۔

*

[1] مہندرو پنجاب میں ایک نیچی سی ذات ہے۔

ادیب سہارنپوری

غزل

جو لوگ منصبِ یادِ بتاں کو بھول گئے
وہ راہِ زندگیِ جاوداں کو بھول گئے

حدودِ جلوۂ جوشِ بہار کیا کہئیے
جو آشیاں سے اُڑے آشیاں کو بھول گئے

گلوں نے خود کو سنوارا کچھ اس سلیقے سے
کہ رہ کے باغ میں ہم باغباں کو بھول گئے

اُنہیں نہ دیر میں عزت ملی نہ کعبے میں
جو لوگ شیوۂ کارِ مغاں کو بھول گئے

بہت بلند ہے دانائیوں سے رعنائی
اُنہیں نہ بھول سکے۔ دو جہاں کو بھول گئے

رہِ حیات کے دشوار پیچ و خم کو نہ پوچھ
ہزار راہنما۔ کارواں کو بھول گئے

کچھ اس ادا سے بہی جا رہی ہے کشتیِ زیست
کہ جیسے کھول کے وہ بادباں کو بھول گئے

"جہاں نورد" ہیں ابرِ بہار و موجِ نسیم
نہ کہہ کے اہلِ قفس گلستاں کو بھول گئے

ہمیں نہ بھول سکا۔ کارِ آشیاں بندی
ستمگری کے چلن آسماں کو بھول گئے

غمِ خزاں نے اُنہیں عیشِ یکنفس نہ دیا
جو پھول۔ دسترسِ باغباں کو بھول گئے

جو شرق و غرب سے اُٹھے تھے انقلاب ادیبؔ
وہ اب کے بھی مرے ہندوستاں کو بھول گئے

پریم ناتھ پردیسی

تحریک

ہاؤس بوٹ کی جالی دار کھڑکی سے اُس نے باہر دیکھا تو صبح ہو چکی تھی۔ اور آسمان کا مختصر سا حصّہ جو وہ اِس کھڑکی سے دیکھ سکا تھا۔ بالکل صاف تھا وہ انگڑائی لے کر اُٹھا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے رات کا بوجھ اُس کے ذہن سے اُتر چکا ہے اور وہ اس صبح بالکل تازہ دم ہے۔ میز پر رات کا لکھا ہوا نامکمل ناول اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ آج اُسے اِس کا آخری باب لکھنا تھا۔ جس میں وہ بے انتہا رعنائی، بے انتہا سرا کت بھرنا چاہتا تھا۔ اُس نے ناول کی طرف فاتحانہ انداز میں دیکھا۔ اور اپنے میں خوشی سی محسوس کی۔ یہ ناول اُس کا شاہکار ہوگا۔ جس میں اُس نے ایک اَن کہی بات — موت کا جنم — بیاں کی تھی۔

اُس کے ذہن میں مکمل ناول گھومنے لگا۔ جاذب نظر کتابت، حسین طباعت، لظر نواز گرد پوش اور پھر احباب کی مبارک بادیاں اور اہلِ نظر کے شاندار تبصرے، معتدر رسائل کے حوصلہ افزا ریویو۔ اور ادب میں قابلِ قدر اضافہ۔ اُسے اپنا آپ بہت بڑا نظر آنے لگا۔ کچھ کچھ سنجیدہ اور مُدبّر۔ لیکن وہ حیران بھی تھا۔ کہ یہ سنجیدگی یہ تدبّر آج تک اُس کی نظر سے اوجھل کیوں رہے۔ وہ اگرچہ شروع ہی سے [illegible] کا قائل تھا لیکن یہ [illegible] آج تک کیوں پیدا نہ ہوئی تھی۔ اور آج اس کے لئے کون ذمہ دار تھا۔ نادان ملاح کے خوبصورت نالے کا دلکش ماحول یا مہاجنی قسم کے تاثر کی پیشگی ادائیگی۔ جو اُس نے اپنی طرف سے فراخ دلی سے کی تھی۔ خیر کچھ بھی ہو۔ وہ آخر کار زیادہ دیر اپنی قدر سے غیر واقف رہا۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ اُس کے اندر ایک اور جیز ہے جو اس کی شوخ و معصوم طبیعت سے یکسر مختلف ہے۔ جس میں سنجیدہ سوچتی ہے۔ بڑھاپے کا سا تجربہ ہے۔ اور چنار کا سا پھیلاؤ۔

وہ ہاؤس بوٹ کے اگلے حصّے پر آ گیا۔ سندھ کا نالہ اپنے گدلے پانی کو لئے آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ آسمان پر بادل آدھے چھٹ چکے تھے اور آدھے کسی بے پرواہ دوشیزہ کی طرح کبھی پہاڑوں کی طرف لپکتے تھے اور کبھی میدانوں کی طرف۔ نالے کے دونوں طرف سبزے سے ڈھکے ہوئے کھُلے میدانوں میں دُور کے گاؤں کی مریل سی گائیں اور مویشی سر جھکائے آ رہے تھے اور ہاؤس بوٹ کے بالکل نزدیک سفید بطخوں کی ایک قطار اپنی زرد چونچوں سے بال سنوار رہی تھیں۔ بائیں طرف کے میدان میں چناروں کے نیچے ایک مبہوت سی خاموشی لہرا رہی تھی۔ اور دلوں کے اکھڑے اکھڑے چھلکوں میں کچھ چوزے کیڑے مکوڑے تلاش کر رہے تھے۔ کنارے لگے ہوئے ہاؤس بوٹوں کی قطار میں حرکت سی پیدا ہو گئی تھی۔ سیاح ابھی سو رہے تھے۔ مگر ملاح اپنے بال بچوں سمیت کشتیوں کی رسیاں اور چپو ٹھیک کر رہے تھے۔ رات کو یک لخت نالے میں زیادہ پانی آ گیا تھا اسی لئے۔ حالانکہ بارش زیادہ زور کی نہ ہوئی تھی۔ پھر بھی میدانوں کے سبزے سے ڈھکے ہوئے دامن گدلے پانی میں ڈوب گئے تھے۔ اور بہت حسین نظر آنے تھے۔ نیلا سبزہ اور گدلا پانی — کیا یہ بھی [illegible] ہی تھی؟ جس نے خود نالے اور نالے کو راستہ دکھانے والے میدان کو اِس قدر حسین بنا یا تھا شاید اُن دُور کی سیاہ اور چلی جلی پہاڑیوں کے پیچھے کسی مہاجن نے رات کے اندھیرے میں اپنی فراخدلی کا ثبوت دیا ہے۔ اور نالے کو اپنی عظمت، سنجیدگی اور پھیلاؤ ظاہر کرنے پر اُکسایا ہے۔

دُنیا میں سب کچھ محض — [illegible] پر ہوتا ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ اور اپنی دلیل پر خود ہی بشاشت سی محسوس کرنے لگا۔ سائنس، آرٹ، ادب، سب اسی سے آگے بڑھتے ہیں ورنہ دُنیا میں آج سے ایک ہزار برس پیشتر جو کچھ تھا وہی آج بھی ہوتا۔ تحریک ایک نامحسوس زندگی کی حرکت ہے۔ جلن ہے۔ پھیلاؤ ہے۔

اُس کے نوکر نے میز پر چائے کا سامان چُننا شروع کیا۔ سفید مٹی کے پیالوں اور برتنوں کی جھنکار اور چنگو بسے کی طرح کشتی کی دل نواز حرکت سے چونک کر اُسے احساس ہوا۔ کہ

وہ کافی دیر سے یہاں کھڑا ہے حالانکہ اس وقت تک اُسے یہاں سے کبھی فارغ ہو جانا چاہیئے تھا۔ وہ جلد جلد قدم اُٹھاتا ہوا باغ میں گیا۔ اور جب واپس آیا تو میز پر گرم گرم چائے اس کا انتظار کر رہی تھی اُسے اس سے بیشتر بہت کھانے پینے کے موقعوں پر تنہائی کا شدید احساس ہوتا تھا۔ لیکن آج حالت بالکل مختلف تھی۔ وہ تنہا نہیں تھا۔ خیالات کا ایک ہجوم اُس کے دماغ میں باہر نکلنے کے لئے چلّا رہا تھا اور لمحہ بہ لمحہ نالے کے پانی کی طرح بڑھتا جا رہا تھا، جسے روکنا اب اُس کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ اُس نے اسی لذّت احساس میں چائے پی۔ مارملیڈ لگے ہوئے ٹوسٹ کی شیریں تُرشی اُسے مطلق محسوس نہ ہوئی۔ صرف چائے کی گرمی جو دماغ کے خیالات کو اور مشتعل کر رہی تھی۔

وہ نامکمل ناول پر جُھک گیا۔ طوئنیہ سات جزیروں کی رانی بننے کے خواب میں آشتی کی محبت کو اپنے گورے پاؤں تلے روند کر چلی گئی تھی۔ اور آشتی حیران و پریشان، سراب اور حقیقت کے بھنور میں بھٹک رہا تھا۔ اُسے دل ہی دل میں آشتی سے نفرت ہو گئی طوئنیہ نے اگر ریٹالانگا کے خزانے دیکھے تھے۔ اُس کے راج محل دیکھے تھے۔ اُس کی بے پناہ فوج دیکھی تھی تو اس میں اُس کا کیا قصور تھا۔ عورت ہمیشہ ظاہر پسند اور جاہ پرست ہوتی ہے۔ اُس کی نظر اتنی صاف نہیں جو گوشت اور پوست کو چیر کر باطن کو دیکھ سکے۔ اور پھر آشتی کے پاس تھا کیا؟ صرف خیالات، حسین ہی سہی مگر اُن سے زندگی سنور تو نہیں سکتی۔ ریگستان میں مُرلی بجانے سے سبزہ نہیں اُگ سکتا۔ پھر طوئنیہ اُس کی محبت کا دم بھر کر اپنے شباب اور حُسن کو ریگستان کیوں بناتی؟ اُس نے اچھا کیا کہ آشتی سے صاف صاف کہا۔ میں ایٹالانگا کی رانی بنونگی۔۔ اور سات جزیروں کی ملکہ جہاں جہاں زندگی ہی زندگی ہے۔ اور آشتی اب تک کاغذ کے سفید ورقوں پر کھڑا سوچ رہا تھا۔ میرے خیالات کے لازوال سات جزیروں کی حکمرانی کون کریگا۔ سورج دیوتا نے جو آگ میرے سینے میں پھونک دی ہے اُس کی تپش کیسے آدم کی اولاد تک پہنچے گی۔۔؟

تھوڑی دیر کے لئے وہ پریشان سا ہو گیا۔ خیالات کی اَن دیکھی زنجیریں بھی کس قدر نرالی ہوتی ہیں جب کھلنے پر آتی ہیں تو کھلتی ہی جاتی ہیں اور جب گرہ لگ جاتی تو آدمی دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ اِس گرہ کو محسوس کر رہا تھا۔ بلکہ اُسے دیکھ رہا تھا۔ دماغ میں چلّانے والا خیالات کا ہجوم خاموش ہو گیا تھا۔ جیسے اُس نے بھی اپنے سامنے کوئی خطرہ دیکھا ہو۔ اور وہ اب ہارے ہوئے لوگوں کی طرح کھسک رہا تھا منتشر ہو رہا تھا۔

وہ دوبارہ اُٹھا۔ اور باہر آ گیا۔ میدانوں میں میلی سی دھوپ پھیل گئی تھی جس سے نالے کا پانی اور گدلا دکھائی دیتا تھا۔ بادل کے منتشر ٹکڑے باہوں میں باہیں ڈالے دُور کی پہاڑیوں کی طرف جا رہے تھے۔ چناروں کے نیچے برف ایسی سفید چادروں سے ڈھکی ہوئی میزیں اور گدیلے والی کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ گائیں گردنیں جُھکا جُھکا کر چر رہی تھیں۔ اُن کے چرنے سے ایسی آواز آ رہی تھی جیسے کوئی ناتجربہ کار درزی کفن کا کپڑا پھاڑ رہا ہو۔ کہیں کہیں ریوڑ میں آٹھ دس بیل کسی دُم اُٹھائی ہوئی گائے کے پیچھے بے تحاشا بھاگ رہے تھے۔ باقی بیل اپنی سوکھی گردنیں حیران ہو کر اُوپر اُٹھائے تھے جیسے پوچھ رہے ہوں۔ کون تھی وہ؟ لیکن وہ مرگ انبوہ میں شامل ہونے کی ہمت اپنے میں نہ پاتے تھے۔ البتہ پیشاب کی ایک دھار بکھیرتے بکھیرتے وہ دوبارہ چرنے لگتے تھے۔ اور کفن پھاڑنے کی آواز ـــــ

اُس نے بے اختیاری کے عالم میں بوٹ سے لگے ہوئے تختے کو عبور کیا۔ جب کنارے پر پہنچا تو اُس کے پائنچے پانی سے بھیگ چکے تھے۔ لیکن اُس نے اِس طرف کوئی توجہ نہ کی۔ وہ دراصل آشتی کے سینے کی آگ کسی کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔ اور طوئنیہ ایٹالانگا کا مال و متاع دیکھ کر اُس کی رانی بننے کے لئے چلی گئی تھی۔ عورت جاہ پرست عورت۔ اُسے افسوس ہوا کہ اُس نے طوئنیہ کے دماغ میں جاہ پرستی کا جذبہ پیدا ہی کیوں کیا۔ اور اُسے آشتی سے جُدا کیوں ہونے دیا لیکن کیا وہ ایسا کر سکتا تھا؟ کیا اِس کے سوا عورت کی صحیح تعریف ہو سکتی تھی۔ جب وہ عام ادیبوں کی طرح حقیقت پسند تھا۔ اگر ایسا بھی نہ کیا جاتا تو ادب کے سوچ پرور نخلستان میں سراب نظر آتا جس پر سب حرف گیری

کرے۔ اور وہ شاندار تبصرے اور ریویو اور مبارک بادیاں۔

وہ چناروں کے نیچے نیچے سہمے ہوئے سے انداز میں چلتا گیا۔ مبہوت خاموشی اگرچہ میلی دھوپ سے دُور ہو گئی تھی۔ مگر اُسے اب بھی چناروں کے تنوں سے لپٹے ہوئے' پتوں کے ہجوم میں چھپے ہوئے کسی ناقابلِ بیان خوف کا احساس ہوا۔ کیا تھا وہ۔؟ کیسا خوف؟ وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ مگر کچھ تھا ضرور ـــــ کبھی کبھی کوئی سوکھا پتہ اُوپر سے لہرا کر نیچے گرتا تھا تو وہ چونک اُٹھتا تھا۔ اور چنار کی غیر منظم چوٹی کو دیکھنے لگتا تھا۔ جہاں پتے اور شاخیں بے حس و حرکت تھیں شاید انہیں اپنے ایک ساتھی کے چھوٹنے کا غم نہ تھا۔ کنارے لگے ہوئے ہاؤس بوٹوں میں اب مکمل زندگی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ وہ کھلی کھڑکیوں سے اندر کے کمروں کا کافی حصّہ اچھی طرح سے دیکھ سکتا تھا۔ سجے سجائے کمرے' حسین فرنیچر' پھولوں کے گملے، تصاویر' ٹائلیٹ کا سامان' صاف ستھرے آئینے۔ جاذب نظر کتابیں اور اُجلے اُجلے بستر' جیسے زندگی مسکرا رہی ہو۔ لیکن ایک بات تھی کسی بھی ہاؤس بوٹ میں اُسے پارے کی طرح تھرکتا ہوا نوجوان سیاح نظر نہیں آیا۔ صرف بوڑھے انگریز اور بوڑھی میمیں۔ جن کے سفید چہروں پر مکڑی کے جالے کی طرح جھریاں تھیں اور گراموفون ریکارڈ کی طرح بے شمار داستانیں کھدی ہوئی' شباب کی' محبت کی' سیر و سیاحت کی' معاشقوں کی۔ ... پھر بھی وہ سب خاموش تھے۔ خاموش مگر پُر اُمید۔ اور اُن کمین گاہوں میں مسکراتی ہوئی زندگی ـــــ

وہ حیران رہ گیا۔ اتنے حسین ماحول میں یہ بُڈھے اور بُڑھیاں کس لئے آئی ہیں؟ انہیں کسی قبرستان کے پاس ٹھہرنا چاہیئے تھا یا کسی غیر جذباتی مقام پر؛ جہاں زندگی کی شام زیادہ عیاں ہوتی ہے۔ پھر ان کا یہاں کیا کام؟ کیا یہ زندگی سے فریب کرتے ہیں؟ حسین ساز و سامان سے لدے پھندے ہاؤس بوٹوں میں رہ کر اُس سے دھوکا کرتے ہیں یا اپنی زندگی کی تھکی اور کُملائی ہوئی شاموں کے لئے اس قدر پُر فضا مقام کی حسین بالشتوں سے رس لیتے ہیں اور اُنہیں نیلے سبزے کی طرح تر و تازہ رکھتے ہیں۔

خبر کچھ بھی ہو۔ اُسے کیا۔ وہ خود بھی زندگی سے نبھاہ کرنے کا قائل ہے۔ خواہ وہ زندگی کتنی ہی نا اُمید' تھکی ہوئی اور بدصورت کیوں نہ ہو۔ اور یہ نبھاہ صرف sublimation سے ہو سکتا ہے۔ سیگبوں اور فراخ دلیوں سے۔ لیکن اُس کے آشی کو کیا ہوا۔ وہ نبھاہ کیوں نہیں کریگا۔ اگر طوبہ اپنا عورت پنا دکھا کر چلی گئی تو کیا ہوا آشی اِن بوڑھی عورتوں اور بوڑھے مردوں کی طرح کسی اور سے رس لے سکتا ہے۔ اور زندگی سے نبھاہ کر کے چھپی ہوئی آگ آدم کی اولاد کے حوالے کر سکتا ہے۔ وہ اس خیال پر بہت خوش ہوا اور اُسے اپنے اندر چھپے ہوئے فنکار کی سنجیدگی کا شدید احساس ہوا۔

وہ آگے چلتا گیا۔ ایک چنار کی اوٹ میں کرسی پر بیٹھی ہوئی ایک بوڑھی میم نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"آپ بیٹھئے۔ آج موسم بے حد خوشگوار ہے۔" اُس نے کہا۔

اُس نے دیکھا' بوڑھی اُن سے مختلف نہیں جو کنارے لگے ہوئے ہاؤس بوٹوں میں وہ دیکھ چکا تھا۔ خاموش' ضعیف' گرتی ہوئی سی ـــــ مگر پُر اُمید۔

"شکریہ" اُس نے قریب جا کر کہا۔ "واقعی آج موسم بے حد خوشگوار ہے۔"

بُڑھیا نے نیلی رگوں سے بھرا ہوا ہاتھ اُٹھا کر اُسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہا "آپ شاید سیر کو جا رہے ہونگے۔ سچ مچ یہ وقت گھومنے کا ہے۔"

وہ اگرچہ سیر کو نہیں جا رہا تھا' بلکہ ہارے ہوئے خیالات کے ہجوم کو منتشر کرنے کے لئے' پھر بھی بحث میں نہ پڑنے کی خاطر اُس نے کہا "جی۔ میں صبح کی سیر کا بڑا قائل ہوں۔"

بُڑھیا نے ایک آہ سرد کھینچ کر کہا۔ "جوانی میں سیر سراب سے کم کیف آور نہیں ہوتی۔ کبھی میں بھی سیر کیا کرتی تھی مگر اب مجھ میں طاقت نہیں۔ پھر بھی چند قدم گھوم ہی لیتی ہوں۔"

"طاقت نہیں؟" اُس نے عام ہندوستانی کی طرح حیرانی ظاہر کر کے کہا۔

بوڑھی میم نے مسکرا کر کہا۔ "بوڑھی جو ہوں۔"

"بالکل نہیں۔ یہ تمہارا وہم ہے مادام۔ مجھے تم خاصی

جوان اور حسین نظر آتی ہو۔" اُس سے مسکرا کر کہا۔

بوڑھی عورت کے سفید چہرے پر ہلکا سا گلابی رنگ نکھر گیا۔ جس سے مکڑی کے جالے بھر گئے۔ اُس نے اُچھل کر پوچھا "کیا سچ مچ۔ میں خاصی جوان اور خوبصورت نظر آتی ہوں۔؟"

اُس نے اُسی انداز میں کہا "بالکل"۔

بوڑھی عورت نے مسرت بھرے لہجے میں کہا "اسی لئے مجھے ہندوستانیوں سے پیار ہے۔ کہ وہ کبھی حقیقت کو نہیں چھپاتے۔ حالانکہ آج کل یہ فیشن بھی ہے"۔

اُسے اپنا چہرہ کانوں تک جلتا ہوا محسوس ہوا۔ کیا یہ حقیقت تھی کہ وہ خاصی جوان اور حسین ہے۔ کیا اُس کے سفید چہرے پر سُکڑے ہوئے چمڑے کی طرح جھریاں نہیں؟ کیا وہ ضعیف نہیں؟ پھر اُس نے جھوٹ کیوں کہا۔ اپنے حقیقت پسند ضمیر کا گلا کیوں گھونٹا۔؟ وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہوا لیکن اُس نے کسی تاثر کو چہرے پر ظاہر ہونے نہ دیا۔ اُس نے بات کو ٹالنے کی نیت سے موضوع بدلا "تم کتنے دن رہو گی مادام۔؟"

بڑھیا نے ہنس کر کہا "پورا سیزن۔ میں آج سے چالیس برس پہلے یہاں آچکی ہوں اور آج تک اسے نہیں بھولی۔ لیکن اُن دنوں شادی پور اس سے زیادہ خوبصورت تھا۔ آج خوبصورت جگہوں پر مذہب آ کر بیٹھ گیا ہے۔ مندر اور مسجدیں اور قبرستان"۔

"چالیس برس پہلے؟" اُس نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔ اُن دنوں میں اچھی لڑکی تھی۔ اور اپنے خاوند کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔" بڑھیا نے کہا۔

"لیکن اب وہ کہاں ہے؟" اُس نے پوچھا۔

بڑھیا کے چہرے کا ہلکا گلابی رنگ اُڑ گیا۔ اُس نے آسمان کی طرف آنکھیں اُٹھا کر کہا "اُسے خدا نے جنت میں جگہ دی ہے"۔

اُسے افسوس ہوا کہ ایسا سوال اُس نے پوچھا ہی کیوں جس سے بوڑھی عورت کے جذبات مجروح ہو گئے۔ لیکن جلد ہی اُس کا تاسف دُور کرنے کے لئے اُس نے پوچھا "اور وقت کیسے گذارتی ہیں آپ؟"

بوڑھی عورت کی آزردگی ابھی مکمل طور پر دُور نہ ہوئی تھی۔ بیٹھی ہوئی آواز میں بولی "کتابیں پڑھ پڑھ کر، خدا کی عبادت کر کے۔ یا چند قدم گھوم کر"۔

"کتابیں بھی ——؟"

"ہاں، مجھے مختصر افسانوں سے بے حد لگاؤ ہے۔ اور یہی حال میرے جنتی خاوند کا بھی تھا ہر چند وہ ہائیکورٹ کا جج تھا اور اکثر قانونی پیچیدگیوں کو سُلجھانے میں مصروف رہتا تھا۔ مگر گھر بھی ہر فرصت کے لمحے وہ کہانی ہی پڑھتا تھا۔"

"یہ اچھی بات ہے" اُس نے ہنس ہنس کر کہا "کہانی انسان کو تازہ دم کرتی ہے اور اُسے دعوتِ فکر دیتی ہے"۔

"ہاں۔ بشرطیکہ کہانی میں لکھنے والے نے کوئی بات پیدا کی ہو۔ ورنہ عام طور پر وہی سستی سی محبت کے بے جوڑ قصے ہوتے ہیں۔ جن سے مجھے سخت نفرت ہے"۔

"آپ کس قسم کی کہانیاں پسند کرتی ہیں؟" اُس نے پورے اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔

"میں؟" وہ ذرا سے مسکرائی۔ "مجھے وہ کہانیاں پسند ہیں، جن میں زندگی کے مسائل پر روشنی پڑتی ہو۔ نئے زاویوں سے، نئے نظریوں سے، ورنہ جن میں خدا کی عظمت جھلکتی ہو"۔

"لیکن اکثر افسانہ نگار اپنی کہانیوں میں زیادہ تر محبت ہی بیان کرتے ہیں۔" اُس نے طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"صحیح اسی لئے مجھے اُن سے نفرت ہے۔ میں ہمیشہ ٹالسٹائی کو پسند کرتی ہوں"۔

"اور ناول کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"ناول؟ مجھے مطلق پسند نہیں۔ اوّل تو اس لئے کہ اسے پڑھنے کے لئے وقت کی ضرورت ہوتی ہے جو اکثر میرے پاس نہیں ہوتا۔ دوم اس لئے کہ ناول میں مبالغے سے کام لیا جاتا ہے"۔

اُسے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی اپنا آپ بوجھل سا محسوس ہونے لگا۔ جیسے اُس کے گھٹنوں پر بڑے بڑے پتھر رکھے گئے ہوں۔ لیکن جلد ہی اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ کیا اس بوڑھی

عورت کی رائے قابلِ قدر ہے جو قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھی ہے۔
یہ ٹھیک ہے۔ کہ ناول کے لئے وقت چاہئیے۔ لیکن مبالغہ آمیزی۔
بلے وہ ماننے کو تیار نہیں۔ ناول میں مبالغہ نہیں ہوتا۔ فن
کاری ہوتی ہے۔ فن کو ابھارنے کے لئے چابکدستی ہوتی ہے۔
ادب کو لازوال بنانے کے لئے جذبات ہوتے ہیں اور حُسن۔
اُس نے اس موضوع پر مزید گفتگو نہ کرنا چاہی، اور اُٹھنے
کی تیاریاں کرنے لگا۔ بُوڑھی میم اس کی حرکت تاڑ گئی۔ بولی۔
"اگر اعتراض نہ ہو تو ہم ہر شام کو اکٹھے گھوما کریں گے"۔
اُس نے مصنوعی مسکراہٹ پھیلا کر کہا "مجھے کوئی
اعتراض نہیں"۔
"لیکن آپ اپنا وقت کیسے گذارتے ہیں؟" بڑھیا
نے پوچھا۔
اُس نے اپنے دل میں نامانوس سی کمزوری محسوس
کی۔ بولا "میں ایک ناول لکھ رہا ہوں"۔
"ناول؟ مائی لارڈ" اُس نے چلا کر کہا۔ "خدا کے
لئے نہ لکھیئے۔ یہ تضیع اوقات ہے اپنی بھی اور اوروں کی بھی"۔
اُس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ وہ مسکراتا مسکراتا واپس
آیا۔ لیکن یہ مسکراہٹ ہر قدم کے بعد ہوا میں اُڑ گئی جس کے
عوض غصّہ، نفرت اور انتقام کے جذبے پوری شدّت کے
ساتھ اُبھرتے گئے۔ اور وہ حقیقت کا اظہار کرنے کے لئے
چلّانے کا قصد کرنے لگا۔ بُوڑھی عورت۔ چُڑیل تمہارے
ساتھ گھوم کر مجھے کیا ملے گا۔ میں کیوں تمہارے ساتھ گھوموں
تمہیں ناول کا کیا پتہ کہ ہمارے ادب میں اِس کی کس قدر
ضرورت ہے۔ اور ہمیں اِس کے لئے ابھی کیا کچھ کرنا ہے۔
تم تو اپنی بیہودہ سی موت کا انتظار گھمبیر گھمبیر چناروں کے
نیچے کر رہی ہو۔ تمہیں ہم نوجوانوں کی زندگی میں دخل
دینے کا کیا حق ہے؟ تو سچ مچ بوڑھی ہے۔ میں نے جھوٹ
کہا تھا کہ تو خاصی جوان اور حسین ہے۔ تیرے ضعیف
ہاتھوں کی نیلی رگیں سوکھ کر سکڑ گئی ہیں۔ تیری زندگی
کا سورج سیاہ اور جلی جلی پہاڑیوں کے پیچھے چھپ
گیا ہے۔ تیری زندگی کو اب کوئی
نہیں دے سکتا۔ نہ تیرے ہاؤس بوٹ کا ساز و سامان
نہ نازان باغ کا پُر کیف ماحول نہ ٹالسٹائی کی کہانیاں۔
موت ایسی بے رحم آنکھوں سے تجھے دیکھ رہی ہے۔ اور چناروں کے
پتوں میں چھُپی بیٹھی ہے۔ میں ناول لکھوں گا اور ضرور لکھوں گا
اگرچہ طویل ... [illegible]
ہے۔ وہ ... انتظار کر رہی ہے ... [illegible]
کرنا سکوں گا ... [illegible]
قہقہے بلند کر دیئے۔

وہ چلتا گیا۔ چناروں کے ... [illegible]
دھوپ کی کرنیں ... [illegible]
لٹک رہی تھیں۔

اور جب وہ دوبارہ ... مکمل ناول ... [illegible]
بدستور موجود تھی۔ آتشی ... [illegible]
بر لبان کھڑا تھا۔ وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اُسے آگے ... [illegible]
یا نہیں ——

مطبوعاتِ ساقی بُک ڈپو، دہلی

کولتار: اس کتاب میں ... [illegible] اور مزاحیہ افسانے ہیں ... [illegible] مل کر کتاب کو پورا مزاحیہ ناول بنا دیتے ہیں۔ قیمت [illegible]

روحِ ظرافت: جغتائی صاحب کے ... [illegible] مجموعہ، پہلا ... [illegible] ہے۔ قیمت [illegible]

روحِ لطافت: جغتائی صاحب کے ... [illegible] کا مجموعہ ... [illegible] ہے۔ قیمت [illegible]

پُھل بُوٹ: حسن و عشق کی ... [illegible] ایک جوتے کی ... [illegible] قیمت [illegible]

شریر بیوی: جغتائی صاحب کا ... [illegible] زیادہ مقبول مزاحیہ ناول۔ قیمت [illegible]

کمزوری: "اے عورت تیرا نام کمزوری ہے" ... [illegible] ایک بڑی حیرتناک داستان۔ قیمت [illegible]

مسٹر کرشلے: یہ ناول ایک عبرتناک ... [illegible] ہے۔ قیمت [illegible]

امین حزیں

جمالِ نشین

فغانِ نیم شبی میں اگر گداز نہیں
نوائے راز نہیں وہ نوائے راز نہیں
وہ عشق عشق نہیں جو نیاز مند نہ ہو
وہ حسن حسن کہاں کا جو بے نیاز نہیں
جبھی تو عام ہوا "عشق دشمنی" کا جنوں
کہ عشق روزِ ازل سے زمانہ ساز نہیں
نشانے پر ترا تیرِ نگاہ کیا پڑتا!
دل و جگر کا جب آپس میں ساز باز نہیں
شکارِ زندہ کے جلووں کی تاب کیا لائے!
کہ چشمِ زاغ و زغن چشمِ شاہباز نہیں
قمر ستاروں سے نرگس گلوں سے کہتی ہے
نگاہ جسکی نہیں پاک پاکباز نہیں
کسی کے ہجر نے دوزخ میں ڈال رکھا ہے
امیں عذاب کی علت شبِ دراز نہیں

امین حزیں

معارف

مدارِ ظرفِ نگہ عزم کی بلندی ہے
یہ خود ستائی نہ نخوت نہ خود پسندی ہے
زماں سے لاگ مکاں سے لگاؤ تک نہ رہے
اگر عزیز تخیّل کی ارجمندی ہے

(۲)

نگاہِ فکر نہیں ہے فلک شگاف اگر
اٹھ اور آخرِ شب کا دکھا اسے منظر
تڑپ اٹھیگی یہ معراجِ لامکاں کے لئے
نظر جب آئیگا اس کو "تراقِ نجمِ سحر"

(۳)

تجلیات سراپا امیں ظہورِ سحر!
نگاہِ فکر کا زینہ کمندِ نورِ سحر!
شجر حجر کی زباں پہ ہے نغمۂ اَرِنی!
ستارہ صبح کا گویا ہے شمعِ طورِ سحر!

(۴)

جنابِ ساقیٔ فطرت کا انتظام تو دیکھ
شفق کی آتشِ سیال[1] زینتِ جام تو دیکھ
کلی کلی نے صراحی سنبھال لی اپنی
ہے کس غضب کا صبوحی کا اہتمام تو دیکھ

[1] آتش سیال یعنی شرابِ سرخ!

طاہرہ دیوی شیرازی

بابل کے تہذیب و تمدن پر ایک نظر

میسوپوٹیمیا یا عراق میں تمدن کے ایک دوسرے دور کو بابل کے تمدن کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بابل کے معنی (باب اور ایل) اللہ کا دروازہ ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے لگ بھگ تین ہزار سال پہلے بابل کا شہر بسایا گیا اور دو ہزار سال تک تہذیب و تمدن کا ایک بڑا مرکز بنا رہا۔ شاید دنیا کی کوئی دوسری راجدھانی اتنی طویل مدت تک دولت اور عظمت کا مرکز نہیں رہی مہاراج حمورابی کے بعد سے بابل کا نام تاریخ میں ہمیشہ روشن رہا ہے۔

سمیر اکعاد اور ایلام کو جیتنے کے بعد حمورابی کی حکومت کا سکہ رعایا کے دلوں پر بیٹھ گیا۔ دیس کی ترقی کے ہر مسئلے پر اس نے غور کیا۔ دھرتی کی قدرتی پیداوار کو بڑھانے کے اس نے ذرائع نکالے۔ پرجا کے سکھ چین کی طرف اس نے دھیان دیا۔ حمورابی کا ایک ایسا بیان ہے جو حال کی کھدائی میں نکلا ہے۔ اس میں لکھا ہے:۔

"میں حمورابی بابل کا مہاراجہ ہوں۔ انو اور بیل کی دیا سے سمیر اور اکعاد کا راج میرے ہاتھوں میں آیا ہے۔ دیوتاؤں کی کرپا سے مجھ حمورابی نے لوگوں کی بھلائی کیلئے یہ بڑی نہر کھدوائی ہے۔ یہ نہر پانی کی کبھی ختم نہ ہونے والی مقدار سمیر اور اکعاد کے شہر میں لاتی ہے۔ اس نہر کے دونوں طرف کی زمین جو پہلے بنجر پڑی تھی آج دھان کے کھیتوں سے لہلہا رہی ہے۔ اس زمین میں میں نے خوب بیج بوائے سینچائی کے لئے پانی کافی مقدار میں فراہم کیا۔ اس دیس کی بدانتظامی کو میں نے انتظام میں بدلا، اور یہاں کی بکھری ہوئی قوموں کو میں نے پریم کے ایک ہار میں گوندھا۔ جنتا کو خوش حال اور سکھی بنایا۔ میں نے انہیں وہ جیون دیا جس سے وہ جتنی چاہیں ترقی کر سکتے ہیں۔"

جس دیس میں بارش شاید ہی کبھی ہوتی ہو، وہاں حمورابی کی بنائی ہوئی یہ نہر آبپاشی کے لئے فائدہ مند ثابت ہوئی۔ اس کے بعد اس نے عمارتیں بنانے کا کام ہاتھ میں لیا۔ بابل میں اس نے کال کے بُرے دنوں کے لئے بہت بڑی کھتی بنوا کر اس میں گیہوں جمع کیا۔ اور لارسا اور سپیر میں اس نے سورج کے عالیشان مندر بنوائے۔ بارسپیر اور بابل میں بھی اس نے بڑے بڑے مندر بنوائے کل بادائیں میں بغداد کے پاس اس نے اپنے رہنے کے لئے ایک بڑا محل تیار کروایا۔ سمیر کی پرانی کتابوں کو اس نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اکٹھا کیا۔ تہذیب و تمدن کے معیار پر اس نے بابل کو بڑے اونچے رتبے تک پہنچایا۔ بعد میں جب حکومت بابل سے ہٹ کر اسیریا کی راجدھانی نینوا میں پہنچ گئی تب بھی بابل تہذیب کا مرکز بنا رہا۔ اسیریا کے راجہ دھرم کے معاملوں میں بابل ہی کی پیروی کرتے تھے نینوا سپاہیوں کا مسکن تھا، بابل عالموں کا وطن تھا اور حمورابی ہی کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ وہی بابل کی عظمت کا اصلی بانی تھا۔ اس نے ۴۵ سال تک اس لمبے چوڑے ملک پر حکومت کی۔ اس کی سلطنت ٹھوس بنیادوں پر قائم ہوئی تھی۔ اُتر اور دکھن دونوں نے اس کے وارثوں کا لوہا مانا اس سکھ شانتی کے زمانے میں علم اور فن کو اس ترقی کا موقعہ ملا جس کی جوت سے دنیا صدیوں تک جگمگاتی رہی۔

حمورابی کے عہد میں بابل کا سب سے بڑا دیوتا ماروک سمجھا جانے لگا۔ حمورابی نے بابل کے سماج کو نئے سرے سے ترتیب دی۔ اس نے ساری آبادی کو تین طبقوں میں بانٹا۔ اول امیلو۔ اس میں پجاری، سرکاری افسر اور فوج کے سپاہی ہوتے تھے۔ دوسرے مشکینو۔ اس میں بیوپاری دکاندار کاریگر، مزدور اور کسان ہوتے تھے تیسرے داس[1] اس میں لڑائی کے قیدی، غلام، غلاموں کی اولاد اور نئے خریدے ہوئے غلام ہوتے تھے سپاہی دو طرح کے

---

[1] تیسرے طبقے کا اصلی نام "وارددو" تھا۔ پنڈت جی نے اسے داس لکھا ہے۔

ہوسکے۔ ان میں حاصل وصول نہیں رکھتے۔ یہ گھمسان کی لڑائی لڑتے تھے اور خود راجہ ان کا سردار ہوتا تھا۔ یہ سات سات کی قطاروں میں چلتے تھے۔ لڑائی کے میدان میں راجہ بدن پر کا چھالا ... پر مرگ چھالا ڈال کر اور سر پہ مغز ... ما ... جو زمین ملی تھی، وہ الگو ... تھی۔ یہ جائداد نہ ضبط ہو سکتی تھی نہ بیچی جا سکتی تھی اور نہ مہاجن اسے قرض کے عوض لے سکتا تھا۔

... ہمیوں کو چھوڑ کر بانی صنعتا سے لڑائی کا ایک ... ٹیکس لیا جاتا تھا۔

حمورابی کو جرموں کی سزا کے معاملے میں بہ نسبت سمیر والوں کے زیادہ سختی برتنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایک ... اس کے متعلق لکھتا ہے:

"سمیر میں پہلے زنا کی سزا توبہ اور بے عزتی تھی لیکن حمورابی کے ... میں اس کی سزا موت قرار دی گئی۔ سمیر میں جو کوئی کسی کے ... اور محرم غلام کو پناہ دیتا اسے ... جرمانہ دینا ہوتا تھا۔ حمورابی کے قانون کے مطابق ... کی سزا کبھی موت قرار پائی۔ ... غلام کو ... دیتے تھے۔ ... قانون کے مطابق اس کا ... کاٹنے کی سزا ملتی تھی۔ کوئی شخص بیک وقت ایک ... عورت سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔"

حمورابی کے قانون کے مطابق ... کے جرم میں ... تھا کہ نیک چلن عورت کو اگر اس کا شوہر لونڈی ... یا اسے الگ رکھتا تو وہ جہیز کے ساتھ طلاق کی حقدار ہوتی تھی ... عورت کو ندی میں پھینک دیا جاتا تھا۔ کوئی شوہر ... بیمار بیوی کو طلاق نہیں دے سکتا تھا۔ اگر عورت ... ہوئے پکڑی جاتی تو اسے اس مرد کے ساتھ باندھ کر دریا میں پھینک دیتے تھے۔ اگر شوہر ... دونوں کو معافی مل جاتی۔ اگر عورت کسی ... پر ملزم ٹھہرائی ... ہو تو وہ قسم کھا کر اپنی گلو خلاصی کرا لیتی تھی۔

مقدموں کے معاملے میں بھی حمورابی نے کچھ نئے قاعدے بنائے۔ مدعی کو کبھی کبھی بابل آنا پڑتا تھا، یا اس کی طرف سے کوئی وکیل پیروی کر سکتا تھا۔ کبھی تین اور کبھی چار پنچ عدالت میں بیٹھتے تھے۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے اور کبھی کبھی گھرانے کے مکھیا پنچ مقرر کر دئے جاتے تھے۔ ان پنچوں میں عورتیں بھی ہوتی تھیں۔ ایسے مقدموں میں جن میں موت کی سزا مل سکتی تھی۔ جھوٹی گواہی دینے پر اس گواہ کو موت کی سزا دی جاتی تھی۔ روپے پیسے کے معاملے میں گواہ کے جھوٹ بولنے پر اسے پورا ہرجانہ دینا پڑتا تھا۔ کسی چیز کے خریدتے وقت لکھا پڑھی یا گواہی نہ ہوئی ہو تو خریدار چور سمجھا جاتا تھا۔ عدالتوں کے اختیارات کی وضاحت کر دی گئی تھی۔ لکھا ہے کہ بابل کے پنچوں نے ایک مقدمہ لینے سے انکار کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ یہ مقدمہ ضابطے کی رو سے سپّر کی عدالت میں دائر ہونا چاہیئے۔

حمورابی کے راج میں حسب ذیل جرموں پر موت کی سزا ملتی تھی:۔

قتل کے مقدمے میں جھوٹی گواہی دینے پر۔ محل یا مندر میں چوری کرنے پر۔ چوری کا مال خریدنے پر۔ لکھا پڑھی یا گواہی کے بغیر نابالغ کی جائداد خریدنے یا رہن رکھنے پر۔ غلام کو بھاگنے میں مدد دینے یا بھاگے ہوئے غلام کو پناہ دینے پر۔ فوج میں سپاہی بننے سے انکار کرنے پر۔ کسی کنواری سے زنا بالجبر کرنے پر۔ باپ کی مرضی کے خلاف لڑکی کو بہکانے پر۔ شراب کی قیمت مقررہ نرخ سے زیادہ لینے پر۔ کسی چیز کے بدلے دام کے عوض چیز لینے سے انکار کرنے پر یا دام کے عوض زیادہ چاندی مانگنے پر۔ عورتوں کی بدکاری اور شوہر کی غیرحاضری میں اس کی جائداد ضائع کرنے پر۔

اگر ماں بیٹے میں ناجائز تعلق ہوتا تو دونوں کو زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ دیوداسی اگر شراب خانے میں پکڑی جاتی تو اسے موت کی سزا ملتی تھی۔ اگر کوئی آزاد آدمی مہاجن کی مار پیٹ سے مر جاتا تو مہاجن کے بیٹے کو موت کی سزا ملتی تھی۔ اگر کسی کے حملے سے کسی عورت کا حمل گر جاتا اور وہ مر جاتی تھی تو حملہ کرنے والے کی لڑکی کو موت کی سزا ملتی تھی۔ اگر مکان گر جانے سے کسی کی موت واقع ہوتی تو معمار کو موت کی سزا دی جاتی تھی۔ باپ کو مارنے والے کے ہاتھ کاٹ دئے جاتے تھے۔ اگر کسی اَنّا کے دودھ نہ پلانے سے بچہ مر جاتا تو اُس اَنّا کی چھاتیاں کاٹ دی جاتی تھیں۔ بیٹی کے ساتھ بدکاری کرنے پر باپ کو دیس نکالے کی سزا ملتی تھی۔ اگر کسی شوہر

یا صوبے میں ڈاکہ پڑتا تو عدالت وہاں کے نقصان کا تخمینہ لگاتی اور وہ جرمانہ صوبیدار یا ضلعدار کو ادا کرنا پڑتا تھا۔

شادی شدہ عورت اپنی نجی جائداد کی آمدنی یا نجی پیسے کا سود خرچ کر سکتی تھی۔ اصل جائداد پر اس کے بچوں اور بچوں کے نہ ہونے پر باپ یا بھائی کا حق ہوتا تھا۔ لیکن دیوداسیوں کو اپنی جائداد پر پورا حق ہوتا تھا۔ اُس زمین پر اس آدمی کا حق سمجھا جاتا تھا جو اسے صاف کر کے پہلے اس پر قبضہ کر لیتا تھا۔

صوبیداروں کو اپنی فوج کے لئے اس طرح کی زمین کی پیداوار چارے اور بھوسے کا حق ہوتا تھا۔ گورنر یعنی صوبیدار لڑائی کے وقت جنتا سے سپاہی، مویشی اور رتھ زبردستی لے سکتے تھے۔ نہروں کی صفائی، سڑکوں کی مرمت اور ایسے ہی کاموں کے لئے صوبیدار جنتا سے بیگار لے سکتا تھا۔

قانون چھوٹے کسانوں کی حفاظت کا خاص خیال رکھتا تھا۔ زمین خریدنے کے لئے کسی کسان کے پاس پورے دام نہ ہوں تو حکومت چھوٹی چھوٹی قسط مقرر کر دیتی تھی۔ کسی کسان نے اگر کسی مہاجن سے قرض لیا ہو اور اُس کی فصل خراب ہو جاتی تو قرض کی ادائیگی اگلے سال کے لئے ملتوی کر دی جاتی تھی۔ ہر گاؤں میں پنچایتی چراگاہ کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا۔ عراق میں بارش کم ہوتی ہے۔ اس لئے چراگاہ کی سینچائی کا راج کی طرف سے انتظام کیا جاتا تھا۔ کسان اپنے جانوروں کو ان چراگاہوں میں مفت چرا سکتے تھے۔ ہر مکان کی زمین ضابطے سے ناپی جاتی اور اس کا رقبہ اور اوسط قیمت شہر کے سرکاری رجسٹروں میں درج کی جاتی تھی۔ مکان بنانے والے معمار کو چاندی کے سکوں کے حساب سے مزدوری دیتے تھے۔ کسی مکان کی دیوار گر جاتی تو معمار کو دیوار اپنے خرچ سے پھر بنانی پڑتی تھی۔ دیوار گرنے سے سامان خراب ہو جاتا تو اُس سامان کی قیمت دینی پڑتی تھی اور اگر مالک خود دب کر مر جاتا تو معمار کو موت کی سزا ملتی تھی۔

غیر سرکاری کارخانوں کے علاوہ راج کے اپنے کارخانے بھی ہوتے تھے۔ راج کی طرف سے کارخانوں کی جانچ کے لئے ایک افسر رہتا تھا۔ وہ اس بات کا دھیان رکھتا تھا کہ مالک اپنے مزدوروں کے ساتھ پریم اور انصاف کا برتاؤ کرے۔ راج یہ سمجھتا تھا کہ کاریگروں اور مزدوروں کی بھلائی ہی میں دیس کی بھلائی ہے۔ کوئی بھی کاریگر کسی لڑکے کو اس کے والدین کی رضامندی سے اپنے یہاں رکھ کر کام سکھا سکتا تھا۔ اگر وہ کام سیکھ لیتا تو پھر والدین کا اس پر کوئی حق نہ ہوتا۔ لیکن اگر کچھ نہ سیکھ سکتا تو والدین کو لوٹا دیا جاتا تھا۔ بعد میں ایرانیوں کے زمانے میں قاعدہ بن گیا تھا کہ اگر استاد شاگرد کو کام نہ سکھا سکے تو اسے لڑکے کے باپ کو ہرجانہ دینا پڑتا تھا۔

ندیوں اور نہروں کے ذریعہ تجارت ہوتی تھی۔ دریائے فرات کے دونوں کناروں پر بڑے بڑے شہر بسے ہوئے تھے۔ کشتی کے ذریعہ سفر اور تجارت ہوتی تھی۔ ایک کشتی کی قیمت بیس شیکل سے تیس شیکل تک ہوتی تھی۔ دُور دُور کے شہروں اور ملکوں کے ساتھ تجارت کرنے کے لئے بابل کے تاجروں میں پتی داری کا رواج تھا۔ اس طرح کی کمپنیوں کی طرف سے جگہ جگہ آڑھتیں کھولی جاتی تھیں۔ اور ایجنٹوں کو منافع میں حصہ ملتا تھا۔ یہ ایک طرح کی لمٹیڈ کمپنیاں ہوتی تھیں۔ نفع نقصان کے بارے میں عہدنامے بھی ہوتے تھے۔ جب کوئی کمپنی ٹوٹ جاتی تو حساب صاف کرنے کے معاملے میں عدالت کو پورا پورا اختیار ہوتا تھا۔

چیزوں کی یا جائداد کی قیمت میں اناج یا دوسری چیزیں بھی دی جا سکتی تھیں۔ راج کی طرف سے ایک افسر مقرر تھا جس کے سامنے ہر قرض کی لکھا پڑھی ہوتی اور سود کی در بھی وہی طے کرتا تھا۔ قرض کی ادائیگی بھی اسی افسر کے سامنے ہوتی تھی۔ اس وجہ سے کہ مہاجنوں کے ظلم سے غریب لوگ بچ جاتے تھے۔ قرض اکثر جَو کے رُوپ میں ملتا تھا۔ لین دین کے وقت اگر کوئی ساہوکار دھوکا دینے کی کوشش کرتا اس کا سارا قرض اور حق رد کر دیا جاتا۔ اس کے ساتھ ہی ساہوکار کے مفاد کا بھی لحاظ رکھا جاتا تھا۔ ساہوکار قرض کی ادائیگی کو پکا کرنے کے لئے قرضدار سے ضمانت مانگ سکتا تھا۔ بیوی، بچے، غلام، کھیت اور مکان وغیرہ قرض کے عوض رہن رکھے جاتے تھے۔ قرضدار اپنے وعدے کے مطابق قرض ادا نہ کر سکتا تو غلام بنایا جا سکتا تھا۔ گروی رکھنے والا ساہوکار گروی کی چیز

کھوجانے پر اس ذمہ دار ہوتا تھا۔

یہ سارے قاعدے قانون زیادہ تر حمورابی کے بنائے ہوئے تھے۔ حمورابی کے بعد ۱۷۶۱ ق م تک دیس میں بالکل امن رہا۔ اس کے بعد پورب کی طرف سے وحشی قوم "کشان" نے بابل پر حملہ کیا۔ بابل کے راجہ نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن وحشیوں کے آگے اس کی نہ چلی اور انہوں نے بابل پر قبضہ کر لیا اور وہیں بس گئے۔ ان جنگلیوں نے جب بابل کے تمدن اور تہذیب کو نزدیک سے دیکھا تو ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ انہوں نے بابل کے جسم کو جیتا لیکن بابل کو ان کی روح پر حکومت حاصل ہو گئی کیونکہ بابل میں رہ کر وہ دھیرے دھیرے وہیں کے ہو گئے۔ بابلیوں کے ساتھ شادی کر کے انہوں نے وہاں کے پرانے خون کو گرما دیا اور بیداری کی ایک نئی لہر پیدا کر دی۔ اس خاندان نے لگ بھگ چھ سو سال بابل پر راج کیا۔ وہ بابلیوں میں گھل مل گئے۔ انہوں نے بڑی بڑی عمارتیں اور نہریں بنوائیں وہ بابل کے دیوتا کی پوجا کرتے تھے اور مصر کے فرعونوں میں ان کا شادی بیاہ ہو جاتا تھا۔

اس کے بعد کا حال لکھنے سے پہلے بابل کی تہذیب پر ایک اور نظر ڈالنی ضروری ہے۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ حمورابی نے بابل کے دیوتا ماردک کو دیس کا سب سے بڑا دیوتا مان لیا تھا۔ ماردک کا سالانہ تہوار خوشی کا سب سے بڑا دن تھا۔ اور اسے "اکیتی" کہتے تھے۔ ماردک کے بڑے پجاری کو "یوری گلو" کہا جاتا تھا۔ ماہ نیسان کی دوسری تاریخ کو یوری گلو سورج نکلنے سے دو گھنٹے پہلے اٹھتا، فرات کے پانی میں اشنان کر کے خاص پوشاک پہن کر مندر میں آتا اور منتروں کا جاپ کرتا۔ اس کے بعد بھجن گانے والے آتے وہ ڈھول اور مجیروں سے دیوتا کو رجھاتے اور پکوان کا چڑھاوا چڑھاتے۔ رات کو رت جگا ہوتا اور خوب بھجن گائے جاتے۔ دوسرے دن سورج ڈوبنے سے تین گھنٹے بعد بڑھئی کاریگر مندر میں مٹی کی مورتیں بنانے آتے۔ یہ مورتیں سات سات انگل اونچی ہوتی تھیں۔ انہیں لال کپڑے اور جواہرات پہناتے اور ان کی کمر میں کھجور کی پتیوں کا پٹکا باندھتے تھے۔ ان مورتوں کے ایک ہاتھ میں سانپ اور دوسرے میں بچھو ہوتا تھا۔ چھ دن کے جشن کے بعد انہیں ساتویں دن آگ میں جلا دیتے تھے۔ اس کے چوتھے دن دجلہ اور فرات کے پانی سے مندر کو دھویا جاتا اور ایک بھیڑ کا خون چھڑک کر مندر کی دیواریں پاک کی جاتی تھیں۔ بعد میں اس بھیڑ کی لاش کو فرات میں پھینک دیتے تھے۔

ان دنوں بڑا پجاری یوری گلو برابر اپنے آپ کو مندر ہی میں بند رکھتا۔ خون چھڑکنے کے چار گھنٹے بعد وہ پوجا کی تیاری کرتا۔ راجہ بھی اس دن مندر میں آتا تھا۔ بابل سے چند میل کے فاصلے پر بورسیپا کا دیوتا "نبو" نامی تھا جس کی سواری راجہ کے ساتھ آتی تھی۔ راجہ اندر آ کر مندر کے آنگن میں کھڑا ہو جاتا۔ پجاری اس کے کپڑے اتار کر ماردک دیوتا کی چوکی پر رکھ دیتا۔ پھر وہ راجہ کے گال پر ایک طمانچہ مار کر اسے ماردک کے سامنے لے جاتا اور کان پکڑ کر اسے گھٹنوں کے بل بٹھا دیتا۔ اس کے بعد راجہ ماردک کے آگے ماتھا ٹیک کر یہ دعا مانگتا تھا:۔

"اے دنیا کے مالک! نہ تو میں نے کوئی پاپ کیا۔ نہ فرض میں کوتاہی کی اور نہ تیری شان کے خلاف کوئی بات کی۔ میں نے بابل کو اجاڑا نہیں اچھی طرح بسایا ہے۔ میں نے دھرم کا راستہ پکڑا اور تیرے احکام پر عمل کیا۔ نہ میں نے پرجا کو ستایا اور نہ انہیں بے عزت کیا۔"

اس کے بعد یوری گلو کہتا

"فکر مت کرو۔ دیوتا بھلا کریگا۔ وہ تمہارے دشمنوں کو فنا کر دیگا اور تمہاری برائی چاہنے والوں کو سزا دے گا۔"

راجہ تب مندر سے باہر نکلتا۔ اس کی پوشاک تاج اور چتر واپس کر دئے جاتے۔ یوری گلو دوبارہ اس کے گال پر طمانچہ مارتا اور اگر اس بار بادشاہ کی آنکھوں میں آنسو نہ آتے تو یہ بدشگونی سمجھی جاتی تھی۔

مندر کے آنگن کے بیچوں بیچ ایک ہون کنڈ ہوتا تھا اسی دن سورج ڈوبنے کے بعد چالیس سرکنڈوں کو کھجور کی پتیوں سے باندھ کر آنگن کے اوپر رکھتے، اس پر شہد، مکھن اور تیل چھڑکتے، راجہ اپنے ہاتھ سے ہون میں آگ دیتا اور پھر ایک سفید بیل کی قربانی دی جاتی تھی۔

ساتویں دن مارڈک کا سنگھار ہوتا اسے قیمتی ہیرے جواہرات سے جڑے ہوئے کپڑے پہنائے جاتے۔ آٹھویں دن اُس کا جلوس نکلتا۔ راجہ خود دیوتا کا ہاتھ پکڑ کر چلتا تھا۔ مارڈک پہلے مندر کے آنگن میں لایا جاتا جہاں بابل کے سب دیوتاؤں کی سواریاں مارڈک کی سلامی کے لئے آتی تھیں۔ اس کے بعد جلوس دریائے فرات پر جاتا۔ وہاں سے ناؤ میں بیٹھ کر مارڈک ایجور کے مندر میں چلا جاتا اور گیارہ دن قیام کر کے پھر اپنے مندر میں آجاتا تھا۔

لگ بھگ ایک ہزار سال تک بابل علم و ہنر کا مرکز بنا رہا۔ ہر طرف امن اور خوش حالی کی فضا چھائی رہی۔ بابل والے مذہب کے پابند تھے اور ان کے سماج میں عورت کی عزت تھی۔ ان کی تہذیب کا مدار طاقت اور جونزیری پر نہیں تھا۔ وہ دشمن سے بھی نرمی کا برتاؤ کرتے تھے۔ اچھے چال چلن کا وہ خاص لحاظ رکھتے تھے۔

ہندوستان کے ساتھ ان کی تجارت کا سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ رگ وید میں سمندر پار کی جن یاتراؤں کا ذکر ہے، وہ سمیر اور بابل ہی کی طرف ہوتی تھیں۔ بدھوں کی کتاب "بابیرو جاتک" میں لکھا ہے کہ ہندوستانی بیوپاری پرانے زمانے سے بابیرو کے ساتھ بیوپار کرتے رہے ہیں۔ اس زمانے کے ہندوستانی بڑے اچھے جہاز راں تھے جاتک کی کہانیوں میں ایسے جہازوں کا ذکر ہے جن میں سات سات سو آدمی ایک ساتھ سفر کر سکتے تھے۔

بابل خاص طور پر مندروں کا دیس کہا جاتا تھا۔ لہرا[1] کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ بڑے سے بڑے مندر بنوائے جس طرح مصر کے فرعون اہرام بنوانے کے لئے مشہور ہیں یا اسیریا کے بادشاہوں نے بڑے بڑے محل بنوائے تھے، اسی طرح بابل کے راجہ اپنے عالیشان مندروں کے لئے مشہور ہیں۔

بابل والوں کے نام زیادہ تر ال یعنی خدا کے نام پر رکھے جاتے تھے۔ مردوں کے نام اس طرح ہوتے تھے۔ الی یعنی میرا خدا۔ الی دُری یعنی میرا خدا میرا قلعہ ہے۔ الی امرانی یعنی میرا خدا مجھے دیکھ رہا ہے۔ الی عشمی انی۔ یعنی میرے خدا نے میری دعا سن لی۔ الی می علی۔ یعنی میرا خدا میرا باپ اکر

لہ بابل کا ہندی تلفظ۔

من لم کہ ما علی یعنی میرے خدا کے برابر کون ہے۔ عورتوں کے نام اس طرح کے ہوتے تھے۔ الی راملی یعنی خدا ہی میرا سہارا ہے۔ ر...ی یعنی میرے شوہر کا خدا عظیم ہے۔ ال...ی ...بابل والے سب دیوتاؤں کا پیدا کرنے والا مانتے تھے۔

بابل کے رشیوں اور پجاریوں مندروں میں مذہبی کتابوں اور پوجا کے گیتوں کے علاوہ دستکاری پر بھی اچھی اچھی کتابیں جمع رہتی تھیں۔ مندروں میں معمولی لوگ ہمیشہ ننگے پاؤں جاتے تھے۔ مندر کے مہنت اور پجاری پوجا کے وقت اپنا سر ڈھک لیتے تھے۔ وہ دھاری دار لمبا جبہ پہنتے تھے اور اس جبے کے اوپر ایک صدری صرف عالموں کو خواہ وہ عورت ہوں خواہ مرد پجاری بننے کا حق دیا تھا۔ پجاریوں کی سماج میں بڑی عزت ہوتی تھی لیکن کسی کو پجاری بننے کا پیدائشی حق نہ تھا۔ ایسے پردیسی بھی جو وہاں کے علم اور مذہب کے عالم ہوں، پجاری بنا دیا جاتا تھا۔ پجاریوں کی رسائی راجہ تک ہوتی اور وہ منصف کے فرائض انجام دیتے تھے۔ عوام کی نذر نیاز انہیں روزی کمانے کی فکر سے آزاد رکھتی تھی۔ ملک کی بہت سی بستیوں میں کتب خانے اور مدرسے بنائے گئے تھے۔

(نوٹ:۔ یہ مضمون پنڈت سندر لال جی کے ایک مقالے سے اخذ کیا ہے جو "وشو وانی" میں شائع ہوا تھا۔)

مولوی عنایت اللہ دہلوی کے دلکش تراجم

فلاتیر کا شہپارہ، تاریخ دروماں کا حسین مرقع،

سلامبو:۔ جس میں کئی ہزار سال پہلے کی تہذیب پیش کی گئی ہے۔ قیمت چار روپے (للعہ)

نجم السحر:۔ پانچ ہزار سال پہلے کے مصری کی تہذیب و تمدن و معاشرت کا کوئی پہلو مصنف کی نظر سے نہیں بچا ہے۔ قیمت تین روپے (للعہ)

ملنے کا پتہ:

ساقی بک ڈپو، دہلی سے طلب فرمایئے

رباعیات

جاں نثار اختر

بکھرے جو سیاہ زلف بکھر جانے دے
اس وقت کو کچھ اور سنور جانے دے
باقی نہ رہے صبح کا دھڑکا کوئی
اک رات تو ایسی بھی گزر جانے دے

ٹپکا ہے کہ گل رنگ شرارا جیسے
سونے پہ تڑپتا ہوا پارا جیسے
شبنم میں جھلکتا ہوا یا چاند کا عکس
سنگم پہ دمکتا ہوا تارا جیسے

پُرنم ہے تری نگاہ میری خاطر
تو آج بھی ہے تباہ میری خاطر
اس تیری پرستش کا ٹھکانا ہے کوئی
منظور ہے ہر گناہ میری خاطر

افسردہ و مغموم نظر آتی ہے
ہر عیش سے محروم نظر آتی ہے
میں تیرے تاثرات غم کے صدقے
تو اور بھی معصوم نظر آتی ہے

یہ عشق کرشمے سے دکھاتا ہے مجھے
ہر حال میں دیوانہ بناتا ہے مجھے
یا بے ترے چین مجھ کو آتا ہی نہ تھا
یا تو جو نہ ہو تو چین آتا ہے مجھے

یہ دل کی نزاکت تو نہ دیتا مجھ کو
اس درجہ لطافت تو نہ دیتا مجھ کو
شبنم کو اگر دیتے نہ اشکوں کے گہر
احساس کی دولت تو نہ دیتا مجھ کو

تعمیرِ نو

نشور واحدی

جس وقت کہ سورج کی کلی کچھ دھیمی دھیمی جلتی ہے
بنگلوں سے بہاروں کی ٹولی ملبوس چمن میں نکلتی ہے
جو سب سے دلکش ہوتی ہے وہ سب سے آگے چلتی ہے
ایسا کہ خرامِ محشر سے قوموں کو کچلتی جاتی ہے

اس وقت ملوں کے سینے سے اٹھتا ہے دھواں آزادی کا
پھاٹک سے نکلکر سڑکوں پر چلتا ہے سماں بربادی کا
اک پیرزن دلسوختہ بھی کرتی ہوئی رخ آبادی کا
چلتی ہے مگر جو رستوں پر چکرا کے سنبھلتی جاتی ہے

اک کھیل سا ہوتا ہے گویا تہذیب کے صورت خانوں میں
الفاظ و ادا کے دیوانے ہیں محو ابھی افسانوں میں
صناعی عہد حاضر نے اک روح بھری بیجانوں میں
تصویر کی صورت پردے پر دنیا ہے کہ چلتی جاتی ہے

ہر چند جمالِ جاناں کی دلسوز ادائیں عام رہیں
وہ عشق جو تھا مجبوروں کا اس عشق کی آہیں خام رہیں
جلووں کی جو صبحیں روشن تھیں وہ غم کی نظر میں شام رہیں
اک شمع نظامِ کہنہ ابھی طوفاں میں جلتی جاتی ہے

ہستی کے نئے عنوانوں میں آیاتِ بصیرت پاتا ہوں
احساس کے خونِ تازہ میں کچھ نشۂ دولت پاتا ہوں
قوموں کے سفالیں ساغر میں پھر بادۂ عشرت پاتا ہوں
ہر دور میں یہ صہبائے کہن پیمانہ بدلتی جاتی ہے

تحریر بنائے انساں میں عظمت کے اشارے ملتے ہیں
اس خاکِ خنک کے ذروں میں تابندہ ستارے ملتے ہیں
میری شبِ یاس و حرماں کے سورج سے کنارے ملتے ہیں
اشکوں کے درخشاں مشرق سے اک صبح نکلتی جاتی ہے

حسن عباس

لیڈی ڈاکٹر

(نام اور کردار فرضی ہیں)

وہ اس وقت اونچی ایڑی کا چمک دار سینڈل پہنے کھٹ پٹ کرتی اپنے دوائی خانے میں اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ آج اُس نے سبز شیفون کا نیا فراک پہن رکھا تھا اور اُسے بار بار یوں محسوس ہوتا جیسے مخملیں گھاس کا فرش اس کے ساتھ لپٹ رہا ہے۔ وہ نیا فراک پہن کر بہت خوش تھی اور گھنے بالوں پر جو اُس کے ماتھے پر بہت نیچے اُتر آتے تھے کالی جالی لگا رکھی تھی۔ وہ آج اپنے بالوں کو اپنی مرضی کے مطابق سنوار نہ سکی تھی۔ لیکن جالی نے اُس کی یہ اُلجھن دُور کر دی۔ وہ بہت خوش تھی اور اونچی ایڑی کا چمکدار سینڈل پہنے کھٹ پٹ کھٹ پٹ کرتی اپنے دوا خانہ میں اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ یکایک اُس کی گدرائی ہوئی پنڈلیاں ارشد کے دماغ میں گھس کر اس کے تحت الشعور میں چھپی ہوئی کسی خواہش کے ساتھ ٹکرائیں اور دیر تک وہیں لٹکتی رہیں۔ اُس نے کتنی کوشش کی کہ ان اُبھری ہوئی پنڈلیوں پر چھڑکے ہوئے سفید پاؤڈر کو پونچھ کر انہیں اصلی رُوپ میں دیکھے مگر ہر بار اسے ناکامی ہوئی کیونکہ وہ اُس کے چھوتے ہی ذہن کی وہیں تحلیل ہو جاتیں۔ اُس کی زندگی ایسے ان گنت واقعات سے اٹی پڑی تھی جب کسی راہ چلتی کے مُسکراتے ہوئے لب، جگمگاتے بُندے یا سُتواں ناک یکایک اُچک کر اُس کے دماغ کی کھونٹی سے چپک گئی اور جہاں اس کا ہاتھ اس کھونٹی کی طرف بڑھا وہ مُسکراتے ہوئے لب، جگمگاتے بُندے اور سُتواں ناک سبھی غائب! یہ مقناطیسی حرکت اتنی خود بخود اور بے اختیار ہوتی کہ وہ اس پر غور کرنے کے باوجود غور نہ کر سکتا تھا۔ اس کی زندگی میں یہ لمحے بارہا آتے اور وہ اپنی ناکامی پر کچھ اس طرح بھنّا جاتا جیسے کوئی مکھی اس کے بار بار اُڑانے پر بھی اس کی ناک پر آن بیٹھتی ہو۔

وہ فاقہ مست تھا۔ شرابی تھا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر کچھ اور بھی۔ باتیں بنانے میں بڑا کایاں، آنکھ جھپکنے میں پورا ایک قصّہ سُنا دیتا۔ سارا اس گھڑت اور ایسے چٹخارے سے لے کر بیان کرتا کہ سُننے والا یقین ہی تو کر لے۔

اس کا عقیدہ تھا کہ شرابی کو شراب کیلئے اور دانیمی کو افیم کیلئے خدا جیسے ویسے ہی دیتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اب کے پورے پکھواڑے میں اُسے شراب کا ایک قطرہ نصیب نہ ہوا تھا مگر اس سے اسکے عقیدے میں کوئی کمزوری نہ آئی تھی۔ اس کی ایک رشتے کی بہن مس فریا کے زیر علاج تھی اور وہ اس وقت اس کے دوا خانے میں بیٹھا اُس کی موٹی موٹی پنڈلیوں سے کھیل رہا تھا۔ "لاکھ کالی سہی آخر میم ہے" اُس نے دل ہی دل میں سوچا اور غیر ارادی طور پر مُسکرا دیا۔ ایک لمحہ کے لئے اُس کی آنکھوں کے سامنے کئی کالی کالی میمیں آئیں اور کسی گورے کی باہوں کے ساتھ لٹکن کبر کی طرح لٹکتی ہوئی چلی گئیں۔ مس فریا کی گدرائی پنڈلیاں اُسکی دماغ کی کھونٹی سے اب بھی لٹکی ہی تھیں اور وہ چاہتا تھا کہ ان موٹی موٹی پنڈلیوں کی سختی کو اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے محسوس کرے۔ اسی سوچ بچار میں اس نے اپنی اُنگلی کو جو بُری طرح بوتل کے گلے میں پھنس گئی تھی نکالنے کے لئے جھٹکا دیا۔ شیشی ٹوٹ گئی اور اُس کی آواز نے گویا اُس کے ذہن میں یکبارگی سینکڑوں چھوٹی بڑی شیشیاں پیدا کر دیں جو ایک دوسری سے ٹکرا کر ٹوٹ رہی تھیں۔

اُسے یاد تھا کہ جب پہلی بار اس کے سامنے مس فریا اُسکے مکان پر مریضہ دیکھنے آئی تو سیڑھیاں اُترتے وقت اُس نے بجلی کے قمقمے کی روشنی میں اُس کے کولہوں کی بناوٹ پر غور کیا تھا ہو اُس وقت دوا کی خالی بوتل میں اُنگلی پھنسائے ان کے متعلق سوچتے سوچتے وہ اپنے اوپر ایک دباؤ سا محسوس کرنے لگا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ مس فریا کے دو متوازی کولہوں میں اس کی ٹانگوں کا سارا گوشت سمٹ کر رہ گیا ہے لیکن ہر کے جسم میں گوشت کی کوئی کمی تو نہ تھی۔ اس کے وہ ادپر کو اُٹھے ہوئے شانے جو فراک سے پھٹے پڑتے تھے کتنے ناہموار اور سخت تھے۔ اپنے مکان کی سیڑھیاں اُترتے وقت بائیں ہاتھ جب

اس کی دوائیوں کا بکس تھامے، اس نے ایک ہلکی سی چٹکی لینے کی کوشش کی تھی۔ اور اپنے تمام تر مٹاپے کے باوصف اس نے بچانے کی کوشش کی تھی ——— اس کا قد میانہ تھا اور سینہ خمیری آٹے کی طرح پھولا ہوا۔ اور چہرے کے خطوط جیسے کسی نے تیز دھار چاقو سے لکڑی کے تختہ پر بے اختیار ٹوٹی پھوٹی لکیریں کھینچ دی ہوں جونہی وہ مسکراتی اس کے دونوں گال کسی پھٹے ہوئے جال کے کونوں کی طرح دکھائی دیتے، پیشانی پر کئی سلوٹیں پڑ جاتیں اور کوّے ایسی سیاہ آنکھوں کے نیچے حلقے گہری لکیروں کی طرح سمٹ جاتے، اس کی ٹھوڑی کچھ ایسی بھدّی نہ تھی لیکن اس کا وہ اُبھرا ہوا ہونٹ جس پر ننھے ننھے ملائم بالوں کی کائی سی جمی تھی۔ نچلے ہونٹ پر ایک کالی بھڑ کی طرح بیٹھا ہوا دکھائی دیتا۔ وہ باتیں کرتے وقت اسے اُسے ارادتاً سفید رومال کے نیچے چھپا لیا کرتی تھی۔

وہ اس وقت اپنے مشورہ کے کمرے میں ایک نوبیاہتا سے کچھ باتیں کر رہی تھی۔ اعضا کی غیر مناسبت اور رنگت سے قطع نظر اس کی آواز میں ایک باریکی، ایک لکنتی سی ضرور تھی اور وہ بھی، شاید پتلی گردن کی رعایت سے جس میں شہ رگ ایک شیشے کی گولی کی طرح اٹکی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

"مس صاحب جی متلاتا ہے اور طبیعت جیسے گری گری رہتی ہے"، نوبیاہتا نے کہا۔

"کچھ فکر کی بات نہیں"، مس فریا نے جواب دیا۔ "خود سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کچھ فکر کی بات نہیں، یہ تو میں بھی جانتی ہوں لیکن دراصل یہ ہے بڑی فکر کی بات۔ میرا شوہر انگریزی فیشن کا ہے۔ اور۔۔" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

"اور کہا ——— تمہارے شوہر کی کھوپڑی میں جراثیم معلوم ہوتے ہیں۔ میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں کر سکتی۔"

نوبیاہتا کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ بڑی اُمیدیں لے کر گھر سے چلی تھی۔ جونہی مس فریا اٹھی وہ بولی۔

"مس صاحبہ میں آپ کو منہ مانگی فیس دونگی۔ سو دو سو"

"نہیں ——— نہیں"، اور مس فریا باہر نکل گئی۔ سنّو دوسنّو ۔۔ جیسے ان الفاظ کے ساتھ مس فریا کے کانوں میں سکوں کی تیز کھنکھناہٹ سنائی دی۔ "لیکن نہیں"، اس نے پوچھا۔ ان سکوں کو جو اس کے تھرمامیٹر کے خول کی طرح سرد اور سفید ہیں۔ وہ کب تک جمع کرتی جائے گی۔ ایکا ایکی اُسے محسوس ہوا کہ اس کی زندگی دواخانے کی اُطاق کی طرح بے حس ہے جس پر کئی چھوٹی بڑی، سُرخ سفید نیلی پیلی بوتلیں، میٹھی، کڑوی، ترش اور بے ذائقہ دوائیوں سے بھری پڑی ہیں۔ بوتلیں حرکت کرتی ہیں۔ خالی ہو کر پھر بھری جاتی ہیں، ٹوٹ جاتی ہیں لیکن اُطاق ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ اُس نے آج پہلی بار شدّت سے محسوس کیا۔ کہ اس کی زندگی بھی ایک بڑی بوتل ہے جو شروع سے بالکل خالی ہے۔ اس پر کسی مرد نے اپنا لیبل چپکانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُطاق کی دوائیوں کا تعفن کسی طرح اس بڑی بوتل میں داخل ہو کر اس میں بدبو پیدا کر دے۔ لیکن وہ اپنی زندگی کو ان نیلی پیلی شیشیوں سے الگ تھلگ بھی تو نہیں رکھ سکتی تھی۔ یہ تو اس کا روز کا دھندا تھا۔ اُسے ہر ہفتے دو تین کیس کرتے پڑتے۔ دواخانے میں بھی مریضوں کا تانتا بندھا رہتا لیکن اپنی تمام مصروفیت کے باوجود بھی وہ اپنے آپ کو بالکل اکیلی محسوس کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ کسی مرد کو اس کی شکل وصورت سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی اور وہ اکثر سوچتی کہ اگر لوگ سانڈ، اور گائے بھینس خرید سکتے ہیں تو کیا وہ کسی مرد کی جیب میں سکے کھنکھنا کر اُسے خرید نہیں سکتی۔ شاید وہ نہیں خرید سکتی تھی۔ مانا کہ یہ دُنیا ایک بڑی منڈی ہے جس میں انسان اور انسانیت دونوں کھلے داموں بکتے ہیں۔ بکتے آئے ہیں اور شاید بکتے رہیں گے۔ لیکن مخالف جنس کو خریدنا آسان نہیں۔ کبھی اُس کا جی چاہتا کہ اپنے گلے میں رسّی ڈال کر چیخے "مجھے خرید لو ——— مجھے خرید لو"۔ لیکن شہر کی مشہور ڈاکٹر مس فریا کا دل جانتا تھا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ کسی مرد کے ہاتھ مفت بکنے کو تیار تھی اُسے معلوم تھا کہ وہ کسی ایک مرد کے لئے اچھی خاصی جائداد بن سکتی ہے جس کا مالک اس میں رہائش کے علاوہ تین چار سو ماہوار وصول بھی کر سکتا ہے۔ اس کی صحت اچھی تھی، بہت اچھی، لیکن اس کا سینہ جیسے اندر سے بالکل خالی، کھوکھلا سا ہو چلا تھا اور اسی احساس کے باعث کبھی وہ ایک لمبی سانس لے کر دم روک

یعنی تاکہ ایک لمحہ کے لئے اس کے سینے کا خلا پُر ہوجائے۔ سینما ٹی پارٹی یا کسی ہنگامی تقریب میں وہ اپنے بھائی جوزف کو ساتھ لے جاتی تاکہ تحت الشعور میں چھپی ہوئی کسی خواہش کو وہ ایک لمحہ کے لئے فریب دے سکے۔ انہی خیالات میں کھوئے اس نے اپنے سینے پر لٹکتی ہوئی طلائی صلیب کو جو اس کے کنوار پنے کا رسمی نشان تھا ہتھیلی پر رکھ کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ یہ طلائی صلیب ایک آہنی کیل کی طرح اُس کی زندگی میں پیوست ہو چکی ہے اور نکالے نہ نکلے گی

وہ بالکنی میں کھڑے کھڑے ٹرام کی گڑگڑاہٹ سے اُکتا کر دواخانے کی طرف آئی جو وقتی طور پر اس کے ذہن سے اُتر چکا تھا اچانک کسی بوتل کے فرش پر گر کر ٹوٹنے کی آواز سُنائی دی اور وہ بڑی تیزی سے کھٹ کھٹ کرتی کمپونڈر کی طرف بڑھی۔

"مس صاحبہ..." کمپونڈر نے خوفزدہ لہجے میں کہا ایک نایاب دوا کی بوتل اسکے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔

"مس صاحبہ کا بچہ.. "! اور اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ جونہی یہ الفاظ ارشد کے کان میں داخل ہوئے اُسے یوں محسوس ہوا جیسے مس فریا کا پیٹ ایکا ایکی پھول کر آن کی آن میں غبارے کی طرح پھٹ گیا ہے اور وہ لمبا ننگا آدمی اس میں سے کود پڑا ہے۔ چند سیکنڈ کے وقفے میں اس کے نتھنے بار بار پھولتے اور سکڑتے رہے "مس فریا کا بچہ..." اس نے سوچا ٹھیک تو ہے۔ بچے کی پیدائش کے لئے کوئی شادی شرط تھوڑی ہی ہے۔ شادی کے بغیر بھی تو عورت ماں بن سکتی ہے ــــــ ارشد مُسکرا دیا حالانکہ وہ مسکرانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا ذہن، پنڈلیوں اور کولہوں کے قریب سے الگ ہوکر ایک نئے اضطراب میں گرفتار تھا۔

اب گیارہ بجنے کو آئے تھے۔ کمپونڈر نے اپنی ٹوپی سنبھالی چابیاں مس فریا کے حوالے کیں اور چپکے سے باہر نکل گیا۔

وہ اپنے خیالات میں کھوئی، اپنے مخملیں فراک پر ہاتھ پھیرتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف آئی۔ اس کے ذہن میں دواخانے میں کسی کی موجودگی کا کوئی احساس باقی نہ تھا۔ اچانک اس کی نظریں ارشد پر پڑیں۔ وہ بولی:-

"آپ انگلفی چیمبرز سے آتے ہیں نا، ٹھیک ہے اتوار کو انجکشن لگے گا اور پھر ایک دن چھوڑ کر"

"انگلفی چیمبرز... انجکشن..." ارشد پریشان ہوگیا "میں تو نیو ناگپاڑے سے آیا ہوں، آپ مسٹر شنٹو..."

"اوہ میں سمجھ گئی"! وہ بولی "آپ سلمے کی دوائی لینے آئے ہیں۔ اس کے بھی کل انجکشن لگے گا اور پھر ایک دن چھوڑ کر"

"اور دوائی؟"

"دوائی ایکدم بند"

ارشد اُٹھ کھڑا ہوا۔ سالی پگلی تو نہیں ہوگئی، اس نے سوچا، بغیر انجکشن کے بات ہی نہیں کرتی۔ اُس نے ٹوٹی ہوئی شیشی کے ریزوں کو ٹھکراتے ہوئے مس فریا پر ایک نگاہ ڈالی اور اچانک اس کے سارے خیالات اس طلائی صلیب میں اٹک کر رہ گئے جو سبز ساٹن کے مخملیں فراک سے لپٹ رہی تھی۔ مس فریا اس کی نگاہ کا مطلب غلط سمجھی اور ایک لمحہ کے لئے اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک ڈاکٹر نہیں بلکہ محض ایک عورت ہے جو ایک مرد کے رُو برو کھڑی ہے ــــ وہ کچھ جھینپ سی گئی اور یونہی اپنا پرس کھول کر ننھے سے آئینے میں اپنی صورت دیکھنے لگی۔

"تو آپ کل صبح سلمے کو یہاں لے آئیں"۔ اس نے پرس بند کرتے ہوئے کہا۔

"کل .... کل تو میری شادی ہے.. "

"شادی.. ویڈنگ .." مس فریا نے مُسکرا کر کہا اور ایکا ایکی اُسے محسوس ہوا جیسے اس طلائی صلیب کی زنجیر سُکڑ کر اس کا گلا گھونٹ رہی ہے۔ اس نے اپنے گلے پر ہاتھ پھیرا اور ایک مصنوعی مُسکراہٹ کے ساتھ بولی "کل ہو رہی ہے شادی آپ کی.... کل"!

"میری شادی تو ٹھیک ایک مہینہ پہلے ہو جاتی مگر میں نے بڑی چالاکی سے کام لیا اور انٹ شنٹ دوائی لگاکر میں شادی کے دنوں میں بیمار پڑ گیا۔ بات یوں ہے کہ میں فردوس سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے تو میں بھی اُسے چاہتا ہوں لیکن میں شادی کرکے اس محبت اور چاہت کے پاک بندھن کو توڑنا نہیں چاہتا میاں بیوی بن کر محبت بہت جلد اپنی صورت بدل لیتی ہے!

میں یہ برداشت نہ کرسکونگا۔"

مس فریا خاموشی سے اُس کا چہرہ تکتی رہی۔ شاید وہ اپنی مُسکراہٹ بھول چکی تھی۔ وہ بولا۔"میں نے سُنا ہے دو ایک دن میں میرے گھر والے مجھے منانے آرہے ہیں اور میں کسی کے آنے سے پہلے شادی کرلینا چاہتا ہوں، شادی کسی ایک عورت سے، خواہ وہ کسی قوم سے تعلق رکھتی ہو۔ کنواری ہو یا بیوہ، کالی ہو یا گوری .. میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں میری صحت اس کی اجازت نہیں دیتی، وہ دوائی جانے کیا بلا تھی کہ اُس کے کھاتے ہی سینے کا درد شروع ہوگیا اور جانے کا نام نہیں لیتا۔" اِن الفاظ کے ساتھ اس نے مس فریا کی طرف دیکھا جو سفید رومال سے اپنا ماتھا پونچھ رہی تھی۔"آپ ذرا.. ."

اور جیسے ان دو لفظوں نے مس فریا کے دل کے کسی گوشے میں چھپے ہوئے چور کو جگا دیا ہو۔ ان الفاظ کے ساتھ اس کے اپنے سینے پر ہاتھ رکھنے سے وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ وہ سنبھلی اور چاہا کہ صاف الفاظ میں اُس سے کہہ دے کہ میں مردوں کا علاج نہیں کرتی لیکن وہ نہ کہہ سکی! اس کے الفاظ اس کے لبوں پر لپ سٹک کی تحریر کے ساتھ جم کر رہ گئے۔ اسی کی ایک وجہ شاید وہ احساسِ کمتری بھی تھا جو بدصورتی کی وجہ سے اس کے اندر پیدا ہوچکا تھا۔

"ایک دو تین . "مس فریا نے جو سٹیتھسکوپ لگائے اس کے سینے پر جھکی ہوئی تھی، کہا۔

"ایک، دو، تین "ارشد نے طلائی صلیب سے نظریں ہٹاتے ہوئے تیزی سے کہا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ صلیب اس کے گلے سے اُتر کر اُس کے دماغ کی کٹھالی میں پگھل کر تحلیل ہورہی ہے . ...اس کی کھوپری سُنہری ہو رہی ہے اور لمحہ بہ لمحہ اس میں سُنہری خون چھلک رہا ہے جس کی تیز حرکت سے اس کے جسم کی رگیں، اس کی نس نس سُنہری ہو رہی ہے.. اُس کی آنکھیں، اُس کی پپوٹے اُس کی پلکیں تک سُنہری ہوگئی ہیں۔ یکا یک اُس کا ہاتھ صلیب کی طرف بڑھا لیکن احساسِ شعور کے ایک فوری جھٹکے سے جوں کا توں رہ گیا وہ سٹیتھسکوپ لگائے کھڑی تھی

اور دفعتًہ اُس نے محسوس کیا کہ دل کی دھڑکنیں سٹیتھسکوپ کی سُرخ نالیوں سے گزر کر کانوں کے راستے اُس کے اپنے دل کی دھڑکنوں سے گھل مل رہی ہیں اور وہ سارے کا سارا کسی چور دروازے سے اُس کے اندر داخل ہوگیا ہے۔

اس نے نیلے رنگ کی کھلے منہ والی بوتل سے دوا کے چند قطرے ٹب میں ٹپکائے اور ہاتھ سے پانی میں لہریں پیدا کرنے لگی۔ اس کی زندگی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں آج پہلی بار ایک لہر پیدا ہوئی اور ڈوب گئی۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اونچی فضا میں اُڑتے اُڑتے دھم سے نیچے آن گری ہے۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اور زبان جیسے آم چوس چوس کر تھک گئی ہو۔ اُس نے نل کھولا لیکن وہ ٹن سے قہقہہ لگا کر خاموش ہوگیا۔ اس نے اپنے ہونٹ پر اُگے ہوئے بالوں کو جو پسینے سے بھیگ رہے تھے سفید رومال سے پونچھا۔ یکا یک اُس کے دماغ کو ایک دھچکا سا لگا۔ ہلکا ہاتھ اس کی گردن کو چھو کر سینے پر تھا۔ وہ بوکھلا سی گئی اور لپک کر اپنے کمرے کی میز کے اوپر نیچے، اِدھر اُدھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی——

وہ اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالے جانے کیا سوچ رہی تھی۔

ساقی بکڈپو کی دلکش کتابیں

خانم :۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کی بہترین تصنیف ہے۔ اس دلچسپ اور دلکش کتاب کا ہر باب ایک چمکتا ہوا مزاحیہ افسانہ ہے ہر افسانہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔ قیمت ؎ٰ

شکست ۔ مُلک کے مشہور افسانہ نگار مسٹر کرشن چندر ایم۔ اے نے یہ ناول لکھا ہے۔ ناول کا پس منظر بہشت نظیر کشمیر ہے۔ کرشن چندر نے اس سرزمینِ حُسن میں زندگی کے رومانی پھول کھلائے ہیں۔ قیمت ؎ ر

ریزۂ مینا ۔ اُردو کے بہترین پچاس افسانوں کا مجموعہ، سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۴۰ء تک ساقی میں سیکڑوں افسانے شائع ہوئے انہی منتخب افسانوں میں سے شاہد احمد دہلوی نے یہ پچاس افسانے انتخاب کئے ہیں۔ ضخامت ۵۵۰ صفحے۔ قیمت پانچ روپیہ (ﷲ) علاوہ محصولڈاک۔

وقار عظیم

اُردو شاعری میں رقیب

ایک دن عاشق صاحب نے اپنے دل سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ ؎

گر رقیب روسیہ کو بزم میں پائیں گے ہم
اے دلا ہرگز نہ ٹھہریں گے چلے آئیں گے ہم

آپ اس 'اے' اور 'دلا' میں 'ا' کی تکرار کی پروا نہ کریں۔ عشق کی سرکار میں اس طرح کی غلطیوں کی عام اجازت ہے۔ جی ہاں! تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ عاشق صاحب ایک دفعہ بزم یار میں گئے اور یہ عہد کر کے گئے کہ اگر وہاں رقیب موجود ہوا تو یہ اُلٹے پاؤں پھر آئیں گے ـــــ لیکن لوگوں کا بیان ہے کہ رقیب وہاں موجود تھا پھر بھی یہ اُلٹے پاؤں وہاں سے نہ پھرے۔ اور کچھ دیر کے بعد بہت بے آبرو کر کے وہاں سے نکالے گئے۔ لیکن اس مختصر سے قیام میں رقیب کے متعلق وہ ساری باتیں معلوم کر لائے جن تک خفیہ پولیس اور کراماً کاتبین کے علاوہ شاید کسی اور کی دسترس نہیں۔ یہی باتیں اُن کی آپ بیتی میں درج ہیں۔ انھیں کے ڈھانچے پر میں نے رقیب کی سیرت اور کردار کا ایک خاکہ سا بنایا ہے۔ وہ میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

لیکن یہ تصویر پیش کرنے سے پہلے اپنی صفائی میں ایک بات کہہ دوں۔ جن شہادتوں کے سہارے پر میں نے رقیب کے کردار کی ..... یہ تصویر بنائی ہے وہ داخلی نہیں صرف خارجی ہیں۔ اور یونیورسٹی اور پولیس دونوں کے نزدیک اس میں تحقیق یا تحقیقات سے زیادہ قیاس کو دخل ہے عاشق کی سوانح کی ترتیب اور کردار اور سیرت کی تعمیر میں ان حضرت کی زبان درازی سے سب سے زیادہ مدد ملتی ہے لیکن تحقیق کرنے والوں کو رقیب سے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ اُس نے اپنے یا محبوب کے متعلق خلوت یا جلوت میں کبھی کچھ نہیں کہا ـــــ اور خلوت میں بھی اگر کبھی کچھ کہا ہے تو اُسے عاشق کے علاوہ کسی اور نے نہیں سُنا۔ اس لئے ان کے کردار کے متعلق ہمیں اسی خارجی شہادت پر اکتفا کرنی پڑی ـــــ اور باوجودیکہ عاشق اور رقیب کے تعلقات ہمیشہ سے صدرجہ کشیدہ سے رہے ہیں۔ یہی شہادت میری تحقیق کی بُنیاد ہے۔

معاف کیجئے گا مجھے ایک بات اور یاد آگئی۔ اور وہ شاید آپ کے لئے بھی دلچسپی کی ہو۔ میں نے لوگوں کو کہتے سُنا ہے کہ رقیب کا وجود کچھ مشتبہ سا ہے۔ لیکن میرے نزدیک ایسا نہیں۔ سُنا گیا ہے کہ رقیب پہلے نجومی کا پیشہ کرتا تھا چنانچہ ایک دن عاشق صاحب نے اسے اپنا حالِ زار دکھانے کو بلایا اور جب حال دکھا چکے تو معلوم ہوا کہ وہ ان کا رقیب بن گیا ہے چنانچہ اس واقعہ کا ذکر اُن کی آپ بیتی کے ایک نسخہ کے شروع میں ان لفظوں میں کیا گیا ہے ع۔

دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب

سوانح عمری کے ایک دوسرے نسخے میں اسی بات کا ذکر کسی قدر اختلاف کے ساتھ ایک دوسرے انداز میں ہے۔ میں یہ عبارت بھی لفظ بہ لفظ نقل کئے دیتا ہوں ؎

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ رقیب رقیب ہونے سے پہلے چاہے جو کچھ رہا ہو لیکن اُس کا رقیب ہونا مسلم ہے۔ اس لئے اور بھی کہ بعض فلسفیانِ عشق کے نزدیک رقیب کے وجود کے بغیر عشق اور عاشق دونوں کا وجود معرضِ خطر میں پڑ جاتا ہے۔ رقیب نہ ہوتا تو عاشق اور محبوب کے تعلقات کی ساری رنگینیاں ختم ہو جاتیں اور تھوڑے سے ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد قاضی جی کے ہاتھوں دونوں انجام بخیر ہو کر رہ جاتے اور پھر ساری کی ساری اولادِ آدم غمِ عشق سے زیادہ، غمِ روزگار میں مبتلا نظر آتی ـــ اِنا للہ و انا الیہ راجعون لیکن اب عشق کا یہ سارا ہنگامہ صرف انہیں ذاتِ شریف کا شرمندۂ احسان ہے جنہوں نے کہا کچھ بھی نہیں اور کیا سب کچھ۔ خاموش مسکین لیکن اپنے کام میں دیوانوں سے بھی زیادہ ہوشیار۔ جنھوں نے اپنا کام بنایا اور دوسرے کا اس سے کہیں زیادہ بگاڑا۔

رقیب کے کردار کی سب سے بڑی خصوصیت بزم سازی ہے۔ وہ سارے ہنگامے جنہوں نے عاشق کو عاشق بنایا یا

رقیب کی بزم میں ہوتے اور یا خود محبوب کی بزم میں ـــــ لیکن ہر صورت رقیب اور محبوب یا محبوب اور رقیب ان بزموں میں ساتھ ساتھ رہے۔ اور انھیں میں سے کسی بزم سے رقیب کے ایما اور اشارے پر عاشق کو بے آبرو کر کے نکالا گیا تھا ـــــ

اس بزم میں عاشق اور محبوب کے درمیان وقتاً فوقتاً جو گفتگو ہوئی ہے اُس سے رقیب کے کردار کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اس لئے عاشق کی ڈائری میں مجھے جا بجا جو کام کے اندراجات اور حاشیے ملے ہیں وہ آپ کی خدمت میں پیش کئے دیتا ہوں ؎

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا ؛ جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

محبوب کے ساتھ بزمِ غیر کی طرف جاتے وقت اس سے اگلے صفحہ پر ہے ؎

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

حاشیہ پہ باریک حروف میں درج ہے ـــــ انہیں لگا تار کئی گھنٹے رقیب کی طرف دیکھنے کے بعد اسی صفحہ پر ایک اور شعر ہے۔

غیر سے سرگوشیاں کر لیجئے پھر ہم بھی کچھ
آرزوہائے دلِ رشک آشنا کہنے کو ہیں

(اُسی دن) چند صفحوں کے بعد کے اندراجات ؎

دیکھ کر انجمن غیر یہ حسرت آئی
آپ آئے تو یہ ہنگامہ مرے گھر ہوتا
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں

ان شعروں کے ساتھ کوئی نوٹ نہیں پھر بھی قیاس کہتا ہے کہ یہ باتیں، عاشق نے محبوب سے رقیب کی طرف بڑھتے ہوئے التفات کو دیکھ کر کی تھیں۔

ان شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ رقیب کوئی بڑا چابک دست اور چرب زبان آدمی تھا جس نے اپنی باتوں سے بہلا پھسلا کر محبوب کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور وہ عاشق کی طرف سے بدظن رہنے لگا عاشق کی زندگی کا یہ زمانہ ہے جب اُس کے کلام میں حد درجہ تلخی اور ـــــ پیدا ہو گئی تھی اور یہی زمانہ ہے جب رقیب کی عیاریاں شباب پر تھیں طنز بھری باتیں جو کہیں اُن میں شاید آپ کے لئے بھی لطف ہو ؎

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے ؛ غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

آپ کا قصد محبت ہے اگر غیروں سے
مول لے لیجئے تھوڑی سی محبت ہم سے
کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

اس کے بعد کے واقعات کا انداز کچھ اس طرح کا ہے کہ اُن سے رقیب کا کردار حد درجہ مشتبہ سا ہو جاتا ہے اور ان کی تفصیل بیان کرنے میں ازالۂ حیثیت عرفی کا مجرم قرار دئے جانے کا اندیشہ ہے اس لئے میں واقعات کی تفصیل میں نہیں پڑنا چاہتا۔ ہاں صرف ایک واقعہ کی طرف اشارہ کئے دیتا ہوں اُس سے آپ کو خود نتیجہ پر پہنچنے میں آسانی ہوگی۔ ایک محبوب گھبرایا ہوا کہیں سے آیا اور اس طرح گرتے گرتے بچا تو عاشق نے اُس سے پوچھا کہ ؎

گرتے ہوتے سجدہ کر کر آستاں سے ؛ چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے

لیکن جب محبوب کے چہرے پر شرمندگی اور ندامت کے آثار دیکھے تو اس سے کہا کہ ؎

ہم سمجھے نہ آئے تم کہیں سے ؛ پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

انتہائی کاوش اور جستجو کے بعد بھی یہ پتہ نہیں چل سکا کہ محبوب گھبرایا ہوا کہاں سے آیا تھا اور اُس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے کیوں تھے ـــــ لیکن تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ یہ روایت عام ہے کہ اس دن کے بعد سے محبوب اور رقیب کے تعلقات میں کشیدگی شروع ہو گئی اور اس کے بعد کے واقعات افسانوی حیثیت سے رفتہ رفتہ زیادہ دلچسپ بنتے چلے گئے سنا ہے کہ محبوب کو رقیب کی طرف سے بدظنی تو ضرور ہو گئی تھی لیکن اُسے کبھی نہ کبھی بات کا پاس تھا کہ وہ یکبارگی اُس سے قطع تعلق تو نہیں کر لینا چاہتا تھا۔ اور اس نے رقیب کی آزمائشیں کرنی شروع کیں۔ انہیں دنوں کا ذکر ہے کہ ؎

مانگی جو اُس نے جان رقیبوں پہ آبنی
حالانکہ ایک ہنسی تھی فقط امتحان تھا

آپ رقیبوں کے لفظ سے پریشان ہوں۔ جس طرح حضرت ناصح واحد بھی حاضر ہیں اور جمع بھی حاضر ـــــ اسی طرح یہ رقیب صاحب واحد بھی غائب ہیں اور جمع بھی غائب۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ زیادہ گھبراہٹ اور ذمہ داری کے موقعوں پر رقیب واحد

جمع رقیب بن جاتا ہے ـــــ جی ہاں! تو بات یہ ہو رہی تھی کہ جب محبوب کو یقین ہوگیا کہ رقیب کی محبّت کے دعوے جھوٹے ہیں تو اس نے اُسے طرح طرح سے ستانا شروع کیا۔

اس زمانے کے واقعات میں بعض پہلو ایسے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ رقیب کی زندگی میں بھی رفتہ رفتہ وہی آثار پیدا ہونے لگے تھے جو صرف عاشق کی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں اور اس لحاظ سے رقیب کے کردار میں یہ ایک بڑی خوبی کی بات ہے کہ وہ اپنے آپ کو آسانی سے حالات کے ساتھ بدل لیتا ہے۔ اس دور سے پہلے شاید کبھی کوئی موقع ایسا نہیں آیا تھا کہ محبوب نے رقیب کو گالیاں دی ہوں۔ لیکن اب معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ محبوب نے ایک دن رقیب کو بے نقط گالیاں سُنائیں۔ اور یہ گالیاں سُن کر رقیب ذرا بھی بے مزہ نہ ہوا ـــــ یہ اور بات ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ محبوب کے شیریں لبوں کی خاصیت تھی۔ حالانکہ میں اس بات سے متفق نہیں، میں اس معاملہ میں محبوب کی شیریں لبی کا نہیں بلکہ رقیب کے 'ضبط' کا قائل ہوا ہوں۔

انہیں دنوں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ محبوب نے رقیب کو زخمی کیا۔ باوجود کوشش کے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کس چیز سے اور نہ اس بات کا پتہ لگا کہ اعضائے رئیسہ میں کون کون سے زخمی ہوئے۔ لیکن یہ بات تحقیق کے ساتھ معلوم ہے کہ رقیب اس زخم کی لذّت کو بالکل بھول گیا۔ عاشق نے تو اس واقعہ کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے ؎

غیر کیا کور نمک ہیں کہ جو زخمی ہو کر
ذائقہ بھول گئے ہیں نمکدانی کا

لیکن میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ حافظ کی کمزوری کی وجہ سے ہوا یا شاید اس لئے کہ کسی نے زخموں پہ نمک کی جگہ شکر چھڑک دی تھی۔ اس طرح رقیب کو زخمی کرنے کے بعد محبوب نے آخر ایک دن رقیب کو تہ تیغ کر ہی دیا۔ اور اسی کے دوسرے دن عاشق نے محبوب سے یہ شکایت کی کہ ؎

غیروں کو تو کرتے ہیں تہ تیغ جفا آپ
اک روز مرے حق میں بھی ہو جائیں ادا آپ

بہرحال رقیب مر گیا۔ اور مرنے کے بعد بھی اُس کی زبان بند ہی رہی۔ نہ وہ محبوب سے یہ کہہ سکا کہ "کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ۔"

اور نہ محبوب نے ٹھوکر لگا کر جلانے کی کوشش کی۔ محبوب شاید روتا ہوا اس کے جنازے کے ساتھ بھی نہیں گیا۔ البتہ ایک دن اُس نے دُور سے اُس کی لحد پہ دئے ضرور دیکھے لیکن رقیب کی بے حسی دیکھیئے کہ اُس وقت بھی اُس سے کروٹ نہ لی گئی۔ حشر کے دن کے حالات اور بھی زیادہ صاف اور صریح ہیں۔ اس لئے کہ رقیب نے اپنی ساری سرگرمیاں اور سارے ہنگامے مرنے سے پہلے ہی ختم کر دئے تھے۔ حشر کے دن آپ نے خاموشی سے عاشق اور محبوب کے ڈرامے کے آخری سین دیکھنے ہی پر اکتفا کی، اور کسی نے پوچھا کہ حضرت یہ آخر کیا ماجرا ہے تو جواب دیا کہ جو ہنگامہ مجھے برپا کرنا تھا کر چکا اب تو میں نے دُنیا میں اپنے نائب چھوڑ دئے ہیں اور وہ میرے مشن کی تکمیل میں مصروف ہیں ـــــ یہ عاشق صاحب عشق عشق چلّاتے ہیں لیکن اب دنیا کو معلوم ہو رہا ہے کہ عشق کی رنگینی تو میرے دم سے تھی۔ نہ میں ہوتا نہ عشق میں یہ شدّت پیدا ہوتی ـــــ اللہ بس باقی ہوس۔

رقیب کے کردار کے متعلق جتنی قانونی یا غیر قانونی شہادتیں میں نے فراہم کرکے آپ کی خدمت میں پیش کیں اُن سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ رقیب کے کردار میں عاشق کے کردار سے کہیں زیادہ ـــــ اور ناصح کے کردار سے کہیں کم پختگی اور استقلال ہے۔

ایک اور چیز جو رقیب کو شاعری کے سارے کرداروں سے الگ کرتی ہے۔ اُس کی خاموش فطرت ہے۔ عاشق نے زندگی بھر رقیب کے خلاف طرح طرح کا پروپیگنڈا کیا۔ لیکن اس نے کبھی اعلانیہ اس کا جواب نہ دیا۔ بلکہ اس پروپیگنڈے کا جواب خاموش پروپیگنڈے سے دیا اور عاشق کی ساری زندگی روتے اور شکایتیں کرتے گُذری۔

اس کے علاوہ بعض شہادتیں اس طرح کی فراہم ہوتی ہیں جن سے اس پختہ کردار کی بلند آہنگی اور خاموش متانت پر شبہ سا پیدا ہونے لگتا ہے۔ میں ان چند باتوں کو بے ربط طریقے سے آپ کی خدمت میں پیش کئے دیتا ہوں ـــــ نتیجہ آپ خود نکال لیجئے ؎

دعوت تھی رقیب کی میرے گھر
جُوتی میں دال کیا بٹی ہے!

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ دعوت کس کے گھر تھی۔ جی ہاں! عاشق کے گھر۔ اور یہیں جوتی میں دال بٹی تھی۔ واقعی عجب طرح کی دعوت تھی۔ لیکن مجھے اور آپ کو دعوت کی نوعیت سے بحث نہیں۔ سوچنا صرف یہ ہے کہ اس دعوت میں رقیب کا عمل کیا رہا — آپ سوچئے اور میں ایک دوسرے واقعہ کا ذکر کرتا ہوں آپ کو یہ شعر یاد ہوگا ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

جب عاشق کے ساتھ یہ پاسباں والا معاملہ پیش آیا تو اُس نے خدا سے دعا مانگی کہ یا اللہ کسی طرح پاسباں کو رقیب بنا دے اور مجھے پاسباں — سُنا ہے کہ وقت اثر کا تھا۔ خدا نے اسے پاسبان بنا دیا اور پاسباں رقیب بن کر آیا اور اُس نے ان کے قدم لئے — اور پھر وہی معاملہ رقیب کے ساتھ پیش آیا جو دعا مانگنے سے پہلے ان کے ساتھ پیش آیا تھا — لیکن چونکہ رقیب نے اس موقعہ پر بھی خاموشی اختیار کی ہے اس لئے انجام کا پتہ نہیں چلا۔

ایک واقعہ پر تو مجھے اس وقت بھی ہنسی آرہی ہے۔ رقیب کا مشن تھا کہ عاشق کبھی اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکے لیکن آخر محبوب کے دل سے اس کا اعتبار اُٹھ گیا اور محبوب عاشق کی طرف ملتفت ہوا۔ انہیں دنوں کا ذکر ہے کہ ایک رات محبوب عاشق کے یہاں مہمان تھا کہ رقیب .. لیکن نہیں اس واقعہ کا ذکر خود عاشق ہی کی زبانی سن لیجئے ؎

با مک سے اُسکے نہ ہم دہو کیں آئے شب وصل
غیر — ٹا لے میں رہا آپ ہی مُرغا بن کر

ایک روایت ہے کہ آخر عمر میں اُس نے نالے کرنے بھی سیکھ لئے تھے لیکن اس کے نالوں میں اثر بالکل نہ تھا اور بےچارہ اسی تاثیر کی تمنا میں اس دُنیا سے سدھار گیا۔

لوگوں کا خیال ہے کہ رقیب کی زندگی میں جو دو چار اس طرح کے واقعات ہمیں ملتے ہیں، اُن کی وجہ شاید عاشق کی صحبت کا اثر ہے۔ نالے کرنا اور تاثیر کا طالب ہونا۔ اُس کے کردار اور سیرت کے بالکل منافی تھا۔ پھر اسی طرح کی دو ایک حرکتیں اور بھی — مثلاً ایک دفعہ اُس نے محبوب کے پاؤں میں مہندی لگائی اور اس سے عاشق کے سینے میں آگ سی لگ گئی۔ پھر ایک دفعہ اور وہ محبوب کے خط کو سڑک پر پڑھتا جا رہا تھا کسی نے پوچھا کہ یہ کیا ہے تو اُس سے خط چھپائے نہ چھپا۔ اور شاید اُس کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ اس طرح کی بعض چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن سے رقیب کی پختہ سیرت پر کچھ داغ نظر آنے لگتے ہیں۔

لیکن ٹھہریئے۔ مجھے دو باتیں اور یاد آگئیں۔ سُنا ہے کہ رقیب نے اب تھانہ میں جا کر رپٹ لکھوانے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے اور وہ عشق کے سرٹیفکٹ تقسیم کرنے لگا ہے۔ سرٹیفکٹ بغیر اب عشق تسلیم نہیں ہوتا — اور یہ دونوں باتیں میرے لئے تلخ بھی ہیں اور ناگوار بھی — اس لئے مجھے ان دونوں سے بچ کر نکل جانے کی اجازت دیجئے۔ آداب عرض۔

مطبوعات ساقی بک ڈپو۔ دہلی

نرگس:- از حضرت ایم۔ اسلم۔ جس میں ایک طوائف کی دردناک و عبرت انگیز زندگی کے حالات پیش کئے گئے ہیں نہایت غم ناک کہانی ہے۔ قیمت دو روپے (عہ)

گنہگار:- ادیب شہیر حضرت ایم۔ اسلم کے سات افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت عہ

کلیاں:- عصمت چغتائی کے سولہ مضامین کا مجموعہ جو نہایت دلکش اور حد درجہ موثر ہے۔ قیمت تین روپے!

دھنک:- صادق الخیری ایم۔ اے کے افسانوں کا مجموعہ، قیمت دو روپے (عہ)

ستاروں کے کھیل:- اشک نے انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کیا ہے یہ ناول اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتا ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے (عہ)

قفس:- اشک کے بارہ منتخب افسانوں کا مجموعہ، قیمت ایک روپیہ بارہ آنے (عہ)

گذرگاہِ خیال:- ظفر قریشی دہلوی کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ، قیمت دو روپے (عہ)

فرعون:- جس نے خدائی کا دعوے کیا تھا مصر کی ایک حسینہ پر عاشق تھا۔ اُسکی داستان ایک عجیب و غریب رومانی کہانی ہے۔ قیمت عہ!

وشوامتر عادل

بہن

"آج ڈاکیہ نہیں آیا!" مہندر نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا اور پھر چائے کی پیالی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ لیکن اُس کی نگاہیں کھڑکی سے باہر ہی رہیں۔ اشریفے کی ٹہنیوں کو چھوتی ہوئیں جہاں کالی ڈنڈی پر ایک سبز رنگ کا شریفہ سر جھکائے ہوئے تھا اور پھر نیم کی ٹہنیوں سے لٹکے ہوئے جھولے پر تھوڑی دیر جھولتی ہوئیں اور پرے چلی گئیں۔ سُرخ پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ دیوار پھلانگ کر سامنے کوونٹر والے کی دُکان تک جہاں شیشے کی الماری میں سفید سفید دودھ کی بوتلیں سوتی ہوئی بطخوں کی طرح سردی کی پھیکی پھیکی دھوپ میں چمک رہی تھیں۔

"تجھے ہر وقت ڈاکیے ہی کی پڑی رہتی ہے۔ پڑھنا لکھنا سب بھول گیا ہے تو!" اُس کی ماں نے چیک کر کچھ اس طریقے سے کہا کہ پاس بیٹھے ہوئے اخبار پڑھنے میں مستغرق پتا کے کانوں میں یہ بات جا پہنچے اور وہ جان لیں کہ ان کا ہونہار بیٹا آوارہ ہو رہا ہے۔ مہندر چونک پڑا۔ اس کی نگاہیں کھٹک کر ماں کے چہرے پر آ گئیں۔ اُن میں کچھ نفرت جھلکی، کچھ بے بسی۔ اُس کی ماں دوہرے جسم والی عورت تھی، گوشت اور پوست کا ایک لوتھڑا۔ گال پھولے ہوئے لیکن سرخ، آنکھیں چھوٹی چھوٹی اندر کو دھنسی ہوئیں، پیشانی تنگ اور سر پہ تھوڑے سے بال جو اب سفید ہو چکے تھے۔ مہندر نے کئی بار چاہا تھا کہ وہ اپنی ماں سے لپٹ جائے، جس طرح موہن اپنی لمبی پڑھی لکھی ماں سے لپٹ جاتا ہے اور دونوں مسرت کی ایک جیتی جاگتی تصویر بن جاتے ہیں یا جس طرح رمیش کی ماں (اور رمیش بھی تو میری عمر کا ہے۔ مجھ سے کیا کم ہوگا) رمیش سے لپٹ جاتی ہے اور ہر بار پوچھتی ہے۔ "اچھا تو تیری گڑیا کا کیا حال ہے؟" رمیش کی گڑیا اُس کی ہم جماعت خوبصورت پتلی پتلی اُنگلیوں اور نیلی نیلی آنکھوں والی لڑکی ہے جس سے رمیش اکثر ملتا ہے، ٹینس سکھاتا ہے اور کئی بار اپنے گھر چائے پر بھی بُلاتا ہے۔ لیکن میری ماں۔ مہندر نے سوچا۔ میری ماں کے سامنے اگر میری بہن کے سوا کوئی دوسری لڑکی آ جائے تو . . . مہندر نے چائے کی پیالی میں جھانکنا شروع کر دیا۔ اُسے کپکپاتی سطح پر اپنی آنکھوں کا عکس دُھندلا دُھندلا دکھائی دینے لگا۔

"مہندر ٹھیک تو کہتی ہے تیری ماں۔ یہ ڈاکیہ تو عمر بھر آتا رہے گا۔ ڈاکیے کا کام ہی ڈاک لانا ہے لیکن پڑھائی ہمیشہ نہیں ہو سکتی، یہی دن ہیں پڑھنے لکھنے کے!" مہندر کے پتا نے نرمی سے کہا۔ مہندر کو اپنی بے بسی پر رحم آ گیا۔ اس کی پلکیں پُرنم ہوتے ہوتے رہ گئیں۔ اُس کے حلق میں ایک گولا سا پھنس گیا۔ مصیبت تو یہ تھی اس کے پتا نے اُسے کبھی نہیں ڈانٹا تھا بلکہ ہر بات پیار سے سمجھاتے تھے۔ "ڈاکیے کا کام ہی ڈاک لانا ہے!" اس فقرے میں سو فیصدی سچ ہے اور صفر فیصدی جھوٹ۔ مہندر کو اپنے پتا پر اس وقت غصہ سا آ گیا۔ ان کی ہر بات ٹھیک ہے اور میری ہر بات اُلٹ۔ مہندر کے پتا ایک خوبصورت انسان تھے، ادھیڑ عمر میں بھی ان کا چہرہ تر و تازہ تھا۔ وہ اپنی اِس خدا داد نعمت پر نازاں تھے اور اکثر اپنے بیٹے سے کہا کرتے تھے "دیکھو نا اپنے سوکھے ہوئے بازو۔ بیٹا جوانی میں خون کا ایک قطرہ بھی ضائع نہیں ہونا چاہیئے۔" اور مہندر یہ بات سُن کر چڑ سا جاتا۔ ایک عادی مجرم کی طرح اُس کی آنکھیں جھک جاتیں۔ اس کے پتا کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ وہ جھوٹ بول ہی نہیں سکتے تھے۔ آخر وہ جھوٹ بولیں ہی کیوں؟ انہیں پرماتما نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ خوبصورتی، دولت، ایک سنہرے بالوں والی بیٹی اور دو بیٹے ایک ہوبہو بہا کا نقشہ اور دوسرا ـــ مہندر نے پیالی میز پر رکھ دی اور اپنے پتلے پتلے بالوں سے ڈھنپے ہوئے سر کو دیکھنے لگا ـــ لیکن میں اتنا بدصورت بھی تو نہیں ـــ اور پھر گھر میں سب سے زیادہ پڑھا لکھا ہوں۔ ایک ایم۔ اے پاس کر چکا ہوں۔ دوسرے ایم۔ اے کی تیاری اپنے پتا کی مرضی کے خلاف کرنے والا ہوں۔ ورنہ پتا تو کہتے تھے بیٹا! اب نوکری کر لو۔ اور وہ نوکری بھی کیا نوکری ڈھونڈی تھی میرے

لئے اڈیفنس ڈیپارٹمنٹ میں ساٹھ روپے کی کلرکی! اور اب اُلٹا مجھ کو ڈانٹتے ہیں کہ میں پڑھتا نہیں۔ لیکن وہ ڈانٹتے کب ہیں؟ وہ تو سمجھاتے رہتے ہیں؟ آخر میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ جوانی میں خون کا ایک قطرہ بھی ——؟ آخر بار بار کیوں اس فقرے پر زور دیا جاتا ہے؟ اسی لئے نا کہ کبھی کبھی فرحت کا خط میرے نام آجاتا ہے؟ یہ حضرت خود بھی تو کسی زمانے میں لڑکیوں کے کالج میں پڑھاتے تھے۔ لیکن اس چڑیل ادِتا نے جاکر پتا سے جڑ دی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ چوہے کھانی سارا بھانڈا پھوڑ دے گی۔ میں نے ابھی فرحت کا منہ تک نہیں چوما اور بدنام ہوگیا۔ واہ ری قسمت! کیا معصوم سا چہرہ لئے میرے پاس آبیٹھی تھی!

"کس کا خط ہے مہندر؟"

"کسی کا نہیں"

"ہوگا کسی بہنی کا!"

"تمہیں ہوگی تو"

"ہاں ضرور بھتی ہی ہوگی، تبھی تو آپ دکھاتے نہیں"

مہندر چپ ہو رہا اور کنکھیوں سے اپنی قمیص کی جیب میں نیلے رنگ کے لفافے کو دیکھنے لگا۔

"جانتی ہوں کیا لکھا ہے اس میں"

"کیا لکھا ہے؟"

"یہی — مُردہ چوہوں کی ٹانگیں، بکروں کے ٹوٹے ہوئے سر اور — اور جلے بھنے مکوڑے ہاہاہا ہی ہی ہی"

"خی خی خی! بس دانت دیکھ لو اس چڑیل کے"

"ہی ہی ہی — ہی ہی ہی"

"موتی پروئے ہیں موتی!"

"ہی ہی ہی"

"دیکھو۔ آنکھیں پھٹ جائیں تو کہنا"

اور ادِتا نے گول گول معصوم آنکھیں گھما کر پڑھنا شروع کردیا "پیارے مہندر، تم بھی عجیب باتیں سوچتے ہو۔ یہ ہو سکتا ہے میں ایک روز شادی کروں۔ میری ایک گڑیا سی گاگلی بیٹی ہو۔ میں اُسے کھڑکی کے پاس لئے کسی کی منتظر رہوں۔ کسی کے قدموں کی چاپ کا انتظار ہو۔ اور پھر کوئی دروازہ کھٹکھٹائے "امعتم!" اور تم اندر آجاؤ۔ تمہاری ڈاڑھی، برف جیسی سفید ڈاڑھی ہو۔ تمہاری آنکھوں پر کچھوے کی ہڈی کا چشمہ ہو۔ ننھی شبنم تمہاری گود میں جا بیٹھے تمہاری عینک اُتار لے اور تم سے کہے "ہمیں ایک کہانی سُناؤ"۔ تم میری طرف دیکھو۔ ہائے! تم کس طرح دیکھو گے میری طرف؟ مجھے ایسا محسوس ہوگا گویا میں ننگی ہوگئی ہوں۔ تم کہانی سُناتے رہو میری اور اپنی کہانی۔ اور پھر جب تم کھڑکی کی طرف نظر اُٹھاؤ تو وہاں تمہیں میرا خاوند دکھائی دے۔ اُس کی آنکھیں تمہیں حیرت سے گھور رہی ہیں۔ اس کی اُنگلیوں میں ایک موٹا سا سگار ہے۔ سگار! نہیں۔ نہیں۔ مجھے سگار سے چڑ ہے۔ میرا خاوند سگار کبھی نہیں پیئے گا۔ کبھی نہیں — کبھی نہیں —"

"چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ پی لو نا اسے۔ پھر مجھے برتن بھی صاف کرنے ہیں" مہندر کی ماں نے اُسے سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھ کر کہا۔ مہندر کو اپنی ماں پر بے حد غصہ آیا۔ اچھے خاصے ثابت و سالم ہاتھ پاؤں والے تین نوکر گھر میں ہوتے ہوئے بھی دیکھو برتن مانجھتی رہتی ہے۔ اسے اپنے میکے کی زندگی ابھی تک فراموش نہیں ہوئی۔ تہذیب چھو تک نہیں گئی۔ اس کی ہر حرکت میں اس کے ماں باپ کا گھر سانس لیتا ہے۔ دالان میں تنور کے پاس محلے بھر کی عورتیں اپنی پراتوں میں گندھا ہوا آٹا لئے آجاتیں۔ کڑی دھوپ میں تنور کی زبانیں لپک اُٹھتیں۔

"ادِتی۔ ذرا اس میں لکڑیاں اور اُپلے اور ڈال دے"۔ شعلے اور لپک اُٹھتے۔ اور پھر تنور کسی اژدہے کی طرح پھنکار کر لمبے لمبے سانس لینے لگتا۔ سب عورتیں باری باری روٹیاں پکاتیں۔ پھر دوپہر کو سارا کنبہ باورچی خانے میں بیٹھ کر روٹی کھاتا۔ اس کے بعد میری ماں اور اس کی ماں دونوں برتن مانجھتیں۔ تیس برس پہلے کی طرح اب بھی اسے برتن مانجھنے یاد ہیں۔ اس کی انگلیاں اینٹھ جاتی ہیں، اس کے ناخن نیلے پڑ جاتے ہیں، اسے سردی میں بیٹھے بیٹھے چھینکیں آنے لگتی ہیں لیکن نہیں، جب تک یہ برتن نہ مانجھ لے، انہیں راکھ سے رگڑ رگڑ کر چمکا نہ لے، اس کا دن ادھورا رہتا ہے۔ اس میں خلا رہ جاتا ہے۔ ایک بہت بڑا ٹھنڈا اُداس سا خلا ——

"ابھی تک چائے نہیں پی؟" اُس کی ماں نے پھر کہا۔

مہندر نے پیالی خالی کر دی اور اُسے کھٹ سے میز پر رکھ دیا "چائے نہیں پی۔" چائے نہیں پی۔ تین بے معنی الفاظ لیکن ماں نے انہیں ترتیب سے اکٹھا کر دیا ہے، ان میں نئے معنی ڈال دیتے ہیں۔ بیٹے لئے، میرے لئے نہیں۔ میرے لئے تو وہ ایسے ہیں جیسے کسی ظالم کے کوڑے، قیدی کی ننگی پیٹھ پر۔ شڑاپ۔ قیدی کی پیٹھ پر ایک لمبا سا تانبے کے رنگ کا نشان اُبھر آیا ہے۔ شڑاپ! ایک اور نشان، پہلے نشان کو ایک سرے سے کاٹتا ہوا۔ شڑاپ! شڑاپ! شڑاپ!!! چائے نہیں پی؟ چائے نہیں پی؟ چائے نہیں پی؟ یہ مائیں بھی کتنی ظالم ہو سکتی ہیں۔ انہیں صرف اپنا خیال ہوتا ہے اور کسی کا نہیں۔ اپنے خون سے سینچے ہوئے ڈھانچوں کا بھی نہیں۔ شڑاپ! چائے نہیں پی؟ اگر برتن تھوڑی دیر بعد صاف کئے گئے تو کونسی قیامت آ جائے گی۔ شڑاپ! پیٹھ پر تانبے کے رنگ کے بے شمار نشان۔ گالوں پر طمانچے کی پانچ انگلیوں کے نشان۔ مہندر نے اوپر والا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ اُس کے جسم میں درد کی لاتعداد لہریں دوڑ گئیں۔ نرم نرم گالوں پر ماں کی سخت اُنگلیوں کے نشان! اُسے فرحت یاد آ گئی۔ اُس روز بارش ہو چکی تھی۔ اور وہ فرحت کے تعاقب میں کالج سے نکلا تھا۔ تارکول کی سڑکیں دُھل کر نکھر آئی تھیں۔ دونوں طرف شیشم کے درختوں کے لباس دُھل چکے تھے۔ لا- لا- لا- لا۔ ساون کے نظارے ہیں لا لا- لا- لا۔ "فرحت فرحت! فرحت ایک تکونے پتوں والے درخت کے نیچے، ہوسٹل کے دروازے پر۔ فرحت نے سائیکل روک لی۔ مہندر بھی اُتر پڑا۔ "ذرا یہ کتابیں تھامو۔" مہندر نے اس کی کتابیں تھام لیں۔ مہندر نے سوچا جب یہ کتابیں واپس مانگے گی تو میں اس کا ہاتھ آہستہ سے دبا دوں گا، آہستہ سے جس طرح کوئی مخمل کی سطح پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دے اور مخمل دب جائے، آہستہ سے خود بخود۔ فرحت سائیکل کا سہارا لئے باتیں کر رہی تھی۔

"ہمارے گھر کے باہر نیم کا درخت ہے۔"

"نیم کا درخت؟"

"تمہیں تو یاد ہی ہوگا ہے نا؟"

"ہاں۔ ہاں۔" مہندر نے یونہی کہہ دیا۔

"تو ایک دن ابّا گھر آئے، اُن دنوں ابّا اس طرح بھدّے نہیں تھے۔ اُن کے ہونٹ، جو اب موٹے موٹے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن دنوں، ہائے میں کیا کہوں، ان دنوں انگور کے دانوں کی طرح رسیلے تھے۔"

"لوگ کہتے تو ہیں کہ موٹے ہونٹ ــــ"

"اور امّی تو اُن پر جان چھڑکتی تھیں۔ امّی کو میرا ذرا بھی خیال نہیں تھا۔ جیسے ہی ابّا اندر آئے انہوں نے مجھے گود میں لے لیا۔ امّی چلّائیں نیچے اُتر مُردار۔ گھر آتے ہی چمٹ جاتی ہے چھپکلی کی طرح! لیکن ابّا نے ہنسی ہنسی کر کے اپنی ٹھوڑی میرے گالوں پر پیار سے رگڑ دی۔ ہائے، ابّو کاٹتے ہیں میں چلّائی۔ کاٹتے نہیں بیٹی، یہ داڑھی ہے۔ ابّا بولے "نہیں کاٹتے ہیں" میں نے کہا اور گود سے نیچے اُتر آئی۔ امّی نے فوراً ابّا کی اچکن اُتاری۔ اُسے کھونٹی پر لٹکا دیا اور پھر جانتے ہو پھر کیا ہوا؟ پھر ابّا امّی کو پیار کرنے لگے میں چلّائی "امّی! کاٹتے ہیں کانٹے"۔ اور امّی ابّا کے بازوؤں سے نکل کر مجھ پر جھپٹیں۔ میرے منہ پر زور سے طمانچہ مارا اور مجھے اُٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دیا۔ میں روتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ نیم کے پیڑ کے تلے ایک لال مرغی اور سات رنگ برنگے چوزے چگ رہے تھے۔ میں کوڑے سے گال لگائے سسکیاں لیتی ہوئی، بڑی دیر تک اپنے دُھندلے دُھندلے آنسوؤں میں سے لال مرغی اور چوزوں کو تکتی رہی۔" فرحت کی آواز بھرّائی ہوئی تھی مہندر خاموش سُنتا رہا۔ فرحت نے ہاتھ بڑھا دیا۔ مہندر نے کتابیں دے دیں۔ مہندر نے اس کا ہاتھ نہ دبایا۔ مہندر اس کے اُداس چہرے کو دیکھتا رہا۔ فرحت جا چکی تھی ... حت کے گال۔ پانچ انگلیوں کے نشان ــــ سامنے ہوسٹل کی زرد دیواریں ــــ مائیں اور یہ مائیں!

"میں دفتر جاتا ہوں۔ تم یونہی نہ بیٹھے رہنا۔ جی چاہے تو کچھ پڑھ لکھ لینا۔" مہندر کے پتا نے اخبار کی تہ لگاتے ہوئے کہا۔ مہندر اپنا اوپر والا ہونٹ دانتوں سے کاٹ چکا تھا۔ اُس نے اُنگلی ہونٹ پر پھیری۔ اُنگلی پر تھوڑا سا خون درخشاں تھا۔

"رحمن بس" باورچی خانے سے بیبی کے برتن گرنے کی آواز آئی۔

"ہائے ہائے مر گیا ۔ یہ نوکر بھی اپنے مالکوں کی جان کے دشمن ہیں" مہندر کی ماں نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا "ہزار بار کہہ چکی ہوں، لاکھ بار کہہ چکی ہوں کہ دس دس تکے مل ان چینی کے برتنوں کو میز پر نہ رہنے دیا کرو پر میری اس گھر میں کون سنتا ہے؟ کوئی پوچھے وقت ہے یہ پلاؤ پینے کا۔" مہندر کی ماں کی آواز باورچی خانے میں سے آ رہی تھی۔

مہندر نے پھر کھڑکی سے باہر جھانکا نیم کے آدھے درخت پر بے جان سی تھکی ہوئی دھوپ میں پھیل چکی تھی۔ دو کوے ایک ٹہنی پر بھیگے ہوئے بیٹھے تھے۔ ان کی گردنوں کے پر بھیگ کر الجھ گئے تھے اور ان کی سیاہی میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ نیم کے درخت سے "ٹپ" "ٹپ" بارش کی بوندیں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد گر رہی تھیں۔

"ٹپ" بوند چمکی۔ زمین پر گری۔ زمین میں جذب ہو گئی۔ پاس ہی ایک گلہری "چڑ چڑ" کر کے بھاگ گئی۔

"ٹپ" ایک بوند اور گری۔ وہ پرے سے بھنگن کی جوان لڑکی آ رہی ہے۔ ایک ہاتھ میں جھاڑو دیے ٹوکرا بائیں بازو کے نیچے کمر پر دبائے ہوئے اس کی آنکھیں بیباک ہیں، اس کی چال بے جھجک ہے۔ اس کا لہنگا بار بار اوپر نیچے ہوتا ہے۔ اس کے ٹخنے سفید ہیں۔ اس کا لہنگا سرخ ہے۔ سرخی! لہنگا نیچے ہو گیا۔ سفیدی لہنگا اوپر چلا گیا۔ سرخی سفیدی۔ سرخی سفیدی اس کی آنکھیں بھی نہیں جھکتیں۔ وہ جب آتی ہے مجھے بیباک نگاہوں سے گھورتی ہے۔ میں بھی اسے دیکھتا ہوں سرخی سفیدی۔ سرخی سفیدی۔ اس کی آنکھیں کتنی بڑی ہیں! اس کی پتلیاں کیسے ناچتی ہیں۔ اگر کسی نے مجھے اس عورت سے دیکھ لیا تو۔ سرخی سفیدی — شریفے کا درخت بھی بھیگا ہوا ہے۔ وہ سبز شریفہ ویسے ہی لٹکا ہوا ہے۔ سبز سبز پکے پھوڑے سے۔ سرخی سفیدی جیسے سفیدے کے درخت کو کاٹ کر یہ تختے تراش لیے گئے ہوں۔ ان پر بال بھی نہیں، جیسے تختے پر رکھے ہیں، جیسے جو کبدا لگی ہوئی کے تختوں پر ہیں جیسے۔ سفیدی سفیدی۔ وہ کھڑی ہو گئی ہے۔ اس نے پھر مجھے دیکھنا شروع کر دیا ہے کمبخت چلی بھی جا بھنگن کی بچی!

مہندر کے کان سرخ ہو گئے، مہندر کی آنکھیں جلنے لگیں۔ مہندر کے ہونٹ سوکھ گئے۔ مہندر نے آنکھیں بند کر لیں اس کی آنکھوں میں جیسے ہوئے کانپ رہے تھے۔ سرخی! سرخی! سرخی!!! سرخی کا بہتا ہوا دریا کثیف، گاڑھا کثیف۔ رواں دواں رواں دواں — یہ خون۔ یہ کشتی۔ یہ سرخ۔ یہ سرخ سرخ لحاف۔ لحاف پر آہستہ آہستہ پھرتا ہوا ہاتھ لحاف کے نیچے گرم گرم جسم۔ لحاف کے کنارے سے جھانکتا ہوا چہرہ۔ اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹ۔ اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں۔ اس کے جھکتے ہوئے پپوٹے۔ خواب آگیں، خواب آور۔ خواب آلود۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"تم۔ تم رات یہیں سو رہو۔ اس وقت کہاں جاؤ گے"

ملائم ریشمی قمیض۔ گرم، نرم انگلیاں۔ مد و جزر۔ مد و جزر۔ مد و جزر۔ اس کی انگلیاں، اس کے ہاتھ، مد و جزر۔ مد و جزر۔ یہ ہاتھ ڈوب جائیں گے۔ یہ ہاتھ کھو جائیں گے۔ یہ ہاتھ پگھل جائیں گے۔ نرم و گرم، گرم و نرم۔ سرخ سرخ یہ خون کا دریا۔ یہ خون کے شعلے۔ یہ شعلے، یہ دریا۔ یہ گرمی، یہ نرمی۔ یہ نرمی یہ گرمی۔ سکوت۔ سکوت۔ سکوت۔ سکوت۔ سانس سانس۔ سانس۔

"مہندر ڈاکیہ نہیں آیا"۔ اوشا نے بغل والے کمرے سے نکل کر پوچھا۔

"مہندر اچھل پڑا۔" اور چیخ کر بولا "نہیں"۔

"کاٹنے کو کیوں آتے ہو؟" اوشا بولی

"دفع ہو یہاں سے۔ چڑیل کہیں کی"۔ غصے کے مارے اس کا سارا بدن کانپنے لگا۔ اوشا سہم کر بھاگ گئی۔ نیم کی ٹہنیوں سے دونوں کوے ڈر کر اڑ گئے تھے۔ گلہری ابھی تک نیم کے تنے سے چمٹی ہوئی تھی۔ مہندر تھک کر پھر کرسی پر گر بیٹھا۔

"مہندر۔ مہندر"۔ اوشا نے شانے جھنجھوڑ کر مہندر کو جگا دیا۔ مہندر نے آنکھیں مل کر کھول دیں۔ دھوپ نیم کے سارے درخت پر پھیل گئی تھی۔

"کیا ہے؟" اس نے سخت ملامت کو درشتی میں تبدیل

کرتے ہوئے کہا۔

"یہ دیکھو" اوشا نے سفید رنگ کا ایک بڑا سا لفافہ جھلکاتے ہوئے کہا۔ اور پھر اسے اپنے بلاؤز میں سامنے تھام لیا۔ لمحہ بھر کے لئے مہندر کی آنکھوں کے سامنے سرخ پگڑی باندھے ناک پر تاروں کی عینک رکھے مسکراتی چال سے چلتا ہوا ڈاکیہ پھر گیا۔

"کس کا ہے؟"

"تمہارا۔"

"لاؤ۔ ادھر لاؤ۔"

"اوں ہوں۔"

"اوں ہوں کی بچی۔ دیتی ہے یا کاٹ دوں چٹیا۔"

"نہیں دیتی۔"

"تیرے سر میں چولھے کی راکھ نہ ڈالی تو کہنا۔"

نہیں دیتی۔"

مہندر آپے سے باہر ہوگیا۔ یہ مائیں۔ یہ بہنیں۔ ذرا دیکھو تو سہی، مکھن اور چینی کی بنی ہوئی یہ حقیر سی چھوکری، مٹھی میں دبا لوں تو "پچر" کر کے پانی کی طرح بہ نکلے۔ بہن بنی پھرتی ہے اور ذرا چٹیا کھینچو تو بس ماں پیچھے جھاڑو لے کر پیچھے پڑ جاتی ہے۔ "یہ پرائے گھر کا دھن ہے اسے مارتے شرم نہیں آتی تجھے اوسٹے جتنا بڑا ہوگیا ہے اور عقل ———" ایک چپت لگا، بس صاحب آسمان پھٹ پڑا۔ یہ تیری چھوٹی بہن ہے۔ اپنے ہاتھوں ڈولی میں ڈالنا ہوگا ایک دن۔ اور اسے مارتا ہے۔ یہ بہن، یہ نفرت انگیز جنہیں۔ نہ ڈانٹ سکو۔ نہ مار سکو۔ بس بہن بنا کے رکھو۔ اور پھر ماں کی مصیبت یہ ہے کہ جو لڑکی گھر آئے "بیٹا تیری بہن چمپا آئی ہے قلم دوات مانگنے" "بیٹا! خورشید بہن آئی ہے خط پڑھوانے۔" "بیٹا سمترا بہن آئی ہے۔" سر منڈوانے۔" مہندر نے کہہ دیا۔ وہ اس روز مولوی کی بہن کمبخت طلاق لے چکی خاوند سے۔ بُھنا ہوا مرغ لے آئی میرے لئے سمجھتا ہوں اور ماں چلائی۔ "بیٹا یہ تیری بہن نور ن آئی ہے" بہن ——— بہن ——— بہن۔ بہن ہوگی مولوی کی ———!

"بس، ہار گئے" اوشا نے چڑاتے ہوئے کہا۔

"مہندر سوچ رہا تھا کہ لفافہ کیسے چھینے۔"

"یہ دیکھو جادو کا لفافہ ——— اگر بکر ظاہر بھی کھو

اتنی نوٹ پورے سو۔

"اس کر کھوں کے دیکھو لو ———" اوشا نے لفافے کا ایک سرا پھاڑ دیا۔ مہندر بے بس ہوگیا۔

"دیکھو اوشا۔ پیاری بہن۔ بہن ۔ بہن۔ مجھے نفرت ہے اس لفظ سے) دیکھو پیاری بہن میں کبھی تمہیں ستاتا ہوں؟ کبھی تمہاری شکایتیں لگاتا ہوں ماں سے؟ تم تو بہت اچھی ہو یہ دے دو۔ لاؤ بھی نا ——— دیکھو اب میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ مہندر نے اوشا کو سینے سے لگا اس کے گال تھپتھپائے اور پھر لفافہ لے لیا۔ اوشا پاس کھڑی ہوگئی۔

"چل دفع ہو اب یہاں سے" مہندر نے پھر ڈانٹ بتائی۔

"اچھا! یہ بات ہے؟ پھر کوئی چیز لینا۔"

"جا۔ جو تیرا جی چاہے کر اس وقت دماغ نہ چاٹ۔"

اوشا چلی گئی۔ دروازے کے پاس جا کر بولی "کہتی ہوں ماں سے جا کر۔" مہندر نے لفافہ چاک کیا۔ اس میں فرحت کی تصویر تھی۔ فرحت مسکرا رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ چوٹی کے بالوں کو انگلی کے گرد لپیٹ رہا تھا اور دوسرے ہاتھ میں سفید شفون کا دوپٹہ تھا۔ کالی قمیص۔ سفید دوپٹہ۔ بال اُلجھے ہوئے نیچے لکھا تھا "مہندر کے لئے چاہے وہ کچھ نہ ہو" او فرحت! فرحت! تم کتنی خوبصورت ہو۔ تم کتنی اچھی ہو۔ تم کتنی پیاری ہو۔

"فرحت!"

"جی ۔ او۔"

"تم جی۔ او کس انداز سے کہتی ہو!"

"سچ! ——— جی ——— او۔"

"مجھے میرا مطلب ہے، کیا کہوں۔ میرا مطلب ہے، تم میرا مطلب سمجھ گئی ہو نا؟"

"جی ۔ او ———"

مہندر کا چہرہ سرخ ہوگیا، مہندر کے ہونٹ کانپنے لگے۔ فرحت نے مہندر کے بالوں بھرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ اس کے بالوں کو اپنی انگلیوں سے ٹٹول رہی تھی ———

"مہندر" اوشا اندر سے آتی ہوئی چلائی۔

"مہندر بھائی صاحب" بے بی نے متانت سے کہا۔ بے بی پڑوس والے منیجر کی لڑکی تھی۔

" مہندر بھائی صاحب۔ یہ دیکھئے" ڈولی نے بی کی چھوٹی بہن نے مہندر سے تصویر چھینی۔

" اوہو تو یہ مس دیوکی جی ! " بے بی نے طنز سے کہا۔

مہندر نے تصویر واپس چھین لی۔ " مہندر بھائی صاحب مہندر بھائی صاحب۔ یہ بھائی ! یہ بہنیں ! میں ان بہنوں کا آچار ڈالوں۔ مربہ ساؤں۔"

مہندر کی ماں جس کے دونوں ہاتھ گیلے آٹے سے لتھڑے ہوئے تھے آگئی۔

" بھائی جی ۔۔۔ دیکھئے نا مہندر کے پاس آپ کی بہو" ڈولی نے کہا۔

مہندر کی ماں پر گویا گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اُسے وہ دن یاد آیا۔ جب اس کے محلے میں چودھری کا لڑکا پاس ہونے کی خوشی میں ایک چماری کو ساتھ لایا تھا۔ بے شرم کہیں کی ! بھگوے سُرخ نیلے رنگ کی قمیص اور شلوار پہنے گلی میں چودھری کے لڑکے کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ محلے بھر کی کنواریاں کواڑوں کی درزوں میں سے چھپ چھپ کر دیکھ رہی تھیں۔ نہ بالوں میں سیدھی مانگ نہ مانگ میں سیندور۔ اور پھر نیچ ذات کی۔ رام۔ رام۔ رام رام۔ اور مہندر کتنی بار کہہ چکی ہو اس کے پتا سے کہ اس کی شادی کر دو۔ پر میری کون سنتا ہے اس گھر میں ؟

" بھائی جی۔ یہ کون ہے ؟" ڈولی ایک بار پھر چلائی۔

" ہوگی کوئی اسکے کالج کی بہن"۔ ماں نے لاپروائی سے کہا لیکن ندامت کو چھپانے کے لئے اندر چلی گئی۔

" بہن ؟" بے بی نے طنز سے آہستہ سے مسکرا کر کہا۔

" ہاں بہن" مہندر نے کچھے ہوئے انداز سے کہا "یہ لو۔ دیکھ لو جی بھر کر" اور تصویر پھینک کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

" لڑکیاں تصویر پر جھپٹ پڑیں"

" آنکھیں چھوٹی ہیں "

" پر ہونٹ بڑے خوبصورت ہیں"

" اور بال ؟"

" اور گردن ؟"

سمارٹ کتنی ہے !

" کیوں نہ ہو۔ لڑکوں کے کالج میں ۔۔۔"

مہندر اپنے کمرے میں چارپائی پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔

اگلے روز جب بھنگن کی جوان لڑکی ٹوکرا اُٹھائے ہوئے آئی اور نیم کے نیچے کھڑی ہو کر مہندر کو گھورنے لگی تو مہندر پہلی بار مسکرا دیا اور دل ہی دل میں ماں سے کہنے لگا۔ "ماں کیا یہ بھنگن کی لڑکی بھی میری بہن ہے ؟" اور اسے ایسے محسوس ہوا گویا اُس کی ماں کے ہاتھ سے مٹر کے دانوں کا تھال فرش پر گر کر زور زور سے قہقہے لگا رہا ہے۔ اور مٹر کے دانے چاروں طرف خوشی سے ناچ رہے ہیں۔

ساقی بک ڈپو کی کتابیں

رفیق احمیری کے ۳۴ افسانوں کا مجموعہ۔ رفیق احمیری

کہکشاں :- کی تحریر کا اسلوب بالکل کسی اور ادیب کی تحریر میں آپ کو نہیں مل سکتا قیمت تین روپے

شیر محمد اختر کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ۔ اختر کے

سائے :- افسانے زندگی کی تصویر ہوتے ہیں۔ طرز بیان نہایت دلکش اور کہانی نہایت موثر ہوتی ہے۔ قیمت عـ۸/

مشہور افسانہ نگار محمد حسن عسکری ایم۔اے

جزیرے :- کے آٹھ افسانوں کا مجموعہ عسکری صاحب نے اُردو افسانہ نگاری میں ایک جدید دلدوز طرز بیان کا اضافہ کیا ہے تخیل مبارک اور ان کا طریقہ اظہار بے لاگ ہے قیمت عـ۲/

شمشیر سنگھ نرولا کے بارہ افسانوں کا مجموعہ نروُلا

جالے :- جزئیات نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ وہ ایک ماہر سائنسٹ کی طرح باریک سے باریک اور خفیف سے خفیف جذبات کا تجزیہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ قیمت عـ۱۲/ زندگی ایک تلخ حقیقت ہے اور کبھی کبھی ایک

مضراب :- خوابناک رومان۔ مضراب راجہ مہدی علی خاں کی ساقط کلٹریہ اور رومانی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس طرز کی نظمیں آج تک اُردو میں نہیں لکھی گئیں اگر آپ کو شاعری سے ذوق ہے تو ایک جلد آج ہی منگا لیجئے۔ اُردو شاعری میں ان نظموں سے جدید اضافہ ہوا ہے۔ دیباچہ میراجی نے لکھا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عـ۸/)

ملنے کا پتہ :- ساقی بک ڈپو۔ دہلی

آثر صہبائی

غزل

اُس حُسنِ مجسّم کا لب پر مرے نام آیا
اُلفت کا سلام آیا، عشرت کا پیام آیا

اک نُور کا عالم ہے! نغموں کا تلاطم ہے
صحرائے محبّت میں اب یہ بھی مقام آیا

وارفتہ و بے خود ہے، یہ ہوش کہاں دل کو
کب وقتِ سجود آیا، کب وقتِ قیام آیا

مخمور فضائیں ہیں، مسرور ہوائیں ہیں
صہبائے طرب لے کر وہ ماہِ تمام آیا

طاری ہے دل و جاں پہ اک رقصِ نشاط آور
اک ہاتھ میں زلف آئی، اک ہاتھ میں جام آیا

نئی اور عمدہ کتابیں

پیش کردہ اُردو پبلشنگ گاہ ۔ دہلی ——— خوبصورت کتابت طباعت، مضبوط جلد، خوشنما گرد پوش

بے غیرت

"بے غیرت" بلجیم کے قابل ترین ادیب موریس ماترلنگ کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔ ایک غیور سپہ سالار کی ماں کیا رہوی اپنے ملک اور قوم کو غلامی اور بھوک سے بچانے کے لئے اپنی عصمت پر کھیل جانے کو تیار ہو گئی، تو اُس کے شوہر نے اسے بے غیرت سمجھا اور اُسے لعنت ملامت کی۔ لیکن کیا واقعی وہ بے غیرت تھی؟ پھر اُس نے دشمن کے خیمہ میں وصل کی شب کس طرح بسر کی؟ یہ آپ اس ڈرامہ میں پڑھئے جسے ترجمہ کرنے کی خاص مصنف سے اجازت حاصل کی گئی تھی۔ مترجمہ جلیل احمد قدوائی۔ قیمت عہ

طغیان

بنگال کے شعلہ بیان ادیب قاضی نذرالاسلام کے یہ افسانے بنگلہ سے براہ راست اُردو میں پہلی بار منتقل ہوئے ہیں۔ محبت کی چوٹ کتنی ظالم ہوتی ہے، یہ ان افسانوں میں دیکھئے۔ طغیان گویا قلزم عشق ہے جس کی ایک ایک بوند میں بے پناہ عزائم اور جذبات کروٹیں لے رہے ہیں۔ ان افسانوں کے پس منظر میں ہم اپنے دیس کی وہ سماجی و معاشرتی بنیادیں دکھائی دیتی ہیں جو شکستہ ہو چکی ہیں۔ وہ زندگیاں نظر آتی ہیں جو موت اور بھوک کے مانے (؟) جانے میں بجھی ہوتی ہیں۔ اس مجموعہ میں وہ فریادیں ہیں جو دلوں کو ہلا دیتی ہیں، وہ للکاریں ہیں جو سوئے ضمیر کو جگاتی ہیں۔ قیمت عہ

اصنام خیالی

پروفیسر جلیل احمد قدوائی ایم۔ اے روسی و فرانسیسی افسانوں کو سب سے پہلے ہم سے روشناس کرایا۔ اصنام خیالی انہی کے دلکش و دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں ترکیب، چیخوف، اڈموپساں کے علاوہ خود اُنکے بہترین افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کتنی رنگا رنگ، کتنی تلخ و شیریں، کتنی بھیانک و چمکدار ہے۔ اس کتاب کی عمدگی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) نے اس پر مقدمہ لکھا ہے جو دراصل جدید افسانہ نگاری کے عروج و ارتقا کی بیش از معلومات داستان ہے۔ قیمت عہ

دھنک

قوس قزح کی مناسبت سے یہ سات رنگین دلآویز افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ارشاد الخیری ایم۔ اے دہلوی اس میں وہ مشہور افسانہ "شمن" بھی شامل ہے جس کے شائع ہوتے ہی سارے ملک میں دھوم مچ گئی تھی۔ "دھنک" کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ آنریبل سر شیخ عبدالقادر اور آنریبل سر سلطان احمد جیسے حضرات نے اسے بے حد پسند فرمایا۔ نیز ہندوستان کے تمام اخبارات و رسائل اور آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی، لکھنؤ وغیرہ نے اس پر مفصل تبصرے کئے ہیں۔ سالگرہ، مزاح حضرات و خواتین کیلئے "دھنک" نہایت عمدہ تحفہ ہے۔ دوسرا ایڈیشن خاص اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ قیمت عہ

پیمانے

اُردو کے مشہور شاعر اور افسانہ نگار ما ہرالقادری کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ۔ یہ افسانے اتنے عمدہ اور پُر لطف ہیں کہ بغیر ختم کئے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ ہر افسانہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت عہ

رنگ و نور

جلیل احمد قدوائی کی شاعری دل کی شاعری ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اتنے اچھوتے اور البیلے انداز میں کہ دل و دماغ پر بے حد اثر ہوتا ہے۔ "رنگ و نور" ایک لطیف تخیل اور پُرسوز کلام کا حسین و جمیل مجموعہ ہے۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ۔

اگر سب کتابیں اکٹھی منگائے گا تو پیکنگ اور محصولڈاک ہم خود ادا کریں گے	**خاتون کتاب گھر، اُردو بازار، دہلی**	اُردو کی ہر کتاب خواہ وہ کہیں چھپی ہو ہم سے منگائیے۔

مختار صدیقی

۱۹۴۵ء کی بہترین نظمیں

یہ انتخاب اس سلسلے کی پانچویں کڑی ہے جو چھ سال پہلے حلقۂ اربابِ ذوق نے شروع کیا تھا۔ زیرِ نظر مجموعہ میں ۵۸ نظمیں ہیں جن کے لکھنے والے ۲۴ شاعر ہیں۔ ضخامت ۱۲۷ صفحے ہیں۔

انسان کی فطری ظاہر پرستی اس کی نظر سب سے پہلے ظاہر ہی پر الجھاتی ہے۔ ورق منظر ہو یا تاثر۔ انسان ہو یا اس کی کوئی تخلیق۔ سب سے پہلے اُسی پر قصوری نظر پڑتی ہے جو ... "یہ چاند ... ہے"۔ چنانچہ ظاہر کا ردِ عمل۔ باطن کی بصیرت سے بعد کو جھوٹا ثابت ہو تو ہو۔ مگر ایک نظر نے بھی دیکھا کہ اس کتاب کے ظاہر کا ردِ عمل چنداں خوشگوار نہیں۔ ٹائیٹل شاعروں کے ناموں سے بھرپور ہے پہلے کا نام سیاہ ... اور سیاہ پس منظر میں ضرورت سے زیادہ جلی نظر آتا ہے اور سفیدی پس منظر کی سیاہی کو اور بھی گہرا کرتا ہے۔ کتاب کی ورق گردانی پر دو چیزیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو شاعروں کے نام ہیں جو ٹائیٹل پر تو ٹھیک ہیں لیکن فہرس اور ... تک پہونچتے پہونچتے ان میں ایک عجیب تغیر آجاتا ہے۔ ٹائیٹل پر یہ نام اُسی ہیئت میں ہیں۔ جس طرح وہ مشہور ہیں لیکن فہرس میں پہونچتے ہی وہ یوسف ظفر۔ ن۔ م۔ راشد۔ محمد خلیل الرحمن۔ قیوم نظر۔ سردار انور۔ وشوامتر عادل کی بجائے ظفر یوسف۔ راشد ن۔ م۔ خلیل الرحمن محمد۔ نظر قیوم۔ انور سردار۔ عادل وشوامتر کا روپ بدل لیتے ہیں۔ یہ تبدیلی شاعروں کے ناموں کی ترتیب کی بدولت ہوئی ہے جنہیں فہرس میں حرفِ تہجی کا سیاق ملا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حلقۂ اربابِ ذوق نے اس دفعہ شاعروں کے مختصر حالات بھی درج کئے ہیں۔ حالات کے اوپر شاعروں کے نام۔ تقدم تاخر کے اُسی اصول سے لکھے گئے ہیں جو حرفِ تہجی کی ترتیب کا خاصہ ہے۔ اس التزام سے نتیجے خاصے ناموں میں کچھ ایسی تعقید اور بعض جگہ "بندش کی ایسی سستی" پیدا ہو گئی ہے۔ جو پرانی شاعری میں ... کے نزدیک بھی کسی طرح جائز نہیں۔ مثلاً احمد ندیم قاسمی کے حالات اگر آپ پڑھنا چاہیں تو پہلے آپ کو یہ تعقید گوارا کرنا ہوگی کہ اُن کا نام ندیم قاسمی احمد ہو گیا ہے۔ ناموں کی اس ترمیم اور تحریف کے علاوہ شاعروں کے حالات بھی محلِ نظر ٹھہرتے ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ کہتا ہے کہ میری طرح یہ حالات شاعروں نے خود لکھ کر بھیجے، لیکن جب یہ چھپے تو ناموں کی طرح اُن کی بھی صورت بدل گئی۔ موجودہ صورت میں شاعروں کے یہ حالات بیان کے لحاظ سے اکثر جگہ اور انداز کے اعتبار سے ہر جگہ بُری طرح کھٹکتے ہیں۔ صرف دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

ضیا جالندھری:۔ "ابتدا میں سُلگتی ہوئی نظمیں کہتے تھے۔ پھر ہلکی پھلکی نظمیں کہنے لگے۔ آج کل فکر کے لحاظ سے بوجھل جبر دوں؟"

مخمور جالندھری:۔ "کبھی سردار گوربخش سنگھ تھے لیکن شاعری کے طفیل مخمور ہو گئے اور ۱۹۱۵ء میں جالندھر چھاؤنی میں پیدا ہونے کے باعث جالندھری کہلانے لگے۔"

ن۔ م۔ راشد:۔ "۱۹۳۸ء میں ملتان میں کلرکی کر رہے تھے کہ آل انڈیا ریڈیو کی لہروں کی نذر ہو گئے۔ آج کل آپ اپنی سلاسل میں گرفتار مشرقِ وسطیٰ میں ایک کپتان کی حیثیت سے دادِ شعر دے رہے ہیں۔"

شاد عارفی:۔ "آپ ۱۹۰۳ء میں اپنے کہنے کے مطابق ہندوستان میں پیدا ہوئے۔"

مظفر سلیم:۔ "اُن کے خط لکھنؤ سے آتے ہیں۔ اور کیا حال خدا جانے!" وغیرہ۔

شاعروں کے حالات کا عام انداز یہی ہے، اس کی ذمہ داری ظاہر بیں نظروں کیلئے قیوم نظر سکریٹری حلقۂ اربابِ ذوق پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اس کتاب کو مرتب کیا۔ ہو سکتا ہے کہ سوانح کا یہ غیر سنجیدہ اندازِ بیاں اُن رعایتوں کے

نہ نعاوت کے طور پر اختیار کیا گیا ہو جو آجکل مشرق اور مغرب میں ہملتہ سے مجموعۂ نظم پیش کرتے وقت ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔ نظم کے انگریزی موں میں حالات شعرا کا حصہ بہت سیدھا سادا اور مختصر ہوتا ہے۔ اس میں صرف مطلب کی بات کہی جاتی ہے۔ البتہ ان دنوں اشتہاریت عجیبی کے زیر اثر "للی پٹ"، "سٹریٹ"، "پال مال" ایسے دوفر پرچے یا نیو ٹائمنگ جیسے میم پرچے۔ ٹیم کتابیں۔ جب کسی خاص اجرا لکھنے والوں کے حالات زندگی لکھنے میں گراں میں پڑ۔ کچھ بے تکلفی اور غیر سنجیدگی بلکہ بعض اوقات مزاح تک کا سہارا لیتے ۔ مگر وہ لوالب کو بھی ہاتھ سے نہیں دیتے اور دھر بہ ہاتھ ہے۔ زیر نظر کتاب میں سوانح شعرا کا لہجہ ایسا ہے جو اسی مدہ کتاب کے ساتھ کسی طرح میل نہیں کھاتا۔ عبارت آرائی میں سب کے وقار اور سنجیدگی کے جائز تکلف کو بھی روا نہیں با گیا۔ سال کے متعلق بھی مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ سر میں کچھ روانی ہے۔ اور شاید لکھنے والے نے نثر میں کچھ شاعرانہ تجاہل برتا ہے!!

"ظاہر کی آنکھ کا ساتھ یہاں ختم ہوتا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ کس کے متن کا فیصلہ کیا ہے۔!

یہ نظمیں ایک سال یعنی ۱۹۴۵ء کی نظموں کا انتخاب ہیں۔ ۱۹۴۵ء کا سال بیسویں صدی کا بڑا اہم سال ہے۔ کیونکہ سال۔ دنیا کی دوسری بڑی جنگ کا خاتمہ ہوا۔ اور وہ طاقتیں بلکہ وہ نظریئے۔ جو تلوار کی نوک سے اپنی سچائی منوانے لئے میدان میں اترے تھے ایک فیصلہ کن منزل پر پہنچ گئے۔ ترقی یافتہ مادیت، اور سائنس کے عروج نے یہ دوسرا معرکہ دیکھا۔ اپنی مدد سے ان نظریوں کو سچا ثابت کر دکھایا۔ جن میں ان کی خدمت کا مقدور زیادہ تھا۔ ایسی جیت کا نتیجہ منطقی طور پر کچھ ہونا چاہیئے تھا وہی ہوا۔ یعنی جیتنے والے نظریوں نے جیت کی اگلی صبح ہی یہ محسوس کیا کہ جیت ان کی نہیں، مادیت اور نس کی ہوتی ہے۔ جو حافظ شیرازی کی مجوزہ ہاتے ہزار داماد ہیں اور سب کے ہونے پر جاتے بھی کسی کی نہیں ہیں۔ کا مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے مقصد کو خود ہی جھٹلا دیا۔ اس بصیرت کا رد عمل ایسی شکست خوردگی تھی جو دونوں ہوں پر اس وقت طاری ہے۔

صلح کے جشنوں اور رات کی پاگل کر دینے والی دھوم میں پاگل ہونے والے ان گنت سپاہی اور شہری تیز شراب اور تیز تر بیوں کے نشے میں بھی یہ بھولتے نہیں پاتے کہ یہ سب کچھ بے سود ہے۔ بے کار محض ہے۔ یہ خوشی یہ شادیانے یہ ناچ گانے سب ڈھونگ ہیں۔ وہاں کا حال بھی وہی ہے جو ہارنے والوں کا ہے۔ مشرق و مغرب کے ویرانوں اور آبادیوں میں رد عمل کی گہری تلخی ہر جگہ ملتی ہے۔ اسی جان حزیں احساس نے ہی پچھلی جنگ عظیم کے جانباز شاعر ولفرڈ اوون سے شعر کہلوائے تھے۔

(محبوبہ سے) سرخ ہونٹ اتنے سرخ نہیں\
جتنے وہ داغدار پتھر جنہیں ہمارے رنیوالوں نے دم آخر بوسے دیئے!!\
محبت بھری آنکھوں کی فسوں کاری مٹ جاتی ہے\
جب مجھے ان آنکھوں کا خیال آتا ہے۔\
جن کی روشنی میدان جنگ میں مٹ مٹ گئی!!

نہ جانے یہ شعر آج کتنے انسانوں کے حسب حال ہیں۔ اور کتنے لوگوں کو یہی شعر [illegible] کی طرح عین فتح کے جشن کے موقع پر یاد آئے!!!

اس شکست خوردگی کی عالمگیر لہر تو آپ ان نظموں میں بھی کہیں کہیں دیکھیں گے۔ لیکن لڑائی کے دنوں میں لکھی جانے کے باوجود یہ نظمیں جنگ کے زمانہ کی نظمیں یا war-poetry نہیں ہیں۔ ان میں آپکو ۱۹۴۵ء کی تاریخی اہمیت یا سماجی اور تمدنی خصوصیت کا کہیں سراغ نہیں ملے گا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس دور کے شاعروں کو دنیا کے حالات سے دلچسپی نہیں اور وہ اپنے خیالوں کی خیرہ کن روشنی میں ہی کھوئے رہتے ہیں۔ ذاتی واقفیت کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں

کہ آجکل کے شاعروں کے عام واقعات کی رفتار سیاسی اور تمدنی کوائف تاریخی حالات سے بہت قریب ہیں۔ لیکن ان نظموں اور آجکل نظموں کے "جنگی" نہ ہونے اور جنگ سے بلا واسطہ متاثر نہ ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم ہندوستانی اس جنگ میں خود نہیں آئے لائے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ مارے باندھے کے کاموں کے ساتھ دل میں ناگواری کا ایسا تاثر بیٹھ جاتا ہے کہ جب ہم کوئی جرئت کریں تو مجبوری کے اس فرض کا شائبہ تک اُس کاوش میں بار نہیں پاتا۔ اسی ناگواری کے طفیل آپکو پچھلے سال کی نظموں میں لڑائی کے چھ برس کی نظموں میں واضح طور پر "جنگی عنصر" نہیں ملے گا۔ ہاں ایسی نظمیں ضرور نظر آئیں گی جو یا تو کمیونسٹوں نے رُوس کے درد کو اپنا درد سمجھ کر لکھی ہیں یا پھر گورنمنٹ آف انڈیا نے لکھوائی ہیں۔ اس طرح جنگ میں حصہ لینے والے ملکوں میں ہندوستان کی حیثیت عجب سی ہو جاتی ہے کیونکہ باقی ملکوں نے اپنے سپوتوں کی قربانی دے کر اپنے ادب میں اُن کے خون کی سُرخی شامل کی۔ لیکن ہم نے قربانی تو شاید سب سے زیادہ دی۔ لیکن اس کا ادب میں کوئی تاثر نظر نہیں آتا۔

چنانچہ زیرِ نظر کتاب میں زیادہ نظمیں محبت اور اس کے عوامل اور عواقب کی ہی گھٹتی بڑھتی پرچھائیاں ہیں جنگ ہولناک مصیبتوں گرانی۔ خوشحالی کے قحط اور خود قحط نے انسان کے اس اوّلیں شاید آخریں جذبے میں کوئی کمی نہیں کی۔

میراجی کی "دو نوں کہانیاں"۔ اختر الایمان کی "ایک پرتو"۔ منیب الرحمٰن کی "بہار"۔ سلام کی "آخری کش"۔ اختر ہوشیارپوری کی "جائزے"۔ صبا کی "بجھی ہوئی آگ"۔ انور کا "ڈانس ہال"۔ قیوم نظر کا "ناچ"۔ یوسف ظفر کی "رقیب"۔ "اجنبی"۔ وشوامترہ کی "نئی یا پرانی کہانی"۔ اعجاز بٹالوی کی "رات کے بعد"۔ ایسی نظمیں ہیں جو اسی جذبے کی وسعتوں میں حلقہ بند ہیں۔ جن کی تخلیق کبھی ایک وارفتگی یا سرشاری یا شدت کے لمحے کے تابع ہے۔ اس لئے ان نظموں میں آپ کو کسی نامانوس یا غیر یقینی کیفیت یا کسی خاص اُلجھاؤ سے واسطہ نہیں پڑے گا۔ بعض نظموں میں آپکو خیال یا جذبے کی ایسی نازکی اور اچھوتی خوبصورتی بھی دکھائی دیگی جو بڑی کاوش سے لفظوں میں لائی گئی ہے! مثلاً :۔

خدا کی مخلوق سو گئی ہے فریبِ صبحِ بہار کھا کر　　سکوں کے دامن میں فکرِ امروز گر پڑی ہے نڈھال ہو کر
میرے تخیل سے ایک پرتو۔ اُبھر رہا ہے سوال ہو کر　　یہ غم کی لہریں جو ہر تمنا سے کھیلتی ہیں مآل ہو کر
دیارِ محبوب کی خموشی کہیں تجھے سنگ ہی نہ کر دے　　حسیں امیدوں کا یہ تلاطم تیرو نفس میں سے زہر بھر دے　　(اختر الا

یا:۔
اور برسوں سے یہ تکتے ہوئے بوسیدہ کواڑ　　کیا تیرے درد کی درماں ہی نہیں
راستہ بھولے ہوئے رہرو کو　　کیا تیرے دل کی شبستانوں میں
اپنی آغوش میں لے لیتے ہیں　　موت کا پیتے سایوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔
اور یہ پوچھتے ہیں۔　　(وشوامترعادل

یا:۔
تم ایک اندازِ بے نیازی سے سر اٹھا کر جھٹک دو شب رنگ گیسوؤں کو
ہنسی سے بیتاب ہو کے تم ناگہاں کسی پیڑ کی گھنیری مہکتی چھاؤں میں لیٹ جاؤ
اور آفتاب سحر کی نو خیز نرم کرنوں کو فرطِ عشرت سے اپنی آغوش میں جکڑ لو!!　　(منیب الرحمٰن)

اور یہ دیکھئے —— شفق کی دُلہن جا چکی ہے۔ ہر اک سمت ہیں آسمان پرستاروں کے آنسو
اِدھر آ —— اِدھر آ مری زرد رو۔ میری بے حس دلہن میری آغوش میں آ،
کہ میں ڈر رہا تھا۔
مجھے دیکھتی تھی شفق کی دُلہن تیرے ہوتے ہوئے بھی مجھے دیکھتی تھی !!
مجھے گھورتی تھی ——　　(یوسف ظفر)

یا:۔
آؤ ہواؤں ان زلفوں کو اہراؤ　　زلفوں میں پنہاں ہیں شانے دکھلاؤ
ندی۔ ان گالوں کی گرمی دور کرے　　مست بھر سانسوں کی گرمی دور کرے

بھرے مال مدے مانگی اور لیں گھولیں — سمندر تا کے بھید اندھیرے کھولیں!! (میراجی)

ایک مثال اور سُنیے۔

اور پھر آنکھ کھلی، کوئی تھا تم بھی نہیں — اشک بے ساختہ آنکھوں سے بہے جاتے ہیں
اور ارمان تہِ دام پرندوں کی طرح — اپنی مجبوری کو چپ چاپ سہے جاتے تھے!! (ضیا)

مزدوری محنت۔ اس کے عوامل اور عواقب کی حلقہ مذر باتوں کی کچھ جھلکیاں۔ باقاعدہ نظموں کو دیکھیں تو ان میں چند نظمیں ماحول کی مشکلوں اور اُن مشکلوں کی پیدا کردہ فریاد یا اُن پر طنز سے متعلق نظر آتی ہیں۔ ماحول کی مشکلوں اور اُن کی پیدا کردہ فریاد کے سلسلے میں تین نظمیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ ہیں "اسام۔ راشد کی پہلی کرن"۔ "دسعت سب کے بار" سحر الا از خبیب الرحمٰن اور "کنوئیں کی منڈیر پر" از مجید امجد۔ مگر ان تینوں میں ماحول کا مخصوص تاثر اور اس کی پیدا کردہ فریاد جدا جدا ہے۔ راشد کا درد قومی اور جماعتی ہے، مگر اس ربط ملت کی بنیادی تڑپ انفرادی ہے۔ جماعتی کسک ہے۔

کوئی یہ سمجھا دو کہ حاصل ہے کیا ہستیِ رائگاں سے
کہ غیروں کی تہذیب کی استواری کی خاطر
عبث بن رہا ہے ہمارا لہو مومیائی
میں اس قسم کا فرد ہوں جس کے حصے میں محنت ہی محنت ہے نانِ شبینہ نہیں ہے!!

یہی جماعتی کسک انفرادی تڑپ کا روپ لے کر اور زیادہ جاں خراش بن جاتی ہے۔

تری چھاتیوں کی جوئے شیر کیوں زہر کا اک سمندر نہ بن جائے۔
جیسے پی کے سو جائے ننھی سی یہ جان
جو اک چھپکلی بن کے چمٹی ہوئی ہے تیرے سینہ مہرباں سے
جو واقف نہیں تیرے دردِ نہاں سے
اسے بھی تو ذلت کی پابندی کے لئے آلہ کار بننا پڑے گا!!

مجید امجد کا درد بھی جماعتی ہے، مگر اس کا تاثر اس انفرادی تڑپ کا حامل ہیں، اسی لئے اس میں فریاد کے عنصر کی بجائے مطربیہ عنصر زیادہ ہے جو گہرے درد میں ڈوبا ہوا ہے۔

کنوئیں والا گاڑی پہ لیٹا ہے مست اپنی بنسی کی میٹھی صدا میں
کہیں کھیت سوکھے پڑے رہ گئے اور نہ ان تک کبھی آئی پانی کی باری
کہیں بہ گئی تُند ریلوں کی فیاض لہروں کو کانٹوں کی کیاری
کہیں ہو گئیں دھل کے دھول لاکھوں رنگا رنگ فصلیں ثمر دار ساری
تڑپتی ہیں خوشبوئیں دامِ ہوا میں ——— نظامِ فنا میں
اور اک نغمہ سرمدی کان میں آ رہا ہے مسلسل کنواں چل رہا ہے۔

ماحول کے تاثرات کی نمائندہ دو نظمیں اور ہیں۔ ایک تو ضیا کی نظم "نئی پود" اور دوسری قیوم نظر کی نظم "نئی تحریکیں" مگر یہ تاثر اور اس کی پیدا کردہ فریاد کی بجائے کچھ کچھ محاکمے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ماحول سے متعلق نظموں کا ایک تیسرا گروپ ایسا بھی ہے جو خالصتاً سماجی حالات کی آئینہ دار ہیں۔ یہ شاد عارفی کی نظمیں "ترا ما کوٹ" اور "شادی" ہیں۔ ان کو پڑھ کر کچھ مایوسی ہوتی ہے اس دفعہ شاد عارفی کی نظمیں ان کے عام معیار سے ہلکی ہیں۔ دونوں کے موضوع بہت ہی عام بلکہ معمولی ہیں یعنی کسی گورے کے اترے ہوئے کوٹ کی خریداری اور شادی کے بعد ہندوستان میں قلیل

آمدنی، کثرتِ اولاد اور رشتے ناتوں کے جھگڑے۔ ایسے موضوع چھانٹنا شاد کا معمول ہے مگر اس معمول کے ساتھ عام طور پر ان کا معمول یہ بھی ہے کہ وہ معمولی موضوع کو اپنے بیان۔ اسلوب اور انداز کے سہارے شاعرانہ بلندیوں پر پہونچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی مشہور نظمیں۔ مثلاً "واپسی"۔ "بسنت"۔ "اندھیر نگری"۔ "دیہاتی لاری"۔ "سخنہائے گفتنی"۔ "مشورہ" اس کی بیّن مثالیں ہیں۔ مگر اس دفعہ شاید موضوع ہی ایسے تھے کہ شاد کے زورِ کلام اور ان کے خاص۔ زاویہ نظر سے بھی نہ سنور سکے۔ یا شاید وہ انہیں بہتر ترتیب نہیں دے سکے۔ یہ نظمیں۔ کچھ منظوم نثر ہی ہو کر رہ گئی ہیں۔

آخر میں میں پانچ نظموں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں سے دو نظموں کا نام ایک ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں کے پڑھنے سے یوں محسوس ہوا جیسے اُن کے بنیادی تاثر کا مبدا کہیں اور ہے۔ پہلی احمد ندیم قاسمی کی نظم "شرمیلا فن کار" اور دوسری ظہیر کاشمیری کی نظم "تقدیر" ہے۔ نظم "شرمیلا فن کار" میں گہرے تفکر کا انداز نظر آتا ہے۔ یہ تفکر نظم کے حصہ عروج میں پہنچتا ہے جو نظم کے آخر میں ہے:۔

تری وحدت تو مسلّم مگر یہ ظلمات — کس نے تخلیق کئے ہیں تری دنیا کیلئے
دوسرا کون ہے خلّاقِ پسِ پردۂ چرخ — تو اگر حال میں ہے کون ہے فردا کیلئے
اصطلاحات کے پردوں سے نکل آ ورنہ — ابن آدم کے لپکتے ہوئے پنجوں سے نہ ڈر
سامنے آ کے نئے نقش بنا رنگ جما — اپنے فن سے کبھی فن کار بھی کرتا ہے حذر؟

اس عروج میں ابن آدم کی وہ ساری تخلیقی صناعی اور اس کا ایجاداتی کمال اپنے خالق کی ایک نظرِ رحمت کے لئے عرض پیرا ہے جس نے خدا کی رات کے مقابلے میں چراغ پیدا کیا۔ اس کی بے جان بے حقیقت مٹی سے ایاغ وضع کئے۔ فلسفہ، حکمت، سائنس، ایجاد، ترقی کے کمالات حاصل کئے۔ اور پھر عاجز ہو کر خدا ہی سے مخاطب ہوا کہ اب تیرا فن۔ اب اپنے آپ کو دیکھ چکا۔ خودی کی خوب سیر کر چکا۔ اب تجھے دیکھنا چاہتا ہے ـــــ اس تفصیل کے مطابق۔ یہ نظم عارفِ ہندی اقبالؒ کی مشہور نظم "تصویر و مصور" کا اگلا باب ہے۔ اس لئے شاید اس کا مبدا وہی ہے۔ اگرچہ دونوں میں موضوع کی تفصیل کا بنیادی فرق ہے۔

دوسری نظم ظہیر کاشمیری کی "تقدیر" ہے۔ اس کا بنیادی خیال نظم کا دوسرا بند ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ "سنگ و آہن کی اس دیوار کے اُس پار" ـــــ

اس کے اس پار خداؤں کی حسیں وادی ہے — جس کے باغوں میں زمرد کے جلو خانے ہیں
دف بجاتی ہیں تھرکتی ہوئی دوشیزائیں — مرمر و خواب میں ڈھلتے ہوئے افسانے ہیں
اور خدا؟ اونگھتے رہتے ہیں گھنے سایوں میں — شغل ان کا کہیں نغمے کہیں پیمانے ہیں!!

اس بند کے ساتھ۔ الفرڈ لارڈ ٹینی سن کی مشہور نظم *Lotus Eaters* کی یہ لائنیں دیکھئے:۔

.....Like Gods, together, careless of mankind,
For they lie beside their nectar, and bolts are hurl'd
Far below them in valleys, and clouds are lightly curl'd
Round their golden houses, girdled with gleaming worl
Where they smile in secret.....

باقی کی تین نظمیں ایسی ہیں جنہیں بے کراں رات کی مبہم پہنائیوں نے جنم دیا۔ ان میں پھیلی ہوئی تاریکیوں کے ساتھ ایسا انہماک ہے جس میں بڑی سپردگی اور بڑی گہرائی ہے۔ یہ انہماک ویسے تو اسی بنیادی عجب کا پیدا کردہ ہے جو انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ لیکن اس کی بڑی وجہ وہ حیاتیاتی عمل بھی ہے۔ جو دن بھر کی شورش سے نڈھال اعصاب پر۔ رات کے فضائی سکون سے واقع ہوتا ہے۔ اس انہماک میں وہ فلسفیانہ فریاد پنہاں ہے جس نے عارفِ ہندی اقبالؒ کی زبان پر آتے ہی "ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فرداستی"

کا لفظی جامہ پہنا تھا۔ اس میں وہ فرق تفکر کا روپ لیتا ہے جو دن کے بے پناہ ہنگاموں اور رات کی گہری خاموشی میں ہے اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کتنی ہمہ گیر ہے۔ اس میں کس قدر جودت کس قدر وسعت ہے مگر اس کے ساتھ ہی زندگی۔ نظام کائنات میں کتنی بے مایہ سی ہے عرض یہ انہماک ہزاروں ایسے اجمال سے مرکب ہے جن کی تفصیل مذہب جیسے الوہی علوم سے لے کر فلسفہ و حکمت اور سائنس جیسے انسانی علوم لے گی ہے ظاہر ہے کہ اس انہماک اور شغف کا احساس یا وجدان بڑی مشکل بات ہے اور اسکے لئے سرشار جذبوں کی پوری قوت اور ان کی لطیف ترین طراری کی ضرورت ہے.... ورنہ ایک رات کی بے کراں اور غیر محسوس خاموشی۔ شاہدان مصرعوں سے پہلو چرا کر نکل جاتی:۔

تارے اور یہ گہری جھلمل جھلمل دور — درختوں میں خاموشی
اور بڑھائی ہے خاموشی سونی راہوں میں خاموشی کتنی رات گئی ہو؟ (خلیل الرحمٰن)

اسی انہماک کا یہ پہلو ملاحظہ کیجئے جس میں رات کی گہری خاموشی ہی زندگی کی ہمہ گیری اُس کی جودت اور وسعت کا احساس کراتی ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی سجھاتی ہے کہ نظام کائنات میں ہماری زندگی کتنی بے مایہ ہے۔

یہ تیرگی جیسے سکوں کے بحرِ بے پایاں کی حامل ہے یہی
اور ہر گھڑی بڑھتی ہوئی دُنیا کی منزل ہے یہی
اسکی انوکھی دل کشی

اور اس سے آگے چلئے:۔

اور روشنی

یہ مرجع یکجمال صورت گرِ حسن و جمال
اپنی چمکتی وسعتوں کا لاکھ پھیلائے فسوں بے آب چیروں کا نکھار
ممکن کہاں اس میں سکوں!! اڑتا ہے کہ اس طرح انساں کی سعی عام کو
یہ دن —— یہی گویا خدا ہے نام کو!!
ہنگامہ آرائے بہار (قیوم نظر)

مگر اس تسلسل کو احمد ندیم قاسمی اپنی نظم "ثبوت" میں اس نظام کائنات کے کسی بے مثل و مثال صناع کے وجود پر رجعت سمجھا ہے قیوم نظر روشنی اور اندھیرے کی برد آزمائی دن رات کی لا متناہی زنجیر۔ دن کے ہنگاموں اور رات کے گہرے سکون کے تسلسل و تواتر میں کائنات کو کھو دیتے ہیں۔ مگر احمد ندیم قاسمی نے یہیں پہونچکر تفلسف کی شاہراہ چھوڑ دی ہے کیونکہ اُنہیں شاہراہ سے الگ ہوکر اپنی منزل مل گئی۔ رات سے اُن کے انہماک کا بنیادی محبّب آسودہ ہوگیا اور اعصاب کا تناؤ سکون پا گیا کیونکہ اُنہیں وہ ثبوت مل گیا جس کی جستجو میں اُنہوں نے اس شاہراہ پر اپنے تفکر کو بھٹکنے بھیجا تھا۔
یعنی تیرگی ہی کسی کی سُنہری مانگ بھرتی ہے!!"

میں نے ابھی تک ان نظموں کی فنی یا تکنیکی خوبیوں اور کمزوریوں پر کچھ نہیں کہا۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ جہاں تک ہو سکے ان نظموں کے بنیادی محرکات اور ذہنی پس منظر پر ہی کچھ لکھوں۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ نئی شاعری کو ان نمائندہ نظموں کا کسی طرح جواز پیش کروں۔ یا ان کو سامنے رکھ کر اُن اعتراضات کو جھٹلاؤں یا ثابت کروں جو آج کل کی نظموں پر ساری دُنیا کو ہیں۔ زبان محاورے کی غلطیاں یا روزمرہ کے عیوب اور محاسن گنوانا میری علمیت اور بساطت سے باہر ہے میرا اندازِ نظر جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ صرف بنیادی محرکات اور ذہنی پس منظر کا پابند رہا ہے۔

اس پر بھی اس مجموعے میں بعض نظمیں ایسی دکھائی دیتی ہیں جو بیان اور تکنیک کے اعتبار سے بہت ہلکی ہیں۔ مثلاً مذہب۔ قانون۔ آفتاب اور چاندرات وغیرہ —— یوں دیکھنے میں کئی نظمیں ایسی بھی ملتی ہیں جن میں ہمواری نہیں

ب ایک موضوع سے دوسرے موضوع پر پہونچتے پہونچتے یا تو گریز کا پہلو ہلکا رہ گیا ہے یا دونوں موضوع کی پیوستگی کمزور ہے۔ کی سب سے واضح مثال منیب الرحمٰن کی نظم "یہ وسعتِ بے کنارِ صحرا ہے"۔ "رقیب" (یوسف ظفر) "گزرنے والے گزر رہے ہیں" مر روانی) اور "خلا"۔ یہ سبھی نظمیں شاید طول کلام اور بیان کے پھیلاؤ کی بدولت موضوع کی اصل نزاکت اور خوبصورتی بیٹھی ہیں۔ ان کے موضوع کا تانا بانا بہت لطیف تھا۔ اس میں اتنی تاب و دلچسپ نہ تھی کہ اُسے اس طرح دُور دُور تک دیر تک کھینچا جا سکے مگر شاید میں اپنے موضوع سے دور ہٹ رہا ہوں، کیونکہ میں نو ۴۵ ۹ء کی شعری تحریکوں دراک تک ہی محدود رہنا چاہتا تھا۔

ان سب نظموں کو ایک ساتھ دیکھکر اُن میں ڈوب ڈوب کر اور رچ رچ کر تو وہی احساس ہوتا ہے جسے ایک ی پہلے مرزا غالب نے الہام بنایا تھا ——— یعنی ہمارا آنکا دور۔ . . .

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں!

(ارباب ذوق شاخ دلی)

احمد صدیقی

شکستِ پرواز

کی طرح ستاروں کی سی ہے اک دُنیا
تاب ہمارا ہی عکس ہے شاید ——— !!

ہتاب ہمارا ہے ——— ہم سمجھتے ہیں،
بسارتِ تخیل اک گناہ جو تھی ——— !
ہ اُلجھنا پڑا مہر و ماہ سے آخر،
ہ نکلنا پڑا بزمِ مہر و ماہ سے دوست،
ہ شکستِ تخیل سے سخت نفرت ہے ——— !!

بار بڑھا ہوں ستاروں کی جانب،
بار بڑھو نگا میں ماہتاب کی سمت،
بار اُٹھا ہے سمندروں سے دھواں،
بار مٹی ہے ستاروں کی محفل،
بار یہ مہتاب کانپ اُٹھا ہے،
ہتاب تو کیا؟ ——— آفتاب کانپا ہے ——— !!
ابدست زمیں پر نسیم کی لہریں ———

ہزار بار شرر بار ہو کے اُٹھی ہیں،
گل و سمن میں بھی سرد و منجمد لاشیں ———
قبائے زرد لہو میں ڈبو کے اُٹھی ہیں ——— !

زمین گرم ہوئی ——— گرم ہو کے لوٹ گئی،
چٹانیں کوہ بنیں ——— کوہ سے شرار اُٹھے۔
مثالِ قافلۂ جنگ لالہ زار اُٹھے،
اُٹھے، بڑھے سوئے مہتاب و آفتاب چلے،
——— چلے شعاعوں کی صورت ہمارے خواب چلے،
مگر ستاروں سے ٹکرا کے لوٹ آتا تھا،
یہ ماہتاب سے ٹکرا کے لوٹ آئے ہیں،
پہنچ سکے نہ یہ خود اپنی ہی فضاؤں میں ——— !!

زمیں پہ چاند اُتر آئے ——— کیا یہ ممکن ہے ——— ؟
(ابھی جوان ہے تمنا ——— مذاق کمسن ہے)
تڑپ رہے ہیں ستارے ——— زمیں ساکن ہو ——— !!

میراجی

غزل

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا،
کیا ہے تیرا کیا ہے میرا، اپنا پرایا بھول گیا!

کیا بھولا کیسے بھولا، کیوں پوچھتے ہو؟ بس یوں سمجھو
کارن دوش نہیں ہے کوئی بھولا بھالا بھول گیا!

کیسے دن تھے کیسی راتیں کیسی باتیں گھاتیں تھیں
من بالک ہے پہلے پیار کا سندر سپنا بھول گیا

یاد کے پھیر میں آ کر دل پر ایسی کاری چوٹ لگی
سکھ میں دکھ ہے دکھ میں سکھ ہے بھید یہ نیارا بھول گیا

اپنی بیتی جگ بیتی ہے جب سے دل نے جان لیا،
ہنستے ہنستے جیون بیتا، رونا دھونا بھول گیا

اندھیارے سے ایک کرن نے جھانک کے دیکھا، شرمائی
دھندلی چھب تو یاد رہی کیسا تھا چہرہ بھول گیا

سوجھ بوجھ کی بات نہیں ہے من موجی ہے مستانہ
لہر لہر سے جا سر ٹپکا. ساگر گہرا بھول گیا

ہنسی ہنسی میں کھیل کھیل میں بات کی بات میں رنگ مٹا
دل بھی ہوتے ہوتے آخر گھاؤ کا رِسنا بھول گیا

ایک نظر کی، ایک ہی پل کی بات ہے ڈوری سانسوں کی
ایک نظر کا نور مٹا جب اِک پل بیتا۔ بھول گیا

جس کو دیکھو اس کے دل میں شکوہ ہے تو اتنا ہے
ہمیں تو سب کچھ یاد رہا پر ہم کو زمانہ بھول گیا

کوئی کہے یہ کس نے کہا تھا کہہ دو جو کچھ جی میں ہے
میراجی کہہ کر پچھتایا اور پھر کہنا بھول گیا!

اعجاز حسین بٹالوی

سفر پارہ

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں فوج میں تھا اور ای ٹی کا کورس ختم کرنے کے بعد اپنی رجمنٹ کے ہیڈکوارٹرز واپس جا رہا تھا۔ آملہ کے اسٹیشن پر گاڑی تبدیل کی تو معلوم ہوا کہ دوسری گاڑی کے چلنے میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ مارے گرمی کے بُرا حال ہو رہا تھا۔ کچھ عرصے پلیٹ فارم پر بے مطلب چکر کاٹنے اور بک اسٹال پر رسالوں اور کتابوں کی بے مقصد ورق گردانی کرنے کے بعد میں ڈائننگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ ذلیل قسم کا ڈنر زہر مار کرنے کے بعد سگریٹ سلگایا۔ دو ایک لمبے کش لئے اور سوچا کہ گاڑی میں جا کر وردی اُتار کر سو جاؤں۔ خیال کی اس لہر پر ابھی عمل کرنے کی سوچ رہا تھا کہ مدراس سے دہلی کے لئے گرانڈ ٹرنک ایکسپریس زند ناتی ہوئی اسٹیشن پر آ رُکی۔

دس بیس مسافر ڈنر کے لئے اندر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام میزیں رُک گئیں۔ بجلی کے پنکھوں کی ایک ہموار سی گنگنی، بیروں کے تیز قدموں کی چاپ اور میزوں پر برتنوں کی کھنک۔ کمرے میں ایک گہما گہمی سی تھی۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور میں نے دیکھا کہ کچھ فوجی لڑکیاں خاکی وردی میں چاق چوبند اندر آ رہی ہیں۔ وہ دروازے کے قریب پہنچ کر کچھ ٹھٹک سی گئیں اور تمام ہال پر ایک نظر دوڑا کر آپس میں کچھ مشورہ کرنے لگیں۔ چہرے پر کچھ گھبراہٹ کے آثار تھے جیسے وہ اس بات کے لئے تیار نہیں تھیں کہ دروازہ کھلتے ہی سارے ہال کی نگاہیں ان کی طرف اُٹھ جائیں۔ ایک نے دروازہ کھول کر واپس جانا چاہا، دوسری نے اس کی اس "جوش شکن" حرکت پر زور سے اس کے بازو پر چٹکی لی، ایک نے کچھ خود اعتمادی پیدا کرتے ہوئے ایک بیرے کو کچھ تحکمانہ انداز سے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر بیرا بہت مصروف تھا، تعمیل نہ کر سکا اور وہ اپنی شکست پر محجوب سی ہو کر اپنے رومال کو دونوں ہاتھوں سے نچوڑنے لگی۔ بالآخر ان میں سے ایک ہمت کر کے آگے بڑھی۔ اتفاق سے یہ سب سے زیادہ موٹی تھی۔ سیاہ رنگت پر گاڑی کا دُھواں اور گرد و غبار، بال اُلجھے ہوئے، تنگ پیشانی کے پیچھے دو بھنچی بھنچی سی چالاک آنکھیں چمک رہی تھیں، ناک کی ولت بھری ہوئی گالوں میں دبکی بیٹھی تھی۔ موٹے موٹے ہونٹ جلے ہوئے گوشت کی طرح سکڑے ہوئے تھے۔ اوپر کا ہونٹ بڑھے ہوئے دانتوں نے ناک کی طرف دھکیل دیا تھا اور نیچے کا ہونٹ بے جان سا ہو کر مختصر سی ٹھوڑی پر لٹک رہا تھا۔ قد بمشکل چار فٹ ہو گا۔ کالی کالی بھدی سی باہیں کندھوں تک عریاں تھیں۔ مجھے اس کی طرف دیکھ کر اپنی ایک ہم جماعت لڑکی کا خیال آ گیا جسے ہم "موٹ" کہا کرتے تھے، وہ اپنے ساتھیوں کی قیادت کے لئے آگے بڑھی اور ان کو ساتھ لئے دو تین میزوں کے گرد گھومتی ہوئی اچانک میری میز کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اسکے اس طرح رُک جانے پر مجھے یک لخت اس بات کا احساس ہوا کہ میں ایک پوری میز پر تنہا قبضہ کئے بیٹھا ہوں۔

ایک لفظ کہے بغیر انہوں نے نہایت بے تکلفی سے کرسیاں گھسیٹ لیں۔ کرسیاں صرف تین تھیں اور "جوش شکن" سب سے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ اپنے لئے کوئی کرسی نہ پا کر وہ میز کے قریب کھڑی ہو گئی۔ تینوں نے اس کی طرف دیکھا، میری طرف دیکھا اور پھر کرسی آتے جاتے بیرے کے لئے نظر دوڑائی۔ اسے اس طرح کھڑے دیکھ کر میں نے سوچا کہ اپنی کرسی خالی کر دوں۔ اُٹھنے کے لئے کرسی کو پیچھے سرکایا ہی تھا کہ سٹیورڈ اس کے لئے ایک کرسی لئے آ پہنچا سب نے اِدھر اُدھر کھسک کر کچھ جگہ بنائی اور وہ کرسی کھینچ کر میرے دائیں ہاتھ براجمان ہو گئیں۔ میں نے میز پر پڑے ہوئے اپنے ادھ بچ سکوئش کے گلاس کی طرف دیکھا جس میں سینکڑوں ننھے ننھے بلبلے پھوٹ رہے تھے۔

بیرا آیا۔ "موٹ" نے باگ ڈور سنبھالی اور تینوں سے رائے لینی شروع کی "جوش شکن" اور ان کی چٹکی لینے والی محترمہ دونوں بہت شرمیلی نظر آتی تھیں۔ البتہ "موٹ" اور بٹوے والی میں دو ایک منٹ تک خوب بحث ہوتی رہی۔ وہ دونوں

مرہٹی میں گھسے گھور رہی تھیں اور میں بیرے کے چہرے کے آثار چڑھاؤ کی طرف دیکھ رہا تھا جسے گفتگو کے طول پکڑنے سے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ آخر کار کچھ طے ہوا اور ڈنر کے لئے آرڈر دے دیا گیا۔ میرا آرڈر دے کر گیا تو میں نے "جوش شکن" کا جائزہ لینا شروع کیا۔ میری ہمسں تھی اس کے نقش چاروں میں سب سے زیادہ تیکھے تھے "موت" کی طرح اس کی ناک چپٹی ہمس تھی۔ آنکھیں موٹی موٹی اور نظریں بہت خوفزدہ سی تھیں۔ بہت سلجھی ہوئی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا تو مجھے اپنی حرکت پر شرمندگی سی ہوئی۔ میں نے سوچا شاید مجھے اس طرح گھورنا نہیں چاہیئے تھا۔ میں نے اُس کی طرف سے نظر ہٹائی تو سامنے بٹوے والی سی آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ آہستہ آہستہ موت سے گفتگو کر رہی تھی، مگر آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں بہت بیباک نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ہونٹوں پر ایک عجیب بیہمانہ سا تبسم تھا۔ چہرے کا تمام اظہار کہہ رہا تھا کہ "آ بیل مجھے مار"۔ قیافے سے بہت واہیات سی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ موت کے بائیں ہاتھ میرے مقابل اور بٹوے والی کے درمیان چٹکی لینے والی بیٹھی تھیں۔ "جوش شکن" کی طرح وہ بھی خاموش بیٹھی میز کو گھور رہی تھیں۔

میں نے دائیں طرف جھک کر "جوش شکن" سے آہستہ سے پوچھا "آپ دہلی جا رہی ہیں کیا" اس نے نظریں میز سے اُٹھائے بغیر جواب دیا "جی ہاں"۔ دفعتاً میز پر تمام گفتگو ختم ہوگئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سب کی توجہ ایک دم ہم دونوں کی طرف مبذول ہوگئی ہے۔ میں اس خاموشی پر کچھ گھبرا سا گیا۔ اتنے میں بیرا کھانا لے کر آگیا اور فضا پھر درست ہوگئی۔ کھانے کے دوران میں میں نے اس سے دو ایک اور سوال کئے مگر اُسکے جواب بہت مختصر اور حوصلہ شکن سے تھے اور پھر جب میں نے پوچھا کہ فوج میں آئے آپکو کتنا عرصہ ہوگیا ہے تو جواب میں بٹوے والی بول اُٹھیں کہ "اوہ یہ تو ابھی بہت خام ہیں، صرف چند ماہ" اور میں نے پوچھا "آپ؟" "ڈیڑھ سال" اُس نے فاتحانہ انداز میں کہا اور "آپ؟" اُس نے چھری اور کانٹے کو پلیٹ میں رکھتے ہوئے پوچھا "دو سال" میں نے جواب دیا اور "موت" بول اٹھی،

"صرف دو سال"۔ اور یوں آہستہ آہستہ گفتگو اپنے آپ بہنے لگی، اور حجاب خود بخود اُٹھ گیا۔ کھانا ختم ہونے تک ہم سب کافی بے تکلفی سے گفتگو کر رہے تھے "موت" گفتگو کرنے میں بہت اچھی ثابت ہوئی۔ بٹوے والی کرسی کھسکا کر میرے بہت نزدیک آگئی اور کئی مرتبہ ہنستے ہنستے ایکدم میری طرف جھک جاتی۔ اس کی بغل میں سے بہت گھناؤنی بو آ رہی تھی اور میں دائیں طرف جھک رہا تھا۔ میرے دائیں "جوش شکن" تھی اور وہ مجھے اپنی طرف جھکتا دیکھ کر کرسی میں سمٹی جا رہی تھی۔ گاڑی کے چلنے کا وقت ہو رہا تھا "موت" نے رائے دی باہر چلنا چاہیئے۔ میں نے تائید کی اور ہم سب باہر آگئے۔

پلیٹ فارم پر نکلتے ہی "جوش شکن" کچھ بہانہ کرکے اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف چل دی اور ہم ویٹنگ روم کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ میں چند لمحوں کی غیر حاضری کے لئے معافی مانگ کر ویٹنگ روم کی طرف لپکا۔ ویٹنگ روم خالی تھا۔ میں تھوڑی دیر کے بعد غسل خانے سے باہر نکلا تو بٹوے والی آئینے کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی تھی۔ اس کا بٹوا اسکے سامنے کھلا پڑا تھا اور دو ایک چیزیں میز پر دھری تھیں میری طرف دیکھ کر وہ پھر اسی بیہمانہ انداز سے مسکرائی اور بولی "کس قدر غلیظ سفر ہے یہ اور گاڑیوں کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہے آجکل۔ پانی تک نہیں کمپارٹمنٹ میں اور آئینہ بھی اُتار لیا ہے کمبختوں نے"۔ میں نے "جی ہاں" کہہ کر اسکی ہاں میں ہاں ملائی اور سگریٹ سلگا کر اُس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ بال سنوارنے کے لئے اس کے ہاتھ اوپر کو اُٹھے ہوتے تھے اور بغل سے آنے والی بُو اور بھی زیادہ گھناؤنی ہو رہی تھی۔ میں اسی دم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے سنگار ختم کرکے بٹوا بند کیا اور میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ پھر وہی مسکراہٹ وہی نگاہیں "آ بیل"، میں گھبرا گیا "باہر چلئے" میں نے جلدی میں کہا اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ ہلی تک نہیں اپنی جگہ سے اور اسی طرح کھڑی مسکراتی اور مجھے گھورتی رہی۔ میں نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا فرار کی کوئی صورت بھی تو نظر نہیں آتی تھی۔ ویٹنگ روم خالی تھا، دروازہ بند تھا اور میری سٹی گم۔ میں نے پھر اُس کی طرف دیکھا وہ اور

قریب آچکی تھی۔ خدایا! کسقدر تعفن تھا اس کے سانس میں اور پھر اچانک انجن نے سیٹی دی اور انجن کی یہ چیخ میری بے خیالی کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ میں ایک دم چونک اُٹھا "گاڑی جارہی ہے" میں نے اُس کے بازو کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا لیکن میرا قدم اُٹھنے سے پہلے اس کے ٹٹولنے والا ہاتھ میری کمر سے ہوتے ہوئے میرے کندھے تک پہنچ چکا تھا اور دوسرا ہاتھ دوسرے کندھے کے اوپر سے جھول کر میری پُشت پر جا پڑا تھا، اسکی دونوں باہیں میری گردن کے پیچھے ایک دوسرے سے مل رہی تھیں۔ وہ اپنی پوری طاقت سے میرے سر کو نیچے کی طرف کھینچ کر اپنے پنجوں کے بل اُوپر اٹھی ——— یہ سب کچھ پلک جھپکنے میں ہوا۔۔ وہ جاچکی تھی۔

میں اپنی جگہ بُت بنا کھڑا رہ گیا، اس کے جاری سے گزر جانے پر دروازے کے بٹاخ سے بند ہونے کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی اور اس کے ساتھ سیمنٹ کے فرش پر اس کے سینڈل کی ٹک ٹک' گاڑی کی دوسری سیٹی اور انجن میں سے گھٹی ہوئی بھاپ کے آزاد ہونے کی مہیب شاں شاں۔ یہ سب آوازیں مل کر میرے دماغ میں میں ایک عجیب تلاطم پیدا کر رہی تھیں۔ میں ویٹنگ روم سے باہر نکلا اور جلدی جلدی قدم اُٹھاتا ہوا اپنی گاڑی کے پلیٹ فارم پر پہنچا۔ گاڑی روانہ ہونے کو تھی اور میں فرسٹ کلاس کے ایک کُوپے میں تنہا تھا۔ دروازہ بند کرکے میں نے کھڑکیاں چڑھا دیں۔ وردی اُتاری اور غسل خانے میں داخل ہو کر ٹب کو انگوٹھے سے دبایا پانی کا گلاس بھر کر میں نے سامنے رکھا اور "ڈیٹول" کی ایک پوری خوراک ناپ کر اس میں اُنڈیل دی۔ دانتوں کے برش پر پیسٹ کی دوہری تہ بچھائی۔ ہوا غراتی ہوئی حلق سے نکلی۔ گالوں کو اندر کی طرف چُوس کر زبان سے تمام مُنہ کا لعاب سمیٹا اور زور سے فرش پر تھوک دیا۔

پندرہ منٹ کے بعد میں غسلخانے سے نکل کر ململ کا کرتہ پہنے برتھ پہ آلیٹا۔ میرے مُنہ کا ذائقہ خوشگوار تھا۔ شاور باتھ کے بعد طبیعت بہت ہلکی ہو گئی تھی اور پسینے کے ساتھ اُس کی بغل کا تعفن جو غسلخانے میں بھی میرے نتھنوں میں معلق محسوس ہو رہا تھا دھل چکا تھا۔ نتھنوں سے اس کے تھوک کے نشان بھی صابن کے ساتھ مل کر بہہ گئے تھے مگر اب بھی ایک دباؤ سا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید اس کے چہرے کے بوجھ سے پسی ہوئی رگیں اب تک دھڑک رہی تھیں۔ گردن میں ایک طوق سا لٹکا ہوا محسوس ہوتا تھا نرم اور گرم مگر وزنی۔ سینے پر کسی سخت چیز کا لمس اب تک مرتعش تھا۔ رانوں کے پٹھے اب تک کانپ رہے تھے اور ان پر اس کی گداز رانوں کا پُرجوش دباؤ اب تک منقش تھا۔

میں کتنی دیر تک لیٹا اپنے دماغ میں اس ایک لمحے کو دُہراتا رہا اور پھر جب گاڑی کسی چھوٹے اسٹیشن پر ایک دھچکے کے ساتھ رُکی تو میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ میں بہت تیزی سے سانس لے رہا تھا۔ پیشانی سے پسینے کے قطرے پھسل پھسل کر میری پلکوں پر اٹک رہے تھے۔ میں نے میز پر سے "ساربان" کا پرچہ اُٹھا لیا۔ سرورق بہت دیدہ زیب تھا میں دیر تک اسکی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ کس قدر لوچ تھا رقاصہ کی کمر میں اور وہ دو حلقے اس کی کمر کے گرد کتنے ذومعنی تھے وہ حلقے۔ کتنی ستھری اور پاکیزہ معلوم ہوتی تھی اسکی کمر۔ اسکے شانے، اسکی گردن اس کے بازو۔ یہ تصویر کاغذ پر کتنی بھلی معلوم ہوتی تھی کاش عورت سچ مچ ایسی ہوتی، اس قدر نورانی اسی طرح نازک۔ اسی طرح متناسب اور ایسی ہی رنگین۔

(حلقۂ ارباب ذوق شاخ دلی میں پڑھا گیا)

دو نئی کتابیں

وہ گیت جو دل کے ساز پر گائے جاتے ہیں

تیرے گیت

اور

میرے گیت

جب محبت نغمے کے قالب میں ڈھل جاتی ہے جب حسن و عشق دونوں گنگنانے لگتے ہیں۔ یہ رسیلے گیت جوانی کی ترنگ کے آئینہ دار ہیں عشرت رحمانی کے لکھے ہوئے یہ گیت ہزار ہا سُننے والوں کے دلوں کو برما چکے ہیں۔ دونوں کتابوں کی قیمت ایک ایک روپیہ ہے۔ ساقی بک ڈپو، دہلی سے طلب فرمائیے۔

نقد و تبصرہ

مبادیاتِ تنقید مجنوں ایم۔ اے کی یہ کتاب طالب علموں کے علاوہ ہر صاحبِ ذوق کے لئے بھی بہت معلومات ہوگی۔ ہمارے ادب میں اس فن پر کوئی مستقل کتاب نہیں ہے۔ تنقید جدید ادبِ جدید کے دوسرے شعبوں کی طرح ایک نیا فن ہے اور انہی کی طرح یورپ سے متاثر ہوکر ہمارے ادب میں جگہ پاچکا ہے جیسا کہ اس کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے یہ کتاب تنقید کے ترقی یافتہ اصولوں پر کوئی آخری لفظ نہیں ہے تاہم اس فن سے متعارف کرنے کے لئے یہ کتاب ہماری مطبوعات میں منفرد ہے۔ کتاب پر قیمت درج نہیں ہے۔ غالباً ڈیڑھ روپے کی ہوگی۔ انڈین پریس الہ آباد سے طلب کیجئے۔

برفان :۔ اس مجموعہ میں چھ روسی افسانوں کے ترجمے شامل ہیں۔ ٹرگنیف، چیخوف، کارشن اور ٹالسٹائے یہ چاروں مصنف مقبول نام ہیں محسن علی ان افسانوں کے مترجم ہیں۔ ترجمہ چونکہ لفظی کیا گیا ہے۔ اس لئے روانی مفقود ہے۔ افسانوں کا انتخاب اچھا ہے قیمت ۱۲؍ انڈین پریس الہ آباد سے طلب کیجئے۔

الطاف کے نغمے :۔ الطاف مشہدی جدید شعرا میں کافی مشہور ہیں۔ ان کے کلام کے کئی منتخب مجموعے شائع ہو چکے ہیں اب انکے نغموں کا ایک اور مجموعہ دار البلاغ لاہور سے شائع ہوا ہے اس میں اردو کی غزلیں ہندی کی غزلیں نظمیں دوگانے گیت، ماہیئے اور نظمیں شامل ہیں۔ الطاف کا کلام بڑا موثر ہوتا ہے اور الفاظ کا آہنگ اس کی دلکشی میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کتاب کو جہاں سے جی چاہے کھول کر پڑھنا شروع کر دیجئے پھر اس کا چھوڑنا مشکل ہو جائے گا۔ دار البلاغ سے شائع ہونے کے بعد اس کے ظاہر کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ دار البلاغ۔ محمد نگر۔ میور روڈ۔ لاہور۔

سنگریزے :۔ محمد یونس احمر، شاہ خلیل الرحمٰن، اور قیصر نشاط کے پانچ پانچ افسانوں یعنی کل پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے سب افسانے پڑھنے کے لائق ہیں۔ اگرچہ تینوں افسانہ نگار ابھی اپنی تحریروں میں پختگی پیدا نہیں کر سکے ہیں تاہم یہ حضرات حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں کہ اردو ان کے لئے فی الحقیقت ایک اکتسابی زبان ہے ہم ان حضرات کی اس پہلی کوشش پر مبارکباد دیتے ہیں۔ قیمت ۱۲؍ روپے دارہ اردو ادب ۳ ماستی لگان لین کلکتہ۔

روحِ تبسم :۔ یہ مجموعہ ہے ظریف الملک حضرت ظریف دہلوی کے مزاحیہ کلام نظم کا۔ اس میں آپ تبسم غنچہ کی پائیں گے اور خندہ دنداں نما بھی۔ اس پر زبان و بیان کی لطافت و نزاکت اور محاورہ بندی سونے پر سہاگہ ہے۔ دلی کی جس زبان کو کان ترستے ہیں اور اردو کے وہ محاورات جو اب مفقود و معدوم ہوتے جا رہے ہیں ظریف صاحب نے اپنے خاص مزاحیہ انداز میں اس خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ سموئے ہیں کہ زبان چٹخارے لیتی رہ جاتی ہے ہونٹ تبسم کناں اور دل و دماغ شگفتہ ہو جاتے ہیں۔ اس کتاب میں دو سو سے زیادہ محاورات و ضرب الامثال نظم کی ہیں جنہیں مزاحیہ رنگ دے کر عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ عمدہ کاغذ۔ لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب۔ خوبصورت گرد پوش خوشنما ٹائٹل پیج۔ حجم ۱۸۴ صفحات۔ مصنف کا فوٹو بلاک بھی موجود ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت دو روپے (عہ) ملنے کا پتہ۔ مشہور پبلشنگ ہاؤس فراشخانہ۔ دہلی۔ یا ساقی بکڈپو۔ کوچہ نواب مرزا۔ دہلی۔

نکہتِ گل :۔ محمود عالم وفا براہی کی تقریباً اسی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اشعار سیدھے سادے اور تعقید سے پاک ہیں۔ وفا صاحب رنگِ قدیم کے دلدادہ ہیں۔ حضرت نوح ناروی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں (بقیہ صفحہ ۶۴)

یہ آل انڈیا ریڈیو ہے

دلی ریڈیو اسٹیشن کے خلاف آئے دن ساقی میں مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ گورنمنٹ کے دوسرے اداروں یا دفتروں کی خرابیوں کی طرف آپکی توجہ کیوں نہیں ہوتی اور صرف آل انڈیا ریڈیو آپ کا ہدف ملامت کیوں بنا ہوا ہے؟ کیا دوسرے سرکاری محکموں میں ریڈیو سے زیادہ اندھیر گردی نہیں ہے؟ ایک راشن کے محکمے ہی کو دیکھ لیجئے اس قدر ابتری ہے اس میں رشوت ستانی کی کتنی گرم بازاری ہے کہ آئے دن اس کے افسر بدلے اور نکالے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ وہ محکمہ ہے جس کا تعلق براہ راست روٹی کپڑے سے ہے جس کے بغیر زندگی ناممکن ہے۔ ہندو مسلم سوال جتنا دلی کے راشننگ اور کنٹرول کے دفتروں میں ہے شاید ہی کسی اور سرکاری دفتر میں ہو۔ آئے دن اس کے خلاف پوسٹر نکلتے رہتے ہیں اور اخبارات میں لکھا جاتا ہے اور ان کی بدعنوانیاں اتنی مشہور اور پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہیں کہ اور افسروں کا تو ذکر ہی کیا خود کنٹرولر صاحب کا تبادلہ زیر غور ہے۔ سپلائی میں اس سے بھی زیادہ بدعنوانیاں تھیں جس کے متعلق یہ لطیفہ تو آپ اخبارات میں دیکھ ہی چکے ہونگے کہ حکومت نے رشوت ستانی کے تدارک کے لئے ایک اسپیشل اسٹاف رکھا تو خود اس اسٹاف نے رشوت کھانی شروع کر دی۔ ایسا کون سا سرکاری دفتر ہے جس میں کچھ نہ کچھ خرابیاں نہ ہوں اور جو اصلاح طلب نہ ہو؟ ریڈیو کا محکمہ تو پھر غنیمت ہے کہ اس میں اتنی نمایاں اور اتنی بڑی بڑی خرابیاں نہیں ہیں۔ ہندو مسلمانوں کا تناسب بھی اگر بالکل ٹھیک نہیں تو کچھ زیادہ قابل اعتراض بھی نہیں ہے۔ پنجابی اور غیر پنجابی کا سوال بھی عصبیت کی پیداوار ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اور صوبوں کے مقابلے میں پنجاب نے قابل، محنتی اور جفاکش کارکن پیدا کئے ہیں اور ہر مقابلے اور انتخاب میں قدرتی طور پر انہی کی اکثریت شریک ہوتی ہے اور منتخب ہوتی ہے۔ دلی اور یو۔پی والوں کا یہ شکوہ کہ انہیں نہیں لیا جاتا بیجا ہے۔ اول تو اکثر غیر پنجابی اس محکمے میں کام کر رہے ہیں اور بعض اونچے عہدوں پر بھی ممتاز ہو گئے ہیں۔ بمبئی، مدراس اور سرحد وغیرہ کے اسٹیشنوں پر سب مقامی لوگ رکھے گئے ہیں۔ یہ شکایت کہنا بالکل بے بنیاد ہے کہ دلی، لکھنؤ، لاہور اور پشاور کے اسٹیشنوں کے لئے جو کارکن انتخاب کئے گئے وہ بیشتر پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر یہ محکمہ دوسرے محکموں سے بہت مختلف ہے۔ ریڈیو کا کاروبار حکومت کے دوسرے دفتروں سے مختلف ہے۔ یہ وہ ادارہ ہے جس کی مشکلوں سے عوام پوری طرح واقف نہیں ہو سکتے۔ یہاں کے کارکنوں کی دشواریوں کا اندازہ باہر والوں کو ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر ریڈیو والوں کی مجبوریوں کو مدنظر رکھا جائے تو یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ جتنے اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ سب ناواقفیت کی وجہ سے کئے جاتے ہیں۔ ذرا اسی بات پر غور فرمائیے کہ یہ کتنا مشکل کام ہے کہ ہر ایک کو خوش کرنے اور خوش رکھنے کی کوشش کی جائے اور پھر ہندوستان جیسے ملک کی آبادی کو! یہ ریڈیو کا کتنا بڑا کارنامہ ہے کہ گذشتہ دس سال میں اتنی ہر دلعزیزی حاصل کر چکا ہے کہ معمولی سے معمولی گھر میں بھی اس نے دخل پا لیا ہے۔ گھر بیٹھے آپ تازہ ترین خبریں دن میں چار دفعہ سن سکتے ہیں۔ اعلیٰ درجے کی موسیقی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ بہترین اہل قلم کی لکھی ہوئی تقریریں خود اُن کی زبانی سن سکتے ہیں۔ دلچسپ ڈرامے سنئے۔ آپکی عورتوں اور بچوں کے لئے بھی خاص پروگرام ہوتے ہیں۔ تعلیمی اور دیہاتی پروگرام بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ غرض آپکے سارے گھر کے لئے دلچسپی کا سامان ریڈیو مہیا کر دیتا ہے اور یہ سب کچھ صرف دس روپے سال میں۔ یہ پروگرام لاکھوں روپیہ صرف کر کے تیار کیا جاتا ہے جو آپ دس روپے سالانہ دے کر سن سکتے ہیں۔ ان دس روپے دے کر آپ اس کے بھی مجاز ہو جاتے ہیں کہ ہندوستان کے ساتھ ساتھ آپ دنیا بھر کا پروگرام بھی سنیں جو محکمہ آپکی دلبستگی کا اتنا

[illegible] اگر تاہم [illegible] لائق ہے کہ ذرا ذرا سی کوتاہیوں اور [illegible] پر [illegible] التفات [illegible] اور کوتاہیاں اور لغزشیں کسی وجہ سے ہوئی ہوں تو [illegible] ہوئی ہوں یا جو ناگزیر ہوں۔

آل انڈیا ریڈیو نے جس کٹھن مرحلے طے کئے ہیں کسی اور محکمے نے آج تک نہیں کئے ہیں۔ اب یہ ایک بہت بڑا اور کامیاب ادارہ سمجھا جاتا ہے۔ جنگ کے زمانے میں اس ادارہ نے بے مثال خدمات انجام دی ہیں جنہیں حکومت نے بھی سراہا ہے اور پبلک نے بھی۔ ہر چند کہ یہ ایک سرکاری محکمہ ہے اور حکومت کی پالیسی کو اس میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تاہم اس محکمے کی غیر جانبدارانہ حکمت عملی اور دانشمندانہ رویہ نے حاکم و محکوم دونوں سے خراج تحسین حاصل کیا۔ محکمے کے حسن خدمات کی بنا [illegible] اس کے لائق افسروں کی بدولت ہے اور ان میں بھی صرف ایک شخص کے سر اس کا سہرا ہے اور وہ ہے احمد شاہ بخاری جو اس محکمے کا ڈائرکٹر جنرل ہے۔ یہ وہی بخاری صاحب ہیں جو گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادبیات کے مشہور پروفیسر تھے اور اردو ادب میں پطرس کے نام سے شہرت دوام حاصل کر چکے ہیں۔ ممکن ہے کہ بخاری صاحب میں بھی کچھ بشری کمزوریاں ہوں لیکن ان کی اعلیٰ قابلیت اور قابل قدر خدمات کو دیکھتے ہوئے ہمیں ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کر دینا چاہیئے۔

"واقفکار"

آل انڈیا ریڈیو کے سلسلے میں واقفکار کا مضمون تصویر کے دوسرے رُخ کا ہلکا سا عکس پیش کرتا ہے۔ صاحب مضمون کا طریق استدلال عجیب ہے۔ یہ کہنا کہ ریڈیو میں اگر بہیں خرابیاں ہیں تو دوسرے سرکاری محکموں میں بھی یہی خرابیاں ہیں، ریڈیو کی بریت ثابت کرنے کا ناموزوں پیرایہ ہے۔ ریڈیو کے علاوہ دوسرے سرکاری محکموں کی خرابیوں کے متعلق بھی ساقی میں حسب ضرورت لکھا گیا ہے مثلاً اروِن ہسپتال کی سفاکیوں پر، سیول سپلائیز کی بیہودگیوں پر، ڈاکخانوں کی غیر ذمہ داریوں پر۔ ان کے علاوہ غیر سرکاری اداروں پر بھی وقتاً فوقتاً لکھا جا چکا ہے۔ ریڈیو پر بطور خاص لکھنے کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ اس کا دخل تقریباً ہر گھر میں ہے اور اسے سننے میں بوڑھے جوان مرد عورت اور بچے سبھی شریک ہیں۔ اس کے علاوہ ہر مذہب اور خیال کے لوگ اسے سنتے ہیں۔ ریڈیو کا تعلق ہماری تہذیب، ہمارے ادب اور ہمارے فنون سے بہت گہرا ہے۔ انکی ترویج اور انکی تشکیل اگر غلط طریقہ پر کی جائیگی تو ہماری قومی سیرت ہی برباد ہو جائیگی۔ ریڈیو کا ایک ایک لفظ قلب و ذہن میں امرت بن کر بھی ٹپک سکتا ہے اور زہر بن کر بھی۔ ہمیں ان میں سے ایک کو قبول کرنا پڑے گا اور ظاہر ہے کہ زہر کسی کو قبول نہیں ہو سکتا۔ اس زہر کے خلاف، جو غیر محسوس طور پر ہماری سیرت میں ٹپکایا جا رہا ہے، احتجاج کرنا ہر معقول شخص کا فرض ہے۔ ہندو مسلم سوال دوسرے سرکاری دفتروں کی طرح ریڈیو میں بھی ہے۔ ہم ساقی کی کسی گذشتہ اشاعت میں اعداد و شمار پیش کر چکے ہیں اور اب تو کھلے بندوں مسلمانوں کا ہر طرح استخفاف کیا جا رہا ہے۔ پروگراموں میں، ملازمتوں میں، تنخواہوں میں، افسروں میں، زبان کے مسئلے میں، ہر ممکن طریقے سے مسلمانوں کی حق تلفی کی جا رہی ہے۔ ہندوؤں نے ریڈیو کے خلاف منظم سازش کی، ریڈیو کا بائیکاٹ کیا اور اس کے اسٹیشنوں کے آگے مظاہرے کئے، ان پر پکٹنگ کی، دھمکیاں دیں اور اپنے اثر و رسوخ سے کام لیا۔ چنانچہ انکے من مانے مطالبات پورے کئے گئے۔ مسلمانوں نے برے وقت میں اس محکمے کا ساتھ دیا اور ان سب زیادتیوں کو برداشت کیا اور اپنا نقصان بھی گوارہ کیا، محض اس لئے کہ اس کا ڈائرکٹر جنرل ایک مسلمان ہے مگر اب مسلمانوں کو بھی اس کا احساس ہو گیا ہے کہ اس ایک مسلمان نے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے اعتماد کو، ہندوؤں کی ترقی کے لئے، دھوتیوں کا پردہ بنایا اور اپنے خلوص کی آڑ میں سفاکانہ حق تلفیاں کرتا رہا۔ چنانچہ مثال کے طور پر اس ایک واقعہ ہی کو دیکھ لیجئے کہ تین ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ہیں، تینوں غیر مسلم، ان میں سے ایک کا حقدار ایک مسلمان تھا لیکن اس کی بجائے ایک ایسے شخص کو ترقی دی گئی جو حسب موقع مذہب بدلنے کے لئے مشہور ہے۔ نو اسٹیشن ڈائرکٹر ہیں جن میں سے چھ ہندو۔ چیف انجینیر ہیں، سب کے سب ہندو بلکہ ٹیکنیکل اسٹاف میں سوائے دو چار تھوڑی تنخواہ پانے والوں کے باقی سب ہندو۔ خبروں کے محکمے میں صرف مترجم تو چند مسلمان ہیں باقی افسر ہندو، اور ہندو بھی اس کٹر ذہنیت کے کہ مسلمانوں کے حقوق

کو پریشان کرنا ان کے دھرم کا جزو۔ ہندو کانگریس کی ذرا ذرا سی خبر کو نمایاں کرنا اور مسلم لیگ کی بڑی سے بڑی خبر کو مسخ کرنا اور دبانا انکا فرضِ منصبی اور یہ سب کچھ ایک "مسلمان" ڈائریکٹر جنرل کی نگرانی میں ہو رہا ہے!

عصبیت کا الزام لگا کر حقیقت کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ دلی اور یو۔پی میں قحط الرجال ضرور ہے اور اس کی تاریخی وجوہ ہیں، لیکن اہلِ پنجاب کو اور صوبوں کے رہنے والوں پر ترجیح دینے کے جو وجوہ واقفکار نے پیش کئے ہیں ان سے خود عصبیت ظاہر ہوتی ہے واقعہ یہ ہے کہ جو غیر پنجابی اس محکمے میں کام کر رہے ہیں وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں اپنے ہمسروں سے پیش پیش رہتے ہیں۔ علاوہ دفتر کے کام کے اسٹوڈیو کے کام میں بھی معقول حصّہ لیتے ہیں پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ انہیں ترقی نہیں دی جاتی اور سات سات آٹھ آٹھ سال گذر جانے کے باوجود انہیں مستقل نہیں کیا جاتا؟ اس گیارہ سال کے عرصے میں صرف ایک یو۔پی والا مر مر کے اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر ہوا ہے۔ اس صوبائی سوال کو بھی چھوڑیئے؛ اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض پنجاب ہی کے "محنتی اور جفاکش" کارکن جو روزِ اوّل سے ریڈیو میں کام کر رہے ہیں آج تک اس ترقی سے محروم ہیں جس کے وہ مستحق ہیں کیا یہ ایک افسوسناک حقیقت نہیں ہے کہ ان میں سے بعض نے مایوس اور شکستہ دل ہو کر اب استعفیٰ دیدیا ہے۔ کیا یہ سب باتیں ڈائریکٹر جنرل کے علم میں نہیں ہیں؟ اور کیا ان حق تلفیوں کا ذمہ دار ڈی۔جی۔ کے علاوہ کوئی اور ہے؟ کیا یہ بھی ایک امرِ مجبوری ہے کہ اس محکمے میں ترقی صرف انہیں ملتی ہے جو "ڈی۔جی کے آدمی" ہوں؟

ریڈیو کے کارخانے اور اس کے چلانے کے متعلق باہر والوں کو یقیناً صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا لیکن جو لوگ اس کی بیرونی اور اندرونی کارکردگی سے نہ صرف واقف ہوں بلکہ اُس کی تعمیر میں بھی ان کا معقول حصّہ ہو۔ اُن پر "نہ جاننے" کا اعتراض سرے سے وارد ہی نہیں ہوتا۔ ریڈیو کی افادیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ اعتراض اس کی بدعنوانیوں پر ہے۔ اوّل تو سب کو خوش کرنے کی کوشش بجائے خود کچھ زیادہ عقلمندی کا فعل نہیں ہے۔ دوسرے اس کوشش کے جو نتائج اب تک برآمد ہوئے ہیں وہ ہر جہت سے اس درجہ تخریبی ہیں کہ ان کا بار بار اعادہ کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، مثلاً اُردو جیسی قدرتی اور شائستہ زبان کو بگاڑ کر ہندوستانی جیسی نقلی اور غیر مہذب زبان کو رواج دینا۔ ہندوستان کی خالص موسیقی کو گھٹیا فنکاروں کے ذریعہ برباد کرانا اور اُس کے مقابلے میں سستی دُھنیں کثرت سے پیش کر کے انہیں رواج دینا۔ ریڈیو کی اس پالیسی کی ذمہ داری کس پر ہے؟ ڈی۔جی۔ پر یا کسی اور پر؟

واقفکار سے ہمیں سولہ آنے اتفاق ہے کہ ریڈیو کا کارخانہ دوسرے سرکاری دفتروں کی طرح نہیں چلتا۔ اس میں اتنا اضافہ ہم اور کرتے ہیں کہ اگر چلایا جائیگا تو اس میں اسی طرح کی خرابیاں پیدا ہونگی جیسی کہ موجود ہیں۔ یہاں یہ کلیّہ کس نے بنایا ہے کہ ہر شخص ہر کام کر سکتا ہے؟ آج ایک شخص تقریروں کا کام کر رہا ہے، کل وہی ڈرامہ کا اور پرسوں موسیقی یا عورتوں اور بچوں کے پروگرام کا یا تعلیمی پروگرام کا۔ اور یہ اصول کس نے بنایا ہے کہ جو ان سب میں ناکام ہو چکا ہو یا ان سے قطعی واقف نہ ہو وہ پروگرام ڈائریکٹر ہوگا؟ کیا ڈی۔جی کے علاوہ کوئی اور اس کا ذمہ دار ہے؟

پروفیسر احمد شاہ بخاری کی علمی قابلیت کے ہم معترف ہیں اور ان کی بے مثل مزاح نگاری کے مداح۔ انکی ریڈیائی خدمات، خصوصاً جنگ کے زمانے کی، اس لائق ہیں کہ حکومت انہیں جاگیریں دے۔ اور اعلیٰ خطابات سے سرفراز فرمائے، لیکن آل انڈیا ریڈیو کی موجودہ بدعنوانیوں اور غلط کاریوں کے ہوتے ہم اس کے ڈائریکٹر جنرل ہی کو ان سب کا ذمہ دار سمجھتے ہیں اور جب تک وہ ان کے تدارک اور اصلاح کی طرف مائل نہیں ہونگے یہی سمجھا جائے گا کہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف سے غافل ہیں۔

بخاری صاحب کو زحمت تو ہوگی لیکن اگر وہ اپنے "ہاتھی دانت کے مینار" سے نیچے اُتر کر دفتر اور اسٹوڈیوز کا معائنہ کریں تو عجیب و غریب باتیں اُنکے علم میں آئیں گی۔ مثلاً یہاں کے نہایت ذمہ دار افسروں کو اس کا علم نہیں کہ کون شخص کس پروگرام کا ذمہ دار ہے، کس شخص کو کیا تنخواہ مل رہی ہے اور اس کے فرائض کیا ہیں۔ بلکہ انہیں

اس کا کچھ علم نہیں ہے کہ اسٹیشن کی کیا پالیسی ہے کہ پروگرام کس طرح بنتے ہیں اور کس کس کو دیئے جاتے ہیں اور کیوں دیئے جاتے ہیں۔ فنکاروں کی فیس تو ایک عرصے سے مقرر ہو گئی ہے لیکن موسیقی کے شعبے میں فیسوں میں اتنی ناہمواری کیوں ہے؟ فنکاروں کو وہ لوگ کیسے مقرر کرتے ہیں جو فن سے قطعی نابلد ہیں بلکہ متنفر ہیں۔ ماہوار فنکاروں کی تنخواہیں کس معیار سے مقرر کی گئی ہیں۔ آلاتِ موسیقی اور سازندوں کا اتنا کم کیوں ہے۔ فنکاروں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیوں کیا جاتا ہے۔ جب شہر میں کرفیو آرڈر ہوتا ہے تو فنکاروں کو رات کے بارہ بجے سلامتی کے ساتھ ان کے گھروں پر پہنچانے کے بجائے انہیں پولیس کی حوالات میں بند ہونے (اور ممکن ہو تو گولی سے ہلاک ہونے) کے لیے کیوں لاوارثوں کی طرح چھوڑ دیا جاتا ہے اور اگر کوئی آرٹسٹ اندیشہ ظاہر کرتا ہے تو اس کی ترقی بند اور نوکری سے علیحدہ کرنے کی دھمکی کیوں دی جاتی ہے۔ بلا اور اسی قسم کی سینکڑوں خرابیاں اسی وقت بخاری صاحب پر کھلیں گی جب وہ یہاں آئے اور معائنہ کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔ ریڈیو کی ترقی کا سہرا اگر بقول واقفکار بخاری صاحب کے سر ہے تو بدعنوانیوں کی یہ بدعنوانی کس کے سر ہوگی؟

شاہد احمد

ہر شعبۂ زندگی پر ایک

ہفت روزہ "نگاہ" بمبئی

ادارۂ تحریر:- ہاجرہ مسرور، تسنیم عیگ، خدیجہ مستور

اگر آپ دورِ حاضر کی زندگی کے ہر عنوان پر ایک ناقدانہ نظر ڈالنا چاہتے ہیں تو "نگاہ" کا مطالعہ کیجیے

اردو کے مشہور شعرا و ادبا اور ناقدین کے افکار کا نمائندہ ہفت روزہ "نگاہ"

مستقل ابواب:- علمی، ادبی، فلمی

قیمت سالانہ پیشگی

اندرونِ ملک سے ۹ روپے

بیرونِ ملک سے ۱۰ شلنگ

ششماہی ۵ روپے

پتہ:- مینیجر "نگاہ" ہفت روزہ ۳۲ بچو علی ٹریس پریل بمبئی ۱۲

تنقید و تبصرہ (بقیہ سلسلہ صفحہ ۶)

شاعروں کے کامیاب شاعر ہیں۔ کتاب بہت صاف ستھری چھپی ہے مجلّد اور جلد پوش سے آراستہ ہے۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ:- مکتبہ جہانگیر، بازار سیتا رام، دہلی۔

سالنامہ "قوم" دہلی:- یہ رسالہ کئی سال سے نکل رہا ہے اور دلی کے مقبول پرچوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اگست میں اس کا سالنامہ شائع ہوا ہے جسے دیکھ کر حیرت ہوئی ہے کہ مضامین کے اعتبار سے بھی اور تصاویر کے لحاظ سے بھی اور سب سے زیادہ قیمت کی وجہ سے تقریباً ڈھائی سو صفحے کا یہ ضخیم سالنامہ صرف ایک روپیہ میں دیا گیا ہے۔ مضامین بصیرت افروز، افسانے دلکش اور منظومات دلنشیں۔ سرورق ہفت رنگہ۔ اس کامیاب پیشکش پر "قوم" کے سرگرم اڈیٹر انوار الحق صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ خاص نمبر ایک اچھا اور نہایت سستا تحفہ ہے۔

قمر:- خواجہ محمد شفیع دہلوی کا لکھا ہوا ایک ناولٹ ہے جس میں موجودہ سوسائٹی کے پوست کندہ حالات پیش کئے گئے ہیں۔ قمر اس ناول کی ہیروئن ہے جو ماڈرن سوسائٹی کے تمام لغویات دیکھتی اور ہمیں دکھاتی ہے۔ لیکن اس طوفانی ماحول میں بھی اس کے قدم نہیں ڈگمگاتے اور اس کے دل میں نیکی کی شمع روشن رہتی ہے۔ اور یہ نورِ ایمان ان گھناؤنی راہوں میں اس کے لئے شمعِ ہدایت بن جاتا ہے۔ ساحرہ کی آپ بیتی بھی ایک بڑی دلچسپ حقیقت ہے اور یہ دونوں کہانیاں اس چھوٹے سے ناول کو اتنا دلکش بنا دیتی ہیں کہ ہم اسے ایک ہی نشست میں ختم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب کا طرزِ بیان نہایت دل آویز ہوتا ہے اور ان کے چبھتے ہوئے فقرے تیر و نشتر کا کام کرتے ہیں۔ یہ ناولٹ مجلّد اور جلد پوش سے آراستہ ہے اور اس کے ناشر ہیں:- ہندوستانی پبلشرز اردو بازار، دہلی۔ قیمت عہ

خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ اور جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ آنے ضروری ہیں۔ (مینیجر)

Regd. No. L. 2627



Printed at the Mahboob-ul-mataba Press, Delhi & Published by
Shahid Ahmad B.A. Hons from the office of the "SAQI" Delhi



34(6)
12DEC19

[illegible]

ادارہ
شاہد احمد دہلوی
محمد حسن عسکری

سالانہ چندہ
چھ روپے
قیمت فی پرچہ نو آنے

جرعات

جلد ۳۷ | ساقی دہلی، بابت ماہِ دسمبر ۱۹۴۶ء | نمبر ۶

پیکرِ جمیل کی رنگینیوں کا مرقع اور نغمہ و موسیقی کا امتزاج

فلم ساز و ہدایت کار سبطین فضلی کی کامیاب تخلیق

مہندی

فضلی فلم کی ایک

جو ایسی مکمل تصویر ہوگی جسے آپ ہمیشہ یاد رکھیں گے

نرگس اور بیگم پارہ کے ساتھ کرن دیوان

سلطان مظہر۔ مراد۔ جانی بابو۔ غوری جیسے آرٹسٹ مہندی کی زینت ہیں

موسیقی:۔ غلام حیدر ٭ مکالمے:۔ ساغر نظامی ٭ گانے:۔ ساغر نظامی اور مجروح سلطان پوری ٭ عکاسی:۔ پرشوتم دویچہ ٭ صدابندی:۔ اے۔ ناد

آئندہ پروگرام:۔ خاتون، گڑیا اور آوارہ

فضلی فلمز۔ رتن والا۔ دادر بمبئی

تقسیم کنندگان:۔ دی۔ دکن فلم ایکسچینج۔ حیدر آباد دکن۔ جنوبی ہند:۔

دنیا کا بہترین ادب اردو میں پیش کرنے والے

مکتبہ جدید لاہور

۷۔ انارکلی

محبی! تسلیم

ہم روس کے بلند پایہ مصنف مائیکل شولوخوف کا ناول (And Quiet Flwos The Dan) "اور ڈان بہتا رہا" پیش کر کے اردو ادب میں بیسویں صدی کے ایک بہت بڑے شاہکار کا اضافہ کر رہے ہیں ہے ... اور ڈان بہتا رہا، مائیکل شولوخوف کا وہ ناول ہے۔ جسے روس کا سب سے بڑا اعزاز "فرسٹ سٹالن پرائز" پیش کیا گیا جس کے شائع ہوتے ہی دنیا کے مفکروں کو روسی ادب کی اس نشاۃ ثانیہ کا معترف ہونا پڑا۔ اور شولوخوف کو موجودہ دور کا ممتاز ناول نویس تسلیم کیا گیا۔

ہندوستان کے مسلمہ ادیبوں نے ہماری اس پیشکش کو جن تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھا اور گراں قدر آرا کا اظہار کیا۔ انہیں ملاحظہ فرمائیں:

... اور ڈان بہتا رہا

میں روسی انقلاب کا عمل اور رد عمل نہ صرف ہو بہو دکھائی دیتا ہے بلکہ ہو بہو محسوس ہوتا ہے یہ ناول انقلاب کا آئینہ ہے۔ سند سریع الحرکت، پُر ہیبت اور [illegible]

— فیض احمد فیض

... اور ڈان بہتا رہا

روس کی اس نسل کی سوانح حیات ہے جو انقلاب سے پہلے پیدا ہوئی لیکن اس کی روح انقلاب کی آگ میں یوں تپ کر نکلی کہ ایک عالم میں احیا ہو گیا۔ اردو میں ایسے حیات پرور ادب کی اشاعت اہلِ ذوق کے لئے صلائے عام ہے۔

— اختر حسین رائے پوری

... اور ڈان بہتا رہا

جب روس میں انقلاب سے پہلے ایک دنیا مر رہی تھی اور دوسری جنم لے رہی تھی، اس وقت وہاں کے مزدوروں، سپاہیوں، کسانوں اور پڑھے لکھے نوجوانوں کی کیا حالت تھی؟ اسے زندہ اور متحرک دیکھنا ہو تو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے ——— [illegible] سال خود انقلاب کے دور [illegible] ہے۔ اس ناول کا مطالعہ غیر معمولی کشش کا حامل ہے۔

— احتشام حسین

... اور ڈان بہتا رہا

دلستان نگاری کی حیثیت سے خاص دلچسپی اور اہمیت رکھتا ہے۔

— محمد حسن عسکری

... اور ڈان بہتا رہا

انقلاب کی آپ بیتی، ایک نئی دنیا اور نئے آدم کی تخلیق کی تفسیر ہے ——— اردو ادب میں بیسویں صدی کے ایک بہت بڑے شاہکار کا اضافہ ہوا ہے

— مخدوم محی الدین

... اور ڈان بہتا رہا

دریائے حیات کی روانی کا اشاریہ بھی ہے۔ اور المناک فسانہ بھی ساحلِ ڈان پر پھیلنے والی زندگی کی انقلابی مرحلوں کو [illegible] نے اپنی صناعت سے دوام بخش دیا ہے

— اختر اورینوی

... اور ڈان بہتا رہا

کی روسی زبان میں ایک کروڑ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ پانچ ہزار روبل کا انعام ملا، اردو زبان میں پہلی بار چھپی ہے۔

سفید کاغذ۔ نظر فریب لکھائی، دیدہ زیب چھپائی ۲۲ × ۱۸ سائز ایک ہی ضخیم اور مضبوط جلد میں، محمود جالندھری اور سراج الدین ظفر کا [illegible] صفحات [illegible] قیمت [illegible] روپیہ محصول ڈاک کے تمام اخراجات مفت (ہندوستان بھر کے بک سیلرز اور ایجنٹوں کے [illegible]) [illegible] قیمت بہت کم رکھی گئی ہے تاکہ آسانی عوام تک پہنچ سکے۔

مخلص رشید احمد چودھری

مکتبہ جدید لاہور

شاہد احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

سالنامہ ساقی :- اپریل کے "ظریف نمبر" کے بعد جولائی میں ساقی کا "افسانہ نمبر" شائع ہونا چاہیئے تھا لیکن حکومت ہند نے اُسی زمانے میں کاغذ کی کمی کو محسوس کیا اور مقررہ مقدار میں کمی کر دی۔ اس کے تین مہینے بعد حالات بہتر ہو گئے اور حسبِ ضرورت کاغذ ملنے لگا۔ اس خوشگوار تبدیلی کی وجہ سے ہم نے ستمبر ہی سے سالنامہ شائع کرنے کے ارادہ سے مضامین فراہم کرنے شروع کر دیئے۔ اِس سلسلے میں ہمیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور اکتوبر سے سالنامہ کی کتابت شروع کرا دی گئی۔ ناظرینِ ساقی کو ہم یہ مژدہ سُناتے ہیں کہ جنوری کے پہلے ہفتے میں ساقی کا سالنامہ ان کی خدمت میں پیش کیا جائیگا! ہم نے دانستہ اس کے مضامین اور مضمون نگاروں کی فہرست ابھی شائع نہیں کی ہے تاکہ مسابقت کی کشمکش سے ہمارے ادبی رسالے محفوظ رہیں اور ہر رسالہ بقدرِ ہمت اپنا سالنامہ شائع کرے۔ مختصراً ہم آپکو صرف یہ بتلائے دیتے ہیں کہ ساقی کے سالنامہ میں آپکے سب پسندیدہ مضمون نگار اور شاعر شریک ہو رہے ہیں۔ حسبِ دستور سالانہ چندہ ہی میں سالنامہ ساقی کے مستقل خریداروں کو دیا جائیگا۔ جو مستقل خریدار نہیں ہیں اُنہیں سالنامہ دو روپے میں اخبار فروشوں اور ریلوے اسٹیشنوں سے ملیگا۔

کتب خانہ نذیریہ :- حضرت نذیر حسین محدّث دہلوی کی یادگار میں اُن کے نواسے مولوی عبدالرؤف صاحب نے عرصہ دراز سے ایک لڑکیوں کا اسکول اور ایک کتب خانہ قائم کر رکھا ہے۔ مولوی صاحب موصوف تب سے روز انکی ترقی کے لئے ساعی رہتے ہیں۔ انکی محنت اور خلوص کی وجہ سے نذیریہ لائبریری ایک ایسا علمی سرچشمہ بن گئی ہے جس سے ہزاروں بندگانِ خدا مستفیض ہوتے ہیں۔ دوسرے اسلامی اداروں کی طرح یہ ادارہ بھی مالی مشکلات میں مبتلا رہتا ہے لیکن مولوی صاحب کی جواں ہمتی کی وجہ سے کسی نہ کسی طرح اسکے اخراجات پورے ہوتے رہتے ہیں۔ مقندر حضرات اگر اس ادارہ کی طرف متوجہ ہوں تو عنداللہ ماجور اور عندالناس مشکور ہونگے۔ نذیریہ لائبریری کے متعلق ایک وقیع رائے یہاں درج کی جاتی ہے جس سے اس ادارہ کی اہمیت واضح ہو سکے گی :-

"آج مورخہ ۳ نومبر ۱۹۴۶ء کو محکمہ تعلیم حکومتِ ہند کی جانب سے میں نے نذیریہ پبلک لائبریری کا معائنہ کیا۔ مولوی عبدالرؤف صاحب کا دم غنیمت ہے کہ باوجود بے سروسامانی محض اپنی لگن سے اتنے بڑے کتب خانے نذیریہ عامہ کو چلا رہے ہیں۔ ہر قوم کی ذہنی ترقی میں کتب خانوں کو خاص اہمیت حاصل ہے اور عوام کا فرض ہے کہ وہ ایسے اداروں کی ہر ممکن مدد کریں۔ میری رائے میں اس کتب خانہ کو ایک مستقل عمارت کی فوراً ضرورت ہے اور اس کے انتظام میں زیادہ تاخیر نہ ہونی چاہیئے۔ راقم ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔ معاون و مشیر تعلیم حکومتِ ہند۔"

اِنّا للّٰہ و اِنّا الیہ راجعون

عرش تیموری اطلاع دیتے ہیں کہ ۲۹ ستمبر کو انکے والد ماجد حضرت مرزا نظام شاہ صاحب لبیب گورگانی اِس دارِ فانی سے کوچ کر کے اپنے حبیب سے جا ملے۔ دلّی کے بزرگوں میں مرحوم ایک مخصوص صفات کے بزرگ تھے۔ ادب، تاریخ اور فلسفے کے دقیق مسائل کو چٹکی بجاتے میں سمجھا دینا انہی کا کام تھا۔ شاعر شیریں مقال بھی تھے اور نثر با کمال بھی۔ افسوس کہ انکی وفات سے وہ سب علمی مسودے ادھورے رہ گئے جو مکمل ہو کر اگر شائع ہو جاتے تو اُردو میں ان سے بیش بہا اضافہ ہوتا۔

پروفیسر محمود احمد جموں سے اطلاع دیتے ہیں کہ انکے والد صاحبزادہ محمد عمر صاحب مصنف "ناٹک ساگر" ۱۶ اکتوبر کو حرکتِ قلب بند ہو جانے سے رحلت فرما گئے۔ انکے رفیق اور مصنفِ شریک کار نور الٰہی صاحب چند سال قبل [illegible]

محمد حسن عسکری

جھلکیاں

ایسے فتنہ و فساد اور کشت و خون کے زمانے میں ترقی پسند مصنفین بڑے آڑے وقت ملک کے کام آئے۔ انسانیت کے درد سے مجبور ہو کر بیچاروں نے فوراً ایک بیان دو سو دستخطوں کے شائع کر دیا جس میں وحشت و بربریت، درندگی اور دوسرے ہولناک لفظوں کے خلاف اور محبت، اخوت، انسانیت جیسی ترقی پسندانہ نیکیوں کے حق میں اپیل کی گئی ہے۔ خیر، جہاں تک اُن جذبات اور اُس رنج کا تعلق ہے جن کا اظہار اس بیان میں ہوا ہے، اُس سے تو ہم غیر ترقی پسند لوگ بھی اپنے آپ کو غیر متعلق نہیں کر سکتے، لیکن اس بیان سے اپنے آپ کو متعلق کرنے میں اتنا بھی تو فائدہ نظر نہیں آتا کہ چلو، اور کچھ نہیں تو "پانیر" میں نام ہی چھپ جائے گا۔ آپ رجعت پسند ہوں یا ترقی پسند، رنگِ گل سے بلبل کے پر باندھنے میں مصروف رہتے ہوں یا اب تک قلیوں کی دو چار ناکامیاب ہڑتالوں کی لیڈری کر چکے ہوں، جب تک آپ ادیب ہیں ہندوستان میں آپ کو گانٹھتا کون ہے۔ یقین نہ آئے تو آج ہی ہندوستان کی ساری زبانوں کے سارے ادیبوں کی ایک کانفرنس کر کے دیکھ لیجئے۔ ٹرام کے ڈرائیوروں کا جلسہ ہو تو اخبار میں دو کالم دئے جائیں گے۔ لیکن ادیبوں کے جلسے کی خبر اگر کہیں ملی تو زنا اور چوری کے واقعات کے بیچ میں دبی دبائی کسی کونے میں پڑی ہوگی۔ مانا کہ آپ کے دل میں بڑا درد ہے، آپ کے جذبات بڑے پُرخلوص ہیں، سب کچھ سہی، لیکن آپ کی اپیل پہنچتی کتنے آدمیوں تک ہے؟ اور پہنچی بھی تو سنتا کون ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کرشن چندر نے اپیل کی، محمد حسن عسکری پر رقت طاری ہو گئی۔ محمد حسن عسکری نے اپیل کی، کرشن چندر نے دو چار ٹھنڈے سانس بھر لئے۔ اس ملک اور ان حالات کے درمیان رہتے ہوئے بس یہی ممکن ہے کہ اگر "مخبری" بہت زیادہ ہو جائے تو ہم لوگوں کو مستفید ہونے کا موقع دیجئے۔ یہاں تو اگر آپ کو زیادہ سے زیادہ تسلی ملی تو یہ مل جائے گی:-

میں اپنی داد خود دے لوں کہ میں بھی کیا قیامت ہوں۔

اور اتنی بات تو کسی مشترکہ محضر نامے پر دستخط کئے بغیر بھی ممکن ہے۔

ملک میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اُس پر رنج اور افسوس تو اپنی جگہ ہے ہی، ترقی پسندوں نے اپنے بیان میں جن جذبات کا اظہار کر دیا ہے میں اب اُن میں اور کیا اضافہ کر سکتا ہوں، اتنی خطابت تو مجھے آتی بھی نہیں۔ لیکن اس رنج سے زیادہ ڈر مجھے ایک اور بات کا ہے۔ جہاں تک کشت و خون کا تعلق ہے ادیب اسے تو مطلق نہیں روک سکتے، زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو اس میں حصہ لینے سے روک سکتے ہیں، یا اس سے بھی آگے یہ کر سکتے ہیں کہ اپنے اپنے ہم قوموں پر ظلم ہوتے دیکھیں لیکن اپنے اندر دوسری قوم کے خلاف نفرت یا انتقامی جذبہ نہ پیدا ہونے دیں۔ لیکن جو چیز زیادہ اندیشہ ناک ہے وہ یہ کہ کہیں یہ غیر معمولی حالات دماغ پر مسلط ہو کے نہ رہ جائیں، اور یہ غیر معمولی کیفیت زندگی کے مختلف مظاہر کو ناپنے کا پیمانہ نہ بن جائے۔ خیر، ان واقعات کا دماغ پر مستقل قبضہ تو ناممکن ہے، مگر کسی ادیب کے دماغ کا دو یا تین دن کے لئے بھی اس طرح مجبور و معذور ہو جانا بڑا ہولناک تصور ہے۔ اسے فراری ذہنیت کہئے یا کوئی اور عالمانہ سی گالی تراش لیجئے، مگر میں تو سمجھتا ہوں کہ آج کل تھوڑی سی بے رحمی اور بے حسی بڑی ضروری چیز ہے۔ بلکہ اگر اسے ذہنی تندرستی بھی کہہ لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ یہ بے حسی فرانسیسی انحطاط پرستوں کی ایجاد نہیں ہے، بلکہ ٹھیٹ عوامی چیز ہے۔ ان دنوں دلی میں جو سب سے امید افزا چیز مجھے نظر آئی وہ یہ تھی کہ دو محلے اُدھر تو تڑاتڑ گولی چل رہی ہے، اور یہاں چار براتیں نکل رہی ہیں۔ اور [illegible] انتقام سے کتنی [illegible] زندگی موت سے

موت ارزاں ہو رہی ہے تو کیا، زندگی تو اُسی قدر گراں ہے، اس کی جستجو تو مرتے مرتے ہونی چاہیئے۔ کم سے کم غیر معمولی حالات کی وجہ سے دماغ پر اتنا ہراس تو نہ طاری ہونا چاہیئے کہ روزمرّہ کی انسانی زندگی اور اس کے متعلقات کا تخیّل باقی نہ رہے۔ اگر اس قسم کے ہنگامے کوئی معنی رکھتے ہیں تو وہ بھی روزمرّہ کی زندگی کے پس منظر میں۔

چنانچہ، ترقی پسندوں کے بیان کے باوجود، میں تو یہی جانتا ہوں کہ ادیب کے لئے تو ان حالات سے ذہنی فرار ہی مناسب ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ ادیب کی ان واقعات کے متعلق کوئی رائے نہیں ہونی چاہیئے، یا اُسے انکے اسباب اور نتائج کا تجزیہ نہیں کرنا چاہیئے، یا اس موقع پر سیاست سے الگ ہو جانا چاہیئے۔ یہ سب باتیں بڑے خلوص اور جوش و خروش سے انجام دینے کے ساتھ ساتھ اپنے ذہنی توازن کے لئے اُسے تھوڑا سا ذہنی فرار بھی لازم ہے — جو دراصل حقیقت سے فرار نہیں ہوگا، بلکہ حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے کی کوشش۔ ان واقعات کو صرف اُنھیں بھلا کر ہی سمجھا جا سکتا ہے، آڑ کے پیچھے سے ہی ان کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک آڑ تو خیر ترقی پسندوں والی انسانیت پرستی ہی ہے، اور بڑی کارآمد۔ اس سے کام چل سکتا ہو تو سبحان اللہ، ورنہ کوئی اور ڈھونڈ لے۔ غرضکہ ذہن کو اس ہَول سے مغلوب نہ ہونے دیجئے، کسی طرح اسے بھلائیے، اور کچھ نہ بن پڑے تو ننگی تصویریں ہی دیکھئے۔ غیر انسانی خوف و ہراس و ہیجان سے تو انسانوں کی سی شہوت پرستی بہرحال بہتر ہے۔

حامد عزیز مدنی

شکست

میں نے جانا تھا اِس دیار میں ہے
نورِ مہتاب و نکہتِ لالہ
رقص میں ہیں جوانیاں پیہم | پُرفسوں نکتہ دانیاں پیہم
رات کی لازوال خاموشی | ارضِ محزوں کی پاسباں ہو گی
ذرّہ ذرّہ میں دل کی دھڑکن ہے
راہ میں کوئی گیت گاتا ہے | بے سبب کوئی مسکراتا ہے
تشنہ لب ہیں، ترم بانہیں ہیں | جال بُنتی ہوئی نگاہیں ہیں
زندگی ایک بولتا رن ہے
پاس پہنچا تو ہے اُداس فضا
بجھ رہی ہے فلک کی تابانی
ہر شبستاں بلا فغاں بکنار | ایک نم دیدہ خاک کا انبار
سینکڑوں زرد رُو حزیں مہتاب | سر دریا توں سے کر رہے ہیں خطاب
رات تاروں پہ دام افگن ہے
چیخنا چاہتی ہے تیرہ زمیں | جرأتِ نغمہ بھی ہے کا حزیں
یہ خموشی یہ کاروانِ وجود | آج تیری دہائی سے ہے معبود
لب کھلیں اور گیت گا نہ سکوں
توڑ دوں ساز اور لوٹ چلوں

(نگاہِ اوّلیں، بقیہ سلسلہ صفحہ ۲) ہوتے ہم سے مستفید ہوتا تھا۔ محمد عمر صاحب ڈرامہ کی زندہ تاریخ تھے۔ ناٹک ساگر کو شائع ہوئے کوئی بیس سال ہو گئے۔ اس عرصے میں مرحوم نے ہندوستانی ڈرامہ کے متعلق کثیر مواد جمع کیا تھا اور اُن کا ارادہ تھا کہ ناٹک ساگر کے جدید اڈیشن میں اپنے اِس بے بہا ذخیرے کو پیش کریں لیکن یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہی اور ہمارا ادب اس سے مالا مال نہ ہو سکا۔

اِن دونوں بزرگوں کا انتقال [illegible] ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے [illegible] پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

جزیرے — مشہور افسانہ نگار محمد حسن عسکری ایم۔اے کے آٹھ دلکش افسانوں کا مجموعہ، عسکری صاحب نے اُردو افسانہ نگاری میں ایک جدید دلنشین طرزِ بیان کا اضافہ کیا ہے ان کا تخیّل بیباک اور ان کا طریقۂ اظہار بے لاگ۔ قیمت عہ

ساقی بک ڈپو، دہلی سے طلب فرمائیے!

امینِ حزیں

جمالِ ہمنشیں

نوائے تلخ میں آتی ہے جب شمشیر کی تیزی
اثر اُس کا قیامت آفرینی حشر انگیزی

جُدا سارے زمانے سے ہے مسلک عشق والوں کا
نہیں رکھی گئی فرہاد کی فطرت میں پرویزی

ودیعت جسکو جو فطرت ہوئی ممکن نہیں بدلے
خردِ جاہل کیا جانے خرامِ نازِ شبدیزی[۱]

ترے آبا ترے اجداد کو معلوم تھا ظالم!
دلِ بیدار کا خلاق ہے ذوقِ سحرخیزی

نگاہِ پاک کا سرچشمہ ہے "غضِ بصر"[۲] ناداں!
ازل سے خود نگہداری کا مولد ہے کم آمیزی

یہ تہذیبِ نوی نے کونسا مارا ہے تیر آکر؟
وہی جیلے ہیں پرویزی وہی حربے ہیں چنگیزی

تیزی عقل کی دشمن وہ تیزی آن کی ضامن
طبیعت کی ہیں! تیزی نہیں تلوار کی تیزی

۱؎ شبدیز خسرو پرویز کے سیاہ رنگ گھوڑے کا نام تھا۔
پھر سیاہ رنگ گھوڑے کو بھی شبدیز کہتے ہیں۔
۲؎ غضِ بصر یعنی حیا سے آنکھیں جھکائے رکھنا!

امینِ حزیں

معارف

درد کی لذتیں نہ پوچھ درد کسی کی یاد ہے
عشق کی ہے یہ وہ ادا حسن کا جس پہ صاد ہے
جس سے نہ ہو کشادِ قلب جس سے نہ ہو کشودِ کار
درد وہ غم سرشت ہے درد وہ بدنہاد ہے

(۲)

تیکدۂ حیات میں درد کی آذری کی دھوم
کعبۂ ممکنات میں اسکی پیمبری کی دھوم
کارگہہ صفات میں اسکے عمل سے رونقیں
حلقۂ درسِ ذات میں درد کی خودگری کی دھوم

(۳)

درد ہی جوہرِ نمو درد ہے روحِ ارتقا
دیدۂ راہ بیں یہی ہے یہی مشعلِ ھدیٰ
شہپرِ جبرئیل ہے فکر و نظر کو یہ امیں
جولانگہ تخیلات اس سے وریٰ ماوریٰ

(۴)

خضرِ خجستہ پا ہے یہ بادیۂ وجود میں
درد کا دستِ غیب ہے زیست کی ہر نمود میں
حسن کی بارگاہ سے اے کفِ خاک درد مانگ
ہے یہی چیز کام کی عشق کی ہست و بود میں

اختر صہبائی

دو غزلیں

غم کو اگر گزار سکے گا خوشی کے ساتھ
اک روشنی رہے گی تری زندگی کے ساتھ

دُنیا نے تجھکو چھوڑ دیا ہے تو غم نہ کر
آخر رہا ہے کوئی کہاں تک کسی کے ساتھ

یہ سوز و اضطراب ہی رُوحِ حیات ہے
روشن ہے شمعِ عشق اسی بیکلی کے ساتھ

اے دل! عجیب شے ہے محبّت کی روشنی
رنگیں ہے بزمِ حسن اسی روشنی کے ساتھ

اُس حسنِ پاکباز کی آتی ہے اب بھی یاد
نورِ سحر کے ساتھ، کبھی چاندنی کے ساتھ

وہ بندگی ہر ایک بلندی سے ہے بلند
شامل ہے ذوقِ عشق بھی جس بندگی کے ساتھ

سرمستیاں عجیب ہیں صہبائے عشق کی
اک [illegible] بھی ہے اختر بیخودی کے ساتھ

اُلفت پرستی میرے لئے ہے
مستی ہی مستی میرے لئے ہے

تیرا تصوّر ہے اور میں ہوں
جلووں کی بستی میرے لئے ہے

ہر نقش رنگیں ہے جام میرا
یہ بزمِ ہستی میرے لئے ہے

جس کی تمنّا ہے قدسیوں کو
وہ شور و مستی میرے لئے ہے

ملتا ہے جس سے جلوہ خدا کا
وہ خود پرستی میرے لئے ہے

اربابِ حق کو خوفِ فنا کیا
ہستی ہی ہستی میرے لئے ہے

عرفاں کا دریا ہر تار جس کا
وہ سازِ مستی میرے لئے ہے

انتظار حسین

اُردو ہندی مسئلہ لسانیاتی نقطۂ نظر سے

زمین گول ہے اور اس لئے یہ ممکن ہے کہ ہم پیرس سے شنگھائی ہوتے ہوئے لندن پہونچ جائیں لیکن تاریخ کا میدان سپاٹ ہے ہمیں ایک مخصوص تاریخی منزل تک پہونچنے کے لئے براہِ راست اس کی سمت بڑھنا پڑتا ہے۔ اور زبان فطرت نہیں بلکہ تاریخ ہے۔ ہر نظری اختلاف کے باوجود زبان ایک سماجی ادارہ ہے۔ اس کی سیرت کو اس کی سمتوں کو جو چیز متعین کرتی ہے وہ نہ تو کسی مخصوص فرد یا جماعت کی خواہش ہے اور نہ قدرتی حالات ہیں بلکہ سماجی ماحول ہے۔ تاہم معیاری یا عام زبان اور بولیوں کی تشکیل اور نشو و نما میں چند فرق ضرور ہیں۔ بولیاں لسانی افعال کے فطری اختلاط سے بے اختیاری طور پر پیدا ہوتی ہیں۔ سیاسی اور معاشی اسباب کی اہمیت تسلیم کرنیکے بعد بھی یہ بات اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ بولی سب سے پہلے ایک لسانی چیز ہے۔ اس کا مدار لسانی عناصر کے فطری ارتقا پر ہے معیاری زبان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اس کی تشکیل میں ہمیشہ خارجی اسباب کا ہاتھ ہوتا ہے۔ مختلف سماجی اسباب کے ماتحت کوئی ایک بولی اُبھر کر معیاری زبان بن جاتی ہے۔ معیاری زبان کے نشو و نما پانے کا طریقہ کچھ ایسا ہے کہ وہ پہلے جمہور میں پھیل جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اپنا ایک ادب پیدا کر لیتی ہے اور تقریر سے تحریر میں آجاتی ہے۔ گویا وہ پہلے جمہور کے دلوں میں گھر کرتی ہے پھر ادیبوں اور مفکروں کو متوجہ کرتی ہے پہلے بول چال کی زبان ہوتی ہے پھر تحریری زبان بنتی ہے۔ یہ طریق نشو و نما ایک اٹل لسانیاتی قانون ہے اور زبانوں کی تاریخ میں شاید ہی کوئی استثنا مل سکے ہندی غالباً پہلی زبان ہے جو خالص تحریری زبان ہونیکے باوجود ہندوستان کی معیاری زبان بننے کی خواہاں ہے۔ ہندی کی زندگی ایک بڑے انوکھے طریقہ سے شروع ہوئی ہے۔ اس نے ایک مخالف نقطہ سے اُلٹا چلنا شروع کیا ہے۔ وہ پیرس سے چل کر شنگھائی ہوتی ہوئی لندن پہونچنا چاہتی ہے۔ عوام کی زبان میں تو خیر تمام شعوری کوششوں کے باوجود اس کا اب تک پتہ نہیں ہے لیکن اس کی تحریری زندگی بھی کچھ ایسی زیادہ طویل نہیں ہے فورٹ ولیم سکول تک تو ہم بآسانی اس کا سراغ لگاتے ہوئے پہونچ جاتے ہیں لیکن اس کے آگے کچھ نظر نہیں آتا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز یہاں یکایک پیدا ہو گئی۔ 'کن فیکون' والا معاملہ تھا کہ کسی نے کہا 'ہو' پس وہ ہو گئی۔ یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ ہندی ارادی اور شعوری طور پر ایک منظم سازش کے ماتحت ظہور میں آئی یہ منظم سازش فرنگیوں کا وہی تقسیم کرو اور حکومت کرو کا پرانا حربہ تھا۔

مغلیہ حکومت کے زوال کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس زمانہ میں تاریخی قوتیں بڑی سرعت سے مصروفِ عمل نظر آتی ہیں جن کے اثر کے ماتحت ہندوستان کی مختلف قومیں اور ان مختلف قوموں کے تمام سماجی ادارے ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے تھے۔ گویا دوسرے الفاظ میں تاریخی قوتیں قومی و مذہبی تفریق کو ختم کر کے ایک متحدہ ہندوستانی قوم، ان کا ایک متحدہ تمدن بنانے پر تلی ہوئی تھیں۔ ان قوتوں کی رفتار پر دانستہ اور باقاعدہ طور پر گرفت کی گئی۔ اُردو اسی متحدہ ہندی قومیت کا مظہر ہے (Melting Pot) سے مختلف قومیں اور نسلیں مدغم ہو کر ایک متحدہ ہندی قوم کی شکل اختیار کر رہی تھیں اور ان کی زبانیں منہدم ہو ہو کر ایک متحدہ قومی زبان کا یعنی اُردو کا پیکر اختیار کر رہی تھیں سر جیمز اور سپردکا

اُردو کو "ہندو مسلمانوں کے مقدس ترکہ" سے تعبیر کرنا اس حقیقت کے شعور پر مبنی ہے۔ ہندوستان کی اب تک دو مقدس زبانیں ہوئی ہیں۔ ایک سنسکرت اور دوسری اُردو۔ سنسکرت ہندوستان کے مٹتے ہوئے جلال کی آئینہ دار ہے اُردو ہندوستان کے تابناک مستقبل کا لقب ہے۔ اگر یہ تابناک مستقبل ایک خواب بن کر رہ جائے تو یہ بے شک ہماری نیتوں کا قصور ہے۔ ہاں تو ذکر یہ تھا کہ اِن تاریخی قوتوں کو جو مغلیہ حکومت کے زوال کے زمانہ میں برسرِ عمل تھیں باقاعدہ طور پر روکا گیا۔ اگر محض سطحی قومی و مذہبی جذبات کو بھڑکا کر ہندوستانیوں کو لڑایا جاتا تو غالباً انہیں زیادہ ضرر نہ پہونچتا۔ اور نہ یہ باہمی عناد ایک مستقل شکل اختیار کرتا۔ لیکن لڑانے والے قومی نفسیات کے بھی ماہر تھے۔ اُنہوں نے اس باہمی لڑائی کو ایک دوامی شکل دینے کی خاطر ہمارے روحانی اور ثقافتی اداروں پر بھی حملہ کیا۔ زبان ایک عظیم ترین اور اہم ترین ثقافتی ادارہ ہے۔ ایک قوم کا دل و دماغ، اس کے عزائم، اس کے آدرش اس کی زبان میں جو پوشیدہ ہوتے ہیں۔ لسانی وحدت قومی وحدت کی شرط ہے۔ لسانی انتشار غالباً سب سے بڑی لعنت ہے۔ ایک قدیم روایت کے بموجب بابل والوں پر عذاب لسانی انتشار کی صورت میں نازل ہوا۔ فرانسیسی عالم السنہ وینڈریز زبان کو "اخوت کا نشان" بتاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ افرادِ جماعت کو منسلک کرنے والا مضبوط ترین رشتہ زبان ہی ہے۔ وہ ان کی مشترک زندگی کا رمز بھی ہوتی ہے اور محافظ بھی۔ زبان کا واقعی وجود تو بولنے والوں کے اشتراکِ احساس میں ہی ہوتا ہے[1]۔ متحدہ ہندی قومیت کے تخیل کو پارہ پارہ کر دینے کا اس سے بہتر طریقہ اور کون سا ہو سکتا تھا کہ ان کی لسانی وحدت کو فنا کر دیا جاتا۔ اور اس قسم کے مذموم ارادے کے ماتحت فورٹ ولیم اسکول ظہور میں آیا۔ فورٹ ولیم اسکول ہندوستان کا برجِ بابل ہے۔ لسانی تفریق کا عذاب ہم پر یہیں سے نازل ہوا ہے۔ ہمارے بعد جب مورخین اس زمانہ کی لسانی اور قومی تفریق کا تذکرہ لکھنے بیٹھیں گے تو اُس کا عنوان غالباً وہ فورٹ ولیم اسکول رکھیں گے۔ ایک گہری سازش کے ماتحت یہاں ایک ایسی زبان تراشی گئی جس کا ہندوستان کی لسانی تاریخ میں کوئی وجود نہیں تھا۔ للولال جی تاریخی قوتوں کی پیداوار نہیں بلکہ انگریزی ذہن کی تخلیق ہے۔ ہندی اِس بات کا اعلان ہے کہ زبان کبھی کبھی خلا میں بھی پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اُردو کے ایک نقص نے بھی اِس سازش کو تقویت پہونچائی۔ دکن میں اُردو صحیح خطوط پر نشو و نما پا رہی تھی۔ لیکن دہلی میں اسے مہربان اور دور اندیش سرپرست نہ ملے مرزا مظہر جانجاناں کی تحریک بڑی زہریلی تھی جس نے اُردو کی جڑوں کو کمزور کر دیا۔ اس نے اُردو میں سے بھاشا کے الفاظ خارج کرنے شروع کئے اور اُن کی جگہ خالص فارسی الفاظ کو رکھدیا۔ رفتہ رفتہ اُردو کا ہندی روایات سے ناطہ ٹوٹ گیا اور بھیم اور ارجن کی جگہ رستم اور اسفندیار نے چھین لی۔ اُردو کی تاریخ میں یہ بڑا المناک واقعہ ہے۔ کاش اُردو میں کوئی مظہر جانجاناں پیدا نہ ہوتا۔ اِس واقعہ سے یہ ہوا کہ اُردو میں ایک ہلکی سی غیریت کا رنگ پیدا ہو گیا اور لسانی نقطۂ نظر سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک چھوٹی سی خلا نمودار ہو گئی جو عام نگاہوں سے تو پنہاں رہی لیکن باریک بیں انگریز اسے تاڑ گیا۔ وہ تو پہلے موقعہ کی تاک میں تھا ہی چنانچہ جھٹ اس نے ایک ایسی چیز اس خلا میں رکھدی جس نے پورے جسم میں زہر پھیلا دیا۔

لیکن اِتنا مسلم ہے کہ اِس نقص کے پیدا ہونے کے باوجود اُردو ہی ہندوستان کی عام زبان تھی۔ ہر بے لاگ ماہر لسانیات نے اِس بات کو تسلیم کیا ہے۔ اے ایچ سائس کہتا ہے "ہندی تو محض ہندوی کی ایک جدید شکل ہے، ایک ایسی زبان جو حالیہ ہندو ادب کے عہد وسطیٰ میں خوب منجھ گئی تھی۔ اس کے برخلاف ہندوستانی

---

[1] لنگوئسٹک انٹروڈکشن ٹو ہسٹری A Linguistic Introduction to History - Vendryes

یا اُردو لشکر کی زبان وہ ہندی ہے جس میں عربی و فارسی کا کچھ میل ہے۔ درحقیقت یہ لنگوا فرنکا ہے جس نے گیارہویں صدی میں اسلامی حملہ کے وقت ظہور کیا[۱۵] لیکن اب حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ اِس حقیقت سے انکار ہی مناسب سمجھا جا رہا ہے۔ ہندی ساہتیہ سمیلن کے ایک اجلاس میں کے۔ ایم منشی صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ اُردو ہندی کا تنازعہ اب ادبی و لسانی مسئلہ نہیں رہا ہے بلکہ سیاسی و مذہبی مسئلہ بن گیا ہے[۱۶]۔ درست ہے بدقسمتی سے ہندوستان میں مذہب کو مسخ مذہب کو اوّلین اہمیت حاصل ہے اور اُردو کو چونکہ ساز شاً اسلامی تمدّن سے متعلق کر دیا گیا ہے اس لئے اب ہمارے ارباب ملک کو اک نئی لنگوا فرنکا کی تلاش ہے۔ سنیتی کمار چیٹرجی کا خیال ہے کہ "اگر محض ہندو انڈیا کا سوال ہوتا تو سنسکرت اِس مسئلہ کو حل کر دیتی"۔ یہ اِسی قسم کی رائے ہے کہ لاطینی کو بین الاقوامی یا کم از کم یورپی بین الاقوامی زبان قرار دیدیا جائے۔ لیس پرسن Jespersen نے اس رائے کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ لاطینی ہماری موجودہ ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی۔ یہی جواب چیٹرجی کی بات کا ہے۔ سنسکرت کا تقدس اور عظمت مسلم لیکن دقت یہ ہے کہ وہ روحِ عصر سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتی۔ چیٹرجی خود آگے چل کر اِس بات کو محسوس کر لیتے ہیں کہ مسلمان ہی نہیں بلکہ "بہت سے ہندوؤں کا احساس بھی سنسکرت کی فضا سے مانوس نہیں ہے"۔

اُردو کے متعلق سب سے زیادہ قابلِ اعتراض چیز اِس کا رسم الخط ہے۔ کانگریس جب رسم الخط کے مسئلہ کو حل نہ کر سکی تو اُس نے ہندوستانی کیلئے فارسی اور ناگری دونوں رسم الخط جائز قرار دیدئے۔ سنیتی کمار چیٹرجی اِس اقدام کے خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "اگر ایک واحد زبان کو قائم کرنا ہے تو ایک واحد ہی رسم الخط ہونا چاہیئے"۔ یہ دُرست ہے اور کانگریس کا فیصلہ اسکی لسانی بے بصری پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن کون سا رسم الخط ہونا چاہیئے۔ ذرا ٹیڑھا سوال ہے۔ چیٹرجی کی رائے ہے کہ چونکہ فارسی یا ناگری کے حق میں کسی فوری مفاہمت کی توقع نہیں ہے ۔۔۔ اگرچہ ویسے سے کوئی رسم الخط کے حق میں فیصلہ کرنے کی ہی توقع رکھنی چاہیئے ۔۔۔ اس لئے اِس اُلجھی ہوئی گرہ کو ایک تیسرا رسم الخط بیچ میں لا کر کاٹا جاسکتا ہے جو غیر جانبدار رہے یعنی لاطینی یا رومن جو ان دونوں کی جگہ لے لے ۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چیٹرجی زبان کو ارادہ اور شعور کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ اِسی بنا پر اُنہوں نے سنسکرت قومی زبان بنانے کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہندی تو تاریخ لسان میں ایک بیربط کڑی ہے۔ اس سے یہ بات کہاں ثابت ہوتی ہے کہ زبان ارادہ اور شعور کا معاملہ ہے۔ زبان کی پرورش سماج کے سینے میں ہوتی ہے۔ اس کی جڑیں اجتماعی لاشعور کی گہرائیوں میں پیوست ہوتی ہیں۔ یہ تو تاریخی جبریت کا معاملہ ہوتا ہے انتخاب اور استرداد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی حال اس کے رسم الخط کا ہے۔ انتخاب اور استرداد کا سوال وہاں بھی نہیں اُٹھتا۔ ایک زبان سماجی حالات کے زیر اثر کوئی ایک رسم الخط اختیار کر لیتی ہے۔ رفتہ رفتہ اُن میں آپس میں اتنا گہرا رشتہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک کو مسترد کرنا دوسرے کے گلے پہ چھری رکھنا ہے۔ وہ تو آپس میں ایسے شیر و شکر ہو جاتے ہیں کہ ان کے انقطاع کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستانی یعنی اُردو کے رسم الخط کو بدلنا ایسا ہی ہوگا جیسے محمد تغلق کا دارالخلافہ بدلنے کا اقدام۔ اور یوں بھی ہر زبان کا ایک مخصوص مزاج، ایک مخصوص سیرت ہوتی ہے۔ ہماری زبان کی سیرت رومن رسم الخط سے مانوس نہیں ہے۔ اس رومن رسم الخط کو اختیار کرنے کی صورت میں یہ بھی بہت ممکن ہے کہ زبان کا اپنے ماضی سے رشتہ منقطع ہو جائے اور روایات کا وہ عظیم سلسلہ جو اس کی پُشت پر ہے اور جس کی بنا پر اسے یہ استحکام حاصل ہے وہ ٹوٹ جائے۔ اسکی مثال ہمیں فارسی زبان میں ملتی ہے۔ عربوں نے جب ایران پر

---

۱۵ انٹروڈکشن ٹو دی سائنس آف لنگویج۔
۱۶ حسرت بازار پتیر کا مورخہ ۹ اکتوبر ۱۹۴۵ء

فتح بابل کے اثر سے ایرانیوں کی زبان کا رسم الخط بھی بدل گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زبان رفتہ رفتہ اپنے ماضی سے بالکل بیگانہ ہوگئی آج بھی اگر فارسی داں کے سامنے زندگی کوئی عبارت پڑھی جائے تو وہ یہ محسوس کرے گا کہ اس میں اور جدید فارسی میں گہری مشابہت ہے اور یہ کہ ان دونوں میں کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور ہے لیکن چونکہ رسم الخط بدل گیا ہے اس لئے انہیں پڑھا نہیں جا سکتا اور اس لئے وہ تعلق جس کی بقا کا رسم الخط ضامن ہوتا ہے ٹوٹ چکا ہے۔ یہی حال اردو کا ہوگا۔ رومن رسم الخط اختیار کرنے کی صورت میں ولی دکھنی سے لے کر ن۔ م۔ راشد اور کرشن چندر تک یہ تمام ادبی ذخیرہ ہمارے ادیبوں کی قائم کی ہوئی تمام ادبی و لسانی روایات آنے والی نسلوں کے لئے بے معنی چیزیں کر رہ جائیں گی۔ میر کے شعر کو سن کر کوئی یہ کہہ اٹھے کہ "یہ تو ہماری زبان کی چیز معلوم ہوتی ہے" تو دوسری بات ہے لیکن وہ رشتہ جو رسم الخط کی صورت میں قائم رہتا ہے ختم ہو جائے گا۔ میر و غالب اور مومن و آتش جو آج ہمارے لئے زندہ حقیقتیں ہیں اس وقت مرجھا کر قوم کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گی۔

لیکن سوال پھر وہی آجاتا ہے کہ رسم الخط تو قومی زبان کا ایک ہی ہونا چاہیئے۔ اُردو اور ناگری رسم الخط سے بچنے کی کیا صورت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اُردو کا، ہندوستانی کا رسم الخط تو ایک ہے ہی۔ دوسرا رسم الخط یعنی دیوناگری محض ہم میں تفرقہ ڈالنے کی غرض سے کھڑا کر دیا گیا ہے۔ چیٹرجی اُردو رسم الخط کو غیر ملکی پودا بتاتے ہیں۔ درست لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس پودے نے بھارت ماتا کا دودھ پیا ہے اور اسکی جڑیں اس کی مٹی میں اتنی گہرائی میں پیوست ہوگئی ہیں کہ اس کو اکھاڑنا بھارت ماتا کے سینے کو زخمی کرنا ہے۔ ایک چیز کے غیر ملکی ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ قومی ملکیت نہیں بن سکتی۔ ہندوستان میں زیادہ تر چیزیں غیر ملکی ہیں۔ اگر ان کو خارج کر دینے کی سوچی ہے تو پھر متحدہ قومیت کی بات اٹھانا ہی حماقت ہے۔ خود ناگری رسم الخط مغرب سے آیا ہے اور غالباً ارمیبائی الاصل ہے[1]۔ لیکن جس طویل مدت تک اس نے اِس سرزمین میں پرورش پائی ہے اس کی بنا پر وہ ہندی سیرت کی رگ رگ میں سما گیا ہے اور آج ہم اس کے غیر ملکی ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہی حال اُردو رسم الخط کا ہے۔ اس نے ہندوستان کے سبزہ زاروں میں پرورش پائی ہے، اس نے گنگا جمنا کا پانی پیا ہے، اس میں کرشن کی بنسری کی تانیں اور رام کی تلوار کی جھنکاریں پیوست ہیں، اس نے ہندوستان کے مقدس مذہبوں کے مقدس اصولوں کی تبلیغ کی ہے، مختصر یہ کہ ہندوستان میں وہ اب اِتنا رس بس گیا ہے کہ غیریت اس کی بالکل ختم ہوگئی ہے۔ چیٹرجی فرماتے ہیں کہ پنجاب اور یو۔پی کے ہندوؤں نے حالیہ سالوں میں زیادہ تر ملکی ناگری کو دوبارہ زندہ کر لیا ہے"۔ صحیح ہے۔ ناگری رسم الخط زندہ ہوا نہیں ہے زندہ کیا گیا ہے دانستہ طور پر۔ اُردو رسم الخط تھوڑے سے ہندوؤں میں ہی محدود نہیں تھا۔ اس کی زد میں پورا ہندوستان تھا۔ رامائن کا ایک نسخہ اُردو رسم الخط میں لکھا ہوا ملا ہے اور یہ نسخہ خود تلسی داس جی کے زمانے کا ہے[2]۔ اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ اس رسم الخط کو آج سے صدیوں پہلے ہی کتنی مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ ہندوستان کا جلیل القدر شاعر بھی اس بات پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ اپنی شہرۂ آفاق نظم کو اُردو کی آمیزش سے عوام کے سمجھنے کے قابل بنائے اور پھر اس کا نسخہ بھی اُردو رسم الخط میں پیش کرے۔

مختصر یہ کہ ہندی ایک شعوری اور ارادی زبان ہے اور اسلئے تاریخِ لسان میں ایک بے ربط کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُردو صحیح صحت مند قوتوں کی پیداوار ہے اور اس کی موجودگی میں ایک نئی لنگوا انڈیکا کی فکر کرنا کوئی دانشمندی کی بات نہیں ہے۔

---

[1] انٹروڈکشن ٹو دی سائنس آف لنگویج ــــ ایچ حالش۔
[2] لنگوسٹک سروے آف انڈیا۔

ادیب سہارنپوری

"عقل و مذہب"

"نعرۂ عقل"

سوے دی انساں کو میں نے رخشِ ہستی کی لگام
میں نے ہی پھونکا ہے اسکے دل میں سوزِ ناتمام
میرا نعرہ چار سو رخشندگی تا بندگی
ملتوں میں گرم بازارِ سیاست مجھ سے ہے
لرزہ بر اندام نادانی کی ظلمت مجھ سے ہے
میرے تیروں کے ہدف لاکھوں فلاطونِ زماں
ہر جگہ چرچے ہیں میرے حسنِ عالمگیر کے
رکھ دیے میں نے پہاڑوں کے کلیجے چیر کے
میری فطرت کا تنوع زندگی کا بانکپن
میری دنیا میں "دھندلکوں" کو اماں ملتی نہیں
امن و آزادی مرے مسلک میں فردوسِ بریں
سرنگونی کو لبِ ترکی میں نے ٹھہرایا جنوں
بت سوا تو ما سوا کے میرے "کعبوں" میں نہیں
میرے جلوے آشکارا ہیں حجابوں میں نہیں
سینۂ کونین میں میرے لئے گنجائشیں
بجلیاں میری کنیزیں حادثے میرے غلام
بے بدل ہر صبح میری بے اندھیرا میری شام
میرے بن خالی نجامیں اور فرہاد دتے ہیں

میرے کس بل پر عناصر بن گئے آخر ... غلام
میرے ہی شہپر کی جنبش میں ہیں ... دشنام
بیرگی کی گود سے چھینی ہے میں نے زندگی
بے نیابت کاروبارِ علم و حکمت مجھ سے ہے
جگمگاتی چاندنی راتوں کی قیمت مجھ سے ہے
ارتقا کے جسم پر میری کمندوں کے نشاں
بحر و بر محکوم میری قوتِ تسخیر کے
کتنے آئینے ہیں میری حسرتِ تعمیر کے
میرے ہی دم سے جبینِ ابنِ آدم پُرشکن
سجدۂ بیچارگی کرتی نہیں میری جبیں
تجربوں پر منحصر ہے میری دنیا میرا دیں
"سجدہ کتے باشد رواچوں آفتاب یدبرد"
معجزوں کے تذکرے میری کتابوں میں نہیں
"الکتابی نور" میرے ماہتابوں میں نہیں
جی نہیں سکتی ہیں اب مذہب کی بوڑھی بازنیں
ڈال دی ہے میں نے طوفانوں کے جبڑوں میں لگام
علم و فن نے میرے ہی سائے میں پایا ہے دوام
معجزے میرے مسلّم میری ایجادوں سے ہیں

"مذہب کا جواب"

کیا دلاؤں یاد جو کچھ تجھ سے نسبت ہے مجھے
اپنے احسانات گنوانے کی قدرت ہے مجھے
سوچ تو کس باغ سے رنگینیاں لاتا ہے پھول
رات کی "دشمن" ستارے ہی نہیں دن بھی تو ہے
تیرے الفاظ میں پوشیدہ ترا بن بھی تو ہے
مے سے رندوں کا تعلق ہے کہ خالی جام سے

خامشی سے اُنس لفاظی سے نفرت ہے مجھے
تجھ سے بڑھ کر امتیازِ نور و ظلمت ہے مجھے
میری شفقت کو بھلا دے میری گودی کو نہ بھول
موج و طوفاں سے گذر کر کر ساحل بھی تو ہے
صرف ظاہر ہی نہیں ہر شے کا باطن بھی تو ہے
پھر نہ جانے کیوں تجھے کد ہے خدا کے نام سے

سعیدہ بشیر

"پھول کھلتے رہے"

"مدنیر۔۔۔ میں نے کسمسا کر کروٹ بدل لی لیکن اس طرف بھی میری آنکھیں بند ہونے کے باوجود دھندھلا ... آنکھوں کے سامنے خون کے رنگ کا سرخ سرخ سمندر لہریں مار رہا ہوا اور پھر پپوٹوں پر شعاعوں کی ہلکی ہلکی ... "اُوہ۔۔۔ کون ہے یہ۔۔۔ اُلو کہیں کا۔" اور ... جھلا کر آنکھیں کھول دیں اور پھر سورج مجھے اپنی آنکھوں کے اس قدر قریب دکھائی دیا۔ اس قدر قریب جیسے ... آنکھوں کے اندر ہی اُتر آیا ہو۔ دونوں آنکھوں میں دو ننھے ننھے سے چمکیلے سورج۔! میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی باہر سے ایک قہقہہ کی آواز آئی۔۔۔ دیکھا تو باغ کی سڑک پر کھڑے ہو کر حامد آئینہ میں سورج کا عکس لے کر مجھ پر پھینک رہا ہے۔ میں منہ پھلا کر کھڑکی کے قریب گئی اور دھڑ سے دونوں پٹ بند کر دیئے۔ باہر کی تر و تازہ فضا میں ایک اور قہقہہ لہرایا۔۔۔ ہی ہی ہی۔۔۔ ہی ہی ہی۔ کتنی عجیب ہنسی ہے کمبخت کی۔ میں نے دل ہی دل میں اُسے کوسا اور ڈریسنگ روم میں گھس گئی۔

چائے پیتے وقت نجمی بڑی سنجیدگی سے بولی "یہ حامی تمہیں پسند نہیں کیا؟" پسند کی خوب رہی۔ مجھے تو اس سے سخت چڑ ہے۔" میں نے ٹوسٹ پر راسپبری کا جام لگاتے ہوئے کہا۔ "لیکن وہ تو تم پر جان دیتا ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟" "تو کیا تم سچ مچ اس سے نفرت ..." "تم بھی کتنی عجیب لڑکی ہو نجمی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہوں یا وہ جواب دے۔ امی کی خوابگاہ کا پردہ ہلا اور آواز آئی۔۔۔ "بلی!" ساتھ ہی حامد صاحب دھمک پڑے اور میری قریب والی کرسی میں دھنس گئے۔ پھر مسکرا کر بولے "کہو بلی کیسا حال رہا۔ تم رات کو سوئیں نہیں شاید۔ صبح ہی نو بجے کے نو بجے تک پڑی پلنگ پر لوٹتی رہتی ہو۔ اور اگر میں نے آئینہ کے ذریعہ تم پر سورج کی شعاعیں نہ ڈالی ہوتیں تو

سارا دن کے بارہ بج جاتے۔" نجمی نے لقمہ دیا۔ "میں نے آپ سے سو بار کہہ دیا ہے کہ مجھے بلی مت کہا کیجئے۔" میں نے جل کر کہا۔ "تم چاہے جیسا چلو ہم تو تمہیں بلی ہی کہیں گے۔ تم ہو جو بالکل بلی ایسی۔ خصوصاً تمہارے سامنے کے یہ دو نکیلے دانت بالکل جیسے ہر دم کسی موٹے تازے چوہے کی تاک ہی میں رہتے ہوں۔" اس پر نجمی نے ایک قہقہہ لگایا اور مجبوراً مجھے بھی ہنسنا پڑا۔ "اچھا آج کا پروگرام کیا ہے؟" حامد نے انگور کا ایک بڑا سا خوشہ اپنے جناتی منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔ "کوئی خاص تو نہیں۔" میں نے اُسے ٹالنا چاہا۔ "اچھا چلو کچھ دیر ریڈیو سنتے ہیں۔" یہ نادر شاہی حکم کسی طرح ٹالے نہ ٹلا اور ہم ریڈیو کے کمرے میں پہنچے میں نے اپنی نیٹنگ اٹھا لی۔ نجمی ایک میز پوش پر فلوکس اور زینیا کے پھول بناتی رہی اور حامد ریڈیو پر مختلف سٹیشن بدلتا رہا۔ پروگرام ذرا اچھا نہ تھا۔ کہیں سے طبلے کی دھڑ دھڑ دھم دھم کے علاوہ کچھ سنائی نہ دیا۔ کہیں سے ... غراتے رہے اور کہیں سے بلیاں! آخر میں اپنی آداس سماعت سے شور و غل کی ان بدصورت آوازوں کی ٹکر برداشت نہ کر سکی۔ "چلو زینی کے یہاں ہو آئیں۔" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ نجمی اور ہم دونوں حامد کو اس کے بھدّے ماحول میں چھوڑ کر رفوچکر ہو گئے۔

"ارے۔۔۔ نسیم اونگھتے اونگھتے ایکدم سیٹ پر سے اچھل پڑے "غضب کرتی ہیں آپ۔ اتنی تیز سپیڈ" اور پھر جلدی سے انھوں نے بریک پر پاؤں دھر دیا۔ موٹر ایک ہچکولے کے ساتھ رک گئی۔ پھر بولے "آپ بڑی دیر سے چلا رہی ہیں۔ ہٹیئے اب میں چلاؤں گا۔" اور میں خاموشی سے سٹیرنگ اُن کے ہاتھ میں دے کر اُن کی جگہ آ بیٹھی۔ موٹر آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ کہنے لگے۔ "دیکھئے آج موسم کتنا خوبصورت ہے۔" اور پھر انھوں نے میری طرف دیکھا۔ "ارے کیا رو دیں گی؟"

آپ لڑکیوں کی یہ ہی ایک عادت تو بس ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی آپ کتنی بھولی بھالی ہوتی ہیں۔ بس ذرا سا ہم نے ہاتھ جوڑے، معافی مانگی اور پانی پانی ہوگئیں۔ اس بات پر تو ہم ایمان لے آئے ہیں کہ آپ لوگوں میں جس بلا کا خلوص ہوتا ہے ہم لڑکوں میں کبھی نہیں آسکتا۔ دیکھئے ہم اپنی جنس کی برائی کر رہے ہیں پھر بھی آپ خفا ہیں — من جایئے نا"— وہ خوشامد کرتے رہے۔ "اچھا کیا میرے سٹیرنگ لے لینے کی وجہ سے چڑ گئی ہیں؟ تو لیجئے لے لیجئے — لیجئے نا"۔ انھوں نے موٹر روک دی۔ لیکن پھر بھی میں منہ پھلائے باہر ہرے ہرے کھیتوں پر نظریں گاڑے رہی۔ "میں نے تو اس وجہ سے لے لیا تھا کہ ابھی آپ کو بہت اچھی طرح کار چلانی نہیں آتی۔ میں اونگھتے اونگھتے سوچا تا اور آپ کہیں کسی غریب کسان کو مار ڈالتیں۔ یا کسی درخت سے یا بجلی کے کھمبے سے کار ٹکرا دیتیں تو —" میں پھر بھی چپ رہی تو منہ بسور کر کہنے لگے "اچھا تو جایئے ہم بھی آپ سے نہیں بولتے"۔ اور وہ سچ مچ روٹھ گئے۔ پھر مجبوراً مجھے منانا پڑا اور پھر ہم دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔

وہ شام میری زندگی کی ایک حسین ترین شام تھی۔ سورج ڈوب چکا تھا اور شفق کی لالی سارے آسمان پر پھیلی ہوئی تھی۔ مغرب کے آسمان پر نارنجی نارنجی بادلوں کے ننھے ننھے ٹکڑے آہستہ آہستہ محوِ خرام تھے جیسے کسی نامعلوم جذبہ کے زیرِ اثر ہولے ہولے جھوم رہے ہوں۔ اور ہماری کار دھان کے سبز سبز کھیتوں کے بیچ سے ہوتی ہوئی ایک پتلی سی سڑک پر رینگ رہی تھی کہ دفعتہً پیاری پیاری خوشبوؤں کی آندھیاں چل پڑیں۔ اس وقت ہم ایک ایسی جگہ سے گذر رہے تھے جہاں پھولوں کے غالیچے بچھے ہوئے تھے۔ ہمارے قریب پھول تھے، اس سے آگے پھول تھے۔ اس سے آگے بھی پھول اور پھر اس سے پرے بھی پھول ہی پھول! قوسِ قزح کے سے بھینے بھینے رنگوں کے یہ دمکتے ہوئے پھول! اور ان کی نزاکت میں ڈوبی ہوئی مست بنا دینے والی نکہت۔ ہمیں ایسا لگا جیسے ہم جنت کے ایک چھوٹے سے خطے کی جھلک دیکھ رہے ہیں۔!

"کس قدر حسین جمیل پھول ہیں!" نسیم نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "یہاں ٹھیرنے کو جی چاہ رہا ہے"۔ میں نے کہا اور انھوں نے جھٹ سے کار روک دی۔ اور ہم ان پھولوں کے حسین چہروں میں جذب کر رہ گئے۔ نسیم نے مجھے ان نازک پودوں کے درمیان لٹا کر تصویریں لیں۔ اور مجھے ایسا لگا جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ اتنے پیارے پھول میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اودے اودے، زرد زرد، سرخ نیلے اور سفید پھول! گویا ایرانی قالین پر طرح طرح کے نقش و نگار بنے ہوئے ہوں جس میں ہمارے پاؤں دھنسے جا رہے تھے۔ جب ہوا کے ننھے ننھے لطیف جھونکوں سے یہ نازک نازک سے چہرے جھوم جھوم اٹھتے تو نسیم بولے "یہ پھول ہمیشہ یونہی کھلتے رہتے ہیں اور کھلتے رہیں گے۔ انسانی دنیا کا بڑے سے بڑا انقلاب بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ ایک پھول مرجھاتا ہے تو فوراً دوسرا اس کی جگہ کھل اٹھتا ہے۔ یہ کھلنا بند نہیں کر سکتے۔ خواہ کسی کا گھر ماتم کدہ بنا ہوا ہو۔ خواہ کوئی سینے میں ایک درد لئے کسی سے بچھڑ رہا ہو۔ یا کسی کے دل میں درد و کرب کی ٹیسیں اٹھ رہی ہوں۔ اگلے سال اسی موسم میں یہ پھر اپنی پوری جولانیوں پر ہوں گے اور تب نہ جانے آپ اور ہم کہاں ہوں۔ اور یہ سن کر میں سوچ میں پڑ گئی۔ نسیم سے بچھڑ جانے کا احساس ہی کتنا تکلیف دہ تھا۔ میں سوچنے لگی وہ چلے گئے تو پھر وہی اداس اداس سے دن ہو گئے۔ پھیکی پھیکی سی صبحیں اور بے کیف سی شامیں! ایکدم سے نیلے رنگ کے بے شمار ننھے ننھے سے پھول میرے سر پر برسنے لگے۔ دیکھا تو ہم اس وقت ایک چھتری نما چھوٹے سے درخت کے نیچے سے گذر رہے تھے جس پر سے بے انتہا نیلے نیلے پھولوں کے گچھے نیچے کی طرف لٹک رہے تھے اور جن کی فراوانی اس قدر تھی کہ اتنی دور کی زمین ان کے عکس سے نیلی نیلی سی معلوم ہونے لگی تھی۔!

پھر سارے راستے نسیم مجھے کیٹس اور الزبتھ براؤننگ کی چند خاص خاص نظمیں سناتے رہے اور جب ہم گھر

پہونچے تو آسمانی چراغ کبھی کے روشن ہو چکے تھے اور ہلکی، ہلکی، نرم نرم ہوا کے تھپیڑے خواہ مخواہ ہی آنکھوں میں غنودگی پیدا کرنے کی کوشش میں لگے ہوتے تھے۔ میں نے کار سے اُترتے ہی دیکھا کہ حامد ڈرائینگ روم کے پردے کی آڑ میں کھڑا مجھے اور نسیم کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا ہے۔ اُسی رات جب میں نجمی کو شب بخیر کہہ رہی تھی تو اُس نے کہا "نو فتیہ تم اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتیں لیکن مجھے ڈر ہے حامد کہیں معاملہ کو بہت زیادہ سنجیدہ اور اہم نہ بنا دے" اور میں نے مسکرا کر کہا "تم ایک بے حد ڈرپوک لڑکی ہو نجمی۔ ابّا اور امّی میری مرضی کے خلاف ہرگز بھی حامد سے میرا دامن نہیں باندھیں گے۔ پھر اُس کا مجھ پر حق ہی کیا ہے" اور میں اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ کہنے کو تو یہ جملہ میں مسکرا کر کہہ گئی تھی لیکن خدا جانے رات بھر نجمی کے کہنے کے مطابق مجھے معاملہ کی اہمیت کا اندازہ کیوں ہوتا رہا۔ حامد نسیم سے بُری طرح جلنے لگا ہے گو کہ دونوں ایک دوسرے کے دوست رہ چکے تھے۔ لیکن ان کی دوستی کے درمیان میں جو بُری طرح حائل ہو چکی تھی۔ مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ حامد نہ جانے کس طرح گھوم گھام کر امّی کا بھانجا لگتا تھا اور ان کی خالہ صاحبہ کا یہ دعویٰ تھا کہ بچپن سے ہی وہ حامد سے مجھے منسوب کر چکی ہیں۔ لیکن حامد مجھے آج تک کبھی کسی وقت بھی اچھا نہ لگا۔ اور نسیم نجمی کے خالہ زاد بھائی تھے ہم ایک ہی خاندان سے تھے لیکن آج تک میں نے نسیم کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ اُن سے ملنے کا یہ پہلا اتفاق تھا اور ہم دونوں بڑی جلدی دوست بن گئے۔

اُس روز صبح ہی صبح نہ جانے سب لوگ کہاں غائب ہو گئے۔ امّی اور ابّا اکٹھے ہی کسی تقریب پر مدعو تھے۔ نجمی بھی میوزک کالج گئی ہوئی تھی اور نسیم خدا جانے کدھر نکل گئے تھے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ گھر کیا میں سارے عالم میں ہی اکیلی ہوں، کوئی پُرسانِ حال نہیں ہے کوئی دل بہلانے والا نہیں ہے۔ کوئی بھی تو ایسا نہیں ہے جو پوچھے کہ تم اس قدر چُپ چُپ کیوں ہو۔ اور یکدم سے چاروں طرف سے اُداسیاں ہی اُداسیاں برس پڑیں۔ میری کھڑکی سے باہر پپیہا اس بُری طرح چیخ رہا تھا۔ "پی کہاں۔۔۔ پی کہاں" اور ہوا بھی یوں چل رہی تھی جیسے ڈر ڈر کے قدم رکھ رہی ہو۔ میرے اوپر جیسے گہری اُداسی کا موڈ چھا گیا اور جی چاہا کہ بس رو دوں۔۔۔ بلا وجہ ہی۔ فضول ہی۔۔۔ نہ کوئی رنج تھا نہ غم۔ نہ فکر نہ پریشانی۔ بس اپنے اوپر ایک رومانیت طاری کرنے کے لئے..... اور خدا جانے ایسے وقتوں میں دل میں ہلکا ہلکا سا درد کیوں ہونے لگتا ہے۔ درد سے بھلا تکلیف کس کو نہیں ہوتی۔ لیکن اس تکلیف میں بھی۔۔۔ اس اذیت میں بھی جو کیف جو مسرت خوشبو بنی یہاں تھی۔ اس درد میں بھی جو مٹھاس گھلی ہوئی تھی اُس سے کون کافر انکار کر سکتا ہے۔ ایکدم سے کار کا ہارن سُنائی دیا اور پھر نسیم میرے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے "کیا ارادہ ہے جناب" وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئے "کار ڈرائیو کرنی سیکھ لی۔ سائیکل چلانی پہلے ہی سے آتی تھی۔ کرکٹ کھیلنا سیکھ لیا۔ گھوڑے کی سواری بھی آ گئی۔ اب کیا سیکھیں گی؟" "تیرنا" میرے منہ سے فوراً ہی نکل گیا۔ اور میں اچھل پڑی۔ کتنے دنوں سے ارمان تھا کہ تیرنا سیکھوں۔ جل پریوں کی طرح پانی میں اِدھر سے اُدھر پھسلتی پھروں اور جب سے میں نے وہ فلم "BATHING-BEAUTY" دیکھی تھی تیرنے کا خبط بُری طرح سوار تھا۔ طے ہوا اُسی شام نسیم مجھے تیرنے کا پہلا سبق دیں گے اُسی جنتِ ارضی کے رنگین پھولوں کے درمیان جہاں خوشبوؤں کے طوفان اُٹھا کرتے تھے ایک ندی تھی۔ آفتاب غروب ہوتے ہی ہم وہاں پہونچ گئے۔ دیر تک تیرتے رہے جہاں پانی زیادہ گہرا ہوتا نسیم مجھے موٹر کے ٹیوب دے دیتے، یا اپنے بازوؤں سے سہارا دے دیتے۔ اور جب آسمانی ہیروں کا عکس ندی کی خاموش سطح پر جھلمل جھلمل کرتا ہوتا تو ہم واپس لوٹتے۔ کئی بار نجمی سے کہا کہ تم بھی چلا کرو۔ لیکن اُسے ان باتوں سے زیادہ شوق نہ تھا۔ ہر وقت کتابوں کا کیڑا بنی رہتی۔ اور پھر آجکل تو اس کے امتحانات ہو رہے تھے۔

پھر یکایک سُنا کہ حامد ڈاکٹری پڑھنے بمبئی جا رہے ہیں۔ کوئی مجھ سے پوچھتا کہ مجھے کس قدر خوشی ہوئی۔ اب میں بالکل آزاد تھی۔ اب روز شام کو تیرنے کا ہی پروگرام رہتا۔ نسیم کہتے کہ میں بہت تیز ہوں ہر بات بڑی جلدی سیکھ لیتی ہوں۔ اور اُس روز تو ہم ملٹنی شو دیکھنے چلے گئے تھے۔ ندی دُور تھی۔ پہونچتے پہونچتے دیر ہوگئی۔ ہم ذرا ہی دیر تیرے تھے کہ چنار کے ایک شان دار درخت کے پیچھے سے چاند طلوع ہوا اور پھر جیسے سارے عالم پر ایک باریک سی نور کی چادر چھا گئی۔ فضا ایکدم سے بے طرح رنگین اور کیف آور معلوم ہونے لگی۔ ندی کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی دل و دماغ کو کس قدر سکون بخش رہا تھا۔ پھر ایکدم سے نسیم نے پہلی بار مجھے اپنی آغوش میں لے کر میری پیشانی چوم لی۔ اور میرے اوپر جیسے غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایسا لگا جیسے میرے کانوں میں کہیں دُور سے کسی خواب کی دنیا سے ہلکی ہلکی موسیقی کی آوازیں آ رہی ہیں۔ اور پھر اُن رنگین پھولوں کی خوشبو نے دل و دماغ کو اور بھی پگھلا دیا۔ پھر یکایک معلوم ہوا جیسے تارے اُس ہلکی ہلکی سی خوابی موسیقی پر محوِ رقص ہیں اور چاند میں سے طرح طرح کے مدہوش کن نغموں کی مدھم مدھم سی صدائیں آ رہی ہیں۔ جیسے کائنات گا رہی ہے۔ جیسے ساری دُنیا ناچ رہی ہے۔ جیسے سارا عالم مست ہے بے خود ہے۔ اور آسمانوں پر ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر لمبی لمبی نور کی لکیریں کھینچ کھینچ کر ایک دوسرے کا مُنہ چوم رہے ہیں۔ آج تک میں نے باپ بھائی یا ماموں کے کیرکٹروں کے علاوہ مرد کو کبھی اور حیثیت میں نہیں دیکھا تھا۔ اور پھر اُن دو مضبوط اور مست بازوؤں، اُس خوبصورت اور کشادہ سینے اور اُن دو جلتے ہوئے آتشیں لبوں نے مجھے دیوانہ بنا دیا۔ نسیم نے تیرتے تیرتے مجھے اپنے مضبوط بازوؤں کی مردانہ گرفت میں لے لیا۔ آنکھیں بند کئے کئے ان گنت محبت کے راگ سُنا ڈالے۔ اور میرا دل چاہا کہ میں زندگی بھر اس مضبوط اور فراخ سینے سے یونہی چمٹی رہوں۔ ان معطر شانوں پر میرا سر یونہی رکھا رہے۔ یہ تندرست اور سڈول بانہیں مجھے ہمیشہ یونہی سنبھالے رہیں۔ اے کاش کہ میری زندگی کے یہ لمحاتِ رنگیں جاودانی ہو جائیں۔ زندگی وہیں رک جائے۔ وقت کی رفتار مدھم پڑتے پڑتے ایکدم وہیں ختم ہو جائے۔ وہ حسین اور سحر انگیز رات کبھی ختم نہ ہو۔ زندگی کا اندھا بہاؤ ایکدم وہیں کسی چٹان سے ٹکرا کر یکایک اپنے اختتام پر آ جائے۔ آہ! کاش کہ چاند اور تارے اُن طرح طرح کی موسیقیوں کے ساتھ یونہی ہم پر ضو فشاں رہیں۔ اور اپنے سے بیگانہ بنا دینے والی خوشبوؤں کے جھونکے یونہی چلتے رہیں۔ ....!

اُس رات ہم تیرنے کے بعد بھی بڑی دیر تک اُن ننھے ننھے دلفریب پھولوں کے درمیان چاند کی بے طرح پھیلی کرنوں کو اپنے جسم میں جذب کرتے رہے اور نسیم نے مجھ سے پہلی بار دل کھول کر باتیں کیں۔ کہنے لگے "نوشی میں صرف اس خصوصیت کا حامل ہوتے ہوئے کہ ایک مرد ہوں ایسا مُنہ تو نہیں رکھتا کہ تمہیں اپنی محبت کا یقین دلاؤں اور نہ دوسرے مردوں کی طرح اُس کے متعلق طرح طرح کے دعوے اور اونچی اونچی باتیں کر سکتا ہوں۔ میں جیسا بھی ہوں تمہارے سامنے ہوں۔ اگر تم آسانی سے یقین کر سکو تو کر لو کہ میری زندگی میں تم وہ پہلی لڑکی ہو جس نے مجھے زندگی کے کھیل میں جیت لیا ہے۔" پھر میں نے اس کا جواب دیا۔ "اور اس کا یقین کیا میں کر لوں کہ یہی باتیں آپ نے کسی اور لڑکی سے نہ کی ہوں گی۔ مرد تو ازل سے ہی بے وفا مشہور ہیں اور ابد تک اپنی اس فطری بزدلی کا ثبوت دیتے رہیں گے۔" "لیکن پانچوں انگلیاں برابر تو نہیں ہوتیں۔" انھوں نے وہی فرسودہ سی بات دہرائی لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان کے لہجے میں صداقت کی گہری جھلک ہے۔ "اور اسی طرح سب مرد یا سب عورتیں بھی ہرگز ہرگز یکساں نہیں ہوتے۔ یہ میں نے مانا کہ ہم مرد اپنی بے وفائی کے لئے بدنام ہیں اور ٹھیک بدنام ہیں۔ لیکن جس طرح ایک مچھلی سارے تال کو گندہ کر دیتی ہے اسی طرح بعض اچھے اور صاف دل والے مرد بھی اس بدنامی کی زد میں آ جاتے ہیں۔ اور شنو تم ہی بُرا مت ماننا اگر میں یہ کہوں کہ مردوں

کی فطری بے وفائی اور ہرجائی پن ایک بڑی حد تک ہم
لڑکیوں یا عورتوں کی نسوانی جھجک، شرم اور بھولے
پن پر ہے کہ تم لوگوں کو فطرتاً دلچسپی [illegible] ہے۔ [illegible]
اگر تم باغی ہو جاؤ! ورنہ ذرا غور کرو [illegible] سکتے
ہیں۔" "کیوں۔۔؟ کیا اُن کے ہرجائی پن کا تمہارے
پاس کیا علاج ہے؟" میں نے ایک ناتجربہ کار لڑکی
ہوتے ہوئے کچھ لاپروائی سے پوچھا۔ "سنو جب ایک
لڑکا ایک لڑکی سے اظہارِ عشق کرتا ہے تو لڑکی پہلے تو
اُسے یونہی ٹالنا چاہتی ہے لیکن جہاں اُس نے لڑکے
کی طرف ذرا سی بھی سنجیدگی پائی فوراً ایک نیک اور
معصوم دل رکھتے ہوئے اس کی باتوں کا یقین کر لیتی
ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کمبخت لڑکے کے لئے تو وہ تھوڑے
دنوں کا سامان تفریح ہو جاتا ہے اور لڑکی سچ مچ اپنا
دل دے بیٹھتی ہے اور یہ دیکھ کر کہ اب وہ لڑکا کسی
اور حصول کی شرارت پر سوار ہونے پر تلا ہوا ہے، دل
ہی دل میں پگھلتی رہتی ہے، کڑھتی رہتی ہے اور اس
بے وفا کی خاطر اپنی زندگی برباد کر لیتی ہے۔ اصل میں
تمہیں چاہیئے یہ کہ جس طرح لڑکے تمہیں جلاتے ہیں تم
بھی انہیں جلاؤ۔ اُن کے عشق کا مذاق اُڑاؤ۔ انہیں
سنجیدگی سے کبھی مت لو کہ دل کو بعد میں تکلیف ہو۔
بلکہ انہیں طرح طرح سے ستاؤ اور کبھی اُن کے دام
میں گرفتار نہ ہو۔ تم خود ہرجائی پن اختیار کر لو۔ نتیجہ
یہ ہوگا کہ لڑکے بامر دتھک ہار کر اپنی عادت بدلنے
کی فکر کرنے لگیں گے۔ دُنیا میں وہ کون سی بات ہے
جو ممکن نہیں۔ ہر چیز بدل سکتی ہے۔ ہر بات میں انقلاب
آ سکتا ہے۔ چونکہ یہ بات مستند قرار دے دی گئی ہے
کہ مرد بے وفا ہے، ہرجائی ہے، سنگدل ہے اس لئے
یہ بات بدلی نہیں جا سکتی، خواہ کچھ بھی ہو وہ اپنی حالت
پر قائم رہے گی۔ لیکن میں یہ کہتی ہوں کہ یہ تم لڑکیوں
کے اپنے اختیار میں ہے۔ بس ذرا سی بہادری اور سخت
دلی کی ضرورت ہے۔ اور پھر اگر تم ایسی لڑکیاں مل کر
اس بلند عزم کا سنگِ بنیاد رکھ دیں تو۔۔۔" تسنیم نے
اپنی تقریر یہاں ختم کی۔۔ اور میری نگاہوں میں کچھ

ڈھونڈھنے کی کوشش کرنے لگے گویا اِن آنکھوں میں کچھ پا کر
ہی بات ختم کرنا چاہتے ہوں۔ میں مسکرائی "لیکن آپ کو
کیسے معلوم کہ میں [illegible] ہوں؟" "جھوٹ جو
[illegible] ایک شخص
تو [illegible] ظاہر محبت اپنے
[illegible] اظہار کرنا چاہتا ہے اور
تم [illegible] کہتے" مگر ابھی ابھی تو آپ نے کہا
تھا کہ ہم آپ لڑکوں کی بات کا یقین نہ کیا کریں اور آپکو
خوب ستایا کریں۔" "کاش تم بہت بہادر لڑکی ہو۔"
وہ اپنے آپ ہی کچھ زیادہ سنجیدہ ہو گئے۔ پھر بولے۔
"چلو اب گھر چلیں۔ بڑی دیر ہو گئی۔ تمہاری امی پریشان
ہو رہی ہوں گی۔" اور اُن کی یکایک چپ و سنجیدگی
نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ہم گھر کی طرف اُڑے چلے
جا رہے تھے۔ سارے عالم پر چاندنی کا نورانی سمندر
لہریں مار رہا تھا کہ میں نے کہا "اور میں تو ایک معمولی
سی [illegible] لڑکی ہوں۔ مجھ میں کوئی جاذبیت بھی تو
نہیں۔" "یہ تو بڑا عام مقولہ ہے کہ ایسی محبت کی عمر
جو حُسن یا کسی اور خوبی کی بنا پر کی جائے بہت چھوٹی
ہوتی ہے۔ اور پھر اگر تم اتنی ہی معمولی ہوتیں تو حامد
اور [illegible] حبیب لینے کے لئے ایک دوسرے کے
رقیب نہ بن جاتے اور ایک ساتھ ہی تم پر جان نہ
چھڑکتے ہوتے۔ پھر حقیقی محبت وہی اصل ہوتی ہے جو
اپنی طرف سے کسی قسم کی کوشش کے بغیر ہو جائے۔
اور مجھ سے پوچھو کہ میرے لئے تم میں کیا کیا دلفریبیاں
موجود نہیں ہیں۔" اور پھر گھر آ گیا۔ اور پھر ہم اپنی
اپنی خوابگاہ میں جا کر محوِ خواب ہو گئے۔ اور میں آپ
سے کیا بتاؤں کہ اُس رات میں نے کیسے پیارے پیارے
اور کتنے میٹھے میٹھے سپنے دیکھے۔ لیکن پھر یکدم سے
میری زندگی کی خوبصورتیوں پر زوال آ گیا۔ وہ
ابھی پوری طرح جوان بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ یکدم
سے بوڑھی ہو گئیں۔ آہ! میری تمناؤں کا آفتاب
یکایک غروب ہو گیا اور میری دُنیا پر ایک بھیانک تاریکی
مسلط ہو گئی اور اُس چمکیلی ندی میں جو میری اُمیدوں

کے ننھے ننھے سے اَن گنت کنول کھلے ہوئے تھے اور جنہیں میں جلدی جلدی سمیٹنے کی کوشش میں تھی یکایک مرجھا کر رہ گئے۔ نسیم کے ابا کا امریکہ سے تار آیا کہ میں سخت بیمار ہوں تم فوراً آجاؤ۔ نسیم اُداس تھے۔ بے حد اُداس! لیکن جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اُس مرجھائی ہوئی سی پژمردہ صبح جب میں انہیں اسٹیشن چھوڑنے جا رہی تھی۔ نہ جانے کیسے کیا سوجھی جو میں کہہ گئی! "میری پیشانی کے وسط کو اب تک وہ انگارے جلائے دے رہے ہیں"۔ "اور اگر پیشانی کے اس گوشے کو بھی وہ انگارے چھو لیں تو کیا ہو؟" انھوں نے شرارتاً کہا اور پھر اپنے آتشیں لب میری پیشانی سے چھُوا دیئے۔ پھر جب وہ مجھے خدا حافظ کہہ رہے تھے تو بالکل ہی بے اختیارانہ طور پر میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ نسیم نے میری آنکھوں کے پپوٹوں کو چومتے ہوئے کہا "فوضی تم تو بہادر ہو نا۔ پھر یہ آنسو کیسے؟ دیکھو اس طرح کیا ہم لڑکے اپنی فطرت، اپنا ہرجائی پن بدل سکیں گے بھلا!" اور میں پھوٹ پڑی۔ بالکل جیسے کسی بڑے سے دریا کا بند ایک دم سے کھل پڑے اور پھر آنسوؤں کا سیلاب آگیا۔ انھوں نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا "پگلی فوضی ہم تو ایسی بزدل لڑکیوں سے بہت ڈرا کرتے۔ میری فوضی میں اس وقت تک تمہارا انتظار کر سکتا ہوں جب تک تیری اُمیدوں کی ڈوب تھک ہار کر سسک سسک کر دم نہ توڑ دے" اور پھر وہ چلے گئے۔ میری رگ رگ میں دوڑتے ہوئے خون میں بلا کی حدت۔ قیامت کا جوش اور ایک وحشیانہ ہیجان بپا کر کے! لیکن اب سب کچھ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ کوئی اگر میرے ارمانوں کی آگ کو جو اب راکھ کا ڈھیر بن چکی تھی کرید کرید کر بھی دیکھتا تو شاید اُسے دہکتی ایک چنگاری بھی نہ ملتی۔ اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جو کہ میری زندگی کا منحوس ترین وقت تھا۔ نجمی نے آکر مجھ سے کہا "فوضیہ چچا ابا نے تو تمہاری شادی حامی سے منظور کر لی ہے۔ یہ دیکھو خط ہے" اور میں نے خاموشی سے سب کچھ سن لیا۔ حامد کی غیر شاعرانہ آواز میرے کانوں میں گونجی۔ "نیلی!" اور میرے سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے کی قوتیں یکایک زائل ہوتی ہوئی معلوم دیں اور روح جیسے مردہ ہو کر رہ گئی۔ لیکن سچ تھی تو میں جو تھی میں ایک بہادر لڑکی بننا چاہتی تھی۔ نسیم کے کہنے کے مطابق ایک سنگدل لڑکی! اور میں ونایتاً دیکھتی رہی۔ جیسا کہ باغ میں پھول کھلے دیکھتی رہی، کنولوں کی چھاپ ڈھلتی رہی۔ شبنم کے موتیوں پر سورج کی ارغوانی کرنوں کا رقص دیکھتی رہی۔ محسوس کرتی رہی کہ بریت راز چھپائے دل میں اور چیخ دل نشاط انگیز ساموں میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں۔ اور میری آنکھوں نے دیکھا کہ سپنے مسکرا کر رہے ہیں۔ اور میں سنتی رہی کہ ہوائیں گا رہی ہیں۔ سونگھتی رہی کہ فضا میں کس درجہ پیاری خوشبوئیں رقصاں ہیں۔ اور پھول بھی تو برابر کھلتے ہی رہے ——!

خانم

مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم کی بہترین تصنیف ہے۔ اس دلچسپ اور دلکش کتاب کا ہر باب ایک چمکتا ہوا مزاحیہ افسانہ ہے ہر افسانہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔ مگر سب کہانیوں کا ہیرو اور کردار ایک ہے۔ ایک سے ایک مزیدار اور سنسنی ہوتی کہانی اس قدر پُرلطف، اس قدر پُرمذاق اس قدر عجیب اور اس قدر مضحکہ خیز، اس قدر ظرافت اور لطافت آمیز پلاٹ کہ جو پڑھے ہنسے۔ چغتائی صاحب کی بہترین کتاب ہے ضخامت ۴۰۰ صفحات جلد پوشش سے آراستہ ہے۔

قیمت چار روپے (للعہ)

کولتار

اس کتاب میں مندرجہ انتہا سے زیادہ دلچسپ اور مزاحیہ افسانے ہیں۔ اور یہ سب افسانے مل کر کتاب کو پورا مزاحیہ ناول بنا دیتے ہیں۔ قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بکڈپو، دہلی

سرزمینِ محبّت کی سیر

سُونی سُونی اُداس پگڈنڈی،
اُجڑی اُجڑی ملول سی چوپال،
عہدِ ماضی بھی کتنا دلکش تھا،
رُکتا جاتا ہے راہوارِ خیال،

تیری خلوت گہِ تصوّر میں،
کیا نہیں اُبھرے وہ حسیں سائے،
جو کہ اس سرزمینِ اُلفت میں،
کیف زا ہو کے باہم اُلجھے تھے،

تیرے گیتوں کا سحرِ پارینہ،
ان فضاؤں میں پھر لرزنے لگا،
روح ہونے لگی ہے پھر تحلیل،
میرے پہلو میں دل دھڑکنے لگا،

کیا تجھے یاد ہے مری محبوب،
اس شجر کی بلند شاخوں پر،
دو پرندوں کا آشیانہ تھا؟
کیا ہوا اُنکو؟ — آہ کس کو خبر!

کہہ نہیں سکتا کیوں نگاہوں میں،
پھر وہ تنہائیاں مچلنے لگیں،
جن میں بچوں کی طرح چھُپ چھپکر،
ہم نے لاکھوں پہیلیاں تھیں کہیں،

دیکھ وہ ماہتاب اُبھر آیا،
گذری گھاتوں سے ہم کو کیا حاصل،
اِن مناظر کی گفتگو کو سُن،
بیتی باتوں سے ہم کو کیا حاصل!

میری آنکھوں میں اشک جھوٹ ہے یہ،
تو سمجھ جھیل میں ستارے ہیں!
میری آہوں کا دھیان کیوں ہے تجھے،
یہ تو بادِ صبا کے دھارے ہیں!

دیکھ یہ کروٹیں بدلتی ندی،
یوں ترے پاؤں چھونے آئی ہے،
جیسے مندر میں کوئی پوجارن،
صد عقیدت سے پھول لائی ہے!

خوابگوں لرزشوں میں لپٹی ہوئی،
کہکشاں یوں فلک پہ تاباں ہے،
جیسے تیری نظر کی ایک کرن،
ٹوٹ کر میرے دل پہ رقصاں ہے!

دیکھ یہ چاندنی کی نادانی،
رہگذاروں سے عشق کرتی ہے،
یوں لپٹتی ہے ذرّے ذرّے سے
جیسے نغموں سے اُنکی میٹھی لَے

لَے کے رنگین لفظ نے دل میں،
پھر اُسی لَے کی یاد تازہ کی،
تیرے پہلو میں بیٹھ کر میں نے
بارہا جس سے جاں بہائی تھی،

آہ وہ لَے، وہ زمزموں کا ہجوم،
حسنِ ماضی نظر پہ چھانے لگا،
سینکڑوں دلنشیں خیالوں کو،
پھر دماغی خلا میں لانے لگا،

دیکھ وہ ماہتاب اُبھر آیا،
گذری گھاتوں سے ہم کو کیا حاصل!
اِن مناظر کی گفتگو کو سُن،
بیتی باتوں سے ہم کو کیا حاصل!

عبدالمتین عارف

علی احمد خاں

فراق کی شاعری میں بلاغت

کیوں نہ فراق کے اشعار ہی سے یہ مضمون شروع کر دوں؟ آگے چل کر اختصار کے ساتھ بہت کچھ اُن کے اشعار کے متعلق مجھے کہنا ہے۔

کوئی پیغام دلوں کو لبِ اعجاز تو دے　　موت کی آنکھ بھی کھل جائے گی آواز تو دے
قول و قرارِ دوست بھی خواب و خیال ہو گئے　　جو نہ کہا تھا حُسن نے عشق کو بھولتا نہیں
عشق میں سچ ہی کا رونا ہے　　جھوٹے نہیں ہم جھوٹے نہیں ہم
رازِ سکون دعافیت یا تو کبھی کھل گئے مگر　　عشق کو بھی خوشی نہ تھی حسن بھی شادماں نہ تھا
سنگ و آہن بے نیازِ غم نہیں!　　دیکھ ہر دیوار و در سے سر نہ مار
ہم سے کیا ہو سکا محبت میں　　تو نے تو خیر بے وفائی کی
جہاں میں تھی فقط افواہ تیرے جلووں کی　　چراغِ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا
قفس سے چھٹ کے وطن کا سراغ بھی نہ ملا　　وہ رنگِ لالہ و گل تھا کہ باغ بھی نہ ملا

شاعر کا وجدان کتنا مفکرانہ ہے۔ اگر ہم دورِ حاضر کی اُردو شاعری کا آغاز اقبال کی موت کے بعد سے سمجھیں تو یہ حقیقت کھل جائے گی کہ فراق کے تخیل میں اور اُن کے احساس میں جتنی گہرائی، وزن، لطافت، رمزیت، آفاقیت و صداقت و کیف انگیزی ہے وہ اقبال کے بعد کسی اور شاعر کو نہیں ملی۔ اس دور کے اور شعراء نے بہت بلند مفکرانہ شاعری کی ہے لیکن جو دل و دماغ اور جو مفکرانہ اندازِ شعور لے کر فراق اُردو شاعری کی دنیا میں آئے حیات و کائنات کی جن چھپی ہوئی قدروں کو اُنھوں نے اشعار کے آبگینوں میں جھلکا دیا وہ آپ اپنی مثال ہے فراق کی شخصیت ایک معمّہ ہے جس سے ہم جتنا ہی مانوس ہوتے جاتے ہیں اُس کی رمزیت بڑھتی جاتی ہے۔ مندرجہ بالا اشعار میں شاعر کی فکر رموزِ حیات و کائنات کی گویا تھاہ لے رہی ہے۔ ہم ان اشعار میں گویا ڈوبتے چلے جاتے ہیں۔ ان سب اشعار اور فراق کے ایسے سینکڑوں اشعار غمِ ہستی کے احساس سے کھر کھرائے ہوتے نظر آتے ہیں لیکن یہ عجیب غم ہے۔ ان اشعار میں ہمیں غم کا نیا وجدان ملتا ہے غم کے نئے آفاقی پہلو ان اشعار میں جھلک جاتے ہیں۔ خود غم ان اشعار میں سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے، یہ غم ہمارے اندر وہ روح پھونک دیتا ہے جس سے زندگی کو صحت اور توانائی ملتی ہے۔ فانی بدایونی اپنے یاس انگیز اشعار میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فراق اپنی المیہ شاعری میں کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں اس عالمِ محویت میں حیات و کائنات غم کی دیوی کا روپ دھار کے اُن کے سامنے آتی ہے اور وہ اُس کے خدوخال کو دیکھ کر اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ لو ابا۔ ئے سرمدی چھیڑ دیتے ہیں۔

غمِ حیات کی دیوی پھر ایک عمر کے بعد　　بچہرہ مُتبسّم بچشم نم آئی
موت ایک گیت رات گاتی تھی　　زندگی جھوم جھوم جاتی تھی
زندگی کو وفا کی راہوں میں　　موت خود روشنی دکھاتی تھی
ہر گام پر طریقِ محبّت میں موت تھی　　اس راہ میں کھلے درِ رحمت کہاں کہاں
دلوں کو اب نہیں فردوسِ گمشدہ کی تلاش　　وہ نشۂ غمِ فردا چلا دئے میں نے
خُلدِ بریں میں آج تک گونج رہی ہے یہ صدا　　آ و عذاب نے کسے کیا ہے دھر انجات میں

جدھر نگاہ کریں سیرِ شبنمستاں ہے / [illegible] آنسوؤں کا کفن
خنکیِ مہر و ماہ کی مت پوچھ / [illegible]
اشک سے دیدۂ انجم میں جھلک جاتے ہیں / یہ بھی اک راز ہے انساں کی قسمت کی طرح
ہیں رازدارِ غمِ کارواں نہ افلاک / تکے ہے رنگِ رخ رہگزار ہیں ہم لوگ
نہ ذکرِ موجِ فنا کر کہ غم کے غرقوں کو / گزار سینۂ ساحل ڈبو چکا کب کا
شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس / دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں
تمام خستگی و ماندگی ہے عالمِ ہجر / تھکے تھکے سے یہ تارے تھکی تھکی سی یہ رات
فراق ایسے میں کیوں آنکھ ڈبڈبا آئی / ہوا میں نرم [illegible] فضا میں ٹھنڈک سا ہے
دے رہا ہے عہدِ رفتہ آج بھی اپنا نشاں / آج بھی خاکسترِ ماضی سے اٹھتا ہے دھواں
اب گزرتا ہے وہاں سے زندگی کا کارواں / موت کی بھی جن فضاؤں میں نکل آئے زباں
آج دو جگ مل رہے ہیں کانپتی ہیں بے سپے / ماس کی پرچھائیوں کو دوسری پرچھائیاں
اپنی ہی گرمی سے آیا عشق میں اک بانکپن / اپنی ہی نرمی سے گھائل ہو گیا حسنِ بتاں
دیکھیے تو دیتا جاتا ہے کب تک آدم کا گناہ / دیکھیے اٹھتا ہے کب تک خونِ انساں سے دھواں
یہ ذرّے ذرّے کی شادابیاں یہ جاں بخشی رات / یہ کائنات [illegible] آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی
تاروں کی آنکھوں سے بھی اوجھل / [illegible] غم ہے تیرا
تیرہ بختی نہیں جاتی دلِ سوزاں کی فراق / شمع کے سر پہ وہی آج دھواں ہے کہ جو تھا

یہ آواز پیغمبرانہ ہے۔ شاعر کے شعورِ غم کی بیکرانی وہ آواز ہے جو ہمیں کن فضاؤں میں لے جاتی ہے کس طرح زندگی کا حسن شاعر کے آنسوؤں کے قطروں سے دھلا دکھائی پڑتا ہے کیسا سکون ہے۔ ان اشعار میں کتنی شانتی، کتنی طمانیت۔ ان اشعار میں مہاتما گوتم بدھ کے مجسموں کے وہ نرم خط و خال نظر آجاتے ہیں جن میں آفاقی جذبۂ ترحم نے ایک ناقابلِ بیان گھلاوٹ پیدا کر دی ہے۔ میر کے کلام میں کہیں کہیں جس آفاقی غم کے احساس کا پتہ چلتا ہے اسی احساس کی ارتقائی شکل میر سے ڈیڑھ سو برس بعد فراق کے کلام میں نظر آرہی ہے کتنی معصومی اور طہارت ہے اس نوائے غم میں۔ کتنا نرم ادراک، کیسا رچا ہوا جمالیاتی شعور، معلوم ہوتا ہے کہ اس آواز پر ستارے کان لگائے ہوتے ہیں۔ یہ المیہ شاعری خیر و برکت کے آغوش میں پلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس شاعری میں محبت کے صحیفوں نے آنکھیں کھولی ہیں۔ فراق نے بلاغت کے تصور کو نئی معنویت دی۔ جو لوگ یہ مضمون پڑھیں گے ان میں بہتوں نے قریب قریب تمام رسالوں میں کسی نہ کسی شاعر یا ادیب پر تنقیدی مضامین اکثر دیکھے ہوں گے آپ نے ضرور دیکھا ہوگا کہ بسا اوقات شاعر کی شاعری کہیں جا رہی ہے اور تنقید کہیں اور معمولی سے معمولی شعر لے کر اشعار اکثر و بیشتر رسمی اشعار پر تعریف کے قلابے خالی کر دیے جاتے ہیں۔ لوگوں کو بے جان اشعار میں یا ان اشعار میں جن میں ایک جھوٹی قسم کی زندگی ہے کہاں سے نہ جانے کہاں سے فصاحت و بلاغت، شعریت و نشتریت نظر آجاتی ہے۔ بلاغت فردوسی کے اس ہنگامے میں سچی ذمہ دارانہ تنقید کا کام اور مشکل ہو جاتا ہے۔ فراق کی شاعری کو پیش کرتے ہوئے اسی لئے کچھ جھجک سا لگتا ہے اور سودا کا یہ شعر یاد آجاتا ہے:

دکھلائیے لیجا کے تجھے مصر کا بازار / گاہک نہیں واں کوئی مگر جنسِ گراں کا

فراق کے ہاں تعبیرات، تشبیہات، استعارے، نفسیاتِ عشق، داخلی معاملہ بندی و خارجی ادا بندی، اشاریت، حیات و کائنات کی خلاقانہ ترجمانی مختلف اسالیب سے روح نما و حیات نما مصوری کاروانِ انسانیت بلکہ کاروانِ وجود کا منزل منزل بڑھاؤ اور ٹھہراؤ، فضا کا احساس، زمان و مکان کا احساس، یہ تمام صفات، بالغ نظری کی یہ تمام مثالیں کچھ

اِس انداز سے ملتی ہیں کہ ہم پر سحر کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جو مثالیں اب تک ان کے کلام سے دی گئی ہیں وہ زندگی اور سنسار کے حسن اور محبت کے المیہ پہلو سے متعلق نہیں لیکن فراق کا آفاقی تخیل وجدانِ محفل کی پیداوار ہے خود فراق کی زندگی کے واقعات میں خوشی کے لمحے اب تک بہت کم رہے ہیں لیکن تصوف و مذہب کے حسین فریبوں سے بچتے ہوئے انھوں نے کسی داخلی سادھنا یا ریاضت کے سہارے اپنے اندر وہ جمالیاتی شعور پیدا کر لیا ہے جو اس دنیا کے المیہ پہلو تک محدود نہیں ہے۔ شعور کی بلندیوں پر روحانیت و فوقیت کا میل ہو جاتا ہے۔ ان بلندیوں پر شاعر کے وجدان میں ستاروں کے دل کی دھڑکن پیدا ہو جاتی ہے وہ ان مقامات سے کائنات کو دیکھ کر مدہوش بھی ہو جاتا ہے اور وجد میں بھی آ جاتا ہے۔ اس کے آنسوؤں سے نشاط کی کرنیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ فراق کی شاعری سوئی قوم کو جگاتی ہے یا جاگتی قوم کو سلانے کے لئے نہیں ہے بلکہ زندگی کو زندگی بنانے کے لئے ہے۔ اور اسی عمل میں اس کی بلاغت کے رموز پنہاں ہیں۔ کاغذی لغت سے نہیں 'زندگی کی لغت' سے یہ شاعری مرتب ہوتی ہے۔ اُن کی شاعری میں زندگی کی تکنیک ہے۔ آرٹ کی تکنیک نہیں۔ یہ شاعری علمِ بلاغت سے زیادہ بلیغ ہے۔ ہمارے شعور و فکر کے لئے کائنات و حیات کے دروازے پر دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ زندگی کے المیہ پہلو سے نظر ہٹا کر شاعر یوں نغمہ سرا ہوتا ہے۔

منزلیں گرد کے مانند اڑی جاتی ہیں　　وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا
ابر ہے صاف تو ہر صبح نئی رنگ کرتی تھی　　حسن اگر شوخیاں تو سادگی بھی آہی جاتی ہے
بہت آہستہ اٹھتی ہے نگاہِ شاعرِ فطرت　　رخِ ہستی سے چادر سی مگر سرکا ہی جاتی ہے
ابھی ہر شے سے ہویدا ہے نہ یاں شانِ انسانی　　ابھی ہر چیز میں محسوس ہوتی ہے کمی اپنی
فراق دیکھ بدلتی ہے منزلِ آفاق　　کہ مہر و ماہ کی میں باگ توڑ سکتا ہوں

بیسویں صدی کے شہرۂ آفاق ادیب رومان رولاں نے انقلابِ فرانس کے موضوع پر اپنے ایک ڈرامہ میں کہا ہے کہ انقلاب ہونے کے پہلے کوئی چیز اتنی غیر متوقع نہیں ہوتی جتنا۔ فراق نے ایک شعر میں اس حقیقت کی طرف کتنا لطیف اشارہ کیا ہے۔

دیکھ رفتارِ انقلاب فراق　　کتنی آہستہ اور کتنی تیز

دنیا کے بحرانی دور پر کچھ اور اشعار سنئے۔ فراق کہتے ہیں۔

شورشِ کائنات ہے خاموش　　موت ہی زندگی کے دوش بدوش
تھرتھرانے ہیں افق پر شعلۂ بانگِ جرس　　کاروانِ عہدِ نو کی مل رہی ہیں آہٹیں
اندھی فضاؤں میں تارے چھٹک آئے ہیں　　یا چہرۂ فردا پر قطرے ہیں پسینے کے
نیند آتی نہیں ستاروں کو　　آج دنیا پہ رات بھاری ہے
ڈر رہے ہیں شکستِ دشمن سے　　لڑنے والوں کی وضعداری ہے

جرنیل وغیرہ جو ہٹلر سے لڑتے ہوئے بھی روس کے ہاتھوں اچانک شکست کے تصور سے کانپ کانپ جاتے تھے اُس طرف کتنا خوبصورت اشارہ ہے۔

جھپکا رہی ہے دیر سے آنکھیں ہوئے دہر　　کون و مکاں کو نیند سی کچھ آ رہی ہے آج
ہر لفظ کے معنی و مطلب بدل چلے　　ہر بات اور بات ہوئی جا رہی ہے آج
یا زندگی دہر تھی سوگند موت کی　　یا موت زندگی کی قسم کھا رہی ہے آج
ابنائے دہر لیتے ہیں یوں سانس گرم و تیز　　جینے میں جیسے دیر ہوئی جا رہی ہے آج
بیتے جگوں کی چھاؤں میں امروز پر فراق　　ہر چیز ایک فسانہ ہوئی جا رہی ہے آج

ان اشعار میں زندگی کے بجائے اِس دَور اُس کی بدلتی ہوئی قدروں، پُرانے الفاظ کے نئے مفہوموں کے احساس سے کیسا خاموش تلاطم نظر آرہا ہے۔ بڑے پیمانہ سے بین الاقوامی تصادم اور جنگِ عظیم سے متعلق حوادث کی عکاسی فراق کی سیاسی نظموں میں کی گئی ہے۔ بڑی چالاک انگلیوں کے سجلے پوروں سے دورِ حاضر کی اُلجھی ہوئی گتھیاں ان نظموں میں سلجھائی گئی ہیں۔ سیاسی اور سماجی نظموں میں عموماً معنویت کا فقدان ہوتا ہے۔ اُن میں سب کچھ ہوتا ہے لیکن ہنگامی مسائل اُس خوابناک منظر کی طرح ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں آتے جو انھیں دوامی زندگی دے سکے۔ دورِ حاضر کے متعلق کئی اچھی نظمیں گزشتہ پانچ سات برسوں کے اندر کہی گئیں ہیں لیکن اُن میں وہ گمبھیر وچار، وہ تہ در تہ معنویت، وہ بلاغت نہیں ہے جو فراق کی پولیٹیکل شاعری میں ہے دل والوں اور آنکھ والوں کو ملتی ہے۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا ان نظموں کی نرم تابناکی چڑھتے ہوئے دن کی طرح جگمگاتی جائے گی۔

فراق کا قلم جس راہ سے گامزن ہوتا ہے بہت چمکتے ہوئے نقشِ قدم چھوڑ جاتا ہے۔ حسن و عشق کے نفسیات کی نازک ترین ترجمانی ان اشعار میں دیکھئے۔

نازک وقتوں میں کام آکر عشق دیجاتا ہے
چڑھتی ندی پار اُتارے اُتری ندی ڈبوئے

بدھا پیدا کرے دلوں میں ایمانوں کے دیپ جلانے
بات وہ کہہ اے عشق کہ سُن کر سب قائل ہوں کوئی نہ مانے

حُسن کے ہر نیاک میں جذب تھیں لاکھوں غفلتیں
کون کسی کو یاد تھا، کس نے کسے بھلا دیا

اور ہوئے گا مآلِ عشق کا ردِّ عمل
جب یہ سمجھتا تھا کبھی دھوکا ہی تو سمجھائیں گے کیا

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تیری رنجشِ بیجا بھی نہیں

مانا کہ ترے لطف و کرم میں کمی نہیں
آسان اس قدر تو تری دوستی نہیں

ہم دیکھ کر بھی دیکھ سکیں حُسنِ یار کو
اتنی طویل فرصتِ نظارگی نہیں

وہ کچھ رُکی رُکی ہوئی آواز میں تجدیدِ دلداری
مجھے بھولا نہیں وہ التفاتِ سرگراں اب تک

رشکِ صد لطف و کرم ہو یہ بنا رنگِ ستم
کچھ نہیں جان سکے تیرا پشیماں ہونا

کٹی یوں تو سامِ ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اُٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا

محض جوان مرد شاعر ما ہیجان زدہ شاعر جنسی تحت کے نازک پیچیدہ مسائل پر اتنے گہرے شعر نہیں کہہ سکتا۔ دَورِ حاضر کی عشقیہ شاعری میں یا فراق کے ہمعصر متغزلین کے یہاں اتنے گہرے اشعار دو چار کی تعداد میں بھی نہیں ملتے۔ فراق کے یہاں سینکڑوں ایسے اشعار ملیں گے جو ہمارے ادراک کو مسلسل جگاتے چلے جاتے ہیں۔ اسی کو مشہور انگریزی شاعر ادیب میرڈتھ ـــــ Ecstasy of Understanding کہتا ہے یعنی نشاطِ شعور کہا ہے حیات و اخلاقیات کے مسائل پر کچھ اشعار سُنئے:۔

جو لانگہِ حیات کہیں ختم ہی نہیں
منزل نہ کر حدود سے دنیا بنی نہیں

آتے نہ نظر، لکیر ایسی
نیکی و بدی کے درمیاں ہے

ہر تو خیر ہنر عیب سے بھی جلتے ہیں
فغاں کہ اہلِ زمانہ ہیں کس قدر کم بیں

بنا کر ہم کو مٹ جانے ہیں غم بھی شادمانی بھی
یہ آنی جانی دُنیا ہے حقیقت بھی کہانی بھی

دوست و دشمن خوبیاں میری بھلا سمجھیں گے کیا
کہ اُنھیں عشق سمجھ جائیں اگر میرے عیوب

زندگی زندگی کو دنیا میں
کارواں کارواں چھپاتی تھی

فراق کی رباعیاں جو رُوپ کے نام سے ابھی ابھی شائع ہوئی ہیں ہندستان بھر میں مشہور ہوچکی ہیں۔ رباعی میں بڑی بلاغت کی ضرورت ہوتی ہے اس کے آخری مصرعہ میں عمر بھر کا تجربۂ حیات و کائنات سمیٹ لیا جاتا ہے۔

عذرا شیریں

"مُثبت و منفی"

اُس کی رنگت سیاہ ہونٹ موٹے اور نقوش بھدّے تھے۔ لیکن پھر بھی اُس کے آنے سے دفتر کی خاموش گھٹی گھٹی زندگی میں ایک انقلاب سا آگیا۔ خاموش افسردہ زندگی صبح سے لیکر شام تک فائلوں اور ملازمت کے متلاشی لوگوں سے مغز کھپائی میں گزر جاتی۔ ایک ایسی زندگی جس میں کوئی مسکراہٹ نہ تھی کوئی جذبہ نہ تھا اور پھر کوئی جھجک اور تکلّف بھی نہ تھا۔ افسروں سے لے کر کلرکوں تک کی روزانہ زندگی کا پروگرام ایک ہی نقطہ پر مرکوز تھا کہ اس بھوک کی ماری ہوئی بیکار مخلوق کے لئے رزق مہیا کرنے کا سامان کرے لیکن اُس کے آنے سے یہ زندگی اچانک بدل گئی۔ کلرک اب بھی وہی کلرک تھے اور افسر اب بھی وہی افسر۔ لیکن ان سب کی زندگی میں جیسے ایک انقلاب آگیا تھا۔ اور اُن کے مرجھائے ہوئے چہروں پر رونق سی آگئی تھی۔

حکومتِ ہند کی نئی سکیم کے سلسلے میں وہ فوج سے فارغ ہونے والی دیکائیوں کے سیکشن کی انچارج تھی اور اس سے پہلے فوج میں جونیر کمانڈر کی خدمات سرانجام دے چکی تھی۔ لیکن اُس کے رویہ، اس کے اندازِ گفتگو اور اس کی آنکھوں میں عجیب بے باکی تھی۔ جس سے دفتر کا نوجوان طبقہ شاید پہلے کبھی دوچار نہ ہوا تھا۔ وہ بے تکلفی سے دفتر کے کمروں میں اِدھر سے اُدھر گھومتی۔ قطع نظر اس سے کہ اس کی اپنی پوزیشن کیا تھی۔ کام پر جھکی ہوئی نظریں اُٹھتیں اور اس کے قدموں کا تعاقب کرتی ہوئی پھر جھک جاتیں بات کرنے میں اُس کا انداز بے تکلفانہ تھا اور اُس کی مسکراہٹ ہر شخص کے لئے وقف تھی۔

جب وہ پہلے پہل دفتر میں آئی تو کام کی شکل نوعیت کے پیش نظر رشید کو ہی بیشتر اُس کے پاس بیٹھنے اور اُسے کام سمجھانے کا موقع ملتا رہا۔ وہ خاموش اُس کا مطالعہ کرتا لیکن دوسروں سے برعکس اُس کے دل میں کوئی نیا احساس بیدار نہ ہوا تھا۔ وہ اُسے ایک عام عورت سمجھتا تھا جو اپنی مسکراہٹوں کو بکھرتی اور اس طرح نہ جانے کیا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ وہ قطعاً اس بات کی پروا نہ کرتا جب وہ مُسکرا کر کہتی مسٹر رشید مزاج اچھے ہیں، اور مسٹر رشید میں آپ کی بہت شکرگزار ہوں۔ وہ صرف ایک انداز بے اعتنائی سے مسکرا دیتا۔ اور جوابی شکریہ ادا کرتے ہوئے اُس کے کمرے سے باہر چلا جاتا۔ وہ اُس کے اپنے سیکشن کی انچارج نہ تھی۔ لیکن دفتر میں سب سے پُرانا اور تجربہ کار کلرک ہونے کی وجہ سے مس شیلا کو کام سمجھانے کی ذمہ داری اُسے سونپی گئی تھی۔ اُس کا زیادہ دیر تک مس شیلا کے پاس رہنا یا اُس سے دیر تک باتیں وغیرہ کرتے رہنا۔ دوسروں کے لئے خواہ کچھ ہی معنی کیوں نہ رکھتا ہو اُس کے لئے سوائے دفتری کام کے اور کچھ نہ تھا۔ اُس نے کبھی اِس طرف توجہ نہ دی تھی کہ یہ بے باک سیکشن انچارج آخر ان مسکراہٹوں اور اپنے بے تکلف اشاروں کنایوں میں کیا بات پوشیدہ رکھتی تھی۔ دفتر کے دوسرے کلرک رشید کو چھیڑنے کے لئے مبارک باد دیتے اور خود بہانے بہانے اُس کے کمرے میں بکھری ہوئی خوشیوں کو سمیٹنے جاتے۔ اس کا ہر ایک سے بے تکلفی سے ملنا خواہ اُس کا حُسنِ خلق ہی کیوں نہ ہو دفتر کے لوگوں کے لئے عجیب دلکش کیفیت کا حامل تھا مگر یہ عجیب دلکش کیفیت رشید نے کبھی محسوس کی تھی۔ دفتر آکر اُسے ہر وقت یہ خیال ضرور رہتا کہ ابھی مس شیلا آئیگی یا اُسے بلائے گی۔ مگر وہ اُس سے ملنا نہ چاہتا تھا۔ وہ ان چند ہی دنوں میں اُس سے اُکتا سا گیا تھا۔ اور حتی الوسع پرہیز کرتا تھا کہ اُس کے کمرے میں جائے۔ آہستہ آہستہ اُسے یہ محسوس ہوا کہ وہ اُس سے دُور رہنا چاہتا تھا شاید وہ اُس مہیب مسکراہٹ سے نفرت کرتا تھا جو موٹے موٹے لبوں پر نمودار ہو کر اُس کے گالوں کو پھیلا دیتی تھی اُن گہری نظروں سے نفرت کرتا تھا جو ہر ایک کے دل کی گہرائیوں میں اُترنے کی کوشش کرتی تھیں۔"

اور دوسروں سے یوں گھل مل جاتی تھیں جیسے بچپن کے ساتھی ہوں اس دُور رہنے کے پورا کرنے میں اسے کوئی دقت نہ تھی۔ وہ نہ اُس کے کمرے میں جاتے اور نہ اُس کا سامنا کرے۔ آخر اُسے کوئی مجبوری تو تھی نہیں کہ ضرور آتے ہی اُسے سلام کرنے جاتے۔ دفتر کا کام وہ اُسے سیکھا ہی چکا تھا اور اس لئے اب اُس نے مس شیلا کے پاس جانا ترک کر دیا۔

ایک روز دفتر ابھی کھلا ہی تھا اور رشید کو اپنی سیٹ پر بیٹھے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ وہ آئی۔

"مسٹر رشید!" اُس نے دونوں ہاتھ اُس کی میز پر رکھنے اور میز پر آگے کو جھکتے ہوئے کہا "ایک بات کہوں۔"

"جی فرمائیے" رشید نے جواب دیا۔

"لیکن یہ وعدہ کرو کہ ہنسو گے نہیں۔" اس قسم کی وعدہ طلبی ایک عجیب سی بات تھی۔ تاہم اس نے وعدہ کر لیا۔

"میرے پاس ایک ویکانی آئی ہے۔ میرا کلرک ابھی تک نہیں آیا اس لئے تم اُس کا نام رجسٹر میں درج کر دو۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اُسے دیکھ کر ہنسو نہیں۔" اس قسم کی گفتگو غیر متوقع تھی۔ رشید پریشان ہو گیا۔ اُس نے کہا "آپ اُسے بھیج دیجئے۔" وہ چلی گئی اور ایک نہایت سیاہ فام عمر رسیدہ ویکانی داخل ہوئی۔

"مجھے آپ کے پاس مس صاحبہ نے بھیجا ہے تاکہ آپ میرا نام درج کر لیں۔" اُس نے کہا۔

"ہاں تشریف رکھئے" اور رشید رجسٹر میں جھکا کر اُسے درج کرنے میں مصروف ہو گیا۔

"آپ کا نام؟"

"مس نورا۔"

"باپ کا نام، تعلیم، مذہب، زبان اور آخری سوال تھا آپ کی شادی ہو چکی ہے یا نہیں۔" وہ سب سوال پوچھتا چلا گیا۔ لیکن آخری سوال کے جواب پر وہ اگرچہ ہنسا تو نہیں مگر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"میں ابھی تک مس ہوں مین تم کیا بولتا ہے۔"

"اوہ معاف فرمائیے!" رشید نے کہا اور رجسٹریشن مکمل کر کے چپڑاسی کے ساتھ اُسے مس شیلا کے پاس بھیج دیا۔

اُس کے جانے کے بعد وہ ایک بار پھر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر اس کے ساتھ ہی مس شیلا کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ ظاہر ہے مس شیلا نے شرارتاً یہ الفاظ کہے تھے مگر کیوں۔ اِس بات کو وہ نہ سمجھ سکا۔ آخر وہ ایک کلرک تھا۔ اُس سے شوخی و شرارت کیا معنی۔ اور پھر اس خاص نوعیت کی شرارت جو کوئی عورت شاید بلا جھجک نہ کر سکے، اُس کی بے باک نگاہوں کی چمک رشید کے لئے ناقابلِ فہم تھی اور اس طرح بے تکلفی سے میز پر ہاتھ رکھ کر اس قدر جھک جانا کہ سر اُس کے سر کے قریب آ جائے آخر کس مقصد کے لئے تھا۔ ہو سکتا ہے وہ اُسے آزما رہی ہو تاکہ اُسے اپنے سیکشن میں تبدیل کروا لے، یا پھر اُس کے جذبات سے کھیلنا چاہتی ہو۔ مگر وہ اس بات کی اجازت دینے پر قطعاً آمادہ نہ تھا۔ ایک ۴۵ روپے کا کلرک اور ایک گزیٹڈ آفیسر کا جوڑ ہی کیا، اچانک اُس کے خیالات پلٹا کھانے۔

وہ سوچتا شاید مس شیلا کی نگاہوں کی بے باکی، فعال کی بے تکلفی اور اُس کے میٹھے اور نرم الفاظ بے چارے کلرکوں کی بے حس زندگی میں آگ بھرنے کیلئے تھے۔ یا شاید اُن کو زندگی کا احساس دلانے کے لئے تھے۔ اور اب یہ اُن کا فرض تھا کہ اس آگ کو اپنے سینوں میں بھر لیں، وہ محبت کے اُن پھولوں سے اپنی زندگی کو آراستہ کر لیں جو مس شیلا انہیں پیش کر رہی تھی۔ مگر یہ خیال زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا۔ آخر اُسے کیا حق حاصل تھا کہ ہماری پُرسکون زندگی میں تڑپ پیدا کرے۔ ہمارے دلوں میں خواہش پیدا کرے۔ کسی چیز کو پا لینے کی خواہش، پھر خود دُور کھڑی ہو کر تماشا دیکھے۔ ہم اُس تک نہیں پہنچ سکتے۔ اُسے پا نہیں سکتے۔ پھر اسے کیا حق ہے کہ ہمارے سینوں میں دبی ہوئی آگ کو بھڑکانے کی کوشش کرے۔

اُس کے خیالات مختلف راہوں پر چلتے رہے۔ شاید وہ خود اپنے جذبات کی تسکین کا سامان چاہتی تھی۔ اُن سے کھیلنا چاہتی تھی یا خود نمائی کے جذبے کو تسکین دینا چاہتی تھی۔ مس شیلا کا کردار اُس کے ذہن پر مختلف صورتوں سے اُبھرتا اور مٹتا رہا مگر کوئی صورت بھی پوری طرح اُجاگر نہ ہو سکی۔ رشید کیلئے مس شیلا کی

ذات ایک معمہ تھی وہ اُسے سمجھ نہ سکتا تھا مگر جب بھی اُسے مس شیلا کا خیال آتا وہ خود کو مس شیلا کے سامنے ایک ناچیز پودے کی طرح دیکھتا جو کسی بہت بڑے درخت کے پہلو میں اُگا ہوا اور اپنے ساتھی کو دیکھ کر اپنے احساس کمتری کو محسوس کر رہا ہو۔ اور اسی سے شاید اُسے آہستہ آہستہ مس شیلا سے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ وہ اپنے دل میں ایک جلن سی محسوس کرتا۔ ایسی جلن جو ایک مجبور اور بے بس پرندہ قفس میں آزادی کا خیال آنے پر محسوس کرے، جب وہ آزاد تھا۔ جب اُس کی سوچ آزاد تھی اور جب اُس سے پر نہیں چھینے گئے تھے۔ اور اسی لئے جب ایک دن مس شیلا کا چپراسی اُسے بلانے کے لئے آیا تو اس نے جانے سے انکار کر دیا۔

اور پھر چند روز یونہی گذر گئے۔ اس عرصہ میں کوئی قابلِ ذکر بات نہ ہوئی۔ دفتر کی گہما گہمی کلرکوں کے مسکراتے ہوئے چہرے، افسروں کے روزانہ بدلتے ہوئے سوٹ اور اُن کی نکٹائیاں سب روزمرہ کی چیزیں بن رہی تھیں۔ آخر رشید کو ان سب میں کیا دلچسپی تھی؟ وہ اب بھی وہی رشید تھا جو مس شیلا کے آنے سے پہلے تھا، اب بھی اُس کا مقصد روٹی کمانا تھا اور اس کے لئے صبح سے شام تک وہ کوشش کرتا لوگوں کے لئے روٹی کمانے کا سامان کرے تاکہ وہ خود بھی روٹی حاصل کر سکے۔ اور اس کام میں اُسے کسی قدر دلچسپی بھی تھی۔ وہ اسے انسانی خدمت اور ملکی فلاح و بہبود کے سلسلے میں اپنی حقیر خدمات تصور کرتا تھا، اور اُس کی زندگی اس پر مرکوز ہوتی جا رہی تھی۔ مس شیلا کی ذات سے جو نفرت اُس کے دل میں کچھ دن پہلے بہت بڑھ گئی تھی اب قدرے کم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اگرچہ کبھی کبھی کسی کلرک کی خودنمائی کی کوشش سے چڑجاتا جو اُس کے نزدیک یقیناً احمقانہ تھی مگر اس کا اظہار اُس نے کبھی نہ کیا تھا۔ وہ خاموش زندگی گذار رہا تھا۔ مس شیلا سے ملے اُسے کتنے ہی روز ہو گئے تھے۔ اگرچہ یہ ایک معمولی بات تھی مگر نہ جانے کیوں اُس نے محسوس کرنا شروع کیا کہ جب کبھی کوئی کلرک آکر کہتا۔ آج مس شیلا مجھے فوجی سلام کرنا سکھاتی رہی یا "آج مس شیلا کہہ رہی تھی کہ شادی سے بچنے کے لئے وہ فوج میں بھرتی ہوگئی تھی"، تو وہ توجہ سے یہ باتیں سنتا۔ اور طنزیہ انداز میں مسکرا دیتا۔ مس شیلا سے نفرت کی بجائے اب اسے اُن کلرکوں سے نفرت ہوتی جا رہی تھی جو مس شیلا کے متعلق باتیں کرتے تھے یا زیادہ تر اُس کے پاس آتے جاتے تھے۔ مس شیلا سے کچھ عرصے سامنا نہ ہونے کی وجہ سے اُس کے دل میں جو نفرت پیدا ہو رہی تھی نہ جانے کن گہرائیوں میں گم ہوتی گئی۔ اب جب کوئی کلرک مس شیلا کے متعلق کوئی بات کرتا تو اُس کا جی چاہتا کہ وہ اُس کے مُنہ پر زور سے طمانچہ مارے، اُس کا گلا دبا دے۔ اپنی اس خواہش پر سوچ بچار کرنے سے وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ آخر اب وہ دوسرے کلرکوں سے کیوں چڑتا تھا۔ اگر وہ مس شیلا کے پاس آتے جاتے تھے تو اُسے کیا۔ آخر وہ کیوں حسد کرے، اُس نے خود ہی تو مس شیلا کے پاس آنا جانا چھوڑ دیا تھا مگر اب اس کا احساس اپنی شہرت کھوتا جا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ مس شیلا کے پاس جا کر اُس سے محبت نہ کر سکے گا۔ اُس کے بھدے نقوش اور بے باک نگاہیں اُس کی نفرت کو پھر اُبھار دیں گی۔ مگر اس کے باوجود وہ یہ گوارا نہ کر سکتا تھا کہ دوسرے اُس کے کمرے میں اس طرح آئیں جائیں یا اس سے گھل مل کر باتیں کریں۔ وہ مس شیلا کے خیال سے بچنا چاہتا تھا۔ مگر پھر بھی اُسے ہر روز دفتر آتے ہی مس شیلا کا خیال آتا۔ ایک بار اُس نے سوچا کہیں وہ مس شیلا سے محبت تو نہیں کرنے لگا۔ مگر دوسرے ہی لمحہ اُس نے یہ خیال دل سے نکال دیا۔ یقیناً مس شیلا سے محبت نہ کی جا سکتی تھی۔ پھر آخر اس کشمکش کا سبب کیا تھا۔ اگر وہ خود مس شیلا کی نگاہوں کا جواب نہ دے سکتا تھا یا اُس کا سامنا کرنا نہ چاہتا تھا تو آخر دوسروں سے کیوں جلے۔ ہر روز اُس کے لاشعور میں مس شیلا کا خیال منجمد رہنے لگا۔ اُس کی ذہنی کشمکش روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اُسے یقیناً مس شیلا سے کبھی نفرت تھی مگر اب کیوں نہیں تھی۔ اب اس نفرت کی جگہ کوئی اور نامعلوم ...

اُس کے دل میں گھر کرتا جا رہا تھا۔ یہ نامعلوم جذبہ کیا تھا، کبھی کبھی وہ سوچتا۔ گہری سوچ میں محو دنیا اُس کے سامنے ہوتی مس شیلا، موٹے ہونٹ، بھدّے نقوش، بے باک نگاہیں۔ نفرت اُبھرتی مگر پھر ایک اور جذبہ اس پر چھا جاتا، مس شیلا کی نرم گفتگو، بے تکلفانہ باتیں اور اُس کا دل مس شیلا سے لگاؤ سا محسوس کرتا۔ اور پھر اُسے اُن کلرکوں پر غصہ آتا جو مس شیلا کے پاس زیادہ آتے جاتے تھے۔ وہ چاہتا کہ مس شیلا کی مسکراتی ہوئی نظریں اُس کی طرف بھی اُٹھیں، کبھی کبھی اُس کی یہ خواہش بہت تیز ہو جاتی۔ وہ کوشش کرتا کہ اس خواہش کو دل میں دبا دے مگر دبانے سے یہ اور بھی اُبھرتی۔ مس شیلا کی خاموش مسکراتی ہوئی نظریں بے باک نگاہوں کی جگہ نظر آتیں، اور وہ بھول جاتا کہ وہ کیا تھا، مس شیلا کے بھدّے نقوش اور موٹے ہونٹ فضا میں تحلیل ہو جاتے۔ ہر طرف مسکراہٹ ہی مسکراہٹ پھیل جاتی اور وہ اس مسکراہٹ کے نشے میں کھو جاتا۔

ایک روز جب کمال نے اُسے آ کر بتایا کہ آج وہ اور مس شیلا اکٹھے بیٹھ کر چائے پیتے رہے ہیں تو نہ جانے کیوں اُس کے جسم میں آگ سی لگ گئی۔ اُس نے محسوس کیا جیسے یہ ذہنی کشمکش اب انتہا تک پہنچ گئی تھی اُس نے شدّت سے محسوس کیا کہ وہ کیا چاہتا تھا۔ وہ خود کو کمال کی جگہ دیکھنا چاہتا تھا، ہر اُس کلرک کی جگہ جسے وہ فوجی سلام کرنا سکھاتی تھی یا اپنی فوجی زندگی کے راز ہائے سربستہ کا ذکر کرنے میں باک نہیں کرتی تھی۔ اُس نے ایک جلن سی محسوس کی جو آہستہ آہستہ تیز ہوتی گئی، وہ مس شیلا سے ملنا چاہتا تھا۔ اُس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اب وہ دور نہیں رہ سکتا اُس کی وہ تمام نفرت جو کچھ عرصے پہلے پیدا ہوئی مصنوعی تھی، مس شیلا سے دور رہنے کی کوشش بھی مصنوعی تھی، وہ شاید اُس سے محبت کرتا تھا، شیلا سے، اُسی عورت سے جسے وہ بدصورت خیال کرتا تھا، شیلا کا خیال اُس کی زندگی کا ایک جزو بن گیا تھا۔ بے اختیار اُس کا جی چاہتا کہ وہ شیلا کے کمرے میں چلا جائے اور اُس سے کہہ دے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، اُس سے شکایت کرے کہ تم نے مجھے اتنے عرصے کیوں نہیں بلایا، وہ چاہتا تھا کہ آج اپنا دل کھول کر مس شیلا کے سامنے رکھ دے اور اُسے اپنا لے، خیالات ایک طوفان کی طرح اُٹھے، لکھتے لکھتے اُس نے قلم زور سے پھینک دیا۔ وہ ایکدم کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور تیز تیز قدم چلتا ہوا مس شیلا کے کمرے کی طرف بڑھا، مس شیلا کا کمرہ اُن کے اپنے کمرے سے کچھ فاصلے پر تھا۔ خیالات کے طوفان میں اُسے کچھ بھی نظر نہ آتا تھا، وہ جیسے ہوا میں اُڑا چلا جا رہا تھا۔ کہ اچانک مینجر کے کمرے کی گھنٹی زور سے بجی اور وہ دھڑام سے زمین پر آ گرا، اُس کا خواب ٹوٹ گیا۔ مینجر کے نام کا خوبصورت بورڈ ایکدم اُس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ اُسے اب معلوم ہوا کہ وہ مینجر کے کمرے کے پاس تھا، اور اُس کی بغل میں ہی مس شیلا کا کمرہ تھا۔ اُس نے ایک نظر مس شیلا کے دروازے کی طرف دیکھا، وہ اندر داخل ہونا چاہتا تھا مگر رُک گیا۔ شاید اندر کوئی ملنے ملانے والے لوگ ہوں؟ اُس نے چاہا کہ اندر جھانک کر دیکھ لے مگر اچانک دروازے کی چق اُٹھی اور مس شیلا خود باہر نکلی، وہ اب بھی مسکرا رہی تھی، اُس کے بھدّے ہونٹ پھیلے ہوئے تھے "مسٹر رشید" مس شیلا نے کہا، مگر وہ جواب نہ دے سکا، اُس کا جیسے دم گھٹنے لگا، وہ اُس مہیب مسکراہٹ کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اُس نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور جس تیزی سے آیا تھا اُسی تیزی سے واپس چلا گیا۔ اپنی میز پر پہنچتے ہی اُس نے اپنا استعفےٰ مینجر کو بھجوا دیا۔ (حلقۂ اربابِ ذوق میں پڑھا گیا)

شاہجہاں: مرمریں خواب کی دلدوز تمثیل، شاہجہاں کی آنکھ سے ڈھلکا ہوا آنسو جس نے تاج کا روپ دھار لیا۔ عشرت رحمانی نے مغلیہ حرم کی یہ رنگین داستان ایک نہایت موثر پیرایہ میں لکھی ہے۔ کتاب آرٹ پیپر پر چھپی ہے۔ مجلّد اور جلد پوش سے آراستہ۔ قیمت ۱۲ار

سحر بنگال: طاہرہ دیوی شیرازی کی دلکش نثر اور اچھوتے پلاٹ کے افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت عہ

ساقی بکڈپو دہلی سے طلب فرمایئے

بلدیو دیوان

پتی دیو

وہ بیل گاڑی سے اُتری اور اپنے پتی دیو کے پیچھے پیچھے چل دی۔ اُن کے پیچھے قُلی مدّتوں کا زنگ آلودہ ٹرنک اُٹھائے آ رہا تھا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، یہ بڑی بڑی عمارتیں کیا ہیں۔ اُس کے پتی دیو مسافرخانے میں آ کر رُک گئے۔ قلی نے ٹرنک نیچے رکھدیا، گھونگھٹ میں سے جہاں تک اُس کی نظریں کام کرتی تھیں، آدمی اور عورتیں ہی نظر آتے تھے، وہ رہ رہ کر سوچتی، یہ لوگ سمائیں گے کہاں؟ اُس کا حیران ہونا بجا بھی تھا، کیونکہ اُس نے گنتی کے آدمی ہی تو دیکھے تھے۔ گاؤں میں لے دے کر سودا سلف کی ایک ہی تو دُکان تھی۔ جس کے مالک اُس کے پتی دیو تھے۔ ایک ایک کر کے تمام گاؤں والوں کی صورتیں اُس کی نظروں میں گھوم گئیں۔ پٹواری، چودھری اور وہ کسان جو تاروں کی چھاؤں میں بیلوں کو ہانکتے اور کندھوں پر ہل رکھے جگّے ڈاکو کے گیت گاتے چلے جاتے:-

جگّے ماریا لائل پور ڈاکہ
کرتاراں کھڑک گئیاں

آپے —

آپے تریکاں بھگتن گے تیرے ماپے

جگّے کے لئے اُن کسانوں کے دلوں میں کتنا احترام ہے، کتنی عزت، گو وہ ڈاکو ہی تو تھا مگر غریبوں کی مدد کرنے والا — گاؤں کی فضا میں ڈوبتے ڈوبتے وہ جگّے کو نہ جانے اور کتنی عزت سے دیکھنے لگتی اگر اُس کے پتی اُس کے خیالات کا تسلسل نہ توڑ دیتے تو —

"تم ذرا ٹرنک پر بیٹھو میں ٹکٹ لے آؤں"، اُس کے پتی ایک طرف کو چل دیئے۔ اُس کی نظریں پتی کے پاؤں کا تعاقب کرتی رہیں حتیٰ کہ اُن کے رُک جانے پر اُس کی نظروں نے جا ہی لیا۔ اُس نے پھر غور سے دیکھا، بھیڑ بہت تھی، کندھے سے کندھا ٹکرا رہا تھا اور تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ لوگ اُس کے پتی دیو کو کھڑا بھی نہ ہونے دیتے تھے۔ اُس نے اچانک دوسری طرف دیکھا، بھیڑ تو خیر کم نہ تھی مگر اُس سے تو بہت کم، وہ سوچنے لگی کہ پتی دیو کو کیسے کہے کہ وہ اُدھر سے ٹکٹ لے لیں۔

اُس کے دیکھتے دیکھتے لوگ بکھرتے گئے۔ اور دو حصوں میں بٹ گئے جیسے دریا کے دو کنارے ہوں اور اُن کے ملنے کا کوئی امکان نہ ہو۔ ایک نوجوان عورت ٹکٹ لینے کیلئے بڑھی۔ یہ بھی خوب تماشا ہے گاؤں کے ساہوکار کو تو کوئی کھڑا بھی نہیں ہونے دیتا اور نہ جانے کون بیسوا ہے جسکے آتے ہی مردودوں نے راہ بنا دی ہے۔ شرم نہیں آتی اُسے دُشٹ، پاپی، کمینی، برائے مردوں کے سامنے یوں کھلے مُنہ سر جاتے۔ کاش جگّے کو۔ اُس کے گیتوں کے ہیرو کو اور بے لبسوں کے مددگار کو اُن کی بے لبسی معلوم ہو جاتی تو وہ اُنہیں بتا دیتا کہ وہ کیسے اُسے ٹکٹ نہیں لینے دیتے۔ ہائیں اُس کے گال اتنے سُرخ کیوں ہیں، اُس کے چہرے پر اتنی سپیدی کیوں ہے۔ ارے اُس کے ہاتھ میں کیا ہے جس میں سے وہ روپے نکال رہی ہے۔ کیا وہ اکیلے سفر کرے گی، چلتی کس طرح ہے۔ خوبصورت بھی نہیں۔ مگر لوگ اُس کی طرف دیدے پھاڑ پھاڑ کر کیوں دیکھ رہے ہیں — کیا یہ شہری ایسے ہوتے ہیں۔

اُس کے پتی کے آ جانے پر اُس کے خیالات منتشر ہو گئے۔ اُس کے پتی اندھے کی لاٹھی بنے آگے آگے چل رہے تھے اور وہ اپنے رہبر کے پیچھے۔ اُس کے دو بالشت لمبے گھونگھٹ نے اُسے اور بھی قابلِ توجہ بنا دیا تھا۔ بھیڑ بہت تھی، کندھے سے کندھا ٹکرا رہا تھا۔ اتنے میں ایک نوجوان بھیڑ کو چیرتا ہوا آیا اور اُسے ٹہوکا مارتا ہوا آگے نکل گیا۔ وہ اُس نوجوان کو تو نہ دیکھ سکی مگر اس کے سُرخ و سپید ہونٹ اُس کی آنکھوں میں پھرتے رہے ....

اُس نے سُنا تھا کہ شہری نوجوان خوبرو عورتوں کو شانے مارا کرتے ہیں اور اُن پر پھبتیاں کسا کرتے ہیں۔ تو کیا

وہ بھی خوبصورت ہے۔ مگر اس میں شک کی کونسی بات ہے گاؤں بھر میں تو اُس کے سُندر نقوش کے چرچے ہوتے، مگر اُس نے اُس کے چہرے کو کیسے دیکھا۔ آخر دوپٹہ بھی تو ململ کا ہی ہے۔ اور اگر اس کے چہرے کو نہ بھی دیکھ سکا ہو تو اُس نے چال سے بھانپ لیا ہوگا۔ اُس کی چال تو اُس کے پتی دیو کو بھی بہت بھاتی تھی۔

اُس کا دل بے چین سا ہوگیا۔ اُس نے اپنے آپ میں کچھ کمی محسوس کی، وہ بار بار پیچھے دیکھنے کی کوشش کرتی مگر وہ سُرخ وسپید لوٹا نہ وہاں تھے نہ اُسے دکھائی دیئے۔ اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ نوجوان پھر سے اُدھر سے گذرے اُس کا شانہ اُس کے شانے سے چھُو جائے اور ایک ہیجان خیز سی لمس محسوس ہو، اُس کے دل کے ایک کونے سے آواز آئی شاماں تم نے وہ پاپ کیا ہے جس کی تلافی نہ ہوسکتی ہے نہ ہوگی، وہ لرزی، کانپی، مگر پھر سے سنبھل گئی۔ اُسے پھر خیال آیا کہ کسی نے دیکھ تو نہیں لیا۔ کوئی کیا کہے گا، گاؤں کی ساہوکارنی کو کوئی یوں کندھا مارے۔۔۔ ساہوکارنی کا لفظ دماغ میں آتے ہی وہ گاؤں کی فضا میں کھوگئی۔ اُسے پھر سے گاؤں کی وہ پھوہڑ عورتیں یاد آنے لگیں جنہیں برتنوں اور چولھے سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ اوپلے تھاپنا جن کا معمول ہو۔ جن کے ذہن میں پتی کی سیوا کے سوا اور کوئی خیال نہیں۔ جن کے لئے پتی دیو دُنیا کے سب سے اعلےٰ آدمی ہیں۔ وہی اُن کے لئے بادشاہ وہی اُن کے لئے ان داتا۔ مگر گاؤں کی اُن پھوہڑ عورتوں کو کبھی ایسی بھیڑ سے گذرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اگر نہیں ہوا تو یہی وجہ ہے کہ اُن کے پتی اُنکے لئے سب سے خوبصورت اور اچھے مرد ہیں۔ اگر وہ ایک بار ایسے ہجوم میں آئیں۔ اُن کے شانے نوجوانوں کے شانوں سے چھُو جائیں۔ سگرٹوں کے دھوئیں اُن کے چہروں پر برسات کے بادلوں کی طرح چھا جائیں۔ اور خوبصورت چہرے اُن کی نظروں سے گذریں .... تو کیا پھر بھی اُن کے خاوند، اُن کے پتی دیو، پرماتما روپ اور حسین ترین مرد ہوں گے

پھر یکایک جیسے انجن کے ٹھہر جانے پر گاڑی کے تمام ڈبے ساکت ہو جاتے ہیں، وہ ٹھہر گئی اُس کے پتی دیو، گاؤں کے ساہوکار، اُسے دو قدم پرے ٹھہرا کر ایک ڈبے کی طرف بڑھے۔ دروازے میں ایک فوجی کھڑا تھا۔ بہت سے آدمی سر کھڑکیوں سے باہر نکالے ہوئے تھے اور بہت سے اُس کی منتیں کر رہے تھے اُس کے پتی بھی اُس کے پاس گئے۔ التجا آمیز لہجہ میں بہت کچھ کہا مگر جواب میں وہ بولا "جگہ نہیں ہے لالہ"!

شاماں دو قدم پرے کھڑی گھونگھٹ میں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی اُسے اپنے پتی دیو پر رحم آ رہا تھا۔ گاؤں میں وہ ساہوکار تھے اور کوئی اُن سے بڑھکر بات بھی نہ کرسکتا ہے۔ کیا وہ اسٹیشن پر آنے ہی اتنے ہیٹے ہوگئے ہیں اُسے وہ بیل گاڑی یاد آگئی جو اُنہیں وہاں لائی تھی۔ جب اُس کے پتی دیو نے ایک اٹھنی گاڑی بان کو دی تھی تو اُس نے کتنی دعائیں دی تھیں۔ ساہوکار جی! بھگوان آپکی عمر لمبی کرے۔ مایا آپکے قدم چومے بھگوان آپ کو ایک چاند سا بچہ دے ... وہ مارے شرم کے سمٹ سی گئی تھی مگر یہ تو بالکل عجیب معاملہ ہے پیسے دے کر بھی سوار ہونا نصیب نہیں ہوتا۔ اُس کے پتی دیو ناکام واپس آ رہے تھے۔ اور اُن کے قدموں سے ناامیدی ٹپک رہی تھی......

وہ اپنے پتی دیو کے پیچھے چلی جا رہی تھی۔ اور لوگ بدستور ادھر اُدھر گھوم رہے تھے، اُس کے پتی پھر ایک ڈبے کے سامنے رُکے۔ دروازے میں فوجی ہی کھڑا تھا۔ جس کے بڑے بڑے بوٹ کہہ رہے تھے ہم نے ملایا کی سیر کی ہے سنگاپور میں خون پسینہ ایک کیا ہے۔ ہم نے جنگ جاپان جیتی ہے، یہ ہمارے مالک کو اتنا بھی حق نہیں کہ وہ آرام سے سفر بھی کرسکے ... وہ ڈر سی گئی جیسے اُسکے پتی دیو کو پھر سے ناامید ہونا پڑا ہو۔ مگر خلافِ قیاس فوجی نے اُس کے پتی دیو سے پوچھا "کہاں تک جاؤگے لالہ اور کیا یہ مائی بھی تمہارے ساتھ ہے"۔ اُس کے پتی نے جیسے امرت کے چند گھونٹ پی کر اندر دیوتا سے کہا ہو بھگوان تمہارا بھلا کرے، مگر فوجی نے اپنا پورا جواب نہ پاکر اپنا سوال دہرایا، اُس کے پتی دیو نے کہا "مجھے دو چار

اسٹیشن جاتا ہے۔" اُس نے دروازہ کھولا اور آدمی بھی اندر آنے لگے مگر فوجی نے روکا۔ پھر بھی دو چار اندر گھس ہی گئے آدمی سمٹ کر بیٹھ گئے اور وہ اپنے پتی دیو کے پاس دبک کر بیٹھ گئی جیسے ایک مرغی نے سردی سے سکڑ کر اپنے پروں کو سمیٹ لیا ہو۔ ..

خوانچے والے سے اُس کے پتی دیو نے اسٹے دو روٹیوں پر دال رکھوا کر دی۔ تھوڑے سے تامل کے بعد اُس نے باہر کی طرف منہ کرکے کھانا شروع کیا۔ وہ کھا تا تھی کھا رہی تھی اور سامنے بھی دیکھ رہی تھی۔ اتفاق سے سامنے ڈائننگ روم تھا۔ ایک بنی ٹھنی عورت آئی اُس نے جالی دار دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی، دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ وہ بالکل حیران رہ گئی۔ ایک منٹ کے دوران میں اُس نے کیا کیا دیکھا۔ خوبصورت میزوں پر نفیس برتنوں میں چُنے ہوئے کھانے۔ خدمت کے لئے کمر بستہ بیرے۔

سورگ تو ہوگی یا نہیں مگر ان لوگوں کے لئے تو یہی سورگ ہے۔ راجہ اِندر کے پرستان کے دیوتاؤں اور اپسراؤں کی فرضی تصویریں اس کی نظروں میں گھوم گئیں۔ اُسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی، وہ بھی چاہتی تھی کہ کسی کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہوئی کھانا کھائے۔ اُسی نوجوان کے سُرخ و سپید ہونٹ اُس کی نظروں میں گھوم گئے اور سوکھی روٹی کا نوالہ اُس کے حلق میں اٹک گیا۔ اُس نے روٹی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اُس کے پتی دیو نے اُسے کھانا نہ کھاتے دیکھ کر بہت اصرار کیا کہ وہ کھالے اُسے بھوک لگی ہوگی مگر اُس کا جی متلا رہا تھا۔ اُسے اُس کھانے سے نفرت ہو چکی تھی۔ اُس کے لئے یہ کھانا بھی امرت بن سکتا تھا اگر اُس کے ساتھ کوئی نوجوان بیٹھ کر کھائے۔ اور ہنس ہنس کر باتیں بھی کرتا جائے۔

دو ایک شریف آدمی سامنے والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے صلاح دی کہ اُسے زنانہ ڈبے میں بٹھا دیا جائے۔ اُس کے پتی دیو نے کہا کہ زنانہ ڈبے میں تو تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں ہے۔ پھر اُنہوں نے خواتین کو ایک علیحدہ سیٹ پر بٹھانا تجویز کیا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ سمٹ گئے۔ اُس سیٹ کی طرف جاتے ہوئے اُس کی ٹانگ ایک نوجوان کے گھٹنے سے ٹکرا گئی، اُس کے دل نے جیسے ایک پھریری لی، لیکن وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ ہی گئی۔

اپنی جگہ پر پہنچ کر اُس نے مسافروں کا جائزہ لیا۔ فوجی ابھی تک دروازے میں کھڑا تھا۔ اور کبھی کبھی آنکھیں پھیر کر اُسے بھی دیکھ لیتا۔ گاڑی چلی تو وہ دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سوچنے لگی یہ لوگ جائیں گے کہاں۔ انہیں کیا کام ہے کیا وہ سب اُن کی طرح اپنے بھتیجوں کی شادیوں میں جا رہے ہیں۔ اُس کی نظر اپنے پتی دیو کے چہرے پر جا رکی۔ وہ اونگھ رہے تھے۔ گاؤں پھر اُس کی نظروں میں گھوم گیا۔ اُس کے پتی جب باہر والے کمرے میں (جسے گاؤں والے ساہوکار کی دُکان کہتے تھے) کھانا کھانے کے بعد جا بیٹھتے۔ حقہ گڑگڑاتے رہتے اور گاہکوں کی انتظار میں اونگھنے لگتے۔ وہ گھونگھٹ میں سے اپنے پتی دیو کی ٹوپی کو دیکھ رہی تھی جسے شاید بیاہ کے موقعہ پر اُن کی ماں نے شہر سے منگوایا تھا۔ اور اب اُس پر مصوّرِ قدرت نے ہر قسم کے شیڈ بنا دیتے تھے۔ نچلے کنارے پر گاڑھے اور اوپر اس سے ہلکے اور اُس سے اوپر اُس سے بھی ہلکے۔ وہ اُن کے ڈھیلے ڈھالے کوٹ کو دیکھ رہی تھی۔ اور اُن کی بڑھی ہوئی توند اُسے ایک آنکھ بھی نہ بھاتی۔ مگر وہ تو اُس کے پتی دیو تھے۔ اُس کے پرماتما، اُس کے سب کچھ۔

گاڑی لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے پاس سے بڑی تیزی سے گذر رہی تھی۔ اُس نے سر کھڑکی سے باہر نکالا اور پھر جلدی ہی اندر کر لیا۔ مگر ہوا کے تند جھونکے نے اس کا آنچل اُس کے شانوں پر گرا دیا۔ اُس نے جلدی سے دُرست کیا۔ دروازے سے لگا فوجی اُسے عجیب نظروں سے تاک رہا تھا۔ کیا اُسے دیکھنے کے لئے ہی اُس نے انہیں اندر آنے دیا ہے۔ ایک کونے میں بیٹھے نوجوانوں کے قہقہے بلند ہوتے جاتے تھے۔ کیا یہ پھبتیاں مجھ پر ہی کسی جا رہی ہیں۔ وہ سوچنے لگی۔ اگر مجھ پر ہی کسی جا رہی ہیں تو کیوں؟ اگر مجھ پر ہی ہنس رہے ہیں تو کیوں؟ اس لئے کہ میرا گھونگھٹ بہت لمبا ہے۔ اُس نے پاس بیٹھی عورتوں کو دیکھا تو کسی کے بھی گھونگھٹ نہ تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ گھونگھٹ تو کیا دوپٹہ تک اُتار پھینکے۔

اُسے پھر خیال آیا کہ یہ تو عین بے حیائی ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ اگر گھونگھٹ کو اُتارنا ہی تھا تو پہلے نکال کر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ خیر تھوڑا تھوڑا اوپر سرکا ہی دینا چاہیئے آہستہ سے اُس نے گھونگھٹ کو ذرا اونچا کیا اُس نے پرے کونے میں بیٹھے ہوئے نوجوان کو دیکھا۔ وہ بدستور باتوں میں مشغول تھے۔ اور کبھی کبھار قہقہہ بھی پڑ جاتا۔ وہ سوچتی کتنے خوبصورت ہیں یہ نوجوان اور سب سے خوبرو تو وہ ہے جو کونے میں بیٹھا ہے۔ سنورے ہوئے بال، فراخ پیشانی، دلکش خدوخال، باریک تراشی ہوئی مونچھیں۔ ادھر اس کے پتی دیو اُس کے پرماتما اُس کے سب کچھ، مگر بے ڈھنگا ڈیل ڈول۔ برسوں کی پرانی ٹوپی، بڑھا ہوا خط، غلیظ کپڑے، جس سے تیل اور مرچوں کی بُو آتی ہے۔ کتنا فرق ہے میرے پتی دیو میں اور اُس میں۔

اُس نے پھر سر کھڑکی سے باہر نکالا ریل کی پٹریاں بڑھ رہی تھیں اور چند قدموں پر سبز جنگلا نظر آ رہا تھا۔ گاڑی رُکی، نوجوان اُترنے لگے، وہ بھی اُترنے لگا، وہ حیران سی ہو گئی، اس کا جی ڈوبنے لگا جیسے دل میں ایک کسک سی رہ گئی ہو۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے برسوں کا مانوس پنچھی اُڑ چلا ہو۔ وہ سوچتی رہ گئی، اُس کے پتی دیو اُسے دیکھ رہے تھے۔ مگر وہ ماضی میں کھو چکی تھی، اُسے وہ دن یاد آنے لگے جب ایک وِدوان آیا تھا۔ جو ہر روز شِوالے میں رامائن کی کتھا کیا کرتا۔ کتنی مست تھیں اُس کی آنکھیں کتنی سُریلی تھی اس کی آواز۔ وہ جتنے روز وہاں رہا، کھانا تو اُنہیں کے ہاں کھاتا رہا۔ جب وہ کھانا کھانے بیٹھتا وہ خود پکاتی اور اپنے ہاتھوں سے پھلکے لا کر دیتی۔ وہ کتنی خوش ہوتی تھی اُسے کھانا کھلا کر۔ اُس کا جی چاہتا کہ وہ اچھے اچھے کھانے پکائے اور اُسے کھلائے۔ مگر چند ہی روز بعد وہ چلا گیا تھا۔ کتنا مختلف تھا وہ اُس کے پتی دیو سے۔ لیکن اُس نے کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

نہ جانے گاڑی کب اُس چھوٹے سے اسٹیشن سے چلی اور کتنا فاصلہ طے کر آئی۔ اُس کے پتی دیو باہر دیکھ رہے تھے اور اُس کے کانوں میں گاڑی کی آواز گونج رہی تھی۔ کھٹا کھٹ۔ کھٹا کھٹ اور اس کے ساتھ وِدوان کی سُریلی آواز میں گائی ہوئی چوپائیاں۔ گاڑی کی کھٹ کھٹ اور رامائن کی چوپائیاں۔ وہ لرز گئی۔

اُس کے ذہن میں دو نقش اُبھرنے لگے، جن میں سے ایک تو رام کا تھا اور دوسرا اُس کے پتی دیو کا۔ دھنش پہنے رام کی تصویر اُس کے دماغ میں اُبھرتی گئی اور دوسری طرف ترازو ہاتھ میں لئے اُس کے پتی دیو —— وہ ڈر گئی، اُس کا دماغ چکرانے لگا۔ وہ اپنے پتی اور رام میں امتیاز نہ کر سکتی تھی، کبھی رام کا دھنش اُس کے پتی دیو کے ہاتھ میں آ جاتا۔ اور کبھی اُس کے پتی کا ترازو رام کے کندھے سے جا لٹکتا۔ رام!... پتی دیو..... ترازو. . . دھنش! اُس پر سکتہ سا چھا گیا۔

وہ بیٹھے بیٹھے یکایک چونک پڑی۔ اُس نے ڈر کر اپنے پتی دیو کی طرف دیکھا مگر وہ خود ہی تو ڈکار رہے تھے۔ اُن کا منہ ایک گہرے غار کی طرح کھل گیا تھا۔ لوگوں نے اس طرف سے منہ پھیر لئے اور کئی ایک نے تو چہروں پر رومال بھی رکھ لئے، کمرہ بدبو سے بھر گیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ زمین پھٹ جائے یا وہ گاڑی سے کود کر مر جائے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ یہ اس کے پتی دیو ہیں۔ اُس کے دل میں اُن کے لئے حقارت اُمڈ آئی، اپنے پتی دیو کے لئے جنہیں ڈکارنا بھی نہیں آتا۔ وہ دل ہی دل میں جل بھن رہی تھی۔

گاڑی یکایک ایک اسٹیشن پر رُکی۔ باہر جنگلے کے پاس ایک خوبصورت نوجوان کھڑا تھا۔ شاماں نے باہر دیکھا، نوجوان بھی اُسے گھورنے لگا، اُس کی نظریں اُسے کہہ رہی تھیں۔ شاماں! گو میرے پاس دوسرے درجے کا ٹکٹ ہے مگر بیٹھوں گا تمہارے ہی پاس۔ وہ اندر دیکھنے لگی۔ پچھلے واقعات اُس کے لئے بیتا ہوا خواب بن گئے۔ گاڑی چلی تو وہ نوجوان گاڑی کے ڈبہ کے ڈنڈے کو پکڑ کر فٹ بورڈ پر کھڑا ہو گیا۔ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے کہا "اندر آ جاؤ کہیں گر نہ جاؤ" دروازے کے پاس بیٹھے ہوئے مسافر نے دروازے کے پاس پڑے سامان کو ذرا کھسکایا اور وہ دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اب بھی وہ نوجوان اُسے گھور رہا تھا۔ وہ بھی اُسے دیکھنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے شادی والے لڑکے کا تصور آ گیا۔ وہ سوچنے لگی وہ کتنا خوش ہو گا

وہ بھی اپنی شادی پر بہت خوش تھی۔ گو اور ست آنسو بہا رہی تھی۔ اس کے پتی نے اُس سے کہا۔ سامان اتار کر پلیٹ فارم پر آئے تو سہی، اُس نے ایک بے ڈھنگی سی لیتی ہیٹ کے نیچے سے نکالی اُس کے پتی ہلتے ہلاتے اور ساتھ والے مسافروں کو ہلاتے ہوئے اپنی جوتی پہننے لگے۔ جوتہ تو سب سے وہی کھا اور وہ اُس نوجوان جیسا سُرخ و سپید لوٹ۔ اتنے میں اسٹیشن آگیا، مگر تھا دوسری طرف، اُس نے مڑ کر دیکھا، نوجوان کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ واہ بھئی ہم نے تمہارے لئے اپنے درمیانے درجے کا آرام گنوایا اور تم ہو کہ جا رہی ہو۔

اُس نے دیکھا اور نوجوان سمجھ گیا۔ جیسے اُس کی نظریں کہہ رہی تھیں —— تم میرے پتی سے بہت خوبصورت ہو اور یہ مانا کہ میرے پتی کی توند بڑھی ہوئی ہے اُن کا کوٹ ڈھیلا ہے اُن کی ٹوپی میں بہت سے پیوند لگ گئے ہیں اور مجھ سے اچھا سلوک کبھی نہیں کر سکتے۔ وہ لمبی لمبی اور گندی ڈکاریں بھی لیتے ہیں۔ اُن کے کپڑوں سے تیل اور مرچوں کی بو بھی آتی ہے۔ مگر مقدس اگنی اور پاکیزہ منتروں نے مجھے اُن کے حوالے کر دیا ہے یہ میرے پتی دیو ہیں۔ میرے پرماتما۔ میرے سب کچھ!

نرگس :- ناول حضرت ایم۔ اسلم نے لکھا ہے جس میں ایک طوائف کی دردناک عبرت انگیز زندگی کے حالات بتائے گئے ہیں نہایت غم ناک کہانی ہے جس سے یہ بات معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی گناہ آلود زندگی گزارنے والی کے پہلو میں ایک حساس اور محبت کرنے والا دل دھڑکتا رہتا ہے۔ اور جب ایسا ہوتا ہے تو اُس کی تباہی اور بربادی کس طرح ہوتی ہے یہ سب کچھ آپ کو نرگس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔ مجلد، گرد پوش سے آراستہ ہے
قیمت دو روپے (عہ)

گنہگار :- ادیب شہیر حضرت ایم۔ اسلم کے سات جدید افسانوں کا مجموعہ، قیمت عہ!

ساقی بکڈپو دہلی سے طلب کیجیے!

احمد ندیم قاسمی

احیاء

جل چکا باغِ ارم، یادِ ارم باقی ہے
ابھی وجدان میں تخلیق کا دم باقی ہے

کھل گئے پھول اُڑتی ہوئی ظلمت میں مگر
تیز خوشبو سے گلستاں کا بھرم باقی ہے

کنج کے سامنے انگڑائی سی لیتا ہوا پیڑ
کھو چکا ہے، مگر اک نرم سا خم باقی ہے

موج مدہوش سہی، موت نہیں مدہوشی
یہ بتانے کو حبابِ لبِ یم باقی ہے

نصف شب تک نہیں محدود تماشائے جمال
ٹوٹتی رات کے تاروں کا جنم باقی ہے

شمع خاموش سہی، نور سے عاری تو نہیں
آہ محبوس سہی، شیوۂ رم باقی ہے

بُت تراش اپنی عبادت میں مگن ہیں، جب تک
تودۂ سنگ و تقاضائے صنم باقی ہے

ذوقِ تجدید ہی جس دل میں، تو مید نہیں
رات کیا، آمدِ خورشید کی تمہید نہیں

صفیہ سلطان جہاں بیگم رعنا

"عید"

"دیکھ اگر نہیں سُنے گا تو اچھا نہ ہوگا" میں نے جل کر کلّو سے کہا۔

"اچھا نہ ہوگا" اُس نے بے باکی سے میری نقل اُتارتے ہوئے مُنہ چڑایا۔

"بہت سر پہ چڑھا چلا جا، اتنی جوتیاں ماری ہونگی کہ ساری گرمی نکل جائے گی" میں نے اس کو پھر مرعوب کرنا چاہا۔

"بڑی مارنے والی آئیں جاؤ ہم نہیں جاتے رقعہ برزہ لے کر اس چڑیل کے یہاں" وہ اکڑ کر بولا۔

"کیا موئے حرامزادے سچ مچ شامت تو نہیں آئی، موت آئے تجھکو ابھی کیا ہوا ہے اوقات بھول گیا ہے تو ورکیا اب نادرہ اس لئے ہوگئی کہ یہ کمبخت چڑیل کہے اللہ کی تیری شان چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل" مجھے سچ مچ غصّہ آگیا۔

مگر وہ اکڑتا ہوا یہ جا وہ جا۔ ڈور کی چرخی اور بہت ساری بھری لال رنگ برنگی پتنگیں لئے ہوئے گھر ہی سے چلتا بنا، اور میں اپنا سا مُنہ لے کر رہ گئی، میں نے طے کر لیا آج اس کو اس وقت تک کھانے کو نہ دونگی جب تک یہ نہ کریگا اور سو مرتبہ اُٹھا بیٹھی کان پکڑ کر نہ کریگا۔ میں بھری بیٹھی تھی کہ خالہ جان جو اندر کے کمرے میں نماز پڑھ رہی تھیں، بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل آئیں۔

"لو کو یہ کیا ستم ہے کہ نوکر کو ہر وقت کھائے جاتی ہو، بات بات پر جوتی پیزار، جبھی تو کوئی دس دن ٹکتا نہیں ہے"

"خالہ جان آپ تو ہر وقت جائز ناجائز اسی کی طرفداری کیا کرتی ہیں، آپ ہی کی شہ پر وہ اس قدر بے باک اور بد زبان ہو گیا ہے" میں نے مُنہ بسورتے ہوئے زخمی شیرنی کی طرح جواب دیا۔

"واہ واہ واہ! یہی تعلیم تمہارے اماں باوا نے دی ہے کہ زبان چلاؤ، ذرا بہت نہ بڑھ چلو ابھی کیا ہوا ہے ہم پر بھی اعتراض ہونے لگے"

"میں اعتراض تو نہیں کر رہی ہوں"

"نہیں نعوذ باللہ قرآن پڑھ رہی ہو"

"تو میں روز روز کی نوکر کی بدزبانی نہیں سُن سکتی" میں نے رو کر کہا۔

"اے توبہ لٹّو ہوئے کیا جاتی ہو، میں تمہاری اس مکّاری کو جوتی کی نوک پر مارتی ہوں" وہ اٹھلا کر بولیں۔

"تو مجھکو ہوسٹل بھیج دیجئے" میں نے روتے ہی ہوئے کہا۔

"بسم اللہ جائیے نا؟ وہ تو میں جانتی ہی ہوں کہ موت کا چلّو ہاتھ میں ہوگا، رشیدہ باجی کی اولاد ہو نا"

"تو اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے، میری وجہ سے آپ کے نوکر نہیں ٹکتے میں سب کا پیچھا لیا کرتی ہوں تو میں ہی اپنا مُنہ کالا کر جاؤں نا؟"

"ارے کل کا کوتی آج اور ابھی مُنہ کالا کر جاؤ میرے ٹھینگے سے"

"مُنی کی اماں ذرا تانگہ تو لے آؤ" میں نے نوکرانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ذرا جلدی لا دو تانگہ" (نوکرانی سے مخاطب ہوتے ہوئے وہ بولیں) میرا کیا ہے تم ہوسٹل کیا کسی گھر پر جا رہو کٹے گی تمہارے اماں باوا کی"

"آخر کسی صورت چین ہی نہیں ہے" میں نے تلملا کر کہا۔

"نہیں چین کیوں نہیں، چین تو قمر کے یہاں ملے گا۔ یہاں کہاں"

"قمر تو بھائی جان کا دوست ہے مجھکو بہن کہتا ہے! وہ بھی بُرا ہو گیا"

"نہیں بُرا کیوں ہو گیا کلیجے کی ٹھنڈک ہے کیڑے تو کلّو میں پڑ گئے ہیں جو خط نہیں لیجاتا ہے"

"خط کسی مرد کو بھیج رہی تھی جو یہ آپ کہتی ہیں"

"مردوں ہی کو بھیجوگی تو میں کیا کر لونگی، ابھی تانگہ منگوا

رہی ہو تو میں کیا روک سکتی ہوں۔"

" تو مجھکو آخر جوتی بنا کر اس کلو کے بچے نے کیوں پہن لیا ہے۔"

" تو بیگم وہ کوئی غلام گٹا تو ہے نہیں جو اُٹھتے جوتی بیٹھتے لات سہا کرے، بچہ ہے اُس کا جی چاہے گا کام کر دیگا نہیں چاہے گا نہیں کریگا۔"

" تو گویا من مانی ہوتی۔"

" ہے ہی۔" یہ کہکر وہ مغرب کی نماز پڑھنے چلی گئیں۔

میں نے غصّہ کے مارے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا، سردی بھی زور کی تھی اپنے کمرے میں پڑکر سو گئی، صبح صبح نادرہ آ گئی اُس نے ٹھیل ٹھیل کر پوچھنا شروع کیا "یہ مُنہ کاہے کو پھولا ہے؟ کوئی یاد آ رہا ہے، جوتیاں ماری ہیں خالہ جان نے۔"

"جوتیاں تمہارے لگی ہونگی۔" میں نے ہنسکر کہا۔

" اور مُنہ کیا ہو گیا سرکار کا۔" (واہ ری میری رفو رفیعہ کو پیار میں وہ رفو کہتی تھی)

" اوچ، میرے دشمنوں کا مُنہ کیا ہو جاتے۔"

"گویا کلو یا خالہ جان کا۔"

" میرے دشمنوں کا۔"

" ہم بھی تو سمجھ لیں آپکے دشمنوں کو۔"

اتنے میں خالہ جان گرجتی ہوئی اپنے کمرہ سے نکلیں۔

"بارہ بج گئے اور بی صاحبہ کی صبح نہیں ہوئی، نہ گھر بار سے غرض ہے نہ پڑھنے لکھنے سے، بس صبح ہوئی یاری آشنائی کے دکھڑے شروع ہو گئے، تیری میری ہونے لگی، اماں باوا نے بھیجا ہے کہ بیٹی تیر مار آئیں اور بیٹی کو تاک جھانک چھوچھوی سے فرصت نہیں ہے، مصاحب صبح ہی حاضر ہو گئے (نادرہ سے) ارے بھئی آخر تم لوگوں نے میرے گھر کی خاک کیوں لے ڈالی ہے کالج کے چھ گھنٹے کچھ کم ہیں، جو دن رات سوتے جاگتے گھر پر بھی پہرا ہے، اگر ایسی ہی مامتا ہے تو اُٹھا لیجاؤ اپنے گھر میں بھی تو دیکھوں کے دن رکھتی ہو۔"

"خالہ جان میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی کہ آپ بگڑ پڑیں۔"

" نہیں صاحب وہ تو ہم پاگل ہیں، لوگوں کو خواہ مخواہ ڈھیلے مارتے پھرتے ہیں۔"

" نہ تو میں نے نہیں کہا، آپ خود جو دل چاہے کہیئے۔"

" ہم نہیں کہیں گے اور کون سڑک والے کہنے آئیں گے، ذرا درازی تو دیکھو۔"

" اے لاحول ولاقوۃ، آپ تو بیکار خفا ہو رہی ہیں، اگر میرا آنا ناگوار ہے تو میں جاتی ہوں، معاف کیجئے گا۔"

" لاحول پڑھنا اپنے ہونوں سوتوں پر۔ ہاں مت آنا کم اس دہلیز پر، آتی ہیں تو ٹکسال دے جاتی ہیں۔"

" تو اشرفیاں لے بھی نہیں جاتی ہوں۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

" تو کاہے کے لئے صبح شام پھیرے ہوتے ہیں کون سے خصم پوت کا دکھڑا ہوتا ہے ہم بھی تو سُنیں۔"

" دیکھئے خالہ جان گالیاں دیجئے گا رفیعہ کو میں آپ کا دیا تو کھاتی نہیں ہوں، یہ اُلٹے بیچ کی باتیں مجھے ناپسند اور سُنیئے خواہ مخواہ کہا آؤ بہن لڑیں، وہ بولیں لڑے میری بلا، کہا بلا لگے تیری جان کو، لو صاحب لڑائی ہونے لگی آ میں جاہل تو ہوں نہیں نہ میرا دماغ اس لئے ہے کہ بچی کہ جائے، لیجئے میں جا رہی ہوں۔"

"ہاں ہاں وہ تو سب اسی مُردار کی کارستانی ہے رتی رتی گھر کے دکھڑے رو رہی ہے نہیں بیوی تمہاری کیا مجال تھی اور مُنہ میں کے دانت تھے جو ایسی اٹھلا کر اوچھی باتیں کرتیں، جاہل جاہل!! ابھی کیا ہوا ہے عقل چرخ ہو گئی ہے، ذرا سا ساڑھی باندھ لی، جمپر پہن لیا، سینڈل پہن لی، مُنہ پر پاؤڈر تھوپ لیا، پٹھے دار بال بنا لئے، انگریزی کے دو بول پڑھ لئے، اپنے کو افلاطون سمجھنے لگیں۔"

" ہیں ہی افلاطون، جمپر، ساڑھی، سینڈل پاؤڈر کوئی خیرات مانگ لائے ہیں۔"

" جی نہیں بڑی محنت کی کمائی ہے۔" وہ مٹک کر بولیں

" دیکھئے خالہ آپ پھر اسی قسم کے رکیک جملے استعمال کئے جا رہی ہیں۔"

" اری چل چل، بڑی آئی وہاں سے وہ بنکر چل لمبی۔"

" رفو ہم جاتے ہیں اب کالج میں ملیں گے۔" نادرہ رودو ہو کر بولی۔

" ہاں ہاں جائیے، انا للہ و انا الیہ راجعون۔"

"خالہ جان اجازت دیجئے اب میں گھر جا رہی ہوں چھٹیاں ہوگئی ہیں، والدہ سے کچھ کہلانا ہو تو بتا دیجئے اطمینان سے سُن لوں نہیں تو کاظم بھائی آئیں گے تو آتے ہی جلدی جلدی کرنے لگیں گے۔" میں نے گرمی کی چھٹیاں شروع ہوتے ہی ایک دن خالہ جان سے کہا۔

"مجھے بس یہی کہنا ہے کہ وہ تم کو جلدی سے واپس بھیج دیں میرا دل نہیں لگے گا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کل سے کلوا الگ غمزدہ بنا بیٹھا ہے تم جا رہی ہو افسوس اس کو ہے، دیکھو کتنا بیاہنا ہے تم کو اور تم ہو کر اس سے برابر لڑا کرتی ہو۔"

"وہی لڑتا ہے مجھ سے خالہ جان، مکاری کر رہا ہے اب، در اصل آپ کا سارا کام کرنا پڑے گا نا؟"

"ارے چلو رہنے دو، تم کو تو چلی گئی، میں بنانا آتی ہیں وہ موا نہیں نہیں کہہ کر مرا جاتا ہے اور یہ سر چڑھی جاتی ہیں"

"آپ نے صحیح فرمایا خالہ جان میں ہی غلطی پر تھی۔" میں نے یہ سوچ کر چلتے وقت کون ہاتھ ہاتھے کرے کہہ دیا۔

"(خوش ہو کر) دیکھو جب بریلی سے آنا تو دو چار روپیہ کا کچھ لیتی آنا اور ہو سکے تو بدایوں سے پیڑے ضرور منگوا لینا اس کو بہت پسند ہیں، جب ہر وقت بچوں کا دل ہاتھ میں رکھتے ہیں تب وہ رہتے ہیں۔"

"صحیح فرما رہی ہیں آپ۔" میں نے پھر اپنے جذبات کا گلا گھونٹ دیا۔

کاظم بھائی شام کی گاڑی سے آئے خالہ جان نے بہت روکا مگر وہ نہ رُکے اور مجھے لے کر گھر چلے آئے۔

ابکی بار چھٹیاں گذارنا دو بھر ہوگیا، ہر دوسرے دن خالہ جان کا خط دھرا ہے کہ جس جلدی چلی آؤ میرا دل نہیں لگتا تمہارے بغیر، گھر کاٹے کھاتا ہے میں دیوانی ہو جاؤں گی، یہ اور وہ، میں حیران تھی کہ آخر خالہ جان کو اتنی مامتا کہاں سے اُمڈ آئی اور وہ کیوں اتنی مہربان ہوگئی ہیں، مگر میں نے طے کر لیا تھا کہ ابکی اُن کے یہاں نہ رہوں گی البتہ پندرہ بیس دن پہلے پہنچ جاؤں گی اور کسی نہ کسی بات پر لڑ جھگڑ کر الگ ہوسٹل میں جا رہوں گی، والدہ سے بھی ہوسٹل کی اجازت لے لی ہے اور اپنے واسطے ہوسٹل میں بھی سیٹ بک کرا لی تھی۔

آخر میں دس دن پہلے خالہ کے یہاں پہنچ گئی۔ تانگے سے اترتے ہی اُنہوں نے کلوا کو آواز دی، اے کلو میاں لو تمہاری بی آگئیں۔

"کہاں کہاں ہیں کب آئیں۔" وہ بوکھلا کر اندر والے کمرہ سے نکل پڑا۔

"دیکھو بیٹی نمائش ہے تمہارے جگر کو، ہم لوگ تم کو دیکھی نہ آتے یہاں کلو میاں نے کئی دن تک کھانا نہیں کھایا۔" وہ بولیں۔

"جی۔۔۔" میں نے ذرا جی کو کھینچ کر کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کاظم بھائی ابکی دو دن رہے مگر خالہ ہی کے کمرے میں دن رات گھسے رہتے تھے، کلوا کا منہ پھول کر کپا ہوتا جاتا تھا، بات بات پر نکل جانے کی دھمکی دیتا اور خالہ اس کو گھنٹوں رو رو کر مناتی تھیں، رات کو بھی کاظم بھائی دیر سے خالہ کے ساتھ سینما دیکھ کر آتے تھے، خالہ کلوا کو ساتھ نہ لے جاتی تھیں، مگر کلو کا پتہ اس وقت تک نہ رہتا جب تک خالہ سینما سے واپس نہ آجاتیں۔۔۔ آخر کاظم بھائی جانے لگے مگر خالہ نے ابکی اُن کو سنہرا اور رو پہلی کا کپڑا، شال، ٹوائلٹ باکس، سینٹس، سگریٹ کیس، پانوں کی ڈبیا اور بہت سا نقد روپیہ دیا اور آبدیدہ ہو کر رخصت کیا۔۔۔ کلوا مگر خالہ سے بہت خفا تھا۔۔۔!

ہماری یہ خالہ ہماری ماں سے بہت چھوٹی تھیں اور کاظم بھائی سے صرف چار سال بڑی، ان کی شادی بچپن میں ہوگئی تھی مگر ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ بیوہ ہوگئیں، ہمارے یہاں دوسری شادی معیوب خیال کی جاتی ہے دوسرے خالہ اس کو بُرا بھی خیال کرتی تھیں اس وجہ سے یہ اور بھی کنواری ہی تھیں!

آج جو خالہ سو کر اُٹھیں تو اُن کی آنکھیں لال تھیں معلوم ہو رہا تھا کہ خالہ تمام رات روتی اور جاگتی رہی ہیں۔ صبح اٹھ کر اُنہوں نے کلوا کو کلو میاں کہہ کر آواز دی۔

"کیا ہے کیا؟" کلوا نیچی چارپائی پر پڑے پڑے بولا۔

"ارے ذرا میرا سر دبا دو میاں، میری طبیعت نہیں ٹھیک ہے"
"تو میں کیا کروں، میری طبیعت جب سے کاظم بھیا گئے ہیں آپ خراب ہے۔" وہ بولا۔

میں متوجہ تھی کہ آخر کاظم بھائی پر اچھی خالہ جان اس قدر مہربان کیوں تھیں، اور یہ کلو کیوں خفا تھا اور اب تک خفا ہے۔ مگر میری سمجھ میں خاک نہ آیا، غور کرتے کرتے میں تھک گئی، آج کلو تمام دن باہر لونڈوں میں آوارہ گردی کرتا رہا اور خالہ اپنے کمرے میں پڑی رہیں، غالباً کسی وجہ سے وہ رو رہی تھیں۔ دو دن تک یہی عالم رہا، تیسرا دن تھا شام ہو چکی تھی میں اپنے کمرہ سے اٹھ کر خالہ کے ڈرائنگ روم میں ٹیبل لیمپ لینے جو گئی تو ان کے سونے کے کمرے سے کلو کے لڑنے کی زور زور سے آواز آ رہی تھی دروازہ بند تھا، میں دراڑ میں سے چھپ کر ان کی گفتگو سننے کی کوشش کرنے لگی۔

"اور کیا، وہ سالا کاظم کا بچہ ہم سے اچھا ہو گیا، کل تک ہم ہی ہم تھے آج دودھ کی مکھی ہو گئے۔" کلو خالہ کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ارے تم تو بلاوجہ کا شک کر رہے ہو، تمہاری خاطر تو اس چڑیل کو بلا کر رکھا ہے۔" وہ بولیں۔

"چڑیل چڑیل، وہ رفیعہ ذرا اپنی اور اس کی صورت آئینہ میں ملاؤ۔"

"تو پھر تمہاری ہی وجہ سے کاظم کی اتنی خاطر کی اور تم ہی شک کر رہے ہو۔" وہ گڑگڑا کر بولیں۔

"چلو بس رہنے دو، الّو کسی اور کو بنانا اٹھارہ برس کا ہونے آیا اب بچہ تھوڑی ہوں سب سمجھتا ہوں۔"

"اپنی جان کی قسم سب خیال ہے تمہارا۔" وہ بولیں۔

"اپنے دیدوں سے دیکھا ہے وہ بائیسکوپ میں سب، بس رہنے دو۔"

"ارے وہ تو مجھے یہ بتا رہا تھا کہ انگریز ایسے کرتے ہیں دلہن کو پیار، وہ میرا بچہ ہے۔"

"خیر بچہ تو میں بھی ہوں دنیا کے سامنے۔"

"ارے تم تو خفا ہی ہوتے چلے جا رہے ہو۔" یہ کہہ کر انہوں نے کلو کو اپنے اوپر کھینچ لیا۔

میں نے جلدی سے سانس روک کر اپنے کمرے کا رخ کیا، میرا دل ملعون اچھل رہا تھا۔ کاظم بھائی پر عنایتوں کی بارش اور کلو کی یہ ساری شکایتیں، میرے بلاوے اور محبت سب میری سمجھ میں آ گیا تھا، میں نے جلدی سے اپنے کمرہ کی کنڈی اندر سے بند کر لی مگر پھر بھی رات بھر نہ سو سکی، وہی لعنت میرے سامنے گھوم رہا تھا، کلو کی بدزبانیاں خالہ جان کی خوشامد پھر وہ کھینچ لینا اور چینچنے کیا کیا۔ توبہ! میں دیوانی ہوئی جا رہی تھی صبح اٹھ کر میں پرنسپل صاحبہ کے بنگلہ چلی گئی اور سامان بھی وہیں منگوا لیا۔

کاظم بھائی اب مجھ سے بہت محبت ہے وہ ہر سنیچر کو مجھے دیکھنے آ جاتے ہیں، خالہ ہی کے یہاں ٹھہرتے ہیں اور مجھ سے ملے بغیر چلے جاتے ہیں، مگر پھر بھی وہ برابر آتے ہیں۔ اور کلو نے فوج میں نام لکھا لیا ہے۔ مگر خالہ پھر بھی خوش ہیں! اب ان کی زندگی ایک مستقل عید بن کر رہ گئی ہے۔

ریزۂ مینا

اردو کے بہترین پچاس افسانوں کا مجموعہ، سنہ ۳۰ء سے سنہ ۴۷ء تک ساقی میں سینکڑوں افسانے شائع ہوئے۔ انہی منتخب افسانوں میں سے شاہد احمد دہلوی نے پچاس افسانے انتخاب کئے ہیں۔ مشہور نقادوں کی رائے ہے کہ جدید اردو افسانے کا ایسا کوئی اور مجموعہ شائع نہیں ہوا جو ہمارے افسانے کی تدریجی ترقی کا آئینہ دار ہو۔ "ریزۂ مینا" افسانوی ادبِ اردو کے بحرِ ذخار میں ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کتاب نایاب تھی۔ اب پھر بڑے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ ضخامت (۵۵۰) صفحے۔ مجلد اور خوشنما جلد پوش سے آراستہ ہے۔ قیمت پانچ روپے (۵ روپے)

اپنے شہر کے مشہور کتب فروشوں یا

ساقی بکڈپو، دہلی سے طلب کیجئے

افضل تکمیل

کلرک

کردار

فیض . کلرک | آمنہ . راشدہ کی سہیلی
راشدہ . فیض کی بیوی | الیاس .. فیض کا بیٹا

پہلا سین (راستہ)

راوی:-
فیض تنخواہ لے کے دفتر سے — حاصلِ ماہ لے کے دفتر سے
اک شکستہ بہار کی صورت — زخم خوردہ شکار کی صورت
ہولے ہولے قدم اُٹھاتا ہوا — اپنی قسمت پہ پیچ کھاتا ہوا
سوچ کی راہ سے گذرتا ہوا — دل ہی دل میں حساب کرتا ہوا
اپنے گھر کی طرف رواں ہوا
کھبل دفتر کا اک فسانہ ہوا

دوسرا سین (فیض کا گھر)

راوی:-
فیض غم سے نڈھال بیٹھا ہے — ماورائے خیال بیٹھا ہے
رنگ چہرے پہ آئے جاتے ہیں — سوزِ دل کا پتہ بتاتے ہیں
خامشی ترجمانِ حسرت ہے — ہر نظر داستانِ حسرت ہے
راشدہ مسکرا کے کہتی ہے — فیض کے پاس آ کے کہتی ہے

راشدہ:- کس تصور میں گم ہو بولو کچھ — خامشی کے کواڑ کھولو بھی
بات کیا ہے نڈھال سے کیوں ہو — اسقدر پائمال سے کیوں ہو
کیوں ہیں چہرے پہ غم کے سائے سے — آ رہے ہو نظر پرائے سے

فیض:- کیا بتاؤں کہ دل کا حال ہے کیا — میرے ہیتی نظر سوال ہے کیا
ڈس رہا ہے خیال بیٹے کا — ختم ہے آج سال بیٹے کا

الیاس:- ماردواڑی بھی آج آیا تھا — اور بڑے رعب سے بلایا تھا

فیض:- اُس کی میعاد بھی تو پوری ہے

الیاس:- قسط دینا بہت ضروری ہے

راشدہ:- خیر ہوگی نہ اتنا گھبراؤ

(دروازہ کھلتا ہے)

فیض:- کون آیا ہے

راشدہ:- آمنہ

فیض:- آؤ

خیر ہے بدحواس سی کیوں ہو

راشدہ:- آج اتنی اُداس سی کیوں ہو

آمنہ:- میرے بھائی کا تار آیا ہے — جانے کیا بات ہے بُلایا ہے
وہم دل کھا رہے ہیں سینے میں — زلزلے آرہے ہیں سینے میں
میرے بس میں مرے حواس نہیں — پھوٹی کوڑی بھی آج پاس نہیں
تم کرایہ اگر مجھے دو گی — اے بہن مجھ کو مول لے لو گی

راشدہ:- مجھ سے کہتی ہو میرے پاس کہاں — چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

آمنہ:- غم نہ کوئی کرو میں دیدوں گی — جب وہ آئیں گے اُن سے لے دوں گی
میرے وعدے کا اعتبار کرو

راشدہ:- یوں نہ رہ رہ کے شرمسار کرو
جبھی تنخواہ یہ تو لیتے ہیں — قرض خواہوں میں بانٹ دیتے ہیں

فیض:- راشدہ! آمنہ کو دس دے دو
(وقفہ)
سوچ کس بات کی ہے بس دیدو

راشدہ:- اچھا یہ لو بہن اُداس نہ ہو
(آمنہ کو دس روپے کا نوٹ دیتی ہے)

فیض:- (آہ بھر کر) ہائے وہ! کچھ بھی جس کے پاس نہ ہو
(آمنہ کا جانا)

راشدہ:- کیا کہوں میں یہ کیا کیا تم نے — مجھ کو شرمندہ کر دیا تم نے
میرا انکار اک مذاق نہ تھا — کیا الم اُس کا مجھ پہ شاق نہ تھا
آہ کتنا خیالِ خام تھا یہ — کوئی احسان کا مقام تھا یہ

فیض:- اس قدر زر سے تجھ کو پیار نہیں — توڑنا دل مرا شعار نہیں
آس لے کر غریب آئی تھی — چند پیسے تھے کیا خدائی تھی
اس میں احسان کا سوال نہ تھا

راشدہ:- تم سے پوشیدہ گھر کا حال نہ تھا
دودھ والے کا بل بقایا ہے — آج دو مرتبہ وہ آیا ہے
اختری کی قمیض لینی ہے — فیس الیاس کی بھی دینی ہے

فیض:- راشدہ تم سے شرمسار ہوں میں — ایک بے کیف سی بہار ہوں میں
میری غربت سے ہے گلا تم کو — میرے گھر آ کے کیا ملا تم کو
زیست ٹکرائی بدنصیبی سے — ہر خوشی دب گئی غریبی سے

راشدہ:- باتیں اب کس لئے بناتے ہو راز دل مجھ سے کیوں چھپاتے ہو
تم بھی اب مجھ سے چال چلتے ہو میری چھاتی پہ مونگ دلتے ہو
یہ خیالات یہ تمہارے بس جگ ہنسائی کراؤگے اک دن
تو یہ سمجھی ہو کسی گلوب تمہیں

فیض:- سب وہی ہیں یہ بات نہیں
کسی کوئی حسر ہوتی ہے سب کو عزت عزیز ہوتی ہے
لے نہ ڈوبے تمہیں یہ نادانی

راشدہ:- تم بڑے آئے تے حاتم ثانی
گھر میں فاقہ گلی میں حیرانی جانتی ہوں تمہاری سب باتیں

(دودھ والا آواز دیتا ہے)

فیض:- کس نے آواز دی ہے دیکھو تو دل میں چٹکی سی لی ہے دیکھو تو

(الیاس دیکھ کر کہتا ہے)

الیاس:- دودھ والے کا چھوٹا بھائی

فیض:- میرے اللہ تری دہائی ہے

راشدہ:- اس کو اب کون جا کے سمجھائے

فیض:- کہہ دو الیاس وہ نہیں آئے

راشدہ:- اس طرح کب وہ ٹلنے والا ہے کوئی بابو نہیں گوالا ہے
کب بہانوں کو مانتا ہے وہ آج ہی سے جانتا ہے وہ
اس موئی کو جو دس اگر دیتے اس مصیبت سے جان چھڑا لیتے
میری پروا ذرا نہ کی تم نے

فیض:- پھر وہی بات چھیڑ دی تم نے
کیوں وہ پہلی سی بات آج نہیں وہم کا تو کوئی علاج نہیں

راشدہ:- رہنے بھی دو کیسے بناتے ہو چٹکیوں میں مجھے اڑاتے ہو

فیض: دیکھو۔

راشدہ: جاؤ میرا نہ سر کھاؤ

دودھ والا:- فیض بابو ذرا یہاں آؤ
کب سے در پر کھڑا بلاتا ہوں

فیض:- ٹھہرو آتا ہوں بھائی آتا ہوں

(فیض کا باہر جانا)

پردہ

شکست ملک کے مشہور افسانہ نگار مسٹر کرشن چندر ایم۔ اے نے یہ ناول لکھا ہے ناول کا پس منظر بہشت نظیر کشمیر ہے کرشن چندر نے اس سرزمین حسن میں زندگی کے رومانی پھول کھلائے ہیں قیمت تین روپے۔ ساقی بکڈپو دہلی سے طلب کیجئے!

اختر رضی

لیٹے لیٹے

آج پھر برآمدے میں لیٹے لیٹے ہسپتال کی دیواریں آپریشن بلاک ہوگئی ہیں "بیمار نرسوں کے لئے ہدایات" والی تختی تحلیل ہوکر "آپریشن بلاک" کا پھر معلوم ہونے لگی ہے۔ باہر جب درخت ہوا سے لہراتے ہیں، تو وہی برآمدہ یاد آتا ہے جس میں میری آنکھوں نے تمہیں دیکھا تھا۔ میں آنکھیں بند کرلیتا ہوں، میری چادر پر تمہارے کومل ہاتھ بکھر جاتے ہیں۔ یہ وہی تصویر ہی تو ہے جو میرے ذہن نے اپنے اندر اُس وقت سمولی تھی جب تم آپریشن ہال کے باہر میرے آپریشن سے پہلے آئیں۔ تم نے آتے ہی سسٹر سے پوچھا "یہ کیس کس وارڈ کا ہے؟"

"ہاں"! اُس کی بھدی آواز تمہاری گداز آواز میں کھوگئی۔ میں نے غنودگی سے آنکھیں کھولیں۔ تم ٹھوڑی کی بائیں جانب ہاتھوں پر سہارا لئے کھڑی سامنے ہوا سے جھومتے درختوں کو دیکھ رہی تھیں، شاید اسی ہوا سے تمہاری لٹیں باہر لٹک گئی تھیں، سفید کپڑے کی ٹوپی میں سے تمہارے بال اُبھر کر بکھرتے اور بکھر کر اُبھر جاتے۔ میری طرف والے گال پر تین سفید سے نشان جو شاید کیلوں پر کوئی دوا لگانے سے ہوئے تھے، بھلے نہیں تو بُرے بھی معلوم نہ ہوئے۔ تمہاری آنکھیں رسیلی اور ناک پتلی، زیادہ اونچی نہ تھی۔ میں زیادہ دیکھ نہ سکا، آنکھیں بند رہی تھیں لیکن تمہارے وہاں ہونے کے احساس سے میں سو بھی سکا۔ میں پھر دیکھ رہا تھا۔ سفید ملبوس، جس پر سوائے نیلی پیٹی کے کوئی غیر دھبہ نہ تھا۔ سفید لباس ویسے بھی مجھے بہت پسند ہے اور پھر جب تم ایسی نوجوان لڑکی اِس طرح سامنے کھڑی ہو تو سب انتظار کی کوفت اور آنے والے آپریشن کی سب ہیبتیں اُڑ ہی گئیں، لیکن پھر بھی اپنا اثر دکھائے بنا نہ رہا، میں کچھ سوتا اور کچھ جاگتا ہی رہا۔

آپریشن ہال میں میری نگاہیں تمہاری جستجو میں رہیں گو آپریشن گلے کا ہی تھا، ڈاکٹر اسے معمولی کہتے تھے پھر بھی ہوتی، کلوروفارم دیا جا رہا تھا، نہ جانے کیا ہو، لوگوں کو آخری نظر میں دیکھ ہی لیتا۔ میری حالت یکایک خراب ہو گئی، دل گھبرایا، دورہ سا دھڑکا، سانس رکا اور پھر سے ٹھیک ہوگیا۔ اسی طرح اس نے کئی حالتیں بدلیں۔ — ڈاکٹر اور نرسیں، مسکراتے ہوئے۔ سعید گاؤن پہنے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے، ایک چپڑاسی میرے پاؤں کی طرف اوزار ٹھیک کر رہا تھا جس کی آواز نے مجھے پریشان کر دیا اور سب لوگ مجھے قصاب معلوم ہونے لگے۔ لیکن جب تم میرے قریب آئیں تو میری ڈھارس بندھی اور میں نے وہیں بڑے بڑے آخری نظر تمہیں دیکھا اور وابستگی محسوس کی۔ ایک ڈاکٹر نے میرے منہ پر ایک ٹوپی سی رکھی اور تم نے میرے بازوؤں پر ہاتھ رکھ دیے۔ ٹوپی کے اُوپر کچھ چھڑکا جس کی بو سے دماغ گھومنے لگا، میں نے ایک دم ہاتھ چھڑا کر ٹوپی اُتار دینا چاہی لیکن تمہارے بازوؤں کا خیال مجھے روکے رہا۔ میں اُن کا قرب محسوس کر رہا تھا، جکڑ رہا دد ہو رہے تھے اور

آج جب میں اُن احساسات پر غور کرتا ہوں تو مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔ میری "آخری نظر" تو کچھ بھی نہ تھی وہی حال اب ماضی ہے، ایک خواب ہے۔ کبھی کبھی جب سوچتا ہوں تو دُھندلے نقوش یکجا ہوکر بکھر جاتے ہیں بالکل اُسی طرح جیسے۔ سامنے ہوا سے لہراتے درختوں کی پتیاں ایک دوسرے کے پاس آکر بکھر جاتی ہیں، درخت جھومتے ہی رہتے ہیں اور میں سوچتا رہتا ہوں مسلسل ایک ہی سوچ، واقعات دُھندلے سے ہوگئے مگر تمہاری موہنی صورت اور بھی صاف۔ مجھے یاد ہے جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میری کلائی پر کچھ تھا اور تمہارا چہرہ گھوم رہا تھا۔ میری آنکھیں [illegible] یاد آیا نشے میں درد تھا، جیسے تم ہو۔ میں کچھ سمجھا، تم شاید دیکھ رہی تھیں آپریشن ہو چکا تھا۔ میں نے پھر آنکھیں کھولیں اور اِدھر اُدھر دیکھا،

میرے سامنے سبتوں والی الماری تھی، اُس کی داہنی جانب کھڑکی جس سے ذرا پرے ہٹ کر دروازہ یہی دروازہ صحن کو جاتا تھا، اس کے ساتھ ہی کواڑ دوسرے کمرے میں کھلتا تھا، میرے پاؤں کی طرف ہی برآمدہ تھا، جسے ہسپتال کا حصّہ تو کہہ سکتے ہیں فیملی سیٹ کا نہیں، میرے پلنگ کی بائیں طرف چارپائی پڑی تھیں اور سرہانے اور دائیں طرف بہنیں میں سمجھ گیا میں واپس آگیا تھا، اور تم جھکی ہوئی میری کلائی تھامے نبض دیکھ رہی تھیں، جب میری نظر تم پر پڑی تو تم مسکرادیں، اُف وہ مسکراہٹ! پکڑی ہوئی ہوگئے جیسے کبھی آئے ہی نہ تھے۔ اور وہی مسکراہٹ آج تک مجھے سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

آج اپریشن کو چوتھا دن ہے، تم دن میں دو تین مرتبہ آتی ہو۔ تمہارے ہاتھ میں ایک پلیٹ سی ہوتی ہے جس میں دو دوائیں ایک نیلی اور ایک لال، ایک سرٹ کی شیشی میں تھرمامیٹر، ایک روئی کا ٹکڑا ہوتا ہے میں لیٹے لیٹے جب پلیٹ کے پیچھے دھاروں کی طرح پھیلی ہوئی اُنگلیوں کو دیکھتا ہوں تو کئی آسنائیں اور تراتائیں ذہن میں سرایت کر جاتی ہیں۔ میرے سینے سے کچھ اُٹھتا ہے کان بولتے ہیں اور کنپٹیاں پھڑکنے لگتی ہیں چاروں طرف سے اندھیرا سا سمٹ کر تمہارے گرد چھا جاتا ہے جیسے تم ہی کائنات ہو، مجھے اور کچھ سجھائی نہیں دیتا، اور تمہاری مسکراہٹ! مجھے خیال ہی نہیں رہتا کہ چارپائی کے گرد امی اور بہنیں کھڑی ہیں۔ میں تمہیں دیکھتے دیکھتے سوچتا ہوں تھرمامیٹر دو منٹ کے لئے کیوں نہیں لگایا جاتا، ایک منٹ بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔ نبض کیوں اتنی تیز نہیں ہو جاتی کہ تم گن نہ سکو اور میرا ہاتھ تھامے رہو۔ مجھے افسوس ہونے لگتا ہے میرے گلے کا خون بہہ کر، جلدی بند ہو گیا، کچھ زیادہ بہتا، دو دن کی بجائے تم زیادہ دفعہ پونچھتیں تو تمہاری اُنگلیاں میرے ہونٹوں سے مس کرتیں۔۔۔

ابھی کل کی بات ہے، میرے دوست آئے ہوئے تھے کہ تم آئیں، مکھڑے پر مسکان تھی، اپنے انداز میں نبض دیکھ کر تھرمامیٹر لگایا اور ہنستی ہوئی واپس چلی گئیں۔ تم تو چلی گئیں لیکن، ہلچل سی مچ گئی، میرے دوست بولے "بھئی خوب رہے تم تو"

میں نے آنکھوں سے پوچھا "کیا ہوا؟" مجھے بولنا منع تھا۔

کہنے لگے "بس! بس گئے بیچاری کے دل میں"

میرے دل میں لہر سی پھیلی میں چُپ رہا۔

"بڑی معصوم ہے بیچاری، کیا بن ہے ظالم کا، اور کیا خدوخال ہیں" وہ جتنی دیر رہے۔ تمہارے حسن معصومیت اور خدوخال بنا منہ سے کچھ نہ نکلا۔ اور میرے ذہن میں خیالات کا ہجوم بڑھتا چلا گیا۔ اُن کے جانے پر گھڑی گھڑی الفاظ بجتے اور تم سامنے آجاتیں۔

کل ہی رات مجھے باہر برآمدے میں سونے کی اجازت بھی مل گئی۔ اندر گرمی تھی نا! اس لئے چارپائی باہر لگوائی، دن کو گرمی زیادہ رہی تھی جس سے رات کو آندھی چلنے لگی، دوست کی باتوں نے میرے اندر جھکڑ چلا دیئے تھے جن کی تندی سے میرے جذبات ہلکورے لے رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا میرے دوست اور قدرت نے مل کر سازش کر رکھی ہے۔ اندر کے ہیجان اور باہر کے طوفان سے نیند اُڑ گئی تھی، جب کوئی اونگھ میرا رُخ کرتی دونوں طرف سے روک لی جاتی۔ اُس سمے تم تھیں، جسے میں اپنے پاس لے آتا، اپنے بہت قریب۔ تمہارے گرد میرے دوست کے الفاظ ناچتے اور تم مجسم دلفریبی ہو جاتیں۔ پر آندھی کا جھونکا آتا اور تم کہیں دور برآمدے کے اندھیرے میں کھو جاتیں، جھونکا گذرتا تو کمروں میں سے چھنتی ہوئی روشنی سے تم اُبھرتیں، لیکن آندھی کی تیزی میں ایک ریلے سے پھر غائب۔ درخت جھومتے جیسے قہقہے لگا رہے ہوں میرا ہیجان اور بڑھ جاتا، یہ سب کچھ اتنی جلدی جلدی ہو رہا تھا، کہ مجھے اپریشن ہال کے چکر یاد آگئے، اسی چکر میں میں پاؤں مارتا ہوا تمہیں ڈھونڈھتا رہا، اور بے پناہ گڑگڑ، سان سان میں تمہاری گدا ز آواز کو ترستے رات کٹی۔

آج صبح جب ڈاکٹر صاحب نے بولتے ہوئے نہ ٹوکا تو میری ہمت بندھی اور میں تمہارا انتظار کرنے لگا۔ امی اور بہنیں بہت خوش تھیں اور میری تیمارداری میں بہت مصروف،

اور میں تمہاری راہ دیکھ رہا تھا تم آؤگی روز کی طرح، تو پھر اتنے دنوں سے رُکا ہوا سیلاب اپنے بند کھول دیگا، لیکن مجھے ڈر تھا کہ سیلاب بیجا نہ بہہ نکلے، میں اُسے قابو میں رکھنے کے طریقے سوچنے لگا۔ میں چھت والے پنکھے کو دیکھتا ہوا اپنے جذبات کو الفاظ میں ڈھالتا رہا۔ چھت کی کڑیوں پر ایک ایک بات کندہ ہوگئی اور میرے تکیئے نے مجھے ٹر ٹراتے سُنا۔ میں کہنے سے پہلے ریہرسل کر رہا تھا، تم آؤگی تھرمامیٹر تھامے، تمہاری مرمریں انگلیاں میرے ہونٹوں سے ذرا پرے رُک جائیں گی، میری پھڑکتی کلائی تمہاری نرم اُنگلیوں کی گود میں ہوگی، اور جھکی ہوئی گردن کلائی کی گھڑی پہ وقت دیکھے گی، تم جتنی دیر تھرمامیٹر نہ لگاوگی تجلتی ہوئی بیل کی طرح جھولتی رہوگی، پھر کلی کھلے گی اور تم دیکھتے ہی دیکھتے چارٹ پر نشان لگا کر چلی جاؤگی۔ شاید تم اس لئے نبض دیکھ کر مُسکرانی ہو کہ وہ ہمیشہ ہی تیز ہوتی ہے۔ تم نہیں جانتیں یہ اُس رُکا وٹ کا اثر ہے جو میں اپنے پر ڈالے ہوں، پھر اندر ہی اندر موجیں بند سے ٹکرا ہی جاتی ہیں۔ مگر آج تو بند کھل گئے تھے اور میں جذبات کو الفاظ پہنا رہا تھا۔

دروازے کی آواز سے سب چوکے ہوگئے، سب کی نگاہیں اُس طرف اُٹھ گئیں۔ میں ہمہ تن انتظار ہوگیا دل دھڑکا، مگر دوسرے لمحے بیٹھ گیا، تم نہیں تھیں وہ تو کوئی دوسری نرس تھی، میں کیا پوچھتا؟ تمہارے متعلق میں کوئی سوال نہ کرسکا۔ وہ آئی، تھرمامیٹر لگایا، نبض دیکھی اور چارٹ پر نشان لگا کر چلی گئی۔ یہ نرس کتنی بے نیاز تھی میری تکلیف سے، میری ذہنی کشمکش سے یہ آئی اور کام کر کے چلی گئی جیسے اس کے مُنہ میں زبان ہی نہ تھی اور وہ تھرمامیٹر کی طرح حرارت ہی دیکھنا جانتی تھی۔ تم سے بالکل مختلف، تم تو پھر بھی مسکراتی ہو، حال پوچھتی ہو اور شاید میری کشمکش کو بھانپ جاتی ہو۔ میں سمجھ نہ سکا یہ اتنی کٹھور کیوں ہے؟

آج دن کو گرمی بھی زیادہ تھی اور تم بھی نہ آئیں تو میرا کیا ہوتا، مجھے افسوس ہونے لگا۔ کاش مجھے بولنے کی اجازت نہ ہوتی اور میں کوشش ناکام نہ کرتا، میں نے کتنی دیر ذہن کو الٹ پلٹ کیا تھا "نہیں یہ لفظ ٹھیک نہیں کہیں وہ ناراض نہ ہوجائے۔ یہ غلط ہے مطلب واضح نہیں ہوتا۔ اتنے زیادہ الفاظ کی کیا ضرورت ہے یہ دو الفاظ ہی کافی ہیں۔"

اور جب میں نے باتیں مکمل کرلیں تو تم نہیں آئیں۔ اب میں پوچھ بھی نہ سکتا تھا "کیوں نہیں آئیں تم؟"
کوئی کہتا "تمہیں کیا ۔۔۔؟ تمہیں تو حرارت ہی دکھانا ہے کوئی سی نرس دیکھ لے"

افسوس ہے وہ یہی تو نہیں سمجھتے۔ اب خیالات کی بھرمار کیسے تھمتی، میں نے سونا ہی چاہا۔ امی بھی مجھے سونے کو کہہ رہی تھیں۔ لیکن یہ ڈر کہ تم کہیں آکر واپس نہ چلی جاؤ، میری باتیں دل ہی میں نہ رہ جائیں میں نے سونا بھی نہ چاہا۔ تم نے کئی مرتبہ یوں کیا ہے مریض کو جگایا نہیں جاتا نا ۔۔۔ میں خوب سمجھتا ہوں پر مجھے نہ جگانے سے تکلیف اور بھی زیادہ ہوتی ہے مگر یہ کون جانتا ہے؟ شاید تم بھی نہیں۔

آخر جب میں اُٹھا تم اُسی وقت اندر داخل ہوئیں۔ میں نے مُسکرا کر "ہیلو" کہا مگر آواز حلق سے باہر نہ نکلی اور تم نے مُنہ میں تھرمامیٹر رکھ کر کلائی تھام لی اور گھڑی دیکھنے لگیں۔ میری نظر کبھی تمہارے چہرے کے شفاف رنگ رنگین ہونٹوں اور معصوم سی آنکھوں پر کبھی تمہارے سفید ملبوس اور کبھی سپید بانہہ کے کالے فیتے والی گھڑی پر پڑ رہی تھی۔ ایک منٹ کونسی دیر ہے لیکن میرا ماتھا بولنے لگا تھا ۔۔۔ چارٹ پر نشان لگانے کو جھکیں تو میں نے ہمت کی، تم رُکیں، کائنات پھر سمٹ گئی الفاظ کھو گئے اور میں نے صرف "ٹمپریچر کتنا ہے؟" ہی پوچھ لیا۔ تم مُسکرا دیں اور "نارمل" کہہ کر باہر چلی گئیں۔ تمہاری مُسکراہٹ کتنی کیف آور تھی، ایک نشہ تھا ۔۔۔ سفید دانت، اُن کے گرد ہونٹوں کا حلقہ کس قدر سہانا تھا۔ اور پھر تمہاری گداز آواز ۔۔۔

سب کچھ میرے کمرے میں چھا گیا چارٹ پر تمہاری اُنگلیاں بچھ گئیں۔ دروازے کی دہلیز پر تمہاری پنڈلیاں کالی جرابوں میں، کالے بوٹوں پر ختم ہوتی ہوئی نقش

ہوگئیں میری کلائی سرلامبی، پتلی انگلیاں کسی نزی سے رکھی رہتیں۔ آنکھوں کے قریب وہ چہرہ جس نے مجھے "آپریشن بلاک" کے باہر ادھر اُدھر بکھرے ہوئے مسنوں چہروں سے ڈھونڈ کر اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ اور بلڈنگ کے قریب ایک سمندر سل آگئی میں بس تکتا رہتا اور کسی کے بلانے پر چونک سا پڑتا۔

شام جب تم آئیں تو میرے کمرے میں کوئی نہ تھا۔

تمہیں معلوم ہے میں مسکرا دیا تھا میرے جسم کے تمام تار تن گئی تھیں، لیکن تم نے میرا حال نہ پوچھا، نہ ہی مسکرائیں روز کی طرح اب کام کرنے لگیں، مجھے ایکدم سے صبح والی نرس یاد آگئی۔ تم بھی ویسی ہی معلوم ہوئیں۔ تمہیں کیا معلوم تھا ایک فیملی وارڈ کا مریض سارا دن کیا دیکھتا رہا ہے کس کی آواز پر کان لگا رہتا ہے کس کے قدم اُسے چونکا دیتے ہیں اور رات بیمار داروں کو چھوڑ کر کس کی ہمدردی کو ترستا ہے۔ کل شام تک تم کتنی میرے نزدیک تھیں میں کیسے سمجھتا رہا کہ تم بالکل پاس ہو مگر آج شام یکایک مجھے احساس ہوگیا کہ تم تو کہ بالکل ہو جیسے تھرمامیٹر منہ میں رکھ کر حرارت دیکھتے ہیں تم مسکرا کر بیماروں کا کام کرتی ہو تھرمامیٹر سے حرارت دیکھی جاتی ہے تم انسان ہو لیکن تمہارا کام حرارت دیکھنا ہے اور بس تمہارے دل سے ہمدردی مفقود ہو چکی ہے۔ میں یہی سوچتا رہا کہ لفظوں کے پھول چن چن کر چننے والے اس قدر کٹھور کیوں ہیں اور بڑھتی ہوئی شام نے میری امنگیں اپنے میں لے لیں۔ اس رات میں برآمدے میں لیٹے لیٹے آپریشن بلاک میں پہنچ جاتا ہوں۔ کمروں میں سے چھنتی ہوئی سفید روشنی میں سے تم ابھرتی معلوم ہوتی ہو لیکن جب میں نے تمہیں آواز دی تو میری سمجھ میں آیا کہ تم تو دور جانے کہاں اس رات کے سنّاٹے میں کھو گئیں دل دھڑکی ہوئی سے تھکی ہاری کیوں نہ میں صبح تم سے وہ میگزین مانگوں جو کل دوپہر تم برآمدے میں ٹہلتی ہوئی پڑھ رہی تھیں لیکن تب تم کو پھر ملاقات چاہیئے" اُس کی سطور کافی ہیں تمہاری نظر دیکھنے کیلئے مگر میں تو صبح سات بجے ہی ہسپتال سے جا رہا ہوں ٹھیک ہوگیا ہوں نا۔ گلے کے آپریشن کیلئے مجھے چار دن ہی تو ہسپتال میں ٹھہرنا ہوتا ہے۔ اور تم آٹھ بجے ڈیوٹی پر آتی ہو اور تمہیں مجھ سے

غزل

سکندر علی وجد

زہے سوزِ کلامِ عاشقانہ
زباں کرتی ہے کارِ تازیانہ

فسانہ زندگی کی ہر حقیقت
حقیقت اک محبت کا فسانہ

مقدس ہے زبا وہ کون یارب
جبیں میری کہ تیرا آستانہ

ادائے دلنوازی کچھ نہیں ہے
محبت ڈھونڈ لیتی ہے بہانہ

عجب ہے منظرِ سوز و تب و تاب
بنا بجلی کی زد پر آشیانہ

جلالِ عزمِ آزادی کا مظہر
غلاموں کی نگاہِ باغیانہ

یہی ہے وقت جاگو سونے والو
نئی کروٹ بدلتا ہے زمانہ

پرکاش موہن

بیسوا

وہ جب پھر پھرا کر موٹر کے اڈّے پر پہنچا تو بس کا کوئی پتہ نہ تھا۔ البتہ سڑک کے کنارے چھ سات آدمی اکٹھے ہو گئے تھے دور پرے چائے اور سوڈے والوں کی دکانیں اب بھی ویران پڑی تھیں۔ امرود بیچنے والا اپنی چھابڑی کے پاس زمین پر اُسی طرح خاموش بیٹھا تھا۔ اور اس کے پاس ہی پکوڑوں والا بھی جیسے وہ انہیں چھوڑ گیا تھا۔

وہ اس چھوٹے سے گروہ کے پاس سے ہو کر گذر گیا جو سڑک کے کنارے اکٹھا ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا ان کے درمیان ایک ٹیڑھی میڑھی چارپائی پر ادھیڑ عمر کی ایک مریل سی عورت پڑی کراہ رہی ہے شاید اس کی کوئی ہڈی ٹوٹ گئی تھی کیونکہ اس کے جسم پر کہیں زخم کا نشان نہ تھا اور اُس کے کراہنے کے انداز سے عیاں تھا کہ اسے سخت اذیت ہو رہی ہے ایک شخص جو شکل سے کباڑی اور قرائن سے ڈاکٹر معلوم پڑتا تھا۔ اس پر جھکا ہوا تھا اس کے پاس ایک بکس کھلا دھرا تھا۔ جس میں سے روئی اور پٹیاں جھانک رہی تھیں۔

اس کی بھوک کی شدت ہر لحظہ بڑھ رہی تھی چار دن کے خالی پیٹ کے تقاضے اب ناقابلِ برداشت ہوتے جا رہے تھے مگر اس کا دل اور اس کا تخیّل اب بھی اپنی ضد پر قائم تھے۔ اُس نے فیصلہ کر لیا۔ آج وہ ضرور کچھ کھائے گا ابھی۔ اسی وقت وہ اس اندرونی بغاوت کو بے رحمی سے دبا دے گا۔ وہ امرود والے کے پاس پہنچ گیا اور اس سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کیوں بھئی امرود کیسے دئے ہیں؟"

امرود والے نے جواب دیا۔ "تین آنے پاؤ بابو جی" اور پھر ترازو اُٹھاتے ہوئے پکوڑوں والے سے کہا۔ "اور ڈرائیور کمبخت چلاتے بھی تو بے تحاشا ہیں۔"

پکوڑوں والے نے کہا۔ "اور کیا۔ یہ بھی انسان ہوتے ہیں کہیں؟ یہ تو تم جانو کوئلے کی بسوں نے کچھ بچاؤ کر دیا۔ ورنہ پہلے تو بس ہر روز ایک آدھ ایکسیڈنٹ ہو جایا کرتا تھا۔"

امرود والے نے اسے پوچھا "کیا تولوں بابو جی؟" اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر پکوڑوں والے سے کہا "میرا راج ہو جائے تو قسم ہے خدا کی جو ڈرائیور شراب پئے دس سال کے لئے اندر کر دوں۔ مدہوش ہو کر چلاتے ہیں سالے، نہیں سوچتے کہ خود تو مریں گے سو مریں گے ساتھ پانچ دس بے گناہوں کو مفت میں لے ڈوبیں گے۔"

پکوڑوں والے نے کہا۔ "اجی یہ خود کہاں مرتے ہیں کمبخت اسی ایکسیڈنٹ میں نہیں دیکھتے دونوں بیچارے جان سے گئے اس بڑھیا کی کمر ٹوٹی سو الگ، مگر ڈرائیور کے ایک خراش تک نہ آئی۔ بیٹھا ابھی ابھی کریپے کی دکان پر دندنا رہا تھا۔"

اُس نے کہا "ارے بھئی یہ تم کیا قصّہ لے بیٹھے اب لوگ جو یوں عاجزی سے اپنی جانیں ڈرائیور کے بس میں دے دیتے ہیں تو بھگتا کریں تمہیں کیا پڑی ہے تم اپنے پکوڑے بیچا کرو۔"

پکوڑے والے نے کہا۔ "پکوڑے تو خیر بیچیں گے ہی صاحب پیٹ کی خاطر۔ مگر یہ اندھیر بھی تو نہیں دیکھا جاتا۔ اب آپ جائیے سفر تو سب کو کرنا ہوا سبھی ڈرائیور تھوڑا ہی بن سکتے ہیں۔"

امرود والا بولا۔ "اجی بھاڑ میں جائے ایسا سفر۔ جو تم نے بھی کہیں میری طرح ان دو مُردوں کو دیکھ لیا ہوتا تو قسم ہے خدا کی ساری عمر سفر کا نام نہ لیتے۔ ایک کا سر تو بالکل پلپلے امرود کا سا ہو رہا تھا۔ بھیجا نکلا ہوا تھا، مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ دوسرے میں تھوڑی جان باقی تھی ابھی۔ اور اس کے پیر ذرا ذرا ہل رہے تھے۔ نئے ذبح کئے ہوئے مُرغ کی طرح، خدا جانے کتنا درد ہو رہا ہوگا بیچارے کو"

دفعتاً دونوں چھابڑی والے سہم سے گئے۔ وہ ہنس رہا تھا ایک وحشتناک کھوکھلی سی ہنسی جس میں پاگل پن کی ایک ہلکی سی جھلک تھی۔

معلوم ہوتا ہے دوست۔ اس نے کہا "تم نے کسی کو مرتے

نہیں دیکھا کبھی جبھی اس قدر گھبرا رہے ہو، دو چار آدمیوں کا مرنا کیا چیز ہے میاں۔ ہم نے وہ منظر دیکھے ہیں کہ دل بھر ہو گیا ہے اب ہماری آنکھوں کے سامنے کسی کو آرے سے چیر دو لو اس نہ ہوا مزے سے میٹھے امرود کھایا کریں۔"

وہ پھر ہنسا، مگر ایکے اس ہنسی میں وہ کھسیانا پن تھا جو اپنے آپ پر کوئی پھبتی کسنے کے بعد پیدا ہو جاتا ہے۔ چھابڑی والوں نے اُسے پہلی بار غور سے دیکھا، وہ یقیناً ایسا بے رحم و نظر نہ آتا تھا۔ وہ ایک عام سا انسان معلوم پڑتا تھا — ایک عام انسان جو کسی بھی المناک منظر پر دو آنسو بہا سکتا تھا۔ چھابڑی والوں کو اس کی ہیئت میں کوئی غیر معمولی چیز نظر نہ آئی۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں ضرور غیر معمولی طور پر ابھری ہوئی تھیں جس سے اس کے گال بے طرح پچکے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس کی شکل و صورت بھی اُداس اُداس سی تھی اور اس کی لمبی اور پتلی انگلیوں کے ناخن بھی بے طرح بڑھے ہوئے تھے۔ مگر لیسے انسان ہندوستان میں نایاب تو نہیں۔ ہاں اگر وہ غور سے دیکھتے تو اس کے پتلے پتلے ہونٹوں کے لرزتے ہوئے کونے، اُس کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک — اس کے سر پر سیدھے کھڑے ہوئے بال جو گویا کسی سانحہ کی دہشت پر سہم کر کھڑے ہو گئے ہوں اور پھر بیٹھ نہ سکے ہوں اور اس کی پیشانی کی گہری شکنیں ان پر ضرور واضح ہو جاتیں اور وہ شاید اندازہ لگاتے کہ یہ شخص غیر معمولی طور پر حساس ہے۔

پکوڑے والے نے اپنا معائنہ ختم کرنے کے بعد کہا۔ "کلکتے سے تو نہیں آ رہے آپ؟"

پکوڑے والے کا اشارہ کلکتے کے اس خونیں فساد کی طرف تھا جس میں اب تک ہزاروں آدمی مر چکے تھے۔ اور جو اب بھی سینکڑوں جانیں لے رہا تھا مگر اس نے گویا پکوڑے والے کی بات سُنی ہی نہیں خاموش کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ ایک اچھے بھلے وقفے کے بعد جس کے دوران میں وہ دونوں اس کی طرف دیکھ کر خدا جانے کیا کیا اندازے لگاتے رہے وہ ان کی جانب پھر متوجہ ہوا اور کہنے لگا۔ "جانتے ہو کلکتہ کا فساد کیسے شروع ہوا؟"

دونوں چھابڑی والے بیک وقت بول اُٹھے "نہیں۔"

اور پھر امرود والے نے بڑھاوا دینے کے انداز میں کہا "کیا آپ جانتے ہیں؟"

وہ بولا "ہاں۔ میں جانتا ہوں، کلکتہ کے فساد کی جڑ دو ڈرائیور تھے۔"

چھابڑی والوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا۔ امرود والے نے پھر بڑھاوا دینے کے انداز میں کہا "اچھا؟"

وہ کہے گیا گویا اب وہ رُک نہ سکتا ہو "یہ ڈرائیور آپس میں سگے بھائی تھے۔ ان کا باپ اپنے زمانے میں کلکتہ کا بہت بڑا رئیس تھا۔ کروڑوں کی جائداد تھی، ساری عمر گل چھرے اُڑاتا رہا آخری عمر میں ایک بیسوا گھر ڈال لی، وہ تھی تو بمشکل سولہ سترہ سال کی۔ مگر تھی بڑی کایاں کہ بڑی بڑی کٹنیوں کے کان کترے۔ اِدھر وہ مرا۔ اُدھر اُس نے ساری جائداد ہتھیا لی۔ کئی تو یہ بھی کہتے سنے گئے کہ اسی نے اُس بیچارے کو جلد اپنے ٹھکانے لگا دیا۔

"اُس وقت ان دونوں بھائیوں کی عمر کوئی بہت زیادہ نہ تھی بڑا بارہ سال کا تھا۔ چھوٹا سات آٹھ برس کا ماں پہلے ہی چل بسی تھی۔ اب باپ جو مرا تو ان کا کوئی سہارا نہ رہا بیسوا تھی دُور اندیش۔ بڑے لڑکے کو آرام آسائش سے پالا، پڑھایا لکھایا مطلب یہ کہ بڑا ہو کر قابو میں رہے اور جائداد پر حق نہ جتائے، چھوٹا بیچارا مارا مارا پھرتا رہا۔

بڑا پہلے پہل تو شاکر رہا مگر تھا بہت سمجھدار، جوں جوں عمر بڑھتی گئی آنکھیں کھلتی گئیں۔ سولہ سترہ برس کا ہوا تو باپ کی جائداد واپس لینے کے منصوبے باندھنے لگا۔ پہلے دبی زبان میں ذکر کرتا رہا۔ وہ بھی دم دلاسے دیتی رہی مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس کے تقاضوں میں بھی شدت آتی گئی حتیٰ کہ جب پچیس برس کا ہوا تو کھلم کھلا مطالبہ کیا کہ سیدھے ہاتھوں میری جائداد مجھے سونپ دو۔ اُس بیسوا نے تھوڑا بہت دے کر ٹالنا چاہا۔ مگر یہ نہ مانا۔ اس سے بالکل قطع تعلق کر لیا اور کچھ اپنا کمانے کی سوچنے لگا اور تو کچھ آتا جاتا نہ تھا موٹر ڈرائیوری سیکھ لی تین چار ہی برس میں اس کا شمار کلکتہ کے بہترین ڈرائیوروں میں ہونے لگا آدمی شریف بھی تھا، محنتی بھی، دیانتدار بھی۔ اچھا کمانے لگا۔ کچھ پس انداز کیا۔ اور جب چار پیسے ہاتھ میں ہو گئے تو

جائداد حاصل کرنے کے لئے نالش ٹھوک دی۔

اُدھر چھوٹا بھی اب تیئس چوبیس برس کا ہو چلا تھا۔ اُس کی ایک ایک بات باپ سے ملتی تھی۔ وہی لاپروائی، وہی رنگیلا پن، وہی شاہانہ طبیعت جو آیا اُڑا دیا۔ بھائی کی طرح سمجھدار نہ تھا۔ سیدھا سادا آدمی تھا، دوست بنے تو جان قربان کر دے اور دشمن بنے تو جان لئے بنا نہ چھوڑے۔ اس بیسوا نے جو دیکھا کہ بنا بنایا کام بگڑ چلا اور بڑا ہاتھوں سے نکل گیا تو چھوٹے کو ہاتھوں پر ڈالنے کی کوشش کی، یہ تو تھا ہی لااُبالی۔ آخر اپنے باپ کا بیٹا تھا اور پھر جوان اس کی باتوں میں آگیا۔ یہ اگرچہ ادھیڑ ہو چلی تھی، مگر اپنے فن میں ماہر تھی۔ چار دن میں ایسا رام کیا کہ بس اسی کی مالا جپنے لگا یہی سمجھ بیٹھا کہ یہ تو مجھ پر مرمٹی۔ اب جائداد کہاں جاتی ہے کی۔"

پکوڑے والے نے حیرت سے کہا "تو کیا وہ حرامزادی اتنی بے حیا تھی کہ باپ کے بعد بیٹے سے آشنائی پیدا کر لی؟"

امرود والے نے کہا "واہ میاں ایسی عورتوں کی بے حیائی کی بھی خوب کہی۔ خدا کی پناہ ہے ان کے جلتروں سے۔ یہ جو کر گذریں تھوڑا ہے۔"

وہ کہے گیا۔ گویا اُس نے چھابڑی والوں کی باتیں سُنی ہی نہ ہوں "بڑے نے جو یہ حال دیکھا تو آگ ہو گیا چھوٹے کو بلا کر سمجھایا بجھایا اپنی محبت اور خاندان کی عزت کے واسطے دئے۔ اس بیسوا کی کرتوت کھول کر سمجھائیں، مگر چھوٹے پر کہاں اثر ہوتا؟ اب تک بڑے نے کبھی اس کی بات تک نہ پوچھی تھی جن دنوں یہ ان کے ہاں رہتا تھا اور اس کی سو سو خاطریں ہوتی تھیں تو اس نے ایک بار بھی چھوٹے کو بلا کر نہ کہا کہ بھیا کس حال میں ہو بلکہ ہمیشہ اُس سے اس طرح پیش آتا رہا گویا وہ بھائی نہ ہو کوئی اچھوت ہو۔ اب دفعتاً جو بڑے نے یہ تیور بدلا تو چھوٹے کو بیسوا کی وہ ساری باتیں جو وہ بڑے کے خلاف کہتی رہی تھی دُرست نظر آئیں اور اس کی بدگمانی بڑھی۔ آخرکار بہت بحث بحثی کے بعد چھوٹے نے کہا۔ کہ بھائی صاحب جائداد تو حاصل کریں گے آپ۔ ہم پیچھے پاس رہی یا اسکے پاس، میں تو وہی کنگال کا کنگال رہوں گا، آگے آپ نے کون سا اچھا سلوک مجھ سے کیا ہے کہ آئندہ کے لئے کوئی اُمید رکھوں۔ سیدھی بات ہے۔ پہلے مجھے میرا حصہ لکھ دو۔ پھر میں دل و جان سے تمہارے ساتھ ہوں۔"

پکوڑے والے نے کہا "بھئی بات تو پتے کی کہی۔"

امرود والا بولا "خاک پتے کی کہی، گولی مارو ایسے بھائی کو۔ قسم ہے پاک پروردگار کی میرا کوئی ایسا بھائی ہو تو مار مار کے سیدھا کر دوں۔"

پکوڑے والے نے پوچھا "یہ بھی ایک ہی کہی۔ کیوں کیا چھوٹے کا جائداد پر حق نہ تھا؟"

امرود والے نے جواب دیا "حق کیوں نہ تھا؟ جتنا حق بڑے کا۔ اتنا چھوٹے کا۔ مگر آخر بھائی کو بھائی پر اعتبار بھی تو چاہیئے۔ اور پھر جائداد حاصل تو کر لیتے، سوت نہ کپاس اور کولی سے لٹھم لٹھا۔"

پکوڑے والے نے سمجھانے کے انداز میں کہا "بھئی جب بدگمانی ہو جاتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور پھر چھوٹے کی بدگمانی تھی بھی تو جائز۔ اور یہ بھی سوچو کہ بڑا پھر سمجھدار تھا اتنی سی بات لکھ دیتا تو چھوٹے کا سب شک رفع ہو جاتا۔ بچھڑے ہوئے گلے مل جاتے۔ پھر کس کا بٹوارا اور کیسا جھگڑا۔"

امرود والے نے چڑ کر کہا "ایسا گلے ملنا بھی بھلا کیا ہوا؟ اس سے تو لڑائی اچھی۔ چھوٹے کو یہ تو گوارا ہوا کہ جائداد اسی فاحشہ کے قبضے میں رہے۔ یہ نہ برداشت کر سکا کہ اپنا ہی بھائی اُسے حاصل کر لے۔"

پکوڑے والا کب ہار ماننے والا تھا بولا "بھگوان جانے تمہیں یہ موٹی سی بات کیوں سمجھ میں نہیں آتی بھئی آخر بڑے کو ہی درگذر کرنا چاہیئے۔ ہر بات کا موقع ہوتا ہے اچھا اور نہیں تو اس حرامزادی کا منہ بند کرنے کے لئے ہی لکھ دیتا۔"

امرود والا بولا "اجی ایسے بھائی کو تو آدمی ایک کھوٹی کوڑی بھی نہ دے۔ اس سے جائداد میں آگ ہی نہ لگا دے جس بھائی میں اتنی غیرت نہ ہو اور اپنے سگے کو چھوڑ کر بیسواؤں کے پیچھے لگا پھرے، وہ خنزیر ہے بس۔"

پکوڑے والا کچھ جواب دینے ہی کو تھا کہ وہ بول اٹھا۔ کیوں

بھئی میں بند کردوں یہ قصہ؟ تم لڑلو آپس میں۔"

دونوں بیک وقت بول اُٹھے "نہیں نہیں۔" اور پھر امرود داسہ نے کہا "جی یہ تو سٹری ہے۔ پوچھ کتا رہتا ہے آپ آگے کہئیے۔ پھر کیا ہوا؟"

اس نے جواب دیا "ہونا کیا تھا میاں۔ بڑا بھائی کوئی تمہارے ہی جیسا تھا۔ چھوٹے کو اس کا حصہ دینے سے انکار کردیا۔ کہا کہ پہلے جائداد حاصل کرلیں پھر چاہے ساری تمہیں لے لینا، چھوٹا نہ مانا تو وہ جاتے جاتے کہہ گیا کہ میاں شرم ہو تو ڈوب مرو۔ اُس حرامزادی کے ٹکڑوں پر پل رہے ہو۔ جس نے ابا جان کو برباد کیا اور اب ہمارا حق غصب کئے بیٹھی ہے۔ تم میرے ساتھ شامل نہیں ہوتے تو میری بلا سے۔ ایشور نے چاہا تو تن تنہا اپنا حق واپس لوں گا۔ تم جاؤ۔ اس کا حقہ تازہ کرو۔ پاؤں دابو اور کتے کی طرح دُم ہلاتے پیچھے پیچھے پھرو۔"

وہ تو یہ کہہ کر چلا گیا، چھوٹے پر اس بات کا بہت اثر ہوا آدمی خوددار تھا قسم کھالی کہ اب اپنے پاؤں پر کھڑا ہوکر دکھاؤنگا اور تو کچھ نہ سوجھا اُس نے بھی ڈرائیوری سیکھ لی اور بھائی کے مقابلے کا ڈرائیور بن گیا بیسوا سے قطع تعلق کرلیا۔ مگر بھائی کے حصہ نہ لکھ دینے پر اسکی بدگمانی اور بھی بڑھ گئی تھی چنانچہ بیسوا سے کہیں زیادہ اپنے بھائی کا دشمن بن بیٹھا۔

اب اِدھر تو بڑے نے جائداد کے حصول کے لئے اپنی کوششیں تیز کردیں۔ اُدھر چھوٹے نے پر پرُزے نکالنے شروع کردئے۔ بیسوا کو فکر ہوئی کہ دونوں بھائی برسرِ اقتدار ہیں۔ اگر کہیں ان میں ملاپ ہوگیا تو میں کہیں کی نہ رہونگی۔ انگریزی عدالتیں سست رفتار سہی مگر آخر کبھی تو یہ مقدمہ فیصل ہوگا۔ اب تو لے دے کے اس کے پاس ایک ہی بہانہ رہ گیا تھا کہ میں جائداد آج دیتی ہوں مگر کس کے حوالے کردوں؟ اب اُس نے ایسی چال سوچی کہ ان میں پھوٹ اور بڑھے اور بظاہر اپنی نیکنامی بھی ہو۔ چنانچہ اُس نے بڑے پر ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ لاکھ لاکھ قسمیں کھائیں اپنی محبت کا یقین دلایا۔ جائداد دینے پر رضامندی ظاہر کی۔ اُس نے عورت کی شکل کب دیکھی تھی ساری عمر عدالتوں میں جوتیاں چٹخاتے یا ڈرائیوری کرتے گزر گئی تھی۔ پھر یہ ناز و ادا یہ غمزہ، یہ عہد و پیمان، انہیں کے بل بوتے پر تو اس بیسوا نے ایک زمانہ لوٹ کھایا تھا۔ بڑے کا دل ڈول گیا مگر آدمی حد درجہ محتاط تھا۔ کھلم کھلا عشق کا اظہار نہ کیا۔ دل میں یہ سوچا کہ یہ پری تو شیشے میں اُتر آئی ہے۔ اگر اس آسانی سے جائداد ہاتھ آتی ہے تو کیا بُرا ہے زیادہ سے زیادہ بے وفا ثابت ہوگی۔ مگر آزمانے میں کیا حرج ہے اور کچھ نہیں تو اس کا پول ہی کھلے گا۔

بیسوا تو تھی ایک ہی گھاگ، بھانپ گئی کہ تیر نشانے پر بیٹھا اور بھائیوں میں رقابت کا ایک اور باعث پیدا ہوگیا۔ اب یہ کبھی نہ مل بیٹھیں گے۔ چنانچہ ایک دن دونوں کو کہلا بھیجا کہ بھئی تم آپس میں کیوں لڑتے ہو؟ جائداد تو تمہاری ہے میرا اس پر حق ہی کیا ہے۔ خدا اور اسکے بیٹے کی رحمت ہو تمہارے والد مرحوم پر۔ ان کی چیز تھی مرتے ہوئے مجھے سونپ گئے۔ اب تک یہ امانت تمہاری خاطر سنبھالے رہی اب خیر سے تم جوان ہوگئے۔ تو مجھے اس بار سے سُبکدوش کردو۔ کسی دن اکٹھے چلے آؤ جو سو پچاس نقد ہے وہ ابھی بانٹ لو اور باقی کا فیصلہ پھر کرلینا تمہاری سہولیت کے لئے بانٹنے کا طریقہ میں سمجھا دوں گی تاکہ کسی کو گلہ نہ رہے۔

کلکتہ میں جس نے یہ بات سُنی، بی صاحبہ کی بے غرضی کی تعریف کی۔ مگر ہوا وہی جس کا اُسے یقین تھا یعنی ان دونوں بھائیوں کو قریب تو کیا آنا تھا۔ اُلٹا اور بھی ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ بڑے نے سوچا۔ چھوٹا جوان ہے ہماری دال نہیں گلے گی اس محفل میں اسی سے التفات ہوگا۔ اور ہم مفت میں جلتے رہیں گے۔ اور پھر سو پچاس کی بساط ہی کیا جو اس کی خاطر وہاں جائیں، لکھ بھیجا کہ نقد کی بانٹ کے لئے ہم نہیں آتے۔ ہاں جائداد کے بٹوارے میں ضرور شامل ہوں گے اور بٹوارا جیسے ہم چاہیں گے ویسے ہی ہوگا۔ آخر تم تیسری جگہ بانٹ کا طریقہ سمجھانے والی کون ہوتی ہو؟

چھوٹا تو پہلے ہی اس تاک میں تھا۔ بہت خوش ہوا کہ نقد روپیہ تو بلا شرکتِ غیرے اینٹھو باقی پھر دیکھا جائیگا۔

اب یہ بچکر کہاں جائے گی۔ یہ مردانہ حسن، یہ پٹھے، یہ کسرتی جسم، باپ کی جائداد تو خیر ملے گی ہی، کچھ اور بھی ساتھ لے مرینگے۔ چنانچہ نئی شیروانی سلوا کر پہنی، شلوار میں بل ڈالے، بٹنوں کو چلادی۔ موچھوں کو تاؤ دیا۔ اور بڑے ٹھسے سے اکڑتے ہوئے کوٹھے پہ جا چڑھے، اوپر سے جواب آیا ہم نے تو شرط کی تھی کہ دونوں اکٹھے آؤ، یہ اکیلے آنا چہ معنی؟

امرود والے نے کہا۔ "اچھا ہوا۔ اس سالے کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیئے تھا۔"

پکوڑے والے نے کہا۔ "چھوٹے میاں بس جل ہی تو گئے ہونگے۔"

وہ بولا۔ "اور نہیں تو کیا۔ ایسے خفیف ہوئے کہ منہ دکھانے کے قابل نہ رہے اور تو کچھ بن نہ پڑا۔ اعلان کردیا کہ ہم بانٹ میں شامل نہ ہونگے کیونکہ بڑے نے اپنی مرضی سے بانٹ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ اس طرح ہمارے پلّے کیا پڑا؟ اور اگر ہماری غیر موجودگی میں بانٹ ہوئی تو ہم سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

امرود والے نے کہا۔ "واہ بے تیس مار خاں گویا نہ کبھی بانٹ ہوگی۔ نہ اس فاحشہ کے ہاتھوں سے جائداد نکلے گی۔ بھئی اچھے نکّو بنے۔"

پکوڑے والے نے کہا۔ "دیکھ لیا نا بڑے کی غلطی کا نتیجہ۔ اگر پہلے ہی بانٹ پر رضامند ہو جاتا تو کاہے کو یہ فساد کھڑا ہوتا، اب بانٹ کرنا منظور بھی کرلیا اور ملاپ بھی نہ ہو سکا۔"

وہ کہے گیا۔ "اُدھر جب بڑے کو یہ خبر ملی تو باچھیں کھل گئیں اور جس سو پچاس کو بڑے رعب سے ٹھکرا دیا تھا اُسے اب قبول کرنے کے لئے بے تاب ہوگیا۔ سمجھے کہ بس اب پو بارہ ہیں۔ موچھوں کو خضاب لگایا۔ نئی دھوتی نکال کر پہنی، مُنہ میں ایک آدھ گلوری دابی، اپنی کھدر کی نوکدار ٹوپی سر پر ترچھی سجائی، کندھوں پہ بگلے کے پر کی طرح سفید چادر ڈال لی اور ان سے ملاقات کے لئے تیار ہوگئے مگر احتیاطاً پہلے پچھوا بھیجا کہ صاحب۔ اجازت ہو تو ہم آجائیں، ادھر بھلا کیا دیر تھی فوراً قبولیت لکھ بھیجی۔ اور شام کا وقت ملاقات کے لئے مقرر ہوا۔

دن کے کوئی تین بجے کا وقت ہوگا۔ ملاقات میں ابھی تین چار گھنٹے باقی تھے، چھوٹا بھائی کباب ہو رہا تھا۔ لاری چلا رہا تھا۔ مگر جی کرتا تھا کہ ساری دُنیا کو آگ لگا دے۔ رہ رہ کر دانت پیستا تھا، اپنی وحشت میں اس زور سے لاری بھگائے لئے جا رہا تھا کہ سواریاں سہمی جاتی تھیں۔ جب اس کی لاری کلکتہ کے سب سے پُر رونق بازار میں پہنچی تو اُس نے دُور سے دیکھا بڑے بھائی بڑی شان سے اپنی لاری بڑھائے چلے آرہے ہیں۔ چہرے پر فتح مندی کا جلال ہے اُس نے جو دیکھا تو آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ پاگل سا ہوگیا اور پوری رفتار پر اپنی لاری اسی کی طرف چھوڑ دی۔

اُس دن بازاروں میں غیر معمولی بھیڑ تھی کیوں کہ مسلم لیگ منسٹری نے ڈائرکٹ ایکشن ڈے کے سلسلے میں عام تعطیل کر رکھی تھی، ادھر اس نے لاری بڑھائی ادھر بڑے نے جو یہ حال دیکھا تو ڈٹ گیا۔ اور بات کی بات میں کلکتہ کے سب سے گنجان آبادیوں میں مسافروں کی کھچا کھچ بھری لاریوں کی پوری رفتار پر ٹکر ہوگئی۔"

دونوں چھابڑی والے بیک زبان کہہ اٹھے۔ "ارے!"

اس کی آواز مدھم ہوتی جا رہی تھی "میں خود وہاں موجود تھا۔ لاریاں ٹکرائیں۔ پیچھے ہٹیں۔ پھر ٹکرائیں اور پاش پاش ہوگئیں ان کی لپیٹ میں راہ چلتے بیسیوں مسافر آگئے سینکڑوں گھبرا کر چیختے ہوئے بھاگے۔ اس افراتفری میں کئی بسیں، ٹرامیں اور لاریاں آپس میں ٹکرا گئیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے تڑپتے ہوئے جسموں کو اُچھل کر زمین پر گرتے دیکھا۔ میں نے وزنی لاریوں کو انسانی ٹانگوں، بازوؤں اور چھاتیوں پر سے گذرتے دیکھا، میرے کانوں نے معصوم بچّوں کی دلدوز چیخیں سنیں۔

اُس دن شہر میں پہلے ہی ہندو مسلم فساد کے چرچے ہو رہے تھے، لوگوں نے جہاں جہاں اس سانحہ کی خبر سنی اسے فرقہ دارانہ رنگ دیا اور بات کی بات میں کلکتہ میں ہندو مسلم فساد ہوگیا۔"

اس کی آواز مدھم ہوتے ہوتے محض ایک سرگوشی بن کر رہ گئی تھی، وہ بے حد تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اور بہت نڈھال، گویا بیہوش ہو کر گرنے کو ہو۔ دونوں چھابڑی والوں نے گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

پھر وہ سنبھل گیا اور جلد جلد کہنے لگا "اُس بات کو آج چار دن گذر چکے ہیں۔ چار دن سے میں نے کچھ نہیں کھایا نوالے میرے حلق سے نیچے نہیں اُترتے، میں جب کھانے لگتا ہوں تو میری آنکھوں کے آگے خون میں لتھڑی ہوئی لاشیں، کچلے ہوئے چہرے، باہر نکلی ہوئی زبانیں۔ بے جان ناکوں میں بیباکی سے گھستی ہوئی مکھیاں اور وحشت اور ڈر سے کھلی ہوئی مُردہ آنکھیں آجاتی ہیں اور ہر نوالہ مجھے کسی ایسی لاش کا ٹکڑا نظر آتا ہے جسے ظالموں نے کچل کچل کر قیمہ بنا دیا ہو۔ میں کچھ نہیں کھا سکتا۔ میں مر جاؤں گا!"

وہ چند لمحے اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے خلا میں کچھ تکتا رہا اور اُس کی لمبی اور پتلی انگلیوں کے بے طرح بڑھے ہوئے ناخن اس کے سر پر وحشت سے سیدھے کھڑے ہوئے بالوں کو کھجلاتے رہے۔ پھر وہ چیخ کر بولا۔ "اب میں صرف ایک ہی چیز کھا سکتا ہوں۔ صرف ایک ہی چیز ہضم کر سکتا ہوں۔ صرف ایک ہی چیز — اُس بیسوا کے جسم کے کباب!"

دوسرے ہی لمحہ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ ہنسے جا رہا تھا۔ وہی کھوکھلی وحشتناک ہنسی اور دونوں چھابڑی والے اُس کی طرف ڈر اور استعجاب سے دیکھ رہے تھے — بے بس، مبہوت اور ساکت۔

افسر سیمابی

"احتجاج"

مجھے تیری محبت کی قسم ایسا نہ ہوتا تھا\
غمِ درماں کثیر اور درد کم ایسا نہ ہوتا تھا

امیروں کو نصابِ سیم و زر مفلس تہی دامن\
ترا دستِ کرم ابرِ کرم! ایسا نہ ہوتا تھا

کہیں دہقان کے سینے پہ مہریں فاقہ مستی کی\
کہیں تختِ سکندر، جامِ جم ایسا نہ ہوتا تھا

کہیں چنگیز کے ہونٹوں پہ موجِ خندہ رنگیں\
کہیں مظلوم کی آنکھوں میں نم ایسا نہ ہوتا تھا

جبینِ شوق کو سجدوں سے فرصت ہی نہیں ملتی\
کم از کم حسن کا نقشِ قدم ایسا نہ ہوتا تھا

ریاکاری کا پرچم لہلہائے خانقاہوں پر\
نگوں سر عشق و مستی کا علم ایسا نہ ہوتا تھا

ہزاروں سال گذرے ہیں ابھی تک تیری دنیا میں\
وہی ہنگامۂ "لا و نعم" ایسا نہ ہوتا تھا

لطافت بے کثافت کچھ نہیں، مانا۔ مگر یا رب\
صنم خانے میں بنیادِ حرم ایسا نہ ہوتا تھا

اگر پیدا ہی کرنا تھا مجھے بے حس غلاموں میں\
تو پھر میری نوا کا زیر و بم ایسا نہ ہوتا تھا

مجھے پاسِ عبودیت ہی لیکن یہ بھی کہنے دے\
جہاں تیری خدائی کی قسم ایسا نہ ہوتا تھا

چمکی:- عورت کی فطرت، جان جائے پر آن نہ جائے، غیرت و شرافت کی منہ بولتی تصویر "چمکی" میں دیکھئے! قیمت دو روپے (عہ)

شریر بیوی:- اس قدر شریر عورت تھی کہ بڑے بڑوں کے کان کاٹتی تھی۔ کیسا کیسا ناک میں دم کیا ہے اس شریر بیوی نے! قیمت عہ!

کمزوری:- عورت کی کمزور فطرت سے شہزور مرد نے ناجائز فائدہ اُٹھایا اور اُس کی زندگی خراب کی! قیمت عہ!

ساقی بکڈپو دہلی سے طلب فرمائیے!

محبّت کا بُلاوا

(۱)

تجھ کو طوفانِ حوادث میں اگر ہو محسوس
"زیست ہے ایک غم انگیز مذاق"
سایۂ لطفِ محبّت میں چلا آ اے دوست
اس قدر زشتیٔ قسمت سے نہ گھبرا اے دوست
کہ یہاں
سایۂ عاطفت بالِ ہُما کی مانند
ہے ستاروں بھری شبہائے درخشاں کا سکوت
اور اک میٹھی سی نیند،
اور سکوں ہے
توڑ زنجیرِ علائق کو خدا را اے دوست
ماہ تاباں ہے کوئی نقرئی پھول
نیلے پانی میں رواں
دیکھ اس کشتیٔ انوار کا اندازِ خرام
غمِ دوراں کے شکار
محوِ انوار ہو، اور بھُول غمِ دوراں کو

(۲)

تیری یہ آنکھیں، یہ تابندہ نجوم
(یا دمکتے ہوئے شفاف حسیں مروارید)
دیکھتی کیا ہیں؟
زمانے میں ہے کیا قابلِ دید؟
جس کی آرائشِ فانی کے طفیل
تو اُسے رکھے عزیز!!
ان سے رنگینیٔ احساس کا لے تو بھی اثر
سائے ہیں سارے زمانے کو چھُپائے ہوئے سے
تو بھی ان سایوں میں کھو جا کسی سایہ کی طرح
غمِ دوراں کی حقیقت کیا ہے؟

(۳)

زندگانی کی کشاکش سے ملول
رُوح آوارہ تری کیوں ہے پریشاں ہر سمت
ڈھونڈتی ہے کہیں دامانِ سکون
لیکن
آوازیں کہیں دُور سے دیتا ہے شباب
کہ دُھندلکے ہیں نگاہوں کے نقاب
نشہ یہ کیوں تری ہستی میں نہ ساری ہو جائے
کیوں نہ تحلیل ہو
اس نشے میں تو
یعنی تو ہو غمِ دوراں کا حریفِ غالب

(۴)

غم کے سایوں سے کہیں دُور، بیابانوں میں
بارِ محنت سے سُبکدوشی کا احساس لئے
خوابِ پُرکیف میں کھو جا!

شام کے سائے ہیں تاریک و محبت پرور
اس سے پہلے، کہ نسیمِ سحری کے جلوے
شمعِ خورشید کی تنویرِ حسیں میں گم ہوں
ہو ترا راہنما عشق کا خوابِ زرّیں
عمر کو عارضتاً نذرِ محبّت کر دے
اور آ جا مری آغوش میں دم بھر کے لئے

ناجو

ساقی صدیقی

"ٹھہرا ہوا پارہ"

ستارے جھلملا کر کھو گئے ظلمت کی راہوں میں
پناہیں ڈھونڈنے نکلا ہے کوئی نرم باہوں میں
خنک انگڑائیاں پرتو فگن ہیں آسمانوں پر
نگاہیں جم کے رہ جاتی ہیں یخ بستہ چٹانوں پر
بڑی مشکل سے اب جوئے رواں کی پاؤں اٹھتی ہیں
فلک زادے سکوتِ مرگ کے سائے اگلتے ہیں
تحمل سوزِ پنہاں کے قدم جمنے نہیں دیتا
یقیں کے بطن سے ہوتے ہیں اربابِ گماں پیدا
پر افشاں ہیں بہت بے ڈول افسانے فضاؤں میں
جواں نغموں کے لاشے جذبے ہیں ٹھنڈی ہواؤں میں
جہاں بڑھتے ہوئے قدموں سے دہکائے گئے شعلے
گذرتے ہیں انھیں راہوں سے گہری نیند کے سائے
تبسم اشکِ خونیں بن کے آنکھوں سے برستا ہے
لہو لب ہائے لعلیں پر بسانِ شمع جلتا ہے
فریبِ مستقل سے کم نہیں رسمِ جبیں سائی
نظر والوں کو کثرت میں بھی وحدت ہی نظر آئی
یہ افسانہ حقیقت میں نہ ناری ہے نہ نوری ہے
خدا ہونے سے پہلے آدمی ہونا ضروری ہے
نگاہِ حق نگر نا واقفِ بامِ حرم کیوں ہے
لبوں پر نعرۂ ہو حق ہے سینوں میں صنم کیوں ہے
جب انساں شعلہ و شبنم کی سرحد سے گزرتا ہے
زمانہ اک نئے انداز سے کروٹ بدلتا ہے

رشید دُلہن

یقیناً ۴۷ء کی بہترین پیشکش ہو گی جس کی ضمانت ہے

سحر بیان حضرت جگر مراد آبادی اور شاعر رومان عمر انصاری بی۔ اے (آنرز) کے درد بھرے اور دل میں چٹکیاں لینے والے نغمات۔ (۲) بھائی جان اور شاہکار کے خالق جناب ایس۔ خلیل کی نگرانی۔ (۳) ہر دلعزیز افسانہ نویس نسیم سندیلوی بی۔ اے (آنرز) ایم۔ اے کی ہدایت کاری اور مسٹر ایم۔ ایم۔ بیگ کی کہانی۔ سنہرے پردہ پر جگمگاتے شہر لکھنؤ اور شامِ اودھ کے پُرکیف مناظر اور کھلی فضائیں۔

"رشید دُلہن"

عکاسی	صدا بندی	موسیقی	آرٹ ڈائرکشن
مسٹر جاگیردار	مسٹر ترویدی	مسٹر کے، دتا	مسٹر کوتوال

اور پھر رشید دُلہن کے فوراً ہی بعد

سُہاگ ——— اور ——— اپنے پرائے

حقوق تقسیم کیلئے: دی سائن ٹون لمیٹیڈ ۳۰ مال حضرت گنج، لکھنؤ

نورالحسن برلاس

پروفیسر برلاس کا خط

برادرِ عزیز شاہد احمد صاحب۔

السلام علیکم۔ آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ ہم دونوں ٹوکیو کی وحشت ناک و غضب ناک اور آتش خیز بمباری سے بچ نکلے۔ مال اسباب بھی بچ گیا۔ ہمارے بچاؤ کا باعث حکومت جاپان کا قیامت خیز حکم ہو گیا۔ نہ ہم کو مکان خالی کرنے کا حکم ملتا نہ ہم بچتے۔ دس دن کے اندر مال اسباب لے کر نکل جانا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ مگر اسی جابرانہ حکم کی وجہ سے بچ گئے۔ اپنی جان کسی طرح بچ بھی جاتی تو سامان بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ہمارا محلہ جلا اور تمام شہر جل گیا۔ ستر فی صدی ٹوکیو راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ جن کے مکان بچ گئے وہ بڑے قسمت والے ہیں۔ شدید بمباری کے زمانے میں نو مہینے گاؤں میں رہے۔ بڑی مصیبت کی زندگی تھی۔ کئی برس سے تکلیف ہی تکلیف تھی ہر شخص مصیبت میں گرفتار تھا۔ مرگ انبوہ جشنے دارد۔ اس وجہ سے تکلیف کا احساس کم ہو گیا تھا۔ پردیسیوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جو لوگ جاپانیوں کا سیاسی کام کر رہے تھے انہیں بہت سی راحتیں میسر تھیں۔ مجھے ان کی حرکتوں سے گھن آتی تھی۔ مسٹر راش بہاری بوس کے پیرو تمام ہندو دو دو پیسے میں ہندوستان کو بیچ رہے تھے۔ مجھے میرے ایمان نے بچا لیا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ان آلودگیوں سے پاک رہا۔

آپ کی آپا نے بھی سخت مصیبتیں جھیلی ہیں۔ کون سا کام ہے جو انھوں نے نہیں کیا۔ ہندوستانی عورت کے وہم و گمان میں بھی وہ کام نہیں آ سکتے جو انہوں نے کئے ہیں بڑی ممتاز عورت ہیں۔

دورانِ جنگ میں ہم کو جاپان کے مطالعہ کا ایسا موقع ملا ہے جو بیسیوں برس یہاں رہنے پر بھی میسر نہ آ سکتا تھا۔ انکی بداخلاقی، تنگ دلی، مطلب پرستی اور وحشیانہ پن کو جتنا برا کہا جائے بجا ہے مگر انکی خوبیوں پر پردہ ڈالنا اپنی تنگ نظری ہے۔ جو اوصاف ان کو ایک عظیم الشان قوم بنانے میں ممد ہوتے انہی کی افراط تفریط سے اس قوم کو عظیم الشان شکست ہوئی۔ اس قوم کی رعونت دیکھ کر میرا دل گواہی دیتا تھا کہ اسے شکست ہوگی۔ مگر وہی دل گواہی دے رہا ہے کہ یہ شکست اس قوم کی جلا کا باعث ہوگی۔ یہ اوصاف سے متصف ہو کر پھر دنیا کو اپنا مداح بنا لے گی۔ اس کے شکست جھیلنے میں بھی ایک شان ہے جو ہمیں متحیر کر رہی ہے۔

افسوس ہے کہ جاپان کے مطالعہ سے جو فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا اس سے مسلمان محروم رہے۔ یہ فائدہ ہندوؤں نے حاصل کر لیا۔ مسلمان صرف گھاٹے میں نہیں رہے بلکہ جاپانیوں کی ایک جماعت نے اسلام کو سخت صدمہ پہنچا دیا ہے جس کا گھاؤ عرصہ دراز تک مندمل نہیں ہو سکتا۔

اس خط میں میں نے بہت سے چیدہ خیالات پیش کر دئے ہیں جو کسی مضمون کو زیب دے سکتے ہیں آپ کے لئے ایک طویل مقالہ "ہماری آزمائشیں" لکھ رہا ہوں۔ دو سال ہوتے جب شروع کیا تھا ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ کوئی پچیس صفحے لکھ چکا ہوں اور ابھی بہت کچھ باقی ہے جسے مختصر کر کے جلد ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اسے پڑھ کر مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں گی ....

کلیاں:- عصمت چغتائی نے طنز نگاری میں ایک نئی شاہراہ خیال اختیار کی ہے جو نہایت دلکش اور بدرجہ موثر ہے "کلیاں" عصمت چغتائی کے سولہ مضامین کا مجموعہ ہے یہ مضامین ملک کے مقتدر رسائل میں شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ قیمت تین روپے (للعہ)

رُوحِ تبسم:- ظریف الملک حضرت علامہ ظریف دہلوی کے روح پرور و خندہ آفریں کلام کا دلکش مجموعہ ہر شعر ہنسانے ہنساتے آپکے پیٹ میں بل ڈالدیگا قیمت عہ

ساقی بک ڈپو، دہلی سے طلب فرمائیے۔

سلام مچھلی شہری

چراغ تیز کردو

شمع کی لَو کچھ تیز کر دو!

دروازے میں قفل لگاؤ۔ بوتل کھولو۔ جام اُٹھاؤ
ایسے میں بھی سو ہی رہی ہے، لا پروا عورت کو جگاؤ
دروازے میں قفل لگے ہیں، اب جی بھر کر عیش مناؤ
گاؤ ـــــــ

لڑکوں، باروں، عشرت گاہوں میں جو نازسے ناچ رہے تھے
اُن گانوں کی نقل اُڑاؤ
گاؤ ـــــــ

گاتے گاتے تھک جاؤ تو اِس عورت سے دل بہلاؤ
اور سویرے سے کچھ پہلے اپنے اپنے کام پہ جاؤ
گاؤ ـــــــ

مانو یہ دلکش تدبیر ـــــــ
دروازے میں قفل لگے ہیں، ہم آزاد ہیں ساری رات
جام اُٹھاؤ۔ بوتل کھولو۔ اِس عورت سے دل بہلاؤ
گاؤ ـــــــ

صبح کھُلے گا یہ دروازہ ـــــــ
اور مقدّس۔ منصف دُنیا ہنس کر بخشے گی زنجیر
یہ اپنی اپنی تدبیر۔ یہ اپنی اپنی تقدیر
یا کل زنجیروں میں جکڑو یا اِس رات کو ناچو گاؤ
گاؤ ـــــــ!

اے ساقی آوارہ گردو!
شمع کی لَو کچھ تیز کرو
شمع کی لَو کچھ تیز کرو ـــــــ!!

کمال صدیقی

"وہ محل، وہ پائیں باغ"

وہ محل، وہ پائیں باغ
کتنے رنگوں کا لطیف اک امتزاج -؟
ختم ہے آرائشوں پر اہتمام ——!
نور کا سرچشمہ اجسامِ جواں کی دلبرائی کے چراغ،
اور مسرت جن کی ادنیٰ سی شعاع،
ڈھونڈتی پھرتی ہے جس کو زندگی،
کوچہ و بازار کی تاریکیوں میں صبح و شام ——!!
نغمہ و مے، رقص کی پرچھائیاں، ہنگامۂ مینا و جام -!
کتنے گم کردہ ہیں ان رنگیں فضاؤں کے مزاج ؟!
وہ محل، وہ پائیں باغ،
جن میں ہر شب ہی شبِ ماہِ تمام -!
ذہن کی اک اختراع ؟
کچھ سہی ——
ان نفس گاہوں سے بڑھکر روشن و تابندہ ہیں ——!!

میں تھکا ہارا، پریشاں حال، کمزور و نحیف و ناتواں -!
کارواں سالار لیکن منزلیں پامال کرتا جا رہا ہے اور ٹھہرتا ہی نہیں -!!
کسقدر منحوس ہے تپتی ہوئی یہ شاہراہ ؟
جو مسافر اس سے گذرا جیتے جی منزل نہ مل پائی اُسے -!!
اک ذرا سا راہ سے ہٹ کر ہیں وہ پگڈنڈیاں،
لہلہاتے سبز کھیتوں میں سبک اور صندلی انگڑائیاں،
جسمیں لہریں جسطرح بحرِ زمردیں اٹھیں و اٹھکر مجسم ہو گئیں -!!

(کھیل سکتا کاش ان لہروں سے میں)
بالیوں کے ریشمیں پردوں ہی میں روپوش ہیں گیہوں کی
کمسن نوجواں رعنائیاں -!
کر رہی ہے جن سے ہر موجِ ہوا اٹکھیلیاں !
—— اور کھیتوں سے پرے وہ ہیں ندی کی سیڑھیاں -
کتنی رادھاؤں کا جھرمٹ ہے وہاں -؟!
آم کے باغات، امرودوں کے جھنڈ،
میری قسمت میں کہاں ؟
یہ دھواں، یہ شعلے، یہ چنگاریاں ——
—— یہ گرج - آپس میں ٹکرلتے ہوں جیسے دو پہاڑ -!!
ان سے اب عاجز ہیں احساس و نظر

کسقدر ہموار ہے یوں دیکھنے میں شاہراہ ؟
لڑکھڑا رہا ہوں ٹھوکروں پر ٹھوکریں !-
یہ لرزتے گام اور ہر گام پہ سو منزلیں - !
راستہ میں جب کوئی منزل ملی،
کارواں سالار چیخ اٹھا کہ اک منزل ہے آگے اور بھی -!!

آج بھی بکھرے پڑے ہیں کتنے نظارے کمال ——
—— ایسے نظارے جو دے سکتے ہیں نظروں کو پناہ !!
وہ محل، وہ پائیں باغ،
اب تو ہے اس کا تخیل بھی فراز ——!!

فراق نے کمال یہ کیا ہے کہ روپ کی رباعیوں میں انھوں نے اخلاق و فلسفہ کے موضوعات کو چھوڑ کر صرف سنگھار رس کے ترانے ہم کو سناتے ہیں۔ ان کی فلسفیانہ رباعیاں روحِ کائنات میں ملیں گی:۔

خلقت کو سنوار دے عبادت کیا ہے　　دنیا کا شباب آئے جنت کیا ہے
ہاں میکدۂ جہاں کا ذرہ ذرہ　　سرشارِ مجاز ہو حقیقت کیا ہے

اب روپ کی یہ رباعی سنیے:۔

ہر جلوے سے اک درسِ نمو لیتا ہوں　　چھلکے ہوئے صد جام و سبو لیتا ہوں
اے جانِ بہار تجھ پہ پڑتی ہے جب آنکھ　　سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں

دیدارِ محبوب سے درسِ نمو لینا کتنی بڑی بات ہے۔ کتنی گہری دریافت اس ٹکڑے میں ہے اور درسِ نمو کی ارتقائی منزلیں کس سبک روی سے سنگیت کی سرحدوں پہ پہنچ کے ختم ہوتی ہیں۔

اردو شاعری میں منظر نگاری خوب خوب ہوتی ہے لیکن ایسی نظموں میں اگر آپ وہ گہرائیاں تلاش کریں جن میں آپ ڈوب ڈوب جائیں اگر آپ مصوری میں بلاغت کی صفت ڈھونڈیں تو روحِ کائنات کی آخری نظم دیکھیے جس کا عنوان ہے دھندلکے۔

یہ چاندنی، یہ ہوائیں، یہ شاخِ گل کی لچک
یہ دورِ بادہ، یہ خاموش سازِ فطرت کے
سنائی دینے لگی جگمگاتے سینوں میں
دلوں کے نازک و شفاف آبگینوں میں
ترے خیال کی پڑتی ہوئی کرن کی کھنک

اس نظم کا آخری بند سنیے:۔

کسی خیال میں ہے غرق چاندنی کی چمک
حیات و موت میں سرگوشیاں سی ہوتی ہیں
کروڑوں سال کے جاگے ستارے نم دیدہ
سیاہ گیسوؤں کے سانپ نیم خوابیدہ
یہ پچھلی رات! یہ رگ رگ میں نرم نرم کسک

مناظرِ فطرت کو معنی کی دنیا بنا دینا، ان میں جیون سنگیت بھر دینا۔ مناظر کے خد و خال کی ایسی بلیغ ترجمانی کرنا فراق ہی کا کام تھا۔ ان کے الفاظ میں وہ تازگی ہے کہ فارسی کا یہ مصرعہ یاد آجاتا ہے ع لفظے کہ تازہ است بمضمون برابر است۔

فراق کے یہاں الفاظ بسا اوقات اپنی لغوی حدود کو توڑتے ہوئے فضا کی بیکرانیوں میں ہمیں گم کر دیتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ تخلیقِ کائنات سے لے کر اب تک کا زمانہ ان کے اشعار پہ منڈلا رہا ہے۔ بہت مشہور شعراء کے پورے مجموعۂ کلام میں جتنے تجربات پھیلے ہوتے ہیں اتنے تجربات اور اتنے معانی بسا اوقات فراق ایک ایک مصرعہ یا ایک ایک شعر میں سمیٹ لیتے ہیں خود کہتے ہیں:۔

ابھی تو بحر و بر پہ سو رہی ہیں وہ میری صدائیں　　سمیٹ لوں انھیں تو پھر وہ کائنات کو جگائیں

روحِ کائنات، مشعل، روپ، شعلۂ ساز اور شبنمستان کے اشعار میں ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کی بہتیری رگیں تھرتھرا رہی ہیں۔

Regd. No. L. 2627



Printed at the Mahbob-ul-mataba Press, Delhi & Published by
Sahid Ahmed B.A. Hons from the office of the "SAQI"